تفسیر قرطبی مترجم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ۰ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ۔ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی جلد اول

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام:

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد اول)
مفسر	امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
	مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی
	من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیر اہتمام	ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اکتوبر 2012ء، بار اول
کمپیوٹر کوڈ	QT54

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350 ۔فیکس042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔32630411-32212011-021 ۔فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے حبیب لبیب اور ہمارے آقا حضور پر نور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے طفیل اس کی توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز آپ کی خدمت میں ''الجامع لاحکام القرآن'' جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے پیش کر رہا ہے۔ یہ تفسیر امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 671ھ کی تالیف ہے۔ حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز نے تفسیر ضیاء القرآن کی تالیف کے دوران اس تفسیر سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ الفاظ قرآن کی لغوی اور بلاغی تعبیر ہو یا آیات کی ترکیبی توضیح، حکمت دین کا معاملہ ہو یا فلسفہ اسلام جا بجا اس کی تفسیر کی طرف رجوع ملتا ہے یہ امر تفسیر قرطبی کی عظمت شان کا پتہ دیتا ہے۔

دلی آرزو تھی کہ اس تفسیری کام کو اردو زبان میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے اس مشکل امر کو ادارہ ضیاء المصنفین کے علماء نے اپنے ذمہ لیا تقریباً ساڑھے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد ہم اس قابل ہوئے کہ یہ ارمغان محبت آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

اپنی بساط کے مطابق ہم نے اس کے ظاہری اور باطنی محاسن کو ملحوظ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ہم امید واثق رکھتے ہیں کہ ہماری یہ کاوش بھی آپ کی نظر التفات کی مستحق بنے گی اور آپ میرے، ادارہ کے جملہ اراکین اور ادارہ کے حق میں دعا کریں گے کہ خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رہے اور ہمارے لیے خصوصاً یہ بھی دعا فرمائیں گے کہ ہماری اس خدمت کو اللہ تعالیٰ توشہ آخرت بنا دے۔

آپ کا خادم
محمد حفیظ البرکات شاہ عفی عنہ

حسن انتخاب کا سبب

تفسیر ضیاء القرآن کے مصادر کی تخریج کے مرحلہ سے جب ہم گزر رہے تھے تو یہ امر آشکارا ہوا کہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری ادب میں سے تقریباً چوبیس تفاسیر سے نکات اخذ کئے ہیں اور سب سے زیادہ تفسیر قرطبی اور تفسیر مظہری کی طرف رجوع کیا ہے۔

ادارہ ضیاء المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی حاجی حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر محمد ابراہیم شاہ کے توجہ دلانے سے تفسیر مظہری کا ترجمہ ہوا۔ درمیان میں دوسرے کام ہوتے رہے۔ آج جون 2012ء سے ساڑھے چھ سال پہلے ادارہ ضیاء المصنفین کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ العالی صدر ادارہ ضیاء المصنفین کی سربراہی میں ہوا اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے کا اردو ترجمہ کروایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کا سلسلہ شروع ہوا اس کام میں چار احباب نے حصہ لیا۔

1۔ جناب سید محمد اقبال شاہ صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ غوثیہ
2۔ جناب محمد انور مگھالوی
3۔ جناب شوکت علی چشتی
4۔ راقم الحروف محمد بوستان

تفسیر قرطبی علوم کا سمندر ہے۔ عربی ادب پر کامل گرفت، حکمت دین پر گہری نظر اور مسائل شرعیہ پر عبور، یہ حضرت مفسر کا خاصہ ہے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالتے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ قاری آسانی کے ساتھ مفاہیم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے مصادر کی تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

اس کے مصادر کو صفحہ قرطاس کی زینت بنانے اور پروف ریڈنگ کے مختلف مراحل میں علامہ شوکت علی چشتی صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔ ان کی عملی مدد حاصل نہ ہوتی تو اس کام کی تکمیل میں مزید کئی سال صرف ہو سکتے تھے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس فاضل نوجوان کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ان کی ذات کو ملت اسلامیہ کے لیے نافع بنائے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے قبول عام نصیب فرمائے اور ہمارے لیے توشہ آخرت بنائے۔

محمد بوستان عفی عنہ
مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

امام محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح ابوعبداللہ انصاری، خزرجی، قرطبی، اندلسی مالکی۔

آپ نے ابن رواج، ابن جمیزی، شیخ ابوالعباس احمد بن عمر قرطبی صاحب المفہم، ابوعلی حسن بن محمد بن محمد بکری حافظ اور ابو الحسن علی بن محمد بن علی بن حفص تحصبی وغیرہ سے اکتساب فیض کیا۔

آپ سے ان کے بیٹے شہاب الدین احمد وغیرہ نے اکتساب فیض کیا۔

امام ذہبی آپ کے بارے میں ذکر کرتے: آپ مختلف فنون میں نہایت نامہ رکھنے والے اور علم میں تبحر امام ہیں۔ آپ کی بڑی مفید تصانیف ہیں جو آپ کے کثرت علم اور زیادتی فضل پر دال ہیں۔ آپ کی تفسیر کو شہرت نصیب ہوئی یہ تفسیر اپنے معنی میں کامل ہے۔ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو آپ کی امامت، ذکاوت اور کثرت علم پر دال ہیں۔

ابن فرحون نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں، متقی عارف علماء، دنیا میں زہد اختیار کرنے والے اور ان افراد میں سے تھے جو امور آخرت میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے اوقات عبادت وتصنیف میں صرف ہوتے آپ نے تکلف کو دور پھینک رکھا تھا۔

ابن عماد نے شذرات الذہب میں کہا: آپ حدیث کے معانی میں غواصی کرنے والے اور عمدہ تصنیف کے حامل تھے۔

آپ کی مطبوعہ کتب یہ ہیں۔

1۔ الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی وصفاتہ

2۔ الاعلام بمافی دین النصاری من الاوہام

3۔ التذکار فی افضل الاذکار

4۔ التذکرہ فی احوال الموتی وامور الآخرۃ

5۔ قمع الحرص بالزہد والقناعۃ وردذل السوال بالکتب والشفاعۃ

6۔ الجامع لاحکام القرآن یہی تفسیر ہے۔

آپ کا وصال مصر میں منیۃ بنی خصیب میں پیر کی رات نوشوال کو 671ھ میں ہوا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

الجامع لاحکام القرآن

الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے یہ تفاسیر میں سے جلیل الشان تفسیر ہے کیونکہ یہ معانی القرآن کی وضاحت اور احکام کی تفصیل پر مشتمل ہے پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس میں قراءات، اعراب، شعری شواہد، لغوی مباحث، نحوی اور صرفی نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

آپ کا اسلوب یہ ہے۔

☆ سورت کی فضیلت اور اس کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں ہے۔

☆ نزول کا سبب بیان کرتے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ایسی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو اس سے متعلق ہوں اور جو الفاظ جن لغوی معانی کا احتمال رکھتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ اس بارے میں اشعارِ عرب سے تائید لاتے ہیں۔

☆ آیت کے متعلقہ احکام فقیہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان میں ائمہ کا اختلاف ذکر کرتے ہیں اور ہر ایک کے دلائل لاتے ہیں۔

☆ لفظ کے اشتقاق، باب اور اعراب کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی بعض اوقات ائمہ لغت کے اقوال کو بیان کرتے ہیں۔

☆ قراءات متواترہ اور غیر متواترہ کا ذکر کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب علمی موسوعہ ہے۔ جس میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف علوم کو جمع کر دیا ہے احکام القرآن کی تفصیل کی طرف خصوصی توجہ دی ہے، اسی پر کتاب کی بنیاد رکھی ہے اور اسے اسم بامسمّٰی بنا دیا ہے۔

اس تفسیر کے اہم مصادر

1۔ المحرر الوجیز۔ یہ ابن عطیہ کی تفسیر ہے متوفی 546ھ
2۔ النکت والعیون۔ یہ ماوردی کی تفسیر ہے۔ متوفی 450ھ
3۔ تفسیر ابی اللیث۔ یہ ابولیث سمرقندی کی تفسیر ہے۔ متوفی 375ھ
4۔ تفسیر بغوی یہی معالم التنزیل ہے۔ متوفی 516ھ
5۔ الوسیط۔ یہ الواحدی کی تفسیر ہے اسباب النزول بھی انہی کی علمی کاوش ہے۔ متوفی 468ھ
6۔ معانی القرآن۔ اعراب بالقرآن اور الناسخ والمنسوخ یہ ابوجعفر نحاس کی کتب ہیں۔ متوفی 338ھ
7۔ التمہید، الاستذکار، الکافی اور الدرر وغیرہا یہ ابوعمر بن ابن عبداللہ کی کتب ہیں۔ متوفی 463ھ
8۔ احکام القرآن۔ یہ ابوبکر بن العربی کی تفسیر ہے متوفی 543ھ
9۔ معانی القرآن اس نام کی کتب یہ اخفش سعید متوفی 211ھ، یحییٰ بن زیاد الفراء 207ھ اور ابی اسحاق زجاج متوفی 311ھ تالیفات ہیں۔
10۔ مجاز القرآن یہ ابوعبیدہ متوفی 210ھ کی تالیف ہے۔
11۔ احکام القرآن للکیا ہراسی متوفی 504ھ کی تالیف ہے۔
12۔ المفہم یہ ابوالعباس قرطبی متوفی 656ھ کی تالیف ہے۔
13۔ کتب احادیث جو مشہور و معروف ہیں۔

تفسیر قرطبی کے مصادر کی تخریج

☆ بنیادی طور پر یہ فریضہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے دورہ حدیث کے طلباء نے اساتذہ کی نگرانی میں انجام دیا۔

☆ صحاح ستہ کے بارے میں ابتداءً یہ ہدایت دی گئی تھی کہ حکومت پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم نے جو کتب شائع کی ہیں ان کو ہی بنیاد بنایا جائے اور کتاب، باب اور صفحہ کو درج کیا جائے۔ عموماً صحاح ستہ کی کتب کی تخریج اسی طرح موجود ہے۔

☆ قریب ہی عرصہ میں ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے صحاح ستہ (مترجم) کو شائع کیا تو تھوڑے وقت میں یہ کوشش کی گئی کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ صحاح ستہ کی یہ احادیث جن کے نمبر درج ہیں وہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتب کے نمبرز ہیں۔

☆ تفسیری اقوال کے حوالے سے یہ گزارش ہے کہ جس تفسیر کا ذکر ہے اس کی اسی آیت کے ضمن میں وہ قول دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کتب مختلف مکتبوں نے شائع کی ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ صفحہ میں کچھ فرق ہو۔

☆ مسند امام احمد بن حنبل کے دو مطبوعوں کے حوالہ جات ہیں۔

1۔ مسند کی وہ حدیث جس کا نمبر درج ہے وہ مکتبہ دارالحدیث قاہرہ کی شائع شدہ ہیں۔

2۔ جلد اور صفحہ والی حدیث یہ دار صادر المکتب الاسلامی بیروت کے مطبوعہ کی ہے۔

کچھ فاضل مترجمین کے بارے میں

علامہ ملک محمد بوستان صاحب

زمانے کی بساط پر کوئی تحریک اسی وقت ابھرتی ہے جب اسے قائد کے بعد مدبر اور صاحب بصیرت کارکن میسر آجائیں۔ کوئی ادارہ اسی وقت اوج کمال کو چھوتا ہے جب اسے سربراہ کے بعد پرعزم اور وفا شعار رفیق نصیب ہو جائیں۔ بلاشبہ ایسے کارکن اور رفیق قائد کا مان اور تحریک کی جان اور ادارے کی شان ہوتے ہیں۔ ان کی انگان اور رفتار انہی کے کردار سے ہوتی ہے ایسے بلند ہمت نفوس قیمتی سرمایہ اور اثاثہ ہوتے ہیں۔ چمن کا کاروبار انہی کے دم سے چلتا ہے۔

حضرت مولانا ملک محمد بوستان مدظلہ مفکر اسلام، مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی تحریک دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے ایک ایسے ہی کارکن اور رفیق ہیں جن پر ادارے کو بجا طور پر ناز اور فخر ہے بلاشبہ آپ تحریک سے فکری اور علمی ناطہ بھی رکھتے ہیں اور حبی اور قلبی رشتہ بھی۔

حضرت قبلہ ملک صاحب چکوال کے قریب ایک گاؤں کھوکھر زیر میں جناب محترم عبدالرحمٰن صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ابتدائی دینی وعصری تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی۔

پھر قسمت مہربان ہوئی، رب رحمٰن کے دست کرم نے تھاما اور دبستان کرم میں لا بٹھایا۔ جہاں آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ظاہری و باطنی، علمی و روحانی فیوضات و برکات کی خوب خوشہ چینی کی، اپنی شخصیت کو نکھارا اسے پروان چڑھایا اور مطلع حیات پر علم وعمل کا پیکر بن کر ظاہر ہوئے۔

مڈل پاس کرنے کے بعد 21 مئی 1971ء کو آپ نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور 21 مئی 1981ء کو مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔ حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ فاضل اور اجل اساتذہ سے استفادہ کیا اور مہارت اور کمال حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی کچھ اس دلسوزی جاں سپاری اور سرشاری سے گزارا کہ خود کو حضرت ضیاء الامت اور اپنے اساتذہ کی نگاہ میں اپنی مادر علمی کی ہر طرح کی خدمت کے لیے اہل ثابت کر دیا۔ چنانچہ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کا حق ادا کیا یوں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

فن تدریس میں اپنی منفرد شان رکھتے ہیں۔ سبق کی پہلے زبانی جامع تقریر فرماتے ہیں پھر ترجمہ کرتے ہیں جس سے سبق اور کتاب دونوں سے ربط قائم ہو جاتا ہے۔ سبق بھی سمجھ آجاتا ہے اور عبارت بھی سلجھ جاتی ہے۔ مطالعہ آپ کی عادت ہے۔ بغیر مطالعہ کوئی سبق نہیں پڑھاتے۔ تقریر خوش بیانی اور نکتہ آفرینی کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔

مرکزی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہونا اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔ آپ نے اپنی لگن، محنت، ذوق اور اخلاص سے نہ صرف اس میدان میں اپنی جگہ بنائی بلکہ خود کو اس منصب کا اہل باور کرایا اور اپنے شیخ کے انتخاب کو سچ کر دکھایا۔ بلاشبہ قدرت

نے آپ کے وجود میں بہت جوہر رکھے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ خوب کھلے۔ اپنے خداداد تدبر فہم اور بصیرت کی بدولت جلد ہی آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ادارے کے معتمد کارکن اور رفیق شمار ہونے لگے۔ کسی کی نگاہ میں اپنا مقام بنانا آسان کام نہیں لیکن آپ نے اپنے جذبہ اخلاص اور سرفروشی سے اوائل سفر میں یہ کمال حاصل کر لیا۔

تعلیمی مسائل ہوں یا انتظامی، تنظیمی معاملات ہوں یا تحریکی، نصابی سرگرمیاں ہوں یا غیر نصابی، تعلیم کا سلسلہ ہو یا تربیت کا، قبلہ ملک صاحب کی ذات ہمیں ہر میدان میں متحرک اور سرگرم نظر آتی ہے۔

دماغ تو ہر کوئی رکھتا ہے لیکن اسے برمحل اور بروقت برتنے کی خوبی کوئی کوئی رکھتا ہے۔ دماغ سے سوچنا، سمجھنا اور مسئلے کا حل نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ قبلہ ملک صاحب میں یہ خوبی بھی ہے کہ آپ اپنے دماغ سے کام لینا خوب جانتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ درپیش مسئلے کے ہر پہلو کو سوچنا، پوری گہرائی سے اسے سمجھنا اور پھر حل نکالنا آپ کا نمایاں اور امتیازی وصف ہے۔ آپ اجتہادی فکر اور تجدیدی سوچ کے مالک ہیں۔ تعلیم و تدریس اور انتظام و انصرام میں آپ نے کئی نئی جہات متعارف کرائیں۔

کئی اضافی فرائض نبھاتے ہیں۔ قبلہ عالم حضرت جانشین ضیاء الامت کے معتمد اور مشیر خاص ہیں۔ تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن بھی ہیں۔ مرحلہ وار لجنۃ الامتحانات کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ ادارہ ضیاء المصنفین اور الکرم ویلفیئر فنڈ کی نگرانی بھی فرماتے ہیں۔ نصابی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

جامع مسجد بازار دالی میں عرصہ سے خطبہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔ آواز گو دھیمی ہوتی ہے مگر گفتگو علم و حکمت سے بھری ہوتی ہے۔ فکر و نظر کے نئے نئے زاویوں اور پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ سامع محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وجیہ اور حسین قد و قامت کے مالک ہیں۔ بدن نحیف اور حس لطیف رکھتے ہیں۔ نازک طبع اور منتظم مزاج ہیں نکتہ سنج اور معاملہ فہم ہیں۔ نظم و ضبط کے پابند اور قواعد و ضوابط پر کاربند۔ ذوق نفیس رکھتے ہیں اس لیے خوش خوراکی اور خوش لباسی کے عادی اور بروقت اور مناسب کام کرنے کے خوگر ہیں۔ گہری سوچ، عمیق نظر اور دقیق فکر آپ کی پہچان ہے۔ برملا رائے کا اظہار کرنا، اسے صائب سمجھتے ہوئے اس پر قائم رہنا جو کام پسند آجائے اس پر خوش ہونا اور حوصلہ افزائی کرنا اور جو معیار پر نہ ہو اترے اس کی اصلاح کرنا آپ کا وتیرہ ہے۔ اور جسم کے نزاری اور صحت کی کمزوری کے باوجود اپنی جملہ ذمہ داریوں سے مستقل مزاجی سے عہدہ برا ہونا آپ کا وظیفہ ہے۔

قلم کے برتنے کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔ جہاں آپ نے علم کی دنیا کے دوسرے کئی میدانوں میں اپنی لیاقت کا سکہ جمایا ہے وہاں تحریر کے میدان میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ تفسیر بیضاوی (پارہ ۲۹۔ ۳۰)، قصیدہ بردہ (بوصیری) اور قیدہ اطیب النغم (شاہ ولی اللہ) کا عربی میں جامع حاشیہ تحریر فرمایا۔ نیز تفسیر مظہری (4 جلد) تفسیر درمنثور (2 جلد)، النبی محمد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کا ترجمہ بھی فرمایا جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ تفسیر قرطبی (4 جلد) جو ابھی زیر طبع ہے۔
فتاوی شامی کے ترجمہ پر بھی کام جاری ہے یہ سب آپ کے میدان تحریر میں بھی لیاقت و قابلیت کا ثبوت ہیں۔

شیخ الحدیث پیر سید محمد اقبال شاہ گیلانی

اگر حضور رحمت عالمیان ﷺ کے اہل بیت کے سلسلۃ الذہب کو دیکھا جائے تو اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے حسین اور زیبا تر ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فیضان جو آپ نے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو عطا فرمایا تھا وہ اس نسب پاک کے ہر ہر فرد میں پورے جوبن پر نظر آتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے دیگر انساب کو دیکھتے ہیں تو بمشکل ایک یا دو فرد ہی علم وعرفان کے امین نظر آتے ہیں۔ لیکن نثار جایئے اس عظیم سلسلہ پر جہاں ہر آفتاب دوسرے سے درخشندہ تر اور ہر ماہتاب دوسرے سے تابندہ تر نظر آتا ہے کہیں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ لب پہ تبسم سجائے جام شہادت نوش کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں رضائے الٰہی کے حصول کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ بہتر تن وار دیتے ہیں کہیں امام زین العابدین اہل عبادت وریاضت کے لیے مینارۂ نور نظر آتے ہیں۔ کہیں امام باقر علم وعرفان کا نیر تاباں دکھائی دیتے ہیں کہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بحر معرفت کے شناور دکھائی دیے ہیں۔ کہیں امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ جیسے نابغہ روزگار شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ ہر ہر فرد آسمان علم وحکمت کا مہر منیر نظر آتا ہے حتیٰ کہ مرج البحران یلتقیان کی طرح یہ سارے اوصاف حمیدہ اور شمائل سنیہ حضور غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسینی رضی اللہ عنہ کی ذات ستودہ صفات میں جمع ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث پیر سید ۔ اقبال شاہ گیلانی صاحب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک حسین کڑی ہیں آپ اپنے اسلاف عظام کی طرح نہ صرف جدید اور قدیم علوم سے مزین ہیں بلکہ خدائے تعالیٰ نے عرفان ومعرفت کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا ہے حتیٰ کہ مجھے ایک بزرگ نے فرمایا قبلہ شاہ صاحب کی نہ صرف من موہنی صورت اپنے اسلاف سے ملتی ہے بلکہ چال ڈھال میں بھی کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ علم کی بے کرانی کا عالم یہ ہے کہ قبلہ شاہ صاحب دورہ حدیث شریف کو بخاری شریف جیسی اہم کتاب پڑھا رہے ہیں اور عرفان ومعرفت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی سر سجدہ میں رکھ کر اپنے رب تعالیٰ کو راضی کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی درود پاک کو اپنی زبان کی زینت بنا کر بارگاہِ رسالت مآب میں ہدیہ عقیدت پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ انتہائی ظریف ہونے کے باوجود نہ کبھی تدریس میں بد دیانتی کی ہے اور نہ ہی عبادت میں کمی۔

آپ کا اسم گرامی ''سید محمد اقبال شاہ گیلانی'' ہے۔ والد گرامی کا نام نامی سید محمد حسین شاہ گیلانی ہے آپ حضور غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد پاک سے ہیں۔ میانوالی کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ آپ کی پیدائش کا ضلع بنا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم، بعد ازاں میٹرک تک تعلیم ضلع میانوالی میں ہی حاصل کی۔ ہر امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد 1979ء کو دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا دوران تعلیم ایک ذہین اور ہونہار طالب علم کی حیثیت سے بلند مقام حاصل کیا۔ محنت شاقہ سے علم کے زینے طے کئے۔ 1988ء میں دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سے تعلیم کی تکمیل کی اور شہادت عالمیہ اور سند حدیث حاصل کی۔ پھر اپنے مرشد کریم، مفسر قرآن، عظیم سیرت نگار، حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے دارالعلوم ضیاء

القرآن فاضل ضلع بھکر میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ بلند پایہ مدرس ثابت ہوئے طلباء کے دلوں میں محبت الٰہیہ اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی جوت جگائی۔ اس کے بعد 1993ء سے تا حال مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں مسند تدریس پر فائز ہیں۔ آپ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آپ 2000ء سے بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ یہ امر کتنا پرلطف اور دلکش ہے کہ گلشن رسالت کے گلہائے زیبا اہل بیت کا ایک شہزادہ ہی امت مرحومہ میں تقسیم کر رہا ہو۔

2001ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور عمرہ کی سعادت حاصل کی جبکہ 2006ء میں مجاہد ختم نبوت، پیر طریقت محمد امین الحسنات شاہ صاحب مدظلہ العالی نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی خلافت سے نوازا۔ 2011ء کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

آپ کا کمال یہ ہے کہ بخاری اور بیضاوی شریف جیسے اہم مضامین پڑھانے کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ضیائے حرم میں مختلف عنوانات پر مضامین حوالہ قرطاس کئے اور کچھ عرصہ تک ضیائے حرم کا فقہی کالم بھی لکھا، اس کے علاوہ علوم نبوت، حقیقت استمداد، بیعت کی شرعی حیثیت کے نام سے کتب تالیف کیں۔ درود پاک کی فضیلت پر منفرد کتاب ''القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع'' کا ترجمہ کرنے کی سعادت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ دیگر شاہکار کتب درج ذیل ہیں جنہیں آپ نے اردو قالب میں ڈھالا۔

1۔ تفسیر مظہری، تین جلدیں۔ 2۔ تفسیر درمنثور، دو جلدیں۔ 3۔ تفسیر قرطبی تین جلدیں، 4۔ زجاجۃ المصابیح۔ 5۔ بخاری شریف۔ 6۔ فضائل مدینہ۔

آپ اٹھارہ سال سے ضلع خوشاب میں ایک قصبہ روڈہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے خلوص اور محنت و لگن سے وہاں کی عوام میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ آپ کے دلپذیر خطبات کی وجہ سے کئی بے ریش افراد کے چہروں پر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجی اور عوام نہ صرف دلجمعی سے عبادات کے خوگر بنے بلکہ وہ اپنے معاملات بھی احسن انداز سے دین اسلام کے سنہری اصول پر چلانے لگے ہیں۔ آپ نے وہاں طلباء کے لیے دار العلوم محمدیہ غوثیہ کے نام سے اور طالبات کے لیے غوثیہ گرلز کالج کے نام سے دو ادارے قائم کیے ہیں۔ وہاں کے کثیر لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں۔

ان چند سطور میں آپ کے علمی کمالات اور روحانی فیضان کو قلمبند نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی سعادت کے لیے چند پھول آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں اس نیت سے کہ

''شاہاں چہ عجب اگر بنوازند گدارا''

علامہ محمد انور مگھالوی

ادیان عالم میں اللہ تعالیٰ نے جس دین کو اپنا دین قرار دیا جسے سند قبولیت سے نوازا اور جسے تمام ادیان پر غالب کیا وہ دین اسلام ہے۔ چنانچہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمہ کرم پر لی۔ اس کی سنت جاریہ ہے کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کا یہ کام اپنے منتخب بندوں سے لیتا ہے۔ اس نے اپنے کسی بندے کو خدمت دین کی سعادت ارزانی فرمانا ہوتی ہے اور اس کی ذات کو دوسروں کے لیے نفع بخش اور فیض رساں بنانا ہوتا ہے تو وہ اپنی خاص رحمت فرماتے ہوئے اسے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے جو پھر قرآن مجید کے حکم ''ولتکن منکم امۃ'' کی تعمیل کرتے ہوئے حفاظت دین کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہمارے ممدوح حضرت مولانا ابوالعرفان محمد انور مگھالوی مدظلہ بھی انہی پاک نہاد اور بخت رسا نفوس میں سے ایک ہیں جنہیں دین کا فہم اور بصیرت عطا کر کے اس کی خدمت کی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت مولانا قبلہ 16 اپریل 1959ء کو ضلع چکوال کی تحصیل چواسیدن شاہ کے ایک معروف گاؤں وعولہ میں حضرت الحاج حافظ نور محمد صاحب کے علمی وروحانی گھر میں پیدا ہوئے۔

حضرت قبلہ حافظ صاحب علاقے کی مشہور دیندار، بارسوخ اور علم وفضل کی مالک شخصیت ہیں۔ آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف کے دیرینہ اور مخلص متوسلین میں سے ہیں۔ قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ چالیس سال قریبی گاؤں مگھال میں پوری تندہی سے امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیئے۔ ہزاروں کو قرآن مجید کی تعلیم سے بہرہ ور کیا اور قرآن کے نور سے ان کے قلوب واذہان کو جلا بخشی۔ یہ قرآن سے الفت، دین سے محبت اور آستانہ عالیہ سے عقیدت ہی ہے کہ اپنی تمام اولاد کو بھی حافظ قرآن اور عالم دین بنایا اور اپنے پوتوں اور نواسوں کو بھی خدمت دین پر مامور کیا۔

حضرت مولانا قبلہ نے جب شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید ناظرہ اپنے پدر بزرگوار سے پڑھا۔ پرائمری اور مڈل کی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی۔ قسمت نے یاوری کی قدرت نے مہربانی کی گورنمنٹ مڈل سکول ڈلوال میں ابھی ساتویں جماعت میں تھے کہ مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری مگھال تشریف لائے اور انہیں حافظ صاحب سے اپنے لیے مانگ لیا۔ پھر کیا تھا مراد بن کر دبستان کرم بھیرہ شریف میں آگئے اور یہیں ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دیئے۔

یکم مئی 1977ء کو مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور اپریل 1983ء مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔ چنانچہ حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کی علمی برکات سے بھی مستفید ہوئے اور روحانی فیوضات سے بھی مستفیض ہوئے۔ علاوہ ازیں شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الفقہ مولانا محمد فاضل، شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری، شیخ الادب مولانا الحاج ملک عطا محمد، مولانا محمد سعید اسعد، مولانا عبدالرزاق صدیقی، مولانا رب نواز اجمیری، مولانا محمد رفیق چشتی، پروفیسر حافظ احمد بخش اور پروفیسر محمد اسلم چوہدری جیسے فاضل اور اہل اساتذہ سے صرف، نحو، لغت، بلاغت ادب، انشا، تاریخ،

منطق، فلسفہ، فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث، تفسیر و اصول تفسیر وغیرہ جیسے قدیم فنون اور انگریزی، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ جیسے جدید علوم میں درک حاصل کر کے ان میں کمال پیدا کیا۔

مقصد عظیم اور منزل ارفع ہو۔ ذہن میں کچھ کرنے کا سودا سمایا اور دل میں کچھ پانے کی لگن لگی ہو تو زندگی کا رنگ خود بدل جاتا ہے۔ حضرت مولانا اپنے مرشد کے حکم سے دین کی راہ پر نکلے تھے اس لیے اس راہ کی نزاکتوں اور تقاضوں کا ادراک کیا۔ حد درجہ محنتی، فرض شناس اور ذمہ دار طالب علم واقع ہوئے۔ زمانہ طالب علمی بڑی جاں سوزی، جگر کاوی اور عرق ریزی سے گزارا۔ نیز تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ اور اساتذہ کی خدمت کو بھی اپنی تعلیم و تربیت کا جزو بنایا جس کا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر اور عکس نظر آتا ہے۔ طبیعت میں سادگی، علم میں پختگی اور عمل میں پاکیزگی اسی خدمت کی برکت ہے۔

ستمبر 1983ء کو عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت کے حکم پر مرکزی دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ آپ کے لیے اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔ تاہم آپ نے پورے تدبر اور بصیرت سے اس کا پاس کیا۔ انتھک محنت اور اخلاص سے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے ادا کئے کہ خود کو بہت تھوڑی سی مدت میں کامیاب مدرسین کی صف میں لا کھڑا کیا بلکہ فن تدریس کو ایک نئی جہت دی صرف و نحو آپ کے خاص مضمون ٹھہرے۔ سبق کی جب تقریر فرماتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے لفظوں کی آبشار رواں ہو گئی ہو۔ کمزور ترین ذہن بھی خالی دامن نہیں اٹھتا۔ سبق کے جملہ پہلوؤں پر کامل دستگاہ، مطالعہ کی وسعت، لفظوں کے معانی کو ذہنوں میں اتار کر انہیں نقش کرنے پر قدرت آپ کی خاص پہچان ہے۔

تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن اور مرحلہ وار شعبہ امتحانات کے سکریٹری کے اضافی فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ فن تدریس کے ساتھ فن خطابت کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ خطاب میں زور بیان بھی ہوتا ہے اور معانی کا سیل رواں بھی۔ جامع ڈلوال میں 1979ء سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں جو اس فن میں آپ کی لیاقت اور قابلیت پر شاہد ہے۔

آپ نے ظاہری علوم کے ساتھ حضرت ضیاء الامت کے روحانی فیوضات سے بھی حظ وافر پایا ہے اس لیے عامل بھی ہیں اور روحانی بیماریوں کا مداوا اور علاج بھی کرتے ہیں۔ دبستان کرم کے پروردہ ہیں اس لیے قلم کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم کیا اور اسے اپنے ذوق سے پروان چڑھایا اور جلد ہی اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ علمی و تحقیقی کام کر چکے ہیں جو اس فن میں آپ کی مہارت اور دسترس کا ثبوت ہے۔ ''فقہ حنفی کے اساسی قواعد، الوصول الی الاصول فی اصول الفقہ، ضیاء علم الحدیث اور ایام قربانی اور اس کے مسائل'' تالیف فرمائیں۔ زبدۃ الاتقان، تفسیر مظہری، تفسیر درمنثور، تفسیر قرطبی، سنن ابی داؤد اور فضائل مدینہ کا ترجمہ بھی فرمایا۔ فتاویٰ شامی (ج 4) کے ترجمہ پر کام جاری ہے اس کے علاوہ ماہنامہ ضیائے حرم اور مجلہ جمال کرم کے لیے متعدد متنوع موضوعات پر مضامین تحریر فرمائے ہیں۔

عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بلاشبہ ان تمام اوصاف اور خواص کے بھی حامل ہیں جو ایک عالم دین کے ماتھے کا جھومر اور شان ہوتے ہیں۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ سنجیدہ، مہمان نواز اور ملنسار ہیں۔ سب سے محبت اور اپنائیت سے ملتے ہیں۔ کشادہ ذہن، فراخ دل مہربان اور مشفق ہیں۔ گفتگو خوب فرماتے ہیں جو خوش مزاجی اور لطافت سے لبریز ہوتی ہے۔

علامہ شوکت علی چشتی

دین کی نعمت، خدمت اور اس کی تبلیغ کی سعادت سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے اور بڑا خوش بختی کا کام نہیں۔ یہ خوش بختی صرف اسے نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کے لیے پسند کر لیتا ہے۔ جس پر ذات باری خیر کے دروازے کھولنے کا ارادہ کرتی ہے۔ جسے دوسروں کے لیے نفع رساں بنانا مقصود ہوا سے وہ اپنے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

برادرم مولانا شوکت علی چشتی صاحب بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نعمت، اس کی خدمت اور تبلیغ کی توفیق اور سعادت ارزانی فرمائی۔

مولانا موصوف 22 جون 1976ء کو ضلع چکوال کی تحصیل تلہ گنگ کے ایک گاؤں سگھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ گورنمنٹ ہائی سکول سگھر سے پرائمری اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گھرانہ علم دوست اور روحانیت پسند تھا۔ چنانچہ علم کا شوق اور دین کا ذوق کشاں کشاں بھیرہ شریف لے آیا جہاں 1990ء میں عالم اسلام کی عظیم مثالی درسگاہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا۔ مفکر اسلام، مفسر قرآن، نباض عصر حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز اور مجاہد ملت امین حسن کرم قبلہ عالم، حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ کے زیر سایہ علوم اسلامیہ وعربیہ کی تکمیل کی اور جید اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔

شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا مفتی قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب الحاج ملک عطا محمد مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا ملک عبدالرزاق صدیقی مدظلہ، علامہ ملک محمد بوستان مدظلہ، علامہ محمد انور مگھالوی مدظلہ نمایاں اساتذہ میں سے ہیں۔

طلب دین کا جذبہ وافر پایا تھا اس لیے اکتساب اور تحصیل کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے۔ دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا جامعہ نظامیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا علی احمد سندیلوی سے حدیث مسلسلات کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت ضیاء الامت سے کلام اقبال پڑھنے کی سعادت بھی حصے میں آئی۔

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سے میٹرک، ایف اے، بی اے کے ساتھ ادیب عربی، عالم عربی، فاضل عربی اور الشہادۃ العالمیہ کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے۔ 2000ء میں فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں ماسٹر کیا۔ اس کے بعد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ جو بڑے اعزاز کی بات ہے۔ جلد ہی اپنی لگن اور محنت سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔ قابل اور لائق جونیئر سٹاف میں شمار ہوتے ہیں۔

تدریسی قابلیت کے ساتھ ساتھ قلمی صلاحیت بھی پائی ہے۔ قلم و قرطاس سے بھی گہرا والہانہ رشتہ رکھتے ہیں۔ ماہنامہ

ضیائے حرم، طلبہ کے ترجمان سیریل شاہین اور دیگر کئی رسائل میں مختلف علمی و فکری عنوانات پر لکھتے رہتے ہیں۔ 2000ء میں حضرت ضیاء الامت کے شہرہ آفاق ترجمہ ''جمال القرآن'' کے مفردات پر کام کیا جسے بیحد پذیرائی ملی۔ جمال القرآن کے ترجمہ کی ریکارڈنگ کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ مشہور قاری بزرگ شاہ الازہری کی تلاوت کے ساتھ اردو ترجمہ کی ڈبنگ کے لیے آپ ہی کی آواز کا انتخاب ہوا۔

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے عنوان سے ورکشاپ منعقد ہوئی۔ دارالعلوم کی طرف سے نمائندگی کا اعزاز آپ کے حصے میں آیا۔ ایسے سلسلوں میں آپ یہ اعزاز حاصل کرتے رہتے ہیں خطابت اور نقابت کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔ سرگودھا شہر کی ایک مرکزی مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ جہاں ہزاروں اہل اسلام آپ کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ ادارہ کی تقریبات کی نقابت بڑی خوبی سے سرانجام دیتے ہیں جسے سامعین بڑا سراہتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ سلسلہ ارادت بھی آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف سے رکھتے ہیں۔ 1993ء میں حضرت ضیاء الامت کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ دوسرا اعزاز ہے جو نصیب ہوا۔

متحرک، سرگرم اور باہمت ہیں راہ وفا پہ گامزن ہیں، پر عزم ہیں۔ اس لیے مشن کے فروغ کے لیے اپنے من تن دھن سے کوشاں رہتے ہیں اور سوئے منزل محو سفر رہتے ہیں۔

علامہ ابو عبداللہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر الجامع لاحکام القرآن کے ترجمہ کی بھی سعادت ارزانی ہوئی، یہ ادارہ ضیاء المصنفین کی آپ پر اعتماد کی دلیل اور ثبوت ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم کو اور بہتر کرے اور علمی، فکری ترقی عطا فرمائے۔ آمین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

وَبِهٖ نَسْتَعِيْنُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا

شیخ فقیہ امام عالم عامل، علامہ محدث ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری خزرجی اندلسی ثم قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:
سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہر حمد کرنے والے سے پہلے خود اپنی تعریف کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو سب کو پالنے والا ہے، بے نیاز ہے، یکتا ہے، حیی و قیوم ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، صاحب عزت و اکرام ہے، بڑے بڑے عطیات کا مالک ہے، قرآن کے ساتھ کلام کرنے والا ہے، انسان کا خالق ہے، انسان پر ایمان کا انعام فرمانے والا ہے، بیان کے ساتھ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب تک رات اور دن کی گردش رہے اور جب تک صبح و شام کا تبادلہ ہوتا رہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایسی واضح کتاب کے ساتھ بھیجا جو شک اور یقین میں فرق کرنے والی ہے، جس کے چیلنج نے بڑے بڑے فصحاء کو عاجز کر دیا، جس کے مقابلہ نے بڑے زیرک لوگوں کو بے بس کر دیا، جس کی معارضت و مشاکلت نے بلغائے عرب کو گنگ کر دیا، وہ اس کی مثل نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال کو غور وفکر کرنے والے کے لئے عبرت بنایا، اس کے اوامر کو اس کے لیے ہدایت بنایا جس نے ان میں بصیرت سے دیکھا اور اس کتاب مبین میں احکام کے واجبات کو واضح فرمایا، اس میں حلال وحرام کو واضح کیا، اس میں سمجھنے کے لئے مواعظ اور قصص کا تکرار فرمایا، اس میں مثالیں بیان فرمائیں، غیب کی خبریں بیان کیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام:38) (نہیں نظرانداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو) اس کے ساتھ اپنے اولیاء (دوستوں) کو خطاب فرمایا، پس انہوں نے اس کو سمجھا اور ان کے لئے اس کی مراد کو بیان فرمایا۔ پس وہ جان گئے، پس قرآن کو پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کے خلفاء اور اس کے امین ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے قریبی، خاص، چیدہ اور منتخب لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ہم میں سے کچھ اللہ کے اہل ہیں۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: قرآن کے اہل، اللہ کے اہل اور اس کے خاص بندے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، ابوبکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ پس جس نے اللہ کی کتاب کا علم حاصل کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نواہی سے رکنے، جو اس میں وضاحت کی گئی ہے اس میں غور وفکر کرنے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کا خوف کرنے، اس کے احکامات کا خیال کرنے اور اس سے حیاء کرنے کا کتنا مستحق ہے، کیونکہ اس پر رسل کا بوجھ ڈالا گیا ہے، وہ قیامت کے روز دوسری ملتوں کے مخالفین پر گواہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ:143) (اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے

1۔ ابن ماجہ، باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر 210، (مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز)

مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر)۔

خبردار! جس نے اس کا علم حاصل کیا پھر اس سے غافل ہوا اس پر یہ حجت ہے، اور جو اس سے کوتاہ ہوا اور جاہل ہوا اس پر اس حجت کو مؤکد کیا۔ جس کو علم قرآن عطا کیا گیا اور پھر اس نے نفع نہ اٹھایا، اس کے نواہی نے اسے جھڑکا اور وہ باز نہ آیا اور اس نے قبیح گناہوں کا ارتکاب کیا اور رسوا کن جرائم کا مرتکب ہوا، قرآن اس پر حجت ہوگا اور اس کا مدمقابل ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے'' (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، پس جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے خاص فرمایا اسے قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، اور اس کی عبارت کے حقائق میں غور و فکر کرے اور اس کے عجائب کو سمجھے اور اس کے غرائب کو بیان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ (ص:29) (یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اس کی آیتوں میں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں سے بنائے جو اس کی پوری پوری رعایت کریں اور اس میں اچھی طرح غور و فکر کریں، اس کے حق کو ادا کریں اور اس کی شرائط کو پورا کریں اور اس کے علاوہ کسی سے ہدایت تلاش نہ کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ظاہری اعلام اور قطعی احکام سے ہدایت دے اور ہمارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی کو اس کے ذریعے جمع فرمائے۔ وہ اہل التقویٰ اور اہل المغفرۃ ہے۔ پھر اس نے اس قرآن میں جو مجمل تھا اس کا بیان اور اس کے مشکل کی تفسیر، اس کے محتمل کی تحقیق اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپی تاکہ رسالت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اس اختصاص کا ظہور اور تفویض کا مرتبہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل:44) (اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے معانی پر جو تنبیہ فرمائی اور اس کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا اس کے استنباط کا فریضہ علماء کو بخشا تاکہ اس میں کوشش و محنت کے ذریعے علم المراد تک پہنچیں اور وہ دوسروں سے ممتاز ہو جائیں اور اپنی کوشش کے ثواب سے مختص ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ: 11) (اللہ تعالیٰ ان کے، جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا، درجات بلند فرمائے گا۔) پس کتاب اصل ہے اور سنت اس کا بیان ہے اور علماء کا استنباط اس کی وضاحت ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے ہمارے سینوں کو اپنی کتاب کے لئے ظرف بنایا، ہمارے کانوں کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا مورد بنایا اور ہماری ہمتوں کو ان کی تعلیم، ان کے معانی اور غرائب کے متعلق بحث کے لئے پھیر دیا۔

ہم اس کے ساتھ رب العالمین کی رضا کے طالب ہیں اور ملت اور دین کے علم تک اس کے ذریعے داخل ہونے والے ہیں۔

حمد و تعریف کے بعد! جب اللہ تعالیٰ کی کتاب جو تمام علوم شرعیہ کی کفیل ہے، جس نے سنت اور فرض کو قائم فرمایا، اس

1۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، جلد 1 صفحہ 119، مطبوعہ وفاقی وزارۃ تعلیم

کے ساتھ آسمان کا امین (جبرئیل امین) زمین کے امین (حضرت محمد ﷺ) کی طرف اترا تو میرا ارادہ ہوا کہ میں اپنی عمر اس میں مشغولیت کے ساتھ گزاروں اور اس میں اپنی ساری قوت وصلاحیت صرف کروں، اس طرح کہ میں اس کے متعلق مختصر سی تعلیق لکھوں، جو تفسیری، لغوی، ترکیبی اور قراءت کے نکات اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو، اس میں گمراہ اور کج رو لوگوں کا رد ہو اور ایسی احادیث کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو جو ان احکام اور نزول آیات کی دلیل ہوں جن کو ہم ذکر کریں اور قرآن وسنت کے معانی کی وہ تعلیق جامع ہو اور سلف وخلف کے اقوال کے ساتھ مشکل الفاظ کو بیان کرنے والی ہو۔ میں نے اپنے نفس کی نصیحت کے لئے یہ عمل کیا اور قبر کے دن کے لئے ذخیرہ اور اپنی موت کے بعد باقی رہنے والے علم صالح کے طور پر یہ عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿۱۳﴾ (القیامہ) (آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) پیچھے چھوڑے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿۵﴾ (الانفطار) (اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے اور جو اثرات وہ پیچھے چھوڑ آیا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال سے اس کا ثواب منقطع نہیں ہوتا: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور نیک بیٹا جو اس کے لئے دعا کرتا ہے''۔(1)

اس کتاب میں میری شرط یہ ہے کہ اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب کروں گا اور احادیث کی ان کے مصنفین کی طرف نسبت کروں گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی برکت میں سے یہ ہے کہ قول کو اس کے قائل کی طرف مضاف کیا جائے۔ اکثر احادیث کتب فقہ اور تفسیر میں مبہم ہوتی ہیں اور جس نے اس کو نقل کیا ہوتا ہے اسے نہیں پہچانتا مگر جو کتب حدیث پر مطلع ہوتا ہے، پس پڑھنے والا حیران و پریشان رہتا ہے۔ نہ وہ صحیح وسقیم کو جانتا ہے حالانکہ اس کی معرفت ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس کی طرف سے اس کے ساتھ احتجاج کو اور استدلال کو قبول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ وہ اس کی طرف حدیث کو منسوب کرے جو ائمہ اعلام اور مشاہیر ثقہ لوگوں میں سے ہے جس نے اس کو نقل کیا ہے اور ہم اس کتاب میں ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ صحیح بات کی توفیق دینے والا ہے۔ اور میں مفسرین کے بہت سے قصص اور مؤرخین کی اخبار سے اجتناب کروں گا مگر جن کا ذکر ضروری ہوگا اور وضاحت کی خاطر ان کا چھوڑنا ممکن نہ ہوگا اور احکام کی آیات کو بیان کرنے کے لئے میں ایسے مسائل سے تائید دوں گا جن سے ان کا معنی واضح ہو جائے گا اور جو طالب کی ان احکام کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ ہر آیت کے ضمن میں ایک، دو یا زیادہ احکام ہوتے ہیں، اس میں ہم ہر آیت کے تحت اسباب نزول، تفسیر غریب اور حکم میں سے جو اس کے متعلق احکام ومسائل ہوں گے انہیں بیان کریں گے اور اگر کوئی حکم اپنے ضمن میں نہ رکھتی ہوگی تو میں اس میں تفسیر وتاویل ذکر کروں گا۔ اسی طرح آخر کتاب تک ہوگا۔

میں نے اس کتاب کا نام ''اَلْجَامِعُ لِاَحْكَامِ الْقُرْآنِ وَالْمُبَيِّنُ لِمَا تَضَمَّنَهُ مِنَ السُّنَّةِ وَآيِ الْفُرْقَانِ'' رکھا۔ اللہ تعالیٰ اسے خاص اپنی رضا کے لئے کرے اور اس کے ذریعے مجھے اور میرے والدین کو نفع پہنچائے اور اللہ تعالیٰ دعا کو سننے والا ہے، قریب ہے، قبول فرمانے والا ہے۔ آمین

1۔ مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته، جلد 2 صفحہ 41

باب

فضائل قرآن

قرآن میں رغبت دلانا، اس کے طالب، قاری، سننے والے اور اس کے عامل کی فضیلت

جان لو کہ یہ باب بہت بڑا وسیع ہے۔ اس میں علماء نے کثرت سے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم ان میں سے چند نکات ذکر کریں گے جو اس کی فضیلت پر دلیل ہوں گے اور حاملین قرآن کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو ثواب اور جزا تیار کر رکھی ہے اس پر دلالت کریں گے جب کہ ان کی طلب خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ سب سے پہلے تو مومن اس کی فضیلت میں سے یہ سمجھے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے، کلام غیر مخلوق ہے، اس ذات کا کلام ہے جس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ اس کی صفت ہے جس کی نہ شبیہ ہے، نہ اس کا مدمقابل ہے، وہ اس کی ذات کا نور ہے، اور قراءت، قراء کی آوازیں اور ان کے نغمات یہ ان کے کسب ہیں جن کا بعض عبادات میں ایجابی حالت میں ان کو حکم دیا جاتا ہے اور اکثر اوقات میں استحبابی طور پر حکم دیا جاتا ہے اور ان کو اس سے جھڑکا جاتا ہے جب وہ اجتناب کرتے ہیں اور ان کے کرنے پر انہیں ثواب دیا جاتا ہے اور ان کے ترک پر انہیں سزا دی جاتی ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور آثار اس کے مطابق گواہ ہیں۔ اس پر مشہور اخبار دلیل ہیں اور ثواب و عقاب کا تعلق بندوں کے کسب کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں اس کو اٹھانے کی وہ قوت نہ رکھتا جو اس نے ان میں رکھی تا کہ وہ اس میں غور و فکر کریں، عبرت حاصل کریں اور اس میں جو طاعت و عبادت، حقوق و فرائض کی ادائیگی ہے اس میں تذکیر کریں، تو اس کے بوجھ سے انسانوں کے دل کمزور پڑ جاتے اور لرز جاتے، انہیں اس کے اٹھانے کی کیسے طاقت ہوتی، خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اس کا قول حق ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر: 21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) دلوں کی قوت کا پہاڑوں کی قوت سے کہاں مقابلہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خود اس کے اٹھانے کی قوت بخشی۔ یہ اس کا فضل اور رحمت ہے۔

وہ آثار جو اس باب کے متعلق آئے ہیں

سب سے پہلا وہ جو امام ترمذی نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جس کو قرآن اور میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھتا ہے میں اسے اس سے افضل دیتا ہوں جو میں مانگنے والوں کو دیتا ہوں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (1)۔ ابو محمد الدارمی السمرقندی نے اپنی مسند میں حضرت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفضائل، باب فضل کلام اللہ علی سائر الکلام، حدیث نمبر 2850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: (اس کی سورتوں میں سے) سبع طُوَل تورات کی مثل ہیں، المئون (سو آیات والی سورتیں) انجیل کی مثل ہیں اور مثانی سورتیں زبور کی مثل ہیں۔ اس کے بعد تمام قرآن زیادہ ہے۔ حارث نے حضرت علی سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: ''تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب جس میں پہلے لوگوں کے واقعات بھی ہیں اور تمہارے بعد کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے درمیان ہے اس کا حکم بھی ہے۔ یہ فصل (واضح حکم) ہے، مزاح نہیں ہے۔ جو جابر اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ دے گا اور جو اس کے علاوہ کسی کتاب سے ہدایت کی تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور واضح نور ہے۔ ذکر حکیم ہے، یہ صراط مستقیم ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ خواہشات ٹیڑھی نہیں ہوتیں، زبانیں اس کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتی، اس کے ساتھ آراء بکھرتی نہیں ہیں اور اس سے علماء سیر نہیں ہوتے ہیں۔ متقی لوگ اس سے اکتاتے نہیں ہیں، بار بار دہرانے کے باوجود یہ بوسیدہ نہیں ہوتا اور اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ کلام ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو انہوں نے اس کا انکار نہ کیا۔ انہوں نے کہا: ہم نے عجب قرآن سنا ہے۔ جس نے اس کا علم حاصل کیا وہ سبقت لے گیا، جس نے اس کے ساتھ بات کی اس نے سچ کہا، جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا اسے اجر ملا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کی۔ اے اعور! اس کو مضبوطی سے پکڑ لے'' (1)۔ شعبی نے حارث کو جھوٹا کہا ہے اور یہ کچھ نہیں ہے اور حارث سے جھوٹ ظاہر نہیں ہوا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت میں افراط کی وجہ سے اور دوسرے صحابہ پر حضرت علی کو فضیلت دینے کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ ناراضگی کی بات کی گئی۔ اسی بناء پر۔ واللہ اعلم۔ شعبی نے اسے جھوٹا کہا ہے کیونکہ شعبی کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور وہ سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت ابوعمر بن عبدالبر نے کہا: میرا گمان ہے، شعبی کو اپنے اس قول کی وجہ سے سزا دی گئی، جو انہوں نے حارث ہمدانی کے بارے میں کہا (نہ کہ حارث اعور کے بارے میں) کہ مجھے حارث نے بیان کیا اور وہ جھوٹوں میں سے ایک تھا۔

ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی لغوی نے اپنی کتاب ''الرد علی من خالف مصحف عثمان'' میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، پس تم اس سے اپنی طاقت کے مطابق سیکھو، یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، یہ نور مبین اور شفا نافع ہے، جس نے اس کو مضبوطی سے پکڑا اس کے لئے حفاظت ہے اور جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے نجات ہے، ٹیڑھے کو سیدھا کرتا ہے اور کج رو کو درست کرتا ہے، اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے اور بار بار پڑھے جانے کی وجہ سے بوسیدہ نہیں ہوتا، پس تم اس کی تلاوت کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تلاوت پر ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں کا اجر دے گا، میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے۔ میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل القرآن، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ ایک پاؤں رکھے ہوئے سورۂ بقرہ کو پڑھنا چھوڑ دے کیونکہ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے اور خیر سے خالی گھروں میں سے وہ گھر ہے جو کتاب اللہ سے خالی ہے (1)۔ ابوعبید نے اپنی غریب میں حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، جو اس میں داخل ہوگا وہ امن میں ہوگا۔ فرمایا: حدیث کی تاویل یہ ہے کہ قرآن کو ایسے کام سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے کرتا ہے۔ اس میں ان کے لئے خیر اور منافع ہیں۔ پھر اس نے انہیں اس کی طرف بلایا۔ کہا جاتا ہے: مادُبة، د مادَبة۔ جس نے مادُبة کہا اس نے اس کام کا ارادہ کیا جو انسان کرتا ہے پھر اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور جس نے مأدَبة کہا وہ اس سے ادب کا مفہوم لیتا ہے اور الادب سے مَفْعَلَة بناتا ہے، ایک اور حدیث سے وہ حجت لیتا ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی ادب گاہ ہے اس کے اخلاق سے سیکھو۔ احمر، ان دونوں لغتوں کو ہم معنی بناتا تھا میں نے اس کے علاوہ کسی کو یہ کہتے نہیں سنا۔ فرمایا: پہلی تفسیر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

بخاری نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور قرآن سکھائے'' (2)۔ مسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے لیموں جیسے پھل (سنگترہ) کی ہے، جس کی خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی میٹھا ہوتا ہے اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال نیاز بو کی ہے جس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی سی ہے جس کی خوشبو بھی نہیں ہوتی اور ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے''۔ ایک روایت میں منافق کی مثال کی جگہ فاجر کی مثال کے الفاظ ہیں (3)۔ بخاری نے کہا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال لیموں جیسے پھل کی سی ہے جس کا ذائقہ اچھا ہوتا ہے اور خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا وہ کھجور کی مثل ہے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

ابوبکر الانباری نے ذکر کیا ہے: ہمیں احمد بن یحییٰ الحلوانی نے خبر دی، انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن عبدالحمید نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا۔ دوسری سند میں ہے: ہمیں ادریس نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا، انہوں نے العوام بن حوشب سے روایت کیا کہ ابوعبدالرحمن السلمی پر جب قرآن ختم کرنے والا قرآن ختم کرتا تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتے اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے اور اسے کہتے: اے فلاں! اللہ سے ڈر، میں تجھ سے بہتر کوئی شخص نہیں جانتا اگر تو اس کے مطابق عمل کرے جو تو نے جان لیا ہے۔ دارمی نے وہب الذماری سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ قرآن دیتا ہے اور وہ رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور اس

1۔ مستدرک حاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر 4639، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وقصرہا، باب فضیلۃ حافظ القرآن

4۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن علی سائر الکلام، حدیث نمبر 4671، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور اطاعت پر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن سفرہ اور احکام کے ساتھ اٹھائے گا۔ سعید نے کہا سفرہ سے مراد ملائکہ ہیں اور احکام سے مراد انبیاء ہیں۔

مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کا ماہر معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے اس کی زبان سے تع تع نکلتا ہے اور اس پر اس کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے تو اسے دو اجر ملیں گے (1)۔ ایک اجر تلاوت کا ملے گا اور ایک اجر مشقت کا ملے گا اور ماہر کے درجات اس سے بلند ہیں، کیونکہ اس پر پہلے قرآن کا پڑھنا مشکل تھا پھر وہ اس سے ترقی کر گیا اور فرشتوں کے مشابہ ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے اس کے بدلے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا بدلہ دس نیکیاں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے، لیکن الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے (2)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ ایک طریق سے یہ موقوف بھی روایت کی گئی۔ مسلم نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جبکہ ہم صفہ میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ روزانہ بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے دو بلند کوہانوں والی اونٹنیاں لے آئے جبکہ نہ اس میں گناہ ہو، نہ قطع رحمی۔ ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم سب یہ پسند کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم میں سے کوئی صبح کے وقت مسجد کی طرف جائے پھر علم حاصل کرے یا کتاب اللہ میں سے دو آیتیں پڑھے جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور تین آیتیں، تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں، چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور انہی کی تعداد میں اونٹوں سے بہتر ہیں۔ (3)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور کرے گا۔ جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا، اور جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے اور جو ایسے راستہ پر چلتا ہے جس میں وہ علم کا متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہیں ہوئی (جس میں) وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں اس کا تکرار کرتے ہیں مگر ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان کے اندر کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور جو قرآن پر عمل میں سستی کرے گا اس کا نسب اسے جلدی (جنت میں)

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الماہر بالقرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن الخ، حدیث نمبر 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءۃ القرآن فی الصلاۃ

نہیں لے جائے گا''۔(1)

ابو داؤد، نسائی، داری اور ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: ''قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے والا، علانیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور آہستہ قرآن پڑھنے والا، خفیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے''۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے(2)۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''قیامت کے روز صاحب قرآن آئے گا اور کہے گا: یا رب! کپڑوں کا جوڑا۔ تو صاحب قرآن کو کرامت کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یا رب! اس میں اضافہ فرما۔ پھر صاحب قرآن کو کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یا رب! تو اس بندے سے راضی ہو جا۔ تو اللہ تعالیٰ اس حال قرآن سے راضی ہو جائے گا۔ اسے کہا جائے گا: تو پڑھ اور اوپر چڑھ، ہر آیت کے بدلے ایک نیکی کا اضافہ کیا جائے گا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے(3)۔ ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا: پڑھ اور اوپر چڑھ اور قرآن اس طرح ترتیل سے پڑھ جس طرح دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا۔ بے شک تیری منزل اس آخری آیت کے پاس ہوگی جو تو تلاوت کرے گا(4)۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا جب وہ جنت میں داخل ہوگا: پڑھ اور اوپر چڑھ۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک درجہ اوپر چڑھتا جائے گا حتیٰ کہ وہ آخری آیت پڑھے گا جو اس کے پاس ہوگی۔

ابو بکر الانباری نے ابو امامہ الحمصی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کو قرآن کا تہائی دیا گیا اسے نبوت کا تہائی دیا گیا اور جسے قرآن کے دو ثلث دیے گئے اسے نبوت کے دو ثلث دیے گئے اور جس نے پورا قرآن پڑھا اسے پوری نبوت (کا فیضان) ملا مگر اس کی طرف وحی نہیں کی جاتی، اسے قیامت کے دن کہا جائے گا: قرآن پڑھ اور ترقی کر، وہ ایک آیت پڑھے گا اور ایک درجہ بلند ہوگا حتیٰ کہ وہ پورا قرآن پڑھ لے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: مٹھی بند کر۔ وہ مٹھی بند کرے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: کیا تو جانتا ہے تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو اس کے دائیں ہاتھ میں خلد ہوگا اور بائیں ہاتھ میں نعمتیں ہوں گی۔

ادریس بن خلف نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بتایا انہوں نے تمام سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن کا ثلث (۱/۳) حاصل کیا اور اس پر عمل کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن

3۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ، حدیث 1252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو اس نے نبوت کا تہائی حاصل کیا اور جس نے نصف قرآن حاصل کیا اور اس پر عمل کیا تو اس نے نبوت کے نصف امر سے حاصل کیا اور جس نے پورا قرآن حاصل کیا اس نے پوری نبوت حاصل کی''۔ فرمایا: محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں محمد نے خبر دی۔ یہ محمد بن سعدان ہیں۔ انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن محمد نے بتایا، انہوں نے حفص سے انہوں نے کثیر بن زاذان سے انہوں نے عاصم بن ضمرہ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تلاوت کی اور اسے یاد کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اس کی سفارش اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔ حضرت ام الدرداء نے کہا: میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی۔ میں نے انہیں کہا: قرآن پڑھنے والے کو، قرآن نہ پڑھنے والے پر کیا فضیلت ہوگی ان میں سے جو جنت میں داخل ہوں گے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: قرآن کی آیات کی تعداد، جنت کے درجوں کی تعداد کے برابر ہے، کوئی شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ قرآن پڑھنے والے سے افضل نہ ہوگا۔ یہ حدیث ابو محمد مکی نے ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کے احکامات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت دے گا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے برے حساب سے بچائے گا۔ یہ اس لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ (طٰہٰ) (تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو نہ وہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہوگا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے ضمانت دے گا جو قرآن کی پیروی کرے گا، دنیا میں گمراہ نہیں ہوگا اور آخرت میں بدبخت نہیں ہوگا۔ یہ بھی مکی نے ذکر کیا ہے۔ اللیث نے کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی کی طرف جو رحمت آتی ہے وہ قرآن سننے والے کی طرف آنے والی رحمت سے تیز نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ (الاعراف) اور لعل اللہ کی طرف سے وجوب کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

ابوداؤد الطیالسی کی مسند میں ہے، یہ پہلی مسند ہے جو اسلام میں تالیف کی گئی ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو دس آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ غافلین سے نہیں لکھا جائے گا اور جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ عبادت گزاروں سے لکھا جائے گا اور جو ہزار آیات سے قیام کرے گا تو وہ مقنطرین میں سے لکھا جائے گا۔

اس باب میں بہت سے آثار ہیں۔ جو ہم نے ذکر کر دیے ہیں کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

کتاب اللہ کی تلاوت کی کیفیت اور اس میں سے جو مکروہ ہے اور جو حرام ہے اور اس کے متعلق لوگوں کا اختلاف

امام بخاری نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے بارے میں پوچھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ مد کے ساتھ پڑھتے تھے جب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ پر مد کرتے تھے، الرَّحْمٰنِ پر مد کرتے تھے اور الرَّحِيْمِ پر مد کرتے تھے''۔(1)

ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ علیحدہ کر کے قرأت کرتے تھے۔ آپ پڑھتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ پھر ٹھہر جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتے، پھر وقفہ کرتے، پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھتے''۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے(2)۔ ابوداؤد نے اسی طرح روایت کی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں میں اچھی آواز والا وہ ہے جو قرآن پڑھے تو تو اس پر اللہ کی خشیت دیکھے''۔ زیاد النمیری سے مروی ہے، وہ قراء کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انہیں کہا گیا تو پڑھ۔ انہوں نے بلند آواز سے قرآن پڑھا اور غنا کے ساتھ پڑھا۔ وہ بڑے بلند آواز تھے۔ حضرت انس نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا حضرت انس کے چہرے پر کالا کپڑا تھا۔ حضرت انس نے کہا: اے فلاں وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت انس کوئی ایسی چیز دیکھتے جو ناپسند کرتے تو اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیتے تھے۔ قیس بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ذکر کے وقت بلند آواز کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور قرآن کی قراءت کے وقت بلند آواز کرنے کی کراہت جن علماء سے مروی ہے ان میں سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قاسم بن محمد، حسن، ابن سیرین اور نخعی وغیرہ ہیں۔ مالک بن انس اور احمد بن حنبل نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے۔ ان تمام نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا کی صورت پیدا کرنے کو مکروہ قرار دیا۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کو لوگوں کی امامت کراتے ہوئے سنا، وہ قراءت میں غنا پیدا کر رہے تھے۔ سعید نے انہیں پیغام بھیجا: اللہ تیری اصلاح کرے، ائمہ اس طرح نہیں پڑھتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کے بعد غنا کو ترک کر دیا۔ قاسم بن محمد سے مروی ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاوت کی اور اس نے گانے کی صورت میں پڑھا، تو قاسم نے اس پر انکار کیا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ (حم السجدہ) (بے شک یہ بڑی عزت (وحرمت) والی کتاب ہے، اس کے نزدیک نہیں آ سکتا باطل، نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے)

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مد القراءۃ، حدیث نمبر 4658، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءات، باب فاتحۃ الکتاب، حدیث 2877، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک سے مروی ہے، ان سے نماز میں قرآن کی قراءت گویے کی طرز پر پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور سخت کراہت کا اظہار فرمایا۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ نماز میں ان سے الحان سے متعلق پوچھا گیا تو امام مالک نے فرمایا: مجھے یہ اچھا نہیں لگتا اور فرمایا: یہ غنا ہے جس کے ساتھ وہ گاتے ہیں تا کہ اس پر دراہم حاصل کریں۔
اور ایک طائفہ نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا پیدا کرنے کی اجازت دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ خوبصورت آواز میں قرآن پڑھے گا تو نفوس میں اس کا زیادہ اثر ہوگا اور دل زیادہ متوجہ ہوں گے۔ اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: ''قرآن کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو''، اس حدیث کو حضرت براء بن عازب سے روایت کیا گیا ہے (1)۔ ابوداؤد اور نسائی نے اس کو نقل کیا ہے اور اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہ کیا اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا: اگر میں جانتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کو انتہائی خوبصورت آواز میں پڑھتا اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال اپنے سفر میں سواری پر سورۂ فتح تلاوت کی اور قراءت میں ترجیع کی یعنی آواز کو اوپر نیچے کیا۔ اس نظریہ کے حامل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب ہیں اور امام شافعی، ابن مبارک، نضر بن شمیل ہیں اور یہی ابوجعفر الطبری، ابوالحسن بن بطال اور قاضی ابوبکر بن عربی وغیرہم کا مختار ہے۔
میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے۔ اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ مزید اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور دوسرے قول والوں نے پہلی حدیث جس سے انہوں نے حجت پکڑی ہے وہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ یہ مقلوب کے باب میں سے ہے یعنی قرآن کے ساتھ اپنی آوازوں کو مزین کرو۔ خطابی نے کہا: اور بہت سے محدثین نے اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے۔ یعنی اپنی آوازوں کو قرآن سے مزین کرو۔ اور انہوں نے فرمایا: یہ قلب کے باب سے ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں: میں نے حوض اونٹنی پر پیش کیا حالانکہ اس کا مطلب ہے: میں نے اونٹنی کو حوض پر پیش کیا۔ فرمایا: معمر نے منصور سے انہوں نے طلحہ سے یہ حدیث روایت کی ہے اور اصوات کو قرآن پر مقدم کیا ہے اور یہ صحیح ہے۔
خطابی نے کہا: یہ حدیث طلحہ نے عبدالرحمٰن بن عوسجہ سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زینوا القرآن باصواتکم یعنی قرآن کی قراءت کرو اور اپنی آوازوں کو اس کے ساتھ مشغول کرو اور اس کو شعار اور زینت بناؤ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی قرآن کے پڑھنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور اس پر کوشش اور مشقت کرنا ہے۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: زینوا اصواتکم بالقرآن، اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ مزین کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ حسین کرو۔
میں کہتا ہوں: اس معنی کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول راجع ہے۔ ہم میں سے وہ نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔ یعنی ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت نہیں کرتا، اسی طرح عبداللہ بن ابی ملیکہ نے اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القرائۃ، حدیث 1256، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تاویل کی ہے۔ عبدالجبار بن الورد نے کہا: میں نے ابن ابی ملیکہ کو یہ فرماتے سنا کہ عبداللہ بن ابی یزید نے کہا: ہمارے پاس سے ابولبابہ گزرے، ہم ان کے پیچھے چلے حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ بوسیدہ ہیئت شخص تھے۔ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: لیس منا من لم یتغن بالقرآن(1) ''وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہیں کیا''۔ فرمایا: میں نے ابن ابی ملیکہ سے کہا: اے ابومحمد! بتایئے جب کوئی شخص خوبصورت آواز والا نہ ہو تو؟ انہوں نے فرمایا: اپنی استطاعت کے مطابق خوبصورت بنائے۔ یہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا نبی کریم ﷺ سے یہ کہنا کہ مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت کرتا اور اسے مزین کرتا اور ترتیل سے پڑھتا۔

یہ دلیل ہے کہ وہ فطری خوش الحان ہونے کے باوجود قراءت جلدی کرتے تھے، اگر انہیں علم ہوتا کہ نبی کریم ﷺ تلاوت سن رہے ہیں تو وہ اپنی قراءت میں مد کرتے اور ترتیل سے پڑھتے جیسا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر پڑھتے تھے۔ پس یہ قراءت کے ساتھ حسن صوت میں زیادتی تھی۔ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ پر یہ کہنے کی تاویل کی جائے کہ قرآن کو اصوات کے ساتھ یا کسی اور چیز کے ساتھ مزین کیا جائے گا۔ جس نے یہ تاویل کی وہ ایک عظیم امر میں واقع ہوا کہ قرآن مزین کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ قرآن نور ہے، ضیاء اور زین ہے اس کے لئے جسے اس کی بہجت دی گئی اور وہ اس کی ضیاء سے روشن ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: تزئین کا حکم قراءت کا اکتساب ہے اور اسے آوازوں کے ساتھ مزین کرنا ہے۔ تقدیر یوں ہوگی قراءت کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو، اس صورت میں قرآن بمعنی قراءت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (الاسراء: 78) یعنی فجر کی قراءت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ (القیامہ) یعنی اس کی قراءت کی اتباع کرو۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: سمندر میں شیاطین میں سے جو قید کیے گئے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں باندھا ہے۔ قریب ہے کہ وہ نکلیں اور لوگوں پر قرآن پڑھیں یعنی قراءت کریں۔

شاعر نے حضرت عثمان کے بارے میں کہا:

ضَحُّوْا بِاَشْمَطَ عُنْوَانَ السُّجُوْدِ بِهٖ يُقَطِّعُ اللَّيْلَ تَسْبِيْحًا وَّ قُرْآنًا

اس شعر میں قرآن بمعنی قراءت ہے۔

پس اس تاویل پر یہ معنی صحیح ہوگا: مگر یہ کہ وہ قراءت اپنی حد سے نکل جائے تو پھر ممتنع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حدیث میں جو یتغنی بہ استعمال ہوا ہے اس کا معنی استغناء ہے جو فقر کی ضد ہے نہ کہ غنا مراد ہے۔ کہا جاتا ہے: تغنیت و تغانیت بمعنی استغنیت ...... صحاح میں ہے: تغنی الرجل، بمعنی استغنی الرجل، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے غنی کیا۔ و تغانوا یعنی بعض بعض سے مستغنی ہوئے۔ مغیرہ بن حبناء التمیمی نے کہا:

كِلَانَا غَنِيٌّ عَنْ اَخِيْهِ حَيَاتَهٗ وَ نَحْنُ اِذْ مِتْنَا اَشَدُّ تَغَانِيَا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید باب قولہ تعالیٰ: واسروا قولکم او اجھروا بہ، حدیث نمبر 6973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہم دونوں اپنے بھائی کی زندگی سے غنی ہیں اور ہم جب مریں گے تو زیادہ مستغنی ہو جائیں گے۔
اس تاویل کی طرف سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح گئے ہیں۔ سفیان نے سعد بن ابی وقاص سے یہ روایت کیا ہے۔ سفیان سے دوسری وجہ بھی مروی ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ نے ذکر کی ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے دوسری احادیث سے مستغنی ہوتا ہے۔ اس تاویل کی طرف محمد بن اسماعیل بخاری گئے ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ عنوان باندھا ہے اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ (العنکبوت: 51) مراد یہ ہے کہ قرآن کی وجہ سے دوسری امتوں کی اخبار سے مستغنی ہونا۔ یہ اہل تاویل کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے قرآن کی وجہ سے وہ غمگین ہوتا ہے یعنی قاری پر وہ غم ظاہر ہوتا ہے جب وہ قرأت اور تلاوت کرتا ہے۔ غم، خوشی کی ضد ہے۔ یہ الغنية سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اگر یہ غنية سے ہوتا تو یتغانی به ہوتا، یتغنی به نہ ہوتا۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ بھی ہے، ان میں امام ابو محمد بن حبان البستی ہیں اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر عن ابیہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپ کے سینہ میں رونے کی وجہ سے ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز نکل رہی تھی۔ حدیث میں ابلنے کے لئے الازیز کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے کڑک کی آواز اور ہانڈی کے ابلنے کی آواز۔ علماء نے فرمایا: حدیث میں واضح بیان ہے کہ حدیث سے مراد غمگین ہونا ہے اور انہوں نے اپنی تائید اس حدیث سے لی ہے جس کو ائمہ حدیث نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر پڑھو، میں نے آپ پر سورۂ نساء پڑھی۔ جب میں فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا۝ (النساء) پر پہنچا تو میں نے دیکھا آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ چار تاویلات ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو الحان کے ساتھ قراءت اور قراءت میں ترجیع پر دلالت کرتی ہو۔ ابو سعید بن الاعرابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لیس منا من لم یتغن بالقرآن کی شرح میں فرمایا: عرب غنا اور گانے کے زیادہ حریص تھے۔ جب قرآن نازل ہوا تو انہوں نے پسند کیا کہ قرآن بھی ان کی عادت پر غنا کے ساتھ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔
پانچویں تاویل: ترجیع (☆) اور تطریب پر استدلال اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عمر بن شبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے ابو عاصم النبیل سے ابن عیینہ کی یتغن کے قول میں یستغنی کی تاویل ذکر کی تو انہوں نے فرمایا: ابن عیینہ نے کچھ نہیں کیا۔ امام شافعی سے ابن عیینہ کی تاویل کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہم اس کو زیادہ جانتے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغنا مراد لیا ہوتا تو آپ من لم یستغن فرماتے۔ جب آپ نے یتغن فرمایا تو ہم جان گئے کہ آپ نے التغنی مراد لی۔ طبری نے کہا: ہمارے نزدیک کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ التغنی سے مراد وہ غنا ہے جو ترجیع کے ساتھ آواز کا خوبصورت ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَغَنَّ بِالشِّعْرِ مَهْمَا كُنْتَ قَائِلَهُ　　اِنَّ الْغِنَاءَ بِهٰذَا الشِّعْرِ مِضْمَارُ

☆ ترجیع، گانے کی صورت میں آواز کو اوپر نیچے کر کے پڑھنا۔

شعر کو خوش الحانی سے گا جب تو اس کو کہنے والا ہے اس شعر کے ساتھ غنا پوشیدہ ہے۔ فرمایا: جنہوں نے تغنیت بمعنی استغنیت کا دعویٰ کیا ہے وہ عرب کلام میں اشعار میں استعمال نہیں ہوا ہے اور ہم کسی عالم کو نہیں جانتے جس نے یہ کہا ہو۔ اور رہا اعشی کے اس قول سے احتجاج

وَ كُنْتُ امْرَأً زَمَناً بِالْعِرَاقِ عَفِيْفَ الْمُنَاخِ طَوِيْلَ التَّغَنْ

انہوں نے کہا: اعشی نے تغن سے مراد استغناء لیا ہے۔ تو یہ غلط ہے۔ اعشی نے یہاں التغن سے مراد ٹھہرنا لیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: غَنِيَ فُلَانٌ بِمَكَانِ كَذَا۔ یعنی فلاں اس جگہ ٹھہرا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (الاعراف:92) رہا و نحن اذا متنا اشد تغانیا۔ اس سے استشہاد بھی غفلت ہے کیونکہ التغانی دونفسوں سے ہوتا ہے جب ہر ایک دوسرے سے مستغنی ہو جائے، جیسے کہا جاتا ہے تضارب الرجلان، جب ہر ایک دوسرے کو مارے اور جس نے یہ دو شخصوں کے فعل میں کہا اس نے اس کی مثل ایک میں کہنا جائز قرار نہیں دیا پس تغانی زید، تضارب عمرو کہنا جائز نہیں ہے اسی طرح تغنی بمعنی استغنی کہنا بھی جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: طبری کا یہ دعویٰ کہ کلام عرب میں تغنی بمعنی استغنی وارد نہیں ہوا۔ حالانکہ جوہری نے یہ ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور ہروی نے بھی یہ ذکر کیا ہے اور رہا اس کا قول کہ تفاعل کا صیغہ صرف دو شخصوں کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ بہت سے مقام پر ایک شخص کے لئے بھی یہ صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اسی سے حضرت ابن عمر کا قول ہے و انا یومئذ قد ناھزت الاحتلام (میں اس وقت قریب البلوغ تھا) عرب کہتے ہیں: طارقت النعل، عاقبت اللص، داویت العلیل۔ ان مثالوں میں تفاعل ایک شخص کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ پس تغانی بھی ان مثالوں میں سے ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یتغن، الغناء اور الاستغناء دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے تو ایک معنی پر محمول کرنا دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے بلکہ الاستغناء پر اس کو محمول کرنا اولیٰ ہے اگرچہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی تاویل نہ ہو کیونکہ صحابی کبیر سے مروی ہے جیسا کہ سفیان نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے سفیان کے حق میں کہا: میں نے سفیان بن عیینہ سے زیادہ احادیث کی تاویل کو جاننے والا نہیں دیکھا اور یہ مسلم بات ہے کہ اس نے امام شافعی کو دیکھا اور وہ ان کا ہم عصر تھا۔

چھٹی تاویل: وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا: ما اذن اللہ لشیء ما اذن لنبی حسن الصوت یتغنی بالقرآن یجھر بہ (1)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنا کسی چیز سے راضی نہیں ہوتا جتنا کہ نبی کے خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنے سے راضی ہوتا ہے۔ طبری نے کہا اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح ابن عیینہ نے کہا ہے تو حسن الصوت اور الجھربہ کے ذکر کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ ہم کہتے ہیں: یجھر بہ کے الفاظ یا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں یا حضرت ابو ہریرہ کے ہیں یا کسی اور کے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو اس میں بُعد ہے اور وہ تطریب و ترجیع کے نہ ہونے پر دلیل ہے کیونکہ یطرب بہ نہیں فرمایا بلکہ یجھر بہ فرمایا ہے، یعنی وہ خود سنے اور اس کے قریب والے سنیں۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق بہ، باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن، جلد 1، صفحہ 268

کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے بلند آواز سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں کو کہا: اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے (1) (الحدیث) اسی طرح اگر کسی صحابی سے ہو یا کسی اور سے ہو تو اس میں جو انہوں نے کہا ہے اس پر حجت نہیں ہے۔ اس تاویل کو بعض علماء نے اختیار فرمایا اور کہا: یہ اشبہ ہے کیونکہ عرب ہر بلند آواز کرنے والے کو غانی کہتے ہیں اور اس کا فعل غنا ہوتا ہے، اگرچہ وہ نغمہ کی طرز پر نہ گا رہا ہو اور کہا: یہ تفسیر صحابی نے کی ہے اور وہ کلام اور حال سے زیادہ آگاہ ہے۔

ابوالحسن بن بطال نے امام شافعی کے مذہب کے لئے حجت قائم کرتے ہوئے کہا: اس مسئلہ میں اشکال کو وہ حدیث دور کرتی ہے جو ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔ فرمایا: ہمیں زید بن الحباب نے بتایا، فرمایا: ہمیں موسیٰ بن علی بن رباح نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اور انہوں نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سیکھو اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو اور اس کو لکھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ مخاض (اونٹنی) سے بھی زیادہ رسی سے نکل جانے والا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اگرچہ اس کی سند صحیح ہے، پس اس کو رد کرتی ہے یہ بات جو قطعیت سے معلوم ہے کہ قرآن کی قراءت ہماری لغت کے ساتھ متواتر طور پر نسل در نسل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اور اس میں تلحین (☆) و تطریب نہیں ہے حالانکہ کثرت سے حروف کے مخارج، مد، ادغام، اظہار اور اس کے علاوہ قراءت کی کیفیت میں گہرائی سے غور کرنے والے موجود تھے پھر ترجیع اور تطریب میں وہ لفظ مہموز ہو جاتا ہے جو مہموز نہیں ہوتا، اس میں مد ہو جاتی ہے جو ممدود نہیں ہوتا، ایک الف کئی الف کی مقدار بن جاتا ہے، ایک واو کئی واو کی مقدار ہو جاتی ہے، ایک حرف کئی حروف کی مقدار بن جاتا ہے اور یہ چیز قرآن میں زیادتی تک پہنچا دیتی ہے اور یہ ممنوع ہے۔ اگر وہ ہمزہ کی جگہ کو اس طرح پڑھے گا تو بہت سے ہمزے بنا دے گا، حروف میں سے جہاں ہمزہ واقع ہوتا ہے وہ صرف ایک ہمزہ ہوتا ہے اور پھر وہ ممدودہ ہوگا یا مقصورہ ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں سواری پر سورۂ فتح پڑھی تو قراءت کو اوپر نیچے کیا۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے اور اوپر نیچے کی صفت میں آ ءآ ءآ فرمایا۔

ہم کہتے ہیں یہ مد کے اشباع پر محمول ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سواری کی حرکت کے وقت کی آواز کی حکایت ہو، جیسا کہ بلند آواز کرنے والے کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے۔ جب وہ سوار ہو اس کی آواز سواری کی حرکت سے کٹ جاتی ہے اور رک جاتی ہے۔ جب اس میں یہ احتمال ہے تو اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ ابو محمد عبدالغنی بن سعید الحافظ نے حضرت قتادہ کی حدیث عبدالرحمٰن بن ابی بکر عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت مد تھی اس میں ترجیع نہیں تھی۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤذن آواز کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا علا عقبۃ، حدیث نمبر 5905، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث عقبہ بن عامر

☆ آیت کو گانے کی صورت میں پڑھنا

اوپر نیچے (غنا کی صورت میں) کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذان سہل اور بغیر غنا کے ہے۔ جب تیری اذان سہل اور بغیر غنا کے ہو تو فبہا ورنہ تو اذان نہ دے۔ یہ حدیث دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تطریب (غنا کی صورت) اذان میں منع فرمائی تو قرآن میں اس کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ہے جس کی حفاظت کا ذمہ الرحمٰن ذات نے اٹھایا ہے۔ اس نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) (بے شک ہم نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقینا ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حم السجدۃ) (اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے۔ یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے سب خوبیاں سراہے کی طرف سے)

میں کہتا ہوں: یہ اختلاف اس وقت ہے جب قرآن کا معنی اصوات کے لوٹانے اور ترجیعات کی کثرت کی وجہ سے نہ سمجھا جائے اور اگر یہ امر مزید بڑھ جائے حتیٰ کہ اس کا معنی بھی نہ سمجھا جائے تو یہ حرام ہے جیسا کہ مصر کے شہروں میں قراء کرتے ہیں جو بادشاہوں اور جنازوں کے سامنے قرآن پڑھتے ہیں اور اس پر اجرت اور تحائف لیتے ہیں۔ ان کی سعی گم ہوئی اور ان کا عمل ضائع ہوا۔ پس وہ اس کے ساتھ کتاب اللہ کی تبدیلی حلال سمجھتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنا اپنے نفسوں پر آسان سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن میں اضافہ کر دیں جو اس میں نہیں ہے۔ یہ ان کی دین سے جہالت، اپنے نبی کی سنت سے خروج اور سلف صالحین کی سیرت کو چھوڑنے اور شیطان کے مزین کردہ اعمال کی طرف رجحان کی وجہ سے ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اچھا عمل کر رہے ہیں۔ پس وہ گمراہی میں گردش کر رہے ہیں اور اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل رہے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ! لیکن مخبر صادق نے خبر دی تھی کہ ایسا ہوگا، پس ایسا ہوا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔

امام الحافظ ابوالحسین رزین اور ابوعبداللہ الترمذی الحکیم نے نوادر الاصول میں حضرت حذیفہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کو پڑھو عربوں کی لحن اور ان کی آوازوں میں۔ اہل عشق کی آوازوں میں اور اہل کتاب کی آوازوں میں پڑھنے سے بچو میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کے ساتھ غنا اور نوحہ جیسی ترجیع (آواز کو اوپر نیچے کر کے گانے کی صورت میں پڑھنا) کریں گے۔ قرآن ان کے گلوں سے تجاوز نہیں کرے گا، ان کے دل اور ان لوگوں کے دل جو ان کو اچھا سمجھتے ہیں، فتنہ میں مبتلا کئے گئے ہیں (1)۔ اللحون جمع ہے لحن کی اس کا مطلب آواز کو اوپر نیچے کرنا اور قراءت، شعر اور گانے کے ساتھ آواز کو خوبصورت کرنا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا، ہمارے زمانہ کے قراء جو واعظین کے سامنے اور مجالس میں عجمی لہجوں میں قرآن پڑھتے ہیں یہ اس کے مشابہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ قراءت میں ترجیع کا مطلب ہے حروف کو گھمانا جس طرح نصاریٰ کی قراءت ہے اور قراءت میں ترتیل کا مطلب ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور حروف و حرکات کو ظاہر کرنا۔ برابر دانتوں کے ساتھ اس کو تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کو گل بابونہ کی کلی سے تشبیہ دی ہے اور قراءت میں یہی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ

1۔ بیہقی شعب الایمان، فصل فی ترک التعمق فی القرآن الکریم

وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (المزمل) (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے بارے اور آپ کی نماز کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: تمہیں ان کی نماز سے کیا مناسبت، آپ نماز پڑھتے تھے اتنی مقدار سو جاتے تھے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی تھی پھر سونے کی مقدار نماز پڑھتے تھے پھر نماز کی مقدار سوتے تھے حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ پھر حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کو بیان کیا۔ آپ قراءت کو حرف حرف بیان کرتی تھیں۔ اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1)۔

اہل قرآن اور اہل علم کو ریاکاری وغیرہ سے ڈرانا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (النساء:36) (اور عبادت کرو اللہ کی اور نہ شریک ٹھہراؤ اس کا کسی چیز کو)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (الکہف) (پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو)۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ شخص شہید ہوگا، اسے لایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ سب نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کو کیسے استعمال کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیری رضا کی خاطر جہاد کیا حتیٰ کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو تو اس لئے لڑا تھا تاکہ جری کہا جائے، وہ تجھے کہا گیا پھر حکم ہوگا کہ اسے منہ کے بل اوندھا گھسیٹ کر لے جاؤ حتیٰ کہ وہ آگ میں ڈالا جائے گا اور وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر کی گئی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ انہیں پہچان لے گا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور علم سکھایا اور میں نے تیری رضا کے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے علم سیکھا تاکہ عالم کہا جائے تو نے قرآن پڑھا تاکہ قاری کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھسیٹ کر لے جاؤ اور آگ میں ڈال دو۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے وسعت دی اور اسے ہر قسم کا مال دیا پھر اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جس میں میں نے خرچ کرنے کو پسند کیا مگر میں نے اس میں تیرے لئے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، باب کیف کان قراءۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ، حدیث نمبر 1254، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے یہ عمل کیا تا کہ جواد کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھسیٹ کر لے جایا جائے پھر آگ میں ڈالا جائے گا (1)۔ (امام ترمذی نے اس حدیث میں کہا) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے گھٹنے پر مارا اور فرمایا: اے ابو ہریرہ! یہ تین پہلی اللہ کی مخلوق ہوگی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آگ کو بھڑکائے گا۔ ابو ہریرہ کا نام عبداللہ ہے بعض نے فرمایا: عبدالرحمٰن ہے۔ فرمایا: مجھے ابو ہریرہ کی کنیت دی گئی کیونکہ میں اپنی آستین میں بلی اٹھائے ہوئے تھا۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: بلی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ہریرہ!۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو عمل اور علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں رکھتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے اللہ کے علاوہ کیلئے علم حاصل کیا یا اللہ کی رضا کے علاوہ اس سے کوئی ارادہ کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے (2)۔

ابن مبارک نے ''رقائق'' میں حضرت عباس بن عبدالمطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ دین غالب آئے گا حتیٰ کہ سمندر سے گزر جائے گا حتیٰ کہ گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں دریاؤں میں داخل کیا جائے گا۔ پھر ایک قوم آئے گی جو قرآن پڑھیں گے۔ جب قرآن پڑھیں گے تو کہیں گے ہم سے زیادہ قاری کون ہے ہم سے زیادہ علم والا کون ہے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں خیر دیکھتے ہو؟ صحابہ نے کہا: نہیں۔ فرمایا: یہ تم میں سے ہیں اور یہ اس امت سے ہیں اور یہ آگ کا ایندھن ہیں۔ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے تا کہ دنیا کا کوئی سامان حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو محسوس نہیں کرے گا (3)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب الحزن کیا ہے؟ فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے جس سے جہنم ہر روز سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ فرمایا: قراء جو اعمال کیساتھ دکھاوا کرتے ہیں۔ (4)

امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اسد بن موسیٰ کی کتاب میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے، اس وادی کے شر سے جہنم ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اس وادی میں ایک کنواں ہے، جہنم اور وہ وادی اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار

2۔ جامع ترمذی، باب جاء فیمن یطلب بعلمہ الدنیا

ایضاً، ابن ماجہ، باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ، حدیث 253، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ، حدیث 3179، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ، حدیث 2305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کنویں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اس کنویں میں ایک سانپ ہے۔ جہنم، وادی اور کنواں اس سانپ سے سات مرتبہ اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان اشقیاء (بدبخت) کے لئے تیار کر رکھا ہے جو حاملین قرآن اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ پس حامل قرآن اور طالب علم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ کے لئے خاص عمل کرنا چاہئے۔ اگر پہلے کوئی ناپسندیدہ کام ہو چکا ہو تو اسے جلدی توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔ طلب اور عمل میں اخلاص سے آغاز کرے۔ حافظ قرآن کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ تحفظ لازم ہے جیسا کہ اس کے لئے جو اجر ہے وہ دوسروں کے لئے نہیں۔ ترمذی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض کتب میں اللہ نے نازل کیا یا بعض انبیاء کی طرف وحی کی گئی کہ تم ان لوگوں سے کہو جو غیر دین کے لئے فقہ حاصل کرتے ہیں اور غیر عمل کے لئے علم حاصل کرتے ہیں اور آخرت کے عمل کے ساتھ دنیا طلب کرتے ہیں انہیں مینڈھوں کی جلدیں پہنائی جائیں گی اور ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں جیسے ہوں گے، ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی ہوں گی اور دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے مجھے وہ دھوکا دیتے ہیں اور میرے ساتھ استہزاء کرتے ہیں میں ان کے لئے ایسی آزمائش تیار کروں گا جو ان میں حلیم کو حیران کر دے گی۔ (1)

طبری نے کتاب ''آداب النفوس'' (☆) میں نقل کیا ہے ہمیں ابو کریب محمد بن علاء نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں محاربی نے بتایا انہوں نے عمرو بن عامر بجلی سے انہوں نے ابن صدقہ سے انہوں نے ایک صحابی سے روایت کیا یا جس نے انہیں بتایا۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ کو دھوکا دیتا ہے اللہ اسے دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کو کیسے دھوکا دیتا ہے؟ فرمایا: تو اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس کا اس نے تجھے حکم دیا اور اس کے ذریعے کسی غیر کو طلب کرتا ہے، ریا سے بچو کیونکہ یہ شرک ہے اور ریاکار قیامت کے روز ان چار اسماء کے ساتھ اشہاد کے سروں پر بلایا جائے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جائیں گے یا کافر، یا خاسر، یا غادر، یا فاجر۔ تیرا عمل گم ہوا اور تیرا اجر باطل ہوا آج تیرے لئے کوئی حصہ نہیں ہے تو اپنا اجر اس سے طلب کر جس کے لئے تو عمل کرتا تھا۔ اے دھوکا باز! علقمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم کیسے ہو گے جب تمہیں ایسا فتنہ لاحق ہو گا جس میں چھوٹا بڑا ہو جائے گا بڑا بوڑھا ہو جائے گا، سنت کو بدعت بنا دیا جائے گا لوگ اس بدعت پر چلیں گے جب اس بدعت میں کوئی تبدیلی ہو گی تو کہا جائے گا: سنت بدل دی گئی۔ پوچھا گیا اے ابو عبدالرحمن! یہ کب ہو گا؟ فرمایا: جب تمہارے قراء زیادہ ہوں گے اور فقہاء کم ہوں گے اور امراء زیادہ ہوں گے اور امین کم ہوں گے، دنیا کو آخرت کے عمل کے ذریعے تلاش کیا جائے گا اور دین کے علاوہ کے لئے فقہ حاصل کیا جائے گا (2)۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: ہمیں یہ حضرت ابن عباس سے خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر حاملین قرآن، قرآن کا حق ادا کرتے اور جو مناسب تھا تو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا لیکن انہوں نے اس کے ساتھ دنیا کو طلب کیا تو اللہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ، حدیث 2328، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن داری، باب تغیر الزمان وما یحدث فیہ

☆ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا طبری کی ایک ترتیب العلماء جس کا یہ آغاز ہے اسے مکمل نہ فرمایا۔

نے ان سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور وہ لوگوں پر ذلیل ہو گئے۔ ابو جعفر محمد بن علی سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ (الشعراء) کے تحت مروی ہے، فرمایا: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے اپنی زبانوں کے ساتھ حق اور عدل کا وصف بیان کیا اور انہوں نے غیر کی طرف اس کی مخالفت کی۔ اس باب کا مزید بیان کتاب کے دوران ان شاء اللہ آئے گا۔

صاحب قرآن کو چاہئے کہ وہ اس سے اپنے لئے حصہ بنائے اور غافل نہ ہو

سب سے پہلی بات صاحب قرآن کے لئے یہ ہے کہ وہ قرآن کا علم خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حاصل کرے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، دوسری یہ کہ وہ رات اور دن میں، نماز میں یا نماز کے علاوہ تلاوت کرے تاکہ اسے قرآن بھول نہ جائے۔ مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صاحب قرآن کی مثال باندھے گئے اونٹوں والے کی ہے کہ وہ ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے تو وہ انہیں روکے رکھتا ہے اور اگر وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے تو وہ چلے جاتے ہیں۔ جب صاحب قرآن، قرآن کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دن اور رات میں اس کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اسے یاد رہتا ہے جب وہ قرآن کے ساتھ قیام حفاظت کا اہتمام نہیں کرتا ہے تو وہ اسے بھول جاتا ہے(1)۔ پس صاحب قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، اس کی نعمت کا شکر ادا کرے، اس کا ذکر ہو اور اس پر توکل کرنے والا ہو اور اسی سے مدد طلب کرنے والا ہو، اسی کی طرف رغبت کرنے والا ہو، اس کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو، اپنی موت کو یاد کرنے والا ہو، اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے والا ہو، اسے چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے خوف کرنے والا ہو، اپنے رب کے عفو کا امیدوار ہو، صحت میں خوف اس پر غالب ہو کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کب ختم ہونے والی ہے اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے وقت اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھنے والا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنے والا ہو یعنی یہ گمان رکھے کہ وہ اس پر رحم فرمائے گا اور اسے بخش دے گا اور اسے چاہئے کہ وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو جاننے والا ہو، اس کے تسلط سے اپنی حفاظت کرنے والا ہو، اپنے نفس کی خلاصی اور اپنی روح کی نجات کے لئے کوشش کرنے والا ہو اور دنیا کا سامان جتنی قدرت رکھتا ہے آگے بھیجنے والا ہو اور حتی المقدور اپنے نفس سے جہاد کرنے والا ہو اور اس کو چاہئے کہ اس کے نزدیک اہم امر دین میں تقویٰ ہو اور جو اللہ نے حکم دیا اور جس سے اللہ نے منع فرمایا اس کا خیال کرنے والا ہو اور اس میں تقویٰ پر عمل کرنے والا ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قاری قرآن کو چاہئے کہ وہ رات کو جاگنے والا معروف ہو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اور دن کو بھی بیدار معروف ہو جب لوگ بیدار ہوں اور وہ رونے میں مصروف ہو جب لوگ ہنس رہے ہوں اور وہ خاموشی سے معروف ہو جب لوگ بری باتوں میں مشغول ہوں اور وہ خضوع و عجز کے ساتھ معروف ہو جب لوگ ایک دوسرے کو فریب دینے میں مصروف ہوں اور وہ حزن کے ساتھ معروف ہو جب لوگ خوش ہوں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق بہ، باب الامر بتعھد القرآن

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: حامل قرآن بری باتوں میں مشغول لوگوں کے ساتھ مشغول نہ ہو اور جاہلوں کے ساتھ جاہل نہ بنے، بلکہ قرآن کے حق کی وجہ سے معاف کر دے کیونکہ اس کے جوف میں اللہ کا کلام ہے۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ شبہات کے راستوں سے اپنے آپ کو بچائے، غیر مفید باتوں کے ساتھ مجالس قرآن میں کلام نہ کرے اور کم ہنسے، اپنے اوپر حلم اور وقار قائم رکھے اور اسے چاہئے کہ فقراء کے لئے تواضع اختیار کرے، تکبر اور اعجاب سے اجتناب کرے۔ اگر اپنے نفس پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو دنیا اور دنیا والوں سے جدا رہے، جنگ و جدل کو ترک کرے اور نرمی اور ادب کا مظاہرہ کرے اور اسے چاہئے کہ وہ ان افراد سے ہو جن کے شر سے امن ہوتا ہے، جن سے خیر کی امید کی جاتی ہے اور جن کے نقصان سے حفاظت سمجھی جاتی ہے اور اس کی بات نہ سنے جو اس کے پاس چغلی کھائے اور اس کے ساتھ سنگت اختیار کرے جو خیر پر معاون ہو اور صدق اور مکارم اخلاق پر رہنمائی کرنے والا ہو اور اسے زینت بخشنے والا ہو نہ کہ عیب دار کرنے والا ہو۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو سیکھے اور اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے اسے سمجھے اور جو اللہ نے فرض کیا اسے سیکھے، جو پڑھے اس سے نفع حاصل کرے اور جو تلاوت کرے اس پر عمل کرے۔ پس جو معنی نہیں سمجھے گا وہ عمل کیسے کرے گا اور کتنا برا ہے وہ جو تلاوت کرتا ہے اس کے مفہوم کے متعلق پوچھا جائے اور وہ نہ جانتا ہو۔ اس کی مثال گدھے کی مثل ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، اور اس کے مناسب ہے کہ وہ مکی، مدنی صورتوں کی پہچان کرے تا کہ وہ تفریق کر سکے جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء اسلام میں لوگوں سے خطاب فرمایا اور جو آخر میں خطاب فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ نے پہلے فرض کیا تھا اور اس کے آخر میں زائد فرض کیا۔ اکثر قرآن میں مکی کے لئے مدنی ناسخ ہے اور مکی حکم سے مدنی حکم کو منسوخ کرنا ممکن نہیں کیونکہ منسوخ نزول میں ناسخ سے مقدم ہوتا ہے اور اس کے کمال میں سے یہ ہے کہ وہ اعراب اور غریب کو جانتا ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے پڑھے جانے والے کے حصہ کی معرفت آسان ہوگی اور جو وہ تلاوت کرے گا اس سے شک دور ہوگا۔ ابو جعفر طبری نے کہا: میں نے جرمی کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں تیس سال سے فقہ میں سیبویہ کی کتاب سے فتویٰ دیتا رہا ہوں۔ محمد بن یزید نے کہا: ابو عمر جرمی صاحب حدیث تھے۔ جب انہوں نے سیبویہ کی کتاب کا علم حاصل کر لیا تو حدیث کا علم سیکھا کیونکہ سیبویہ کی کتاب سے نظر اور تفسیر سیکھتے تھے۔ پھر سنن ماثور جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت تھیں ان میں غور وفکر کرتے تھے۔ طالب، اللہ کی کتاب کے مراد تک پہنچنے کے لئے سنت کا وسیلہ پکڑے یہ اس کے لئے احکام قرآن کے مضمر راز کھولے گی۔ ضحاک نے وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ (آل عمران: 79) کے تحت فرمایا: ہر قرآن پڑھنے والے پر حق ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو۔

ابن ابی حواری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہم فضیل بن عیاض کے پاس سنہ ۱۸۵ ہجری میں آئے۔ ہم ایک پوری جماعت تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے رہے۔ انہوں نے ہمیں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کسی نے بتایا کہ اگر وہ نکلیں گے تو تلاوت قرآن کے لئے نکلیں گے۔ ہم نے ایک قاری کو تلاوت کرنے کو کہا۔ اس نے تلاوت کی تو فضیل نے ہماری طرف ایک کھڑکی سے جھانکا۔ ہم نے کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ انہوں نے کہا: وعلیکم السلام۔ ہم نے پوچھا: اے ابو علی! آپ کیسے ہیں آپ کا کیا حال ہے؟ فضیل نے کہا: میں اللہ کی طرف سے عافیت میں ہوں اور تمہاری وجہ سے اذیت میں ہوں اور تم نے

اسلام میں بدعتیں نکالی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ ہم اس لئے علم حاصل نہیں کرتے تھے لیکن ہم مشائخ کے پاس آتے تھے تو ہم ان کے پاس بیٹھنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ پس ہم ان سے دور بیٹھتے تھے جو چوری چھپے سنتے تھے جب وہ حدیث گزرتی تو ہم اس کو اعادہ کے لئے تلاش کرتے اور اسے ہم لکھ لیتے اور تم جہالت کے ساتھ علم حاصل کرتے ہو اور تم نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتاب اللہ کو طلب کرتے تو تم اس میں اپنی بیماری کی شفاء پاتے۔ ہم نے کہا: ہم نے قرآن سیکھا۔ فضیل نے کہا: تمہارے قرآن سیکھنے میں تمہاری عمروں اور تمہاری اولاد کی عمروں کی مشغولیت ہے۔ ہم نے کہا: اے ابوعلی! وہ کیسے؟ فضیل نے کہا: تم قرآن کو نہیں پہچانو گے حتیٰ کہ تم اس کا اعراب پہچان لو۔

متشابہ سے محکم اور منسوخ سے ناسخ کی پہچان کر لو۔ جب تم اس کی پہچان کر لو گے تو فضیل اور ابن عیینہ کے کلام سے مستغنی ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا: اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۞ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ۞ (یونس) (اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آ گئی ہے) شفاء ان بیماریوں کے لئے جو سینوں میں ہیں اور (آ گئی ہے) ہدایت اور رحمت مومنین کے لئے (اے حبیب!) آپ فرمایئے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے۔ پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ مراتب قاری قرآن کو حاصل ہوتے ہیں جب وہ قرآن کا ماہر ہو، فرقان کا عالم ہو اور وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو اسے اپنا قرب بخشتا ہے اور وہ مذکورہ چیزوں سے نفع حاصل نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کو طلب کرے اور طلب کے بعد اس کی نیت میں خلوص ہو اور طالب علم کبھی اس سے ابتدا میں مباہات اور دنیا میں شرف حاصل کرنے کی نیت کرتا ہے، وہ علم کا حصول اسی خاطر کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نظریہ میں خطا ہے اور اس سے توبہ کرتا ہے اور نیت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہے اور پھر اس سے نفع حاصل کرتا ہے اور اپنا حال درست کرتا ہے۔ حسن نے کہا: ہم دنیا کے لئے علم حاصل کرتے تھے پھر وہ ہمیں آخرت کی طرف لے گیا۔ یہ سفیان ثوری نے بھی کہا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم نے علم حاصل کیا اور اس میں ہماری نیت خالص نہ تھی پھر بعد میں ہماری نیت خالص ہوئی۔

قرآن کے اعراب، قرآن کی تعلیم، قرآن پر ابھارنا اور اعراب کے ساتھ قرآن پڑھنے والے کا ثواب

ابوبکر بن انباری نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے قرآن کے اعراب کی فضیلت، اس کی تعلیم پر ترغیب مروی ہے اور گانے کی طرز پر پڑھنے کی مذمت اور کراہیت مروی ہے اور قرآن کے قاریوں پر جو کوشش سے اس کی تعلیم حاصل کرنا واجب ہے وہ بھی مروی ہے۔

اس میں سے وہ روایت ہے جو ہمیں یحییٰ بن سلیمان ضبی نے بتائی۔ فرمایا: ہمیں محمد بن ابوسعید نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابومعاویہ نے عبداللہ بن سعید مقبری سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کو فصیح انداز میں پڑھو اور اس کے غرائب تلاش کرو۔ مجھے میرے باپ نے بتایا فرمایا: ہمیں ابراہیم بن ہیثم نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں آدم یعنی ابن ابی ایاس نے بتایا۔ فرمایا: ہمیں ابو طیب مروزی نے بتایا فرمایا: ہمیں عبدالعزیز بن ابی رواد نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس میں غلطی نہ کی تو اس پر ایک فرشتہ متعین کیا جاتا ہے جو اس کے لئے لکھتا ہے، جیسا کہ اتارا گیا ہے، ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھتا ہے اور جو اس کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھتا ہے اس پر دو فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے بیس نیکیاں لکھتے ہیں پھر اگر وہ اسے فصیح عربی میں پڑھتا ہے تو اس پر چار فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے ستر نیکیاں لکھتے ہیں۔ جو یبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھو اور خوبصورت آوازوں کے ساتھ اس کو مزین کرو اور اس کو فصیح عربی میں پڑھو کیونکہ یہ عربی ہے اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اسے فصیح عربی میں پڑھا جائے۔ مجاہد سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن کو فصیح عربی میں پڑھو۔ محمد بن عبدالرحمن بن زید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھنا ہمارے نزدیک اس کے حروف یاد کرنے سے افضل ہے اور شعبی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے قرآن کو فصیح عربی میں پڑھا اس کے لئے دو اجر ہیں بنسبت اس کے جس نے فصیح عربی میں نہیں پڑھا۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عربوں کو تین وجوہ سے پسند کرتا ہوں کیونکہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کا کلام عربی ہے۔ سفیان نے ابوحمزہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حسن کو اس قوم کے متعلق بتایا گیا جو عربی سیکھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: وہ اچھا کرتے ہیں وہ اپنے نبی کی لغت سیکھتے ہیں اور حسن سے کہا گیا ہمارا ایک امام ہے جو گانے کی طرز پر قرآن پڑھتا ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا: اسے پیچھے ہٹادو۔

ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا: ایک اعرابی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آیا اور کہا: مجھے وہ کون پڑھائے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا؟ فرمایا: ایک شخص نے اسے سورۂ برأت پڑھائی۔ اس نے جب پڑھا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ: 3) اس پڑھانے والے نے رسولہ کو زیر کے ساتھ پڑھا تو اعرابی نے کہا: کیا اللہ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو میں اس سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعرابی کی بات پہنچی تو اسے بلایا اور کہا: اے اعرابی! کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بری ہے۔ اعرابی نے کہا: اے امیر المومنین! میں مدینہ آیا اور مجھے قرآن کے بارے کوئی علم نہ تھا۔ میں نے پوچھا: کون مجھے قرآن پڑھائے گا؟ پس اس نے مجھے سورۃ برأت پڑھائی اور کہا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ: 3) میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری

ہے تو میں بھی اس سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اعرابی! بات اس طرح نہیں ہے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیسے ہے؟ حضرت عمر نے کہا: اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ (التوبہ: 3) اعرابی نے کہا: میں اللہ کی قسم اس سے بری ہوں جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ لغت کا جاننے والا لوگوں کو قرآن پڑھائے۔ پھر آپ نے ابو اسود کو حکم دیا اور اس نے نحو کا علم وضع کیا۔

علی بن جعد سے مروی ہے، فرمایا: میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ صاحب حدیث جو عربی نہیں جانتا اس گدھے کی مثل ہے جس پر خورجی ہو جس میں چارہ نہ ہو۔ حماد بن سلمہ نے کہا: جس نے حدیث کو طلب کیا اور نحو کو نہیں سیکھا یا فرمایا عربی کو نہیں سیکھا وہ اس گدھے کی مانند ہے جس پر خورجی لٹکائی گئی ہے جس میں جو نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: قرآن کا اعراب شریعت میں سے ہے کیونکہ اس کے ساتھ وہ معانی قائم ہوئے ہیں جو شرع ہے۔

ابن انباری نے کہا(1): صحابہ کرام اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ قرآن کے غریب الفاظ اور مشکل الفاظ پر لغت اور شعر سے حجت پکڑتے تھے جو نحویوں کے مذہب کی صحت کو بیان کرتا اور اس کے مذہب کے فساد کو واضح کرتا جو ان پر انکار کرتا۔ اس سے یہ ہے جو ہمیں عبید بن عبدالواحد بن شریک البزاز نے بتایا۔ ہمیں ابن ابی مریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں ابن فروخ نے بتایا۔ فرمایا: مجھے اسامہ نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: مجھے عکرمہ نے خبر دی کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم مجھ سے غریب القرآن کے متعلق پوچھو تو اسے شعر میں تلاش کرو کیونکہ شعر عربوں کا دیوان ہے۔ ہمیں ادریس بن عبدالکریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں خلف نے بتایا فرمایا: ہمیں حماد بن زید نے بتایا انہوں نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کیا، فرمایا: میں نے حضرات سعید بن جبیر اور یوسف بن مہران کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا، ان سے قرآن کی کسی آیت کے بارے پوچھا جا رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا: اس میں ایسا ایسا ہے۔ کیا تم نے شاعر کو ایسا ایسا کہتے ہوئے نہیں سنا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، حضرت ابن عباس سے کسی شخص نے وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ۪ۙ (المدثر) کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: تو اپنے میلے کپڑے نہ پہن اور غیلان ثقفی کے قول سے مثال دی۔

فانی بحمد الله لا ثوب غادر　　لبست ولا من سوأة اتقنع

ایک شخص نے عکرمہ سے الزنیم کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: وہ ولد الزنا ہے اور شعر کے اس بیت سے مثال بیان کی۔

زنیم لیس یعرف من ابوہ　　بغی الام ذو حسب لئیم

عکرمہ سے یہ بھی مروی ہے کہ الزنیم کا مطلب فاحش کمینہ شخص بھی ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

زنیم تداعاہ الرجال زیادۃ　　کما زید فی عرض الادیم الاکارع

عکرمہ سے ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍۚ (الرحمن) کے ارشاد کے تحت مروی ہے، فرمایا: دونوں سائے اور ٹہنیوں والے اور فرمایا: کیا تم نے شاعر کا قول نہیں سنا۔

1۔ فی الوقف والابتداء، جلد 1، صفحہ 21

ماهاج شوقك من هديل حمامة تدعو على فنن الغصون حماما

تدعو ابا فرخين صادف طائراً ذا مخلبين من الصقور قطاما

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَاِذَاهُمْ بِالسَّاهِرَةِ (النازعات) کے تحت فرمایا ہے: اس سے مراد زمین ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے امیہ بن ابی الصلت نے کہا: عندهم لحم بحر و لحم ساهرة۔ ابن انباری نے کہا: راوی اس بیت کو اس طرح روایت کرتے ہیں۔

فيها لحم ساهرة و بحر و ما فاهوا به لهم مقيم

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس سے کہا لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ:255) کے بارے مجھے بتائیے۔ یہ السنۃ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اونگھ ہے۔ زہیر بن ابی سلمی نے کہا:

لا سنة في طوال الليل تاخذه ولا ينام ولا في امره فند

رات کی طوالت میں نہ اسے نیند آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے اور نہ اس کے امر میں رائے کی کمزوری ہوتی ہے۔

قرآن کی تفسیر اور مفسرین کی فضیلت

ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ اور تابعین سے تفسیر کی فضیلت میں جو منقول ہے اس میں سے یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ کا ذکر کیا اور ان کا علم کے ساتھ وصف بیان کیا۔ ایک شخص نے کہا: میں جناب پر قربان ہو جاؤں آپ جابر کا علم کے ساتھ وصف بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ تو (علم میں) آپ ہی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص:85) کی تفسیر جانتے تھے۔ مجاہد نے کہا: اللہ کے نزدیک محبوب ترین شخص نازل شدہ کتاب کا عالم ہے۔ حسن نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت نازل نہیں فرمائی مگر اس نے پسند کیا کہ جس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جو اس سے مراد ہے وہ معلوم ہو۔ شعبی نے کہا: مسروق ☆ نے ایک آیت کی تفسیر کے لئے بصرہ کا سفر کیا۔ انہیں بتایا گیا جو اس آیت کی تفسیر بیان کرتا تھا وہ شام چلا گیا ہے۔ پس مسروق نے تیاری کی اور شام تک سفر کیا حتیٰ کہ اس آیت کی تفسیر جان لی۔ عکرمہ (☆☆) نے وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء:100) کی تفسیر میں فرمایا: میں چودہ سال اس شخص کا نام تلاش کرتا رہا جو گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلا تھا حتیٰ کہ میں نے اس کا نام پا لیا۔ ابن عبد البر نے کہا وہ ضمرہ بن حبیب ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابن عباس نے کہا: میں دو سال ٹھہرا رہا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات کہنے کا ارادہ کیا تھا۔ مجھے ان کی ہیبت مانع تھی میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ حفصہ اور

☆ مسروق بن اجدع یہ ابو عائشہ وادعی ہے ہمدانی، کوفی

☆☆ ابو عبد اللہ قرشی یہ ان کے مولیٰ تھے مدنی، بربری، حافظ، مفسر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے۔

عائشہ تھیں۔ ایاس بن معاویہ نے کہا: ان لوگوں کی مثال جو قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے، اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس ان کے بادشاہ کی کتاب رات کو آئی ہو اور ان کے پاس چراغ نہ ہو، انہیں خوف لاحق ہو اور وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ کتاب میں کیا ہے اور اس شخص کی مثال جو تفسیر جانتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو ان کے پاس چراغ لایا ہو پھر انہوں نے وہ پڑھا ہو جو کچھ کتاب میں تھا۔

قرآن کا حامل، اور وہ کون ہے اور جس نے حامل قرآن سے دشمنی کی وہ کون ہے

ابو عمر نے کہا (☆): ایک ضعیف و کمزور حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ تین اشخاص کی عزت اللہ تعالیٰ کے جلال کی تعظیم میں سے ہے: عدل کرنے والا امام، بوڑھا مسلمان اور قرآن کا حامل جو نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ ہی قرآن سے انحراف کرنے والا ہو (1)۔ ابو عمر نے کہا: حملة القرآن سے مراد اس کے احکام اور اس کے حلال اور حرام کو جاننے والے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اس کو جاننے والے ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قرآن ہر چیز سے افضل ہے جس نے قرآن کی عزت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی توقیر و عزت کی اور جس نے قرآن کو خفیف سمجھا، اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا قرآن کے حاملین اللہ کی رحمت سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں، اللہ کے کلام کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کا نور پہننے والے ہوتے ہیں۔ جس نے ان سے دوستی کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا۔

حامل قرآن اور قاری قرآن کو قرآن کی تعظیم اور حرمت لازم ہے

ترمذی حکیم ابو عبد اللہ نے نوادر الاصول میں فرمایا: قرآن کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اسے بے وضو نہ چھوئے نیز اسے باوضو پڑھے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ تلاوت سے پہلے اپنے منہ کو پاک کرے اور مسواک اور خلال کرے کیونکہ یہ اس کا راستہ ہے۔ یزید بن ابی مالک نے کہا: تمہارے منہ قرآن کے راستوں میں سے ہیں پس تم انہیں پاک اور صاف کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے لئے ایسا لباس پہنے جیسے کسی امیر کے پاس جانے کے لئے پہنتا ہے کیونکہ وہ مناجات کرنے والا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قراءت کے وقت قبلہ رخ ہو۔ ابو العالیہ نے کہا: جب قرآن پڑھے تو عمامہ باندھے، لباس پہنے، چادر اوڑھے اور قبلہ کی طرف رخ کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب بھی اسے بلغم آئے کلی کرے۔ شعبہ نے ابو حمزہ (☆☆) سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، اس کے سامنے ایک برتن ہو جب بھی بلغم کرے تو کلی کرے پھر تلاوت میں شروع ہو، جب بھی بلغم آئے تو کلی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب اسے جمائی آئے تو قراءت سے رک جائے کیونکہ جب وہ تلاوت کر رہا ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تنزیل الناس منازلھم، حدیث نمبر 4203، تقدیم و تاخیر کے ساتھ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ ابو عمر سے مراد ابن عبد البر ہے ☆☆ ابو حمزہ سے مراد عمران بن عطاء الاسدی ہے۔

ہے تو اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے اور باتیں کر رہا ہوتا ہے اور جمائی شیطان کی طرف سے ہے۔ مجاہد نے کہا: جب تجھے جمائی آئے جبکہ تو قرآن پڑھ رہا ہو تو قرآن کی تعظیم کی خاطر قرآن کی تلاوت سے رک جا حتیٰ کہ جمائی ختم ہو جائے۔ یہ عکرمہ نے کہا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اس فعل میں قرآن کی عزت کر رہا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ تلاوت کی ابتدا میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے اگر اس کی قراءت سورت کے آغاز سے ہو یا جس جگہ پہنچا ہو۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت شروع کرے تو بغیر ضرورت آدمیوں سے کلام کرتے ہوئے اسے لحہ بہ لحہ قطع نہ کرے اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قراءت کے لئے تنہا بیٹھے تا کہ اس پر کلام کے ذریعے کوئی تلاوت کو قطع نہ کرے اور اس کے جواب کے ساتھ تلاوت کو ملا نہ دے کیونکہ جب وہ ایسا کرے گا تو اس سے استعاذہ کی سلطانی زائل ہو جائے گی جو اس نے ابتدا میں کہا تھا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ تلاوت کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے قرآن میں اپنے ذہن اور فہم کو استعمال کرے تا کہ مفہوم کو سمجھے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ آیت وعدہ پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے رغبت کرے اور اس کے فضل کا سوال کرے اور آیت وعید پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے اس سے پناہ مانگے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ قرآن کی امثال پر ٹھہرے اور ان کی پیروی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کے غرائب کو تلاش کرے۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ ہر حرف کو اس کی ادائیگی کا حق دے تا کہ کلام لفظ کے ساتھ مکمل ظاہر ہو کیونکہ ہر حرف کے بدلے اس کے لئے دس نیکیاں ہیں اور اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت کو ختم کرے تو اپنے رب کی تصدیق کرے یعنی صدق اللہ العظیم کہے اور رسول کریم کے پہنچانے کی شہادت دے اور یہ گواہی دے کہ یہ حق ہے۔ پس کہے صدقتَ ربّنا، و بلغتْ رسلُك و نحن علی ذلك من الشاهدين ـ اللهم اجعلنا من شهداء الحق، القائمين بالقسط۔ پھر دعائیں مانگے اور اس کی حرمت سے ہے کہ جب تلاوت کرے تو ہر سورت سے کچھ آیات چن کر نہ پڑھے کیونکہ ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا جبکہ وہ ہر سورت سے کچھ تلاوت کر رہے تھے آپ ﷺ نے اسے پوری سورت تلاوت کرنے کا حکم فرمایا او کما قال علیہ السلام۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قرآن کو رکھے تو کھلا ہوا نہ چھوڑے اور کوئی کتاب قرآن کے اوپر نہ رکھے حتیٰ کہ ہمیشہ تمام کتب سے بلند ہو، وہ کتب علمی ہوں یا کوئی اور۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب تلاوت کرے تو قرآن کو اپنی گود میں رکھے یا سامنے کسی چیز پر رکھے، زمین پر نہ رکھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ تختی سے قرآن کو تھوک کے ساتھ صاف نہ کرے بلکہ پانی کے ساتھ دھوئے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ جب پانی کے ساتھ دھوئے اور پانی کو نجاست والی جگہ سے اور ایسی جگہوں سے بچائے جو روندی جاتی ہیں کیونکہ اس غسالہ کی بھی حرمت ہے۔ سلف صالحین قرآن کے دھوون سے شفاء طلب کرتے تھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قرآن کے اوراق بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں دوسری کتب کی حفاظت کے لئے استعمال نہ کرے کیونکہ یہ عظیم جفا ہے بلکہ پانی کے ساتھ اسے مٹا دے۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ کوئی دن بھی قرآن کی زیارت سے خالی نہ ہو اور حضرت ابو موسیٰ فرماتے تھے: میں حیا کرتا

ہوں کہ میں کسی دن ایک مرتبہ اپنے رب کے عہد کو نہ دیکھوں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ اپنی آنکھوں کو قرآن سے حصہ دے کیونکہ آنکھ نفس تک پہنچاتی ہے، نفس اور سینہ کے درمیان حجاب ہے اور قرآن سینہ میں ہوتا ہے جو زبانی تلاوت کرے گا تو اس کے کان سنیں گے پھر وہ نفس تک پہنچائیں گے اور جب وہ خط کو دیکھے گا تو آنکھ اور کان دونوں ادائیگی میں شریک ہوں گے اور یہ ادائیگی کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ آنکھ نے بھی کان کی طرح اپنا حصہ لیا۔ زید بن اسلم نے عطا بن یسار سے انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی آنکھوں کو عبادت سے حصہ دو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آنکھوں کا عبادت سے کیا حصہ ہے؟ فرمایا: قرآن کی طرف دیکھنا، اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائب کے وقت عبرت حاصل کرنا۔ مکحول نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی افضل عبادت دیکھ کر قرآن پڑھنا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے کے وقت قرآن کی تاویل نہ کرے۔ ہمیں عمرو بن زیاد حنظلی نے بتایا، فرمایا: ہمیں ہشیم بن بشیر نے بتایا انہوں نے حضرت مغیرہ سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا فرمایا: وہ دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے پر قرآن کی بطور حوالہ آیت پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ مثلاً جب کوئی شخص تیرے پاس آئے تو تو کہے: جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ۝ (طٰہٰ) کھانا سامنے آئے تو کہے: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ (الحاقہ) اس طرح کی اور مثالیں ہیں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ یہ نہ کہے کہ فلاں سورت جیسے تو کہتا ہے سورۃ النحل، سورۃ البقرہ، سورہ النساء، بلکہ کہے: وہ سورت جس میں نحل کا ذکر ہے وغیرہ۔ میں کہتا ہوں: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الآیتان من آخر سورۃ البقرۃ من قرء بھما فی لیلۃ کفتاہ (سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں جو انہیں رات کو پڑھے گا یہ اس کی کفایت کریں گی۔) کے مخالف ہے(1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو الٹا تلاوت نہ کرے جیسے بچوں کے معلم کرتے ہیں وہ اپنے طور پر اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس میں مخالفت ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی قراءت گلے میں زور دے کر نہ نکالے جس طرح یہ ہمزین مبتدعین تکلفاً اپنے بدبودار مونہوں سے کلام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے شیطان نے ان کی طرف اس کو ڈالا اور انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ گانے کی طرز پر قرآن نہ پڑھے جس طرح اہل فسق پڑھتے ہیں۔ نہ تو نصاریٰ کی ترجیع میں پڑھے اور نہ رہبانوں کے نوحہ میں پڑھے۔ یہ سب راہ حق سے ہٹنا ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن لکھے تو عظیم الفاظ میں لکھے۔ ابوحکیمہ سے مروی ہے کہ وہ کوفہ میں قرآن لکھتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گزرے تو آپ نے اس کی کتاب کی طرف دیکھا اور فرمایا: اپنی قلم کو موٹا کرو۔ میں نے قلم کو قط دیا ایک طرف سے پھر میں نے لکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے میری کتاب کو دیکھ رہے تھے۔ فرمایا: اس طرح اس کو روشن کر جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا۔ اس کی حرمت سے ہے کہ پڑھتے ہوئے ایک دوسرے سے بلند نہ پڑھیں تاکہ دوسرے پر فساد پیدا کر دے حتیٰ کہ سننے والا اس پر ناراض ہو اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کیفیت طاری ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب من شھود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3707، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قراتوں میں جھگڑا نہ کرے اور اپنے ساتھی کو یہ نہ کہے کہ یہ اس طرح نہیں ہے، ہوسکتا ہے وہ صحیح ہو اور قرآن میں جائز ہو تو یہ کتاب کا انکار کرنا ہوگا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ بازاروں میں شوروغل اور لغو جگہ میں اور بیوقوفوں کے مجمع میں نہ پڑھے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ذکر کیا اور ان کی تعریف فرمائی کہ اذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً۔ یہ تو خود گزرنے پر ہے پھر تلاوت قرآن کرنے والے کا اہل لغو کے درمیان اور سفہاء کے مجمع سے گزرنا کتنا منع ہوگا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو تکیہ نہ بنائے اور اس پر ٹیک نہ لگائے اور قرآن کسی کو دینے لگے تو قرآن کو پھینکے نہیں اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو بالکل چھوٹا نہ کرے۔ اعمش نے ابراہیم سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مصحف کو چھوٹا نہ بنایا جائے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن دیکھا تو پوچھا: یہ کس نے لکھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے۔ حضرت عمر نے اسے درے سے مارا اور فرمایا: قرآن کی تعظیم کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے مسیجد یا مصیحف کہنے سے منع فرمایا۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ملائے جو اس میں سے نہ ہو۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ وہ اسے نہ تو سونے سے مزین کرے اور نہ سونے سے لکھے تاکہ دنیا کی زینت ان کے ساتھ نہ ملے۔ مغیرہ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے وہ مصحف کو سونے سے مزین کرنا اور لکھنا ناپسند سمجھتے تھے یا اس کی آیتوں کے سروں پر نشان لگانے اور قرآن کو چھوٹا بنانے کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت ابودرداء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنی مساجد کو مزین کرو گے اور اپنے مصاحف کو زیور پہناؤ گے تو تم پر ہلاکت ہوگی (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب انہوں نے قرآن کو چاندی سے مزین دیکھا، تم اس پر چوروں کو ابھارتے ہو حالانکہ زینت اس کے جوف میں ہے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ زمین پر اور دیوار پر نہ لکھے جیسا کہ جدید مساجد میں ہوتا ہے۔ ہمیں محمد بن علی شقیقی نے اپنے باپ سے انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے محمد بن زبیر سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر لکھی ہوئی ایک تحریر کے پاس سے گزرے، آپ نے ہذیل کے ایک نوجوان سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کے الفاظ ہیں جو یہودی نے لکھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنے مقام پر رکھو۔ محمد بن زبیر نے کہا: حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک لڑکے کو دیوار پر قرآن لکھتے ہوئے دیکھا تو اسے مارا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب کسی مریض کی شفا کے لئے قرآن کی تحریر کو دھوئے تو اسے کوڑے پر اور نجاست کی جگہ پر اور روندی جانے والی جگہ پر نہ ڈالے، بلکہ زمین کے کسی ایسے کونے میں ڈالے جہاں لوگوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔ یا کسی پاک جگہ پر گڑھا کھودے تاکہ پانی اس گڑھے میں گرے یا کسی بڑی نہر میں اسے بہائے تاکہ اس کے پانی کے ساتھ بہہ جائے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن کو ختم کرے تو پھر سے شروع کرے تاکہ اسے چھوڑنے والے کی ہیئت پر نہ ہو اسی وجہ

1۔ الزہد ابن مبارک، صفحہ 797۔ فضائل القرآن، ابوعبید، صفحہ 242

سے رسول اللہ ﷺ جب ختم فرماتے تو ابتدا سے پانچ آیات کی مقدار پڑھتے تا کہ مہجور کی ہیئت پر نہ ہوں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ایک شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: علیك بالحال المرتحل۔ (1) اس نے عرض کی: حضور! اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن اول سے آخر تک پڑھے پھر ابتداء سے شروع کرے جب بھی ختم کرے تو نئے سرے سے شروع کردے۔

میں کہتا ہوں: مستحب ہے کہ جب قرآن ختم کرے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرے۔ ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں وکیع نے بتایا انہوں نے مسعر سے انہوں نے حضرت قتادہ سے روایت کیا کہ حضرت انس بن مالک جب قرآن ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرتے اور دعا کرتے۔ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے حکم سے روایت کیا فرمایا: مجاہد اور عبدہ بن ابی لبابہ اور لوگ قرآن حکیم کا دور کرتے۔ جب ختم کرنے کا ارادہ کرتے تو ہماری طرف متوجہ ہوتے اور ہمیں بلاتے کیونکہ قرآن کریم کے ختم کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے۔

ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا انہوں نے عوام سے اور انہوں نے ابراہیم تیمی سے روایت کیا، فرمایا: جس نے دن کی ابتدا میں قرآن ختم کیا اس کے لئے شام تک فرشتے دعا کرتے رہتے ہیں اور جس نے رات کے آغاز میں قرآن ختم کیا اس پر صبح تک فرشتے درود بھیجتے رہتے ہیں۔ فرمایا: لوگ دن کے اور رات کے آغاز میں قرآن ختم کرنا مستحب سمجھتے تھے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن سے تعویذ نہ بنایا جائے اور پھر اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہو مگر یہ کہ وہ چمڑے یا چاندی وغیرہ کے غلاف میں ہو۔ پھر وہ اس طرح ہو جائے گا جیسے تیرے سینہ میں ہے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب وہ قرآن لکھے اور اس کو پیئے تو ہر سانس پر اللہ کا نام لے اور اس میں بڑی نیت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیت کی مقدار ہی اسے عطا فرمائے گا۔ لیث نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تو قرآن لکھے اور پھر مریض کو پلائے۔ ابوجعفر سے مروی ہے، فرمایا: جو اپنے دل میں سختی پائے تو وہ زعفران کے ساتھ پیالے میں سورۂ یس لکھے پھر اسے پیئے۔

میں کہتا ہوں: اس کی حرمت سے ہے کہ چھوٹی سورت نہ کہا جائے۔ ابو العالیہ نے چھوٹی یا بڑی سورت کہنا ناپسند کیا اور جس کو یہ کہتے ہوئے انہوں نے سنا اسے فرمایا: تو اس سے چھوٹا ہے قرآن سارا عظیم ہے۔ مکی نے یہ قول ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے جو روایت کیا ہے وہ اس کے معارض ہے۔ عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده کے سلسلہ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: مفصل میں سے کوئی چھوٹی اور بڑی سورت نہیں ہے مگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کے ساتھ لوگوں کو امامت کراتے سنا ہے۔ (2)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء ان القرآن انزل علی سبعة احرف، حدیث نمبر 2872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب من رای التخفیف فیها، حدیث 691، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے اور اس پر جرأت کرنے پر وعید اور مفسرین کے مراتب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتاب اللہ کی تفسیر فرماتے تھے مگر چند آیات کی جو جبریل آپ کو سکھاتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس حدیث کا مطلب ہے قرآن کے مغیبات کے بارے میں، مجمل کی تفسیر وغیرہ کے بارے میں حضور تفسیر فرماتے تھے جن تک اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر رسائی ممکن نہ تھی۔ جملہ مغیبات میں سے وہ ہے اللہ تعالیٰ نے جن کا علم نہیں دیا ہے جیسے قیامت کے قیام کا وقت وغیرہ، جو الفاظ سے تلاوت کی جاتی ہیں، صور میں نفخات کی تعداد، آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ترتیب۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو (وہ بیان کرو) جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے اور فرمایا: جو قرآن میں اپنی رائے کو دخل دے وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے (1)۔ حضرت جندب سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے دی اور صحیح بھی بیان کیا تو اس نے خطا کی (2)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور اس کے ایک راوی پر کلام کی گئی ہے۔ رزین نے یہ زائد بیان کیا ہے جس نے اپنی رائے دی اور غلطی کی تو اس نے کفر کیا۔ ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی، لغوی نے اپنی کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس کی حدیث کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں (۱) جس نے قرآن کے مشکل الفاظ کی ایسی تفسیر بیان کی جو صحابہ، تابعین اور پہلے لوگوں کے مذہب سے معروف نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے اور قول اثبت ہے اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ جس نے قرآن کے بارے میں کوئی قول کیا جبکہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے تو وہ دوزخ کے ٹھکانا میں اترے، یتبوا کا معنی ینزل و یحل (اترنا) ہے۔ شاعر نے کہا ؎

و بوئت فی صمیم معشرھا فتم فی قومھا مبوؤھا

اور حضرت جندب کی حدیث میں فرمایا: بعض اہل علم نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ رائے سے مراد خواہش ہے یعنی جس نے قرآن کے بارے میں ایسا قول کیا جو اس کی خواہش کے موافق ہے اس نے ائمہ سلف سے نہیں لیا ہے پھر وہ ٹھیک بھی کہے گا تو خطا کرنے والا ہوگا کیونکہ اس نے قرآن پر ایسا حکم لگایا جس کی اصل معروف نہیں ہے اور وہ اہل اثر اور نقل کے مذاہب پر موقوف نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص سے کتاب اللہ کا کوئی معنی پوچھا گیا تو اس

1۔ مسند امام احمد، مسند عبداللہ بن عباس، جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی تفسیر القرآن برأیه، حدیث نمبر 2875، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم، حدیث نمبر 3167، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے علماء کے قول میں غور وفکر کئے بغیر فوراً کوئی معنی بتادیا جس کا تقاضا علم کے قوانین نحو اور اصول کرتے ہیں تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے کیونکہ لغوی علماء لغت کی وضاحت کرتے ہیں، نحوی علماء نحو کی وضاحت کرتے ہیں فقہاء اس کے معانی بیان کرتے ہیں اور ہر ایک علم ونظر کے قوانین پر مبنی اجتہاد سے کہتا ہے۔ اس صفت پر کہنے والا وہ اپنی رائے سے کہنے والا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اس قول کو بہت سے علماء نے اختیار کیا ہے۔ جس نے اپنے گمان اور دل کے خیال سے بات کی جبکہ اس نے اصول سے استدلال نہیں کیا تو وہ خطا کرنے والا ہے اور جس نے اس کا معنی مستنبط کیا محکم اور متفق اصول پر محمول کرتے ہوئے تو وہ ممدوح ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: تفسیر سماع پر موقوف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء:59) علماء کا یہ قول فاسد ہے کیونکہ قرآن کی تفسیر کے متعلق نہی ان باتوں سے خالی نہ ہوگی یا تو اس سے نقل، مسموع اور استنباط کے ترک پر اکتفا کرنا مراد ہے یا کوئی دوسرا مفہوم مراد ہے اور یہ تو باطل ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ کوئی شخص قرآن کے متعلق کلام نہ کرے مگر جو اس نے سنا ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر کئی وجوہ سے کی۔ جو انہوں نے کہا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر نہیں کہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو بلایا اور دعا دی: اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل۔ اے اللہ! دین میں اسے سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل سکھا۔ اگر تاویل پھر قرآن کی طرح مسموع ہوتی تو اس تخصیص کا کیا فائدہ تھا۔ یہ واضح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے مزید بیان سورۃ النساء میں ان شاء اللہ آئے گا۔ نہی کو دو وجہوں میں سے ایک پر محمول کیا جائے گا۔

تفسیر بالرای کی صورت

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے کسی چیز میں رائے ہو اور اس کی طرف اس کا طبعی میلان اور خواہش ہو پھر وہ اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی تاویل کرے تاکہ وہ اپنی غرض کی صحت پر حجت پکڑے۔ اور اگر اس کی یہ رائے اور خواہش نہ ہوتی تو قرآن سے اس کے لئے یہ معنی ظاہر نہ ہوتا۔ یہ صورت کبھی تو علم کے ساتھ ہوتی ہے جیسے وہ شخص جو بعض آیات سے اپنی بدعت کی صحت پر حجت پکڑتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آیت سے مراد یہ نہیں ہے لیکن اس کا مقصود اپنے خصم (مقابل) پر مسئلہ کو ملتبس کرنا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ جہالت کی بنا پر ہوتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ آیت احتمال رکھتی ہے اس کا فہم اس وجہ کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے۔ وہ اپنی رائے اور خواہش سے اس جانب کو راجح کرتا ہے۔ پس وہ اپنی رائے سے تفسیر کرتا ہے یعنی اس کی رائے اسے اس تفسیر پر ابھارتی ہے اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو یہ وجہ اس کے نزدیک راجح نہ ہوتی۔ کبھی اس کے لئے صحیح غرض ہوتی ہے اس کے لئے وہ قرآن سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ اس پر ایسی بات سے استدلال کرتا ہے جو معلوم ہے کہ اس سے یہ ارادہ کیا گیا ہے جیسے سخت دل کو مجاہدہ کی طرف کوئی بلاتا ہے اور کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى (طٰہٰ) اور اس کے دل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرعون سے یہی مراد ہے۔ یہ جنس بعض واعظین مقاصد صحیحہ میں کلام کی تحسین اور سامعین کی رغبت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہ ممنوع ہے

کیونکہ یہ لغت میں قیاس ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اور کبھی باطنیہ، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اور اپنے باطل مذاہب کی طرف دعوت دینے کے لئے مقاصد فاسدہ میں استعمال کرتے ہیں اور قرآن کو اپنی رائے کے مطابق اتارتے ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن سے یہ مراد نہیں۔ یہ فنون تفسیر بالرائے سے منع کی ایک وجہ ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غرائب قرآن کے متعلق نقل اور سماع کے بغیر ظاہر عربی کے ساتھ جلدی سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا اور قرآن میں جو مبہم اور مبدل الفاظ ہیں اور جو قرآن میں اختصار، حذف، اضمار اور تقدیم و تاخیر ہے اس کے اظہار میں نقل و سماع کا اظہار نہ کر کے قرآن کی تفسیر کرنا۔ جو تفسیر کے ظاہر کو محکم نہیں کرتا اور صرف عربی جاننے پر معانی کے استنباط کی طرف جلدی کرتا ہے وہ اکثر غلطی کرتا ہے اور تفسیر القرآن بالرائے کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ابتداً ظاہر تفسیر میں نقل اور سماع کا اعتبار ضروری ہے تاکہ اس میں غلطیوں سے محفوظ رہے اس کے بعد فہم اور استنباط کو وسعت دے۔ غرائب وہ ہوتے ہیں جو صرف سماع سے سمجھے جا سکتے ہیں ظاہر احکام سے پہلے باطن تک پہنچنے کی کوئی امید نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا (الاسراء: 59) اس کا معنی ہے: آیة مبصرة فظلموا انفسهم بقتلها۔ پس ظاہر عربی کی طرف دیکھنے والا گمان کرے گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹنی روشن تھی اور اسے معلوم نہیں ہوگا کہ کس کے ساتھ انہوں نے ظلم کیا حالانکہ انہوں نے دوسروں سے اور اپنے آپ سے ظلم کیا۔ یہ حذف اور اضمار سے ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ ان دو وجہوں کے علاوہ کوئی لاحق نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ابن عطیہ نے کہا: بڑے سلف صالحین جیسے حضرات سعید بن مسیب، عامر شعبی وغیرہما تفسیر قرآن کو بڑا سمجھتے تھے اور ادراک اور تقدم کے باوجود احتیاط اور تقویٰ کی بنا پر تفسیر قرآن سے توقف کرتے تھے۔ ابوبکر انباری نے کہا: گزشتہ ائمہ کرام قرآن کے مشکل کی تفسیر سے بچتے تھے۔ بعض تو کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرے جو اللہ تعالیٰ کی مراد کے موافق نہ ہو پھر وہ اس قول سے پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بعض اس سے ڈرتے تھے کہ وہ تفسیر میں امام بنا دیا جائے اور اس کے مذہب پر بنیاد رکھی جائے اور اس کے طریقہ پر اکتفا کیا جائے۔ شاید بعد میں آنے والا کسی حرف کی اپنی رائے سے تفسیر بیان کرے اور اس میں خطا کرے اور کہے سلف میں سے فلاں امام تفسیر قرآن بالرائے میں میرا امام ہے۔ حضرت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کے ایک حرف کی تفسیر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور میں کہاں جاؤں گا اور میں کیسے کروں گا جب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ایک حرف کے بارے میں ایسی بات کہہ دوں گا جو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی۔ ابن عطیہ نے کہا: سلف صالحین میں بہت سی تعداد ہے جنہوں نے قرآن کی تفسیر کی وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر رحمت و مہربانی کرنے والے تھے۔ صدر المفسرین اور مفسرین کے مؤید حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس تھے، انہوں نے اس کام کے لیے تجرد اختیار کیا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ علماء نے ان کی پیروی کی جیسے حضرات مجاہد، سعید بن مسیب وغیرہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تفسیری نکات جو محفوظ ہیں ان کی نسبت حضرت عبد اللہ بن عباس سے زیادہ محفوظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

میں نے قرآن کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی تعریف کرتے تھے اور ان سے تفسیر لینے پر برانگیختہ کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: عبداللہ بن عباس کتنا بہترین ترجمان قرآن ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گویا باریک پردے سے غیب کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ان کے بعد حضرات عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ہیں جو صحابہ سے لیا گیا وہ عمدہ ہے کیونکہ وہ نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا۔ حضرت عامر بن واثلہ سے مروی ہے: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا وہ خطبہ دے رہے تھے میں نے ان کو خطبہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا: تم مجھ سے پوچھو اللہ کی قسم! تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھو گے جو قیامت تک ہونی ہے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بیان کروں گا۔ تم مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو اللہ کی قسم! کوئی آیت ایسی نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، ہموار زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر، ابن الکواء کھڑا ہوا اور کہا: اے امیر المومنین! الذاریات ذروا کیا ہے اور حدیث ذکر کی (1)۔ منہال بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر مجھے کسی کے بارے میں علم ہو کہ وہ مجھ سے کتاب اللہ زیادہ جانتا ہے مجھے اس تک سواریاں پہنچائیں گی تو میں اس کے پاس جاؤں گا۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا: کیا تم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نہیں ملے ہو؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں میں ان سے ملا ہوں (2)۔

مسروق سے مروی ہے، فرمایا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کو علم میں بڑا چھوٹا پایا، ایک عالم اپنے سے بڑے عالم سے روایت کرتا ہے ایک عالم، دو عالموں سے روایت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک عالم اگر لوگوں پر وارد ہو تو ان سب کو کھینچ لائے اور حضرت عبداللہ بن مسعود ان علماء میں سے تھے۔ یہ مناقب ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیے ہیں اور فرمایا: اخاذ عربوں کے نزدیک وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پانی روکا جاتا ہے جیسے تالاب۔ ابوبکر نے کہا: ہمیں احمد بن ہیثم بن خالد نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن عبداللہ بن یونس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں سلام نے بتایا انہوں نے زید العمی سے روایت کیا، انہوں نے ابی الصدیق الناجی سے انہوں نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر زیادہ رحم کرنے والا ابوبکر ہے، اللہ کے دین میں سب سے مضبوط عمر ہے، حیا کے اعتبار سے سچا عثمان ہے اور سب سے بڑا قاضی علی ہے اور زید سب سے زیادہ علم وراثت کو جاننے والا ہے اور کتاب اللہ کا زیادہ قاری ابی بن کعب ہے، حلال وحرام کو زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے، اس امت کا امین ابو عبیدہ بن جراح ہے اور ابو ہریرہ علم کا برتن ہے، سلمان ایک علم کا سمندر ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور زمین و آسمان میں ابوذر رضی اللہ عنہم سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔ (3)

ابن عطیہ نے کہا: تابعین میں سے مفسرین حضرات حسن بصری، مجاہد، سعید بن جبیر، علقمہ ہیں۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر قراءت کی ہر آیت پر وقوف کیا اور ہر آیت کو سمجھ کر پڑھا، ان کے بعد عکرمہ اور ضحاک ہیں۔ اگرچہ ضحاک

1۔ الجرح والتعدیل، تعارف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ 2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل عبداللہ بن مسعود وامہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل۔ ایضاً، 1،2،3، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 150-151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں ملا تھا انہوں نے ابن جبیر سے علم حاصل کیا ہے اور عامر شعبی سدی اس پر اور ابو صالح پر طعن کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں کوتاہ نظر سمجھتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یحییٰ بن معین نے کہا: کلبی کوئی شے نہیں ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان نے سفیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: کلبی نے کہا ابو صالح نے مجھے ایک مرتبہ کہا جو میں تجھے بتاؤں تو وہ جھوٹ ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم اسے جھوٹا کہتے تھے یعنی ابو صالح مولیٰ ام ہانی اور فارسی لغت میں زیادہ جھوٹ بولنے والے کو دروغ زن کہا جاتا ہے۔

پھر کتاب اللہ کی تفسیر کو ہر خلف سے عادل لوگوں نے حاصل کیا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس علم کو ہر خلف سے ان کے عادل لوگ حاصل کریں گے اور اس سے غالی لوگوں کی تحریف، مبطلین کے مذہب اختیار کرنے اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے۔ اس حدیث کو ابو عمرو وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ خطیب ابو بکر احمد بن علی بغدادی نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شہادت ہے کہ وہ دین کی پہچان، مسلمانوں کے ائمہ، تحریف سے شریعت کی حفاظت کریں گے، باطل سے بچائیں گے اور بیوقوفوں کی تاویل کارد کریں گے، ان کی طرف رجوع واجب ہے اور دین کے معاملہ میں اعتماد ان پر ہوگا۔ رضی اللہ عنہم

ابن عطیہ نے کہا: تفسیر کے بارے میں علماء نے تالیفیں کیں جیسے عبدالرزاق، مفضل، علی بن ابی طلحہ بخاری وغیرہم۔ پھر محمد بن جریر نے لوگوں پر مختلف تفاسیر کو جمع کیا، ان سے بعید کو قریب کیا اور اسناد کے ذریعے شفا دی۔ متاخرین مفسرین میں ابو اسحاق الزجاج ابو علی فارسی ہیں۔ رہے ابو بکر نکاش، ابو جعفر نحاس، اکثر لوگوں نے ان کی غلطیاں نکالیں اور ان کے طریقے پر مکی بن ابی طالب تھے۔ ابو العباس المہدوی تالیف کو پختہ کرنے والے تھے۔ یہ سب مجتہد تھے اور ماجور تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور ان کے چہروں کو شاداب رکھے۔

کتاب کی وضاحت سنت سے کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل:44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر، آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ (النور) (پس ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا انہیں دردناک عذاب نہ آلے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝ (الشوریٰ:52) (بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف) اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں حضور علیہ السلام کی اطاعت کو فرض قرار دیا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)۔

ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں عبدالرحمن بن یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک محرم (احرام باندھنے والا) کو

دیکھا جس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے تو آپ نے محرم کو منع کیا۔ اس محرم نے کہا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کوئی آیت بطور دلیل پیش کرو تو میں اپنے کپڑے اتار دوں گا تو عبدالرحمن نے یہ آیت پڑھی: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) اور رسول کریم جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جن سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

ہشام بن حجیر سے مروی ہے، فرمایا: طاؤس عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ چھوڑ دو۔ طاؤس نے کہا: حضور نے انہیں سنت بنانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز سے منع فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا ان دو رکعتوں پر تجھے عذاب دیا جائے گا یا اجر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: 36) (نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرمادے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا، تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اپنے اس معاملہ میں۔

ابوداؤد نے مقداد بن معدیکرب سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ نے فرمایا: خبردار! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے۔ خبردار! قریب ہے کوئی شخص تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تمہیں اس قرآن کے بارے میں کہے جو تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال کرو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام کرو۔ خبردار! تمہارے لئے گھروں کے رہنے والے گدھے اور ذی ناب درندے اور معاہد کی گری پڑی چیز حلال نہیں ہے مگر یہ کہ اس چیز کا مالک اس چیز سے مستغنی ہو جائے۔ جو کسی قوم کے پاس آئے، اس قوم پر اس کی مہمان نوازی کرنا ہے اگر وہ مہمان نوازی نہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اپنی مہمان نوازی کی مثل ان سے لے لے۔ (1)

خطابی نے کہا او تیت الکتاب و مثلہ معہ (2) کا ارشاد کئی احتمال رکھتا ہے: ایک یہ کہ اس کا معنی ہے مجھے وحی باطن عطا کی گئی ہے جو غیر متلو ہے جیسا کہ مجھے وحی ظاہر متلو عطا کی گئی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مجھے کتاب بطور وحی عطا کی گئی ہے جو تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی مثل بیان بھی عطا کیا گیا ہے یعنی آپ کو اجازت دی گئی ہے کہ آپ اسے بیان فرمائیں جو کتاب میں ہے۔ پس عام کریں، خاص کریں، اس میں زیادتی کریں اور کتاب میں جو کچھ ہے اسے شریعت بنائیں۔ پس اس پر عمل واجب ہو گا اور اس کا قبول کرنا لازم ہو گا جیسا کہ ظاہر جو قرآن سے تلاوت کیا جاتا ہے (اس کا قبول کرنا لازم ہے) اور یوشک رجل شبعان اس ارشاد سے آپ ان سنن کی مخالفت سے ڈرا رہے ہیں جن کو آپ نے مقرر فرمایا جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے جیسا کہ خوارج اور روافض کا نظریہ ہے کہ وہ ظاہر قرآن کو پکڑتے ہیں اور ان سنن کو ترک کرتے ہیں جو کتاب کے بیان کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ فرمایا: وہ لوگ حیران ہوئے اور گمراہ ہوئے۔ فرمایا: الاریکۃ پلنگ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اریکہ نہیں بولا جاتا مگر جب وہ پالکی میں ہو۔ فرمایا: اریکۃ سے مراد مال و دولت والے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں کو لازم پکڑا اور علم حاصل نہ کیا۔ الا ان یستغنی عنہا صاحبہا کا مطلب یہ ہے کہ جس کی چیز گم ہوئی ہے وہ اس سے نہ لے جس

1۔ سنن ابی داود، باب لزوم السنۃ حدیث نمبر 3988، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ معالم السنن، جلد 4، صفحہ 298

نے وہ چیز اٹھائی ہے، اس سے عدم دلچسپی کی بنا پر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ (التغابن: 6)
اس کا معنی ہے ان سے استغنا کی بناء پر اللہ نے انہیں فراموش کر دیا۔

اور فلہ ان یعقبھم مثل قراۃ یہ اس کے لئے حکم ہے جو مضطر اور مجبور ہو اور کھانا نہ پائے اور اسے جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو۔ پس اس کے لئے جائز ہے کہ جس مہمان نوازی سے انہوں نے اسے محروم کیا اس کی مقدار ان کے مال سے لے لے۔ یعقبھم مشدد اور معاقبہ سے مخفف دونوں طرح مروی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ (النحل: 126) یعنی غلبہ تمہارے لئے ہو پھر تم ان سے مال غنیمت لو اسی طرح مہمان نوازی کی مقدار سے ان کے مال سے لے لو۔ فرمایا: حدیث کے اندر یہ دلیل ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو تو وہ خود حجت ہے۔ فرمایا: جو بعض علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو اگر وہ اس کے موافق ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر موافق نہیں ہے تو اسے رد کر دو۔ یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کی دو قسمیں ہیں۔ کتاب میں جو مجمل ہے اس کا بیان جیسے پانچ نمازوں کے لئے ان کے اوقات، سجود، رکوع اور سارے احکام کا بیان اور زکوٰۃ کی مقدار، اس کا وقت، کس مال سے زکوٰۃ لی جائے گی ان سب چیزوں کا بیان، اسی طرح مناسک حج کا بیان۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حج فرمایا تو فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (1) اور فرمایا: تم نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا (2)۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ابن مبارک نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا: تو ایک احمق آدمی ہے کیا تو اللہ کی کتاب میں ظہر کی چار رکعتیں پاتا ہے جن میں جہری قراءت نہیں ہے۔ پھر اس پر نماز، زکوٰۃ وغیرہ کو شمار کیا پھر فرمایا: کیا تو یہ چیزیں کتاب اللہ میں تفسیر سے پاتا ہے۔ کتاب اللہ میں یہ چیزیں مبہم ہیں اور سنت اس کی مفسر ہے۔ امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی تھی اور جبریل سنت کے ساتھ آتے تھے جو اس کی تفسیر کرتی تھی۔ سعید بن منصور نے روایت کیا ہے، ہمیں عیسیٰ بن یونس نے اوزاعی سے روایت کر کے بتایا انہوں نے مکحول سے روایت کیا، فرمایا: قرآن کو سنت کی زیادہ ضرورت ہے بنسبت سنت کو قرآن کی ضرورت کے۔ اوزاعی سے یہی مروی ہے۔ فرمایا: یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: سنت کتاب پر فیصلہ کرنے والی ہے جب کہ کتاب سنت پر فیصلہ کرنے والی نہیں۔ فضل بن زیاد نے کہا: میں نے احمد بن حنبل کو سنا جبکہ اس حدیث کے بارے میں ان سے پوچھا گیا جس میں ہے کہ سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کرتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں تو کہتا ہوں: سنت کتاب کی تفسیر کرتی ہے اور اسے بیان کرتی ہے۔

دوسرا بیان: وہ کتاب کے حکم پر زیادتی کرنا ہے جیسے پھوپھی اور خالہ کے عقد میں ہوتے ہوئے ان کی بھتیجی اور بھانجی سے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرۃ العقبۃ الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین، حدیث نمبر 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح کرنا حرام ہے، پالتو گدھوں کا اور ذی ناب درندوں کا حرام کرنا اور ایک گواہ کے ساتھ قسم سے فیصلہ کرنا، اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو سمجھنے اور سیکھنے کی کیفیت اور جو وارد ہے کہ اس پر آسانی کی گئی جس نے اس پر عمل پر پیش قدمی کی اور حفظ نہ کیا

ابو عمرو الدانی نے کتاب ''البیان'' میں اپنی سند سے حضرات عثمان، ابن مسعود اور اُبی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں دس آیات پڑھاتے تھے اور دوسری دس آیات کی طرف تجاوز نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ جان لیتے تھے جو ان میں عمل ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں قرآن اور عمل اکٹھا سکھاتے تھے۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے عطا بن سائب سے انہوں نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم جب قرآن کی دس آیات سیکھتے تھے تو بعد والی دس آیات نہ سیکھتے تھے حتیٰ کہ ہم ان آیات کا حلال، حرام، امر اور نہی پہچان لیتے تھے۔ مؤطا امام مالک میں ہے، فرمایا: انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر آٹھ سال تک سورۂ بقرہ کو سیکھتے رہے۔ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الحافظ نے اپنی کتاب المسمی میں مرداس بن محمد ابو بلال اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عمر نے بارہ سال میں سورۂ بقرہ سیکھی جب اسے ختم کیا تو ایک اونٹ ذبح کیا(1)۔ ابو بکر انباری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے محمد بن شہریار نے بتایا ہمیں حسین بن اسود نے بتایا ہمیں عبید اللہ بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے زیاد بن ابو مسلم ابو عمرو سے روایت کیا انہوں نے زیاد بن مخراق سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم پر قرآن کے الفاظ حفظ کرنا مشکل تھا اور ہم پر اس پر عمل کرنا آسان تھا اور ہمارے بعد والوں پر قرآن کا حفظ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ابراہیم بن موسیٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں فضل بن دکین نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: اس امت کی ابتدا میں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کوئی فاضل قرآن سے ایک سورت وغیرہ یاد کرتا تھا اور انہیں قرآن پر عمل بخشا گیا تھا اور اس امت کا آخر ان میں بچے، بوڑھے اور اندھے قرآن پڑھیں گے اور انہیں عمل کی توفیق نہ ہوگی۔ مجھے حسن بن وہاب، ابو محمد بن ابی عنبر نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو بکر بن حماد مقری نے بتایا فرمایا: میں نے خلف بن ہشام البزار سے سنا وہ فرما رہے تھے: میں گمان کرتا ہوں ہمارے ہاتھوں میں قرآن خالی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے سورۂ بقرہ دس سے زائد سالوں میں یاد کی پھر جب حفظ کر لی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک اونٹ ذبح کیا اور ہمارے زمانہ میں ایک بچہ میرے سامنے بیٹھتا ہے اور تہائی قرآن تلاوت کر لیتا

1۔ شعب الایمان، بیہقی، 1957

ہے اس سے ایک حرف بھی نہیں چھوڑتا میرا خیال ہے ہمارے سامنے قرآن خالی ہے۔ محدثین نے کہا: طالب علم کے لئے مناسب نہیں کہ حدیث کو سمجھے بغیر صرف یاد کرے اور لکھے۔ ورنہ وہ لا حاصل کام میں اپنے نفس کو تھکانے والا ہو گا، اس کا حدیث کی حفاظت کرنا بتدریج تھوڑا تھوڑا اور دن اور رات میں ہو۔ یہ شعبہ، ابن علیہ اور معمر جیسے محدثین سے مروی ہے۔ معمر نے کہا: میں نے زہری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو اکٹھا علم حاصل کرے گا اکٹھا ہی ضائع کرے گا۔ علم کو ایک ایک دو دو حدیث یاد کر کے حاصل کیا جائے۔ واللہ اعلم۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا: تم جو چاہو علم حاصل کرو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے علم پر ہرگز اجر نہ دے گا حتیٰ کہ تم عمل کرو۔ ابن عبدالبر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاذ کے قول کی مثل عباد بن عبدالصمد کی روایت سے مروی ہے اس میں یہ زیادتی ہے کہ علماء کی ہمت (ارادہ) درایت ہے اور سفہاء (بیوقوفوں) کا ارادہ رِوایت ہے۔ انہوں نے موقوف روایت کی ہے اور موقوف اس کی روایت سے اولیٰ ہے جنہوں نے مرفوع روایت کی ہے۔ عباد بن عبدالصمد ان لوگوں میں سے نہیں جن سے حجت پکڑی جائے۔ کتنا اچھا کہا ہے جس نے علم کی فضیلت، کتاب عزیز و روشن سنت کے شرف کے بارے میں کہا ہے۔ عربی اشعار۔

ترجمہ: علوم اگرچہ ان کے محاسن عظیم ہیں ان سب کا تاج وہ ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کی حفاظت وہ خود کرتا ہے، اس کے بعد وہ علم ہے جس نے تکالیف کو دور کیا۔ وہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اس میں نبوت کا نور ہے، شریعت اور ادب ہے۔ اس کے بعد علوم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو اے علم کو ترجیح دینے والے! تو اپنے لئے اختیار کر اور علم خزانہ ہے تو اس کو معادن میں پائے گا اے طالب! تلاش کر اور کتب کا مطالعہ کر اور کتاب اللہ کو سمجھ کر پڑھ اس میں تمام علوم ہیں اس میں غور و فکر کرنے سے عجب چیزیں دیکھے گا۔ اور پڑھ، حدیث مصطفیٰ سے تجھے ہدایت کی گئی ہے اور اپنے مولا سے سوال کر جو تیری خواہش ہو وہ تیری ہر خواہش پوری کرے گا۔ جس نے دین کے علم کا ذائقہ چکھا وہ خوش ہوا، اس نے بیان کیا تو علم میں اضافہ ہوا اور خوش ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا جو آسان ہو وہ پڑھو

مسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی غفار کے غدیر کے پاس تھے۔ جبریل امین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر ایک حرف پر پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر دوبارہ جبرئیل امین آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ دو حرفوں پر تلاوت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین تیسری مرتبہ آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر تین حروف پر پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین چوتھی مرتبہ آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر قرآن سات

حروف پر پڑھیں۔ جس حرف پر پڑھیں گے، درست ہوگا (1)۔ ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ جبریل امین سے ملے اور کہا: اے جبریل! مجھے ایک امی امت کی طرف بھیجا گیا ہے، اس میں بوڑھے، شیخ کبیر، غلام، لونڈی اور وہ افراد ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔ جبریل نے کہا: اے محمد! قرآن سات حروف پر اتارا گیا ہے (2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری، مسلم، موطا، ابوداؤد، نسائی وغیرہ امہات الکتب جو مصنفات اور مسندات میں سے لکھی گئی ہیں ان میں حضرت ہشام بن حکیم کا واقعہ مذکور ہے (☆)، باب کے آخر میں مکمل طور پر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

''سات حروف پر نازل ہونے'' کے متعلق علماء کے پینتیس اقوال ہیں، ان کو ابو حاتم محمد بن حبان بستی نے ذکر کیا ہے۔ ہم ان میں سے اس کتاب میں صرف پانچ اقوال ذکر کریں گے۔

پہلا قول: یہ وہ قول ہے جس پر اکثر اہل علم ہیں مثلاً حضرات سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن وہب، طبری، طحاوی وغیرہم۔ اس سے مراد مختلف الفاظ کے ساتھ متقارب معانی کی سات وجوہ مراد ہیں مثلاً اقبل، تعال اور ھلم (ان سب کا معنی ہے آؤ)۔ طحاوی نے کہا: ابوبکرہ کی حدیث میں جو ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ فرمایا: جبریل امین نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ایک حرف پر پڑھو اور میکائیل نے کہا: حضور ﷺ کو مزید دو تو جبریل نے کہا: دو حروف پر پڑھو۔ میکائیل نے کہا: مزید دو حتیٰ کہ سات حروف تک پہنچے اور کہا: پڑھو، ہر ایک شافی اور کافی ہے مگر آیت رحمت، آیت عذاب سے یا آیت عذاب، آیت رحمت سے خلط ملط نہ ہو، جیسے ھلم، تعال، اقبل، اذھب، اسرع، عجل۔

ورقاء نے ابن ابی نجیح سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے وہ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا (الحدید: 13) کو للذین آمنوا امھلونا، للذین آمنوا اخرونا، للذین آمنوا ارقبونا پڑھتے تھے۔ اسی سند کے ساتھ ابی سے مروی ہے کہ وہ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ (البقرہ: 20) مروا فیہ، سعوا فیہ پڑھتے تھے۔ بخاری اور مسلم میں ہے زہری نے کہا: یہ حروف ایک امر میں حرام، حلال میں مختلف نہیں ہوتے۔ طحاوی نے کہا: حروف میں لوگوں کے لئے وسعت رکھی گئی کیونکہ وہ دوسروں کی لغت پر قرآن حاصل کرنے پر عاجز تھے کیونکہ وہ امی تھے لکھنا نہیں جانتے تھے مگر تھوڑے جب کسی ایک لغت والے پر گراں ہوتا کہ وہ دوسری لغت کی طرف پھرے، اگر وہ اس کا قصد کرتا تو اس کے لئے بہت عظیم مشقت ہوتی۔ پس ان کے لئے الفاظ کے اختلاف میں وسعت پیدا کی گئی جبکہ معنی ایک ہو۔ وہ اسی نہج پر تھے حتیٰ کہ ان میں سے لکھنے والے زیادہ ہو گئے اور ان کی لغات رسول اللہ ﷺ کی لغت کی طرف پھر گئیں۔ پس وہ آپ کے الفاظ کی حفاظت پر قادر ہو گئے۔ پس اس وقت انہیں اس کے خلاف پڑھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ابن عبد البر نے کہا: اس سے ظاہر ہوا کہ یہ سات حروف ایک خاص وقت میں ضرورت کے لئے تھے جن کا تقاضا موجود تھا۔ پھر یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق به، باب بیان القرآن علی سبعة احرف

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءة، حدیث 2868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ صحابی بن صحابی یعنی حکیم بن حزام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں وصال فرمایا، السیر، جلد 3، صفحہ 51

ضرورت ختم ہوگئی اور سات حروف والا حکم بھی اٹھ گیا اور ایک حرف پر پڑھنا واپس آ گیا۔

ابو داؤد نے حضرت ابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے قرآن پڑھایا گیا، مجھے کہا گیا ایک یا دو حروف پر؟ فرشتہ جو میرے ساتھ تھا اس نے کہا: تم کہو دو حرفوں پر۔ پھر مجھے کہا گیا: دو حرفوں پر یا تین حروف پر؟ میرے ساتھی فرشتے نے کہا: تم کہو تین حروف پر حتیٰ کہ سات حروف پر معاملہ پہنچا۔ پھر کہا: اس میں سے کوئی حرف نہیں ہے مگر شافی وکافی ہے۔ اگر تو کہے: سمیعًا، علیمًا، عزیزًا، حکیمًا جب تک کہ آیت عذاب آیت رحمت سے یا آیت رحمت آیت عذاب سے خلط ملط نہ ہو(1)۔ ثابت بن قاسم نے اس حدیث کی مثل حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود کے کلام سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے کہا: جب یہ روایت (یعنی حدیث ابی) ثابت ہے تو یہ اس پر محمول ہوگا کہ پہلے حکم مطلق تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ پس لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ان کی جگہ سے بدلنا جائز نہیں خواہ ان کا معنی موافق ہو یا مخالف ہو۔

دوسرا قول: بعض علماء نے کہا: یہ سات لغات قرآن میں ہیں تمام عربوں کی لغات پر یعنی ان کے یمنی ونزار قبائل کی لغات۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ان لغات میں سے ہر ایک لغت جانتے تھے آپ کو جوامع الکلم کی شان دی گئی تھی۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ ایک حرف میں سات وجوہ ہیں لیکن یہ سات لغات قرآن میں متفرق ہیں۔ اس کا بعض لغت قریش پر ہے بعض لغت ہذیل پر ہے بعض لغت ہوازن پر ہے بعض لغت یمن پر ہے۔ خطابی نے کہا: قرآن میں جو الفاظ سات وجوہ پر پڑھے گئے وہ یہ ہیں وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ (المائدہ:60) اور مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ (یوسف:12) پھر خطابی نے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ گویا خطابی کا نظریہ ہے کہ بعض الفاظ سات حروف پر نازل کئے گئے ہیں نہ کہ تمام۔ اس قول کے مطابق قرآن سات حروف پر آیا ہے یعنی سات لغات پر اترا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام اور ابن عطیہ کا یہی نظریہ ہے۔ ابو عبید نے کہا: بعض قبائل نے بعض سے زیادہ حصہ پایا۔ ابن شہاب کی حدیث حضرت انس سے روایت کی گئی کہ حضرت عثمان نے جب انہیں قرآن کے نسخے لکھنے کا حکم دیا تو فرمایا: جب تم اور زید اختلاف کرو تو لغت قریش میں لکھو، کیونکہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا ہے(2)۔ یہ بخاری نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے۔ فرمایا: قرآن کعبین کی لغت میں نازل ہوا۔ کعب قریش اور کعب خزاعہ۔ بعض علماء نے کہا: یہ کیسے ہے؟ فرمایا: کیونکہ گھر ایک ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یعنی خزاعہ قریش کے پڑوسی ہیں انہوں نے ان کی لغت سے لیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: حضرت عثمان کے قول "قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اکثر حصہ اور زیادہ حصہ ان کی زبان پر نازل ہوا اور کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ سارا قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا کیونکہ اس میں ایسے کلمات اور حروف ہیں جو قریش کی لغت کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف، حدیث نمبر 1262، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب نزل القرآن بلسان قریش، حدیث نمبر 3244، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الزخرف: 3) یہ نہیں فرمایا کہ قرآنا قرشیا۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن عربوں کی تمام زبانوں پر نازل ہوا۔ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ عربوں میں سے دوسروں کو چھوڑ کر قریش کا ارادہ کرے جیسا کہ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عدنان کی لغت کا ارادہ فرمایا نہ کہ قحطان کا، یا ربیعہ کا ارادہ فرمایا نہ کہ مضر کا، کیونکہ عرب کا اسم تمام قبائل کو مکمل شامل ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: جس نے کہا قرآن لغت قریش کے مطابق نازل ہوا میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ زیادہ لغت قریش پر نازل ہوا کیونکہ لغت قریش کے علاوہ بھی صحیح قراءت میں موجود ہیں مثلاً ہمزات وغیرہ کا موجود ہونا اور قریش ہمزہ نہیں پڑھتے۔ ابن عطیہ نے کہا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ (قرآن سات حروف پر نازل ہوا) اس کا مطلب ہے سات قبائل، تمام کی لغت کے مطابق قرآن نازل ہوا، اس کے معنی کو کبھی قریش کی عبارت سے کبھی ہذیل کی عبارت سے کبھی دوسرے قبائل کی عبارت سے تعبیر فرمایا، لفظ میں جو افصح اور ایجاز کے مطابق تھا۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فَطَرَ کا معنی قریش کے علاوہ کے نزدیک ابتدا ہے اس نے چیز کو پیدا کیا اور کام پر لگایا پھر قرآن میں آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سمجھ نہ آیا حتیٰ کہ دو اعرابی ان کے پاس ایک کنویں کے بارے میں جھگڑا لے آئے تو ایک نے کہا: انا فطرتھا (میں نے اسے کھودا تھا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس وقت مجھے فاطر السموات والارض کا معنی سمجھ آیا۔ اسی طرح فرمایا میں رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (اعراف: 89) کا معنی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ میں نے ذی یزن کی ایک عورت کو اپنے خاوند کو یہ کہتے ہوئے سنا تعال افاتحك یعنی میں تیرا فیصلہ کروں، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب نے کہا وہ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (النحل: 47) کا معنی نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح قطبہ بن مالک کے لئے اتفاق ہوا جب اس نے نبی کریم ﷺ کو وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ (ق: 10) پڑھتے ہوئے سنا۔ یہ مسلم نے باب القراءۃ فی صلاۃ الفجر میں ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں۔

تیسرا قول: یہ سات لغات مضر قبیلہ میں تھیں۔ یہ ایک قوم کا خیال ہے اور انہوں نے حضرت عثمان کے اس قول سے حجت پکڑی ہے قرآن مضر کی لغت میں نازل ہوا اور انہوں نے کہا: یہ بھی جائز ہے اس میں سے قریش، کنانہ، اسد، ہذیل، تیم، ضبہ اور قیس کی لغات ہوں۔ وہ کہتے ہیں: یہ مضر کے قبائل ہیں وہ سات لغات کو ان مراتب پر گھیرے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود پسند کرتے تھے کہ مصاحف لکھنے والے مضر قبیلہ سے ہوں، دوسروں نے انکار کیا کہ تمام مضر قبیلہ سے ہوں اور انہوں نے کہا مضر قبیلہ میں شواذ ہیں ان کے ساتھ قرآن کو پڑھنا جائز نہیں مثلاً کشکشۃ، قیس، تمتمۃ تمیم، رہا کشکشۃ قیس تو وہ مؤنث کی کاف کو شین بنا دیتے ہیں اور وہ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (مریم: 24) کو جعل ربش تحتش سریا پڑھتے ہیں اور رہا تمتمۃ تمیم تو وہ الناس کو النات اور اکیاس کو اکیات پڑھتے ہیں۔ یہ لغات ہیں، ان کے ساتھ قرآن کا پڑھا جانا درست نہیں اور نہ سلف سے اس کے متعلق کوئی چیز محفوظ ہے۔

دوسرے کہتے ہیں: رہا ہمزہ کو عین سے بدلنا اور حروف حلقیہ کو ایک دوسرے سے بدلنا تو فصحاء سے مشہور ہے اور اس کے ساتھ بڑے بڑے قراء نے پڑھا ہے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت سے حجت پکڑی ہے۔ لیسجننہ عتی حین انہوں نے پڑھا ہے اور یہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اور ان علماء نے ذی الرمہ کے قول سے حجت پکڑی ہے۔

فعيناك عيناها و جيدك جيدها ولونك الا عنها غير طائل

عنہا سے مراد انہا ہے۔

چوتھا قول: یہ صاحب الدلائل نے بعض علماء سے حکایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے اسی طرح حکایت کیا ہے۔ فرمایا: تو قرأت میں اختلاف کی وجوہ میں غور کرے گا تو انہیں سات ہی پائے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس میں حرکت تبدیل ہوتی ہے اور معنی زائل نہیں ہوتا اور صورت بھی نہیں بدلتی۔ مثلاً هن اطهرُ لكم، و اطهرَ، و يضيقُ صدری، و يضيقَ، بعض میں صورت نہیں بدلتی، اعراب کے ساتھ معنی بدل جاتا ہے مثلاً ربنا باعِدْ بين اسفارنا، و باعَدَ بعض میں صورت باقی رہتی ہے حروف کے اختلاف کے ساتھ معنی تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً ننشزها و ننشرها، بعض میں صورت بدلتی ہے اور معنی باقی رہتا ہے جیسے كالعهن المنفوش و كالصوف المنفوش، بعض میں صورت اور معنی دونوں بدل جاتے ہیں مثلاً و طلح منضود و طلع منضود اس میں تقدیم و تاخیر ہے جیسے و جاءت سكرة الموت بالحق اور جاءت سكرة الحق بالموت۔ زیادہ اور کمی کے ساتھ جیسے تسع و تسعون نعجة انثى اور یہ قول اما الغلام فكان كافراً و كان ابواه مومنين۔ اور یہ قول فان الله من بعد اكراههن لهن غفور، رحيم۔

پانچواں قول: سات حروف سے مراد کتاب اللہ کے معانی ہیں۔ یہ امر، نہی، وعدہ، وعید، قصص مجادلہ اور امثال ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ اس کو احرف سے تعبیر نہیں کیا جاتا اور اس پر اجماع ہے کہ حلال کی حلت میں اور معانی میں سے کسی معنی کو تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں۔ قاضی ابن طیب نے اس معنی میں ایک حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ پھر فرمایا لیکن یہ ایسی صورت نہیں جس کے ساتھ قراءت کی اجازت دی ہو۔ اس صورت میں حرف بمعنی جہت اور طریقہ ہوگا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج: 11) پس اسی طرح اس حدیث کا معنی ہو سات طریقے جیسے تحلیل، تحریم وغیرہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس ارشاد (سات حروف پر قرآن نازل ہوا) کا مطلب وہ سات قراءتیں ہیں جو سات قراء نے پڑھی ہیں کیونکہ وہ تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت سے مروی ہیں اور یہ قول بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کا بطلان ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

فصل: بہت سے علماء مثلاً داؤدی، ابن ابی صفرہ وغیرہما نے فرمایا: یہ سات قراءتیں جو ان سات قراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہ وہ سات حروف ہیں جن کے ساتھ قرأت میں صحابہ کو رعایت دی گئی۔ یہ سات میں سے ایک حرف کی طرف راجع ہیں۔ یہ وہ ہے جس پر حضرت عثمان نے مصحف کو جمع فرمایا۔ یہ ابن نحاس وغیرہ نے ذکر فرمایا۔ یہ مشہور قراءتیں ان ائمہ قراء کے اختیارات ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اس کو اختیار فرمایا جو مروی تھا اور اس کی وجہ معلوم تھی اور اس کے نزدیک وہ احسن اور اولیٰ تھی۔ پس اس نے اس کا التزام کیا۔ پس اس نے اس کو روایت کیا اور اس کے ساتھ پڑھا اور اس سے وہ قرأت مشہور ہوئی، اس سے معروف ہوئی اور اس کی طرف منسوب ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: حرف نافع، حرف ابن کثیر۔ ان میں سے کسی نے دوسرے کے اختیار کو منع نہیں فرمایا اور نہ اس کا انکار کیا بلکہ اس کو جائز قرار دیا۔ ان ساتوں میں ہر ایک سے دو یا دو سے زیادہ اختیار بھی

مروی ہیں اور سب صحیح ہیں۔

مسلمانوں کا اس زمانہ میں ان ائمہ سے جو صحیح مروی ہے اس پر اعتماد کرنے میں اجماع ہے۔ جو کچھ انہوں نے روایت کیا اور جو انہوں نے قراءت میں سے جو رائے قائم کی اور انہوں نے اس کے متعلق تصانیف لکھیں اور درست بات پر اجماع قائم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو حفظ کتاب کا وعدہ فرمایا وہ پورا ہوا۔ یہی نظریہ متقدمین فضلاء محققین کا ہے جیسے قاضی ابوبکر بن طیب اور طبری وغیرہما۔ ابن عطیہ نے کہا سات قراءتوں پر زمانہ گزر چکا ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے، کیونکہ یہ اجماع سے ثابت ہیں اور رہی شاذ قراءتیں تو ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جاتی، کیونکہ لوگوں کا اس پر اجماع ہے اور ان شاذ قراءتوں میں سے جو صحابہ سے اور علماء تابعین سے مروی ہیں، ان میں اعتقاد نہیں کیا جاتا مگر انہوں نے اس کو روایت کیا ہے اور جو ابو السال اور ان کے ہم عصر علماء سے مروی ہے اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مصاحف متواترہ سے شاذ قراءتیں قرآن میں ہیں ان کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا کہ یہ اس میں سے ہیں۔ اور اس کا بہترین محمل یہ ہے کہ وہ اس شخص کے مذہب کی تاویل کا بیان ہیں جن کی طرف وہ قراءت منسوب کی گئی ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت فصیام ثلاثۃ ایام متابعات اگر راوی رسول اللہ ﷺ سے سماع کی صراحت کرے تو پھر بھی دو اقوال کے مطابق اس پر عمل میں اختلاف ہے یعنی ایک قول نفی میں ہے اور ایک قول اثبات میں ہے۔ نفی کی وجہ یہ ہے کہ راوی نے خبر کے مطابق روایت نہیں کیا بلکہ قرآن کے مطابق روایت کیا۔ وہ ثابت نہیں ہے تو قرآن ہونا ثابت نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن ہونا ثابت نہیں ہے تو سنت ہونا ثابت ہوا۔ اس پر عمل کرنا، دوسری اخبار احاد کی طرح ہوگا۔

فصل: حضرت عمر اور ہشام کی حدیث کے معنی کا ذکر

ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ان سات حروف پر پڑھنا مباح فرمایا ہے۔ جبریل امین نے یہ سات حروف پیش کئے اور اس طریقہ پر پیش کئے جس میں اعجاز اور عمدگی تھی اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل: 20) کے ارشاد سے یہ اباحت ثابت نہیں کہ ہر صحابی جب چاہے بعض الفاظ کو بعض سے بدلنا چاہے تو اپنی طرف سے بدل دے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا اعجاز ختم ہو جاتا اور ہر ایک حرف دوسرے سے بدل دیا جاتا اور قرآن وہ نہ رہتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ان سات حروف میں اباحت واقع ہوتی تھی تاکہ اس کے ساتھ اپنی امت پر وسعت پیدا کریں۔ کبھی تو آپ نے حضرت ابی کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے، کبھی حضرت ابن مسعود کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمر کی سورۂ فرقان کی قراءت اور ہشام بن حکیم کی قراءت واقع ہوئی ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ نبی کریم ﷺ ہر قراءت کے بارے فرماتے جو مختلف تھیں مجھے جبریل نے اسی طرح پڑھائی ہے، یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ نے کبھی اس طرح پڑھی ہو اور کبھی اس طرح پڑھی ہو۔ اس پر حضرت انس کا قول محمول ہوگا جب انہوں نے پڑھا ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ و اصوب قیلاً واھیأ۔ ان سے کہا گیا: ہم تو اقوم قیلاً پڑھتے ہیں۔ حضرت انس نے کہا: اصوب قیلاً اور اقوم قیلاً و اھیأ ایک ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ ورنہ اگر لوگوں میں

سے کسی لے لئے ایسا کرنا درست ہوتا تو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) کا معنی باطل ہو جاتا۔ بخاری اور مسلم وغیرہما نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان اس انداز میں پڑھتے سنا جو میرے پڑھنے کے انداز سے مختلف تھا او۔ مجھے یہ سورت خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں ہشام پر جھپٹ پڑتا پھر میں نے اسے مہلت دی حتیٰ کہ اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کو چادر سے پکڑ لیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کو سورۂ فرقان اپنے سے مختلف انداز میں پڑھتے ہوئے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: پڑھو، اس نے اس طریقہ پر پڑھی جس پر پڑھتے ہوئے میں نے اسے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے فرمایا: تم پڑھو۔ میں نے پڑھی تو فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے، یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جو ان میں سے آسان ہو اس پر پڑھو (1)۔ میں کہتا ہوں: حضرت عمر کی اس حدیث کے معنی میں مسلم کی روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے، فرمایا: میں مسجد میں تھا۔ ایک شخص داخل ہوا اور نماز پڑھنا شروع کی۔ اس نے ایسی قراءت کی جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ پھر دوسرا شخص آیا اس نے پہلے ساتھی کے علاوہ طریقہ پر قراءت کی۔ جب ہم نے نماز مکمل کر لی تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: اس نے ایسی قراءت کی ہے جس کا میں نے انکار کیا ہے۔ دوسرا داخل ہوا اس نے اس قراءت سے مختلف قراءت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: پڑھو۔ ان دونوں نے پڑھا تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی تحسین فرمائی۔ میرے دل میں ہیبت و حیرت واقع ہوئی۔ تکذیب کی وجہ سے میں چونکہ زمانہ جاہلیت میں ایسا نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ میری کیفیت دیکھ کر پہچان گئے۔ انہوں نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا، تو میرا پسینہ نکل آیا گویا میں اللہ تعالیٰ کی طرف خوف سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے یہ پیغام بھیجا گیا ہے کہ میں ایک حرف پر قرآن پڑھوں۔ میں نے بات لوٹائی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ پھر دوبارہ پیغام آیا کہ دو حروف پر قراءت کرو۔ میں نے عرض کی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ تیسری دفعہ پیغام آیا کہ سات حروف پر قراءت کرو۔ پس تیرے لیے ہر بار لوٹانے کے بدلے میں ایک دعا کا موقع ہے جو آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کی: اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما، اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما اور تیسری مرتبہ کو میں نے اس دن کے لئے مؤخر کر دیا جس دن ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی (2)۔

حضرت ابی کا قول: فسقط فی نفسی کا معنی ہے مجھے حیرت اور دہشت لاحق ہوئی یعنی شیطان کا حملہ ہوا کہ اس پر ان کا حال مشوش کرے اور اس پر اس کا وقت مکدر کر دے کیونکہ شیطان نے قرآن کے اختلاف کو ان پر عظیم بنا دیا جو حقیقت میں ایک عظیم مسئلہ نہ تھا اور نہ اختلاف قراءت سے کون سا حال اور تکذیب لازم آتی ہے اور یہ چیز الحمد للہ نسخ میں بھی لازم نہ آتی جو اس

1۔ صحیح بخاری، باب انزل القرآن علی سبعة احرف، حدیث نمبر 4608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب بیان ان القرآن علی سبعة احرف

سے عظیم تھا تو قراءت میں یہ کیسے آسکتی تھی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیفیت بدلتی ہوئی دیکھی تو اس کے سینہ پر ہاتھ مار کر اسے تنبیہ فرمائی تو اس کے بعد حضرت ابی کا سینہ کھل گیا اور باطن روشن ہو گیا حتیٰ کہ کشف اور شرح معاینہ کی حالت کی طرف لوٹ گیا۔ جب دل کی قبح ان پر ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ سے حیا کی وجہ سے پسینہ میں ڈوب گئے۔ اس شخص کا دل بھی اسی قبیل سے تھا جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اپنے نفسوں میں ایسی کیفیت پاتے ہیں ہم میں سے کوئی اس کو بیان کرنا بھی برا سمجھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ایسی کیفیت پاتے ہو؟ صحابہ نے کہا: ہاں، فرمایا: یہ صریح ایمان ہے (1)۔ یہ حدیث مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ مزید کلام سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قرآن جمع کرنے کا ذکر، حضرت عثمان کا قرآن کے نسخے لکھوانے کا سبب اور باقی نسخے جلانے کا ذکر، صحابہ میں سے حفاظ قرآن کا ذکر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مردوں کے سینوں میں متفرق تھا اور کچھ صحیفوں میں تھا۔ کچھ کھجور کے پتوں پر تھا، کچھ لخاف اور ظرر پر اور کچھ ٹھیکریوں وغیرہ پر تھا۔ اصمعی نے کہا: لخاف سفید باریک پتھر کو کہتے ہیں اور اس کا واحد لخفة ہے اور الظرر اس پتھر کو کہتے ہیں جس کی چھری کی طرح دھار ہوتی ہے اس کی جمع ظرار ہے جیسے رطب کی جمع رطاب ہے، ربع کی جمع رباع ہے اور اس کی جمع ظران بھی ہے جیسے صرد کی جمع صردان ہے۔ جب حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں قراء کی شہادت زیادہ ہوئی اس جنگ میں سات سو قراء شہید ہوئے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کو قرآن جمع کرنے کا مشورہ دیا کہ بوڑھے قراء فوت نہ ہو جائیں جیسے حضرات ابی، ابن مسعود اور زید رضی اللہ عنہم تو ان دونوں حضرات نے حضرت زید بن ثابت کو اس کام کے لئے بلایا۔ انہوں نے بڑی مشقت کے بعد سورتوں کی ترتیب کے بغیر قرآن کو جمع کیا۔ بخاری نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنگ یمامہ کے موقع پر مجھے حضرت ابوبکر نے بلایا (میں پہنچا) تو حضرت عمر بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: حضرت عمر میرے پاس آئے اور کہا: جنگ یمامہ میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قراء بہت سے مواقع پر شہید ہو گئے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا مگر یہ کہ تم قرآن کو جمع کر لو۔ میرا خیال ہے کہ تم قرآن کو جمع کرو۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے حضرت عمر کو کہا: میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے۔ حضرت عمر مجھ پر یہ بات بار بار لوٹاتے رہے حتیٰ کہ اس کے لئے اللہ نے میرا سینہ کھول دیا۔ میں نے بھی وہ رائے قائم کر لی جو حضرت عمر کی تھی۔ حضرت زید نے کہا جبکہ حضرت عمر ان کے پاس خاموش بیٹھے تھے حضرت ابوبکر نے مجھے کہا: تو ایک نوجوان، عقلمند شخص ہے اور تجھ پر کوئی تہمت نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وحی لکھتا رہا ہے تم قرآن کو تلاش کرو اور جمع کرو۔ اللہ کی قسم! اگر حضرت ابوبکر مجھے پہاڑوں میں سے کوئی پہاڑ نقل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان

کرنے کا حکم دیتے تو مجھ پر وہ اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا کہ مجھے حضرت ابوبکر نے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے کہا: تم دونوں وہ کام کیسے کرتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے میں بار بار یہ بات لوٹاتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا اس کام کے لئے جس کے لیے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا سینہ کھول دیا تھا، میں نے قرآن کو تلاش کیا اور میں کپڑوں سے، کندھوں کی ہڈیوں سے، کھجور کے پتوں سے اور مردوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کرنے لگا حتیٰ کہ میں نے سورۂ توبہ کی دو آیتیں صرف خزیمہ انصاری کے پاس پائیں جو میں نے کسی اور کے پاس نہ پائیں۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ (التوبہ)

وہ صحیفے جن میں قرآن جمع کیا گیا تھا وہ پہلے حضرت ابوبکر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت عمر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس رہے۔ لیث نے کہا: مجھے عبدالرحمٰن بن غالب نے ابن شہاب سے روایت کر کے بتایا کہ ابوخزیمہ انصاری کے پاس وہ آیات تھیں، ابو ثابت نے کہا: ہمیں ابراہیم نے بتایا وہ خزیمہ کے پاس یا ابوخزیمہ کے پاس تھیں: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ (توبہ) امام ترمذی نے اپنی حدیث میں، حضرت زید سے روایت کیا کہ میں نے سورہ برأت کی آخری آیات خزیمۃ بن ثابت کے پاس پائیں لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ (التوبہ) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

بخاری میں حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، فرمایا: جب ہم نے مصاحف میں صحیفوں کو نقل کیا تو میں نے سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ میں نے کسی کے پاس وہ آیت نہ پائی مگر خزیمہ انصاری کے پاس، جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی شہادت کے قائم مقام بنایا تھا۔ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ (الاحزاب: 23) (2) امام ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنتا تھا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ (الاحزاب: 23) میں نے اس کو تلاش کیا تو میں نے اسے خزیمہ انصاری یا ابو خزیمہ کے پاس پایا پھر میں نے اسے اس سورت سے لاحق کر دیا (3)۔ میں کہتا ہوں: پہلی آیت سورۂ برأت کے آخر سے پہلی مرتبہ جمع کرنے کے وقت ساقط تھی جیسا کہ بخاری اور ترمذی نے کہا اور دوسری مرتبہ جمع کرنے کے وقت سورۂ احزاب کی آیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب لقد جاء کم رسول من انفسکم، حدیث نمبر 4311، جامع ترمذی، حدیث 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، حدیث نمبر 4411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

موجود نہ تھی۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ آیت برأت آخری جمع کے وقت ساقط تھی۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم، اگر یہ کہا جائے کہ کیا وجہ تھی کہ حضرت عثمان نے اپنے مصحف پر لوگوں کو جمع کیا حالانکہ حضرت ابوبکر اس کام کو پہلے سرانجام دے چکے تھے اور وہ اس کام سے فارغ ہو چکے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان نے جو کیا ان سے ان کا مقصد مصحف کی تالیف پر لوگوں کو جمع کرنا نہ تھا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے کس طرح حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ ہماری طرف صحیفہ بھیجو ہم اس کو دوسرے مصاحف میں نقل کریں گے پھر تمہیں اپنا صحیفہ واپس کر دیں گے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت عثمان نے یہ اس لئے کیا تھا کہ لوگ قراءتوں میں اختلاف کرنے لگ گئے تھے کیونکہ صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اس میں صورت حال گھمبیر ہو گئی تھی اور اختلاف وانتشار بڑھ گیا تھا اور اہل شام اور عراق کے درمیان وہ واقع ہوا جو حضرت حذیفہ نے ذکر فرمایا۔ یہ اس طرح ہوا کہ وہ غزوہ ارمینیہ میں جمع ہوئے تو ہر طائفہ نے اس کے مطابق قراءت کی جو اسے روایت کیا گیا تھا۔ آپس میں اختلاف کرنے لگے اور جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے اور ایک دوسرے سے برأت اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ نے یہ منظر دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ جب مدینہ طیبہ آئے تو اپنے گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان کے پاس آئے۔ عرض کی: اس امت کی چارہ سازی کیجئے اس سے پہلے کہ یہ ہلاک ہو جائے۔ حضرت عثمان نے پوچھا: کیا ہوا؟ حضرت حذیفہ نے کہا: اللہ کی کتاب کے بارے جھگڑا ہوا۔ میں اس غزوہ میں موجود تھا۔ لوگ اس غزوہ میں عراق، شام اور حجاز سے جمع ہوئے تھے پھر سارا واقعہ بیان کیا، اور فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کے بارے میں اس طرح اختلاف کریں گے جس طرح یہود ونصاریٰ نے اختلاف کیا تھا(1)۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علماء کے قول کے بطلان پر بڑی واضح دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ سات حروف سے مراد سات قراء کی قراءتیں ہیں کیونکہ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔ حضرت سوید بن غفلہ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے، حضرت عثمان نے کہا: تم مصاحف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو کیونکہ لوگ قراءت میں اختلاف کر چکے ہیں حتیٰ کہ کوئی کہتا ہے میری قراءت تیری قراءت سے بہتر ہے اور یہ کفر کے مشابہ ہے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عثمان نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ لوگ ایک قراءت پر جمع ہو جائیں، کیونکہ آج اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد آنے والے مزید اختلاف کریں گے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی رائے درست ہے۔ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ تم ہماری طرف قرآن کا نسخہ بھیجو ہم اس سے مزید نسخے تیار کرائیں گے پھر تمہیں اپنا مصحف واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہ نے وہ حضرت عثمان کی طرف بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ قرآنی نسخے نقل کریں۔ حضرت عثمان نے قریش کے گروہ کو کہا: جب تم اور زید بن ثابت قرآن کے متعلق کسی چیز کے بارے میں اختلاف کرو تو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے اس صحیفہ سے مزید مصاحف

1۔ جامع ترمذی، ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کر لئے تو حضرت عثمان نے وہ صحیفہ حضرت حفصہ کو واپس کر دیا۔ حضرت عثمان نے ہر علاقہ کی طرف ایک نسخہ بھیجا اور قرآن کے باقی جتنے صحیفے یا مصاحف موجود تھے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ یہ حضرت عثمان نے کام کیا جبکہ مہاجرین، انصار اور اجل اہل اسلام اس بات پر متفق ہو گئے ہیں اور حضرت عثمان نے ان سے مشورہ کر لیا تھا۔ پس وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو قرآن کی قراءت مشہورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس کو جمع کیا جائے اس کے علاوہ کو ترک کر دیا جائے۔ سب نے حضرت عثمان کی رائے کو درست کہا اور ان کی رائے پختہ اور صائب تھی۔ رضی اللہ عنہم۔ طبری نے اپنی روایت میں کہا: حضرت عثمان نے حضرت زید کے ساتھ ابان بن سعید بن العاص کو ملایا تھا یہ ضعیف ہے۔ بخاری، ترمذی وغیرہما نے جو کہا ہے وہی اصح ہے۔ طبری نے کہا: وہ صحیفہ جو حضرت حفصہ کے پاس تھا اسے اس آخری جمع میں امام ومقتداء بنایا گیا اور یہ صحیح ہے۔

ابن شہاب نے کہا: مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے کہا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے حضرت زید بن ثابت کے مصاحف نقل کرنے کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا: اے مسلمانوں کے گروہ! میں مصاحف کی نقل سے جدا ہوتا ہوں اس کام کا ایسا والی بنا ہے اللہ کی قسم! میں اسلام لا چکا تھا اور یہ ایک کافر شخص کی پیٹھ میں تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی مراد زید بن ثابت تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا تھا: اے اہل عراق! وہ مصاحف جو تمہارے پاس ہیں ان کو چھپا دو اور انہیں بند کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: 161) پس تم اللہ سے مصاحف کے ساتھ ملو۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اس پر مزید کلام سورۂ آل عمران میں ان شاء اللہ آئے گی (1)۔

ابو بکر انباری نے کہا: حضرت زید کو حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی طرف سے حضرت عبد اللہ بن مسعود پر جمع قرآن میں ترجیح نہ تھی۔ حضرت عبد اللہ، حضرت زید سے افضل تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے میں مقدم تھے اور زیادہ سبقت لے جانے والے تھے اور عظیم فضائل کے مالک تھے مگر حضرت زید حضرت عبد اللہ سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے کیونکہ انہوں نے سارا قرآن یاد کر لیا تھا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر حیات میں تھے اور حضرت عبد اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ستر سے زائد سورتیں آپ سے سیکھی تھیں پھر باقی سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سیکھی تھیں۔ پس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات میں قرآن ختم کر چکا تھا اور یاد کر چکا تھا وہ مصحف کو جمع کرنے میں اولیٰ تھا اور ایثار و اختیار کے لئے زیادہ حقدار تھا، کسی جاہل کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ پر طعن ہے کیونکہ حضرت زید ان سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے۔ پس یہ ان کے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے تقدم کا موجب ہے کیونکہ حضرات ابو بکر و عمر سے بھی حضرت زید قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے حالانکہ حضرت زید ان دونوں حضرات سے بہتر نہیں بلکہ فضائل و مناقب میں ان کے مساوی بھی نہیں۔ حضرت ابو بکر نے کہا: حضرت عبد اللہ کی طرف سے جو انکار وارد ہوا ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو غصہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس پر نہ عمل ہو گا نہ اس کو قبول کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد حضرت عثمان اور دوسرے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اختیار کو پہچان لیا اور پھر ان کی موافقت پر باقی رہے اور اختلاف

1۔ جامع ترمذی، ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3028، حضرت عبد اللہ بن مسعود کے ان الفاظ کو جلیل القدر صحابہ نے سخت ناپسند کیا تھا۔

ترک کر دیا۔ اور یہ اہل نقل و روایت کے نزدیک مشہور و معروف اور جانا پہچانا مسئلہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بقیہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حاصل کیا۔ بعض ائمہ نے فرمایا: حضرت عبداللہ قرآن ختم کرنے سے پہلے وصال فرما گئے۔ یزید بن ہارون نے کہا۔ المعوذتان (سورہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) سورۂ بقرہ اور آل عمران کے متعلق جو کہتا ہے کہ یہ قرآن سے نہیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والا ہے۔ حضرت زید سے کہا گیا حضرت عبداللہ کا ان سورتوں کے متعلق قول کا کیا ہوگا؟ حضرت زید نے فرمایا: مسلمانوں کے درمیان اختلاف نہیں کہ حضرت عبداللہ کا وصال ہو گیا تھا جبکہ انہوں نے ابھی سارا قرآن یاد نہیں کیا تھا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، اس کی وضاحت آگے آئے گی، اسماعیل بن اسحاق وغیرہ نے کہا حضرت حماد نے کہا: میرا خیال ہے حضرت مالک بن انس سے انہوں نے روایت کیا ہے؟ فرمایا: لوگ ایک آیت کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے: فلاں بن فلاں کو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی تھی۔ پھر مدینہ طیبہ سے وہ تین راتوں کی مسافت پر ہوتا تو اسے لایا جاتا اور اسے کہا جاتا: تجھے فلاں فلاں آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے کیسے پڑھائی تھی۔ پس وہ جس طرح کہتا لوگ لکھ لیتے تھے۔ ابن شہاب نے کہا: اس دن تابوت میں اختلاف ہوا۔ حضرت زید نے کہا: یہ التابوہ ہے۔ حضرات ابن زبیر، سعید بن العاص نے کہا: التابوت ہے۔ یہ اختلاف حضرت عثمان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسے تاء کے ساتھ لکھو کیونکہ قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا۔ اس روایت کو بخاری اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت زید نے ھاء کے ساتھ پڑھا اور قریشیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا تو انہوں نے تاء کے ساتھ لکھا۔ مصاحف اسی طریقہ پر لکھے گئے تھے جس طرح پہلے تھے حضرت عثمان نے ان سے نقل کروائی۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ نئے نسخے جو تیار کئے گئے تھے وہ سات تھے۔ بعض نے کہا: چار تھے۔ یہ اکثر کا قول ہے اور یہ نسخے مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ عراق، شام اور مصر اصل نسخے بھیجے گئے۔ پس ان شہروں کو قراء نے اپنے اختیارات کا معتمد بنایا اور ان میں سے کسی نے مصحف کی مخالفت نہ کی جس طرح کہ انہیں وہ پہنچا۔ اور جو سات قراء میں حروف میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض زیادہ کرتے ہیں بعض کم کر دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس پر اعتماد کرتا تھا جو اسے پہنچا تھا اور انہوں نے جو روایت کیا تھا کیونکہ حضرت عثمان نے بعض نسخوں میں ان جگہوں کو لکھوایا اور بعض میں نہ لکھوایا یہ شعور دلاتے ہوئے کہ یہ سب صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے قراءت جائز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: پھر حضرت عثمان نے باقی مصاحف جلا دینے کا حکم دیا۔ ان تحرق اور ان تخرق دونوں طرح یہ لفظ مروی ہے خاء نقطہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا دفن کرنے کا حکم دیا اور بغیر نقطہ والی حاء کی روایت احسن ہے۔

ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں حضرت سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ فرماتے سنا، اے لوگوں کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور حضرت عثمان کے بارے میں غلو سے بچو۔ تم کہتے ہو حضرت عثمان قرآن کو جلانے والے تھے۔ اللہ کی قسم! انہوں نے ان نسخوں کو نہیں جلایا مگر ہم میں سے اصحاب محمد کے گروہ سے مشورہ کر کے ایسا کیا۔ عمیر بن سعید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: اگر حضرت عثمان کے وقت میں میں والی ہوتا تو میں

بھی مصاحف کے بارے میں وہی کرتا جو حضرت عثمان نے کیا تھا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا: حضرت عثمان کے مصاحف کو جمع قرآن کے وقت جلانے کے حکم سے، ان کتب کے جلانے کا جواز ثابت ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوتے ہیں اور یہ ان نسخوں کا اکرام تھا اور انہیں قدموں کے نیچے روندے جانے سے اور زمین میں ضائع ہونے سے بچانے کے لئے تھا۔ معمر نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ ان صحف کو جلا دیتے تھے جب ان کے پاس رسائل جمع ہو جاتے تھے جن میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے فقہ کی کتب جلائیں جو جنگ کے دن ان کے پاس تھیں۔ ابراہیم نے ان صحیفوں کو جلانے کو ناپسند کیا جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اور جلانے والے کا قول اولیٰ بالصواب ہے۔ حضرت عثمان نے ایسا کیا تھا۔ قاضی ابوبکر نے لسان الامہ میں کہا: امام کے لئے ان صحیفوں کو جلانا جائز ہے جن میں قرآن ہو جب اس کا اجتہاد ان کو جلانے تک پہنچے۔

فصل: ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل میں حلولیہ اور حشویہ فرقوں کا رد ہے جو حروف اور اصوات کو قدیم کہتے ہیں، اور کہتے ہیں قراءت اور تلاوت قدیم ہیں ایمان قدیم ہے اور روح قدیم ہے حالانکہ امت محمدیہ اور امت نصاریٰ، یہود اور براہمہ بلکہ ہر ملحد و موحد کا اجماع ہے کہ قدیم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ قادر کی قدرت کسی وجہ اور سبب سے متعلق نہیں ہوتی اور قدیم پر عدم جائز نہیں ہوتا اور قدیم محدَث نہیں ہوتا اور محدَث قدیم نہیں ہوتا اور قدیم وہ ہوتا ہے جس کے وجود کے لئے آغاز نہیں اور محدَث (حادث) وہ ہوتا ہے جو نہ ہونے کے بعد ہوتا ہے یہ طائفہ ملتوں کے عقلاء کے اجماع کے خلاف کہنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں: محدث کے لئے قدیم ہونا جائز ہے اور بندہ جب اللہ کا کلام پڑھتا ہے تو وہ اللہ کے کلام کو قدیم بنا دیتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی اینٹ اور لکڑی سے حروف تراشتا ہے یا سونے اور چاندی سے حروف بناتا ہے یا کوئی کپڑا بنتا ہے اور اس پر کتاب اللہ کی کوئی آیت منقش کرتا ہے تو انہوں نے کلام اللہ کو قدیم بنا دیا اس کا کلام مفسوخ قدیم، منحوت قدیم، مصنوع قدیم ہو گیا۔ انہیں کہا جائے گا تم اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق کیا کہتے ہو، کیا اس کا پگھلانا، مٹانا اور جلانا جائز ہے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو وہ دین سے نکل گئے اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا تمہارا ان حروف کے بارے میں کیا قول ہوگا۔ شمع یا سونا یا چاندی یا لکڑی یا کاغذ سے کتاب سے کسی آیت کی جن سے تصویر بنائی گئی ہے پھر وہ آگ میں گری اور جل گئی اور پگھل گئی، کیا تم کہتے ہو کہ اللہ کا کلام جل گیا؟ اگر وہ کہیں ہاں تو انہوں نے اپنا قول چھوڑ دیا اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا کیا تم نے نہیں کہا کہ یہ کتاب کلام اللہ ہے حالانکہ وہ جل گیا ہے، اور تم نے کہا یہ حروف اللہ کا کلام ہیں حالانکہ وہ پگھل گئے ہیں، اگر وہ کہیں حروف جل گئے ہیں اور کلام اللہ باقی ہے تو وہ حق اور صواب کی طرف لوٹ آئے اور وہ جواب کے قریب ہو گئے یہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر تنبیہ کرتے ہوئے جو اہل حق کہتے ہیں۔ اگر قرآن کھال میں ہو پھر آگ میں واقع ہو تو وہ نہیں جلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ پر کتاب نازل کی گئی ہے جس کو پانی نہیں دھوتا تم اسے سوتے ہوئے اور بیدار ہوتے ہوئے پڑھتے ہو(1)۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کا کلام نہ حروف ہے اور نہ حروف کے مشابہ ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة

اس مسئلہ میں کلام طویل ہے۔ اس کی مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو الکتاب الاسنٰی، فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی میں بیان کر دیا ہے۔

فصل: روافض، اللہ ان کو تباہ و ناکام کرے، قرآن میں طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ایک شخص آیت اور حرف کی نقل میں کافی ہے جیسا کہ تم نے کیا، تم نے ایک شخص کے قول سے سورۂ برأت کا آخر ثابت کیا وہ خزیمہ بن ثابت تنہا ہے اور مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ (الاحزاب:23) بھی اسی ایک شخص سے ثابت کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خزیمہ رضی اللہ عنہ نے جب ان آیات کو بیان کیا تو بہت سے صحابہ کو یاد آ گئیں۔ حضرت زید ان دو آیات کو پہچانتے تھے۔ اسی وجہ سے فرمایا: میں نے سورۂ توبہ کے آخر سے دو آیتیں مفقود پائیں اگر وہ ان آیتوں کو نہ جانتے ہوتے تو وہ نہ جانتے کہ کیا کوئی آیت مفقود ہے یا نہیں۔ آیت اجماع سے ثابت ہوئی نہ کہ تنہا حضرت خزیمہ سے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک حضرت خزیمہ کی گواہی سے ثابت ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت میں اس کی صحت پر دلیل قائم ہے۔ یہ قرینہ ہے جو دوسرے گواہ کے طلب سے مستغنی کر دیتا ہے بخلاف آیت احزاب کے۔ وہ حضرت زید اور حضرت ابوخزیمہ کی شہادت سے ثابت ہوئی کیونکہ ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ آیت سنی تھی۔ مہلب نے یہ مفہوم بیان کیا اور ذکر کیا کہ حضرت خزیمہ، حضرت ابوخزیمہ کے علاوہ ہے اور حضرت ابوخزیمہ وہ ہے جن کے پاس آیت توبہ پائی گئی، یہ انصار میں سے معروف صحابی ہیں۔ حضرت انس نے اس کو پہچانا اور کہا: ہم اس کے وارث ہیں اور سورۂ احزاب کی آیت حضرت خزیمہ بن ثابت کے پاس پائی گئی، پس کوئی تعارض نہیں۔ یہ واقعہ اس واقعہ سے مختلف ہے اس میں کوئی اشکال اور التباس نہیں ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: حضرت ابوخزیمہ کے نام کی صحت پر آگاہی نہیں ہے وہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہے اور وہ حضرت ابوخزیمہ بن اوس بن زید بن اصرم بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار ہے یہ جنگ بدر اور اس کے بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے اور حضرت عثمان کے دور خلافت میں فوت ہوئے تھے، یہ مسعود بن اوس کے بھائی تھے۔ ابن شہاب نے عبید بن سابق سے انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس پائیں، یہ وہ ہے جس کا حارث بن خزیمہ ابوخزیمہ سے نسبی رشتہ نہیں ہے مگر انصار میں دونوں جمع ہوتے ہیں۔ ایک اوسی ہے اور دوسرا خزرجی ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں انصار میں سے چار شخصوں نے جمع کیا تھا۔ حضرات ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید۔ میں نے حضرت انس سے کہا: ابوزید کون ہے؟ انہوں نے کہا: میرے چچوں میں سے ایک ہے (1)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور قرآن چار آدمیوں کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا: حضرات ابودرداء، معاذ بن جبل، زید اور ابوزید۔ حضرت انس نے کہا: ہم ابوزید کے وارث بنے (2)۔ دوسری روایت میں ہے، فرمایا: ابوزید فوت ہوئے اور کوئی اولاد نہ چھوڑی وہ بدری صحابی تھے ابوزید کا نام سعد بن

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 4619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بن کعب الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 4620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبید تھا۔ ابن طیب نے فرمایا: یہ آثار دلالت نہیں کرتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہرہ میں قرآن محفوظ نہیں تھا اور ان چار کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا جیسا کہ حضرت انس بن مالک نے کہا ہے۔ طرق متواترہ سے ثابت ہے کہ قرآن حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت تمیم داری، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم نے جمع کیا۔ حضرت انس کا قول کہ قرآن ان چار افراد کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا یہ احتمال رکھتا ہے کہ ان چار کے علاوہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے حاصل نہیں کیا تھا اور جمع نہیں کیا تھا کیونکہ اکثر صحابہ نے ایک دوسرے سے حاصل کیا تھا۔ روایات ایک دوسرے کی معاون ہیں کہ خلفاء اربعہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا کیونکہ وہ اسلام میں سبقت لے گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عظمت دی تھی۔

میں کہتا ہوں: قاضی نے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ کا ذکر نہیں کیا، میرے خیال میں ان دونوں نے قرآن جمع کیا ہوا تھا۔ جریر نے عبداللہ بن یزید صہبانی سے انہوں نے کمیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور آپ کے ساتھ ابو بکر بھی تھے اور وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے چاہا تھا۔ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس سے گزرے وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ام عبد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبداللہ اسی طرح قرآن پڑھ رہا ہے جس طرح پہلی قراءت پر نازل ہوا ہے۔ بعض علماء نے غضاً کما اُنْزِلَ کا معنی یہ بیان فرمایا کہ وہ پہلے حرف پر پڑھ رہا ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا نہ کہ ان سات حروف پر جن کی قراءت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہر رمضان میں جبریل آپ سے قرآن کے دور فرماتے تھے۔ وکیع اور ایک جماعت نے اعمش سے انہوں نے ابو ظبیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: تم کون سی قراءت پر پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: پہلی قراءت جو ابن ام عبد کی قراءت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے مجھے فرمایا بلکہ یہ دوسری قراءت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبریل کو قرآن سناتے تھے جب آپ کے وصال کا سال تھا آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بھی موجود تھے۔ پس حضرت عبداللہ نے جان لیا جو اس میں سے منسوخ ہوا تھا اور جو تبدیل ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو: ابن ام عبد سے، پہلے ان کا نام ذکر فرمایا، معاذ بن جبل سے، ابی بن کعب سے سالم مولیٰ ابی حذیفہ سے۔

میں کہتا ہوں: یہ اخبار دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عبداللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن جمع کر لیا تھا بخلاف پہلی روایات کے۔ واللہ اعلم۔ ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں محمد بن شہریار نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن اسود نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن آدم نے بتایا انہوں نے ابو بکر سے انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے بہتر اور تہتر سورتیں پڑھیں۔ میں نے آپ پر سورۂ بقرہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ) تک پڑھی۔ ابو اسحاق نے کہا: حضرت

عبداللہ نے باقی قرآن مجمع بن جاریہ انصاری سے سیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ صحیح ہیں تو وہ اجماع صحیح ہے جس کا ذکر یزید بن ہارون نے کیا ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابوبکر بن طیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں قرآن جمع کرنے والوں کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کیا۔

ابوبکر انباری نے کہا: مجھے ابراہیم بن موسیٰ الخوزی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں مالک بن اسماعیل نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں زہیر نے بتایا انہوں نے ابواسحاق سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اسود سے پوچھا کہ حضرت عبداللہ سورۂ اعراف کے ساتھ کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ اسے سیکھتے تھے حتیٰ کہ کوفہ میں آ گئے بعض اہل علم نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود کا وصال ہو گیا تھا معوذتین سیکھنے سے پہلے۔ اسی وجہ سے ان کے مصحف میں دو سورتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ بھی علماء کے قول میں مزید بیان معوذتین کے ذکر کے وقت ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابوبکر نے کہا: وہ حدیث جو ہمیں ابراہیم بن موسیٰ نے بیان کی انہوں نے کہا ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بیان کی، انہوں نے کہا: ہمیں عمر بن ہارون خراسانی نے بیان کیا انہوں نے ربیعہ بن عثمان سے انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا، فرمایا: جنہوں نے قرآن ختم کر لیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری حیات میں تھے۔ وہ حضرات عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے۔ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ محمد بن کعب پر مقصور ہے وہ مقطوع ہے اس کو نہ لیا جائے گا نہ اس پر اعتماد ہو گا۔ میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد (قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو، ابن ام عبد) یہ اس کی صحت پر دلیل ہے اور ان چیزوں میں سے جو تیرے لئے بیان کرتی ہیں کہ اصحاب قراءات اہل حجاز، شام اور عراق میں سے تھے ان میں سے ہر ایک نے ایسی قراءت حضرت کو اس کی طرف منسوب کیا ہے جس کو صحابہ میں سے کسی ایک نے اختیار کیا تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کو پڑھا تھا اور جملہ قرآن سے کسی چیز کی استثنیٰ نہیں کی۔ عاصم نے اپنی قراءت حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کی طرف منسوب کی اور ابن کثیر نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی۔ اسی طرح ابوعمرو بن علاء نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی اور عبداللہ بن عامر نے اپنی قراءت حضرت عثمان کی طرف منسوب کی۔ یہ تمام کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن پڑھا۔ ان قراءتوں کی اسانید متصل ہیں اور ان کے رجال ثقہ ہیں یہ خطابی کا قول ہے۔

قرآن کی سورتوں، آیات، شکل، نقطوں، منازل، تعشیر، حروف کی تعداد، اجزاء کلمات اور آیت کی ترتیب کے بارے میں جو وارد ہے

ابن طیب نے کہا: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ سلف کا قرآن کی سورتوں کی ترتیب میں اختلاف ہے، بعض نے اپنے مصحف میں سورتوں کو ان کے نزول کی ترتیب کے اعتبار سے لکھا مکی کو مدنی پر مقدم کیا۔ بعض نے اپنے مصحف میں پہلے سورۃ الحمد لکھی، بعض نے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (علق: 1) لکھی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصحف کے آغاز میں تھی اور مصحف ابن مسعود کے آغاز میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ (فاتحہ: 3) پھر سورۂ بقرہ پھر النساء تھی یعنی مختلف ترتیب پر تھے۔ مصحف ابی کی ابتدا میں الحمد، پھر سورہ

نساء پھر آل عمران پھر انعام پھر اعراف پھر مائدہ تھی پھر اسی طرح شدید اختلاف تھا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ ترتیب پر قرآن صحابہ کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ یہ مکی بن ابی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ برأت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے ذکر کیا ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ لکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھا۔ جب آپ نے سورۂ برأت کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا حکم نہ دیا تو بسم اللہ نہ لکھی گئی۔ یہ اصح ہے جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔

ابن وہب نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے سلیمان بن بلال کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ربیعہ کو یہ کہتے سنا، ان سے پوچھا گیا سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران کیوں مقدم کی گئی ہے حالانکہ ان سے پہلے اسی (80) سے زائد سورتیں نازل ہوئی تھیں یہ سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی تھیں تو ربیعہ نے کہا: یہ دو سورتیں مقدم کی گئیں اور قرآن اس کے علم پر مرکب کیا گیا جس نے اس کو مرکب کیا تھا اور اس علم پر اجتماع ہوا۔ پس اس تک ہماری انتہا ہے اور ہم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں معتمر نے بتایا انہوں نے سلام بن مسکین سے انہوں نے قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جو تم میں سے پیروی کرنا چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی پیروی کرے کیونکہ وہ دلوں کے اعتبار سے اس امت میں نیکوکار تھے، علم کے اعتبار سے گہرے تھے، تکلف کے اعتبار سے کم تھے، ہدایت کے اعتبار سے درست تھے، حالات کے اعتبار سے خوبصورت تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لئے اختیار فرمایا تھا اور اپنے دین کے قیام کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ پس تم ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان کے آثار کی اتباع کرو کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔

اہل علم کی ایک قوم نے کہا: سورتوں کی تالیف جو ہمارے مصحف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توقیفی ہے اور جو حضرات ابی، علی اور عبداللہ کے مصحف میں اختلاف مروی ہے وہ آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبریل پر پڑھنے سے پہلے کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے سورتوں کی تالیف کو مرتب فرمایا اس کے بعد کہ پہلے ایسا نہیں کیا تھا۔ یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ قرآن اسی طرح پر تالیف ہے جس طرح صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اکٹھا آسمان دنیا پر اتارا پھر بیس سال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر متفرق طور پر نازل ہوتا رہا (1)۔ کوئی سورت کسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوتی جو رونما پذیر ہوتا۔ کوئی آیت کسی سوال کرنے والے کا جواب ہوتی۔ جبریل امین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ اور آیت کی جگہ پر آگاہ کرتے۔ پس سورتوں کا سیاق بھی آیات اور حروف کے سیاق کی طرح ہے یہ سب محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور انہوں نے رب العالمین سے روایت کیا ہے جس نے مقدم سورت کو مؤخر کیا، یا مؤخر کو مقدم کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے آیات کے نظم کو خراب کیا، حروف اور کلمات کو بدلا اور اہل حق پر سورہ بقرہ کے انعام پر مقدم ہونے پر کوئی حجت نہیں ہے، سورہ انعام، بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب سے لی تھی۔ آپ خود فرماتے تھے: اس سورت کو قرآن کی فلاں جگہ پر رکھو۔ جبریل آیات کی جگہ پر آگاہ کرتے تھے۔

1۔ صحیح قول یہ ہے کہ تقریباً تیئس 23 سالوں میں اس کا نزول ہوا۔

حسن بن حباب نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابوہشام نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن عیاش نے بتایا انہوں نے ابواسحاق سے انہوں نے براء سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا یہ آیت تھی: یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ (النساء: 176)

ابوبکر بن عیاش نے کہا: ابواسحاق نے غلطی کی کیونکہ محمد بن سائب نے ہمیں ابوسائب سے روایت کر کے بتایا اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت تھی: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ (البقرہ)

جبریل نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کو سورۂ بقرہ کی دوسواسی آیت کے آغاز میں رکھو۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا: جو علماء یہ کہتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ قرآن کی تلاوت نماز میں اور درس میں مصحف کی ترتیب پر واجب ہے بلکہ رسم اور خط میں سورہ کی تالیف واجب ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ یہ ترتیب نماز میں اور قرآن کی تلاوت میں اور درس میں واجب ہے، اور کسی کے لئے سورۂ بقرہ سے پہلے سورۂ کہف کا سیکھنا حلال نہیں اور کہف سے پہلے حج کا سیکھنا حلال نہیں...... کیا آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا جس نے آپ سے پوچھا تھا تجھے کوئی نقصان نہ دے گی تو پہلے جو آیت بھی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں ایک رکعت میں ایک سورت تلاوت کرتے تھے پھر دوسری رکعت میں اس سورت کے علاوہ پڑھتے تھے جو پہلی رکعت کی سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی تھی اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر سے جو مروی ہے کہ وہ قرآن کو الٹا پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: یہ دل کے الٹے کرنے کا باعث ہے۔ انہوں نے اس سے مراد سورت کو الٹا پڑھنا لیا ہے مثلاً آخر سے شروع کرے اور ابتداء تک لے آئے، یہ ممنوع اور حرام ہے۔ لوگوں میں سے کچھ لوگ قرآن اور اشعار میں ایسا کرتے ہیں تاکہ ان کی زبان اس کے ساتھ چلے اور حفظ پر قادر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت کو ممنوع قرار دیا ہے اور قرآن میں اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ سورت کا خراب کرنا ہے اور سورت سے جو مقصود ہے اس کی مخالفت ہے۔

مصاحف میں قرآن کا اثبات، تاریخ نزول کے اعتبار سے واجب نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ صحیح اور ثابت شدہ بات ہے کہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ مکی سورتوں میں رکھی گئیں۔ کیا آپ نے حضرت عائشہ کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا۔ سورۂ بقرہ اور النساء نازل ہوئیں تو میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھی (1) یعنی مدینہ طیبہ میں اور یہ دونوں سورتیں مصحف میں مقدم کی گئیں ان سورتوں پر جو مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اگر وہ تاریخ نزول پر مرتب کرتے تو سورتوں کی آیات کی ترتیب کا ٹوٹنا واجب ہوتا۔

ابوبکر انباری نے کہا: ہمیں اسماعیل بن اسحاق قاضی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حجاج بن منہال نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہمام نے بتایا، انہوں نے قتادہ سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سورۂ بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانفال، برأت، الرعد، النحل، الحج، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الرحمن، الحدید، المجادلہ، الحشر، الممتحنہ، الصف، الجمعہ،

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر 4609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المنافقون، التغابن، الطلاق اور یا ایھا النبی لم تحرم دس آیات، اذا زلزلت، اذا جاء نصر اللہ یہ تمام سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں اور باقی قرآن مکہ میں نازل ہوا۔

ابوبکر نے کہا: جس نے اثر کے ترک اور اجماع سے اعراض پر عمل کیا اور سورتوں کو مکہ مدینہ کے منازل کے اعتبار سے منظم کیا اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سورۂ فاتحہ کو کہاں رکھے کیونکہ اس کے نزول کی جگہ کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور جو شخص اس آیت کو مؤخر کرنے کی طرف مجبور ہوا وہ سورۂ بقرہ کی دو سو پینتیس سے چالیس تک ہیں اور جس نے نظم قرآن کو خراب کیا اس نے کفر کیا اور حضرت محمد ﷺ نے جو رب تعالیٰ سے حکایت کیا اس کا رد کیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدنی سورتوں کی مکی سورتوں پر تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو ان کی لغت کے ساتھ خطاب فرمایا اور خطاب کے فنون اور محاورات میں خطاب فرمایا جن کو عرب جانتے تھے۔ جب ان کی کلام کا فن مؤخر کو مقدم کرنے اور مقدم کو مؤخر کرنے پر مبنی تھا تو اس معنی کے ساتھ کتاب اللہ میں ان کو خطاب کیا گیا۔ اگر وہ قرآن میں یہ فن نہ پاتے تو کہہ سکتے تھے کہ یہ کیسا کلام ہے جو ہمارے پسندیدہ کلام میں جو نظم تھا اس سے یہ خالی ہے۔ عبید بن ابرص نے کہا:

ان بُدّلت منهم وحوشًا　　و غيرت حالها الخطوب

عيناك دمعهما سروب　　كان شأنيهما شعيب

اصل کلام اس طرح ہے: عيناك دمعهما سروب لان تبدلت من اهلها وحوشاً۔ مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا اور سروب کا معنی ہے زمین کی سطح پر انڈیلا گیا، اسی سے سارب ہے زمین میں سیدھا چلنے والا۔ شاعر نے کہا:

انی سربت و کنت غیر سروب۔ میں چلا اور تو نہیں چلی۔

اور شأنیھما، شان واحد ہے اس کی جمع شؤن ہے۔ سر کے حصوں کو ملانے والی جگہ اس سے آنسو آتے ہیں۔ شعیب سے مراد متفرق ہے۔

فصل: مصحف کے اعراب اور اس کے نقطے

روایت ہے کہ عبداللہ بن مروان نے ان کا حکم دیا تھا، واسط میں حجاج نے یہ کام کیا اور اس میں بڑی کوشش کی اور اس کی تحزیب کا اضافہ کیا۔ اس نے حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کو یہ کام کرنے کا حکم دیا جب وہ عراق کا والی تھا۔ اس کے بعد واسط میں اس کی قراءتوں کے بارے میں کتاب تالیف کی اس میں ان تمام روایتوں کو جمع کیا جن میں لوگوں کا اختلاف تھا اور جن میں خط کی موافقت تھی، لوگ اس پر ایک زمانہ تک چلتے رہے یہاں تک کہ ابن مجاہد نے اپنی کتاب قراءات کے بارے میں ترتیب دی۔

زبیدی نے کتاب الطبقات میں مبرد تک سند بیان کر کے کہا کہ سب سے پہلے مصحف کے نقطے ابو اسود دؤلی نے لگائے تھے۔ اور اس طرح اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کا مصحف تھا اس پر یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے تھے۔

فصل: دس دس آیات کے بعد نشان لگانا

ابن عطیہ نے کہا: بعض تاریخ کی کتب میں گزرا کہ مامون عباسی نے اس کا حکم دیا تھا، بعض نے کہا: حجاج نے یہ کام کیا

تھا ابو عمرو الدانی نے کتاب البیان میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ مصحف میں دس آیتوں کے بعد نشانات لگانا مکروہ ہے وہ اس کو مٹا دیتے تھے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ وہ مصحف میں خوشبو اور تعشیر کو ناپسند کرتے تھے۔ اشہب نے کہا: میں نے امام مالک سے سنا ان سے ان نشانات کے بارے پوچھا گیا جو سرخ سیاہی کے ساتھ یا دوسرے رنگوں کے ساتھ لگائے جاتے ہیں تو امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا اور فرمایا: سیاہی کے ساتھ مصحف کے دس دس آیتوں کے بعد نشان لگانے میں کوئی حرج نہیں ان مصاحف کے بارے میں پوچھا گیا جن میں سورتوں کے خواتم لکھے جاتے ہیں ہر سورت میں جتنی اس کی آیات ہوتیں۔ امام مالک نے فرمایا میں مصاحف کے اصل نسخوں میں سے کسی بھی چیز کو لکھنا یا کوئی شکل بنانا ناپسند کرتا ہوں۔ رہے وہ نشانات جو بچوں کو سکھانے کے لئے ہوتے ہیں ان میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔ اشہب نے کہا: پھر ہمارے لئے انہوں نے اپنے دادا کا مصحف نکالا جو انہوں نے اس وقت لکھا تھا جب حضرت عثمان نے مصاحف لکھوائے تھے ہم نے اس کا خواتم دیکھا وہ سیاہی سے لمبی سطر میں تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہی کے ساتھ آیتوں کو نشان لگایا گیا تھا۔ قتادہ نے فرمایا: پہلے انہوں نے نقطے لگائے پھر پانچ آیتوں پر نشان لگائے پھر دس آیتوں پر نشان لگائے۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: قرآن، مصاحف میں مجرد تھا سب سے پہلے باء، تاء اور ثاء پر نقطے لگائے گئے تھے اور علماء نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں یہ اس کے لئے نور ہے پھر آیات کے اختتام پر نقطے ایجاد کئے پھر فواتح اور خواتیم ایجاد ہوئے۔ ابو حمزہ سے مروی ہے، فرمایا: ابراہیم نخعی نے میرے مصحف میں سورت کے آغاز میں اس طرح دیکھا تو فرمایا: اس کو مٹا دو کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: کتاب اللہ میں کوئی ایسی چیز داخل نہ کرو جو اس میں سے نہیں ہے۔ ابو بکر سراج سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابو رزین کو کہا: کیا میں اپنے مصحف میں سورت اس اس طرح لکھوں؟ انہوں نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کوئی اس کی حقیقت کو نہ جانتے ہوئے اسے قرآن نہ گمان کرنے لگے۔

الدانی نے کہا: یہ تمام اخبار اس بات پر آگاہی دیتی ہیں کہ تعشیر، تخمیس، فواتح السور، رؤس الآیات صحابہ کے عمل سے تھے، اس عمل کی طرف ان کی اجتہاد نے رہنمائی کی اور میرا خیال ہے جنہوں نے اس کو مکروہ کہا انہوں نے مختلف رنگوں مثلاً سرخ، زرد رنگ کے استعمال کی وجہ سے مکروہ کہا کیونکہ تمام آفاق میں مسلمانوں کا اس کے جواز اور اصل نسخوں میں اس کے استعمال پر اتفاق ہے اور حرج اور خطا دونوں ان سے اٹھ جاتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فصل: حروف کی تعداد اور اس کے اجزاء کے بارے میں

سلام ابو محمد حمانی نے روایت کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے قراء، حفاظ اور کاتبوں کو جمع کیا اور کہا: مجھے بتاؤ سارے قرآن کے کتنے حروف ہیں؟ سلام نے کہا: میں بھی ان میں تھا ہم نے حساب لگایا تو ہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ قرآن کے تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں۔ پھر حجاج نے کہا: مجھے بتاؤ۔ کس حرف پر نصف قرآن ختم ہوتا ہے؟ تو وہ سورہ کہف میں ولیتلطف کی فاء پر ہوتا تھا۔ پھر اس نے کہا: اس کے تین حصے کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا تہائی سورہ برأت کی سویں آیت پر، دوسری تہائی سورہ الشعراء کی سویں یا ایک سو ایک آیت پر بنتا ہے اور تیسری تہائی باقی قرآن ہے۔ پھر اس نے کہا: حروف کے

اعتبار سے سات حصے کہاں کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا ساتواں سورہ نساء میں منھم من صد کی دال میں، دوسرا ساتواں حصہ اعراف میں حبطت کی تاء میں، تیسرا ساتواں حصہ سورۃ الرعد (اکلھا دائم) میں اکلھا کے آخری الف میں، چوتھا ساتواں حصہ سورۃ الحج میں ولکل امۃ جعلنا منسکا کے الف میں، پانچواں ساتواں حصہ سورۂ احزاب میں و ما کان لمومن ولا مومنۃ کی ھاء میں چھٹا ساتواں حصہ سورۃ الفتح میں الظانین باللہ ظن السوء کی واؤ میں اور باقی سارا قرآن ساتواں حصہ ہے۔

سلام ابو محمد نے کہا: ہم نے چار مہینے یہ عمل کیا۔ حجاج پر رات کو چوتھائی قرآن پڑھتا تھا۔ پہلا چوتھائی سورۂ انعام کا خاتمہ ہے، دوسرا چوتھائی سورۂ کہف میں ولیتلطف پر ہے اور تیسرا چوتھائی سورۂ الزمر کا خاتمہ ہے اور چوتھا چوتھائی باقی قرآن ہے۔ اس جملہ میں ابو عمرو الدانی کی کتاب البیان میں اختلاف مذکور ہے جو اس سے آگاہی چاہے وہ وہاں مطالعہ کرے۔

فصل: المدنی الاول میں قرآن کی آیات کی تعداد

محمد بن عیسیٰ نے کہا: مدنی اول میں قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار ہے۔ ابو عمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جو اہل کوفہ نے اہل مدینہ سے روایت کی ہے اور کسی معین شخص کا نام نہیں لیا جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہوں۔ اور رہا المدنی الاخیر تو وہ اسماعیل بن جعفر کے قول کے مطابق چھ ہزار دو سو چودہ آیات ہیں۔ فضل نے کہا: مکیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو انیس ہے۔ محمد بن عیسیٰ نے کہا: کوفیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے۔ یہ وہ عدد ہے جو سلیم اور کسائی نے حمزہ سے روایت کیا ہے، کسائی نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ محمد نے کہا: بصریوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چار ہے یہ وہ عدد ہے جس پر سلف اعتماد کرتے آئے ہیں اور یحییٰ بن حارث ذماری نے کہا: اہل شام کے نزدیک تعداد چھ ہزار دو سو چھبیس ہے ایک روایت میں چھ ہزار دو سو پچیس ہے ایک آیت کم ہے۔ ابن ذکوان نے کہا: میرا گمان ہے یحییٰ نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو شمار نہیں کیا۔ ابو عمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جس کو لوگ تالیف میں استعمال کرتے ہیں اور قدیم وجدید تمام آفاق میں اس کو شمار کرتے ہیں۔

رہے قرآن کے کلمات تو فضل بن شاذان نے کہا: قرآن کے تمام کلمات، عطا بن یسار کے قول کے مطابق ستتر ہزار چار سو انتالیس ہیں اور اس کے حروف تین لاکھ تیئیس ہزار پندرہ ہیں۔

میں کہتا ہوں: حمانی سے جو قول پہلے گزرا ہے یہ اس کے مخالف ہے۔ عبداللہ بن کثیر نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ تعداد جو ہم نے قرآن سے شمار کی ہے وہ تین لاکھ گیارہ ہزار ایک سو تیس ہے یہ بھی حمانی سے منقول قول کے مخالف ہے۔

سورت، آیت، کلمہ اور حرف کا معنی

کلام عرب میں سورت کا معنی ایک سورت کو دوسری سورت سے جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

الم تر ان اللہ اعطاک سورۃ   تری کل ملک دونھا یتذبذب

یعنی کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے شرف والی منزل عطا کی ہے تو ہر بادشاہ کو اس کے بارے میں متذبذب دیکھتا ہے۔

بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے شرف اور بلند ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے جیسا کہ زمین کے بلند ٹکڑے کو سود کہا جاتا ہے، بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا اس مرتبہ پر بلند ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتا جیسے عمارت کی چار دیواری یہ تمام بغیر ہمزہ کے ہے، بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن میں سے علیحدہ ہوتی ہے عرب بقیہ کو سؤر کہتے ہیں جاء فی آسار الناس یعنی بقایاھم۔ اس مفہوم پر سورۃ کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہوگی پھر اس میں تخفیف کی گئی اور ماقبل مضموم کی وجہ سے اسے واؤ سے بدلا گیا۔ بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے تمام اور کمال کی وجہ سے دیا گیا ہے عرب مکمل اونٹنی کو سورۃ کہتے ہیں اس کی جمع سُوَر واؤ کے فتحہ کے ساتھ آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

سود المحاجر لا یقرأن بالسوَر۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس کی جمع سُوْرات اور سُوَرات ہو۔

الآیۃ اس کا معنی علامت ہے یعنی یہ اس کلام کے انقطاع کی علامت ہوتی ہے جو پہلی ہوتی ہے یعنی اس کا بعد والے کلام سے کوئی تعلق نہیں یعنی یہ اپنے قریب والی سے جدا اور منفرد ہے۔ عرب کہتے ہیں: میرے اور فلاں کے درمیان (آیۃ) علامت ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِہٖٓ (البقرہ: 248) نابغہ نے کہا۔

توھمت آیات لھا فعرفتھا لستة اعوام و ذا العام سابع

میں نے اس کی آیات کا وہم کیا تو میں نے اسے چھ سال سے پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔

نابغہ نے اس شعر میں آیات کو علامات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کے حروف کی جماعت ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے: خرج القوم بآیاتھم یعنی لوگ جماعت کے ساتھ نکلے۔ برج بن مسہر الطائی نے کہا:

خرجنا من النقبین لا حی مثلنا بآیاتنا نزجی اللقاح المطافلا

اس شعر میں آیات جماعت کے معنی میں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ عجیب ہے۔ انسان اس کی مثل کے ساتھ کلام کرنے سے عاجز ہے۔ نحویوں کا آیۃ کی اصل میں اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ فَعَلَةٌ کے وزن پر اَیَیَۃ تھا جیسے اَکَمَةٌ و شَجَرَۃ۔ جب یاء متحرک ماقبل مفتوح ہوا تو یاء الف سے بدل گئی۔ پس آیۃ ہمزہ کے ساتھ ہے اس کے بعد مدہ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کی اصل آیِیَۃٌ ہے بروزن فاعلۃٌ جیسے آمنۃ یاء الف سے بدل گئی کیونکہ وہ مفتوح تھی اور اس کا ماقبل متحرک تھا پھر جمع کے ساتھ التباس کی وجہ سے حذف ہوگئی۔ فراء نے کہا: اس کی اصل اَیِّیَۃ ہے یعنی پہلی یاء مشدد ہے پھر تشدید کی کراہت کی وجہ سے الف سے بدل گئی اور آیۃ ہوگئی اس کی جمع آی، آیات، آیاء آتی ہے۔

ابوزید نے کہا:

لم یبق هذا الدهر من آیاته　　غیر اثافیه و ارمدائه

اس زمانہ میں اپنی آیات میں سے سوائے اپنے پتھروں اور راکھ کے کوئی شی باقی نہیں چھوڑی۔

الکلمة، وہ صورت جو حروف کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور قرآن میں لمبا ترین کلمہ وہ ہے جس کے حروف دس تک پہنچتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ اور اَنُلْزِمُكُمُوْهَا اور ان کے مشابہ کلمات ہیں، اور فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ اس کے لکھنے میں دس حروف ہیں اور بولنے میں گیارہ حروف ہیں اور چھوٹا کلمہ وہ ہے جو دو حروف پر مشتمل ہے جیسے لا، ما، لك، له اور ان کے مشابہ حروف۔ اور معانی کے حروف میں سے وہ جو ایک کلمہ پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً ہمزہ استفہام، واو عاطفہ، مگر اس کو مفرد نہیں بولا جاتا۔ کبھی ایک کلمہ پوری آیت ہوتا ہے مثلاً والفجر، والضحی، والعصر اسی طرح الم، المص، طه، يس، حم یہ کوفیوں کے قول کے مطابق ہے اور یہ سورتوں کے آغاز میں ہیں اور سورتوں کے درمیان میں نہیں ہیں۔

ابوعمر والدانی نے کہا میں کوئی ایسا کلمہ نہیں دیکھتا جو آیت ہو مگر سورۃ الرحمٰن میں مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ کا کلمہ، اس کے علاوہ کوئی نہیں، البتہ دو کلمے متصل آتے ہیں اور وہ دو آیتیں ہیں۔

اور یہ اس ارشاد میں ہیں حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ (شوریٰ) کوفیوں کے قول کے مطابق کبھی کلمہ کا لفظ اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مکمل آیت اور وہ کلام جو قائم بنفسہ ہے اگر چہ وہ زیادہ ہو یا تھوڑی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف: 137) بعض علماء نے فرمایا: یہاں کلمہ سے مراد یہ ارشاد ہے: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ الی آخر الایتین (القصص: 5) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (الفتح: 26) مجاہد نے کہا اس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو کلمے زبان پر خفیف ہیں، میزان پر بھاری ہیں، رحمٰن کو محبوب ہیں سبحان الله وبحمده، سبحان الله العظيم (1)۔ عرب پورے قصیدہ اور قصہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: قال قس فی کلمته کذا، یعنی قس نے اپنے خطبہ میں کہا: وقال زهیر فی کلمته کذا۔ یعنی اپنے قصیدہ میں یہ کہا قال فلان فی کلمته، یعنی فی رسالته۔ کلام کے جملہ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے کیونکہ کلمہ اس سے ہوتا ہے۔ عربوں کی عادت ہے کہ کسی شے کا نام اس چیز سے رکھ دیتے ہیں جس سے وہ چیز بنتی ہے یا جو اس کے قریب ہوتی ہے اور اس کا سبب ہوتی ہے۔ یہ مجازاً اور اتساعاً ہوتا ہے۔

الحرف: وہ ہوتا ہے جو تنہا قائم ہوتا ہے، حرف کو کلمہ کہا جاتا ہے اور کلمہ کو حرف کہا جاتا ہے اس میں وسعت و مجاز ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ابوعمر والدانی نے کہا: اگر کہا جائے کہ ان حروف کو کیسے یہ کہا جائے گا جو سورتوں کے آغاز میں ایک ایک حرف آیا ہوا ہے جیسے (ص، ق اور ن) انہیں حرف یا کلمہ کیسے کہا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: کلمہ ہیں حرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف پر سکوت نہیں کیا جاتا اور صورت میں تنہا نہیں ہوتا اور جس سے

1۔ بخاری شریف، باب قول الله ونضع الموازین القسط الخ، آخری حدیث، حدیث نمبر 7008، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ملا ہوا ہوتا ہے اس سے جدا نہیں ہوتا اور ان حروف پر سکوت کیا جاتا ہے یہ علیحدہ اور جدا ہوتے ہیں جس طرح کلمہ جدا اور علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو کلمات کہا جاتا ہے حروف نہیں کہا جاتا۔ ابو عمرو نے کہا: حرف کبھی اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً مذہب اور وجہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ (الحج: 11) یعنی علی وجہ و مذھب۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے یعنی لغات کی سات وجوہ پر نازل کیا گیا ہے (1)۔ واللہ اعلم

کیا قرآن میں عربوں کی لغت کے علاوہ کسی لغت کے کلمات وارد ہیں یا نہیں

اس میں ائمہ کا اختلاف نہیں کہ قرآن میں غیر عربی اسلوب پر کلام مرکب نہیں اس میں اسماء اعلام ہیں جو عربی زبان میں سے نہیں ہیں جیسے اسرائیل، جبریل، عمران، نوح، لوط۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا اعلام مفردہ کے علاوہ غیر عربی الفاظ ہیں یا نہیں۔ قاضی ابوبکر بن طیب اور طبری وغیرہما کا خیال ہے کہ قرآن میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، قرآن صریح عربی ہے اور وہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں اور جن کی نسبت تمام لغات کی طرف ہے ان میں اتفاق ہے کہ لغات ان پر وارد ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ عربوں، فارسیوں اور حبشیوں وغیرہ نے کلام کی ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن میں ان کا وجود ہے اور یہ الفاظ بہت کم ہیں اس لئے یہ قرآن کو عربی ہونے سے نہیں نکالتے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زبان کے ساتھ کلام کرنے والا ہونے سے نکالتے ہیں۔ المشکاۃ کا معنی طاقچہ ہے۔ نشأ کا معنی رات کو اٹھنا ہے۔ اسی سے ہے اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ (المزمل: 6) يُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَيۡنِ (الحدید: 28) یعنی دوہرا اجر۔ فَرَّتۡ مِنۡ قَسۡوَرَةٍ (المدثر: 51) قسورہ سے مراد شیر ہیں۔ یہ تمام الفاظ حبشی زبان کے ہیں۔ الغساق ترکی زبان میں بدبودار پانی کو کہتے ہیں القسطاس رومیوں کی لغت میں میزان کو کہتے ہیں، السجیل فارسی زبان میں پتھر اور مٹی کو کہتے ہیں، الطور، سے مراد پہاڑ ہے، الیم سریانی زبان میں دریا کو کہتے ہیں، التنور زمین کی سطح، عجمی زبان کا لفظ ہے۔

ابن عطیہ نے کہا: ان الفاظ کی حقیقت یہ ہے کہ اصل میں یہ عجمی ہیں لیکن عربوں نے ان کو استعمال کیا ہے اور عربی بنایا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ عربی ہیں۔ عرب عاربہ جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا وہ تجارت کی وجہ سے اور قریش کے سفروں کی وجہ سے دوسری زبانوں سے بعض الفاظ خلط ملط ہوتے جیسا کہ مسافر بن ابی عمرو نے شام کی طرف سفر کیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کا سفر، حضرت عمرو بن العاص کا سفر اور عمارہ بن ولید کا حبشہ کی زمین کی طرف سفر، اعشیٰ کا حیرہ کی طرف سفر، اور اس کا نصاریٰ سے ملنا حالانکہ وہ لغت میں حجت تھا۔ ان اسفار کی وجہ سے عربوں نے عجمی الفاظ استعمال کیے، بعض حروف میں کمی کی اور عجمہ کے ثقل کو تخفیف سے بدلا اور ان الفاظ کو اپنے اشعار اور محاورات میں استعمال کیا حتیٰ کہ یہ الفاظ عربی صحیح کے قائم مقام ہو گئے اور ان کا بیان واقع ہوا۔ اس حد پر قرآن ان سات قراءت پر نازل ہوا۔ اگر کوئی عربی ان الفاظ سے جاہل ہو تو وہ صریح عربی کا دوسروں کی لغت کو نہ جاننے کے مترادف ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فاطر کا معنی نہ جانا۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری کا نظریہ کہ دو لغتیں ایک لفظ میں متفق ہو گئیں یہ بعید ہے بلکہ اکثر میں ایک اصل ہے اور دوسری

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2868، تفصیل اس کے متعلقہ بحث میں گزر چکی ہے۔

فرع ہے کیونکہ ہم قلیل اتفاق کے جواز کا انکار نہیں کرتے۔

دوسرے علماء نے کہا: پہلا قول اصح ہے اور یہ دوسروں کے کلام میں اصل ہے اور عربوں کے کلام میں دخیل ہے۔ یہ قول اپنے برعکس قول سے اولیٰ نہیں کیونکہ عربوں نے اس کے ساتھ خطاب کیا ہوگا یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو یہ ان کے کلام سے ہوگا کیونکہ ان کی لغت اور کلام کا اور کوئی معنی نہیں مگر جو ان کے نزدیک اسی طرح ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ دوسروں نے بعض کلمات پر ان کی موافقت کی ہو۔ یہ امام کبیر ابو عبیدہ نے کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کلمات عرب کلام کے اوزان پر نہیں ہیں۔ پس یہ عرب کلام سے نہیں ہیں ہم کہیں گے کس نے تمہارے لئے یہ تسلیم کیا ہے کہ تم نے عربوں کے اوزان کو شمار کر لیا ہے تاکہ تم ان الفاظ کو ان اوزان سے خارج کر دو۔ قاضی نے کلام عرب کے اوزان اصول سے بحث کی ہے اور ان اسماء کو نحوی طریقہ پر ان اصولوں کی طرف لوٹایا ہے۔ اگر عربوں نے ان کے ساتھ کلام نہیں کیا ہے اور نہ عربوں نے پہچانا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ان سے ایسی کلام سے کلام کرنا محال ہے جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔ اس صورت میں تو قرآن عربی مبین نہیں رہے گا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو ان کی زبان میں خطاب کرنے والے ہوں گے۔

اعجاز قرآن میں نکات کا ذکر، معجزہ کی شرائط اور اس کی حقیقت

معجزہ اس کی جمع معجزات ہے۔ انبیاء کے معجزات ان کی صداقت پر دلیل ہوتے ہیں۔ معجزہ کو معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دوسرے انسان اس کے لانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس کی پانچ شرائط ہیں۔ اگر ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو وہ معجزہ نہ ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ اس پر قادر نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ، اور معجزہ کے لئے اس شرط کا حصول واجب ہے کیونکہ اگر کوئی آنے والا ایسے زمانہ میں آیا جس میں رسل کا آنا صحیح ہو اور اس نے رسالت کا دعویٰ کیا ہو، اور اپنا معجزہ حرکت کرنا، سکون کرنا، کھڑا ہونا یا بیٹھنا بنایا تو یہ اس کا دعویٰ معجزہ نہ ہوگا نہ اس کی سچائی کی دلیل ہوگا کیونکہ مخلوق اس کی مثل پر قادر ہوتی ہے، واجب ہے کہ معجزات ایسے ہوں جیسے دریا کا پھٹنا، چاند کا ٹوٹنا اور ان کے مشابہ چیزیں ہوں جن پر انسان قادر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط: وہ عادت کے خلاف ہو۔ اس شرط کا پایا جانا واجب ہے کیونکہ اگر کوئی مدعی رسالت کہے کہ میری نشانی یہ ہے کہ دن کے بعد رات کا آنا ہے اور مشرق سے سورج کا طلوع ہونا ہے تو اس کا یہ دعویٰ معجزہ نہ ہوگا کیونکہ یہ افعال اگرچہ ایسے ہیں جن پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں لیکن یہ اس شخص کی وجہ سے نہیں ہیں۔ یہ اس کے دعویٰ سے پہلے بھی اسی طرح تھے جس طرح اس کے دعویٰ کے وقت ہیں اور اپنی نبوت پر ان کی دلالت کا دعویٰ، دوسرے دعویٰ کی طرح ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کے صدق پر دلیل ہے۔ وہ چیز جس کی گواہی رسول دیتا ہے وہ اس کی سچائی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے میری سچائی پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے رسالت کے دعویٰ کی وجہ سے عادت کے خلاف کرے گا وہ اس ڈنڈے کو سانپ بنا دے گا، پتھر کو پھاڑ دے گا، اس کے درمیان سے اونٹنی نکالے گا یا میری انگلیوں کے درمیان سے پانی نکلے گا جیسے چشمہ سے پانی نکلتا ہے۔ پس اس کے لئے یہ علامات اللہ تعالیٰ کے قول کے قائم مقام ہوں گی اگر ہم اس کا کلام سن سکتے تو وہ فرماتا اس نے سچ کہا میں نے اس کو مبعوث کیا ہے۔ اس مسئلہ کی مثال، اللہ اور اس کے رسول کی اعلیٰ امثال ہیں، اگر زمین کے بادشاہوں میں

سے کسی بادشاہ کے پاس ایک جماعت ہو۔ اس جماعت میں سے ایک شخص کہے جبکہ وہ سامنے ہو اور بادشاہ سن رہا ہو۔ بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے اے جماعت! اس طرح کرو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بادشاہ اپنے افعال میں سے کسی فعل کے ساتھ میری تصدیق کرے گا اور وہ میری تصدیق کے ارادہ سے اپنے ہاتھ سے اپنی انگوٹھی نکالے گا۔ جب بادشاہ اس کے کلام اور دعویٰ کو ان کے درمیان سنے پھر وہ اس کی سچائی پر گواہی پیش کر دے تو یہ اس کے اس قول کے قائم مقام ہوگا کہ اگر وہ کہتا اس نے جو میرے بارے دعویٰ کیا ہے اس میں سچا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کوئی عمل کر دے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہو اور رسول کے ہاتھ پر عادت کے خلاف کر دے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کے کلام کے قائم مقام ہوگا۔ اگر وہ ہمیں سنائی دیتا اور وہ کہتا میرے بندے نے رسالت کے دعویٰ میں سچ کہا میں نے اسے تمہاری طرف بھیجا ہے تم غور سے سنو اور اطاعت کرو۔

تیسری شرط: یہ ہے کہ وہ مدعی رسالت اس معجزہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر گواہی طلب کرے۔ وہ کہے میری نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پانی کو زیتون کا تیل بنا دے گا اور میرے زمین کو زلزلہ پیدا کرنے کا حکم دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ زمین کو حرکت دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا تو اس کا یہ چیلنج صحیح ہوگا۔

چوتھی شرط: یہ ہے کہ معجزہ اس کے دعویٰ کے مطابق واقع ہو، اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ اگر مدعی رسالت کہے کہ میری نبوت کی نشانی اور میری حجت کی دلیل یہ ہے کہ میرا ہاتھ بولے گا یا یہ سواری بولے گی، پھر وہ ہاتھ بولا یا سواری بولی اور اس نے کہا: یہ جھوٹا ہے اور یہ نبی نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ نے کلام پیدا کی ہے جو اس مدعی رسالت کے جھوٹ پر دلیل ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ نے کیا وہ اس کے دعویٰ کے مطابق نہ تھا۔ اسی طرح جو روایت ہے کہ مسیلمہ الکذاب لعنۃ اللہ۔ نے ایک کنویں میں تھوکا تا کہ اس کا پانی زیادہ ہو جائے تو پانی مزید نیچے چلا گیا، جو پانی موجود تھا وہ بھی چلا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے کیا۔ یہ آیات اس کو جھٹلانے والی ہیں جن کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوئیں، کیونکہ یہ بناوٹی جھوٹے نبی کے ارادہ کے خلاف واقع ہوئیں۔

پانچویں شرط: ۔ یہ ہے کہ وہ چیز جو چیلنج کے وقت معجزہ ظاہر کرے اور کوئی دوسرا ایسا معجزہ مقابلہ کی بنا پر نہ لا سکے۔ اگر چیلنج شدہ امر جس کے ذریعے نبوت پر شہادت حاصل کی گئی ہے ان شرائط سے مکمل ہو تو وہ اس شخص کی نبوت پر دلالت کرنے والا معجزہ ہو گا جس کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے کے لئے کوئی پیدا کر دیا حتیٰ کہ وہ بھی ایسا لے آیا جو مدعی نبوت لایا تھا اور اس نے بھی اس کے عمل کی طرح عمل کر دکھایا تو اس کا نبی ہونا باطل ہو جائے گا اور اس امر کا معجزہ ہونا خارج ہو جائے گا اور اس کی صداقت پر دلیل نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِۦٓ إِن كَانُوا صَٰدِقِينَ ﴿٣٤﴾ (الطور: 34) (اس کی مثل کلام لے آئیں اگر وہ سچے ہیں) اور فرمایا أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِۦ مُفْتَرَيَٰتٍ (ہود: 13) (یا وہ کہتے ہیں اس نے یہ خود گھڑا ہے فرمائیے تم اس کی مثل دس گھڑی ہوئی سورتیں لے آؤ) گویا فرمایا: اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظم سے ہے اور ان کے عمل سے ہے تو تم اس نظم کی جنس سے دس سورتیں لے آؤ۔ جب تم تمام اس سے عاجز ہو تو جان لو کہ یہ ان کے نظم اور عمل سے نہیں ہے۔

یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ معجزات جو ان پانچ شرائط کے ساتھ مقید ہیں صرف سچے لوگوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ

مسیح دجال کے لئے بھی ہوں گے جیسا کہ تم نے اپنے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اس کے ہاتھوں پر بڑی بڑی آیات اور بڑے بڑے امور ظاہر ہوں گے جو معروف و مشہور ہیں۔ ہم کہیں گے وہ نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ وہ ربوبیت کا دعویٰ کرے گا، ان کے درمیان اتنا فرق ہے جتنا اندھوں اور دیکھنے والوں کے درمیان فرق ہے۔ دلیل عقلی قائم ہو چکی ہے کہ بعض مخلوق کو بعض کی طرف بھیجنا ممنوع اور مستحیل نہیں ہے، اور کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی سچائی پر دلائل قائم کر دے جو شرع اور ملت کو ساتھ لے آئے۔ دلائل عقلیہ دلالت کرتے ہیں کہ مسیح دجال اس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتا ہے اور یہ ثابت ہے کہ یہ صفات محدثات کے لائق ہیں اور اللہ تعالیٰ تشبیہ سے پاک ہے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

فصل:۔ جب یہ ثابت ہے تو جان لو کہ معجزات کی دو قسمیں ہیں: (۱) جن کی نقل مشہور ہے اور نبی کریم ﷺ کے وصال کے ساتھ ان کا زمانہ ختم ہو گیا۔ (۲) جن کی صحت اور حصول کے ساتھ اخبار متواتر ہیں اور اس کے ثبوت اور وجود کے ساتھ اخبار مشہور ہیں، سامع کو ان کا علم ضرورتاً حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی شرط میں سے یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے کثیر تعداد میں ہوں اور جس کو وہ نقل کر رہے ہوں اس کے متعلق علم ضروری رکھتے ہوں۔ کثرت تعداد میں، ابتدا اور وسط میں اور آخر میں راوی برابر ہوں حتیٰ کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ یہ صفت قرآن اور نبی کریم ﷺ کے وجود کی نقل کی ہے کیونکہ امت قرآن کو ہر دور میں ایک دوسرے سے نقل کرتی آئی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے جن کا وجود بالضرورۃ معلوم ہے اور جن کی صداقت معجزات کے ساتھ ثابت ہے اور رسول کریم ﷺ نے جبریل سے اور انہوں نے رب تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ پس قرآن کو دو معصوم رسولوں نے کمی اور زیادتی کے بغیر نقل کیا اور ہماری طرف ان کے بعد اہل تواتر نے نقل کیا جن پر نقل کرنے اور سنانے میں کثرت تعداد کی وجہ سے کذب جائز نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے لئے انہوں نے جو حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس سے قرآن کے ظہور اور چیلنج میں سے جو نقل کیا اس کے بارے میں ان کی سچائی کی وجہ سے علم ضروری حاصل ہوا۔ اس کی مثال دنیا کا علم ہے انسان اسے جانتا ہے جو شہروں کے وجود کے متعلق اس کی طرف جو نقل کیا گیا جیسے بصرہ، شام، عراق، خراسان، مدینہ، مکہ اور دوسری اس کے مشابہ مثالیں جو اخبار متواترہ سے ثابت ہیں۔ پس قرآن ہمارے نبی کریم ﷺ کا معجزہ آپ ﷺ کے بعد قیامت تک رہنے والا ہے، ہر نبی کا معجزہ اس کے جانے کے بعد ختم ہو گیا یا اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا ہو گیا جیسے تورات اور انجیل۔

قرآن کی وجوہ اعجاز دس ہیں

۱۔ یکتا نظم

عربی اور غیر عربی زبان میں جو معہود نظم موجود تھا قرآن کا نظم اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا نظم نہ تو نظم شعری میں سے ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسین: 69) (اور نہ ہم نے اسے شعر سکھایا اور نہ یہ اس

کے لئے مناسب ہے) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوذر کے بھائی انیس نے حضرت ابوذر سے کہا: میں مکہ میں ایک شخص سے ملا ہوں جو تیرے دین پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے۔ میں نے کہا: لوگ کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: وہ کہتے ہیں شاعر ہے، کاہن ہے، ساحر ہے اور انیس ایک شاعر تھا، انیس نے کہا: میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے وہ ان کے کلام جیسا کلام نہیں کرتا۔ میں نے اس کا قول شعر کی اقسام پر پیش کیا تو میرے بعد کسی کی زبان پر اس کے کلام کو شعر کہنا بھی مناسب نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں (1)۔ اسی طرح عتبہ بن ربیعہ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ نہ جادو ہے، نہ شعر ہے جب رسول اللہ ﷺ نے حم فصلت تلاوت کی تھی۔ اس کا بیان وہاں آئے گا جب عتبہ نے زبان کے اعتبار سے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعتراف کیا کہ اس نے قرآن کی مثل کلام نہیں سنا تو وہ اس قول میں قرآن کے اعجاز کا اقرار کرنے والا تھا حالانکہ اسے اور ان کے ہم مثل محققین کو فصاحت اور تکلم پر قدرت تھی، وہ کلام کی تمام انواع و اجناس پر کلام کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

2۔ دوسری وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کا اسلوب تمام اسالیب عرب سے مختلف ہے۔

3۔ تیسری یہ کہ اس میں ایسی بڑائی ہے جو مخلوق کے لئے کسی حال میں صحیح نہیں۔ سورہ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ (ق:1) میں آخر تک غور کر اور وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الی آخر السورۃ (الزمر:67) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ الی آخرھا۔ (ابراہیم:42) ابن حصار نے کہا جس نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اس نے جان لیا کہ اس بڑائی کی مثل کسی دوسرے کے خطاب میں صحیح نہیں اور کسی دنیا کے عظیم بادشاہ کی طرف سے یہ کہنا صحیح نہیں لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (غافر:16) اور نہ یہ کہنا جائز ہے: وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (الرعد:13)

ابن حصار نے کہا: یہ تینوں نظم، اسلوب اور جزالت ہر سورت کو لازم ہے بلکہ ہر ایک آیت کو لازم ہیں۔ ان تینوں صفات کے مجموعہ کی وجہ سے ہر آیت اور ہر سورت مسموع، بشر کے کلام سے ممتاز ہے۔ اس کے ساتھ چیلنج واقع ہوا ہے اور لوگوں کو عاجز کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سورت ان تینوں صفات کے ساتھ منفرد ہے بغیر اس کے کہ کوئی دوسری دس وجوہ اعجاز میں سے کوئی وجہ اس کی طرف مضاف ہو۔

یہ سورۃ الکوثر چھوٹی تین آیات ہیں۔ یہ قرآن کی چھوٹی سورت ہے حالانکہ یہ دو غیب کی باتیں اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ کوثر (نہر) کے متعلق خبر، اس کی بڑائی، اس کی وسعت اور اس کے برتنوں کی کثرت کے متعلق خبر دے رہی ہے اور یہ دلیل ہے کہ اس کی تصدیق کرنے والے تمام رسولوں کے متبعین سے زیادہ ہوں گے۔ دوسری ولید بن مغیرہ کے متعلق خبر ہے۔ وہ اس آیت کے نزول کے وقت مالدار اور صاحب اولاد تھا جیسا کہ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے: ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ (المدثر) پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مال اور اولاد کو ہلاک کر دیا اور اس کی نسل کو ختم کر دیا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابوذر، حدیث نمبر 4570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ عرب زبان میں اس انداز سے تصرف ہے کہ کوئی عربی میں اس طرح نہیں کر سکتا حتیٰ کہ عربوں کی طرف سے اتفاق سے یہ قول آیا ہے کہ اس کا ہر کلمہ اور ہر حرف اپنی جگہ پر بالکل درست آیا ہے۔

5۔ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ ان امور کی خبر دیتا ہے جو دنیا کے آغاز سے اس کے نزول کے وقت تک گزر چکے ہیں اور یہ ایسے امی کی طرف سے خبریں ہیں جس نے اس سے پہلے نہ کتاب پڑھی ہے نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا ہے۔اس نے انبیاء اور ان کی امتوں کے حالات بتائے اور گزشتہ زمانہ کے واقعات وحالات کو بیان کیا اور اہل کتاب نے جو آپ سے سوال کئے ان کا ذکر کیا۔انہوں نے اہل کہف کے قصہ، موسیٰ وخضر علیہما السلام اور ذوالقرنین کے حالات کے متعلق پوچھا تو آپ نے انہیں جواب دیا حالانکہ آپ امی تھے امی امت سے تھے جس کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔اس کے ذریعے وہ گزشتہ کتب کی صحت کو پہچان گئے اور اس کی سچائی کا یقین کیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: ہم ضرورۃً جانتے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہے جس تک رسائی ممکن نہیں مگر سیکھنے سے جبکہ یہ معروف تھا کہ آپ اہل آثار سے اور مؤرخین سے نہیں ملے نہ آپ کسی معلم کے پاس گئے ہیں اور نہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو پڑھ سکتے ہیں تا کہ یہ جائز ہو کہ آپ کو کوئی کتاب ملی ہو جس سے یہ ساری چیزیں آپ نے لی ہوں۔پس معلوم ہوا کہ ان کے علم تک رسائی ممکن نہیں مگر وحی کی تائید سے۔

6۔اس کی وجوہ اعجاز میں سے ایک وعدہ کا وفا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کے متعلق جو وعدہ فرمایا وہ وعدہ ظاہر وعیاں پایا گیا ہے یہ اخبار مطلقہ اور شرط کے ساتھ مقید وعدہ کی طرف منقسم ہے، اخبار مطلقہ کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور ان لوگوں کو نکالنے کا وعدہ کیا جنہوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا اور دوسرے مقید شرط کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق:3) وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (التغابن: 11) وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝ (الطلاق) اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال:65)

7۔ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ آنے والے حالات غیبیہ کی خبر دیتا ہے جن کی اطلاع صرف وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔اس میں سے اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وعدہ ہے کہ وہ اس کے دین کو سب ادیان پر غالب کرے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ (الصف:9) تو ایسا ہی ہوا۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب اپنے لشکروں کو کسی مہم پر روانہ کرتے تو انہیں اللہ کی طرف سے اپنے دین کو غالب کرنے کا وعدہ یاد دلاتے تا کہ انہیں نصرت کا وثوق ہو جائے اور کامیابی کا یقین ہو جائے۔حضرت عمر بھی ایسا کرتے تھے۔پس شرق وغرب اور بحر وبر میں متواتر فتوحات ہوتی رہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور:55)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح:27) (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجد حرام میں جب اللہ

نے چاہا امن وامان سے۔)

اور فرمایا: وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں میں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے۔

فرمایا: الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ (الروم) (الف، لام، میم ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے)۔

یہ تمام غیوب کی خبریں ہیں جن پر صرف رب العالمین واقف ہے یا وہ جس کو رب العالمین نے ان سے واقف کیا۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان آنے والے واقعات پر آگاہ کیا تا کہ آپ کی سچائی پر دلیل ہو جائیں۔

8۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن اپنے ضمن میں ایسا علم رکھتا ہے جو پوری انسانیت کے لئے قوام ہے۔ حلال، حرام اور دوسرے تمام احکام اس میں موجود ہیں۔

9۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس میں حکم بالغہ ہیں جو ایک آدمی سے عادتاً اپنے شرف اور کثرت کی وجہ سے صادر نہیں ہوتیں۔

10۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ جو علم ظاہراً اور باطناً اس میں ہے اس میں تناسب ہے اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝ (النساء)

میں کہتا ہوں: یہ دس وجوہ اعجاز ہیں جو ہمارے علماء نے ذکر کی ہیں اور گیارہویں وجہ اعجاز وہ ہے جو نظام اور بعض قدریوں نے بیان کی۔ وہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ سے روکا گیا ہے اور چیلنج کے وقت اس کی مثل لانے سے پھیرا گیا ہے، یہ منع اور پھیرنا ذات قرآن کے علاوہ ایک معجزہ ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمتوں کو معارضہ سے پھیر دیا ہے حالانکہ انہیں اس کی مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور یہ فاسد ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے مخالف کے حدوث سے پہلے قرآن معجز تھا۔

اگر ہم کہیں کہ منع اور پھیر دینا معجز ہے تو قرآن کا معجزہ ہونا خارج ہو جاتا ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو معلوم ہوا کہ نفس قرآن معجز ہے، کیونکہ اس کی فصاحت و بلاغت خارق للعادت ہے کیونکہ کوئی کلام اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ جب ان سے ایسا کلام مالوف و معتاد ہی نہیں ہے تو دلیل ہے کہ منع اور صرف معجز نہیں ہے اور جنہوں نے اس کے مقابلہ سے پھیرنے کا قول کیا ہے ان کے دو قول ہیں: (۱) مقابلہ کی قدرت سے انہیں پھیر دیا گیا، اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو بھی عاجز آتے (۲) وہ مقابلہ کرنے سے پھیرے گئے حالانکہ انہیں اس کی قدرت تھی۔ اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو اس پر ان کا قادر ہونا جائز ہوتا۔

ابن عطیہ نے کہا: قرآن میں چیلنج کی وجہ اس کا نظم اور معانی کی صحت، الفاظ کی فصاحت کا متواتر ہونا ہے اور اس کی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے اور از روئے علم کے کلام کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ پس اپنے احاطہ سے اس نے جان لیا کہ کون سا لفظ پہلے لفظ سے ملنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کو بیان کرے گا پھر اسی طرح اول قرآن سے آخر قرآن تک ہے۔ انسانوں کو جہالت، نسیان اور ذہول طاری ہوتا ہے اور ضرورۃً معلوم ہے کہ

انسان کبھی بھی احاطہ کرنے والا نہیں ہوا۔

اسی وجہ سے نظم قرآن انتہائی فصاحت و بلاغت کو چھو رہا ہے۔ اس نظر سے ان کا قول باطل ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ عرب کی قدرت میں تھا کہ وہ قرآن کی مثل انتہائی فصاحت و بلاغت والا کلام لائے۔ جب حضرت محمد ﷺ آئے تو وہ اس سے پھیر دیئے گئے اور وہ اس جیسا کلام لانے سے عاجز ہو گئے۔ صحیح یہ ہے کہ قرآن کی مثل لانے کی کبھی کسی مخلوق میں قدرت ہی نہیں ہے، تیرے لئے انسانی کمزوری اس میں ظاہر ہوگی کہ ان کا فصیح شخص خطبہ دیتا ہے یا قصیدہ پڑھتا ہے، اس میں وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے پھر وہ پورا سال خود اس کی تنقیح کرتا ہے پھر اس کے بعد کسی دوسرے کو وہ قصیدہ دیتا ہے وہ اس میں تبدیلی اور تنقیح کرتا ہے اور اپنی طبیعت کے مطابق کچھ لیتا ہے پھر بھی اس کے بعد اس میں نظر اور تبدیلی کے مقامات موجود ہوتے ہیں اور کتاب اللہ اگر اس سے ایک لفظ بھی نکالا جائے پھر پوری لسان عرب سے اس سے بہتر لفظ ڈھونڈا جائے تو نہیں پایا جائے گا۔

قرآن کی فصاحت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں دو امروں، دو نہیوں، دو خبروں اور دو بشارتوں کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (القصص: 7) (ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی کہ وہ انہیں دودھ پلائے) اسی طرح سورۂ مائدہ کا آغاز ہے وفا کا حکم دیا اور عہد توڑنے سے منع فرمایا، ایک چیز کو حلال فرمایا پھر استثنا کے بعد استثنا فرمائی پھر اس کی حکمت و قدرت کے متعلق بتایا۔ یہ ایسی چیز ہے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت، فوت شدہ کا افسوس، آخرت کا گھر، اس کا ثواب، عقاب، دارین کی فلاح، مجرموں کا ہلاک ہونا، دنیا سے دھوکا کھانے سے ڈرانے کی خبر دی اور دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں قلت سے تعبیر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: 185) ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تمہیں قیامت کے دن پورے اجر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح پہلے، پچھلے اور خوشحال لوگوں کے حالات، ہلاک ہونے والوں کی صفات ایک آیت کے ایک حصہ میں بیان فرما دیئے۔ ارشاد فرمایا: فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (العنکبوت: 40) (پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں سے بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا۔)

اللہ تعالیٰ نے کشتی کے امر، اس کے چلانے، کفار کو ہلاک کرنے اور کشتی کے ٹھہرنے اور اس کے استواء اور آسمان اور زمین کی طرف تسخیر کے اوامر کی توجیہ کے بارے میں بتایا۔ ارشاد فرمایا: وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (ہود)

جب قریش قرآن کی مثل لانے سے عاجز آ گئے تو کہا نبی کریم ﷺ نے یہ خود کہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۴﴾ (الطور) پھر انہیں مزید عاجز کرنے کے لئے یہ اتارا: اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَیٰتٍ (ہود:13) جب وہ عاجز آ گئے تو اس مقدار کو مزید کم کر دیا۔ اس کی سورتوں میں سے چھوٹی سورت کی مثل لے آؤ۔ فرمایا: وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ (البقرہ:23) پس جواب سے وہ عاجز آ گئے اور ان کے اسباب کٹ گئے اور وہ جنگ اور عناد کی طرف پلٹے اور انہوں نے بیوں بچوں کے قیدی ہونے کو ترجیح دی۔ اگر وہ معارضہ پر قادر ہوتے تو یہ ان کے لئے بہت آسان تھا اور حجت میں زیادہ بلیغ اور تاثیر میں زیادہ شدید تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ارباب البلاغت اور صاحب زبان تھے۔ ان سے فصاحت و بلاغت سیکھی جاتی تھی۔

قرآن کی بلاغت احسان کے اعلیٰ طبقات میں ہے اور ایجاز و بیان کے بلند درجات میں ہے بلکہ حسن و عمدگی کی حد سے تجاوز کرتے ہوئے زیادتی و بلندی کے مقام تک پہنچ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم عطا کئے گئے تھے اور آپ غرائب الحکم کے ساتھ مختص تھے۔ جب تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں غور کرے گا جو آپ نے جنت کی صفت میں فرمایا اگرچہ وہ احسان کی انتہا میں ہے لیکن تو اسے قرآن کے رتبہ سے کم پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب کا ارشاد ہے: فیھا ما لا عین رات، ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ (اس میں ایسی نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے سنی ہیں نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے۔)(1)

لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس کو کیا نسبت وَ فِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡهِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ (الزخرف:71) اور ارشاد فرمایا: فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ (السجدۃ:17) یہ وزن کے اعتبار سے اعدل ہے، ترکیب کے اعتبار سے احسن ہے لفظ کے اعتبار سے زیادہ اعذب (میٹھا) ہے اور حروف کے اعتبار سے کم ہے۔ اس کا اعتبار نہیں ہو سکتا مگر سورت کی مقدار میں یا لمبی آیت کی مقدار میں کیونکہ کلام جب طویل ہو تو اس میں متصرف کی مجال کی وسعت ہوتی ہے اور کوتاہ و متکلف پر مقال تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ عربوں پر حجت قائم فرمائی کیونکہ وہ ارباب فصاحت تھے اور معارضت کی جگہ تھے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں اطباء پر حجت قائم ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں جادوگروں پر حجت قائم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معجزات کو مشہور وجہ کے ساتھ زیادہ عمدہ طریقہ کے ساتھ پیش کیا جو اس نبی کے زمانہ میں جس کے اظہار کا ارادہ فرمایا تھا۔ پس جادو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا (تو موسیٰ علیہ السلام کو اس کے مقابلہ کی طاقت بخشی) طب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عروج پر تھی، فصاحت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کمال بلندی پر تھی۔

ان احادیث پر تنبیہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں وضع کی گئی ہیں

قرآن کی سورتوں اور فضائل اعمال کے بارے میں احادیث کے واضعین اور جھوٹی اور باطل اخبار گھڑنے والوں کی

1۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة، حدیث نمبر 3005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہئے۔ ایک پوری جماعت نے ایسی احادیث گھڑنے کا ارتکاب کیا ہے اس ارتکاب میں ان کے اغراض و مقاصد مختلف تھے مثلاً زنادقہ میں سے مغیرہ بن سعید کوفی، محمد بن سعید شامی جس کو زندقہ کی وجہ سے پھانسی چڑھایا گیا تھا۔ انہوں نے احادیث گھڑیں اور ایسی احادیث بیان کیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالیں۔ ان گھڑی ہوئی روایات میں سے محمد بن سعید نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انا خاتم الانبیاء لا نبی بعدی الا ماشاء الله۔ میں انبیاء کا خاتم ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے مگر جو اللہ چاہے۔ وہ الحاد اور زندقہ کی طرف جو بلاتا تھا اس کی وجہ سے استثنا کا اضافہ کر دیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبدالبر نے اس حدیث کو التمہید میں ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کی ہے بلکہ رؤیاء پر استثنا کی تاویل کی ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی خواہش کے لئے احادیث گھڑیں جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ خوارج کے شیخ نے توبہ کرنے کے بعد کہا: یہ احادیث دین ہیں (پہلے) دیکھو تم یہ دین کس سے لے رہے ہو۔ ہم جب کسی امر کی خواہش کرتے تھے اسے حدیث بنا دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے ثواب کی خاطر احادیث گھڑیں جیسا کہ انہوں نے کہا کہ وہ لوگوں کو فضائل اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جس طرح ابوعصمہ بن نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جوبیاری وغیرہم سے روایت کیا گیا ہے۔ ابوعصمہ سے کہا گیا تم نے یہ قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں عن عکرمہ عن ابن عباس کا ارتکاب کیوں کیا؟ تو اس نے کہا: میں نے لوگوں کو دیکھا وہ قرآن سے اعراض کر رہے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی فقہ، محمد بن اسحاق کے مغازی میں زیادہ مشغول ہو رہے ہیں تو میں نے ثواب کی خاطر یہ حدیث گھڑی۔ ابوعمرو عثمان بن صلاح نے اپنی کتاب علوم حدیث میں فرمایا۔ اسی طرح ایک طویل حدیث ابی بن کعب عن النبی ﷺ کے سلسلہ میں قرآن کی ہر ہر سورت کی فضیلت میں گھڑی گئی ہے۔ متلاشی نے اس کے مخرج سے بات کی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اور ایک جماعت نے اس حدیث کو وضع کیا ہے اور اس پر وضع کا اثر ظاہر ہے۔ الواحدی مفسر اور دوسرے مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس روایت کو نقل کرنے میں غلطی کی ہے۔

ایک سائلین اور بھکاری لوگوں کی جماعت نے بھی یہ کام کیا۔ وہ بازاروں اور مساجد میں کھڑے ہوتے تھے اور صحیح اسانید کے ساتھ، جو انہوں نے یاد کر رکھی ہوتی تھیں، رسول اللہ ﷺ پر احادیث منسوب کرتے تھے۔ وہ ان اسانید کے ساتھ جھوٹی روایات بیان کرتے تھے۔ جعفر بن محمد طیالسی نے کہا: مسجد الرصافہ میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے نماز پڑھی ان کے سامنے ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور کہا: حدثنا احمد بن حنبل و یحیی بن معین قالا انبأنا عبدالرزاق قال انبأنا معمر عن قتادة عن انس قال قال رسول الله ﷺ۔ یعنی اس سند کے ساتھ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے حوالہ سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے ہر کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ

سونے کی، پر مرجان کے۔ اس نے بیس ورق کا یہ واقعہ بیان کیا۔ احمد، یحییٰ کی طرف دیکھنے لگے اور یحییٰ، احمد کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: تو نے اسے یہ بیان کی ہے؟ دوسرے نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو یہ سنی بھی اسی وقت ہے۔ وہ دونوں خاموش رہے حتیٰ کہ وہ اپنے قصص سے فارغ ہوا تو یحییٰ نے پوچھا: تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اس نے کہا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ انہوں نے کہا: میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہے۔ ہم نے تو یہ کبھی رسول اللہ کی حدیث میں سنی ہی نہیں۔ اگر تجھے ضرور جھوٹ بولنا ہے تو کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا کر۔ وہ قصہ گو کہنے لگا: تو یحییٰ بن معین ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: میں سنا رہتا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ اب مجھے اس کا یقین ہوا ہے۔ یحییٰ نے پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں۔ اس نے کہا: گویا دنیا میں یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل تمہارے علاوہ نہیں ہیں۔ میں نے اس کے علاوہ گیارہ احمد بن حنبل سے احادیث لکھی ہیں۔ احمد نے اپنے منہ پر اپنی آستین رکھی اور کہا: اسے چھوڑو۔ وہ آدمی ان سے مزاح کرنے والے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ ان تمام گروہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جھوٹ بولے اور دوسرے لوگ جو ان کی طرح تھے انہوں نے بھی جھوٹ بولے۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ رشید کبوتروں کو پسند کرتا تھا اور ان سے کھیلا کرتا تھا۔ اس کو ایک کبوتر ہدیۃً دیا گیا اور اس کے پاس ابوالبختری القاضی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا: حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مقابلہ نہیں ہے مگر اونٹ دوڑانے میں یا گھوڑے دوڑانے میں یا پرندے اڑانے میں۔ اس نے پرندے اڑانے کا ذکر اپنی طرف سے زائد کیا۔ یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر وضع کیا تھا۔ رشید نے اسے عظیم انعام دیا۔ جب وہ چلا گیا تو رشید نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے جان لیا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ اس نے تمام کبوتر ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ اس سے کہا گیا: کبوتروں کا کیا گناہ ہے؟ اس نے کہا: ان کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ پس علماء نے اس کی وجہ سے اور دوسری موضوعات کی وجہ سے بختری کی حدیث کو ترک کر دیا۔ علماء اس کی حدیث کسی حال میں نہیں لکھتے۔

میں کہتا ہوں: اگر لوگ اس پر اکتفا کرتے جو صحاح اور مسانید میں ثابت ہیں جو علماء کے ہاتھوں کتب گردش کرتی ہیں اور جو ائمہ فقہاء نے روایت کی ہیں تو ان کے لئے ان میں کفایت تھی اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کی تحذیر سے نکل جاتے۔ میرے بارے میں حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے (1)۔ (الحدیث) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی امت کو جھوٹ کی بناء پر آگ سے ڈرایا۔ یہ دلیل ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ پر جھوٹ بولا جائے گا۔ پس دین کے دشمنوں کی من گھڑت باتوں سے بچو جو انہوں نے ترغیب و ترہیب میں وضع کی ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان دہ وہ لوگ ہیں جو زہد کی طرف منسوب ہیں اور اپنے گمان میں ثواب کی خاطر حدیثیں گھڑی ہیں۔ لوگوں نے ان کی جھوٹی باتوں کو ان پر اعتماد کی وجہ سے قبول کیا اور ان کی طرف میلان کی وجہ سے ان کی باتوں کو قبول کیا۔ پس وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برایہ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
مسند امام احمد حدیث 2675-2974

قرآن پر طعن کرنے والے کے خلاف حجت اور مصحف عثمان کی زیادتی اور کمی کی بناء پر مخالفت کرنے والے کے خلاف حجت

امت اور ائمہ اہل سنت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے جو حضرت محمد ﷺ بطور معجزہ لے کر آئے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں پر پڑھا گیا ہے، مصاحف میں لکھا گیا ہے، اس کی سورتیں اور آیات علم یقینی کی بنا پر معلوم ہیں اس کے حروف اور کلمات کمی اور زیادتی سے مبرا ہیں۔ یہ قرآن اپنی تعریف میں نہ کسی حد کا محتاج ہے اور نہ کسی شمار کا۔ جس نے اس پر زیادتی یا اس میں کمی کا دعویٰ کیا اس نے اجماع کو توڑا اور لوگوں کو مبہوت کیا اور وہ قرآن جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آتے تھے اس نے اس کا رد کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا رد کیا: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾ (الاسراء) (آپ فرمایئے اگر انس و جن اس قرآن کی مثل لانے پر جمع بھی ہو جائیں تو اس کی مثل نہیں لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔)

اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کو رد کیا کیونکہ اس طرح تو قرآن ان کی مقدور میں ہوگا۔ جب باطل کی اس میں ملاوٹ کی گئی ہوگی جب وہ اس پر قادر ہوں گے تو نہ حجت رہے گا نہ نشانی، اور معجزہ ہونے سے بھی خارج ہو جائے گا۔ پس جو کہتا ہے قرآن میں کمی اور زیادتی ہے تو وہ کتاب اللہ کو رد کرنے والا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اس کا انکار کرنے والا ہے جیسے کوئی کہتا ہے فرض نمازیں پچاس ہیں، نو عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے، اللہ نے رمضان کے ساتھ اور کچھ دن کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو دین میں ثابت نہیں ہیں اس نے اجماع کا رد کیا۔ قرآن پر اجماع، زیادہ مؤکد، زیادہ لازم اور زیادہ واجب تھا۔

امام ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار محمد انباری نے کہا: اہل فضل و عقل ہمیشہ سے قرآن کے شرف اور اس کے بلند مرتبہ کے معترف رہے ہیں۔ حق، انصاف اور دیانت جس کو ثابت کرتی ہے اور مبطلین کے قول، ملحدین کی ملمع سازی اور زائغین کی تحریف کی اس سے نفی کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں یہ ملت اسلامیہ سے دور شخص نکلا اور امت پر حملہ آور ہوا اس حملہ کے ساتھ وہ اس شریعت کو باطل کرنے کا ارادہ کرتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تائید فرماتا رہا ہے اور اس کی بنیاد کو ثابت فرمایا ہے اور اس کی شاخوں کو بڑھایا ہے اور ظالموں کے معایب سے اور اہل عداوت و کفر کی سازشوں سے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

وہ کہتا ہے: یہ مصحف جو حضرت عثمان نے جمع فرمایا تھا جبکہ حضرت عثمان کے فعل کے صائب ہونے پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ وہ پورے قرآن پر مشتمل نہیں ہے کیونکہ اس سے پانچ سو حروف ساقط ہو گئے ہیں۔ میں نے بعض کا ذکر کیا ہے اور باقی کا بعد میں ذکر کروں گا ان میں سے بعض یہ ہیں: والعصر و نوائب الدھر۔ وہ کہتا ہے: مسلمانوں نے نوائب الدھر کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ اَتٰىهَاۤ

اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ و ما كان الله يهلكها الا بذنوب اهلها۔ یہ انسان دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن سے یہ بھی ساقط ہو گیا ہے (و ما کان الله یھلکھا الا بذنوب اھلھا) اس نے بہت سے حروف کا دعویٰ کیا ہے۔

اور اس نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمان اور صحابہ نے قرآن میں ایسی زیادتی کی ہے جو قرآن سے نہیں ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا اور لوگ سنتے رہے، الله الواحد الصمد۔ اس نے (قل ھو) قرآن سے ساقط کر دیا اور (احد) لفظ میں تبدیلی کی اور دعویٰ کیا کہ یہ درست ہے اور جس پر لوگ قائم ہیں وہ باطل اور محال ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا: قل للذین کفروا لا اعبد ما تعبدون۔ اور اس نے مسلمانوں کی قراءت پر طعن کیا ہے۔

اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مصحف جو ہمارے ہاتھوں میں ہے حروف کی تصحیف پر مشتمل ہے اس میں فساد اور تغیر ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے: اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۱۸﴾ (المائدہ) اس آیت میں حکمت اور عزت، مغفرت کے مناسب نہیں ہیں۔ صحیح یہ ہے وان تغفر لھم فانك انت الغفور الرحیم اس کے ذریعے گمراہی کو اس میں ڈالا اور اشکال پیدا کیے حتیٰ کہ اس نے دعویٰ کیا مسلمان اس آیت میں تبدیلی کرتے ہیں۔ وَكَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ وَجِيۡهًا ﴿۶۹﴾ (الاحزاب: 69) جب کہ اس کے نزدیک درست یہ ہے جس میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ و کان عبد الله وجیھا۔ حتیٰ کہ اس نے فرض نماز میں پڑھا ہمیں اس جماعت نے بتایا جنہوں نے اس سے سنا اور اس کے پاس موجود تھے۔ لا تحرك به لسانك ان علینا جمعه و قراءته فاذا قراناه فاتبع قراءته ثم ان علینا نبا به۔ ہمیں دوسرے لوگوں نے کئی اور لوگوں سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے اسے یہ پڑھتے ہوئے سنا: ولقد نصرکم الله ببدر بسیف علیؓ و انتم اذلة۔ اور ان لوگوں نے ہمیں اس سے روایت کیا کہ اس نے کہا: ھذا صراط علی مستقیم اور انہوں نے بتایا کہ اس نے قرآن کی آیت میں ایسی چیز داخل کی جو رسول الله ﷺ کی فصاحت کے مناسب نہیں اور یہ اس قوم کی زبان میں داخل ہے جن کے متعلق الله تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ (ابراہیم: 4) اس نے أأنت قلت للناس کی جگہ الیس قلت للناس پڑھا ہے۔ یہ اعراب دینے والوں سے معروف نہیں اور نہ نحویوں کے مذاہب پر محمول ہے کیونکہ عرب لیس قمتَ نہیں کہتے۔ اور رہا لستَ قمتَ تاء کے ساتھ تو یہ شاذ، قبیح، خبیث اور ردی لغت ہے کیونکہ لیس فعل ماضی کی نفی نہیں کرتا اور اس کی مثل نہیں پایا جاتا مگر ان کے قول میں ألیس قد خلق الله مثلھم۔ یہ شاذ لغت ہے کتاب الله کو اس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ اس شخص نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن جمع کرنے کا معاملہ حضرت زید بن ثابت کے سپرد کیا تو صحیح نہیں کیا۔ کیونکہ حضرت عبد الله بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب حضرت زید سے اولیٰ اور بہتر تھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری امت کا بڑا قاری ابی بن کعب ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کو قرآن پہلی قرأت پر پڑھنا خوش کرے جیسا کہ وہ نازل ہوا تھا تو وہ ابن ام عبد کی قراءت کے ساتھ پڑھے۔ وہ کہتا ہے: میں مصحف عثمان کی مخالفت کرتا ہوں جس طرح ابو عمرو بن العلاء نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے پڑھا: (انّ ھذین) (فاصدق و اکون) (و بشر عبادی الذین) فما اتانی الله (یاء کے فتح کے ساتھ) اور مصحف میں ہے ان ھذان (الف کے ساتھ ہے) فاصدق و اکن (بغیر واؤ کے ہے) فبشر

عباد۔ مما اتان اللہ (دونوں جگہ یاء کے بغیر ہے) اور جس طرح ابن کثیر، نافع، حمزہ اور کسائی نے عثمان کے مصحف کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے پڑھا: کذالك حقا علینا ننج المومنین۔ دونوں نونوں کے اثبات کے ساتھ، بعض نے دوسرے نون کو فتح دیا، بعض نے اسے ساکن کیا اور مصحف میں ایک نون ہے (1)۔ جیسا کہ حمزہ نے مصحف عثمان کی مخالفت کی۔ اس نے پڑھا: (أتمدون بمال) ایک نون کے ساتھ اور یاء پر وقف کیا اور مصحف عثمانی میں دو نون ہیں اور ان کے بعد یاء نہیں ہے۔ جس طرح حمزہ نے مصحف عثمانی کی مخالفت کی اور پڑھا: الا ان ثمودا کفروا ربھم بغیر تنوین کے اور الف کے اثبات کے ساتھ جو تنوین کا موجب ہوتا ہے اور ان تمام صورتوں میں قراء پر تنقید کی ہے جن کی وجہ سے مصحف کا خلاف لازم آتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے پہلے اس تعداد کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں مصاحف کا اختلاف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔

ابوبکر نے کہا: اس شخص نے ذکر کیا کہ ابی بن کعب وہ ہے جس نے پڑھا: (کان لم تغن بالامس و ما کان اللہ لیھلکھا الا بذنوب اھلھا) اور یہ باطل ہے کیونکہ عبداللہ بن کثیر نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا: (حصیدا کان لم تغن بالامس کذالك نفصل الایات) ایک روایت میں ہے حضرت ابی بن کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑھا۔ یہ سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہے۔ اہل عدالت وصیانت نے اس کو نقل کیا ہے جب ایک امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح مروی ہو تو اسے اس حدیث کی وجہ سے نہیں لیا جائے گا جو اس کی مخالف ہو۔ یحییٰ بن مبارک یزیدی نے کہا: میں نے قرآن ابی عمرو بن العلاء پر پڑھا، ابو عمرو نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا، حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا اور حضرت ابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑھا اور اس میں یہ نہیں ہے: و ما کان اللہ لیھلکھا الا بذنوب اھلھا جس نے انکار کیا کہ یہ زیادتی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر نازل کی ہے تو وہ کافر اور گناہگار نہیں۔

مجھے ابی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں نصر بن داؤد صاغانی نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا فرمایا: جو حروف مروی ہیں اور وہ اس مصحف کے مخالف ہیں جس پر اجماع ہے ان حروف میں سے جن کی اسانید کو خاص لوگ جانتے ہیں عام نہیں جیسا انہوں نے حضرت ابی سے نقل کئے ہیں: و ما کان اللہ لیھلکھا الا بذنوب اھلھا کے حروف بھی ان میں سے ہیں اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے، لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم فی مواسم الحج اور اس میں سے جو حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ غیر المغضوب علیھم و غیر الضالین پڑھتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں اہل علم نے یہ نقل نہیں کیا کہ ان کے ساتھ نماز جائز ہے اور نہ یہ نقل کیا ہے کہ یہ مصحف عثمان کے معارض ہیں کیونکہ یہ اگر کوئی اس کا انکار کرے کہ یہ قرآن سے ہیں تو کافر نہیں ہوگا۔ اور قرآن وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے جمع کیا انہیں صحابہ کی موافقت بھی حاصل تھی۔ اگر اس کے کسی حصہ کا انکار کیا تو وہ کافر ہوگا اس کا حکم مرتد کا حکم ہوگا اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔ اگر وہ توبہ

1۔ مصحف میں دونوں ہیں۔

کرے تو فبہا ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ ابو عبید نے کہا: حضرت عثمان کا قرآن جمع کرنے کا کام ہمیشہ سے آپ کے بڑے مناقب میں شمار ہوتا رہا بعض کج فہموں نے آپ کے اس کام پر طعن کیا۔ پس اس کا پردہ چاک ہوا اور شرمندہ ہوا۔

ابو عبید نے کہا: مجھے یزید بن زریع عن عمران بن جریر عن ابی مجلز کے سلسلہ سے بتایا گیا ہے، فرمایا: ایک قوم نے اپنی حماقت کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن جمع کرنے پر طعن کیا پھر انہوں نے نسخ شدہ قرآن پڑھا۔ ابو عبید نے کہا: ابو مجلز اس طرف گئے ہیں کہ حضرت عثمان نے جو ساقط کیا تو علم کے ساتھ ساقط کیا جس طرح جو ثابت کیا تو علم کے ساتھ ثابت کیا۔ ابو بکر نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) میں ایسے شخص کے کفر پر دلالت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تغییر و تبدیل سے حفاظت فرمائی ہے اور زیادتی اور کمی سے حفاظت فرمائی ہے، جب کوئی قاری تبت یدا ابی لھب و قد تب ما اغنی عنه ماله و ما کسب سیصلی ناراً ذات لھب و مریته حمالة الحطب فی جیدھا حبل من لیف پڑھے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا اور ایسی بات کہی جو اس نے نہیں کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدلا اور اس میں تحریف کی اور اس نے اس کا ارادہ کیا جس سے اس نے قرآن کی حفاظت فرمائی اور اختلاط سے منع فرمایا۔ اس عمل میں جو اس نے کیا ملحد لوگوں کے لئے راستہ ہموار کیا تا کہ وہ قرآن میں ایسی چیز کو داخل کریں جس کے ساتھ وہ اسلام کے امر کو گدلا کریں اور وہ اس قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے وہ قوم جنہوں نے اس کو اباطیل کے ساتھ ان پر پھیرا۔ اس میں اس اجماع کا ابطال ہے جس کے ساتھ اسلام کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ثبات کے ساتھ نمازوں کا قیام ہوتا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی ہوتی ہے اور عبادات کا قصد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) میں ایسے انسان کی بدعت پر اور کفر کی طرف خروج پر دلالت ہے۔ کیونکہ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کا معنی مخلوق کو اس قدرت سے روکنا ہے کہ وہ ان پر اضافہ کر سکیں یا اس سے کمی کر سکیں یا اس کا معارض پیش کر سکیں، ہم نے اس انسان کو پایا کہ اس نے اس میں یہ زیادتی کی ہے و کفی الله المومنین القتال بعلی و کان الله قویا عزیزا۔ اور قرآن میں اس نے جھوٹ بولا۔ اور اس نے حضرت علی کا ایسی جگہ ذکر کیا اگر آپ اس کو یہ ذکر کرتے ہوئے سن لیتے تو آپ اس پر حد جاری فرماتے اور اس کے قتل کا حکم دیتے۔ اس نے اللہ کے کلام سے (قل ھو) کو ساقط کر دیا اور (احد) کو تبدیل کیا اور الله الواحد الصمد پڑھا جو اس نے ساقط کیا اس کا اسقاط اس کی نفی ہے اور کفر ہے اور جس نے قرآن کے ایک حرف کا کفر کیا تو اس نے سارے قرآن کا کفر کیا اور آیت کا معنی باطل کر دیا کیونکہ اہل تفسیر نے کہا: یہ آیت اہل شرک کے رد میں نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا ہمارے لئے اپنے رب کی صفت بیان کیجئے کیا وہ سونے کا ہے یا تانبے کا ہے یا کسی اور دھات کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اور ھو میں رد اور جواب پر دلالت ہے۔ جب وہ ساقط ہوا تو آیت کا معنی ہی باطل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ پر افترا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب واقع ہوئی۔ اس انسان کو اور اس کے مددگاروں کو کہا جائے گا ہمیں اس قرآن کے متعلق بتاؤ جو ہم پڑھتے ہیں اور ہم اور ہم سے پہلے اسلاف اس کے علاوہ کو نہیں جانتے۔ کیا وہ اول سے آخر تک پورے قرآن پر مشتمل ہے الفاظ صحیح اور معانی فساد اور خلل سے خالی ہیں؟ یا وہ بعض قرآن پر واقع ہے اور بعض ہم سے غائب

ہے جیسا کہ ہمارے اسلاف سے غائب تھا اور ہماری ملت کے پہلے لوگوں سے غائب تھا؟ اگر وہ جواب دیں کہ قرآن جو ہمارے پاس ہے وہ تمام قرآن پر مشتمل ہے اس سے کوئی چیز ساقط نہیں ہے لفظ صحیح ہیں اور معانی بھی صحیح ہیں اور ہر زلل خلل سے سلامت ہیں تو انہوں نے خود ہی اپنے اوپر کفر کا فیصلہ کر لیا۔ جب انہوں نے اس میں زیادتی کی فلیس لہ الیوم ھاھنا حمیم و لیس لہ شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم اس سے زیادہ واضح قرآن میں زیادتی کون سی ہوگی اور قرآن میں اور ملاوٹ کیسی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اسے محفوظ فرمایا ہے اور ہر مفتری اور مبطل کو اس کے ساتھ ایسے الحاق سے منع فرمایا ہے۔ جب اس کے معنی میں غور و فکر کیا گیا تو وہ فاسد اور غیر صحیح نکلا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ ملتا ہے اور نہ معنی اس کے موافق ہے کیونکہ اس کے بعد ہے لَّا يَأْكُلُهُۥٓ إِلَّا ٱلْخَٰطِـُٔونَ ۝ (الحاقہ) شراب کو کیسے کھایا جاتا ہے اور وہ جو اس نے پہلے کہا: فلیس لہ الیوم ھاھنا حمیم و لیس لہ شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم لا یاکلہ الا الخاطئون۔ یہ کلام ایک دوسرے کی مناقض ہے کیونکہ شراب کھائی نہیں جاتی۔ عرب یہ نہیں کہتے: اکلت الماء (میں نے پانی کھایا) بلکہ وہ کہتے ہیں شربتہ و ذقتہ و طعمتہ۔ اس کا معنی اللہ تعالیٰ نے صحیح قرآن میں اتارا ہے۔ جس نے ایک حرف کی مخالفت کی اس نے کفر کیا۔ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ (الحاقہ) غسلین کو نہیں کھائیں گے مگر خطا کار، یا یہ کھانا نہیں کھائیں گے مگر خطا کار۔ غسلین، پیٹ وغیرہ سے جو پیپ نکلتی ہے۔ یہ کھانا بطور سزا کھلایا جائے گا۔ اور پینے والی چیز کا کھانا محال ہوتا ہے اگر یہ انسان دعویٰ کرے کہ یہ باطل جو اس نے اپنے قول سے زائد کیا ہے (من عین تجری من تحت الجحیم) اس کے بعد لَّا يَأْكُلُهُۥٓ إِلَّا ٱلْخَٰطِـُٔونَ ۝ (الحاقہ) نہیں ہے۔ اور اس نے اس آیت کی قرآن سے نفی کر دی تا کہ اس کی زیادتی صحیح ہو جائے تو اس نے کفر کیا کیونکہ اس نے قرآن کی ایک آیت کا انکار کیا۔ تیرے لئے یہ سب اس کے قول کو رد کرنے اور اس کے کلام کو رسوا کرنے کے لئے کافی ہے اور صحابہ اور تابعین سے جو مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ایسا پڑھا وہ بطور بیان اور تفسیر ہے نہ کہ وہ قرآن ہے جو پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ آیات جن کے الفاظ اور حکم یا لفظ منسوخ ہیں لیکن ان حکم نہیں وہ قرآن نہیں۔ اس کا مزید بیان مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ (البقرہ:106) کے تحت آئے گا۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

اس کے متعلق بارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: ہر قراءت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے أَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا حکم دیا فرمایا۔ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ۝ (النحل) یعنی جب تو تلاوت کرنے کا ارادہ کرے۔ مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ جیسا شاعر نے کہا

وانی لاتیکم لذکری الذی مضی　　من الود و استئناف ما کان فی غد

اس شعر میں مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ ما یکون کی جگہ ما کان استعمال کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر سے ہر دو فعل معنی میں قریب قریب ہوں تو جائز ہے جس کو چاہیں مقدم کر دیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ

دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ (النجم) اس کا معنی ہے فتدلی ثم دنا۔ اس کی مثل ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر) یہ قرآن میں کثیر ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا امر استحبابی ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق نماز کے علاوہ ہر قراءت میں اور نماز میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ نقاش نے عطاء سے حکایت کیا ہے استعاذہ واجب ہے۔ ابن سیرین، نخعی اور ایک اور جماعت نماز کی ہر رکعت میں تعوذ پڑھتے تھے اور استعاذہ میں عموم پر الله تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نماز میں پہلی رکعت میں تعوذ پڑھتے ہیں اور وہ پوری نماز کی قراءت کو ایک قراءت کی طرح سمجھتے ہیں اور امام مالک فرضی نماز میں تعوذ پڑھنے کا نظریہ نہیں رکھتے اور قیام رمضان میں اس کے پڑھنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اجماع ہے کہ تعوذ قرآن سے نہیں ہے اور نہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ یہ قرآن کے قاری کا قول ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ جمہور کے نزدیک تعوذ کے یہی الفاظ ہیں کیونکہ یہ کتاب الله کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم کہا تو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن ام عبد!، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مجھے جبریل نے لوح محفوظ کے واسطہ سے قلم سے اسی طرح پڑھایا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ عمرو نے کہا: مجھے معلوم نہیں یہ کون سی نماز تھی۔ آپ نے کہا: الله اکبر کبیراً الله اکبر کبیراً (تین مرتبہ) الحمد للہ کثیراً الحمد للہ کثیراً (تین مرتبہ) سبحان الله بکرۃ و اصیلاً (تین مرتبہ) اعوذ باللہ من الشیطان من نفخہ و نفثہ و ہمزہ۔ عمرو نے کہا: ہمزہ سے مراد مرگی، نفثہ سے مراد شعر اور نفخ سے مراد کبر ہے (1)۔ ابن ماجہ نے کہا: الموتۃ سے مراد جنون ہے اور النفث سے مراد بغیر تھوک کے پھونک مارنا ہے اور الکبر سے مراد بھٹکنا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھتے تو الله اکبر کہتے پھر تین بار لآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے اور الله اکبر کبیراً بھی تین بار کہتے پھر اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من ہمزہ و نفخہ و نفثہ پھر قراءت کرتے (2)۔

سلیمان بن سالم نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ استعاذۃ یہ ہے: اعوذ باللہ العظیم من الشیطان الرجیم ان الله ھو السمیع العلیم بسم الله الرحمن الرحیم۔ ابن عطیہ نے کہا: پڑھنے والوں نے اسم کی صفت میں بہت زیادہ تبدیلی کی ہے جیسے بعض نے کہا: اعوذ باللہ المجید، من الشیطان المرید۔ اس قسم کو میں نہ تو اچھی بدعت کہتا ہوں اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ یہ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5: مہدوی نے کہا: قراء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سورہ الحمد کی قراءت سے پہلے استعاذہ کا اظہار کیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما یستفتح بہ الصلاۃ، حدیث نمبر 651، سنن ابن ماجہ، باب الاستعاذۃ فی الصلاۃ، حدیث نمبر 798، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب تفریع استفتاح الصلاۃ، باب ما یستفتح بہ الصلاۃ، حدیث نمبر 658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا مگر حمزہ نے اس کو مخفی کیا ہے۔ سدی نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے کہ وہ قراءت بسم اللہ سے شروع کرتے تھے۔ ابو لیث سمرقندی نے بعض مفسرین سے روایت کیا ہے کہ تعوذ فرض ہے۔ جب قاری بھول جائے اور بعد میں اسے یاد آئے تو تلاوت چھوڑ کر اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر ابتدا سے قرأت کرے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر اسی جگہ سے شروع کرے جہاں وقف کیا تھا۔ پہلا قول حجاز اور عراق کے علماء کا ہے اور دوسرا قول شام اور مصر کے علماء کا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: زہراوی نے حکایت کیا ہے: یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی، نماز میں ہم استعاذہ کو مستحب سمجھتے ہیں، فرض نہیں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا پھر ہم نے آپ کی پیروی کی۔

مسئلہ نمبر 7: حضرت ابوہریرہ سے قراءت کے بعد استعاذہ پڑھنا مروی ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے۔ ابوبکر بن عربی نے کہا: قوم کو بے علمی نے یہاں تک پہنچادیا کہ انہوں نے کہا: جب قاری قرآن کی قراءت سے فارغ ہو جائے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت سے پہلے نماز میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھتے تھے۔ یہ نص ہے اگر کہا جائے کہ قراءت کے وقت شیطان سے پناہ مانگنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو ہم کہیں گے: ایک فائدہ تو حکم الٰہی کی پیروی ہے۔ شرعیات کا فائدہ امر کی اطاعت کرتے ہوئے وفا کے حق کو قائم کرنا اور نہی کی صورت میں اس سے اجتناب کر کے حق کو پورا کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قراءت کے وقت شیطان کے وسوسہ سے پناہ مانگ کر حکم کی پیروی کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج: 52) ابن عربی نے کہا: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل) کی تفسیر میں امام مالک کا قول ہم نے بہت عجیب پایا۔ انہوں نے کہا: جو نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھے اس کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ یہ ایسا قول ہے جس کے بارے میں کوئی اثر نہیں ہے اور نہ اس کی تائید میں کوئی نظر ہے۔ اگر یہ اسی طرح ہے جس طرح لوگوں نے کہا کہ استعاذہ قراءت کے بعد ہے تو اس کی نماز میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے ساتھ تخصیص بے بنیاد دعویٰ ہے۔ مالک کی اصل درست نہیں ہے نہ اسکو فہم تسلیم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روایت کے راز کو بہتر جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: تعوذ کی فضیلت: مسلم نے سلیمان بن صرد سے روایت کیا ہے، دو شخصوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آپس میں جھگڑا کیا۔ ایک اتنا غصہ میں تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس کا یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (1)

ایک شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا وہ اس کے پاس گیا اور کہا: کیا تو جانتا ہے جو ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے؟

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس سے یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب صفۃ ابلیس وجنودہ، حدیث نمبر 3040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ وہ شخص کہنے لگا: کیا تو مجھے مجنون دیکھتا ہے (کہ میں یہ کلمہ کہوں) اس حدیث کو بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔
مسلم نے عثمان بن ابی عاص ثقفی سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اسے مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شیطان ہے جسے خنزب کہا جاتا ہے۔ جب تو اسے محسوس کرے تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگ اور اپنی بائیں طرف تین دفعہ تھوک دے۔ عثمان بن ابی عاص فرماتے ہیں: میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے دور کر دیا (1)۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کرتے اور کسی جگہ رات گزارتے تو یہ پڑھتے۔ یَا اَرْضُ رَبِّیْ وَ رَبُّكِ اللّٰهُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فِیْكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا یَدِبُّ عَلَیْكِ وَ مِنْ اَسَدٍ وَ اَسْوَدَ وَ مِنَ الْحَیَّةِ وَ الْعَقْرَبِ وَ مِنْ سَاكِنِی الْبَلَدِ وَ وَالِدٍ وَ مَا وَلَدَ۔ (2)
ترجمہ:۔ اے زمین میرا اور تیرا رب اللہ ہے میں تیرے شر اور اللہ تعالیٰ نے جو تجھ میں پیدا کیا اس کے شر سے اور جو تجھ پر رینگتا ہے اس کے شر شیر، ناگ، سانپ، بچھو، بستی والوں اور باپ اور اولاد کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔
حضرت خولہ بنت حکیم نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: جو کسی جگہ اترے پھر یہ کہے: اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ تو اسے کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی (3)۔ اس حدیث کو موطا، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ جن کلمات کے ساتھ پناہ مانگی جاتی ہے وہ احادیث میں کثرت سے ثابت ہیں۔ واللہ المستعان۔

مسئلہ نمبر 9: استعاذہ کا معنی عرب کلام میں پناہ لینا ہے کسی کی طرف جگہ لینا ہے یعنی مکروہ چیز سے بچنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عُذْتُ بفلان و اسْتَعَذْتُ بہ یعنی میں نے اس کی بارگاہ میں پناہ لی وہ میری پناہ گاہ ہے۔ و اعذتُ غیری بہ وعوّذتہ دونوں ہم معنی ہیں کہا جاتا ہے أعوذ باللہ منک۔ اس کا معنی ہے: میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ راجز نے کہا:

قالت و فیها حیدة وذعر عوذ بربی منکم و حجر

عرب ناپسندیدہ امر کے وقت کہتے ہیں: حجراً لہ یعنی دفعاً لہ۔ یہ کسی امر سے پناہ مانگنے کے لئے ہوتا ہے۔ العوذۃ والمعاذۃ والتعویذ تمام کا معنی ہے پناہ لینا۔ اعوذ اصل میں اَعْوُذُ تھا۔ ضمہ کو عین کی طرف نقل کیا کیونکہ واؤ پر ثقیل تھا پس واؤ ساکن ہو گئی۔

مسئلہ نمبر 10: شیطان کی جمع شیاطین جمع مکسر ہے، اس کا نون اصلی ہے کیونکہ یہ شطن سے مشتق ہے جب کوئی خیر سے دور ہو تو شطن بولتے ہیں و شطنت دارہ اس کا گھر دور ہے۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسۃ فی الصلاۃ
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل، حدیث نمبر 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ موطا امام مالک، کتاب الاستئذان، باب ما یؤمر بہ من الکلام فی السفر

نأتْ بسعاد عنك نوى شطون   فبانت والفؤاد بها رهين

بئرٌ شطون ایسا کنواں جو بہت گہرا ہو۔ الشطن رسی کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اس کی دونوں طرفیں دور ہوتی ہیں۔ ایک اعرابی نے اپنے سرکش گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا: کانہٗ شیطان فی اشطان۔ شیطان کو شیطان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے دور ہوتا ہے اور سرکش ہوتا ہے۔ جن، انس اور جانوروں میں ہر سرکش کو شیطان کہا جاتا ہے۔ جریر نے کہا:

ایام یدعوننی الشیطان من غزل   و هن یهویننی اذ کنت شیطانا

بعض علماء نے فرمایا: شیطان، شاط یشیط سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ہلاک ہونا اور نون زائدہ ہے اور شاط کا معنی جلنا بھی ہے شیطتُ اللحم۔ میں نے گوشت کو پکایا۔ اشتاط الرجل، جب کوئی شخص انتہائی غصہ میں ہو۔ ناقة مشیاط جو موٹا پا ہو۔ اشتاط کا معنی ہے ہلاک ہونا، اعشیٰ نے کہا:

قد نخضب العیر من مکنون فائله   و قد یشیط علی ارماحنا البطل

اس شعر میں ہلاکت کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس قول والے علماء پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ عرب کہتے ہیں تشیطن فلان۔ جب کوئی شیطانوں والے افعال کرے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یہ شطن سے تفیعل کا وزن بنایا گیا ہے۔ اگر یہ شاط سے ہوتا تو تشیط کہتے۔ اسی طرح امیہ بن ابی صلت کا شعر بھی ان کا رد کرتا ہے۔

ایما شاطن عصاہ عکاہ   و رماہ فی السجن والاغلال

اس شعر میں شاطن، شطن سے مشتق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 11: الرجیم، خیر سے دور، ذلیل۔ الرجم کی اصل پتھر مارنا ہے قد رجمتُہ ارجمُہ، فھو رجیم و مرجوم کا معنی پتھر مارنا ہے۔

الرجیم کا معنی قتل کرنا، لعنت کرنا، دھتکارنا اور گالی دینا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ تمام معانی بیان کئے گئے ہیں لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ یٰنُوۡحُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِيۡنَ ۝ (الشعراء) اور حضرت ابراہیم کے باپ کا قول ہے: لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ (مریم:46) اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 12: اعمش نے ابو وائل سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صفا کے پاس دیکھا۔ آپ ایک شخص کی طرف متوجہ تھے جو ہاتھی کی صورت میں تھا۔ آپ اسے لعنت کر رہے تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کون تھا جس کو آپ لعنت کر رہے تھے؟ فرمایا: یہ الشیطان الرجیم ہے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! اللہ کی قسم! میں تجھے قتل کروں گا اور امت کو تجھ سے راحت دوں گا۔ شیطان نے کہا: یہ میری تمہاری طرف سے کیا جزا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! میری طرف سے تیری کیا جزا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! تجھ سے کوئی دشمنی نہیں کرتا مگر میں اس کے باپ کے ساتھ اس کی ماں کے رحم میں شریک ہوا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس میں اٹھائیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: علماء نے فرمایا بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہمارے رب کی طرف سے قسم ہے۔ اس نے ہر سورت کے آغاز پر اس کو نازل فرمایا اس نے اپنے بندوں کے لئے قسم اٹھائی کہ یہ میں نے تمہارے لئے رکھی ہے۔ اے میرے بندو! اس سورت میں حق ہے اور میں تمہارے لئے وہ تمام وعدے، لطف اور بھلائی پوری کروں گا جو اس سورت میں ہے اور بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں اتارا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد خصوصی طور پر اس امت پر اسکو اتارا۔ بعض علماء نے فرمایا: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ تمام شرع کو متضمن ہے کیونکہ یہ ذات اور صفات پر دلالت کرتی ہے اور یہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 2: حضرت سعید بن ابی سکینہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اسے فرمایا: اسے عمدہ طریقہ سے لکھو، ایک شخص نے اسے عمدہ طریقہ سے لکھا تو اس کی بخشش کردی گئی (1)۔ حضرت سعید نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک شخص نے ایک کاغذ میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ دیکھی تو اسے بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں پر لگایا تو اس کی بخشش کردی گئی۔ اسی مفہوم میں بشر حافی کا واقعہ ہے۔ انہوں نے جب وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا جس میں بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اسے خوشبو لگائی تو اس کے نام کو خوشبو لگائی گئی۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔

امام نسائی نے ابوملیح سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھنے والے سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تیری سواری ٹھوکر کھائے تو تعس الشیطان (شیطان تباہ ہو) نہ کہو وہ بڑا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کمرے کی مثل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اپنی طاقت سے یہ کیا لیکن تم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہو کیونکہ اس سے وہ چھوٹا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مکھی کی مثل ہو جاتا ہے۔ حضرت علی بن حسین نے اپنی تفسیر میں وَ اِذَا ذَكَرۡتَ رَبَّكَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا ۝ (الاسراء) کے تحت فرمایا اس کا مطلب ہے جب تم بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھتے ہو۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابووائل سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو ارادہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کے انیس فرشتوں سے نجات عطا فرمائے تو وہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ ہر ایک فرشتے سے ڈھال بنا دے گا۔ بِسۡمِ اللّٰہِ کے دوزخ کے فرشتوں کی تعداد کے برابر انیس حروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے بارے فرمایا: علیها تسعة عشر۔ وہ اپنے ہر فعل میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہتے ہیں یہی ان کی قوت ہے اور بسم اللہ کے ساتھ وہ قوت حاصل کرتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی مثال ان کا قول لیلۃ القدر کے بارے میں ہے وہ ستائیسویں کی رات ہے کیونکہ انا انزلناہ سورت کے کلمات سے (ھی) کا لفظ ستائیسواں کلمہ ہے۔ اس کی مثال ان فرشتوں کی تعداد میں بھی ہے جنہوں نے ربنا ولك الحمد حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه کہنے والے کے اس قول کو لکھنے میں جلدی کی، اس کلمہ

1۔ شعب الایمان، بیہقی، 2667

کے تیس سے زیادہ حروف ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو جلدی کرتے ہوئے دیکھا کہ پہلے کون لکھتا ہے (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ عمدہ تفسیر ہے لیکن پختہ علم سے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3: شعبی اور اعمش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ باسمك اللهم لکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کو بِسْمِ اللهِ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ پس آپ نے بِسْمِ اللهِ لکھا پھر جب قُلِ ادْعُوا اللهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110) نازل ہوا تو آپ نے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ لکھا جب اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (النمل) نازل ہوا تو آپ نے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا اور مصنف ابو داؤد میں ہے امام شعبی، ابو مالک، قتادہ، ثابت بن عمارہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں لکھا حتیٰ کہ سورہ النمل نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 4: امام جعفر الصادق سے مروی ہے، فرمایا: بِسْمِ اللهِ، سورتوں کے تاج ہیں میں کہتا ہوں یہ دلیل ہے کہ یہ نہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ علماء کے اس کے متعلق تین مختلف اقوال ہیں۔

۱- یہ نہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

۲- یہ ہر سورت کی آیت ہے۔ یہ عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے۔

۳- امام شافعی نے فرمایا: یہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور باقی سورتوں کے بارے میں انہیں تردد ہے۔ کبھی فرمایا: ہر سورہ کی آیت ہے کبھی فرمایا: یہ صرف سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سورۃ النمل کی آیت ہے۔

امام شافعی نے دار قطنی کی اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے جو ابو بکر حنفی نے عبد الحمید بن جعفر سے انہوں نے نوح بن ابی بلال سے انہوں نے سعید بن ابی سعید مقبری سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب تم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی قراءت کرو تو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھو یہ ام القرآن ہے، ام الکتاب ہے السبع المثانی ہے اور بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس کی آیت میں سے ایک آیت ہے۔

عبد الحمید بن جعفر نے اس حدیث کو مرفوع بیان کیا ہے اور عبد اللہ کو احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید اور یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابو حاتم نے اس کے بارے فرمایا: اس کا محل صدق ہے۔ سفیان ثوری اس کو ضعیف قرار دیتے تھے اور ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ نوح بن ابی بلال ثقہ مشہور ہے۔

ابن مبارک کی حجت اور امام شافعی کے ایک قول کی حجت مسلم کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے آپ کو اونگھ آ گئی۔ پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کو کس نے ہنسایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے پڑھا: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ حدیث ذکر فرمائی۔ مکمل ان شاء اللہ سورۃ کوثر میں آئے گی۔

1۔ صحیح بخاری، باب فضل اللهم ابنائك الحمد، حدیث نمبر 757، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 5: ان اقوال میں سے صحیح قول امام مالک کا ہے کیونکہ قرآن اخبار احاد سے ثابت نہیں ہوتا، اس کا طریق تواتر قطعی ہے جس میں اختلاف نہیں ہوتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے قرآن نہ ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس میں لوگوں کا اختلاف ہے اور قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔ صحیح اخبار جن میں کوئی طعن نہیں ہے وہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی آیت ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی اور جب بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی۔ اور کبھی فرمایا میرے بندے نے میری طرف اپنا معاملہ سپرد کیا۔ اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا، جب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ○ - فرمایا یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا(1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ قسمت الصلوۃ۔ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے یعنی سورۂ فاتحہ کو تقسیم کیا۔ سورۃ فاتحہ کو صلاۃ کہا کیونکہ نماز اس کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ پہلی تین آیات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائیں اور انہیں اپنے ساتھ خاص کیا، اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ پھر چوتھی آیت اپنے اور اپنے بندے کے درمیان فرمائی کیونکہ وہ آیت بندے کے تذلل اور اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرنے کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے پھر تین آیات سات آیات کا تتمہ ہیں۔ جو چیز ان آیات کے تین ہونے پر دلیل ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ھؤلاء لعبدی (یہ میرے بندے کے لئے ہیں) یہ حدیث مالک نے نقل کی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ (ھاتان) یہ دلیل ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ ابن بکیر نے کہا: امام مالک نے فرمایا اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ پھر ساتویں آیت آخر تک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو آپ نے ابی کو فرمایا تھا کہ تو جب نماز شروع کرتا ہے تو کیسے پڑھتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں نے پڑھا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ حتیٰ کہ میں آخر تک پہنچا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے اسی طرح اہل مدینہ، اہل شام، اہل بصرہ اور اکثر قراء نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو آیت شمار کیا۔ اسی طرح قتادہ نے ابونضرہ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ چھٹی آیت اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے اور رہے اہل کوفہ کے قراء اور فقہاء تو وہ بسم اللہ کو آیت شمار کرتے ہیں اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو علیحدہ آیت شمار نہیں کرتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بسم اللہ مصحف میں موجود ہے، لکھی ہوئی ہے اور نقل ہوتی آرہی ہے جس طرح سورۃ النمل میں نقل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوتی آرہی ہے تو یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے جو تم نے ذکر کیا وہ صحیح ہے لیکن یہ اس کے قرآن ہونے یا سورتوں کے درمیان فاصل ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ صحابہ سے مروی ہے کہ ہم سورت کا اختتام نہیں جانتے تھے حتیٰ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوئی (1)۔ یہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے یا اس سے برکت حاصل کرنے کے لئے ہر سورت کے آغاز میں اسے لکھا جاتا ہے جیسا کہ کتب اور رسائل کی ابتدا میں اسے لکھنے پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ سب احتمال ہیں اور حریری نے کہا حضرت حسن سے بسم اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رسائل کے آغاز میں لکھی جاتی ہے اور حسن نے یہ بھی فرمایا کہ بسم اللہ، قرآن میں سے کسی سورت میں نازل نہیں ہوئی مگر سورۂ طس میں اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

٭ فیصلہ یہ ہے کہ قرآن نظر اور استدلال سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن نقل متواتر، قطعی اضطراری کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ پھر امام شافعی کا قول ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ کے متعلق مضطرب ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ نہ کسی سورت کی اور نہ الحمد للہ کی آیت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک جماعت سے اس کا قرآن ہونا مروی ہے۔ دارقطنی نے ایک جز میں اس جماعت کے اقوال کو جمع کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے ہم اس کے متعلق روایت کا انکار نہیں کرتے اور ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا بھی ہے اور ہماری بھی اس کے مقابلہ میں روایات ہیں جن کو ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کے ساتھ نماز کا آغاز فرماتے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے فرماتے۔ الحدیث۔ مکمل حدیث آگے آئے گی۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر کے پیچھے نماز پڑھی، وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے آغاز کرتے تھے۔ وہ بسم اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے نہ قراءت کی ابتدا میں اور نہ آخر میں۔ (2)

ہمارا مذہب ایک عظیم وجہ کے ساتھ راجح ہے اور وہی معقول بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد جو مدینہ طیبہ میں ہے اس پر زمانہ گزر چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر امام مالک کے زمانہ تک طویل عرصہ بیت چکا ہے اور اس مسجد میں کسی نے کبھی سنت کی اتباع کرتے ہوئے بسم اللہ نہیں پڑھی اور یہ تمہاری احادیث کا رد ہے۔

مگر ہمارے اصحاب نے نفل میں اس کی قراءت کو مستحب کہا ہے اور اسی پر اس کی قراءت کے بارے میں وارد آثار محمول ہیں یا اس میں وسعت کی بنا پر ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نفلوں میں بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ان کے پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں جو دور کرتے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ یہ کسی اور سورت سے ہے۔ نمازی فرض نماز میں اور کسی دوسری نماز میں اس کو سراً اور جہراً نہیں پڑھے گا اور نوافل میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ اصحاب مالک کے نزدیک یہی مشہور مذہب ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نوافل میں سورت کے آغاز میں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من جهربها، حدیث نمبر 669، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجة من قال لایجهر بالبسملة، حدیث نمبر 655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بسم اللہ پڑھی جائے گی اور سورت الحمد سے پہلے نہیں پڑھی جائے گی۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ فرض اور نفل نماز میں اس کے ساتھ قراءت شروع کی جائے گی اور کسی حال میں ترک نہیں کی جائے گی۔ اہل مدینہ میں سے بعض نے کہا: نماز میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ضروری ہے، ان میں سے حضرت ابن عمر اور ابن شہاب ہیں۔ یہی امام شافعی، احمد، اسحاق، ابوثور اور ابوعبید کا قول ہے۔

یہ دلیل ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادیہ ہے قطعیہ نہیں ہے جیسا کہ بعض جہلاء نے کہا ہے جس کے قول پر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے۔ حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح اس نے گمان کیا ہے کیونکہ اختلاف علماء موجود ہے۔ الحمدللہ۔ علماء کی جماعت کا خیال یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے گا۔ ان میں سے امام ابوحنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار اور حضرت ابن زبیر کا قول ہے یہی حکم اور حماد کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو عبید نے بھی یہی کہا ہے۔ اوزاعی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ ابوعمر نے استذکار میں یہی حکایت کیا ہے اور ان علماء نے اس اثر سے حجت پکڑی ہے جو منصور بن زاذان نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور ہمیں بسم اللہ کی قراءت نہ سنائی (1) اور عمار بن رزیق نے اعمش سے انہوں نے شعبہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرات ابوبکر و عمر کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان میں سے کسی سے بسم اللہ جہراً نہیں سنی۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے اس پر حضرت انس سے مروی آثار متفق ہیں اور ان میں تضاد نہیں ہے اور اس طرح بسم اللہ کے متعلق اختلاف سے بھی انسان نکل جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: مشرک مسجد میں آتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ پڑھتے تو وہ کہتے: یہ محمد، یمامہ کے رحمان یعنی مسیلمہ کا ذکر کرتا ہے۔ تو آپ کو بسم اللہ آہستہ پڑھنے کا حکم دیا گیا اور وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل ہوا۔ حکیم ترمذی ابوعبداللہ نے کہا: آج تک یہ اسی طریقہ پر باقی ہے اگرچہ علت زائل ہوگئی ہے۔ جس طرح طواف میں رمل باقی ہے اگرچہ علت ختم ہوگئی ہے، دن کی نماز میں سری قراءت باقی ہے اگرچہ علت ختم ہوگئی ہے۔

مسئلہ نمبر 6: امت کا اتفاق ہے کہ رسائل اور علم کی کتابوں میں سے ہر کتاب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا جواز ہے۔ اگر کتاب شعری دیوان ہو تو مجالد نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: علماء کا اجماع ہے کہ وہ شعر سے پہلے بسم اللہ نہ لکھیں۔ زہری نے کہا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ شعر میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اور حضرت سعید بن جبیر کا نظریہ یہ ہے کہ شعر کی کتب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنا جائز ہے۔ اکثر متاخرین نے ان کی متابعت کی ہے۔ ابوبکر خطیب نے کہا: ہم اس کو پسند کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: الماوردی نے کہا: بسم اللہ کہنے والے کو مبسمل کہنا یہ روی لغت ہے۔ شعر میں آیا ہے، عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک الجهر بسم الله الرحمٰن الرحیم، حدیث نمبر 896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لقد بسملت ليلى غداة لقيتها فيا حبذا ذاك الحبيب المبسمل

لیلیٰ نے اس صبح بسم اللہ کہا جس صبح میں ملا، وہ حبیب بسم اللہ کہنے والا کتنا اچھا ہے۔

میں کہتا ہوں: اہل لغت سے مشہور بسمل ہے۔ یعقوب بن سکیت، مطرز ثعالبی وغیرہم لغویوں نے کہا: بسمل الرجل جب کوئی بسم اللہ کہے کہا جاتا ہے: اكثرت من البسملة یعنی تو نے بسم اللہ کا قول زیادہ کیا۔ اس کی مثل حوقل الرجل ہے اس نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا۔ ھلل۔ جب کوئی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے۔ سبحل جب سبحان اللہ کہے۔ حمدل جب کوئی الحمد للہ کہے، حیصل جب حی علی الصلوٰۃ کہے۔ جعفل جب جعلت فداك کہے، طبقل جب کہے اطال اللہ بقاءك (اللہ تیری عمر دراز کرے) دمعز جب کہے ادام اللہ عزك۔ حیفل جب کہے حی علی الفلاح۔ مطرز نے الحیصلة کا ذکر نہیں کیا جب حی علی الصلوٰۃ کہے اور جعفل، جب جُعِلتُ فداك کہے، طبقل، جب اطال اللہ بقاءك کہے، دمعز جب ادام اللہ عزك کہے۔

مسئلہ نمبر 8: ہر فعل سے پہلے بسم اللہ کا ذکر مستحب ہے جیسے کھانا، پینا، ذبح کرنا، حقوق زوجیت ادا کرنا، سمندر پر سوار ہونا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام: 118) (اسے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو)۔ ارشاد ہے: قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا (ہود: 41) (نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس کشتی میں اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام لو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے برتن کو ڈھانپو تو اللہ کا نام ذکر کرو اور اپنے مشکیزہ کا منہ باندھو تو اللہ کا نام ذکر کرو (1)۔ اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے: بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا۔ اگر ان کی تقدیر میں بچہ ہوگا تو شیطان اسے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ عمر بن ابی سلمہ کو فرمایا: اے غلام! بسم اللہ پڑھ اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھا اور اپنے سامنے سے کھا (2)۔ اور فرمایا: شیطان کھانے کو حلال کر لیتا ہے مگر جب اس کھانے پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اور فرمایا: جس نے ابھی ذبح نہیں کیا وہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے۔ عثمان بن ابی العاص نے اس تکلیف کی شکایت کی جو انہیں اسلام قبول کرنے کے وقت سے جسم میں تھی۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے جسم میں تکلیف والی جگہ پر ہاتھ رکھ اور تین مرتبہ بسم اللہ پڑھ اور سات مرتبہ یہ کلمات کہہ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ (3)۔ یہ تمام احادیث صحیح میں ثابت ہیں۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنوں اور بنی آدم کی شرمگاہوں کے درمیان پردہ ہے کہ جب لیٹرین میں داخل ہو تو پہلے بسم اللہ پڑھے (4)۔ دارقطنی میں حضرت عائشہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنودہ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمة، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع الید علی موضع الالم مع الدعاء

4۔ سنن ابن ماجہ، ما یقول الرجل اذا دخل الخلاء، حدیث نمبر 292، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پانی کو چھوتے تو بسم اللہ پڑھتے پھر اپنے ہاتھوں پر پانی بہاتے۔

مسئلہ نمبر 9: ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے افعال کی انہیں قدرت دی گئی ہے اور ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر فعل کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

بسم اللہ کا معنی، باللہ ہے اور باللہ کا مفہوم ہے اللہ کی تخلیق اور تقدیر سے مقصود تک پہنچا جاتا ہے۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: بسم اللہ کا مطلب ہے میں نے اللہ کی مدد، اس کی توفیق اور برکت سے شروع کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے تاکہ قراءت اور دوسرے کاموں کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر سے کریں تاکہ اللہ کی برکت سے افتتاح ہو۔

مسئلہ نمبر 10: ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ کا نظریہ یہ ہے کہ اسم زائدہ ہے اور انہوں نے لبید کے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکم   و من یبك حولاً کاملاً فقد اعتذر

ایک سال تک تم روپھر تم سلامتی ہو جو ایک سال تک روئے وہ معذور ہے۔

اس شعر میں اسم کا لفظ زیادہ ہے مراد ثم السلام علیکما ہے۔

ہمارے علماء نے لبید کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ اسم ہی مسمی ہے۔ مزید کلام آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 11: اسم کے زیادہ ذکر کرنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ قطرب نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اجلال اور تعظیم کے لئے زیادہ کیا گیا ہے۔ اخفش نے کہا: یہ اس لئے زیادہ کیا گیا ہے تاکہ قسم کے حکم سے نکل جائے اور تبرک کا قصد ظاہر ہو کیونکہ اصل کلام باللہ ہے۔

مسئلہ نمبر 12: اس پر با کے دخول کے معنی میں بھی علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ امر کے معنی پر داخل ہوا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابدأ بسم اللہ۔ یا خبر کے معنی پر داخل ہوا؟ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابتدأت بسم اللہِ۔ پہلا قول فراء کا ہے اور دوسرا زجاج کا ہے اور نصب کی حالت میں ہونے کی دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ابتدائی بسم اللہ۔ بسم اللہ محل رفع میں ہوگا۔ مبتدا کی خبر کی حیثیت سے۔ بعض نے فرمایا: خبر محذوف ہے۔ یعنی ابتدائی مستقر یا ثابتٌ بسم اللہ۔ اور جب تو خبر کو ظاہر کرے گا تو محل نصب میں ثابت اور مستقر کی وجہ سے ہوگا۔ یہ زیدٌ فی الدار کے قائم مقام ہوگا۔ قرآن میں ہے: فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل: 40) اور عندہ محل نصب میں ہے۔ یہ بصرہ کے نحویوں سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے: ابتدائی بسم اللہ موجود او ثابت۔ پس باسم اس مصدر کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا جو ابتدائی ہے۔

مسئلہ نمبر 13: بسم اللہ کو بغیر الف کے لکھا جاتا ہے باء، الصاق کی وجہ سے اس کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور کثرت استعمال کی وجہ سے لفظاً اور خطاً اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ بخلاف اقرأ باسم ربك کے قلت استعمال کی وجہ سے

حذف نہیں کی جاتی۔ الرحمٰن اور القاھر کے ساتھ اس کو حذف کرنے میں اختلاف ہے۔ کسائی، سعید، اخفش نے کہا: الف حذف کی جائے گی۔ یحییٰ بن وثاب نے کہا: الف حذف نہیں کی جاتی مگر صرف بسم اللہ میں کیونکہ اس کا استعمال کثیر ہے۔

مسئلہ نمبر 14: با جارہ کو کسرہ دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا تاکہ اپنے عمل کے مناسب ہو جائے۔ بعض نے فرمایا: باء چونکہ صرف اسماء پر داخل ہوتی ہے اس لئے زیر کے ساتھ خاص کی جو اسماء کے ساتھ خاص ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کے اور اسم حروف کے درمیان فرق کرنے کے لئے جیسے کاف۔ شاعر کا قول ہے:

و رحنا بکابن الماء یجنب و سطنا۔ اس کا مطلب بمثل ابن الماء یا جو اس کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اسم اس کا وزن اِفعٌ، اس میں واؤ حذف ہے کیونکہ یہ سموت سے ماخوذ ہے اس کی جمع اسماء اور تصغیر سُمَیّ ہے۔ اس کی اصل کی تقدیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: فِعْلٌ، بعض نے فرمایا فُعل ہے۔ جوہری نے کہا: اسماء جمع اس وزن کی ہوگی اس کی مثال جذع کی جمع اجذاع ہے، قُفْل کی جمع اقفال ہے۔ اس کا صیغہ سماع کے ساتھ ہی پایا جاتا ہے، اس میں چار لغات ہیں اسم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، اسم ضمہ کے ساتھ۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: جنہوں نے الف کو ضمہ دیا انہوں نے اسے سموتُ اور اَسمُو سے مشتق کیا ہے اور جنہوں نے ہمزہ کو کسرہ دیا انہوں نے سَمَیت اَسمی سے مشتق کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: سِمٌ اور سُمٌ۔ شاعر نے کہا:

واللہ اسماك سُما مبارکاً آثرك اللہ به ایثارك

اس شعر میں شاعر نے سُما استعمال کیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

و عامنا اعجبنا مقدمه یدعی ابا السمح و قرضاب سُمُهٗ

مبتر الکل عظم یلحمه۔

اس میں شاعر نے سُمٌ استعمال کیا ہے۔ ان اشعار میں قرضاب استعمال ہوا ہے۔ جب کوئی شخص خشک چیز کھائے تو وہ کہتے ہیں قرضب الرجل۔ سمہ سین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایک شاعر نے کہا:

باسم الذی فی کل سورۃ سُمہ اس کے نام سے شروع کرتا ہے ہر سورت میں جس کا نام ہے۔

باسم سے سین کو غیر قیاسی تعلیل کر کے ساکن کیا گیا ہے اس کا الف وصلی ہے کبھی کبھی ضرورت کے لئے شاعر اس کے الف کو قطعی بنا دیتا ہے۔ جیسے احوص کا قول ہے:

و ما انا بالمخسوس فی جذم مالك ولا من تسمی ثم یلتزم الاسما

اس میں شاعر نے ہمزہ کو قطعی بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 16: عرب اسم کی نسبت کے وقت کہتے ہیں سموی۔ اگر تو چاہے تو اسمی کہہ دے، اب تو نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی جمع اسماء ہے اور اسماء کی جمع اسامی ہے، الفراء نے حکایت کیا ہے: اعیذك باسماوات اللہ۔

مسئلہ نمبر 17: اسم کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: یہ السمو سے مشتق ہے جس کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان بلند ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا: اسم مسمی کو بلند کرتا ہے اور اسے دوسروں سے بلند کر دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: سم کو اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ کلام کی دونوں قسموں حرف اور فعل پر اپنی قوت سے بلند ہوتا ہے۔ اسم، حرف اور فعل سے بالا جماع اقویٰ ہے کیونکہ اسم اصل ہے۔ پس اس کے حرف اور فعل سے بلند ہونے کی وجہ سے اسم کہا جاتا ہے۔ یہ تین اقوال ہیں۔

کوفیوں نے کہا: یہ السمۃ سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے کیونکہ اسم علامت ہوتا ہے اس کی جس کے لئے وضع کیا جاتا ہے اس بناء پر اسم کی اصل وسم ہوگی۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ تصغیر میں سمی اور جمع اسماء بولا جاتا ہے۔ جمع اور تصغیر اشیاء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتی ہیں۔ وُسَیْم اور اوسام نہیں کہا جاتا۔ اس کی صحت پر اختلاف کا فائدہ دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 18: جو کہتا ہے السمو سے مشتق ہے جس کا معنی العلو ہے وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ مخلوق کے وجود سے پہلے اور ان کے وجود کے بعد اور ان کے فنا ہونے کے وقت ہمیشہ ہمیشہ موصوف تھا۔ اس کے اسماء اور صفات میں مخلوق کا کوئی اثر نہیں۔ یہ اہل سنت کا قول ہے اور جنہوں نے کہا: یہ السمۃ سے مشتق ہے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ازل میں بغیر اسم اور صفت کے تھا جب اس نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مخلوق نے اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء اور صفات بنائیں۔ جب اللہ انہیں فنا کر دے گا تو پھر بغیر اسم اور صفت کے رہ جائے گا۔ یہ معتزلہ کا قول ہے۔ یہ قول امت کے اجماع کے مخالف ہے۔ یہ ان کی بڑی خطا ہے کیونکہ انہوں نے کہا: اللہ کا کلام مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر اسم اور مسمی میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 19: اہل حق کا نظریہ یہ ہے جو قاضی ابو بکر بن طیب نے نقل کیا ہے کہ اسم ہی مسمی ہے۔ ابن فورک نے بھی اس کو پسند کیا ہے، یہی قول ابو عبیدہ اور سیبویہ کا ہے۔ جب کوئی کہتا ہے: اللہ عالم، تو اس کا قول اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو عالم ہونے کے ساتھ موصوف ہے پس اسم عالم ہوگا اور بعینہ وہی مسمی ہے۔ اسی طرح جب کہتا ہے: اللہ خالق تو خالق اللہ ہے۔ وہی بعینہ اس کا اسم ہے۔ پس اسم ان کے نزدیک بعینہ مسمی ہے بغیر کسی تفصیل کے۔ ابن حصار نے کہا: جو بدعتی لوگوں میں سے صفات کی نفی کرتا ہے وہ کہتا ہے اسماء کے لئے کوئی مدلول نہیں ہے مگر ذات، اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں اسم مسمی کا غیر ہے اور جو صفات کو ثابت کرتا ہے وہ اسماء کے لئے مدلولات کو ثابت کرتا ہے یہ ذات کے اوصاف ہیں اور یہ عبارات کا غیر ہیں اور یہ ان کے نزدیک اسماء ہیں اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ، یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں بڑا اور جامع ترین اسم ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم اعظم ہے اور کسی غیر کا نام اس کے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے نہ اس کا تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ (مریم:65) کی ایک تاویل یہ بھی ہے یعنی کیا اللہ کے اسم کے ساتھ کسی کا نام رکھا جاتا ہے۔ اللہ اس موجود حق، صفات الٰہیہ کی جامع، ربوبیت کی صفات سے موصوف ذات کا اسم ہے جو وجود حقیقی کے ساتھ منفرد ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کا معنی ہے وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ واجب

الوجود جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ان سب کا مفہوم ایک ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشتق ہے یا یہ ذات کے لئے علَم وضع کیا گیا ہے۔ اکثر اہل علم کا پہلا نظریہ ہے اور اس کے اشتقاق میں اور اس کی اصل میں بھی اختلاف ہے۔ سیبویہ نے خلیل سے روایت کیا ہے کہ اس کی اصل الاہ ہے جیسے فِعَال۔ پھر ہمزہ بدل الف، لام داخل کیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: یہ الناس کی مثل ہے جس کی اصل اُناس ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل (لاہ) ہے اور تعظیم کے لئے الف، لام اس پر داخل کیا گیا ہے۔ یہ سیبویہ کا مختار ہے۔ اس نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے۔

لاہ ابن عمك لا افضلتَ فی حسَب عنی ولا انت دیانی فتخزونی

اس شعر میں لاہ کا استعمال ہوا ہے اور اس شعر میں تخزونی حاء معجمہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی تسوسنی (دیکھ بال کرنا) ہے۔

کسائی اور فراء نے کہا بسم اللہ کا معنی بسم الالہ ہے۔ ہمزہ حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے لام میں ادغام کیا گیا تو لام مشدد ہو گیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ (الکہف: 38) اس کا معنی لکن انا ہے۔ اسی طرح حسن نے بھی پڑھا ہے پھر کہا ہے کہ یہ وَلَہَ سے مشتق ہے جس کا معنی حیران ہونا ہے۔ الوالہ کا مطلب عقل کا چلا جانا ہے کہا جاتا ہے: رجل والہٌ وامرۃ والھۃ و والہ۔ وماء مولہ۔ صحراء میں بھیجا گیا پانی، اللہ تعالیٰ کے بارے عقول حیران ہیں اور اس کی صفات کی حقائق میں وہ گم ہیں اور فکر اس کی معرفت میں ششدر ہے۔ اس بنا پر الاہ کی اصل ولاہ ہو گی۔ ہمزہ، واو کا بدل ہے جس طرح اشاح میں ہمزہ واو کا بدل ہے اسی طرح اسادۃ اصل میں وسادۃ تھا۔ خلیل سے مروی ہے اور ضحاک سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ کا نام الہ ہے کیونکہ مخلوق اپنی حاجات میں اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتی ہے اور تکالیف کے وقت اس کی بارگاہ میں عجز وانکساری اور تضرع وزاری کرتے ہیں۔ خلیل بن احمد سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مخلوق اس کی بارگاہ میں رجوع کرتی ہے۔ یالھون لام کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الارتفاع کے معنی میں ہے۔ عرب ہر بلند چیز کو لاھا کہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے جب سورج طلوع ہوتا تھا لاھت۔ بعض نے فرمایا: یہ اَلَہَ الرجلُ سے مشتق ہے جب وہ عبادت کرے۔ تَاَلَّہَ، جب کوئی عبادت کرے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (الاعراف: 127)۔ اس قراءت پر حضرت ابن عباس وغیرہ نے وعبادتك پڑھا ہے۔

علماء نے فرمایا: اللہ کا اسم اس سے مشتق ہے۔ پس اللہ کا معنی ہوگا: المقصود بالعبادۃ اسی سے موحدین کا قول ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس کا معنی ہے لا معبود غیر اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور الا کا کلمہ غیر کے معنی میں ہے استثناء کے معنی میں نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اصل الھاء ہے جو غائب سے کنایہ ہے۔ انہوں نے اس کو لوگوں کی عقول میں موجود ثابت کیا ہے۔ پس انہوں نے اس کی طرف حرف کنایہ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ پھر اس میں لام الملك زیادہ کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے ان کا مالک ہے پس (لَہٗ) ہو گیا پھر اس میں تعظیم وتفخیم کے لئے الف، لام زیادہ کیا گیا۔

دوسرا قول: یہ قول بہت سے علماء کا ہے ان میں امام شافعی، ابو المعالی، خطابی، غزالی، مفضل وغیرہم ہیں، خلیل اور سیبویہ سے

مروی ہے کہ الف، لام اس کا لازمہ ہے، اس کو اس سے حذف کرنا جائز نہیں۔ خطابی نے کہا اور اس پر دلیل کہ الف، لام اس اسم کی اصل سے ہے اور الف، لام تعریف کیلئے داخل نہیں ہوا، اس پر حرف ندا کے حرف کا داخل ہونا ہے جیسے تیرا قول ہے یا اللہ۔ اور حروف نداء، الف لام تعریف کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ تو یا الرحمن اور یا الرحیم نہیں کہتا جیسا کہ تو کہتا ہے یا اللہ۔ پس یہ دلیل ہے کہ الف لام اس اسم کی اصل سے ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 22: الرحمٰن کے اسم کے اشتقاق میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا کوئی اشتقاق نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مختصہ میں سے ہے۔ اگر یہ الرحمۃ سے مشتق ہوتا تو مرحوم کے ذکر کے ساتھ متصل ہوتا۔ پس یہ کہنا جائز ہوتا اللہ رحمن بعبادہ جس طرح رحیم بعبادہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ رحمۃ سے مشتق ہوتا، عرب اس کا انکار نہ کرتے جب انہوں نے اس کو سنا تھا کیونکہ وہ اپنے رب کی رحمت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ الآیۃ (الفرقان:60) (جب انہیں کہا جاتا ہے۔ رحمن کے لئے سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمن کون ہے؟) جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا تو سہیل بن عمرو نے کہا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، ہم اس کو نہیں جانتے، بلکہ تم وہ لکھو جو ہم جانتے ہیں باسمك اللهم (1)۔ ابن عربی نے کہا: وہ صفت سے جاہل تھے موصوف سے نہیں۔ اس نے اس پر عربوں کے قول ما الرحمٰن سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ومن الرحمٰن نہیں کہا۔ ابن حصار نے کہا: گویا ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری آیت وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد:30) نہیں پڑھی تھی۔ جمہور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ الرحمٰن، الرحمۃ سے مشتق ہے، مبالغہ کے لئے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے ایسا رحمت والا جس کی رحمت میں مثال نہیں۔ اسی وجہ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی جس طرح الرحیم کا تثنیہ اور جمع بنائی جاتی ہے۔

ابن حصار نے کہا: اس کے اشتقاق پر جو روایت دلالت کرتی ہے وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں رحمن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اس کے لئے اسم اپنے اسم سے مشتق کیا۔ پس جو رشتہ داری کو ملائے گا میں اسے ملاؤں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں اسے کاٹوں گا (2)۔ یہ حدیث اشتقاق میں نص ہے مخالفت وشقاق کا کوئی مطلب نہیں اور عربوں کا اس کا انکار ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کی شان سے جہالت کی بنا پر ہے۔

مسئلہ نمبر 23: مبرد نے لکھا ہے جو ابن انباری نے اپنی کتاب ''الزاہر'' میں بیان کیا ہے کہ الرحمٰن عبرانی اسم ہے اور اس کے ساتھ الرحیم لایا جاتا ہے۔ انہوں نے بطور استشہاد یہ اشعار پڑھے ہیں۔

لن تدركوا المجد او تشروا عباءكم ۔۔۔ بالخز او تجعلوا الينبوت ضمرانا

1۔ صحیح بخاری، باب الشروط فی الجہاد الخ، حدیث نمبر 2529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی قطیعۃ الرحم، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

او تترکون الی القسین ھجرتکم و مسحکم صلبھم رحمان قربانا

ابو اسحاق زجاج نے ''معانی القرآن'' میں کہا ہے: احمد بن یحییٰ نے کہا: الرحیم عربی ہے اور الرحمٰن عبرانی ہے۔ اسی وجہ سے دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ وہ قول ہے جو مرغوب نہیں ہے۔

ابو العباس نے کہا: نعت کبھی مدح کے لئے واقع ہوتی ہے جس طرح تو کہتا ہے۔ جریر شاعر نے کہا: مطرف نے قتادہ سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے قول کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے۔ قطرب نے کہا: تاکید کے لئے ان دونوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے اور تو کید میں عظیم فائدہ ہے۔ یہ کلام عرب میں کثیر ہے استشہاد کی ضرورت نہیں اس میں فائدہ وہ ہے جو محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ تفضل کے بعد تفضل ہے۔ انعام کے بعد انعام ہے، یہ رغبت کرنے والوں کی امیدوں کو قوت دینا ہے اور وعدہ ہے کہ اس کی امید خائب و خاسر نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 24: اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں یا مختلف معانی رکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ہم معنی ہیں جیسے ندمان، ندیم۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعلان کی بنا پر فعیل کی طرح نہیں ہے کیونکہ فعلان واقع نہیں ہوگا مگر فعل کے مبالغہ پر، جیسے تیرا قول ہے رجل غضبان۔ جو غصہ سے بھرا ہوا ہو اور فعیل کبھی بمعنی فاعل اور مفعول کے معنی میں ہوتا ہے۔ عملّس نے کہا

فاما اذا عضت بك الحرب عضۃ فانك معطوف علیك رحیم

الرحمٰن خاص الاسم عام الفعل ہے اور الرحیم عام الاسم خاص الفعل ہے یہ جمہور کا قول ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: الرحمٰن، رحمت کی تمام اقسام میں عام ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خاص ہے اور الرحیم، وہ مومنین کی جہت میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (الاحزاب) عزمی نے کہا: الرحمٰن وہ اپنی تمام مخلوق کو بارشیں عطا فرماتا ہے حواس کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور عام نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ الرحیم مومنین پر رحیم ہے کہ انہیں ہدایت دیتا ہے اور ان پر لطف فرماتا ہے۔ ابن مبارک نے کہا: الرحمٰن۔ جب اس سے مانگا جاتا ہے تو عطا فرماتا ہے۔ الرحیم جب اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام ترمذی نے اپنی جامع میں ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے (1)۔ فرمایا: میں نے ابو زرعہ سے ابو صالح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ابو صالح وہ ہے جسے الفارسی کہا جاتا ہے۔ یہ خوزستان کا رہنے والا تھا میں اس کا نام نہیں جانتا۔ بعض شعراء نے یہ معنی لیا اور کہا:

اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ و بنی آدم یسال یغضب

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الدعاء، حدیث نمبر 3295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب فضل الدعا، حدیث نمبر 3816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اگر اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے تو اللہ ناراض ہوتا ہے اور انسان سے سوال کیا جاتا ہے تو ناراض ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ دونوں اسم رقت پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رقیق ہے یعنی رحمت میں زیادہ ہے۔

خطابی نے کہا: یہ مشکل ہے کیونکہ رقت کا اللہ کی صفات میں سے کسی شے میں دخل نہیں۔ حسین بن فصل بجلی نے کہا: یہ راوی سے وہم ہے کیونکہ رقت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے۔ یہ دونوں اسم رفق پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رفق پر دلالت کرتا ہے اور رفق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ رفیق (مہربان) ہے رفق کو پسند کرتا ہے۔ رفق پر جو وہ عطا کرتا ہے وہ سختی پر عطا نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 25: اکثر علماء کا قول ہے کہ الرحمٰن اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کا اس کے ساتھ نام رکھنا جائز نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110) اس اسم کو ذکر فرمایا جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں فرمایا۔ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ۠ (الزخرف: 45) پس اس نے خبر دی کہ رحمٰن ہی عبادت کا مستحق ہے مسیلمہ کذاب لعنۃ اللہ علیہ نے افسوسناک کام کیا اور اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھا اور یہ نام نہ رکھا حتیٰ کہ کذاب کی صفت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کذاب کی صفت کو لازم کر دیا اگرچہ ہر کافر جھوٹا ہوتا ہے۔ پس یہ وصف (کذاب) مسیلمہ کے لئے علم بن گیا جس کے ساتھ وہ پہچانا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کذاب کا اسم لازم کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الرحمٰن اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 26: الرحیم، مخلوق کے لئے صفت مطلقہ ہے۔ چونکہ الرحمٰن میں عموم پایا جاتا ہے ہمارے کلام میں قرآن کی موافقت میں الرحیم پر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ مہدوی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رحیم کا معنی ہے کہ تم رحیم کے ذریعے اللہ اور الرحمٰن تک پہنچے۔ الرحیم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ صفت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: (رؤف رحیم) گویا یہ معنی ہے: بسم الله الرحمن الرحيم و بالرحيم۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے تم مجھ تک پہنچے یعنی اس کی اتباع کر کے اور جو وہ لے کر آئے اس کے ساتھ تم نے میرا ثواب، میری کرامت اور میرے چہرہ کی طرف نظر کرنے کو پایا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 27: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: بسم اللہ ہر بیماری کی شفا ہے اور ہر دوا پر مدد ہے اور الرحمٰن ہر ایمان لانے والے کے لئے مدد ہے۔ یہ ایسا اسم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا نام نہیں رکھا جاتا اور رہا رحیم۔ یہ ہر توبہ کرنے، ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے کے لئے ہے۔ بعض نے حروف پر تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بسم اللہ کی تفسیر کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الباء سے مراد بلاء الله و روحه و نضرته و بهاءه ہے یعنی اللہ کا انعام، اس کی روح، اس کی شادابی اور رونق اور سین سے مراد اس کی سناء (روشنی) ہے اور میم سے مراد اللہ کا ملک ہے۔ اور اللہ سے مراد لا الہ غیرہ ہے اور الرحمن اپنی مخلوق میں سے ہر فاسق، فاجر پر مہربانی

فرمانے والا ہے۔ اور الرحیم وہ صرف مومنین پر مہربان ہے۔ حضرت کعب احبار سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: الباء سے مراد اس کی رونق و شادابی ہے۔ سین سے مراد اس کی روشنی ہے، کوئی چیز اس سے اعلیٰ نہیں ہے میم سے مراد اس کا ملک ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اسے مشکل میں نہیں ڈالتی۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر حرف، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم کا آغاز ہے۔ باء، اس کے اسم بصیر کی چابی ہے، سین اس کے اسم سمیع کی چابی ہے میم اس کے اسم ملیک کی چابی ہے، الف اس کے اسم اللہ کی چابی ہے لام اس کے اسم لطیف کی چابی ہے، هاء اس کے اسم ھادی کی چابی ہے، راء اس کے اسم رازق کی چابی ہے، حاء اس کے اسم حلیم کی چابی ہے نون اس کے اسم نور کی چابی ہے۔ اس کا معنی ہر چیز کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے۔

مسئلہ نمبر 28: الرحیم کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ حضرت ام سلمہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے الرحیم الحمد۔ میم کو ساکن کرتے اور اس پر وقف کرتے اور الف کے ساتھ علیحدہ آغاز کرتے۔ کوفیوں کی ایک قوم نے ایسا پڑھا بھی ہے۔ جمہور لوگوں کی قراءت الرحیم الحمد ہے۔ الرحیم کو جر کے ساتھ اعراب دیا جاتا ہے اور اَلْحَمْدُ کے الف کو وصلی بنایا جاتا ہے۔ کسائی نے بعض عربوں سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے الرحیم الحمد یعنی میم کے فتحہ اور الف کے وصل کے ساتھ پڑھا ہے گویا میم ساکن کی گئی اور الف کو قطعی بنایا گیا پھر اس کی حرکت میم پر ڈالی گئی اور اسے حذف کیا گیا۔ ابن عطیہ نے کہا: میری معلومات کے مطابق ایسی قراءت کسی سے مروی نہیں ہے۔ یحییٰ بن زیاد کا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ (آل عمران: 1) میں اسی طرح کا نظریہ ہے۔

سورۃ الفاتحہ

ایاتھا ۷ ﴿۱ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۵﴾ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۗ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۗ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۧ

''سب تعریفیں الله کے لئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا، بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا، مالک ہے روز جزا کا، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو سیدھے راستہ پر راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا''۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

تفسیر سورۂ فاتحہ

اس کے متعلق چار ابواب ہیں۔

الباب الاول

یہ باب سورۂ فاتحہ کے فضائل اور اسکے اسماء کے بارے میں ہے اور اس باب میں سات مسائل کا ذکر ہوگا

مسئلہ نمبر 1: ترمذی نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تورات اور انجیل میں الله تعالیٰ نے ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی مثل کلام نہیں اتارا اور یہ سورہ سبع مثانی (ایسی سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) ہے۔ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ (1)

مالک نے علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے روایت کیا ہے کہ ابوسعید مولیٰ عبدالله بن عامر بن کریز نے انہیں بتایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب کو بلایا جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مذکورہ بالا حدیث ذکر کی۔ ابن عبدالبر نے فرمایا: ابو سعید کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی وہ اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور ان

1۔ جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر، صفحہ 140، جلد 2، (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 3050، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی یہ حدیث مرسل ہے اور یہی حدیث ابوسعید بن معلیٰ سے بھی مروی ہے، یہ صحابہ میں سے ایک شخص ہے اس کے نام پر بھی آگاہی نہیں ہوئی۔ اس حدیث کو ابوسعید نے حفص بن عاصم اور عبید بن حسنین سے روایت کیا ہے۔

میں (قرطبی) کہتا ہوں: ''التمہید'' میں اسی طرح ہے کہ اس کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی اور ''کتاب الصحابہ'' میں اس کے نام میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ابوسعید بن معلیٰ سے روایت کیا ہے۔ ابوسعید نے فرمایا: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دی۔ میں نے آپ کو جواب نہ دیا (میں دیر سے حاضر خدمت ہوا) تو عرض کی: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ (الانفال: 24) لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے۔ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، جب آپ ﷺ نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی: حضور! آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ میں تجھے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ سورت یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یہ سبع مثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (1)۔ ابن عبدالبر وغیرہ نے فرمایا: ابو سعید بن معلیٰ جلیل القدر انصار میں سے ہے اور انصار کے سرداروں میں سے ہے۔ امام بخاری نے تنہا ان سے روایت کیا ہے۔ اس کا نام رافع ہے۔ اسے حارث بن نفیع بن معلیٰ کہا جاتا ہے اور اوس بن معلیٰ بھی کہا جاتا ہے اور ابوسعید بن اوس بن معلیٰ بھی کہا جاتا ہے ان کا وصال ۷۴ ہجری میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ قبلہ کی تبدیلی ہوئی تو یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ مزید ذکر آگے آئے گا۔ حضرت ابی بن کعب کی حدیث کو یزید بن زریع نے مسند (متصل) ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: ہمیں روح بن قاسم نے علاء بن عبدالرحمن سے روایت کر کے بتایا، علاء نے اپنے باپ سے، ان کے باپ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا، حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ ابی کے پاس تشریف لے گئے جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مکمل حدیث کا مفہوم ذکر کیا۔

ابن انباری نے اپنی کتاب ''الرد'' میں ذکر کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: مجھے ابوعبید اللہ وراق نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں ابوداؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں شیبان نے بتایا انہوں نے منصور سے اور انہوں نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: ابلیس۔ اللہ اس پر لعنت کرے۔ چار مرتبہ (افسوس کا اظہار کرتے ہوئے) رویا: (۱) جب اس پر لعنت کی گئی (۲) جب اسے جنت سے نکالا گیا (۳) جب حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا (۴) جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی (2)۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا بعض سورتوں اور بعض آیتوں کا دوسری بعض سورتوں اور آیتوں پر فضیلت رکھنے کے متعلق اختلاف

1۔ صحیح بخاری، تفسیر القرآن، صفحہ 642، جلد 2، (وزارت تعلیم)

ایضاً صحیح بخاری، تفسیر القرآن، باب ما جاء فی فاتحۃ الکتاب، حدیث 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 5، زیر آیت

ہے، (اسی طرح) بعض اسماءِ حسنیٰ کا دوسرے بعض اسماءِ حسنیٰ پر فضیلت رکھنے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: کسی سورت، آیت اور اسم کو دوسری سورت، آیت اور اسم پر فضیلت نہیں ہے کیونکہ قرآن سارا الله کا کلام ہے، اسی طرح اس کے اسماءِ حسنیٰ کے درمیان بھی کوئی تفاضل نہیں ہے یہ قول شیخ ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر بن طیب، ابوحاتم محمد بن حبان بستی اور فقہاء کی ایک جماعت کا ہے۔ امام مالک سے بھی اس کا مفہوم مروی ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ نے کہا: بعض قرآن کو بعض قرآن پر فضیلت دینا غلطی ہے۔ اسی طرح امام مالک نے ایک سورت کو بار بار پڑھنا یا اسے ہی دہراتے رہنا مکروہ قرار دیا ہے۔ امام مالک سے الله تعالیٰ کے ارشاد بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ:106) کے تحت یہ مروی ہے کہ ہم منسوخ آیت کی جگہ محکم آیت لے آتے ہیں۔ ابن کنانہ نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ان علماء نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ افضل، مفضول کے نقص کا شعور دیتا ہے، جبکہ تمام قرآن میں ذاتیت ایک ہے اور وہ کلام الله ہونا ہے اور الله کے کلام میں کوئی نقص نہیں ہے۔

سبتی نے کہا: حدیث کے الفاظ ''تورات و انجیل میں سورۂ فاتحہ کی مثل نہیں اتارا گیا'' کا مطلب یہ ہے کہ الله تعالیٰ تورات اور انجیل کو پڑھنے والے کو اتنا ثواب عطا نہیں فرماتا جو ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھنے والے کو عطا فرماتا ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے اس امت (محمدیہ) کو دوسری امتوں پر اپنے فضل خاص سے فضیلت بخشی ہے اور اپنے کلام قرآن کی قراءت پر دوسرے اپنے کلام کی قراءت کی نسبت زیادہ فضیلت دی ہے اور یہ الله تعالیٰ کی جناب سے اس امت کے لئے خاص فضل ہے اور فرمایا: اعظم سورت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کی سورتوں میں سے اجر کے اعتبار سے عظیم ہے، نہ کہ بعض قرآن بعض سے افضل ہے۔

بعض علماء بعض قرآن کی بعض پر فضیلت کے قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں: قرآن کی آیت وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ (البقرہ) آیۃ الکرسی، سورہ حشر کی آخری آیات، سورۂ اخلاص اور وہ سورتیں جو الله تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں ان میں جو فضیلت ہے وہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (لہب:1) اور اس جیسی دوسری سورتوں میں موجود نہیں ہے۔

اور تفضیل معانی عجیبہ اور کثرت معانی کے اعتبار سے ہے نہ کہ صفت کے اعتبار سے ہے اور یہی حق ہے اور جو علماء تفضیل کے قائل ہیں ان میں سے اسحاق بن راہویہ وغیرہ متکلمین علماء میں سے ہیں اور یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی، ابن حصار کا مختار ہے۔ ان علماء کے قول کی وجہ ابوسعید بن معلی اور حضرت ابی بن کعب کی حدیث ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! تیرے نزدیک کتاب الله میں کون سی آیت عظیم تر ہے، میں نے عرض کی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (البقرہ:255) حضرت ابی نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابا منذر! تجھے یہ علم مبارک ہو۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ (1)

ابن حصار نے کہا: مجھے ان علماء پر تعجب ہے جو ان نصوص کے ہوتے ہوئے بھی اختلاف ذکر کرتے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الکہف، صفحہ 271، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ)

ابن عربی نے کہا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل اور قرآن میں اس (سورہ فاتحہ) کی مثل نازل نہیں کیا(1)۔ اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باقی کتب کا ذکر نہیں کیا جیسے منزل صحیفے اور زبور وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذکور دوسری کتب سے افضل ہیں اور جب کوئی چیز کسی افضل سے افضل ہو تو وہ تمام چیزوں سے افضل ہوتی ہے جیسے تیرا قول زید، علماء سے افضل ہے۔ پس وہ تمام لوگوں سے افضل ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ایسی صفات ہیں جو کسی دوسری سورت میں نہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے کہا: پورا قرآن اس سورت میں ہے اس کے پچیس کلمات ہیں جو تمام علوم قرآن کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ اس سورت کے شرف میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم فرمایا ہے اور قربت صرف اسی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور کوئی عمل اس کے ثواب کو لاحق نہیں ہوتا۔ اسی مفہوم کی وجہ سے یہ قرآن عظیم کی اصل بن گئی۔ جیسا کہ سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ قرآن کا ثلث (۱/۳) ہے (2) کیونکہ قرآن، توحید، احکام اور مواعظ کا نام ہے اور سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ساری توحید ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا: قرآن میں کون سی آیت عظیم ہے؟ تو حضرت ابی نے کہا اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ:255)(3) یہ آیت عظیم ہے کیونکہ یہ تمام توحید ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد افضل ما قلته انا والنبیون من قبلی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (4) افضل ذکر بن گیا کیونکہ یہ ایسے کلمات ہیں جو توحید میں تمام علوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ توحید، عبادت، وعظ اور نصیحت کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں۔

مسئلہ نمبر 3: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران:18) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ (آل عمران:26) یہ آیات عرش سے معلق ہیں ان کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے،

ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب البیان میں اس روایت کو متصل نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: سورہ فاتحہ کے اسماء

اس کے بارہ اسماء ہیں۔

۱- الصلاۃ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف، نصف تقسیم کیا(5) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 7، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القراءۃ قل ھو اللہ احد، صفحہ 271، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4627، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ موطا امام مالک، کتاب القرآن، باب ماجاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم) جامع ترمذی، حدیث نمبر 3305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ)

۲-سورۃ الحمد

چونکہ اس میں حمد کا ذکر ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ سورۃ اعراف، سورۂ انفال اور سورۂ توبہ وغیرہا۔

۳-فاتحہ الکتاب

اس نام میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ لفظاً اس کے ساتھ قرآن کی قراءت کا آغاز کیا جاتا ہے اور خطاً مصحف میں اس کے ساتھ کتابت کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ نمازوں کو شروع کیا جاتا ہے۔

۴-ام الکتاب

اس نام میں اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرات انس، حسن بصری اور ابن سیرین نے مکروہ قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: ام الکتاب حلال اور حرام احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران: 7) حضرت انس اور ابن سیرین نے کہا: ام الکتاب لوح محفوظ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ (الزخرف: 4)

۵: ام القرآن

اس نام میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت انس اور ابن سیرین نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ احادیث ثابتہ ان دونوں اقوال کی تردید کرتی ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الحمد للہ ام القرآن، ام الکتاب اور السبع المثانی ہے(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور بخاری میں ہے فرمایا: ام الکتاب نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ مصاحف میں اس کے لکھنے کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے اور نماز میں اس کی قراءت کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے(2)۔ یحییٰ بن یعمر نے کہا: ام القریٰ مکہ ہے، ام خراسان مرو ہے اور ام القرآن سورۂ الحمد ہے(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ فاتحہ کو ام القرآن اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قرآن کے آغاز میں ہے اور قرآن کے تمام علوم کو متضمن ہے۔ اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے کیونکہ مکہ، زمین کا پہلا ٹکڑا ہے پھر اس سے زمین پھیلائی گئی۔ اسی وجہ سے ماں کو ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نسل کی اصل ہوتی ہے اور امیہ بن ابی الصلت کے قول میں زمین کو ام کہا گیا ہے۔

فالارض معقلنا و کانت امنا فیھا مقابرنا و فیھا نولد

زمین ہماری پناہ گاہ ہے اور زمین ہماری اصل ہے اس میں ہماری مقابر ہیں اور اس میں ہماری پیدائش ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فاتحۃ الکتاب، حدیث 1245، جامع ترمذی، حدیث نمبر 3049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 65، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

جنگ کے جھنڈے کو بھی ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ آگے ہوتا ہے اور لشکر اس کی پیروی کرتا ہے اور ام کی اصل امۃ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع امہات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُمَّهٰتُكُمْ (النساء: 23)۔ بغیر ہاء کے امات بھی کہا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا: فَرَجْتَ الظَّلَامَ بِاُمَّاتِكَا۔ تو نے اپنی نسبی شرافت سے تاریکیوں کو ختم کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا: انسانوں میں امہات اور چوپاؤں میں امات بولا جاتا ہے ابن فارس نے ''المجمل'' میں یہی بیان کیا ہے۔

۶-المثانی

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس امت کے لئے خاص کی گئی ہے پہلی امتوں میں سے کسی پر یہ نازل نہیں ہوئی، اسی امت کے لئے محفوظ کی گئی تھی۔

۷-القرآن العظیم

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں قرآن کے تمام علوم ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کمال وجلال کے ساتھ اس کی ثنا پر مشتمل ہے اور عبادت کے امر اور اخلاص، بغیر اعانت الٰہیہ کے کسی کام کرنے سے عجز کے اعتراف پر مشتمل ہے نیز صراط مستقیم کی طرف ہدایت کے لئے اسی کی بارگاہ میں تضرع وزاری پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں عہد توڑنے والوں کے احوال کی کفایت بھی ہے اور محنت کرنے والوں کے انجام کے بیان پر مشتمل ہے۔

۸-الشفاء

دارمی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب ہر زہر سے شفاء ہے (1)۔

۹-الرقیۃ (دم کرنا)

حضرت ابوسعید خدری کی حدیث سے یہ نام ثابت ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا، جس نے قبیلہ کے سردار کو دم کیا تھا: تجھے کیا معلوم کہ یہ دم ہے۔ حضرت ابوسعید نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ایک چیز تھی جو میرے دل میں ڈالی گئی تھی (2)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مکمل آگے آئے گی۔

۱۰-اساس

ایک شخص نے امام شعبی سے اپنے پہلو میں درد کی شکایت کی تو امام شعبی نے کہا: تو اساس القرآن، فاتحۃ الکتاب پڑھ۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لئے ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اس سے زمین پھیلائی گئی اور آسمانوں کی اساس عریب ہے یہ ساتواں آسمان ہے، زمین کی اساس عجیب ہے، یہ نچلی ساتویں

1۔ سنن دارمی، صفحہ 320، جلد 1 (مدینۃ المنورہ الحجاز)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارہ باب ما یعطی فی الرقیۃ، حدیث نمبر 2115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زمین ہے، جنتوں کی اساس جنت عدن ہے، یہ جنتوں کی ناف ہے اس پر جنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آگ کی اساس جہنم ہے اور نیچے والا ساتواں طبقہ ہے اس پر درکات کی بنیاد رکھی گئی ہے، خلق کی اساس آدم ہیں اور انبیاء کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، کتب کی اساس قرآن ہے، قرآن کی اساس سورۂ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کی اساس بسملہ ہے جب تو بیمار ہو یا تجھے تکلیف ہو تو تجھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئے، تجھے شفا ہو گی۔

۱۱- وافیہ

سفیان بن عیینہ نے یہ نام بیان کیا ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ نصف نصف نہیں ہوتی اور جدائی کو برداشت نہیں کرتی۔ اگر کوئی باقی سورتوں میں سے کسی سورت کا نصف ایک رکعت میں پڑھے اور نصف دوسری رکعت میں پڑھے تو یہ جائز ہو گا۔ اگر سورۂ فاتحہ کو آدھا آدھا کر کے دو رکعتوں میں پڑھے تو جائز نہ ہو گا۔

۱۲- کافیہ

یحییٰ بن ابی کثیر نے فرمایا: اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ باقی تمام سورتوں سے کفایت کرتی ہے جبکہ باقی تمام سورتیں اس سے کفایت نہیں کرتیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن خلاد اسکندرانی نے روایت کی، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ام القرآن دوسری تمام سورتوں کا بدل ہے جبکہ دوسری سورتیں اس کا بدل نہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 5: مہلب نے کہا: دم کا مقام یہ ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ بعض علماء نے فرمایا: پوری سورت دم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ارشاد فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ سے دم کرنے کی خبر دی تھی: تجھے کیسے معلوم تھا کہ یہ سورت دم ہے (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں دم ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ پوری سورت دم ہے کیونکہ یہ کتاب کا آغاز ہے اور تمام علوم کو متضمن ہے جیسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: دوسری چیزوں کا نام المثانی اور ام الکتاب رکھنے کی وجہ سے اس کا نام المثانی اور ام الکتاب رکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر:23) اس آیت میں کتاب پر مثانی کا اطلاق فرمایا ہے کیونکہ اس میں اخبار بار بار بیان کی جاتی ہیں۔ سبع طوال سورتوں کو بھی مثانی کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں فرائض اور قصص دہرائے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سبعاً من المثانی دی گئیں۔ فرمایا: اس سے مراد السبع الطوال سورتیں ہیں (3) یہ قول نسائی نے ذکر کیا ہے اور السبع الطوال سورتیں سورۂ بقرہ سے اعراف تک چھ سورتیں ہیں اور ساتویں میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ یونس ساتویں ہے، بعض نے فرمایا: سورۂ انفال اور توبہ ہے۔ یہ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعشی ہمدان نے کہا تھا:

1۔ سنن دار قطنی، صفحہ 322، جلد 1 (دار المحاسن للطباعۃ قاہرہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارہ باب مایعطی فی الرقیۃ، حدیث 2115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، صفحہ 146، جلد 1 (و۔ت)۔ کتاب افتتاح الصلاۃ، باب تاویل قول اللہ لقد آتیناک سبعا من المثانی، حدیث 905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلجوا المسجد و ادعوا ربکم　　وادرسوا هذی المثانی الطول

یعنی مساجد میں داخل ہو جاؤ اور اپنے رب کو پکارو اور یہ مثانی اور طوال سورتیں پڑھو۔

مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الحجر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: المثانی، مثنیٰ کی جمع ہے اس سے مراد دوسری ہے، طُوَل جمع ہے اطول کی، الانفال کو مثانی کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ مقدار میں طویل سورتوں کے بعد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ سورت ہے جس کی آیات مفصل سورتوں سے زائد ہیں اور مئین سورتوں سے کم ہیں۔ مئون ان سورتوں کو کہا جاتا ہے جن میں سے ہر سورت کی سو سے زائد آیات ہوتی ہیں۔

دوسرا باب

یہ باب سورۂ فاتحہ کے نزول اور اس کے احکام کے بارے میں ہے۔ اس میں بیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں، مگر صرف حسین الجعفی سے روایت کیا گیا ہے کہ اس کی چھ آیات ہیں (1)۔ اور یہ قول شاذ ہے۔ (اسی طرح) عمرو بن عبید سے مروی ہے کہ اس نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو علیحدہ آیت شمار کیا ہے (2) اور آٹھ آیات بنائی ہیں۔ یہ قول بھی شاذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (الحجر: 87) اور فرمایا: میں نے نماز کو تقسیم کیا (3)۔ (الحدیث) یہ آیت اور حدیث ان دونوں اقوال کا رد کرتی ہیں۔

اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ یہ سورۂ قرآن سے ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر یہ قرآن میں سے ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعود اپنے مصحف میں اسے لکھتے، جب انہوں نے اسے اپنے مصحف میں نہیں لکھا تو یہ دلیل ہے کہ یہ قرآن میں سے نہیں ہے، جیسا کہ معوذتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) کا حکم ان کے ہاں تھا۔

اس کا جواب ابو بکر انباری نے یہ دیا ہے۔ فرمایا: ہمیں حسن بن حباب نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں سلیمان بن اشعث نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابن ابی قدامہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے اعمش سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا، ابراہیم نے فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہا گیا تم اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھتے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر میں اسے لکھتا تو میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا۔ ابو بکر نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ ہر رکعت میں تلاوت کی گئی سورت سے پہلے ام القرآن سے آغاز کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے اس کو چھوڑ کر اختصار کیا ہے اور میں نے اس بات پر اعتماد کیا ہے کہ مسلمان اس کو محفوظ کئے ہوئے ہیں میں نے اسے کسی ایک جگہ پر نہیں لکھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا کیونکہ نماز میں یہ ہر سورت سے مقدم ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ مکی سورت ہے یا مدنی سورت ہے۔ حضرات ابن عباس، قتادہ اور ابو العالیہ الریاحی اس کا نام رفیع ہے وغیر ہم نے فرمایا: یہ سورت مکی ہے۔ حضرات ابو ہریرہ، مجاہد، عطاء بن یسار، زہری وغیر ہم نے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 69، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

فرمایا: یہ مدنی سورت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نصف مکہ میں نازل ہوا اور نصف مدینہ میں نازل ہوا۔ یہ قول ابولیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ یہ آیت سورۃ الحجر کی ہے اور سورۃ الحجر بالاجماع مکی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز مکہ میں فرض تھی اور اسلام میں کبھی بغیر الحمد کے نماز نہیں تھی۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: "لا صلاۃ إلا بفاتحۃ الکتاب" (1) (سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں)۔ یہ حکم کے متعلق خبر ہے نہ کہ ابتدا کے متعلق خبر ہے۔ واللہ اعلم

قاضی ابن طیب نے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے کہ قرآن کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۂ مدثر، بعض نے فرمایا: اقرأ، بعض نے فرمایا: سورۂ فاتحہ۔ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ابومیسرہ عمرو بن شرحبیل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کو فرمایا: جب میں تنہا خلوت میں ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں، اللہ کی قسم! مجھے کچھ ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے کہا: معاذ اللہ! اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ کے ساتھ ایسا کرے، اللہ کی قسم! تم امانت کو ادا کرتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، بات سچی کرتے ہو۔ جب حضرت ابوبکر داخل ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود نہیں تھے۔ حضرت خدیجہ نے حضرت ابوبکر کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بتائی اور کہا: اے عتیق! تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس جاؤ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت ابوبکر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ہمارے ساتھ ورقہ کی طرف چلو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے۔ ابوبکر نے کہا: خدیجہ نے۔ پس دونوں ورقہ کی طرف چلے اور اسے صورت حال بتائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے یا محمد، یا محمد کی آواز سنتا ہوں، پھر میں زمین میں بھاگ پڑتا ہوں۔ ورقہ نے کہا: ایسا نہ کیا کر۔ جب تیرے پاس آواز آئے تو ٹھہر جاؤ حتیٰ کہ وہ جو کہے سن لو، پھر میرے پاس آؤ اور مجھے بتاؤ۔ جب آپ تنہائی میں تھے تو آواز آئی۔ یا محمد! کہو: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۝ کہو: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس آئے اور یہ سب کچھ ذکر کیا۔ ورقہ نے آپ سے کہا: بشارت ہو، بشارت ہو، بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہ ہے جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور تو موسیٰ علیہ السلام کے ناموس کی مثل پر ہے، تو نبی مرسل ہے، تو ایک وقت جہاد کا حکم دے گا۔ اگر مجھے وہ وقت میسر آیا تو میں آپ کے ساتھ مل کر ضرور جہاد کروں گا۔ جب ورقہ فوت ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ورقہ کو جنت میں دیکھا اس پر ریشمی کپڑے تھے، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی (2)۔ بیہقی نے فرمایا: یہ حدیث منقطع ہے اگر یہ محفوظ ہو تو پھر یہ احتمال ہوگا کہ یہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اور یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کے نزول کے بعد الحمد کے نزول کی خبر ہو۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 104، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلاۃ، باب وجوب القراۃ للامام والماموم، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ دلائل النبوۃ، جماع ابواب المبعث، باب مبتدا البعث والتنزیل

مسئلہ نمبر 3: ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے گمان کیا کہ جبریل سورۃ الحمد کے ساتھ نازل نہیں ہوئے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر سے ایک آواز سنی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا، اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا ہے۔ جبریل نے کہا: یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے آج سے پہلے کبھی نہیں اترا، اس نے سلام کیا اور کہا: تمہیں دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ (وہ نور یہ ہیں) فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان میں سے کوئی حرف نہیں پڑھیں گے مگر تمہیں وہ عطا کیا جائے گا (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح بعض علماء نے گمان کیا ہے کیونکہ یہ حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس فرشتے سے پہلے آئے۔ اس کی آمد اور جو کچھ وہ لے کر آ رہا تھا اس کے متعلق آگاہ کیا۔ اس بنا پر جبریل اس کے نزول میں شریک ہو گیا۔ واللہ اعلم

میں (علامہ قرطبی) کہتا ہوں: حدیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جبریل امین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا تھا اور جبریل اس سورت کو لے کر آئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ (الشعراء) یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ سارا قرآن جبریل امین لے کر آئے۔ پس جبریل اس کی تلاوت مکہ ں لے کر آئے ہوں گے اور یہ فرشتہ مدینہ طیبہ میں اس کا ثواب لے کر آیا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سورت مکی، مدنی ہے جبریل امین اس کو دو مرتبہ لے کر آئے تھے۔ یہ قول ثعلبی نے حکایت کیا ہے اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اولیٰ ہے کیونکہ ہمارا قول قرآن وسنت کو جمع کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: یہ پہلے گزر چکا ہے کہ بسم اللہ صحیح قول کے مطابق اس سورت کا جز نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو نماز کا حکم یہ ہے کہ جب وہ تکبیر تحریمہ کہے تو سورۂ فاتحہ پڑھے اور خاموش نہ رہے، نہ توجیہہ ذکر کرے اور نہ تسبیح کیونکہ حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی احادیث اسی پر دلالت کرتی ہیں جو پیچھے گزر چکی ہیں۔ جبکہ توجیہہ، تسبیح اور سکوت کی احادیث بھی موجود ہیں۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ فرمایا ہے: حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ یہ دونوں حضرات جب نماز شروع کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك (2) حضرات سفیان، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول وہ ہے جو حضرت علی سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے پھر کہتے: وجهت وجهي (3) اس کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ پوری حدیث سورۂ انعام کے آخر میں آئے گی۔ اس مسئلہ میں مکمل گفتگو وہاں آئے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل الفاتحة وخواتيم سورة البقرة، صفحہ 271، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجة من قال لايجهر بالبسملة، صفحہ 172، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء فی صلاۃ وقیامہ، صفحہ 263، جلد 1

ابن منذر نے کہا: یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں تکبیر (تحریمہ) کہتے تو قراءت سے پہلے تھوڑی دیر خاموش رہتے اور یہ دعا پڑھتے: اللھم باعد بینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق و المغرب اللھم نقنی من خطایای کما یُنَقّی الثوبُ الابیض من الدنس اللھم اغسلنی من خطایای بالماء و الثلج و البرد۔ حضرت ابوہریرہ نے اس پر عمل کیا۔ ابوسلمۃ بن عبدالرحمن نے کہا: امام کے لئے دو سکتے ہیں۔ ان سکتوں میں قراءت کو غنیمت جانو (1)۔ حضرات اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز، امام احمد بن حنبل کا میلان بھی اس مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 5: نماز میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے وجوب میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین علماء نے فرمایا: یہ امام اور منفرد کے لئے ہر رکعت میں متعین ہے۔ ابن خویز منداد بصری مالکی نے کہا: امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے کہ جو دو رکعت والی نماز میں ایک رکعت میں الحمد شریف پڑھنا بھول جائے تو اس کی نماز باطل ہے اور جائز نہیں ہے اور اس شخص کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے جو چار یا تین رکعت والی نماز میں کسی ایک رکعت میں الحمد بھول جائے، کبھی تو فرمایا: وہ نماز کا اعادہ کرے اور کبھی فرمایا: سجدہ سہو کرے۔ ابن عبد حکیم وغیرہ نے امام مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس رکعت کا اعادہ کرے اور سلام کے بعد نمازی دوسری رکعت پڑھے گا جیسا کہ وہ شخص جس نے بھول کر سجدہ ساقط کر دیا۔ یہ ابن قاسم کا مختار مذہب ہے۔ حضرت حسن بصری، اکثر اہل بصرہ اور مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی مدنی نے کہا: جب کوئی شخص نماز میں ایک مرتبہ ام القرآن پڑھ لے تو وہ کافی ہو جائے گی، اس پر اعادہ نہ ہوگا کیونکہ نماز میں اس نے ام القرآن پڑھ لی ہے۔ پس اس کی نماز مکمل ہوگی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی نماز مکمل نہیں جس نے ام القرآن (الحمد) نہیں پڑھی (2)۔ اور اس شخص نے الحمد ایک مرتبہ پڑھ لی ہے (پس اس کی نماز مکمل ہوگی)۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ یہی قول صحیح ہے جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے نماز کی اکثر رکعات میں الحمد شریف نہیں پڑھی۔ یہی اختلاف کا سبب ہے۔ واللہ اعلم

حضرات امام ابوحنیفہ، ثوری، اوزاعی نے فرمایا: اگر جان بوجھ کر پوری نماز میں الحمد شریف چھوڑ دی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو اس کی نماز جائز ہو جائے گی۔ امام اوزاعی سے اس کے متعلق اختلاف مروی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن نے کہا: قراءت کی کم از کم مقدار تین آیات ہیں یا ایک بڑی آیت ہے جیسے قرضہ والی آیت۔ اور امام محمد سے یہ بھی مروی ہے۔ فرمایا: میں آیت کی مقدار اور کلمہ مفہومہ کی مقدار میں اجتہاد کو جائز قرار دیتا ہوں جیسے الحمد للہ، اور میں ایسے حرف کو جائز قرار نہیں دیتا جو کلام نہ ہو۔

علامہ طبری نے فرمایا: نمازی ہر رکعت میں الحمد کی تلاوت کرے گا، اگر الحمد نہیں پڑھے گا تو نماز جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ الحمد کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلاۃ، باب مایقول بعد التکبیر، حدیث 702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مثل قرآن سے الحمد کی آیات کی تعداد اور اس کے حروف کی تعداد کے مطابق تلاوت کرے۔

ابن عبد البر نے کہا: اس کا کوئی مطلب نہیں کیونکہ الحمد کی تعیین اور تخصیص نے اس حکم کے ساتھ اس کو خاص کر دیا ہے اور یہ محال ہے کہ جس پر الحمد کا پڑھنا واجب ہے وہ اس کا بدل پڑھ لے اور الحمد چھوڑ دے جبکہ وہ الحمد پڑھنے پر قادر بھی ہو بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ الحمد ہی پڑھے اور اسی کی طرف لوٹے جیسا کہ دوسری عبادات میں متعین فرائض ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: مقتدی اگر امام کو رکوع میں پالے تو امام مقتدی کی طرف سے قراءت کرنے والا ہوگا کیونکہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو مقتدی تکبیر کہے اور رکوع میں چلا جائے، قراءت نہ کرے اور اگر امام کو قیام میں پائے تو قراءت کرے۔

مسئلہ نمبر 7: اور کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ امام کے پیچھے سری نماز میں قراءت چھوڑ دے۔ اگر وہ قراءت چھوڑ دے گا تو اچھا نہیں کرے گا، لیکن امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ اور جب امام . ہری قراءت کر رہا ہو تو پھر یہ مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8: امام کے پیچھے جہری نماز میں نہ سورۂ فاتحہ پڑھے اور نہ کوئی دوسری سورت پڑھے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کیا بات ہے مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جا رہا ہے'' (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امام کے بارے ارشاد ہے: ''جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو'' (صحیح مسلم۔ کتاب الصلاۃ)۔ اور ارشاد فرمایا: ''جس کا امام ہو، امام کی قراءت اس کی قراءت ہے'' (2)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور امام شافعی سے یہ قول بویطی اور امام احمد بن حنبل نے حکایت فرمایا کہ کسی کی نماز نہ ہوگی حتیٰ کہ وہ ہر رکعت میں الحمد پڑھے خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہو۔ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری۔ امام شافعی عراق میں مقتدی کے بارے میں کہتے تھے جب امام سری قراءت کرے تو مقتدی قراءت کرے اور جب جہری قراءت کرے تو مقتدی قراءت نہ کرے جیسا کہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ اور امام شافعی کے مصر میں امام کے جہری قراءت کرنے کی صورت میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدی قراءت کرے دوسرا یہ کہ امام کی قراءت کافی ہے مقتدی خود قراءت نہ کرے۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ ابن وہب، اشہب، ابن عبد الحکم، ابن حبیب اور کوفہ کے علماء نے کہا: مقتدی بالکل قراءت نہ کرے۔ خواہ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری قراءت کر رہا ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: امام کی قراءت، مقتدی کی قراءت ہے (3) یہ حکم عام ہے اور جابر کا قول ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو (4)۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلاۃ، باب ترک القراءۃ خلف الامام، صفحہ 59، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اقامۃ الصلاۃ، اذا قرا الامام الخ، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب لاصلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 9: ان اقوال میں سے صحیح قول امام شافعی، امام احمد کا ہے اور امام مالک کا دوسرا قول ہے کیونکہ ہر شخص کے لئے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بالعموم متعین ہے (☆)۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اس کی نماز نہیں جس نے نماز میں الحمد نہیں پڑھی (1)۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے (2)۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اعلان کروں کہ سورہ الحمد اور اس سے زائد کی قراءت کے بغیر نماز نہیں (3)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے، جس طرح کہ کسی رکعت کا سجدہ اور رکوع دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتا اسی طرح ایک رکعت کی قراءت دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتی۔

عبداللہ بن عون، ایوب سختیانی اور ابوثور وغیرہ اصحاب شوافع، داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی مثل اوزاعی سے بھی مروی ہے اور یہی قول مکحول کا بھی ہے۔ حضرات عمر بن خطاب، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، ابی بن کعب، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، عثمان بن ابی عاص اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، فرماتے ہیں: سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ یہی قول حضرت ابن عمر کا ہے اور اوزاعی کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ یہ صحابہ مقتداء ہیں اور ان ذوات میں اسوہ ہے یہ تمام حضرات ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں۔

امام ابوعبداللہ بن محمد یزید بن ماجہ القزوینی نے اپنی سنن میں ایسی روایت نقل کی ہے جو اختلاف کو ختم کر دیتی ہے اور ہر احتمال کو زائل کر دیتی ہے۔ فرمایا: ہمیں ابوکریب نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن فضیل نے بتایا۔ دوسری سند اس طرح ہے ہمیں سوید بن سعید نے بتایا، ہمیں علی بن مسہر نے بتایا تمام نے ابوسفیان سعدی سے روایت کیا، انہوں نے ابونضرہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں الحمد اور کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی (4)۔ خواہ فرضی نماز ہو یا نفلی نماز ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا جس کو آپ نماز سکھا رہے تھے: "تو اس طرح اپنی تمام نماز میں کر (5)"۔ آگے یہ حدیث تفصیل سے آئے گی۔ دوسری دلیل اس کے متعلق وہ روایت ہے جو ابوداؤد نے نافع بن محمود الربیع سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عبادہ بن صامت صبح کی نماز میں لیٹ ہو گئے تو ابونعیم مؤذن نے تکبیر کہی اور خود ہی لوگوں کو نماز پڑھا دی۔ حضرت عبادہ بن صامت آئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا حتیٰ کہ ہم نے ابونعیم کے پیچھے صف بنائی، ابونعیم جہری قراءت کر رہے تھے عبادہ نے الحمد پڑھنی شروع کر دی جب سلام پھیرا تو میں نے عبادہ سے کہا: میں تجھے الحمد پڑھتے ہوئے سن رہا تھا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ باب لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ، حدیث نمبر 697، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب القراءۃ خلف الامام، حدیث نمبر 829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 119، جلد 1 (د۔ت)۔ کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، حدیث 701، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
☆ جب امام کی قراءت مقتدی کی کفالت کر جاتی ہے تو پھر احناف کا قول راجح ہوگا کیونکہ مقتدی جب امام کو رکوع میں پائے تو اس کی رکعت مکمل ہو جاتی ہے۔ مترجم

جبکہ ابونعیم جہری قراءت کر رہے تھے؟ عبادہ نے کہا: ہاں۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز پڑھائی جس میں آپ جہری قراءت کر رہے تھے، آپ پر قراءت خلط ملط ہوگئی جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو ہماری طرف رخ انور پھیر لیا اور فرمایا: کیا تم قراءت کرتے ہو جب میں جہری قراءت کرتا ہوں؟ ہم میں سے بعض نے کہا: ہم واقعی ایسا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، میں کہہ رہا تھا مجھے کیا ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے، تم قرآن میں سے کچھ نہ پڑھا کرو جب میں جہری قراءت کر رہا ہوں، مگر صرف سورہ الحمد (پڑھا کرو) (1)۔ یہ مقتدی کے بارے میں نص صریح ہے کہ وہ بھی سورہ الحمد پڑھے۔ اس حدیث کا معنی ابوعیسیٰ ترمذی نے محمد بن اسحاق کی حدیث سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ اور امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اس حدیث پر اکثر اہل علم صحابہ اور تابعین کا عمل ہے۔ حضرات مالک بن انس، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ حضرات امام کے پیچھے قراءت کا نظریہ رکھتے تھے۔

اس حدیث کو دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ اسناد حسن ہے۔ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں اور انہوں نے ذکر کیا کہ محمود بن ربیع ایلیاء میں رہتے تھے اور ابونعیم پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں اذان دی۔ ابومحمد عبدالحق نے کہا: نافع بن محمود کو بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر نہیں کیا اور نہ ابن ابی حاتم نے اسے ذکر کیا اور نہ بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل کی۔ اس کے متعلق ابوعمر نے فرمایا: یہ مجہول ہے۔ دارقطنی نے یزید بن شریک سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے عمر سے قراءت خلف الامام کے بارے پوچھا تو انہوں نے مجھے قراءت خلف الامام کا حکم دیا۔ میں نے کہا: اگر آپ بھی امام ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں بھی ہوں۔ میں نے کہا: اگرچہ آپ جہری قراءت کر رہے ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں جہری قراءت کر رہا ہوں (2)۔ دارقطنی نے کہا: یہ سند صحیح ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام ضامن ہے (3) جو کچھ وہ کرے تم بھی وہ کرو۔ ابوحاتم نے کہا: یہ اس کے لئے (دلیل) صحیح ہے جو امام کے پیچھے قراءت کا قائل ہے۔ حضرت ابوہریرہ نے الفارسی کو یہی فتویٰ دیا تھا کہ وہ دل میں قراءت کیا کرے جب اس نے حضرت ابوہریرہ سے کہا تھا کہ میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا گیا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اس کا نصف میرے لئے ہے اور اس کا نصف میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑھو۔ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ..... (4) (الحدیث)

مسئلہ نمبر 10: پہلے علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد واذا قرأ فانصتوا (5) (جب امام قرأت کرے تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ فی کل رکعۃ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الکتاب، صفحہ 317، جلد 1 (دار المحاسن للطباعۃ القاہرہ)

3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 77، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجب علی المؤذن من تعاھد الوقت، حدیث 434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک قراءۃ بسم اللہ فی الفاتحہ، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)

5۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، صفحہ 174، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

خاموش رہو) سے استدلال کیا ہے۔ اسے مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث سے نقل کیا ہے اور فرمایا: جریر عن سلیمان عن قتادہ کی سند سے جو حدیث مروی ہے اس میں زیادتی ہے: واذا قرأ فانصتوا۔ دارقطنی نے کہا: قتادہ سے اس زیادتی کو ذکر کرنے میں سلیمان تیمی کی متابعت نہیں کی گئی بلکہ قتادہ کے شاگردوں میں سے حفاظ نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا۔ حفاظ حدیث میں یہ افراد شامل ہیں: شعبہ، ہشام، سعید بن ابی عروبہ، ہمام، ابوعوانہ، معمر، عدی بن ابی عمارہ۔

دارقطنی نے کہا: ان حفاظ کا اجماع دلیل ہے کہ سلیمان تیمی کو ان الفاظ میں وہم ہوا ہے۔ عبداللہ بن عامر عن قتادہ کی سند سے تیمی کی متابعت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ قطان نے اس کو ترک کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے یہ زیادہ نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ زیادتی اذا قرء فانصتوا محفوظ نہیں ہے (1)۔ ابومحمد عبدالحق نے ذکر کیا ہے کہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح کہا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مسلم کا حضرت ابوموسیٰ کی حدیث سے ان الفاظ کو اپنی کتاب میں داخل کرنا ان کے نزدیک اس کی صحت کی دلیل ہے اگرچہ اس کی صحت کا تمام علماء کا اجماع نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور ابن منذر نے صحیح کہا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف: 204) تو یہ مکہ میں نازل ہوا اور نماز میں کلام کرنے کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت زید بن ارقم نے فرمایا: پس اس میں حجت نہ رہی کیونکہ مقصود مشرکین تھے جیسا کہ حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے آواز بلند کرنے کے بارے نازل ہوئی۔ اور دارقطنی نے فرمایا: عبداللہ بن عامر ضعیف ہے۔ رہا حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جا رہا ہے (2)۔ اسے امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے ابن اکیمہ لیثی سے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے اس کے نام کے بارے فرمایا: عمرو۔ جبکہ دوسرے محدثین نے کہا: عامر، بعض نے کہا: یزید، بعض نے کہا: عمارہ، بعض نے کہا: عباد، اس کی کنیت ابوالولید تھی، ایک سو ایک ہجری میں اس کا وصال ہوا جبکہ اس کی عمر ۹۹ سال تھی۔ ان سے زہری نے صرف یہی حدیث روایت کی ہے اور یہ ثقہ ہے۔ محمد بن عمرو وغیرہ نے اس سے روایت کیا ہے۔ اس کی حدیث میں یہ معنی موجود ہے جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو تم بلند آواز سے قراءت نہ کرو کیونکہ یہ تنازع، چھیننا اور تخالج ہے (بلکہ) دل میں پڑھو۔ حضرت عبادہ کی حدیث اور حضرت عمر فاروق اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ بھی اس حدیث کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔ اگر مالی انازع القرآن (کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے) (3) سے وہ یہ منع کا مفہوم سمجھتے تو اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ حضرت ابن اکیمہ کی حدیث میں زہری کا قول ہے کہ پھر لوگ اس نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قراءت کرنے سے رک گئے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند آواز سے قراءت کرتے تھے جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سنی۔ یہاں قراءت سے مراد الحمد ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یصلی من قعود، حدیث 511، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ترک القراءۃ باب خلف الامام فیما جہر فیہ، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً

ہے۔ وباللہ توفیقنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں توفیق ملتی ہے۔

رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''جس کا امام ہو، تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے'' (1)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حسن بن عمارہ نے اسے متصل ذکر کیا ہے اور وہ متروک ہے۔ ابوحنیفہ (امام اعظم) وہ بھی ضعیف ہے (یہ تبصرہ تعجب کی بات ہے خصوصاً جب حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے محدث آپ کی شاگردی پر فخر کریں۔ مترجم)۔ ان دونوں حضرات نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث کو حضرات سفیان ثوری، شعبہ، اسرائیل، ابن یونس، شریک، ابو خالد الدالانی، ابو الاحوص، سفیان بن عیینہ، جریر بن عبدالحمید وغیرہم نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے مرسلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور مرسل ہی درست ہے۔ رہا حضرت جابر کا قول کہ ''جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں الحمد نہ پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر جب امام کے پیچھے ہو'' (2)۔ اس قول کو مالک نے وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اس قول کو یحییٰ بن سلام صاحب تفسیر نے مالک سے انہوں نے ابونعیم وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ صواب حضرت جابر پر موقوف ہے جیسا کہ مؤطا میں ہے۔ اس حدیث میں فقہی مسئلہ یہی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ رکعت باطل ہے جس میں الحمد نہ پڑھی گئی۔ یہ دلیل ہے اس مذہب کی جس کی طرف ابن قاسم گئے ہیں اور انہوں نے مالک سے اس رکعت کے لغو ہونے اور دوسری رکعت پر بنا کرنے کو روایت کیا ہے۔ نمازی اس رکعت کو شمار نہیں کرے گا جس میں اس نے الحمد نہ پڑھی ہوگی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام کی قراءت اس کے مقتدیوں کی قراءت ہے (۱)۔ یہ حضرت جابر کا مذہب تھا اور دوسرے لوگوں نے ان کی اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 11: ابن عربی نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: لا صلاۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب (3) (اس کی نماز نہیں جس نے الحمد نہیں پڑھی) اس کی اصل کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ کمال اور تمام کی نفی پر محمول ہے یا جواز کی نفی پر محمول ہے۔ ناظر کے حال کے اختلاف کی وجہ سے فتویٰ بھی مختلف ہے۔ اس اصل میں مشہور اور اقویٰ یہ ہے کہ نفی عموم پر ہے اور مالک کی روایت سے اقویٰ یہ ہے کہ جس نے اپنی نماز میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے پھر ہم نے ہر رکعت میں الحمد کے تکرار میں غور کیا۔ پس جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: افعل ذالك فی صلاتك كلها (4) (اپنی نماز میں ایسا کر) کی یہی تاویل کی اسے ہر رکعت میں الحمد کا لوٹانا لازم ہے جیسا کہ رکوع و سجود کو لوٹاتا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 12: اس باب میں سورۂ فاتحہ کی تعیین میں جو معانی اور احادیث ذکر کی ہیں یہ سب کوفہ کے علماء کے اس

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا قرأ الامام فانصتوا، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی ام القرآن، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحۃ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)   4۔ ایضاً، صفحہ 170، جلد 1

(۱) قراءت خلف الامام کے حوالے سے شرح معانی الآثار کتاب الصلاۃ باب قراءۃ خلف الامام میں اور علامہ عینی کی عمدۃ القاری شرح بخاری میں تفصیلی بحث موجود ہے۔

قول کا رد کرتی ہیں جو کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ متعین نہیں ہے اور سورۂ فاتحہ اور قرآن کی دوسری آیات برابر نہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد سے اسے متعین فرمایا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم ﷺ **واقیموا الصلوۃ** کی مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے والے ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سورۂ فاتحہ اور جو مزید قراءت میسر ہو وہ پڑھیں (1)۔ پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعرابی کو جو فرمایا تھا کہ جو تیرے پاس قرآن ہے وہ پڑھ اور جو سورۂ فاتحہ سے زائد ہے وہ پڑھ (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ** (المزمل: 20) کی تفسیر ہے تو پڑھ لیا کرو قرآن سے جتنا آسان ہو۔

مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی (3) ایک روایت میں ''اور کچھ زائد'' اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے مکمل نہیں ہے (4) یعنی ادلہ مذکورہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ الخداج کا لفظ حدیث میں استعمال ہوا ہے اس کا معنی نقص اور فساد ہے۔ اخفش نے کہا: خدجت الناقۃ اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی ناقص بچہ جنم دے اور اخدجت اس وقت کہا جاتا ہے جب وقت سے پہلے بچہ پھینک دے اگرچہ اس کی تخلیق مکمل ہو۔

نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کمی کے ہوتے ہوئے نماز جائز نہ ہو کیونکہ یہ ایک ایسی نماز ہے جو مکمل نہیں ہوئی اور جو اپنی نماز سے خارج ہو جبکہ اس کی نماز مکمل نہ ہوئی ہو تو اس پر اعادہ واجب ہے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے اور جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کمی کے باوجود نماز جائز ہے حالانکہ وہ کمی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے اور اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو لازم ہو۔

مسئلہ نمبر 13: امام مالک سے مروی ہے کہ کسی نماز میں قراءت واجب نہیں ہے اور اسی طرح امام شافعی عراق میں اس شخص کے بارے فرماتے تھے جو قراءت بھول جائے پھر مصر میں اس قول سے رجوع کر لیا اور کہا: اس شخص کی نماز جائز نہیں، جو سورۂ فاتحہ اچھی طرح پڑھ سکتا ہے مگر سورہ فاتحہ کے ساتھ۔ اور سورۂ فاتحہ میں سے ایک حرف بھی کم ہوا تو نماز جائز نہ ہو گی۔ پس اگر سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھا یا اس سے کوئی حرف کم کر دیا تو وہ نماز کا اعادہ کرے اگرچہ دوسری کوئی سورت تلاوت بھی کی ہو۔ اس مسئلہ میں یہی قول صحیح ہے۔ اور رہا وہ مسئلہ جو حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی۔ ان کے سامنے قراءت نہ کرنے کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے پوچھا رکوع وسجود کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا: وہ تو بہت اچھا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: پھر کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث منکر اللفظ ہے اور منقطع الاسناد ہے کیونکہ اسے ابراہیم بن حارث تیمی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور کبھی ابراہیم اسے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عمر کے سلسلہ سے روایت کرتے تھے اور دونوں سندیں منقطع ہیں اس میں حجت نہیں ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں اسے ذکر کیا ہے اور یہ بعض رواۃ نے بیان

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب من ترك القراءة في صلاة بفاتحة الكتاب، حدیث 695، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 169، جلد 1 4۔ ایضاً

کی ہے جبکہ یحییٰ اور ان کے ساتھ والے طائفہ نے اسے بیان نہیں کیا کیونکہ امام مالک نے اپنی کتاب میں اسے آخر میں ذکر کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث پر عمل نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ نماز جس میں الحمد نہ پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہے(1) حضرت عمر سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس نماز کا اعادہ کیا تھا اور یہ ان سے صحیح ثابت ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری نے فرمایا: ابو معاویہ نے ہمیں بتایا انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے ہمام بن حارث سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر مغرب کی نماز میں قراءت بھول گئے تو آپ نے لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھائی۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ حدیث متصل ہے۔ ہمام نے حضرت عمر سے اس کو بیان کیا اور اس کو انہوں نے کئی طرق سے روایت کیا۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: امام مالک سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جو قراءت بھول گیا تھا۔ کیا تجھے تعجب میں ڈالتا ہے جو حضرت عمر نے کہا تھا؟ انہوں نے فرمایا: میں انکار کرتا ہوں کہ حضرت عمر نے ایسا کیا تھا اور میں اس روایت کا انکار کرتا ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: لوگ حضرت عمر کو مغرب کی نماز میں ایسا کرتے دیکھتے تھے اور وہ سبحان اللہ نہیں کہتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو ایسا کرے (یعنی قراءت نہ کرے) تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔

مسئلہ نمبر 14: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قراءت کے بغیر نماز نہیں ہوتی جیسا کہ علماء کے اصول سے گزر چکا ہے اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی قرأت متعین نہیں ہے مگر وہ مستحب قرار دیتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ ایک سورت پڑھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل اکثر ثابت ہے۔ امام مالک نے فرمایا: قراءت میں سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں الحمد اور کوئی سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: ام القرآن (الحمد) پڑھے اگر الحمد نہ پڑھی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو بھی اس کی نماز جائز ہو جائے گی اور فرمایا: اگر تین رکعتوں میں قراءت بھول جائے تو نماز کو دوبارہ پڑھے۔ ثوری نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں چاہے تو تسبیح کرے اور اگر چاہے تو قراءت کرے، اور اگر قراءت نہ کرے اور تسبیح بھی نہ کرے تب بھی نماز جائز ہو گی۔ یہ قول امام ابو حنیفہ اور دوسرے تمام کوفیوں کا ہے۔ ابن منذر نے فرمایا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قراءت کر اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح پڑھ۔ امام نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

سفیان نے کہا: اگر تین رکعتوں میں قراءت نہ کی تو نماز کا اعادہ کرے کیونکہ ایک رکعت کی قراءت جائز نہیں۔ فرمایا: اسی طرح اگر فجر کی نماز میں ایک رکعت میں قراءت بھول جائے (تو بھی نماز کا اعادہ کرے)۔ ابو ثور نے کہا: نماز جائز نہیں مگر ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے ساتھ جیسا کہ امام شافعی کا مصری قول ہے اسی پر شوافع کا اجماع ہے۔ اسی طرح ابن خویز منداد مالکی کا قول ہے۔ فرمایا: ہمارے نزدیک ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت ابو قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھاتے تھے اور ظہر اور عصر کی نمازوں

1۔ صحیح مسلم، باب وجوب قرأۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن الفاتحۃ ولا مکنہ تعلمھا قرأ ما تیسر لہ غیرھا، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت کرتے تھے۔ کبھی ہمیں کوئی آیت کریمہ سناتے تھے، ظہر کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے اور دوسری کو چھوٹا کرتے تھے اور اسی طرح صبح کی نماز میں کرتے تھے (1)۔ ایک روایت میں ہے کہ دوسری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے (2) یہ صریح نص ہے اور حدیث صحیح ہے۔ یہی امام مالک کا مسلک ہے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے تعین میں یہ نص ہے بخلاف ان علماء کے جنہوں نے اس کا انکار کیا۔ حجت، سنت میں ہوتی ہے نہ کہ اس قول میں جو سنت کے خلاف ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15: جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سے زائد قراءت واجب نہیں ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نماز میں قراءت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہم سے جہری قراءت کی ہم نے تم سے جہری قراءت کی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مخفی (قراءت) کی ہم نے بھی تم سے مخفی کی۔ پس جس نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی اس کی طرف سے قرأت جائز ہوگئی اور جس نے سورۂ فاتحہ سے زائد پڑھا وہ افضل ہے (3)۔ بخاری میں ہے: اگر تم اس سے زائد پڑھو تو بہتر ہے (4)۔ اکثر اہل علم نے ضرورت یا غیر ضرورت کے لئے سورت کو ترک کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان میں سے حضرات عمران بن حصین، ابوسعید خدری، خوات بن جبیر، مجاہد، ابووائل، ابن عمر، ابن عباس وغیرہم ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور قرآن میں سے مزید کچھ نہ پڑھے۔ پھر ان علماء میں سے بعض نے دو آیات کی حد متعین کی بعض نے ایک آیت کی حد متعین کی، بعض نے کوئی حد متعین نہیں کی اور فرمایا: قرآن میں سے کچھ پڑھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم ہے: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (مزمل:20) پس سورۂ فاتحہ کے ساتھ ہر حال میں جو اسے میسر ہو وہ پڑھے کیونکہ حضرات عبادہ، ابوسعید خدری وغیرہما کی حدیث میں یہی حکم ہے۔ مدونہ میں ہے: وکیع نے اعمش سے انہوں نے خیثمہ سے روایت کیا، فرمایا: مجھے اس نے بتایا جس نے حضرت عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھے۔ سورت کی قراءت کے بارے میں تین اقوال ہیں: سنت ہے، فضیلت ہے، واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 16: جو شخص بسیار کوشش کے باوجود سورۂ فاتحہ یا قرآن میں سے اور کچھ نہ سیکھ سکے تو اسے لازم ہے کہ وہ قراءت کی جگہ ممکن حد تک تکبیر یا تہلیل یا تحمید یا تسبیح یا تمجید یا لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ جب وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو جبکہ سری قراءت والی نماز ہو۔

ابوداؤد وغیرہ نے عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: میں قرآن یاد نہیں کرسکتا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو قراءت کی کفایت کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو کہہ: سبحان اللہ، الحمد للہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ تو اللہ کے لئے ہے، میرے لئے کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراۃ فی الظہر والعصر، صفحہ 185، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)　2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 106، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب القراۃ فی الفجر، حدیث 730، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے؟ فرمایا: تو اس طرح کہہ: اے اللہ! تو مجھ پر رحم کر، مجھے عافیت دے، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما (1)۔

مسئلہ نمبر 17: اگر کوئی شخص ان الفاظ کے یاد کرنے سے بھی عاجز ہو تو وہ امام کے ساتھ نماز کو نہ چھوڑے۔ امام اس کی طرف سے ان شاء اللہ یہ ادا کرنے والا ہوگا۔ اس شخص پر لازم ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید قرآن سیکھنے کی کوشش ہمیشہ کرتا رہے حتیٰ کہ اس پر موت آجائے، تو بھی وہ کوشش میں لگا ہوا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرمالے گا۔

مسئلہ نمبر 18: جو عجمی لوگوں میں سے عربی نہ بول سکتا ہو اور اس کے لئے عربی دعا کا اس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو جس کو وہ سمجھتا ہو تاکہ وہ اپنی نماز قائم کرے تو ان شاء اللہ یہ بھی اس کے لئے جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 19: جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ جو عربی اچھی طرح جانتا ہو وہ اگر فارسی میں قراءت کرے گا تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: فارسی میں قراءت جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو کیونکہ مقصود معنی کو پانا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور اس کے بھی خلاف ہے جو نبی کریم ﷺ نے سکھایا اور مسلمانوں کی جماعت کے عمل کے بھی خلاف ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے قول کی کسی عالم نے موافقت کی ہے۔ (۱)

مسئلہ نمبر 20: جس نے نماز کو شروع کیا جس طرح کہ حکم دیا گیا تھا جبکہ وہ قراءت نہ جانتا تھا پھر نماز کے دوران ہی اسے قرأت کا علم حاصل ہو۔ اور یہ متصور ہے اس طرح کہ کوئی شخص تلاوت سنے اور سننے کے ساتھ ہی وہ اس کے حافظہ میں معلق ہو جائے تو ایسا شخص نماز کو نئے سرے سے شروع نہ کرے کیونکہ اس نے جو پیچھے ادا کیا وہ حکم الٰہی کے مطابق تھا۔ پس اس کے سابقہ عمل کو باطل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ ابن سحنون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

تیسرا باب

آمین کہنے کے متعلق ہے

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: قرآن پڑھنے والے کے لئے سنت ہے کہ سورۂ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے نون پر سکتہ کے بعد آمین کہے تاکہ قرآن، غیر قرآن سے ممتاز ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2: حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے کتب حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے سے موافقت کر جائے گا اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے'' (2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 121، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجزئ الامی والاعجمی من القراۃ، حدیث 708، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب جھر الامام بالتأمین، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۱) احناف کی کتب میں موجود ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا ''ہدایہ'' ان کا پہلا عذر حکمی کی وجہ سے تھا۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: گناہ کی مغفرت کی ترتیب چار مقدمات پر ہے جن کو یہ حدیث متضمن ہے: (۱) امام کا آمین کہنا۔ (۲) مقتدیوں کا آمین کہنا۔ (۳) فرشتوں کا آمین کہنا۔ (۴) آمین کہنے میں موافقت۔ بعض علماء نے فرمایا: اجابت میں موافقت، بعض نے فرمایا: زمانہ میں موافقت، بعض نے فرمایا: دعا کے اخلاص کی صفت میں موافقت مراد ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو درآں حالیکہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل اور اخلاص سے خالی دل کی دعا قبول نہیں فرماتا'' (1)۔

مسئلہ نمبر 3: ابوداؤد نے ابو مصبح مقرائی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ابوزہیر منیری کے پاس بیٹھتے تھے اور وہ صحابہ میں سے تھے، وہ بڑے اچھے انداز میں حدیث بیان کرتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی دعا مانگتا تو کہتے: اس پر آمین سے مہر لگاؤ کیونکہ آمین صحیفہ پر مہر کی طرح ہے۔ ابوزہیر نے کہا: میں تمہیں اس کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہم ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ ہم ایک شخص کے پاس آئے جو دعا کرنے میں اصرار کر رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے سنتے ہوئے ٹھہر گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے مہر لگا دی تو یہ واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے کہا: کس چیز کے ساتھ مہر لگائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آمین کے ساتھ کیونکہ اگر آمین کے ساتھ مہر لگا دے گا تو واجب کر دے گا۔ وہ شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا وہ واپس آیا اور اس شخص کے پاس پہنچا اور اسے کہا: اے فلاں! مہر لگا اور خوش ہو (2)۔

ابن عبدالبر نے کہا: ابوزہیر منیری کا نام یحییٰ بن نفیر تھا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، مکڑی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا لشکر ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: آمین کے چار حرف ہیں اللہ تعالیٰ ہر حرف سے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو دعا کرتا رہتا ہے۔ اے اللہ! ہر اس شخص کو بخش دے جس نے آمین کہا اور خبر میں ہے سورۃ فاتحہ سے میرے فارغ ہونے کے بعد مجھے جبریل نے آمین کی تلقین کی اور کہا: یہ خط پر مہر کی طرح ہے ایک اور حدیث میں ہے آمین رب العالمین کی مہر ہے۔ ہروی نے کہا: ابوبکر نے کہا: اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہر لگائی کیونکہ وہ آمین کے ساتھ بندوں سے آفات و بلیات دور فرماتا ہے۔ پس گویا یہ خط کی مہر کی مانند ہے جو خط کو محفوظ رکھتی ہے اور اس میں خرابی کرنے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اسے ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے آمین جنت میں ایک درجہ ہے۔ ابوبکر نے کہا: اس کا معنی یہ ہے یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا کہنے والا اس کے ذریعے جنت میں ایک درجہ حاصل کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اکثر اہل علم کے نزدیک آمین کا معنی ہے: اللهم استجب لنا (اے اللہ ہماری دعا قبول فرما) یہ دعا کی جگہ رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ جعفر بن محمد، مجاہد، ہلال بن یساف سے مروی ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے جبکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: آمین کا معنی ہے اسی طرح ہونا چاہئے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی جامع الدعوات، صفحہ 186، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوۃ، باب التامین وراء الامام، حدیث نمبر 803، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آمین کا معنی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اس کا معنی ہے) اے میرے رب! تو (ایسا) کر۔ مقاتل نے کہا: یہ کلمہ دعا کے لئے قوت ہے اور برکت طلب کرنے کے لئے ہے۔ ترمذی نے کہا: اس کا معنی ہے ہماری امیدوں کو نامراد نہ کر۔

مسئلہ نمبر5: آمین میں دو لغتیں ہیں: (۱) مد، بروزن فاعیل جیسے یاسین (۲) بغیر مد کے یمین کے وزن پر۔

شاعر نے مد میں کہا ہے۔

یا رب لا تسلبنی حبها ابداً   و یرحم الله عبداً قال آمینا

اے رب! مجھ سے اس کی محبت کبھی نہ نکال اور اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو آمین کہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

آمین آمین لا ارضی بواحدۃ   حتی ابلغها الفین آمینا

آمین آمین، میں ایک مرتبہ کہنے پر راضی نہ ہوں گا حتیٰ کہ میں اسے دو ہزار آمین تک پہنچاؤں گا۔

ایک اور شاعر نے بغیر مد کے کہا ہے:

تباعد منی فُطْحُلٌ اذ سالتُهٗ   امین فزاد الله ما بیننا بعداً

اس شعر میں امین بغیر مد کے استعمال ہوا ہے۔

آمین کو میم کی شد کے ساتھ پڑھنا غلطی ہے یہ جوہری کا قول ہے۔ حسن اور حضرت امام جعفر صادق سے شد کے ساتھ مروی ہے حسین بن فضل کا بھی یہی قول ہے اور یہ امّ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے قصد کرنا یعنی ہم تیری طرف قصد کرنے والے ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ (المائدہ: 2) یہ قول ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم قشیری نے حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: یہ این اور کیف کی مثل مبنی برفتحہ ہے کیونکہ اجتماع ساکنین ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: اَمَّنَ فلان تامیناً۔

مسئلہ نمبر6: علماء کا اختلاف ہے کیا امام آمین کہے اور کیا وہ اسے بلند آواز سے کہے۔ امام شافعی اور مالک اور ایک روایت میں مدنی علماء اسی مسلک کی طرف گئے ہیں۔ کوفہ کے علماء اور بعض مدنی علماء نے کہا: وہ بلند آواز سے آمین نہ کہے۔ یہی طبری کا قول ہے۔ ہمارے مالکی علماء میں سے ابن حبیب نے یہی کہا ہے۔ ابن بکیر نے کہا: اسے اختیار ہے (1)۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام آمین نہ کہے بلکہ مقتدی آمین کہیں۔ یہ ابن قاسم اور اصحاب مالک میں سے مصری علماء کا قول ہے اور ان کی حجت حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور ہمارے لئے ہمارا طریقہ بیان فرمایا اور ہمیں اپنی نماز سکھائی اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو پھر تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو جب وہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے گا (2) حدیث ذکر فرمائی۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے اسی کی مثل سمی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 79، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، صفحہ 174، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اسے مالک نے نقل فرمایا۔ پہلا قول صحیح ہے اس کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ فرمایا: رسول الله ﷺ جب وَ لَا الضَّآلِّيْنَ پڑھتے تو آمین کہتے اور اس کے ساتھ آواز کو بلند کرتے (1)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے یہ حدیث روایت کی ہے اور یہ زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: یہ سنت ہے جس کے ساتھ اہل کوفہ منفرد ہیں یہ صحیح ہے اور جو اس کے بعد ہے۔

امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے: جهر الامام بالتامين۔ (2)

عطاء نے کہا: آمین دعا ہے۔ ابن زبیر اور ان کے مقتدیوں نے آمین کہا حتیٰ کہ مسجد میں گونج پیدا ہوئی۔ امام ترمذی نے کہا: نبی کریم ﷺ کے صحابہ اور تابعین علماء میں سے اکثر علماء فرماتے ہیں کہ نمازی اپنی آواز آمین کے ساتھ بلند کرے اور آہستہ نہ کہے (3)۔ یہی قول امام شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ مؤطا اور بخاری و مسلم میں ہے، ابن شہاب نے فرمایا: رسول الله ﷺ فرماتے تھے: آمین (4)۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں نے آمین کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ رسول الله ﷺ جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتے تھے تو آمین کہتے تھے حتیٰ کہ پہلی صف والے سن لیتے تھے اور مسجد اس کے ساتھ گونج جاتی تھی (5)۔ رہی ابو موسیٰ اور سمی کی حدیث تو ان دونوں کا معنی اس مقام کی وضاحت ہے جہاں آمین کہا جاتا ہے اور وہ وہ مقام ہے جب امام وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے تاکہ ان دونوں کا قول اکٹھا ہو جائے اور مقتدی آمین کے قول کے ساتھ امام سے آگے نہ بڑھ جائیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ والله اعلم۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو (6)۔ ابن نافع نے اپنی کتاب ''ابن الحارث'' میں فرمایا: مقتدی آمین نہ کہے حتیٰ کہ امام کو وَ لَا الضَّآلِّيْنَ کہتے ہوئے سن لے اور جب امام سے اتنا دور ہو کہ اس کی آواز نہ سن سکے تو آمین نہ کہے۔ ابن عبدوس نے کہا: وہ قراءت کا اندازہ کر کے آمین کہے (7)۔

مسئلہ نمبر 7: امام ابوحنیفہ کے ساتھیوں نے کہا: آہستہ آمین کہنا، بلند آواز سے آمین کہنے کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ دعا ہے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (اعراف: 55) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ)۔ مزید کہتے ہیں: آہستہ آمین کہنے پر دلیل وہ تاویل ہے جو اس آیت قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس: 89) کے بارے میں مروی ہے۔ فرمایا: موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔ دونوں کو الله تعالیٰ نے آمین کہنے والا فرمایا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 135-134، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التامین وراء الامام، حدیث 797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔
3۔ سنن ترمذی، صفحہ 34، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین
4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین خلف الامام
5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 62، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجهر بامین، حدیث نمبر 842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
6۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب جهر الامام بالتامین، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
7۔ المحرر الوجیز، صفحہ 80، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کا اخفاء افضل ہے کیونکہ اس میں ریا داخل ہو جاتا ہے لیکن وہ امر جو جماعت کی نماز کے ساتھ متعلق ہے، اس میں حاضری، ایک شعار کا اظہار ہے اور حق کا اظہار بندوں کو اس کے اظہار کی دعوت دیتا ہے۔ امام سورۃ فاتحہ کی قراءت بلند آواز سے کرتا ہے جو دعا اور آمین کہنے پر مشتمل ہے۔ جب دعا ایسی چیز ہے جس میں جہر سنت ہے تو آمین کہنا تو دعا کے لئے مہر ہے اور اس کے قائم مقام ہے اور یہ واضح امر ہے۔

مسئلہ نمبر 8: آمین کا کلمہ ہم سے پہلے صرف موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لئے تھا۔ حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں عبد الوارث بن عبد الصمد نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں رزین نے بتایا جو ہشام بن حسان کی مسجد کے مؤذن تھے۔ انہوں نے کہا: ہمیں حضرت انس بن مالک نے بتایا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین ایسی چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں فرمائیں۔ وہ یہ ہیں: اہل جنت کا سلام، فرشتوں کی صفیں اور آمین مگر موسیٰ اور ہارون کو آمین کا کلمہ دیا گیا تھا۔ ابو عبد اللہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے خلاف دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا قرآن میں اس طرح ذکر کیا قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس: 89) ہارون علیہ السلام کے کلام کو ذکر نہیں فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبَّنَا (اے ہمارے رب!) اور ہارون علیہ السلام نے کہا: آمین۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان دونوں کو دعا کرنے والا کہا کیونکہ ان کی طرف سے یہ دعا ہوگئی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: آمین اس امت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: یہود تم پر اتنا حسد کسی چیز پر نہیں کرتے جتنا کہ وہ سلام اور آمین کہنے پر حسد کرتے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے حماد بن سلمہ عن سھیل بن ابی صالح عن ابیہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مکمل حدیث ذکر کی۔ حضرت ابن عباس کی حدیث سے بھی نبی کریم ﷺ سے روایت فرمایا، فرمایا: یہود تم پر کسی چیز میں اتنا حسد نہیں کرتے جتنا کہ آمین پر تم سے حسد کرتے ہیں، پس آمین کا قول زیادہ کہا کرو (2)۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: اہل کتاب نے ہم سے حسد کیا کیونکہ اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے پھر اس کی بارگاہ میں عجز ونیاز ہے پھر ہمارے لئے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا ہے پھر ہمارے قول آمین کے ساتھ ان کے لئے بددعا ہے۔

چوتھا باب

اس میں سورۃ فاتحہ کے معانی، قراءت، اعراب اور حمد کرنیوالوں کی فضیلت ہے

اس باب میں چھتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)۔ ابو محمد عبد الغنی بن سعید الحافظ نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیہا باب الجہر بآمین، صفحہ 62، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، صفحہ 61، جلد 1

بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے سچ کہا، بے شک حمد میرے لئے ہے(1)۔ مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو لقمہ کھائے تو اس پر اللہ کی حمد کرے، کوئی مشروب پیے تو اس پر اس کی حمد کرے(2)۔ حضرت حسن نے فرمایا: کوئی نعمت نہیں ہے مگر اس پر اللہ کی حمد ہو تو وہ اس نعمت سے افضل ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر کوئی نعمت فرمائی پھر اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس موجود نعمت سے افضل نعمت اسے عطا فرمائی(3)۔ ''نوادر الاصول'' میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ دنیا تمام کی تمام میرے امتی کے ایک ہاتھ میں ہو پھر وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ان تمام نعمتوں سے افضل ہوگی۔ ابو عبداللہ نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اسے دنیا عطا فرمائی پھر اس کے بعد یہ حمد کا کلمہ عطا فرمایا حتیٰ کہ اس نے یہ کلمہ بولا تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل تھا کیونکہ دنیا فانی ہے اور یہ کلمہ باقی ہے، یہ باقیات صالحات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝ (الکہف) بعض روایات میں ہے جو اس نے دیا وہ اس سے زیادہ ہے جو اس نے لیا۔ پس یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا وہ اللہ تعالیٰ سے لینے والا ہے، پس یہ تدبیر میں ہے۔ اسی طرح کلام میں جاری ہوگا کہ یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا اللہ کی طرف سے ہے اور اصل میں دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، دنیا بھی اس کی طرف سے ہے اور اَلْحَمْدُ کا کلمہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، دنیا اس نے بندے کو عطا فرمائی اور اسے غنی کر دیا پھر اسے کلمہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) عطا فرمایا اور آخرت میں اس کے ساتھ اسے شرف عطا فرمائے گا۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بیان کیا کہ ایک بندے نے کہا: یا رب لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك۔ فرشتوں کے لئے اس کا لکھنا مشکل ہو گیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اسے کیسے لکھیں۔ پس وہ دونوں آسمان کی طرف بلند ہوئے اور عرض کی: یا رب! تیرے بندے نے ایسی کلام کی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اسے کیسے لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، حالانکہ وہ زیادہ جانتا ہے جو اس کے بندے نے کہا تھا۔ میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتوں نے کہا: یا رب! اس نے کہا: یا رب لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اسی طرح لکھ دو جس طرح میرے بندے نے کہا حتیٰ کہ وہ مجھ سے آکر ملے گا تو میں خود اسے اس کی جزا دوں گا(4)۔

اہل لغت نے کہا: اعضل الامر، جب معاملہ سخت ہو جائے اور بند ہو جائے۔ المعضلات سختیوں کو کہتے ہیں۔ عضلت المرأة والشاة کہا جاتا ہے جب بچہ جنم دے اور اس کا مخرج تنگ ہو یہ ضاد کی شد کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر فرمایا: اعضلت الملکین یا عضلت الملکین، یعنی اس امر نے فرشتوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل لا الہ الا اللہ، صفحہ 277، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل والشرب، صفحہ 352، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل الحامدین، صفحہ 278، جلد 1 (وزارت تعلیم)　4۔ ایضاً

مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طہارت ایمان کا نصف ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اسے بھر دیتے ہیں (1)۔ آگے حدیث ذکر کی۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ بندے کا قول اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ افضل ہے یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ افضل ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ افضل ہے کیونکہ اس کے ضمن میں توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی موجود ہے اور بندے کے اس قول میں توحید اور حمد ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں صرف توحید ہے۔ اس کی بنیاد پر مخلوق سے جنگ کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال (جنگ) کروں حتیٰ کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیں (2)۔ اس قول کو ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اس پر قول فیصل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: افضل ذکر وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ (3)

مسئلہ نمبر 3: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساری نعمتوں پر محمود ہے اور اس کے انعاموں میں سے ایک ایمان بھی ہے۔ میں یہ دلیل ہے کہ ایمان اس کا فعل اور اس کی تخلیق ہے اس پر دلیل رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کا ارشاد ہے۔ العالمون تمام مخلوق کو کہتے ہیں اور اس مخلوق میں سے ایمان بھی ہے۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح قدریہ کہتے ہیں کہ ایمان ان کی تخلیق ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 4: عرب کلام میں اَلْحَمْدُ کا معنی ثنا کامل ہے۔ الف اور لام محامد کی جنس کے استغراق کے لئے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی ہر حمد کا مستحق ہے کیونکہ اس کے اسماء خوبصورت ہیں اور صفات بلند ہیں۔ شاعر کے قول میں اَلْحَمْدُ کے لفظ کی جمع، جمع قلت کے وزن پر بنائی گئی ہے۔

و ابلج محمود الثناء خصصتہ　　بأفضل اقوالی و أفضل احمدی

اس کی محمود تعریف روشن ہے۔ میں نے اسے اپنے افضل اقوال اور افضل حمد کے ساتھ خاص کیا ہے۔

حمد، مذمت کی نقیض ہے۔ تو کہتا ہے: حمدت الرجل احمدہ حمداً فھو حمیدٌ و محمود۔ التحمید، حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد، شکر سے اعم ہے۔ المحمد اس ذات کو کہتے ہیں جس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

شاعر نے کہا:

الی الماجد القرم الجواد المحمد

اس مصرعہ میں شاعر نے المحمد اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ والزکوۃ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ موطا امام مالک، کتاب القرآن باب ماجاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ نام رکھا گیا ہے۔
شاعر نے کہا:

فشق له من اسمه ليجله　　فذو العرش محمود و هذا محمد

اس نے اپنے نام سے اس کا نام مشتق کیا تا کہ اسے عظمت دے، وہ صاحب عرش محمود ہے یہ محمد ہے۔
المحمدة، یہ المذمة کے خلاف ہے۔ احمد الرجل، اس کا مطلب ہے اس کا امر حمد کا باعث ہوا۔ احمدته کا مطلب ہے: میں نے اسے محمود پایا۔ تو کہتا ہے: میں فلاں جگہ آیا اور میں نے اسے محمود اور موافق پایا۔ یہ اس وقت کہے گا جب تو اس میں رہائش یا اس کی چراگاہ پر راضی ہو۔ رجل حُمَدَة، ہمزہ کی مثل اس شخص کو کہتے ہیں جو اشیاء کی حمد زیادہ کرتا ہو اور ان چیزوں کی صفات بیان کرنے میں مبالغہ کرتا ہو۔ حمدة النار۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5: ابو جعفر طبری اور ابو العباس مبرد کا خیال ہے کہ حمد اور شکر ایک معنی میں ہے اور یہ پسندیدہ نہیں ہے (1)۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی نے اپنی کتاب ''الحقائق'' میں امام جعفر صادق اور ابن عطا سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن عطا نے کہا: اس کا معنی اللہ کا شکر ہے کیونکہ اس کی ہمیں تعلیم بھی اس کا احسان ہے حتیٰ کہ ہم نے اس کی تعریف کی۔ طبری نے ان کے ہم معنی ہونے پر تیرے اس قول کی صحت سے استدلال کیا ہے الحمد لله شكرا۔ (2) ابن عطیہ نے کہا کہ یہ حقیقت میں دلیل ہے ان کے مسلک کے خلاف پر کیونکہ تیرے قول شکرا، تو اس کو حمد کے ساتھ خاص کیا کیونکہ یہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: شکر، حمد سے زیادہ عام ہے کیونکہ شکر، زبان، جوارح اور دل سے ہوتا ہے اور حمد صرف زبان سے ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: حمد اعم ہے کیونکہ اس میں شکر اور مدح کا معنی ہے اور یہ شکر سے اعم ہے کیونکہ حمد شکر کی جگہ رکھی جاتی ہے اور شکر کو حمد کی جگہ نہیں رکھا جاتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہر شکر گزار کا کلمہ ہے۔ آدم علیہ السلام کو جب چھینک آئی تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اور اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو فرمایا: فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ (المومنون) (تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جور وستم) سے) اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا:
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراہیم: 39)
داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے کہا: وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿﴾ (النمل) (اور انہوں نے کہا: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا (الاسراء: 111) (اور آپ فرمایئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

اہل جنت نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر:34) (کہیں گے سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)) وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (یونس:10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہو گی کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں) میں کہتا ہوں: حمد، ممدوح کی اس کی صفات کی وجہ سے کسی سابقہ احسان کے بغیر تعریف کرنا ہے اور شکر، مشکور کی احسان کی وجہ سے تعریف کرتا ہے۔ اس تعریف کی بنا پر ہمارے علماء نے فرمایا: اَلْحَمْدُ شکر سے اعم ہے کیونکہ حمد ثنا، تحمید اور شکر پر واقع ہوتی ہے اور جزا مخصوص ہے کہ یہ اس کا بدل ہوتی ہے جو تیرے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ پس اَلْحَمْدُ اس آیت میں اعم ہے کیونکہ یہ شکر پر زائد ہے اور یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ حمد بمعنی رضا بھی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بلوته فحمدته یعنی میں خوش ہوا۔ اس سے یہ ارشاد بھی ہے: مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (الاسراء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احمد الیکم غسل الاحلیل میں تمہارے لئے شرمگاہ کا دھونا پسند کرتا ہوں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی تفسیر میں مروی ہے۔ جس نے اس کی صفات کی وجہ سے اس کی حمد کی جس طرح اس نے خود اپنی توصیف کی ہے اس نے حمد کی، کیونکہ حمد حا، میم اور دال سے مرکب ہے، حا، وحدانیت سے ہے، میم، الملک سے ہے اور دال دیمومیت (ہمیشگی) سے ہے جس نے وحدانیت، دیمومیت اور الملک کو پہچان لیا اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد کو پہچان لیا۔ یہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی حقیقت ہے۔ شقیق بن ابراہیم نے اَلْحَمْدُ کی تفسیر میں فرمایا: یہ تین وجوہ پر منحصر ہے: (۱) جب اللہ تعالیٰ تجھے کوئی چیز عطا فرمائے تو تو جان لے جس نے تجھے یہ چیز عطا کی۔ (۲) جو اس نے تجھے عطا فرمایا تو اس پر خوش ہو، (۳) جب تک تیرے جسم میں قوت ہے تو اس کی نافرمانی نہ کر۔ یہ حمد کی شرائط ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ سبحانہ نے اپنی حمد خود فرمائی اور اپنی کتاب کا آغاز اپنی حمد سے کیا اور دوسروں کو اپنی خود تعریف کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی تعریف کرنے سے اپنی کتاب اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے منع فرمایا۔ فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم) (پس اپنی خودستائی نہ کیا کرو وہ خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مدح کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی ڈالو (1)۔ اس حدیث کو حضرت مقداد نے روایت کیا اس کے متعلق سورۃ النساء میں ان شاء اللہ وضاحت آئے گی۔

پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اپنی حمد کی ہے اس سے پہلے کہ عالمین میں سے کوئی میری حمد کرتا اور میں نے اپنی خود حمد ازل میں بغیر کسی علت کے کی تھی اور مخلوق جو میری حمد کرتی ہے وہ علل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مخلوق جس کو کمال کلی عطا نہیں کیا گیا اس کا اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں تاکہ وہ اپنے لئے منافع حاصل کرے اور اپنے آپ سے نقصان دور کرے۔

بعض علماء نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس کے بندے اس کی حمد سے عاجز ہیں تو اس نے اپنی حمد ازل میں خود ہی کی۔ پس اس کے بندوں نے انتہائی کوشش کی اس کی حمد سے عاجزی کا اظہار ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ سید

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب عن المدح اذا کان فیه افراط، صفحہ 414، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے عجز کا اظہار فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لا أحصی ثناء علیك۔(1) (میں تیری ثناء نہیں کر سکتا)۔
اور یہ شعر پڑھو:

اذا نحن اثنینا علیك بصالح فانت کما نثنی وفوق الذی نثنی

اور جب ہم کسی کرم کی وجہ سے تیری ثنا کرتے ہیں تو تو واقعی اسی طرح ہے جس طرح ہم تیری تعریف کرتے ہیں اور تو اس سے بلند مرتبہ ہے جو ہم تیری تعریف کرتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: اس نے ازل میں اپنی حمد خود فرمائی جب اس نے اپنے بندوں پر نعمتوں کی کثرت کو دیکھا اور ان کے شکر کے قیام کے عجز کو دیکھا تو اس نے اپنی تعریف کی اور ان کی طرف سے اپنی تعریف خود کی تاکہ ان کے سامنے نعمت مزید خوشگوار ہو جائے اس حیثیت سے کہ اس نے لوگوں سے احسان کا بوجھ بھی ساقط کر دیا۔

مسئلہ نمبر 7: ساتوں قراء اور جمہور لوگوں کا الحمد کی دال پر رفع پڑھنے میں اجماع ہے۔ سفیان بن عیینہ، رؤبہ بن عجاج سے الحمد میں دال کا نصب مروی ہے اور یہ فعل کے اظہار کی تقدیر پر ہے(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رفع کے ساتھ مبتدا اور خبر میں اور خبر کی تبیل فائدہ دینا ہوتا ہے۔ اس میں کیا فائدہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ سیبویہ نے کہا: جب کوئی شخص اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رفع کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس میں اسی قسم کا معنی ہوتا ہے جو تیرے اس قول میں ہے: حمدت الله حمدا مگر وہ جو اَلْحَمْدُ کو رفع دے رہا ہے وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ اس کی طرف سے حمد اور تمام مخلوق کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے اور وہ جو اَلْحَمْدُ کو نصب دیتا ہے وہ خبر دیتا ہے کہ تنہا اس کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے۔ سیبویہ کے علاوہ علماء نے فرمایا: وہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے عفو، مغفرت، اس کی تعظیم اور اس کی بزرگی بیان کرنے کے لئے کرتا ہے اور خبر کے معنی کے خلاف ہے، اس میں سوال کا معنی ہے۔ حدیث میں ہے" جس کو میرے ذکر نے مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اس سے افضل دوں گا جو میں سوال کرنے والوں کو دوں گا"(3)۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا اپنی حمد و ثناء کرنا بندوں کو یہ سکھانے کے لئے ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ تم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ طبری نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تعریف ہے اس کے ساتھ اس نے اپنی ہی تعریف کی اور اس کے ضمن میں اپنے بندوں کو حکم فرمایا کہ تم بھی اس کی تعریف کرو۔ گویا یوں فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ اسی طرح ہوگا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہو۔ عرب اس طرح حذف کرتے ہیں کہ ظاہر کلام اس حذف پر دلالت کرتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

و اعلم اننی ساکون رمسا اذا سار النواعج لا یسیر
فقال السائلون لمن حفرتم فقال القائلون لهم وزیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، صفحہ 192، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء کیف کانت قراءۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 116، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں جانتا ہوں کہ ہو جاؤں گا جب تیز رفتار اونٹنیاں نہیں چلیں گی۔ سوال کرنے والوں نے کہا کس کے لئے قبر کھود رہے ہو جواب دینے والوں نے کہا ان کا وزیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے قبر کھودی جارہی ہے وہ وزیر ہے۔ پس اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ ظاہر کلام اس پر دلالت کر رہا تھا اور یہ عرب کلام میں کثیر ہے(1) ابن ابی عبلہ سے الحمد للہ دال اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا مروی ہے اس بنا پر کہ دوسرا حرف اعراب میں پہلے حرف کے تابع کر دیا گیا ہو۔ یا کالفظ متجانس ہو جائے اور لفظوں میں تجانس کا طلب کرنا عربوں کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً أجؤك، وھو منحدرٌ من الجبل (☆)۔ اس میں دال اور جیم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ شاعر کا قول ہے: اضرب السآمین امك هابل۔ اس مصرعہ میں ہمزہ کے ضمہ کی وجہ سے نون ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اہل مکہ کی قراءت میں مُرُدفین راء پر ضمہ پڑھا گیا ہے میم کی اتباع کرتے ہوئے۔ اسی طرح مُقُتلین میں میم کی اتباع میں قاف پر ضمہ پڑھا گیا ہے۔ اس طرح عرب کہتے ہیں: لِاِمك یعنی لام کی اتباع میں ہمزہ کو کسرہ دیتے ہیں۔ نعمان بن بشیر کے لئے یہ کہا:

ویل امها فی هواءِ الجو طالبة ولا کهذا الذی فی الارض مطلوب

اس شعر میں ہمزہ کو کسرہ دیا ہے۔

اصل میں ویل، لامها تھا پہلے لام کو حذف کیا گیا اب کسرہ کے بعد ہمزہ پر ضمہ بھاری تھا پھر اس ہمزہ کو لام کی طرف منتقل کر دیا پھر لام کو میم کی طرح حرکت دی گئی۔ حسن بن ابی الحسن اور زید بن علی سے مروی ہے، اَلْحَمْدِ لِلّٰهِ۔ یعنی دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے پہلے حرف کو حرکت میں دوسرے حرف کی اتباع کرائی گئی (2)۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا مالک ہے، ہر چیز جس کا وہ مالک ہے وہ اس کا رب ہے۔ پس الرب کا مطلب المالك ہے اور ''الصحاح'' میں الرب، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اس لئے بغیر نسبت و اضافت کے کسی دوسرے کے لئے نہیں بولا جائے گا، لوگ زمانہ جاہلیت میں مالک کے لئے رب کا لفظ بولتے تھے۔ حارث بن حلزہ نے کہا:

و ھو الرب والشھید علی یوم الحیارین والبلاء بلاء

اس میں رب، مالک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

رب کا معنی سردار بھی ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے: اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف:42) (یعنی اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا) اور حدیث میں ہے ان تلد الامة ربتها۔(3) یعنی لونڈی اپنے سردار کو جنم دے گی۔ اور ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور الرب سے مراد مصلح، مدبر، جابر اور قائم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 67-66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 133، جلد 1
3۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب ام لولد، صفحہ 344، جلد 1 (وزارت تعلیم)
☆ مثال غیر واضح ہے۔

(نگران) بھی ہوتا ہے۔ الہروی وغیرہ نے کہا: جو شخص کسی شے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے مکمل کرتا ہے اس کے لئے بولا جاتا ہے: ربتہ یربہ فھو ربٌ لہ و رابٌ۔ اسی وجہ سے علماء کو ربانیون کہا جاتا ہے جو کتب کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے ھل لک من نعمۃ تربھا علیہ (1) یعنی کیا تیرے پاس کوئی نعمت ہے جس کی تو دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے اور الرب بمعنی معبود بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

اربٌ یبول الثعلبان براسہ لقد ذل من بالت علیہ الثعالب (2)

اور یہ لفظ زیادتی اور کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ رباہ و ربیہ و ربتہ (یعنی اس سے اسے زیادہ کر دیا) یہ معنی نحاس نے بیان کیا ہے۔ ''الصحاح'' میں ہے: ربّ فلان ولدہ یربہ ربّاً، و ربیہ و تربّبَہٗ کا معنی ہے ربّاہ اور المربوب کا مطلب ہے المربی۔ جس میں کثرت کی گئی ہو۔

مسئلہ نمبر 9: بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم (رب) اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے کیونکہ اسے پکارنے والے کثرت سے پکارتے ہیں اور قرآن حکیم میں غور کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران، سورۃ ابراہیم وغیرہ میں ہے۔ یہ وصف رب اور مربوب کے درمیان تعلق کا شعور دیتا ہے ساتھ ساتھ اپنے ضمن میں ہر حال میں مہربانی، رحمت اور مخلوق کے اس کی طرف محتاج ہونے کا تصور بھی رکھتا ہے۔

اس کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: یہ التربیۃ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کا مدبر اور مربی ہے۔ اسی مفہوم میں ہے: رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ (النساء: 23) (تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں) بیوی کی بیٹی کو ربیبۃ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا خاوند اس کی تربیت کرتا ہے۔ پس اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مدبر اور مربی ہے تو یہ فعل کی صفت ہوگی اور اس بنا پر کہ الرب بمعنی مالک اور سردار ہے تو یہ ذات کی صفت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 10: جب رب پر الف لام داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص ہوتا ہے کیونکہ الف لام عہد کے لئے ہوگا۔ اور اگر ہم الف لام حذف کر دیں تو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مشترک ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اللہ رب العباد، (اللہ بندوں کا رب ہے) زید رب الدار (زید گھر کا مالک ہے) اللہ تعالیٰ رب الارباب ہے، وہ مالک و مملوک کا مالک ہے وہ ہر ایک کا خالق و رازق ہے۔ اس کے علاوہ ہر رب، غیر خالق اور غیر رازق ہے ہر مملوک، مالک بنایا گیا ہے اس کے بعد کہ وہ مالک نہ تھا اور اس سے ملکیت چھینی بھی جائے گی، مخلوق میں سے مالک کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ان معانی کے مخالف ہے اور خالق و مخلوق کی صفت کے درمیان یہی فرق ہے۔

مسئلہ نمبر 11: اَلْعٰلَمِیْنَ، اہل تاویل کا اَلْعٰلَمِیْنَ کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: العالمون، جمع ہے عالم کی اور عالم سے مراد اللہ کے سوا ہر موجود ہے اور لفظاً اس کا واحد نہیں ہے جیسے رھط اور قوم کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر زمانہ کے لوگ عالم ہیں۔ یہ حسین بن فضل کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ باب فی الحب فی اللہ، صفحہ 317، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 67، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الشعراء) اس آیت میں الْعٰلَمِيْنَ سے مراد لوگ ہیں۔ حجاج نے کہا:

فخندف هامة هذا العالم

جریر بن خطفی نے کہا:

تنصفهُ البرية و هو سامر — و يضحى العالمون له عيالا

اس شعر میں العالمون لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عالمون سے مراد جن وانس ہیں اس کی دلیل الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴿۱﴾ (الفرقان) (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس کو ڈرانے والے تھے نہ کہ چوپاؤں کو)۔ فراء اور ابوعبیدہ نے کہا: العالم سے مراد ہر ذی عقل ہے اور یہ چار امم ہیں: انسان، جن، ملائکہ اور شیاطین۔ بہائم، چوپاؤں کو عالم میں نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ جمع ذی عقل کی جمع ہوتی ہے۔

اعشٰی نے کہا:

ما ان سمعت بمثلهم في العالمينا — میں نے ذی عقل لوگوں میں ان کی مثل نہیں سنا۔

زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد وہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قول ابوعمرو بن علاء کا ہے کہ وہ روحانیون ہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا معنی بھی یہی ہے، ہر ذی روح جو زمین کی سطح پر چلا۔ وہب بن منبہ نے کہا: الله تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: الله تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ دنیا، مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔ مقاتل نے کہا: عالمون، اسی ہزار عالم ہے، چالیس ہزار عالم خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار عالم سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جن ایک عالم ہے، انسان ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں پندرہ ہزار عالم ہیں الله تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لئے تخلیق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ عالم ہر مخلوق و موجود کو شامل ہے اس کی دلیل الله تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (الشعراء)

اور یہ علم اور علامة سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ اپنے موجد پر دلالت کرتا ہے اسی طرح زجاج نے کہا: عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے الله تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں پیدا فرمایا۔ خلیل نے کہا: العلم، العلامة اور المعلم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر دلالت کرے۔ عالم چونکہ دال ہے اپنے خالق و مدبر پر اور یہ واضح ہے۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید کے سامنے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو حضرت جنید نے اسے کہا: اسے مکمل کرو جس طرح الله تعالیٰ نے فرمایا۔ تم کہو: رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس شخص نے پوچھا: العالمین کون ہیں حتیٰ کہ تم الله کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہو؟ حضرت جنید نے فرمایا: اے بھائی! تم کہو کیونکہ حادث کا جب قدیم کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے تو حادث کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

مسئلہ نمبر 12: رب میں رفع اور نصب جائز ہے۔ نصب، مدح کی بنا پر اور رفع قطع (1) کی بنا پر۔ یعنی عبارت یوں ہوگی: ھو رب العالمین۔

مسئلہ نمبر 13: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ - رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے اپنی صفت بیان کرنے کے بعد اپنی تعریف ان کلمات سے فرمائی کہ وہ بہت مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے، چونکہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی صفت سے متصف ہونے میں ترہیب تھی اس لئے ساتھ ہی الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ذکر فرما دیا کیوں کہ اس میں ترغیب تھی تا کہ اس کا خوف اور اس کی طرف رغبت دونوں کو اپنی صفات میں جمع کرلے، پس یہ اس کی طاعت اور نافرمانی سے اجتناب میں مددگار ثابت ہوں گی جیسا کہ ارشاد فرمایا: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں (اور یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے)۔

اور فرمایا: غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ (غافر: 3) (گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر مومن وہ سزا جان لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی جنت کا طمع بھی نہ کرے اور اگر کافر اللہ کی رحمت جان لے تو کوئی جنت سے مایوس نہ ہو" (2)۔

الرَّحْمٰنِ اور الرَّحِيْمِ دونوں اسموں کے معانی گزر چکے ہیں پس دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 14: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ - محمد بن سمیفع نے مالك کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں چار لغات ہیں: ١۔ مالك، ٢۔ مِلك، ٣۔ مَلْك... مَلِكَ سے مخفف...... ٤۔ مليك۔

شاعر نے کہا:

عصينا الملك فيها ان ندينا　　　و ايام لنا غرّ طوال

ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ان میں ہم نے بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔

اور ایک شاعر نے کہا:

فاقنع بما قسم المليك فانما　　　قسم الخلائق بيننا علامها

میں اس پر قناعت کرتا ہوں جو مالک نے تقسیم فرمایا اور طباع کو ان کے جاننے والے نے ہمارے درمیان تقسیم فرمایا۔

اس شعر میں الخلائق سے مراد وہ فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا جاتا ہے، نافع سے ملك میں کسرہ کا اشباع مروی ہے۔ اس شخص کی لغت پر جو حرکات میں اشباع کرتا ہے مَلِكِيْ پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی عربوں کی ایک لغت ہے، جس کو مہدوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

1۔ صفت کو موصوف سے جدا کر دیا جائے تو پھر اس سے پہلے مبتدا محذوف ہوتا ہے۔

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعة رحمة الله تعالیٰ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 15: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مَلِكِ زیادہ بلیغ ہے یا مالك۔ دونوں قراءتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ امام ترمذی نے ان کو ذکر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مَلِك، یہ مالك سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ ہر ملک مالک ہوتا ہے اور ہر مالک، ملک نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مَلِك کا امر، ہر مالک میں اس کی مِلك میں نافذ ہوتا ہے حتی کہ وہ مالک، ملک کی تدبیر سے ہی تصرف کرتا ہے۔ ابوعبیدہ اور مبرد نے یہ کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مالك زیادہ بلیغ ہے کیونکہ وہ انسانوں اور دوسری چیزوں کا مالک ہوتا ہے۔ پس مالك از روئے تصرف کے زیادہ بلیغ اور عظیم ہے کیونکہ شرع کے قوانین کا اجراء اس کی طرف سے ہوتا ہے پھر مالک کے پاس تملک میں زیادتی بھی ہے۔

ابوعلی نے کہا: ابوبکر بن سراج نے ان لوگوں سے حکایت کیا ہے جنہوں نے ملک کی قراءت کو پسند کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے ساتھ اپنی توصیف فرمائی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس لئے مالک کی قراءت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو تکرار ہو جائے گا۔

ابوعلی نے کہا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ قرآن حکیم میں اس انداز میں بہت سی اشیاء آئی ہیں عام مقدم ہوتا ہے پھر خاص کا ذکر ہوتا ہے جیسے هو الله الخالق البارئ المصور۔ خالق عام ہے۔ پھر المصور کا ذکر فرمایا کیونکہ اس میں صنعت اور حکمت کے وجود پر تنبیہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۝ (البقرہ) یہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (البقرہ:3) کے بعد ذکر فرمایا، جبکہ غیب کا کلمہ آخرت اور دوسری غائب چیزوں کو شامل تھا لیکن آخرت کی عظمت اور اس کے اعتقاد کے وجوب پر تنبیہ اور منکرین کفار کا رد کرنے کے لئے پھر ذکر فرمایا۔ اسی طرح فرمایا: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔ پہلے الرَّحْمٰنِ ذکر فرمایا جو عام ہے اس کے بعد الرَّحِيْمِ ذکر فرمایا کیونکہ و کان بالمومنین رحیما کے ارشاد میں مومنین کے ساتھ اس کی رحمت تخصیص ہے (1)۔

ابوحاتم نے کہا: مالك۔ خالق کی مدح میں ملك سے زیادہ بلیغ ہے اور ملك مخلوق کی مدح میں مالک سے زیادہ بلیغ ہے۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ مخلوق میں سے مالک کبھی مَلِك نہیں ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ مالک ہوگا تو ملک بھی ہوگا۔ یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی نے پسند کیا ہے اور انہوں نے اس کی تین وجوہ ذکر فرمائی ہیں:

۱- تو مالک کو خاص اور عام کی طرف مضاف کرتا ہے اور تو کہتا ہے: مالك الدار و الارض و الثوب (گھر کا مالک، زمین کا مالک، کپڑے کا مالک) جس طرح تو کہتا ہے: مالك الملوك (بادشاہوں کا مالک)۔

۲- مالک کا اطلاق زیادہ اور تھوڑی ملکیت والے پر ہوتا ہے۔ جب تو ان دونوں قولوں میں غور و فکر کرے گا تو دونوں کو ایک پائے گا۔

۳- تو کہتا ہے: مالك الملك، جبکہ تو مَلِك الملك نہیں کہتا۔

ابن حصار نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ مالك سے مراد ملک پر دلالت ہے اور یہ مُلك کو متضمن نہیں ہے اور مَلِك دونوں

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 70، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

امروں کو شامل ہے پس مبالغہ کی وجہ سے اولیٰ ہے۔ اور یہ کمال کو بھی متضمن ہے اسی وجہ سے وہ دوسرے تمام بادشاہوں پر ملک کا مستحق ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ نہیں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں) اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الامامة فی قریش (1)۔ اور قریش، عرب قبائل میں سے افضل ہیں اور عرب، عجم سے افضل واشرف ہیں۔ اقتدار اور اختیار کو متضمن ہیں۔ یہ الملك میں ضروری امر ہے اگر وہ قادر، مختار نہ ہو اور اس کا حکم اور امر نافذ نہ ہو تو دشمن اس پر جبر کرے گا اور غیر اس پر غالب آجائے گا اور اس کی رعیت ذلیل و رسوا ہو جائے گی اور یہ سخت پکڑ، امر، نہی، وعدہ، وعید کو بھی متضمن ہے۔

آپ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا: مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ۝ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا (النمل) اس کے علاوہ بھی امور عجیبہ عمدہ معانی ملك میں پائے جاتے ہیں جو مالك میں نہیں پائے جاتے۔ میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حجت پکڑی ہے کہ ملك زیادہ بلیغ ہے کیونکہ مالك میں ایک حرف زائد ہے اور اس کے قاری (پڑھنے والے) کے لئے دس نیکیاں زیادہ ہوں، جبکہ ملك کے پڑھنے والے کے لئے دس نیکیاں کم ہوں گی۔ میں کہتا ہوں: یہ صیغہ کے اعتبار سے ہے نہ کہ معنی کے اعتبار سے ہے۔ ملك کے ساتھ قرأت ثابت ہے، اور ملك میں جو معنی پایا جاتا ہے وہ مالك میں نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16: کسی کا یہ نام نہیں رکھا جائے گا اور اس کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے ''حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضہ میں لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا: میں الملك ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں گئے'' (2) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین نام اس شخص کا ہے جسے مالك الاملاك کہا جائے (3)۔ مسلم میں یہ زائد ہے۔ ''اللہ کے سوا کوئی مالک نہ ہوگا'' (4)۔ سفیان نے کہا: ملك الاملاك شاہان شاہ کی مثل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں نے ابو عمرو شیبانی سے اخنع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس کا معنی اوضع (گھٹیا) ہے۔ ان سے ہی مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کی بارگاہ میں باعث ناراضگی اور براترین شخص وہ ہوگا جسے ملك الاملاك کہا جاتا ہوگا، اللہ کے سوا کوئی ملك نہیں ہے (5)۔ ابن حصار نے کہا اسی طرح مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور مالك الملك ہے اس میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہئے کہ تمام مخلوق پر یہ نام

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث نمبر 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب صفة القیامة والجنة والنار صفحہ 370، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 916، جلد 2 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب أبغض الاسماء الی اللہ تبارك و تعالیٰ، حدیث 5737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الاداب، باب استحباب تغییر الاسم القبیح، صفحہ 208، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)　5۔ ایضاً

رکھنا حرام کیا گیا ہے جس طرح ملک الاملاک حرام کیا گیا ہے، اور رہا مالک اور ملک بطور وصف ذکر کرنا۔

مسئلہ نمبر 17: ان کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز ہوگا جو ان دونوں مفہوموں کے ساتھ متصف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ناس من امتی عرض علی غزاۃ فی سبیل اللہ یرکبون ثبج ھذا البحر ملوکا علی الاسرۃ او مثل الملوک علی الاسرۃ (1) یعنی میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کئے گئے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے تھے وہ اس سمندر کے وسط پر سوار تھے (جیسے) تختوں پر بادشاہ ہوتے ہیں یا فرمایا بادشاہوں کی مثل تختوں پر سوار تھے۔

مسئلہ نمبر 18: اگر کوئی یہ کہے کہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ کیسے فرمایا جبکہ یَوْمِ الدِّیْنِ ابھی آیا ہی نہیں اور اپنی ایسی چیز کی ملکیت سے صفت بیان کرنا کیسے صحیح ہے جس کو اس نے ابھی پایا ہی نہیں؟ اسے کہا جائے گا کہ مالک اسم فاعل کا صیغہ ہے ملک یملک سے۔ اور اسم فاعل عرب کلام میں اپنے مابعد کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور وہ فعل مستقبل کے معنی میں ہوتا ہے اور عربوں کے نزدیک یہ کلام معقول، پختہ اور صحیح ہوتی ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: ھذا ضارب زید غدا یعنی وہ کل زید کو مارے گا اور اسی طرح ھذا حاج بیت اللہ فی العام المقبل، اس کا مطلب ہے آئندہ سال وہ حج کرے گا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فعل اس کی طرح منسوب کیا گیا ہے حالانکہ اس نے ابھی وہ فعل کیا نہیں اور اس سے مراد استقبال لیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ استقبال کی تاویل پر ہے یعنی وہ مالک ہوگا روز جزا کا یا وہ روز جزا کا مالک ہوگا جب وہ دن آئے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مالک کی تاویل قدرت کی طرف لوٹنے والی ہوگی یعنی وہ روز جزا میں قادر ہوگا، یا یہ معنی کہ وہ روز جزا پر قادر ہوگا اور اسے پیدا کرنے پر قادر ہے کیونکہ کسی شے کا مالک اسی شے میں تصرف کرنے والا اور اس پر قادر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا مالک ہے اور اپنے ارادہ کے مطابق انہیں پھیرنے والا ہے اس پر اسے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ پہلی وجہ عربی زبان کے اصول سے زیادہ مس کرنے والی ہے اور اس کے ضابطہ کے مطابق زیادہ جاری ہونے والی ہے۔ یہ ابو القاسم الزجاجی کا قول ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ یہاں یَوْمِ الدِّیْنِ کی ملکیت کی تخصیص کیوں کی گئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور دوسری چیزوں کا بھی مالک ہوگا۔ جواباً کہا جائے گا کہ لوگ دنیا میں ملک میں جھگڑا کرنے والے تھے جیسے فرعون، نمرود وغیرہما لیکن اس دن اس کی ملک میں کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہ ہوگا تمام لوگ سر جھکائے ہوئے ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (غافر: 16) آج بادشاہی کس کے لئے ہے، ساری مخلوق جواب دے گی: للہ الواحد القھار اللہ واحد قہار کی ہے۔ اسی لئے فرمایا: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ یعنی اس دن میں نہ کوئی مالک ہوگا، نہ قاضی ہوگا، نہ کوئی جزا دینے والا ہوگا سوائے اللہ تعالیٰ کے، پاک ہے وہ ذات کوئی معبود برحق نہیں سوائے اس کے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (و-ت)۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر19: اگر اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی جائے کہ وہ ملک ہے تو یہ اس کی ذات کی صفات سے ہوگی۔ اگر مالک کے ساتھ صفت بیان کی جائے تو یہ اس کے فعل کی صفات سے ہوگی۔

مسئلہ نمبر20: الیوم سے مراد طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک وقت ہے پھر یہ عاریۃً یا مجازاً قیامت کے آغاز سے لے کر جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے تک اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کے لئے بولا جاتا ہے کبھی الیوم پورے دن کی ایک گھڑی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ:3) یوم کی جمع ایام ہے۔ اصل میں ایوام تھا پھر ادغام کیا گیا بعض اوقات، شدت کو الیوم سے تعبیر کرنے میں کہا جاتا ہے۔ یوم ایوم، جس طرح کہا جاتا ہے: لیلۃ لیلاء۔ راجز نے کہا:

نعم اخو الهيجاء في اليوم اليمي۔

ہیجا کا بھائی شدت میں کتنا اچھا تھا۔

اس مصرعہ میں الیمی میں قلب کیا گیا ہے۔ واؤ کو مؤخر کیا گیا ہے اور میم کو مقدم کیا گیا ہے۔ پھر واؤ کو یاء سے قلب کیا گیا ہے کیونکہ وہ طرف کلمہ میں ہے جیسا کہ عرب دلو کی جمع میں ادل کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر21: الدین۔ اس کا مطلب اعمال پر جزا اور اعمال کا حساب ہے۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، ابن جریج اور قتادہ وغیرہم نے اسی طرح فرمایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ مروی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ (النور:25) اس آیت میں دین سے مراد حساب ہے۔ فرمایا: اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (غافر:17) اور فرمایا اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ:28) اور فرمایا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ (صافات) یعنی ہم جزا دیئے جائیں گے اور ہمارا محاسبہ کیا جائے گا۔ لبید نے کہا:

حصادك يوماً ما زرعت و انما　　　يدان الفتى يوماً كما هودائنٌ

تو اس دن وہی کاٹے گا جو تو نے بویا، نوجوان کو جزا دی جائے گی جو وہ کرنے والا ہوگا۔

ایک اور نے کہا:

اذا ما رمونا رميناهم　　　و دنا هم مثل ما يقرضونا

جب انہوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے ان پر تیر پھینکے اور ہم نے انہیں جزا دی جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔

ایک اور نے کہا:

واعلم يقينا ان ملكك زائلٌ　　　واعلم بان كماتدين تدان

جان لو کہ تمہاری حکومت ختم ہونے والی ہے اور جان لو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

اہل لغت نے بیان کیا ہے: دِنْتهٗ بفعله دِيْنًا (مصدر) دال کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: میں نے اسے جزا دی، اسی سے ہے: الدیان۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یعنی جزا دینے والا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: الكيس من

دان نفسہ (1) (عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے) بعض نے فرمایا: الدین سے مراد فیصلہ ہے۔ یہ بھی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسی معنی میں طرفہ کا قول ہے۔

لعمرك ما كانت حمولة معبد		على جدها حربًا لدينك من مضر

تیری عمر کی قسم معبد کے اونٹ کنویں پر تیرے فیصلہ کی وجہ سے مضر قبیلہ سے جنگ کرنے کے لئے نہیں تھے۔

دین کے یہ تینوں معانی قریب قریب ہیں۔ الدین کا معنی طاعت بھی ہے۔ اس معنی میں عمرو بن کلثوم کا شعر ہے۔

و ايام لنا غر طوال		عصينا الملك فيها ان ندينا

ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ہم نے ان میں بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔

پس یہ دین کا لفظ مشترک ہے۔

مسئلہ نمبر 22: ثعلب نے کہا: دان الرجل کا مطلب ہے اس نے اطاعت کی اور دان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس نے نافرمانی کی۔ دان اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی عزت پائے اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی ذلیل ہو اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی غالب آئے۔ پس یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ الدین کا اطلاق عادت اور شان پر بھی ہوتا ہے جیسا ہے کہ ایک شاعر نے کہا:

کدینك من ام الحویرث قبلها		جیسا کہ تیری شان ام الحویرث کی طرف سے ہے۔

مثقب نے اپنی اونٹنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

تقول اذا درأتُ لها وضيني		اهذا دينه ابداً و ديني

وہ اونٹنی کہتی ہے جب میں اس کا تنگ زمین پر بچھا دیتا ہوں یہ اس کی اور میری ہمیشہ کی عادت ہے۔

الدین بادشاہ کی عملداری کو بھی کہتے ہیں۔ زہیر نے کہا:

لئن حللت بجوٍ فی بنی اسد		فی دين عمرو وحالت بيننا فَدَكَ

اگر تو بنی اسد میں جو کے مقام پر عمرو کی عملداری میں اترے گا تو ہمارے درمیان فدک کا مقام حائل ہوگا۔

شاعر نے عمرو کی طاعت کی جگہ مراد لی ہے۔

الدین سے مراد بیماری بھی ہے۔ لحیانی سے مروی ہے، اس نے کہا:

یا دین قلبك من سلمى و قد دینا

اس میں دین بمعنی مرض استعمال کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ اللہ تعالیٰ نے غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغہ کی طرف رجوع فرمایا کلام میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے کیونکہ سورت کے آغاز سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر تھی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، حدیث نمبر 4249، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی ثنا تھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدہر) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب)۔ پھر آگے مخاطب کی ضمیر ذکر فرمائی۔ فرمایا: اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً (الدہر:22) (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے۔ اسی طرح اس کا الٹ بھی قرآن میں ہے یعنی پہلے مخاطب کے صیغے اور پھر غائب کے صیغے ذکر فرمائے۔

حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ (یونس:22) (یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

نعبد کا معنی ہے نطیع (ہم عبادت کرتے ہیں) عبادت کا مطلب طاعت اور عجز و انکساری کا اظہار کرنا ہے۔ طریق معبد اس راستہ کو کہتے ہیں جو چلنے والوں کے لئے آسان بنایا گیا ہو۔ یہ ہروی کا قول ہے۔ بندہ جب یہ کہتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کو ثابت کرتا ہے، کیونکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں وغیرہ کو بھی پوجتے ہیں۔ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○۔ یعنی ہم تجھ سے ہی مدد، تائید اور توفیق طلب کرتے ہیں۔ سلمی نے ''حقائق'' میں کہا: میں نے محمد بن عبداللہ بن شاذان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابوحفص فرغانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ کا اقرار کیا وہ جبر و قدر سے بری ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 24: اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں مفعول کو فعل پر مقدم کیوں کیا گیا ہے تو جواباً کہا جائے گا اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے۔ عربوں کی یہ عادت ہے کہ اہم کو مقدم کر دیتے ہیں۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک بدو نے دوسرے بدو کو گالی دی تو جس کو گالی دی گئی اس نے گالی دینے والے سے اعراض کیا۔ گالی دینے والے نے اس سے کہا: اياك اعنی (میری مراد تو ہی ہے)۔ اسے دوسرے نے کہا: وعنك اعرض میں تجھ ہی سے اعراض کرتا ہوں۔ دونوں نے اہم کو مقدم کیا۔ اسی طرح بندے اور عبادت کو معبود پر مقدم نہیں کیا گیا۔ پس نعبدك اور نستعينك، و لا نعبد اياك و نستعين اياك جائز نہیں کہ فعل کو مفعول کی ضمیر پر مقدم کیا جائے، لفظ قرآن کی اتباع کی جائے گی۔ عجاج نے کہا:

اياك ادعو فتقبل ملقی و اغفر خطاياى و كثر ورقی

میں تجھ سے ہی التجا کرتا ہوں، میری عاجزی کو قبول فرما، میرے گناہ معاف فرما اور میرے مال سے زیادہ فرما۔

اور ثمر بھی مروی ہے۔ رہا شاعر کا قول:

اليك حتیٰ بلغت اياكا اونٹنی تیری طرف چلی حتیٰ کہ تیرے پاس پہنچ گئی۔

یہ شاذ ہے اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ ورق راء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد دراہم اور واو کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مراد مال ہوگا۔ آیت میں ضمیر کو مکرر فرمایا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور غیر سے مدد چاہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 25: جمہور قراء اور علماء اياك کو یاء کی شد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ عمرو بن فائد نے اياك کو ہمزہ کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے یاء کی تضعیف کو ناپسند کیا ہے کیونکہ یاء کی تشدید اور اس کے ماقبل کسرہ ہونے کی وجہ سے ثقل لازم آتا ہے یہ قرأت مرغوب نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں معنی ہوگا ہم تیرے سورج یا تیری روشنی کی عبادت

کرتے ہیں ایاۃ الشمس کا مطلب ہے سورج کی روشنی اور کبھی ہمزہ کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

سقتہٗ ایاۃ الشمس الا لثاتہ اُسِفّ فلم تکدم علیہ باثمد

اس میں شاعر نے ایاۃ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اگر تو ہا کو گرادے تو مد کے ساتھ پڑھے گا۔ کہا جاتا ہے: الایاۃ للشمس کالھالۃ للقمر یعنی چاند کے اردگرد کے دائرہ کو ہالہ کہتے ہیں اور سورج کے دائرہ کو ایاۃ کہتے ہیں۔ فضل رقاشی نے ایاک ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مشہور لغت ہے(1)۔ ابوسوار غنوی نے دونوں جگہ پر هِیَّاک پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ شاعر نے کہا:

فھیاک والامر الذی ان توسعت موارده ضاقت علیک مصادره

یہاں ھیاک، ایاک کے لئے استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 26: وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۔

جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے نستعین کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم، اسد، قیس اور ربیعہ قبائل کی لغت ہے تاکہ مدطلب کرنے والے پر دلالت کرے، نون کو کسرہ دیا جاتا ہے جس طرح الف وصل کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ نستعین اصل میں نَستَعوِن تھا واؤ کی حرکت عین کو دی تو واو یاء بن گئی۔ اس کا مصدر استعانۃ ہے اصل میں استعوان تھا۔ واؤ کی حرکت عین کو دی گئی تو واؤ الف سے بدل گئی، دو ساکن جمع نہیں ہوتے، تو دوسرے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ زائدہ تھا۔ بعض نے فرمایا: پہلے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ دوسرا معنی کے لئے ہے اور ھاء عوضاً لازم ہے (یعنی واؤ کو حذف کیا تو اس کے عوض آخر میں ھاء لازم ہے۔)

مسئلہ نمبر 27: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝

اھدنا، مربوب کی، رب کی بارگاہ میں دعا اور رغبت ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہماری سیدھے راستہ پر رہنمائی فرما اور سیدھے راستہ کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما اور ہمیں اپنی ہدایت کا وہ راستہ دکھا جو تیری عبادت اور تیرے قرب تک پہنچنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دعا اور تمام چیزوں کو اس سورت میں رکھ دیا۔ اس کے نصف میں ثنا ہے اور نصف میں حاجات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ اس سورت میں جو دعا ہے وہ اس دعا سے افضل ہے جو دعا کرنے والا خود مانگتا ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ اور حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا سے زیادہ معزز کوئی چیز نہیں'' (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں سنن کے استعمال کی رہنمائی فرما۔ بعض نے فرمایا: اس میں اصل امالہ (مائل کرنا) ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَیْكَ (اعراف: 156) یعنی ھدنا کا معنی ہم مائل ہوئے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض کی حالت میں مسجد میں تشریف لائے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 72، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

راوی نے کہا: یتھادٰی بین اثنین یعنی دو آدمیوں کے درمیان جھک کر چل رہے تھے۔ یہاں یتھادٰی بمعنی یتمایل ہے۔ اس سے الھدیۃ ہے جو ایک شخص کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت کی طرف جاتا ہے۔ اسی سے الھدی اس حیوان کو کہا جاتا ہے جو حرم کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے دلوں کو حق کی طرف مائل کردے۔ فضیل بن عیاض نے کہا: الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مراد دلائل کا راستہ ہے، یہ خاص ہے، جبکہ عمومی معنی بہتر ہے۔

محمد بن حنفیہ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے بارے میں فرمایا: یہ اللہ کا دین ہے، اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ بندوں سے کوئی دین قبول نہیں کرتا۔

عاصم احوال نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے دو خلفاء ہیں۔ عاصم نے کہا: میں نے حسن سے کہا: ابوالعالیہ کہتے ہیں: الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھی (ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما) ہیں۔ حسن نے کہا: انہوں نے سچ کہا اور ٹھیک کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 28: الصِّرَاطَ کا اصل معنی عرب کلام میں الطریق ہے۔ عامر بن طفیل نے کہا:

شحنا ارضھم بالخیل حتی   ترکنا ھم اذل من الصراط

شاعر نے الصِّرَاطَ کو راستہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

جریر نے کہا:

امیر المومنین علی صراط   اذا اعوج الموارد مستقیم

اس شعر میں صراط بمعنی راستہ استعمال کیا ہے یعنی امیر المومنین سیدھے راستہ پر ہے۔

ایک اور نے کہا:

فصد عن نھج الصراط الواضح   اس نے واضح راستہ سے روکا۔

نقاش نے بیان کیا کہ رومی لغت میں الصِّرَاطَ کا مطلب الطریق (راستہ) ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف قول ہے (1)۔ السراط (سین کے ساتھ) بھی پڑھا گیا اور اس صورت میں یہ الاستراط سے مشتق ہوگا جس کا معنی الابتلاع (نگلنا) ہے۔ گویا راستہ چلنے والوں کو نگل لیتا ہے۔ راء اور صاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور سین اصل ہے۔ سلمہ نے فراء سے روایت کیا ہے، فراء نے کہا: الزراط۔ خالص زاء کے ساتھ عذرہ، کلب اور بنی القین کی لغت ہے۔ فرمایا: لوگ کہتے ہیں: ازدق جب انہوں نے اصدق کہنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: الازد اور الاسد ولسق بہ اور لصق بہ۔ الصراط، دوسرے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، کیونکہ ہدایت کا فعل حرف جر کے واسطہ سے دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ (الصافات) اور ہدایت کا فعل بغیر حرف جر کے بھی دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ الْمُسْتَقِيْمَ، الصِّرَاطَ کی صفت ہے۔ مستقیم اسے کہتے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھا پن

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اور انحراف (موڑ) نہ ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (انعام: 153) مستقیم اصل میں مستقوم تھا۔ واو کی حرکت نقل کر کے ماقبل قاف کو دی گئی پھر واو ماقبل کسرہ کی وجہ سے یاء سے بدل گئی۔

مسئلہ نمبر 29: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

صِرَاطَ، الصِّرَاطَ سے بدل کل ہے جیسے تو کہتا ہے: جاءنی زیدٌ ابوك۔ اس آیت کا مطلب ہے ہمیں ہمیشہ اپنی ہدایت عطا فرما کیونکہ انسان راستہ کی طرف رہنمائی کیا جاتا ہے پھر وہ اس سے بھٹک بھی جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس صراط سے مراد اور صراط ہے۔ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا فہم۔ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے اور قرآن کی لغت الذین ہی ہے حالت رفعی، نصبی اور جری میں اور ہذیل حالت رفعی میں اللذون کہتے ہیں۔ عربوں میں کچھ کہتے ہیں اللذو اور بعض الذی کہتے ہیں (خواہ حالت رفعی ہو نصبی ہو یا جری ہو) جیسا کہ آگے آئے گا۔

عَلَیْهِمْ میں دس لغات ہیں: عَلَیْهِمْ ھاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ ھا کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ۔ علیھمی ھا اور میم کے کسرہ اور کسرہ کے بعد یاء کے الحاق کے ساتھ۔ علیھمو۔ ھا کے کسرہ، میم کے ضمہ اور ضمہ کے بعد واو کی زیادتی کے ساتھ۔ علیھمُو ھاء اور میم کے ضمہ اور میم کے بعد واو کے ادخال کے ساتھ علیھم ھا اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کی زیادتی کے بغیر۔ یہ چھ وجوہ قراء ائمہ سے منقول اور چار وجوہ عربوں سے منقول ہیں قراء کی طرف سے بیان نہیں کی گئیں۔ عِلیھِمِیْ ھا کے ضمہ، میم کے کسرہ اور میم کے بعد یاء کے ادخال کے ساتھ یہ حضرت حسن بصری نے عربوں سے حکایت کیا ہے۔ علیھم ھا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ یاء کی زیادتی کے بغیر۔ علیھمُ ھا کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کے الحاق کے بغیر۔ علیھِم ھاء اور میم کے کسرہ کے ساتھ میم کے بعد یاء کے بغیر۔ یہ تمام صورتیں درست ہیں۔ یہ ابن انباری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 30: حضرت عمر بن خطاب بن زبیر رضی اللہ عنہما نے صراط من انعمت علیھم پڑھا ہے۔ علماء مفسرین کا اختلاف ہے کہ کون لوگ مراد ہیں جن پر انعام کیا گیا ہے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا (النساء) (اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی)۔

ہدایت تقاضا کرتی ہے کہ یہ لوگ صراط مستقیم پر ہیں اور آیت الحمد میں ہی مطلوب ہے اور تمام اقوال کا مرجع یہی ہے۔ اس لئے متعدد اقوال ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فاللہ المستعان

مسئلہ نمبر 31: اس آیت میں قدریہ اور معتزلہ، امامیہ کا رد ہے کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان سے فعل کے صدور میں انسان کا ارادہ ہی کافی ہے خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ہو کیونکہ ان کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خالق ہے وہ اپنے افعال کے صدور میں اپنے رب کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تکذیب فرمائی کیونکہ انہوں نے

صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اس کی بارگاہ سے سوال کیا۔ اگر معاملہ ان کے سپرد ہوتا اور ان کے اختیار میں ہوتا ان کے رب کے پاس یہ معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہدایت کا اس سے سوال نہ کرتے اور ہر نماز میں بار بار سوال نہ کرتے۔ اسی طرح مصیبت کے دور کرنے میں اس کی طرف ان کا تضرع وزاری کرنا بھی ہے۔

اور مکروہ سے مراد ہدایت کے مخالف چیز ہے۔ جب انہوں نے کہا: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝ جس طرح انہوں نے اس سے اپنی ہدایت کا سوال کیا اس طرح انہوں نے سوال کیا کہ انہیں گمراہ نہ کر۔ اسی طرح وہ دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران: 8)

مسئلہ نمبر 32: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝

علماء کا اختلاف ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور الضَّآلِّيْنَ سے کون مراد ہیں۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ عدی بن حاتم کی حدیث میں اور ان کے اسلام کے قصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تفسیر سے ذکر کی گئی ہے (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کیا ہے۔ اس تفسیر کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے جو یہود کے بارے میں وارد ہے وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرہ: 61) (وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔) اور فرمایا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (الفتح: 6) (ان پر اللہ کا غضب ہوا) اور نصاریٰ کے بارے فرمایا: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ (المائدہ: 77) (جو گمراہ ہو چکی ہے پہلے سے (قوم) اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے) بعض علماء فرماتے ہیں: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد مشرکین ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد منافقین ہیں۔ اور بعض نے فرمایا: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نماز میں اس سورت کی فرضیت کو ساقط کیا۔ الضَّآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی قراءت کی برکت سے گمراہ ہوئے۔ یہ قول سلمی نے اپنی ''حقائق'' میں اور ماوردی نے اپنی تفسیر میں حکایت کیا ہے لیکن اس قول کی کوئی حقیقت نہیں۔ ماوردی نے کہا: یہ قول مردود ہے کیونکہ جب اس کے مفہوم میں اخبار آپس میں معارض ہیں اور آثار مقابل ہیں اور اختلاف پھیلا ہوا ہے تو اس پر اس حکم کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدعتوں کی اتباع کی اور اس وجہ سے ان پر غضب ہوا۔ الضَّآلِّيْنَ سے سنن ہدیٰ سے گمراہ لوگ مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حسن ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر اولیٰ، اعلیٰ اور احسن ہے۔ عَلَيْهِمْ حالت رفعی میں ہے کیونکہ اس کا معنی ان پر غضب کیا گیا۔ لغت میں غضب کا معنی شدت ہے۔ رجلٌ غضوب، یعنی سخت خلق والا فحش۔ الغضوب برے سانپ کو کہتے ہیں اس کی شدت کی وجہ سے۔ الغضبتہ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو اونٹ کی جلد سے بنائی جاتی ہے اور تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ اس کی شدت کی وجہ سے اسے الغضبۃ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت میں غضب کا معنی سزا کا ارادہ کرنا ہے۔ یہ ذات کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کی ذات کی صفات سے ہے۔ یا اس کا معنی نفس عقوبت (سزا) ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث

1۔ جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، الباب تفسیر فاتحۃ الکتاب، صفحہ 199، جلد 2 (وزارت تعلیم)

استعمال ہوئی ہے: ان الصدقة لتطفئ غضب الرب۔(1) (صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے یہ فعل کی صفت ہے)۔

مسئلہ نمبر 33: وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ عرب کلام میں الضلال کا مطلب حق کے راستہ اور قصد کے طریقوں سے دور چلا جانا ہے۔ اس معنی میں یہ مثال ہے: ضل اللبن فی الماء، یعنی دودھ پانی میں غائب ہو گیا۔ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ: 10)۔ یعنی ہم موت کے ساتھ غائب ہو جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے۔ شاعر نے کہا:

ألم تسأل فتخبرك الديار　　عن الحی المضلّل این ساروا

کیا تو نے نہیں پوچھا کہ تجھے گھر خبر دیتے غائب قبیلہ کے متعلق کہ وہ کہاں چلے گئے۔

الضلضلة اس ملائم پتھر کو کہتے ہیں پانی جسے وادی میں گھماتا رہتا ہے۔ اسی طرح الغضبة پہاڑ میں اس چٹان کو کہتے ہیں جس کا رنگ پہاڑ سے مختلف ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

او غضبة فی هضبة ما امنعا

مسئلہ نمبر 34: حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابی بن کعب نے غیر المغضوب علیهم وغیر الضالین پڑھا ہے(2) اور ان دونوں حضرات سے راء پر نصب اور جر کا پڑھنا مروی ہے اور جر یہ الَّذِيْنَ سے عَلَيْهِمْ میں ھا اور میم سے بدل ہونے کی وجہ سے ہوگا یا الَّذِيْنَ کی صفت کی حیثیت سے ہوگا۔ الَّذِيْنَ معرفہ ہے اور اصول یہ ہے کہ معرفہ کی صفت نکرہ سے اور نکرہ کی صفت معرفہ سے نہیں لگائی جاتی۔ لیکن یہاں الَّذِيْنَ سے متعین افراد نہیں ہیں بلکہ یہ عام ہے۔ پس یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہوگا: انی لا مر بمثلك فا کر مه۔ یا غَيْرِ کا لفظ معرفہ بن گیا ہے کیونکہ یہ دو چیزوں کے درمیان ہے جن کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (یعنی دو ضدوں کے درمیان ہے اور دو ضدوں کے درمیان غَيْرِ آئے تو معرفہ بن جاتا ہے) جیسے الحی غیر المیت، الساکن غیر المتحرك، القائم غیر القاعد۔

یہ ترکیب کے دو قول ہیں: پہلا فارسی کا ہے اور دوسرا زمخشری کا ہے اور غَيْرِ پر نصب کی دو وجہیں ہیں: یا تو الَّذِيْنَ سے حال ہے یا عَلَيْهِمْ میں ھا اور میم سے حال ہے۔ گویا تو نے کہا: انعمت علیهم لا مغضوباً علیهم یا استثناء کی بنا پر نصب ہے۔ گویا تو کہتا ہے: الا المغضوب علیهم۔ اور اعنی فعل کے ساتھ نصب جائز ہے۔ خلیل سے یہ حکایت کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 35: وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں جو لَا ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ زائدہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (اعراف: 12) (اس میں لا زائدہ ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے تاکہ وہم نہ ہو کہ الضَّآلِّيْنَ، الَّذِيْنَ پر معطوف ہے۔ یہ قول مکی اور مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ کوفیوں نے کہا لا بمعنی غَيْرِ ہے۔ یہ عمر اور ابی کی قراءت ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 36: الضَّآلِّيْنَ اصل میں الضاللین تھا۔ پہلے لام کی حرکت حذف کی گئی پھر لام کو لام میں ادغام کیا گیا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزکوۃ، باب ماجاء فضل الصدقة، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 78، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پس دو ساکن جمع ہوئے۔ مدۃ الالف اور لام مدغمہ۔ ایوب سختیانی نے ولا الضألین غیر ممدودہ ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا اس نے التقاء ساکنین سے دوری اختیار کی۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابوزید نے حکایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عمرو بن عبید کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے: فیومئذ لا یسأل عن ذنبہ انسٌ ولا جأن۔ میں نے گمان کیا انہوں نے غلطی کی ہے حتیٰ کہ میں نے عربوں سے سنا: دأبۃ و شأبۃ۔ ابوالفتح نے کہا: اس لغت پر بہت سے اقوال ہیں۔

اذا ما العوالی بالعبیط احمارّت۔(1)

جب تازہ خون کی وجہ سے نیزوں کی انیاں سرخ ہوگئیں۔

سورۃ الحمد کی تفسیر ہم مکمل کرتے ہیں۔ سب تعریفیں اور احسان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 78، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سورۃ البقرہ

ایاتہا ۲۸۶　۲ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷　رکوعاتہا ۴۰

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے کرم سے شروع کرتا ہوں جس کے سوا کوئی پالنہار نہیں۔

اس سورت کے آغاز میں اس سورت کا نزول، اس کی فضیلت اور جو کچھ اس کے متعلق مروی ہے اسے ذکر کیا جائے گا۔ ہم ہر سورت کے آغاز میں اسی طرح عمل کریں گے اگر ہمیں اس کے نزول اور فضیلت کے متعلق کچھ میسر آیا۔

سورۂ بقرہ مدنی سورت ہے۔ یہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ سوائے اس ایک ارشاد کے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ کیونکہ یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور یہ دسویں ذی الحجہ کے دن حجۃ الوداع میں منیٰ میں نازل ہوئی اور سود والی آیات بھی قرآن حکیم میں سے آخر میں نازل ہونے والی ہیں۔

اس سورت کی فضیلت عظیم ہے اور اس کا ثواب جسیم ہے، اسے فسطاط القرآن کہا جاتا ہے۔ یہ خالد بن معدان کا قول ہے۔ اس نام کی وجہ اس کی عظمت، بہا، کثرت احکام اور مواعظ کی وجہ سے ہے۔ حضرت عمر نے اس سورت کو اس کی فقاہت اور معانی کے ساتھ بارہ سال میں پڑھا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اس سورت کو آٹھ سال میں پڑھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے بعض شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سورت میں ہزار امر، ہزار نہی، ہزار حکم اور ہزار خبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، وہ کثیر تعداد میں تھا اور ایک نوجوان کو ان کا امیر بنایا گیا تھا کیونکہ اس کو سورۂ بقرہ یاد تھی۔ اسے فرمایا: ”تو جا تو ان کا امیر ہے“ (1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے، مسلم نے حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سورۂ بقرہ پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور بطلہ اس کے (پڑھنے کی) طاقت نہیں رکھتے (2)۔ اس حدیث کے ایک راوی معاویہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو مقابر نہ بناؤ۔ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے (3)۔

دارمی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، کوئی گھر ایسا نہیں جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے مگر اس سے شیطان نکل جاتا ہے جبکہ اس کی ہوا آواز بلند خارج ہو رہی ہوتی ہے (4)۔ اور فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا لباب ہوتا ہے اور قرآن کا لباب مفصل ہے۔ ابو محمد دارمی نے کہا: اللباب سے مراد خالص ہے۔ صحیح البستی میں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی، صفحہ 111، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قرأۃ القرآن و سورۃ البقرۃ، صفحہ 270، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ و جوازہا فی المسجد، صفحہ 265، جلد 1

4۔ سنن دارمی، صفحہ 365، جلد 2 (المدینۃ المنورہ الحجاز)

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے جس نے اسے رات کے وقت اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہ ہوگا اور جس نے اسے دن کے وقت پڑھا وہ شیطان اس کے گھر میں تین دن داخل نہ ہوگا(1)، اس سے مراد سرکش شیطان ہیں۔

دارمی نے اپنی مسند میں شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ نے فرمایا: جس نے رات کے وقت سورۂ بقرہ کی دس آیات تلاوت کیں اس گھر میں اس رات شیطان داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ صبح ہو جائے (وہ دس آیات یہ ہیں) ابتدائی چار آیات، آیۃ الکرسی اور آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیات اور تین آخری آیات۔ جن کا آغاز لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے ہے(2)۔ شعبی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے قریب اس دن نہ شیطان آئے گا اور نہ کوئی ایسی چیز جو اسے ناپسند ہو۔ یہ کسی مجنون پر نہیں پڑھی جائے گی مگر اسے ہوش آ جائے گا۔ مغیرہ بن سبیع نے کہا: یہ عبداللہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ قرآن نہیں بھولے گا۔ اسحاق بن عیسیٰ نے کہا: جو اس نے یاد کیا ہوگا وہ نہیں بھولے گا۔ ابو محمد دارمی نے کہا: جو یہ کہتے تھے ان میں مغیرہ بن سمیع بھی تھے۔ ابن عبدالبر کی کتاب ''الاستیعاب'' میں ہے لبید بن ربیعہ (بن عامر) بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جاہلیت کے شعراء میں سے تھا اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور اسلام قبول کر کے اسے خوب نبھایا اور اسلام کے زمانہ میں اس نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اس سے اس کے اشعار کے متعلق پوچھا اور اس سے شعر سننا چاہا تو لبید نے سورۂ بقرہ پڑھ دی۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے تجھ سے تیرے اشعار کے متعلق سوال کیا ہے۔ لبید نے کہا: مجھے جب سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا علم بخشا ہے اس کے بعد میں نے کبھی شعر کا ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمر کو اس کے اس قول پر تعجب ہوا، اس کا وظیفہ دو ہزار تھا تو حضرت عمر نے مزید پانچ سو کا اضافہ کر دیا۔ بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ لبید نے جب سے اسلام قبول کیا کبھی شعر نہیں کہا۔ بعض نے فرمایا: اس نے اپنے زمانہ اسلام میں اس شعر کے علاوہ کوئی شعر نہیں کہا۔

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی حتی اکتسیت من الاسلام سربالاً

سب تعریفیں اللہ کے لئے کہ میری موت نہیں آئی حتیٰ کہ میں نے اسلام کا لباس زیب تن کر لیا۔

ابن عبدالبر نے کہا: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ شعر قردہ بن نفاثۃ السلولی کا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ شعر یہ ہے جو اس نے اسلام کے زمانہ میں کہا تھا۔

ما عاتب المرء الکریم کنفسہ والمرء یصلحہ القرین الصالح

اس نے کریم شخص کو اپنے نفس کی طرح عتاب نہیں کیا اور انسان کی اصلاح اس کا نیک دوست کرتا ہے۔

مزید فضیلت کا ذکر، آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گا اور سورۂ آل عمران کی ابتدا میں اس سورت کی فضیلت کا مزید بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ سنن دارمی، صفحہ 324، جلد 2 (المدینۃ المنورہ) 2۔ ایضاً

اے میرے رب آسان فرما اور مدد فرما۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الله کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛ فِيۡهِ ۛ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ

''الف لام میم۔ یہ ذی شان کتاب اور ذرا شک نہیں اس میں، یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے''۔

علماء تاویل کا ان حروف کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہے جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں۔ عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا: یہ قرآن میں الله تعالیٰ کے راز ہیں (1) اور الله کی کتب میں سے ہر کتاب میں اس کے راز ہیں یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف الله تعالیٰ کو ہے اور ان کے متعلق گفتگو کرنا واجب نہیں لیکن ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح آئے ہیں۔ یہ قول حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابولیث سمرقندی نے حضرت عمر، حضرت عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حروف مقطعہ پوشیدہ حقیقت سے ہیں جن کی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ ابو حاتم نے کہا: ہم حروف مقطعہ صرف سورتوں کے آغاز میں پاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے جو الله تعالیٰ نے ان سے مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی مفہوم کو ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی سند سے ربیع بن خثیم سے روایت کیا ہے، فرمایا: الله تعالیٰ نے یہ قرآن نازل کیا اور اس میں جتنا علم چاہا اپنے ساتھ خاص فرمایا اور جتنا چاہا اس پر تمہیں مطلع فرمایا اور جو اس نے اپنے ساتھ خاص فرمایا تم اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پس تم اس کے متعلق مت پوچھو اور وہ علم جس پر اس نے تمہیں مطلع فرمایا وہ علم ہے جس کے متعلق تم پوچھتے ہو اور تجھے اس کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ پورا قرآن تم نہیں جانتے اور وہ جو تم جانتے ہو اس پر عمل کرتے ہو۔ حضرت ابوبکر نے کہا: یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ قرآن کے کچھ حروف کے معانی عام عالم سے چھپائے گئے ہیں۔ یہ الله تعالیٰ نے بطور آزمائش وامتحان کیا ہے۔ پس جو ان پر ایمان لایا اس نے اجر پایا اور سعادت مند ہوا اور جس نے انکار اور شک کیا وہ گنہگار ہوا اور حق سے دور ہو گیا۔ ہمیں ابو یوسف بن یعقوب القاضی نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالرحمن بن مہدی نے بتایا۔ انہوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے عمارہ سے انہوں نے حریث بن ظہیر سے انہوں نے حضرت عبدالله سے روایت کیا، فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا پھر یہ آیت پڑھی: الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ۔

میں کہتا ہوں: یہ قول متشابہ اور اس کے حکم کے متعلق ہے اور یہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ بہت سے علماء کبار نے فرمایا بلکہ ان کے متعلق ہم پر گفتگو کرنا واجب ہے تاکہ ہم وہ فوائد نکالیں جو ان کے ضمن میں ہیں اور وہ معانی نکالیں جو ان سے نکل سکتے ہیں، اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں: حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور حضرت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قرآن میں حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس کی ان حروف سے تالیف کیسی ہے (1)، قطرب اور فراء وغیرہما نے کہا: یہ حروف ہجاء کی طرف اشارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب عربوں کو چیلنج فرمایا تو انہیں ان کے ساتھ بتایا کہ یہ قرآن ان حروف سے مرکب ہے جن پر ان کے کلام کی بنیاد ہے تا کہ ان کا اس سے عجز زیادہ ظاہر ہو جائے کیونکہ اس نے ان کے کلام سے خروج نہیں کیا۔ قطرب نے کہا: وہ لوگ قرآن کو سننے سے بھاگتے تھے جب وہ سنتے تھے الم، المص۔ انہوں نے اس لفظ کو عجیب سمجھا۔ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لئے خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکب قرآن ان پر پڑھا تا کہ قرآن کو ان کے کانوں میں ثابت کر دیں اور ان پر حجت قائم کر دیں۔ ایک قوم نے کہا: روایت ہے کہ مشرکین نے جب مکہ میں قرآن سننے سے یہ اعراض کیا تو انہوں نے کہا: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (فصلت:26)۔ مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور وغل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان تو یہ حروف مقطعات نازل ہوئے تا کہ وہ اس پر تعجب کریں پھر اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کریں اور اس کے قرآن کو سنیں تا کہ ان پر حجت لازم ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حروف اسماء پر دلالت کرتے ہیں، اسماء سے یہ حروف اخذ کئے گئے ہیں اور ان کے بقیہ حروف کو حذف کیا گیا ہے جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے، الف، اللہ سے ہے، لام، جبریل سے ہے، میم، محمد سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف، اسم اللہ کی چابی ہے، لام، لطیف کی چابی ہے، میم، اسم مجید کی چابی ہے۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے الٓمّٓ کے قول میں روایت کیا ہے، فرمایا: انا اللہ اعلم۔ الٓرٰ۔ انا اللہ اری۔ المص۔ انا اللہ افصل۔ (2) الف انا کے معنی کو ادا کرتا ہے، لام اللہ کے اسم کا معنی ادا کرتا ہے اور میم اعلم کا معنی ادا کرتا ہے۔ اس قول کو زجاج نے پسند کیا ہے۔ زجاج نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ان حروف میں سے ہر حرف ایک معنی ادا کرتا ہے۔ عرب بھی نظماً اور فصحاً حروف مقطعات کو ان کلمات کے بدل بولتے ہیں جن سے یہ حروف مشتق ہیں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلت لها قفی فقالت قاف

میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا: میں ٹھہر گئی۔

شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قالت وقفت۔ زہیر نے کہا:

بالخیر خیرات وان شراً فا　　ولا أرید الشر الّا ان تا

اس سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے وان شراً فشر اور اِلّا اَنْ تشاء۔ ایک اور شاعر نے کہا:

نادوهم ألا الجموا ألاتا　　قالوا جمیعاً کلهم ألافا

اس میں شاعر نے الاتر کبون مراد لیا ہے اور انہوں نے کہا: الا فار کبوا اور حدیث پاک میں ہے: من اعان علی قتل مسلم بشطر کلمة۔ (3) شقیق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اقتل میں سے اُق کہتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً

3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً، حدیث 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کفی بالسیف شا۔ اس کا مطلب ہے: شافیا۔

حضرت زید بن اسلم نے کہا: یہ حروف مقطعات سورتوں کے اسماء ہیں۔ کلبی نے کہا: یہ قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے شرف اور فضل کی وجہ سے ان کے ساتھ قسمیں اٹھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو رد کیا ہے۔ فرمایا: ان کا قسم ہونا صحیح نہیں کیونکہ قسم کے لئے مخصوص حروف ہیں مثلاً ان، قد، لقد اور ما اور ان حروف میں سے کوئی حرف یہاں نہیں پایا جاتا۔ پس قسم ہونا جائز نہیں۔ اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ قسم کی جگہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡہِ اگر کوئی انسان قسم اٹھائے تو کہے گا: واللہ ھذا الکتاب لا ریب فیہ۔ تو یہ کلام درست ہوگا اور لا جواب قسم ہوگا۔ پس کلبی کا قول اور جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے صحیح اور درست ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسم اٹھانے میں کیا حکمت ہے۔ اس وقت میں لوگ دو قسم کے تھے: ایک تصدیق کرنے والے اور دوسرے تکذیب کرنے والے۔ تصدیق کرنے والے تو بغیر قسم کے ہی تصدیق کر دیتے ہیں اور مکذب قسم کے ساتھ بھی تصدیق نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن لغت عرب میں نازل ہوا ہے۔ عربوں میں سے جب کوئی اپنے کلام کو مؤکد کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کلام پر قسم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی حجت کو مؤکد کرنے کا ارادہ فرمایا تو قسم اٹھائی کہ قرآن اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الٓمّٓ کا مطلب ہے میں نے تجھ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔ قتادہ نے الٓمّٓ کی تفہیم میں فرمایا: یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ محمد بن علی ترمذی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں جو احکام اور قصص ودیعت فرمائے ہیں وہ ان حروف میں ودیعت فرما دیئے جو ان سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے ہیں۔ ان حقیقتوں کو سوائے نبی یا ولی کے کوئی نہیں جانتا پھر ان حقائق کو سورت میں بیان فرمایا تاکہ لوگ سمجھ سکیں (1)۔ ان اقوال کے علاوہ بھی حروف مقطعات کے بارے میں اقوال موجود ہیں۔ حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے۔

ان حروف پر وقف ان کے نقصان کی وجہ سے ہے مگر جب ان کو تو مبتدا بنائے گا یا انہیں معطوف کرے گا تو ان کو اعراب دے گا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا اعراب میں کوئی محل ہے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا کوئی اعراب نہیں کیونکہ یہ اسماء متمکنہ نہیں ہیں نہ یہ افعال مضارعہ ہیں۔ یہ حروف تہجی کے قائم مقام ہیں۔ پس یہ محکیۃ ہیں یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے اور جن علماء نے فرمایا کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں ان کے نزدیک ان کا اعراب مرفوع ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہیں یعنی ھذہ الم۔ جیسا کہ تو کہتا ہے: ھذہ سورۃ البقرۃ یا یہ مبتدا ہیں اور ان کی خبر ذالک ہے جیسا کہ تو کہتا ہے زیدٌ ذالک الرجل۔ ابن کیسان نحوی نے کہا الٓمّٓ نصب کی جگہ میں ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: اقرأ الم یا علیك الم۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قسم کی بنا پر جر کی جگہ میں ہیں کیونکہ حضرت ابن عباس کا قول ہے: یہ قسمیں ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسمیں اٹھائی ہیں (2)۔

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ھذا الکتاب۔ اور ذٰلِکَ حاضر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ یہ وضع غائب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق خبر دیتے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ ایضاً

ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (السجدہ) اسی طرح خفاف بن ندبہ کا قول ہے

اقول له و الرمح یاطر متنه تامل خفافاً اننی انا ذلکا

یعنی انا هذا۔ پس ذٰلِكَ کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یہ هذا کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ اس کی تلخیص یہ ہے: الم هذا الکتاب لا ریب۔ یہ ابوعبیدہ، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ (انعام: 83) (اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی ابراہیم کو)۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (بقرہ: 252) (یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ)۔ ان آیات میں تِلْكَ بمعنی هذه استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہ توڑیں گئیں تو گویا وہ دور ہو گئیں۔ بخاری میں ہے، معمر نے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی تفسیر میں فرمایا: کتاب سے مراد یہ قرآن ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ یہ بیان اور دلالت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ (الممتحنہ: 10) یعنی هذا حکم اللہ۔

میں کہتا ہوں: هذا بمعنی ذالك استعمال ہوتا ہے، مثلاً ام حرام کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: یرکبون ثبج هذا البحر (1)۔ یعنی ذالك البحر، (واللہ اعلم)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ غائب کی طرف اشارہ کے باب پر ہے۔

اس غائب میں علماء کے مختلف دس اقوال ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ کتاب ہے جو میں نے مخلوق کی سعادت، شقاوت، عمر اور رزق کے بارے میں لکھی۔ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ یعنی اس میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ تحریر ہے جو ازل میں میں نے اپنے بارے میں لکھی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں اپنے بارے میں لکھا اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (ایک روایت میں تغلب کی جگہ سبقت کے الفاظ ہیں) (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جس کو پانی نہیں مٹا سکے گا۔ پس اسی وعدہ کی طرف اشارہ فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا اور اس کے عرب و عجم پر ناراضگی کا اظہار کیا سوائے اہل کتاب کے بقیہ لوگوں کے۔ اور فرمایا: میں نے تجھے مبعوث فرمایا تا کہ تجھے آزمائش میں ڈالوں اور تیرے ذریعے آزماؤں، میں تجھ پر ایک کتاب نازل کروں گا جس کو

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا سبقت غضبہ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً

پانی صاف نہیں کردے گا، تو اسے نیند اور بیداری کی حالت میں پڑھے گا(1)۔ (الحدیث)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قرآن کے اس حصہ کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں یہ ارشاد نازل فرمایا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ (المزمل) (بیشک ہم جلدی ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف سے اس وعدہ کے پورا ہونے کے منتظر رہتے تھے۔ پھر جب مدینہ طیبہ میں الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ نازل ہوا۔ اس میں اس قرآن کا معنی ہے جو میں نے تم پر مدینہ طیبہ میں اتارا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تجھ سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تیری طرف وحی کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ سے اس کلام کی طرف اشارہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہے اور الٓمّٓ قرآن کا اسم ہے تقدیر کلام یہ ہوگا: یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر تورات اور انجیل میں کی گئی ہے یعنی تورات اور انجیل اس کی صحت کے گواہ ہیں اور جو معانی تورات اور انجیل میں ہیں ان کا یہ جامع ہے اور جو کچھ ان میں نہیں وہ بھی اس میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ تورات اور انجیل دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ الٓمّٓ دو کتابیں ہیں یا ان دو کتابوں کی مثل ہے یعنی یہ قرآن ان دونوں کتابوں کے معانی وحقائق کا جامع ہے، پس تثنیہ کو ذٰلِكَ سے تعبیر فرمایا اس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ (البقرہ:68) (کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر ہو)۔ یہاں بَیْنَ ذٰلِكَ بمعنی بین تینک ہے یعنی بوڑھی اور جوان کے درمیان ہو۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ کسائی نے کہا ذٰلِكَ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جو آسمان میں تھا اور ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب نازل کرے گا۔ پس یہ اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے(2)۔ المبرد نے کہا: معنی یہ ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کے وسیلہ سے تم کفار پر فتح طلب کیا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اشارہ ہے حروف معجمہ کی طرف، اس کے قول پر جو کہتا ہے: الٓمّٓ سے مراد وہ حروف ہیں جن پر قرآن نظم کر کے میں نے تمہیں چیلنج کیا ہے(3)۔

کتاب: کتب یکتب سے مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ اسی وجہ سے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے اس کے اجتماع کی وجہ سے۔ عرب کہتے ہیں: تکتبت الخیل جو گھوڑے چھوٹے چھوٹے لشکر ہو جائیں۔ کتبت البغلة کہا جاتا ہے۔ جب بغلہ کے رحم کو حلقہ یا دھاگہ کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ شاعر نے کہا:

لا تامنن فزاریا حللت به　　علی قلوصك واكتبها باسیار

الکتبہ (کاف کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی الخرزۃ۔ سینے کا تسمہ ہے اور اس کی جمع کُتَبٌ ہے اور الکتب الخرز یعنی تسمہ۔ ذوالرمہ کا شعر ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة واهل النار، صفحہ 385، جلد 2

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 83، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　3۔ ایضاً

وفراء غرفیة اثأی خوارزها مشلشل ضیعته بینها الکتب

اس شعر میں یہ لفظ اسی مفہوم میں شاعر نے استعمال کیا ہے۔

کتاب کاتب کے حروف معجمہ لکھنے کو کہتے ہیں خواہ وہ حروف جمع ہوں یا جدا جدا ہوں اس کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ مکتوب ہو، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تومل رجعة منی و فیها کتابٌ مثل ما لصق الغراء

اس میں مذکورہ مفہوم میں کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا معنی فرض، حکم اور القدر بھی ہے۔ جعدی کا قول ہے:

یابنة عمی کتاب الله اخرجنی عنکم وهل امنعن الله ما فعلا

اس میں شاعر نے کتاب سے مراد فرض، حکم لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَیۡبَ ۛۚ فِیۡہِ۔ یہ نفی عام ہے، اسی وجہ سے رَیۡبَ کو اس کے ساتھ نصب دی گئی ہے، رَیۡبَ کے تین معانی ہیں۔

۱۔ شک: عبد اللہ بن الزبعری نے کہا:

لیس فی الحق یا امیمة ریبٌ انما الریب ما یقول الجهول

اے امیمہ! حق میں کوئی شک نہیں، شک تو اس میں ہوتا ہے جو جاہل کہتا ہے۔

۲۔ تہمت: جمیل نے کہا:

بثینة قالت یا جمیل اربتنی فقلت کلانا یابثین مریب

بثینہ نے کہا: اے جمیل! تو نے مجھ پر تہمت لگائی۔ میں نے کہا: ہم میں سے ہر ایک اے بثین تہمت لگانے والا ہے۔

۳۔ حاجت: شاعر (کعب بن مالک) نے کہا:

قضینا من تهامة کل ریب و خیبر ثم اجمعنا السیوفا

ہم نے تہامہ اور خیبر سے ہر حاجت کو پورا کر لیا پھر ہم نے تلواروں کو جمع کیا۔

پس اللہ کی کتاب میں کوئی شک وارتیاب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں حق ہے وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کی صفات میں سے ایک صفت غیر مخلوق اور غیر حادث ہے اگرچہ کفار کے لئے شک واقع ہوا ہے۔ **بعض علماء** نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس کا معنی نہی ہے یعنی تم اس میں شک نہ کرو۔ کلام مکمل ہے۔ گویا فرمایا: یہ کتاب حق ہے، تو کہتا ہے: رابنی هذا الامر۔ جب وہ امر شک اور خوف کو داخل کر دے۔ اراب، شک والا ہو گیا۔ **فهو مریبٌ، رابنی امره، ریبٌ** الدهر۔ زمانہ کی گردشیں۔

اس کے متعلق چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِ اس میں ھلاء فی کی وجہ سے حالت جری میں ہے، اس میں پانچ وجوہ ہیں عمدہ ترین وجہ فیہِ ھدی ہاور اس کے قریب پھر فیہُ ھدی (بغیر واؤ کے ھاء کے ضمہ کے ساتھ) یہ زہری، سلام اور ابوالمنذر کی قراءت ہے۔ پھر اس کے قریب فیھی ھدی ہے یعنی (یاء کے اثبات کے ساتھ) یہ ابن کثیر کی قراءت ہے۔ اس میں فیھو ھدی (واؤ کے ساتھ) بھی جائز ہے، اس میں فیہ ھدیٰ مدغم کر کے پڑھنا جائز ہے، ھدی کا رفع مبتدا ہونے کی بنا پر ہے اور فِيْهِ خبر ہے، الھدی عرب کلام میں الرشد اور بیان کے معنی میں ہوتا ہے یعنی اس میں اہل معرفت کے لئے کشف، رشد، بیان کی زیادتی اور رہنمائی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: الھدیٰ، ھدیان، ھدیٰ کا معنی دلالت ہے۔ یہ وہ ہے جس پر رسول اور ان کے متبعین قادر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد) (اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں)۔ اور ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ) (اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ نے رسل کے لئے ہدایت کو ثابت فرمایا جس کا معنی ہے دلالت، دعوت اور تنبیہ۔ اور وہ ہدایت جس کا معنی تائید اور توفیق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ:52)۔ (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں)۔

پس اس اعتبار سے هُدًى کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دل میں پیدا فرمایا۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرہ:5) (وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے) اور ارشاد ہے يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البقرہ:142) ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ الھدی اور الاھتداء اس کا معنی ارشاد کے معنی کی طرف راجع ہے، جیسے بھی تو اس کا صیغہ بنائے۔ ابوالمعالی نے کہا: کبھی ہدایۃ کا لفظ وارد ہوتا ہے اور اس سے مراد مومنین کی جنت کے راستوں اور جنت تک پہنچانے والے طرق کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں مجاہدین کی صفت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ (محمد:4) اسی مفہوم میں یہ ارشاد ہے: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ (صافات) اس کا معنی ہے انہیں جحیم کے راستہ کی طرف چلاؤ۔

مسئلہ نمبر 3: الھدیٰ لفظ مونث ہے۔ فراء نے کہا: بعض بنی اسد الھدی کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ھذہ ھُدی حسنۃ۔ اور لحیانی نے کہا: یہ مذکر ہے، اس پر اعراب نہیں آتا، یہ اسم مقصور ہے اور الف پر حرکت نہیں آتی۔ یہ حرف جر کے ساتھ اور بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں یہ گزر چکا ہے، تو کہتا ہے: ھدیتہ الطریق والی الطریق، والدار والی الدار (یعنی میں نے اسے راستہ کی پہچان کرائی اور گھر کی پہچان کرائی) حرف جر کے متعدی ہونا اہل حجاز کی لغت ہے اور دوسری صورت یعنی بغیر حرف جر کے متعدی ہونا، اخفش نے حکایت کیا ہے اور قرآن حکیم میں ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (فاتحہ) (چلا ہم کو سیدھے راستے پر)۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف:43)۔ ساری تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی۔

بعض علماء نے فرمایا: الھدی دن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے کیونکہ لوگ دن میں اپنی معیشت اور ... کے لئے راستوں پر نکلتے ہیں۔ اسی سے ابن مقبل کا قول ہے:

حتی استبنت الھدی والبید ھاجمۃ یخشعن فی الآل غلفا او یصلینا

اس شعر میں الھدی، دن کے لئے استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلۡمُتَّقِيۡنَ۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے ساتھ المتقین کو خاص فرمایا ہے اگرچہ قرآن ساری مخلوق کے لئے ہے یہ متقین کو شرف بخشنے کے لئے فرمایا ہے کیونکہ وہ ایمان لائے اور جو کچھ اس قرآن میں ہے اس کی تصدیق کی۔ ابوروق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ھُدًی لِّلۡمُتَّقِيۡنَ یعنی متقین کی عزت و شرف کے لئے ہدایت کو متقین کے لئے ذکر فرمایا اور ان کی فضیلت وعظمت کے لئے یہ فرمایا۔

متقین اصل میں الموتقیین تھا یعنی دو یاؤں کے ساتھ تھا، پہلی یاء کے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کر دیا گیا اور واؤ اور تاء کے اجتماع کی صورت میں واؤ کو تا سے بدل دیا گیا پھر تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا، پس یہ متقین بن گیا۔

مسئلہ نمبر 5: التقویٰ اس کا اصل میں لغوی معنی قلت کلام ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی حکایت کیا ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث شریف ہے التقی ملجم، کم کلام کرنے والا لگام دیا گیا ہے۔ متقی، مومن اور اطاعت کرنے والے سے بلند درجہ ہے، یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نیک عمل اور خالص دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتا ہے۔ یہ اتقاء المکروہ بما تجعلہ حاجزاً بینک و بینہ سے مشتق ہے یعنی جس کو تو اپنے اور مکروہ چیز کے درمیان آڑ بناتا ہے جیسا کہ نابغہ نے کہا تھا:

سقط النصیف و لم ترد اسقاطہ فتناولتہٗ واتقتنا بالید

اس کی اوڑھنی گر گئی اور اس نے اس کو گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پس اس نے اس کو پکڑ لیا اور ہاتھ سے ہمیں بچا لیا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فالقت قناعاً دونہٗ الشمس واتقت باحسن موصولین کف و معصم

اس نے دھوپ سے بچاؤ کیلئے پردہ ڈالا اور ہاتھ اور کلائی دونوں خوبصورت ملی ہوئی چیزوں کے ساتھ بچاؤ کیا۔

ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے سعید بن زربی ابو عبیدہ بن عاصم بن بھدلہ عن زر بن جیش عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن مسعود نے ایک اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تو کتنے زیادہ لوگ دیکھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تائب توبہ کرنے والے اور گناہوں سے بچنے والے کے۔ پھر فرمایا: اے میرے بھائی کے بیٹے! تو لوگوں کو دیکھتا ہے کتنے زیادہ ہیں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے عالم یا متعلم کے۔

ابو یزید بسطامی نے کہا: متقی وہ ہے جب بات کرے تو اللہ کے لئے بات کرے اور جب عمل کرے تو اللہ کے لئے عمل

کرے، ابوسلیمان دارانی نے کہا: المتقین وہ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت ختم کر دی۔ بعض علماء نے فرمایا: متقی وہ ہے جو شرک سے بچتا ہے اور نفاق سے بری ہوتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول فاسد ہے کیونکہ کبھی ایک شخص شرک ونفاق سے پاک ہوتا ہے لیکن وہ فاسق ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی سے تقویٰ کے متعلق پوچھا، تو حضرت ابی نے کہا: کیا تم نے کانٹوں والا راستہ پایا ہے؟ حضرت عمر نے کہا: ہاں۔ حضرت ابی نے کہا: پھر تم نے اس سے گزرتے ہوئے کیا کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے کپڑے اوپر کر لئے اور بچ کے احتیاط سے گزرا۔ حضرت ابی نے کہا: یہ تقویٰ ہے ابن المعتز نے یہی معنی لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

خلِّ الذنوب صغیرها　　و کبیرها ذاك التقی

واصنع کماشٍ فوق ار　　ض الشوك یحذر مایری

لا تحقرن صغیرة　　ان الجبال من الحصٰی

ترجمہ: تو گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو چھوڑ دے یہی تقویٰ ہے اور تو کانٹوں والی زمین کے اوپر چلنے والے کی طرح کر کہ وہ کانٹوں کو دیکھ کر احتیاط کرتا ہے۔ صغیرہ گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ، کنکریوں سے بنتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: تقویٰ میں تمام خیر کے اعمال جمع ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اولین وآخرین میں وصیت ہے۔ یہ وہ خیر ہے جو انسان حاصل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء نے کہا، ان سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھی شعر کہتے ہیں اور تجھ سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی۔ فرمایا:

یرید المرء ان یوتی مناہ　　و یابی اللہ الا ما ارادا

یقول المرء فائدتی و مالی　　و تقوی اللہ افضل ما استفادا

انسان ارادہ کرتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کی جائے اور اللہ تعالیٰ عطا نہیں فرماتا مگر جس کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

انسان کہتا ہے میرا فائدہ اور میرا مال حالانکہ جو اس نے فائدہ اٹھایا اس میں سے افضل اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابوامامہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: مومن تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی خیر حاصل نہیں کرتا اگر وہ اسے حکم دے، تو اس کی اطاعت کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کرے اور اس پر کوئی قسم اٹھائے تو اسے سچا کرے، اگر وہ اس سے غائب ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں اس سے اخلاص کا مظاہرہ کرے(1)۔

تقویٰ اصل میں وقویٰ تھا بروزن فعلی، پھر واو کو تاء سے بدلا گیا یہ وقیتہ، اقیہ سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے بچایا رجلٌ تقی، یعنی ڈرنے والا شخص۔ اصل میں وقی تھا اسی طرح تقاۃ اصل میں وقاۃ تھا جیسا کہ عرب کہتے ہیں تجاہ، و تراث اصل میں وُجاہ اور وارث تھا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب النکاح، باب افضل النساء، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

''وہ جو ایمان لائے غیب پر اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں''۔

اس میں چھبیس مسائل ہیں☆۔

مسئلہ نمبر 1: الَّذِيْنَ یہ متقین کی صفت ہونے کے اعتبار سے حالت جری میں ہے اور قطع کے اعتبار سے رفع بھی جائز ہے۔ یعنی اس سے پہلے هم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور مدح کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ کا معنی یصدقون ہے یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں۔ الایمان کا لغوی معنی تصدیق کرنا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یوسف: 17) (تو ہماری تصدیق کرنے والا نہیں) ایمان کا لفظ باء اور لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (آل عمران: 73) (ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں کہ مت مانو کسی کی بات، سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی) اور فرمایا: فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى (یونس: 83) (پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر) حجاج بن حجاج احول سے مروی ہے (یہ زق العسل سے ملقب ہوتا تھا) فرمایا: میں نے حضرت قتادہ کو یہ فرماتے سنا، اے ابن آدم! اگر تو چستی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو تیرا نفس اکتاہٹ، کوتاہی اور بے زاری کی طرف مائل ہوگا لیکن مومن وہ ہوتا ہے جو تکلیف اٹھانے والا ہوتا ہے، مومن وہ ہوتا ہے جو قوت کا اظہار کرنے والا ہوتا ہے اور مومن اپنے نفس پر سختی کرنے والا ہوتا ہے، مومنین رات دن اللہ کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کی قسم! بندہ مومن سرًا اور علانیۃً ربنا، ربنا کہتا رہتا ہے حتیٰ کہ سرًا اور علانیۃً اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْغَيْبِ عرب کلام میں الغیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تجھ سے غائب ہے۔ یہ لفظ اجوف یائی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: غابت الشمس تغیب۔ الغیبة معروف ہے و اَغَابَتِ المراُۃ یعنی وہ عورت جس کا خاوند غائب ہوتا ہے۔ و وقعنا فی غیبة و غیابة یعنی ہم زمین کی گہرائی میں واقع ہوئے۔ الغیابة کا معنی ہے: الاجنة، یعنی گھنے درخت جن میں چھپا جاتا ہے، ہموار زمین کو بھی الغیب کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ سے غائب ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: مفسرین نے الغیب کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں الغیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابن عربی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: الغیب سے مراد قضاء و قدر ہے۔ بعض علماء نے کہا: الغیب سے مراد قرآن اور اس میں موجود غیوب ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی مثلاً قیامت کی علامات، عذاب قبر، حشر، نشر، صراط، میزان، جنت، دوزخ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اقوال متعارض نہیں ہیں بلکہ ان تمام پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ایمان شرعی ہے جس کی طرف حدیث جبریل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب جبریل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: مجھے ایمان کے متعلق بتایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل، آخرت کے دن پر ایمان لائے اور

1۔ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس مسائل ہیں۔

خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل امین نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ (آگے مکمل حدیث ذکر کی) (1)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ (2)

میں کہتا ہوں۔ قرآن حکیم میں ہے وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۞ (اعراف) (اور نہ تھے ہم ان سے غائب)۔

اور فرمایا: الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء: 49) (جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات آنکھوں سے غائب ہے، اس دنیا میں وہ دیکھی نہیں جاتی لیکن نظر و استدلال کے اعتبار سے غائب نہیں۔

یعنی وہ ایمان لاتے ہیں کہ ان کا رب قادر ہے وہ اعمال پر جزا دے گا، وہ اپنی خلوتوں میں بھی اس سے ڈرتے ہیں جہاں وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر آگاہ ہے۔ اس اعتبار سے آیات متفق ہو جاتی ہیں اور ان میں تعارض نہیں رہتا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

بعض علماء نے فرمایا: الغیب سے مراد لوگوں کے ضمائر اور قلوب ہیں بخلاف منافقین کے۔ یہ عمدہ قول ہے۔ شاعر نے کہا:

و بالغیب آمنا وقد کان قومنا　　یصلون للاوثان قبل محمد

ہم دل سے ایمان لائے جبکہ ہماری قوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بتوں کی عبادت کرتی تھی۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یہ جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ اقامۃ الصلوۃ کا مطلب ہے نماز کو اس کے ارکان، سنن اور اس کی ہیئت کے ساتھ اس کے اوقات میں ادا کرنا، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: قام الشیء یعنی اس چیز کو دوام اور ثبوت ہو گیا۔ یہ القیام علی الرجل سے مشتق نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: قام الحق یعنی حق ظاہر ہو گیا اور ثابت ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

وقامت الحرب بنا علی ساق

یعنی ہم پر جنگ قائم اور ثابت ہو گئی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

واذا یقال أتیتم لم یبرحوا　　حتی تقیم الخیل سوق طعان

اور جب کہا جاتا ہے تم آ گئے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے حتیٰ کہ گھوڑے نیزوں کے چلنے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: يُقِيْمُوْنَ کا معنی یدیمون ہے۔ واقامہ یعنی اس نے اسے ہمیشہ قائم کیا۔ اسی معنی کی طرف حضرت عمر نے اشارہ فرمایا: من حفظها و حافظ علیها حفظ دینهٗ و من ضیعها فهولما سواها اضیع۔ (جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر دوام اختیار کیا تو اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ نماز کے علاوہ احکام کو زیادہ ضائع کرنے والا ہو گا)۔

1۔ صحیح بخاری، باب سوال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 27، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 5: اقامۃ الصلاۃ معروف ہے اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے کیونکہ جو اس کے سنن وغیرہ کو ترک کر دیتا ہے اس پر اعادہ نہیں ہے اور اوزاعی، عطا، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک اقامۃ الصلوٰۃ واجب ہے اور جو اقامت کو ترک کرے گا اس پر اعادہ واجب ہوگا، اہل ظواہر کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ابن عربی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اعرابی والی حدیث میں ہے "اَقِمْ" (یعنی نماز قائم کرد) یہاں اقامت کا حکم دیا ہے جس طرح تکبیر، استقبال قبلہ اور وضو کا حکم دیا ہے۔

فرمایا: اب تم حدیث پر آگاہ ہو چکے ہو تو امام مالک کی اس روایت کے مطابق قول کرنا واجب ہے وہ یہ کہ اقامت فرض ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کی کی تحریم تکبیر ہے (1)" دلیل ہے کہ جس نے تکبیر تحریمہ نہیں کی وہ نماز میں داخل نہیں ہوا۔ پس جو کچھ احرام سے پہلے تھا اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ جس چیز پر علماء کا اجماع ہو تو اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم کیا جائے گا جیسے طہارت، قبلہ، وقت اور دوسری اس قسم کی چیزیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر اقامت کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے اور یہ اقامت کے وجوب کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کا سہواً اور عمداً ترک کرنے کا حکم برابر ہوتا۔ یہ اعادہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس نے سنن کو ہلکا سمجھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6: علماء نے اس شخص کے بارے اختلاف کیا ہے جو نماز کی اقامت سنے تو کیا وہ جلدی چلے یا نہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ جلدی نہ چلے اگرچہ اسے رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ تم اس حال میں چلتے ہوئے آؤ کہ تم پر وقار ہو پھر جو نماز جماعت کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے وہ مکمل کر لو (2)"۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم میں سے کوئی نماز کی طرف دوڑ کر نہ آئے بلکہ چل کر آئے جبکہ اس پر سکینت اور وقار ہو، جو تو پائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لے اور جو وہ تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اس کو بعد میں پڑھ لے (3)" یہ (صراحۃ) نص ہے معنی کے اعتبار سے کہ جب وہ تیز چلے گا تو اس کا سانس اکھڑا ہوا ہوگا اور اس پر نماز میں داخل ہونا اس کی قراءت اور خشوع سب میں تشویش ہوگی۔ سابقین علماء کی ایک جماعت جن میں حضرات ابن عمر اور ابن مسعود بھی ہیں، مذکور نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ تیز چلے۔ اسحاق نے کہا: جب رکعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیز چلے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ فرمایا: اس شخص کے لئے کوئی حرج نہیں جو گھوڑے پر سوار ہو تو اسے نماز کے لئے تیز چلائے۔ بعض نے پیدل چلنے والے اور سوار کے درمیان فرق کیا ہے کیونکہ سوار کا سانس اس طرح اکھڑا ہوا نہیں ہوگا جس طرح پیدل چلنے والے کا ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 9، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث نمبر 56، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 124، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب المشی الی الجمعۃ، حدیث نمبر 857، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی النداء للصلوٰۃ، صفحہ 53، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہر حال میں اولیٰ ہے۔ پس وہ وقار اور سکون کے ساتھ چلے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کیونکہ وہ نماز میں ہے اور یہ محال ہے کہ آپ ﷺ کی خبر اس کے خلاف ہو جو آپ ﷺ نے خبر دی ہو۔ پس جس طرح نماز میں داخل ہونے والے پر سکینت اور وقار لازم ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے والے پر ہے تا کہ اسے اس کے ساتھ مشابہت حاصل ہو اور اس کی صحت پر دلیل وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور وہ حدیث ہے جو دارمی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو وضو کرے اور مسجد کی طرف جانے کا ارادہ کرے تو اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں مت ڈال کیونکہ تو نماز میں ہے (1)''۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ صحیح ہے کہ یہ عمل جلدی چلنے سے کم ہے نماز کی طرف جانے والے کو نماز پڑھنے والے کی طرح بنایا ہے۔ یہ تمام سنن اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الجمعہ:9) کا معنی واضح کرتی ہیں۔ اس سے مراد تیز چلنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جمعہ کی تیاری کرنا ہے۔ امام مالک نے اسی طرح کی تفسیر فرمائی ہے۔

مسئلہ نمبر 7: نبی کریم ﷺ کے ارشاد و ما فاتکم فاتموا (2) (جو نماز امام کے پیچھے رہ جائے اسے مکمل کرلو) اور واقض ما سبقك (3) (جو امام تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اسے ادا کرلو) کی تعبیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ دونوں ہم معنی ہیں یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں ہم معنی ہیں، کبھی قضاء کا لفظ بولا جاتا ہے اور مراد تمام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ:10) (جب تم مکمل کرلو) اور فرمایا: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ:200) (جب تم اپنے مناسک حج مکمل کرلو) اور بعض علماء نے فرمایا: ان دونوں جملوں کا معنی مختلف ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ اختلاف مرتب ہوتا ہے کہ جو شخص نماز میں شریک ہوتا ہے یہ اس کی نماز کا اول ہے یا اس کی نماز کا آخر ہے، پہلے قول کی طرف مالکیوں کی رائے گئی ہے ان میں ابن قاسم بھی ہے لیکن فوت شدہ نماز کو الحمد اور سورت کے ساتھ قضا کرے۔ پس وہ افعال میں بنا کرنے والا ہوگا اور اقوال میں قضا کرنے والا ہوگا۔

ابن عبد البر نے کہا: یہ مشہور مذہب ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: وہ قول جس پر ہمارے اصحاب کا نظریہ قائم ہے وہ یہی ہے اور یہی قول اوزاعی، شافعی، محمد بن حسن، احمد بن حنبل، طبری اور داؤد بن علی کا ہے۔ اشہب نے روایت کیا ہے، یہ وہی قول ہے جو ابن عبد الحکم نے مالک سے روایت کیا ہے۔ عیسیٰ نے ابن قاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جو اس نے امام کے ساتھ نماز پائی وہ اس کی آخری نماز ہے اور وہ افعال و اقوال میں قضا کرنے والا ہے۔ یہی کوفہ کے علماء کا قول ہے۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: جن علماء نے امام کے ساتھ پائی جانے والی نماز کو پہلی نماز قرار دیا میرا خیال ہے انہوں نے احرام (تکبیر تحریمہ) کی رعایت کی کیونکہ احرام (تکبیر تحریمہ) نماز کے آغاز میں ہوتی ہے اور تشہد اور سلام نماز کے آخر میں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا: جو اس نے امام کے ساتھ

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 51، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی کراھیۃ التشبیك بین الاصابع فی الصلوٰۃ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار و سکینۃ والنھی عن اتیانھا سعیا، صفحہ 220، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

نماز پائی وہ اس کی پہلی نماز ہے، اس کے ساتھ ساتھ سنت میں فاتموا کا ارشاد وارد ہے اور تمام آخر ہوتا ہے۔
دوسرے علماء نے فاقضوا کے ارشاد سے حجت پکڑی ہے، وہ جو قضا کرتا ہے وہ پہلی نماز کو فوت کرنے والا ہے، مگر فاتموا کی روایت زیادہ راویوں سے مروی ہے اور اس شخص کے قول پر یہ درست نہیں جس نے کہا: جو امام کے ساتھ نماز پائی وہ پہلی نماز ہے اور یہ عام ہے مگر عبدالعزیز بن ابی سلمہ، الماجشون، المزنی، اسحاق اور داؤد نے کہا: اگر امام کے ساتھ نماز پائے تو الحمد اور سورت پڑھے اور جب بقیہ نماز کو قضا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو صرف الحمد پڑھے۔ یہ ان کی اصل قول اور فعل پر عام ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اقامت نفلی نماز کے شروع کرنے سے مانع ہے۔ رسول الله ﷺ نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں (1)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے مگر جب کوئی پہلے نوافل شروع کر چکا ہو تو وہ انہیں نہ توڑے کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) خصوصاً جبکہ ایک رکعت پڑھ چکا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: نوافل کو توڑ دے کیونکہ حدیث کا حکم عام ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو مسجد میں داخل ہوا اور اس نے فجر کی دو سنتیں نہ پڑھی ہوں۔ پھر نماز کھڑی ہو جائے۔
امام مالک نے فرمایا: امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر مسجد میں داخل نہ ہوا ہو اور اسے ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ مسجد کے باہر سنتیں ادا کرے مسجد کے احاطہ میں سنتیں ادا نہ کرے۔ جہاں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ جو مسجد سے متصل ہے۔ اگر اسے پہلی رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔ اور پھر یہ سنتیں اگر پڑھنا پسند کرے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ میرے نزدیک سورج طلوع ہونے کے بعد ان کا ادا کرنا ان کے ترک سے افضل ہے۔
امام ابو حنیفہ اور ان کے مقلدین کہتے ہیں: اگر نمازی کو فرضوں کی دونوں رکعتوں کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے امام کو نہ پا سکے تو امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائے۔ اگر اسے ایک رکعت فرض پانے کی امید ہو تو فجر کی سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔ یہی قول امام اوزاعی کا بھی ہے مگر وہ کہتے ہیں: جب تک دوسری رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو مسجد میں سنتیں ادا کرنا جائز ہے۔ ثوری نے کہا: اگر ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو سنتیں پڑھ لے اگرچہ مسجد میں داخل بھی ہو۔ حسن بن حی نے کہا: جنہیں ابن حیان کہا جاتا ہے جب مقیم اقامت سن لے تو پھر فجر کی سنتوں کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو مسجد میں داخل ہوا اور جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے، نہ مسجد سے باہر اور نہ مسجد کے اندر۔ اسی طرح طبری نے کہا ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے بھی یہی حکایت ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "جب نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا باب کراھیۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع الموذن فی اقامۃ الخ، صفحہ 247، جلد 1

کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز جائز نہیں (1)'' اور فجر کی دو رکعتیں سنت ہیں یا فضیلت ہیں یا رغبت ہیں اور جھگڑے کے وقت حجت، سنت ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے قول کی حجت وہ روایت ہے جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر آئے جبکہ امام صبح کی نماز پڑھا رہا تھا۔ پس حضرت ابن عمر نے حضرت حفصہ کے حجرہ میں دو سنتیں ادا فرمائیں پھر امام کے ساتھ فرض نماز پڑھی اور ثوری اور اوزاعی کی حجت میں سے وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے مسجد کے اندر ایک ستون کے پاس فجر کی دو رکعتیں ادا فرمائیں پھر نماز میں شریک ہوئے جبکہ حضرات حذیفہ اور ابو موسیٰ بھی وہاں موجود تھے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جب فرضی نماز کو چھوڑ کر مسجد سے باہر نوافل میں مشغول ہونا جائز ہے تو مسجد کے اندر بھی مشغول ہونا جائز ہے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن مالک بن بُحینہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جبکہ مؤذن تکبیر کہہ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو صبح کی چار رکعتیں پڑھتا ہے (2) اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس شخص پر انکار تھا جو فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ رہا تھا جبکہ امام فرض پڑھا رہا تھا۔ اس سے یہ استدلال کرنا بھی ممکن ہے کہ فجر کی دو سنتیں اس حال میں ادا کی جائیں تو صحیح ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز ختم نہیں کرائی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قادر تھے۔

مسئلہ نمبر 10: صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور صَلّی یُصَلّی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دعا کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطراً فلیطعم وان کان صائماً فلیصل (3) (جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اس کی دعوت قبول کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو کھانا کھائے اور اگر روزے سے ہو تو دعا کرے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں فلیصلّ سے مراد بھی معروف نماز ہے۔ پس وہ دعوت دینے والے کے گھر دو رکعتیں پڑھے اور واپس آ جائے لیکن پہلا معنی (دعا کرنا) مشہور ہے اور اکثر علماء کا یہی نظریہ ہے۔ جب حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جنم دیا تو حضرت اسماء نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا۔ حضرت اسماء نے فرمایا: ثم مسحه و صلیٰ علیه (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَصَلِّ عَلَيْهِمْ** (توبہ: 103) یعنی ان کیلئے دعا کیجئے۔ اعشیٰ نے کہا:

تقول بنتی و قد قربت مرتحلاً		یا رب جنب ابی الاوصاب والوجعا
علیك مثل الذی صلیت فاغتمضی		نوماً فان لجنب المرء مضطجعا

ان اشعار میں صلاۃ کا لفظ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور اعشیٰ نے کہا:

وقابلها الریح فی دنها		و صلی علی دنها و ارتسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، باب کراھیۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع المؤذن فی اقامۃ الخ، صفحہ 247، جلد 1

ایضاً، بخاری، ابواب صلاۃ الجماعۃ والامامۃ، باب اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ، حدیث نمبر 623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً		3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابۃ الداعی الی دعوۃ، صفحہ 462، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں بھی صلاۃ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ارتسم الرجل کا معنی ہے، اس نے تکبیر کہی اور دعا کی۔ صحاح میں اس کا یہی معنی درج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الصلا سے مشتق ہے اس سے مراد وہ رگ ہے جو پیٹھ کے وسط میں ہوتی ہے اور اس کے آخری حصہ میں جدا ہو جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے۔ اسی سے ہے: اخذ المصلی فی سبق الخیل، مصلی گھوڑ دوڑ میں شروع ہوا کیونکہ وہ دوڑ میں شریک ہوتا ہے اور اس کا سر سبقت لے جانے والے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ پس الصلاۃ اس سے مشتق ہے یا اس لئے کہ نماز کا ایمان کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ پس نماز کو گھوڑے سے تشبیہ دی گئی یا اس لئے کہ رکوع کرنے والا اپنے پچھلے حصہ کو دوہرا کرتا ہے۔ الصلا، گھوڑے کی دم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کا تثنیہ صلوان ہے۔ المصلی، دوسرے نمبر پر آنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا سر اگلے گھوڑے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نمبر پر تھے دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت عمر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لزوم سے ماخوذ ہے۔ اسی سے ہے: صَلِیَ بالنار جب وہ آگ کو لازم ہو جائے۔ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ (غاشیہ)

حارث بن عباد نے کہا:

لم اکن من جناتها علم اللّٰہ   له و انی بحرها الیوم صال

اس شعر میں صال، کا مطلب ہے کہ اس کی گرمی کو لازم پکڑنے والا ہے۔

گویا اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس حد پر عبادت کو لازم پکڑنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صلیت العود بالنار سے ماخوذ ہے جب تو لکڑی کو سیدھا کرے اور آگ پر گرم کر کے اسے نرم کرے۔ الصلاء، صلاء النار صاد کے کسرہ کے ساتھ ممدود ہے اگر تو صاد کو فتحہ دے گا تو مقصور ہو گا گویا نمازی اپنے نفس کو عبادت میں لگا کر اسے سیدھا کرتا ہے اور نرم کرتا ہے۔ الخارزنجی نے کہا:

فلا تعجل بامرك واستدمه   فما صلى عصاك كمستديم

اس میں صلی سیدھا کرنے کے معنی میں ہے۔

الصَّلٰوة کا معنی دعا ہے اور الصَّلٰوة کا معنی رحمت بھی ہے۔ اسی سے ہے: اللھم صل علی محمد (1) (اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیج) اور الصَّلٰوة کا معنی عبادت بھی ہے۔ اسی سے ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ (الانفال:35) (یعنی ان کی عبادت بیت اللہ کے پاس نہ تھی) الصَّلٰوة کا معنی نفلی نماز بھی ہے۔ اسی معنی میں ہے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (طٰہٰ:132) (اپنے گھر والوں کو نفلی نماز کا حکم دو)۔ صلاۃ کا معنی تسبیح بھی ہے، اسی سے ہے: فَلَوْلَآ أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ (صافات) اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا، اسی سے سبحة الضحیٰ ہے، چاشت کی نماز۔ بعض علماء نے نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (بقرہ:30) کی تاویل میں فرمایا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ الصَّلٰوة کا معنی قراءت بھی ہے۔ اس معنی میں ہے: وَلَا تَجْهَرْ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 940، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدعوات، باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث 5880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِصَلَاتِكَ (الاسراء:110) (اپنی قراءت کو بلند نہ کرو)۔

الصَّلٰوۃَ کا لفظ مشترک ہے۔ الصَّلٰوۃَ اس مکان کو بھی کہتے ہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: علم ہے جو عبادت کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ کو بھی شریعت سے خالی نہیں چھوڑا اور کوئی شرع نماز سے خالی نہیں تھی۔ یہ مفہوم ابو نصر القشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول پر اس کا کوئی اشتقاق نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: علماء اصول کا اختلاف ہے کہ کیا یہ اپنے اصلی وضعی ابتدائی لغوی معنی پر باقی ہے۔ اسی طرح ایمان، زکوٰۃ، صیام اور حج (اپنی اصلی معنی پر باقی ہیں) شرع نے مشروط داحکام کے ساتھ اس میں تصرف فرمایا۔ یا شرع کی طرف سے یہ زیادتی اسے شرع سے پہلے کی وضع ابتدائی کی طرح موضوعہ کر دیتی ہے یہاں بھی اختلاف ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت، عربی زبان میں ثابت ہے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا لیکن عربوں کے لئے اسماء میں فیصلہ کا اختیار ہے جیسے دابۃ پر ہر اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جو زمین پر رینگ کر چلے پھر عرف نے اسے چوپائیوں کے لئے خاص کر دیا اسی طرح شرع کے عرف کے لئے اسماء میں انہیں اختیار ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 12: اس آیت میں الصَّلٰوۃَ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرائض مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا: فرائض ونوافل سب مراد ہیں، یہی صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور متقی فرائض ونوافل دونوں ادا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: نماز رزق کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (طٰہٰ:132) (اپنے اہل کو نماز کا حکم دو) جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ طہ میں آئے گا اور نماز پیٹ وغیرہ کی تکلیف کے لئے شفا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ظہر کی نماز جلدی پڑھی میں نے بھی جلدی کی، نماز پڑھی اور میں بیٹھ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اشکمت درد ہ (کیا تیرے پیٹ میں درد ہے؟) میں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ نماز میں شفا ہے(1)''۔ ایک روایت میں ہے، اشکمت درد (یعنی تیرے پیٹ میں درد ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف پناہ لیتے (2)۔

مسئلہ نمبر 14: نماز صحیح نہیں ہوتی مگر چند شرائط اور فرائض کے ساتھ۔ نماز کی شرائط میں ایک شرط، طہارت ہے جس کے احکام کا بیان سورۂ نساء اور مائدہ میں آئے گا، دوسری شرط شرمگاہ کا ڈھانپنا ہے، اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا اور نماز کے فرائض یہ ہیں۔ قبلہ کی طرف منہ کرنا، نیت کرنا، تکبیر تحریمہ، اس کے لئے قیام کرنا، الحمد کی قراءت کرنا، قراءت کے لئے قیام کرنا، رکوع کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، رکوع سے سر اٹھانا اور اس میں اعتدال کرنا، سجدہ کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، سجدہ سے سر اٹھانا، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور اس جلوس (بیٹھنے) میں طمانیت کا ہونا، دوسرا سجدہ کرنا اس میں

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب الصلوٰۃ شفاء، حدیث نمبر 3448، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب قیام اللیل، باب وقت قیام النبی من اللیل، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طمانیت کا ہونا۔ ان تمام فرائض کی اصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اس شخص کے بارے میں ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز سکھائی تھی جب اس نے نماز صحیح ادا نہیں فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کا تو ارادہ کرے تو مکمل وضو کر، پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر قرآن پڑھ جو تجھے میسر ہو، پھر رکوع کر حتیٰ کہ رکوع کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر رکوع سے سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ سجدہ کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جا، پھر پوری نماز اسی اطمینان کے ساتھ ادا کر (1)''۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس کی مثل حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے جسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء (مالکی علماء) نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے ارکان کو بیان فرمایا اور اقامت اور رفع یدین سے، قراءت کی حد سے انتقالات کی تکبیر سے، رکوع و سجود کی تسبیح سے، درمیانی جلسہ سے، تشہد سے، جلسہ اخیرہ سے اور سلام سے سکوت فرمایا۔ اقامت اور سورۂ فاتحہ کی تعیین پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ رفع یدین ہمارے علماء اور عام فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے، اس کی وجہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے۔ داؤد اور بعض ان کے ساتھیوں نے کہا: رفع یدین تکبیر تحریمہ کے وقت واجب ہے۔ داؤد کے بعض ساتھیوں نے کہا: تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین واجب ہے اور جس نے ہاتھ نہ اٹھائے اس کی نماز باطل ہے۔ یہ حمیدی کا قول ہے اور اوزاعی سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ان علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: صلوا کما رائیتمونی اصلی (2) (تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا)۔

اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہم پر واجب ہے کہ ہم اس طرح کریں جس طرح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کرتے دیکھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو پہچاننے والے ہیں اور حدیث مذکور کی وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں مسنون ہیں۔ ابن قاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں: جس نے نماز میں تین یا اس سے زائد تکبیریں چھوڑ دیں تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ اگر اس نے سجدہ سہو نہ کیا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اگر ایک تکبیر بھول گیا یا دو تکبیریں بھول گیا تو بھی سجدہ سہو کرے لیکن اگر اس صورت میں سجدہ نہ کیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی۔ ابن قاسم سے مروی ہے کہ ایک تکبیر بھول جائے تو بھولنے والے پر کچھ واجب نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ زیادہ تکبیریں اور کل تکبیریں ان کے نزدیک فرض ہیں، لیکن تھوڑی تکبیریں اگر رہ جائیں تو معاف ہیں۔ اصبغ بن فرج اور عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا: اگر کوئی شخص ابتدا سے لے کر انتہا تک تکبیریں نہ کہے جبکہ اس نے تکبیر تحریمہ کہی ہو تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اور اگر تکبیر تحریمہ بھول جائے تو سجدہ سہو کرے۔ اگر سجدہ نہ کرے گا تو بھی کچھ واجب نہ ہو گا۔ پس کسی کے لئے جان بوجھ کر تکبیر کو ترک کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اگر اس کو کوئی چھوڑ دے گا تو وہ برا کرے گا اور اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی اور اس کی نماز ہو جائے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ من کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن الفاتحۃ الخ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: صحیح قول شافعی علماء، کوفی فقہاء اور اہل حدیث کی جماعت اور مالکیوں کا ہے نہ کہ ان علماء کا جو ابن قاسم کے قول کے پیروکار ہیں۔ امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے باب اتمام التکبیر فی الرکوع والسجود اور اس میں حضرت مطرف بن عبداللہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے اور حضرت عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب کے پیچھے نماز پڑھی۔ حضرت علی جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے، جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے، جب نماز کو حضرت علی نے مکمل فرمایا تو حضرت عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اس شخص نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یاد دلا دی ہے یا فرمایا: اس نے ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھائی۔ حضرت عکرمہ کی حدیث ہے، فرمایا: میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس دیکھا جو نیچے جاتے ہوئے اور اوپر اٹھتے ہوئے تکبیر کہتا تھا اور جب کھڑا ہوتا اور بیٹھتا تو تکبیر کہتا۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ بتایا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: کیا یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہیں ہے (1) (تیری ماں نہ ہو)۔ امام بخاری نے تیری رہنمائی فرمائی کہ تکبیر ان کے نزدیک معمول بہ نہیں تھی۔

ابو اسحاق السبیعی نے یزید بن ابی مریم سے انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے جنگ جمل کے دن نماز پڑھائی جس کے ساتھ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یاد دلا دی۔ آپ رضی اللہ عنہ نیچے جاتے ہوئے، اوپر اٹھتے ہوئے، قیام کرتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے تکبیر کہتے تھے (2)۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم نے یا تو ان تکبیروں کو بھول کر ترک کر دیا یا جان بوجھ کر ترک کر دیا۔ میں کہتا ہوں: کیا تو انہیں دیکھتا ہے کہ انہوں نے نماز کا اعادہ کیا۔ پس کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جس نے تکبیر کو ترک کیا اس کی نماز باطل ہے اگر یہ ایسا ہوتا تو سنت اور فرض کے درمیان فرق نہ ہوتا۔ جب کوئی چیز انفراداً واجب نہ ہو تو وہ جمعاً بھی واجب نہیں ہوتی۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 15: رکوع و سجود میں تسبیح جمہور علماء کے نزدیک مذکور حدیث کی وجہ سے واجب نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے تسبیحات کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جس نے تسبیحات کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''رکوع میں رب کی تعظیم بیان کرو اور سجدہ میں دعا میں اجتہاد کرو، یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کی جائے'' (3)۔

مسئلہ نمبر 16: جلوس اور تشہد، اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے فرمایا: پہلا جلوس (قعدہ) اور اس میں تشہد سنت ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے پہلے قعدہ کو واجب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: یہ تمام فرائض سے مخصوص ہے کہ سجدہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے جیسے بیع مزابنہ (☆) میں سے عرایا (☆☆) کی بیع جائز ہے اور اجارات میں سے قراض جائز ہے، اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد اس شخص کا وقوف جائز ہے جو امام کو رکوع کی حالت میں پائے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر یہ سنت ہوتا تو جان بوجھ کر اسے ترک کرنے والے کی نماز باطل نہ ہوتی جس طرح نماز کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب اتمام التکبیر فی السجود، حدیث 745، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح ابن ماجہ، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ وسنت، باب التسلیم، حدیث 906، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، صفحہ 191، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

☆ اندازہ سے بیع کرنا جیسے درخت پر موجود پھل کی اتارے ہوئے پھل سے بیع کرنا۔　☆☆ ہبہ کے طور پر کھجور کا پھل درخت پر ہی دے دینا۔

دوسری سنن ترک کرنے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی اور جو علماء اسے واجب نہیں کہتے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر یہ نماز کے فرائض میں سے ہوتا تو بھولنے والا اس کی طرف واپس آ جاتا حتیٰ کہ اسے ادا کرتا جیسا کہ اگر کوئی سجدہ ترک کر دے یا رکوع ترک کر دے تو وہ واپس آ جاتا ہے۔ اس میں وہ اسی طرح تواتر اور رتبہ کی رعایت کرتا جس طرح رکوع و سجود میں کرتا ہے پھر وہ سجدہ سہو کرتا جس طرح رکوع یا سجدہ ترک کرنے والا کرتا ہے اور پھر انہیں ادا کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن بحینہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہو گئے اور تشہد پڑھنا بھول گئے۔ لوگوں نے تسبیح کہی تا کہ آپ بیٹھ جائیں، آپ سیدھے کھڑے ہو گئے اور پیچھے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام سے پہلے دو سجدے سہو کے لئے کیے (1)۔ اگر بیٹھنا فرض ہوتا تو نسیان اور سہواً سے ساقط نہ کرتے کیونکہ نماز میں فرائض کا حکم یہ ہوتا ہے۔ سہواً اور عمداً ان کا ترک برابر ہوتا ہے سوائے مقتدی کے۔ نماز کے آخری جلوس کے حکم میں بھی اختلاف ہے اور اس سے جو غرض ہے اس میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 17: اس کے بارے علماء کے پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: بیٹھنا فرض ہے اور اس میں تشہد پڑھنا بھی فرض ہے اور سلام بھی فرض ہے۔ جن علماء نے یہ کہا ان میں امام شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت میں) ابو مصعب نے اپنی مختصر میں امام مالک اور اہل مدینہ سے یہی حکایت کیا ہے اور داؤد نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے پہلا تشہد ترک کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ترک کیا اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے اور ان کے ترک کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو ہے۔ جب کوئی بھول کر یا جان بوجھ کر تشہد ترک کر دے تو نماز کا اعادہ کرے اور ان علماء نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نماز میں فرض ہے کیونکہ اس کے فرض کی اصل مجمل ہے۔ جو بیان کا محتاج ہے مگر یہ کہ جو دلیل سے خارج ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا'' (2)۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ آخری قعدہ، تشہد اور سلام واجب نہیں ہیں۔ یہ تمام سنت ہیں یہ بعض بصریوں کا قول ہے اور ابراہیم بن علیہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے آخری قعدہ کو پہلے قعدہ پر قیاس کرنے کی تصریح کی ہے۔ جمہور علماء کی اس نے مخالفت کی ہے اور ان سے جدا نظریہ قائم کیا ہے مگر وہ اس شخص پر نماز کا اعادہ لازم سمجھتے ہیں جو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ترک کر دے۔ ان کی حجت میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام اپنی نماز کے آخری سجدہ سے سر اٹھائے پھر اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی۔ یہ حدیث ابو عمرو۔ کے قول پر صحیح نہیں ہے ہم نے اسے ''کتاب المقتبس'' میں بیان کیا ہے اور یہ لفظ سلام کو ساقط کرتے ہیں جلوس (بیٹھنے) کو ساقط نہیں کرتے۔

تیسرا قول: تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے اور تشہد اور سلام بطور فرض واجب نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 85، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیھا، باب ما جاء فی الخ، حدیث 1195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کوفیوں کی جماعت کا قول ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے افریقی عبدالرحمٰن بن زیاد سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز کے آخر میں بیٹھے پھر سلام سے پہلے اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی (☆)۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ فخر الاسلام درس میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

ویری الخروج من الصلوٰۃ بضرطۃ　　این الضراط من السلام علیکم

وہ گوز کے ساتھ نماز سے نکلنا صحیح خیال کرتے ہیں، گوز، السلام علیکم کی جگہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے اس مسئلہ کی وجہ سے دو ضعیف فرعی مسئلے نکالے ہیں۔ ایک وہ جو عبدالملک نے عبدالملک سے روایت کیا ہے کہ جس نے دل لگی کرتے ہوئے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اس نے اگر چار رکعتوں کی نیت کی تھی تو یہ اس کی دو رکعتیں جائز ہو جائیں گی یہ اہل عراق کا مذہب ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ غیر مقبول کتب میں ہے کہ امام تشہد کے بعد سلام سے پہلے جب جان بوجھ کر حدث لاحق کرے تو اس کے مقتدیوں کی نماز جائز ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس کی طرف فتویٰ میں توجہ نہیں دی جاتی اگرچہ اس کے ساتھ یاد کے لئے مجالس آباد ہوں۔

چوتھا قول: جلوس اور سلام فرض ہے اور تشہد واجب نہیں، یہ حضرت مالک بن انس، آپ کے اصحاب اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے: اور انہوں نے یہ کہہ کر استدلال کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ اور اُم القرآن (سورۂ فاتحہ) کے علاوہ ذکر میں سے کوئی چیز واجب نہیں۔

پانچواں قول: یہ ہے کہ تشہد اور جلوس دونوں واجب ہیں اور سلام واجب نہیں ہے۔ یہ ایک جماعت کا قول ہے جس میں اسحاق بن راہویہ بھی ہے۔ اسحاق نے حضرت ابن مسعود کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جب رسول اللہ ﷺ نے اسے تشہد کی تعلیم دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی اور جو تجھ پر لازم تھا وہ تو نے ادا کر دیا'' (1)۔

دارقطنی نے کہا: ''آپ ﷺ کا یہ ارشاد جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی'' (2)۔ بعض راویوں نے اس جملہ کو زہیر کی طرف سے حدیث میں داخل کیا ہے اور اس نے نبی کے کلام کے ساتھ اس کو ملا دیا ہے اور شبابۃ نے زہیر سے روایت کر کے علیحدہ ذکر کیا ہے اور اس جملہ کو حضرت ابن مسعود کے کلام سے شمار کیا ہے یہ قول زیادہ درست ہے بنسبت اس کے قول کے جس نے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ شبابۃ ثقہ شخص ہے۔ غسان بن ربیع نے اس پر ان کی

1۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ احناف کے نزدیک صورتحال یہ نہیں۔ اگر اسے اس حالت میں حدث لاحق ہو جائے تو وہ وضو کرے گا اور بنا کرتے ہوئے سلام پھیرے گا تب نماز مکمل ہوگی جس طرح ہدایہ شریف میں اس کی تصریح ہے اور اگر وہ اس حالت میں جان بوجھ کر حدث لاحق کرے گا تو صورتحال مختلف ہوگی۔ مترجم

متابعت کی ہے حدیث کے آخر کو اس نے بھی حضرت ابن مسعود کا کلام بتایا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے مرفوع روایت نہیں کی۔

مسئلہ نمبر18: سلام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ واجب ہے، بعض نے فرمایا: واجب نہیں ہے لیکن حضرت عائشہ اور حضرت علی کی صحیح حدیث کی وجہ سے اس کے وجوب کا قول صحیح ہے۔ حضرت علی کی حدیث ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے سفیان ثوری نے حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل سے انہوں نے حضرت محمد بن حنفیہ سے انہوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے'' (1)۔ یہ حدیث تکبیر اور سلام کے وجوب میں اصل ہے کوئی دوسری چیز ان کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ستر اسماء کے ساتھ نماز کو شروع کرے اور تکبیر تحریمہ نہ کہے تو یہ جائز نہ ہوگا اور اگر سلام سے پہلے حدث لاحق ہوگیا تو بھی جائز نہ ہوگا۔ یہ عبدالرحمن بن مہدی کی طرف سے حضرت علی کی حدیث کی تصحیح ہے اور عبدالرحمن بن مہدی علم حدیث میں اور صحیح و سقیم کی پہچان میں امام ہیں۔ تیرے لئے یہی کافی ہے۔

علماء نے آغاز کے وقت تکبیر کے وجوب میں اختلاف کیا ہے:

مسئلہ نمبر19: ابن شہاب زہری، سعید بن مسیب، اوزاعی، عبدالرحمن اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب نہیں ہے۔ امام مالک سے مقتدی کے بارے میں ایک روایت ہے جو اس قول پر دلیل ہے لیکن امام مالک کا مذہب صحیح یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب ہے۔ یہ فرض ہے اور نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور یہی صواب ہے اور یہی جمہور کا نظریہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اس قول کی مخالفت کی اس کا مقابلہ سنت سے کیا گیا۔

مسئلہ نمبر20: علماء کا اختلاف ہے اس لفظ کے بارے میں جس کے ساتھ نمازی نماز میں داخل ہو۔ امام مالک ان کے متبعین اور جمہور علماء نے کہا: تکبیر کے بغیر نماز میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تکبیر کی جگہ تحلیل، تسبیح، تعظیم اور تحمید جائز نہیں۔ یہ حجازیوں اور اکثر عراقیوں کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ کوئی کلمہ جائز نہیں۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے اور انہوں نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اللہ الاکبر اور اللہ الکبیر بھی جائز ہے۔

امام مالک کی حجت حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی قرأت کے ساتھ شروع فرماتے تھے'' (2)۔ حدیث علی میں ہے نماز کی تحریم تکبیر ہے۔ اعرابی کی حدیث میں ہے: فکبر (3) (تکبیر کہہ)۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور علی بن محمد طنافسی نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں ابواسامہ نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے عبدالحمید بن جعفر نے بتایا فرمایا: ہمیں محمد بن عمرو بن عطاء نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت ابوحمید ساعدی کو یہ فرماتے ہوئے سنا، رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف رخ کرتے اور اپنے ہاتھوں

1۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 40، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ ومایفتتح بہ ویختتم بہ وصفۃ الرکوع والاعتدال الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 3، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کو بلند کرتے اور اللہ اکبر کہتے (1)۔ یہ صریح نص ہے صحیح حدیث ہے جو لفظ تکبیر کی تعیین کر رہی ہے۔ شاعر نے کہا:

رأیت اللہ اکبر کل شیء　محاولۃً و اعظمہ جنوداً

میں نے دیکھا اللہ تعالیٰ از روئے تدبیر ہر چیز سے بڑا ہے اور از روئے لشکر عظیم ہے۔

پھر یہ قدم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے جبکہ کبیر اور عظیم اس کو اپنے ضمن میں نہیں لیتے۔ پس یہ معنی میں زیادہ بلیغ ہو گا۔ واللہ اعلم

امام ابو حنیفہ نے کہا: اگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے نماز کو شروع کرے تب بھی جائز ہے اور اگر اللھم اغفرلی کہا تو جائز نہ ہو گا محمد بن حسن کا بھی یہی قول ہے۔ ابو یوسف نے فرمایا: جب تکبیر اچھی طرح کہہ سکتا ہو تو اور کلمات جائز نہیں۔ حکم بن عتیبۃ نے فرمایا: جب تکبیر کی جگہ اللہ کا ذکر کر دے تو جائز ہو گا۔ ابن منذر نے کہا: میں اس بات میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ جو قرأت اچھی طرح کر سکتا ہو وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور تکبیر کہہ دے اور قراءت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے۔ پس جس کا یہ مذہب ہے اس کو یہ کہنا لازم ہے کہ تکبیر کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہ ہو جیسا کہ قراءت کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا: فارسی میں تکبیر جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو۔ ابن المنذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جماعات سے اختلاف ہے اور اس کا خلاف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سکھایا۔ ہم کوئی ایسا شخص نہیں جانتے جس نے امام ابو حنیفہ کی اس قول میں موافقت کی ہو۔

مسئلہ نمبر 21: امت کا تکبیر تحریمہ کے وقت نیت کے وجوب پر اتفاق ہے۔ جو ہمارے اصحاب نے روایت کیا ہے اس پر مزید کلام آیت طہارت میں آئے گا۔ اس کی حقیقت آمر کے تقرب کا قصد کرنا ہے ایسے فعل کے ساتھ جس کا اس نے حکم دیا ہے جیسا کہ اس نے وہ فعل طلب کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: نیت میں اصل یہ ہے کہ اس کا عقد، اس فعل کے کرنے کے ساتھ ہو جس کی نیت کی گئی ہے یا استصحاب کی شرط کے ساتھ اس فعل سے قبل نیت ہو۔ اگر پہلے نیت کی ہو پھر غفلت طاری ہو جائے حتیٰ کہ اس حالت میں عبادت میں تلبس واقع ہو تو اس نیت کا اعتبار نہ ہو گا جس طرح اس نیت کا اعتبار نہیں ہوتا جب فعل میں تلبس کے بعد واقع ہو۔ روزے میں نیت کے مقدم کرنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ اس کے آغاز میں نیت متصل کرنے میں حرج واقع ہوتی ہے۔

ابن عربی نے کہا ابو الحسن قروی نے ہمیں عسقلان کی سرحد پر کہا کہ میں نے امام الحرمین کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نماز پڑھتے وقت نیت کرے اور وہ صانع میں نظر کرے، عالم کے حدوث کو دیکھے نبوت کو دیکھے، حتیٰ کہ اس کی نظر نماز کی نیت تک پہنچ جائے۔ فرمایا: اس کے لئے اسے طویل زمانہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک لمحہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ جملوں کی تعلیم تو طویل زمانہ کی محتاج ہے اور ان چیزوں کو ذہن میں یاد کرنا ایک لمحہ میں ہوتا ہے۔ نیت کی تکمیل میں سے یہ ہے کہ نیت پوری نماز میں متصل ہو مگر جب یہ امر مشکل ہوا تو شریعت نے نماز کے درمیان میں نیت کے جدا ہونے کو معاف فرما دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 58، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیہا باب افتتاح الصلوۃ، حدیث 794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں نے اپنے شیخ ابوبکر الفہری (☆) کو مسجد اقصیٰ میں یہ فرماتے سنا کہ محمد بن سحنون (☆☆) نے فرمایا: میں نے اپنے باپ سحنون کو دیکھا بعض دفعہ جب وہ نماز مکمل کر لیتے تو دوبارہ پڑھتے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: نماز کے دوران میری نیت جدا ہو گئی تھی اسی وجہ سے میں نے نماز کا اعادہ کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ نماز کے اجمالی احکام تھے اور تفصیلی احکام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ رکوع، جماعت کے ساتھ نماز، قبلہ، اوقات کی طرف جلدی کرنا اور نماز خوف کا ذکر تو اسی سورت میں آجائے گا۔ قصر نماز اور خوف کی نماز سورۂ نساء اور اوقات کا ذکر سورۂ ہود، سبحان اور سورۂ روم میں آئے گا اور رات کی نماز (تہجد) کا ذکر سورۂ المزمل میں آئے گا اور سجدہ تلاوت کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا اور سجدہ شکر کا ذکر سورۂ ص میں آئے گا۔ ان شاء اللہ ہر ایک کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔

مسئلہ نمبر 22: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾

رَزَقْنٰهُمْ کا معنی ہے، ہم نے انہیں عطا کیا۔ اہل سنت کے نزدیک رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ معتزلہ کا مسلک اس کے مخالف ہے۔ ان کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے کیونکہ اس کا تملک صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ حرام عطا نہیں فرماتا بلکہ حلال عطا فرماتا ہے اور رزق ملک کے معنی میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ایک بچہ چوروں کے ساتھ پرورش پائے اور اس نے کچھ نہ کھایا مگر وہ جو چوروں نے اسے کھلایا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوا، طاقتور ہوا اور چور بن گیا پھر وہ ہمیشہ چوری کرتا رہا اور مرتے دم تک چوری کا مال کھاتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی چیز عطا نہ فرمائی کیونکہ اس کا اسے مالک نہیں بنایا تھا اور وہ مر گیا اور اس نے اللہ کے رزق سے کچھ نہ کھایا۔

یہ قول اور نظریہ فاسد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رزق بمعنی تملیک ہوتا تو واجب تھا کہ بچے کو رزق نہیں دیا گیا اور ان جانوروں کے بچوں کو بھی رزق نہیں ملا کیونکہ ان کی ماؤں کے دودھ کا مالک تو ان کا مالک تھا نہ کہ جانوروں کے بچے۔

جب امت کا اس پر اجماع ہے کہ بچہ اور جانوروں کے بچے اور دوسرے جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے حالانکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ رزق صرف غذا ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ غلاموں اور جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے جبکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا رزق وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جو معتزلہ نے بیان کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (فاطر: 3)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾ (الذاریات) (بلاشبہ اللہ ہی (سب کو) روزی دینے والا قوت والا (اور) زور والا ہے) اور فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)۔ یہ آیات قطعی ہیں، اللہ تعالیٰ حقیقۃً رازق ہے اور بندہ مجازاً رازق ہے کیونکہ اس کا مالک ہونا عارضی ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ فاتحہ میں بیان کیا ہے۔ بندے کو بھی حقیقۃً ان جانوروں کی طرح رزق

☆ محمد بن ولید اندلسی طرطوشی شیخ المالکیہ، وفات 520ھ ☆☆ عبدالسلام بن حبیب تنوخی حمص مالکی، قاضی قیروان صاحب المدونہ

دیا گیا ہے جن کو کوئی ملکیت حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسے کسی چیز کے حاصل کرنے کا اذن دے دیا گیا تو وہ حکماً اس کے لئے حلال ہوگی اور جس کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کا لینا حکماً حرام ہے اور یہ تمام رزق ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استنباط کیا ہے: **كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ** (سبا) (کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور)۔

فرمایا: مغفرت کا ذکر یہ اشارہ کرتا ہے کہ رزق کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ**، رزق مصدر ہے رزق یرزق رزقاً و رزقاً کا اور الرزق راء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور الراء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس کی جمع ارزاق ہے اور الرزاق کا مطلب ہے الرازقیہ اولی سفید کپڑوں کو کہتے ہیں۔ ارتزق الجند کا مطلب ہے دس بکریوں نے اپنا اپنا رزق حاصل کیا۔ الرزقۃ ایک مرتبہ لینا، اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: الرزق کا معنی ازدشنوہ لغت میں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں رزق کا معنی شکر ہے: **وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ** (واقعہ) یعنی تمہارا شکر جھٹلانا ہے۔ رزقنی کا معنی ہے: شکرنی اس نے میرا شکر ادا کیا۔

مسئلہ نمبر 24: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **يُنْفِقُوْنَ** اس کا معنی ہے: وہ نکالتے ہیں۔ انفاق کا معنی ہاتھ سے مال نکالنا ہے اسی سے ہے نفق البیع یعنی بیع بائع کے ہاتھ سے نکل کر خریدنے والے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نفقت الدابۃ یعنی جانوروں کی روح نکل گئی۔ اسی سے ہے: النافقاء اس چوہے کی بل کو کہتے ہیں جب وہ اپنی بل سے نکل جاتا ہے، جب بل کی دوسری طرف کو اختیار کرتا ہے اسی سے المنافق ہے کیونکہ وہ ایمان سے نکل جاتا ہے یا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ نیفق السراویل معروف ہے۔ شلوار کا وہ حصہ جہاں سے پاؤں نکالا جاتا ہے۔ نفق الزاد کا معنی ہے زادراہ ختم ہو گیا، مالک نے اسے خرچ کر دیا۔ انفق القوم قوم کا زادراہ ختم ہو گیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ** (الاسراء: 100) (سو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں)۔

مسئلہ نمبر 25: اس آیت میں نفقہ کی مراد کو متعین کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ فرضیہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ نماز کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انسان کا اپنے اہل پر خرچ کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا افضل صدقہ ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دینار وہ ہے جو تو نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے غلام آزاد کرنے میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے مسکین پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا، ان سب سے از روئے اجر کے عظیم وہ دینار ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا(1)''۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''افضل دینار وہ ہے جو آدمی اپنے عیال پر خرچ کرتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک واثم من ضیعھم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے اور وہ دینار جو الله کے راستہ میں (جہاد کے لئے) اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جو الله کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔ ابوقلابہ نے کہا: عیال سے آغاز فرمایا پھر ابوقلابہ نے کہا: کون سا شخص اس شخص سے زیادہ اجر والا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ انہیں بچاتا ہے یا الله تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ نفع دیتا ہے اور انہیں غنی کرتا ہے'' (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ضحاک سے مروی ہے کہ زکوٰۃ کا ذکر لفظ مخصوص زکوٰۃ کے ساتھ آتا ہے جب زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنے کا ذکر آئے تو فرضی اور نفلی دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور جب انفاق کے لفظ کے ساتھ آئے تو نفلی خرچ ہی مراد ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا: نفقہ ایک قرب تھا لوگ اس کے ساتھ الله تعالیٰ کا قرب اپنے اخلاص کے مطابق حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ فرضی صدقات اور ناسخات کا حکم سورۂ برأت میں نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ وہ واجبی حقوق ہیں جو مال کو لاحق ہوتے ہیں کیونکہ الله تعالیٰ نے جب اسے نماز کے ساتھ ملایا تو یہ فرض تھا جب لفظ زکوٰۃ سے عدول فرمایا تو زکوٰۃ کے علاوہ فرض مراد ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عام ہے اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ یہاں جو انہیں دیا گیا ہے اس سے خرچ کرنا مدح کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور یہ صرف حلال مال میں ہوتا ہے یعنی وہ عطا کرتے ہیں جو شرع نے اس پر لازم کیا زکوٰۃ اور دوسرے مالی حقوق جو بعض احوال میں لاحق ہوتے ہیں جبکہ اس خرچ کی طرف انہیں رغبت بھی دی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ایمان بالغیب، دل کا نصیبہ ہے اور نماز قائم کرنا بدن کا حصہ ہے اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ مال کا حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے۔ بعض متقدمین مفسرین نے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تاویل میں فرمایا: جو ہم نے انہیں سکھایا وہ سکھاتے ہیں۔ یہ ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم القشیری نے حکایت کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

''اور وہ جو ایمان لائے اس پر (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) جو اتارا گیا ہے آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں''۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اہل کتاب کے مؤمن ہیں جیسے حضرت عبدالله بن سلام۔ ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی اور پہلی آیت عرب کے مومنین کے بارے نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: دونوں آیتیں مومنین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسی بنا پر الَّذِيْنَ کا اعراب عطف کی وجہ سے مجرور ہے اور استیناف کی بنا پر رفع ہونا بھی صحیح ہے یعنی اس سے پہلے هم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور جنہوں نے دونوں آیتوں سے دونوں علیحدہ علیحدہ قسمیں مراد لی ہیں ان کے نزدیک الَّذِيْنَ کا اعراب مبتدا ہونے کی وجہ سے رفع ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى ہے اور عطف کے احتمال کی وجہ سے جر کا احتمال بھی رکھتا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد بِمَآ اُنْزِلَ اس سے مراد قرآن ہے وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد سابقہ کتب ہیں بخلاف اس کے جو یہود و نصاریٰ نے کہا جیسا کہ الله تعالیٰ نے خود ان کے متعلق بتایا وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقة على العيال والمملوك واثم من ضيعهم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

عَلَيْنَا (البقرہ:91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ تو یہود و نصاریٰ نے کہا ہم غیب پر ایمان لائے جب یہ آیت نازل ہوئی وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ تو انہوں نے کہا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جب وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا حکم نازل ہوا تو کہنے لگے: ہم خرچ کرتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ تو بدک پڑے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کتنی کتب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک سو چار کتب نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور اخنوخ (حضرت ادریس علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت ابراہیم پر دس صحائف نازل فرمائے، تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ اسلام پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ تورات، انجیل۔ زبور اور فرقان نازل فرمائیں۔ اس حدیث کو حسین آجری اور ابوحاتم البستی نے نقل کیا ہے۔

ایک مسئلہ: اگر کہنے والا کہے سابقہ تمام کتب پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جبکہ ان کے احکام منافی ہیں؟ اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے پہلی شریعتوں کی پابندی کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان سے ایمان لانا منسوخ نہیں ہوا۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے متقدمہ شرائع کے التزام کو واجب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (یعنی وہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کے متعلق جانتے ہیں)۔ الیقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یقنت الامر یقناً وایقنت واستیقنت و تیقنت ان تمام کا معنی ایک ہے میں یقین پر ہوں۔ موقن میں یا ماقبل ضمہ کی وجہ سے واؤ سے بدل گئی ہے جب تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اصل کی طرف لوٹا دے گا۔ تو کہے گا: مُيَيْقِنٌ تصغیر اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے اسی طرح جمع بھی اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ بعض اوقات ظن کو یقین کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اس سے لغو قسم میں ہمارے علماء کا قول ہے کہ وہ اللہ کی قسم اٹھائے ایک ایسے امر پر جس کا اسے گمان ہو پھر اس کے لئے ظاہر ہو کہ معاملہ تو اس کے خلاف تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

شاعر نے کہا:

تحسب هوّاس وايقن انی بها مفتد من واحدٍ لا أغامره

آخرت، تاخر سے مشتق ہے ہم سے اس کے تاخر کی وجہ سے اور ہمارے اس سے تاخر کی وجہ سے اسے آخرت کہا جاتا ہے جیسا کہ دنیا، دنو سے مشتق ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں"۔

نحاس نے کہا: اہل نجد کہتے ہیں: أُلاك، بعض کہتے ہیں: أُلالِك، ك خطاب کے لئے ہے۔ کسائی نے کہا: جس نے اولئك

کہا اس کا واحد ذالك ہے اور جس نے الاك کہا اس کا واحد ذاك ہے اور اُلالِك، اولئك کی مثل ہے۔ ابن سکیت نے شعر کہا ہے:

الالِك قومی لم یکونوا اشابة و ھل یعظ الضلیل الا اُلالکا

اس شعر میں الالك کا معنی اولئك ہے۔

بعض کہتے ہیں: اولئك غیر عقلاء کے لئے ہے۔ شاعر نے کہا:

ذم المنازل بعد منزلة اللوی والعیش بعد اولئك الایام

اس میں اولئك غیر عقلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾ (الاسراء)

ہمارے علماء نے فرمایا: مِّنْ رَّبِّهِمْ کے کلمات میں قدریہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ وہ ایمان اور ہدایت خود گھڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے پاک ہے۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح قدریہ نے کہا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا: من انفسهم اس پر اور ھدیٰ پر کلام گزر چکی ہے اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، هُمْ میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ دوسرا مبتدا ہو اور اس کی خبر الْمُفْلِحُوْنَ ہو۔ پھر یہ مبتدا خبر اُولٰٓئِكَ مبتدا کی خبر ہوں، اور یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ زائدہ ہو۔ بصری علماء اسے فاصلہ کہتے ہیں اور کوفی علماء اسے عماد کہتے ہیں اور الْمُفْلِحُوْنَ، اُولٰٓئِكَ کی خبر ہو۔

الفلح کا لغوی معنی الشق اور القطع (پھٹنا اور کاٹنا) ہے۔ شاعر نے کہا

ان الحدید بالحدید یفلح

لوہے کے ساتھ لوہا کاٹا جاتا ہے۔

اسی سے فلاحة الارضین ہے جو زمین کو کھیتی کے لئے پھاڑتا ہے۔ یہ مفہوم ابوعبید نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کسان کو فلاح کہا جاتا ہے، جس کا نچلا ہونٹ کاٹا گیا ہو اسے افلح کہا جاتا ہے۔ جس کا شق ظاہر ہو۔ گویا مفلح مصائب و مشکلات کو کاٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے، کبھی یہ غور و بقا میں استعمال ہوتا ہے، یہ لغت میں اس کی اصل ہے۔ اس سے مرد کو اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے۔

استفلحی بامرك اس کا معنی ہے: اپنے امر میں کامیاب ہو جا۔ شاعر نے کہا:

لو كان حی مدرك الفلاح ادركه ملاعب الرماح

اس میں فلاح کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اضبط بن قریع سعدی نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

لكل هم من الهموم سعه والمسیٔ والصبح لا فلاح معه

شاعر نے یہاں بھی فلاح کو کامیابی و کامرانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

کسی نے کہا:

لیس مع کر اللیل والنہار بقاء

رات اور دن کی گردش کے ساتھ بقا نہیں۔

ایک اور نے کہا:

نحل بلاداً کلها حل قبلنا ونرجو الفلاح بعد عاد و حمیر

ہم ان تمام شہروں میں اترے جس طرح ہمارے بزرگ اترے اور ہم عاد اور حمیر کے بعد فلاح کی امید کرتے ہیں۔

عبید نے کہا:

افلح بما شئت فقد یدرک بالض عف و قد یخدع الاریب

جس کے ساتھ چاہے کامیاب ہو جا، ضعف و کمزوری ضرور آئے گی، کبھی ذہین و فطین بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ کا معنی ہے جنت کی کامیابی حاصل کرنے والے اور اس میں باقی رہنے والے۔ ابن ابی اسحاق نے کہا: الْمُفْلِحُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ سب کچھ پا لیا جو انہوں نے طلب کیا اور اس شر سے بچ گئے جس سے وہ بھاگے تھے، یہ ایک معنی ہے۔ کبھی الفلاح، السحور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ حدیث ہے ''حتی کاد یفوتنا الفلاح مع رسول اللہ ﷺ قلت و ما الفلاح قال السحور'' (1) حتیٰ کہ قریب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا فلاح فوت ہو جاتا۔ میں نے پوچھا: الفلاح کیا ہے؟ فرمایا: سحری کا کھانا۔ تو حدیث کا معنی یہ ہے کہ سحری کھانے کے ساتھ روزے کی بقا ہے، اسی وجہ سے سحری کے کھانے کو فلاح کہا جاتا ہے الفلاح، کرایہ پر جانور دینے والے کو کہتے ہیں۔

لها رطل تکیل الزیت فیه وفلاح یسوق لها حمارا

پھر الفلاح عرف میں، مطلوب کی کامیابی اور خوفناک چیز سے نجات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حمزہ نے یہ کیسے پڑھا۔ علیہُم و الیہُم و لدیہُم جبکہ، من ربہِم اور فیہِم اور جنتیہِم نہیں پڑھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علیہم الیہم و لدیہم میں یا الف سے بدلی ہوئی ہے۔ اصل میں علاھم، لداھم اور الاھم تھے۔ پس ھا اپنے ضمہ پر قائم ہے اور فیہم، من ربہم اور جنتیہم میں ایسا نہیں ہے۔ کسائی نے علیہم الذلہ اور الیہم اثنین میں حمزہ کی موافقت کی ہے۔ ان کے متعلق قراء سے یہی معروف ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝

''بے شک جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

جب پہلے مومنین اور ان کے احوال کا ذکر فرمایا تو کافروں اور ان کے انجام کا اب ذکر ہو رہا ہے۔ کفر، ایمان کی ضد ہے،

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیہا، باب ماجاء فی قیام شہر رمضان، حدیث نمبر 1316، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت میں یہی مراد ہے کبھی کفر کا لفظ نعمت اور احسان کی ناشکری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، حدیث کسوف میں عورتوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اسی معنی میں ہے۔ فرمایا: و رایت النار فلم ار منظراً کالیوم قط افظع و رایت اکثر اھلھا النساء قیل بم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال بکفرھن قیل أیکفرن باللہ۔ قال یکفرن العشیر و یکفرن الاحسان لو احسنت الی احداھن الدھر کلہ ثم رات منک شیئاً قالت ما رایت منک خیراً قط (1) (بخاری) میں نے جہنم دیکھی اور میں نے آج کی طرح کبھی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیوں؟ فرمایا: ان کے کفر کی وجہ سے۔ عرض کی گئی: کیا یہ اللہ سے کفر کرتی ہیں؟ فرمایا: یہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تو ان میں سے کسی سے پورا زمانہ احسان بھی کرے کبھی تجھ سے کوئی تھوڑی سی کمی دیکھے گی تو کہے گی: میں نے تجھ سے کبھی خیر نہیں دیکھی۔

عرب کلام میں کفر کی اصل ڈھانپنا اور پردہ ڈالنا ہے۔ شاعر کا قول ہے: فی لیلۃ کفر النجوم غمامھا۔ (رات کے بادلوں نے ستاروں کو چھپا دیا)۔ اسی وجہ سے رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تاریکی کے ساتھ ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فتذکرا ثقلا رثیداً بعدما ألقت ذکاء یمینھا فی کافر

یہاں کافر ڈھانپنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ذکاء، (ذال کے ضمہ اور مد کے ساتھ) یہ سورج کا اسم ہے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

وہ فجر پھوٹنے سے پہلے آئی جبکہ سورج رات میں چھپا ہوا تھا۔

کافر دریا، اور بڑی نہر کو کہتے ہیں، کافر، کسان کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع کفار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ** (الحدید: 20) یعنی کسان، کیوں کہ وہ دانے کو (زمین میں) چھپاتے ہیں۔ رماد مکفور چھپائی گئی راکھ۔ سفت الریح علیہ التراب ہوا نے اس پر مٹی اڑائی۔ الکافر من الارض اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے دور ہو اور کوئی وہاں اترتا نہ ہو اور کوئی وہاں سے گزرتا نہ ہو۔ پس جو ایسی جگہوں پر اتریں انہیں اھل الکفور کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: الکفور یعنی دیہات۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ یعنی ان کے نزدیک آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یعنی ان پر یہ برابر ہے، برابری کی وجہ سے استفہام کو لایا گیا۔ اس کی مثل ہے: **سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُن مِّنَ الْوٰعِظِينَ** (الشعراء: 136)

شاعر نے کہا: اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ، حدیث نمبر 993، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و لیل یقول الناس من ظلماته　　سواء صحیحات العیون و عورها

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ءَاَنْذَرْتَهُمْ الانذار کا معنی ابلاغ اور اعلام (آگاہ کرنا) ہے اور یہ معنی صرف تخویف (ڈرانے) کی صورت میں ہوتا ہے جس سے بچنے کا زمانہ وسیع ہو۔ اگر بچنے کے لئے اس کا زمانہ وسیع نہ ہو تو اشعار ہوگا، انذار نہ ہوگا۔ شاعر نے کہا:

انذرت عمراً و هو فی مهل　　قبل الصباح فقد عصی عمرو

تناذر بنو فلان هذا الامر، بولا جاتا ہے جب بعض، بعض کو اس امر سے ڈرائیں۔

علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظ کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا معنی اس شخص کے حق میں خاص ہے جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ آگاہ کر دے اس بات پر کہ لوگوں میں اس حال والے بھی کچھ لوگ ہوں گے، کسی کو متعین نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عباس اور کلبی نے فرمایا: یہ آیت یہود کے رؤساء کے بارے نازل ہوئی جس میں حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور ان جیسے دوسرے یہودی تھے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کفار کے سرداروں میں بدر کے دن قتل ہوئے تھے (1)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پس جنہوں نے کسی کو متعین کیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس پر غیب کھل گیا کہ اس کی موت کفر پر ہوگی۔ یہ اس آیت کے ضمن میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ ترکیبی اعتبار سے مرفوع ہے اور ان کی خبر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی خبر ہے سَوَآءٌ اور اس کے بعد والا کلام صلہ کے قائم مقام ہے۔ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: سَوَآءٌ مبتدا کے اعتبار سے مرفوع ہے ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ خبر ہے، اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ نحاس نے کہا: یعنی وہ بیوقوف ہیں انہیں ڈرانا کچھ مفید نہیں۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل مدینہ، ابو عمرو، اعمش اور عبد اللہ بن ابی اسحاق نے پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے، خلیل اور سیبویہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ یہ قریش اور سعد بن بکر کی لغت ہے، اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے۔

ایا ظبیه الوعساء بین جلاجل　　و بین النقا آنت ام ام سالم

اس میں آنت پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ ہے۔

اس شعر میں آنت ایک الف کے ساتھ آیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

تطاللت فا ستشرفته فعرفته　　فقلت له آنت زید الارانب

میں نے اسے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان لیا میں نے اسے کہا: کیا تو خرگوشوں والا زید ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن محیصن سے مروی ہے کہ انہوں نے انذ رتھم ام لم تنذ رھم پڑھا ہے یعنی صرف ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے بعد الف نہیں پڑھا، دو ہمزوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ایک کو حذف کیا گیا ہے یا اس لئے کہ ام با ستفہام پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

تروح من الحی ام تبتکر و ماذا یضیرك ولو تنتظر

اس میں شاعر نے ہمزہ کو حذف کیا ہے۔

تروح سے مراد أتروح لیا ہے اور ام پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ابی اسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے (أأنذ رتھم) پڑھا ہے۔ پس انہوں نے دو ہمزوں کو قائم رکھا ہے اور ان کے درمیان الف داخل کیا ہے تا کہ دو ہمزے جمع نہ ہوں۔ ابو حاتم نے کہا: ان دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرنا اور دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ابو عمرو، اور نافع اکثر ایسا کرتے تھے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دو ہمزوں کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے(1) یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ قول ہے اور خلیل کے نزدیک یہ بعید ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ ثقل میں ضَنِنُوا کے مشابہ ہے۔ اخفش نے کہا: پہلے ہمزہ کی تخفیف اولیٰ ہے۔ یہ قول ردی ہے کیونکہ عرب استثقال کے بعد اور ایک حرف کی ادائیگی کے بعد تخفیف کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: دو ہمزوں کی تخفیف جائز ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مخالف ہے۔ اخفش نے کہا: سعید نے ہمزہ کو ھاء سے بدلا ہے اور ھانذ رتھم پڑھا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ھیاك و ایاك۔ اخفش نے کہا: ھاانتم اصل میں أأنتم تھا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ٘ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۷

''مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: خَتَمَ اللّٰهُ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کو خَتَمَ اللّٰهُ کے ارشاد سے بیان فرمایا ہے۔ الختم ختمت الشیء ختماً فھو مختوم و مختم (مبالغہ کے لئے شد پڑھی گئی ہے) کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی شے کو ڈھانپ دینا اور اسے باندھ دینا ہے حتیٰ کہ اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو۔ اس سے ختم الکتاب والباب اور اس کے مشابہ چیزیں ہیں حتی کہ اس کے اندر کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اس میں ہے اس کے علاوہ کچھ رکھا نہیں جا سکتا۔

اہل معانی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو دس اوصاف کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ الختم، الطبع، الضیق، المرض، الرین، الموت، القساوۃ، الانصراف، الحمیۃ، الانکار۔ انکار کا ذکر اس آیت میں فرمایا: قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (النحل) الحمیۃ کے ذکر میں فرمایا: اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ (الفتح:26) قساوت کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ذکر میں فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:22) الانصراف کے ذکر میں فرمایا: ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ) موت کے بارے میں فرمایا: وَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام:122) اور فرمایا: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (الانعام:36) رین کے بارے فرمایا كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین) اور مرض کے بارے فرمایا: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ:10) الضیق کے بارے فرمایا: وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:125) الطبع کے بارے فرمایا: وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ) اور فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) اور الختم کے بارے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرہ:7) ان تمام کا بیان ان شاء اللہ اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2: کبھی ختم (مہر لگا دینا) حسی ہوتا ہے اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں معنوی ختم مراد ہے۔ دلوں پر مہر لگانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو یاد نہ کرنا، اس کے مخاطبات کا مفہوم محفوظ نہ کرنا اور اس کی آیات میں غور و فکر نہ کرنا ہے اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو نہ سمجھنا جب ان پر تلاوت کیا جاتا ہے یا انہیں اللہ کی وحدانیت کی طرف بلایا جاتا ہے اور آنکھوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی مخلوقات اور اس کی مصنوعات کے عجائب میں غور و فکر کے لئے ہدایت حاصل نہ کرنا۔ یہ مفہوم حضرات ابن عباس، ابن مسعود، قتادہ وغیرہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس آیت میں بڑی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت و ضلال، کفر و ایمان کا خالق ہے۔ اے سننے والو! عبرت حاصل کرو، اے مفکرین! قدریہ فرقہ کی عقول پر تعجب کرو جو کہتے ہیں کہ ایمان و ہدایت کا وہ خود خالق ہے، خَتَمَ کا معنی مہر لگانا ہے تو پھر ان کے لئے ایمان کہاں ہوگا اگرچہ وہ (ہزار) کوشش بھی کریں ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو پھر وہ کب ہدایت پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انہیں کون ہدایت دے گا جب کہ اللہ نے انہیں گمراہ کر دیا اور انہیں بہرہ کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا: وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (غافر:33)۔ (اور جسے گمراہ کر دے اللہ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں) اللہ کا فعل ان لوگوں کے بارے عدل ہے جن کو اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا کیونکہ اس نے انہیں حق سے نہیں روکا جو اس کے لئے واجب تھا ورنہ اس سے صفت عدل زائل ہو جائے گی انہیں اس چیز نے روکا کہ جو اس نے ان پر فضل فرمایا تھا نہ کہ اس چیز نے جو ان کے لئے ثابت تھی۔

اگر وہ کہیں کہ ختم، طبع، غشاوۃ سے مراد نام رکھنا، حکم لگانا اور خبر دینا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، نہ کہ یہ فعل کی خبر دی گئی ہے ہم کہیں گے: یہ قول فاسد ہے کیونکہ ختم اور طبع کی حقیقت وہ فعل ہے جس کی وجہ سے دل مطبوع و مختوم ہو جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی حقیقت نام رکھنا اور حکم لگانا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب کہا جاتا ہے: فلان طبع الکتاب و ختمہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا فعل کیا جس کی وجہ سے کتاب مطبوع اور مختوم ہو گئی ہے نہ کہ نام رکھنا اور حکم لگانا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں ہے نیز امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف مجازاً کی ہے، یہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا

بِكُفْرِهِمْ (النساء: 155) (اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی) اور امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ طبع اور ختم ان کے دلوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ اور مومنین کی طرف بھی ممتنع ہے اگر ختم اور طبع نام رکھنا اور حکم لگانا ہوتا تو انبیاء اور مومنین کی طرف ممنوع نہ ہوتا کیونکہ وہ تمام کفار کا نام رکھ سکتے تھے کہ ان پر مہر لگائی گئی ہے ان کے دلوں پر ختم لگائی گئی ہے وہ گمراہی میں ہیں ایمان نہیں لائیں گے وہ تمام ان کفار پر حکم لگا سکتے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ ختم اور طبع معنوی ہے نام رکھنا اور حکم لگانا نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں پیدا فرماتا ہے جو اسے ایمان سے روکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد بھی ہے: كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (الحجر) (اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں وہ نہیں ایمان لائیں گے) اور فرمایا: وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (الانعام: 25) (اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے)۔

مسئلہ نمبر 4: عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اس میں دلیل ہے کہ دل کو تمام اعضاء پر فضیلت حاصل ہے۔ دل انسان اور دوسری تمام چیزوں کا ہوتا ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو اور جو چیز معزز ہو وہ اس کا دل ہے۔ دل، فکر کا مقام ہے اصل میں یہ مصدر ہے قلبت الشیء اقلبه قلباً۔ جب کوئی کسی چیز کو اس کے آغاز پر لوٹا دے، تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے قلبت الاناء۔ میں نے برتن کو الٹا کر دیا پھر یہ لفظ نقل کیا گیا اور اس کے ساتھ اس عضو کا نام رکھا گیا جو معزز ترین عضو ہے کیونکہ خیالات جلدی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

ما سمی القلب الا من تقلبه فاحذر علی القلب من قلب و تحویل

قلب کو قلب اس کے پھرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے پس تو دل کی تبدیلی اور تحویل سے بچ۔

پھر جب عربوں نے اس مصدر کو اس شریف عضو کے لئے نقل کیا تو عظمت اس میں لازم ہو گئی۔ اس کے اور اس کی اصل کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابوموسیٰ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دل کی مثال اس تنکا کی ہے ہوائیں جسے صحراء میں گھماتی رہتی ہیں'' (1)۔ اسی معنی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے: اللھم یا مثبت القلوب ثبت قلوبنا علی طاعتك (اے اللہ اے دلوں کو ثابت رکھنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر ثابت رکھ (2)۔) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنے عظیم منصب اور جلالت شان کے باوجود یہ دعا کرتے تھے تو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں یہ دعا بدرجہ اولیٰ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ (الانفال: 24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان)۔

مسئلہ نمبر 5: جوارح اگرچہ دل کے تابع ہیں لیکن کبھی دل، جوارح کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے اس تعلق کی وجہ سے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 10، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، مقدمہ، باب فی القدر، حدیث نمبر 84، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 18، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب فضائل صحابہ، باب فیما انکرت الجهمية، حدیث 194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو ظاہر اور باطن کے درمیان ہے، اگرچہ دل ان اعضاء کا رئیس اور مالک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے''(1)۔

ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے (اور اس کی سند صحیح ہے)۔ ''ایک شخص گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے''(2)۔ فرمایا: یہی وہ الرین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس آیت کے اندر کیا ہے: كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین)

مجاہد نے کہا: دل ہتھیلی کی مانند ہے ہر گناہ کی وجہ سے ایک انگلی بند ہو جاتی ہے۔ پھر مکمل بند کر دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: مجاہد کے اس قول میں اور نبی کریم ﷺ کے اس قول میں ''جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو تو پورا جسم فاسد ہوتا ہے۔ خبردار وہ ٹکڑا دل ہے''(3)۔ دلیل ہے ختم حقیقی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: دل صنوبر کے مشابہ ہوتا ہے مجاہد کا قول اس کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دو احادیث بیان فرمائیں۔ ایک تو میں دیکھ چکا ہوں جبکہ دوسری کا منتظر ہوں۔ آپ ﷺ نے ہمیں بیان فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں نازل ہوئی پھر قرآن نازل ہوا، لوگوں نے قرآن سے اس کو جانا اور حدیث سے اس کو پہچانا۔ پھر ہمیں امانت کے اٹھ جانے کے متعلق بتایا۔ فرمایا: ایک شخص سوئے گا تو اس کے دل سے امانت اٹھالی جائے گی اس کا اثر ایک جلن کی مثل باقی ہوگا پھر وہ سوئے گا تو اس دل سے امانت اٹھالی جائے گی۔ پس اس کا اثر ایک چھالے کی مثل ہوگا جیسے تیرے پاؤں پر انگارہ گر جائے تو وہ جگہ پھول جاتی ہے تو اسے پھولا ہوا دیکھتا ہے حالانکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ نے کنکری اٹھائی اور اسے اپنے پاؤں پر لڑھکایا۔ لوگ بیع و شراء کرتے رہیں گے کوئی ایک بھی امانت ادا کرنے والا نہ ہوگا حتیٰ کہ کہا جائے گا: فلاں قبیلہ میں ایک امین شخص ہے حتیٰ کہ اس شخص کے متعلق کہا جائے گا وہ کتنا پختہ آدمی ہے، کتنا ہوشیار اور کتنا عقلمند آدمی ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، مجھ پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا کہ میں پرواہ نہیں کرتا تھا کہ میں کس سے بیع کر رہا ہوں، اگر وہ مسلمان ہو تو اس کا دین مجھ پر میری امانت لوٹا دے گا اور اگر وہ نصرانی ہوگا تو اس کا سردار مجھ پر لوٹا دے گا لیکن آج میں تم سے صرف فلاں فلاں سے بیع کرتا ہوں (4)۔ حدیث میں الوکت کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے تھوڑا سا اثر، کچی کھجور میں جب پکنے کا تھوڑا سا نشان لگتا ہے تو عرب کہتے ہیں قد وکت فھو موکت۔ اور المجل۔ اس سے مراد چھالہ ہے یعنی وہ پانی جو جلد اور گوشت کے درمیان ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر اپنے اس قول (کجمر دحرجتہ) سے فرمائی یعنی تو نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب باب قبح الکذب وحسن صدق وفضلہ، صفحہ 325، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ ﷺ باب من سورۃ ویل للمطففین، صفحہ 169-168، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 13، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، حدیث 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

انگارے کو اپنے پاؤں پر گھمایا تو وہ پھول گیا، تو نے اسے ابھرا ہوا دیکھا ..... یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ دل میں محسوس ہوتا ہے اس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اسی طرح الختم اور الطبع ہے۔

حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: دلوں کو نئے نئے فتنے لاحق ہوتے ہیں جیسے چٹائی ہوتی ہے، جس دل میں یہ فتنے راسخ ہو گئے اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور جو دل ان فتنوں کا انکار کرتا ہے اس میں سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دو دل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید جو صفا کی طرح ہوتا ہے اس کو کوئی فتنہ نقصان نہیں دے گا جب تک آسمان اور زمین قائم ہوں گی اور دوسرا دل سیاہ جس میں سیاہی ملی ہوتی ہے جیسے کوزہ ہوتا ہے جو ٹیڑھا ہوتا ہے وہ نیکی کو جانتا بھی نہیں وہ کسی برائی کا انکار نہیں کرتا، لیکن جو اس کے دل میں برائی راسخ ہو چکی ہوتی ہے(1) (وہ وہی کرتا ہے)۔

مسئلہ نمبر 6: دل کو فواد اور صدر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (فرقان: 32) اور فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الم نشرح) یعنی دونوں جگہ قلبك مراد ہے کبھی قلب سے مراد عقل لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: 37) یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک دل، عقل کا محل ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلٰى سَمْعِهِمْ اس آیت سے کانوں کو آنکھوں پر فضیلت دینے والے نے استدلال کیا ہے، کیونکہ کانوں کو آنکھوں پر مقدم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ (الانعام: 46) اور فرمایا: وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (النحل: 78)

فرمایا: کان چھ جہات، نور اور اندھیرے میں ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ صرف سامنے کی جہت کا ادراک کرتی ہے اور روشنی کے ذریعہ سے ادراک کرتی ہے۔ اکثر متکلمین نے کانوں پر آنکھوں کو فضیلت دینے کا قول کیا ہے کیونکہ کان صرف آوازوں اور کلام کا ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ جسموں، رنگوں اور تمام ہیئتوں کا ادراک کرتی ہے۔ جب اس کے تعلقات زیادہ ہیں تو یہ افضل ہوئی اور انہوں نے آنکھ کے ساتھ چھ جہتوں سے ادراک کو جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ ابصار تو جمع اور سمع کو مفرد کیوں ذکر فرمایا؟ اسے کہا جائے گا: سمع کو مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر ہے قلت و کثرت کے لئے واقع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعت الشیء اسمعہ سمعاً و سماعاً۔ پس السمع، سمعت کا مصدر ہے اور السمع اس عضو کا اسم بھی ہے جس کے ساتھ سنا جاتا ہے اس کو مصدر کا نام دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: جب سمع کی اضافت جماعت کی طرف کی جائے تو یہ اس پر دلیل ہوتی ہے اس سے مراد جماعت کے کان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

بها جيف الحسرى فاما عظامها　　فبيض واما جلدها فصليب

یہاں جلد سے مراد جلود ہے۔ مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ جماعت کے لئے ایک جلد نہیں ہوتی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

اس کی مثل ایک اور شاعر نے کہا:

لا تنکر القتل و قد سُبینا　　　فی حلقکم عظمٌ و قد شجینا

اس شعر میں حلق سے مراد حلوق ہیں۔

اس کی مثل دوسرے شاعر کا قول ہے:

کانه وجه ترکیین قد غضبا　　　مستهدف لطعان غیر تذبیب

اس شعر میں وجه سے مراد وجهین ہے۔ شاعر نے کہا: وجه ترکیین کیونکہ معلوم تھا کہ دو شخصوں کے لئے ایک وجہ (چہرہ) نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں اور وعلی اسماعهم بھی پڑھا گیا ہے، اور وعلی مواضع سمعهم کے معنی کا بھی احتمال ہے کیونکہ سمع پر مہر نہیں لگائی جاتی بلکہ سمع کی جگہ مہر لگائی جاتی ہے۔ پس مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے کبھی سمع بمعنی استماع بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعك حدیثی... ای استماعك الی حدیثی یعجبنی۔ مجھے تیرا میری بات کو غور سے سننا اچھا لگتا ہے..... اسی مفہوم میں ذی الرمہ کا قول ہے جو ایک بیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاریوں اور کتوں کی آواز غور سے سنتا ہے۔

وقد توجس رکزاً مقفر ندس　　　بنبأة الصوت ما فی سمعه کذب

یعنی اس کے استماع میں کذب نہیں یعنی وہ سچا غور سے سننے والا ہے، الندس کا معنی ہے حاذق، النبأۃ خفی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں الرکزہے، السمع (سین کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ) سے مراد انسان کا اچھائی کے ساتھ ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے: ذهب سمعه فی الناس یعنی لوگوں میں اس کا ذکر پھیل گیا۔ السمع بجو سے بھیڑیئے کے بچے کو بھی کہتے ہیں ...... **وَعَلٰی سَمْعِهِمْ** پر وقف ہے۔

غِشَاوَةٌ مبتدا ہے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ فی قلوبهم اور جو اس پر معطوف ہیں ان سب کی ضمیریں اس کے لئے ہیں جو الله کے علم میں ہیں کہ کفار قریش میں سے ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: منافقین کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: تمام کفار کے لئے ہے۔ یہ قول زیادہ عام ہے۔ **خَتَمَ** (مہر) دلوں اور کانوں پر ہے اور **غِشَاوَةٌ** آنکھوں پر ہے۔ الغشاء کا معنی ڈھانپنا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اسی سے غاشیة السرج ہے۔ غشیت الشیء واغشیته۔ نابغہ نے کہا:

هلا سألت بنی ذبیان ماحسبی　　　اذا الدخان تغشی الاشمط البرما

تو نے بنی ذبیان سے کیوں نہیں پوچھا جو میرے لئے کافی ہے۔ دھواں ادھیڑ عمر والی قوم کے ساتھ شراب نہ پینے والے پر چھا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

صحبتك اذ عینی علیها غشاوةٌ　　　فلما انجلت قطعت نفسی الومها

میں نے تیری سنگت اختیار کی جبکہ میری آنکھوں پر پردہ تھا جب پردہ کھلا میں نے اپنے نفس کو ملامت کیا۔
ابن کیسان نے کہا: اگر اس کی جمع بنائی جائے تو یہ غِشَاوَةٌ کے حذف کے ساتھ ہوگا۔ فراء نے اس کی جمع غشاوی ذکر کی ہے جیسے اداوی جمع ہے۔ غشاوۃ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل محذوف ہوگا اور یہ اس بات سے ہوگا علفتھا تبناً و ماءً بارداً (میں نے اسے چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا)۔
ایک اور شاعر کا قول ہے:

یا لیت زوجك قد غدا　　متقلدا سیفا و رمحا

کاش! تیرا خاوند تلوار لٹکائے ہوئے اور نیزہ اٹھائے ہوئے جاتا۔

معنی ہے: اسقیتھا ماء میں نے اسے پانی پلایا، وحاملاً رمحاً۔ کیونکہ نیزہ گلے میں لٹکایا نہیں جاتا۔ فارسی نے کہا: تو یہ استعمال وسعت و اختیار کی حالت میں نہیں پائے گا۔ غشاوہ پر رفع پڑھنا احسن ہے، واو عاطفہ ہوگی جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا اور فرمایا: میں نے غشاوہ سے واو کے ساتھ تصرف کرنے والا فعل نہیں سنا۔ بعض مفسرین نے کہا: کانوں اور آنکھوں پر غشاوہ ہے، وقف قُلُوْبِهِمْ پر ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا: مہر تمام پر ہے اور غِشَاوَةٌ کا مطلب بھی خَتَمَ (مہر) ہے۔ اس صورت میں وقف غِشَاوَةٌ پر ہوگا۔ حسن نے غشاوۃ غین کے ضمہ کے ساتھ، ابوحیوہ نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابوعمرو نے غشوہ پڑھا ہے اس نے اسے مصدر کی اصل کی طرف لوٹایا ابن کیسان نے فرمایا: غَشْوَة اور غِشْوَة پڑھنا جائز ہے اور بہتر غِشَاوَةٌ ہے اسی طرح ہر لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز پر مشتمل ہونے پر دلالت کرے جیسے عمامہ، کنانۃ، قلادہ، عصابہ وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَهُمْ یعنی جھٹلانے والے کفار کے لئے عَذَابٌ عَظِيْمٌ عذاب عظیم ہے۔ عَظِیْمٌ، عَذَابٌ کی صفت ہے۔ عذاب کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً کوڑے مارنا، آگ کے ساتھ جلانا، لوہے سے کاٹنا وغیرہ جو بھی انسان کو تکلیف پہنچائے وہ عذاب ہے۔ قرآن میں ہے: وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور) اس کا معنی الحبس اور المنع (روکنا) ہے۔ لغت میں کہا جاتا ہے: اعذبہ عن کذا یعنی میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے عذوبۃ الماء ہے پانی کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ برتن میں پانی کو روکا جاتا ہے تاکہ صاف ہو جائے اور جو دوسرا مواد اس میں ملا ہوا ہے وہ جدا ہو جائے۔ اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اعذبوا نساء کم عن الخروج، یعنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا تو آپ نے فرمایا: اعذبوا عن ذکر النساء (انفسکم) اپنے نفسوں کو عورتوں کے ذکر سے روکو کیونکہ ان کا ذکر تمہیں جہاد سے محروم کرے گا۔ ہر وہ جسے تو کسی چیز سے روکے تو اس کے لئے اعذبتہ استعمال کر سکتا ہے۔ ضرب المثل میں ہے: لالجمنك لجاماً معذباً۔ (میں تمہیں ایسی لگام چڑھاؤں گا جو تجھے لوگوں پر چڑھنے سے روک لے گی)۔ کہا جاتا ہے: اعذب یعنی میں رک جاتا ہوں۔ اعذب غیرہ، غیر کو روکتا ہوں۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عذاب کو عذاب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی عذاب دیئے جانے والے کو روک دیتا ہے اور جسم کے مناسب سب خیر والی چیزوں کو اس سے روک لیتا ہے۔ اس کے مخالف چیزیں اس پر ڈالتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

”اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر حالانکہ وہ مؤمن نہیں“۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: سورۂ بقرہ میں مومنین کے بارے چار آیات نازل ہوئیں، دو آیات کافروں کے بارے نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسباط نے سدی سے وَ مِنَ النَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ علماء صوفیاء نے فرمایا: النَّاسِ اسم جنس ہے اور اسم جنس کے ساتھ اولیاء کو مخاطب نہیں کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: لفظ النَّاسِ کے بارے میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اسماء جموع میں سے ایک اسم ہے یہ بغیر لفظ کے انسان اور انسانۃ کی جمع ہے اس کی تصغیر نویس ہے۔ الناس، النوس سے مشتق ہے جس کا معنی حرکت ہے۔ کہا جاتا ہے: ناس ینوس یعنی حرکت کرنا۔ اسی سے ام زرع کی حدیث ہے أناس من حلی اذنی (1)۔ (زیورات سے میرے کانوں کو حرکت دی) بعض نے فرمایا: اس کی اصل نسی سے ہے۔ ناس کا اصل نسی ہے قلب ہوا ہے۔ پس نیس بن گیا یا مفتوح ماقبل فتح کی وجہ سے الف سے بدل گئی ہے پھر الف، لام داخل ہوا ہے، بعض نے فرمایا: اس کی اصل النَّاسِ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نسی آدم عهد الله فسمی انساناً۔ (آدم علیہ السلام اللہ کا عہد بھول گئے تو انہیں انسان کیا گیا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولی (2)۔ قرآن میں ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ (طٰہٰ:115) اس صورت میں ہمزہ زائدہ ہوگا۔ شاعر نے کہا

لاتنسین تلك العهود فانما　　سمیت انسانا لانك ناسی

ان عہود کو مت بھول، تیرے بھولنے کی وجہ سے تجھے انسان کہا گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فان نسیت عهوداً منك سالفة　　فاغفر فاول ناس اول الناس

اگر تو سابقہ عہود بھول گیا ہے تو توبہ کر۔ پہلا بھولنے والا پہلا انسان تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم کو انسان کہا گیا کیونکہ وہ حضرت حوا سے انس رکھتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اپنے رب سے انس رکھتے تھے، اس صورت میں ہمزہ اصلی ہوگا شاعر نے کہا:

وما سمی الانسان الا لانسه　　ولا القلب الا انه یتقلب

انسان کو انسان اس کے انس کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور قلب کو قلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ پھرتا رہتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة مع الاهل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورة المعوذتین، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے مومنین کا پہلے ذکر فرمایا۔ ان کے شرف اور ان کی فضیلت کی وجہ سے ان سے آغاز فرمایا۔ ان کے مقابلہ میں پھر کافرین کا ذکر کیا کیونکہ کفر اور ایمان دو طرفیں ہیں۔ پھر ان کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا اور انہیں کافروں کے ساتھ ملایا کیوں کہ ان میں بھی ایمان نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ۔

اس آیت میں کرامیہ فرقہ کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ ایمان زبان کے اقرار کا نام ہے اگرچہ دل میں اعتقاد نہ بھی ہو اور اس قول سے حجت پکڑی ہے: فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا (مائدہ:85) (تو عطا فرمائے اللہ نے بعوض اس قول کے جو وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا جو انہوں نے کہا اور دل میں تصدیق رکھی اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ ''مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ جب وہ یہ کہہ دیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے'' (1)۔ یہ کرامیہ کی عقل کا قصور اور فکر کا جمود ہے۔ قرآن و حدیث میں قول اور اعتقاد کے ساتھ عمل کا جو بیان ہے اس میں غور و فکر کے ترک کی وجہ سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان دل کی معرفت، زبان کے قول اور ارکان کے عمل کا نام ہے'' (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ محمد بن کرام سجستانی اور اس کے ساتھیوں کا جو نظریہ ہے وہ نفاق ہے اور عین شقاق ہے۔ ہم خذلان اور برے اعتقاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا: مومن کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس سے پیار کرتا ہے اور ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ نہ محبت کرتا ہے نہ اس سے پیار کرتا ہے بلکہ اس سے بغض رکھتا ہے اور اس سے دشمنی کرتا ہے، پس ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ایمان قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت و پیار کرتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر اختیار کرے گا تو اللہ اس سے بغض رکھتا ہے، اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے دشمنی رکھتا ہے اس کے موجودہ ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اس کفر اور گمراہی کی وجہ سے جس کے ساتھ وہ موافقت کرے گا۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک کافر وہ جس کو اللہ تعالیٰ یقیناً عذاب دے گا اور ایک کافر وہ جس کو عذاب نہیں دے گا۔ وہ کافر جسے عذاب دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو کفر سے آخر تک موافقت کرے گا۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس سے دشمنی کرتا ہے اور وہ کافر جس کو عذاب نہیں دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض نہیں ہوتا اور اس سے بغض نہیں رکھتا، بلکہ اس سے محبت و پیار کرتا ہے، اس کے موجودہ کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ایمان کی وجہ سے جس سے بالآخر وہ موافقت کرے گا۔ پس مطلق قول کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: مومن ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور کافر عذاب کا مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کی موافات (ایمان پر خاتمہ، کفر پر خاتمہ) کا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر سے اس وقت بھی راضی تھا جب بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اسے ثواب دینے اور اس کے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بتوں کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ عزوجل و امرھم شوریٰ بینھم، حدیث 935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المقدمہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کرتے تھے بلکہ اس ایمان کی وجہ سے بالآخر جس سے انہوں نے موافقت کرلی تھی اور اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض تھا اس کی عبادت کی حالت میں بھی اس کے اس کفر کی وجہ سے بالآخر جس کے ساتھ اس نے موافقت کرنی تھی۔

قدریہ فرقہ والے اس مسئلہ میں مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابلیس پر اس کی عبادت کے وقت ناراض نہیں تھا اور عمر کی بتوں کی عبادت کے وقت عمر سے راضی نہیں تھا۔ یہ قول فاسد ہے۔ جب ثابت ہے کہ ابلیس جس کفر سے موافقت کرنی تھی اللہ اسے جاننے والا ہے اور عمر نے جس ایمان کی موافقت کرنی تھی اسے بھی جاننے والا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ابلیس پر اللہ تعالیٰ ناراض تھا اور عمر پر راضی تھا اس پر امت کا اجماع دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا نہیں جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ دوزخی ہے بلکہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا ہوتا ہے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ وہ جنتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان (کا ثواب وکمال) خاتمہ پر ہے'' (1)۔ اسی لئے صوفیاء وعلماء کہتے ہیں: ایمان وہ نہیں جس کے ساتھ بندہ قولاً اور فعلاً مزین ہے بلکہ ایمان ازل کے سوابق میں سعادت کا جاری ہونا ہے۔ رہا اس کا ہیاکل میں ظہور تو وہ کبھی عارضی ہوتا ہے اور کبھی حقیقۃً ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ثابت ہے جس طرح کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا جو سچے ہیں (اور) آپ سے سچ کہا گیا ہے، کہ تم میں کسی ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے بطن میں چالیس دن میں جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی مدت میں جما ہوا خون رہتا ہے پھر اتنی مدت میں گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اس فرشتے کو چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے (یعنی) اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور اس کا بدبخت یا سعید ہونا لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں کہ تم میں سے کوئی جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پس اس پر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے۔ وہ دوزخیوں والا عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے تم میں سے کوئی دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اس پر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے وہ جنتیوں والا عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 6: امام حافظ ابو محمد عبدالغنی بن سعید مصری نے محمد بن سعید شامی کی حدیث الزندقہ کے بارے میں نقل کی ہے۔ محمد بن سعید سے مراد محمد بن ابی قیس ہے، انہوں نے سلیمان بن موسیٰ سے روایت کی ہے یہ سلیمان اشدق ہے، سلیمان نے حضرت مجاہد بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: ہمیں ابورزین عقیلی نے بتایا، فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور تو اے ابارزین! ایسے دودھ سے ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلا۔ ابورزین نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ مردے کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تو کبھی بنجر زمین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز زمین سے نہیں گزرا پھر تو بنجر

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری، صفحہ 332، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز سے نہیں گزرا؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل اسی طرح نشور ہوگا۔ ابورزین نے کہا: میں نے عرض کی: میں کیسے جان لوں کہ مومن ہوں؟ فرمایا: کوئی اس امت کا فرد نہیں ہے جس نے کوئی نیک عمل کیا پھر اس نے جان لیا کہ یہ نیک عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی بہتر جزا عطا کرنے والا ہے یا اس نے برا عمل کیا پھر اس نے جانا کہ یہ برا عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے والا ہے یا اسے معاف کرنے والا ہے، مگر بندہ مومن کی یہ شان ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث اگرچہ ایسی ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ اگر اس کا معنی صحیح بھی ہو تو پھر بھی حضرت ابن مسعود کی حدیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ وہ خاتمہ پر موقوف ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(1)۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ فی الحال مومن ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7: علماء لغت نے فرمایا: منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی بات کا اظہار کرتا ہے جس کے مخالف وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے، اس کی تشبیہ جنگلی چوہا ہے اس کی ایک بل ہوتی ہے اسے نافقاء کہا جاتا ہے اور ایک اور اس کی بل ہوتی ہے جسے القاصعاء کہا جاتا ہے وہ زمین کو کریدتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین کے ظاہر تک یعنی معمولی سی مٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اسے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اس مٹی کو دور کرتا ہے اور اپنی بل سے نکل جاتا ہے، اس کی بل کے ظاہر پر مٹی ہوتی ہے اور اس کے اندر سوراخ ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق اس کا ظاہر ایمان ہوتا ہے اور باطن کوئی اور۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''فریب دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے''۔

ہمارے علماء نے فرمایا: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہے: وہ اپنے گمان اور خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لئے فرمایا کیونکہ ان کا عمل، ایک دھوکا دینے والے کے عمل جیسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے۔ اصل میں ہے: یخادعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے، ان کے رسول اللہ کو دھوکا دینے کو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ساتھ بلایا۔ اسی طرح جب انہوں نے مومنین کو دھوکا دیا تو یقیناً انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیا۔ ان کا دھوکا یہ تھا کہ وہ ایمان ظاہر کرتے تھے جبکہ ان کے دلوں میں کفر تھا۔ یہ وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں اور وہ گمان کرتے تھے کہ وہ نجات پا گئے اور انہوں نے دھوکا دے دیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اہل لغت نے فرمایا: کلام عرب میں الخدع کا معنی ہے: فساد۔ ثعلب نے یہ ابن اعرابی سے روایت کیا ہے۔ اس نے شعر کہا ہے:

ابيض اللون لذيذٌ طعمه　　طيب الريق اذ الريق خدع

رنگ سفید ہے ذائقہ لذیذ ہے، اس کا لعاب پاک ہے جب کہ اس کا لعاب فاسد ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: اس اعتبار سے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہوگا: وہ اپنے ایمان اور اعمال کو ریا کاری کی وجہ سے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، تفسیر کے ساتھ آیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور قرآن حکیم میں ہے: یُرَآءُوْنَ النَّاسَ (النساء: 142) (وہ لوگوں کے لئے دکھاوا کرتے ہیں)۔ بعض علماء نے فرمایا: خدع کا اصل معنی الاخفاء (چھپانا ہے) ہے۔ اسی سے مخدع البیت ہے جس میں کوئی چیز چھپائی جاتی ہے۔ یہ ابن فارس وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: انخدع الضب فی جحرہ۔ یعنی گوہ اپنے بل میں چھپ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ۔ اس میں نفی اور ایجاب ہے یعنی دھوکے کا انجام اپنے اوپر ہی نازل ہوگا۔ یہ عربوں کے کلام سے ہے: من خدع من لا یخدع فانما یخدع نفسہ، جو ایسی ذات کو دھوکا دیتا ہے جس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ دھوکا تو اسے دیا جا سکتا ہے جو بواطن کو نہ جانتا ہو، اور جو بواطن کو جانتا ہو جو اس کے ساتھ دھوکا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے دھوکا کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ اسے پہچانتے ہوتے تو وہ جان لیتے کہ اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گزر چکا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: تو وہ عمل کرتا ہے جس کا اللہ نے تجھے حکم دیا اور اس کے ساتھ تو غیر کی رضا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھوکا کی حقیقت کا بیان آگے اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے تحت آئے گا۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرو نے دونوں جگہ یخادعون پڑھا ہے تا کہ دونوں لفظ متجانس ہو جائیں۔ عاصم، حمزہ، کسائی اور ابن عامر نے دوسری جگہ یخدعون پڑھا ہے اس کا مصدر خدع و خدیعۃ ہے۔ یہ ابو زید نے حکایت کیا ہے مورق العجلی یخدعون اللہ یعنی یا کے ضمہ، خا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھتے کثرت کا معنی لینے کے لئے۔ ابو طالوت عبد السلام بن شداد اور جارود نے یاء کے ضمہ، خا کے سکون اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) اس معنی پر ما یخدعون الا عن انفسھم، حرف جر کو حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) اصل میں من قومہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا یَشْعُرُوْنَ یعنی وہ نہیں جانتے کہ ان کے دھوکے کا وبال ان کی طرف ہی لوٹنے والا ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے دھوکہ کی وجہ سے نجات پا گئے اور کامیاب ہو گئے۔ یہ دنیا میں ہے اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا: ارجعوا وراءکم فالتمسوا نورا۔ واپس پلٹ جاؤ اور نور تلاش کرو، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اہل لغت نے کہا: شعرت بالشیئ۔ یعنی میں نے اس کو جان لیا۔ اسی سے شاعر کی فطانت کی وجہ سے اسے شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ شاعر جو معانی پہچانتا ہے وہ دوسرے نہیں پہچانتے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: لیت شعری۔ یعنی کاش میں جان لیتا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 90، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ ۙ۬ بِمَا كَانُوۡا یَكۡذِبُوۡنَ ۝۱۰

''ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری اوران کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ المرض سے مراد وہ فساد ہے جو ان کے عقائد میں تھا یا تو یہ شک اور نفاق تھا یا انکار اور تکذیب تھی۔ معنی یہ ہے ان کے دل مریض ہیں کیونکہ وہ عصمت، توفیق، رعایت اور تائید سے خالی ہیں۔ ابن فارس لغوی نے کہا: مَّرَضٌ سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو صحت کی حد سے خارج کردے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق ہو یا کسی امر میں کوتاہی ہو۔ قراء کا مرض کے راء کے فتحہ پر اجماع ہے مگر اصمعی نے ابو عمرو سے روایت کیا ہے کہ اس نے راء کو ساکن کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے خلاف بددعا ہے۔ اس کلام کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شک اور نفاق میں اضافہ فرمائے ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے، اور ان کی مدد کی جگہ ضعف اور قدرت کی جگہ عجز میں اضافہ فرمائے۔ جیسے شاعر نے کہا:

یا مرسل الریح جنوباً وصبا   اذ غضبت زید فزدھا غضباً

اے جنوب کی ہوا اور باد صبا کو چلانے والے! جب بنو زید غضبناک ہوں تو ان کے غضب میں اضافہ کر۔

اس صورت میں آیت کے اندر دلیل ہے منافقین کے خلاف دعا کرنے اور انہیں دھتکارنے کی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بری ترین مخلوق ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ ان کی مرض کی زیادتی کی اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ کردیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰی رِجۡسِهِمۡ (توبہ:125)

اہل معانی نے کہا: فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں مرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں سے پرسکون ہیں اور دنیا کی محبت ان کے دلوں میں ہے اور آخرت سے غافل ہیں اور آخرت سے اعراض کئے ہوئے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نفسوں کے سپرد کردیا ہے۔ ان پر دنیا کے غموں کو جمع کردیا ہے اس لئے وہ دین کے اہتمام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ یعنی دنیا فانی کے بدلے انہیں ایسا عذاب دیا جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

جنید نے کہا: دلوں کی بیماریاں خواہش نفس کی پیروی کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اعضاء کی بیماریاں بدن کے مرض سے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ، اَلِیۡمٌ کا معنی عرب کلام میں مؤلم ہے یعنی درد پہنچانے والا جیسے سمیع معنی مسمع ہوتا ہے۔ ذوالرمہ اونٹوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونرفع من صدور شمردلات   یصك و جوھھا وھج الیم

ہم لمبے اونٹوں کے سینوں کو بلند کرتے ہیں جبکہ ان کے چہروں کو تکلیف دہ گرمی لگ رہی ہوتی ہے۔

الم کا معنی ہے تکلیف دینا، الایلام کا معنی ہے تکلیف دینا۔ الالم، تکلیف کو کہتے ہیں الم یالم الما۔ التالم کا معنی تکلیف

محسوس کرنا۔ اَلِیْمٌ کی جمع اُلَمَاءُ ہے جیسے کریم کی جمع کرماء ہے آلام اس کی جمع اشراف کی طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ، ما مصدریہ ہے یعنی رسل کی تکذیب کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا انکار اور اس کی آیات کی تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دردناک عذاب دیا۔ یہ ابو حاتم نے کہا ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔

مسئلہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے نفاق کا علم تھا تو ان کے قتل سے کیوں رکے رہے، اس کے متعلق علماء کے مختلف چار اقوال ہیں۔

۱۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہ فرمایا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ تھا اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر قتل نہیں کر سکتا۔ باقی تمام احکام میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عربی نے کہا: یہ قول درست نہیں کیونکہ مجذر بن زیاد کو حارث بن سوید بن الصامت نے قتل کیا تھا کیونکہ مجذر نے حارث کے باپ سوید کو جنگ بعاث میں قتل کیا تھا۔ حارث اسلام لے آیا، جنگ احد میں مجذر کو غفلت میں پایا تو اسے قتل کر دیا۔ جبریل امین نے اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر دیا، کیونکہ اس کا قتل دھوکے سے تھا اور دھوکے سے قتل کرنا اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کی غفلت ہے کیونکہ اگر اجماع مذکور ثابت ہے تو پھر اس واقعہ سے اجماع نہیں ٹوٹتا کیونکہ اجماع منعقد نہیں ہوتا، اور ثابت نہیں ہوتا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور وحی کے انقطاع کے بعد۔ یہ واقعہ تو عین وحی کے ساتھ تھا، پس اس سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی ہے یا یہ بالا جماع منسوخ ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ امام شافعی کے پیروکار علماء فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہیں فرمایا کیونکہ زندیق وہ ہوتا ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان ظاہر کرتا ہے۔ اس سے توبہ طلب کی جاتی ہے اور اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ ابن عربی نے کہا: یہ وہم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توبہ طلب نہیں کی تھی اور نہ یہ کسی اور نے کیا تھا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ زندیق سے توبہ طلب کرنا واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق علم ہونے کے باوجود اعراض فرمایا۔ اصحاب شافعی میں سے یہ متاخر ہے۔ جس نے کہا زندیق سے توبہ طلب کرنا جائز ہے اس نے ایسی بات کہی ہے جو کسی کے لئے صحیح نہیں ہے۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلوب کی مصلحت کی خاطر انہیں قتل نہیں کیا تاکہ وہ آپ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: معاذ اللہ ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی۔(1) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ مؤلفہ قلوب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بداعتقادی کا علم تھا یہ ہمارے اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقین کو قتل نہ کرنے کے بارے میں یہ اصحاب مالک کی دلیل

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 499، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب ماینهی عنه من دعوة الجاهلية، حدیث 3257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: اس پر محمد بن الجہم، قاضی اسماعیل، الابہری، ابن الماجشون نے نص قائم کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے حجت پکڑی ہے لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۚۖۛ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝ (الاحزاب)

قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے جب انہوں نے نفاق کا اعلان کیا۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو نفاق تھا وہ آج زندقہ ہے۔ پس زندیق کو قتل کیا جائے گا جب اس پر گواہی قائم ہو جائے گی اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کے قتل سے رک گئے تاکہ امت کو بیان کریں کہ حاکم اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ منافقین کے خلاف گواہی نہیں تھی۔ قاضی اسماعیل نے کہا: عبد اللہ بن ابی پر گواہی نہ دی مگر صرف زید بن ارقم نے۔ اور جلاس بن سوید پر گواہی نہ دی مگر عمیر بن سعد نے جو اس کی پرورش میں تھا۔ اگر اس میں سے کسی ایک پر دو آدمی اس کے کفر اور نفاق کی گواہی دیتے تو اسے قتل کیا جاتا۔ امام شافعی نے دوسرے قول کے لئے حجت پکڑتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے بارے سنت یہ ہے جس پر زندیق ہونے کی گواہی دی گئی ہو پھر وہ انکار کرے اور ایمان کا اعلان کرے اور دین اسلام کا اعلان کرے اور دین اسلام کے علاوہ ہر دین سے براءت کرے تو اس کا خون بہانا ممنوع ہے۔ اصحاب الرائے، احمد، طبری وغیرہم کا یہی نظریہ ہے۔ امام شافعی اور ان کے متبعین نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو قتل نہیں کیا کیونکہ وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا علم تھا، وہ جس کو ظاہر کرتے تھے وہ ماقبل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بندوں پر احکام ظاہر پر رکھے ہیں، ان کے بواطن کا معاملہ اس کے اپنے سپرد ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کسی کے لئے اس کے ظاہر کے خلاف فیصلہ کرے کیونکہ یہ ظنون کے مطابق حکم ہوگا۔ اگر کسی فرد کے لئے یہ جائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ لائق ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ظاہر کی وجہ سے ان پر مسلمانوں والا حکم لگایا اور ان کے بواطن کو اللہ کے سپرد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) میں ان کے ظاہر کی تکذیب کی ہے۔ ابن عطیہ مالکی اس الزام سے اس آیت کی وجہ سے بری ہیں جو ان پر لازم آتا تھا کیونکہ آیت میں اشخاص کو متعین نہیں کیا گیا۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے زجر و توبیخ ہے جو بھی نفاق میں گھر ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ کہنا باقی رہ گیا ہے اس میں سے میں مراد نہیں ہوں۔ میں مومن ہی ہوں، اگر کسی کو متعین کر دیا جاتا تو اس کا جھوٹ کسی چیز کو ختم نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس انفصال میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جانتے تھے یا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ان کی شخصیات اور ان کے اسماء کو جانتے تھے۔ حضرت حذیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے کی وجہ سے منافقین کو جانتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر، حضرت حذیفہ کو کہتے تھے: اے حذیفہ! کیا میں ان میں سے ہوں، حذیفہ کہتے: نہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین انہیں خراب کر سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے مومنین کو ثبات عطا فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین ان کے دین میں بگاڑ پیدا کر سکیں۔ پس ان کے باقی رکھنے میں کوئی ضرر نہ تھا، لیکن آج اس طرح نہیں ہے، ہم زنادقہ سے امن میں نہیں ہیں کہ وہ ہمارے عام اور جاہل لوگوں کے نظریات خراب نہیں کریں گے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝

''اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں''۔

اِذَا ظرف کی بنا پر حالت نصبی میں ہے اور اس میں عامل قَالُوْۤا ہے، اِذَا یہ فعل منتظر کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ جوہری نے کہا اِذَا اسم ہے جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور یہ جملہ کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے مثلاً اجیئك اذا احمر البسر واذا قدم فلان، یعنی میں تیرے پاس آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہو جائیں گی اور جب فلاں آ جائے گا اور جو چیز اس کے اسم ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ یوم کی جگہ واقع ہوتا ہے مثلاً آتیك یوم یقدم فلان یہ ظرف ہے اور اس میں مجازاۃ کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ شرط کی جزا تین چیزیں ہوتی ہیں: الفعل، الفاء اور اذا۔ فعل کی مثال ان تاتنی آتك۔ فاء کی مثال ان تاتنی فانا احسن الیك، اذا کی مثال، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ ۝ (الروم) اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ مجازاۃ کے معنی میں اِذَا اس شعر میں استعمال ہوا ہے:

اذا قصرت اسیافنا کان وصلها　　خطانا الی اعدائنا فنضاربُ

جب ہماری تلواریں قاصر آ جائیں گی تو ہمارے قدم انہیں ہمارے دشمنوں تک پہنچائیں گے اور ہم انہیں ماریں گے۔

نضارب کا عطف کان پر ہے، اس لئے یہ مجزوم ہے۔ اگر نضارب مجزوم نہ ہوتا تو فنضارب نصب کے ساتھ ہوتا کبھی اذا پر ما تاکید اً ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کے ساتھ جزم دی جاتی ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

فقام ابو لیلی الیه ابن ظالم　　وکان اذا ما یسلل السیف یضرب

ابو لیلی ابن ظالم اس کی طرف اٹھا　　اور وہ جب تلوار سونت لیتا ہے تو مار دیتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: کعب بن زہیر نے جو کہا وہ عمدہ ہے:

واذا ما تشاء تبعث منها　　مغرب الشمس ناشطاً مذعوراً

اور جب تو اس سے سورج کے غروب ہونے کے وقت چلنا طلب کرے گا تو وہ اس وقت بھی ایسی تیزی سے اٹھے گی جیسے کوئی جانور شکاری سے ڈرا ہوا ہوتا ہے۔

یعنی عمدہ یہ کہ اِذَا کے ساتھ جزم نہ دی جائے جیسے اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ مبرد سے حکایت کیا گیا ہے کہ خرجت فاذا زیدٌ میں اِذَا ظرف مکان ہے کیونکہ اپنے ضمن میں جثۃ کو لئے ہوئے ہے اور یہ مردود ہے کیونکہ اس کا معنی ہے خرجت فاذا حضور زید۔ یہ مصدر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہوتا ہے جیسے دوسرے ظرف زمان تقاضا کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے

الیوم خمرٌ و غداً امرٌ۔ اس کا معنی ہے آج خمر کا وجود ہے اور کل امر کا وقوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِیْلَ یہ قول سے مشتق ہے۔ اصل میں قُوِلَ تھا۔ واؤ کے کسرہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا پھر واؤ، یاء سے بدل گئی۔ اور قِیْلَ لَهُمْ میں لام کو لام میں ادغام کرنا بھی جائز ہے اور دو ساکنوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یاء حرف مدولین ہے۔ اخفش نے کہا: قیل قاف اور یاء کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کسائی نے کہا: قاف کو ضمہ کی بو دے کر پڑھنا بھی جائز ہے تاکہ دلالت کرے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ قیس قبیلہ کی لغت ہے، اسی طرح جیء، غیض، حِیل، سیق، سیء اور سیئت (1) میں ہے۔ ہشام نے حضرت ابن عباس، رویس نے یعقوب سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ان الفاظ میں سیء اور سیئت کو نافع نے خاص طور پر اشمام سے پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے حیل اور سیق میں بھی اشمام کیا ہے اور باقی قراء نے تمام میں کسرہ دیا ہے۔ ہذیل، بنو دبیر جو اسد اور بنی فقعس سے تھے وہ اسے قُوْلَ واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تُفْسِدُوْا اس میں لا نہی ہے، فساد، صلاح کی ضد ہے، اور فساد کی حقیقت، سیدھے راستہ سے عدل کر کے اس کی ضد کی طرف جانا ہے فسد الشیء یفسُد فساداً و فسوداً و ھو فاسد و فسید آیت میں اس کا معنی ہے زمین میں کفر کر کے اور اہل کفر سے محبت کر کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور قرآن پر ایمان لانے میں جدائی کر کے فساد نہ کرو۔ بعض علماء نے فرمایا:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمین میں فساد تھا، زمین پر ہر قسم کے گناہ کیے جاتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو فساد اٹھ گیا اور زمین کی اصلاح ہوگئی۔ جب منافقین نے پھر گناہ شروع کیے تو اس کی اصلاح کے بعد فساد کیا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف: 56) (تم زمین میں فساد برپا نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِی الْاَرْضِ، الارض مؤنث اسم جنس ہے، اس کے واحد کا حق تھا کہ ارضۃ کہا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ اس کی جمع ارضات آتی ہے کیونکہ عرب ایسی مؤنث کی جمع تاء کے ساتھ بناتے ہیں جس کے آخر میں تاء تانیث نہیں ہوتی مثلاً عرسات۔ پھر علماء کہتے ہیں ارضون۔ انہوں نے اس کی جمع واؤ، نون کے ساتھ بنائی ہے اور مؤنث کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی مگر یہ کہ وہ منقوص ہو جیسے ثبۃ اور ظبۃ، لیکن انہوں نے واؤ اور نون کو الف اور تا جو حذف ہیں ان کے عوض کو ذکر کیا ہے اور را کے فتحہ کو اپنی حالت پر رکھا ہے۔ اور کبھی ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس کی جمع اروض بھی بنائی جاتی ہے۔ ابوالخطاب نے کہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ارض، اراض جیسا کہ اہل کے بارے میں کہا ہے: اھل، اھال، اور الاراضی بھی بغیر قیاس کے جمع آتی ہے۔ گویا انہوں نے آرْضاً کی جمع بنائی۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو وہ ارض ہے ارض اریضۃ یعنی پاکیزہ زمین جس کی اراضت ظاہر ہے۔ قد ارُضَتْ کا معنی ہے، پاکیزہ، عمدہ ہے۔ ابوعمرو نے کہا: نزلنا ارضًا اریضۃً یعنی ہم ایسی زمین میں اترے جو آنکھوں کو اچھی لگنے والی تھی۔ کہا جاتا ہے: لا ارض لک۔ جیسے کہا جاتا ہے: لا ام لک۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 93، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

الارض جانور کے نیچے والے پاؤں کو کہتے ہیں۔ حمید اپنے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولم یقلب ارضها البیطار　　و لا لحبلیه بها حبار

الارض سے مراد نفضة (جھاڑنا ہے) اور الرعدۃ (کپکپی) کو بھی کہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ نے قتادہ سے انہوں نے عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: بصرہ میں زمین پر زلزلہ آیا تو حضرت ابن عباس نے کہا: أزلزلت الارض ام بی ارض۔ کیا زمین لرز رہی ہے یا مجھ پر کپکپی طاری ہے۔ ذوالرمہ نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

اذا توجس رکزا من سنابکها　　او کان صاحب ارض او به الموم

جب اس کے پاؤں کی مدہم سے آواز سنتا ہے یا اسے لرزہ ہے یا اسے برسام کی بیماری ہے۔ الاَرَضُ کا معنی الزکام بھی ہے قد آرضه الله ایراضا یعنی اسے زکام لگا دیا۔ فسیلٌ مستأرِضٌ و ودیۃٌ مستأرضۃٌ (راء کے کسرہ کے ساتھ) جس کی زمین میں جڑ ہو۔ اور جب کھجور تنے پر اُگ آئے تو اسے راکب کہتے ہیں۔ الاراض اون اور بالوں کی بنی ہوئی بڑی قالین۔ رجل اریض، متواضع اور نیکی کرنے والا شخص۔ اصمعی نے کہا: کہا جاتا ہے: هو آرَضُهم ان یفعل ذلک۔ یعنی اس نے انہیں پیدا کیا۔ شیء عریض۔ اریض اس کی پیروی کرنے والا۔ بعض نے اس کو علیحدہ ذکر کیا کہ جَدْیٌ اریض یعنی موٹا دنبہ یا موٹا تحفہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَحْنُ اس کی اصل نحنُ ہے۔ حاء کی پیش نون کو دی گئی اور حاء کو ساکن کر دیا۔ یہ ہشام بن معاویہ نحوی کا قول ہے، الزجاج نے کہا: نحن جمع کے لئے ہے اور جمع کی علامت میں سے واؤ ہے اور ضمہ واؤ کی جنس سے ہے، جب نَحْنُ کو حرکت دینے کی طرف مجبور ہوئے تو انہوں نے ایسی حرکت دی جو جماعت کے لئے تھی۔ زجاج نے کہا: اسی وجہ سے واؤ جمع کو اس ارشاد میں ضمہ دیا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ (البقرہ: 16) (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو خریدا) محمد بن یزید نے کہا نَحْنُ، قبل اور بعد کی مثل ہے کیونکہ یہ دو یا زائد کی خبر دینے کے لئے ہے۔ انا، واحد کے لئے ہے نحن تثنیہ اور جمع کے لئے ہے۔ کبھی متکلم اس کے ساتھ اپنے متعلق خبر دیتا ہے جیسے نحن قمنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ (الزخرف: 32) ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو۔ اور مؤنث اس صورت میں مذکر کے قائم مقام ہوتی ہے جبکہ وہ کلام کرنے والی ہو۔ عورت کہتی ہے: قمتُ و ذهبتُ، قمنَا و ذهبنَا۔ وانا فعلتُ ذاك۔ و نحن فعلنا یہ عربوں کا کلام ہے۔ خوب جان لو!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُصْلِحُوْنَ یہ اصلح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ الصلاح فساد کی ضد ہے، صلح لام کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ ابن سکیت نے کہا ہے۔ صلوح، صاد کے ضمہ کے ساتھ صلح (بضم اللام) کا مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

فکیف باطراق اذا ما شتمتنی　　و ما بعد شتم الوالدین صلوح

جب تم مجھے گالی دو گے تو میں کیسے سر جھکاؤں گا، والدین کو گالی دینے کے بعد صلح نہیں ہوتی۔

اور صلاح مکہ کے اسماء میں سے ہے، الصلح صاد کے کسرہ کے ساتھ نہر کو کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کا فساد کرنا، اصلاح تھا۔ یعنی ہمارا کفار کی مدد کرنا اس لئے تھا کہ ہم ان کے اور مومنین کے درمیان اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

''ہوشیار وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ یہ منافقین کے قول کا رد ہے اور ان کو جھٹلانا ہے، ارباب المعانی نے کہا: جس نے دعویٰ ظاہر کیا اس نے جھوٹ بولا، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ یہ صحیح ہے ان کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ابتداء کلام میں ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: اَنّ پر فتحہ بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے جائز قرار دیا ہے۔ حقًا انك منطلق حقًا بمعنی الا ہے، اور ''هم'' اس کا مبتدا ہونا جائز ہے۔ اور المفسدون خبر ہے پھر مبتدا اور خبر، ان کی خبر ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ''هم'' انهم میں جو ہاء اور میم ہے اس کی تاکید کے لئے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہم فاصلہ ہو کوفی اس کو عماد کہتے ہیں اور المفسدون ان کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے الا انهم المفسدون جیسا کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾ کے قول میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ابن کیسان نے کہا: کہا جاتا ہے جو جانتا نہ ہو کہ وہ مفسد ہے تو اس کی مذمت نہیں ہوتی۔ مذمت تو اس کی ہوتی ہے جو جانتا ہو کہ وہ مفسد ہے پھر علم کے باوجود فساد برپا کرے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کے دو جواب ہیں یہ خفیۃً فساد کرتے تھے اور ظاہر صلاح کرتے تھے اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ ان کا یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ظاہر ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا فساد ان کے نزدیک صلاح تھا اور وہ نہ جانتے تھے کہ یہ فساد ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، حق کو ظاہر کرنے اور اس کی اتباع کو ترک کر کے۔ وَلَٰكِن یہ حرف تاکید اور استدراک ہے اس میں نفی اور اثبات ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے نفی ہو تو اس کے بعد ایجاب ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ایجاب ہو تو اس کے بعد نفی ہو گی۔ اس کے بعد ایک اسم پر اکتفا بھی جائز ہے جب پہلے ایجاب ہو۔ لیکن تو اس کے بعد ماقبل کا مخالف جملہ ذکر کرے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے اور تیرا قول ہے جاءنی زیدٌ و لکن عمرو لم یجئنی۔ اور یہ جائز نہیں جاءنی زیدٌ لکن عمرو پھر تو خاموش ہو جائے کیونکہ لکن کی جگہ بل کی وجہ سے اس جیسی مثال میں مستغنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں جائز ہے جب پہلے نفی ہو جیسے تیرا قول ہے ما جاءنی زیدٌ لکن عمرو۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

''اور جب کہا جائے انہیں: ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف؟ خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ، هم ضمیر سے مراد منافقین ہیں۔ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کرو جیسا کہ مہاجرین نے تصدیق کی اور اہل یثرب میں سے مختلف لوگوں نے تصدیق کی۔ اٰمِنُوْا میں الف قطعی ہے۔ تو کہتا ہے یؤمن، کاف نصب کے مقام پر ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ایمانا کایمان الناس۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ یعنی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ منافقین نے السُّفَهَآءُ سے اہل کتاب کے مومنین مراد لئے۔ یہ منافقین کا قول ہے۔ وہ پوشیدہ اور استہزاء کے طور پر یہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو اس پر آگاہ فرمادیا۔ اور ثابت فرمایا کہ بیوقوفی، عقلوں کا نرم ہونا، بصیرت کا فاسد ہونا، ان کی اپنی ذوات میں ہے اور ان کی صفت ہے بتایا کہ یہی بیوقوف ہیں دلوں پر چڑھی ہوئی میل کی وجہ سے جانتے نہیں ہیں، کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی جب یہود کو کہا گیا کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یعنی عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایمان لائیں جیسے السُّفَهَآءُ ایمان لائے یعنی جہال اور ناسمجھ۔ کلام عرب میں السفه کا معنی ہے خفت اور رقت، کہا جاتا ہے۔ ثوب سفیه جب کپڑے کی بنائی اچھی نہ ہو یا پرانا اور باریک ہو۔ تسفهت الریح الشجر ہوا نے درخت کو جھکا دیا۔ ذوالرمہ نے کہا:

مشین کما اهتزت رماح تسفهت اعالیها مر الریاح النواسم

وہ عورتیں چلیں جیسے نیزے حرکت کر رہے ہوں ہلکی پھلکی ہوا کے چلنے نے ان کے اوپر والے حصوں کو جھکا دیا۔

تسفهت الشیء کسی چیز کو حقیر سمجھنا۔ السفه، حلم (دانشمندی) کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: ان السفه ان یکثر الرجل شرب الماء فلا یروی۔ سفاہیت ہے کہ آدمی زیادہ پانی پیے اور سیر نہ ہو۔ السفهاء کے دونوں ہمزوں میں چار وجوہ جائز ہیں۔ عمدہ وجہ یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو ثابت کرے اور دوسرے کو واؤ سے بدل دے۔ یہ اہل مدینہ کی قرأت ہے اور ابوعمرو کی قرأت سے معروف ہے اور اگر تو چاہے تو دونوں میں تخفیف کرے۔ پہلے تو ہمزہ اور واؤ کے درمیان پڑھے اور دوسرے کو خالص واؤ کے ساتھ پڑھے۔ اگر تو چاہے تو پہلے میں تخفیف کرے اور دوسرے کو ثابت رکھے۔ اگر تو چاہے تو دونوں کو ثابت رکھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ یہ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ کی مثل ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علم، معلوم کی معرفت کو کہتے ہیں جیسا کہ وہ معلوم ہے تو کہتا ہے: علمت الشیء اعلمه علماً عرفته۔ عالمتُ الرجل فَعَلَمْتُهٗ اعلمه (لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی میں علم کے ساتھ اس پر غالب آیا۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭

"اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے

شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ آیت منافقین کے ذکر میں نازل ہوئی۔ اصل میں لقوا، لِقِيُوا تھا۔ ضمہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا اور یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ محمد بن سمیقع یمانی نے لاقوا الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اصل میں لاقیوا تھا۔ یاء کا ماقبل فتحہ تھا۔ اس لئے وہ الف سے بدل گئی پھر دو ساکن لام اور واؤ جمع ہوئے تو الف التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف ہو گیا پھر واؤ کو ضمہ کے ساتھ حرکت دی گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ لاقوا میں واؤ کو کیوں ضمہ دیا گیا اور لَقُوا میں حذف کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لَقُوا میں جو واؤ ہے اس سے پہلے ضمہ تھا۔ اگر واؤ کو ضمہ کی حرکت دی جاتی تو زبان پر اس کا تلفظ ثقیل ہوتا پس اس کے ثقل کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور لاقوا میں حرکت دی گئی کیونکہ اس سے پہلے فتحہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ

اگر کہا جائے کہ خَلَوْا کا صلہ الی کیوں ذکر ہوا جبکہ معروف یہ ہے کہ اس کا صلہ باء ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہاں خَلَوْا بمعنی ذھبوا اور انصرفوا ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

کیف ترانی قالبا مجنّی　　　اضربُ امری ظهره لبطن

قد قتل الله زیاداً عنی(1)

تو مجھے اپنی ڈھال پھیرنے والا کیسے دیکھتا ہے، میں اس کی پیٹھ پر اس کے بطن کے لئے مارتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے زیاد کو میری طرف سے قتل کر دیا ہو

جب صرف کے قائم مقام رکھا تو اس کا صلہ ذکر کیا۔

بعض علماء نے کہا: الی بمعنی مع ہے۔ اس قول میں ضعف ہے۔ بعض علماء نے کہا: الی بمعنی باء ہے(2)۔ اس کا خلیل اور سیبویہ نے انکار کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے واذا خلوا من المؤمنین الی شیاطینهم۔ اس صورت میں الی اپنے اصلی معنی میں ہوگا۔ الشیاطین، شیطان کی جمع مکسر ہے۔ اس کے اشتقاق اور اس کے معنی کے متعلق قول اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے تحت گزر چکا ہے۔

یہاں شیطان سے کون مراد ہیں؟ اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: یہ کفر کے سردار ہیں(3)۔ کلبی نے کہا: یہ جنوں کے شیاطین ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا: یہ کاہن لوگ ہیں۔ الشیطنة کا لفظ وہ ہے جس کا معنی ہے ایمان اور خیر سے دور ہونا۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ سب کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ یعنی ہمیں جس کی طرف بلایا جاتا ہے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی کیا ہے: ہم تمسخر کرتے ہیں۔ الھزء کا معنی ہے تمسخر کرنا اور دل بہلانا۔ کہا جاتا ہے: هزء به و استهزأ۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 96، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

راجز نے کہا:

قد هزئت منی ام طیسله قالت اراه معدما لا مال له

ام طیسلہ نے مجھ سے تمسخر کیا۔ اس نے کہا: میں اسے مفلس دیکھتی ہوں، اس کے پاس کوئی مال نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

قد استهزء وا منهم بالفی مدجج سراتهم وسط الصحاصح جثم

انہوں نے ان سے دو ہزار ہتھیار بندوں کے ساتھ انتقام لیا۔ ان کے سردار چٹیل زمین کے درمیان اپنی جگہ کو لازم پکڑے ہوئے تھے۔

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۝

''اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں تا کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لے گا اور انہیں سزا دے گا اور ان سے تمسخر کرے گا اور انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا۔ سزا کو گناہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ اور عرب اپنے کلام میں اس قسم کی ترکیب کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

الا لا یجهلن احدٌ علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا (1)

خبردار! کوئی ہم پر (حملہ کر کے) جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم زمانہ جاہلیت کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اس نے اپنے غلبہ کو جہل سے تعبیر کیا۔ حالانکہ کوئی صاحب عقل جہالت پر فخر نہیں کرتا۔ یہ اس نے کلام کو ملانے کے لئے جہل کا لفظ استعمال کیا ہے پس یہ زبان پر خفیف ہو جائے گا حالانکہ اس کے لفظ اور اس کے اس مفہوم کے درمیان مخالفت ہے۔ عرب جب ایک لفظ کو کسی لفظ کے مقابلہ میں بطور جواب اور جزا ذکر کرتے ہیں تو اس لفظ کی مثل ذکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ لفظ اس کے معنی کے مخالف ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40) اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ اور فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (البقرہ:194) تو جو تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر زیادتی کرو لیکن اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ جزاء، سیئۃ (برائی) نہیں ہوتی اور قصاص (بدلہ) اعتدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ قصاص تو ثابت حق ہوتا ہے۔ اسی طرح فرمایا وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ (آل عمران:54) اور یہودیوں نے (مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا ۝ وَّ اَكِیْدُ كَیْدًا ۝ (الطارق) یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اسی طرح فرمایا: اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ (البقرہ)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ مکر ہے نہ استہزاء ہے اور نہ کید ہے بلکہ یہ ان کے مکر اور استہزا کی جزا ہے اور ان کے کید کی جزا ہے۔ اسی طرح فرمایا: یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ ہُوَ خَادِعُہُمۡ (النساء:142) وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) فَیَسۡخَرُوۡنَ مِنۡہُمۡ ؕ سَخِرَ اللّٰہُ مِنۡہُمۡ (التوبہ:79) تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لا یمل حتی تملو(1) ولا یسأم حتی تساموا(2) یعنی اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا حتیٰ کہ تم اکتا جاؤ گے اور وہ ملول نہیں ہوتا حتیٰ کہ تم ملول ہو جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں حتیٰ بمعنی واؤ ہے یعنی اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض نے فرمایا: وہ تم سے تمہارے اعمال کا ثواب ختم نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم عمل چھوڑ دو گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسے افعال کرے گا جو انسان کے خیال میں استہزا، دھوکہ اور مکر ہوں گے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ آگ جم جائے گی جس طرح گھی کا تلچھٹ جم جاتا ہے۔ وہ اس آگ پر چلیں گے اور وہ انہیں نجات گمان کریں گے۔ پھر وہ انہیں دھنسا دے گی (3)۔ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا (البقرہ:14) سے مراد اہل کتاب ہیں، منافق لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اور ان کے استہزا کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں یعنی کفر کے رؤساء کے پاس جاتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ تمہارے دین پر ہیں۔ ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے تمسخر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اس تمسخر کی سزا دے گا ان کے لئے، جنت سے جہنم کا دروازہ کھولا جائے گا پھر انہیں کہا جائے گا: ادھر آؤ پس وہ آئیں گے تو وہ جہنم میں چلے جائیں گے اور مومنین اپنے پلنگوں پر بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب وہ دروازے پر پہنچیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر مومنین انہیں دیکھ کر ہنسیں گے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے، اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ۔ یعنی آخرت میں اللہ انہیں اس استہزا کی سزا دے گا جب ان پر دروازے بند ہوں گے تو مومنین ان پر ہنسیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: فَالۡیَوۡمَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡکُفَّارِ یَضۡحَکُوۡنَ ﴿ۙ۳۴﴾ عَلَی الۡاَرَآئِکِ ۙ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿ؕ۳۵﴾ (المطففین) یعنی مومنین دوزخیوں کو دیکھ رہے ہوں گے: ہَلۡ ثُوِّبَ الۡکُفَّارُ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾ (المطففین) کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایک قوم نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور استہزاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے آہستہ آہستہ دوزخ کی طرف لے جا رہا ہے اللہ تعالیٰ ان کے لئے دنیا میں احسان ظاہر کرتا ہے جبکہ عذاب آخرت ان سے چھپائے ہوئے ہے۔ پس وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر حتمی عذاب کا فیصلہ کر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب احب الدین الی اللہ عزوجل ادومہ، حدیث 41، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا، باب امر من نعس فی الصلوٰۃ، صفحہ 267، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

یہ انسان کی سوچ میں گویا استہزا، مکر اور دھوکا ہے۔ اس تاویل پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: اذا رأیتم اللہ عزوجل یعطی العبد ما یحب و ھو مقیم علی معاصیہ فانما ذلک منہ استدراج۔ جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی خواہش کے مطابق عطا فرما رہا ہے جبکہ وہ اس کی نافرمانی پر قائم ہے تو یہ اس کی طرف سے استدراج ہے، پھر اس آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۗ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام) پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں۔ کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہاں والوں کا۔ بعض علماء نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (اعراف) کی تفسیر میں فرمایا: جب وہ کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک نعمت عطا فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَمُدُّهُمْ یعنی ان کے لئے مدت لمبی کر دیتا ہے اور انہیں مہلت دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا (آل عمران: 178) (صرف اس لئے ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ گمراہی کریں)۔ اس کی اصل زیادت ہے۔ یونس بن حبیب نے کہا: کہا جاتا ہے شر کے لئے مدّ اور خیر کے لئے اَمَدّ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (الاسراء: 6) (اور ہم مسلسل تمہیں دیتے رہیں گے مال اور بیٹوں سے)۔

اور فرمایا: وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ (الطور: 22) (اور ہم مسلسل دیتے رہیں گے انہیں (ایسے) میوے اور گوشت جو وہ پسند کریں گے)۔

اخفش سے حکایت کیا گیا ہے کہ مددت لہ بولا جاتا ہے جب تو اسے ترک کر دے اور امددتہ بولا جاتا ہے جو تو اسے عطا کرے۔ فراء اور لحیانی سے مروی ہے کہ مددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جس کی زیادت اس کی مثل سے ہو۔ کہا جاتا ہے: مدّ النھر اور قرآن میں ہے وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ (لقمان: 27) (اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر) اور امددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جب اس میں زیادتی اس کے غیر سے ہو جیسے تیرا قول امددت الجیش بمدد میں نے لشکر کی کمک کے ساتھ مدد کی۔ اسی سے ہے: يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ (آل عمران: 125) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے) وامدّ الجرح (زخم میں پیپ پڑ گئی) کیونکہ پیپ زخم کے علاوہ ہے یعنی اس میں پیپ پڑ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ طُغْيَانِهِمْ یعنی کفر و گمراہی میں۔ طغیان کی اصل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) یعنی پانی بلند ہوا اور چڑھ گیا اور فرشتوں نے جو مقدار متعین کی تھی اس سے تجاوز کر گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے فرمایا: اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (طٰہٰ) یعنی اس نے دعویٰ میں اسراف کیا کہ جب اس نے کہا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿﴾ (النازعات) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر کے ساتھ ڈھیل دی حتیٰ کہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ پس وہ ان کے عذاب میں اضافہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْمَهُوْنَ مجاہد نے فرمایا: یعنی وہ کفر میں متحیر ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ اہل لغت نے بیان کیا کہ عمہ الرجل یعمہ عموھا و عمھاً فھوعمہ و عامہ کا معنی ہے آدمی حیران ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: رجل عامہ و عمہ متردد اور حیران شخص۔ اس کی جمع عمہ ہے۔ عرب کہتے ہیں: ذھبت ابلہ العمھٰی۔ جب معلوم نہ ہو کہ اونٹ کہاں چلا گیا۔ العمی آنکھ کے (اندھے پن) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور العمہ دل کے اندھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿﴾ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى سیبویہ نے کہا: اشْتَرَوُا میں واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے تاکہ واؤ جمع اور واؤ اصلیہ میں فرق ہو جائے جیسے وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ (الجن: 16)۔ (اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر)۔

ابن کیسان نے کہا: واؤ میں ضمہ دوسری حرکات کی نسبت خفیف ہے کیونکہ ضمہ واؤ کی جنس سے ہے۔ الزجاج نے کہا: ضمہ کی حرکت دی گئی ہے جیسے نحن میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اسحاق، یحییٰ بن یعمر نے التقاء ساکنین کی اصل پر واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ ابوزید انصاری نے قعنب ابی سمال عدوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے واؤ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فتحہ خفیف ہے اگرچہ اس کا ماقبل مفتوح ہے۔ کسائی نے واؤ کے ہمزہ اور اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے ادؤر، اشتروا، شراء سے مشتق ہے اور الشراء یہاں مستعار ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہوں نے ایمان پر کفر کو پسند کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (فصلت: 17)۔ یہاں شراء سے تعبیر فرمایا کیونکہ شراء اس چیز میں ہوتا ہے جس کو مشتری پسند کرتا ہے لیکن اگر شراء کا معنی معاوضۃ ہو تو پھر یہ معنی نہیں ہو گا کیونکہ منافقین مومن تھے ہی نہیں کہ وہ ایمان بیچتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: انہوں نے گمراہی کو لیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اس کا معنی ہے: انہوں نے ایمان کو بدلا اور کفر کو ایمان پر پسند کیا۔ وسعت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی بنا پر لفظ شراء کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ شرا اور تجارت، تبدیلی چاہنے کی طرف لوٹتے ہیں۔ عرب اس شخص کے لئے شرا کو استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلے۔ ابوذ ؤیب نے کہا:

ان تزعمینی کنت اجهل فیکم　　　فانی شریت الحلم بعدك بالجهل

(اگر تو مجھے گمان کرتی ہے کہ میں تم سے ناواقف ہوں تو میں نے تیرے بعد جہالت کے بدلے حلم کو اختیار کیا۔)

الضلاله کا اصل معنی حیرت ہے، نسیان کو بھی ضلالت کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ (الشعراء)

اس آیت میں ضالین بمعنی ناسین (بھولنے والے) ہے۔ ہلاکت کو بھی ضلالت کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ:10) (اور کہنے لگے کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی عادت کے مطابق ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی۔ (مثلاً) عرب کہتے ہیں: ربح بیعك و خسرت صفقتك لیلٌ و نهارٌ صائمٌ۔ (1) معنی یہ ہے کہ تو نے اپنی بیع میں نفع اٹھایا اور تو نے اپنی بیع میں خسارہ اٹھایا، تو نے رات کو قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا یعنی انہوں نے تجارت میں نفع نہ اٹھایا۔ شاعر نے کہا:

نهارك هائم و لیلك نائم　　　كذلك فی الدنیا تعیش البهائم

تو دن بھر گھومتا رہتا ہے اور رات بھر سویا رہتا ہے، دنیا میں حیوان اسی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

ابن کیسان نے کہا: تجارۃ و تجائر، ضلاله و ضلائل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (وہ گمراہی کو خریدنے میں ہدایت پانے والے نہ تھے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کی بات ہے (2)۔

الاهتداء، گمراہی کی ضد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝

”ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا مثلهم مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے خبر کاف میں ہے یہ اسم ہے جیسا کہ اعشیٰ کے قول میں ہے:

أتنتهون و لن ینهی ذوی شطط　　　كالطعن یذهب فیه الزیت و الفتل (3)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، صفحہ 99، جلد 1

کیا تم روکتے ہو جبکہ ظالم لوگ پیٹ تک پہنچنے والے تیر کی طرح نہ رکیں گے جس میں تیل اور ڈیوٹ چلی جاتی ہے۔

امرءالقیس کا شعر ہے:

ورحنا بکابن الماء یجنب وسطنا تصوب فیه العین طوراً و ترتقی

ان اشعار میں ک بمعنی مثل ہے یعنی مثل الطعن اور بمثل ابن الماء مراد لیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو: مثلھم مستقر کمثل۔ اس صورت میں کاف حرف ہوگا، المثل، المثل و المثیل تمام کا معنی ایک ہے اور اس کا معنی شبیہ ہے۔ متماثلان کا معنی متشابھان ہے۔ اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الَّذِی یہ اسم موصول واحد اور جمع کے لئے واقع ہوتا ہے۔ ابن الشجری ہبۃ اللہ بن علی نے کہا: کچھ عرب جمع کو واحد کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

وان الذی حانت بفلج دمائھم هم القوم کل القوم یا ام خالد

وہ لوگ جن کے خون بہنے کا وقت فلج کے مقام پر قریب آیا تو اے ام خالد! وہ قوم ہی کامل قوم تھی۔

(اس شعر میں الذی کو جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے)۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (الزمر) میں بھی یہی کہا ہے (یعنی الَّذِی بمعنی الذین ہے) یہ اس لغت کے اعتبار سے ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ۔ اسی لئے آگے فرمایا ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (یعنی جمع کی ضمیر ذکر فرمائی) کلام کے آغاز کو واحد پر اور آخر کو جمع پر محمول کیا، رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا (توبہ: 69) اس میں الذی مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی: خضتم کالخوض الذی خاضوا۔

بعض علماء نے فرمایا: الَّذِی اور اسْتَوْقَدَ واحد ذکر فرمایا کیونکہ آگ جلانے والا ایک تھا اگر آگ جلانا اس کے سپرد تھا۔ جب روشنی ختم ہوگئی تو ان تمام کی طرف رجوع فرمایا ..... فرمایا: بِنُوْرِهِمْ۔ اسْتَوْقَدَ بمعنی اوقد ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب ہے سین اور تاء زائدہ ہیں۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ شاعر کا قول ہے:

و داع دعا یا من یجیب الی الندی فلم یستجبه عند ذاك مجیب

پکارنے والے نے پکارا: اے آواز کا جواب دینے والے! اس وقت کسی جواب دینے والے نے جواب نہ دیا۔

نحویوں کا ''لما'' کے جواب میں اختلاف ہے اور نورھم کی ضمیر کے مرجع میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لما کا جواب محذوف ہے اور وہ طفئت ہے اور نورھم میں ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ یہ ان کی آخرت کی حالت کی خبر دی جارہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ (الحدید: 13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: اس کا جواب ''ذھب'' ہے اور نورھم میں ضمیر کا مرجع الَّذِی ہے، اس قول کے مطابق منافق کی تمثیل آگ جلانے کے ساتھ مکمل ہوگی کیونکہ آگ جلانے والے کی بقا، تاریکیوں میں جو نہیں دیکھتا، اس منافق کی بقا کی طرح ہے جو حیرت وتردد میں ہوتا ہے۔ آیت کی مراد یہ ہے کہ یہ منافقین کے لئے مثال دی گئی ہے یہ اس طرح ہے کہ جو وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں اس ایمان کی وجہ سے ان کے لئے مسلمانوں کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح، توارث، غنائم نفسوں، اولاد اور اموال پر امن وغیرہ یہ مشابہ ہے اس شخص کے جو تاریک رات میں آگ جلاتا ہے اس وجہ سے روشنی ہو جاتی ہے وہ دیکھتا ہے جس سے بچنا اور امن مناسب ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آگ بجھ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے تو اسے اذیت پہنچتی ہے اور وہ متحیر باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح منافقین جب ایمان لائے تو انہوں نے اسلام کے کلمہ کے ساتھ دھوکا کیا پھر وہ مرنے کے بعد عذاب الیم کی طرف جائیں گے جیسا کہ قرآن حکیم نے بتایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے) اور ان کا نور چلا جائے گا، اس لئے وہ کہیں گے انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید: 13)۔ ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کریں تمہارے نور سے۔ بعض علماء نے کہا: منافقین کا مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونا اور ان کے ساتھ ان کا کلام کرنا آگ کی طرح ہے اور ان کا ان کی مودت سے پھرنا اور ان کا ان سے منہ پھیر لینا اس آگ کے جانے کی طرح ہے(1)، اس کے علاوہ بھی علماء کے اقوال ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَارًا، النار مؤنث ہے یہ نور سے مشتق ہے اس کا معنی بھی روشن کرنا ہے اور اس کا الف اصل میں واؤ کو یاء سے بدلا گیا کیونکہ ماقبل کسرہ ہے۔ ضاءت اور اضاءت دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضاء القمر یضوء ضوء واضاء یضیئ۔ یہ لازم اور متعدی ہوتا ہے۔ محمد بن سمیقع نے ضاءت بغیر الف کے پڑھا ہے۔ عام لوگ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اضاءت لهم احسابهم و دجوههم دُجی اللیل حتی نظم الجزع ثاقبه

مَا حَوْلَهٗ۔ مَا زائدہ مؤکدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اضاءت کا مفعول ہے اور حولہ ظرف مکان ہے اور حالت جری میں ہے کیونکہ حول اس کی طرف مضاف ہے، ذھب اور اذھب دونوں لغتیں ہیں اور یہ ذھاب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی شے کا زوال...... وَتَرَكَهُمْ یعنی انہیں باقی رکھا۔ فِیْ ظُلُمٰتٍ یہ ظلمۃ کی جمع ہے۔ اعمش نے لام کے سکون کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے اور جنہوں نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسم اور لغت میں فرق کرنے کے لئے ایسا پڑھا ہے۔ اشہب عقیلی نے لام کے فتحہ کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ضمہ کو فتحہ سے بدلا گیا کیونکہ وہ خفیف ہے کسائی نے کہا: ظلمات، جمع الجمع ہے یہ ظلم کی جمع ہے۔ لَا یُبْصِرُوْنَ فعل مضارع حال واقع ہو رہا ہے گویا یوں فرمایا: غیر مبصرین ...... اس معنی کے اعتبار سے ظلمات پر وقف جائز نہ ہوگا۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ⑱

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 100، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں پھریں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ۔ صُمٌّ یعنی ھم صم یعنی یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت حفصہ کی قراءت میں صماً بکماً عمیاً میں بطور ذم نصب (1) بھی جائز ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا (الاحزاب:61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں وہ پائے جائیں گے)۔ اسی طرح فرمایا: وَّ امۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ ۞ (اللھب) (اور اس کی جورو بھی بدبخت ایندھن اٹھانے والی ہے)۔ شاعر نے کہا:

سقونی اتخمر ثم تکنفونی عُدَاۃَ اللہ من کذب و زور

انہوں نے مجھے شراب پلائی پھر مجھے گھیر لیا۔ اللہ! دشمنوں کی جھوٹ اور غلط بیانی پر میں مذمت کرتا ہوں۔

اس شعر میں عداۃ اللہ بطور ذم منصوب ہے۔ اس مذہب کے مطابق مبصرون پر وقف صحیح ہے اور صما کو ترکھم کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے۔ گویا فرمایا: ترکھم صما بکما عمیا۔ انہیں بہرہ، گونگا، اندھا چھوڑ دیا۔ اس مذہب کے مطابق یبصرون پر وقف بہتر نہ ہوگا۔ الصمم کا معنی عرب کلام میں بند ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے؟ قناۃ صماء ایسا نیزہ جو اندر سے کھوکھلا نہ ہو صممت القارورۃ میں نے بوتل کو بند کر دیا۔ فالاصم جس کے کان کے سوراخ بند ہوں۔ الابکم جو نہ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے اور جو سمجھتا ہو بولتا نہ ہو اسے اخرس کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اخرس اور ابکم ایک ہی ہیں۔ کہا جاتا ہے: رجل ابکم و بکیم یعنی جو پوری طرح گونگا ہو، گونگا پن بالکل ظاہر ہو۔ شاعر نے کہا:

فلیت لسانی کان نصفین منھما بکیمٌ و نصف عندی مجری الکواکب

العمی، کا معنی بینائی کا چلا جانا، عمی فھو اعمی، قوم عمیٌ، اعماہ اللہ، تعامی الرجل جو آدمی اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرے۔ عمی علیہ الامر، جب معاملہ ملتبس ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَمِیَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ یَوۡمَئِذٍ (القصص:66) (اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں اس دن) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے مقصود ان کے حواس سے جملہ ادراکات کی نفی نہیں بلکہ ایک مخصوص جہت سے ان کی نفی مقصود ہے۔ تو کہتا ہے: فلان اصمُّ عن الخنا۔ شاعر نے کتنا خوب کہا ہے:

اصم عما ساء ہ سمیع۔ یعنی بری بات سننے سے بہرہ اس کے علاوہ کو خوب سننے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

دعوراء الکلام صممت عنھا ولو انی اشاء بھا سمیع

ٹیڑھی کلام والی، اس سے میں بہرہ ہوں اگر میں چاہوں تو اسے خوب سننے والا ہوں۔

دارمی نے کہا:

اعمی اذا ما جارتی خرجت حتی یواری جارتی الجدر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں اندھا ہوتا ہوں جب میری پڑوسن نکلتی ہے حتیٰ کہ میری پڑوسن کو دیواریں چھپا لیتی ہیں۔

کسی نے ایک شخص کو وصیت کی جو اکثر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا:

أُدْخُلُ اذا ما دخلت اعمی   وَاخْرُجْ اذا ماخرجت اخرس

جب تو بادشاہ کے پاس جائے تو اندھا ہو کر داخل ہو اور جب تو نکلے تو گونگا ہو کر نکل۔

قتادہ نے کہا: وہ حق سننے سے بہرے ہیں، حق کہنے سے گونگے ہیں، حق دیکھنے سے اندھے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی مراد ہے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا جو آپ نے آخر زمانہ کے والیوں کے متعلق حدیث جبریل میں فرمایا۔ واذا رایت الحفاۃ العراۃ الصم البکم ملوك الارض فذاك من اشراطھا۔ (جب تو دیکھے کہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن، (حق سننے سے) بہرے، (حق کہنے سے) گونگے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے(1))۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں تھا کہ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ رجع بنفسہ رجوعاً رجعہ غیرہ کہا جاتا ہے یعنی یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ ہذیل کہتے ہیں: ارجعہ غیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ (سبا: 31) یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کریں گے۔ جیسا کہ قرآن نے سورۃ سبا میں بیان فرمایا ہے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۞

"یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو۔ ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ طبری نے کہا: اَوْ بمعنی واؤ ہے(2)۔ فراء نے یہی کہا ہے۔

وقد زعمت لیلیٰ بانی فاجر   لنفسی تقاھا او علیھا فجورھا

لیلیٰ نے کہا کہ میں گنہگار ہوں میرے نفس کے لئے تقویٰ ہے اور اس کے خلاف اس کا فجور ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نال الخلافۃ اوکانت لہ قدراً   کما اتی ربہ موسی علی قدر

اس نے خلافت کو پایا اور خلافت اس کا مقدر تھی جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں آئے جو ان کے حق میں مقدر تھا۔

ان اشعار میں او بمعنی واؤ ہے۔ بعض نے فرمایا: اَوْ تخییر کے لئے ہے۔

یعنی تم ان منافقوں کو اس سے تشبیہ دو یا اس سے، کسی ایک امر پر اکتفا نہیں۔ معنی ہے: او کاصحاب صیب۔ یا وہ بارش

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 29، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

والوں کی طرح ہیں۔ الصیب سے مراد بارش ہے۔ یہ صاب یصوب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: نازل ہونا۔ علقمہ نے کہا:

فلا تعدلی بینی و بین مغمر　　　　سقتك روایا المذن حیث تصوب

میرے اور جاہل کے درمیان برابری نہ کر بادل تجھے سیراب کرے جہاں برسے۔

صیب اصل میں صیوبٌ تھا۔ واؤ اور یا جمع ہوئے پہلا ان میں سے ساکن ہے اس لئے واؤ یا سے بدلی اور پھر مدغم ہوگئی جیسا کہ میت، ھین اور لینٌ میں کہا گیا ہے۔ بعض کوفیوں نے کہا: اس کی اصل صوِیبٌ ہے فعیلٌ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا: اگر اس طرح اس کی اصل ہوتی تو اس کا ادغام جائز نہ ہوتا جیسا کہ طویل میں ادغام جائز نہیں ہے۔ صیب کی جمع صیایب ہے۔

تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: مثلھم کمثل الذی استوقد ناراً او کمثل صیب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ السَّمَآءِ، السماء، مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمیة، سموات اور سمی (بروزن فعول) بنائی جاتی ہے۔ عجاج نے کہا:

تلفه الریاح والسُّمی

ہواؤں اور بارشوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔

السَّمَآءِ ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو اور تجھ پر سایہ کرے وہ سماء ہے۔ اسی وجہ سے گھر کی چھت کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آسمان سے اترتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

دیارٌ من بنی الحسحاس تقر　　　　تعفیها الروامس والسماء

بنی حسحاس کے گھر چٹیل میدان ہیں۔ ہواؤں اور بارش نے ان کے نشانات مٹا دیئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

اذا سقط السماء بارض قوم　　　　رعیناہ وان کانوا غضابا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش برستی ہے تو ہم اس زمین پر چراتے ہیں اگرچہ اس کے مالک ناراض بھی ہوں۔

مٹی اور گھاس کو بھی سماء کہا جاتا ہے۔ مازلنا نطأ السماء حتی اتیناکم۔

ہم گھاس اور مٹی کو روندتے رہے حتیٰ کہ ہم تمہارے پاس پہنچے۔

گھوڑے کی پیٹھ کو بھی اس کے بلند ہونے کی وجہ سے سماء کہا جاتا ہے۔

و احمر کالدیباج اما سماؤہ　　　　فریا و اما ارضه فمحول

ریشم کی طرح سرخ ہے، رہی اس کی پیٹھ تو وہ بہت عمدہ ہے اور اس کے پاؤں بڑے سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیْهِ ظُلُمٰتٌ یہ مبتدا خبر ہیں (و رعد و برق) معطوف علیہ ہے۔ ظلمات جمع ذکر فرمایا یہ اشارہ ہے رات کی تاریکی اور بادل کی تاریکی کی طرف، تہ در تہ تاریکی ہے اس لئے جمع ذکر فرمایا، اس کی وضاحت پہلے ذکر ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

علماء کا رَعْدٌ کے متعلق اختلاف ہے۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رَعْدٌ کے متعلق پوچھا کہ یہ (کڑک) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے (جو بادل پر مقرر ہے) اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانک کر لے جاتا ہے جہاں اللہ چاہتا ہے۔ یہود نے کہا: یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ فرشتہ بادل کو جھڑکتا ہے جب وہ اسے جھڑکتا ہے حتی کہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ یہود نے کہا: آپ نے سچ کہا (1)۔ الخ

اس تفسیر پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔ پس الرعد (کڑک) سنی جانے والی آواز کا اسم ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا۔ یہ لغت عرب میں معلوم ہے۔

لبید نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

فجعنی الرعد و الصواعق

مجھے کڑک اور بجلیوں نے ڈرایا......

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: الرعد ایک ہوا ہے۔ بادل کے درمیان چھا جاتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے (2)۔

البرق کے بارے میں اختلاف ہے، حضرات علی، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ البرق لوہے کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ بادل کو چلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی کی حدیث سے یہی ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ یہ نور کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ بادل کو جھڑکتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ البرق فرشتہ ہے جو نظر آتا ہے۔

فلاسفہ کہتے ہیں: الرعد بادل کے اجرام کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز ہے اور اجرام کے ٹکراؤ سے جو آگ چمکتی ہے وہ البرق ہے۔ یہ قول مردود ہے اس کی نقل صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ کہا جاتا ہے: رَعْدٌ کی اصل حرکت سے ہے۔ اسی سے الرعدید، (بزدل کی کپکپی) ہے، ارتعد کا معنی ہے: حرکت کرنا، اس معنی میں حدیث ہے: فجیء بھما ترعد فرائصھما (4) (ان دونوں کو لایا گیا تو ان کے کندھوں کا گوشت حرکت کر رہا تھا)۔ یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

البرق کا اصل معنی چمک اور روشنی ہے۔ اسی سے البراق ہے وہ سواری جس پر معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سوار ہوئے۔ رعدت السماء، یہ الرعد سے ہے جس کا معنی ہے: گرج، اور برقت، البرق سے ہے اور رعدت المرأۃ وبرقت، عورت جب بناؤ سنگھار کر کے سامنے آئے، رعد الرجل و برق، جب

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 140، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 102، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

آدمی دھمکی دے اور ڈرائے۔

ابن احمر نے کہا:

یا جُل ما بعدت علیك بلادُنا و طلابنا فابرق بارضك وارعد

اے جل! تجھ پر ہمارے شہر اور ہمارے مطلوب تجھ سے کتنے ہی دور ہو گئے ہیں اب تو اپنی زمین کو ڈرا دھمکا دے۔

ارعد القوم و ابرقوا یعنی قوم کو کڑک اور بجلی نے آلیا۔ ابو عبیدہ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے: ارعدت السماء و ابرقت۔ آسمان گرجا اور بجلی چمکی۔ ارعد الرجل و ابرق فلاں نے دھمکی دی اور ڈرایا۔ اصمعی نے اس کا انکار کیا ہے اور اس پر اس کے خلاف کمیت کے قول سے حجت پکڑی گئی ہے۔

ابرق و ارعد یا یزید فما وعیدك لی بضائر

اے یزید! تو دھمکی دے تیری دھمکی مجھے کچھ مضر نہیں۔

اصمعی نے کہا کمیت حجت نہیں ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ہم حضرت عمر کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ایک سفر میں تھے اور ہمارے ساتھ حضرت کعب الاحبار بھی تھے۔ فرمایا: تیز ہوا چلنے لگی، بادل گرجنے لگا اور شدید بارش اور ٹھنڈک ہو گئی۔ لوگ گھبرا گئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مجھے کعب الاحبار نے کہا جس نے کڑک کی آواز سن کر کہا سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ تو اس بادل، ٹھنڈک اور بجلی میں جو مصیبت ہوگی اس سے وہ بچا لیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اور کعب نے یہ کلمات پڑھے جب صبح ہوئی تو لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! لوگوں میں جو گھبراہٹ تھی وہ ہم میں نہ تھی۔ حضرت عمر نے پوچھا: وہ کیسے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے حضرت عمر سے حضرت کعب کی بات کہی تو حضرت عمر نے کہا: سبحان اللہ! کیوں تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہم بھی وہ کہتے جیسا تم نے کہا۔ ایک روایت میں ہے، ٹھنڈک حضرت عمر کے ناک کو لگی اور اس نے حضرت عمر پر اثر کیا۔ یہ روایت ان شاء اللہ سورۃ رعد میں آئے گی۔ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے تابعین سے صحابہ کی روایات میں دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کڑک اور بجلیوں کو سنتے تو یہ دعا کرتے: اللھم لا تقتلنا بغضبك ولا تھلکنا بعذابك وعافنا قبل ذالك۔ (1) اے اللہ! تو ہمیں اپنے غضب کے ساتھ ہلاک نہ کر اور تو ہمیں اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور ہمیں اس سے پہلے عافیت دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالنا اس لئے تھا تا کہ وہ قرآن نہ سنیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لے آئیں یہ ان کے نزدیک کفر ہے اور کفر موت ہے۔ الاصابع کے واحد

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 183، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، ابواب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ، باب مایقول اذا سمع الرعد، حدیث نمبر 3372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پانچ لغتیں ہیں: اصبع ہمزہ کے کسرہ اور با کے فتحہ کے ساتھ۔ اُصبع، ہمزہ کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ ہمزہ اور با کے فتحہ کے ساتھ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، دونوں کے کسرہ کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے اسی طرح اذن (کان) مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس میں تخفیف، تثقیل اور تصغیر بنائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: اذینة۔ اگر تو اذن کے ساتھ کسی کا نام رکھے تو اس کی تصغیر بنائے گا تو کہے گا: اذین، پھر یہ مؤنث استعمال نہ ہوگا کیونکہ مذکر کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے اس سے تانیث زائل ہوگئی۔ رہا عربوں کا قول: اذینۃٌ اسم علم تو اس کے ساتھ مصغر نام رکھا گیا ہے، اذن کی جمع آذان آتی ہے۔ تو کہتا ہے: اذنتہ جب تو اسے کان پر مارے، رجلٌ اُذُنٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر ایک کا کلام سنے اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ اذانی بڑے کانوں والا۔ نعجة اذناء، کبشٌ آذن (کانوں والی بھیڑ اور دنبہ) و اذنت النعل وغیرھا تاذینًا جب تو جوتے وغیرہ کے کان بنائے، و اذنت الصبی جب تو بچے کا کان ملے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی بجلیوں کی وجہ سے۔

الصواعق، جمع ہے صاعقۃٌ کی۔ حضرات ابن عباس اور مجاہد وغیرہما نے کہا: جب الرعد فرشتہ زیادہ غضبناک ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے یہی صواعق ہے۔ اسی طرح خلیل نے کہا۔ فرمایا: یہ رعد کی آواز سے شدید ہوتی ہے، اس کے ساتھ کبھی آگ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ گرتا ہے اسے جلا دیتا ہے۔ ابوزید نے کہا: الصاعقہ آگ ہے جو سخت کڑک میں آسمان سے گرتی ہے، خلیل نے ایک قوم سے الساعقة (سین کے ساتھ) حکایت کیا ہے۔ ابوبکر نقاش نے کہا، کہا جاتا ہے: صاعقة، صعقة و صاقعةٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ حسن نے من الصواقع (قاف کی تقدیم کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اسی سے ابوالنجم کا شعر ہے:

يحكون بالمصقوله القواطع تشقق البرق عن الصواقع

نحاس نے کہا: یہ بنی تمیم اور بعض بنی ربیعہ کی لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: صعقتهم السماء، جب آسمان لوگوں پر بجلی گرا دے۔ الصاعقة، عذاب کی ایک چیخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (فصلت: 17) (تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے)۔ کہا جاتا ہے: صعق الرجل صعقة و تصعاقاً یعنی اس پر چھا گئی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف: 143)

اصعقه غیرہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا۔

ابن مقبل نے کہا:

ترى النعرات الزرق تحت لبانه أحاد و مثنى اصعقتها صواهله

اس کے سینے کے نیچے نیلی آنکھوں والی مکھیاں ایک ایک، دو دو دیکھتا ہے اس کے ہنہنانے نے ان کو قتل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (الزمر: 68) (یعنی فوت ہو گیا جو آسمانوں میں تھا اور جو زمین میں تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے احوال کو تشبیہ دی ہے ان چیزوں کے ساتھ جو بارش میں تاریکیاں، کڑک، چمک اور بجلیوں میں سے ہوتی ہیں۔

ظُلُمٰتٌ ان کے کفریہ اعتقادات کی مثال ہے۔ کڑک اور چمک اس کی مثال ہے جس کے ساتھ انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بارش سے مثال دی کیوں کہ اس میں ان پر بہت سی مشکلات تھیں۔ العمی سے مراد تاریکیاں ہیں اور جو اس میں وعید اور زجر ہے وہ کڑک ہے اور اس میں جو نور اور دلائل باہرہ ہیں جو کبھی ان پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بجلی ہے۔ الصَّوَاعِقِ یہ مثال ہے جو قرآن میں جلدی میں جنگ کی طرف نکلنے کی دعوت دی ہے اور تاخیر میں وعید دی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصواعق شرع کی تکالیف ہیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے مثلاً جہاد، زکوۃ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَذَرَ الْمَوْتِ، حذر اور حذار دونوں کا ایک معنی ہے اور دونوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ یہ سیبویہ نے کہا: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مصدر ہے۔ سیبویہ نے ایک شعر کہا ہے:

واغفر عوراء الكريم اذخاره　　　و اَعْرِضُ عن شتم اللئيم تكرماً

میں کریم شخص کی جہالت کو اس کے تعلق کو ذخیرہ کے لئے معاف کر دیتا ہوں اور لئیم آدمی کی گالی سے تکرماً اعراض کرتا ہوں۔

فراء نے کہا: یہ تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ الموت، حیاۃ کی ضد ہے، مات یموت و یمات استعمال ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

بنيتي سيدة البنات　　　عيشي ولا يؤمن ان تماتي

اے میری بیٹی! بیٹیوں کی سردار تھی تو زندہ رہے تیری موت سے امن نہیں۔

فهو ميِّت و مَيْت، قوم موتى و اموات و ميتون و ميتون و المُوات۔ الموت اور الموات ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو۔ الموات اس زمین کو کہتے ہیں جس کا کوئی انسان مالک نہ ہو اور نہ اس سے کوئی نفع اٹھاتا ہو۔ المَوَتان، یہ حیوان کا مخالف ہے۔ کہا جاتا ہے: اشتر الموتان ولا تشتر الحيوان یعنی زمینیں اور گھر خرید، غلام اور جانور مت خرید مُوتان اس موت کو کہتے ہیں جو جانوروں میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع في المال مُوتان، اماته الله و موّته۔ مبالغہ کے لئے تشدید ذکر کی گئی۔ شاعر نے کہا

فعروة مات موتا مستريحاً　　　فها نذا اموت كل يوم

عروہ تو آرام کی موت مر گیا میں ہوں کہ ہر روز مرتا ہوں

اماتت الناقة، جب اونٹنی کا بچہ مر جائے، فهي مميت و مميتةٌ۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح اماتت امرأۃٌ ہے جس عورت کا بچہ مر جائے۔ اس کی جمع مماویت ہے۔ ابن سکیت نے کہا: امات فلان جب کسی کا ایک یا بہت سے بیٹے فوت ہو جائیں۔ المتماوت، ریاکار عبادت کرنے والے کی صفت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ موت مائتٌ، جیسے تیرا قول ہے ليلٌ لائلٌ۔ اس لفظ سے صفت کا صیغہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تاکید لگائی جاتی ہے المستميت للأمر۔ ڈھیلا کام کرنے والا۔ رؤبہ نے کہا:

و زبد البحر له كتيت　　　والليل فوق الماء مستميت

اور سمندر کی جھاگ اس کے لئے آواز ہے اور رات پانی کے اوپر سستی سے گزرنے والی ہے۔

المستمیت، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں موت کی پروا نہیں کرتا۔

حدیث پاک میں ہے: اری القوم مستمیتین (1) وہ لوگ جو موت پر جنگ کرتے ہیں۔ المُوتة، جنون اور مرگی کی ایک جنس ہے جو انسان کو لاحق ہوتی ہے جب اسے افاقہ ہوتا ہے تو پوری عقل اس کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے سونے والے اور نشہ والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مُؤتۃ (میم کے ضمہ اور واو کے ہمزہ کے ساتھ) اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی وہ اس سے فوت نہیں ہوں گے۔ کہا جاتا ہے: احاط السلطان بفلان جب بادشاہ کسی کو سختی سے پکڑ لے اور ہر جہت سے اس کا محاصرہ کر لے۔ شاعر نے کہا:

احطنا بهم حتى اذا ما تيقنوا بما قد رأوا مالوا جميعا الى السلم

ہم نے ان کا گھیراؤ کیا حتیٰ کہ جب انہوں نے اس کا یقین کر لیا جو انہوں نے دیکھا تو وہ تمام صلح کی طرف مائل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ (الکہف: 42) (اور اس کا (باغ) برباد ہو گیا)۔

اصل میں مُحْيِط تھا یاء کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور یا کو ساکن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا احاطہ کرنے والا ہے یعنی وہ اس کے قبضہ اور اس کے غلبہ کے تحت ہے جیسا کہ فرمایا: وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الزمر: 67) (ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن)۔ بعض علماء نے فرمایا: مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کا معنی ہے انہیں جاننے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۠ (الطلاق) (اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ انہیں ہلاک کرنے والا اور انہیں جمع کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (یوسف: 66) (مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے)۔ یعنی تم تمام ہلاک کئے جاؤ۔ کافروں کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ آیت میں پہلے ان کا ذکر ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی بینائی جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس (کی روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، یکاد بمعنی یقارب ہے۔ کہا جاتا ہے: کاد یفعل کذا جب کوئی شخص کام کرنے کے قریب ہو اور کرے نہیں۔ غیر قرآن میں جائز ہے یکاد ان یفعل، جیسا کہ رؤبۃ نے کہا:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 948

قد كاد من طول البلى ان يمصحا

قریب ہے کہ لمبی آزمائش ختم ہو جائے۔

یہ المصح سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ختم ہو جانا، مٹ جانا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خبر بغیر ان کے ہو کیونکہ یہ حال کی مقاربت کے لئے آتا ہے اور ان کلام کو زمانہ مستقبل کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہ منافات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ (النور)

عرب کلام میں ہے: کاد النعام یطیر، شتر مرغ اڑنے کے قریب ہے۔ کاد العروس ان یکون امیرا، دولہا امیر ہونے کے قریب ہے ان کے اس حالت کے قریب ہونے کی وجہ سے۔ کاد فعل متصرف ہے فَعِلَ یفعل کے وزن پر۔ اس کی خبر کبھی اسم ہوتی ہے لیکن یہ بہت قلیل ہے۔ تابط شرا نے کہا: وما کدت آئبا میں لوٹنے کے قریب نہ ہوا۔ کرب، جعل، قارب اور طفق بغیر ان کے خبر استعمال ہونے میں کاد کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: 22) (اور وہ دونوں چپٹانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے)۔

یہ تمام الفاظ حال اور مقاربت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ حال کے ساتھ ان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، الخطف کا معنی ہے تیزی سے اچک لینا۔ ایک پرندے کو اس کی تیزی کی وجہ سے خطاف کہا جاتا ہے۔ پس جس نے قرآن کو تخویف (ڈرانے) کے لئے بنایا ہے معنی یہ ہے کہ جو ان پر نازل ہوتا اس کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اچک نہ لے اور جس نے قرآن کو بیان کے لئے مثال بنایا جو قرآن میں ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس بیان آیا جو ان پر غالب آ گیا یخطَفُ اور یخطِف دونوں لغتیں ہیں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ خطِفه یخطَفه خطفاً یہ عمدہ لغت ہے اور دوسری لغت کو اخفش نے بیان کیا ہے خطَف یخطِفُ۔

جوہری نے کہا: یہ قلیل اور ردی لغت ہے معروف نہیں۔ یونس نے اس لغت کے ساتھ اس آیت کو پڑھا ہے: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ۔ نحاس نے کہا: يَخْطَفُ میں سات وجوہ ہیں: قراءت فصیحہ یخطف ہے۔ علی بن الحسین اور یحییٰ بن وثاب نے یخطف طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سعید اخفش نے کہا: یہ بھی ایک لغت ہے۔ حضرات حسن، قتادہ، عاصم جحدری، ابو رجاء العطاردی نے یا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: بعض اہل مدینہ نے خا کے سکون اور طا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی، اخفش اور فراء نے کہا: یخطف یا، خا، طا کے کسرہ کے ساتھ جائز ہے۔ یہ چھ وجوہ ہیں جو لکھنے میں موافق ہیں۔ ساتویں صورت جسے عبدالوارث نے بیان فرمایا ہے، فرمایا: مصحف ابی بن کعب میں میں نے دیکھا یتخطف لکھا ہوا تھا۔ سیبویہ اور کسائی نے کہا کہ جس نے یخِطِف خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے نزدیک اس کی اصل یختطف ہے پھر تا کو طا میں ادغام کیا گیا۔ دو ساکن جمع ہوئے تو خا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: جس نے خا کو فتحہ دیا اس نے تا کی حرکت اسے دی۔ کسائی نے کہا: جس نے یا کو کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے

کہ اختطف میں الف مکسورہ ہے اور فراء نے اہل مدینہ سے جو خاء کا سکون اور ادغام حکایت کیا ہے وہ معروف نہیں اور جائز نہیں کیونکہ اس میں دو ساکنوں کو جمع کرنا ہے یہ نحاس وغیرہ نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: حسن اور ابو رجاء سے یخطف مروی ہے۔ حضرت ابن مجاہد نے کہا: میں اسے غلط گمان کرتا ہوں، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے خطف الخطفة۔ کسی نے بھی اسے فتحہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔

اَبْصَارَهُمْ یہ بصر کی جمع ہے یہ دیکھنے کا حاسہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ حجج قرآنیہ اور براہین ساطعہ ان پر روشن ہونے کے قریب تھے اور جنہوں نے الْبَرْقُ کو ڈرانے کے لئے مثال بنایا ہے ان کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ جوان پر مصیبت اتری ہے قریب ہے ان کی آنکھیں اچک لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ، كُلَّمَآ منصوب ہے کیونکہ یہ ظرف ہے اور جب کلما بمعنی اذا ہو تو یہ موصولہ ہوتا ہے۔ اس میں عامل مشوا ہے اور مشوا ہی اس کا جواب ہے، اس میں اضاء عامل نہیں ہے کیونکہ وہ ما کے تتمہ میں ہے اور مبرد کے قول کے مطابق مفعول محذوف ہے۔ اس کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: کلما اضاء لھم البرق الطریق۔ (یعنی جب بجلی نے ان کے لئے راستہ روشن کر دیا۔)

بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ فعل اور افعل ہم معنی ہوں، جیسے سکت اور اسکت ہم معنی ہیں۔ پس اضاء اور ضاء برابر ہوں گے۔ مفعول کے حذف کی تقدیر کی ضرورت نہ رہے گی۔ فراء نے کہا: ضاء، اضاء پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ قرآن سنتے ہیں اور ان کے لئے حجج (دلائل) ظاہر ہوتے ہیں تو وہ مانوس ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے ہیں اور جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا ہے جس میں وہ اندھے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہ ہوتے ہیں یا انہیں اس کا مکلف بنایا جاتا ہے تو قَامُوْا وہ اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جب کھیتوں اور مواشی میں ان کے حالات درست ہوتے ہیں، نعمتیں متواتر ملتی ہیں تو کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مبارک ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور کسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ناراض ہوتے ہیں اور اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود اور قتادہ سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا یہ قول عمدہ ہے اور اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (الحج: 11) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے۔

علماء صوفیہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال بیان فرمائی ہے جس کے ابتداءً احوال ارادت درست نہیں ہوتے، پس وہ اپنے دعاوی کے ساتھ ان احوال سے اکابر کے احوال تک بلند ہوتا ہے، گویا اس پر ارادت کے احوال روشن ہوتے اگر وہ ارادت کے اداب کی ملازمت کے ساتھ ارادت کو صحیح کرتا۔ جب اس نے ارادت میں دعاوی کی ملاوٹ کر دی تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ انوار لے گیا اور اسے اپنے دعووں کی تاریکیوں میں چھوڑ دیا۔ اب وہ ان تاریکیوں سے خروج کا راستہ نہیں دیکھتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ بدر میں مدد کی گئی تو انہوں نے طمع کیا اور کہا: اللہ کی قسم! یہی وہ نبی ہے جس کی ہمیں موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ جب احد میں شکست کا سامنا ہوا تو یہ لوگ مرتد ہو گئے اور شک کرنے لگے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ یہ آیت منافقین کے متعلق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے اصح قول ہے اور معنی تمام اقوال کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ''لو'' یہ حرف تمنا ہے۔ اس میں جزا کا معنی ہے۔ اس کا جواب لام یعنی جس جملہ پر لام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو مومنین کو ان پر مطلع کر دیتا پھر ان سے اسلام کی عزت چھین لیتا، مومنین کو ان پر غلبہ عطا فرما کر اور انہیں قتل کر کے اور انہیں مسلمانوں سے باہر نکال کر۔

یہاں سمع اور بصر کو خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہو چکا ہے یا اس لئے کہ یہ انسان میں معزز چیزیں ہیں۔ باسماعھم بھی پڑھا گیا ہے۔ اس پر کلام پہلے اسی جز میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس میں عموم ہے متکلمین کے نزدیک جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جائز ہے، اس پر اس کی قدرت مراد ہے۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدیر کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ قدیر، قادر اور مقتدر ہے۔ قدیر میں قادر کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ زجاجی نے کہا ہے: ہروی نے کہا: قدیر، قادر دونوں کا ایک معنی ہے۔ کہا جاتا ہے: قدرتُ علی الشیء اَقدِرُ قدراً و قَدَراً و مقتدرۃ و مقدُرۃ و قدراناً (یعنی قدرۃ) الاقتدار علی الشیء کا مطلب اس پر قدرت ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر، مقتدر اور قدیر ہے۔ ہر ممکن چیز پر جو وجود اور عدم کو قبول کرتی ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے، اسے قدرت ہے، اپنے علم اور اختیار سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور انسان پر یہ جاننا بھی واجب ہے کہ بندہ کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ کوئی کام کرتا ہے وہ قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عادۃً پیدا فرمائی، بندہ اس قدرت کا مختار نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت خاص طور پر ذکر فرمائی، کیونکہ پہلے ایک ایسے فعل کا ذکر گزرا ہے جو وعید اور خوف دلانے کو متضمن ہے، پس یہاں قدرت کا ذکر ہی مناسب تھا۔

یہ بیس آیات ہیں، کوفیوں کی تعداد کے مطابق چار آیات مومنین کی شان میں پھر دو آیات کافروں کے ذکر میں ہیں اور بقیہ تمام منافقین کے بارے میں ہیں۔ اس کے متعلق روایت ابن جریج سے گزر چکی ہے۔ یہ مجاہد کا بھی قول ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ علقمہ اور مجاہد نے کہا: ہر وہ آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ہر آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ہے وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کا رد اس سے ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ اور سورۂ نساء مدنی ہیں۔ ان میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ آیا ہے۔ رہا یہ کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْٓا جس سورت میں ہے وہ مدنی ہے۔ یہ قول صحیح ہے۔ عروہ بن زبیر نے کہا: ہر حد اور ہر فرض مدینہ طیبہ میں نازل ہوا اور جہاں امم اور عذاب کا ذکر ہے وہ مکہ میں نازل ہوا۔ یہ واضح ہے۔

''یا''، یٰٓاَیُّھَا میں حرف ندا ہے۔ ای منادیٰ مفرد مبنی برضمہ ہے۔ کیونکہ لفظ میں وہ منادیٰ ہے اور ھا تنبیہ کے لئے ہے۔ النَّاسُ مرفوع ہے کیونکہ ای کی صفت ہے۔ یہ جمہور نحویوں کے نزدیک ہے، سوائے مازنی کے۔ انہوں نے یا ھذا الرجل میں نصب کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ای کو ضمہ دیا گیا ہے جس طرح مقصود مفرد کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ھا کو دوسری یا کے عوض ذکر کیا یا کو ذکر نہیں کیا تاکہ کلام منقطع نہ ہو جائے۔ ھا کو ذکر کیا تاکہ کلام متصل رہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا تو نے یا کو دوبارہ ذکر کیا۔ اور اسم ان دونوں کے درمیان ہو گیا جس طرح وہ کہتے ہیں: ھا ھوذا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب دو حرف تعریف سے خالی منادیٰ کی صورت میں ذکر کیے اور اس پر معرف باللام المقصود بالنداء کے احکام پر جاری کیے اور اس کے رفع کا التزام کیا کیونکہ وہ مقصود بالنداء ہے، پس انہوں نے ایسی حرکت کے ساتھ اس کو اعراب دیا جس کا وہ مستحق تھا اگر اس کے ساتھ حرف ندا ملا ہوا ہوتا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ منادیٰ ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ النَّاسُ سے کون مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کفار مراد ہیں جنہوں نے عبادت نہ کی۔ اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ (البقرہ:23) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ پس مومنین کے لئے خطاب ہمیشہ عبادت کرتے رہنے کے لئے ہے اور کفار کے لیے عبادت شروع کرنے کے لئے ہے۔ یہ قول عمدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُعْبُدُوْا یہ عبادت کا حکم ہے۔ یہاں عبادت سے مراد اس کی توحید کا اقرار اور اس کے دین کی شرائع کا التزام ہے۔ عبادت کی اصل خضوع اور تذلیل ہے، کہا جاتا ہے: طریق معبدۃ، جب راستہ قدموں سے روندا گیا ہو طرفہ نے کہا: وظیفا وظیفاً فوق مور معبد۔ میں موٹی پنڈلیوں والی اونٹنی کے پیچھے روندے ہوئے راستہ کے اوپر چلا۔

عبادت کا معنی طاعت ہے۔ التعبد کا معنی التنسک (احکام بجالانا) عبدت فلاناً میں نے اسے غلام بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ خَلَقَكُمْ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ عرب اس بات کے مقر تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور حجت اس کو ذکر کیا اور انہیں متنبہ کرنے کے لئے اس صفت کو ذکر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا تاکہ انہیں اپنی نعمت یاد دلائے جو اس نے ان پر کی ہوئی ہے۔ الخلق کی اصل میں دو وجہیں ہیں:

ا۔ تقدیر۔ کہا جاتا ہے خلقت الادیم للسقاء جب تو چمڑے کو مشکیزے کے لئے کاٹنے سے پہلے اندازہ کرے تو یہ جملہ بولے۔ شاعر نے کہا:

ولانت تفری ما خلقت و بعـ ض القوم یخلق ثم لایفری

تو وہ ہے کہ جس کا تو اندازہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ کرتے ہیں پھر اس کام کو کر نہیں سکتے۔

حجاج نے کہا: ما خلقت الافریت ولا وعدت الا وفیت یعنی میں نے کبھی اندازہ نہیں کیا مگر اسے کر گزرا۔ اور میں نے کبھی

وعدہ نہیں کیا مگر میں نے اسے پورا کیا۔

۲۔ خلق کا دوسرا معنی انشاء، اختراع اور ابداع ہے (یعنی پیدا کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (عنکبوت: 17) اور تم گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے نزدیک ان کی تخلیق ثابت تھی تو دوسروں کی تخلیق بھی ان کے نزدیک ثابت تھی (تو پھر پہلے لوگوں کی تخلیق کا ذکر کیوں کیا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کو تنبیہ اور تذکیر کے لئے جاری فرمایا تا کہ نصیحت میں بلیغ ہو جائے۔ انہیں پہلے لوگ یاد دلائے تا کہ وہ جان لیں کہ جس ذات نے ان سے پہلے لوگوں کو موت دی اور وہ ان کا بھی خالق ہے، انہیں بھی مارے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں میں غور و فکر کریں کہ وہ کیسے تھے اور کن امور کی بناء پر ہلاک ہوئے، تا کہ وہ جان لیں کہ انہیں بھی مبتلا کیا جائے گا جیسے وہ لوگ مبتلا کیے گئے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لعل اعبدوا کے متعلق ہے، خَلَقَكُمْ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہے اس نے انہیں تقویٰ کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ اس قسم کا کلام جو کلام الٰہی میں وارد ہے مثلاً لعلکم تعقلون، لعلکم تشکرون، لعلکم تذکرون، لعلکم تھتدون، تو اس میں تین تاویلات ہیں:

۱۔ لعل ترجی اور توقع کے معنی میں ہے اور ترجی اور توقع یہ بشر کی حیز میں ہے۔ گویا انہیں کہا گیا یہ کرو اس امید پر کہ تم سمجھ جاؤ، تم نصیحت حاصل کرلو اور متقی بن جاؤ۔ یہ سیبویہ اور زبان عرب کے رؤساء کا قول ہے۔ سیبویہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق کہا: اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ) اس کا معنی ہے تم اپنی اس طمع اور رجا پر جاؤ کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا یا ڈرے گا۔ اس قول کو ابو المعالی نے پسند کیا ہے۔

۲۔ عرب لعل کو شک سے پاک لام کی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا تا کہ تم سمجھ جاؤ، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو تا کہ تم متقی بن جاؤ۔ اس پر شاعر کا قول دلالت کرتا ہے:

وقلتم لنا کفوا الحروب لعلنا   نکف و وثقتم لنا کل موثق

فلما کففنا الحرب کانت عھودکم   کلمع سراب فی الملاء متالق

تم نے ہمیں کہا: جنگ روک لو تا کہ ہم رک جائیں اور تم نے ہمیں ہر پختہ عہد دیا۔ جب ہم نے جنگ کو روک لیا تو تمہارے عہد صحرا میں سراب کی چمک کی طرح تھے۔

مطلب یہ ہے کہ کفوا الحروب لنکف۔ جنگ کو روکو تا کہ ہم روک لیں۔ اگر لعل یہاں شک کے لئے ہوتا تو وہ ان کے لئے ہر پختہ عہد نہ کرتے۔ یہ قول قطرب اور طبری سے منقول ہے۔

۳۔ لعل اس معنی میں ہے کہ کسی شے سے تعرض کرنا۔ گویا کہ کہا گیا: یہ کرو تعرض کرتے ہوئے تا کہ سمجھ جاؤ یا نصیحت حاصل کرلو، یا متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا معنی ہے تا کہ تم امر الٰہی کی قبولیت کو اپنے اور آگ کے درمیان بچاؤ کا ذریعہ بنا لو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے اتقاہ بحقہ۔ جب تو اس کے حق کو قبول کرے گویا اس نے اسے اپنا حق دے کر اس کے مطالبہ

سے بچاؤ حاصل کرلیا، اسی سے حضرت علی کا قول ہے: کنا اذا احمر البأس اتقینا بالنبی ﷺ (1)۔ جب جنگ شدید ہوجاتی تو ہم نبی کریم ﷺ کی ذات کو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بناتے، عنترہ نے کہا۔

ولقد کررت المهر یدمی نحره　　حتی اتقتنی الخیل یا بنی حذیم

میں نے گھوڑے کو پلٹایا حالانکہ اس کا سینہ زخمی تھا حتیٰ کہ گھوڑوں نے مجھے میرے بیٹے حذیم کے ساتھ بچایا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲

''وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل حالانکہ تم جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: الَّذِیْ جَعَلَ۔ یہاں جَعَلَ بمعنی صیّر ہے۔ کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے، جَعَلَ، خلق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ (المائدہ:103) نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور سائبہ۔ اور ارشاد ہے جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام:1) اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو یہ سمی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے حٰمٓ ۝ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا یعنی ہم نے اس کا نام قرآناً عربیاً رکھا، اور ارشاد ہے وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (الزخرف:15) اور بنادی ہے (مشرکوں نے) اس کے لئے اس کے بندوں سے جز اور وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (الزخرف:19) اور انہوں نے ٹھہرالیا ہے فرشتوں کو جو خداوند رحمٰن کے بندے ہیں عورتیں۔ ان تمام ارشادات میں جَعَلَ بمعنی سمّی ہے یعنی نام رکھنا۔

اور خلق اخذ کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے شاعر نے کہا:

وقد جعلت نفسی تطیب لضغمة　　لضغمهما ها یقرع العظم نابها

اس میں جَعَلَ، خلق اور اخذ کے معنی میں ہے۔

کبھی جَعَلَ زائدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

و قد جعلت اری الاثنین اربعة　　والواحد اثنین لما هدنی الکبر

میں نے دو کو چار دیکھا اور ایک کو دو دیکھا جب مجھے بڑھاپے نے آلیا۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام:1) میں بھی کہا گیا ہے کہ یہاں جَعَلَ زائدہ ہے۔ جَعَلَ اور اجتعل ایک معنی میں ہیں۔ شاعر نے کہا:

ناط امر الضعاف واجتعل اللیـ　　ـل کحبل العادیة الممدود

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فی غزوۃ حنین، صفحہ 101-100، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں اجتعل بھی جعل ہے۔

فِرَاشًا وہ بچھونا جو لوگ بچھاتے ہیں اور اس پر قرار پکڑتے ہیں اور وہ جگہیں جو بچھونا نہیں ہیں جیسے پہاڑ، نشیبی علاقے، سمندر یہ بچھونے کے مصالح میں سے ہیں کیونکہ پہاڑ کیلوں کی طرح ہیں جیسے فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ (النباء) کیا ہم نے نہیں بنا دیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔ اور سمندر، منافع کے حصول کے لئے ان پر سواری کی جاتی ہے جیسے فرمایا: وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ (البقرہ: 164) اور جانوروں میں سے جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائیں جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو۔

مسئلہ نمبر 2: شوافع نے کہا: اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ بستر پر رات نہیں گزارے گا یا چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا پھر اس نے زمین پر رات گزاری اور سورج کی دھوپ میں بیٹھا تو وہ حانث نہ ہوگا کیونکہ لفظ عرفاً ان کی طرف راجع نہیں ہوتا۔

مالکی علماء فرماتے ہیں: ایمان کی قسمیں نیت یا سبب یا بساط پر محمول ہوں گی جس پر قسم جاری ہوئی۔ اگر یہ نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے گھر کے لئے چھت۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء: 32) (ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت سے) محفوظ ہے ہر وہ چیز جو بلند ہو اور سایہ کرے اسے سماء کہا جاتا ہے، اس کے متعلق پہلے کلام گزر چکی ہے۔ تتقون پر وقف کی نسبت بناء پر وقف زیادہ بہتر ہے کیونکہ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ رب کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے: بنی فلان بیتا و بنٰی علی اهله۔ فلاں نے گھر بنایا، اپنی بیوی سے شب زفاف گزاری۔ عام لوگ کہتے ہیں: بنی باهله۔ یہ غلطی ہے۔ گویا اس میں اصل یہ ہے کہ جو اپنے گھر والوں کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ پر دخول کی رات قبہ بناتا ہے پس اپنے اہل کے پاس جانے والے کو بانِ کہتے ہیں۔ بنّی کثرت کے لئے تشدید ذکر کرتے ہیں۔ ابتنٰی دارا و بنی دونوں کا ایک معنی ہے۔ اس نے گھر بنایا۔ اسی سے بنیان الحائط ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھنا حتیٰ کہ دیوار قائم ہو جائے۔

الماء کی اصل موہٌ ہے۔ ماقبل فتحہ کی وجہ سے واؤ متحرک کو الف سے بدلا گیا تو تو نے کہا ماہٌ۔ پھر دو حرف خفی ملے تو هاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہ زیادہ پختہ ہے اور یہ الف کے زیادہ مشابہ ہے۔ تو تو نے کہا: ماءٌ۔ پہلا الف فعل کا عین کلمہ ہے اور اس کے بعد وہ ہمزہ ہے جو ھا کا بدل ہے اور ہمزہ کے بعد الف ہے جو تنوین کا بدل ہے۔ ابو الحسن نے کہا: بصریوں کے نزدیک صرف دو الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ اگر تو چاہے تو تین الف کے ساتھ لکھے۔ جب عرب اس کی جمع بناتے ہیں یا تصغیر بناتے ہیں تو اصل کی طرف لوٹاتے ہیں۔ کہتے ہیں: مُوَیْهٌ، و امواہ و میاہٌ جیسے جمال و اجمالٌ۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ، الثَّمَرٰتِ ثمرة کی جمع ہے کہا جاتا ہے ثمر جیسے شجر۔ کہا جاتا ہے ثمر جیسے خشب، کہا جاتا ہے ثمر مثل بُدنٌ۔ ثمار جیسے اکام یہ ثمر کی جمع ہے اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ثمار السیاط کوڑے کے اطراف کی گرہیں۔ آیت کا معنی ہے، ہم نے تمہارے لئے مختلف

رنگ کے پھل اور مختلف قسم کے نبات نکالے۔ یہ رزقاً تمہارے کھانے اور تمہارے جانوروں کے لئے چارہ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے اس کی وضاحت کردی اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ۙ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ (عبس)

بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور طرح طرح کے پھل اور گھاس سامان زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے۔ رزق پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

اگر کہا جائے کہ پھلوں میں جو اس نے نکالا اس پر تملک (مالک ہونا) سے پہلے رزق کے اسم کا اطلاق کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کیونکہ وہ اس لائق ہیں کہ ان کا مالک ہوا جائے اور ان میں انتفاع صحیح ہو۔ پس یہ رزق ہے۔

مسئلہ نمبر 5: میں کہتا ہوں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر مخلوق سے غنی کر دیا ہے۔ صحیح حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے پھر اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اٹھا کر لے آئے تو اس کے لئے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے خواہ وہ اسے عطا کرے یا عطا نہ کرے(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں ''لکڑیاں اٹھائے'' کے معنی میں تمام صنعتوں میں مشغول ہونا ہے۔ پس جس نے حرص، امید اور دنیا کی چمک میں رغبت کے سبب اپنے جیسے انسان کی طرف اپنے نفس کو محتاج بنایا تو اس نے اس شخص کی طرف کو پکڑا جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے مدمقابل بنایا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فقر کا راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ تو زمین کو بچھونا بنا، آسمان کو پردہ بنا، پانی کو پاک مشروب، گھاس کو کھانا بنا۔ دنیا کے سبب مخلوق میں سے کسی کی عبادت نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تجھے عطا فرمایا جو تیری زندگی کے لئے ضروری تھا۔ اس میں کسی انسان کا تجھ پر احسان نہیں ہے۔ نوف البکالی نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو دیکھا، وہ باہر نکلے اور ستاروں کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا: اے نوف! کیا تو سویا ہوا ہے یا دیکھ رہا ہے؟ میں نے کہا: اے امیر المومنین! میں دیکھ رہا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دنیا سے دلچسپی نہ رکھنے والوں اور آخرت میں رغبت کرنے والوں کو مبارک ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بساط بنایا، اس کی مٹی کو بچھونا بنایا، اس کے پانی کو پاکیزہ رزق بنایا۔ قرآن اور دعا کو اندر اور باہر کا لباس بنایا، حضرت مسیح علیہ السلام کے طریقہ پر دنیا کو ترک کر دیا...... باقی حدیث بھی ذکر کی (2)۔ اسی سورت میں اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ: 186) کے تحت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6: فَلَا تَجْعَلُوْا۔ یہ نہی ہے۔ انداداً۔ ہم پلہ، امثال اس جیسے، اس کا واحد نِدٌّ ہے۔ محمد بن سمیقع نے ندّاً پڑھا ہے۔ شاعر نے کہا

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 199، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسالۃ، حدیث نمبر 1378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 79

نحمد الله ولا ندله عنده الخير و ما شاء فعل

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں، اس کا کوئی مدمقابل نہیں، اسی کے پاس ساری خیر ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حضرت حسان نے کہا:

أتهجوه ولست له بندّ فشركما لخيركما الفداء

کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بکواس کرتا ہے، تو تو اس کا ہم مثل ہی نہیں۔ پس تم میں سے برا تم میں سے بہتر کے لئے قربان ہو جائے۔

کہا جاتا ہے: ندٌّ و ندیدٌ و ندیدۃ سب کا معنی مدمقابل ہے۔ لبید نے کہا:

لكيلا يكون السندري نديدتي واجعل اقوامًا عمومًا عماعما

تاکہ سندری میرا مقابل نہ ہو اور میں جمع شدہ قوم کو جدا جدا نہ کر دوں

ابوعبیدہ نے کہا: اَنْدَادًا کا معنی ہے: اضداداً (مدمقابل)۔ نحاس نے کہا: اَنْدَادًا پہلا مفعول ہے اور لِلّٰہ دوسرے مفعول کی جگہ ہے۔ جوہری نے کہا: الند (بفتحہ نون) آسمان کی طرف بلند ٹیلے کو کہتے ہیں اور خوشبو میں سے النَدّ عربی میں نہیں ہے۔ نَدّ البعیر ینِدّ نِداً و ندادًا و ندوداً، جدھر منہ آئے بھاگ جانا۔ اسی سے بعض نے یوم التناد پڑھا ہے نَدّد بہ یعنی اس نے اسے شہرت دی۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں اور جملہ حال واقع ہو رہا ہے، خطاب کافروں اور منافقین کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف علم کے ساتھ کیسے بیان فرمایا اس کے برعکس ختم، طبع، الصمم اور العمی کے ساتھ پہلے ان کا وصف بیان کیا۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

۱۔ وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے مراد علم خاص ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پانی کو نازل کیا، رزق کو اگایا۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہی انعام فرمانے والا ہے، نہ کہ اس کے مقابل (جو انہوں نے خود بنا رکھے ہیں)۔

۲۔ معنی یہ ہے کہ تم بالقوۃ اور بالامکان اس کی وحدانیت کو جان لیتے ہو اگر تم غور و فکر کرتے۔ واللہ اعلم۔ اس میں دلیل ہے عقلی دلائل کے استعمال کے امر پر اور تقلید کو باطل کرنے پر۔

ابن فورک نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مومنین کو بھی شامل ہو۔ معنی یہ ہوگا: اے مومنو! مرتد نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل نہ بنانا اس علم کے بعد کہ اللہ ایک ہے(1)۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 106، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

بلالو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ یعنی اگر تم شک میں ہو، مِّمَّا نَزَّلْنَا یعنی القرآن۔ اس آیت کا مخاطب مشرک ہیں جن کو چیلنج کیا گیا کیونکہ انہوں نے جب قرآن سنا تو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ ہم اس میں شک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیت میں اپنی وحدانیت وقدرت پر دلالت کو ذکر کیا تو اس کے بعد اپنے نبی کی نبوت پر دلالت کو ذکر کیا کہ وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ اس کا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے۔

عَبْدِنَا: یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ عبد، تعبد سے ماخوذ ہے جس کا معنی عجز وانکساری کرنا، غلام کو عبد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کے سامنے عجز اور خضوع کا اظہار کرتا ہے۔ طرفہ نے کہا:

الی ان تحامتنی العشیرۃ کلھا و افردت افراد البعیر المعبد

یہاں تک کہ پورے خاندان نے مجھے روکا اور مذلل اونٹ جدا ہونے کی طرح میں جدا ہو گیا۔

بعض علماء نے کہا: جب عبادت معزز ترین خصلت ہے اس کے ساتھ نام رکھنا معزز ترین درجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عبد کہہ کر ذکر فرمایا۔

یا قوم قلبی عند زھراء یعرفه السامع والرائی

لا تدعنی الا بیا عبدھا فانه اشرف اسمائی

اے میری قوم! میرا دل زہراء کے پاس ہے جس کو ہر سامع اور دیکھنے والا جانتا ہے۔ وہ مجھے نہیں پکارتی مگر یا عبد کہہ کر، کیونکہ یہ میرے معزز ناموں میں سے ہے۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ فاء جواب شرط ہے۔ تو لے آؤ ایک سورت کیونکہ یہ مجئی کے باب سے ہے۔ یہ ابن کیسان نے کہا ہے، یہ امر کا صیغہ ہے اور یہاں اس کا معنی عاجز کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سورت لانے سے ان کا عجز معلوم تھا۔ السورۃ، السور کا واحد ہے اس کے متعلق کلام اس سورت میں اور اعجاز قرآن کی بحث میں گزر چکا ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ من مثلہ میں "مِنْ" زائدہ ہے جیسا کہ فاتوا بسورۃ مثلہ کہا ہے اور مثلہ کی ضمیر کا مرجع جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے جیسے حضرات قتادہ، مجاہد وغیرہما۔

بعض مفسرین نے فرمایا: اس کا مرجع تورات اور انجیل ہیں معنی یہ ہوگا کہ تم اس کی مثل کتاب سے سورت لے آؤ، کیونکہ تورات وانجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں جو اس میں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کوئی سورت لاؤ کسی ایسے بشر سے جو آپ کی مثل ہو جو نہ لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو۔ ان دونوں تاویلوں پر من تبعیضیہ ہوگا اور مثلہ پر وقف تام نہ ہوگا کیونکہ وادعوا کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ، شُهَدَآءَ سے مراد مددگار اور حمایتی ہیں۔ فراء نے کہا: اس سے مراد ان کے

معبود (بت) ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: اگر کہا جائے کہ یہاں شہداء کا ذکر کیسے کیا۔ شہداء تو اس لئے ہوتے ہیں تا کہ وہ کسی امر کی گواہی دیں یا کسی امر کی خبر دیں جو انہوں نے دیکھا ہو۔ انہیں تو کہا گیا ہے: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے علماء میں سے جو پاؤ ان سے مدد طلب کرو اور انہیں لے آؤ تا کہ وہ دیکھیں جو تم لے کر آتے ہو۔ تو یہ تمام لوگوں پر رد، حجت قائم کرنے کے اعتبار سے زیادہ مؤکد ہے۔ میں کہتا ہوں: مجاہد کے قول کا یہی معنی ہے۔ مجاہد نے کہا: اُدْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ کا معنی ہے: لوگوں کو بلاؤ جو تمہارے لئے گواہی دیں کہ تم نے قرآن کا مقابلہ پیش کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: شُهَدَآءَكُمْ فعل کے ساتھ اس کو نصب دی گئی ہے اور یہ شهید کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: شاهدٌ، و شهيدٌ، جیسے قادر و قديرٌ۔

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی الله کے سوا دوسروں سے، دُوْنِ کا لفظ فوق کی نقیض (متضاد) ہے اور یہ غایت سے کمی کرتا ہے۔ یہ ظرف ہوتا ہے۔ الدون، حقیر اور خسیس کو کہتے ہیں

اذا ما علا المرء رام العلاء　　ويقنع بالدون من كان دونا

جب کوئی انسان بلند ہوتا ہے تو بلندی کا قصد کرتا ہے اور خسیس آدمی، پستی پر قناعت کرتا ہے۔

دُوْنِ کے لفظ سے فعل مشتق نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں: دان يدون دوناً اور کہا جاتا ہے: هذا دون ذالك یعنی یہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ کسی چیز پر برانگیختہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے: دُوْنَكه (تم اسے پکڑو)۔ تمیم نے حجاج کو کہا: اقبرنا صالحاً ہمیں اجازت دے کہ ہم صالح کی قبر کھودیں۔ حجاج نے صالح کو سولی پر لٹکایا تھا تو حجاج نے کہا: دونكموه تم اسے لے لو اور دفن کردو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ''اگر تم سچے ہو'' اس میں جو تم نے کہا ہے کہ تم قرآن کے مقابلہ پر قادر ہو، مشرکوں نے کہا تھا: لو نشاء لقلنا مثل هذا (اگر ہم چاہیں تو ہم اس کی مثل کہہ سکتے ہیں)۔ صدق (سچائی) یہ کذب (جھوٹ) کا متضاد ہے۔ کہا جاتا ہے: و قد صدق في الحديث، اس نے بات سچی کی، الصدق، نیزوں میں سخت۔ کہا جاتا ہے: صدقوهم القتال۔ انہوں نے ان کو جنگ کے بارے سچی بات بتائی۔ الصديق جو ہمیشہ سچ بولتا ہو۔ کہا جاتا ہے رجلٌ صدق (سچا آدمی)۔ جیسے کہا جاتا ہے: نعم الرجل (اچھا آدمی) الصداقة، یہ الصدق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اخلاص اور محبت میں سچا ہونا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

''پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یعنی اگر تم یہ چیلنج پورا نہ کر سکو۔ وَ لَنْ تَفْعَلُوْا یعنی تم اس کی ہرگز طاقت نہیں رکھو گے۔

اس صورت میں صٰدِقِیْنَ پر وقف، وقف تام ہوگا۔ اکثر مفسرین نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے تم اپنے حمایتیوں کو بلاؤ اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو اور تم ایسا ہرگز نہیں کرسکو گے۔ اگر تم ایسا نہ کرسکو تو آگ سے ڈرو۔ اس تفسیر پر صٰدِقِیْنَ پر وقف مکمل نہ ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ لم پر ان کیسے داخل ہوا حالانکہ ایک عامل، دوسرے عامل پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اِنْ لفظ میں عاملہ نہیں ہے۔ پس یہ لم پر داخل ہوگیا جیسے کہ یہ ماضی پر داخل ہو جاتا ہے، لم میں یہ عمل نہیں کر رہا جس طرح یہ ماضی میں عمل نہیں کرتا۔ پس ان لم تفعلوا کا معنی ہے: ان ترکتم الفعل اگر تم یہ فعل چھوڑ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔ لن کے ساتھ فعل منصوب ہے عربوں میں سے کچھ لوگ اسے جزم دیتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے جزم والا قول ذکر کیا ہے۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے

فلن اعرض ابیت اللعن بالصفد (1)

میں جناب کے فضائل عطا کی خاطر بیان نہیں کر رہا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جب انہیں خواب میں آگ کی طرف لے جایا گیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: مجھے کہا گیا: لن تُرَعْ (تم نہ ڈرو) یہ اسی لغت کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَنْ تَفْعَلُوْا میں ان کے ارادوں کو ابھارنا اور ان کے نفوس کو حرکت دینا ہے تاکہ اس کے بعد ان کا عجز پھر سے ظاہر ہو جائے، یہ ان غیوب سے ہے جن کی خبر قرآن نے ان کے وقوع سے پہلے دی (2)۔ ابن کیسان نے کہا: وَلَنْ تَفْعَلُوْا ان کو اس بات سے روکنا ہے کہ یہ قرآن حق ہے اور وہ اپنے اس گمان میں سچے نہیں ہیں کہ یہ قرآن جھوٹ ہے اور یہ گھڑا گیا ہے اور یہ جادو ہے اور یہ شعر ہے اور یہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہے وہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اس کی مثل ایک سورت بھی پیش نہیں کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ یہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کا جواب ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے آگ سے بچو۔ التقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمیم اور اسد قبائل کی لغت فتقوا النار ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: تقی یتقی جیسے قضٰی یقضی۔

النار مفعول ہے التی اس کی صفت ہے۔ التی میں تین لغات ہیں التی، اللتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ) اللتْ (تاء کے سکون کے ساتھ) یہ مؤنث کے لئے اسم مبہم ہے اور یہ معرفہ ہے اس کو نکرہ بنانے کے لئے اس سے الف لام ہٹانا جائز نہیں ہے اور اس کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا مگر صلہ کے ساتھ۔ اس کے تثنیہ میں بھی تین لغات ہیں: اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتانّ (نون کی تشدید کے ساتھ) اس کی جمع میں پانچ لغات ہیں: اللاتی، یہ قرآن کی لغت ہے، اللاتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر یاء کے) اللواتی، واللوات (بغیر یاء کے)

ابوعبیدہ نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

من اللواتی واللتی واللاتی زعمن ان قد کبرت لداتی

ان سب کا گمان ہے کہ وہ سب عمر رسیدہ ہو چکی ہیں۔

اللوا، (تاء کے سقوط کے ساتھ) یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ابن شجری نے یہ زیادہ کیا ہے اللائی (ہمزہ اور یاء کے اثبات کے ساتھ) اور اللاء (ہمزہ کے کسرہ اور یاء کے حذف کے ساتھ) واللا (ہمزہ کے حذف کے ساتھ) اگر تو اس کی جمع الجمع بنائے تو تو اللاتی میں کہے گا: اللواتی۔ اور اللائی میں کہے گا: اللوائی۔ اور جوہری نے کہا: التی کی تصغیر اللتیا (فتح اور تشدید کے ساتھ)۔ الراجز نے کہا:

بعد اللتیا واللتیا والتی اذا علتها انفس تردتِ

ان کے بعد جب وہ بلندی پر پہنچیں تو تھک ہار کر ہلاک ہو گئیں۔

بعض شعراء نے اَلّتِیْ پر حرف ندا داخل کیا اور حرف ندا ایسے اسم پر داخل نہیں ہوتا جس پر الف لام ہوتا ہے مگر صرف یا اللہ میں۔ گویا اس نے اسے اسم جلالت سے تشبیہ دی ہے اس حیثیت سے الف لام اس سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

من اجلك يا التی تيمت قلبی وانت بخيلة بالود عنی

تیری وجہ سے اے وہ محبوبہ! تو نے میرے دل کو غلام بنالیا ہے جبکہ مجھ سے محبت کرنے میں بخل کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے: وقع فلان واللتيا والتی۔ یہ دونوں مصیبت کے اسماء میں سے ہیں یعنی فلاں مصیبت میں واقع ہوا۔

الوقود، اس کا معنی لکڑی، ایندھن ہے، جبکہ واو کے فتحہ کے ساتھ ہو اور واو کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی روشن ہونا ہے۔

النَّاسُ اس میں عموم ہے لیکن مراد خاص لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ آگ کا ایندھن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آگ سے بچائے۔

الْحِجَارَةُ یہ سیاہ گندھک کا پتھر ہے۔ حضرت ابن مسعود اور فراء سے یہ مروی ہے، اس پتھر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ عذاب دینے میں پانچ اعتبار سے دوسرے تمام پتھروں سے زیادہ ہے، جلدی جلتا ہے، بدبودار ہے، دھواں زیادہ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ سختی سے چمٹ جاتا ہے، جب گرم ہوتا ہے تو باقی تمام پتھروں سے زیادہ گرم ہوتا ہے (1)۔ **وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ** میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے انسان اور پتھر کے علاوہ اس آگ میں کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیات میں جنوں اور شیاطین کے آگ میں ہونے کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **الْحِجَارَةُ** سے مراد بت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ** (الانبیاء: 98) (تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جہنم کا ایندھن ہیں)۔ اس اعتبار سے پتھر اور لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے یہ آگ کی بڑائی کے لئے ذکر فرمایا ہے کہ وہ آگ اتنی سخت ہے کہ لوگوں کو جلانے کے ساتھ ساتھ پتھروں کو بھی جلا دیتی ہے۔ پہلی تاویل پر انہیں آگ اور پتھروں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر اذیت دینے والا آگ میں ہے اور اس تاویل میں دو وجہیں ہیں: (۱) جو دنیا میں لوگوں کو اذیت دے گا اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے آگ سے عذاب دے گا۔ (۲) وہ لوگ جو دنیا میں درندوں وغیرہ کو آگ میں عذاب دیتے ہیں وہ دوزخیوں کی سزا کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ بعض اہل تاویل کا یہ خیال ہے کہ یہ آگ جو پتھروں کے ساتھ خاص ہے یہ خاص کافروں کی آگ ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور آپ کی مدد کرتے ہیں، کیا یہ خدمت انہیں کچھ نفع دے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے اسے آگ کی سختیوں میں پایا پھر میں نے اسے چھوٹے سے گڑھے کی طرف نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے نچلے درجے میں ہوتے (1)۔ وقود یہ ترکیبی اعتبار سے مبتدا ہے اور النَّاسُ اس کی خبر ہے اور الْحِجَارَةُ اس پر معطوف ہے۔ حضرات حسن، مجاہد، طلحہ بن مصرف نے اسے وقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ عبید بن عمیر نے اسے وقیدھا الناس پڑھا ہے۔ کسائی اور اخفش نے کہا: الوقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایندھن ہے اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی جلانا ہے۔ کہا جاتا ہے: وقدت النار تقد وُقوداً ووقداً وَقِدَةً و وقیداً و وَقداً و وَقَدَاناً یعنی آگ روشن ہوئی، اوقدتھا انا واستوقدتھا میں نے آگ کو جلایا۔ الاتقاد، التوقد کی مثل ہے یعنی روشن ہونا۔ اسم ظرف موقد ہے جیسے مجلس، النار موقَدَةٌ آگ جلائی گئی۔ الوقدۃ۔ سخت گرمی کو کہتے ہیں یہ دس دن یا پندرہ دن ہیں۔ نحاس نے کہا: اس صورت میں اسے وقود واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس کا معنی ایندھن ہے۔ لیکن اخفش نے کہا: حکایت کیا گیا ہے کہ بعض عرب وَقود اور وُقود دونوں کو ایندھن اور مصدر کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اکثر علماء کا پہلا قول ہے۔ مثال دی کہ وَضوء واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی پانی ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ اس ارشاد کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے علاوہ اس میں داخل نہ ہوں گے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے مواقع پر گنہگاروں کے لئے وعید آئی ہے اور احادیث جو شفاعت کو ثابت کرتی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مسلمان بھی آگ میں جائیں گے۔ اس آیت میں اہل حق کے قول کی دلیل ہے کہ آگ موجود ہے اور تخلیق ہو چکی ہے جبکہ معتزلہ کا قول اس کے مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔ اسی قول کو قاضی منذر بن سعید البلوطی الاندلسی نے بھی اختیار کیا ہے۔ مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اچانک آپ ﷺ نے ایک آواز سنی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک پتھر ہے جو ستر سال پہلے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شفاعۃ النبی ﷺ لابی طالب والتخفیف عنہ بسببہ صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے دوزخ کی آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اب تک آگ میں گرتا ہے حتیٰ کہ اس کی گہرائی تک پہنچ گیا ہے (1)۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آگ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ آگ نے کہا: میرے اندر جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر ضعیف اور مسکین لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو فرمایا: تو میرا عذاب ہے تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ اس پر رحمت کروں گا۔ تم میں سے ہر ایک نے بھرنا ہے (2)۔ مسلم نے اس کا مفہوم نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: احتجت بمعنی تحتج ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابن مسعود کی حدیث کا مفہوم ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنت اور دوزخ نماز کسوف میں دکھائی گئیں۔ اسی طرح شب معراج میں جنت اور دوزخ کو دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں داخل بھی ہوئے (3)۔ پس جو اس کا مخالف قول کرے اس کا کوئی اعتبار نہیں سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

أُعِدَّتْ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ النَّارَ سے معدۃً کے معنی میں حال ہو اور قد مضمر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (النساء:90) اس کا معنی ہے: قد حصرت صدورھم۔ حالانکہ قد مضمر ہے قد کے اضمار کا قول اس لئے کیا ہے کیونکہ ماضی قد کے ساتھ حال ہوتا ہے۔ اس صورت میں الْحِجَارَةُ پر وقف تام نہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ أُعِدَّتْ کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے فرمایا وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ (فصلت:23) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے انہیں ہلاک کر دیا)۔

سجستانی نے کہا: أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ، التی کے صلہ سے ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمایا وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ (آل عمران) (اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے) ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں التی کا صلہ وَّقُوْدُهَا النَّاسُ موجود ہے۔ پس اسے دوسرے صلہ کے ساتھ ملانا جائز نہیں اور سورۂ آل عمران میں أُعِدَّتْ کے علاوہ کوئی صلہ ہے ہی نہیں۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لئے باغات ہیں۔ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل، (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب جھنم اعاذنا اللہ منھا، صفحہ 381، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (و۔ ت)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ النساء مع الرجال فی الکسوف، حدیث 994، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی جزا کا ذکر فرمایا تو مومنین کی جزا کا بھی ذکر فرمایا: تبشیر کا مطلب ہے: ایسی چیز کی خبر دینا جس کا اثر جلد پر ظاہر ہو۔ پہلی خبر جو تجھ پر وارد ہوتی ہے اس کے ساتھ جلد میں تبدیلی ظاہر ہوتی ہے پھر یہ عام طور پر خوشی کے لئے استعمال ہونے لگا ایسی خبر کی قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہو اور کبھی غیر مقید بھی استعمال ہوتا ہے اور غم اور شر کے لئے تبشیر استعمال نہیں ہوتا مگر اس شر پر قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الانشقاق) (تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی)۔ کہا جاتا ہے: فأبشر، واستبشر وبشر یبشر جب کوئی خوشی ہو تو اس وقت بولا جاتا ہے۔ وجہ بشیر اس کو کہا جاتا ہے جو خوبصورت ہو اور جس کی خوبصورتی بالکل واضح ہو۔ البشریٰ جو کچھ خوشخبری والے کو دیا جاتا ہے۔ تباشیر الشیء چیز کا ابتدائی حصہ۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مکلف (عاقل بالغ) جب یہ کہے کہ جو میرے غلاموں میں سے اس بات کی بشارت دے گا وہ آزاد ہے۔ ایک غلام نے پہلے اسے بشارت دی پھر دوسرے غلاموں نے بشارت دی تو ان میں سے پہلا آزاد ہوگا دوسرا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی کہے میرے غلاموں میں سے جس نے مجھے فلاں بات کی خبر دی تو وہ آزاد ہے، تو کیا اس میں دوسرا پہلے کی مانند ہے؟ شوافع نے کہا: ہاں کیونکہ ان میں سے ہر ایک مخبر ہے۔ ہمارے علماء (مالکی) نے کہا: نہیں کیونکہ مکلف اس خبر کا قصد کرتا ہے جو بشارت ہوتی ہے اور یہ پہلے غلام کے ساتھ خاص ہے اور یہ عرفاً معلوم ہے پس قول کو عرف کی طرف پھیرنا واجب ہے۔ محمد بن الحسن نے اخبرنی اور حدثنی کے قول میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب کوئی شخص کہے: جس غلام نے مجھے فلاں خبر دی یا مجھے ایسا ایسا بتایا تو وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی نیت نہیں ہے، پس اس غلام نے اسے کتاب، یا کلام یا پیغام رسانی کے ذریعے وہ خبر دی تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ خبر ہے اس کے بعد اس کے کسی غلام نے بھی خبر دی تو وہ بھی آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس نے کہا تھا جو غلام مجھے خبر دے گا وہ آزاد ہے، اگر سب غلام یہ خبر دیں گے تو سب آزاد ہو جائیں گے۔ اگر اس نے قسم اٹھاتے وقت بالمشافہ کلام کے ذریعے خبر دینے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے صرف وہی آزاد ہوگا جو بالمشافہ کلام کے ساتھ وہ خبر دے گا اور جب کہے: أيُّ غلامٍ لي حدثني۔ تو یہ بالمشافہ گفتگو کرنے پر محمول ہوگا ان میں سے کوئی آزاد نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس ارشاد میں اس شخص کا رد ہے جو کہتا ہے کہ ایمان صرف طاعات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اگر ایمان صرف اعمال ہوتے تو دوبارہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ذکر نہ کیا جاتا (1)۔ پس جنت ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جنت ایمان کے ساتھ حاصل ہوگی اور درجات کا استحقاق اعمال صالحہ کے ساتھ ہوگا۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اَنَّ لَهُمْ یہ بشر کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو بشارت دو ان کے لئے باغات ہیں الخ یعنی اس سے پہلے باء یا لام تھا۔ جب حرف جر ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا۔ کسائی اور اکثر بصری علماء نے کہا: ان باء کے اضمار کے ساتھ حالت جری میں ہے۔

جَنّٰتٍ، ان کے اسم کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ ان اور اس کا معمول، مفعول ثانی ہے۔ جَنّٰتٍ سے مراد باغات ہیں، جَنّٰتٍ کہا جاتا ہے کیونکہ اپنے درختوں کے ساتھ جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے اسے چھپا لیتے ہیں۔ اسی سے مجن (ڈھال) الجنین (پیٹ کا بچہ) اور جنت ہے۔

تَجْرِیْ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ فعل مستقبل ہے۔ یاء سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کیونکہ ضمہ یاء پر ثقیل ہے۔ الْاَنْهٰرُ۔ اس سے مراد ماء الانہار (نہروں کا پانی) ہے چلنے کی نسبت مجاز کی وجہ سے نہروں کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ چلتا صرف پانی ہے۔ ماء کا لفظ اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) اصل اہل القریہ ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئت ان النار بعدك اوقدت　　　و استب بعدك یا کلیبُ المجلسُ

مجھے بتایا گیا ہے کہ تیرے بعد آگ جلائی گئی۔ اے کلیب! تیرے بعد اہل مجلس نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

اس شعر میں المجلس سے مراد اہل مجلس ہیں۔ اہل کو حذف کیا گیا۔ النہر یہ أنہرت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: وسیع ہونا۔ اسی سے قیس ابن خطیم کا قول ہے:

ملکت بها کفی فانهرت فتقها　　　یری قائم من دونها ماوراءها (1)

میں نے اپنے نیزے کے ساتھ اپنے ہاتھ کو قوت دی۔ پس اس کا سوراخ بہت وسیع ہو گیا اس کے پیچھے کھڑا ہونے والا اس کے دوسری طرف والی چیزوں کو دیکھتا تھا۔

اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ما انهر الدم و ذکر اسم الله علیه فکلوه۔(2) جو چیز ذبح کو کھلا کر دے حتیٰ کہ نہر کی طرح خون بنا دے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ۔ نہر کی جمع نُهُرٌ اور انہار ہے۔ نھرٌ، نَھِرٌ زیادہ پانی کو کہتے ہیں۔ ابو ذویب نے کہا:

اقامت به فابتنت خیمة　　　علی قصب وفراتِ نهر

وہ ٹھہری اور اس نے وسیع پانیوں پر اور میٹھے پانیوں پر خیمہ لگایا۔

روایت ہے کہ جنت کی نہروں کی نالیاں نہیں ہیں بلکہ وہ جنت کی سطح پر قدرت الٰہیہ سے منضبط ہو کر چلتی ہیں (3) جہاں اہل

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب جواز الذبح بکل ما انھر الدم الا السن، صفحہ 156، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، کتاب الشرکة، باب قسمة الغنم، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جنت چاہیں گے وہ چلتی رہیں گی۔ الْاَنْهٰرُ پر وقف حسن ہے لیکن تام نہیں کیونکہ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ، جَنّٰتٍ کے وصف سے ہے (رزقاً) مصدر ہے۔ الرزاق کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ اس میں دو وجوہ ہیں: (۱) وہ کہیں گے یہ وہی ہے جس کا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے (۲) یہ وہ رزق ہے جو دنیا میں ہمیں دیا گیا ہے۔ یہ وہ اس لئے کہیں گے کیونکہ جنت کے پھلوں کا رنگ دنیا کے پھلوں جیسا ہوگا۔ جب وہ انہیں کھائیں گے تو اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلُ یعنی جنت میں جو پہلے دیا گیا، کیونکہ انہیں رزق دیا جائے گا پھر دوبارہ رزق دیا جائے گا جب انہیں دن کے آغاز میں کھانے اور پھلوں کے ساتھ رزق دیئے جائیں گے تو وہ اس سے کھائیں گے پھر دن کے آخر میں اس رزق سے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے دیا گیا تھا یعنی ہم دن کے آغاز میں کھا چکے ہیں کیونکہ اس کا رنگ اس کھانے کے مشابہ ہوگا لیکن جب اسے کھائیں گے تو صبح والے کھانے سے اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ وَاُتُوْا یہ اتیت سے مجہول کا صیغہ ہے۔ ایک جماعت نے اسے ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون الاعور نے واتوا یعنی ہمزہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی قراءت میں ضمیر اہل جنت کے لئے ہے اور دوسری میں خدام کے لئے ہے۔

بِهٖ مُتَشَابِهًا یہ بِهٖ کی ضمیر سے حال ہے یعنی دیکھنے میں بعض بعض کے مشابہ ہوں گے اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے (1)۔ یہ حضرات ابن عباس، مجاہد اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔

حضرت عکرمہ نے کہا: وہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن صفات میں ان سے مختلف ہوں گے (2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ تعجب کی بنا پر کہیں گے دنیا میں کوئی جنت کی چیزوں کے مشابہ نہیں سوائے اسماء کے۔ گویا وہ تعجب کریں گے جب وہ پھلوں کی خوبصورتی اور ان کی عظیم تخلیق کو دیکھیں گے۔ قتادہ نے کہا: مُتَشَابِهًا کا مطلب ہے: وہ سارے عمدہ ہیں ان میں کوئی گھٹیا نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: 23) اور دنیا کے پھلوں کی طرح نہیں ہیں جو مشابہ نہیں کیونکہ دنیا میں کچھ بہتر ہوتے ہیں اور کچھ بہتر نہیں ہوتے۔

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ یہ مبتدا خبر ہے، اَزْوَاجٌ جمع ہے زوج کی۔ مرد کا زوج عورت ہے اور عورت کا زوج مرد ہے (3)۔ اصمعی نے کہا: عرب زوجۃ نہیں کہتے۔ الفراء نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: زوجۃ۔ فرزدق نے کہا:

وان الذی یسعیٰ لیفسد زوجتی کساعٍ الی أسد الشریٰ یستبیلها

وہ شخص جو کوشش کرتا ہے تاکہ میری بیوی کو خراب کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو شیروں کی کچھار کی طرف کوشش کرتا ہے تاکہ ان کا پیشاب ہاتھ میں لے۔

حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہا تھا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں وہ دنیا و آخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترمہ) ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے (4)۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے۔ کسائی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 109، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حدیث نمبر 3488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اس کو پسند کیا ہے۔

مُّطَهَّرَةٌ۔ یہ اَزْوَاجٌ کی صفت ہے۔ مُّطَهَّرَةٌ، طاهرة سے زیادہ جامع اور بلیغ ہے۔ اس طہارت سے مراد حیض، تھوک اور دوسری عورتوں کی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہونا ہے۔ عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے ثوری نے ابن ابی نجیح سے روایت کر کے بتایا اور ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ مُّطَهَّرَةٌ یعنی وہ نہ پیشاب کریں گی نہ پاخانہ، نہ بچے جنم دیں گی نہ انہیں حیض آئے گا نہ ان کو منی آئے گی نہ وہ تھوکیں گے۔ ہم نے اپنی کتاب "التذکرۃ" میں اہل جنت کی صفات اور جنت کی صفات اور اس کی نعمتوں کے وصف کے عنوان کے تحت ان سب چیزوں کو ذکر کر دیا ہے۔ الحمد لله

وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ هُمْ مبتدا ہے خٰلِدُوْنَ اس کی خبر ہے۔ ظرف لغو ہے۔ غیر قرآن میں خالدین کو نصب حال کی حیثیت سے بھی جائز ہے۔ الخلود سے مراد بقا ہے، اسی سے حبة الخلد ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی جنت کبھی یہ زیادہ مدت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی سے عربوں کا قول دعا کے بارے میں ہے: خلد الله ملكه اس کی بادشاہی کو طوالت عطا فرمائی۔ زہیر نے کہا:

الا لا اری علی الحوادث باقیا ولا خالداً الا الجبال الرواسیا

خبردار! میں حوادث کو باقی رہنے والا اور لمبی مدت رہنے والا نہیں دیکھتا سوائے ان پہاڑوں کے جو زمین میں گڑھے ہوئے ہیں۔

آیت میں جو خلود کا لفظ استعمال ہوا ہے ہمیشہ رہنے کے معنی میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

"بے شک الله حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔ تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے) اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا الله نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے الله اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا ہے اس سے مگر نافرمانوں کو"۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا حضرت ابن عباس نے حضرت ابو صالح کی روایت میں فرمایا: جب الله تعالیٰ نے منافقین کے لئے یہ دو مثالیں دیں (یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (البقرہ:17) اور اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ (البقرہ:19) تو انہوں نے کہا: الله تعالیٰ کی ذات مثالیں بیان کرنے میں بلند اور اعلیٰ ہے، الله تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خداؤں کا ذکر کیا اور فرمایا: يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (الحج: 73) (اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے) اور ان کے خداؤں کے حیلہ کو ذکر کیا تو اسے مکڑی کا جالا بیان فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا تو نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا ہے اس قرآن میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، وہ اس سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرات حسن اور قتادہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ مشرکین کے لئے مثال دی تو یہودی ہنسے اور کہا: کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَسْتَحْيِ اصل میں يَسْتَحْيِيُ تھا عین اور لام کلمہ حرف علت تھے تو لام کلمہ میں تعلیل کی گئی۔ ضمہ یا پر ثقیل تھا تو اسے ساکن کر دیا۔ اسم فاعل بھی اسی طرح ہے مُسْتَحْيٍ جمع مستحيُون مُسْتحيين۔ ابن محیصن نے يستحی حاء کے کسرہ اور ایک یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے (یہ تمیم اور بکر بن وائل کی لغت ہے) اس میں پہلی یا کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور اسے ساکن کر دیا پھر ضمہ دوسری یا پر ثقیل تھا تو اسے بھی ساکن کر دیا پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک یا کو حذف کر دیا گیا۔ اسم فاعل مستحٍ ہے جمع مستحون اور مستحين ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے: اس آیت میں يستحيي کے معنی کرنے میں متاولین کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لا يخشى کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں ڈرتا)۔ طبری نے اس معنی کو ترجیح دی ہے، قرآن میں ہے: تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (احزاب: 37) یہاں تخشى بمعنی تستحيي ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ لا يترك کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں چھوڑتا)۔ بعض نے فرمایا لا يمتنع کے معنی میں ہے یعنی اللہ نہیں رکتا۔ استحیاء کا اصل معنی کسی شے سے رکنا ہے قبح کے مواقع کے خوف سے اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے لئے بیان کرنا محال ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ام سلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان الله لا يستحي من الحق۔ (1) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس میں حیا کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ذکر سے نہیں رکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا، يضرب کا معنی يبيّن (بیان کرنا) ہے، ان اپنے فعل کے ساتھ من کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے (مثلاً) يضرب کی وجہ سے منصوب ہے (بعوضة) کے نصب کی چار وجوہ ہیں:

۱- (ما) زائدہ ہے اور بعوضةً، مثلاً سے بدل ہے۔

۲- (ما) نکرہ ہے مثلاً سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور بعوضةً (ما) کی صفت ہے اور ما کی صفت ہے اور جنس نکرہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اس کے ابہام کی وجہ سے کیونکہ وہ بمعنی قلیل ہوتا ہے یہ فراء، زجاج اور ثعلب کا قول ہے (2)۔

۳- حرف جار کے اسقاط کی تقدیر پر اسے نصب دی گئی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا: ان يضرب مثلاً ما بين بعوضة۔ بين کو حذف کیا گیا اور اس کا اعراب بعوضة کو دیا گیا۔ فا بمعنی الی ہے یعنی جو اس سے بڑی چیز ہے یہ کسائی اور فراء کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منها، صفحہ 146، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111-110، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

العباس نے کہا:

یا احسن الناس ما قرنا الی قدمٍ　　ولا حبال محب واصل تصل

اے وہ ذات جو سر سے قدم تک تمام لوگوں سے زیادہ حسین ہے! محب واصل کا کوئی رشتہ پہنچنے والا نہیں۔

اس شعر میں ماقرناً سے مراد ما بین قرنٍ ہے، جب بین کو ساقط کر دیا تو اس کو منصوب کر دیا۔

۴- یضرب بمعنی یجعل ہو۔ اس صورت میں بعوضۃً مفعول ثانی ہو گا۔ ضحاک، ابراہیم بن ابی عبلہ، رؤبہ بن حجاج نے بعوضہ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابوالفتح نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ما اسم ہے جو الذی کے قائم مقام ہے اور بعوضۃ کو مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: لا یستحی ان یضرب الذی ھو بعوضۃٌ مثلاً۔ پس موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا اور وہ ھو مبتدا ہے، اس کی مثل بعض قراء کی قراءت ہے: تماما علی الذی احسن یعنی علی الذی ھو احسن۔ ھو مبتدا محذوف ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: ما انا بالذی قائل لک شیئاً یعنی ھو قائل۔ (1) نحاس نے کہا: مَا میں حذف زیادہ قبیح ہے الذی میں حذف کی نسبت کیونکہ الذی کے لئے تو ایک ہی وجہ ہے، اس کے ساتھ زیادہ طویل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضربت لہ مثلاً کا معنی ہے: مثلت لہ مثلاً میں نے اس کے لئے مثال دی ھذہ الابنیۃ علی ضربٍ واحدٍ (تمام عمارتیں ایک جیسی ہیں) علی مثالٍ واحدٍ و نوعٍ واحدٍ۔ الضرب کا معنی نوع (قسم) ہے۔ البعوضۃ یہ بَعَضَ سے فعولہ کے وزن پر ہے۔ بَعَضَ کا معنی ہے اس نے گوشت کاٹ لیا۔ کہا جاتا ہے: بضع اور بعض ہم معنی ہیں۔ قد بعضتہ تبعیضاً، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ البعوض سے مراد مچھر ہے۔ اس کا واحد بعوضۃٌ اس کو بعوضہ اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ جوہری وغیرہ کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا فَوْقَهَا پہلے گزر چکا ہے کہ فا بمعنی الی ہے اور جنہوں نے پہلے مَا کو صلہ زائدہ بنایا ہے اس نے دوسرے ما کو اس پر معطوف کیا ہے۔ کسائی اور ابوعبیدہ وغیرہما نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا معنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ما دونھا ہے (2)، یعنی جو چیز چھوٹے ہونے میں اس سے زیادہ ہو۔ کسائی نے کہا: یہ کلام میں تیرے اس قول کی مانند ہے أتراہ قصیراً؟ (کیا تو اسے چھوٹا دیکھتا ہے)۔ کہنے والا کہتا ہے: او فوق ذالک یعنی جتنا تو اسے دیکھ رہا ہے وہ اس سے بھی چھوٹا ہے۔ قتادہ اور ابن جریج نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا مطلب ہے اس سے بڑی چیز (3)، اور (انہ) کی ضمیر کا مرجع المثل ہے یعنی مثل حق ہے۔ حق، باطل کے خلاف ہوتا ہے حق کی جمع حقوق ہے۔ الحقۃ، حا کے فتحہ کے ساتھ اس سے زیادہ خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذہ حقتی یعنی یہ میرا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بنی تمیم اور بنی عامر کی لغت اَمَا میں ایما ہے۔ وہ تضعیف کی کراہت کی وجہ سے ایک میم کو یَا سے بدل دیتے ہیں۔ اس بنا پر عمر بن ابی ربیعہ کا شعر پڑھا جاتا ہے:

رأت رجلاً ایما اذ الشمس عارضت　　فیضحی و ایما بالعشی فیخصر

1- المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2- ایضاً　3- ایضاً

اس نے ایک شخص دیکھا جب سورج چڑھتا تو وہ گرم ہوتا جب شام ہوتی تو وہ ٹھنڈا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَقُولُونَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا نحویوں کا مَاذَآ کے متعلق اختلاف ہے۔ یہ ایک اسم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہوگا: ای شیء اراد اللہ۔(1) (اللہ تعالیٰ کس چیز کا ارادہ فرماتا ہے)۔ اس صورت میں اَرَادَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ ابن کیسان نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ بعض نے فرمایا: مَا اسم تام ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور ذَآ بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ما الذی ارادہ اللہ بھذا مثلاً۔ ان کے اس کلام کا مطلب استفہام کے لفظ کے ساتھ انکار ہے اور مَثَلًا قطع کی بنا پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اراد مثلاً یہ ثعلب کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اس تمیز کی بنا پر منصوب ہے جو حال کی جگہ واقع ہوتی ہے(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا بعض علماء نے فرمایا کہ کفار کے قول کا معنی یہ ہے کہ اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف اور ہدایت کی طرف تفریق کرتا ہے(3)۔

بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ یہ زیادہ بہتر قول ہے کیونکہ وہ اقرار کرتے تھے کہ ہدایت اس کی طرف سے ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے یعنی توفیق دیتا ہے اور محروم کرتا ہے۔ اس میں معتزلہ کے قول کا رد ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ گمراہی پیدا کرتا ہے نہ ہدایت۔ وہ کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کا نام گمراہ رکھتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فسقت فلانا یعنی میں نے اس کا نام فاسق رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا، یہ ان کا اضلال میں طریقہ ہے۔ یہ مفسرین کے اقوال کے خلاف ہے اور لغت میں بھی اس کا احتمال نہیں کیونکہ کہا جاتا ہے: جب کوئی کسی کا نام ضال رکھے تو کہتے ہیں ضللہ، اور جب کسی کا نام رکھے تو اَضَلَّہ نہیں کہا جاتا لیکن اس آیت کا معنی وہی ہے جو مفسرین نے بیان فرمایا کہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے محروم فرماتا ہے ان کے کفر کی جزا دیتے ہوئے۔ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، الْفٰسِقِيْنَ کو نصب فعل کی وجہ سے دی گئی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وما یضل احدا الا الفاسقین الذین سبق فی علمہ انہ لا یھدیھم۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقین کو جن کے متعلق پہلے ہی اس کے علم میں ہے کہ اس نے انہیں ہدایت کی توفیق نہیں دینی ہے۔ اور استثنا کی بنا پر الْفٰسِقِيْنَ کو نصب جائز نہیں کیونکہ استثنا ہمیشہ کلام کے مکمل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

نوف بکالی نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا: الٰہی! تو نے مخلوق پیدا کی ہے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو حضرت عزیر علیہ السلام سے کہا گیا: اس سوال سے اعراض کرو تم اس سوال کو چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا مرتبہ نبوت ختم کردوں گا، جو میں کرتا ہوں اس کے متعلق مجھ سے سوال نہیں کیا جاتا لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 112، جلد 1 3۔ ایضاً

الضلال، اس کا اصل معنی ہلاک ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل الماء فی اللبن جب پانی دودھ میں مل کر ختم ہو جائے، اسی سے یہ ارشاد ہے: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ:10) سورۂ فاتحہ میں بحث گزر چکی ہے۔ فسق کی اصل، کلام عرب میں کسی چیز سے خروج ہے۔ کہا جاتا ہے: فسقت الرطبة جب پھل اپنے پردے سے باہر آ جائے اور چوہیا اپنی بل سے باہر آ جائے۔ الفویسقة چوہیا کو کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم الحیة والغراب الابقع والفارة والکلب العقور والحُدَیا(1)۔

پانچ چیزیں فواسق ہیں انہیں حل وحرم میں قتل کیا جائے گا: سانپ، کالا کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اذیت کی وجہ سے ان کا نام فواسق رکھا ہے جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ ذکر آئے گا۔ فسق الرجل یفسِقُ ویفسُق... عن الاخفش... فسقا وفسوقاً یعنی نکلا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف:50) (یعنی اپنے رب کے حکم سے نکل گیا)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ اس نے جاہلیت کے کلام اور اشعار میں کبھی فاسق کا لفظ نہیں سنا۔ فرمایا: یہ عجیب ہے۔ یہ عربی کلام ہے اس کو ابن الفارس اور جوہری نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے اپنی کتاب ''الزاھر'' میں ذکر کیا ہے جب وہ فسق کے معنی پر گفتگو کر رہے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

یذھبن فی نجد و غورا غائراً فواسقاً عن قصدھا جوائراً

وہ نجد میں گئیں اور نشیبی علاقہ میں چلی گئیں اپنے مقصود سے نکل کر ٹیڑھے راستہ پر نکل گئیں۔

الفسیق ہمیشہ فسق کا ارتکاب کرنے والا، ندا کرنے والا وقت۔ کہا جاتا ہے: یا فسق ویا خبث۔ مراد ہوتا ہے: یایھا الفاسق ویایھا الخبیث۔ عرف شرعی میں فسق کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا۔ کبھی اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کفر کے ساتھ نکلتا ہے اور اس پر بھی جو نافرمانی کیساتھ نکلتا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں۔ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ یہ فاسقین کی نعت ہونے کی بنا پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو مبتدا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب فواسق یقتلن فی الحرم، حدیث نمبر 3067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

محذوف کی خبر بنا کر حالت رفع میں کر دے یعنی ھم الذین۔ اس کی مزید بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَنۡقُضُوۡنَ النقض کسی دیوار، یا رسی یا عہد کو توڑ دینا۔ النقاضة، بالوں کی رسی کو توڑ دینا۔ المناقضة، ایسا کلام جس کے معنی میں تناقض ہو۔ النقیضة فی الشعر ایسا شعر جو کسی کے جواب میں کہا جائے۔ النقض۔ توڑی ہوئی چیز۔

علماء کا اس عہد کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیا تھا جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی اپنی مخلوق کو وصیت اور اس کا امر ہے جو اس نے انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نہی ہے جو اس نے اپنے رسل کی زبان کے ذریعے اپنی کتب میں اپنی معصیت سے روکا ہے اور اس کا نقض اس کے احکام پر عمل کا ترک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس نے آسمانوں، زمین اور دوسری اپنی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنی وحدانیت پر دیئے ہیں یہ عہد کے قائم مقام ہیں اور ان کا توڑنا ان میں غور و فکر کو ترک کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ عہد ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بیان کریں اور ان کے امر کو نہ چھپائیں۔ اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہوگی۔ ابو اسحاق الزجاج نے کہا: اس عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء اور ان کے متبعین سے لیا کہ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کریں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَـنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ (آل عمران: 81) میں کہتا ہوں: اس آیت کے ماقبل اور مابعد کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے۔ یہ پانچ اقوال ہیں اور دوسرا قول سب کو جامع ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ، میثاق اس عہد کو کہا جاتا ہے جس کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ الوثاقه والمعاهدة (☆) سے مفعال کا وزن ہے۔ اس کا معنی عقد اور باندھنے میں شدت کرنا۔ اصل پر اس کی جمع المواثیق ہے کیونکہ میثاق کی اصل موثاق ہے۔ ماقبل کسرہ کی وجہ سے واؤ یاء سے بدل گئی، اس کی جمع میاثق اور میاثیق بھی آتی ہے۔ ابن عربی نے کہا:

حتیٰ لا یحل الدھر الا باذننا　　ولا نسال الأقوام عھد المیاثیق

حتیٰ کہ ہمارے اذن کے بغیر زمانہ اسے حلال نہیں کرتا اور قوموں سے عہد و پیمان کا مطالبہ نہیں کرتے۔

الموثق، المیثاق، المواثقة سب کا معنی معاہدہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ (المائدہ: 7) (اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ کیا تھا تم سے)۔

مسئلہ نمبر 4: وَ يَقۡطَعُوۡنَ، القطع یہ معروف ہے۔ قطع تعلقی میں مصدر القطیعة استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قطیعة فھو رجل قَطَعٌ و قطعة جیسے هُمَزَةٌ۔ قطعت الحبل قطعاً میں نے رسی کو توڑ دیا۔ قطعت النھر قطوعا... قطعت

☆ یہ لفظی اعتبار سے محل نظر ہے۔

الطیر قطوعاً و قطاعاً و قِطاعاً جب کوئی پرندہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے۔ اصاب الناس قطعۃٌ جب لوگوں کے پانی کم ہو جائیں۔ و رجل بہ قطعٌ جب آدمی کا سانس تھکاوٹ کی وجہ سے متواتر پے در پے آنے لگے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اس میں (مَا) يَقْطَعُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اگر تو چاہے تو اَنْ کو مَا سے بدل بنادے اور اگر چاہے تو بِهٖ میں جو ضمیر ہے اس سے (ان) کو بدل بنادے۔ یہ ترکیب بہتر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لئلا یوصل ہو یعنی کراھۃ ان یوصل۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو ملانے کا حکم دیا؟ بعض نے فرمایا: صلہ رحمی۔ بعض نے فرمایا: قول کو عمل کے ساتھ ملانے کا حکم ہے۔ پس انہوں نے قول و عمل کو جدا جدا کر دیا۔ اس طرح کہ جو انہوں نے کہا اس پر عمل نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: تمام انبیاء کی تصدیق کو ملانے کا حکم دیا۔ پس انہوں نے بعض انبیاء کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کر کے اس کو توڑا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کے دین اور زمین میں اس کی عبادت، شریعت کا قائم کرنا اور شرعی حدود کی حفاظت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہر اس صورت کو شامل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور الرحم اس کا ایک جز ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور افعال میں ظلم کرتے ہیں کیونکہ ان کے افعال ان کی شہوات کے مطابق ہوتے ہیں (1)۔ یہ فساد کی حد ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور هُمْ زائدہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ دوسرا مبتدا ہو اور الْخٰسِرُوْنَ اس کی خبر ہو اور پھر مبتدا خبر دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ الخاسر وہ شخص ہے جو فلاح و فوز میں سے اپنا حصہ ہی کم کردے۔ الخسران کا مطلب نقصان ہے خواہ وہ میزان میں ہو یا کسی اور چیز میں۔ جریر نے کہا:

ان سلیطا فی الخسار انہٗ　　اولاد قوم خلقوا اقنہٗ

بے شک سلیط خسارے میں ہے وہ ایک قوم کی اولاد ہے جو غلام پیدا کئے گئے ہیں۔

یعنی اپنے حظوظ اور شرف میں کمی کرنے کی وجہ سے خسارہ میں ہیں۔

جوہری نے کہا: خسرت الشیء و اخسرتہ کا معنی ہے: کمی کرنا۔ الخسار و الخسارۃ و الخیسری۔ کا معنی گمراہ ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔ ہلاک ہونے والے کو خاسر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو خسارہ دینے والا ہے اور وہ جنت میں اپنی منزل سے روکے گئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: اس آیت میں دلیل ہے کہ عہد پورا کرنا، اس کا التزام کرنا ہے اور ہر عہد جس کو انسان نے اپنے اوپر لازم کیا ہو اسے اس کے لئے توڑنا حلال نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان کے ساتھ ہو یا کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کی مذمت کی ہے۔ فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ (انفال: 58) پس اللہ تعالیٰ نے غدر (عہد شکنی) سے منع فرمایا ہے اور یہ نہیں ہوتا مگر عہد توڑنے کی وجہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے''۔

كَيْفَ حالت کے متعلق سوال ہے۔ یہ اسم ہے اور تَكْفُرُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یہ مبنی برفتحہ ہے اس کو ساکن ہونا تھا کیونکہ اس میں اس استفہام کا معنی ہے جس کا معنی تعجب ہے۔ پس اس کو حروف سے مشابہت دی گئی اور فتحہ کی خفت کی وجہ سے اس کے لئے فتحہ اختیار کیا گیا یعنی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر تعجب کرنا واجب ہے جب انہوں نے کفر کیا حالانکہ ان پر حجت ثابت ہو چکی ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ خطاب اہل کتاب کو ہونا کیسے جائز ہے کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ جب انہوں نے محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور جو کچھ آپ احکام لے کر آئے اس کی تصدیق نہ کی تو انہوں نے شرک کیا کیونکہ انہوں نے یہ اقرار نہ کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو یہ گمان کرے کہ قرآن انسان کا کلام ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور وہ عہد کو توڑنے والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: كَيْفَ کا لفظ تو لفظاً استفہام ہے لیکن معنی استفہام نہیں بلکہ یہ تقریر اور توبیخ کے لئے ہے یعنی تم کیسے اس کی نعمت کا انکار کرتے ہو جبکہ اس کی قدرت یہ ہے (1)۔ الواسطی نے کہا: اس کلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں حد درجہ کی توبیخ فرمائی کیونکہ مردوں اور جمادات سے اس کا صانع کسی چیز میں جھگڑا نہیں کرتا۔ منازعت (جھگڑا) بیا کل روحانیہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یہ واو حالیہ ہے اور قد مضمرۃ ہے۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت و قد کنتم ہے۔ پھر قد حذف ہو گیا۔ فراء نے کہا اَمْوَاتًا، كُنْتُمْ کی خبر ہے۔

فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ یہاں وقف تام ہے۔ ابو حاتم نے اسی طرح کہا پھر فرمایا: ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اہل تاویل نے ان دو موتوں اور دو زندگیوں کی ترتیب میں اختلاف کیا ہے اور انسان کے لئے کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرات ابن عباس اور ابن مسعود نے فرمایا: یعنی تم تخلیق سے پہلے معدوم تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہاری عمروں کے مکمل ہونے کے وقت تمہیں موت دے گا ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر تمہیں قیامت کے روز زندہ کرے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول اس آیت سے مراد ہے۔ کفار کو اس قول سے انکار نہیں تھا کیونکہ وہ ان دونوں چیزوں کا اقرار کرتے تھے (2)، جب کفار کے نفوس کو یقین تھا کہ وہ معدوم تھے اور پھر دنیا میں انہیں پیدا کیا پھر اس دنیا میں انہیں مارنے کا بھی یقین تھا تو ان پر دوبارہ زندہ کرنے کا لزوم قوی ہو گیا۔ اب ان کا آخرت میں اٹھنے کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً، صفحہ 114، جلد 1

انکار ایسا دعویٰ تھا جس پر کوئی دلیل نہ تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: اس تاویل پر قبر کی زندگی دنیا کی زندگی کے حکم میں ہوگی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں جس میں اس کی موت کا اعتبار نہیں کیا گیا جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مارا پھر دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی آدم کی پیٹھ میں تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں اس کی پیٹھ سے چیونٹیوں کی صورت میں نکالا ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہیں دنیا کی موت دے گا پھر تمہیں اٹھائے گا۔ بعض نے فرمایا كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں نطفہ کی صورت میں تھے پھر اس نے تمہیں رحموں سے نقل کیا فَاَحْيَاكُمْ اور تمہیں زندگی بخشی ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہیں اس زندگی کے بعد موت دے گا پھر سوال کے لئے تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں قبر میں موت دے گا پھر حشر کی طرف لے جانے کے لئے نشر کی زندگی دے گا۔ یہ ایسی زندگی ہے جس کے بعد موت نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر تین موتیں اور تین زندگیاں ہوں گی اور ان کا آدم کی پیٹھ میں مردہ ہونا اور ان کا آدم کی پیٹھ سے نکلنا اور ان پر گواہی دینا مگر ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں میں ان کا نطفہ نہ ہونا اس صورت میں چار موتیں اور چار زندگیاں ہو جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے لوگوں کو ذروں کی صورت میں پیدا کیا پھر انہیں موت دی۔ اس صورت میں پانچ موتیں اور پانچ زندگیاں ہو جائیں گی چھٹی موت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرموں کے لئے جب وہ آگ میں داخل ہوں گے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہے دوزخی جو دوزخ والے ہیں وہ اس میں نہ مریں گے نہ زندہ ہوں گے لیکن کچھ لوگ جنہیں آگ لگے گی ان کے گناہوں کے سبب پھر اللہ انہیں موت دے گا حتی کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں تو اذن شفاعت ہوگا انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر جنت کی نہروں پر انہیں بکھیر دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ۔ پس اس طرح ان پر گوشت پیدا ہو جائے گا جیسے سیلاب کی مٹی پر بوٹی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے کہا: گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں بکریاں چراتے تھے (1)۔ (مسلم)

میں کہتا ہوں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اماتہ اللہ اماتۃ (اللہ پھر انہیں موت دے گا) اس سے حقیقۃ موت مراد ہے کیونکہ مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند طاری کر کے انہیں عذاب سے غائب کر دیا ہو اور یہاں حقیقی موت مراد نہ ہو لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ نحویوں کا اجماع ہے کہ جب فعل کی مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہو تو وہاں مجاز مراد نہیں ہوتا بلکہ حقیقت مراد ہوتی ہے جیسے كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم گمنام تھے فَاَحْيَاكُمْ اس نے زندگی بخشی کہ تمہارا ذکر کیا گیا اور تم اس دین اور اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے جو تمہارے پاس آیا۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا۔ پس تمہارا ذکر ختم ہو جائے گا پھر تمہیں بعث کے لئے زندہ کرے گا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعة واخراج الموحدین من النار، صفحہ 104، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ پھر اس کے عذاب کی طرف، اپنے کفر کی وجہ سے لوٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معنی ہے کہ زندگی کی طرف اور سوال کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ (الانبیاء: 104) پس ان کا دوبارہ زندہ کرنا ان کے ابتدا میں زندہ کرنے کی طرح ہے اور یہی رجوع ہے اور ترجعون اکثر قراء کی قراءت ہے۔ یحییٰ بن یعمر، ابن ابی اسحٰق، مجاہد، ابن محیصن، سلام بن یعقوب نے حرف مضارع کو فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ‌ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

"وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تھا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف تو ٹھیک ٹھیک بنادیا انہیں سات آسمان اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا (وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔)

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: خَلَقَ اس کا معنی عدم سے وجود میں لانا ہے۔ کبھی انسان کے لئے خلق بولا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو ایجاد کرے۔ شاعر کا قول ہے:

من كان يخلق ما يقو لُ فحيلتي فيه قليلةٌ (1)

جو وہ کر گزرتا ہے جو وہ کہتا ہے تو میرا حیلہ اس کے بارے میں کم ہے۔

یہ معنی گزر چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خَلَقَ لَـكُمۡ کا معنی ہے من اجلکم تمہارے لئے پیدا کیا۔ بعض نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے تم پر وہ انعام کیا گیا ہے وہ تمہارے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ توحید اور اعتبار کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کے وہ محتاج ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: جن علماء کا یہ اصول ہے کہ وہ اشیاء جن سے نفع حاصل کیا جاتا ہے وہ مباح ہیں انہوں نے اسی آیت سے یہ اصول مستنبط کیا ہے اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً وَسَخَّرَ لَـكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ‌ؕ (الجاثیہ: 13) (یعنی نفع بخش چیزیں حلال ہیں) حتیٰ کہ منع پر دلیل آجائے۔

انہوں نے اپنے اس اصول کی تائید میں یہ کہا ہے کہ لذیذ کھانے پیدا کئے گئے ہیں ان کے پیدا کرنے کا امکان بھی موجود تھا، یہ عبث تو پیدا نہیں کئے گئے، ان کی کوئی منفعت ہوگی اور اس کی منفعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات ان چیزوں سے مستغنی ہے۔ پس یہ منفعت ہماری طرف ہی لوٹے گی اور ہماری منفعت یا تو لذت کے حاصل کرنے میں ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 114، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان چیزوں سے اجتناب میں ہے تا کہ ہماری اس طرح آزمائش کی جائے یا ہم ان سے عبرت حاصل کریں ان امور سے کوئی بھی حاصل نہیں ہوسکتا مگر چکھنے کے ساتھ۔ پس یہ لازم ہوا کہ یہ مباح ہیں، یہ قول فاسد ہے کیونکہ منفعت کے بغیر تخلیق سے عبث لازم نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے منفعت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اس پر منفعت اصل واجب نہیں ہے بلکہ یہ منفعت اس کو پیدا کرنے کا موجب ہے۔ ہم منفعت کا حصر ان صورتوں میں تسلیم نہیں کرتے جو انہوں نے بیان کی ہیں اور ان منافع میں سے بعض کا حصول چکھنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ ذائقہ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کیا جاتا ہے جیسے کہ طبائعیین کے نزدیک معروف ہے۔

پھر ان کا اصول معارض ہے ہر اس چیز سے جس کے چکھنے سے اس کے ہلاک کرنے والی زہر ہونے کا خوف ہو۔ اصحاب حظر نے شبہات سے معارض ہیں۔ بعض نے توقف فرمایا اور کہا: ہر فعل جس کا حسن اور قبح معلوم نہ ہو مگر یہ کہ وہ فی نفسہ حسن ہو، شرع کے ورود سے پہلے کوئی معین کرنے والا نہیں۔ وقف تو شریعت کے ورود تک موقوف ہوگا۔ یہ تینوں معتزلہ کے اقوال ہیں۔ شیخ ابوالحسن اور اس کے ساتھی اکثر مالکی اور صیرفی نے اس مسئلہ میں مطلق وقف کا قول کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس حالت میں ان اشیاء کا کوئی حکم نہیں ہوگا شرع کے لئے ہے جب وہ آئے تو جو چاہے حکم دے۔

عقل وجوب اور غیر وجوب کے ساتھ حکم نہیں لگاتی۔ اس کا حصہ ہے امور اس کے مطابق پہنچائے جائیں گے جیسے وہ ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ابن فورک نے ابن الصائغ سے روایت کر کے بیان کیا ہے، فرمایا: عقل کبھی سمع سے خالی نہیں ہوتی کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اس میں سمع (سننا) ہوتا ہے، یا اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا یا اس کے لئے ایسی حالت ہوگی جس کی وجہ سے اسے کہا جائے گا۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ یہ حظر، اباحت اور توقف میں غور و فکر سے مستغنی کر دیتا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 3: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ کے معنی میں صحیح اعتبار ہے۔ اس سے ماقبل اور مابعد عبرتوں کے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں (مثلاً) زندہ کرنا، مارنا، تخلیق کرنا، آسمانوں کی طرف استوئ اور آسمانوں کا تسویہ یعنی جو ذات تمہارے زندہ کرنے پر اور تمہاری تخلیق پر، آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر قادر ہے اس کی قدرت سے دوبارہ زندہ کرنا بعید نہیں۔

اگر کہا جائے کہ لَكُمْ کا معنی انتفاع ہے یعنی تا کہ تم ان تمام چیزوں سے نفع اٹھاؤ ہم کہیں گے انتفاع سے مراد اعتبار (عبرت حاصل کرنا) ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بچھوؤں اور سانپوں میں کیا عبرت ہے؟ ہم کہیں گے انسان موذی چیزوں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے آگ میں سزائیں تیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ چیزیں ایمان کا سبب اور گناہوں کے ترک کا سبب بنتی ہیں یہ بہت بڑی عبرت ہے۔ ابن عربی نے کہا: ان تمام چیزوں سے اس قدرت کے متعلق جو خبر دی گئی اس میں منع، اباحت اور توقف کا کوئی تقاضا نہیں۔ یہ آیت دلالت اور تنبیہ کے لئے ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ ارباب معانی نے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا کے متعلق فرمایا: یہ سب تمہارے لئے پیدا فرمایا ہے تا کہ تم اس کی اطاعت پر قوت حاصل کرو نہ کہ تم اس کی معصیت کی وجوہ میں تصرف کرو۔ ابو عثمان نے کہا: تجھے یہ سب کچھ عطا فرمایا اور تیرے لئے مسخر کر دیا تا کہ تم اس کے وجود کی وسعت پر استدلال کرو اور تو سکون

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حاصل کر اس سے جو آخرت میں تیرے لئے بڑی بڑی نعمتیں محفوظ کر رکھی ہیں تو اپنے قلیل عمل پر کثیر نیکی کا مطالبہ نہ کر اس نے تجھے عمل سے پہلے ہی عظیم نعمت دی ہے اور وہ توحید ہے۔

مسئلہ نمبر 4: حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کچھ عطا کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن تم میرے نام پر مال خرید لو جب مال آئے گا تو ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمر نے عرض کی: حضور! جو آپ کے پاس ہو وہ دے دیا کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں بنایا جس پر آپ قادر نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول کو ناپسند فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا (آپ خرچ کریں اور آپ صاحب عرش کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کریں)۔ انصاری کا یہ جملہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرے سے خوشی پہچانی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اقلال کا خوف اللہ تعالیٰ کے متعلق سوئے ظن سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے) اور فرمایا: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) (اور میں نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے)۔ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر کر دیں تاکہ اس کا عذر ختم ہو جائے اور اس پر حجت قائم ہو جائے تاکہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے جس طرح اس نے اسے بندہ پیدا کیا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہے تو اسے کمی کا اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس پر مزید مہربانی فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے)۔

اور فرمایا: فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (النمل) (بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی۔ اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے ہمیشہ عطا فرما رہا ہے دن رات کے خرچ نے اس میں کچھ کمی نہیں کی ہے (1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بہتر بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! کنجوس کا مال تلف فرما (2)۔" اسی طرح سورج کے غروب ہونے کے وقت وہ فرشتے ندا دیتے ہیں۔ یہ صحیح روایت ہے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔ والحمد للہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ ہود، باب قولہ وکان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 4316،6872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ فاما من اعطی واتقی۔۔۔ الخ، حدیث نمبر 1351، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور اس نے اپنے رب کی غنا، اس کے کرم کو جان لیا اس نے خرچ کیا اور کمی کا خوف نہ کیا، اسی طرح جس کی دنیوی خواہشات ختم ہوگئیں اور قوت لا یموت سے اپنی روح کے لئے طاقت حاصل کی اور اپنے نفس کی خواہش کو فنا کر دیا تو ایسا شخص خوشحالی اور تنگی میں عطا کرتا ہے اور کمی کا اندیشہ نہیں کرتا، کمی کا خوف تو وہ کرتا ہے جسے اشیاء دنیا میں خواہش ہو جب وہ آج دے گا تو کل اسے ضرورت ہوگی وہ خوف کرتا ہے کہ کل شاید اسے یہ نہ ملے تو اس پر کمی کے خوف کی وجہ سے آج خرچ کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ مسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عطا کرو اور انڈیل دو اور خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر شمار کرے گا اور خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی عطا روک لے گا (1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک دفعہ ایک سائل میرے پاس آیا اور میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ میں نے سائل کے لئے کسی چیز کے دینے کا حکم کیا پھر میں نے اسے بلایا اور اس مال کو دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے گھر میں کوئی چیز داخل نہ ہو اور نہ کوئی چیز خارج ہو مگر تجھے اس کا علم ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! ٹھہرو، شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر شمار کرے گا (2)۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اسْتَوٰٓی، ثُمَّ اخبار کی ترتیب کے لئے ہے نہ کہ فی نفسہ امر کی ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ الاستویٰ کا لغوی معنی، کسی شے پر بلند ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ (المومنون: 28) (اور پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر) اور فرمایا: لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (زخرف: 13) (تاکہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر)۔ شاعر نے کہا:

فاوردتهم ماء بقيفاء تقفرة و قد حلّق النجم اليماني فاستوىٰ

اس شعر میں استویٰ بھی ارتفع و علا ہے یعنی بلند ہوا۔ استوت الشمس على راسى، یعنی سورج میرے سر پر چڑھا، واستوت الطير على قمة راسى یعنی پرندے میرے سر پر بلند ہوئے۔ یہ آیت مشکلات میں سے ہے یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات کے بارے علماء کے تین نظریات ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے اکثر ائمہ کا یہی نظریہ ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسا کہ امام مالک سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) کے متعلق سوال کیا تو امام مالک نے فرمایا: الاستویٰ مجہول نہیں ہے اور کیفیت سمجھنے کے قابل نہیں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے، میں تجھے برا آدمی دیکھتا ہوں، اس کو باہر نکال دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور اس طرح اس کی تفسیر کرتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث على الانفاق و کراهة الاحصاء، صفحہ 331، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب هبة المرأة بغير زوجها و عتقها... الخ، حدیث نمبر 2402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن نسائی، صفحہ 254-253، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوۃ، باب الاحصاء فی الصدقة، حدیث 2501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں جس طرح ظاہر لغت احتمال رکھتی ہے یہ مشبہ فرقہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں ہم اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے ظاہر معنی پر اس کے محمل کو پھیرتے ہیں۔ فراء نے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ کے متعلق کہا الاستوا کلام عرب میں دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ان یستوی الرجل و ینتھی شبابہ وقوتہ۔ او یستوی عن اعوجاج یعنی آدمی بڑا ہوا اور اس کی جوانی اور قوت انتہا کو پہنچی یا ٹیڑھی روش کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا (راہ راست پر آ گیا)۔ یہ دو وجہیں ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ تو کہے: کان فلان مقبلاً علی فلان ثم استوی علی والی یشاتمنی۔ (فلاں شخص فلاں کی طرف متوجہ تھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے گالی دینے لگا)۔ یعنی اس کا معنی ہوگا میری طرف متوجہ ہوا۔ اس آیت ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ میں یہی معنی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ کا مطلب ہے: بلند ہوا۔ یہ تیرے اس قول کی مانند ہے: کان قاعداً فاستوی وہ بیٹھا تھا پھر کھڑا ہو گیا۔ کان قائماً فاستوی قاعداً پہلے کھڑا تھا پھر بیٹھ گیا۔ یہ تمام معانی عرب کلام میں جائز ہیں۔

امام بیہقی ابوبکر احمد بن علی بن الحسن نے کہا: اسْتَوٰۤى کا معنی اقبل (متوجہ ہونا) صحیح ہے کیونکہ اقبال کا معنی آسمان کی تخلیق کی طرف قصد کرنا ہے اور قصد سے مراد ارادہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں جائز ہے اور ثم کا لفظ خلق سے تعلق کے لئے ہے نہ کہ ارادہ کے لئے۔ اور رہی وہ بات جو اس نے حضرت ابن عباس سے حکایت کی ہے وہ انہوں نے کلبی کی تفسیر سے لی ہے اور کلبی ضعیف ہے۔ سفیان بن عیینہ اور ابن کیسان نے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ کے متعلق فرمایا: قصد الیھا یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ یہ ایک قول ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ بغیر تکییف اور تحدید کے ہے۔ طبری نے اس قول کو اختیار کیا۔ ابو العالیہ الریاحی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ کہا جاتا ہے: اسْتَوٰۤى بمعنی ارتفع ہے (بلند ہوا)۔ بیہقی نے کہا: اس سے مراد اس کے امر کا بلند ہونا ہے وہ پانی کے بخارات ہیں جن سے آسمان کی تخلیق واقع ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: المستوی چڑھنے والا دھواں تھا۔

ابن عطیہ نے کہا: کلام کا وصف اس قول کا انکار کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسْتَوٰۤى کا معنی استولی (غالب آنا) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد استوی بشر علی العراق   من غیر سیف ودم مھراق (1)

بشر عراق پر غالب آیا بغیر تلوار کے اور بغیر خون بہائے۔

ابن عطیہ نے کہا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۞ (طٰہٰ) میں یہ معنی مراد ہے (2)، میں کہتا ہوں: فراء کے قول میں پہلے گزر چکا ہے کہ علی اور الی ایک معنی میں ہیں۔ اس کے متعلق مزید معلومات سورۂ اعراف میں آئیں گی ان شاء اللہ۔ اور اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں قاعدہ نقل و حرکت نہ کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پہلے زمین کی تخلیق فرمائی۔ اسی طرح حم السجدہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ ایضاً

سورت میں ہے اور سورۃ النازعات میں فرمایا: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰهَا ۝ (کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا اس نے اسے بنایا)۔ اس میں آسمان کی تخلیق کا وصف بیان فرمایا اور اس کے بعد فرمایا: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کو زمین سے پہلے تخلیق فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (انعام:1) (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو)۔ یہ قتادہ کا قول ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو طبری نے قتادہ سے روایت کیا ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خشک کیا جس پر اس کا عرش تھا اور اسے زمین بنا دیا اس میں دھواں اٹھا اور بلند ہوا تو اس سے آسمان بنا دیا۔ پس زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی پھر اس کے امر نے آسمانوں کا قصد کیا اور انہیں سات آسمان بنایا پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ جب پہلے پیدا فرمایا تھا تو یہ پھیلی ہوئی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: قتادہ کا قول صحیح وجہ پر نکلے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کا دھواں پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا پھر آسمان کی طرف قصد کیا وہ دھواں تھا اسے سات آسمان بنایا، پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا، جو چیز دلیل ہے کہ دھویں کو زمین سے پہلے تخلیق کیا گیا وہ وہ روایت ہے جو سدی نے ابی مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے مرہ الہمدانی سے انہوں نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے اور بہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اس ارشاد کے بارے روایت کی ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور پانی سے پہلے اس نے کوئی چیز پیدا نہ کی۔ جب اس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا قصد کیا تو پانی سے دھواں نکالا۔ پس وہ دھواں پانی پر بلند ہوا اور اوپر ہو گیا، اس کا نام سماء رکھا پھر پانی کو خشک کیا اور اس سے ایک زمین بنا دی پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں (یعنی) اتوار اور سوموار میں انہیں سات زمینیں بنایا، پھر زمین کو مچھلی پر رکھا۔ الحوت سے مراد النون (مچھلی) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں کیا: نٓ وَ الْقَلَمِ (ن:1) مچھلی پانی میں ایک چٹان پر تھی اور وہ چٹان ایک فرشتے کی پیٹھ پر تھی اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر تھا اور وہ چٹان ہوا میں تھی، یہ وہ (چٹان) ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا لیست فی السماء ولا فی الارض ..... پھر مچھلی نے حرکت کی تو زمین لرزنے لگی پھر اس پر پہاڑوں کو رکھا تو وہ قرار پا گئی، پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (لقمان:10) (اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ)۔ یعنی زمین میں پہاڑ پیدا کیے اور زمین والوں کی خوراک اور درخت اور جو کچھ زمین کے لئے مناسب تھا دو دنوں میں یعنی منگل اور بدھ کو پیدا فرمایا۔ یہ جب فرمایا: قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝ (فصلت) آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم

لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مدمقابل وہ تو رب العالمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہوسکتا ہے) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں کھڑے ہوئے پہاڑ اور جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازے سے مقرر کر دی ہیں اس میں غذائیں (ہر نوع کے لئے) چار دنوں میں (ان کا حصول) یکساں ہے طلبگاروں کے لئے۔

جو یہ پوچھے تو معاملہ اسی طرح ہے ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ (فصلت: 11) پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف وہ اس وقت محض دھواں تھا یہ دھواں پانی کے بخارات سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک آسمان بنایا پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں یعنی خمیس اور جمعہ کے روز سات آسمان بنائے۔ جمعہ کو جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق جمع ہوئی۔ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (فصلت: 12) فرمایا: ہر آسمان میں اس کی مخلوق پیدا فرمائی یعنی فرشتے اور سمندر اولوں کے پہاڑ اور دوسری چیزیں جن کا علم نہیں وہ پیدا فرمایا۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین فرمایا اور ان ستاروں کو زینت بنایا اور شیطانوں سے حفاظت کا باعث بنایا جب اس تخلیق کو مکمل فرمایا جو پسند تھی تو عرش پر استواء فرمایا۔ یہ مراد ہے جب فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (حدید: 4) (پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں)۔

فرمایا كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: 30) (آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں یہ سارا واقعہ ذکر فرمایا جیسا کہ ان شاء اللہ اسی سورت میں اس کا بیان آئے گا۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا پھر اسے فرمایا: تو لکھ۔ قلم نے پوچھا: یا رب! کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ پس وہ سب کچھ جاری ہو گیا جو اس دن سے قیامت تک ہونا تھا۔ فرمایا: پھر مچھلی کو پیدا فرمایا اس پر زمین کو پھیلایا، پانی کے بخارات اٹھے، اس سے آسمان بنے مچھلی نے حرکت کی تو زمین پھیل گئی۔ اس پر پہاڑ پیدا کئے گئے، پہاڑ قیامت تک زمین پر فخر کرتے رہیں گے(1) اس روایت میں زمین کی تخلیق پانی کے بخار کے بلند ہونے سے پہلے ہے جو بخار دھواں تھا، یہ پہلی روایت کے خلاف ہے اور پہلی روایت اس روایت سے اور دوسری روایات سے اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو اس نے کیا ..... اس کے متعلق اقاویل مختلف ہیں اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔

ابونعیم نے حضرت کعب الاحبار سے ذکر کیا ہے کہ ابلیس اس مچھلی کے اندر داخل ہو جس کی پیٹھ پر ساری زمین تھی۔ اس نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ اس نے کہا: اے لوثیا! کیا تو جانتی ہے جو تیری پیٹھ پر قومیں، درخت، جانور، لوگ اور پہاڑ ہیں اگر تو ان کو جھاڑ دے تو تو انہیں اپنی پیٹھ سے نیچے پھینک دے گی۔ حضرت کعب نے کہا: لوثیا (مچھلی) نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک جانور بھیجا جو اس مچھلی کے نتھنے میں داخل ہو گیا، مچھلی نے اس سے نجات کے لئے اللہ کی بارگاہ میں التجا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السیر، باب مبتدا الخلق، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)

کی تو وہ جانور نکل گیا، حضرت کعب نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ مچھلی سامنے اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا اگر وہ کوئی ارادہ کرتی تو وہ جانور پھر اس کے ناک میں داخل ہو جاتا۔

مسئلہ نمبر 7: تمام اشیاء کی تخلیق کی اصل پانی سے ہے کیونکہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز پانی سے تخلیق کی گئی ہے۔ میں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلاؤ، سلام کو پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو، رات کو قیام کرو جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے(1)۔

ابو حاتم نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مجھے ہر چیز کے بارے خبر دیجئے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو پانی سے پیدا کی گئی تھی، اس کی صحت پر دلیل مصطفیٰ علیہ السلام کا جواب ہے۔ آپ نے فرمایا: کل شی خلق من الماء۔ (ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اگرچہ وہ ابھی مخلوق نہ تھی)۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے جس چیز کو اللہ نے پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اسے حکم دیا تو اس نے وہ سب کچھ لکھا جو ہونا تھا(2)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: یہاں پہلی چیز جو اس نے پیدا کی، سے مراد پانی اور ہوا ہے اور عرش کے بعد پہلی چیز جو پیدا کی وہ قلم تھا۔ یہ مفہوم حضرت عمران بن حصین کی حدیث میں واضح ہے۔ پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا(3)۔ عبد الرزاق بن عمر بن حبیب المکی نے حمید بن قیس الاعرج سے انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس آیا اور پوچھا: یہ مخلوق کس سے پیدا کی گئی؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور مٹی سے۔ اس شخص نے کہا: یہ چیزیں کس سے پیدا کی گئیں۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن زبیر کے پاس آیا۔ ان سے یہی سوال کیا انہوں نے بھی حضرت عبد اللہ بن عمرو کے قول کی مثل جواب دیا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن عباس کے پاس آیا ان سے یہی سوال کیا۔ کہا: یہ مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور تاریکی سے۔ اس شخص نے پوچھا: یہ چیزیں کس سے پیدا ہوئی ہیں، تو حضرت عبد اللہ بن عباس نے یہ آیت تلاوت کی: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) (اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے اس نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے)۔ اس شخص نے کہا یہ جواب تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 95، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب ما جاء فی قیام اللیل، حدیث 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب و کان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 6868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے گھرانے کا فرد ہی دے سکتا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا تمام چیزوں کا مصدر اس سے ہے یعنی اس کی تخلیق، ایجاد اور اختراع سے ہے، اس نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا یا پانی اور اس سے اس چیز کو پیدا کیا جس کو اس نے پیدا کرنا چاہا، نہ تو یہ کسی اصل سے ہیں نہ کسی سابق مثال سے ہیں پھر بعد میں جو اس نے پیدا کیا اس کی اصل بنائی، حقیقی پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس کے علاوہ کوئی خالق نہیں اس کی ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ آسمان سات ہیں اور زمین کے لئے کوئی صریح عدد قرآن میں ایسا نہیں آیا جو تاویل کا احتمال نہ رکھتا ہو سوائے اس ارشاد کے وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق:12) (اور زمین کو بھی انہی کی مانند) اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی زمین میں سے تعداد میں اس کی مثل ہیں کیونکہ کیفیت اور صفت میں تو مشاہدہ اور اخبار سے معلوم ہے کہ یہ مختلف ہیں۔ پس تعداد کے اعتبار سے ہم مثل ہونا متعین ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: موٹائی میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس میں ہم مثل ہونا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمینیں بھی سات ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے بنائی گئی ہیں، یہ داؤدی کا قول ہے: پہلا قول ہی صحیح ہے زمینیں، آسمانوں کی طرح سات ہیں۔ مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس نے ایک بالشت کسی کی زمین ظلماً لے لی اسے سات زمینوں تک اس کا طوق پہنایا جائے گا (2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے لیکن اس میں الی کی جگہ من ہے یعنی سات زمینوں سے اس کو طوق پہنایا جائے گا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کوئی شخص ناحق کسی کی ایک بالشت زمین نہیں لے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے روز) سات زمینوں تک طوق پہنائے گا (3)۔

نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ساتھ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے اس کے ذریعے دعا مانگوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! یہ تو تیرا ہر بندہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کہہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا لا الہ الا انت، میں ایسی چیز چاہتا ہوں جس کے ساتھ تو مجھے خاص کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کو آباد کرنے والے میرے سوا اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دوسرے پلڑے میں ہو، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ والا پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری ہو جائے گا۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ ان پر ایک بادل

1۔ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، باب سورۃ حم الجاثیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر 2959، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اثم من ظلم شیئا من الارض، حدیث نمبر 2273، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بادل ہے یہ زمین سیراب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے جو شکر نہیں کرتی اور دعا نہیں مانگتی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رفیع آسمان ہے (یہ) محفوظ چھت ہے اور روکی گئی موج ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اور اس آسمان کے درمیان کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: اسی طرح (کی مسافت ہے) حتیٰ کہ سات آسمانوں کو شمار کیا ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس کے اوپر عرش ہے آسمانوں اور عرش کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی کہ دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زمین ہے پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس زمین کے نیچے دوسری زمین ہے۔ ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے حتیٰ کہ آپ نے سات زمینیں شمار کیں ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر تم نچلی زمین کی طرف رسی لٹکاؤ تو وہ اللہ (کے علم) پر گرے گی۔ پھر یہ آیت پڑھی: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (الحدید) (وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے)(1)۔

ابو عیسیٰ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ وہ رسی اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور سلطنت پر گرے گی۔ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی سلطنت ہر جگہ ہے جبکہ وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت حسن (بصری) نے حضرت ابو ہریرہ سے (حدیث) نہیں سنی اور ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ زمینیں سات ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ ابو الضحیٰ ...... اس کا نام مسلم ہے ...... نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12) سات زمینیں ہیں ہر زمین میں ایک نبی ہے جیسے تمہارے نبی ہیں آدم کی طرح آدم، نوح کی طرح نوح، ابراہیم کی طرح ابراہیم، عیسیٰ کی طرح عیسیٰ۔ بیہقی نے کہا: اس کی سند حضرت ابن عباس سے صحیح ہے یہ مرہ کی وجہ سے شاذ ہے۔ میں ابو الضحیٰ کے لئے اس پر کوئی متابع نہیں جانتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَّا محل نصب میں ہے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب سورۃ الحدید، صفحہ 162، جلد 2 (وزارت تعلیم)
ایضاً، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الحدید، حدیث نمبر 3220، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جَمِيْعًا سیبویہ کے نزدیک یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ **ثُمَّ اسْتَوٰۤى** اہل نجد اس میں امالہ کرتے ہیں تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یاء والے الفاظ میں سے ہے اور اہل حجاز تفخیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ **سَبْعَ** یہ هن ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی فسوی سبع سموٰت۔ اور مفعول بھی ہوسکتا ہے اس تقدیر پر یسوی بینهن سبع سماوات، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا** (الاعراف: 155) اصل میں مِنْ قومه تھا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: حال کی بنا پر (سبع) منصوب ہے۔ **وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ** یہ مبتدا خبر ہیں (ھو) میں اصل ھا کی حرکت ہے اور اسکان تخفیف کی بنا پر ہے۔

السَّمَآءِ۔ واحد مونث استعمال ہوتا ہے جیسے عنان ہے اس کا مذکر ہونا شاذ ہے اور کبھی السماء، سماوۃ کی جمع ہوتا ہے یہ اخفش کے قول کے مطابق ہے اور زجاج کے قول میں یہ سماء کی جمع ہے اور جمع الجمع سماوات، سماءات ہے۔ سواھن بھی آیا یا تو اس لئے کہ السماء جمع ہے یا اس لئے کہ مفرد اسم جنس ہے سواھن کا معنی ہوگا: ان کی سطحوں کو ہموار کرنے کے ساتھ برابر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: انہیں برابر کیا۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ** جو اس نے پیدا کیا اسے جاننے والا ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ ہر چیز کا عالم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ** (الملک: 14) ((نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا)۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور اپنے قدیم ازلی علم کے ساتھ تمام معلومات کو جاننے والا ہے وہ یکتا ہے قائم بذاتہ ہے۔ معتزلہ عالمیت میں ہمارے ساتھ موافقت کرتے ہیں علیمت میں موافقت نہیں کرتے۔ جہمیہ فرقہ کا نظریہ ہے کہ وہ جاننے والا ہے علم سے قائم ہے مگر کسی محل میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ گمراہوں کے قول سے بلند و بالا ہے۔ ان لوگوں کا رد دیانات کی کتب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف علم کے ساتھ بیان فرمایا: **اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ یَشْهَدُوْنَ** (النساء: 166) (اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں)۔ اور فرمایا: **فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ** (ہود: 14) (پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے) اور فرمایا: **فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ** (اعراف: 7) (پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے) اور فرمایا: **وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ** (فاطر: 11) (اور نہ ہی حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے) اور فرمایا: **وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ** (الانعام: 59) (اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے نہیں جانتا سوائے اس کے)۔ ہم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تمام صفات کے ثبوت پر اسی سورت میں **یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ** (البقرہ: 185) کے تحت استدلال کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کسائی اور قالون نے نافع سے (ھو اور ھی) کو ہا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب ان سے پہلے فا، واو، لام یا ثم ہو۔ اسی طرح ابوعمرو نے کہا ہے مگر ثم کے ساتھ اس طرح نہیں پڑھا۔ ابوعون نے حلوانی سے انہوں نے قالون سے یہ زائد نقل کیا ہے انہوں نے ان یمل ھو میں ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہنے لگے: کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے۔ فرمایا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً اس میں سترہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ، اِذْ اور اذا دونوں حرف توقیت ہیں اِذْ ماضی کے لئے ہے اور اذا مستقبل کے لئے ہے کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ المبرد نے کہا: اِذْ جب مضارع کے ساتھ آئے تو اس کا معنی ماضی ہوتا ہے جیسے وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ (الانفال:30) (واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ) اس کا معنی اذ مکر دا ہے اور واذ قلت ہے یعنی مضارع کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے اور جب اذا ماضی پر داخل ہو تو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ (النازعات:34) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝ (عبس) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (نصر:1) ان سب میں جَآءَ بمعنی یجیی ہو جائے گا۔ معمر بن المثنی ابوعبیدہ نے کہا: اِذْ زائدہ ہے تقدیر یہ ہے وقال ربك۔ اور اس نے اسود بن یعفر کے قول سے استشہاد کیا ہے۔

فاذ و ذالك لا مهاه لذكره والدهر يعقب صالحاً بفسادِ

اس قول کا زجاج، نحاس اور تمام مفسرین نے انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلطی ہے کیونکہ (اِذْ) اسم ہے اور یہ ظرف زمان ہے یہ ایسے حروف میں سے نہیں ہے جو زائد کئے جاتے ہیں۔ الزجاج نے کہا: یہ ابوعبیدہ کی طرف سے ایک جرم ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں اور دوسری چیز کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے۔ تقدیر یوں ہے: وابتدأ خلقكم اذ قال۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کیا جب اس نے کہا۔ پس یہ اس محذوف سے ہے جس پر کلام دلالت کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

فان المنية من يخشها فسوف تصادفه اينما

موت اس کے لئے بھی ہے جو موت سے ڈرتا ہے موت اسے ملے گی جہاں بھی چلا جائے گا۔

اس شعر میں اینما کے بعد ذهب محذوف ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ (اذ) فعل مقدر کے متعلق ہو۔ تقدیر اس طرح ہو: اذكر اذ قال۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ:21) کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جس نے تمہیں پیدا کیا جب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 116، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور خطاب فرشتوں کے لئے ثابت ہے اور ازل سے ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کا وجود بھی ہو اور ان کی سمجھ بھی ہو، یہ مسئلہ تمام اللہ کے اوامر، نواہی اور مخاطبات میں ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن اشعری کا قول ہے۔ اس کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنٰی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی و صفات اللہ العلی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

رب مالک، سردار، مصلح اور جابر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد لِلْمَلٰٓئِكَةِ اس کا واحد ملک ہے۔ ابن کیسان وغیرہ نے کہا: مَلَكٌ بروزن فَعَل یہ الملك سے مشتق ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ مفعل کے وزن پر لَاَكَ سے مشتق ہے جس کا معنی بھیجنا ہے۔ الالوکۃ، المألکہ، المألکۃ ان کا معنی پیغام رسانی ہے۔ لبید نے کہا:

و غلامٍ ارسلته اُمُّهٗ　　بالوك فبذلنا ما سأل

ابلغ النعمان عنی مألکاً　　اننی قد طال حبسی و انتظاری

لڑکے کو اس کی ماں نے پیغام دے کر بھیجا تو ہم نے وہ سب خرچ کیا جو اس نے مانگا۔ کہا جاتا ہے: یہ کہا جاتا ہے: اَلِكْنِیْ یعنی مجھے بھیج۔ اس بنا پر اس کی اصل مَألَكٌ ہوگی ہمزہ، فعل کا فاکلمہ ہے پھر لوگوں نے اسے عین کلمہ سے قلب کر دیا اور مَلْاَكٌ پھر تسہیل کی اور کہا: مَلَكٌ۔ بعض علماء۔ نے کہا: اس کی اصل مَلْاَكٌ ہے اور یہ ملك یملِك سے مشتق ہے جیسے شمأل، شمل سے مشتق ہے ہمزہ زائدہ ہے۔ یہ ابن کیسان سے بھی مروی ہے شعر میں اصل پر آیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلست لإنسیٍّ ولکن لملْاَكٍ　　تنزل من جو السماء یصوب

تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترتا ہے جو بارش برساتا ہے۔

نضر بن شمیل نے کہا: عربوں کے ہاں الملك کا اشتقاق نہیں ہے۔ الملائکۃ میں ہا جمع کی تانیث کی تاکید ہے، اس کی مثل صلادمہ ہے اور الصلادم ہے (سخت گھوڑے) اس کا واحد صلدم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ۃ مبالغہ کے لئے ہے جیسے علامہ اور نسابہ کے آخر میں ۃ مبالغہ کے لئے ہے۔ ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو خطاب فرمایا یہ مشورہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان میں جو حرکات، عبادت، تسبیح اور تقدیس کی رؤیت موجود تھی اس کا ظاہر کرنا تھا۔ پھر فرشتوں کو انسانوں کا جو قیم (باپ) تھا اس کی طرف لوٹایا اور فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اعراف: 11) (آدم کے لئے سجدہ کرو)

مسئلہ نمبر3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یہاں جَاعِلٌ بمعنی خالق ہے یعنی میں پیدا کرنے والا ہوں۔ طبری نے یہ ابوروق سے بیان کیا ہے اسی وجہ سے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الْاَرْضِ سے مراد بعض علماء نے فرمایا: مکہ ہے۔ ابن سابط نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: زمین مکہ سے پھیلائی گئی اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قبور زمزم، رکن اور مقام کے درمیان ہیں اور خَلِیْفَةً کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے یعنی جو

زمین میں ان سے پہلے فرشتوں میں تھے ان کے پیچھے آنے والا ہے، جیسا کہ مروی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خلیفہ مفعول کے معنی میں ہو یعنی پیچھے لایا گیا، جیسے ذبیحہ بمعنی مفعولۃ (مذبوحۃ) استعمال ہوتا ہے۔ الخلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو نیکوکاروں میں سے جو پیچھے آئے اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو بروں میں سے جو پیچھے آئے، یہ معروف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔

خَلِیْفَۃً فاء کے ساتھ اکثر قراء کی قراءت ہے مگر حضرت زید بن علی سے مروی ہے کہ اس نے خلیقہ قاف کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں خلیفہ سے مراد حضرات ابن مسعود، ابن عباس اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اوامر نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہی زمین کی طرف پہلے رسول ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اور کہا جاتا ہے وہ کس کے لئے رسول تھے جبکہ زمین میں کوئی شخص تھا ہی نہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف رسول تھے، آپ کی اولاد چالیس تھے جو بیس بطنوں میں پیدا ہوئے تھے، ہر بطن میں جوڑا جوڑا پیدا ہوا، پھر ان کے بچے پیدا ہوئے حتیٰ کہ بہت سے لوگ ہو گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً** (النساء: 1) (پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں))

ان پر اللہ تعالیٰ نے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی تحریم نازل کی تھی اور آدم علیہ السلام نوسوتیس سال زندہ رہے تھے۔ اہل تورات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ حضرت وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ وہ ہزار سال زندہ رہے تھے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت امام اور خلیفہ قائم کرنے میں اصل ہے ایسا خلیفہ اور امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تا کہ اس کے ساتھ کلمہ مجتمع رہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امام اور خلیفہ کے وجوب کے متعلق امت کے ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں مگر وہ قول جو اصم (بہرہ) سے مروی ہے یہ شریعت سے بھی اصم (بہرہ) تھا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے اصم جیسا قول کیا اور اس کی رائے اور اس کے مذہب کی پیروی کی وہ شریعت میں (بہرہ) ہے۔ اصم کا قول ہے کہ دین میں خلیفہ واجب نہیں ہے بلکہ جائز ہے، جبکہ لوگ اپنا حج اور جہاد قائم کرتے ہوں، اپنے آپ میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوں اور حق کو اپنی طرف سے ادا کرتے ہوں، مال غنیمت، مال فے اور صدقات وغیرہ ان کے اہل اور مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے ہوں اور جن لوگوں پر حدود واجب ہوں ان پر حدود جاری کرتے ہوں تو یہ ان کے لئے کافی ہے ان پر امام متعین کرنا واجب نہیں ہے جو ان تمام امور کا والی ہو۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً** (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ** (ص: 26) (اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو نائب زمین میں) اور فرمایا: **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ** (النور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں

سے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں)۔ یہ تمام آیات اور ان کے علاوہ آیات ہمارے دلائل ہیں۔
سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان خلیفہ کے تعین میں اختلاف واقع ہونے کے بعد سیدنا صدیق اکبر کی تقدیم پر صحابہ کا اجماع ہوا حتی کہ انصار نے کہا: ایک امیر ہمارا ہوگا ایک امیر تمہارا ہوگا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور مہاجرین نے ان کی طرف سے یہ قول قبول نہ کیا۔ مہاجرین نے انہیں کہا: عرب صرف قریش میں سے صرف اس قبیلہ کی پیروی و اطاعت کریں گے اور مہاجرین نے انصار کے لئے حدیث بھی روایت کی، تو انصار نے اپنے قول سے رجوع کرلیا اور قریش کی اطاعت کی۔ اگر امامت کا فریضہ واجب نہ ہوتا نہ قریش میں نہ کسی دوسرے قبیلہ میں تو یہ مناسرہ اور تلخ گفتگو جائز نہ ہوتی، اور کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ خلافت کا امر واجب نہیں ہے نہ قریش میں اور نہ کسی دوسرے قبیلہ میں، تمہارے جھگڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اس امر میں لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں جو واجب نہیں ہے، پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے حضرت عمر کو امامت کا عہدہ دیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ امر ہم پر اور تم پر واجب نہیں ہے۔ پس یہ خلافت کے وجوب کی دلیل ہے اور یہ دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا قوام اور اجتماع ہے۔

رافضیوں نے کہا: خلیفہ کا قائم کرنا عقلاً واجب ہے اور نقلی دلائل، عقلی تقاضا کی تاکید کی بنا پر وارد ہیں اور رہی امام کی معرفت یہ نقل کی جہت سے پائی گئی ہے نہ کہ عقل کے تقاضا سے۔ یہ قول فاسد ہے کیونکہ عقل نہ کسی چیز کو ثابت کرسکتی ہے نہ منع کرسکتی ہے نہ اسے برا کہہ سکتی ہے۔ س کی تحسین کرسکتی ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ثابت ہوا کہ یہ شرع کی طرف سے واجب ہے نہ کہ عقل کی جہت سے۔ یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 5: جب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ امامت کے وجوب کا طریق نقلی دلائل ہیں تو ہمیں بتاؤ کہ امام کی معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جہت سے نصوص کے ذریعے واجب ہے یا اہل حل وعقد کے اختیار کی طرف سے ہے یا اس شخص میں ائمہ کے خصال کے کمال کی وجہ سے ہے اور اس کا اپنی طرف سے دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ امامیہ وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کی معرفت کا راستہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نص ہے، اس میں اختیار کا کوئی دخل نہیں، اور ہمارے نزدیک امام کی معرفت کا طریق غور وفکر اور اہل اجتہاد کا اجماع بھی اس کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام کی معرفت کا ذریعہ صرف نص ہے انہوں نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد اپنے اصول پر رکھی ہے کہ قیاس، رائے اور اجتہاد باطل ہے اس کے ذریعے کسی چیز کی پہچان نہیں ہوتی۔ انہوں نے قیاس کو اصلاً اور فرعاً باطل قرار دیا ہے۔ پھر تین فرقوں کا اختلاف ہوا۔ ایک فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے، دوسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے اور تیسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے۔

کسی معین امام پر نص کے مفقود ہونے پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر امت پر کسی معین امام کی طاعت کو اس طرح فرض کردیتے کہ اس سے عدول جائز نہ ہوتا تو آپ بتادیتے کیونکہ غیر معین امام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی پوری امت کو تکلیف دینا محال ہے اور ان کے لئے اس تکلیف کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب علم واجب ہو تو پھر اس علم کی یہ صورتیں ہیں یا تو عقلی

دلائل سے ہوگا یا خبر سے ہوگا۔ عقلی دلائل ایسے نہیں جو کسی شخص معین کی امامت کے ثبوت پر دلالت کریں اور خبر میں بھی کوئی ایسی خبر نہیں جو کسی معین امام کے ثبوت کے علم کو ثابت کرے کیونکہ وہ یا تو متواتر ہوگی جو علم ضروری یا استدلالی کو ثابت کرے گی یا خبر اخبار احاد میں سے ہوگی۔ اس کا طریق تواتر ہونا جائز نہیں جو علم ضروری یا علم استدلالی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر مکلف اس معین کی اطاعت کے وجوب کا علم رکھتا اور اس کے دین سے ہوتا جیسا کہ ہر مکلف کو علم ہے کہ الله کے دین سے اس پر پانچ نمازیں، رمضان کے روزے اور بیت الله کا حج واجب ہے لیکن معین خلیفہ کی طاعت کو ضرورۃً کوئی بھی نہیں جانتا تو یہ دعویٰ باطل ہوا اور اخبار احاد کے ساتھ معلوم ہونا بھی باطل ہے کیونکہ اس کے ساتھ علم کا وقوع محال ہے۔ اگر امام پر نص کی نقل کا رجوع واجب ہو کہ خواہ نص کیسی بھی ہو تو حضرت ابوبکر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی امامت کا اثبات واجب ہوتا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک قوم اس کی امامت پر صریح نص نقل کرتی ہے، جب نص کے ذریعے ایک وقت میں تینوں کا اثبات باطل ہے...... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... اسی طرح ایک کا اثبات بھی باطل ہے، کیونکہ کوئی گروہ نص کی وجہ سے دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے، جب نص کا ثبوت عدم طریق کی وجہ سے باطل ہوگیا تو اختیار اور اجتہاد ثابت ہوگیا۔ اگر کوئی ہٹ دھرم ہٹ دھری کرے اور نص کے ساتھ علم ضروری اور تواتر کا دعویٰ کرے تو اسے فوراً ان لوگوں کے دعویٰ کی نقیض پیش کرنی چاہئے جو حضرت ابوبکر کے بارے نص کے دعویدار ہیں انہیں ان اخبار کا مقابلہ پیش کرنا چاہئے جو اس سے زیادہ ہیں کہ وہ نص کے قائم مقام ہوجاتی ہیں۔ پھر امامیہ فرقہ کے علاوہ نص کی نفی میں لوگوں کی پختہ رائے میں شک نہیں، اور یہ نظریہ خلق کثیر کا اور جم غفیر کا ہے اور علم ضروری ایسا علم ہوتا ہے جس کی نفی پر وہ افراد اجتماع نہیں کرسکتے جن کی تعداد امام کے مخالفین کی تعداد کے دسویں حصہ سے کم ہوں۔ اگر علم ضروری کا اس طرح ناجائز ہوتا تو ایک گروہ کا بغداد اور چین کا انکار کرنا جائز ہوتا۔

مسئلہ نمبر 6: یہ ان احادیث کے رد میں ہے جن سے امامیہ فرقہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص ہونے پر حجت پکڑی ہے۔

ا۔ وہ کہتے ہیں: امت اس نص کے انکار کی وجہ سے کافر ہوگئی اور مرتد ہوگئی اس نے عناد کی وجہ سے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی مخالفت کی ہے۔

ان نصوص میں سے ایک یہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم والِ مَنْ والاہ و عاد من عاداہ** (1)۔ وہ کہتے ہیں: اس حدیث میں مولیٰ کا لفظ آیا ہے۔ لغت میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **فَعلِیٌ مولاہ** فاء تعقیب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ مولیٰ سے مراد یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار اور زیادہ مستحق ہیں۔ پس اس سے آپ کی امامت مراد ہونا ثابت ہوا۔ اور حضرت علی کی طاعت فرض ہے۔

دوسرا ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو فرمایا: **انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی** (2)۔ تو

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 12، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب مقدمہ، باب فضل علی بن ابی طالب، حدیث 112، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 526، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، حدیث 3430، 4064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میرے نزدیک اس طرح ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ہارون تھے لیکن میرے بعد نبی نہیں ہے...... وہ کہتے ہیں: حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام و مرتبہ معروف ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں شریک تھے جبکہ حضرت علی کے لئے نبوت تو نہیں ہے۔ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے حضرت علی، حضور علیہ اسلام کے بھائی بھی نہیں تھے۔ حضرت ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد خلافت ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اہل تشیع کے دلائل ہیں جن سے انہوں نے حجت پکڑی ہے، ان دلائل کا ذکر ان شاء اللہ اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی نے اس کی سند پر جرح کی ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس کے بطلان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مزینہ و جھینہ و غفار و مسلم موالی دون الناس کلھم لیس لھم مولی دون اللہ و رسولہ (1) مزینہ، جہینہ، غفار اور اسلم قبائل میرے موالی ہیں دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر، ان کا اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی مولی نہیں ہے۔

ہمارے یہ علماء کہتے ہیں: اگر من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی فرمایا ہے تو ان دونوں خبروں میں سے ایک خبر جھوٹی ہوگی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ خبر اگر صحیح ہو، ثقہ راوی نے ثقہ سے روایت کیا ہو تو پھر بھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل نہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے وہ اس طرح کہ المولی بمعنی الولی ہو، خبر کا معنی یہ ہوگا: من کنت ولیہ فعلی ولیہ۔ (میں جس کا ولی ہوں، علی اس کا ولی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ (التحریم:4) یعنی اللہ تعالیٰ اس کا ولی ہے، اس حدیث سے مقصود لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر، ان کے باطن کی طرح ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ خبر ایک خاص سبب پر وارد ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا جھگڑا ہوا۔ حضرت علی نے حضرت اسامہ سے کہا: انت مولایَ (تو میرا غلام ہے) حضرت اسامہ نے کہا: لستُ مولاك بل انا مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارا غلام نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام ہوں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (2) جس کا میں مولی ہوں، علی اس کا مولی ہے۔

چوتھا جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا حضور! اس کے علاوہ عورتیں بہت ہیں (3)۔ یہ بات حضرت عائشہ پر شاق گزری، منافقین کو موقع مل گیا، انہوں نے حضرت علی پر طعن کیا اور ان سے برأت کا اظہار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کی بات کا رد کر کے اور انہوں نے حضرت علی سے برأت اور ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم و غفار و مزینہ و جھینہ و اشجع، حدیث نمبر 3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، صفحہ 213، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 595، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ کتاب المغازی، باب حدیث الافك، حدیث نمبر 3826، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طعن کیا تھا اس کو جھٹلاتے ہوئے یہ فرمایا۔ اسی وجہ سے صحابہ کی جماعت سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین کو حضرت علی کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے (1)۔

رہی دوسری حدیث تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بمنزلہ ھارون من موسیٰ سے خلافت مراد نہیں لی کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا وصال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا تھا جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ان کی وفات کا بیان آئے گا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہ تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون تھے، اگر انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی سے مراد خلافت ہوتی تو آپ فرماتے: انت منی بمنزلۃ یوشع من موسٰی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ خلافت مراد نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ میں اپنی زندگی اور عدم موجودگی میں اپنے اہل پر خلیفہ بناؤں گا جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کی قوم پر خلیفہ تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مناجات کے لئے نکلے تھے۔

یہ کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ایک سبب خاص پر ارشاد فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافقین نے یہ افواہ پھیلائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بغض اور ناراضگی کی بنا پر خلیفہ بنایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور عرض کی کہ منافقین ایسا ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ بولا ہے بلکہ میں نے تجھے اسی طرح اپنا خلیفہ بنایا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی۔ (2) (کیا تجھے پسند نہیں کہ تو میری طرف سے ایسا ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام تھے)۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ نے خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے کئی صحابہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو جائیں گے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر غزوہ میں جاتے وقت کسی نہ کسی صحابی کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان میں سے ابن ام مکتوم اور محمد بن سلمہ وغیرہما صحابہ ہیں۔ اس خبر کا مدار حضرت سعد بن ابی وقاص پر ہے اور یہ خبر واحد ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے لئے روایات مروی ہیں جو اس سے اولیٰ ہیں۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: حضور! ابو بکر اور عمر کو کیوں نہیں بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ان دونوں سے استغناء نہیں کیونکہ ان کا میرے نزدیک اسی طرح مقام ہے جس طرح سر کے لئے کانوں اور آنکھوں کا ہے۔ فرمایا: وہ اہل زمین میں میرے وزیر ہیں۔ یہ بھی مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو بکر اور عمر اسی طرح ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب حضرت ہارون کا مرتبہ تھا (3)۔ یہ خبر ابتداءً وارد ہوئی ہے اور حضرت علی کی خبر ایک سبب پر وارد ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت ابو بکر حضرت علی رضی اللہ عنہما کی نسبت امامت کے زیادہ حق دار ہیں۔ واللہ اعلم

1۔ جامع ترمذی، کتاب نبی پاک کے فضائل، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث نمبر 3650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 633، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث 3430، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، صفحہ 208، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 7: اس میں اختلاف ہے کہ امام، امام کیسے ہوگا۔ اس کے تین طرق ہیں:

ا۔ نص: اس کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ حنابلہ، اہل حدیث کی ایک جماعت حضرت حسن بصری، بکر بن اخت عبد الواحد، اس کے ساتھی اور خوارج کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی خلافت پر اشارہ کے ساتھ نص فرمائی اور حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص فرمائی۔ جب خلیفہ بنانے والا کسی ایک شخص کی خلافت پر نص قائم کر دے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص قائم کی تھی یا کسی جماعت کے سپرد یہ کام کر دے جس طرح حضرت عمر نے کیا تھا تو یہ امام ہونے کا دوسرا طریقہ ہے، اور اس جماعت میں سے ایک کے چننے کا اختیار اس جماعت کے سپرد ہوگا جیسا کہ صحابہ کرام نے حضرت عثمان کی تعیین میں کیا تھا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق اہل حل وعقد کا اجماع ہو جائے۔ وہ اس طرح ہے مسلمانوں کے کسی شہر میں ایک جماعت ہو جب ان کا امام فوت ہو جائے اور ان کا امام نہ ہو اور نہ مرنے والے نے کسی کو خلیفہ بنایا، پھر جس شہر میں وہ امام موجود تھا اس شہر والے اپنے لئے کسی کو امام بنا دیں اس پر اجماع ہو جائے اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں تو آفاق میں آگے پیچھے جہاں بھی مسلمان موجود ہیں ان کو اس امام کی طاعت میں داخل ہونا واجب ہے جبکہ وہ امام اعلانیہ فسق وفساد کرنے والا نہ ہو کیونکہ یہ دعوت ان کو محیط ہے اس کا قبول کرنا واجب ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ دو اماموں کے قائم کرنے میں کلمہ کا اختلاف ہے اور واضح فساد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں کی وجہ سے مومن کے دل میں کھوٹ اور نفاق نہیں ہوتا: (ا) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص۔ ۲۔ جماعت کا لزوم ۳۔ اپنے حکمرانوں سے خلوص کا اظہار کیونکہ مسلمانوں کی دعوت ان کے ذریعے محفوظ ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اگر ایک شخص اہل حل وعقد میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دے تو وہ ثابت ہو جائے گا اور دوسروں پر اس کو تسلیم کرنا لازم ہو جائے گا لیکن بعض لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ خلیفہ نامزد اہل حل وعقد میں سے ایک جماعت کرے گی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی تو کسی صحابی نے اس کا انکار نہ کیا، چونکہ یہ بھی ایک عقد ہے اس لئے کسی تعداد کی ضرورت نہیں جو اس کو منعقد کریں جس طرح کہ دوسری عقود ہیں۔ امام ابو المعالی نے کہا: جس کے لئے ایک شخص کے عقد کے ساتھ امامت منعقد ہو جائے تو امامت لازم ہو جائے گی، بغیر حدث اور تغیر امر کے اس کو معزول کرنا جائز نہیں۔ انہوں نے فرمایا: اس پر اجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اگر کوئی ایسا شخص عہدہ امامت پر غلبہ کرلے جس کو امامت کی اہلیت ہو اور وہ امامت قہر اور غلبہ سے حاصل کرلے تو کہا گیا ہے کہ یہ امامت کا چوتھا طریقہ ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری سے پوچھا گیا: ہم پر اس شخص کے لئے کیا واجب ہے جو ہمارے شہروں پر غلبہ حاصل کرلے جبکہ وہ امام ہو؟ حضرت عبد اللہ نے فرمایا: تم اس کو تسلیم کرو اور اپنے حق میں سے جو وہ مطالبہ کرے اسے ادا کرو اور اس کے افعال کا انکار کرو اور اس سے مت بھاگو۔ جب اس نے تجھے امر دین میں سے کسی راز کا امین بنایا ہے تو تم اسے افشا نہ کرو۔

ابن خویز منداد نے کہا: جو شخص خود بخود تخت خلافت پر کود پڑے جبکہ وہ خلافت کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ اس نے نہ کسی سے مشورہ کیا ہو، نہ اسے اختیار کیا گیا ہو اور لوگوں نے اس کی بیعت کر لی ہو تو اس کے لئے بیعت مکمل ہو گئی۔

مسئلہ نمبر 10: امامت کی عقد پر شہادت میں اختلاف ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: گواہوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہادت تو قطعی نقلی دلیل کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی قطعی نقلی دلیل نہیں ہے جو شہادت کے اثبات پر دلالت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: گواہوں کی ضرورت ہے۔ جس نے یہ کہا ہے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر امر امامت پر شہادت منعقد نہ ہو گی تو ہر شخص یہ دعویٰ کر دے گا کہ سرًّا اس کی امامت قائم ہوئی ہے اور یہ چیز فتنہ اور جنگ تک پہنچا دے گی۔ پس ثابت ہوا کہ شہادت معتبر ہے اس میں دو گواہ کافی ہیں، جبکہ جبائی کا قول اس کے مخالف ہے۔ اس نے کہا: چار گواہ، ایک امام بنانے والا اور ایک امام بننے والا ہو کیونکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کو مشورہ سونپا تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہمارے درمیان اور اس کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی معتبر ہے اور جو زائد ہیں ان میں اختلاف ہے اور زیادتی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ پس زیادتی کا اعتبار نہ ہو گا۔

مسئلہ نمبر 11: امام کی شرائط۔ یہ گیارہ ہیں:

۱۔ امام کا تعلق قریش کے خاندان سے ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: الائمۃ من قریش (1) (قریش میں سے ائمہ ہوں گے) اس میں اختلاف ہے۔

۲۔ وہ مسلمانوں کا قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اجتہاد کرنے والا ہو اور اسے حوادث میں دوسروں سے استفتاء کی ضرورت نہ ہو۔ یہ متفق علیہ ہے۔

۳۔ وہ دانشمند اور صاحب رائے ہو، جنگی امور، لشکروں کی تدبیر، سرحدوں کی حفاظت، ملت اسلامیہ کی حمایت، امت کو انتشار سے روکنے، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کو اپنا حق دلانے کی قدرت رکھتا ہو۔

۴۔ وہ ایسا شخص ہو کہ حدود قائم کرنے میں اسے رقت لاحق نہ ہو اور گردنوں کو اڑانے اور جسم کو کاٹنے سے مت گھبرائے۔ ان سب پر دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ یہ صفات اس شخص میں جمع ہوں کیونکہ یہ شخص قاضیوں اور دوسرے حکمرانوں کا والی ہوتا ہے اور اس کے خود فیصلہ کرنے اور حکم کرنے کی صلاحیت بھی ہو، خلفاء کے امور اور قاضیوں کے فیصلوں کی چھان بین کر سکتا ہو اور یہ امور صرف وہی بجا لا سکتا ہے جو عالم ہو اور علم میں پختہ ہو۔

۵-۶: وہ آزاد ہو۔ امام کے آزاد ہونے اور اس کے مسلمان ہونے کی شرط میں کوئی خفا نہیں، اس کا مسلمان ہونا یہ چھٹی شرط ہے۔

۷-۸: وہ مذکر ہو۔ اس کے اعضاء سلامت ہوں۔ اس پر اجماع ہے کہ عورت کا امام ہونا جائز نہیں اگرچہ اس کے قاضی ہونے کے جواز میں اختلاف ہے ان امور میں جس میں عورت کی شہادت جائز ہے۔

۹-۱۰: وہ عاقل، بالغ ہو۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۱: وہ عادل ہو کیونکہ امت میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کے لئے امامت کی ذمہ داری جائز نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ علم میں لوگوں سے افضل ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تمہارے ائمہ تمہارے سفارشی ہیں۔ غور کر دکس سے سفارش طلب کر رہے ہو(1)۔ قرآن حکیم میں حضرت طالوت علیہ السلام کے وصف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے کشادگی علم میں اور جسم میں)۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے علم کا ذکر کیا ہے پھر اس چیز کا ذکر فرمایا جو قوت اور اعضاء کی سلامتی پر دلالت کرتی ہے۔ اصْطَفٰىهُ کا معنی ہے: اس نے اسے چن لیا۔ یہ نسب کی شرط پر دلیل ہے، اس کی شرائط میں گناہوں اور خطا سے معصوم ہونا نہیں ہے نہ اس کا عالم بالغیب ہونا ضروری ہے نہ اس کا افراد امت میں سب سے زیادہ بہادر اور گھوڑ سواری میں ماہر ہونا شرائط میں سے ہے اس کا صرف بنی ہاشم سے ہونا بھی شرط نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی امامت پر اجماع ہے حالانکہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ تھے۔

مسئلہ نمبر 12: فاضل کے ہوتے ہوئے فتنہ کے خوف سے مفضول کو امام بنانا جائز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ امت کا امر درست نہ ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ امام اسی لئے بنایا جاتا ہے تاکہ دشمن سے دفاع کرے، ملت بیضاء کی حمایت کرے، خلل کو روکے اور حقوق ادا کرے، حدود کو قائم کرے، بیت المال کے لئے مال جمع کرے اور اسے مستحق لوگوں پر تقسیم کرے۔ جب افضل شخص کو مقرر کرنے پر جنگ، فساد اور ان امور کے ضیاع کا خوف ہو جن کے لئے امام مقرر کیا جاتا ہے تو یہ فاضل سے مفضول کی طرف عدول کرنے کا ظاہر عذر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور ساری امت کو مشورہ کے وقت معلوم تھا کہ ان چھ افراد میں فاضل اور مفضول موجود تھے۔

حضرت عمر نے ان میں سے ہر ایک کے لئے اس ذمہ داری کی اجازت دی تھی جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی تھی اس پر امت کا اجماع ہوا تھا کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 13: جب امام مقرر کیا جائے پھر تقرر کے بعد فاسق ہو جائے تو جمہور علماء کا قول ہے کہ اس کی امامت ختم ہو جائے گی اور ظاہر معلوم فسق کی وجہ سے وہ معزول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ امام حدود کو قائم کرنے، حقوق ادا کرنے، یتیموں اور مجنونوں کے مال کی حفاظت کرنے اور ان دوسرے امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جس شخص میں فسق ہوگا وہ ان امور کو قائم نہیں کر سکے گا، ان کے قیام سے عاجز ہوگا۔ اگر ہم فاسق کی امامت جائز قرار دیں تو ان امور کا ابطال لازم آئے گا جن کے لئے اسے مقرر کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ابتداء میں بھی فاسق کو امام بنانا جائز نہیں ہوتا کیونکہ ان امور کا ابطال لازم آتا ہے جن کے لئے وہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: امام معزول نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ کفر کرے یا نماز کا پڑھنا ترک کر دے یا نماز کی طرف بلانا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 139، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ترک کردے یا شریعت کا کوئی امر ترک کردے کیونکہ حدیث عبادہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہم امامت میں اس کے اہل لوگوں سے نہیں جھگڑیں گے۔ فرمایا: مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ظاہر کفر دیکھو جس میں دلیل ہو'' (1)۔ اور حضرت عوف بن مالک کی حدیث میں ہے اس وقت تک نہیں جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کریں (2)۔ ان دونوں حدیثوں کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم پر امراء بنائے جائیں گے۔ جس نے ناپسند کیا وہ بری ہو گیا جس نے انکار کیا وہ سلامت ہو گیا لیکن جوان سے راضی ہوا اور ان کی پیروی کی...... صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھیں۔ یعنی جس نے دل سے ناپسند کیا اور دل سے انکار کیا (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جب امام اپنے آپ میں ایسا نقص پائے جو اس کی امامت میں موثر ہوتا ہو تو اسے معزول ہو جانا واجب ہے، اور جب ایسا نقص نہ پائے تو کیا اس کو معزول ہونا چاہئے اور کسی غیر کی بیعت کر لینی چاہئے اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی امامت ختم نہ ہو گی۔ بعض نے فرمایا: اسے معزول ہو جانا چاہئے۔ اس پر دلیل کہ امام جب اپنے آپ کو معزول کرے گا تو معزول ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے اقیلونی اقیلونی، ''مجھ سے بیعت واپس لے لو...... مجھ سے بیعت واپس لے لو''۔ اور صحابہ نے کہا: ہم نہ تجھ سے بیعت واپس لیتے ہیں نہ ہم اس کا مطالبہ کرتے ہیں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے دین کے لئے مقدم کیا تھا۔ پس کس کی مجال کہ تجھے ہٹائے۔ تجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے دین کے لئے راضی ہوئے تو ہم آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ اگر حضرت ابوبکر کے لئے ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام اس کا انکار کرتے اور حضرت ابوبکر سے کہتے تجھے یہ کہنا درست نہیں اور آپ کے لئے ایسا کرنا صحیح نہیں۔ جب صحابہ کرام اس پر قائم رہے تو معلوم ہوا کہ امام کے لئے ایسا کرنا جائز ہے چونکہ امام دوسروں کی نگرانی کرنے والا ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کا حکم حاکم کا حکم ہو، اور وکیل جب اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے امام بھی امت کا وکیل اور اس کا نائب ہوتا ہے۔ جب وکیل، حاکم اور ہر نائب کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے تو امام بھی اسی طرح ہوتا ہے اس کا بھی اس کی مثل ہونا واجب ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15: جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا ایک آدمی کے ذریعے کسی امام کی امامت منعقد ہو جائے تو تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ حکم سننے اور اطاعت کرنے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اقامت پر بیعت کریں اور جو کسی عذر کی بناء پر بیعت سے انکار کرے تو اس کا عذر قبول کیا جائے گا اور جو بغیر عذر کے انکار کرے تو اس پر جبر کیا جائے گا، تاکہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر نہ جائے۔ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو پہلا خلیفہ ہو گا اور دوسرا قتل کیا جائے گا۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ، صفحہ 125، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب بخیار الائمۃ وشرارھم، صفحہ 129، جلد 2

3۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کے قتل میں اختلاف ہے کیا یہ قتل حساً ہے یا معنی ہے۔ پس اس کا معزول کرنا اس کا قتل اور اس کی موت ہے۔ پہلا معنی ظاہر ہے (یعنی اسے قتل کیا جائے گا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو(1)۔ اس حدیث کو حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو ایک امام کی بیعت کر لے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے اور دل کا خلوص پیش کر دے تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہئے اگر اسے استطاعت ہے۔ اگر کوئی دوسرا امام آ جائے تو وہ اس سے لڑے اور دوسرے امام کی گردن اتار دے (2) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عرفجہ کی حدیث میں ہے، اس کو تلوار سے مارو خواہ کوئی بھی ہو (3)۔ یہ دو امام مقرر نہ ہونے پر بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ یہ چیز نفاق، مخالفت، انتشار، فتنوں کے ظہور اور نعمتوں کے زوال کا باعث بنتی ہے لیکن اگر قطر بہت دور ہوں اور علاقے جدا جدا ہوں جیسے اندلس اور خراسان تو پھر ہر علاقہ کے لئے علیحدہ امام جائز ہے جیسا کہ مزید بیان آئندہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 16: اگر کوئی شخص عادل امام کے خلاف خروج کرے تو لوگوں پر اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ اگر امام فاسق ہو اور خروج کرنے والا عدل کو ظاہر کرنے والا ہو پھر بھی لوگوں کو مناسب نہیں کہ وہ اس خروج کرنے والے کی نصرت میں جلدی کریں حتیٰ کہ جو وہ عدل ظاہر کرتا ہے وہ واضح ہو جائے یا پہلے امام کے معزول کرنے پر سارے لوگ متفق ہو جائیں۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص جو اس قسم کا معاملہ طلب کرتا ہے وہ اپنی طرف سے صلاح کا نعرہ لگاتا ہے حتیٰ کہ جب غالب آ جاتا ہے تو پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آتا ہے جو اس کے ظاہری صلاح کے خلاف ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17: ایک زمانہ میں اور ایک شہر (ملک) میں دو یا تین اماموں کا قیام بالکل جائز نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام ابو المعالی نے کہا: ہمارے اصحاب عالم کی دونوں طرفوں میں دو شخصوں کی امامت کی ذمہ داری کے عدم جواز کا نظریہ رکھتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا: اگر دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد پر اتفاق ہو جائے تو یہ اس کے قائم مقام ہوگا کہ ایک عورت کے دو ولیوں نے دو خاوندوں سے نکاح کر دیا جبکہ ہر ایک کو دوسرے عقد کا شعور نہ تھا۔ فرمایا: میرے نزدیک اس میں یہ ہے کہ دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد قریبی علاقوں میں تو جائز نہیں اس پر اجماع ہے ہاں جب دونوں اماموں کے درمیان بہت زیادہ دوری ہو تو پھر اس میں احتمال کی گنجائش ہے۔ استاذ ابو اسحاق نے ان دو سلطنتوں میں دو اماموں کا تقرر جائز قرار دیا جو ایک دوسرے سے بہت دور ہوں تا کہ لوگوں کے حقوق اور احکام معطل نہ ہوں۔ کرامیہ فرقہ بغیر تفصیل کے دو امام مقرر کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ انہیں پھر ایک شہر میں بھی اس کی اجازت دینا لازم آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاول، صفحہ 126، جلد 2

3۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین، صفحہ 128، جلد 2

حضرت امیر معاویہ دونوں امام تھے۔ انہوں نے کہا: جب دو شہروں یا دو طرفوں میں دو امام ہوں گے تو ہر ایک اپنے علاقہ کے معاملات پر زیادہ کنٹرول کرے گا اور اس کے معاملات زیادہ نگرانی سے چلائے گا۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب ایک زمانہ میں دو نبیوں کی بعثت جائز ہے اور یہ چیز نبوت کے ابطال تک نہیں پہنچاتی تو امامت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی اور یہ چیز امامت کے ابطال تک نہیں پہنچائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جائز ہوتا اگر اس سے شرع نے منع نہ کیا ہوتا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: فاقتلوا الاخر منهما۔(1) ''دونوں اماموں میں سے جو دوسرا ہے اسے قتل کر دو''۔ امت کا اتفاق اسی پر رہا ہے۔
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مسئلہ انہوں نے اپنے لئے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا وہ شام کی ولایت کے مدعی تھے کہ پہلے ائمہ نے انہیں شام کی حکمرانی دی تھی۔ اس پر دلیل ان کے دور میں ائمہ کا اجماع ہے کہ امام ایک ہے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں امام ہوں اور میرا مخالف بھی امام ہے۔ اگر وہ کہیں عقل اسے محال قرار نہیں دیتی اور نقل میں کوئی چیز اس سے مانع نہیں تو ہم کہیں گے: نقلی دلائل میں سے قوی ترین دلیل اجماع ہے اور وہ اس کے منع کا حکم دیتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ ملائکہ وہی کچھ جانتے ہیں جو انہیں بتایا گیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قول سے سبقت نہیں لے جاتے اور یہ تمام ملائکہ کے بارے میں ہے کیونکہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ (الانبیاء: 27) کا ارشاد ان کی مدح کے لئے ذکر کیا گیا ہے، پھر انہوں نے کیسے کہا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب انہوں نے خلیفہ کا لفظ سنا تو وہ سمجھے کہ بنی آدم میں کچھ لوگ فساد کریں گے کیونکہ خلیفہ کا مقصود اصلاح اور ترک الفساد ہوتا ہے لیکن انہوں نے تمام لوگوں پر معصیت کا حکم لگا دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان میں سے بعض فساد کریں گے اور بعض فساد نہیں کریں گے۔ پس ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ اور اس چیز کو ثابت فرمایا کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم سکھایا اور ان کے لئے اپنے پوشیدہ علم سے پردہ اٹھایا۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ نے دیکھا اور جان لیا تھا جو کچھ جنوں نے فساد برپا کیا تھا اور خونریزی کی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ زمین میں آدم کی تخلیق سے پہلے جن رہتے تھے، انہوں نے فساد کیا اور خونریزی کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو ملائکہ کے لشکر میں بھیجا۔ پس اس نے انہیں قتل کیا اور بعض کو سمندروں اور پہاڑوں پر بھگا دیا۔ پس اس وقت شیطان کو عزت ملی تو فرشتوں نے محض استفہام کی جہت سے اَتَجْعَلُ فِيْهَا کہا۔ کیا یہ خلیفہ پہلے جنوں کے طریقہ پر ہوگا یا نہیں؟ یہ احمد بن یحییٰ ثعلب کا قول ہے۔
ابن زید وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ خلیفہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کچھ لوگ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو انہوں نے یہ قول کیا(2)۔ انہوں نے یا تو گنہگار کو خلیفہ بنانے پر تعجب کرتے ہوئے یہ سوال کیا یا اس اعتبار سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں خلیفہ بنا رہا ہے اور جس پر یہ انعام کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا۔ بڑی تعجب کی بات ہے یا اس کام کو بہت بڑا سمجھتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اسے خلافت بھی ملے گی اور وہ نافرمان بھی ہوگا۔ حضرت قتادہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 117، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جب وہ زمین میں مخلوق پیدا کرے گا تو وہ فساد برپا کریں گے اور خونریزی کریں گے۔ انہوں نے یہ سوال کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، کیا یہ وہی ہے جس کے متعلق انہیں بتایا یا کوئی اور ہے۔ یہ قول بہتر ہے یہ عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کی تفسیر میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ زمین میں جب مخلوق ہوگی تو وہ اس میں فساد برپا کرے گی اور خون ریزی کرے گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کلام میں ان کے مذہب پر حذف ہے معنی یہ ہے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں جو ایسا ایسا کرے گا تو فرشتوں نے کہا: کیا زمین میں تو اسے خلیفہ بنانے والا ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ پہلا قول بہت بہتر ہے کیونکہ اس میں علم کا استخراج اور استنباط الفاظ کے مقتضیٰ سے ہے اور یہ نہیں ہوسکتا مگر علماء سے جو ان دونوں اقوال کے درمیان حسن ہے۔ اس میں غور و فکر کر۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے سوال کرنا کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا (1)...... جیسا کہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے...... تو یہ ان کو توبیخ کرنے کے لئے ہے جنہوں نے کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا، اور اپنی ازلی معلومات کا اظہار ہے کیونکہ انہیں فرمایا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا، مَنْ تجعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور فیھا دوسرے مفعول کے قائم مقام ہے۔ یفسد لفظ کے اعتبار سے ہے غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یفسدون بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ (الانعام: 25) یہ لفظ کے اعتبار سے ہے معنی کے اعتبار سے یستمعون ہے۔ (ویسفك) یہ معطوف ہے اس میں دو وجہیں جائز ہیں۔ اسید نے اعرج سے روایت کیا کہ انہوں نے ویسفكَ الدماء، پڑھا ہے یعنی مضارع کو منصوب پڑھا ہے اور واؤ کے ساتھ اسے استفہام کا جواب بنایا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا

الم اك جاركم و تكون بينی　　و بينكم المودة والاخاء

کیا میں تمہارا پڑوسی نہ تھا اور میرے اور تمہارے درمیان محبت و بھائی چارہ نہ تھا۔

السفك کا معنی انڈیلنا (بہانا) ہے سفكت الدم اسفكه سفكاً۔ میں نے خون کو بہایا اسی طرح آنسو بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ابن الفارس اور جوہری کا قول ہے۔

السفاك، کا معنی السفاح ہے جو کلام پر قادر ہو۔ مہدوی نے کہا: السفك صرف خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کبھی کلام کی نثر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سفك الكلام جب وہ کلام کرے۔ الدماء کا مفرد دم ہے، لام کلمہ محذوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل دَمْیٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: دَمَیٌ ہے اور کوئی اسم دو حرفوں پر نہیں آتا مگر اس سے حرف حذف کیا گیا ہوتا ہے۔ دم سے محذوف یا ہے اور کبھی اصل پر بھی بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلو أنا علی حجر ذبحنا　　جری الدمیان بالخبر الیقین

اگر ہم اس پتھر پر ہوتے تو ہم ذبح کئے جاتے، یقیناً دونوں طرف سے خون جاری ہوتے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 457، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، حدیث 2984، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (یعنی ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں)۔ ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، التسبیح کا معنی تعظیم کے طور پر ہر نقص سے پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

اقول لما جاء نی فخرہ سبحان من علقمہ الفاخر

میں کہتا ہوں: جب میرے پاس اس کا فخر آیا، میں علقمہ فخر کرنے والے سے برأت کرتا ہوں۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سبحان اللہ کی تفسیر پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنا، یہ السبح سے مشتق ہے جس کا معنی چلنا اور جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (المزمل) (بے شک دن میں مصروفیت ہے) پس سبحان اللہ کہنے والا اللہ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنے میں چلنے والا ہے نحن میں کلام گزر چکی ہے نون کو نون میں ادغام کرنا جائز نہیں تا کہ دو ساکن جمع نہ ہوں۔

مسئلہ: اہل تاویل کا فرشتوں کی تسبیح میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس نے فرمایا: فرشتوں کی تسبیح ان کی نماز ہے (1)، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (الصافات) یعنی اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کی تسبیح، ذکر کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ مفضل نے یہی کہا ہے اور جریر کے قول سے استشہاد کیا ہے

قبح الالهُ وجوہ تغلب کلما سبح الحجیج و کبّروا اھلالا

تغلب کے چہروں کو اللہ تعالیٰ نے قبیح کیا جب حاجیوں نے بلند آواز سے ذکر کیا اور تلبیہ کہا۔

حضرت قتادہ نے کہا: ان کی تسبیح سبحان اللہ ہے (2) عرف کے مطابق لغت میں یہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو ملائکہ کے لئے چنا ہے (یا اپنے بندوں کے لئے چنا ہے) سبحان اللہ و بحمدہ، اس کو مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ حضرت عبد الرحمن بن قرط سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جس رات سیر کرائی گئی آپ نے اوپر والے آسمانوں میں یہ تسبیح سنی: سبحان العلی الاعلی سبحانہ و تعالیٰ۔ اس کو بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِحَمْدِكَ یعنی ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کو ملاتے ہیں۔ الحمد کا معنی ثنا (تعریف) ہے پہلے گزر چکا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ بِحَمْدِكَ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ گویا انہوں نے کہا: ہم تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں پھر تسلیم کی جہت پر معترض کلام ذکر کی یعنی تو اس کی طرف ہدایت میں محمود ہے (4)۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل سبحان اللہ وبحمدہ، صفحہ 351، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنُقَدِّسُ لَكَ یعنی ہم تیری تعظیم کرتے ہیں اور ہم تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور ہم تیرے ذکر کو ان خرافات سے پاک کرتے ہیں جو ملحد لوگ تیرے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ مجاہد اور ابو صالح وغیرہما کا قول ہے۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: ہم تیری رضا چاہتے ہوئے اپنے نفسوں کو تیرے لئے پاک کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا جن میں قتادہ بھی ہیں: نقدس لك اس کا معنی ہے ہم نماز پڑھتے ہیں اور التقدیس کا معنی نماز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے(1)۔

میں کہتا ہوں بلکہ اس کا معنی صحیح ہے کیونکہ نماز تعظیم، تقدیس اور تسبیح پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجود میں کہتے تھے: سبوح قدوس رب الملائكه و الروح۔ (2) یہ حضرت عائشہ نے روایت کی ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔ قدس کی بنا پر جیسے بھی بنائی جائے اس کا معنی پاک کرنا ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (المائدہ:21) یعنی پاک زمین میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ (الحشر:23) یعنی طاہر۔ اس کی مثل ہے بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿﴾ (النازعات) بیت المقدس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ مکان ہے جس میں انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوٹے کو قدس کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے وضو کیا جاتا ہے اور طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی سے القادوس ہے۔ حدیث پاک میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو پاک نہیں فرمایا جو ضعیف کے لئے قوی سے مواخذہ نہیں کرتی (3)۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ القدس پاکیزگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شاعر کا قول ہے:

فادركنه ياخذن بالساق والنسا كما شبرق الولدان ثوب المقدس

کتوں نے بیل کو پنڈلیوں اور رانوں سے اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے نصاریٰ کے بچے اپنے راہب کے کپڑوں کو تبرک کے لئے کاٹ لیتے ہیں۔

نماز بندے کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے، نمازی نماز میں اکمل حالات میں داخل ہوتا ہے کیونکہ نماز افضل عمل ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، اَعْلَمُ میں دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ فعل مضارع ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم بمعنی فاعل ہے جیسے کہا جاتا ہے: اللہ اکبر بمعنی کبیر جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

لعمرك ما ادری و انی لأوجل علی أينا تعدو المنية اولُ

تیری عمر کی قسم! میں نہیں جانتا اور مجھے خوف ہے موت ہم میں سے کس پر پہلے آتی ہے۔

اگر اعلم فعل ہو تو ما اعلم کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا اور میم کا میم میں ادغام بھی جائز ہے، اگر تو اسے عالم کے معنی میں اسم بنائے تو (ما) اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔

ابن عطیہ نے کہا: نحویوں کے اجماع کی وجہ سے اس کو منصرف بنانا صحیح نہیں۔ اختلاف افعل میں ہے جب اس کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقول فی الرکوع والسجود، صفحہ 292، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 177، جلد 1 (وزارت تعلیم) 3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نام رکھا جائے اور یہ نکرہ ہو۔ سیبویہ اور خلیل اس کو غیر منصرف بناتے ہیں اخفش اسے منصرف بناتا ہے(1)۔ مہدوی نے کہا: أَعْلَمُ میں تنوین مقدر کرنا جائز ہے جب تو اسے عالم کے معنی میں مقدر کرے، اور ماکو اس کی وجہ سے نصب ہوگی۔ یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ جوہری نے کہا: نسوة حواج بیت اللہ اضافت کے ساتھ جب وہ حج کریں اور اگر وہ حج نہ کریں تو تو کہے گا حواج بیت اللہ۔ بیت کو تو نصب دے گا کیونکہ حواج میں تنوین کا ارادہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَالَا تَعْلَمُوْنَ اس ارشاد کی تاویل میں علماء تاویل کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس (لعنۃ اللہ علیہ) نے غرور کیا اور اس میں تکبر داخل ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کا خازن بنایا اور اسے عزت بخشی تو وہ دل میں اعتقاد رکھنے لگا کہ اسے فضیلت حاصل ہے(2)۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے معصیت اور کفر کو حقیر جانا۔ فرشتوں نے کہا: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ فرشتے نہیں جانتے تھے کہ ابلیس کے نفس میں اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ قتادہ نے کہا: جب فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ جن کو وہ خلیفہ بنا رہا ہے ان میں انبیاء، فضلاء اور طاعت شعار بھی ہیں تو فرمایا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔(3)

میں کہتا ہوں: اس معنی کا بھی احتمال ہے میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس میں سے جو پہلے ہو چکا ہے اور جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا۔ یہ عام ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

''اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا: بتاؤ تم تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، عَلَّمَ بمعنی عرف (پہچان کرانا) ہے اور یہاں تعلیم سے مراد اپنا علم ضروری الہام کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ علم فرشتے جبریل کے واسطہ سے ہو جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کو علم مجہول کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلا لفظ زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے تعلیم حق دینے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام نے ان اسماء کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے یاد کرانے کے ساتھ انہوں نے یاد کیا اور جو اللہ تعالیٰ نے آدم سے عہد کیا تھا وہ بھول گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں ان کے نفس کے سپرد کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (طٰہٰ)

اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

ابن عطا نے کہا: اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ان اسماء کا علم منکشف نہ کیا جاتا تو ملائکہ کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام خبر دینے سے زیادہ عاجز ہوتے۔ یہ واضح ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابوالبشر ہے۔ بعض نے فرمایا: ابو محمد ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت خاتم الانبیاء بیان کی جاتی ہے یہ سہیلی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابو محمد تھی، زمین میں ابوالبشر تھی، اس کی اصل دو ہمزوں کے ساتھ ہے (أأدم) کیونکہ یہ افعل کے وزن پر ہے مگر دوسرے ہمزہ کو لین کر دیا، جب اس کو حرکت دینے کی طرف توجہت پکڑے گا تو تو اسے واؤ بنا دے گا تو جمع میں اوادم کہے گا کیونکہ یاء میں اس کی اصل معروف نہیں ہے عام طور پر اس میں واؤ رکھی جاتی ہے یہ اخفش سے مروی ہے۔

اس کے مادہ اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ادمۃ الارض وادیمہا سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی سطح ہے، انسان اس سے پیدا ہوا اسی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الادمۃ سے مشتق ہے، جس کا معنی گندمی رنگ ہے۔ الادمۃ میں اختلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد گندمی رنگ ہے۔ نضر نے کہا: یہ سفید رنگ ہے آدم علیہ السلام سفید تھے اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ناقۃٌ ادماء، جب اونٹنی سفید ہو۔ اس اشتقاق پر اس کی جمع اُدْم اور اوادم ہوگی جیسے حمر اور احامر ہے، کسی بھی طرح منصرف نہیں اور الادمۃ سے مشتق ہو تو اس کی جمع آدمون ہوگی۔ اس قول والوں پر اس کو منصرف بنانا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ ادیم الارض سے مشتق ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: آدم کو آدم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کی سطح سے پیدا کیا گیا ہے انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ کیونکہ یہ بھولا تھا۔ ابن سعد نے اسے طبقات میں ذکر کیا ہے۔

سدی نے ابو مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، مرہ الہمدانی نے حضرت ابن مسعود سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قصہ میں روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو زمین کی طرف بھیجا تاکہ اس کی مٹی لے آئے۔ زمین نے کہا: میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ سے کچھ کمی کرے یا مجھے عیب لگائے۔ جبریل واپس آ گئے اور مٹی نہ لے آئے۔ جبریل نے عرض کی: یا اللہ! اس نے تیری پناہ مانگی تو میں نے اسے پناہ دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میکائیل کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی پناہ چاہی تو انہوں نے پناہ دے دی۔ وہ بھی واپس آ گئے اور اسی طرح کہا جس طرح جبریل نے کہا۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے پناہ مانگی تو ملک الموت نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں واپس جاؤں اور اس کا امر نافذ نہ کروں پس ملک الموت نے زمین کی سطح سے مٹی لی اور اسے مختلف جگہوں سے لیا کسی ایک جگہ سے نہ لیا، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے لیا، اسی وجہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد کے رنگ مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے آدم کو آدم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کی سطح سے لئے گئے تھے (1)۔ ملک الموت مٹی لے کر اوپر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: تجھے رحم نہ آیا جب زمین نے تیری بارگاہ میں تضرع وزاری کی۔ فرمایا: میں نے تیرا معاملہ اس کے قول سے زیادہ سخت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)

دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو آدم کی اولاد کی ارواح قبض کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر مٹی کو تر کیا حتیٰ کہ وہ لیس دار مٹی بن گئی، اللازب اس مٹی کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، پھر اس مٹی کو چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ اس میں بدبو پیدا ہو گئی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾ (الحجر) یعنی بدبودار سیاہ مٹی سے۔ پھر ملائکہ سے فرمایا: اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۱﴾ (ص) فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾ (الحجر) (میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک ماروں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تا کہ ابلیس ان پر بڑائی نہ جتلائے۔ فرمایا: کیا تو اس پر بڑائی جتلاتا ہے جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے اور میں اس کی وجہ سے فخر نہیں کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بشر بنایا، وہ جمعہ کے دن کی مقدار سے چالیس سال تک مٹی کا جسم رہا۔ پھر ملائکہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے ڈر گئے، جب انہوں نے اسے دیکھا سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا وہ اس کے پاس سے گزرتا تھا تو اسے مارتا تھا، جسم سے آواز پیدا ہوتی تھی جس طرح ٹھیکری سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (الرحمٰن)

شیطان کہتا: اللہ تعالیٰ نے اسے کس امر کے لئے پیدا کیا ہے ابلیس اس آدم کے ڈھانچہ کے منہ سے داخل ہوتا اور اس کی دبر سے نکل جاتا۔ ابلیس نے ملائکہ سے کہا: اس سے مت ڈرو یہ کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ کہا جاتا ہے: ابلیس جب فرشتوں کے ساتھ آدم کے ڈھانچہ کے پاس سے گزرتا تو کہتا: کیا تم نے ملاحظہ کیا اسے جس کے مشابہ تم نے کوئی مخلوق نہیں دیکھی۔ اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم ایسا کرو گے؟ فرشتوں نے کہا: ہم اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں سوچا اگر اسے مجھ پر فضیلت دی گئی تو میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اگر مجھے اس پر فضیلت دی گئی تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ جب وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے آدم میں روح پھونکنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے کہا: جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا۔ جب اس میں روح پھونکی گئی اور روح آدم کے سر میں داخل ہوئی تو آدم نے چھینک ماری۔ فرشتوں نے اسے کہا: تم کہو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ، آدم نے کہا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رحمك ربك (تیرا رب تجھ پر رحم فرمائے) جب روح آدم علیہ السلام کی آنکھوں میں پہنچی تو آدم علیہ السلام نے جنت کے پھلوں کو دیکھا۔ جب روح آدم کے پیٹ میں داخل ہوئی تو آدم کو کھانے کا شوق ہوا۔ پس وہ روح کے قدموں تک پہنچنے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے جنت کے پھلوں کی طرف لپکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿ۙ۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۱﴾ (الحجر) (پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو)۔

ترمذی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اسی (مٹی کی) مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے بھری تھی، پس بنو آدم زمین کی قدر پر پیدا ہوئے، بعض سرخ، بعض سفید اور بعض سیاہ پیدا ہوئے اور بعض گندمی رنگ پیدا ہوئے، کچھ نرم مزاج، کچھ سخت مزاج، کچھ خبیث اور کچھ نیک۔ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ ادیم جمع ہے آدم کی۔ شاعر نے کہا:

الناس اخیاف و شتی فی الشیم　　و کلھم یجمعھم وجه الادم

لوگ مختلف رنگوں میں ہیں اور خصائل میں بھی مختلف ہیں، سب کو زمین کی سطح جمع کرتی ہے۔

پس آدم، ادیم اور الآدم سے مشتق ہے نہ کہ الادمة سے مشتق ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں سے مشتق ہو، اس مسئلہ کی مزید وضاحت تخلیق آدم کے قصہ میں سورۂ انعام میں آئے گی۔

اٰدَمَ، یہ غیر منصرف ہے، ابوجعفر نحاس نے کہا: اٰدَمَ معرفہ ہونے کی صورت میں غیر منصرف ہے اس پر نحویوں کا اجماع ہے کیونکہ افعل کے وزن پر یہ معرفہ ہے اور بصریوں کے نزدیک اس کو منصرف ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں مگر دو علتیں، اگر تو اسے نکرہ بنا دے اور یہ نعت نہ ہو۔ خلیل اور سیبویہ اسے غیر منصرف بناتے ہیں۔ اخفش سعید اسے منصرف بناتا ہے کہ یہ نعت ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے اگر نعت نہ ہو تو منصرف ہوگا۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: قول تو سیبویہ کا ہے۔ وہ نعت اور غیر میں فرق نہیں کرتے، کیونکہ یہ بعینہٖ وہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے فرمایا الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، الْاَسْمَآءَ سے یہاں مراد عبارات ہیں۔ کبھی اسم بولا جاتا ہے اور مراد مسمیٰ ہوتا ہے جیسے تیرا قول زید قائم۔ الاسد شجاع۔ کبھی نام سے مراد ذات ہوتی ہے جیسے تیرا قول اسد کے تین حرف میں پہلی صورت میں اسم بولا گیا ہے مراد مسمّیٰ ہے، دوسری صورت میں مسمیٰ مراد نہیں ہوتا کبھی لغت میں ذات کے قائم مقام عبارت ہوتی ہے اس طرح کا استعمال اکثر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یہ مشہور تاویلات پر ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اِن لله تسعة و تسعین اسماً۔ (2) کبھی یہ ذات کے قائم مقام ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ذات، نفسٌ، عینٌ اسمٌ یہ سب ہم معنی ہیں۔ اکثر اہل علم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (الاعلیٰ) اور تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ (الرحمٰن: 78) اور اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ (النجم: 23) میں اسم کو ذات پر محمول کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے ان کے معنی میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ حضرات ابن عباس، عکرمہ، قتادہ، مجاہد، ابن جبیر نے کہا: علمه اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا۔ (3) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام بڑی چھوٹی اشیاء کے اسماء سکھا دیئے۔

عاصم بن کلیب نے سعد مولی حسن بن علی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پس

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاھا، صفحہ 342، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2531، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

لوگوں نے برتنوں کے نام اور کوڑے کے نام کا ذکر کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کے اسماء سکھائے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مرفوع حدیث میں بھی مروی ہے اور لفظ کلھا بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کلھا یہ احاطہ اور عموم کے لئے وضع کیا گیا ہے، بخاری میں حضرت انس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مومنین قیامت کے روز جمع ہوں گے اور کہیں گے: اگر ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سفارش طلب کریں۔ پس لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور انہیں کہیں گے: انت ابو الناس خلقك الله بيده و اسجد لك ملائكته و علمك اسماء كل شيء، آپ لوگوں کے باپ ہیں اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، تیرے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرایا، تجھے ہر چیز کا نام سکھایا (1)۔ الحدیث۔

ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ لغت توقیفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اور تفصیلی اسماء سکھائے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام بتایا حتیٰ کہ پیالے اور دودھ دوھنے کے برتن کا نام بھی بتایا۔

شیبان نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی مخلوق کے اسماء بتائے جبکہ ملائکہ کو نہ بتائے۔ چیز کا نام بتایا اور ہر چیز کی منفعت اس کی جنس کی طرف پھیری۔ نحاس نے کہا: یہ کچھ اس باب کے متعلق مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجناس کے اسماء بھی سکھائے اور ان کے منافع بھی بتائے۔ یہ چیز اس طرح اور یہ اس کام کے لئے ہے۔ طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو فرشتوں کے اسماء اور ان کو اپنی اولاد کے اسماء سکھائے۔ طبری نے اس قول کو پسند کیا ہے اور اس قول کی وجہ سے اسے ترجیح دی ہے: **ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ**۔

ابن زید نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے اسماء سکھائے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: خاص فرشتوں کے اسماء سکھائے۔ قتبی نے کہا: جو کچھ زمین میں پیدا فرمایا ان کے اسماء سکھائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اجناس اور انواع کے اسماء سکھائے (2) میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

مسئلہ نمبر 4: اہل تاویل کا اختلاف ہے کہ کیا ملائکہ پر اشخاص کے نام پیش کئے تھے یا صرف اسماء پیش کئے تھے بغیر اشخاص کے۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے فرمایا: اشخاص کو پیش کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَرَضَهُمْ (انہیں پیش کیا)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (ان کے اسماء بتاؤ) عرب کہتے ہیں: عرضت الشیء فاعرض میں نے چیز کو ظاہر کیا تو وہ ظاہر ہو گئی۔ اسی سے ہے عرضت الشیء للبیع میں نے چیز کو بیع کے لئے پیش کیا۔ حدیث پاک میں ہے: انه عرضهم امثال الذر انہوں نے چیونٹیوں کی مثال میں پیش کیا (3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، حدیث نمبر 6962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120-119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حضرت ابن عباس وغیرہ نے فرمایا: اسماء کو پیش کیا۔ حضرت ابن مسعود کے حرف میں ہے: عرضھن۔ انہوں نے ضمیر اسماء کی طرف لوٹائی اشخاص کی طرف نہیں، ھن ضمیر مؤنث کے ساتھ خاص ہے، اور حضرت ابی کے حرف میں ہے: عرضھا۔

مجاہد نے کہا: اصحاب الاسماء کو پیش کیا جنہوں نے کہا: اسماء سے مراد المسمیات ہے تو انہوں نے ابی کی قرأت عرضھا کو بنیاد بنایا۔ اور جنہوں نے عرضھم پڑھا انہوں نے کہا: لفظ اسماء اشخاص پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسماء کے لئے عرضھم کہنا جائز ہے اور ھؤلاء میں اسماء کے اشخاص کی طرف اشارہ مراد ہے لیکن اگر چہ وہ غائب تھے پس وہ حاضر تھا جو ان میں سے تھا ایک سبب کی وجہ سے اور وہ ان کے اسماء تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ بات جو ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے اور ان اجناس کے ساتھ ان پر اسماء پیش کئے پھر ان چیزوں کو ملائکہ پر پیش کیا اور ان سے ان چیزوں کے اسماء پوچھے، جو حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھ لئے تھے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں بتایا اس چیز کا یہ اسم ہے اس چیز کا یہ اسم ہے۔

الماوردی نے کہا: اصح یہ ہے کہ ذوات کو پیش کیا گیا تھا پھر ان چیزوں کے پیش کرنے کے زمانہ میں دو قول ہیں۔ (۱) ان چیزوں کو تخلیق کرنے کے بعد انہیں پیش کیا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے دلوں میں ان کی تصویریں ڈال دیں پھر انہیں پیش کیا۔

مسئلہ نمبر 5: اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان کس نے بولی۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی اور سریانی کتاب اور باقی کتب جس نے وضع کیں اور تمام زبانوں کے ساتھ کلام کی وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ یہ حضرت کعب الاحبار کے علاوہ علماء کا بھی قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت کعب احبار سے بہتر وجہ مروی ہے، فرمایا: جس نے سب سے پہلے عربی بولی وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر عربی ڈالی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سام کی زبان پر ڈالی تھی اسے ثور بن زید نے خالد بن معدان سے انہوں نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے واضح عربی زبان سب سے پہلے بولی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے وہ اس وقت دس سال کے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ سب سے پہلے عربی یعرب بن قحطان نے بولی۔ اس کے علاوہ بھی روایات ہیں۔ ہم کہیں گے: صحیح یہ ہے کہ سب سے پہلے انسانوں میں سے عربی بولنے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**۔ اور لغات ساری اسماء ہیں۔ پس یہ اس کے تحت داخل ہیں، سنت میں بھی اس طرح آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھائے حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا نام بھی سکھایا اور پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے عربی بولی تو اس میں احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے سب سے پہلے حضرت اسماعیل نے عربی بولی۔ اسی طرح اس قول کے علاوہ جو اقوال ہیں وہ بھی اس پر محمول ہوں گے کہ مذکور شخص نے اپنے قبیلہ سے پہلے عربی بولی۔ اس کی دلیل وہی ہے جو میں نے ذکر کر دی ہے۔ اسی طرح جبریل

نے فرشتوں میں سے سب سے پہلے عربی بولی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو عربی سکھائی اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے یہ جاری فرمائی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰٓؤُلَآءِ۔ یہ لفظ مبنی بر کسرہ ہے تمیم اور بعض قیس اور اسد قبیلہ کی لغت میں ہؤلاء میں قصر ہے۔

اعشیٰ نے کہا:

هؤلا ثم هؤلا كلا اعطيـ ت نعالا محذوّة بمثال (1)

یہ لوگ پھر یہ لوگ یقیناً تو نے ان کو مثال کے ساتھ سلے ہوئے جوتے دیئے۔

عربوں میں سے بعض اسے ھولاء پڑھتے ہیں الف اور ہمزہ حذف کر دیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: ان کنتم صادقین ان بنی آدم یفسدون فی الارض فانبئونی یعنی اگر تم سچے ہو کہ بنی آدم زمین میں فساد برپا کریں گے تو پھر مجھے بتاؤ۔ یہ مبرد کا قول ہے صٰدِقِيْنَ کا معنی عالمین ہے یعنی اگر تم جاننے والے ہو۔ اسی وجہ سے ملائکہ کیلئے اجتہاد جائز نہیں ہے۔ فرشتوں نے کہا: سبحانک۔ تیری ذات پاک ہے۔ یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ان پر خبر دینے میں صرف سچ شرط نہ ہوتو پھر ان کے لئے اجتہاد جائز ہوتا جس طرح اس شخص کے لئے جائز تھا جسے اللہ تعالیٰ نے سو سال موت دی پھر پوچھا کم لَبِثْتَ اس پر اصابت شرط نہیں تھی۔ فرمایا: اس نے صحیح بات نہ پائی تو اس پر سختی نہ فرمائی یہ واضح ہے اس میں کسی قسم کا خفا نہیں۔

طبری اور ابوعبید نے حکایت کیا ہے کہ بعض مفسرین نے کہا: اِنْ كُنْتُمْ کا معنی ہے اذ کنتم۔ طبری اور ابوعبید نے کہا: یہ غلط ہے (2)۔

اَنْۢبِـُٔوْنِيْ کا معنی ہے: مجھے خبر دو۔ النبأ خبر کو کہتے ہیں اسی سے النبیٔ (ہمزہ کے ساتھ) ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

مسئلہ نمبر 7: بعض علماء نے فرمایا: خبر دینے کے امر سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ نہیں جانتے۔ محققین اہل تاویل کہتے ہیں: یہ تکلیف کی جہت سے امر نہیں ہے یہ تقریر اور توقیف کی جہت سے ہے۔ تکلیف مالا یطاق پر تفصیلی کلام آگے آئے گا کیا تکلیف مالا یطاق واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یہ تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲

''عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر حقیقتاً تو نے ہمیں سکھا دیا۔ بے شک تو ہی علم و

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً

حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سُبْحٰنَكَ تو اس سے پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی غیب جانے۔ یہ اَنْۢبِئُوْنِیْ کے ارشاد کا جواب ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ تو صرف وہی جانتے ہیں جو وہ انہیں سکھاتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا انہیں علم نہیں جیسا کہ ہم میں سے جہال کہا کرتے ہیں۔ مَا عَلَّمْتَنَا میں مَا بمعنی الذی ہے یعنی وہ جو تو نے ہمیں سکھایا اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا مصدریہ ہو بمعنی الا تعلیمك ایانا یعنی مگر تیرے سکھانے کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2: جس شخص سے کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ نہ جانتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ فرشتوں، انبیاء، فضلاء علماء کی اقتداء کرتے ہوئے یہ کہے کہ اللہ جانتا ہے میں نہیں جانتا ...... لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ علماء کی موت کے ساتھ علم اٹھالیا جائے گا، پھر جہال لوگ باقی رہ جائیں گے جن سے فتوے طلب کئے جائیں گے وہ اپنی رائے سے فتوے دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین سے اس آیت کے معنی میں جو مروی ہے وہ البستی نے ''المسند الصحیح'' میں حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بری جگہیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں جبریل امین علیہ السلام سے پوچھ لوں۔ جبریل امین علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو اس نے کہا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں میکائیل علیہ السلام سے پوچھ لوں، میکائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اچھی جگہیں مساجد ہیں اور بری جگہیں بازار ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دادی کو ایک مسئلہ میں کہا تھا تو لوٹ جا حتیٰ کہ میں لوگوں سے پوچھ لوں (2)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: وَابَرَدَها علی الکبد۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیا ہے؟ فرمایا: آدمی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جو وہ نہ جانتا ہو تو وہ کہے: اللہ اعلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ابن عمر نے ٹھیک کہا ہے ایسی بات پوچھی گئی جس کا اسے علم نہیں تھا تو کہا: مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ دارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ابی عقیل یحییٰ بن متوکل صاحب ''بہیۃ'' نے کہا: میں قاسم بن عبید اللہ اور یحییٰ بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحییٰ نے قاسم سے کہا: اے ابا محمد! تیرے جیسے شخص پر بہت بری بات ہے کہ اس دین کا کوئی مسئلہ تجھ سے پوچھا جائے پھر تیرے پاس اس کا علم نہ ہو اور نہ کوئی کشادگی کا راستہ ہو، یا کہا: نہ علم اور نہ نکلنے کا راستہ ہو۔ قاسم نے اسے کہا: یہ کس کے لئے؟ یحییٰ نے کہا کیونکہ تو ہدایت یافتہ اماموں ابوبکر اور عمر کا بیٹا ہے۔ قاسم نے اسے کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل بخشی ہے اس کے نزدیک اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ انسان بغیر علم کے کوئی بات کرے یا کسی غیر ثقہ سے مسئلہ

1۔ صحیح بخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث نمبر 98، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6511

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2507۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2027، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پوچھے۔ یحییٰ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: میں نے ابن ہرمز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عالم کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو لاادری (میں نہیں جانتا) کی میراث دے تا کہ ان کے ہاتھوں میں اصل ہو۔ جب ان میں سے کسی سے وہ مسئلہ پوچھا جائے گا جو وہ نہیں جانتا ہوگا تو کہے گا: میں نہیں جانتا۔ ہیثم بن جمیل نے ذکر کیا ہے کہ میں امام مالک سے اڑتالیس مسائل پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تو امام مالک نے بتیس مسائل میں فرمایا: میں نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء مسلمین سے بہت سی ایسی مثالیں مروی ہیں۔ اس کو اس ریاست کے ترک اور علم میں انصاف نہ کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ ابن عبد البر نے کہا: علم کی برکت اور اس کے آداب سے اس میں انصاف کرنا ہے جس نے انصاف نہیں کیا اس نے نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ یونس بن عبد الاعلیٰ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابن وہب کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہمارے زمانہ میں انصاف سے کم کوئی چیز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صورت امام مالک کے زمانہ میں تھی تو پھر آج ہمارے زمانہ میں کیا حالت ہوگی جبکہ ہمارے اندر فساد پھیل چکا ہے اور کمینے لوگوں کی کثرت ہے اور ریاست کے لئے علم طلب کیا جاتا ہے نہ کہ شعور و آگاہی کے لئے بلکہ دنیا میں ظاہر ہونے اور اس جنگ و جدل کے ذریعے اپنے ہم عصروں پر غلبہ پانے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جو جنگ و جدل دل میں قساوت پیدا کرتا ہے اور کینہ چھوڑتا ہے۔ اس کو عدم تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

کہاں گئی وہ روایت جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: اپنی عورتوں کے مہر چالیس اوقیہ سے زائد نہ رکھو اگر چہ عورت ذی العصبہ کی بیٹی ہو یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی ہو جو زیادہ رکھے گا زیادتی بیت المال میں رکھی جائے گی۔ ایک عورت اٹھی جو صائب الرائے عورتوں میں سے تھی۔ اس کا منہ لمبا تھا اور ناک چپٹی تھی۔ اس عورت نے کہا: تجھے اس مہر کے تعین کا حق نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں؟ اس عورت نے کہا: اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا** (النساء: 20) دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔

حضرت عمر نے کہا: عورت صحیح ہے اور مرد نے غلطی کی (1)۔

وکیع نے ابو معشر سے انہوں نے حضرت محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نے حضرت علی سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت علی نے جواب دیا تو اس شخص نے کہا: اے امیر المومنین! مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے صحیح کہا اور میں نے غلطی کی ہر علم والے کے اوپر علم والا ہوتا ہے۔

ابو محمد قاسم بن اصبغ نے ذکر کیا ہے کہ جب میں مشرق کی طرف چلا تو میں قیروان میں اترا اور میں نے بکر بن حماد سے مسدد کی حدیث حاصل کی۔ پھر میں بغداد چلا گیا۔ میں لوگوں سے ملا۔ جب میں واپس آیا تو میں مسدد کی حدیث کی تکمیل کے لئے ان کی طرف لوٹا۔ ایک میں نے ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی جس کا تعلق مضر قبیلہ سے تھا انہوں نے دھاری دار قمیصیں پہنی ہوئی تھیں بکر بن حماد نے کہا: حدیث میں لفظ **مجتابی النمار** نہیں **مجتابی**

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 233

الثمار ہے۔ میں نے کہا: مجتابی النمار ہے۔ میں نے اندلس اور عراق میں جس شخص پر بھی یہ حدیث پڑھی میں نے اسی طرح پڑھی ہے۔

بکر بن حماد نے کہا: تو عراق میں جانے کی وجہ سے ہمارا مقابلہ کرتا ہے اور ہم پر فخر کرتا ہے۔ پھر مجھے فرمایا: ہمارے ساتھ اس شیخ کی طرف چلو...... جو مسجد میں موجود تھے...... اس کے پاس اس کا علم ہے۔ ہم ان کی طرف چلے۔ ہم نے ان سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ھو مجتابی النمار جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ دھاری دار کپڑے پہنتے تھے اور ان کے گریبان سامنے ہوتے تھے۔ النمار جمع ہے نِمَرَۃ کی۔ بکر بن حماد نے اپنا ناک پکڑ لیا اور کہا: حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو، حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو پھر وہ واپس چلے گئے۔ یزید بن ولید بن عبد الملک نے کتنا اچھا کہا ہے:

اذا ما تحدثت فی مجلس　　تناھی حدیثی الی ما علمت

ولم اعد علمی الی غیرہ　　و کان اذا ما تناھی سکت

جب میں کسی مجلس میں بات کرتا ہوں تو میری بات کی انتہا میرے علم تک ہوتی ہے۔ میں اپنے علم کو کسی غیر تک نہیں لے جاتا۔ جب میرے علم کی انتہا ہوتی ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبۡحٰنَکَ۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک سبحان مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ اس معنی کو ادا کرتا ہے: نسبحك تسبیحًا ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ کسائی نے کہا: یہ نداء کی وجہ سے منصوب ہے(1)۔

الۡعَلِیۡمُ مبالغہ کے لئے اور اللہ کی مخلوق میں معلومات میں کثرت کا معنی دینے کے لئے فعیل کے وزن پر ہے۔ الۡحَکِیۡمُ اس کا معنی حاکم ہے، ان دونوں اسموں کے درمیان مزید مبالغہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی محکم ہے اس صورت میں حکیم فعل کی صفات سے ہوگا، پھر یہ مُفعل سے فعیل کے وزن پر پھیرا گیا ہے جیسا کہ مُسمِع کو سمیع کی طرف اور مُؤلم کو الیم کی طرف پھیرا گیا ہے یہ ابن انباری نے کہا ہے۔ ایک قوم نے کہا: الۡحَکِیۡمُ کا معنی ہے فساد سے روکنے والا۔ اسی سے حکمة اللجام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی گھوڑے کو مقصد کے بغیر بھاگنے اور چلنے سے روکتی ہے۔ جریر نے کہا:

أَبنِیۡ حنیفه احکموا سفهاءکم　　انی اخاف علیکم ان اغضبا (2)

کیا بنی حنیفہ نے اپنے نادان لوگوں کو روکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں تم پر غصہ کروں گا یعنی کیا بنی حنیفہ نے اپنے بیوقوف لوگوں کو فساد سے روکا ہے۔

زہیر نے کہا:

القائد الخیل منکوبا دوابرھا　　قد أحکمت حکمات القدّ والأبَقَا

وہ گھوڑوں کو چلاتا ہے حتیٰ کہ ان کے پاؤں گھس جاتے ہیں وہ روئی اور چمڑے کی لگاموں کے ساتھ روکے گئے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً، صفحہ 122، جلد 1

عرب کہتے ہیں: احکم الیتیم عن کذا و کذا۔ یتیم کو اس اس کام سے روکا گیا ہے۔ السورة المحکمة ایسی سورت جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو اور اس کے ساتھ اس کو ملایا جائے جو اس سے خارج ہو اور اس پر زائد کیا جائے جو اس سے نہ ہو ایسی حکمت ہے، وہ بھی حکمت والے کو جہالت سے روکتی ہے۔ کہا جاتا ہے: احکم الشیء جب کوئی کسی کام کو پختہ کرے اور مقصود سے خارج ہونے والی چیز کو رد کرے۔ فھو محکم و حکیم کثرت اور زیادتی حکمت کا معنی ہے۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''فرمایا: اے آدم! بتادو انہیں ان چیزوں کے نام پھر جب آدم نے بتا دیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بلند مرتبہ پر آگاہ کرنے کے لئے انہیں حکم دیا کہ فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، اس کے بعد کہ پہلے ان پر ان چیزوں کو پیش کیا گیا تھا تا کہ فرشتے جان لیں کہ وہ زیادہ جاننے والا ہے اس کے متعلق جو ان سے پوچھی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کہ اسے ان پر مقدم کیا اس کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں آدم کا شاگرد بنایا اور انہیں حکم دیا کہ ان سے علم حاصل کرو۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کو عظمت و جلال کا رتبہ حاصل ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجود لہ بنایا اور علم کے ساتھ خاص فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں علم اور صاحب علم کی فضیلت کی دلیل ہے۔ حدیث پاک میں ہے فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں (1) یعنی اس کے لئے تواضع و انکساری کرتے ہیں۔ فرشتے تمام لوگوں میں صرف اہل علم کے لئے ایسا کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب و احترام ان پر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے لازم کیا تھا۔ پس یہ ادب ان فرشتوں نے سیکھا جب بھی کسی بشر میں علم ان کے سامنے ظاہر ہوا فرشتے اس کے لئے جھک گئے اور علم کی اور صاحب علم کی تعظیم کے لئے عاجزی کرنے لگے اور علم طلب کرنے اور علم سے مشغول ہونے کی وجہ سے یہ سب تعظیم و مرتبہ انہیں ملا۔ یہ مرتبہ تو طلباء کا ہے، علماء اور جو ربانیین ہیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں سے کرے بے شک وہ عظیم فضل والا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس باب میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ فرشتے افضل ہیں یا انسان افضل ہے علماء کے دو قول ہیں: ایک قوم کا خیال ہے کہ انسانوں میں سے رسل، فرشتوں میں رسل پر افضل ہیں، انسانوں میں سے اولیاء فرشتوں میں سے

1۔ جامع ترمذی، ابواب العلم عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادة، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)
سنن ابی داؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اولیاء پر افضل ہیں۔ دوسرے علماء کا خیال ہے: ملاء اعلی افضل ہے جنہوں نے فرشتوں کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے ان آیات اور احادیث سے حجت پکڑی ہے: عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں)۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء:172) ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام:50) (آپ فرمائیے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں گا کہ خود جان لیتا ہوں غیب اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں)۔

اور بخاری میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: من ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منہم (1) (جس نے مجھے مجمع میں یاد کیا میں نے اسے ان سے بہتر مجمع میں یاد کیا۔) یہ نص ہے۔

اور جن علماء نے بنی آدم کو ترجیح دی انہوں نے ان آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (البینہ) (یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں)۔

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ان الملائکۃ لتضع اجنحتہا رضی لطالب العلم (2) (بے شک فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔)

یہ حدیث ابوداؤد نے ذکر کی ہے، ایسی بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عرفات کی وجہ سے فرشتوں پر مباہات فرماتا ہے اور مباہات ہمیشہ افضل کی وجہ سے کیا جاتا ہے (3)۔ واللہ اعلم بالصواب

بعض علماء نے فرمایا: کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ انبیاء فرشتوں سے افضل ہیں اور نہ اس پر کوئی قطعی دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں کیونکہ اس کا طریق اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا اجماع امت ہے اور اس بارے میں کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ قدریہ فرقہ اور قاضی ابوبکر کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: فرشتے افضل ہیں۔ قاضی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اور شیعہ حضرات نے جو کہا ہے کہ انبیاء افضل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کو یہ کہا جائے گا کہ مسجود لہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا، کیا

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ عزوجل ویحذرکم اللہ نفسہ، حدیث نمبر 6856، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کعبہ مسجود لہا ہے انبیاء اور ساری مخلوق اسے سجدہ کرتی ہے، پھر انبیاء بالاتفاق کعبہ سے بہتر وافضل ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ سجدہ عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو سجدہ ایک جہت کی طرف ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ جہت سجدہ کرنے والے اور عابد سے افضل ہے اور یہ بات واضح ہے۔ مزید بیان اس کے بعد آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس آیت میں دلیل ہے کہ کوئی شخص غیب نہیں جانتا مگر جن کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے جیسے انبیاء کرام یا جن کے لئے اللہ نے علم غیب عطا فرمایا وہ کسی کو کچھ غیب کا علم عطا فرمادیں۔ پس یہ نجوی اور کاہن لوگ جھوٹے ہیں۔ مزید بیان ان شاءاللہ سورۂ انعام میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ۔ یعنی ان کے قول کو میں جانتا ہوں جو انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (البقرہ: 30) یہ مکی اور ماوردی نے کہا ہے زہراوی نے کہا اور جو انہوں نے ظاہر کیا وہ ان کا حضرت آدم علیہ السلام کو جلدی سے سجدہ کرنا ہے وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور سعید بن جبیر نے فرمایا: اس سے مراد وہ ہے جو ابلیس نے کبر اور معصیت اپنے نفس میں چھپائی ہوئی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: تکتمون جمع کا صیغہ ہے جبکہ وہ چھپانے والا اس قول کے مطابق ایک تھا تو یہ مجازاً اور وسعت کی بنا پر ہے۔ کسی قوم کو کہا جاتا ہے جبکہ ان کے ایک بیوقوف نے جنایت کی ہوتی ہے: انتم فعلتم کذا تم نے یہ کیا ہے، یعنی تم میں سے ایک ایسا کرنے والا ہے۔ یہ تخصیص کرنے کے ارادہ سے ہوتا ہے(1)۔

اسی سے یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۝ (الحجرات) حالانکہ ایک شخص عیینہ نے پکارا تھا یا بعض نے کہا: اقرع نے پکارا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: ظاہر کرنا اور چھپانا یہ تمام فرشتوں کے ظواہر اور اسرار کی معرفت کے عمومی معنی پر ہے۔ مہدی بن میمون نے کہا: ہم حضرت حسن کے پاس موجود تھے۔ ان سے حسن بن دینار نے پوچھا: فرشتوں نے کیا چھپایا تھا؟ حسن نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے ایک عجیب مخلوق دیکھی گویا ان کے دلوں میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ فرمایا: پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور آپس میں سرگوشی کرنے لگے اور کہا: تمہیں اس مخلوق سے کوئی پریشانی نہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں فرمائی مگر ہم اس سے اس کے نزدیک افضل ہیں۔

مَا تُبْدُوْنَ سے مَا اس کو اَعْلَمُ کی وجہ سے نصب جائز ہے اس بنا پر کہ اَعْلَمُ فعل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَعْلَمُ بمعنی عالم ہو اور اس کی وجہ سے مَا منصوب ہو پس یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٘ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ۝۳۴

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

"جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور (داخل) ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذْ قُلْنَا اس سے پہلے اذ کرمحذوف ہے اور رہا ابو عبید کا قول کہ (اذ) زائدہ ہے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ (اذ) ظرف ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے، اور فرمایا: قلنا، قلت نہیں فرمایا، چونکہ جبار عظیم ذات اپنے بارے جماعت کے فعل کے ساتھ خبر دیتی ہے، عظمت اور ذکر کی بلندی کے اظہار کے اعتبار سے۔

ملائکۃ یہ جمع ہے ملك کی۔ اس سے پہلے اس کا ذکر گزر چکا ہے، ادم کے متعلق اور اس کے اشتقاق کے متعلق بھی بحث گزر چکی ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابو جعفر بن قعقاع سے مروی ہے کہ انہوں نے ملائکۃ کی تاء کو اسجدوا کے جیم کے ضمہ کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کی مثال الحمد للہ

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْجُدُوْا۔ سجود کا معنی عرب کلام میں تذلل اور خضوع (عجز و انکساری) ہے۔ شاعر نے کہا:

بجمع تضل البلق فی حجراته　　　ترئ الأ کم فیها سجداً للحوافر

اس شعر میں سجداً خضوع وخشوع اور جھکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عین ساجدۃ، ایسی آنکھ جو دیکھنے سے تھکی ہوتی ہو۔ سجدہ کی غایت زمین پر چہرے کو رکھنا ہے۔ ابن فارس نے کہا: سجد اس وقت بولتے ہیں جب کوئی سر جھکا دے۔ جس نے سجدہ کیا اس نے عجز کا اظہار کیا۔ الاسجاد، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ ابو عمرو نے کہا: اسجد کا معنی ہے: اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ شاعر نے کہا:

فضول ازمتها اسجدت　　　سجود النصاری لاحبارها

ان عورتوں نے اپنے جمال کے اضافی کپڑے اپنی کلائیوں پر اس طرح جھکا دیئے جیسے نصاریٰ اپنے راہبوں کے لئے جھکتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے کہا: ایک بنی اسد کے اعرابی نے یہ کہا:

وقلن له اسجد للیلی فاسجد

انہوں نے اسے کہا لیلیٰ کے لئے سر جھکا دے تو اس نے سر جھکا دیا۔

یعنی جب اونٹ نے سر جھکا دیا۔ دراهم الاسجاد ان سکوں کو کہتے ہیں جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی تھیں اور لوگ انہیں سجدہ کرتے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

وافی بها کدراهم الاسجاد　　　اس نے اسے پایا دراہم الاسجاد کی طرح۔

مسئلہ نمبر 3: وہ علماء جنہوں نے حضرت آدم اور ان کی اولاد کی فضیلت پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کیا، جس

میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ۔ فرمایا: یہ ارشاد دلیل ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ کا معنی ہے: آدم کے چہرے کی طرف منہ کرتے ہوئے سجدہ کرو۔ یہ اس طرح ہے جیسے ارشاد فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ (الاسراء:78) یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز قائم کرو اور اس طرح ارشاد ہے: نَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ۝ (ص) یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

یعنی اس کی تخلیق مکمل ہونے کے وقت تم اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ مسجودلہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا جیسا کہ قبلہ سجدہ کرنے والوں سے افضل نہیں۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل نہ تھے تو پھر اس کے ان کے سجدہ کرنے کے حکم میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ نے جب اپنی تسبیح اور تقدیس کی وجہ سے کچھ بڑائی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تا کہ انہیں دکھائے کہ وہ ان کی تسبیح و تقدیس اور ان کی عبادت سے مستغنی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام پر عیب لگایا اور انہیں حقیر سمجھا اور ان کی صنعت کے خصائص کو نہ جان سکے تو انہیں بطور تکریم حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا (البقرہ:30) پر سزا دینے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا جب فرشتوں کو فرمایا: اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا تو وہ یہی کہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اِنِّىۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِيۡنٍ۝ (ص) (بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے اور اسے خلیفہ بنانے والا ہوں) وَ نَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ۝ (ص) اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ تا کہ یہ تمہارے لئے اس وقت سزا ہوگی اس قول کی جو تم نے اب کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عباس نے انسان کی فضیلت پر اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم اٹھائی ہے۔ فرمایا: لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ۝ (الحجر) (اے محبوب! آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں) اور اپنے اس قول سے عذاب سے امن کی نوید سنائی: لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) (تا کہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے)۔

اور فرشتوں کو فرمایا: وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰـهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ (الانبیاء:29) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو ہم اسے سزا دیں گے جہنم کی)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی ذات کی قسم نہیں اٹھائی اسی طرح فرشتوں کی حیات کی قسم نہیں اٹھائی۔ لعمری نہیں فرمایا، اور آسمان اور زمین کی قسم اٹھائی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین اور آسمان، عرش اور ساتوں جنتوں

سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے التین اور زیتون کی قسم اٹھائی ہے۔ اور رہا یہ ارشاد: مَنۡ یَّقُلۡ مِنۡهُمۡ الخ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی مکرم ﷺ سے یہ فرمانا ہے: لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (الزمر: 65)۔ (اور اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے)۔ پس اس میں کوئی فضیلت کی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: ملائکہ کے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے جبکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جمہور علماء نے فرمایا: فرشتوں کو اپنی پیشانیاں زمین پر رکھنے کا حکم تھا جیسا کہ نماز میں سجدہ ہوتا ہے، کیونکہ عرف و شرع میں سجدہ سے یہی ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے یہ سجدہ آدم علیہ السلام کی تکریم اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھا اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے ایسے تھے جیسے ہمارے لئے قبلہ ہے۔ لآدم کا مطلب ہے الی آدم جیسے کہا جاتا ہے: صلی للقبلۃ یعنی قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو آج معروف ہے یعنی زمین پر پیشانی رکھنا بلکہ لغت کی اصل کے اعتبار سے تھا یعنی تذلل و انقیاد یعنی حضرت آدم کے لئے انہوں نے عجز کا اظہار کیا اور اس کی فضیلت کا اقرار کیا۔ فَسَجَدُوۡۤا یعنی جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کیا وہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ تک جائز تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف: 100) (آپ نے اوپر اٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے)۔

یہ آخری وقت تھا جب مخلوق کے لئے سجدہ مباح کیا گیا تھا اور اکثر کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو درخت اور اونٹ نے سجدہ کیا، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: حضور! ہم درخت اور بدکے ہوئے اونٹ کی نسبت آپ کو سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا روا نہیں۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور البستی نے اپنی صحیح میں ابو واقد سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب حضرت معاذ بن جبل شام سے آئے تو رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ حضرت معاذ نے کہا: یا رسول اللہ! میں شام سے آیا ہوں میں نے لوگوں کو دیکھا وہ اپنے بزرگوں اور راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے آپ کے ساتھ ایسا کرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی حتیٰ کہ اپنے خاوند کا حق ادا کرے حتیٰ کہ اگر عورت کا خاوند اس سے خواہش پوری کرنے کا سوال کرے اور وہ کجاوے پر ہو تو اسے منع نہ کرے (1)۔ حدیث میں القتب کا لفظ آیا ہے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: عربوں کے نزدیک ولادت کے لئے کرسی کا وجود باعث عزت تھا۔ وہ اپنی عورتوں کو ولادت کے وقت کجاوے پر سوار کرتے تھے۔ بعض طرق میں ہے انسان کو سجدہ سے منع فرمایا اور مصافحہ کا حکم دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ، حدیث نمبر 1842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: یہ سجدہ جس سے منع کیا گیا ہے جاہل صوفیوں نے سماع اور مشائخ کے پاس جانے کے وقت اور ان سے دعا طلب کرنے کے وقت وہ سجدہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ جب اس کے گمان کے مطابق اسے حال آجاتا ہے تو وہ سجدہ کرتا ہے۔ یہ اس کی جہالت ہے خواہ وہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف ہو یہ ان کی جہالت ہے ان کی یہ ساری سعی و کوشش ضائع ہے اور ان کا عمل نامراد ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ مستثنیٰ متصل کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے کیونکہ جمہور کے قول کے مطابق یہ فرشتوں میں سے تھا۔ یہ حضرات ابن عباس، ابن مسعود، ابن جریج، ابن مسیب اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے۔ شیخ ابوالحسن کا اختیار بھی یہی ہے۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے۔ یہی آیت کا ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس کا نام عزازیل تھا یہ معزز فرشتوں میں سے تھا اس کے چار پر تھے پھر بعد میں یہ مایوس کر دیا گیا۔ سماک بن حرب نے حضرت عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابلیس، ملائکہ میں سے تھا جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اس پر لعنت کی تو وہ شیطان بن گیا۔ الماوردی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے، ملائکہ میں سے افضل صنف سے ابلیس تھا جن کو الجنة کہا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جن ملائکہ میں سے ایک قبیلہ ہے جو آگ سے پیدا کئے گئے ہیں، ابلیس ان میں سے تھا اور باقی تمام ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابن زید، حسن اور قتادہ نے بھی یہ کہا ہے کہ ابلیس ابوالجن ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں وہ فرشتہ نہیں تھا۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے، فرمایا: اس کا نام الحارث تھا۔ شہر بن حوشب اور بعض اصولیوں نے کہا: ابلیس ان جنوں میں سے تھا جو زمین میں رہتے تھے ملائکہ نے ان کو قتل کیا تھا، ابلیس چھوٹا تھا تو اسے فرشتوں نے قید کر لیا تھا۔ پھر یہ ملائکہ کے ساتھ عبادت کرتا رہا اور اسے خطاب کیا گیا (1)۔ طبری نے یہ حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، اس مفہوم پر یہ مستثنیٰ منقطع ہو گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) (نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی) اور ارشاد ہے: اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (المائدہ: 3) سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو۔ شاعر نے کہا:

لیس علیك عطش ولا جوع　　الا الرقاد والرقاد ممنوع

تم پر نہ پیاس ہے نہ بھوک مگر نیند اور نیند بھی ممنوع ہے۔

بعض یہ قول کرنے والے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان فرمایا: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (الکہف: 50)

اور جن ملائکہ کا غیر ہیں تو پہلے مقالہ والوں نے یہ جواب دیا کہ ملائکہ سے ابلیس کو خارج کرنا ممتنع نہیں ہے جبکہ پہلے ہی اس

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 124، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی شقاوت اللہ کے علم میں تھی۔ یہ اس کی طرف سے عدل ہے، جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا۔ اس کی تخلیق میں نہ آگ شامل تھی اور نہ وہ شہوت سے مرکب تھا جب اس پر غضب ہوا۔ یہ بعید نہیں کہ وہ ملائکہ سے ہو اور جن علماء نے کہا وہ زمین کے جنوں میں سے تھا پس وہ قیدی بنایا گیا اس کے مقابلہ میں روایت کیا گیا ہے کہ ابلیس وہ ہے جس نے زمین میں ملائکہ کے لشکر کے ساتھ جنوں سے جنگ کی۔ یہ مہدی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابلیس ملائکہ کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے تھا جنہیں جن کہا جاتا تھا ان کو نار السموم سے پیدا کیا گیا تھا اور ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ سریانی زبان میں اس کا نام عزازیل ہے۔ عربی میں حارث ہے یہ جنت کے دربانوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے ملائکہ کا رئیس تھا۔ اسے آسمان دنیا اور زمین کی سلطانی بخشی گئی تھی۔ یہ ملائکہ میں سے انتہائی محنت کرنے والا اور زیادہ علم والا تھا۔ آسمان اور زمین جو کچھ ہے سب کا انتظام چلاتا تھا، اس نے اپنا شرف اور عظمت دیکھی تو یہی چیز اس کے کفر کا باعث بنی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارا ہوا شیطان بنا دیا۔ جب انسان کی خطا کبر کی وجہ سے ہو تو اس کی امید نہ رکھو اور جب خطا معصیت کی وجہ سے ہو تو پھر اس کی امید رکھو۔

آدم علیہ السلام کی خطا معصیت تھی اور ابلیس کی خطا تکبر تھی۔ ملائکہ کو ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہا جاتا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات: 158) شاعر نے کہا:

سخر من جن الملائك تسعة　　قياماً لديه يعملون بلا اجر (1)

اس نے ملائکہ کے جنوں میں نو مسخر کر لیے۔ وہ اس کے سامنے بلا اجر کام کرتے رہتے ہیں۔

جب وہ جنت کے خزان (دربانوں) میں سے تھا تو اس کی طرف نسبت کی گئی، اس کا اسم جنت سے مشتق کیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ابلیس کا وزن افعیل ہے، اور یہ ابلاس سے مشتق ہے۔ اس کا معنی اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔ اسماء میں اس کی مثال نہیں ہے اسے عجمیت کے ساتھ مشابہ کیا گیا ہے۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ عجمی ہے اس کا اشتقاق نہیں ہے عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَبٰی اس کا معنی ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اس سے وہ رک گیا۔ اسی مفہوم میں صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے جو نبی کریم ﷺ سے انہوں نے روایت فرمائی ہے: اذا قرأ ابن آدم السجدة (فسجد) اعتزل الشيطان يبكى يقول ياويلة ... فى رواية ... ياويلى امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة و امرت بالسجود فابيت فلى النار (2) (مسلم) جب انسان آیت سجدہ پڑھتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا۔ پس اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ نہ کیا تو میرے لئے دوزخ ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترك الصلوٰة، صفحہ 61، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کہا جاتا ہے: اَبَی یأبی اباءً یہ نادر حرف ہے جو فَعَل یَفْعَل کے وزن پر آیا ہے حالانکہ اس میں حروف حلقی میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: میں نے اسماعیل بن اسحاق القاضی کو یہ کہتے سنا کہ میرے نزدیک الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ نحاس نے کہا: میں نہیں جانتا کہ ابواسحق نے اسماعیل سے اس حرف کے علاوہ کوئی اس طرح روایت کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِسْتَكْبَرَ، استکبار کا معنی استعظام (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) ہے۔ گویا اس نے سجدہ کو اپنے حق میں ناپسند کیا اور آدم کے حق میں بڑا سمجھا۔ اس نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کو ترک کیا اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کو کبر سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر۔(1) جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص نے عرض کی: ایک آدمی اچھا لباس اور اچھا جوتا پسند کرتا ہے (کیا یہ کبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ جمیلٌ یحب الجمال۔ الکبر بطر الحق وغمط الناس۔(2) اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ حق کو باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ (مسلم) غمص الناس کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ اس کا معنی بھی حقیر سمجھنا ہے۔ جب آدمی نعمت کا شکر ادا نہ کرے تو کہتے ہیں: غمص فلان النعمة . . . غمصت علیه قولاً قاله یعنی میں نے اسے عیب لگایا۔ اس معنی کی شیطان لعین نے وضاحت کی تھی۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف) (میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے)۔ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ (الاسراء) (کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا)۔ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر) (میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی)۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دیا جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی امر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا حکم بھی یہی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ سب سے پہلا گناہ حسد اور کبر تھا، ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا، درخت کھلانے میں حضرت آدم کو برانگیختہ کیا(3)۔ قتادہ نے کہا: ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا اس نعمت و کرامت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ شیطان نے کہا: میں ناری ہوں اور تو طینی (مٹی سے بنا ہوا) ہے۔ گناہوں کا آغاز کبر سے ہوا پھر حرص

1۔ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، صفحہ 21، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، صفحہ 65، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے ہوا حتیٰ کہ آدم علیہ السلام نے درخت سے کھالیا پھر آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی سے حسد کیا۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: یہاں كَانَ بمعنی صار ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ (ہود) یعنی وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔ شاعر نے کہا:

بِتَيهاء قفرٍ والمَطِيّ كانها قطا الحزن قد كانت فراخاً بيوضها

تیہاء کا میدان اور سواریاں غمگین کونج کی طرح ہیں جن کے انڈے بچے بن گئے ہیں۔

ابن فورک نے کہا: یہاں كَانَ کو بمعنی صار کرنا خطا ہے، اصول اس قول کا رد کرتے ہیں۔ جمہور متاولین نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ کفر کرے گا، کیونکہ حقیقۃً کافر اور حقیقۃً مومن وہی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ آخر میں کفر اختیار کرے گا یا ایمان اختیار کرے گا(1)۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(2)، بعض علماء نے فرمایا: ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی اور جنت میں علی الاستدراج، ریاست اور خزانت دی گئی جس طرح کہ منافقین نے اپنی زبانوں کی اطراف پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دی، اور اسی طرح بلعام نے اپنی زبان کی طرف سے اسم اعظم کی گواہی دی۔ پس یہ چیز اس کی ریاست میں تھی جبکہ کبر اس کے نفس میں متمکن تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: شیطان سوچتا تھا کہ اس کو جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف:12)

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿﴾ (ص) (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے کیا تم نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے)۔

یعنی تو نے تکبر کیا حالانکہ تجھے کبر نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تکبر نہیں کیا جب میں نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور کبر تو میرے لئے مناسب ہے۔ اسی لئے فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ شیطان کی خلقت کی اصل عزت کی آگ سے تھی اسی وجہ سے اس نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ (ص)

عزت نے اسے کبر دیا حتیٰ کہ اس نے آدم علیہ السلام پر اپنی فضیلت دیکھی۔

ابو صالح سے مروی ہے، فرمایا: ملائکہ عزت کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ابلیس عزت کی آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: ہمارے علماء نے فرمایا: جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کرامات اور خوارق للعادات امور ظاہر کرے جبکہ وہ نبی نہ ہو تو یہ چیز اس کی ولایت کی دلیل نہیں ہے، لیکن بعض صوفیاء اور رافضیوں کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف منها، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرامات دلیل ہیں کہ وہ ولی ہے اگر یہ ولی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر کرامات ظاہر نہ فرماتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے ولی ہونے کا علم صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ یہ معلوم ہو کہ وہ مومن ہو کر فوت ہوا ہے۔ جب یہ معلوم نہ ہو کہ وہ مومن ہو کر مرا ہے تو ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم قطعی طور پر کہیں کہ وہ اللہ کا ولی ہے کیونکہ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان سے ہی موافقت کرے گا۔ جب ہمارا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے لئے کسی پر قطعی طور پر یہ حکم لگانا ممکن نہیں کہ وہ ایمان سے موافقت کرے گا نہ خود اپنے بارے کوئی قطعی طور پر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کے ولی ہونے پر دلیل نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ ممنوع نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض اولیاء کو اپنے حسن انجام اور حسن عمل کے خاتمہ کی خبر دے دے اور اس کے ساتھ دوسروں کے حسن خاتمہ کی خبر دے دے (☆)۔

یہ شیخ ابو الحسن اشعری وغیرہ کا قول ہے۔ طبری کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ابلیس کے واقعہ سے انسان میں سے جو ابلیس کے مشابہ ہیں انہیں تنبیہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا حالانکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جانتے تھے اور ان نعمتوں کو جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کے اسلاف (1) پر کی تھیں۔

مسئلہ نمبر 10: علماء کا اختلاف ہے کہ ابلیس کافر تھا یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: کافر نہیں تھا اور ابلیس نے سب سے پہلے کفر کیا اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے پہلے کفار تھے اور وہ جن تھے جو زمین میں آباد تھے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس نے جہالت یا عناد کی بنا پر کفر کیا تھا۔ اس میں اہل سنت و جماعت کے دو قول ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ اپنے کفر سے پہلے اللہ تعالیٰ کو جاننے والا تھا اور جس نے کہا اس نے جہالت کی وجہ سے کفر کیا تھا اس نے کہا اس کے کفر کے وقت اس سے علم چھین لیا گیا تھا اور جنہوں نے کہا عناد کی وجہ سے اس نے کفر کیا تھا اس نے کہا شیطان نے کفر کیا حالانکہ اس کے پاس علم تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: علم کے باقی ہوتے ہوئے عناداً کفر کرنا بعید ہے مگر یہ میرے نزدیک جائز ہے اللہ تعالیٰ جس کو رسوا کرنا چاہے اس کے لئے محال نہیں ہے۔

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵

''اور ہم نے فرمایا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس جنت سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

☆ اس قول میں اولیاء اللہ کے بارے حضرت مفسر نے زیادہ ہی شدت کا اظہار کیا ہے حالانکہ شرح عقائد نسفیہ میں اس پر جامع ترین گفتگو کی گئی ہے۔ ولایت کے ایمان، طاعات پر مواظبت اور معاصی سے اجتناب لازم ہے اور اولیاء اللہ سے کرامات کا وقوع حق ہے۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے کفر کرنے کے وقت اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور اسے جنت سے دور کر دیا اور اس کو نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا (اسکن) یعنی ٹھہرو اور جنت کو مسکن بناؤ۔ سکن الیہ یسکن سکونا (کسی کے پاس ٹھہرنا) السکن آگ کو بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

قد قُوِمَتْ بسکن وادھان

آگ اور تیل لگانے کے ساتھ سیدھے کیے گئے۔

اور السکن ہر وہ چیز جس کی طرف سکون حاصل کیا جائے، السکین چھری کو کہتے ہیں اور چھری کو سکین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذبوح کی حرکت کو ساکن کر دیتی ہے، اسی سے مسکین ہے جس کا تصرف کم اور حرکت قلیل ہوتی ہے، سکان السفینہ کشتی کا پچھلا حصہ وہ کشتی کو اضطراب سے سکون دیتا ہے اس لئے اسے سکان السفینۃ کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ یہ نکلنے پر تنبیہ ہے کیونکہ سکنی ملکیت نہیں ہوتا اس لئے بعض عارفین نے کہا: سکنی ایک خاص مدت تک ہوتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے پس جنت میں آدم وحواء کا دخول، بطور سکنی تھا نہ کہ بطور اقامت تھا۔

میں کہتا ہوں: جب یہ معنی ہو تو پھر جمہور کے قول کی اس میں دلیل ہے کہ جو کسی شخص کو اپنی کسی جگہ ٹھہرائے تو وہ ٹھہرنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا۔ جب ٹھہرانے کی مدت ختم ہو جائے تو اس کے لئے اسے نکالنا جائز ہے۔ امام شعبی فرماتے تھے: جب کوئی شخص یہ کہے: داری لك سکنی حتی تموت میرا گھر تیرے لئے سکنی ہے یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے تو وہ زندگی اور موت میں موہوب لہ (جس کو دیا گیا) کے لئے ہوگا۔ جب یہ کہا: داری ھذہ اسکنھا حتی تموت یہ میرا گھر ہے تو اس میں رہائش رکھ یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے۔ تو مالک کی طرف لوٹے گا جب ٹھہرنے والا مر جائے گا۔ سکنی کی طرح عمریٰ ہے مگر عمریٰ میں سکنی کی نسبت اختلاف زیادہ قوی ہے۔ عمریٰ پر کلام ان شاء اللہ سورۂ ہود میں آئے گی۔ حربی نے کہا: میں نے ابن اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عربوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اشیاء مالک کی ملک میں ہوتی ہیں اور ان کے منافع اس کے لئے ہوتے ہیں جس کو عمری، رقبی، افقار، اخبال، منحہ، عریہ، سکنی، اطراق کے الفاظ بول کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ امام مالک اور ان کے متبعین کی حجت ہے کہ ان چیزوں کا موہوب لہ مالک نہ ہوگا مگر منافع کا مالک ہوگا سوائے غلاموں کے۔ یہ لیث بن سعد، قاسم بن محمد اور یزید بن قسیط کا قول ہے۔

عمریٰ یہ ہے کہ تو کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی عمر کی مدت یا اس کی عمر کی مدت ٹھہرائے، اسی طرح رقبیٰ ہے۔ تو یہ کہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو میں تیری طرف لوٹ آؤں گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تیرے لئے ہوگا۔ یہ المراقبہ سے ہے اور مراقبہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی موت کو تاڑتا رہے۔ اسی وجہ سے اس کی اجازت اور عدم اجازت میں اختلاف ہے۔ ابو یوسف اور امام شافعی نے اس کی اجازت دی ہے گویا ان کے نزدیک یہ وصیت ہے اور امام مالک اور کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک عوض کا قصد کرتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا اسے ملے گا؟ اور ہر ایک دوسرے کی موت

کی تمنا کرتا ہے، اس کے متعلق دو احادیث ہیں جن میں اجازت اور عدم اجازت کا ذکر ہے وہ دونوں احادیث ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہیں۔ پہلی وہ ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃ لمن ارقبھا۔ (1) یعنی عمریٰ جائز ہے جس کے لئے اسے عمر بھر دیا گیا اور رقبیٰ جائز ہے اس کے لئے جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا۔ اس حدیث میں عمریٰ اور رقبیٰ حکم میں برابر ہیں۔ دوسری وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عمر نے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا رقبی ممن ارقب شیئاً فھو لہ حیاتہ و مماتہ۔ (2) ''فرمایا: رقبیٰ نہیں ہے، پس جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا وہ حیات و موت میں اس کے لئے ہے۔'' فرمایا: رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے: منی و منك موتاً میری اور تیری موت تک ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد 'لا رقبی' یہ نہی ہے جو منع پر دلیل ہے اور من ارقب شیئًا فھولہ۔ یہ جواز پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں احادیث نسائی نے بھی نقل کی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عمریٰ اور رقبیٰ برابر ہیں۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: العُمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃٌ لمن ارقبھا۔ ابن منذر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے کہا: عمریٰ ورقبیٰ برابر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ثوری اور احمد نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ پہلے کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔ اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ طاؤس نے کہا: من ارقب شیئًا فھو سبیل المیراث جس کو کوئی چیز رقبیٰ کے طور پر دی گئی تو وہ میراث ہے۔

الافقار، یہ فقار الظھر (پیٹھ کے مہرے) سے ماخوذ ہے۔ افقرتك ناقتی یعنی میں نے تجھے عاریۃً اس کی پیٹھ سوار ہونے کے لئے دی، افقرك الصید جب وہ تجھے اس کی پیٹھ پر قدرت دے حتیٰ کہ تو اس پر تیر پھینکے۔ اس کی مثل الاخبال ہے۔ کہا جاتا ہے: اخبلت فلاناً اذا اعرتہٗ ناقۃ یرکبُھا او فرساً یغزو علیہ۔ جب کوئی اپنی اونٹنی سوار ہونے کے لئے یا گھوڑا جہاد کے لئے پیش کرے تو کہتے ہیں: اخبلت فلاناً۔ زہیر نے کہا:

هنالك ان يستخبلو المال يخبلوا وان يسئلوا يعطُوا وان ييسروا يغلوا

وہاں ان سے مال عاریۃً لیا جائے تو وہ مال دیتے ہیں، اگر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ مال دیتے ہیں اور وہ جب سستے سمجھے جاتے ہیں تو وہ مہنگے ہوتے ہیں۔

المنحۃ سے مراد عطیہ ہے۔ المنحۃ، دودھ کا عطیہ، المنیحہ وہ اونٹنی یا بکری جو کوئی شخص دوسرے کو دودھ پینے کے لئے دیتا ہے پھر وہ اسے واپس کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العاریۃ مؤداۃٌ والمنحۃ مردودۃ والدین مقضی و الزعیم غارمٌ (3) عاریۃً دی گئی چیز واپس پہنچائی جائے گی دودھ والا جانور واپس کیا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2373، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب تضمین العاریۃ، حدیث نمبر 3094، ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس حدیث کو ابوامامہ نے روایت کیا ہے۔ اسے ترمذی، دارقطنی وغیرہما نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

الاطراق، نر جانور عاریۃً دینا۔ استطرق فلان فلاناً فحلہ فلاں نے فلاں سے نر جانور طلب کیا تا کہ وہ اپنی اونٹنی پر بٹھائے فاطرقہ ایاہ، اسے نر جانور دیا۔ کہا جاتا ہے: اطرقنی فحلک یعنی مجھے اپنا نر جانور دو تا کہ میں اپنی اونٹنی پر بٹھاؤں۔ طرق الفحل الناقۃ، اونٹ اونٹنی پر بیٹھا۔ طروقۃ الفحل، مادہ اونٹنی۔ کہا جاتا ہے: ناقۃ طروقۃ الفحل یہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو جفتی کے قابل ہو۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، اَنْتَ فعل میں مضمر ضمیر کی تاکید کے لیے ہے، اس کی مثال یہ ہے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (مائدہ: 24) صرف اسکن و زوجک جائز نہیں ہے اور اذهب و ربک جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے لیے جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

قلت اذ اقبلت و زهر تهادیٰ　　　كنعاج الملا تعسفن رملا

میں نے کہا: جب وہ اور سفید چمکنے والیاں سوار ہو کر آہستہ آہستہ چل کر آئیں جیسے جنگلی گائیوں کا گروہ ہو۔

اس شعر میں زهر کا عطف ضمیر مضمر پر ہے جو اقبلت میں ہے۔ اس ضمیر کی تاکید نہیں لگائی گئی اور غیر قرآن میں بعید طور پر تاکید نہ لگانا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَزَوْجُكَ یہ قرآن کی لغت ہے۔ زوج ھاء کے بغیر۔ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں آتا ہے (زوجۃٌ) حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ایک شخص آپ کے پاس سے گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا۔ وہ آیا تو فرمایا: یا فلاں هذه زوجتی فلانۃ۔ یہ میری فلاں بیوی ہے۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں کون ہوں جو یہ گمان کروں میں نے آپ کے متعلق کوئی ایسا گمان نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرف چلتا ہے (1)۔ حضرت آدم کی بیوی حضرت حوا تھی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا یہ نام رکھا جب وہ ان کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تخلیق محسوس نہ ہوئی تھی۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف محسوس ہوتی تو کوئی شخص اپنی بیوی پر مہربان نہ ہوتا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ سے کہا گیا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: عورت ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا: حوا۔ پوچھا گیا: اس کا امراۃٌ نام کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیوں کہ یہ المرء (مرد) سے ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ روایت ہے کہ ملائکہ نے یہ سب سوال کئے تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا تجربہ کر لیں، فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا: اے آدم! کیا تو اس سے محبت کرتا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ پھر فرشتوں نے حضرت حوا سے پوچھا: اے حواء! کیا تو حضرت آدم سے محبت کرتی ہے؟ حضرت حواء نے کہا: نہیں حالانکہ حضرت حوا کے دل میں، حضرت آدم علیہ السلام کی محبت سے کئی گنا زیادہ محبت تھی۔ فرشتوں نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه یستحب لمن رای خالیا بامراۃ الخ، صفحہ 216، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے محبت میں سچ بولتی ہوتی تو حضرت حوا بھی سچ کہتی۔ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا گیا تو وہ اس میں وحشت سے چلے جب سو گئے تو ان کی بائیں جانب سے چھوٹی پسلی سے حضرت حوا پیدا کی گئی تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور مانوس ہوں، جب آپ جاگے تو آپ نے اسے دیکھا۔ پوچھا: تو کون ہے؟ حضرت حواء نے کہا: ایک عورت ہوں جو تیری پسلی سے پیدا کی گئی ہوں تا کہ تو سکون پائے (1)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف:189) (وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔

علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے عورت کا مزاج ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے (2)۔ ایک روایت میں ہے: پسلی میں سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا حصہ ہے یہ تیرے لئے ایک طریقہ پر سیدھی نہیں ہوگی اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو فائدہ اٹھا لے جبکہ اس میں ٹیڑھا پن ہوگا۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

هي الضلع العوجاء لست تقيمها الا ان تقويم الضلوع انكسارها

اتجمع ضعفا و اقتداراً على الفتى أليس عجيبا ضعفا واقتدارُها

یہ ٹیڑھی پسلی ہے تو اس کو سیدھا نہیں کر سکے گا۔ خبردار! اس کا سیدھا کرنا اس کو توڑنا ہے۔ کیا تو ایک نوجوان پر ضعف اور اقتدار کو جمع کرے گا کیا اس (عورت) کا ضعف اور اس کا اقتدار عجیب نہیں ہے۔

اس سے علماء نے خنثیٰ مشکل کی میراث پر استدلال کیا ہے۔ جب اس میں عورتوں اور مردوں والی تمام صفات و علامات برابر ہوں مثلاً داڑھی بھی ہو، پستان بھی ہوں اور پیشاب کی جگہ میں بھی برابر ہو تو اعضاء کی کمی کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس کی پسلیاں عورت کی پسلیوں سے کم ہیں تو اسے مرد والا حصہ دیا جائے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے...... کیونکہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ مزید تفصیل آگے میراث کی بحث میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْجَنَّةَ اس کا معنی باغ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنۃ الخلد میں نہیں تھے بلکہ وہ عدن کی زمین میں ایک باغ میں تھے اور انہوں نے اپنی بدعت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ اگر یہاں جنت سے جنۃ الخلد مراد ہوتی تو ابلیس جنت میں نہ پہنچتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿۲۳﴾ (الطور) اور فرمایا: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ (النبا) اور فرمایا لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيلًا سَلٰمًا (الواقعہ:25)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نیز وہ کہتے ہیں: اہل جنت تو جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّ مَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۝ (الحجر)
نیز جنت دارالقدس ہے گناہوں اور خطاؤں سے پاک رکھی گئی ہے۔ جبکہ ابلیس نے تو لغو بات کی اور جھوٹ بولا نیز حضرت آدم و حضرت حوا اپنی معصیت کی وجہ سے جنت سے باہر نکالے گئے۔

وہ کہتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کے لئے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ شجرۃ الخلد طلب کریں جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقرب تھے اور آپ عقل میں کمال رکھتے تھے حالانکہ وہ دارالخلد میں تھے اور ایسے ملک میں تھے جو کبھی پرانا ہونے والا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو معرف باللام ذکر کیا ہے اور جو کہتا ہے: اسأل اللہ الجنۃ (میں اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں) مخلوق کے عرف میں جنت سے مراد جنت الخلد ہی ہوتی ہے اور عقلاً کوئی محال نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دینے کے لئے ابلیس جنت میں داخل ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: تو نے اپنی اولاد کو محروم کیا اور انہیں جنت سے نکالا (1)۔ الف، لام جنت پر داخل کیا گیا ہے تاکہ یہ دلالت کرے کہ اس سے مراد جنت معروفہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی انکار نہیں کیا اگر اس سے کوئی اور جنت مراد ہوتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رد کر دیتے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام اس پر خاموش رہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ثابت کیا تو صحیح ہوا کہ جس گھر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نکالا وہ جنت تھی اور وہ اس گھر کے مخالف تھی جس کی طرف وہ نکالے گئے تھے۔

اور جن آیات سے معتزلہ اور قدریہ نے حجت پکڑی ہے یہ حکم اس کے بعد ہو گا جب جنتی قیامت کے دن جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممتنع نہیں ہے کہ جنت دارالخلد اس شخص کے لئے ہو جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ہمیشہ اس میں رکھنے کا ارادہ کیا ہو اور وہ جنت سے نکل جائے گا جس کے متعلق فنا کا ارادہ کیا گیا ہو گا۔

اہل تاویل کا اس بات پر اجماع ہے کہ ملائکہ جنت میں اہل جنت پر داخل ہوتے ہیں اور پھر جنت سے نکل آتے ہیں۔ جنت کی چابیاں ابلیس کے ہاتھ میں تھیں پھر معصیت کے بعد اس سے واپس لے لیں گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں معراج کی رات داخل ہوئے پھر اس سے باہر تشریف لے آئے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اس کے متعلق بتایا اور یہ یقیناً جنت الخلد تھی۔ رہا معتزلہ کا یہ قول کہ جنت دارالقدس ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں سے پاک رکھا ہے یہ ان کی جہالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدسہ (شام) میں داخل ہوں۔ اہل شریعت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس فرمایا حالانکہ ان میں گناہ، کفر، جھوٹ سب پائے گئے ہیں اس کی تقدیس، گناہوں سے مانع نہیں۔ اسی طرح دارالقدس بھی ہے۔ ابوالحسن بن بطال نے کہا: بعض مشائخ نے بیان کیا ہے کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ جنت الخلد وہی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام اترے، جو اس کا مخالف ہے اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ان کا یہ قول کہ حضرت آدم علیہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قولہ کلم اللہ موسیٰ تکلیماً، حدیث نمبر 6961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

السلام کے لئے یہ کیسے جائز ہے کہ انہوں نے شجرۃ الخلد طلب کیا حالانکہ وہ عقل کے کمال کے حامل تھے اور وہ دار الخلد میں تھے، ان پر اس کا عکس پیش کیا جاتا ہے کہ کمال عقل ہونے کے باوجود حضرت آدم پر یہ کیسے جائز ہے کہ وہ دار الفناء میں شجرۃ الخلد طلب کریں یہ تو اس شخص کے لئے بھی جائز نہیں جو معمولی سی عقل رکھتا ہو، حضرت آدم پر کیسے جائز ہے جواز روئے عقل کے تمام لوگوں سے ارجح تھے، جیسا کہ حضرت ابوامامہ نے کہا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا جمہور قراء کی قراءت رغدا ہے۔ یعنی غین کے فتحہ کے ساتھ۔ نخعی اور ابن وثاب نے غین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے الرغد ایسا خوشگوار گھر جس میں کوئی تھکاوٹ نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

بینما　المرء　تراہ　ناعما　　یا من الاحداث فی عیش رغد(1)

جب تو کسی کو نرم و نازک دیکھتا ہے۔ نوجوان خوشگوار زندگی میں امن میں ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: رغد عیشھم و رغد (غین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) ارغد القوم جب لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ مصدر محذوف کی صفت کی وجہ سے منصوب ہے و حیثُ وحیثَ وحیثِ وحوث وحوث وحاث اس میں یہ تمام لغات ہیں۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی کھانے کے لئے اس کے قریب نہ جاؤ کیونکہ باقی نفع حاصل کرنے میں اباحت تھی (2)۔ ابن عربی نے کہا: نضر بن شمیل کی مجلس میں میں نے شاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کہا جاتا ہے: لا تقرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) تو اس کا معنی ہوتا ہے بالفعل اس کام کو مت کر اور جب راء کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے اس کے قریب نہ جا۔ صحاح میں ہے: قَرُبَ الشیء یقرب قربا یعنی چیز قریب ہوئی۔ قربتہٗ (راء کے کسرہ کے ساتھ) اقربہ قربانا یعنی میں اس کے قریب ہوا۔ قربت اقرُبُ قرابةً جیسے کتبت، اکتب کتابةً جب تو پانی کی طرف چلے جبکہ تیرے اور اس کے درمیان ایک رات کا فاصلہ ہو، اس کا اسم القَرَب ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے اعرابی سے کہا: ما القرب؟ انہوں نے کہا: کل پانی پر وارد ہونے کے لئے رات کو چلنا۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض ماہرین کا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے جب اس درخت کے کھانے سے نہی فرمانے کا ارادہ فرمایا تو اس سے نہی فرمائی تو ایک ایسے لفظ کے ساتھ جو کھانے اور کھانے کی طرف راغب کرنے والے اقدام سے منع پر دلالت کرتا ہے اور وہ ہے: قرب۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: یہ سد ذرائع کی واضح مثال ہے(3)۔ بعض ارباب معانی نے کہا: وَ لَا تَقْرَبَا یہ خطا کے وقوع اور جنت سے خروج کا شعور دیتا ہے اور اس بات کا شعور دیتا ہے کہ ان دونوں نے جنت میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، کیونکہ جس نے ہمیشہ رہنا ہو اس پر کوئی چیز ممنوع نہیں ہوتی، نہ اسے حکم دیا جاتا ہے اور نہ اسے منع کیا جاتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: 30) یہ جنت سے خروج کی دلیل ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، صفحہ 105، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 8: هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهِ اسم مبہم ہے اس کے ساتھ ایسے اسم کو بطور صفت ذکر کیا جاتا ہے جس پر الف، لام ہو اس کے علاوہ نہیں۔ جیسے تیرا قول مررت بهذا الرجل، بهذه المرأة و هذه الشجرة۔ ابن محیصن نے اسے هذی الشجرة یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے یہی اصل ہے۔ کیونکہ اس میں ھا، یا کا بدل ہے اسی وجہ سے اس کا ماقبل مکسور ہے۔ کلام میں اس لفظ کے علاوہ کوئی ایسی ھا تانیث نہیں ہے جس کا ماقبل کسرہ ہو اور اس میں ھا کا اصل یا ہے۔

والشجرة والشِجَرَة والشيرة۔ یہ تین لغات ہیں الشجرة، شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے الشِجرة والشَجرة اس درخت کو کہتے ہیں جس کا زمین میں تنا ہو، ارض شجيرةٌ و شجراء ایسی زمین جس میں درخت زیادہ ہوں۔ واد شجیرا اور وادِ اشجر نہیں کہا جاتا شجراء کا واحد شجرة ہے اس جمع کے وزن پر بہت کم حروف کی جمع آتی ہے شجرة شجراء - قصبة قصباء- طرفة طرفاء، حلفة حلفاء۔ اصمعی نے کہا: الحلفا مفرد حلفة ہے معنی دوسرے الفاظ سے مختلف ہے۔ سیبویہ نے کہا: الشجراء واحد اور جمع ہے۔ اسی طرح القصباء والطرفاء اور الحلفاء ہے۔ المشجرة درختوں والی جگہ۔ ارض مشجرة۔ کہا جاتا ہے: هذه الارض اشجر من هذه۔ یعنی یہ زمین اس زمین سے زیادہ درختوں والی ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اہل تاویل کا اس درخت کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، شعبہ بن جبیر، جعدہ بن ہبیرہ نے کہا: یہ انگور کی بیل تھی، اسی وجہ سے شراب ہم پر حرام کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس، ابو مالک اور قتادہ نے فرمایا: یہ سنبل کا درخت تھا اور اس کا دانہ گائے کے گردے کی طرح ہوتا ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ سفید ہوتا ہے۔ وہب بن منبہ کا یہی قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو اسے حضرت آدم کی اولاد کے لئے غذا بنا دیا۔ ابن جریج نے کہا: بعض صحابہ سے مروی ہے کہ یہ انجیر کا درخت تھا(1)۔ سعید نے حضرت قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی وجہ سے خواب میں اس کی تعبیر ندامت کی جاتی ہے کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نادم ہوئے تھے۔ یہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کوئی چیز متعین نہیں جس کی تائید خبر کرے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے منع فرمایا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے کھانے میں ان سے لغزش ہوئی۔ ابو نصر قشیری نے کہا: میرے والد صاحب فرماتے تھے معلوم ہوتا ہے بہر حال یہ محنۃ کا درخت تھا۔

مسئلہ نمبر 10: علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت آدم نے یہ کیسے کھا لیا تھا جب کہ اس کے قریب جانے پر بھی وعید سنائی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

بعض علماء نے فرمایا: جس درخت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کوئی درخت کھایا تھا اور انہوں نے نہی کی تاویل یہ نہ کی کہ یہ نہی پوری جنس پر واقع ہے، گویا ابلیس نے انہیں ظاہر کو لینے کا دھوکا دیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ پہلی معصیت تھی جو اللہ تعالیٰ کی آدم نے کی (2)۔ اس قول کی بنا پر فرمایا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو قسم اٹھائے کہ وہ اس روٹی سے نہیں کھائے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 18، جلد 1 (دار الفکر)

گا پھر وہ اس جنس سے کھالے گا تو حانث ہو جائے گا اس میں تحقیق المذاہب یہ ہے کہ اکثر علماء فرماتے ہیں: اس میں وہ حانث نہیں ہوگا۔

امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر قسم کی بساط مشار الیہ کی تعیین کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی جنس سے کھانے سے حانث نہ ہوگا اور اگر قسم کی بساط یا اس کا سبب یا اس کی نیت جنس کا تقاضا کرتی ہے تو پھر اس پر اسے محمول کیا جائے گا اس جنس سے کسی دوسری چیز کو کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا، اس پر حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کو محمول کیا گیا ہے، ان کو متعین درخت سے نہی کی گئی تھی اور اس کی جنس مراد لی گئی تھی۔ پس انہوں نے قول کو لفظ پر محمول کیا معنی پر محمول نہ کیا۔

ہمارے علماء کا اس وجہ سے فرع میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ گندم نہیں کھاؤں گا پھر اس نے اس کی روٹی کھالی تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: الکتاب میں فرمایا: وہ حانث ہو جائے گا، کیونکہ گندم اسی طرح روٹی بنا کر کھائی جاتی ہے۔ ابن المواز نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس نے گندم نہیں کھائی اس نے روٹی کھائی ہے۔ اس نے اسم اور صفت کا اعتبار کیا۔ اور اگر اس نے اپنی قسم میں کہا میں اس گندم سے نہیں کھاؤں گا تو اس گندم سے بنائی گئی روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا اور جب اس گندم کی قیمت سے کوئی اور کھانا خریدے یا اسے اگالے تو اس میں اختلاف ہے۔

دوسرے علماء فرماتے ہیں: نہی ندب پر محمول تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ مسئلہ اصول فقہ سے تھا یہاں ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (1)

نہی کو وعید کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طہٰ) سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

ابن مسیب نے فرمایا: حضرت آدم نے اس وقت کھایا جب حضرت حوا نے انہیں شراب پلا دی تھی اور آپ نشہ میں ہو گئے تھے اور آپ کو سمجھ نہ تھی۔ یزید بن قسیط نے بھی اسی طرح کہا: وہ دونوں قسم اٹھاتے تھے کہ حضرت آدم نے عقل میں ہوتے ہوئے اس درخت سے نہیں کھایا تھا۔ ابن عربی نے کہا: یہ نقلاً اور عقلاً فاسد ہے۔ نقل کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہے (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنتی شراب کا یہ وصف بیان کیا ہے: لَا فِيْهَا غَوْلٌ (الصافات: 47) اور رہی عقل، تو انبیاء کرام نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں ہر اس چیز سے جو فرائض میں خلل اور جرائم کے ارتکاب کا باعث بنے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کو جنت میں ٹھہرائے جانے سے پہلے سے ثابت کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ (البقرہ: 33) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو وہ علم بتاؤ جو ان کے پاس نہیں ہے۔

بعض علماء نے کہا: حضرت آدم نے وہ درخت بھول کر کھایا تھا اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں وعید کو بھول گئے ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حتمی اور قطعی طور پر بتایا: وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 19، جلد 1 (دار الفکر) 3۔ ایضاً

فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿﴾ (طٰہٰ)

لیکن جب انبیاء کرام کو کثرت معارف اور علو منازل کی وجہ ہے ایسا تحفظ و تیقظ ضروری ہوتا ہے جو دوسروں کو لازم نہیں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام کا نہی کو یاد نہ رکھنا اسے ضائع کرنے کے مترادف تھا تو اس وجہ سے وہ مخالفت کرنے والے ہو گئے۔ حضرت ابوامامہ نے کہا: اگر حضرت آدم کی اولاد جو اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے لے کر قیامت تک پیدا کرنی ہے ان سب کی عقلیں ایک پلڑے میں اور حضرت آدم کی عقل دوسرے پلڑے میں رکھی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی عقل ان پر غالب آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿﴾ (طٰہٰ)

میں کہتا ہوں: حضرت ابوامامہ کا یہ قول تمام بنی آدم کو شامل ہے اور احتمال ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خاص ہوں، کیونکہ آپ عقل و دانش کے اعتبار سے سب لوگوں سے زیادہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوامامہ کے قول کا مطلب یہ ہو کہ اگر بنی آدم کی عقول جو انبیاء نہیں ہیں وہ مراد ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: پہلا قول حسن ہے۔ پس آدم و حوا نے معین درخت مراد لیا اور حقیقت میں مراد جنس تھی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آپ نے سونے اور ریشم کو پکڑا۔ فرمایا: هذان حرامان علی ذکور امتی (1) یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور ایک اور جگہ فرمایا: هذان مهلکان امتی۔ یہ دونوں میری امت کو ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کی جنس مراد لی ہے نہ کہ وہ معین سونا اور ریشم۔

مسئلہ نمبر 11: کہا جاتا ہے: درخت سے پہلے حضرت حوا نے کھایا تھا اس کا سبب ابلیس کا انہیں اغوا (بھٹکانا) تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ شیطان نے پہلے حضرت حوا سے کلام کی کیونکہ عورت محبت کا وسوسہ ہے۔ یہ پہلا فتنہ تھا جو مردوں پر عورتوں کی طرف سے داخل ہوا۔ شیطان نے کہا: تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا گیا مگر اس لئے کہ یہ شجرۃ الخلد ہے کیونکہ شیطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس وہ دونوں کے پاس ایسی جہت سے آیا جو انہیں پسند تھی...... حبك الشیٔ یعمی و یصم ...... کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ جب حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا تو حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور عہد الٰہی کو یاد کیا۔ حضرت حوا پر حضرت آدم اصرار کرتے رہے (کہ نہ کھاؤ) اور حضرت حوا حضرت آدم پر کھانے کے لئے اصرار کرتی رہی حتیٰ کہ حضرت حوا نے کہا: میں تجھ سے پہلے کھاتی ہوں یہاں تک کہ اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو تم سلامت رہو گے۔ پس حضرت حوا نے وہ کھالیا اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ حضرت حوا حضرت آدم کے پاس آئی اور کہا: تم بھی کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ پس حضرت آدم نے وہ کھایا تو ان کا لباس اتر گیا اور گناہ کے حکم میں ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ وہ دونوں نہی میں جمع فرمائے تھے اس لئے سزا نہ اتری حتیٰ کہ دونوں کی طرف سے منہی عنہ کا ارتکاب پایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر یہ مسئلہ مخفی تھا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: اگر کسی نے اپنی دو بیویوں یا دو لونڈیوں کو کہا: اگر تم دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو تم دونوں کو طلاق یا تم دونوں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اللباس، باب فی الحریر للنساء، حدیث نمبر 3535، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آزاد تو طلاق اور آزادی ایک کے داخل ہونے سے واقع نہ ہوگی۔ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ابن قاسم نے کہا: دونوں کو نہ طلاق ہوگی نہ دونوں آزاد ہوں گی حتیٰ کہ اکٹھی گھر میں داخل ہوں، انہوں نے اس اصل پر محمول کیا ہے۔
مطلق لفظ کے مقتضیٰ کو لیا ہے۔ سحنون نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن قاسم نے دوسری مرتبہ کہا: کسی ایک کے داخل ہونے سے دونوں مطلقہ ہو جائیں گی اور آزاد ہو جائیں گی کیونکہ بعض قسم کا ٹوٹنا پوری قسم کا ٹوٹنا ہے۔ جیسے اگر کوئی قسم اٹھائے کہ یہ دو روٹیاں نہیں کھاؤں گا تو وہ ایک روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا بلکہ ان میں سے ایک لقمہ کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا(1)۔ اشہب نے کہا: جو داخل ہوگی وہ آزاد ہو جائے اور اسے طلاق ہو جائے گی کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی طلاق یا آزادی میں شرط تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ بعض شرط، شرط نہیں ہوتی اس پر اجماع ہے(2)۔
میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے۔ نہی جب دو فعلوں پر معلق ہو تو مخالفت متحقق نہ ہوگی جب تک کہ دونوں فعل نہ پائے جائیں کیونکہ جب تو کہتا ہے تم دونوں گھر میں داخل نہ ہو۔ پھر ایک داخل ہوتی ہے تو دونوں کی طرف سے مخالفت نہ پائی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ یہ دونوں کے لئے نہی ہے: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اس کا جواب ہے۔ پس دونوں ظالم نہ ہوں گے حتیٰ کہ دونوں اس کام کو کریں جب حضرت حوا نے کھایا تو اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی کیونکہ منہی عنہ وہ تھا جو کامل پایا گیا۔ یہ معنی حضرت آدم علیہ السلام پر مخفی ہو گیا آپ نے طمع کیا اور یہ حکم بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ: 115) بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام یہ ارشاد بھول گئے: اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ (طٰہٰ) بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

مسئلہ نمبر 12: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین سے صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان سے مؤاخذہ ہوتا ہے اور ان پر انہیں عتاب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس اتفاق کے بعد کہ انبیاء کرام کبیرہ گناہوں اور ہر رذیل بات سے معصوم ہوتے ہیں جس میں نقص اور عیب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابو بکر کے نزدیک مسئلہ اجماعاً ثابت ہے اور استاذ ابو اسحاق کے نزدیک یہ معجزہ کی دلیل کا مقتضا ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ عقلی دلیل کا مقتضی ہے ان کے اصول پر۔ طبری وغیرہ فقہاء، متکلمین اور محدثین نے کہا: انبیاء کرام سے صغائر واقع ہوتے ہیں جبکہ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: انبیاء کرام کبائر وصغائر سے معصوم ہیں اور انہوں نے ان آیات سے حجت پکڑی ہے جو قرآن کریم میں واقع ہوئی ہیں اور جو ان کے گناہوں سے نکلنے کے متعلق احادیث میں ثابت ہے یہ بات ظاہر ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ جمہور فقہاء، مالکی، ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں: وہ تمام صغائر سے اسی طرح معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں کیونکہ ہمیں ان کے افعال، آثار اور سیرت میں ان کی اتباع کا بغیر کسی قرینہ کے التزام کے حکم دیا گیا ہے۔ اگر ان پر ہم صغائر کو جائز قرار دیں تو پھر ان کی اقتدا ممکن نہیں کیونکہ ان کے افعال میں ہر فعل کا مقصد، قربت، اباحت یا ممانعت یا معصیت کے اعتبار سے ممتاز نہیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 17، جلد 1 (دار الفکر)　2۔ ایضاً

ہوتا اور کسی کو کسی ایسے امر کی پیروی کا حکم دینا صحیح نہیں ہے شاید کہ وہ معصیت ہو، خصوصاً ان اصولیوں کے نزدیک جو فعل کو قول پر مقدم جانتے ہیں جب ان میں تعارض آ جائے۔

استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: علماء کا صغائر کے متعلق اختلاف ہے اور وہ بات جس پر اکثر علماء کا نظریہ قائم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام پر صغائر جائز نہیں۔ پس بعض علماء نے صغائر کو جائز قرار دیا ہے اور اس مقال کی کوئی اصل نہیں ہے۔

بعض متاخرین نے کہا: جو پہلے نظریہ کے حامل ہیں: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے گناہ کے وقوع کی خبر دی ہے اور گناہ کی نسبت ان کی طرف کی ہے اور اس پر انہیں عتاب بھی فرمایا ہے اور خود انبیائے کرام کے اپنے نفوس سے گناہوں کے متعلق بتایا ہے اور ان سے وہ نکلے اور ان گناہوں کی وجہ سے ڈرے اور توبہ کی۔ یہ چیزیں بہت سی جگہوں پر وارد ہیں تاویل تمام کو قبول نہیں کرتی اگرچہ اخبار احاد اس کو قبول کرتی ہیں اور یہ تمام کام ایسے ہیں جو انبیاء کے منصب کے لئے معیوب ہیں۔ یہ تمام امور ان سے نادر طور پر اور خطا و نسیان کے طور پر یا ایسی تاویل کے طور پر واقع ہوئے ہیں جو تاویل اس کام کی طرف داعی تھی۔ یہ امور دوسرے لوگوں کے اعتبار سے نیکیاں ہیں اور ان کے حق میں سیئات ہیں ان کے مناصب اور بلند اقدار کی نسبت سے کیونکہ وزیر سے ایک بات پر مواخذہ ہوتا ہے جبکہ سپاہی کو اسی کام پر بدلہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ قیامت کے موقف سے ڈرے باوجود اس کے کہ ان کو امن و امان اور سلامتی کا علم تھا۔ فرمایا: یہی حق اور ثواب ہے۔ حضرت جنید نے کتنا عمدہ کہا ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین وہ کام جو ابرار کی نیکیاں ہوتے ہیں مقربین کے حق میں گناہ ہوتے ہیں۔ پس انبیاء کرام اگرچہ نصوص ان سے گناہ کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں پھر بھی یہ ان کے مناصب میں خلل ثابت نہیں اور نہ ان کے رتبہ میں جرح کا موجب ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے امور کی تلافی فرما دی انہیں چن لیا، انہیں ہدایت سے نوازا ان کی مدح فرمائی ان کا تزکیہ فرمایا، انہیں منتخب کیا اور انہیں چن لیا۔ صلوات اللہ علیہم

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ظلم کا اصل معنی کسی شے کو مناسب جگہ پر نہ رکھنا۔ الارض المظلومہ اس زمین کو کہتے ہیں جو کبھی کھودی نہ گئی ہو پھر کھودی گئی۔ نابغہ نے کہا:

وقفت فیھا اصیلالاً اسائلھا عیت جواباً وما بالربع من احد

اِلّا الاواری لأیا ما ابینھا والنُؤی کالحوض بالمظلومۃ الجلد

میں عصر کے وقت ان کھنڈرات میں کھڑا ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا تو وہ جواب دینے سے عاجز تھے اور وہاں پر کوئی شخص نہ تھا سوائے رسیوں کے اور مشقت کے میں اس کو بیان نہیں کرتا اور حوض کی طرح گڑھے کے جو اس سخت زمین میں کھودا گیا تھا۔

اس کو التراب الظلیم بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فاصبح فی غبراء بعد اشاحۃ علی العیش مردودٍ علیھا ظلیمھا

صبح کے وقت قبر کے گڑھے میں تھا جس کی مٹی اس پر لوٹائی گئی تھی۔

جب اونٹ کو بغیر بیماری کے ذبح کیا جائے تو اس پر ظلم کیا گیا...... اونٹوں کو بغیر بیماریوں کے ذبح کرنے والوں کو ظلامون

للجزر کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: سَقَانا ظلیمۃ طیبۃ جب اس نے دودھ پکنے سے پہلے انہیں پلا دیا۔ وقد ظلم و طبۂ، مکھن نکالنے سے پہلے دودھ پلایا گیا ہو تو یہ جملہ بولتے ہیں: اللبن مظلوم و ظلیمٌ، دودھ تیار نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

و قائلۃٍ ظلمت لکم سقائی وھل یخفی علی العکد الظلیم

اور وہ کہہ رہی تھی میں نے تمہیں دودھ جمنے سے پہلے پلایا کیا زبان کی جڑ پر وہ دودھ مخفی تھا۔

رجل ظلیم، سخت ظلم کرنے والا شخص۔ الظلم سے مراد شرک بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا، کلا سے نون حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ امر کا صیغہ ہے اور ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے، اس کا حذف شاذ ہے۔ سیبویہ نے کہا: عربوں میں کچھ لوگ کہتے ہیں اُءْ کُلْ فَیْتِہِمْ۔ کہا جاتا ہے: اکلت الطعام اَکْلًا و مأ کلاً۔ الاکلۃُ (بالفتح) سیر ہو کر کھانا۔ الاُکلۃُ (بالضم) لقمہ میں کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: اکلت اکلۃً واحدۃً یعنی میں نے ایک لقمہ کھایا، روٹی کو بھی کہتے ہیں ھذا الشی اکلۃ لک یعنی طعمۃٌ لک (تمہاری خوراک سے) الاُکُل جو چیز کھائی جائے۔ کہا جاتا ہے: فلان ذو اُکل یعنی وہ شخص جس کو دنیا کا بہت حصہ ملا ہو اور وسیع رزق والا ہو۔ (رغداً) یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ ابن کیسان نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کی حیثیت سے مصدر ہو۔ مجاہد نے کہا: رَغَدًا کا مطلب ہے ان پر حساب نہ ہوگا۔ الرغد لغت میں اس کثیر کو کہتے ہیں جو تجھے مشقت میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: ارغد القوم، جب لوگ خوشحالی میں ہوں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

حَيْثُ یہ مبنی برضمہ ہے یہ دوسرے ظروف سے مختلف ہے کہ یہ مضاف نہیں ہوتا بہ، قبل اور بعد سے مشابہ ہے جب وہ مضاف الیہ سے جدا کئے گئے ہوں۔ پس اس لئے اسے ضمہ دیا گیا۔ کسائی نے کہا: قیس اور کنانہ کی لغت ضمہ ہے اور تمیم کی لغت فتحہ ہے۔ کسائی نے کہا: بنو اسد جر کی جگہ اس کو جر دیتے ہیں اور نصب کی جگہ نصب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (القلم) حیث پر ضمہ اور فتحہ پڑھا جاتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهٖ میں ھا، یا کا بدل ہے کیونکہ اصل میں ھذی تھا۔ نحاس نے کہا: میں عربی زبان میں ھا تانیث نہیں جانتا جب کہ ماقبل مکسور ہو سوائے هٰذِهٖ کے ھا کے۔ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: ھاتا ھند بعض کہتے ہیں: ھاتی ھند۔

سیبویہ نے حکایت کیا ہے: ھذہ ھند۔ (ھا کے سکون کے ساتھ) کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے: ولا تقربا ھذی الشجرۃ۔ شبل بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: ابن کثیر اور ابن محیصن قرآن میں هٰذِهٖ میں ھا کو کسی جگہ ثابت نہیں رکھتے۔ جماعت کی قراءت رغداً غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن وثاب اور نخعی سے مروی ہے کہ وہ غین کے سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سلمہ نے فراء سے حکایت کیا ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: ھذہ فعلت و ھذی فعلت۔ ذال کے بعد یا کے اثبات کے ساتھ، ھذِ فعلت (ذال کے کسرہ کے ساتھ یا اور ھا کے الحاق کے بغیر)

ھاتا فعلت۔ ہشام نے کہا: کہا جاتا ہے تا فعلت۔ شعر کہا ہے:

خلیلی لو لا ساکن الدار لم أُقِمْ　　بتا الدار الا عابر ابن سبیل

میرے دو دوست اگر اس گھر میں رہنے والے نہ ہوتے تو میں بھی اس گھر میں نہ ٹھہرتا مگر مسافر کی طرح گزر جاتا۔

ابن انباری نے کہا: ھا کے اسقاط کے ساتھ تا اس طرح ہے جس طرح ذی، ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ہے، اور ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ذہ ہے۔ فراء نے کہا: جس نے کہا: ھذ قامت وہ ھا کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ صرف ذال پر اسم مشتمل نہیں ہوتا۔

فَتَكُوْنَا، تقربا پر اس کا عطف ہے اس وجہ سے نون کو حذف کیا گیا ہے۔ جرمی نے کہا: فا ناصبہ ہے اور دونوں جائز ہیں۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

''پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا وقت مقررہ تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا جماعت نے فازلھما بغیر الف کے الزلۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ الزلۃ کا معنی خطا ہے یعنی ان سے خطا کروائی اور انہیں خطا میں واقع کیا۔ حمزہ نے فازالھما یعنی الف کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہے: اس نے انہیں دور کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ازلتہ فزال، میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ ابن کیسان نے کہا: فازالھما، زوال سے مشتق ہے یعنی آدم و حوا طاعت پر تھے اس سے اس (شیطان) نے معصیت کی طرف پھیر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس مفہوم پر دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہو گا مگر جماعت کی قراءت معنی کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے۔ کہا جاتا ہے: ازللتہ فزل۔ میں نے اسے پھسلایا تو وہ پھسل گیا۔ اس معنی پر یہ قول بھی دلیل ہے: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران: 155) ان کے بعض کرتوتوں کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (اعراف: 20) (شیطان نے ان دونوں کے لئے وسوسہ ڈالا) الوسوسہ کا مطلب ہے معصیت کے ساتھ اس نے انہیں خطا میں داخل کیا۔ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹا دے اسے ذلل میں داخل کرنے کی قدرت ہے۔ پس یہ گناہ کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف زوال کا سبب ہو گا۔ بعض نے فرمایا: ازلھما یہ زل عن المکان سے مشتق ہے جب کوئی اپنی جگہ سے ہٹ جائے پھر معنی حمزہ کی قراءت کے مطابق ہو گا یعنی یہ زوال سے مشتق ہو گا۔ امرء القیس نے کہا:

یزل الغلام الخف عن صھواتہ　　و یلوی باثواب العنیف المثقل

ہلکا پھلکا غلام گھوڑے سے گرجاتا ہے اور سخت اور بھاری آدمی اسے کپڑوں کے ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

كميت يزل اللبد عن حال متنه   كما زلت الصفواء بالمتنزل

کمیت گھوڑے سے اس کا کپڑا اس طرح اس کی پیٹھ سے گرجاتا ہے جیسے صاف چٹان اپنے اوپر چڑھنے والے کو گرادیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ جب ازال کو زال عن المکان سے مشتق مانا جائے تو فَاَخْرَجَهُمَا زوال کا بیان اور تاکید ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ جنت میں ہی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہو گئے ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جنت سے زمین کی طرف انہیں نکالنا تھا، کیونکہ وہ زمین سے پیدا کئے گئے تھے، تاکہ حضرت آدم علیہ السلام زمین میں خلیفہ بنیں۔ ابلیس نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کا یہ قصد تو نہیں کیا تھا۔ اس نے تو حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گرانے کا قصد کیا تھا اور انہیں رحمت الٰہی سے دور کرنے کا قصد کیا تھا جیسا کہ وہ خود دور کیا گیا تھا، اس کا مقصد پورا نہ ہوا اور اس کو اپنی مراد نہ ملی بلکہ اس کی آنکھ کی گرمی، نفس کے غصہ اور گمان کے نقصان میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ (طٰہٰ)

پس حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے گھر میں اس کے پڑوسی ہونے کے بعد اس کی زمین میں اس کا خلیفہ بن گئے خلیفہ اور پڑوسی میں بڑا فرق ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کام کو ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ وہ اس کا سبب تھا اس میں مفسرین کا کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اغواء ابلیس کے ہاتھوں ہوا لیکن کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور جمہور علماء نے فرمایا: اس کا اغوا بالمشافہ تھا(1)۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿﴾ (اعراف)

مقاسمہ کا ظاہر مشافہ ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قول عبد الرزاق نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے۔ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سانپ چار ٹانگوں والا تھا جیسے بختی اونٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو پیدا کیا تھا ان میں سانپ خوبصورت ترین جانور تھا، شیطان نے پہلے اپنے آپ کو تمام حیوانوں پر پیش کیا تھا کہ وہ اسے منہ میں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ سوائے سانپ کے کسی نے اسے داخل نہ کیا جب سانپ اسے جنت میں لے گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکلا اس نے اس درخت کو لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع کیا تھا۔ ابلیس وہ لے کر حضرت حواء کے پاس آیا اور کہا: اس درخت کو دیکھو اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا ذائقہ کتنا عمدہ ہے، اس کا رنگ کتنا پیارا ہے، وہ انہیں اغوا کرتا رہا حتیٰ کہ حضرت حوا نے وہ درخت لے لیا اور کھا لیا۔ پھر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اغوا کیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا: کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اسے کھالیا۔ ان دونوں کے لباس اتر گئے، اور گناہ کے حکم میں ہو گئے۔ حضرت آدم اس درخت کے پیٹ

1۔ تفسیر الثعلبی، صفحہ 219، جلد 1 (دار الاحیاء التراث العربی)

میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز دی: تو کہاں ہے؟ حضرت آدم نے عرض کی: میں یہاں ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تو باہر نہیں نکلے گا؟ حضرت آدم نے کہا: یارب! مجھے تجھ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس زمین کی طرف اتر جا جس سے تیری تخلیق کی گئی ہے۔ سانپ پر لعنت کی گئی اور اس کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں لوٹا دی گئیں اور اس کے اور اولاد آدم کے درمیان عداوت و دشمنی بن گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے (جیسا کہ وضاحت آگے آئے گی)۔ حضرت حوا سے کہا گیا جس طرح تو نے اس درخت کا خون بہایا اسی طرح تجھے بھی ہر مہینے خون کی تکلیف لاحق ہوگی تو حمل اٹھائے گی اور بچہ جنم دے گی تکلیف کے ساتھ تو اس کی وجہ سے کئی مرتبہ موت کے قریب ہو جائے گی۔ طبری اور نقاش نے یہ زائد لکھا ہے کہ تو سفیہہ ہوگی حالانکہ تو سیانی تھی، ایک جماعت نے کہا: ابلیس جنت میں نکالے جانے کے بعد حضرت آدم کے پاس نہیں پہنچا تھا اس نے اپنی شیطانیت، سلطنت اور اپنے وسوسہ کے ذریعے حضرت آدم کو اغوا کیا تھا، جس کی اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت بخشی تھی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم۔(1) شیطان ابن آدم میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ اعراف میں آئے گا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تو آپ برہنہ ہو گئے اور انہوں نے لباس تلاش کرنے کی کوشش کی تو درخت ان سے دور ہو گئے اور معصیت کی وجہ سے انہیں رلایا اور انجیر کے درخت نے حضرت آدم پر رحم کھایا۔ پس آپ نے اس کے پتے لیے اور اپنے آپ کو ڈھانپا۔ پس آپ برہنہ ہونے کے ساتھ آزمائے گئے نہ کہ درخت سے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں حکمت دنیا کو آباد کرنا تھا۔

مسئلہ نمبر 3: ذکر کیا جاتا ہے کہ سانپ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کا خادم تھا۔ اس نے خیانت کی اس طرح کہ اس نے اللہ کے دشمن کو اپنے نفس پر قدرت دی اس وجہ سے اس کے لئے عداوت ظاہر ہوگئی۔ جب وہ نیچے اترے تو عداوت مؤکد ہوگئی اور اس کا رزق مٹی بنائی گئی۔ اسے کہا گیا: تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں جہاں بھی ان میں کوئی تجھے پائے گا تیرا سر کچل دے گا۔

حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: پانچ چیزوں کو محرم قتل کر سکتا ہے(2)۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ بھی ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس نے سانپ سے کہا: مجھے تو جنت میں لے جا تو میرے ذمہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے: ابلیس کے ذمہ کو توڑو۔ ساکنہ بنت جعد نے سراء بنت نبہان غنویہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: چھوٹے، بڑے، کالے اور سفید سانپوں کو قتل کرو۔ جو ان کو قتل کرے گا اس کے

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 1063، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب الاحکام، باب الشہادۃ تکون عند الحاکم فی ولایتہ القضاء، حدیث 6636، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 467، جلد 1۔ ایضاً، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب یقتلن فی الحرام، حدیث 3068، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے یہ آگ سے فدیہ ہوں گے اور جس کو سانپ قتل کر دے گا وہ شہید ہوگا(1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: آگ سے فدیہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ ابلیس کے ساتھ شریک تھا اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچانے میں اس کا معاون تھا۔ اسی وجہ سے جس کسی نے سانپ کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کافر اور اس کا قاتل کبھی دوزخ میں جمع نہ ہوں گے(2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ابن جریج نے حضرت عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے، ایک سانپ گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کرو۔ وہ ہم سے بھاگ کر غار میں چلا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کھجور کی شاخیں اور آگ لے آؤ اور اس پر آگ جلا دو(3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اسی نہی کو خاص کرتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا اور اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دے۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث نے اس دشمن کے لئے کوئی حرمت نہیں چھوڑی، جہاں بھی یہ چلا جائے حتیٰ کہ جہاں بھی قدرت ہو اس تک ہلاکت کو پہنچائے، اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ انہوں نے بچھو کو آگ کے ساتھ جلانے کو ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ مثلہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: ہوسکتا ہے ان کو یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نہ پہنچی ہو اور انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا ہو جس میں ہے اللہ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو۔ ان کے نزدیک اس پر عمل اس بنا پر ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک غار میں تھے جبکہ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا۝ (المرسلات) سورت نازل ہوئی۔ ہم نے اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ مبارک سے سنی تھی اچانک ہم پر ایک سانپ نکلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو قتل کرو۔ ہم اسے قتل کرنے کے لئے دوڑے تو وہ ہم سے بھاگ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا(4)، اس میں تو نہ اس پر آگ جلائی گئی اور نہ اس کے قتل کا کوئی اور حیلہ کیا گیا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے وہاں آگ نہ پائی ہو اس لئے اسے ترک کر دیا ہو۔ یا اس کی بل ایسی نہ ہو جہاں آگ فائدہ دیتی ہو دھواں بھی نقصان نہ دیتا ہو اور حیوان تک وہ نہ پہنچتا ہو۔ واللہ اعلم حضور علیہ السلام کا ارشاد اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا یعنی تم اسے قتل کر دیتے اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا یعنی اس کے ڈسنے سے تمہیں بچالیا۔

مسئلہ نمبر 5: سانپوں کو قتل کرنے کا حکم تکلیف کو دور کرنے کے ارشاد سے ہے جس نقصان کا سانپوں سے خوف ہوتا ہے۔ جس سانپ کا ضرر یقینی ہو اس کا قتل کرنے کی طرف جلدی کرنا واجب ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اقتلوا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 49، جلد 1 (دار الصادر بیروت)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قتل کافرا ثم سدد، صفحہ 137، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر بیروت)
4۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الحیات واقتلوا ذا الطفیتین والابتر فانهما یخطفان البصر و یسقطان الحبل (1) (یعنی سانپوں کو قتل کرو اور دو دھاریوں والے اور دم کٹے سانپ کو قتل کرو کیونکہ یہ دونوں آنکھوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور حمل گرا دیتے ہیں) ان دو سانپوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا حالانکہ یہ پہلے عموم میں داخل تھے اور ان کے ضرر کے بڑے سبب کی وجہ سے ان پر متنبہ فرمایا اور جس سانپ کا ضرر محقق نہ ہو پس ان میں سے جو گھروں کے علاوہ کسی جگہ پر ہوں تو ظاہری عمومی حکم کی وجہ سے انہیں قتل کر دو کیونکہ سانپوں کی ہر نوع میں ضرر غالب ہے۔ پس اس پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ سانپ اپنی صورت کی وجہ سے خوف ناک ہے اور نفوس میں نفرت ہے (اس لئے اسے قتل کرنا چاہئے۔) اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شجاعت کو پسند فرماتا ہے اگرچہ سانپ کے قتل پر ہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ کے قتل پر تشجیع فرمائی۔ ابوداؤد کی حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے، اس میں فرمایا: تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے بدلہ لینے سے ڈرا وہ مجھ سے نہیں (یعنی میرے طریقہ پر نہیں (2))

مسئلہ نمبر 6: وہ سانپ جو گھروں میں رہتے ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے حتیٰ کہ تین دن انہیں تنبیہ کی جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مدینہ طیبہ میں جن ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اسے آگاہ کرو (3)۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صرف مدینہ کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ہم نہیں جانتے کہ مدینہ طیبہ کے علاوہ جو جن ہیں وہ اسلام لائے ہیں یا نہیں، یہ ابن نافع کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: تمام شہروں میں گھروں کے سانپوں کو قتل کرنے سے منع ہے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (احقاف: 29)

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا داعی آیا میں ان کے ساتھ گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا۔ اس حدیث میں ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوراک کا سوال کیا وہ جزیرہ کے جن تھے (4)۔ اس کی تفصیل سورۂ جن میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جب یہ ثابت ہے تو کسی سانپ کو قتل نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ پہلے اس پر تنگی کی جائے گی اور اسے ڈرایا جائے گا۔ مزید بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: ائمہ نے ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت ابوسعید خدری کے پاس ان کے گھر میں گئے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوسعید خدری کو میں نے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا تا کہ وہ نماز کو مکمل کر لیں۔ میں نے گھر کی ایک طرف کھجور کی چھڑیوں میں کچھ حرکت سنی۔ میں متوجہ ہوا تو وہ سانپ تھا۔ میں اسے قتل

1۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیات، صفحہ 234، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 356، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4569، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرھا، قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجهر بالقراۃ فی الصبح والقراۃ علی الجن، صفحہ 184، جلد 1

کرنے کے لئے دوڑا تو حضرت ابوسعید نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو گھر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: کیا تم یہ کمرہ دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: اس میں ہمارا ایک نوجوان رہتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ فرمایا: ہم خندق کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ نوجوان نصف النہار کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتا تھا اور گھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا ہتھیار لے لو مجھے تجھ پر قریظہ (کے حملہ) کا اندیشہ ہے۔ اس شخص نے اپنا ہتھیار لے لیا پھر لوٹ آیا وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے اسے نیزہ مارنے کے لئے نیزہ اس کی طرف جھکایا، کیونکہ اسے غیرت آ گئی تھی۔ بیوی نے کہا: اپنا نیزہ دور کر لے اور گھر کے اندر داخل ہوتا کہ تو وہ دیکھ لے جس نے مجھے گھر سے باہر نکالا۔ پس وہ اندر گیا تو زمین پر ایک بہت بڑا سانپ لپٹا پڑا تھا۔ نوجوان نے اس کی طرف نیزہ جھکایا اس میں سانپ کو پرو دیا، پھر وہ باہر نکلا اور نیزہ کو گھر کے صحن میں گاڑھ دیا۔ پس اس سانپ نے اس نیزے کے اوپر حرکت کی پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کون پہلے مرا سانپ یا وہ نوجوان۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ واقعہ ذکر کیا۔ ہم نے کہا: حضور! دعا فرمائیں اسے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے زندہ کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر فرمایا...... مدینہ طیبہ کے جن مسلمان ہو گئے ہیں جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس کو تنبیہ کرو اگر پھر تمہارے لئے یہ ظاہر ہو تو اسے قتل کر دو وہ شیطان ہے۔ دوسری سند سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان گھروں میں رہنے والے سانپ ہیں جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس پر تنگی کرو اگر وہ چلا جائے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دو وہ کافر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: جاؤ اور اپنے ساتھی کو دفن کر دو۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اس حدیث سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وہ سانپ جس کو نوجوان نے قتل کیا تھا وہ مسلمان تھا اور جنوں نے اسے قصاصاً قتل کیا تھا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قصاص ہمارے اور جنوں کے درمیان مشروع ہے تو وہ پھر قتل عمد میں ہو گا اور اس نوجوان نے قتل عمد نہیں کیا تھا کیونکہ اسے تو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا، انہوں نے تو اس نوع کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا قتل کرنا شرعاً مشروع تھا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس میں قصاص نہیں ہے۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ کافر اور فاسق جنوں نے اس نوجوان کو اپنے ساتھی کا انتقام لینے کے لئے قتل کیا تھا۔ جنوں نے حضرت سعد بن عبادہ کو قتل کیا تھا وہ اپنے غسل خانہ میں مردہ پائے گئے تھے اور ان کا جسم سبز ہو چکا تھا اور لوگوں کو ان کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ انہوں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جبکہ انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

قد قتلنا سید الخز رج سعد بن عبادۃ

و رمیناہ بسھمیـ ن فلم نخط فؤادہ

ترجمہ: ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا۔ اور ہم نے انہیں دو تیر مارے اور ہم نے اس کے دل سے خطا نہیں کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا ہے) تا کہ وہ راستہ بیان فرما دیں جس کے ذریعے ان

میں سے کسی مسلمان کو قتل کرنے سے بچایا جائے اور ان میں سے کسی کافر کے قتل پر غلبہ پایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک سانپ مار ڈالا، پھر انہیں خواب میں دکھایا گیا کہ کوئی انہیں کہہ رہا ہے تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر وہ مسلمان ہوتا تو نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس داخل نہ ہوتا۔ اس کہنے والے نے کہا: وہ آپ کے پاس کبھی داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ صبح ہوئی تو حضرت عائشہ نے بارہ ہزار دراہم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے: وہ آپ پر داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے صدقہ کیا اور کئی غلام آزاد کیے۔ ربیع بن بدر نے کہا: الجان ان سانپوں میں سے ہے جن کے قتل سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ یہ وہ سانپ ہیں جو چلتے ہیں اور دوہرے نہیں ہوتے۔ علقمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 8: انذار (ڈرانے) کا طریقہ: امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تین دن انہیں ڈرایا جائے۔ عیسیٰ بن دینار کا بھی یہی قول ہے اگرچہ ایک دن میں کئی مرتبہ ظاہر ہو۔ ایک دن میں تین مرتبہ ڈرانے پر اکتفا نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ تین دن میں یہ ڈرانا پایا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: تین مرتبہ ڈرانا کافی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فلیوذنہ ثلاثا اس کو تین مرتبہ آگاہ کرو۔ اور فرمایا: حرجوا علیہ ثلاثا اور اس پر تین مرتبہ تنگی کرو۔ ثلاثا (تین) کا عدد مؤنث کے لئے ہے پس ظاہر ہوا کہ مراد تین مرتبہ ہے..... امام مالک کا قول اولیٰ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ثلاثۃ ایام یہ صحیح نص ہے ان مطلقات کے لئے مقید ہے اور ثلاثا کو تین ایام کی راتوں کے ارادہ پر محمول کیا جائے گا۔ عربوں کی عادت پر تاریخ کے باب میں رات غالب ہے کیونکہ ان میں تانیث غالب ہوتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ڈرانے میں یہ کہنا کافی ہے: أُحرج علیك باللہ والیوم الاخر الا تبدو النا ولا تو ذونا یعنی میں تجھ پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن کے واسطہ سے تنگی کرتا ہوں کہ تم ہمارے لئے ظاہر نہ ہو اور نہ ہمیں تکلیف دو۔ ثابت بنانی نے عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے کہ ان کے سامنے گھروں میں پائے جانے والے سانپوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: جب تم ان میں سے کوئی سانپ اپنے گھروں میں دیکھو تو کہو: انشد کم بالعھد الذی اخذ علیکم نوح علیہ السلام وانشد کم بالعھد الذی اخذ علیکم سلیمان علیہ السلام۔ میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے نوح علیہ السلام نے لیا تھا اور میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا۔ پھر جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو اسے قتل کر دو۔

میں کہتا ہوں: یہ بظاہر ایک دفعہ اذن کی کفایت پر دلیل ہے لیکن حدیث اس کا رد کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ابن حبیب نے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں: انشد کن بالعھد الذی اخذ علیکن سلیمان... علیہ السلام... الا توذیننا وآلا تظھرن علینا۔ (1)

مسئلہ نمبر 9: جبیر نے نفیر سے انہوں نے حضرت ابوثعلبہ الخشنی سے روایت کیا ہے..... ابوثعلبہ کا نام جرثوم ہے..... کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنوں کی تین قسمیں ہیں اور سب ایک تہائی ہیں: ایک قسم وہ ہے جن کے پر ہیں وہ ہوا میں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 357، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4576، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اڑتے ہیں اور ایک قسم سانپ اور کتے ہیں اور ایک قسم وہ ہے جو کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں اور سفر کرتے ہیں (1)۔

حضرت ابو درداء نے روایت کیا ہے..... ان کا نام عویمر ہے..... فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن تین حصوں میں پیدا کیے گئے ہیں: ایک تہائی کتے، سانپ اور زمین کے کیڑوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک تہائی تیز چلنے والی ہوا کی طرح ہوتے ہیں اور ایک تہائی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ثواب اور عقاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو تین تہائیوں میں پیدا کیا۔ ایک تہائی کے دل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہوتی ہیں جن کے ساتھ دیکھتے نہیں اور کان ہوتے ہیں جن کے ساتھ سنتے نہیں وہ نہیں ہیں مگر ڈنگروں کی مانند بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں اور ایک تہائی جن کے جسم انسانوں کے جسم جیسے ہوتے ہیں، ان کے دل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوتے ہیں اور ایک تہائی اللہ کے (عرش کے) سایہ میں ہوں گے جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (2)۔

مسئلہ نمبر 10: ہر وہ جانور جس کی اصل تکلیف پہنچانا ہو تو اسے ابتداءً قتل کیا جائے گا اس کی اذیت پہنچانے کی وجہ سے، اس میں کوئی اختلاف نہیں جیسے سانپ، بچھو، چوہا، چھپکلی اور اس کے مشابہ جانور..... رسول اللہ نے فرمایا: پانچ فواسق ہیں: انہیں، حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا (3)..... سانپ نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے خیانت کی اس طرح کہ وہ اپنے جبڑوں کے درمیان ابلیس کو جنت میں لے گیا۔ اگر سانپ اسے ظاہر کرتا تو جنت کا دربان اسے داخل نہ ہونے دیتا۔ ابلیس نے سانپ سے کہا: تو میرے ذمہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا: سانپ کو قتل کرو اگرچہ تم نماز میں ہو (4) (یعنی سانپ اور بچھو کو قتل کرو)۔

الوزغة (چھپکلی) اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو پھونکے دیئے تھے جبکہ دوسرے حیوانوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پس اس پر لعنت کی گئی۔ یہ اس نوع سے ہے جو آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے چھپکلی کو قتل کیا گویا اس نے ایک کافر کو قتل کیا اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، جس نے چھپکلی کو پہلی ضرب سے مارا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی اور جس نے تیسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی۔ ایک روایت میں ہے، فرمایا: پہلی ضرب پر ستر نیکیاں ہیں (5)۔

چوہیا، اس نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی رسیاں کاٹنے کا قصد کیا اور انہیں کاٹ دیا۔ عبد الرحمٰن بن ابی نعیم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: محرم سانپ، بچھو، چیل

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر) 2۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب مایندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر)

5۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب استحباب قتل الوزغ، صفحہ 236، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایسا درندہ جو حملہ کرے، کاٹنے والا کتا اور فویسقہ (چوہیا) کو قتل کرے (1)۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے تو چوہیا نے چراغ کی وٹ پکڑی ہوئی تھی تا کہ گھر کو آگ لگا دے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

کوا، اس نے اپنا جوہر اس وقت ظاہر کیا جب حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی سے بھیجا کہ زمین کی خبر لے آئے تو اس نے نوح علیہ السلام کے حکم کو ترک کر دیا اور مردار پر جا بیٹھا۔ یہ سب سانپ کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ذکر کر دیا۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا، اهْبِطُوْا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ الف وصلی ہے، اور قلنا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے اس کے اور اس کے بعد ھا کے سکون کی وجہ سے۔

محمد بن مصفی نے ابوحیوہ سے روایت کیا ہے کہ اھبطوا میں با پر ضمہ ہے یہ ایک لغت ہے۔ اس قول کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ یہ غیر متعدی ہے، اور اکثر غیر متعدی فعل یفعُلُ کے وزن پر آتا ہے۔ یہ خطاب حضرت آدم، حوا، سانپ اور شیطان کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حسن نے کہا: حضرت آدم، حوا اور وسوسہ کو (2)، مجاہد اور حسن نے کہا: بنو آدم اور بنو ابلیس کو ہے۔ الھبوط کا معنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں سرندیپ میں ایک پہاڑ پر اترے جسے بوذ کہا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ جنت کی خوشبو تھی۔ پس اس علاقہ کے درختوں اور وادیوں سے لگی ہر چیز خوشبو سے بھر گئی، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خوشبو سے وہاں سے خوشبو لائی جاتی ہے۔ بادل آپ کے سر کو چھوتا تھا تو آپ گنجے ہو گئے تھے۔ پس گنجا پن آپ کی اولاد کو میراث میں ملا۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا (3)۔ (الحدیث) مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، آئندہ ذکر ہوگی۔ حضرت حوا جدہ میں اتریں اور ابلیس أبلّة میں اور سانپ بیسان میں اترا۔ بعض نے فرمایا: سجستان میں، سجستان میں تمام شہروں سے زیادہ سانپ ہیں۔ اگر عربد سانپ نہ ہوتا جو سانپوں کو کھاتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر مر جاتے ہیں سجستان سانپوں کے لئے خالی کر دیا جاتا۔ یہ ابوالحسن مسعودی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، بَعْضُكُمْ مبتدا ہے، عَدُوٌّ خبر ہے اور یہ جملہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: و ھذہ حالکم۔ واؤ کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں ضمیر عائد موجود ہے جیسے کہا جاتا ہے: رایتك السماء تمطر علیك۔ میں نے تجھے دیکھا دراں حالیکہ آسمان تم پر بارش برسا رہا تھا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء مایقتل المحرم من الدواب، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر ثعلبی، صفحہ 221، جلد 1 (دار الاحیاء التراث)
3۔ صحیح بخاری، صفحہ 468، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم و ذریته، حدیث 3079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

العدو۔ دشمن، یہ صدیق (دوست) کا متضاد ہے یہ عدا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: ظلم کرنا۔ ذئبٌ عدوان (دشمن بھیڑیا) یعدو علی الناس جو لوگوں پر تجاوز کرتا ہے، العدوان صریح ظلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تجاوز کرنا۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: لا یعدوك هذا الامر یعنی یہ امر تجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ عداہ، اس نے اس سے تجاوز کیا، اس کو عَدُوٌّ اس لئے کہتے ہیں اپنے ساتھی کی ناپسند میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔ اسی سے ہے: العدو بالقدم۔ چلنے میں تجاوز کرنا۔ دونوں معانی قریب قریب ہیں کیونکہ جو ظلم کرتا ہے وہ تجاوز کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کو انسان پر محمول کیا ہے اگرچہ یہ معنی صحیح ہے لیکن یہ بعید ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کی دلیل ہے جب بندہ صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان سے کہتے ہیں ہمارے لئے اللہ سے ڈر۔ تو جب سیدھی ہوگی تو ہم سیدھے ہوں گے تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم ٹیڑھے ہوں گے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ عَدُوٌّ کیسے فرمایا اعداء نہیں فرمایا؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ بعض اور کل کے لفظ کی خبر لفظ کے اعتبار سے واحد لگائی جاتی ہے اور معنی کے اعتبار سے اس کے مطابق لگائی جاتی ہے اور قرآن میں یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ (مریم) یہاں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد خبر لگائی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۝ (النمل) یہاں معنی کے اعتبار سے خبر جمع لگادی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عدو جمع کی جگہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (الکہف) (اور وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے)

اسی طرح فرمایا: يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۭ هُمُ الْعَدُوُّ (المنافقون: 4) (گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے۔ یہی حقیقی دشمن ہیں) ابن فارس نے کہا: اَلْعَدُوُّ، اسم ہے جو واحد، تثنیہ، جمع اور تانیث کو جامع ہے، کبھی اس کی جمع بھی بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنا اور جنت سے اتارنا بطور سزا نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد انہیں زمین پر اتارا، یا تو تادیب کی خاطر یا محنت میں سختی کی خاطر اتارا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کو اتارنا اور زمین میں ٹھہرانا حکمت ازلیہ کے سبب تھا اور وہ حکمت یہ تھی کہ زمین میں ان کی نسل پھیلائی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا مکلف بنائے اور انہیں آزمائے۔ پھر اس پر ان کے ثواب اور اخروی عقاب کو مرتب فرمائے، کیونکہ جنت اور دوزخ ایسی جگہ نہیں ہیں جہاں احکام کا مکلف بنایا گیا ہو۔ پس وہ کھانا جنت سے اتارنے کا سبب بنا اور اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے جو چاہے کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا تھا: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ: 30) یہ منقبت عظیمہ اور فضیلت کریمہ شریفہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کے بعد زمین پر اتارا کیونکہ دوسری مرتبہ فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوْا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی حفظ اللسان، صفحہ 63، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یہ مبتدا خبر ہیں اور مُسْتَقَرٌّ اسم ظرف ہے۔ یہ ابو العالیہ اور ابن زید کا قول ہے۔ سدی نے کہا: مُسْتَقَرٌّ سے مراد قبور ہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا (غافر: 64) یہ دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَتَاعٌ، المتاع ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے لطف اٹھایا جائے خواہ کھانا ہو، لباس ہو، زندگی (کی کوئی اور ضرورت ہو) بات ہو، محبت وغیرہ ہو۔ اس سے منفعة النکاح کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک جب اپنے بیٹے کو دفن کے بعد اس کی قبر پر کھڑا ہوا تو کہا:

وقفت على قبر غريب بقفرة   متاع قليلٌ من حبيبٍ مفارق(1)

میں ایک میدان میں مسافر کی قبر پر کھڑا ہوں۔ یہ جدا ہونے والے دوست سے تھوڑا سا سامان ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلٰى حِيْنٍ، الحین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک جماعت کا کہنا ہے: اس سے مراد موت ہے (یعنی مرنے تک) یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر دنیا میں ٹھہرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد ہے قیامت کے قیام تک۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر سے مراد قبور ہیں۔ ربیع نے کہا: اِلٰى حِيْنٍ سے مراد الی اجلِ یعنی موت تک۔

الحین سے مراد وقت بعید ہے اس وقت تیرے قول الآن اب سے دور کرنا سے ہے۔ خویلد نے کہا:

كابي الرماد عظيم القدر جفنته   حين الشتاء كحوض المنهل اللقف

بہت زیادہ سخی ہے، اس کا پیالہ بہت بڑا ہے، سردیوں کے وقت کھلے گھاٹ والے حوض کی طرح ہے۔

کبھی حین پر تا داخل کرتے ہیں۔ ابو وجزہ نے کہا:

العاطفون تحين ما من عاطف   والمطعمون زمان أين المطعم

وہ مہربانی کرنے والے ہوتے ہیں جبکہ کوئی مہربان نہیں ہوتا اور وہ کھلانے والے ہوتے ہیں جس وقت کہا جاتا ہے کھلانے والا کہاں ہے۔

الحین کا معنی مدت بھی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1) الحین کا معنی ساعت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ (زمر: 58)، ابن عرفہ نے کہا: الحین زمانہ کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جیسے ساعت، گھڑی اور اس سے اوپر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (المومنون) اے محبوب رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (ابراہیم: 25) وہ سارا سال پھل لاتا ہے، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہر چھ ماہ بعد پھل لاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: صبح و شام پھل دیتا ہے۔ الازہری نے کہا: الحین اسم ہے جیسے الوقت یہ تمام زمانوں کو شامل ہے خواہ وہ لمبا زمانہ ہو یا مختصر۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 129، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مطلب یہ ہے کہ اس سے ہر وقت نفع اٹھایا جاتا ہے اور اس کا نفع کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ فرمایا: الحین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ الحین سے مراد صبح و شام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ۝ (الروم) (سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو) کہا جاتا ہے: عاملته محاینةً یعنی میں نے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ احینت بالمکان میں وقت وہاں ٹھہرا۔ حان حین کذا۔ یعنی قریب ہوا۔ شاعر نے کہا:

وان سلوی عن جمیلٍ لساعة　　　من الدهر ما حانت ولا حان حینها

مسئلہ نمبر 7: جہاں الحین کے متعلق اہل زبان کا اختلاف ہے وہاں ہمارے علماء اور دوسرے علماء کے درمیان بھی اس میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: الحین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حد پر واقفیت نہیں ہوتی۔ دوسرا حین وہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: تُؤۡتِيۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) یہاں حین سے مراد چھ مہینے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: الحین المجهول وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا اور الحین المعلوم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ احکام متعلق ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلیف کا تعلق ہوتا ہے۔ معلوم کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہے۔ امام مالک احکام اور ایمان (قسموں) میں اس کو اسماء اور زمانوں میں اعم خیال کرتے ہیں۔ امام شافعی اقل خیال کرتے ہیں، ابوحنیفہ درمیانی مدت مراد لیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: چھ ماہ۔ ان کے قول کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مقدرات قیاساً ثابت نہیں ہوتی ہیں اور اس میں صاحب شریعت کی طرف سے کوئی نص نہیں ہے، معنی پر اعتبار کے لفظ کے مقتضیٰ پر لغوی طور پر آگاہی کے بعد ہوتا ہے۔ پس جس نے نذر مانی کہ وہ ایک حین نماز پڑھے گا تو اسے امام شافعی کے نزدیک ایک رکعت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایک رکعت نفل میں سے کم از کم ہے۔ انہوں نے وتر کی ایک رکعت پر قیاس کیا ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: نوافل کم از کم دو ہیں۔ پس زمانہ فعل کی مقدار کے ساتھ مقدر ہوگا۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ جو قسم اٹھائے الا یکلم فلانا حینا او لا یفعل کذا حیناً۔ تو حین سے مراد ایک سال ہوگا اور فرمایا: احکام میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ ایک حین ایسا نہیں کرے گا یا فلاں سے ایک حین بات نہیں کرے گا۔ سال پر زیادتی اس کی قسم میں داخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اتفاق ان کے مذہب میں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایک حین یا زمانہ، یا دھر ایسا نہیں کرے گا تو سب سے مراد ایک سال ہوگا۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، دھر میں ایک سال ہونے میں انہیں شک ہوا۔ ابن منذر نے یعقوب اور ابن الحسن سے حکایت کیا ہے کہ دھر سے مراد چھ ماہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اصحاب الرائے، عکرمہ، سعید بن جبیر، عامر الشعبی اور عبیدہ نے تُؤۡتِيۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) کے تحت فرمایا کہ کل حین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ اوزاعی اور ابوعبیدہ نے کہا: الحین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک الحین میں کوئی معلوم وقت نہیں ہے اور نہ حین کے لئے کوئی حد ہے کبھی ان کے نزدیک الحین سے مراد دنیا کی مدت ہوتی ہے ہم کبھی بھی اسے حانث نہیں بنائیں گے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے ختم ہونے سے پہلے ادا کردے۔ ابوثور وغیرہ نے کہا: الحین اور الزمان اس پر محمول ہوگا جو لغت کہتی ہے۔ کہا جاتا ہے: قد جئت من حینٍ شاید وہ نصف دن سے نہ آیا ہو، الکیا طبری شافعی

نے کہا: و بالجملہ، الحین کے کئی مصارف ہیں۔ امام شافعی کسی محمل کی تعیین نہیں کرتے کیونکہ یہ محمل ہے لغت میں کسی معین معنی کے لئے وضع نہیں کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلٰی حِیۡنٍ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بشارت ہے تا کہ وہ جان لیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس دنیا میں باقی نہیں رہنا ہے انہوں نے جنت کی طرف منتقل ہونا ہے جس کی طرف لوٹنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ حضرت آدم کے علاوہ لوگوں کے لئے قیامت کے قائم ہونے پر دلیل ہے۔ یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾

''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ بعض علماء نے فرمایا: تلقی کا معنی سمجھنا ہے۔ بعض نے فرمایا: قبول کرنا اور لینا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام یتلقی الوحی یعنی وحی حاصل کرتے تھے اسے لیتے تھے۔ تو کہتا ہے: خرجنا نتلقی الحجیج ہم نکلے تا کہ حاجیوں کا استقبال کریں۔ بعض نے فرمایا: تلقی کا معنی تلقین کرنا ہے، یہ معنی صحیح ہے لیکن اصل میں تلقی کا تلقن سے ہونا جائز نہیں کیونکہ جب دو حرف ہم جنس ہوں تو ایک کو یاء سے قلب کیا جاتا ہے مثلاً تظنی، یہ تظنن سے ہے تفضی یہ تفضض اس کی مثل ہے تسریت یہ تسررت سے ہے املیت یہ امللت سے ہے اس کی قسم کی دوسری مثالیں بھی ہیں اسی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا تقبی، تقبل سے ہے اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ تلقی، تلقن سے ہے، مکی نے حکایت کیا حضرت آدم علیہ السلام کو کلمات الہام کئے گئے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے نفع اٹھایا۔ حسن نے کہا: وہ کلمات سیکھے اور ان پر عمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2: کَلِمٰتٍ میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرات ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور مجاہد نے کہا: وہ کلمات یہ تھے: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۲۳﴾ (اعراف) مجاہد سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں: سبحانك اللھم لا الہ الا انت ربی ظلمت نفسی فاغفرلی انك انت الغفور الرحیم (1)۔ ایک جماعت نے کہا: انہوں نے عرش کے پائے پر یہ لکھا ہوا دیکھا: مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ تو انہوں نے ان کلمات سے سفارش طلب کی تو ان کی سفارش قبول کی گئی۔ کلمات سے مراد یہ کلمات ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: کَلِمٰتٍ سے مراد رونا، حیاء کرنا اور دعا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: ندامت، استغفار اور پریشان ہونا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے معہود استغفار کے علاوہ کچھ نہ کہا (2)۔ بعض نیک لوگوں سے پوچھا گیا کہ گناہگار کو کیا کہنا چاہئے تو اس نے کہا: جو اس کے والدین نے کہا تھا: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (اعراف: 23) موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ (القصص: 16) یونس علیہ السلام نے کہا تھا: لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ٭ۖ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۸۷﴾ (الانبیاء) حضرت ابن عباس اور وہب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً، صفحہ 131، جلد 1

بن منبہ سے مروی ہے کہ یہ کلمات تھے: سبحان اللھم و بحمدك لا اله الا انت عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ کلمات تھے: لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم لا اله الا انت سبحانك وبحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك انت الغفور الرحیم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك ارحم الراحمین۔ بعض نے فرمایا: کلمات سے مراد چھینک کے بعد الحمد للہ کہنا ہے۔

الکلمات، کلمۃٌ کی جمع ہے۔ الکلمہ کا لفظ قلیل و کثیر پر بولا جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَابَ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی یا توبہ کی توفیق بخشی۔ جمعہ کے دن دس محرم الحرام کو توبہ قبول فرمائی جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا۔ تاب العبد کا مطلب بندہ اپنے رب کی طاعت کی طرف لوٹ آیا۔

عبد توابٌ، طاعت کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا۔ توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے تاب و ثاب و آب و اناب ان سب کا معنی لوٹنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اگر کہا جائے کہ عَلَيْهِ کیوں فرمایا علیهما کیوں نہیں فرمایا، حضرت حوا بھی تو بالا جماع اس کام میں شریک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ:35) اس درخت کے قریب نہ جانا، اور قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف:23) دونوں نے کہا ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قصہ کے آغاز میں جب حضرت آدم علیہ السلام کو اُسْكُنْ کے ارشاد سے خطاب کیا گیا تو تلقی میں بھی خاص ان کا ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے واقعہ کی تکمیل بھی صرف ان کے ذکر سے کی۔ نیز عورت حرمت اور مستورہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہ فرما کر اس کے لئے پردہ کا ارادہ فرمایا۔ اسی وجہ سے معصیت میں بھی ان کا ذکر نہیں فرمایا وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۞ (طہٰ)

نیز عمومی احکام میں عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ (الکہف:75) (کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا) بعض علماء نے فرمایا: چونکہ دونوں کا امر برابر تھا حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کا ذکر حضرت حوا کی توبہ کی قبولیت کی دلیل ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا (الجمعہ:11) چونکہ قوم کی مقصود تجارت تھی اس لئے ضمیر کی طرف لوٹا دی اور تثنیہ کی ضمیر ذکر نہیں فرمائی، معنی قریب قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

رمانی بامرٍ کنت منه و والدی بریئًا و من فوق الطوی رمانی

اس نے مجھ پر ایک امر کی تہمت لگائی میں اور میرا والد اس سے بری تھے اور اس نے ایک کنویں کی وجہ سے مجھ پر تہمت لگائی۔

قرآن حکیم میں ہے اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ:62) (اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی

کریں) یہاں بھی ایجاز و اختصار کی خاطر حذف کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت التَّوَّابُ بیان فرمائی اور قرآن حکیم میں یہ صفت معرفہ، نکرہ، اسم اور فعل کی صورت میں بار بار ذکر فرمائی، کبھی ثواب کا اطلاق بندے پر بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۝ (البقرہ) (بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو)

ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا وصف ہونے میں ہمارے علماء کے تین اقوال ہیں:

ا- رب تعالیٰ کے حق میں یہ جائز ہے اس نام کے ساتھ اسے پکارا جائے گا جیسا کہ کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے اور کوئی تاویل نہیں کی جائے گی۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا وصف حقیقی ہے۔ توبة الله على العبد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو معصیت کی حالت سے طاعت کی حالت کی طرف لوٹا دیا۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: توبة الله على العبد کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی توبہ قبول کرنا یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد قبلت توبتك (میں نے تیری توبہ قبول کی) کی طرف لوٹے اور اس طرف لوٹنے کا احتمال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مجرم بندے کے دل میں توبہ کرنے اور ظاہری اعضاء پر طاعات کو جاری کرنے کی توفیق بخش دے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کے حق میں تائب کہنا جائز نہیں۔ تائب، اسم فاعل ہے تاب یتوب سے، کیونکہ ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اسم یا صفت استعمال کریں مگر صرف وہی جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے استعمال فرمایا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے استعمال فرمایا یا مسلمانوں کی جماعت نے استعمال فرمایا۔ اگر چہ لغت میں وہ جائز بھی ہو۔ اس باب میں یہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے "الکتاب الاسنٰی فی شرح اسماء الله الحسنٰی" میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ (توبہ: 117) (یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر) اور فرمایا وَ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (الشوریٰ: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی) اللہ تعالیٰ کو تواب کہا گیا ہے فعل کے مبالغہ کے لئے اور جو کثرت سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے کثرت سے اس کی توبہ قبول کرنے کی وجہ سے۔

مسئلہ نمبر 7: کسی کو توبہ تخلیق کرنے کی قدرت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اعمال کی تخلیق میں منفرد ہے جب کہ معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ اسی طرح کسی کے لئے مجرم کی توبہ قبول کرنا اور اسے معاف کرنا جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہود و نصاریٰ نے دین میں اس اصل کا انکار کیا۔ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر) انہوں نے مجرم، گنہگار کے لئے یہ اصول بنایا کہ وہ کسی عالم یا راہب کے پاس جائے اور اسے کوئی چیز (نذرانہ) دے دے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ۝ (انعام) (بہتان باندھ کر اللہ پر بے شک وہ گمراہ ہو

گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے)۔

مسئلہ نمبر 8: ابن کثیر نے فتلقی آدم من ربه کلماتٌ پڑھا ہے باقی قراء نے آدم کے رفع اور کلمات کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے(1) دونوں قرائتیں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتی ہیں کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کلمات کو پایا تو کلمات انہیں مل گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم علیہ السلام کو ملنے والے تھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم نے وہ کلمات قبول کئے اور ان کے ساتھ دعا کی تو یہ کلمات ہی فاعل ہیں۔ گویا اصل اس قراءت پر ہے فتلقت آدمَ من ربه کلماتٌ۔ لیکن جب مؤنث اور اس کے فعل کے درمیان بعد اور دوری پائی گئی تو علامت تانیث کو حذف کرنا اچھا ہوا۔ یہ اصل ہے جو قرآن اور کلام میں جاری ہوتی ہے جب مؤنث کا فعل بغیر علامت تانیث کے ہو۔ اسی سے عربوں کا قول ہے۔ حضر القاضی الیوم امرأةٌ۔ عورت آج قاضی کے پاس حاضر ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات کی تانیث جب حقیقی نہ تھی تو اسے الکلم کے معنی پر محمول کیا گیا۔ پس صیغہ مذکر ذکر کیا گیا۔ اعمش نے ادمَ مِن ربه کو مدغم کر کے پڑھا ہے۔ ابونوفل بن ابی عقرب نے (أنه) ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے لانه کے معنی کی بناپر۔ باقی قراء نے نئی کلام کی بناپر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو، عیسیٰ اور طلحہ نے ھا کو ھا میں ادغام کیا ہے۔ یہ ابوحاتم نے ابوعمرو وغیرہ سے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جائز نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان لفظاً واؤ ہے خطاً نہیں۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے اس واؤ کو حذف کرنا جائز قرار دیا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا ہے:

له زجل كأنه صوت حاد　　　اذا طلب الوسيقة او زمير

اس کیلئے مترنم آواز تھی گویا وہ کسی حدی خوان کی آواز ہے۔ جب اس نے اپنی مادہ کو طلب کیا یا اس کی آواز میں مزمار ہے۔

پس اس صورت میں ادغام جائز ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور تواب خبر ہے پھر پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو ھاء کی تاکید ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ھوفاصلہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا گیا تو زمین میں خشکی پر گدھ کے علاوہ کچھ نہ تھا اور دریا میں مچھلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ گدھ مچھلی کے پاس پناہ لیتی اور رات گزارتی۔ جب گدھ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: اے مچھلی آج زمین کی طرف ایک چیز اتاری گئی ہے جو ٹانگوں پر چلتی ہے اور ہاتھوں سے پکڑتی ہے۔ مچھلی نے کہا: اگر تو سچی ہے تو پھر میرے لئے دریا میں نجات کی جگہ نہیں اور تیرے لئے خشکی میں اس سے خلاصی کی جگہ نہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

''ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **قُلْنَا اهْبِطُوْا** تغلیظ وتاکید کے لئے امر کا تکرار فرمایا جیسے تو کسی کو کہتا ہے: اٹھ اٹھ (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: امر کو مکرر فرمایا کیونکہ ہر امر سے نیا حکم معلق تھا جو دوسرے امر کے حکم سے مختلف تھا، پہلے امر کے ساتھ عداوت معلق تھی دوسرے کے ساتھ ہدایت کا لانا۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا اترنا جنت سے آسمان کی طرف تھا دوسرا اترنا آسمان سے زمین کی طرف تھا، اس قول پر یہ دلیل ہوگی کہ جنت ساتویں آسمان میں ہے جیسے کہ حدیث اسراء اس پر دلالت کرتی ہے (2) نہ جیسا کہ آگے آئے گا۔

جَمِيْعًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حضرت وہب بن منبہ نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام زمین کی طرف اترے تو ابلیس نے درندوں سے کہا: یہ تمہارا دشمن ہے اسے ہلاک کر دو۔ وہ سب جمع ہوئے اور انہوں نے یہ کام کتے کے سپرد کیا۔ انہوں نے کتے سے کہا: تو ہم میں سے زیادہ بہادر ہے، درندوں نے کتے کو سردار بنادیا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کتے کو دیکھا تو متحیر ہوئے۔ جبریل امین حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اپنا ہاتھ کتے کے سر پر پھیرو۔ حضرت آدم نے ایسا ہی کیا۔ جب درندوں نے دیکھا کہ کتا تو آدم سے مانوس ہو گیا ہے تو درندے بھاگ گئے۔ کتے نے حضرت آدم علیہ السلام سے امان مانگی تو حضرت آدم نے اسے امان دے دی، پس وہ اور اس کی اولاد حضرت آدم کے ساتھ باقی رہی۔ حکیم ترمذی نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین کی طرف اتارے گئے تو ابلیس درندوں کے پاس آیا، انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے کے لئے ابھارا، ان میں سے سخت ترین کتا تھا۔ پس اس کا دل مردہ کر دیا گیا۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا کہ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مطمئن ہو گیا اور حضرت آدم سے الفت کرنے لگا۔ پس کتا حضرت آدم کی رکھوالی کرنے والوں میں سے ہو گیا۔ وہ حضرت آدم کی اور آپ کی اولاد کی حفاظت کرنے والا بن گیا اور انسانوں سے الفت کرنے والا ہو گیا، اس کے دل کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے یہ انسان سے ڈرتا ہے، اگر اسے روڑا مارا جائے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے پھر ان سے محبت کی وجہ سے لوٹ آتا ہے۔ کتے میں کچھ ابلیس کا اثر ہے اور کچھ حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کا اثر ہے۔ ابلیس کے اثر کی وجہ سے یہ بھونکتا ہے اور آدمی پر حملہ کرتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کی وجہ سے اس کا دل مردہ ہو گیا حتیٰ کہ یہ تابعدار ہو گیا اور حضرت آدم اور حضرت آدم کی اولاد سے محبت کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ دل کے مردہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برے علماء کو کتے سے تشبیہ دی ہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت آدم علیہ السلام پر وہ ڈنڈا اتارا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے معجزہ بنایا تھا، اس ڈنڈے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام درندوں کو اپنے سے دور کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى**، ھُدًی کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملئکۃ، حدیث 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کتاب اللہ ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ہدایت کی توفیق ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الھدیٰ سے مراد رسل ہیں جو فرشتوں میں سے حضرت آدم کی طرف آئے اور بشروں میں سے حضرت آدم کی اولاد کی طرف آئے (1)۔ جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں آیا ہے۔ آجری نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

مِّنِّيْ کے قول میں اشارہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، جبکہ قدریہ وغیرہ کا قول اس سے مختلف ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

جحدری نے هُدَيَّ پڑھا ہے یہ ھذیل کی لغت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ھدیّ، عصیّ، محییّ۔ نحویوں نے ابوذویب کا شعر نقل کیا ہے جو وہ اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے:

سبقوا هوىّ واعنقوا لهواهم　　فَتُخُرِّموا ولكل جنب مصرع (2)

وہ میری خواہش سے سبقت لے گئے گویا انہوں نے موت کی خواہش کی۔ پس وہ ایک ایک کر کے پکڑے گئے، ہر پہلو کے لئے گرنا ہے۔

نحاس نے کہا: خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس لغت کی علت یہ ہے کہ اضافت کی یا کا ماقبل کسرہ ہونا چاہئے تھا جب وہ نہ تھی کیونکہ الف کو حرکت نہیں دی جاتی تو الف کو یا سے بدل دیا گیا پھر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا۔

(اما) اس میں ما زائدہ ہے، اِنْ شرط کے لئے ہے، اور جواب شرط فا شرط ثانی کے ساتھ ہے۔ جو ''فَمَنْ تَبِعَ'' میں ہے۔ من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تَبِعَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ **فَلَا خَوْفٌ**، اس دوسری شرط کا جواب ہے، سیبویہ نے کہا دوسری شرط اور اس کا جواب دونوں پہلی شرط کا جواب ہیں، کسائی نے کہا: **فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ**۔ دونوں شرطوں کا اکٹھا جواب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ**۞، **خَوْفٌ** سے مراد پریشانی، گھبراہٹ ہے اور یہ مستقبل کے امر پر ہوتی ہے۔ خافنی فلانٌ فخفتہٗ۔ فلاں نے مجھے ڈرایا تو میں اس سے انتہائی خوف زدہ ہو گیا۔ التخوف کا معنی کمی ہونا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ** (النحل: 47) حضرات زہری، حسن، عیسیٰ بن عمر، ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے (فلا خوفَ) فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور نحویوں کے نزدیک پسندیدہ رفع اور تنوین ہے۔ مبتدا ہونے کے اعتبار سے۔ کیونکہ دوسرا اسم معرفہ ہے اور اس میں صرف رفع ہی ہوتا ہے کیونکہ لا معرفہ میں عمل نہیں کرتا۔ پس انہوں نے پہلے اسم میں ہی رفع کو اختیار کیا ہے تاکہ کلام ایک جیسی ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لا خوف میں لا معنی لیس ہو۔

الحُزن اور الحَزن۔ یہ سرور کی ضد ہیں۔ یہ ماضی کے کسی امر پر ہوتا ہے۔ حزِن الرجل فھو حزِن و حزین، احزنہٗ غیرہ و حزنہ۔ جیسے اسلکہ و سلکہ۔ (یعنی حزن لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اس کا مجہول محزونٌ آتا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنہ یہ قریش کی لغت ہے۔ احزنہ یہ تمیم کی لغت ہے۔ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے احتزن اور تحزن کا ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 132　　3۔ ایضاً

معنی ہے: غمگین ہوتا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان پر آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے اور دنیا میں جو فوت ہوا اس پر وہ غمگین نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اطاعت شعاروں پر قیامت کے خوف کی نفی کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قیامت کی تکلیفوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بیان فرمایا ہے لیکن اطاعت شعاروں سے وہ تکلیفیں اللہ تعالیٰ کم کر دے گا جب وہ اللہ کی رحمت کی طرف چلے گئے تو گویا انہیں خوف ہے ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی جنہوں نے شرک کیا، کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ صحبت کا مطلب ہوتا ہے ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں کسی چیز سے ملا ہوا ہونا، اگر ملازمت اور اختلاط ہو تو یہ کمال صحبت ہے۔ اسی طرح یہ دوزخیوں کی دوزخ سے صحبت ہے، اس قول کی وجہ سے صحابہ کا نام رکھنے میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مراتب مختلف ہیں (1)۔ مزید تفصیل ہم ان شاء اللہ سورۂ برأت میں بیان کریں گے۔ اس آیت کے باقی الفاظ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرا کرو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ یہ ندا مضاف ہے اس میں نصب کی علامت یاء ہے۔ اضافت کی وجہ سے اس سے نون حذف کیا گیا ہے۔ بنین کا واحد ابن ہے اس میں اصل بَنَی ہے بعض نے فرمایا: بَنَوٌ ہے۔ جنہوں نے فرمایا: اس میں واو حذف کی گئی ہے انہوں نے بنوۃ سے حجت پکڑی ہے، اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: الفتوۃ میں اصل یاء ہے۔ زجاج نے کہا: میرے نزدیک یاء حذف ہے گویا یہ بنیت سے مشتق ہے۔ اخفش نے اس سے واو کے حذف کو پسند کیا ہے کیونکہ واو کے ثقل کی وجہ سے واو کا حذف اکثر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ابن بیّنُ، البنوۃ۔ اور تصغیر بنی فراء نے کہا: یا بُنِیِّ یا بُنَیَّ دونوں لغتیں ہیں جیسے یا ابتِ و یا ابتَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ البناء سے مشتق ہے۔ یہ کسی شے کو دوسری شے پر رکھنا ہے۔ الابن یہ باپ کی فرع ہے اس پر اس کو رکھا گیا ہے۔

اِسْرَآءِيْلَ سے مراد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام ہے۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: حضرت یعقوب کے علاوہ انبیائے کرام میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے دو نام ہوں مگر ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے بہت سے نام ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''فہوم الآثار'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں کہتا ہوں: کہا گیا ہے کہ المسیح عیسیٰ علیہ السلام کا علم ہے غیر مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام روح اور کلمہ رکھا ہے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابیل الأبیلین کہتے تھے۔ یہ جوہری نے ''الصحاح'' میں ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں خلیل بن احمد سے روایت کیا ہے کہ پانچ انبیائے کرام دو دو ناموں والے تھے۔ محمد اور احمد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ اور مسیح، اسرائیل اور یعقوب، یونس اور ذوالنون، الیاس اور ذوالکفل صلی اللہ علیہم وسلم۔ میں کہتا ہوں: ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام تھے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسماء تھے۔ ان کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ اِسْرَآءِیْلَ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے، اس میں سات لغات ہیں۔ اسرائیل یہ قرآن کی لغت ہے اور اسرائیل مدہ مہموزہ مختلسہ کے ساتھ، یہ شنبوذ نے ورش سے حکایت کیا ہے۔ اسراییل بغیر ہمزہ کے یاء کے مد کے ساتھ، یہ اعمش اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ حسن اور زہری نے بغیر ہمزہ اور مد کے پڑھا ہے۔ اسرئل بغیر یاء کے اور ہمزہ مکسورہ کے ساتھ، اسرأل ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ...... تمیم کہتے ہیں: اسرائین یعنی نون کے ساتھ۔ اسرائیل کا معنی ہے: عبداللہ۔ حضرت ابن عباس نے کہا: عبرانی زبان میں اسرا سے مراد بندہ ہے اور أیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا سے مراد اللہ کا چنا ہوا ہے اور إیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا کا معنی سخت ہونا ہے گویا اسرائیل وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سخت بنایا اور اس کی تخلیق کو پختہ کیا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہیلی نے کہا: اسرائیل اس لئے کہا گیا کہ انہیں ایک رات میں سیر کرائی گئی جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ پس ان کا نام اسرائیل رکھا گیا یعنی اس نے اللہ کی طرف سیر کی۔ پس اسم کا بعض عبرانی ہے اور بعض عرب کے موافق ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، ذکر اسم مشترک ہے ذکر بالقلب (دل کا ذکر) یہ بھولنے کی ضد ہے۔ الذکر باللسان یہ خاموش رہنے کی ضد ہے۔ ذکرت الشیء بلسانی و قلبی ذکرا۔ میں نے زبان اور دل سے اس کا ذکر کیا۔ واجعلہ منك علی ذُکرٍ (بضم ذال) یعنی اس کو مت بھول۔ کسائی نے کہا: جو ذکر دل سے ہو وہ ذال کے ضمہ کے ساتھ ہوتا ہے اور جو زبان کے ساتھ ہو وہ ذال مکسور کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذِکر اور ذُکر ہم معنی ہیں اور الذکر (بفتحہ ذال) مؤنث کا متضاد...... الذِکر کا معنی شرف بھی ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف: 44)

ابن انباری نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ میری نعمت کے شکر کو یاد کرو۔ نعمت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے شکر کو حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں ذکر بالقلب مراد ہے اور وہی مطلوب ہے، یعنی میری اس نعمت سے غافل نہ ہو جاؤ جو میں نے تم پر کی اور اسے بھول نہ جاؤ، یہ عمدہ قول ہے۔ النعمۃ یہاں اسم جنس ہے یہ مفرد ہے اور جمع کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) یہاں بھی نعمۃ سے مراد نعمتیں ہیں۔ اللہ کی نعمتوں میں سے جو اس نے بنی اسرائیل پر فرمائیں یہ ہیں: فرعونیوں سے نجات بخشی، ان سے انبیاء بنائے، ان پر کتب اور من وسلویٰ نازل فرمایا، پتھر سے پانی نکالا، انہیں تورات عطا فرمائی جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت، نعت اور رسالت کا ذکر تھا، والدین

پر جو نعمتیں ہوں وہ اولاد پر بھی ہوتی ہے کیونکہ اولاد والدین کے شرف سے مشرف ہوتی ہے۔

نوٹ: ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نعمت کے ذکر کے ساتھ تعلق قائم فرمایا ہے، جبکہ حضرت محمد ﷺ کی امت سے نعمت کے ذکر کو ساقط کر دیا اور اپنے ذکر کی طرف انہیں بلایا ہے۔ فرمایا: فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ:152) تا کہ دوسری امتوں کی نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور حضرت محمد ﷺ کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ زہری نے تکثیر کے لئے اوف واو کے فتحہ اور فاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس عہد سے مراد یہ ہے: خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (اعراف:171)

اور ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (المائدہ:12) اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران:187)

الزجاج نے کہا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ جو میں نے تم سے تورات میں حضرت محمد ﷺ کی اتباع کا عہد لیا ہے اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ جو میں نے تمہیں اس پر ضمانت دی ہے وہ میں پوری کروں گا۔ اگر تم اس عہد کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ یعنی سنت اور اخلاص کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں اپنا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہیں رعایات کی منازل تک پہنچاؤں گا۔ بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ ظاہری آداب کی حفاظت میں میرا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہارے باطن کی تزئین کا عہد پورا کروں گا۔ بعض نے فرمایا: یہ حکم تمام اوامر، نواہی اور وصایا کو شامل ہے اس میں محمد ﷺ کا ذکر بھی داخل ہے جو تورات وغیرہ میں ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عہد یہ ہے کہ وہ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

میں کہتا ہوں: جو وفاء عہد ان سے طلب کیا گیا ہے وہ ہم سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ:1) وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ (النحل:91) کثرت سے اس قسم کے ارشاد ہمارے لئے بھی ذکر ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنا، ان کے لئے اللہ کی طرف سے وفا کی علامت ہے، اس کے لئے علت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ان پر فضل اور مہربانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ، الرُّهب، الرَّهب اور الرهبة ان سب کا معنی خوف ہے۔ یہ امر اپنے ضمن میں تہدید کا معنی رکھتا ہے نون کے بعد یا ساقط ہو گئی ہے کیونکہ یہ آیت کا سر ہے(1)۔ ابن ابی اسحاق نے فارھبونی (یاء کے ساتھ) پڑھا ہے اسی طرح فاتقونی اصل پر پڑھا ہے۔ ایای فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسی طرح امر، نہی اور استفہام میں اختیار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و ایای ارھبوا فارھبون۔ اور کلام میں وانا فارھبون بھی مبتدا اور خبر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کے اعتبار سے جائز ہے۔ فَارْهَبُوْنِ حذف کی تقدیر پر خبر ہوگی۔ معنی یہ ہوگا: وانا ربکم فارھبون۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل کی ہے میں نے۔ یہ سچا ثابت کرنے والی ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت اور صرف مجھی سے ڈرا کرو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ یعنی قرآن کی تصدیق کرو۔ مُصَدِّقًا یہ اَنْزَلْتُ کی ضمیر سے حال ہے(1)۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: بما انزلته مصدقا۔ اس میں عامل انزلت ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما۔ سے حال ہو اور اس میں عامل اٰمِنُوْا ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: آمنوا بالقرآن مصدقا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما مصدریہ ہو۔ تقدیر عبارت آمنوا بانزال۔ لما معکم، یعنی تورات میں سے جو تمہارے پاس ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ۔ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد ﷺ ہیں۔ یہ ابو العالیہ نے کہا ہے اور ابن جریج نے کہا: اس کا مرجع قرآن ہے کیونکہ بما انزلت کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع تورات ہے کیونکہ لِمَا مَعَكُمْ کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے(2)۔

اگر کہا جائے کہ كَافِرٍ کیسے فرمایا کافرین نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ فَرِيْقٍ كَافِرٍ بِهٖ (3)۔ اخفش اور فراء نے کہا: یہ فعل کے معنی پر محمول ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: اَوَّلُ مَنْ كَفَرَ بِهٖ۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: هُوَ اَظْرَفُ الْفِتْيَانِ وَاَجْمَلُهٗ۔ ظاہر کلام هُوَ اَظْرَفُ فَتًى وَاَجْمَلُهٗ تھا۔ فرمایا: اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ حالانکہ ان سے پہلے کفار قریش نے اس کا انکار کیا تھا۔ اس کا معنی ہے: اہل کتاب میں سے پہلے تم کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ، کیونکہ ایسی مثال میں ان کی طرف نظر کی جاتی ہے کیونکہ وہ حجت تھے ان کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اَوَّلَ کو نصب کان کی خبر کے اعتبار سے ہے۔ یہ ان کلمات سے ہے جن کا فعل نہیں بولا جاتا یہ افعل کے وزن پر ہے اس کا عین اور فاء کلمہ واؤ ہے، اس سے فعل نہیں بولا جاتا تاکہ دونوں جہتوں (عین اور فا) سے تعلیل نہ ہو۔ یہ بصریوں کا مذہب ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہ واٰل سے مشتق ہے جس کا معنی ہے نجات پانا۔ اصل میں اَوْ أَل تھا۔ پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور واؤ سے بدل دیا گیا اور پھر ادغام کیا گیا۔ اور اَوَّلَ کہا گیا جس طرح خطیئة کے ہمزہ کی تخفیف کی جاتی ہے۔ جوہری نے کہا: اس کی جمع الاوائل والاوالی قلب کی صورت میں بھی آتی ہے۔ بعض نے کہا: اصل میں یہ ووّل فوعل کے وزن پر تھا پہلی واؤ ہمزہ سے بدل گئی اور اس کی جمع اداول نہیں بنائی جاتی کیونکہ دو واؤ کا جمع کرنا جن کے درمیان الف جمع ہو ثقیل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آل یؤول سے افعل کے وزن پر ہے اس کی اصل أاول تھا، اس میں قلب کیا گیا اعفل، افعل سے مقلوب ہو کر آیا ہے، پھر تسہیل کی گئی بدل کر ادغام کیا گیا(4)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

مسئلہ: اس آیت میں ان علماء کے لئے کوئی حجت نہیں ہے جو دلیل خطاب کے ساتھ قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوفی اور ان کے موافقت کرنے والے علماء ہیں کیونکہ کلام سے مقصود اول و آخر کفر سے نہی ہے۔ اول کو ذکر کے ساتھ خاص کیا کیونکہ اس میں تقدم زیادہ شدید ہے۔ پس مذکور اور مسکوت عنہ کا حکم ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا یہ وَلَا تَكُوْنُوْٓا پر معطوف ہے اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر قیمت نہ لو یعنی حضرت محمد ﷺ کی صفات میں تبدیلی پر رشوت نہ لو۔ یہود کے علماء ایسا کرتے تھے اس لئے انہیں اس سے منع کیا گیا۔ یہ بعض مفسرین کا قول ہے ان میں سے حسن وغیرہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہودی علماء اپنے علم پر کھانا لیتے تھے جیسے وظیفہ اور تنخواہ ہوتی ہے۔ پس انہیں اس سے منع کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے علماء لوگوں کو دین اجرت پر سکھاتے تھے اس سے انہیں منع کیا گیا، ان کی کتابوں میں ہے اے ابن آدم! علم سکھاؤ جس طرح تجھے مفت علم سکھایا گیا۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم میرے اوامر و نواہی اور آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت نہ لو یعنی دنیا اور اس کی مدت۔ اور وہ زندگی جو تھوڑی ہو اس کا کوئی مرتبہ نہیں (1)۔ جو وہ عوض لیتے تھے اسے ثمنا (قیمت) کہا گیا کیونکہ انہوں نے اس کو عوض بنایا تھا جو چیز عوض ہو اس پر ثمن کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں ثمن نہ بھی ہو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ شاعر نے کہا:

ان كنت حاولت ذنبا او ظفرت به　　فما اصبت بترك الحج من ثمن

"اگر تو گناہ کا ارادہ کرے یا گناہ کر لے تو حج کے ترک کے عوض تو نے کوئی ثمن نہیں پائی"۔

میں کہتا ہوں یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے لیکن یہ اس کو بھی شامل ہے جو ان جیسا فعل کرے گا۔ پس جو حق میں تبدیلی یا اس کو باطل کرنے پر رشوت لے گا یا واجبی تعلیم کے دینے سے انکار کرے گا یا جو اس نے سیکھا اس کی ادائیگی سے رکے گا حالانکہ اس کا سکھانا اس پر متعین ہے حتیٰ کہ وہ اس پر اجرت لے تو وہ اس آیت کے مقتضیٰ میں داخل ہے۔ واللہ اعلم

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے کہ اس کے عوض دنیا کا مال حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا (2)۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن اور علم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ زہری اور اصحاب الرائے (احناف) نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں: قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ تعلیم قرآن ان واجبات میں سے ایک واجب ہے جن میں تقرب کی نیت اور اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس نماز، روزے کی طرح تعلیم قرآن پر بھی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 159، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالیٰ، حدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اجرت نہیں لی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اور نہ خرید و میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت) حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: معلموا صبیانکم شرارکم اقلهم رحمة بالیتیم واغلظهم علی المسکین تمہارے بچوں کے اساتذہ تمہارے برے لوگ ہیں جو یتیم پر رحمت کم کرتے ہیں اور مسکین پر سختی زیادہ کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ معلمین کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کا درہم حرام ہے، ان کا کپڑا سُحت (حرام) ہے اور ان کا کلام ریا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اہل صفہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور کتابت سکھائی۔ ان میں ایک شخص نے مجھے ایک کمان دی۔ میں نے کہا: یہ مال نہیں ہے میں اس کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تجھے پسند ہے کہ تجھے اس کے بدلے آگ کا طوق پہنایا جائے تو پھر یہ قبول کر لے(1)۔

امام مالک، امام شافعی، احمد، ابوثور اور اکثر علماء نے قرآن کی تعلیم پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ...... حدیث الرقیہ (دم والی حدیث) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب اللہ(2)۔ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ حقدار کتاب اللہ ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے، یہ نص ہے اختلاف کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اس پر ہی اعتماد کرنا چاہئے۔ رہا مخالف کا نماز اور روزے پر قیاس تو یہ فاسد ہے کیونکہ یہ قیاس نص کے مقابل ہے۔ پھر ان کے درمیان فرق بھی ہے وہ یہ کہ نماز اور روزہ فاعل کے ساتھ مختص عبادات ہیں اور تعلیم القرآن معلم کے علاوہ کے لئے متعدی عبادت ہے۔ پس اس کو نقل کرنے کے ارادہ پر اجرت جائز ہے جیسے قرآن کی کتابت کی تعلیم پر اجرت جائز ہے۔

ابن منذر نے کہا: امام ابو حنیفہ اجرت کے ساتھ قرآن کی تعلیم کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے کہ وہ اسے تختی یا شعر یا معلوم گانا معلوم اجرت پر لکھ دے گا۔ جو چیز معصیت ہے اس میں اجارہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور جو چیز طاعت ہے اس میں اجارہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔ آیت کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد بنو اسرائیل ہیں اور شرع من قبلنا هل هو شرع لنا (جو ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت تھی کیا وہ ہمارے لئے شریعت ہے) کے اصول میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی یہ نہیں کہتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ اس شخص کے متعلق ہے جس پر تعلیم دینا متعین ہو پھر وہ انکار کرے حتیٰ کہ اس پر اجرت لے لے...... مگر جب متعین نہ ہو تو سنت کی دلیل کے ساتھ اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ کبھی اس شخص پر تعلیم دینا متعین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو وہ اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے تو اس پر تعلیم دینا واجب نہیں ہوتا

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 157، (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن، حدیث 2147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطب، باب الشرط فی الرقیة بقطیع من الغنم، حدیث 5296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کے لئے اپنی صنعت اور اپنے ہنر پر مال قبول کرنا جائز ہے۔ امام وقت پر واجب ہے کہ دین کی اقامت کے لئے اس کی مدد کرے ورنہ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ اس کی مدد کریں کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلافت کے والی بنے اور خلافت کے لئے آپ کو متعین کیا گیا تو آپ کے پاس اتنا مال نہ تھا جو آپ کے گھر والوں کی کفایت کرتا۔ آپ نے کپڑے اٹھائے اور بازار کی طرف نکلے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: میں اپنے عیال پر کہاں سے خرچ کروں، تو صحابہ کرام نے آپ کو واپس لوٹا دیا اور آپ کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کیا۔

رہیں وہ احادیث جو انہوں نے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو قابل حجت ہو۔ ان میں کوئی حدیث نقل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث وہ سعید بن طریف نے حضرت عکرمہ سے اور حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور سعید متروک راوی ہے اور حضرت ابوہریرہ کی حدیث علی بن عاصم نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ابوجرہم سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے، ابوجرہم مجہول غیر معروف راوی ہے۔ حماد بن سلمہ نے کسی ایسے راوی سے روایت نہیں کیا جس کو ابوجرہم کہا جاتا ہو انہوں نے ابوالمہزم سے روایت کیا ہے اور وہ بھی متروک الحدیث ہے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔ رہی حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جو ابوداؤد نے مغیرہ بن زیاد موصلی سے انہوں نے عبادہ بن نسی سے انہوں نے اسود بن ثعلبہ سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے مغیرہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے لیکن اس کی بہت سی مناکیر احادیث ہیں یہ ان میں سے ایک منکر حدیث ہے۔ یہ ابوعمر نے کہا ہے، پھر فرمایا: رہی قوس (کمان) والی حدیث یہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے کیونکہ یہ حضرت عبادہ سے دو سندوں سے روایت کی گئی ہے اور حضرت ابی بن کعب سے موسیٰ بن علی عن ابیہ عن ابی کے سلسلہ سے مروی ہے لیکن وہ منقطع ہے۔ اس بارے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے نقل کی جہت سے جس پر عمل واجب ہو اور حضرت عبادہ اور حضرت ابی کی حدیث تاویل کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ پہلے انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے تعلیم دی ہو پھر اس پر اجر لیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں میں سے بہتر اور جو زمین کی سطح پر چل رہے ہیں ان میں سے بہتر اساتذہ ہیں جب بھی دین بوسیدہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے جلا بخشی تم انہیں اجرت پر نہ لو کہ تم انہیں تنگ کرو کیونکہ معلم جب بچے کو کہتا ہے: پڑھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ، بچہ کہتا ہے: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ تو اللہ تعالیٰ اس سے بچے کی برأت، معلم کی برأت اور اس کے والدین کی برأت لکھ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اجرت پر نماز پڑھانے والے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا جسے نماز پڑھانے کے لئے رمضان میں اجرت پر لیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہ ہوگی۔ فرضوں میں اس کے لئے سخت کراہت ہے۔

امام شافعی اور آپ کے اصحاب، ابوثور نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کے پیچھے نماز میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اس کی نماز ہی نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے اس کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا

ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ مسئلہ سابقہ مسئلہ سے معلق ہے اور ان دونوں کی اصل ایک ہے۔
میں کہتا ہوں: سورۂ برأت میں اس کی ایک اور اصل آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن قاسم نے شعر اور نحو کی تعلیم پر اجرت لی۔ ابن حبیب نے کہا: شعر، رسائل، تاریخ عرب کی تعلیم پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اشعار جن میں شراب، غنا، ہجو کا ذکر ہو وہ مکروہ ہیں۔ ابوالحسن لخمی نے کہا: اس قول پر کتب پر اجرت لینا اور کتب کو بیچنے کا جواز لازم آتا ہے، لیکن غنا اور نوحہ ہر حال میں ممنوع ہے۔

مسئلہ نمبر 4: دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں یعقوب بن ابراہیم نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن عمر بن کمیت نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں علی بن وہب الہمدانی نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ضحاک بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: سلیمان بن عبدالملک مدینہ طیبہ سے گزر رہا تھا وہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ میں کچھ دن ٹھہرا۔ اس سے پوچھا گیا: مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی سے ملاقات کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ابو حازم ہے۔ سلیمان نے ابو حازم کو بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا: اے ابو حازم! یہ جفا کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تو نے کون سی جفا مجھ سے دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا: تمام اہل مدینہ میرے پاس آئے اور تو میرے پاس نہ آیا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تو وہ کہے جو ہوا نہیں ہے، میں نے اس دن سے پہلے نہ تجھے پہچانا ہے اور نہ میں نے تجھے دیکھا ہے۔ سلیمان، محمد بن شہاب زہری کی طرف متوجہ ہوا تو زہری نے کہا: شیخ نے صحیح کہا ہے اور تو نے غلطی کی ہے۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا: کیونکہ تم نے اپنی آخرت کو خراب کر دیا ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے۔ پس تم آبادی سے خرابی کی طرف منتقل ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! تو نے صحیح کہا، کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کیسے آئیں گے؟ ابو حازم نے کہا: جو نیکوکار ہے وہ اس غائب شخص کی طرح آئے گا جو اپنے گھر والوں کے پاس آیا ہے اور جو بدکار ہے وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح آئے گا جو اپنے آقا کے پاس آتا ہے۔ سلیمان رونے لگا اور کہا: کاش! میرا شعور کام کرتا۔ ہمارے لئے اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اپنے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش کرو۔ سلیمان نے پوچھا: میں کون سا مکان پاؤں گا؟ ابو حازم نے کہا: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (انفطار) (بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے) سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ ابو حازم نے کہا: رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اعراف) (اللہ کی رحمت قریب ہے محسنین کے)۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ کے کون سے بندے معزز ہیں؟ ابو حازم نے کہا: صاحب مروت اور صاحب عقل۔ سلیمان نے کہا: کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابو حازم نے کہا: محارم سے اجتناب کے ساتھ فرائض کا ادا کرنا۔ سلیمان نے کہا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ ابو حازم نے کہا: جو شخص اپنے محسن کے لئے کرتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابو حازم نے کہا: مسکین سائل کے لئے اور کم مال والے محنتی کے لئے جس میں احسان اور اذیت نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: کون سا قول زیادہ بہتر ہے؟ ابو حازم نے

کہا: اس کے سامنے حق کا کلمہ کہنا جس سے تو ڈرتا ہے یا جس سے تو امید رکھتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا مومن عقلمند ہے؟ ابوحازم نے کہا: وہ جو اللہ کی طاعت کا عمل کرے اور طاعت پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ کون سا مومن احمق ہے؟ ابوحازم نے کہا: وہ جو اپنے بھائی کی خواہش میں گر گیا حالانکہ وہ ظالم تھا، اس نے اپنی آخرت کو غیر کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالا۔ سلیمان نے اس سے کہا: تو نے صحیح کہا۔ ہم جس حالت میں ہیں اس کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟ ابوحازم نے کہا: اے امیر المومنین! کیا تو مجھے معاف کر دے گا؟ سلیمان نے کہا: نہیں لیکن یہ تو نصیحت ہے جو تو مجھے پہنچائے گا۔ ابوحازم نے کہا: اے امیر المومنین! تیرے آباء نے تلوار کے ساتھ لوگوں پر جبر کیا اور مسلمانوں کی رضا اور مشورہ کے بغیر یہ ملک انہوں نے سختی سے حاصل کیا حتیٰ کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش! تجھے شعور ہوتا جو انہوں نے کہا اور جو ان کے بارے میں کہا گیا۔ بادشاہ سلیمان کے ایک حواری نے کہا: اے ابوحازم! تو نے بہت بری بات کی۔ ابوحازم نے کہا: تو نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حقائق بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔ سلیمان نے کہا: ہم کیسے اصلاح کریں؟ ابوحازم نے کہا: ڈینگیں مارنا چھوڑو، مروت کو پکڑو اور برابر تقسیم کرو۔ سلیمان نے پوچھا: ہم ٹیکس کیسے لیں؟ ابوحازم نے کہا: جس سے لینا جائز ہے اس سے وصول کرو اور جو حقدار ہے اسے پہنچاؤ۔ سلیمان نے کہا: اے ابوحازم! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہے تو ہم سے فائدہ اٹھائے، ہم تجھ سے فائدہ اٹھائیں؟ ابوحازم نے کہا: اعوذ باللہ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں) سلیمان نے پوچھا: ایسا کیوں؟ ابوحازم نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہاری طرف کسی تھوڑی سی چیز کو جھکا دوں اور اللہ تعالیٰ مجھے دنیا و آخرت کا دوہرا عذاب دے۔ سلیمان نے کہا: اپنی ضروریات ہمیں پیش کرو۔ ابوحازم نے کہا: تو مجھے آگ سے بچا لے اور مجھے جنت میں داخل کر دے۔ سلیمان نے کہا: یہ تو میری قدرت میں نہیں۔ ابوحازم نے اسے کہا: مجھے تجھ سے اور تو کوئی حاجت نہیں۔ سلیمان نے کہا: تم میرے لئے دعا کرو۔ ابوازم نے کہا: اے اللہ! اگر سلیمان تیرا ولی ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر آسان فرما دے، اگر تیرا دشمن ہے تو اس کی پیشانی کو پکڑ لے جب تک تو پسند کرے۔ سلیمان نے کہا: یہ کافی ہے۔ ابوحازم نے کہا: میں نے مختصر دعا مانگی ہے اور اگر تو اس دعا کا اہل ہے تو میں نے زیادہ مانگ لیا ہے اور اگر تو اس کا اہل نہیں ہے تو مناسب نہیں کہ میں ایسی کمان سے مارا جاؤں جس کا وتر نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ میں تجھے مختصر سی وصیت کروں گا، تو اپنے رب کی عظمت بیان کر اور اسے دور رکھ کہ تجھے ایسی جگہ دیکھے جہاں سے اس نے تجھے منع کیا ہے یا تجھے مفقود پائے جہاں اس نے تجھے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔

جب ابوحازم باہر نکل گیا تو سلیمان نے اس کی طرف سو دینار بھیجے اور اسے لکھا کہ تو انہیں خرچ کر اور تیرے لئے میرے پاس اس کی مثل بہت سے دینار ہیں۔ راوی فرماتے ہیں: ابوحازم نے وہ دینار واپس کر دیے اور اسے خط لکھا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا مجھ سے سوال کرنا مذاق ہو یا میں تیری عطا کی امید رکھوں، میں ان رقوم کو تیرے لئے پسند نہیں کرتا تو میں اپنے لئے کیسے پسند کروں گا۔

حضرت موسیٰ بن عمران جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے تو اس پانی پر چرواہوں کو اپنے جانوروں کو پانی پلاتے ہوئے پایا

اور ان کے تھوڑا دور دو لڑکیوں کو پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتیں یہاں تک کہ چرواہے واپس چلے جائیں۔ ہمارا باپ بوڑھا آدمی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریوں کو پانی پلایا پھر سائے کی طرف لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اے میرے رب! میں محتاج ہوں اس کا جو تو میری طرف خیر میں سے اتارے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بھوکے بھی تھے اور خوفزدہ بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا لوگوں سے سوال نہ کیا اور نہ آپ نے چرواہوں کو اپنا مسافر ہونا جتایا۔ وہ بچیاں آپ کی کیفیت پہچان گئی تھیں۔ جب وہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں تو سارا واقعہ انہیں عرض کیا اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی وہ بھی بتائی۔ ان بچیوں کے والد، جو حضرت شعیب علیہ السلام تھے انہوں نے کہا: وہ شخص بھوکا تھا۔ حضرت شعیب نے ایک بچی سے کہا: تو جا اور اس شخص کو بلا کر لے آ۔ جب وہ بچی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تو اس نے ان کی عظمت کو دیکھا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: میرے والد صاحب تمہیں بلا رہے ہیں تا کہ آپ کو ہمارے لئے پانی پلانے کا اجر عطا فرمائیں۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی پلانے کے اجر کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہت شاق گزرا، آپ نے اس بچی کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا کیونکہ آپ پہاڑوں کے درمیان بھوکے اور خوفزدہ تھے۔ جب آپ اس کے پیچھے چلے تو ہوا چل پڑی، اس کے کپڑے اس کی پیٹھ کے ساتھ چپک گئے اور اس کا پچھلا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ظاہر ہونے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی نظر اوپر اٹھاتے کبھی جھکا دیتے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آواز دی: اے اللہ کی بندی! میرے پیچھے ہو جا اور اپنی زبان سے میری رہنمائی کر۔ جب حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے نوجوان! بیٹھ اور کھانا کھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے پوچھا: کیوں کیا تو بھوکا نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ میرے پانی پلانے کا عوض نہ ہو جائے۔ میں اہل بیت سے ہوں ہم اپنے دین کو زمین بھر سونے کے عوض نہیں بیچتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں کہا: اے نوجوان! ایسا نہیں لیکن یہ میری اور میرے آباء کی عادت ہے ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔

ابو حازم نے کہا: یہ سو دینار میری گفتگو کا عوض ہیں تو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حالت اضطرار میں حلال ہوتا ہے، اور اگر یہ بیت المال میں حق کی وجہ سے ہے تو اس میں میرے جیسے اور لوگ بھی ہیں۔ اگر تو نے ہمارے درمیان برابری کی ہے تو فبہا ورنہ مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس طرح کتاب اور انبیاء کرام کی اقتدا ہوتی ہے۔ اس امام فاضل عالم کو دیکھو کیسے اس نے اپنے عمل پر عوض نہیں لیا اور نہ ہی اپنی وصیت کا بدل لیا اور نہ اپنی نصیحت پر بخشش لی بلکہ انہوں نے حق کو بیان کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر

1۔ سنن دارمی، باب فی اعظام العلم، صفحہ 125، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ)

بیان کیا۔ اس بارے میں اسے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کسی کی ہیبت حق کہنے یا حق کو قائم کرنے سے نہ روکے جہاں بھی ہو(1)۔ قرآن حکیم میں ہے: يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (المائدہ:54) (جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، فاتقونی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، سہل بن عبداللہ نے کہا: وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ تمہارے بارے میں مجھے ازلی علم ہے اس لئے مجھ سے ڈرو۔ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۞ یہ استدراج اور تدبیر کے مقام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ (اعراف) (ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۞ (الاعراف) (پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) کسی نبی اور صدیق کا استثناء نہیں فرمایا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞

''اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ، اللبس کا معنی خلط ملط ہونا ہے۔ لبست علیه الامر والبسه یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس کی دلیل کو اس کی مشکل کے ساتھ ملا دے اور اس کے حق کو اس کے باطل کے ساتھ ملا دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۞ (الانعام)

وفی الامر لبسۃ، یعنی امر واضح نہیں ہے۔ اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے جو آپ نے حارث بن حوط کو کہا تھا: یاحارث انه ملبوس علیك ان الحق لایعرف بالرجال اعرف الحق تعرف اهله۔ اے حارث! معاملہ تجھ پر خلط ملط ہو گیا ہے حق مردوں کے ساتھ نہیں پہچانا جاتا میں حق کو پہچانتا ہوں تو حق والوں کو پہچانتا ہے۔

خنساء نے کہا تھا:

ترى الجليس يقول الحق تحسبه ... رُشداً و هيهات فانظر ما به التبسا

صدّق مقالته واحذر عداوته ... والبس عليه اموراً مثل مالبسا

تو دوست کو دیکھتا ہے کہ وہ حق کہہ رہا ہے تو اسے ہدایت گمان کرتا ہے دیکھ اس کے ساتھ جو کچھ اس نے ملا دیا۔ اس کی بات کی تصدیق کر اور اس کی عداوت سے محتاط ہو جا اور تو بھی اس پر امور کو ملتبس کر دے جس طرح اس نے التباس کیا۔

عجاج نے کہا

لما لبسن الحق بالتجني ... غنين واستبدلن زيداً مني

سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ یعنی یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ ملتبس نہ

1۔ کنز العمال، حدیث 5567۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف النھی عن المنکر، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا دین وہ ہے جس کے علاوہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اور اس کے بغیر جزا نہیں دیتا وہ دین اسلام ہے، یہودیت ونصرانیت بدعت ہے وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ عنترہ کے قول سے یہ معنی ظاہر ہے:

وکتیبۃ لبستھا بکتیبۃٍ

کتنے لشکر ہیں جن کو میں نے دوسرے لشکروں کے ساتھ ملا دیا۔

یہ اسی مفہوم میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لباس سے ہو۔ آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نہ ڈھانپو۔ اسی سے لبس الثوب ہے، کپڑے کا پہننا۔ کہا جاتا ہے: لَبِستُ الثوبَ اَلْبَسُہ۔ لباس الرجل زوجتہٗ، مرد کا لباس اس کی بیوی ہے اور زوجھا لباسھا۔ اور مرد اپنی بیوی کا لباس ہے۔ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تثنت علیہ فکانت لباسًا

جب سونے والے نے اپنی بیوی کی گردن کو دوہرا کیا تو وہ اس پر لپٹی اور وہ اس کا لباس تھی۔

اخطل نے کہا:

وقد لبست لھذا الامر اعصرہ حتی تجلل راس الشیب فاشتعلا

اس امر کی وجہ سے میں نے اس کا زمانہ ڈھانپ لیا حتیٰ کہ میرے سر میں بڑھاپا ظاہر ہو گیا۔

اللبوس۔ کپڑے اور زرہ میں سے جو پہنا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء:80)

ولا لبست فلاناً حتی عرف باطنہ۔ میں فلاں سے چمٹا رہا حتیٰ کہ میں نے اس کا باطن پہچان لیا۔

وفی فلان ملبسٌ۔ فلاں لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے۔ شاعر نے کہا:

اَلَا اِنَّ بعد العدم للمرء قنوۃ و بعد المشیب طول عمر و ملبسا

خبردار! آدمی کے لئے فقدان کے بعد لباس ہوتا ہے اور بڑھاپے کے بعد لمبی عمر اور لباس ہوتا ہے۔

لِبس الکعبۃ والھودج۔ کعبہ اور ہودج کا کپڑا۔ لباس

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ باطل کلام عرب میں حق کے خلاف کو کہتے ہیں اس کا معنی زائل کرنا ہے۔ لبید نے کہا:

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطلٗ خبردار! ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سوا زوال پذیر ہے۔

بطل الشیء یبطل بُطلًا و بطولًا و بطلانًا۔ چیز ضائع ہو گئی، خسارے میں چلی گئی۔ ابطلہ غیرہ، دوسری چیز نے اسے زائل کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ذھب دمہٗ بطلاً یعنی اس کا خون رائیگاں گیا...... الباطل شیطان کو کہتے ہیں۔ البطل بہادر آدمی۔ اس کو البطل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے کی شجاعت کو زائل کر دیتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

لھم لواء بایدی ماجد بطل لا یقطع الخرق الا طرفہ سامی

ان کا جھنڈا بہادر آدمی کے ہاتھوں میں ہے، وہ پھٹا نہیں ہے مگر اس کی بلند طرف۔

المرأۃ بطلۃٌ۔ عورت بہادر ہے۔ قد بطل الرجل (طا کے ضمہ کے ساتھ) یبطل بطولۃ و بطالۃً۔ یعنی وہ شخص بہادر ہو

گیا۔ بَطَل (بفتحہ طاء) بطالۃً یعنی معطل ہو گیا فھو بطالٌ۔

اہل تاویل کا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے مراد میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے جو تمہارے پاس کتاب میں حق ہے اسے باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یعنی اس سے مراد تغیر و تبدل کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہود نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا ہے لیکن ہماری طرف نہیں ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اقرار کرنا اور ان کی طرف بعثت کا انکار کرنا باطل ہے۔ ابن زید نے فرمایا: الْحَقَّ سے مراد تورات ہے اور باطل سے مراد وہ ہے جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو بدلا۔ مجاہد نے کہا: یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ نہ ملاؤ (1)۔ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس کا قول زیادہ درست ہے، کیونکہ وہ عام ہے اس میں تمام اقوال جمع ہیں۔ واللہ المستعان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ یہ جائز ہے کہ یہ تَلْبِسُوا پر معطوف ہو اور یہ مجزوم ہو، اور اس کا اَنْ کے اضمار کے ساتھ منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: لَا يَكُنْ مِنْكُمْ لُبْسُ الْحَقِّ وَكِتْمَانُهُ یعنی اگر تم حق کو چھپاتے ہو تو تمہاری طرف سے حق کا التباس اور چھپانا نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو چھپانا ہے حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے۔ محمد بن سیرین نے کہا حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ایک جماعت یثرب میں آکر اتری جب بنی اسرائیل کو دشمن کے غلبہ اور ذلت کا سامنا ہوا تھا۔ یہی گروہ اس وقت تورات کا حامل تھا وہ یثرب میں ٹھہر گئے اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کے درمیان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں گے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے، جب وہ بزرگ چلے گئے جو مومنین میں سے تھے پھر ان کی نسل سے لوگ آئے انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور انہوں نے آپ کا انکار کیا حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حال ہے یعنی تم جانتے ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں اور ان کا کفر عناد کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے علم کی گواہی نہیں دی بلکہ انہیں اس سے منع فرمایا کہ جو وہ جانتے ہیں اسے نہ چھپائیں۔ یہ دلیل ہے کہ اسے سخت گناہ ہوتا ہے جو جانتے ہوئے گناہ کرتا ہے وہ جاہل سے زیادہ نافرمان ہوتا ہے۔ مزید بیان اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (البقرہ: 44) کے تحت آئے گا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوۃ اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ امر ہے اور وجوب کے لئے ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اقامۃ الصلوۃ اور اس کے اشتقاق اور اس کے تفصیلی احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یہ امر بھی وجوب کے لئے ہے۔ الایتاء کا مطلب عطا کرنا ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

آتیتہ، کا معنی آعطیتہ میں نے اسے عطا کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ:75) (اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے)۔

آتیتہ۔ قصر کے ساتھ بغیر مد کے ہے اس کا معنی ہے میں اس کے پاس آیا۔ جب اتی استقبال کے معنی میں ہو تو مد کیساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: لاتین رسول اللہ ﷺ فلا خبرنہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور آپ کو یہ بتاؤں گا (1)۔ تفصیل سے یہ حدیث آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 3: زکاۃ یہ زکا الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چیز میں اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے۔ زکا الزرع، والمال یزکو جب کھیتی زیادہ ہو اور مال بڑھ جائے۔ رجل زکی زیادہ خیر والے شخص کا مال نکالنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے ظاہراً مال میں کمی ہوتی ہے لیکن برکت کے ساتھ یا اجر کے ساتھ مال بڑھاتا ہے جس اجر کے ذریعے زکوٰۃ دینے والے کو ثواب دیا جاتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: زرع زاکٍ بیّن الزکاء۔

زکأت الناقۃ بولدھا تزکابہ۔ جب اونٹنی اپنا بچہ اپنی ٹانگوں کے درمیان پھینک دے۔ زکا الفرد جب طاق، جفت بن جائے۔ شاعر نے کہا:

کانوا خسًا او زکًا من دون اربعۃ — لم یخلقوا وجدود الناس تعتلج

وہ طاق تھے یا جفت تھے چار سے کم تھے، انہوں نے پیدا نہیں کیا اور لوگوں کے بخت بلند تھے۔

جدؤ جمع ہے جدّ کی اس کا معنی حصہ اور بخت ہے تعتلج کا معنی بلند ہونا ہے۔

اعتلجت الارض جب زمین کی کھیتی بڑی ہو جائے۔ فخساً سے مراد طاق اور زکاً سے مراد جفت ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ کا معنی اچھی تعریف ہے۔ اسی سے ہے: زکی القاضی الشاھد قاضی نے گواہ کی تعریف کی۔ پس جو زکاۃ نکالتا ہے اسے اچھی تعریف حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ تطہیر کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے زکا فلان یعنی فلاں غافل کرنے اور تنقید کی میل سے پاک ہوا۔ پس گویا مال کی زکاۃ نکالنے والا اپنے آپ کو اس حق کے بوجھ سے پاک کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مال میں مساکین کے لئے رکھا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زکاۃ کے مال کو لوگوں کا میل کہا ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ:103) (اے حبیب وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تا کہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے)۔

مسئلہ نمبر 4: یہاں زکاۃ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکاۃ ہے کیونکہ یہ نماز سے متصل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد صدقہ فطر ہے، یہ امام مالک کا قول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراۃ فی العشاء، صفحہ 187، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، باب من شکی امامہ، حدیث نمبر 664، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: پہلا قول اکثر علماء کا ہے۔ الزَّکٰوۃَ قرآن میں مجمل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بیان فرمایا ہے۔ ائمہ نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دانوں اور کھجوروں میں صدقہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ بخاری نے کہا: خمس اواق من الورق۔ (1) یعنی چاندی میں سے پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس زمین کو آسمان کا پانی یا چشموں کا پانی سیراب کرے یا وہ کھجور کے درخت جو اس بارش کے پانی سے سیراب ہوتے ہوں جو ان کے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہو، اور وہ کھیتی جو کنوؤں سے سینچی گئی ہو اس میں بیسواں حصہ ہے (2)۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گی اور سورہ برأت میں سونے اور جانوروں کی زکاۃ کا ذکر آئے گا، اور اس مال کا بیان جس سے زکاۃ وصول نہیں کی جاتی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ: 103) کے تحت آئے گا۔

رہی زکاۃ الفطر کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی نص نہیں ہے مگر جو امام مالک نے تاویل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۞ (اعلیٰ) (بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور اپنے رب کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا)۔

مفسرین نے اس پر کلام سورۃ الاعلیٰ میں فرمائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر کلام اسی سورۂ بقرہ میں روزوں کی آیات کے تحت ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان میں زکاۃ الفطر فرض فرمائی اور اس حدیث کا ذکر آئندہ آئے گا اور اس زکاۃ کی نسبت رمضان کی طرف کی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَارْكَعُوْا لغت میں رکوع کا معنی کسی شخص کا جھکنا ہے، ہر جھکنے والا رکوع کرنے والا ہے۔ لبید نے کہا:

اخبّر اخبار القرون التی مضت   اَدِبُّ کانّی کلما قمت راکع (3)

مجھے گزشتہ قوموں کی خبر دی گئی تو میں رینگ کر چلنے لگا گویا میں جھکنے والا ہوں جب میں کھڑا ہوا۔

ابن درید نے کہا: الرکعۃ زمین میں گڑھے کو کہتے ہیں یہ یمنی لغت ہے۔ بعض نے فرمایا: جھکنا، رکوع اور سجود کو شامل ہے، کسی منزل میں جھکنے کے لئے عاریۃً استعمال کیا جاتا ہے۔

ولا تعاد الضعیف علك ان   ترکع یومًا والدھر قد رفعه (4)

تو کسی کمزور پر زیادتی نہ کر۔ شاید کبھی تو جھک جائے اور زمانہ اسے بلند کر دے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکاۃ، باب لیس فیما دون خمسۃ اوسق صدقۃ، حدیث 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء والماء الجاری، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)   4۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 6: خصوصی طور پر رکوع کے ذکر کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: رکوع کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ نماز کے ارکان میں سے ہے، اس سے مراد پوری نماز ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صرف رکوع کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ شرع نے قراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح سجدہ سے ایک رکعت مراد لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (اسراء: 78) یعنی فجر کی نماز۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من ادرك سجدة من الصلاة فقد ادرك الصلاة۔(1) یعنی جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، اہل حجاز رکعت پر سجدہ کا اطلاق کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رکوع کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا کیونکہ لوگوں پر زمانہ جاہلیت میں رکوع زیادہ بھاری تھا حتی کہ بعض لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا...... میرا خیال ہے وہ عمران بن حصین تھا...... انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میں جھکوں گا نہیں مگر کھڑا ہو کر، یعنی میں رکوع نہیں کروں گا جب اسلام ان کے دل میں راسخ ہو گیا اور ان کا نفس اس سے مطمئن ہو گیا تو انہوں نے رکوع کے حکم کی پیروی کی۔

مسئلہ نمبر 7: رکوع شرعی یہ ہے کہ آدمی اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرے اور اپنی پیٹھ اور گردن کو لمبا کرے اور اپنی ہاتھ کی انگلیوں کو کھولے اور ان سے اپنے گھٹنوں کو پکڑے پھر اطمینان سے رکوع کرے اور سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہے اور یہ کم از کم مقدار ہے۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کے ساتھ نماز شروع فرماتے تھے۔ قراءت اَلْحَمْدُ سے شروع کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو نہ زیادہ اونچا رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے بلکہ درمیان میں رکھتے تھے (2)۔ بخاری نے حضرت ابو حمید ساعدی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرتے (3)۔

مسئلہ نمبر 8: رکوع فرض ہے۔ یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے اسی طرح سجدہ بھی فرض ہے کیونکہ سورۃ حج کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج: 77) سنت نے اس میں طمانیت اور ان کے درمیان فاصلہ کا اضافہ کیا اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکی ہے اور رکوع کا طریقہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اور رہا سجدہ تو وہ بھی حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث میں وضاحت کے ساتھ آچکا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر ٹکاتے تھے اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے تھے (4)۔ اسی حدیث کو امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدہ میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب من ادرك ركعة من الصلوٰۃ فقد ادرك تلك الصلوٰۃ، صفحہ 221، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ و مایفتتح به الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب سنۃ الجلوس فی التشهد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی السجود علی الجبهة والانف، صفحہ 36، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اپنے بازو کتے کی طرح نہ پھیلائے (1)۔ حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تو سجدہ کرے تو اپنی ہتھیلیوں کو رکھ اور اپنی کہنیوں کو بلند کر (2)۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں کو پھیلاتے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پیچھے سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اور جب بیٹھتے تھے تو اپنی بائیں ران پر بیٹھتے تھے (3)۔

مسئلہ نمبر 9: اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس نے سجدہ میں اپنی پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا، امام مالک نے فرمایا: وہ اپنی پیشانی اور ناک پر سجدہ کرے۔ ثوری اور احمد کا یہی قول ہے۔ نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

امام احمد نے فرمایا: صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ جائز نہیں۔ یہی قول ابو خیثمہ اور ابن ابی شیبہ کا ہے۔ اسحاق نے کہا: اگر ایک چیز پر سجدہ کیا تو ایسا کرنے والے کی نماز فاسد ہے۔ امام اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز نے یہی فرمایا۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ تمام نے ناک پر سجدہ کا حکم دیا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پیشانی پر سجدہ کافی ہے جبکہ ناک نہ بھی لگے۔ یہ قول حضرات عطا، طاؤس، عکرمہ، ابن سیرین اور حسن بصری کا ہے۔ یہی قول شافعی، ابو ثور، یعقوب اور محمد کا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ایک کہنے والے نے کہا: اگر پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا تو اس نے برا کیا لیکن اس کی نماز مکمل ہے۔ یہ نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں نہیں جانتا جس نے پہلے اس قسم کا قول کیا اور نہ بعد والے کسی کو جانتا ہوں جس نے ایسا قول کیا ہو۔

میں کہتا ہوں: سجدہ میں صحیح پیشانی اور ناک کا رکھنا ہے۔ اس کی دلیل ابو حمید کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ پیشانی پر ۔۔۔ اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا ۔۔۔ دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر اور دونوں پیروں کی اطراف پر۔ ہم کپڑے اور بال جمع نہیں کرتے (4)۔ یہ تمام نماز کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پس یہ قول متعین ہو گیا۔ واللہ اعلم

امام مالک سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ ناک لگائے بغیر صرف پیشانی پر سجدہ کو جائز قرار دیتے تھے جیسا کہ عطا اور شافعی کا قول ہے۔ ہمارے نزدیک مختار پہلا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک سجدہ جائز نہ ہوگا جب تک پیشانی پر سجدہ نہیں کرے گا۔

مسئلہ نمبر 10: پگڑی کے پلو پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ اگر وہ ایسا کپڑا ہو جیسے وہ کپڑے ہوتے ہیں جو گھٹنوں اور قدموں کو ڈھانپ دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں افضل یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کرے یا ایسی چیز پر سجدہ کرے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے اگر وہاں کوئی ایسی چیز ہو جو اذیت دیتی ہو تو نماز میں داخل ہونے سے پہلے اسے زائل کر دے اگر پہلے ایسا نہ کیا ہو تو ایک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاعتدال فی السجود ووضع الکفین علی الارض، صفحہ 193، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجمع صفۃ الصلوٰۃ، صفحہ 194، جلد 1　　3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب السجود علی الانف، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرتبہ اسے برابر کردے۔

مسلم نے حضرت معیقیب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے فرمایا جو سجدہ کرتے وقت مٹی برابر کرتا ہے۔ فرمایا: اگر تو نے ایسا کرنا ہے تو ایک مرتبہ کرلو(1)...... حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم سخت گرمی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ جب ہم سے کوئی زمین پر اپنی پیشانی نہیں رکھ سکتا تھا تو وہ اپنا کپڑا بچھاتا تھا اور اس پر سجدہ کرتا تھا(2)۔

مسئلہ نمبر 11: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج: 77) تو ہمارے علماء نے فرمایا: رکوع وسجود میں سے وہ کافی ہے جسے رکوع وسجود کہا جائے۔ اسی طرح قیام کا حکم ہے انہوں نے اس میں طمانیت کو شرط قرار نہیں دیا، اور انہوں نے اس کم از کم کو لیا ہے جس پر رکوع وسجود کا اطلاق ہو سکے۔ گویا انہوں نے نماز کے لغو ہونے کے متعلق ثابت شدہ احادیث سنی ہی نہیں۔ ابن عبدالبر نے کہا: رکوع، سجود، رکوع کے بعد وقوف، دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز ہی نہیں حتیٰ کہ آرام سے رکوع کرے، آرام سے وقوف کرے، آرام سے سجدہ کرے اور آرام سے بیٹھے۔ حدیث میں یہی صحیح ہے۔ یہ جمہور علماء اور اہل نظر کا نظریہ ہے۔ ابن وہب اور ابو مصعب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: ابن قاسم سے فصل کے وجوب اور طمانیت کے سقوط کی روایات کثرت سے ہیں اور یہ وہم عظیم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے طمانیت سے ہر رکن کو ادا کیا اس کا حکم بھی دیا اور اس کی تعلیم بھی دی۔ اگر ابن قاسم کے لئے عذر ہو کہ وہ اس پر مطلع نہیں تھا تو تمہارے لئے کوئی عذر نہیں جبکہ علم تم تک پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ تم پر حجت قائم ہوئی۔ نسائی، دارقطنی، علی بن عبدالعزیز نے حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا۔ مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی۔ جب نماز پڑھ لی تو وہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور لوگوں کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ، نماز پڑھو تم نے (پہلے صحیح) نماز نہیں پڑھی۔ وہ شخص دوبارہ نماز پڑھنے لگا ہم اس کی نماز کو تاڑتے رہے ہم نہیں جانتے تھے کہ کس وجہ سے اس کی نماز معیوب ہوئی ہے۔ پھر جب وہ آیا نبی کریم ﷺ اور لوگوں پر سلام کیا تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور نماز پڑھو تم نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی۔ ہمام نے کہا: ہم نہیں جانتے یہ امر اس کے ساتھ دو دفعہ ہوا یا تین دفعہ۔ اس شخص نے عرض کی: میں نے اب تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے مجھ پر میری نماز کی وجہ سے کیوں عیب لگایا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ وضو کو مکمل کرے جس طرح اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اپنے چہرے کو دھوئے اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے، اپنے سر کا مسح کرے اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوئے پھر تکبیر کہے۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے پھر سورہ الحمد پڑھے اور قرآن حکیم میں سے جو میسر ہو وہ پڑھے پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، رکوع میں اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھے حتیٰ کہ اس کے جوڑ مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب کراھۃ مسح الحصی وتسویۃ التراب فی الصلوٰۃ، صفحہ 205، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود علی الثوب فی شدۃ الحر، حدیث 372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور سیدھا کھڑا ہو جائے حتیٰ کہ اس کی پیٹھ سیدھی ہو جائے اور ہر جوڑ اپنی جگہ پر آ جائے، پھر تکبیر کہے اور سجدہ کرے اور اپنے چہرے کو زمین پر رکھے۔ ہمام نے کہا: کبھی کہتے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھے حتیٰ کہ اس کے مفاصل مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو جائے، پھر تکبیر کہے اور اپنی مقعد پر بیٹھ جائے اور اس کی پیٹھ سیدھی ہو۔ چاروں رکعتوں کا اس طرح وصف بیان فرمایا یہاں تک کہ فارغ ہو گئے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ اس طرح نماز پڑھے۔ اس کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ کتاب اللہ میں مجمل نماز کا بیان ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا ہے اور ساری امت کو پہنچایا ہے۔ پس جو اس بیان سے واقف نہیں اور اس نے کمی کی جو رحمن نے اس پر فرض کیا اور اس نے پیروی نہ کی اس امر کی جو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پہنچا وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہے **فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ** (مریم: 59) اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

بخاری نے حضرت زید بن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع و سجود مکمل نہیں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ نے اسے فرمایا: تو نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی اگر تو (اسی حالت میں) مرے گا تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا (1)۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ، مَعَ کا لفظ معیت اور جمعیت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: ابتدا میں نماز کا امر جماعت کے ساتھ حاضری کا تقاضا نہیں کرتا تھا تو مَعَ کے قول کے ساتھ جماعت کی حاضری کا حکم دیا۔ جماعت کے ساتھ حاضر ہونے کے متعلق علماء کے دو مختلف اقوال ہیں: جمہور کا نظریہ یہ ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنن موکدہ سے ہے اور جو بغیر کسی عذر کے جماعت سے پیچھے رہتا ہے اس پر سزا واجب ہے اور بعض اہل علم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ تمام مساجد کا جماعت سے خالی ہونا جائز نہیں۔ جب مسجد میں جماعت کھڑی ہو جائے تو گھر میں منفرد کی نماز جائز ہو گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجے افضل ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے (3)۔ داؤد نے کہا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے جیسے جمعہ فرض ہے اور داؤد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: لا صلاۃ لجار المسجد الا فی المسجد مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی جائز ہے۔ ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرات عطا بن ابی رباح، احمد بن حنبل، ابو ثور وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا:

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا لم یتم السجود، حدیث 376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، صفحہ 231، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

میں کسی شخص کو جماعت ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر قادر ہو مگر عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑ سکتا ہے یہ ابن منذر نے ان کا قول حکایت کیا ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میرا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لے آئے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تا کہ آپ اسے رخصت دے دیں اور وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس چلا گیا تو اسے پھر بلایا اور فرمایا: کیا تو نماز کی اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر جواب دے (1) کہ (یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کر) ابوداؤد کے الفاظ اس حدیث میں یہ ہیں ''میں تیرے لئے رخصت نہیں پاتا'' اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: سائل عبداللہ بن ام مکتوم تھے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے اسے کوئی عذر مانع نہ ہو...... صحابہ نے پوچھا: عذر کیا ہے؟ فرمایا خوف یا مرض...... اس کی نماز قبول نہ ہوئی جو اس نے پڑھی (2)۔ ابومحمد عبدالحق نے کہا: اس حدیث کو مغراء العبدی نے روایت کیا ہے۔ صحیح حضرت ابن عباس پر موقوف ہے جس نے اذان سنی اور (جماعت کے ساتھ) نہ آیا تو اس کی نماز نہیں۔ قاسم بن اصبغ نے اپنی کتاب میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جواب نہ دیا (یعنی جماعت کے ساتھ حاضر نہ ہوا) تو اس کی نماز نہیں مگر یہ کہ اسے عذر ہو (3)۔ اس سند کے ساتھ تیرے لئے اس کی صحت کافی ہے۔ مغراء العبدی سے ابو اسحاق نے روایت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ہم نے دیکھا کہ جماعت سے پیچھے نہیں رہتا مگر ایسا منافق جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے (4)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمارے اور منافقین کے درمیان فرق عشاء اور صبح کی جماعت کی حاضری ہے۔ منافقین ان نمازوں میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتے (5)۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے کئی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور بغیر عذر کے جواب نہ دیا اس کی نماز نہیں (6)۔ ان صحابہ میں حضرت ابن مسعود، حضرت ابوموسیٰ اشعری ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے جوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے اکٹھے کریں پھر میں ان لوگوں کے پاس آؤں جنہوں نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی جبکہ انہیں کوئی بیماری بھی نہیں ہے تو میں ان پر ان کے گھر جلا دوں (7)۔ یہ ان کی دلیل ہے جنہوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض قرار دیا یہ وجوب میں ظاہر ہے۔ جمہور علماء نے جماعت کے ساتھ نماز کی حاضری کی تاکید پر محمول کیا ہے اور صحابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و موضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ و بیان التشدید فی التخلف عنہ، صفحہ 232، جلد 1

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 421، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 420، جلد 1

4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ و بیان التشدید فی التخلفہ عنہ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ موطا امام مالک، صفحہ 114 6۔ سنن دارقطنی، صفحہ 420، جلد 1 (دار المحاسن)

7۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فی ترک الجماعۃ، حدیث نمبر 462، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے اقوال اور حدیث لا صلوۃ لہ (اس کی نماز نہیں) کو کمال اور فضیلت پر محمول کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ابن ام مکتوم کو فَاَجِبْ کا امر کرنا استحباب پر محمول کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقد هممت (میں نے ارادہ کیا) یہ حتمی وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ نے ارادہ فرمایا لیکن ایسا کیا نہیں۔ آپ نے یہ ارشاد غافلوں کو وعید اور تہدید کے طور پر ذکر فرمایا جو جماعت اور جمعہ سے رہ جاتے ہیں۔ اس معنی کو مسلم کی روایت بھی بیان کرتی ہے جو حضرت عبداللہ نے روایت کی ہے، فرمایا: جسے یہ بات خوش کرے کہ وہ کل اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر ملے تو اسے ان نمازوں کی حفاظت کرنی چاہئے جہاں بھی ان کی ندا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لئے سنن ہدیٰ کو مشروع کیا ہے اور یہ نمازیں (جماعت کے ساتھ پڑھنا) سنن ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جس طرح یہ شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دو گے اور اگر تم اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص اچھی طرح طہارت کرے پھر کسی مسجد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کے بدلے ایک گناہ معاف فرماتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے جماعت سے ایسا منافق پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معلوم ہوتا تھا۔ ایک شخص کو لایا جاتا تھا جبکہ وہ دو شخصوں کے سہارے پر ہوتا تھا حتیٰ کہ اسے صف میں کھڑا کیا جاتا تھا (1)۔

حضرت عبداللہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ جماعت کے ساتھ شریک ہونا سنن ہدیٰ میں سے ایک سنت ہے اور اس کا ترک کرنا گمراہی ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابوالفضل عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سنن کے ظاہر کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں کے بارے میں اختلاف ہے کیا ان سے جنگ کی جائے گی یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ ایسے عمل پر ان سے قتال کیا جائے گا کیونکہ سنن ہدیٰ کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنا انہیں ختم کرنے کے مترادف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر حجت قائم اور ظاہر ہو جائے تو منفرد کی نماز جائز اور صحیح ہوگی۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی نماز جماعت کے ساتھ گھر میں اور بازار میں اس کی نماز سے بیس سے زائد درجے بلند ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور اس کا ارادہ فقط جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہوتا ہے تو جو وہ قدم اٹھاتا ہے اس کے بدلے اس کے لئے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مسجد میں داخل ہو جائے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے جب تک اسے نماز روکے ہوئے ہوتی ہے وہ نماز میں ہی شمار ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس جگہ میں ہوتا ہے جہاں سے اس نے نماز پڑھی ہوتی ہے۔ فرشتے یہ کہتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر نظر رحمت فرما، یہ دعا کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ اس مجلس میں تکلیف نہیں دیتا (یعنی) جب تک اسے حدث لاحق نہیں ہوتا (2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حدث سے کیا مراد ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوۃ الجماعۃ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الصلوٰۃ، المکتوبۃ فی جماعۃ و فضل انتظار الصلوٰۃ و کثیرۃ الخطا الخ، صفحہ 234، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اس کی ہوا آہستہ خارج ہو یا بلند آواز سے خارج ہو۔

مسئلہ نمبر 13: جماعت کی طرف جو فضیلت منسوب کی گئی ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فقط جماعت کے لئے ہے جہاں بھی ہو یا یہ فضیلت اس جماعت کی ہے جو مسجد میں ہوتی ہے، کیونکہ یہ فضیلت ایسے افعال کے ساتھ لازم ہے جو مساجد کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث پاک میں بیان ہوا ہے۔ علماء کے اس کے متعلق دو قول ہیں: پہلا زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ جماعت وہ وصف ہے جس پر حکم معلق کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسجد کی طرف زیادہ قدم چل کر جانا، مسجد کی طرف آنا، مسجد میں بیٹھنا یہ جماعت کی فضیلت کے علاوہ زیادہ ثواب ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 14: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ایک جماعت دوسری جماعت سے کثرت تعداد اور امام کی فضیلت کی وجہ سے فضیلت رکھتی ہے یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں۔ ابن حبیب نے فرمایا: فضیلت رکھتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور ایک شخص کا دو آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو تعداد زیادہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے نقل کی ہے، اس کی سند میں کمزوری ہے۔

مسئلہ نمبر 15: جس نے ایک جماعت سے نماز پڑھ لی ہو وہ وہی نماز دوسری جماعت سے دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب نے فرمایا: وہ شخص جو تنہا اپنے گھر میں یا کسی اور جگہ نماز پڑھ چکا ہو وہ امام کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اگرچہ وہ جماعت تھوڑی بھی ہو وہ زیادہ تعداد والی جماعت یا کم والی جماعت کے ساتھ نماز دوبارہ نہ پڑھے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور داؤد بن علی نے فرمایا: جو ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ نماز اگر چاہے تو دوسری جماعت کے ساتھ پڑھ لے کیونکہ یہ نفل اور سنت ہو جائے گی۔

یہی بات حضرات حذیفہ بن یمان، ابوموسیٰ اشعری، انس بن مالک، صلہ بن زفر، شعبی اور نخعی سے مروی ہے۔ حضرت حماد بن زید اور حضرت سلیمان بن حرب کا بھی یہی قول ہے۔

امام مالک نے اس قول سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک نماز ایک دن میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جائے گی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: دوبارہ نماز نہ پڑھو۔ یہ قول حضرت سلیمان بن یسار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ احمد اور اسحاق نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ایک فرض پڑھے پھر وہ کھڑا ہو اور دوبارہ اسی فرض کی نیت سے دوبارہ پڑھے، لیکن جب وہ امام کے ساتھ سنت یا نفل کی نیت سے پڑھے گا تو وہ نماز کا اعادہ نہیں ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 82، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب فی فضل الصلوٰۃ الجماعۃ، حدیث 467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دار قطنی، صفحہ 416، جلد 1 (دار المحاسن)

جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اعادہ کا جماعت کے ساتھ حکم دیا تھا انہیں فرمایا تھا یہ تمہارے لئے نفل ہے (1) جیسا کہ حضرت ابوذر وغیرہ کی حدیث میں ہے۔

مسئلہ نمبر 16: مسلم نے حضرت ابو مسعود سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: قوم کی امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کا اچھا قاری ہو، اگر قراءت میں برابر ہوں تو جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو اسلام لانے میں مقدم ہو۔ کوئی شخص دوسرے کی سلطنت میں امامت نہ کرائے اور اس کے بیٹھنے کی جگہ پر نہ بیٹھے مگر یہ کہ وہ اسے اجازت دے (2)۔ ایک روایت میں اسلام میں مقدم ہونے کی جگہ، عمر میں بڑا ہونے کا ذکر ہے، یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے، فرمایا: شعبہ نے فرمایا: میں نے اسماعیل سے پوچھا: حدیث میں جو تکرمتہ کے الفاظ آئے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس کا بچھونا (اس کے بیٹھنے کی جگہ) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: حضرت ابو مسعود کی حدیث حسن صحیح ہے اس پر اہل علم کا عمل ہے۔

علماء نے فرمایا: امامت کا سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جو کتاب اللہ (قرآن) کا زیادہ قاری ہو اور سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور علماء نے فرمایا: گھر کا مالک امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض نے فرمایا: جب گھر کا مالک دوسرے کو اجازت دے دے تو دوسرے کے امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں، بعض نے اس کو ناپسند کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ گھر کا مالک امامت کرائے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ ہم نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نوجوان کو امامت کے لئے مقدم کیا اور فرمایا: میں قرآن کو مقدم کرتا ہوں۔ جنہوں نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ کرائے جو قرآن کا بڑا قاری ہو، ان میں حضرات ابن سیرین، ثوری، اسحاق اور اصحاب الرائے ہیں۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ قول سنت کے موافق ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ شخص مقدم ہو جو زیادہ علم والا ہو جبکہ اس کی حالت اچھی ہو اور عمر کا بھی حق ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: وہ امامت کرائے جو زیادہ فقیہ ہو، اسی طرح امام شافعی اور ابوثور نے فرمایا جبکہ وہ قرآن پڑھ سکتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقیہ نماز میں لاحق ہونے والے حوادث کو زیادہ جانتا ہے اور انہوں نے حدیث کی اس طرح تاویل کی ہے کہ صحابہ میں سے بڑا قاری بڑا فقیہ بھی ہوتا تھا کیونکہ وہ قرآن میں سمجھ حاصل کرتے تھے اور صحابہ کے عرف میں فقہاء کو قراء کہا جاتا تھا اور انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر کو ان کے فضل وعلم کی وجہ سے مقدم فرمایا۔

اسحاق نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اس لئے مقدم فرمایا تا کہ یہ دلیل بن جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے، یہ ابوعمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیا ہے۔ ابوالبزار نے اپنی حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سفر کرو تو تم میں سے جو بڑا قاری ہو وہ تمہاری امامت کرائے اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا بھی ہو، جب وہ تمہاری امامت کرائے گا تو وہ تمہارا امیر ہوگا (3)؟ فرمایا: ہم نہیں جانتے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 413، جلد 1 (دار المحاسن) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ کنز العمال، حدیث نمبر 17501

روایت کی گئی ہے مگر حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس سند کے ساتھ۔

میں نے کہا: چھوٹے کی امامت جائز ہے جب وہ قاری ہو۔ صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم ایک چشمہ پر رہتے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر تھا۔ ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے تو ہم ان سے پوچھتے تھے کہ لوگوں کا کیا بنا، وہ شخص (جس نے نبوت کا اعلان کیا ہے) وہ کون ہے؟ لوگ کہتے ہیں: وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے اور اس کی طرف ایسی ایسی وحی کی ہے ایسی ایسی وحی کی ہے میں وہ کلام یاد کر لیتا تھا گویا وہ میرے سینے میں کلام جم جاتا تھا۔

عرب لوگوں کے اسلام لانے کے منتظر تھے۔ وہ کہتے تھے: اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ جائے گا تو وہ سچا نبی ہوگا۔ جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام قبول کرنے میں جلدی کی۔ میرے باپ نے اپنی قوم کے اسلام کے لئے جلدی کی، جب وہ آئے تو کہا: یقیناً میں تمہارے پاس اللہ کے نبی کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم اس وقت میں اس طرح نماز پڑھو۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان دے اور جو تم میں سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرائے۔ پس لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی قرآن پڑھنے والا نہیں کیونکہ میں قافلوں میں ملتا تھا (اور ان سے قرآن سن کر یاد کر لیتا تھا)۔ پس لوگوں نے مجھے امامت کے لئے آگے کیا۔ جب کہ میری عمر چھ یا سات سال تھی میرے اوپر ایک چادر ہوتی تھی جب میں سجدہ کرتا تھا تو وہ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی ایک عورت نے آواز دی: کیا تم اپنے قاری کی شرمگاہ نہیں ڈھانپو گے؟ پس لوگوں نے میرے لئے ایک قمیص خرید دی مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ مجھے اس قمیص کی وجہ سے ہوئی تھی (1)۔ جن علماء نے نابالغ بچے کی امامت جائز قرار دی ہے ان میں حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے جب کہ بچہ نماز کو سمجھتا ہو اور نماز پڑھا سکتا ہو، کیونکہ وہ بچہ بھی اس ارشاد میں داخل ہے "قوم کی امامت بڑا قاری کرائے (2)"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کی استثنا نہیں فرمائی۔ ان علماء نے حجت عمرو بن سلمہ کی حدیث کو بنایا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول ہے: وہ باقی تمام نمازوں کی امامت کرائے لیکن جمعہ کی امامت نہ کرائے، وہ اس سے پہلے فرماتے تھے: جس کی امامت فرض نماز میں جائز ہے اس کی امامت عید میں بھی جائز ہے مگر میں اس میں غیر ولی کی امامت کو ناپسند کرتا ہوں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: فرضی نماز میں بچہ امامت نہیں کرا سکتا حتیٰ کہ اسے احتلام ہو جائے مگر یہ کہ ایسی قوم ہو جن کے پاس قرآن نہ ہو (یعنی کسی کو قرآن یاد نہ ہو) تو پھر قریب البلوغ بچہ امامت کرا سکتا ہے۔ زہری نے کہا: اگر بچے کی امامت میں اضطرار ہو تو وہ ان کی امامت کرائے۔ مالک، ثوری اور اصحاب رائے نے بچے کی امامت سے ہر صورت میں منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 17: ہر بالغ مسلمان آزاد کا مستقل امامت کرانا جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب وہ امام نماز کی حدود کو جانتا ہو اور الحمد شریف پڑھنے میں کوئی ایسی غلطی نہ کرتا ہو جو معنی میں غلطی کا باعث ہو مثلاً وہ ایاك نعبد میں کاف پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح، حدیث 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ، حدیث 494، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسرہ پڑھ دے انعمت میں تا پر ضمہ پڑھ دے اور وہ طا اور ضاد میں فرق کر سکتا ہو، جو ان میں تفریق نہ کر سکتا ہو اس کی امامت صحیح نہیں کیونکہ ان دونوں کا معنی مختلف ہے۔ ان میں سے بعض نے ان تمام صورتوں میں رخصت دی ہے جبکہ وہ قراءت سے جاہل ہو اور جاہلوں کی ہی امامت کراتا ہو۔ عورت اور خنثیٰ مشکل، کافر اور مجنون اور ان پڑھ آدمی کی امامت جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ان لوگوں کا کسی صورت میں امامت کرانا جائز نہیں مگر ان پڑھ اپنے جیسوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس ان پڑھ کی امامت صحیح نہیں جو قراءت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو جبکہ کوئی قاری موجود ہو۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اگر ان پڑھ نے ان پڑھ کی امامت کرائی تو ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب ان پڑھ شخص کسی ایسی قوم کی امامت کرائے جن میں پڑھے ہوئے بھی ہوں اور ان پڑھ بھی ہوں تو تمام کی نماز فاسد ہے۔ امام ابو یوسف نے اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: امام کی نماز اور جو قرآن نہیں پڑھ سکتے ان کی نماز ہو جائے گی ایک گروہ نے فرمایا: ان سب کی نماز جائز ہے کیونکہ ہر ایک اپنا فرض ادا کرنے والا ہے اور وذلك مثل المتيمم يصلي بالمتطهرين بالماء، والمصلي قاعدا يصلي بقوم قيام صلاتهم مجزئة في قول من خالفنا، لأن كلا مؤد فرض نفسه۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی تائید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی حجت پکڑی جاتی ہے "کیا نمازی نہیں دیکھتا جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیسے وہ نماز پڑھتا ہے وہ اپنے لئے نماز پڑھتا ہے (1)" مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط نہیں۔ واللہ اعلم۔۔۔۔۔ عطا بن ابی رباح فرماتے تھے: جب عورت پڑھی ہوئی ہو تو امام تکبیر کہے اور عورت قراءت کرے جب وہ قراءت سے فارغ ہو تو تکبیر کہے اور رکوع اور سجدہ کرے دراں حالیکہ عورت مرد کے پیچھے ہو اسی قسم کا مفہوم حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 18: اندھے، لنگڑے، اشل، ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے، خصی اور غلام کی امامت میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان میں سے ہر شخص نماز کا عالم ہو۔ ابن وہب نے فرمایا: میں نہیں دیکھتا کہ ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا شخص اور اشل امامت کرائے کیونکہ وہ درجہ کمال سے ناقص ہے۔ میں اس کی امامت اس کی کمی اور نقص کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ جمہور علماء نے ان کی مخالفت کی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ کسی عضو کا فقدان نماز کے فروض میں سے کسی فرض سے مانع نہیں ہے۔ پس اس عضو کے نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ کی امامت جائز ہے جیسے آنکھ نہ ہو تو امامت جائز ہوتی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا جو لوگوں کی امامت کراتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے (2)۔ اسی طرح لنگڑے، ہاتھ کٹے ہوئے، اشل اور خصی کا قیاساً اور نظراً یہی حکم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نابینے شخص کے بارے میں فرمایا انہیں اس سے کیا حاجت ہے؟ (یعنی لوگ ان کے بارے میں یہ مسئلہ کیوں پوچھتے ہیں) حضرت ابن عباس اور حضرت عتبان بن مالک دونوں امامت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر بتحسین الصلوٰۃ واتمامها والخشوع فيها، صفحہ 180، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ

کراتے تھے اور دونوں نابینے تھے، اسی پر عام علماء کا فتویٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 19: ولد الزنا (حرامی) کی امامت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں اس کا ہمیشہ امام ہونا ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے۔ حضرت عطا بن ابی رباح فرماتے تھے اسے امامت کرانی چاہئے جبکہ وہ پسندیدہ (نیک) شخص ہو۔ یہ حضرات حسن بصری زہری، نخعی، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اصحاب رائے (احناف) کے نزدیک ولد الزنا کے پیچھے نماز جائز ہے لیکن دوسرا شخص ان کے نزدیک بھی بہتر ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میں ایسے شخص کو مستقل امام بنانا ناپسند کرتا ہوں جس کا باپ معروف نہ ہو لیکن جس نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائز ہوگی۔ عیسیٰ بن دینار نے کہا: ولد الزنا کی امامت کے بارے امام مالک کے قول کو نہیں اپناتا اس بچے پر والدین کے گناہ میں سے کچھ نہیں ہے، ابن عبدالحکم نے اسی طرح فرمایا جب کہ اس میں امامت کی اہلیت نہ ہو۔ ابن منذر نے کہا: ولد الزنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عام ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرءُھم، (1) لوگوں میں امامت ان میں سے اچھا قاری کرائے۔ ابوعمر نے کہا: امامت کی شرط میں وارد آثار میں کوئی ایسا اثر نہیں ہے جو نسب کی رعایت پر دلالت کرے، ان سب آثار میں فقہ، قراءت اور دین کی صلاح کا ذکر ہے۔

مسئلہ نمبر 20: رہا غلام تو امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے مہاجرین کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے قبا کے مقام پر پہنچا تو اس کی امامت سالم کراتے تھے جو ابوحذیفہ کے غلام تھے اور انہیں قرآن زیادہ یاد تھا (2)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: سالم جو ابوحذیفہ کے غلام تھے مہاجرین اولین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی قبا کی مسجد میں امامت کراتے تھے، ان لوگوں میں حضرات ابوبکر، عمر، زید، عامر بن ربیعہ وغیرہ موجود تھے (3)۔ حضرت عائشہ کا غلام ذکوان قرآن سے دیکھ کر آپ کی امامت کراتا تھا (4)۔ ابن منذر نے کہا: ابوسعید جو ابواسید کے غلام تھے وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت کی امامت کراتے تھے ان صحابہ میں حضرات حذیفہ اور ابومسعود بھی تھے۔

غلام کی امامت کی رخصت نخعی، شعبی، حسن بصری، حکم، ثوری، شافعی، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے نے دی ہے۔ ابومجلز نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: غلام امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ قاری ہو اور اس کے ساتھ جو آزاد لوگ ہوں وہ قراءت نہ کر سکتے ہوں لیکن عید اور جمعہ کی امامت غلام نہ کرائے۔ اوزاعی کے نزدیک جائز ہے اگر وہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ ابن منذر نے کہا: غلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرؤھم امامت وہ کرائے جو ان میں سے زیادہ قراءت جانتا ہو۔

مسئلہ نمبر 21: رہی عورت تو امام بخاری نے حضرت ابوبکرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب امامۃ الاعمٰی، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب استقضاء الموالی واستعمالھم، حدیث 6640، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہنچی کہ اہل فارس نے بنت کسریٰ کو اپنی ملکہ بنایا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جنہوں نے اپنا والی عورت کو بنایا (1)...... ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن خلاد سے انہوں نے ام ورقہ بنت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو اس کے لئے اذان دیتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ عبدالرحمن نے کہا: میں نے اس کا مؤذن ایک بوڑھا شخص دیکھا (2)۔ ابن منذر اور شافعی نے کہا: مردوں میں سے جنہوں نے عورت کے پیچھے نماز پڑھی ان پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ ابوثور نے کہا: ان پر اعادہ واجب نہیں۔ یہ مزنی کے قول کا قیاس ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: عورت کی امامت، مردوں اور عورتوں کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ابن ایمن نے عورتوں کے لئے عورت کی امامت کا جواز روایت کیا ہے۔

رہا خنثیٰ مشکل، تو امام شافعی نے فرمایا: وہ مردوں کی امامت نہ کرائے عورتوں کی امامت کرائے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ کسی حال میں امام نہیں بن سکتا۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 22: کافر جو شرع محمد یہ کا مخالف ہے جیسے یہودی اور نصرانی مسلمانوں کی امامت کرا دے جبکہ مسلمانوں کو اس کے کفر کا علم نہ ہو تو امام شافعی اور احمد کہتے ہیں ان کی نماز جائز نہ ہوگی اور وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے کیونکہ وہ قربت کے اہل میں سے نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اسے سزا دی جائے گی۔ ابوثور اور مزنی نے فرمایا: جس نے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی اس پر اعادہ نہیں ہے اور وہ اپنی نماز کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوگا۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کے نزدیک ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23: اہل بدعت جو خواہشات نفس کے پرستار ہیں جیسے معتزلہ، جہمیہ وغیرہ۔ تو امام بخاری نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ تو نماز پڑھ لے، اس کی بدعت کا وبال اس پر ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اہل ہواء میں سے کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھے جبکہ وہ اپنی خواہش (بدعت) کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ امام مالک نے فرمایا: ظالم ائمہ کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ اہل بدعت قدریہ وغیرہم کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ ابن منذر نے کہا: ہر وہ شخص جس کی بدعت کفر کا موجب ہو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں اور جس کی بدعت ایسی نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور ایسی صفت والے کو آگے کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 24: اپنے اعضاء کے ساتھ فسق (گناہ) کرنے والا مثلاً زانی، شرابی اور اس جیسے شخص کی امامت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے فرمایا: جس نے شرابی کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز کو لوٹائے مگر یہ کہ وہ والی ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر اعادہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نشہ کی حالت میں ہو۔ یہ امام مالک کے ساتھیوں کا قول ہے جن سے میں ملا ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر، حدیث 6570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء، حدیث نمبر 500، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرد کی امامت نہ کرائے اور کوئی بدو مہاجر کی امامت نہ کرائے کوئی فاجر نیکوکار کی امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ صاحب سلطنت ہو''۔ ابو محمد عبد الحق نے فرمایا: یہ علی بن زید بن جدعان نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اکثر علماء علی بن زید کو ضعیف کہتے ہیں۔ دار قطنی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کو اپنی نمازوں کو اچھا کرنا پسند ہے تو اپنے اچھے لوگوں کو (امامت کے لئے) آگے کرو۔ اس کی سند میں ابو الولید خالد بن اسماعیل مخزومی ہے جو ضعیف ہے۔ یہ دار قطنی کا قول ہے۔ ابو احمد بن عدی نے خالد کے بارے کہا: یہ مسلمانوں میں سے ثقہ لوگوں پر احادیث وضع کرتا تھا۔ اس کی یہ حدیث اس نے یہ ابن جریج سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

دار قطنی نے سلام بن سلیمان عن عمر بن محمد بن واسع عن سعید بن جبیر عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے امام اپنے عمدہ لوگوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور اللہ کے درمیان وفد ہیں (1)۔ دار قطنی نے کہا: یہ عمر میرے نزدیک عمر بن یزید مدائن کا قاضی ہے اور سلام بن سلیمان بھی مدائن کا رہنے والا ہے۔ یہ قوی نہیں ہے۔ یہ عبد الحق نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 25: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تا کہ اس کی پیروی کی جائے۔ پس اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہے تو تم کہو اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (2)۔

علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے، جو رکوع کرے یا جھک جائے امام کے رکوع کرنے سے پہلے اور وہ یہ عمل جان بوجھ کر کرے۔ دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز فاسد ہے اگر اس نے یہ تمام نماز میں کیا یا اکثر نماز میں کیا۔ یہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابن علیہ نے بیان کیا انہوں نے ایوب سے انہوں نے ابو قلابہ سے انہوں نے حضرت ابو الورد انصاری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر کے پہلو میں نماز پڑھی۔ میں امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا تھا۔ جب حضرت ابن عمر نے سلام پھیرا تو حضرت ابن عمر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مروڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں نے پوچھا: حضرت آپ کو کیا ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے پوچھا: تو کون ہے؟ میں نے کہا: فلاں ابن فلاں۔ پوچھا: تو سچے اہل بیت سے ہے تجھے صحیح نماز پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ میں نے کہا: تو نے مجھے اپنے پہلو میں نماز پڑھتے دیکھا نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: میں نے تجھے دیکھا تو امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا ہے اور اس کی نماز نہیں ہوتی جو امام کی مخالفت کرے۔ حسن بن حی نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام سے پہلے رکوع یا سجدہ کرے پھر امام کے رکوع یا سجدہ کرنے سے پہلے سر اٹھا لے، تو اس کا رکوع و سجود شمار نہیں ہوگا اور اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔

اکثر فقہاء نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس نے غلط کیا اور اس کی نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے اور نماز

1۔ سنن دار قطنی، صفحہ 88، جلد 2 (دار المحاسن)　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام المأموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1، قدیمی کتب خانہ

میں ائمہ کی اقتدا کرنا سنت حسنہ ہے۔ پس جس نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ اس نے اپنی نماز کا فرض، اس کی طہارت، رکوع، سجود اور دوسرے فرائض کے ساتھ ادا کر دیا ہے تو اس پر اعادہ نہیں ہے اگرچہ اس نے اس کی بعض سنن کو ترک بھی کر دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا تو منفرد بھی ادا کر سکتا تھا۔ پس اس نے یہ نماز اپنے امام سے پہلے پڑھ لی ہے تو جائز ہو گئی اور اس نے جو جماعت کو ترک کیا ہے وہ اس نے برا کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: جو امام کی نماز میں داخل ہوا پھر اس نے امام کے ساتھ رکوع و سجود کیا جبکہ وہ ایک رکعت میں اور امام دوسری رکعت میں نہ تھا تو اس کی اقتدا صحیح ہے اگرچہ وہ امام سے پہلے اٹھتا ہے اور امام سے پہلے جھکتا ہے کیونکہ وہ امام کے رکوع کے ساتھ رکوع کرتا ہے اور امام کے سجدہ کے ساتھ سجدہ کرتا ہے اور اوپر اٹھتا ہے جبکہ اس میں وہ اس کی تبع میں ہے مگر وہ اپنے اس فعل میں گناہگار ہے کیونکہ مقتدی کے لئے جو متفق علیہ سنت ہے اس نے اس کے خلاف کیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبدالبر نے جو جمہور علماء سے نقل کیا ہے اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی نماز، امام کی نماز سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اتباع حسی اور شرعی مفقود ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ اثر و نظر کے اعتبار سے پہلا قول صحیح ہے۔ امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے اور اس کے افعال کی اقتدا کی جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ: 124) یعنی لوگ آپ کی اقتدا کریں گے، اس آیت کا بیان آگے آئے گا۔

یہ امام کی لغت اور شرع میں حقیقت ہے۔ جس نے امام کی مخالفت کی اس نے اس کی پیروی نہیں کی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ "جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو(1)"۔ فا کے ساتھ ذکر فرمایا جو کسی کام کو پہلے کے بعد کیا جاتا ہے، اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے لئے سخت وعید ذکر فرمائی جو رکوع امام سے پہلے کرتا ہے یا پہلے سر اٹھاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے وہ ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کی طرح پھیر دے یا اس کی صورت گدھے کی صورت میں بنا دے(2)۔ یہ حدیث مؤطا، بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے(3)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے(4)"۔ پس جس نے جان بوجھ کر امام کی مخالفت کی یہ جانتے ہوئے کہ اسے امام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے تو اس نے نماز کو حقیر جانا اور جو اسے حکم دیا گیا تھا اس کی اس نے مخالفت کی۔ پس واجب ہے کہ اس کی وہ نماز جائز نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 26: اگر بھول کر امام سے پہلے سر اٹھا لیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: بھولنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ جس نے رکوع یا سجود میں ایسا کیا وہ رکوع یا سجدہ کی طرف لوٹ جائے اور امام کا انتظار کرے جس نے ایسا کیا اس نے غلطی کی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس اس پر اختلاف نہ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب ایجاب التکبیر و افتتاح الصلوٰۃ، حدیث 691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 91، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فیمن یرفع قبل الامام، حدیث 528، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب مایفعل من رفع راسہ قبل الامام، صفحہ 75 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 371، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح، حدیث 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو (1)۔ ابن عبدالبر نے کہا: امام مالک کے اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ جو جان بوجھ کر ایسا کرے اس پر اعادہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس کی طرف سے خطا ہے اور بھولنے والے سے گناہ اٹھالیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 27: یہ اختلاف تکبیر تحریمہ اور سلام کے علاوہ میں ہے۔ رہا سلام تو اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے، رہی تکبیر تحریمہ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مقتدی کی تکبیر امام کی تکبیر کے بعد ہو۔ مگر امام شافعی سے ایک قول مروی ہے کہ وہ اپنے امام سے پہلے اگر تکبیر تحریمہ کہے گا تو پھر جائز ہوگی کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طرف آئے جب تکبیر کہی تو واپس چلے گئے اور مقتدیوں کو اشارہ فرمایا: تم جیسے ہو اسی طرح ٹھہرے رہو۔ پھر آپ گھر چلے گئے پھر آئے جبکہ سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو فرمایا: میں جنبی تھا میں غسل کرنا بھول گیا تھا (2) اور حضرت انس کی حدیث میں ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ تکبیر کہی۔ اس کا مزید بیان سورۂ نساء میں ان شاء الله ولا جنبا کے تحت آئے گا۔

مسئلہ نمبر 28: مسلم نے حضرت ابومسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے تھے اور فرماتے تھے: سیدھے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے تم میں سے میرے قریب صاحب عقل و دانش لوگ ہوں پھر وہ جو عقل و فکر میں ان کے قریب ہوں پھر وہ جو ان کے قریب ہوں (3)۔ حضرت ابو مسعود نے فرمایا: آج تم پہلے سے زیادہ اختلاف کرتے ہو (یعنی تمہاری صفیں درست نہیں ہوتی ہیں) اور تم بازاروں میں آوازیں اونچی کرنے سے بچو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "سیدھے ہو جاؤ" یہ صفیں سیدھی کرنے کا حکم ہے خصوصاً پہلی صف جو امام کے قریب ہوتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔ اور اس حدیث کے معنی پر بھی توفیق الٰہی سے گفتگو ہوگی۔ ان شاء الله

مسئلہ نمبر 29: چونکہ نماز میں بیٹھنے کے متعلق آثار مختلف ہیں اس لئے علماء کا نماز میں بیٹھنے کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: مصلی (نمازی) اپنی سرین زمین پر رکھے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں کو دوہرا کرے۔ اس کی وجہ وہ روایت ہے جو امام مالک نے مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے کہ قاسم بن محمد نے انہیں تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ دکھایا تو انہوں نے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کیا اور بائیں پاؤں کو دوہرا کیا اور وہ اپنی سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھے اور اپنے پاؤں پر نہیں بیٹھے۔ پھر فرمایا: مجھے یہ طریقہ حضرت عبدالله بن عمر نے دکھایا اور انہوں نے مجھے بیان کیا کہ ان کے والد (حضرت عمر) ایسا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مسلم کی صحیح میں بھی آیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز تکبیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام المأموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 361، جلد 1 (دار المحاسن)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف و اقامتہا و فضل الاول منہا والازدحام علی الصف الاول، صفحہ 181، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

سے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو زیادہ بلند نہیں رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو دوسرا سجدہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سیدھے بیٹھ جاتے تھے اور دو رکعتوں پر التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور دایاں پاؤں کھڑا کرتے تھے اور شیطان کی طرح ایڑیوں پر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنے بازو (زمین پر) پھیلائے اور نماز کا اختتام سلام سے کرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کی وجہ سے...... اللہ بہتر جانتا ہے...... حضرت ابن عمر نے فرمایا: نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کیا جائے اور بائیں کو بچھایا جائے۔ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن صالح بن حیی نے کہا: دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے ان کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ اسی طرح امام شافعی، احمد اور اسحاق نے درمیانے قعدہ میں بیٹھنے کو کہا ہے اور آخری قعدہ میں ظہر، عصر، مغرب یا عشاء میں ان کا قول امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے گھٹنوں کو پکڑتے پھر اپنی پیٹھ کو جھکاتے جب کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے حتیٰ کہ ریڑھ کا ہر مہرہ اپنی جگہ پر آ جاتا اور جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے نہ تو بازوؤں کو زمین پر پھیلاتے اور نہ بازوؤں کو اکٹھا کرتے اور اپنے قدموں کی انگلیوں کی اطراف کو قبلہ کی طرف متوجہ کرتے تھے جب (پہلی) دو رکعتوں پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور جب آخری رکعت میں بیٹھتے تو اپنے بائیں پاؤں کو آگے کرتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور اپنی سرین کے بل بیٹھتے (2)۔ طبری نے کہا: اگر اس طرح کرے تو اچھا ہے بیٹھنے کے تمام طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

مسئلہ نمبر 30: مالک نے مسلم بن ابی مریم سے انہوں نے علی بن عبد الرحمٰن المعاوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ بن عمر نے مجھے دیکھا جب میں نماز میں کنکریوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو مجھے منع فرمایا اور فرمایا: اس طرح کیا کرو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کرتے تھے؟ فرمایا: جب آپ نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنی تمام انگلیوں کو بند کرتے تھے اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی کے ساتھ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اور اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے اور فرمایا: آپ اسی طرح کرتے تھے۔ ابن عبد البر نے کہا: حضرت ابن عمر نے جو یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنے ہاتھ کی تمام انگلیوں کو بند کر دیتے تھے سوائے سبابہ کے اس کے ساتھ آپ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہوتی تھی۔ یہ نماز میں بیٹھنے کا سنت طریقہ ہے اس پر اجماع ہے۔ میری معلومات کے مطابق علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے لیکن سبابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ وما یفتتح بہ ویختم بہ وصفۃ الرکوع الخ صفحہ 95-194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب سنۃ الجلوس فی التشھد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انگلی کو حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: انگلی کو حرکت دینی چاہئے اور بعض نے کہا: حرکت نہیں دینی چاہئے۔ یہ تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح آثار کے ذریعے مروی ہیں اور ہر صورت مباح ہے۔ الحمد للہ

سفیان بن عیینہ نے یہ حدیث مسلم بن ابی مریم سے روایت کی ہے جو اس حدیث کے ہم معنی ہے جو امام مالک نے روایت کیا ہے اس میں کچھ زائد ہے۔ سفیان نے کہا: یحییٰ بن سعید ہمیں بیان فرماتے تھے اور وہ مسلم سے روایت فرماتے تھے پھر میں ان سے ملا تو میں نے ان سے سنا اور انہوں نے مجھے یہ زائد فرمایا: یہ انگلی کا حرکت دینا شیطان کو دور کرنا ہے تم میں سے کوئی بھولے گا نہیں جب تک وہ انگلی سے اشارہ کرتا رہے گا اور وہ اس طرح کہے گا۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے حضرت ابن زبیر کی حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تھے تو اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہی بعض عراقی علماء کا نظریہ ہے اور انہوں نے انگلی کو حرکت دینے سے منع کیا۔ ہمارے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ انگلی کو اٹھانا یہ ہمیشہ کی توحید کی طرف اشارہ ہے۔ امام مالک کے اصحاب وغیرہم میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ انگلی کو حرکت دے مگر علماء کا متواتر حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق علماء کے دو اقوال ہیں: جو متواتر حرکت دینے کے قائل ہیں انہوں نے اس طرح تاویل کی ہے کہ یہ حرکت دینا نماز میں متواتر حضور کو یاد دلاتی ہے کیونکہ یہ شیطان کو بھگاتی ہے اور اسے دور کرتی ہے جیسا کہ سفیان نے روایت کیا ہے اور جو کلمہ شہادت کے تلفظ کے وقت انگلی کو متواتر حرکت دینے کے قائل نہیں ہیں وہ حرکت میں تاویل کرتے ہیں گویا وہ اپنی اس انگلی کے ساتھ توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 31: نماز میں عورت کے بیٹھنے کے بارے میں اختلاف ہے، امام نے فرمایا: یہ مرد کی طرح ہے، اور یہ احرام کے بعد لباس اور بلند آواز سے تہلیل کہنے کے علاوہ کسی معاملے میں مرد سے مختلف نہیں۔ امام ثوری نے کہا: عورت ایک جانب سے اپنی چادر کا سدل کرے گی۔ انہوں نے یہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے فرمایا: عورت کے لیے جس طرح آسان ہوگا وہ اس طرح بیٹھے گی۔ یہ شعبی کا قول ہے: وہ بیٹھے گی جس طرح اس کے لیے آسان ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: عورت اس طرح بیٹھے گی جس میں اس کے لیے زیادہ پردہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 32: مسلم نے حضرت طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے حضرت ابن عباس سے قدموں پر بیٹھنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ سنت ہے (1)۔ ہم نے حضرت ابن عباس سے کہا: ہم تو اسے آدمی کے لئے جفا دیکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے پھر علماء کا اقعا کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا: اقعا یہ ہے کہ آدمی اپنی سرین کے بل بیٹھے جبکہ رانیں کھڑی کیے ہوئے ہو جیسے کتا اور درندہ بیٹھتا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ اقعا مجمع علیہ ہے اس میں علماء کا اختلاف نہیں یہ اہل لغت اور فقہاء کے ایک گروہ کی تفسیر ہے۔ ابوعبید نے کہا: رہے اہل حدیث وہ اقعا یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی سرین دو سجدوں کے درمیان اپنی ایڑیوں پر رکھے۔ قاضی عیاض نے کہا: میرے نزدیک بہتر اقعا کی تاویل جس کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ سنت وہ ہے جس کی تفسیر فقہاء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب جواز الاقعاء علی العقبین، صفحہ 202، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دو سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے سے کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر ملتی ہے کہ سنت یہ ہے کہ تیری ایڑیاں تیری سرین کو چھوئیں۔ ابراہیم بن میسرہ نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قاضی نے فرمایا: سلف اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے مگر عام فقہاء نے یہ نہیں کہا ہے وہ اسے اقعا کا نام دیتے ہیں۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرات ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کو دیکھا کہ وہ دو سجدوں کے درمیان اقعا کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 33: جن علماء نے سلام کے وجوب اور عدم وجوب کا قول کیا ہے ان کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دوسرا سلام فرض نہیں ہے مگر حسن بن حی سے مروی ہے کہ انہوں نے دونوں سلاموں کو واجب قرار دیا ہے۔ ابوجعفر طحاوی نے فرمایا: ہم نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا کہ وہ دوسرے سلام کو نماز کے فرائض سے سمجھتے ہوں۔ ابن عبدالبر نے کہا: حسن بن حی کی دونوں سلاموں کے وجوب کی دلیل یہ ہے، فرماتے ہیں: اگر پہلے سلام کے بعد کسی کو حدث لاحق ہو جائے جبکہ ابھی دوسرا سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز کی تحلیل سلام ہے پھر سلام کی کیفیت بیان فرمائی کہ وہ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرے اور ایک سلام کو واجب کہنے والوں کی حجت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **تحلیلها التسلیم**۔ یعنی نماز کی تحلیل سلام ہے۔ علماء فرماتے ہیں: ایک سلام پر تسلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ اس اصل پر مبنی ہے کہ کم از کم اسم کو لیا جائے یا تمام کو لیا جائے۔ جب بالا جماع نماز میں داخل ہونا ایک تکبیر کے ساتھ ہے تو نماز سے نکلنا بھی ایک سلام کے ساتھ ہے مگر سنن ثابتہ وارد ہیں۔ مثلاً حضرت ابن مسعود کی حدیث، حضرت وائل بن حجر حضرمی کی حدیث، حضرت عمار کی حدیث، حضرت براء بن عازب کی حدیث، حضرت ابن عمر کی حدیث، حضرت سعد بن ابی قاص کی حدیث ...... کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سلام پھیرتے تھے (1)۔ ابن جریج، سلیمان بن بلال، عبدالعزیز ابن محمد دراوردی یہ تمام عمرو بن یحییٰ المازنی سے وہ محمد بن یحییٰ حبان سے وہ اپنے چچا واسع بن حبان سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتائیں کہ وہ کیسے تھا؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے تکبیر کا ذکر کیا جب آپ سر اٹھاتے تھے اور جب بھی سر کو پست کرتے تھے اور دائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا ذکر فرمایا۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اسناد مدنی صحیح ہے اور مدینہ طیبہ میں مشہور عمل ایک سلام ہے۔ اہل مدینہ یہ عمل نسل در نسل کرتے آ رہے ہیں۔ اس کی مثل سے ہر شہر میں عمل کے ساتھ احتجاج صحیح ہے کیونکہ ہر روز کئی مرتبہ واقع ہونے کی وجہ سے وہ عمل مخفی نہیں رہتا۔ اسی طرح کوفہ وغیرہ میں بھی دو سلاموں پر عمل ہے اور یہ ان کے نزدیک متوارث ہے ہر عمل میں جو اس طرح جاری ہو تو وہ مباح میں اختلاف ہوتا ہے جیسے اذان۔ اسی طرح حجاز، عراق، شام اور مصر کے کسی عالم سے ایک سلام اور دو سلاموں کا انکار مروی نہیں بلکہ ان کے نزدیک سلام معروف ہے۔ ایک سلام والی حدیث کو حضرات سعد بن ابی وقاص، عائشہ، انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے مگر وہ معلول ہے محدثین اسے صحیح قرار نہیں دیتے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التسلیم فی الصلوٰۃ، صفحہ 39، جلد 1 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 34: دارقطنی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ التحیات آہستہ پڑھا جائے۔ حضرت امام مالک نے حضرت عمر کے تشہد کو اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ التحیات للہ الزاکیات للہ الطیبات الصلوات للہ السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ (1)۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب، لیث بن سعد نے حضرت ابن عباس کا تشہد اختیار کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ، السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ (2)۔ ثوری، کوفی علماء اور اکثر اہل حدیث نے حضرت ابن مسعود کا تشہد اختیار کیا ہے جو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یہ کہتے تھے: السلام علی اللہ السلام علی فلان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: بے شک اللہ ہی السلام ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھے تو اس طرح کہے: التحیات للہ و الصلوات و الطیبات السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین...... جب یہ کہے گا تو ہر عبد صالح کو سلام پہنچ جائے گا جو بھی آسمان اور زمین میں ہوگا...... اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ پھر اسے اختیار ہے جو چاہے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے (3)۔

امام احمد، اسحاق اور داؤد کا یہی قول ہے۔ احمد بن خالد نے اندلس میں اسی کو اختیار فرمایا اور اسی کی طرف میلان کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مرفوعاً اور موقوفاً حضرت ابن مسعود کے تشہد جیسا مروی ہے۔ یہ سب اختلاف مباح میں ہے اس میں سے کوئی چیز واجب نہیں الحمد للہ وحدہ یہ تمام احکام امام اور مقتدی کے تھے جن کو وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (البقرہ) کا ارشاد اپنے ضمن میں لئے ہوئے تھا اور نماز میں قیام کا ذکر قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ (البقرہ) کے تحت آئے گا۔

مریض امام کا حکم اور نماز کے دوسرے احکام بھی وہاں بیان ہوں گے اور امام کے علاوہ مریض کی نماز کا حکم سورۂ آل عمران میں آئے گا اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کا حکم صلوۃ خوف کے ضمن میں آئے گا۔ اور سورۂ مریم میں اس امام کا حکم جو مقتدی سے بلند ہو کر نماز پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ نماز کے اوقات، اذان، مساجد کے احکامات وغیرہ بیان ہوں گے۔ یہ سب وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ کے ارشاد کا بیان ہے۔ سورت کی ابتدا میں نماز کے جملہ احکام بیان ہو چکے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

”کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم اتنا بھی

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوۃ، صفحہ 72، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 142، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب التشھد، حدیث 828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب التشھد فی الصلوۃ، صفحہ 173، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نہیں سمجھتے"۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ یہ استفہام ہے اس کا معنی زجر و توبیخ ہے (1) اور اہل تاویل کے نزدیک اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مدینہ طیبہ کے یہودی اپنے کسی سسرالی رشتہ والے یا کسی قرابت دار یا کسی رضاعی رشتہ دار کو کہتے جو مسلمانوں میں سے ہوتا تو اس دین پر قائم رہ جس پر تو ہے، جس کا تجھے یہ شخص حکم دیتا ہے اس سے ان کی مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ کیونکہ اس کا امر حق ہے وہ لوگوں کو اس کا حکم دیتے تھے اور خود ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہود کے علماء اپنے مقلدین اور اپنے پیروکاروں کو تورات کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے انکار میں تورات کی مخالفت کرتے تھے (2)۔ ابن جریج نے کہا: علماء یہود لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارتے تھے اور خود گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا: وہ لوگوں کو صدقہ پر ابھارتے تھے اور خود بخل کرتے تھے (3)۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ بعض اہل اشارات نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں سے معانی کے حقائق کا مطالبہ کرتے ہو اور تم اس کے نقوش کے ظاہر کی مخالفت کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2: جس شخص کی یہ صفت ہو وہ سخت عذاب میں ہوگا۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں کچھ لوگوں کے اوپر سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ اہل دنیا کے خطباء ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں حالانکہ یہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (4) کہا جائے گا: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے: ہم وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اگرچہ کمزوری ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیب بن جحدر ہے امام احمد اسے ضعیف کہتے تھے۔ اسی طرح ابن معین نے یہ حدیث ابو غالب عن ابی امامہ صدی بن عجلان الباہلی کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ ابو غالب وہ جس کے بارے میں یحییٰ بن معین نے بیان کیا ہے کہ حزور القرشی مولیٰ خالد بن عبد اللہ بن اسید ہے۔ بعض نے فرمایا: باہلہ کا غلام تھا بعض نے فرمایا: عبد الرحمن حضرمی کا غلام تھا۔ تجارت کے لئے شام میں آتا جاتا تھا۔ یحییٰ بن معین نے کہا: یہ صالح الحدیث ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس حدیث کے ہم معنی حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائیگا پھر اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا پھر جلدی سے اس کے پیٹ سے انتڑیاں باہر آجائیں گی وہ ان کے اردگرد اس طرح گھومے گا جیسے گدھا چکی کے اردگرد گھومتا ہے، دوزخی لوگ اس پر جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہوا کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میں نیکی کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 137، جلد 1
4۔ معالم التنزیل، صفحہ 75، جلد 1 (دار الفکر)

حکم دیتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا لیکن خود برائی سے رکتا نہیں تھا(1) (آگے مصنف نے حدیث کے الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے میں نے وہ حدیث کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے) میں کہتا ہوں: یہ حدیث اور آیت کریمہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو نیکی اور بدی کو جانتا ہے اور ہر ایک کے قیام کے وجوب سے باخبر ہے اسے بے علم سے زیادہ سزا ملے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرمات کی اہانت کرنے والا ہے اور اس کے احکامات کو خفیف سمجھنے والا ہے اور وہ ان لوگوں سے ہے جو اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس عالم کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اپنے علم سے نفع نہیں پہنچایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 3: اے قاری! اللہ تجھے توفیق بخشے! جان لے کہ اس آیت میں توبیخ نیکی کے فعل کے ترک کے سبب سے ہے نہ کہ نیکی کے حکم کے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس قوم کی مذمت فرمائی ہے جو نیک اعمال کا حکم دیتے ہیں اور ان پر خود عمل نہیں کرتے انہیں سخت توبیخ فرمائی ہے جو قیامت تک سارا زمانہ پڑھی جائے گی۔ فرمایا: **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ** منصور الفقیہ نے کہا اور خوب کہا:

ان قوماً یامرونا بالذی لا یفعلونا

لمجانین وان هم لم یکونوا یصرعونا

بے شک ایک قوم ہمیں اس بات کا حکم دیتی ہے جسے وہ خود نہیں کرتے۔ وہ نادان ہیں اگرچہ وہ گرتے نہیں ہیں۔

ابو العتاہیہ نے کہا:

وصفت التقی حتی کانك ذوتقی و ریح الخطایا من ثیابك تسطع

تو نے تقویٰ کی اس طرح صفت بیان کی حتیٰ کہ یوں لگا کہ تو صاحب تقویٰ ہے جبکہ تیرے کپڑوں سے گناہوں کی بدبو چھائی ہوئی ہے۔

ابو الاسود الدؤلی نے کہا:

لاتنه عن خلق و تاتی مثله عارٌ علیك اذا فعلت عظیم

وابدأ بنفسك فانها عن غیها فان انتهت عنه فانت حکیم

وهناك یقبل ان و عظت ویقتدی بالقول منك و ینفع التعلیم

تو ایسے خلق سے منع نہ کر جبکہ خود تو ایسا کرے، جب تو ایسا کرے گا تو تجھ پر یہ بڑی عار ہوگا۔ تو اپنے نفس سے آغاز کر اسے گمراہی سے روک اگر تیرا نفس گمراہی سے رک جائے گا تو تو حکیم ہوگا۔ اس وقت تیری بات قبول کی جائے گی اگر تو وعظ کرے گا اور تیری بات کی اقتدا کی جائے گی اور تعلیم نفع دے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب عقوبة من یامر بالمعروف ولا یفعله وینهی عن المنکر ویعمله صفحہ 412، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ کنز العمال، حدیث نمبر 28977، صفحہ 187، جلد 10 (مکتبۃ التراث الاسلامی)

ابوعمرو بن مطر نے کہا: میں ابوعثمان الحیری الزاہد کی مجلس میں حاضر تھا۔ وہ گھر سے باہر آئے اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ وعظ و نصیحت کے لئے بیٹھا کرتے تھے، وہ خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ ان کی خاموشی لمبی ہوگئی۔ ایک شخص نے انہیں آواز دی جو ابوالعباس کے نام سے مشہور تھے تو اپنے سکوت میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو ابوعثمان نے یہ شعر پڑھا:

و غیر تقی یامر الناس بالتقی طبیبٌ یداوی و الطبیب مریض

جو خود غیر متقی ہے وہ لوگوں کو تقویٰ کا حکم دیتا ہے، طبیب لوگوں کا علاج کرتا ہے حالانکہ طبیب خود مریض ہے۔

ابوعمرو نے کہا: رونے اور چیخنے کے ساتھ آوازیں بلند ہوگئیں۔

مسئلہ نمبر 4: ابراہیم النخعی نے کہا: تین آیات کی وجہ سے میں وعظ و نصیحت ناپسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (الآیۃ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الصف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ہود: 88) (میں ارادہ نہیں کرتا کہ میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں)۔

مسلم بن عمرو نے کہا۔

ما أقبح التزهيد من واعظ يزهد الناس و لا يزهد

لوكان فی تزهيده صادقاً اضحیٰ وامسیٰ بيته المسجد

ان رفض الدنيا فيا باله يستمنح الناس ويسترفد

والرزق مقسوم علی من تری يناله الابيض والاسود

اس واعظ کا لوگوں کو زہد کی تلقین کرنا کتنا برا ہے جو لوگوں کو زہد کی تلقین کرتا ہے اور خود زہد اختیار نہیں کرتا، اگر وہ زہد کی تلقین میں سچا ہوتا تو صبح و شام اس کا گھر مسجد ہوتا۔ اگر وہ دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا تو وہ لوگوں سے عطیہ طلب نہ کرتا اور بخشش نہ مانگتا۔ رزق تقسیم ہو چکا ہے ان لوگوں پر جنہیں تو دیکھتا ہے، سفید اور سیاہ اسے حاصل کر رہا ہے۔

حسن نے مطرف بن عبداللہ سے کہا: اپنے دوستوں کو نصیحت کرو۔ مطرف نے کہا: میں وہ کہنے سے ڈرتا ہوں جو میں کرتا نہیں۔ حسن نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، ہم میں سے کون ہے جو وہی کرتا ہے جو وہ کہتا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس حال کے ساتھ کامیاب ہو جائے، کوئی شخص نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے ربیعہ بن ابی عبدالرحمن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر کو یہ فرماتے سنا کہ اگر آدمی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے تاکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ پائی جائے تو پھر کوئی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے فرمایا، انہوں نے سچ فرمایا، کون ہے وہ جس میں ایسی بات نہ ہو (یعنی ہر شخص نیکی کا حکم دیتا ہے اور خود پوری طرح نیکی نہیں کرتا۔)

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بِالْبِرِّ یہاں البر سے مراد طاعت اور عمل صالح ہے۔ البر کا معنی سچائی بھی ہے۔ البر، لومڑی کے بچے کو بھی کہتے ہیں۔ البر، بکریوں کے ہانکنے کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: لا یعرف ھراً من بر یعنی

بکریوں کے چرواہے نہیں جانتے کہ کون بکریوں کو ہانک کرلے گیا ہے (اور اس کا لفظی معنی ہے: وہ بلی اور چوہے میں فرق نہیں کر سکتا) یہ مشترک لفظ ہے۔ شاعر نے کہا:

لا ھم رب ان بکراً دونکا　　　یبرك الناس و یفجرونکا

''یترك الناس'' سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے لوگ تجھے عطیہ دیتے ہیں۔

مابعد شعر میں البر کا معنی دل ہے۔

اکون مکان البر منه و دونه　　　واجعل مالی دونه و اوامرُہ

البر با کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی معروف ہے (یعنی گندم) اور با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اجلال اور تعظیم کرتا ہے۔ اسی سے ہے ولد برٌ و بار یعنی بچہ اپنے والدین کی تعظیم کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو ترک کرتے ہیں۔ النسیان (نون کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی کبھی ترک کرنا ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) (جب انہوں نے بھلا دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (انعام: 44) (جب انہوں نے بھلا دیا اسے جس کے ساتھ نصیحت کی گئی تھی)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ (البقرہ: 237) اور تم آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ یہ یاد اور حفظ کا متضاد ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث ہے نَسِیَ آدم فنسیت ذریتہ (1)، حضرت آدم بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: رجل نسیان، کسی چیز کو بہت زیادہ بھولنے والا شخص۔ و قد نَسِیت الشیٔ نِسیاناً (بکسر نون کہے گا) تو نَسیاناً نہیں کہے گا۔ کیونکہ النَسیان، یہ نسا کا تثنیہ ہے جس کا معنی رگ ہے۔

انفس یہ نفس کی جمع ہے اور جمع قلت ہے۔ النفس کا معنی روح بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت نفسه اس کی روح نکل گئی۔

ابوخراش نے کہا

نجا سالم و النفس منه بشدقه　　　و لم ینج الا جفن سیف و مئزراً

سالم نے نجات پائی جبکہ اس کی سانس اس کے ہونٹ کے کنارے پر تھی اور اس نے تلوار کی میان اور چادر کے ساتھ نجات پائی۔

النفس سے مراد روح ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: 42) (اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک اس آیت میں الانفس سے مراد ارواح ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3290، 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت بلال نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: اخذ بنفسی یا رسول اللہ الذی اخذ بنفسك۔ (1) میری روح کو بھی اس نے قبض کر لیا جس نے آپ کی روح کو قبض کر لیا...... یہ ابن شہاب کی حدیث میں ہے، اور حضرت زید بن اسلم کی حدیث میں ہے: ان اللہ قبض ارواحنا و لو شاء لردھا الینا فی حین غیر ھذا...... (2) اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کر لیا اگر وہ چاہتا تو اس وقت کے علاوہ ہماری طرف انہیں لوٹا دیتا، یہ دونوں روایات امام مالک نے روایت کی ہیں۔ یہ معنی اولیٰ ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ النفس سے مراد خون بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سالت نفسہ اس کا خون بہہ پڑا۔ شاعر نے کہا:

تسیل علی حد السیوف نفوسُنا و لیست علی غیر ظبات تسیل

ہمارے خون تلواروں کی انیوں پر بہتے ہیں، تلواروں کی انیوں کے بغیر یہ بہتے ہی نہیں۔

ابراہیم نخعی نے کہا: مالیس لہ نفس سائلۃٌ وہ جانور جس کا بہنے والا خون نہیں ہوتا وہ پانی میں مر جائے تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ النفس سے مراد جسد بھی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئتُ ان بنی سحیم ادخلوا ابیاتھم تامورَ نفس المنذر

مجھے بتایا گیا ہے کہ بنی سحیم نے اپنے گھروں میں منذر کے جسم کا خون داخل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ جو سمجھے تو اس کے لئے یہ بڑی توبیخ ہے۔ تَتْلُوْنَ کا معنی پڑھنا ہے۔ الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ جس نے یہود کی طرح عمل کیا وہ ان کی مثل ہے تلاوت کی اصل اتباع ہے۔ اسی وجہ سے یہ قراءت (پڑھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ بعض کلام حروف میں بعض کے تابع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ترتیب پر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: تلوتہ تلواً میں نے اس کی اتباع کی۔ تلوت القرآن تلاوۃً۔ میں نے قرآن کی تلاوت کی۔ تلوت الرجل تلواً کسی کو رسوا کرنا۔ التلیۃ اور التُلاوۃ (تاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بقیہ ہے۔ کہا جاتا ہے: تلیت لی من حقی تلاوۃ و تلیۃ یعنی میں نے اپنے لیے اپنے حق سے باقی رکھا۔

اتلیتُ، ابقیت (میں نے باقی چھوڑا) تتلّیت حقی۔ میں نے اپنے حق کا پیچھا کیا حتیٰ کہ اسے پورا وصول کر لیا۔ ابو زید نے کہا: تلی الرجل جب انسان زندگی کے آخری سانسوں میں ہو۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی تم اپنے نفسوں کو ہلاکت کی جگہوں سے نہیں روکتے۔ العقل کا معنی روکنا ہے، اسی سے عقال البعیر ہے، اونٹ کی رسی جو اسے حرکت سے روکتی ہے۔ العقل کا معنی دیت ہے کیونکہ وہ مقتول کے ولی کو قاتل کے قتل سے روکتی ہے۔ اسی سے ہے: اعتقال البطن واللسان، پیٹ اور زبان کو روکنا۔ اسی وجہ سے قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے۔ العقل، یہ جہالت کی نقیض ہے، العقل اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جسے عربوں کی عورتیں بناتی تھیں اس کے ساتھ ہودج کو لپیٹا جاتا تھا۔ علقمہ نے کہا:

عقلاً و رقماً تکاد الطیر تخطفہ کانہ من دم اجواف مدموم

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلوٰۃ، باب النوم عن الصلوٰۃ، صفحہ 9، قدیمی کتب خانہ 2۔ ایضاً صفحہ 10

سرخ، منقش کپڑا قریب تھا پرندے اسے اچک لیتے، گویا وہ پیٹوں کے خون سے سرخ کیا گیا ہے۔

الـمـدمـوم سے مراد سرخ ہے اور اس شعر میں یہی معنی مراد ہے، اور الـمـدمـوم سے مراد چربی سے بھرا ہوا اونٹ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ دو چادریں ہیں۔ ابن فارس نے کہا: وہ کپڑا جس کا نقش طول میں ہو اسے عقل کہتے ہیں اور جس کا نقش گول ہو اسے رقم کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عاقل وہ ہے جو اس پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے اور جاہل وہ ہے جو احکام الٰہیہ پر عمل نہ کرے۔

مسئلہ نمبر 9: اہل حق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقل مخلوق اور موجود ہے نہ وہ قدیم ہے نہ معدوم ہے کیونکہ اگر معدوم ہوتی تو اس کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ بعض ذوات مختص نہ ہوتیں جب اس کا وجود ثابت ہے تو اس کے قدیم ہونے کا قول محال ہے کیونکہ اس بات پر دلیل قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے جیسا کہ بیان اسی سورت میں اور دوسری سورتوں میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ عقل قدیم ہے پھر بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ عقل بدن میں ایک جوہر لطیف ہے اس سے اس کی شعاعیں پھیلتی ہیں جس طرح گھر میں چراغ کی شعاعیں پھیلتی ہیں۔ اس کے ذریعے معلومات کے حقائق کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جوہر بسیط ہے یعنی غیر مرکب ہے پھر اس کے محل کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: عقل کا محل دماغ ہے کیونکہ دماغ حس کا محل ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اس کا محل دل ہے کیونکہ دل حیات کا معدن اور حواس کا مادہ ہے۔ عقل کے بارے میں یہ قول کہ یہ جوہر ہے، یہ فاسد ہے اس حیثیت سے کہ جواہر ہم مثل ہوتے ہیں۔ اگر جوہر عقل ہوتا تو ہر جوہر عقل ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: عقل اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے معانی کے حقائق میں سے اشیاء جس پر قائم ہیں۔ یہ قول اگرچہ پہلے قول کے زیادہ قریب ہے، لیکن اس جہت سے درست ہونے سے دور ہے کہ ادراک زندہ کی صفات سے ہے، اور عقل عرض ہے اس سے یہ چیز محال ہے جیسا کہ اس کا ملتذ اور مشتہی ہونا محال ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری، استاذ ابواسحاق اسفرائینی وغیرہما فرماتے ہیں: عقل، علم ہے اس دلیل سے کہ یہ نہیں کہا جاتا: عقلت و ما علمت او علمت و ما عقلت (میں نے سمجھا اور جانا نہیں یا میں نے جانا اور سمجھا نہیں) قاضی ابوبکر نے کہا: واجبات کے وجود، جائزات کے جواز اور مستحیلات کے استحالہ کے علوم ضروریہ کا نام عقل ہے، یہ ابوالمعالی نے ''الارشاد'' میں اختیار فرمایا ہے اور ''البرہان'' میں انہوں نے یہ اختیار فرمایا کہ عقل ایک صفت ہے جس کے ذریعے علوم کا ادراک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قاضی کے مذہب پر اعتراض کیا اور قاضی کے مذہب کے فساد پر استدلال کیا۔ ''البرہان'' میں محاسبی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل ایک فطرت ہے، استاذ ابوبکر نے امام شافعی، ابوعبداللہ بن مجاہد سے حکایت کیا ہے کہ ان دونوں نے فرمایا: عقل تمیز کا آلہ ہے۔ ابوالعباس القلانسی سے حکایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل تمیز کی قوت ہے۔ محاسبی سے حکایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: عقل انوار اور بصائر ہیں پھر ان اقوال کو مرتب کیا اور چند محامل پر انہیں معمول کیا۔ فرمایا: اولیٰ یہ ہے کہ یہ نقل امام شافعی اور ابن مجاہد سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آلہ تو مثبت چیز میں استعمال ہوتا ہے اور اعراض میں اس کا استعمال مجازاً

ہے۔ اسی طرح جنہوں نے کہا کہ یہ قوت ہے (یہ بھی صحیح نہیں ہے) کیونکہ قوت سے صرف قدرت سمجھی جاتی ہے۔
قلانسی نے جو اطلاق کیا ہے وہ عبارات میں مجاز کی بناء پر ہے، اسی طرح محاسبی کا قول ہے عقل نہ تو صورت ہے نہ نور ہے بلکہ اس کے ذریعے انوار و بصائر کو حاصل کیا جاتا ہے۔ آیت توحید کے تحت اس کے فائدہ کا بیان ان شاء اللہ اسی سورت میں آئے گا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

''اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے نہیں''۔
اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، الصبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ قتل فلان صبراً، فلاں باندھا گیا اور روکا گیا حتیٰ کہ تلف ہو گیا۔ صبرت نفسی علی الشیء میں نے اپنے آپ کو اس کام پر روکا۔ المصبورۃ۔ وہ جس سے منع کیا گیا ہو۔ حدیث میں اس سے مراد وہ جانور ہے جو موت پر روکا گیا ہو، اسی کو المجثمہ بھی کہتے ہیں۔ عنترہ نے کہا:

فصبرت عارفة لذالك حرة　　ترسو اذا نفس الجبان تطلع

میں نے اس وجہ سے آزاد عارفہ سے اپنے آپ کو روکا جو ٹھہری ہوئی تھی جبکہ بزدل کا نفس جھانک رہا تھا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے اطاعت پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور کتاب اللہ میں مخالفت سے رکے رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: واصبروا۔ کہا جاتا ہے: فلان صابر عن المعاصی جب کوئی گناہوں سے بچے اور طاعت پر قائم رہے، جو کچھ صبر کے بارے میں کہا گیا اس میں سے یہ قول بہتر ہے۔ نحاس نے کہا: جو مصیبت پر صبر کرے اسے صابر نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے صابر علی کذا، اس پر صبر کرنے والا ہے۔ جب مطلق صابر کہا جائے تو پھر اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّلٰوةِ تمام عبادات میں سے الصَّلٰوةِ (نماز) کو خاص طور پر ذکر فرمایا اس کے ذکر کی بلندی کے لئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز کی طرف پناہ لیتے۔ اسی سے وہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے بھائی قثم کی موت کی خبر دی گئی ...... بعض نے فرمایا: ان کی بیٹی کی موت کی خبر دی گئی ...... جبکہ وہ سفر میں تھے تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا یہ پوشیدہ چیز تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا۔ یہ مؤنث تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی کفایت فرمائی یہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بھیجا۔ پھر راستہ سے ایک طرف ہو گئے اور نماز پڑھی۔ پھر اپنی سواری کی طرف واپس آئے اور یہ پڑھ رہے تھے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اس تاویل پر نماز سے مراد شریعت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لغت میں اپنے عرف پر اس کا معنی دعا ہے۔ پس اس تاویل پر یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مشابہ ہوگی اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ (انفال:45)

کیونکہ ثبات سے مراد صبر ہے۔ ذکر سے مراد دعا ہے اور تیسرا قول مجاہد نے کیا اس آیت میں الصبر سے مراد روزہ ہے، اسی

وجہ سے رمضان کو شہر الصبر کہا جاتا ہے۔ پس اس قول کی مناسبت سے روزہ اور نماز مناسب ہیں کیونکہ روزہ شہوات سے روکتا ہے اور دنیا میں عدم دلچسپی پیدا کرتا ہے نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے اس میں خشوع کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے جو قرآن آخرت کی یاد دلاتا ہے (1)...... واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: اذیتوں پر صبر کرنا اور طاعات پر صبر کرنا یہ نفس کے جہاد سے ہے اور نفس کی شہوات کو ختم کرنے اور لالچ سے اسے روکنے کے باب سے ہے۔ یہ انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق میں سے ہے۔ یحییٰ بن الیمان نے کہا: صبر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا اس کے علاوہ کی تمنا نہ کر اور رضا یہ ہے تو اپنی دنیا و آخرت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو۔ شعبی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کا ایمان سے اس طرح کا تعلق ہے جو سر کا تعلق جسم سے ہے۔ طبری نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان دل کی معرفت، زبان کے اقرار اور عمل بالجوارح کا نام ہے جو عمل بالجوارح پر صبر نہیں کرتا وہ ایمان کے اطلاق کا مستحق نہیں ہوتا اور عمل بالشرائع پر قائم رہنا بالکل ایمان کے ساتھ اس کا وہی تعلق ہے جو سر کا جسم کے ساتھ تعلق ہے کہ انسان کا جسم مکمل نہیں ہوتا مگر یہ کہ سر موجود ہو۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزا کا ذکر فرمایا اور اعمال کے لئے جزا کی ایک حد ذکر فرمائی۔ فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام: 160) (جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لئے دس ہوں گی) اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی جزا سے زیادہ بیان فرمائی۔ فرمایا: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (البقرہ: 261) (مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ) اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بنایا۔ اور صبر کرنے والوں کی مدح بیان فرمائی، فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر) (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔ اور فرمایا: وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ) (اور جو شخص (ان مظالم پر) پر صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

بعض علماء نے فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ (الزمر: 10) میں صابرون سے مراد روزے دار ہیں کیونکہ صحیح سنت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد مروی ہے، الصیام لی وانا اجزی بہ (2) (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا) روزے کا ثواب ذکر نہیں فرمایا جس طرح کہ صبر کی جزا ذکر نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6: صبر کی فضیلت...... اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف صبر سے بیان فرمایا جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیس احدٌ اولیس شیء اصبر علی اذی سمعہ من اللہ تعالیٰ انہم لیدعون لہ ولداً وانہ لیعافیہم ویرزقہم (3)۔ (اللہ تعالیٰ سے کوئی اذیت پر زیادہ صبر کرنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 137، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 254، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، حدیث 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ایضاً صفحہ 901، جلد 2۔ ایضاً، کتاب الادب، باب الصبر علی الأذی، حدیث 5634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والا نہیں جسے وہ سنتا ہے، مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹا ہونے کا قول کرتے ہیں لیکن پھر وہ انہیں عافیت بھی دیتا ہے اور انہیں رزق بھی دیتا ہے۔) اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صبر کے ساتھ وصف بیان فرمایا تو صبر سے مراد حلم ہے اور حلم سے متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سزا کے مستحقین کو فوری سزا نہیں دیتا اس میں تاخیر فرماتا ہے...... اور اللہ تعالیٰ کا صبر کے ساتھ موصوف ہونا قرآن میں وارد نہیں ہے بلکہ حدیث حضرت ابوموسیٰ میں وارد ہے اہل سنت نے صبر کی تاویل حلم سے کی ہے یہ ابن فورک وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں الصبور کا لفظ آیا ہے یہ مجرموں سے حلم میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ ضمیر کے مرجع میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع صرف خاص طور پر نماز ہے کیونکہ یہ نفوس پر اتنی بھاری ہوتی ہے جتنا روزہ بھاری نہیں ہوتا، یہاں صبر سے مراد روزہ ہے اور نماز میں نفوس کی قید ہے اور روزہ میں شہوت کو ختم کرنا ہے۔ پس جو ایک شہوت سے یا دو شہوتوں سے رکا ہوا ہے وہ اس شخص کی مانند نہیں جو تمام شہوات سے روکا گیا ہے۔ پس روزہ دار کو عورتوں، کھانے اور پینے کی شہوت سے روکا جاتا ہے پھر تمام شہوات کلام، چلنے اور مخلوق سے ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پھر ان اشیاء کی وجہ سے وہ تسلی پاتا ہے جن سے اسے روکا گیا ہوتا ہے، جبکہ نمازی ان تمام شہوات سے رکتا ہے، اس کے تمام اعضاء نماز کے ساتھ مقید ہوتے ہیں اور تمام شہوات سے دور ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو نماز نفس پر زیادہ بھاری اور مشکل ہوئی، اسی وجہ سے فرمایا: یہ بہت بھاری ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اِنَّهَا کی ضمیر سے مراد دونوں (صبر اور نماز) ہیں لیکن اغلبؔ سے کنایہ فرمایا اور وہ نماز ہے جیسے ارشاد فرمایا: وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (توبہ:34) (اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا، چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں۔)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا (الجمعہ:11) (جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو اس کی طرف گئے) پہلی آیت میں ضمیر کو الفضۃ کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ اغلب اور اعم ہے، اور دوسری آیت میں تجارت کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ افضل اور اہم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: صبر چونکہ نماز میں داخل ہے اس لئے ضمیر نماز کی طرف لوٹا دی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ:62) اس آیت میں لم یرضوھما نہیں فرمایا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے۔ اسی طرح شاعر نے کہا:

ان شرخ الشباب والشعر الاسو د ما لم يعاص كان جنونا

اس شعر میں لم یعاصیا نہیں فرمایا اور ضمیر شباب کی طرف لوٹا دی کیونکہ شعر اس میں داخل ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر ہر ایک کی طرف لوٹائی لیکن اختصاراً حذف کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً (مومنون:50) اس آیت میں آیتین نہیں فرمایا اسی طرح شاعر کا قول ہے:

فمن يك أمسى بالمدينة رحله فأني و قيار بها لغريب

اور ایک شاعر نے کہا:

لکل هم من الهموم سعه		والصبح والمسی لا فلاح معه

پہلے شعر میں لغریب سے مراد لغربیان ہے اور دوسرے شعر میں لا فلاح معهامراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع عبادت ہے جو معنی کے اعتبار سے صبر اور صلاۃ کے ذکر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع مصدر ہے، اور وہ الاستعانة ہے جس کا تقاضا استعینوا ارشاد کر رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف بلاتے تھے ان میں سے صبر اور صلاۃ بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع کعبہ ہے کیونکہ نماز کا حکم اس کی طرف ہے۔ کبیرۃ سے مراد بھاری اور مشکل ہے اور یہ (انّ) کی خبر ہے، غیر قرآن میں وانه لکبیرة بھی جائز ہے۔ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ مگر ڈرنے والوں پر نماز خفیف (ہلکی) ہے۔ ارباب المعانی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ مگر جن کی ازل میں اجتباء اور ہدایت کے خصائص کے ساتھ تائید کی گئی ان پر بھاری نہیں۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلَى الْخٰشِعِيْنَ، خاشعون جمع ہے خاشع کی اس سے مراد تواضع کرنے والا ہے اور الخشوع نفس کی اس ہیئت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اعضاء میں سکون اور تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: خشوع دل میں ہوتا ہے، اور وہ نماز میں خوف اور آنکھوں کو جھکانا ہے۔ زجاج نے کہا: الخاشع وہ ہے جس پر خشوع اور ذلت کا اثر دکھائی دے جیسے خشوع الدار بعد الاقواء، یہ اصل ہے۔ نابغہ نے کہا:

رماد ككحل العين لأيا أبينه		ونؤی كجذم الحوض اثلم خاشع

مکان خاشعٌ ایسا مکان جس کے لئے رہنمائی نہ پائی جا سکے۔ خشعت الاصوات، یعنی آواز ساکن ہو گئیں۔

خشعت خراشي صدره۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب سینہ سے لیس دار تھوک باہر پھینکے۔ خشع ببصره یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اپنی نظر کو جھکا دے۔ الخشعة، زمین کا نرم ٹکڑا۔ حدیث پاک میں ہے: كانت خشعة على الماء ثم دحيت بعد، کعبہ پانی پر ایک نرم ٹکڑا تھا پھر بعد میں اس سے زمین پھیلائی گئی۔ بلدة خاشعةٌ ایسا شہر جو غبار آلود ہو اس میں کوئی اترنے والا نہ ہو۔ سفیان ثوری نے کہا: میں نے اعمش سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے ثوری! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع کو نہیں جانتا۔ میں نے ابراہیم نخعی سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے اعمش! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع بھی نہیں جانتا۔ خشوع موٹی خوراک کھانا، موٹا لباس پہننا اور سر جھکانا نہیں ہے بلکہ خشوع یہ ہے کہ تو شریف اور گھٹیا کو حق میں برابر دیکھے اور ہر اس فرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو تجھ پر فرض ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک نوجوان کو دیکھا وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے فلاں! اپنا سر اٹھا کیونکہ خشوع اس سے زائد نہیں ہوتا جو دل میں ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو مسلم آدمی کے لئے نرم کرے اور تو نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت اچھی طرح آئے گا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (مومنون) جس نے لوگوں کے لئے اس سے

زیادہ خشوع ظاہر کیا جو اس کے دل میں ہے تو اس نے نفاق پر نفاق ظاہر کیا۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: خاشع اس وقت تک نہیں ہوگا حتیٰ کہ ہر بال اس کے جسم پر خشوع کا اظہار کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (الزمر: 23)

میں کہتا ہوں: یہ خشوع محمود ہے، کیونکہ خوف جب دل کو لاحق ہوتا ہے تو ظاہر خشوع کو ثابت کرتا ہے، ایسا شخص ظاہری خشوع کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوتا، تو اسے دیکھے گا وہ سر جھکائے ہوئے متادب اور متذلل ہوگا۔ نیک لوگ اس قسم سے جو ان پر ظاہر ہوتا تھا اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مذموم خشوع وہ ہے جس میں تکلف ہوتا ہے، جان بوجھ کر رونا اور سر جھکانا ہوتا ہے جیسا کہ جہلاء کرتے ہیں تا کہ انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جائے، یہ شیطان کا دھوکا ہے اور انسان کے نفس کا فریب ہے۔ حضرت حسن نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب کے پاس سانس لیا گویا وہ پریشان ہے۔ حضرت عمر نے اسے مکا مارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بولتے تھے تو اپنی آواز سناتے تھے، جب چلتے تھے تو تیز چلتے تھے جب مارتے تھے تو سخت مارتے تھے آپ سچے احکام پر عمل کرنے والے تھے اور سچا خشوع رکھنے والے تھے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: الخاشعون سے مراد سچے مومن ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

"جو یقین کرتے ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ، الَّذِيْنَ محل جر میں ہے کیونکہ یہ خاشعین کی صفت ہے اور قطع کے اعتبار سے اس کو محل رفع میں کرنا بھی جائز ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہاں ظن بمعنی یقین ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿﴾ (الحاقہ) (مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں)۔

درید بن الصمہ نے کہا:

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج　سراتهم فی الفارسی المسرّد (1)

شاعر نے یہاں ظن بمعنی یقین استعمال کیا ہے۔

ابوداؤد نے کہا:

رُبَّ هم فرجته بغريم　و غيوب كشفتها بظنون

یعنی میں نے کتنے ہی غیوب کو یقین کے ساتھ کھولا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں ظن اپنے معنی میں صحیح ہے۔ کلام میں ان کے گناہوں کو چھپایا گیا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ وہ گنہگار ہیں۔ یہ مہدوی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تعسف ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 138، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فراء نے کہا: ظن کبھی جھوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بصری علماء اس معنی کو نہیں جانتے۔ ظن کی اصل اور اس کا فائدہ ''شک ہونا'' ہے جبکہ اپنے معتقدات میں سے کسی ایک کی طرف میلان ہو۔ کبھی ظن یقین کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت اور دوسری آیات میں ہے لیکن جوامر حس کی طرف نکلے اس کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً عرب جو شخص دکھائی دے رہا ہو موجود ہو اس کے لیے یہ نہیں کہتے أظن هذا انسانًا، تو اس کا استعمال اس صورت میں پائے گا جو ابھی حس کے دائرے میں نہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت اور شعر میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف:53) کبھی یقین بمعنی ظن ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورت کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ تو کہتا ہے: سوت به ظناً، واسأت به الظن (میں نے اسے برا گمان کیا) جب معرف باللام ہو تو الف داخل کراتے ہیں اور مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ سے مراد ہے جزاء ربهم بعض علماء نے فرمایا: یہ باب مفاعلہ ہے حالانکہ یہ عمل ایک طرف سے ہے۔ (فرمایا) یہ اس طرح ہے: عافاه الله۔ اَنَّهُمْ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کا پہلے اِنَّ پر عطف ہے اور قطع کے اعتبار سے اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے اِلَيْهِ سے مراد الى ربهم ہے بعض نے فرمایا الی جزاءه ہے۔ رٰجِعُوْنَ یہ دوبارہ اٹھنے، جزا اور ملک اعلیٰ کے سامنے پیش ہونے کا اقرار ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اس سے مراد ان کے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام لوگوں پر فضیلت مراد ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء بنائے، یہ ان کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے لئے یہ شرف نہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

''اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا یہ امر ہے اور اس کا معنی وعید ہے، تقویٰ پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔ يَوْمًا سے مراد اس دن کا عذاب اور ہول ہے۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے، يَوْمًا کی نصب اتَّقُوْا کی وجہ سے ہے، غیر قرآن میں یوم لا تجزی اضافت کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کلام میں حذف ہے اس میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: یوما لا تجزی فیه نفس پھر فیه کو حذف کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

و یوما شهدناه سليماً و عامراً

اس دن سلیم اور عامر قبیلوں میں حاضر تھے۔

اصل میں شھدنا فیه تھا۔ کسائی نے کہا: یہ خطا ہے فیه کا حذف جائز نہیں لیکن تقدیر اس طرح ہے: واتقوا یوما لا تجزیه نفس تھا پھر ضمیر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کا حذف کرنا جائز ہے کیونکہ ظروف کا ان کے نزدیک حذف کرنا جائز نہیں ہے اور فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں ہے: ھذا رجلاً قصدت ولا رایت رجلاً ارغب۔ جبکہ تیری مراد یہ ہو قصدت الیه و ارغب فیه۔ فرمایا: اگر یہ جائز ہوتا تو یہ بھی جائز ہوتا: الذی تکلمت زید۔ یعنی تکلمت فیه زید۔ فراء نے کہا: ضمیر اور فیه کا حذف کرنا جائز ہے۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ سیبویہ، اخفش اور زجاج کے نزدیک دونوں وجہیں جائز ہیں۔

لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے کسی سے مؤاخذہ نہ ہوگا اور کوئی نفس دوسرے کا دفاع نہیں کر سکے گا۔ جزی عنی ھذا الامر یجزی جیسے تو کہتا ہے قضی عنی۔ واجتزأت بالشیء اجتزاء کہا جاتا ہے جب تو کسی کی کفایت کرے۔ شاعر نے کہا:

فان الغدر فی الاقوام عارٌ وان الحر یجزء بالکراع

اقوام میں غدر عار ہے، بے شک آزاد شخص جانور کے بازو پر کفایت کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: اذا اجریت الماء علی الماء جزیٰ عنك۔ جب تو پیشاب کے اوپر پانی بہادے گا تو اس پر مکان کی طہارت کا حکم جاری ہوگا تجھے اس جگہ کو دھونے کی ضرورت نہیں اور کپڑے وغیرہ کے ساتھ پانی کو خشک کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ ابو بردہ بن نیار سے قربانی کے بارے میں صحیح حدیث میں ہے لن تجزی عن احد بعدك (1)۔ یعنی تیرے علاوہ کسی کے لئے بکری کا چھوٹا بچہ کفایت نہیں کرے گا۔ لَّا تَجْزِیْ کا معنی لا تقضی، لا تغنی اور لا تکفی ہے۔ یعنی وہ ادا نہیں کرے گا، فائدہ نہیں دے گا اور کفایت نہیں کرے گا اگر اس پر کسی کا حق نہ ہوگا اگر اس پر کسی کا حق ہوگا تو وہ اس کی نیکیوں کے اختیار کے بغیر کفایت کرے گا اور ادا کرے گا اور فائدہ دے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر اس کی عزت وغیرہ کے سلسلہ میں ظلم کیا ہو وہ آج ہی اس سے معاف کرا لے اس سے پہلے کہ نہ کوئی دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، اگر اس کا عمل صالح ہوگا تو اس کے ظلم کی مقدار اس سے عمل صالح لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں میں سے گناہ لے کر ظالم کے نامہ اعمال میں داخل کیے جائیں گے (2)۔ یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے اس کی مثل مفلس کے بارے میں حدیث ہے۔ ہم نے ''تذکرہ'' میں ذکر کر دی ہے۔ اسے مسلم نے تخریج کیا ہے اسے تجزئ تاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جزی اور اجزیٰ کا معنی ایک ہے۔ بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: جزی بمعنی قضی ہے کافأ اور اجزیٰ بمعنی اغنی و کفی ہے۔ اجزانی الشیء یجزئنی یعنی کفانی اس نے میری کفایت کی۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب الاکل یوم النحر، حدیث نمبر 902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامہ، حدیث نمبر 6053، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لواجزأت امر العالمین ولم یکن　　بلیجزی الا کامل و ابن کامل

تو نے تمام لوگوں کے معاملات کی کفایت کی اور کوئی کفایت نہیں کرتا سوائے کامل اور ابن کامل کے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ، شَفَاعَةٌ، شفع سے مشتق ہے جس کا معنی دو ہے۔ تو کہتا ہے: کان وتراً فشفعتہ شفعا وہ طاق تھا میں نے اسے جفت بنا دیا۔ اسی سے الشفعہ ہے کیونکہ اپنے شریک کی ملک کو اپنی ملک سے ملا دیتا ہے۔

الشفیع، شفعہ کرنے والے کو کہتے ہیں اور شفاعت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ناقۃ شافع ایسی اونٹنی جس کا حمل اور بچہ متواتر جمع ہو جائیں۔ تو کہتا ہے: شفعت الناقۃ شفعاً۔ ناقۃ شفوع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک ہی مرتبہ دوہنے میں دو برتن بھرنے والی ہو۔ استشفعتہ الی فلانٍ یعنی میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ میری اس کے پاس سفارش کرے۔ تشفعت الیہ فی فلانٍ فشفعنی۔ میں نے اسے فلاں کے پاس سفارش کرنے کے لئے کہا تو اس نے میری سفارش کی۔ پس شفاعت تب ہوگی جب تیرا غیر تیرے مرتبہ اور تیرے وسیلہ کے ساتھ ملے۔ یہ حقیقت میں جس کے پاس سفارش کی گئی ہے اس کے پاس شفیع کی منزلت و مرتبہ کا اظہار ہے اور اس کی منفعت مشفوع (جس کی سفارش کی گئی ہے) کو پہنچانا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت حق ہے۔ معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں: گنہگار مومنین جو آگ میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے لیکن اخبار ظاہر میں ہے کہ موحدین گنہگار انبیاء کرام کی امتوں میں سے ہوں گے انہیں ملائکہ، انبیاء، شہداء اور صالحین میں سے سفارش کرنے والوں کی سفارش پہنچے گی۔ قاضی نے معتزلہ کا رد کرتے ہوئے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے: (۱) وہ اخبار جو معنی میں متواتر ہیں۔ (۲) ان اخبار کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع۔ کسی بھی زمانہ میں کسی شخص سے ان احادیث کا انکار ظاہر نہیں ہوا۔ شفاعت پر مبنی روایات اور ان کی صحت اور قبولیت پر علماء کا اتفاق، اہل حق کے عقیدہ کی صحت اور معتزلہ کے دین کے فساد پر قطعی دلیل ہے۔

اگر وہ کہیں کہ کتاب اللہ میں ایسی نصوص وارد ہیں جو ان اخبار کو رد کرتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ حَمِیۡمٍ وَّلَا شَفِیۡعٍ یُّطَاعُ ۝ (غافر) (نہ ہوگا ظالموں کے لئے کوئی دوست نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے) وہ کہتے ہیں: گناہ کبیرہ کرنے والے ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ (النساء:123) (جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی) وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ (البقرہ:48) (اس سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی) ہم کہتے ہیں: یہ آیات ہر ظالم کے لئے عام نہیں ہیں اور عموم کے لئے وضع نہیں ہے اور یہ آیات ہر برے عمل کرنے والے اور ہر نفس کے لئے نہیں ہیں ان سے مراد کافر لوگ ہیں نہ کہ مومنین۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو شفاعت کے متعلق وارد ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کے لئے شفاعت کو ثابت کیا ہے اور بعض اقوام سے شفاعت کی نفی کی ہے۔ کافروں کی صفت میں فرمایا: فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیۡنَ ۝ (مدثر) (اور نہ نفع دے گی انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش) اور فرمایا: وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی (الانبیاء:28) (اور سفارش نہیں کریں گے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے) اور فرمایا: وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ

عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا:23) (اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو)
ہم نے ان تمام آیات سے جان لیا کہ شفاعت مومنوں کو نفع دے گی کافروں کو نفع نہ دے گی اور مفسرین کا اجماع ہے کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ سے مراد نفس کافرہ ہے نہ کہ ہر نفس، اگر ہم ہر ظالم گنہگار کے لئے عذاب کے عموم کا قول کریں بھی تو ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو ہم نے روایت کی ہیں اور دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (یوسف) (بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ۔)
اگر وہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) اور فاسق پر تو رضا نہیں ہوتی۔ ہم کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے لمن لا یرضی نہیں فرمایا بلکہ لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جن کے لئے شفاعت کو پسند کرے گا وہ توحید پرست ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا۝ (مریم) (انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے) نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق سے کیا عہد ہے؟ فرمایا: وہ ایمان لائیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں (1)۔ مفسرین نے کہا: مگر جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا۔ اگر وہ کہیں کہ جس پر اللہ راضی ہوتا ہے وہ توبہ کرنے والا ہے جس نے اللہ کی بارگاہ میں لوٹنے کا عہد کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے ان کے لئے مغفرت کرتے ہیں۔ اور فرمایا: فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (غافر:7) (بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی) اسی طرح انبیاء کرام کی شفاعت توبہ کرنے والوں کے لئے ہے اہل کبائر کے لئے نہیں ہے۔ ہم کہیں گے: تمہارے نزدیک اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے جب اللہ تعالیٰ گنہگار کی توبہ قبول کرے گا تو شفاعت اور استغفار کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اہل تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا (غافر:7) سے مراد یہ ہے کہ ان کی مغفرت فرما جنہوں نے شرک سے توبہ کی وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (غافر:7) یعنی مومنین کے راستہ کی اتباع کی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی مغفرت کرے ان کے گناہوں سے نہ کہ شرک سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔) اگر وہ کہیں کہ ساری امت نبی کریم ﷺ کی شفاعت میں رغبت رکھتی ہے، اگر یہ اہل کبائر کا خاصہ تھی تو ان کا سوال باطل ہوا۔
ہم کہیں گے ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی شفاعت طلب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رغبت رکھتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو کیونکہ ہر شخص کا عقیدہ ہے کہ وہ گناہوں سے سلامت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو فرض کیا ہے وہ اسے پوری طرح ادا کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے بارے میں نقص کا معترف ہے اسی وجہ سے ہر شخص سزا سے ڈرتا ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل مفهوم، حدیث نمبر 5510، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث 21991

نجات کی امید رکھتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص نجات نہیں پائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی بغیر رحمت الہیہ کے نجات نہیں پائیں گے؟ فرمایا: ''میں بھی نجات نہیں پاؤں گا مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ڈھانپ دیا ہے(1)''۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا يُقْبَلُ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تقبل تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ شفاعت مؤنث ہے۔ باقی قراء نے مذکر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ شفاعت بمعنی شفیع ہے۔ اخفش نے کہا: تذکیر (مذکر کا صیغہ) بہتر ہے کیونکہ تو نے فعل اور فاعل کے درمیان فرق کیا ہے جس طرح کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ:37) میں گزرا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، عَدْلٌ سے مراد فدیہ ہے۔ العدل عین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الفداء ہے اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی المثل ہے۔ کہا جاتا ہے: عَدْلٌ وعدیلٌ اس لئے بولا جاتا ہے جو وزن اور مقدار میں تیری مثل ہو۔ کہا جاتا ہے: عدل الشیء جو چیز قدر و قیمت میں دوسری چیز کے مساوی ہو اگرچہ اس کی جنس سے نہ بھی ہو۔ العدل (عین کے کسرہ کے ساتھ) جو چیز اپنی جنس سے دوسری چیز کے مساوی ہو اور جسم میں مساوی ہو۔ طبری نے حکایت کیا ہے عرب عین کے کسرہ کے ساتھ فدیہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں (2) اور اعدال کا واحد عِدْلٌ ہی ہے (یعنی عین کے کسرہ کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞ یعنی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ النصر کا معنی العون (مدد) ہے۔ الانصار، الاعوان۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران:52) یعنی کون اپنی نصرت کو میری نصرت کے ساتھ ملائے گا، انتصر الرجل، آدمی نے انتقام لیا۔ النصر کا معنی آنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نصرتُ ارض بنی فلاں، میں فلاں کی زمین میں آیا۔ شاعر نے کہا:

اذا دخل شهر الحرام فودعی بلاد تميم وانصری ارض عامر

جب شہر حرام داخل ہو تو تمیم کے شہروں کو الوداع کہہ اور عامر قبیلہ کی زمین میں آ۔

النصر کا معنی بارش بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نُصِرتِ الارضُ زمین پر بارش ہوئی۔ النصر کا معنی عطا بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

وانی واسطار سطرن سطرًا لقائل یا نصر نصرًا نصرا

ان سطور کی قسم جو لکھی گئی ہیں میں کہنے والا ہوں: اے عطا، عطا، عطا۔

اس آیت کا سبب جو علماء مفسرین نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں اور انبیاء کی اولاد ہیں، ہمارے آباء ہماری سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ قیامت کے روز سفارشات قبول نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب ان یدخل الجنۃ احد بعملہ برحمۃ اللہ تعالیٰ، صفحہ 377، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل، حدیث نمبر 5982، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 139، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائیں گی اور نہ فدیہ لیا جائے گا۔ شفاعت، فدیہ اور نصرت کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان چیزوں کے بنی آدم دنیا میں عادی ہیں۔ تکلیف میں مبتلا خلاصی نہیں پاتا مگر اس کے ساتھ کہ اس کی سفارش کی جائے، یا اس کی مدد کی جائے یا فدیہ دیا جائے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

''اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب یعنی ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے''۔

اس آیت میں تیرہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اِذْ حالت نصب میں ہے۔ اس کا اُذْكُرُوا نِعْمَتِيَ پر عطف ہے۔ یہ اور بعد والی آیات میں بنی اسرائیل کو وہ بعض نعمتیں یاد دلانا ہے جو ان پر تھیں۔ یعنی تم میری نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں دشمن سے نجات دی اور تم میں انبیاء بنائے۔ یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے اور مراد ان کے آباء ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ (الحاقہ) (یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں سوار کیا) بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَجَّيْنٰكُمْ کیونکہ آباء کی نجات، موجودہ لوگوں کی نجات کا سبب تھی اور نَجَّيْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے تمہیں زمین کی اونچی جگہ پر ڈالا، یہ اصل ہے پھر ہر کامیاب ہونے والے کو ناجی کہا گیا۔ پس ناجی وہ ہوتا ہے جو تنگی سے خوشحالی کی طرف نکلتا ہے اسے اذانجیتکم بھی پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اٰلِ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی قوم، اس کے متبعین اور اس کے دین کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح آل رسول جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین، آپ کی ملت پر تھے کسی زمانہ میں بھی ہوں، خواہ ان کا نسبی تعلق ہو یا نہ ہو، اور جو آپ کے دین اور ملت پر نہ ہو وہ آپ کے اہل اور آل سے نہیں ہے اگرچہ اس کا نسبی اور قربت کا تعلق موجود بھی ہو۔ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: آل رسول فقط حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (البقرہ: 50) اور یہ ارشاد ہے: اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (غافر) یعنی آل سے مراد اس کے دین کی آل ہیں جبکہ انہیں اس کے ساتھ بیٹا، بیٹی، چچا، بھائی اور عصبہ ہونے کا رشتہ نہ تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو مومن، موحد نہیں وہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی بھی ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آل نبی اور اہل نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نہیں تھے اگرچہ ان دونوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمایا: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: 46)

اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا:

خبردار! آلِ اَبِی...... یعنی فلان...... میرے اولیاء نہیں ہیں میرا مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں (1)۔ ایک طائفہ نے کہا: آل سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ کی اولاد ہے۔ کیونکہ حضرت ابو حمید کی حدیث میں ہے، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ اَبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: اہل معلوم ہیں اور آل سے مراد متبعین ہیں۔

پہلا قول صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ ﷺ دعا فرماتے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ۔ میرا باپ صدقہ لے کر آیا تو یہ دعا دی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِي اَوْفٰى (3)۔

مسئلہ نمبر 3: علمائے نحو کا اس میں اختلاف ہے کہ آل کو شہروں کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: آل فلان، آل فلانة، یہ نہیں کہا جاتا: هُوَ مِنْ آلِ حِمْصَ، اور نہ یہ کہا جاتا ہے: مِنْ آلِ الْمَدِيْنَه۔ اخفش نے کہا: رئیس اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے، جیسے آل محمد ﷺ۔ آل فرعون۔ کیونکہ فرعون گمراہی میں ان کا رئیس تھا۔ اخفش نے کہا: ہم نے شہروں کے بارے میں سنا، وہ کہتے ہیں: اهل المدينه، آل المدينه۔

مسئلہ نمبر 4: نحویوں کا اختلاف ہے کہ آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ نحاس، زبیدی اور کسائی نے اس سے منع کیا ہے۔ پس صرف یہ کہا جائے گا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ (ﷺ) وآله نہیں کہا جائے گا۔ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے گا: اهله۔ علماء کے ایک طائفہ کا خیال ہے کہ آله کہا جائے گا ان علماء میں سے ابن السید بھی ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ سماع صحیح اس کی تائید کرتا ہے۔ عبد المطلب کے قول میں ہے:

لا هُمَّ ان العبد يم نع رحله فامنع حلالك
وانصر على آل الصليب و عابديه اليوم آلك

ان اشعار میں آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

ندبہ نے کہا تھا:

أنا الفارس الحامي حقيقة والدي وآلي كما تحمي حقيقة آلكا

میں شہسوار ہوں اپنے والد کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں اور اپنی آل کی حفاظت کرنے والا ہوں جس طرح

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاة المومنین ومقاطعة غيرهم، صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ، صفحہ 175، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، باب الدعاء لمن اتی بصدقته، صفحہ 46-345، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہاری آل کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں۔

مسئلہ نمبر 5: آل کی اصل میں علمائے نحو کا اختلاف ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اصل اہل ہے پھر ھاء کو الف سے بدلا گیا۔ اگر تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اس کو اصل کی طرف لوٹائے گا۔ تو کہے گا: اُھَیْل۔ مہدوی نے کہا: اس کی اصل اول ہے۔ بعض نے فرمایا: اصل اھل تھا ھاء کو ہمزہ سے قلب کیا گیا پھر ہمزہ کو الف سے بدلا گیا۔ اس کی جمع آلون ہے، اس کی تصغیر اویل ہے جیسا کہ نسائی نے بیان کیا ہے دوسرے لوگوں نے اھیل حکایت کیا ہے ہم نے نحاس سے یہ ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: جب تو الا کی جمع بنائے گا تو کہے گا آلون اور جب تو الا کی جمع بنائے گا جس کا معنی سراب ہے تو تو کہے گا آوال، جیسے مال کی جمع اموال ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِرْعَوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس بادشاہ کا نام ہی فرعون تھا۔ بعض نے فرمایا: عمالقہ کے بادشاہوں میں سے ہر بادشاہ کا اسم فرعون تھا۔ جیسے فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا ہے روم کے بادشاہ کا اسم قیصر ہوتا ہے حبشہ کے بادشاہ کا اسم نجاشی ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا اسم قابوس تھا۔ اہل کتاب کے قول کے مطابق وہب نے کہا: اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس کی کنیت ابومرہ تھی۔ وہ بنی عملیق بن لاوذ بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے تھا۔ سہیلی نے کہا: ہر شخص جو قبطیوں اور مصر کا والی بنا وہ فرعون کہلاتا تھا۔ فرعون اہل اصطخر میں سے فارسی تھا۔ مسعودی نے کہا: فرعون کی عربی میں تفسیر معروف نہیں۔ جوہری نے کہا: فرعون، ولید بن معصب بادشاہ مصر کا لقب ہے۔ ہر سرکش فرعون ہے، العتاۃ، فراعنہ، قد تفرعن، و ھو ذو فرعنۃ، یعنی سازشی اور انکاری۔ حدیث پاک میں ہے: اَخَذْنَا فِرْعَوْنَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ ہم نے اس امت کے فرعون کو پکڑا۔

اس آیت میں فرعون حالت جری میں ہے لیکن عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسُوْمُوْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: وہ تمہیں چکھاتے ہیں۔ تم پر عذاب کو لازم کرتے ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: وہ تمہیں مستحق قرار دیتے ہیں، کہا جاتا ہے: سامہ خطۃ خسف۔ جب کسی ذلت کا مستحق قرار دیا جائے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

اذا ما الملك سام الناس خسفاً　　ابینا ان نقر الخسف فینا

جب بادشاہ نے لوگوں کو ذلیل کیا تو ہم نے اپنے اندر ذلت کے ٹھہرائے جانے کا انکار کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تمہیں ہمیشہ دیتے ہیں۔ السوم کا معنی دوام بھی ہے۔ اسی سے سائمۃ الغنم ہے جو ہمیشہ چرنے والی ہوتی ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ نیا کلام ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال کی حیثیت سے محل نصب میں کر دے۔ یعنی سائمین لکم۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ یہ يَسُوْمُوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہے، اس کا معنی سخت عذاب ہے اور سوم العذاب کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے اور اس کا سوما سیئا کے معنی میں نعت ہونا بھی جائز ہے۔ روایت ہے کہ

فرعون نے بنی اسرائیل کو خدام اور اپنے ماتحت کر دیا تھا اور ان میں اپنے کام تقسیم کر دیئے تھے۔ کچھ لوگ مکانات بناتے تھے، کچھ کھیتی باڑی کرتے تھے، کچھ خدمت کرتے تھے۔ اور فرعون کی قوم لشکر اور حکمران تھی اور بنی اسرائیل میں سے جس کا کوئی کام نہ تھا ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور یہی سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد ہے۔

مسئلہ نمبر 9: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ یہ یَسُوْمُوْنَكُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر بغیر واو عطف کے ہے۔ جیسا کہ سیبویہ نے کہا اور اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

متی تاتنا تلمم بنا فی دیارنا تجد حطبا جزلا و ناراً تآججا

جب ہمارے پاس آئے گا ہمارے شہروں میں اترے گا تو بہت زیادہ لکڑیاں روشن آگ پائے گی۔

فراء وغیرہ نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ بغیر واو کے یَسُوْمُوْنَكُمْ کی تفسیر کے طور پر ہے جیسے تو کہتا ہے: اتانی القوم زید و عمرو۔ پس تفسیر کی بنا پر زید سے پہلے واو کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال یہ بھی ہے: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ (فرقان)

اور سورۂ ابراہیم میں ویذبحون واو کے ساتھ ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں ذبح اور بغیر ذبح کے عذاب دیتے ہیں، پس یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ عذاب کی دوسری جنس ہے، ماقبل کی تفسیر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں یہ احتمال ہے کہ اس میں واو زائدہ ہو۔ اس کی دلیل سورہ بقرہ کی آیت ہے کبھی واو زائدہ بھی ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فلما اجزنا ساحة الحی وانتحٰی

اس مصرعہ میں واو زائدہ ہے۔ مراد قد انتحٰی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الی الملك القرم و ابن الهمام ولیث الكتیبة فی المزدحم

یہاں بھی الملك القرم، ابن الهمام، لیث الكتیبه، سے ایک ہی مراد ہے۔ یہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُذَبِّحُوْنَ اکثر قراء شد کے ساتھ پڑھتے ہیں کثرت کا معنی لینے کی بنا پر۔ ابن محیصن نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الذَّبح کا معنی الشق (چیرنا) ہے۔ الذِبح سے مراد مذبوح (ذبح کیا گیا) ہے۔ الذُباح، انگلیوں کی جڑوں میں پھٹن ہو جانا۔ ذبحت الدّنّ میں نے مٹکے میں سوراخ کر دیا۔ سعد الذابح ایک سعادت مند۔ المذابح۔ محاریب، المذابح، مذبح کی جمع۔ جب سیلاب آ جائے اور زمین کو شق کر دے، تو جو شق بالشت بھر ہو اسے مذبح کہا جاتا ہے۔

فرعون بچوں کو ذبح کرتا تھا اور بچیوں کو باقی رکھتا تھا۔ بچیوں کو مال کے اعتبار سے نساء کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ كُمْ یعنی مردوں کو ذبح کرتے ہیں انہیں بیٹے کہا گیا جب وہ اسی طرح تھے۔ ابناء سے مراد

مرد لینے والوں نے نساء کم سے دلیل پکڑی ہے، پہلا قول اصح ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ نے فعل کو آل فرعون کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ فرعون کے حکم سے یہ کرتے تھے، چونکہ یہ کام ان کے سپرد تھا، اس لئے فعل کی نسبت ان کی طرف کی۔ نیز اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کام کرنے والا اپنے کام کی وجہ سے مؤاخذہ کا حقدار ہوگا۔ طبری نے کہا: یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ جس کو کسی ظالم نے کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو اس سے مؤاخذہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں: علماء کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ ظالم حکم دینے کی وجہ سے اور مامور قتل کرنے کی وجہ سے۔ نخعی نے اسی طرح کہا ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا قول بھی یہی ہے مگر قدرے تفصیل کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا: جب سلطان کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دے جبکہ مامور (جس کو حکم دیا گیا) جانتا ہو کہ اس نے اسے ظلماً قتل کرنے کا حکم دیا ہے، مامور اور امام دونوں پر قصاص ہوگا جیسے دونوں اکٹھا قتل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر امام، مامور کو اس کے قتل پر مجبور کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اسے ظلماً قتل کروا رہا ہے تو صرف امام پر قصاص ہوگا اور مامور کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس پر قصاص ہوگا اور دوسرا یہ کہ اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس پر نصف دیت ہوگی۔ یہ ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مامور کی یا تو یہ کیفیت ہوگی کہ اس پر آمر کی اطاعت لازم ہوگی اور وہ امام کے شر سے خوفزدہ ہوگا جیسے سلطان اور سردار اپنے غلام کے لئے۔ پس اس صورت میں قصاص دونوں کو لازم ہوگا یا ایسا ہوگا کہ اس پر حکم دینے والے کی اطاعت لازم نہ ہوگی، تو اس صورت میں صرف قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا حکم دینے والے کو نہیں جیسے باپ اپنے بیٹے کو یا استاد کسی لڑکے کو یا کاریگر اپنے شاگرد کو حکم دے جب کہ وہ بالغ ہو۔ اگر وہ بالغ نہ ہو تو قتل حکم دینے والے پر ہوگا اور بچے کی عاقلہ پر نصف دیت ہوگی۔ ابن نافع نے کہا: مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ اپنے غلام کو کسی انسان کے قتل کا حکم دے اگرچہ وہ غلام عجمی بھی ہو۔ ابن حبیب نے کہا: میں ابن القاسم کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ اگر ایسے شخص نے حکم دیا جس کی مخالفت میں مامور پر کوئی خوف نہیں ہے تو وہ اکراہ (مجبور کرنے) کے ساتھ لاحق نہیں ہوگا بلکہ مامور کو قتل کیا جائے گا آمر کو نہیں اور آمر کو سزا دی جائے گی اور قید کیا جائے گا۔

امام احمد نے اس سردار کے بارے میں فرمایا جو اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے، تو سردار کو قتل کیا جائے گا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلام کو قید میں رکھا جائے گا۔ امام احمد نے فرمایا: غلام کو قید کیا جائے گا اور اسے مارا جائے گا اور ادب سکھایا جائے گا۔ ثوری نے کہا: سردار کو تعزیر لگائی جائے گی۔ حکم اور حماد نے کہا: غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر غلام فصیح تھا، سمجھدار تھا تو اسے قتل کیا جائے گا اور مالک کو سزا دی جائے گی اگر غلام عجمی تھا تو سردار پر قصاص ہوگا۔ سلیمان بن موسیٰ نے کہا: آمر کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے پھر اسے سزا دی جائے گی اور اسے قید کیا جائے گا۔ یہ دوسرا قول ہے۔ مامور کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے قتل کا فعل کیا ہے۔ اسی طرح عطا، حکم، حماد، شافعی، احمد اور اسحاق نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: ان میں سے کسی کو بھی قتل

نہیں کیا جائے گا۔ یہ تیسرا قول ہے۔ ابو المعالی نے ''البرہان'' میں بیان فرمایا ہے: ان کا خیال ہے کہ آمر اور مباشر ان میں سے کوئی قصاص میں مستقل نہیں ہے اسی وجہ سے ان کے نزدیک کسی کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 12: جمہور نے یُذَبِّحُوْنَ مبالغہ کے لئے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن محیصن نے یُذْبَحُوْنَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا اولیٰ ہے کیونکہ ذبح میں تکرار تھا۔

فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس سے نکلی ہے اور اس نے مصر کے گھروں کو جلا دیا ہے۔ اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی گئی کہ بنی اسرائیل سے ایک بچہ بڑا ہوگا، اس کے ہاتھوں فرعون کا ملک تباہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو قریب المعنی ہیں۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فِیْ ذٰلِكُمْ یہ تمام امور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خبر ہے وہ مفرد حاضر کی طرح ہے یعنی ان کے اس فعل میں تمہارے لئے آزمائش و امتحان ہے۔ بَلَآءٌ اس سے مراد نعمت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (انفال: 17) (تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان) ابو الہیثم نے کہا: بلا کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی المحنۃ، (آزمانا) ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اچھے عمل کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ وہ اس کے شکر کا امتحان لے۔ کبھی کسی ناپسندیدہ مصیبت سے آزماتا ہے تاکہ اس کے صبر کا امتحان لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اچھائی کے لئے بَلَآءٌ اور برائی کے لئے بلاء یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: ذٰلِكُمْ کا اشارہ نجات دینے کی طرف ہے تو اس صورت میں بلا خیر میں ہوگا، یعنی تمہیں نجات دینا تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جمہور علماء نے کہا: اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہے اور البلاء یہاں شر کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے: ذبح میں مکروہ اور امتحان ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خیر کے لئے فعل ابلاہ اللہ و بلاہ استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم　　و ابلاھما خیر البلاء الذی یبلو

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتوں کو جمع کیا ہے۔ اکثر خیر کے لئے ابلیتہٗ اور شر کیلئے بلوتہٗ اور آزمائش کے لئے ابتلیتہٗ و بلوتہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝

''اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھر ہم نے تم کو بچا لیا اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ، اِذْ محل نصب میں ہے اور فَرَقْنَا کا مطلب ہے ہم نے پھاڑ دیا، ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح۔ الفرق کا معنی جدا ہونا ہے۔ اسی سے فرق الشعر اسی سے الفرقان ہے کیونکہ قرآن نے حق و باطل کے درمیان جدائی کی۔ اسی سے فالفارقات فرقاً ہے یعنی ملائکہ حق و باطل کے درمیان فرق کے ساتھ اترتے ہیں اسی سے یوم الفرقان ہے یعنی جنگ بدر کا دن۔ اس دن حق و باطل کے درمیان فرق ہوا۔ اسی سے و قرآنا فرقناہ یعنی

قرآن کو ہم نے بیان کیا اور اسے ہم نے پختہ کیا۔ زہری نے فَرَّقْنَا را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے جدا جدا کر دیا۔ بِکُمُ کا معنی لکم ہے۔ با بمعنی لام ہے۔ بعض نے فرمایا: با اپنے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے فَرَقْنَا الْبَحْرَ بِدُخُولِکُمْ اِیَّاهُ۔ ہم نے دریا کو پھاڑ دیا تمہارے اس میں داخل ہونے کے ساتھ۔ یعنی وہ دو پانیوں کے درمیان ہو گئے یعنی ان کے ساتھ جدائی ہوگئی۔ یہ اولیٰ ہے فانفلق اس معنی کو بیان کرتا ہے۔

الْبَحْرَ اس کا یہ نام اس کی وسعت کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فرس بحرٌ جبکہ گھوڑا زیادہ چلنے والا ہو۔ اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مندوب گھوڑے کے بارے میں ہے جو ابوطلحہ کا تھا۔ وَاِن وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا ہم نے اسے تیز رفتار پایا(1)۔

البحر، نمکین پانی کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ابحر الماء پانی نمکین ہوگیا۔ نصیب شاعر نے کہا:

وقد عاد ماء الارض بحراً فزادنی　　الی مرضی ان ابحر المشرب العذبُ

زمین کا پانی نمکین ہوگیا اس نے میری مرض میں اضافہ کیا کہ میٹھا پانی نمکین ہوگیا۔

الْبَحْرَ: شہر کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: هذه بحرتنا یعنی یہ ہمارا شہر ہے۔ یہ اموی نے کہا ہے۔ الْبَحْرَ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو انسان کے گردے میں لگ جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: لقیتہ صحرۃً بحرۃً یعنی میں اس سے بالکل واضح اور کھلے انداز میں ملا۔ کعب الاحبار سے ایک خبر میں مروی ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا نام صندفائیل ہے۔ تمام دریا اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں ہیں۔ ابونعیم نے یہ روایت ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن کعب کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْجَیْنٰکُمْ یعنی ہم نے تمہیں اس دریا سے نکالا۔ کہا جاتا ہے: نجوتُ من کذا نجاءً و نجاۃً میں نے اسے اس سے نکالا۔ اس کا مصدر نجاء (ممدود) اور نجاۃ (مقصور) دونوں طرح آتا ہے۔ الصدق منجاۃٌ سچ نجات دینے والا ہے۔ انجیت غیری و نجیته دونوں طرح پڑھا گیا ہے (وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ اور فَاَنْجَیْنٰکُمْ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ کہا جاتا ہے: غرق فی الماء غرقا فهو غریق و غارق۔ اسی سے ابوالنجم کا قول ہے:

من بین مقتول و طاب غارقٍ

اغرقه و غرقه فهو مغرق و غریقٌ۔ لجام مفرق بالفضۃِ۔ یعنی چاندی سے مزین لگام۔ التغریق کا مطلب قتل بھی ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

الا لیت قیسا غرقته القوابل

(کاش! قیس کو دایہ عورتیں قتل کر دیتیں)

چونکہ دایہ عورت قحط کے سال نومولود کو جھلی کے پانی میں غرق کر دیتی تھی خواہ وہ مذکر ہوتا یا مونث حتیٰ کہ وہ مرجاتا پھر ہر قتل کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شجاعته صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 252، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تغریق بنایا گیا۔ اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

اذا غرّقت ارباضها ثنی بکرة بتيهاء لم تصبح رءوماً سلوبها

یعنی جب رسیوں نے جوان اونٹنی کے دوسرے بطن کو قتل کر ڈالا تو وہ تھکاوٹ کی وجہ سے اپنے بچے پر مہربان نہ ہوئی۔

بنی اسرائیل کے نجات پانے کی کیفیت میں علماء کے مختلف اقوال

طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ وہ مصر سے بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چلیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ قبطیوں سے عاریۃً سامان اور زیورات لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حلال کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کے ابتدائی حصہ میں لے کر چلے۔ فرعون کو پتا چلا تو اس نے کہا: کوئی شخص ان کا پیچھا نہ کرے حتیٰ کہ مرغ اذان دے۔ اس رات مصر میں کسی مرغ نے اذان نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات بہت سے قبطیوں کے بیٹوں کو موت دی، وہ ان کے دفن میں مشغول ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے اس وقت نکلے جب سورج چڑھ چکا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ۝ (الشعراء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا کی جانب چلے تھے حتیٰ کہ اس کے کنارے پر پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے کچھ زائد تھی اور فرعونیوں کی تعداد بارہ لاکھ تھی (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں نے دس لاکھ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ ان میں مؤنث گھوڑی کوئی نہیں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں اپنی اولاد کے ساتھ ۷۶ افراد میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھایا اور ان کی اولاد میں برکت دی حتیٰ کہ فرعونیوں سے نکل کر دریا کی طرف گئے تو وہ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کے علاوہ چھ لاکھ تھے۔ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں شبابہ بن سوار نے انہوں نے یونس بن اسحاق سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے عمرو بن میمون سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلے تو فرعون کو خبر پہنچی۔ اس نے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ وہ ذبح کی گئی۔ پھر اس نے کہا: اس کی کھال اتارنے سے فراغت سے پہلے میرے لئے چھ لاکھ قبطی جمع ہوں۔ فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے رہے حتیٰ کہ دریا تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا سے کہا: پھٹ جا۔ دریا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! تو نے تکبر کیا ہے، کیا میں اولاد آدم میں سے کسی کے لئے پھٹا ہوں کہ تمہارے لئے پھٹ جاؤں؟ راوی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی جانب جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اس شخص نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ وہ گھوڑا تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر اس شخص نے پوچھا: اب کس سمت کا حکم دیا گیا ہے؟ فرمایا: اس طرف کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ تو نے جھوٹ بولا ہے اور نہ تجھ سے جھوٹ بولا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 141، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

گیا ہے پھر دوبارہ اس نے گھوڑا دریا میں ڈالا وہ تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم دیا گیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ آپ نے جھوٹ بولا اور نہ آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء: 63) (کہ اپنا عصا دریا پر مارو) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح تھا اس میں بارہ راستے تھے کیونکہ بارہ قبائل تھے ہر قبیلہ کا ایک راستہ تھا وہ ایک دوسرے کو دکھائی دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی کے پہاڑوں میں کھڑکیاں اور سوراخ تھے جس سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باہر نکل گئے اور فرعونی ابھی دریا کے اندر تھے تو دریا نے انہیں طمانچے مارے اور انہیں غرق کر دیا۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بحر قلزم تھا اور وہ شخص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا وہ نوجوان یوشع بن نون تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پھٹ جائے جب وہ تجھ پر ضرب لگائیں۔ وہ دریا اس رات موجیں مارتا رہا جب صبح ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو مارا اور اس کی کنیت ابو خالد رکھی۔

ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے قصص میں یہ معنی بیان کیا ہے اور جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ یونس اور سورۂ الشعراء میں آئے گا۔

فصل: اللہ تعالیٰ نے نجات دینے اور غرق کرنے کا ذکر فرمایا اور اس دن کا ذکر نہیں فرمایا جس میں یہ سب کچھ ہوا۔ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو یہود کو پایا کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا: یہ ایک عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن بطور شکر روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تم سے زیادہ قریبی ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا(1)۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے کے ان سے زیادہ مستحق ہو۔ پس تم روزہ رکھو۔

مسئلہ: ان احادیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں اس دن کے روزے کا حکم دیا جیسا کہ یہود نے اس کے متعلق بتایا۔ حقیقت اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، فرمایا: عاشوراء کے دن قریش زمانہ جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو خود بھی یہ روزہ رکھا اور اس روزے کا حکم بھی فرمایا۔ جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کے دن کا روزہ ترک کر دیا اور فرمایا: جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے یہ روزہ ترک کر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 1865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دے(1)۔ بخاری اور مسلم نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ احتمال ہے کہ قریش نے یہود کے خبر دینے کی وجہ سے یہ روزہ رکھا ہو کیونکہ وہ ان سے سنتے تھے کیونکہ یہود ان کے نزدیک اہل علم تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں مکہ میں روزہ رکھا ہو۔ جب آپ مدینہ طیبہ آئے اور یہود کو یہ روزہ رکھتے ہوئے پایا تو فرمایا: ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریبی اور پیروی کے زیادہ مستحق ہیں (2)۔ پس آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع میں روزہ رکھا۔ امر بصیامہ یعنی اس دن کے روزہ کے امر کو مؤکد فرمایا حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ ہم کہیں گے: یہ اس شخص کا شبہ ہے جو کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مکلف تھے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں جیسا کہ سورۂ انعام آیت 90 میں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کے تحت مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ: عاشوراء کے دن میں اختلاف ہے۔ کیا یہ نویں محرم الحرام کا دن ہے یا دسویں کا۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ یہ نویں کا دن ہے۔ ان کی دلیل حکم بن اعرج کی حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: مجھے عاشوراء کے روزہ کے متعلق بتاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب تو محرم کا چاند دیکھے تو شمار کر اور تو نویں محرم الحرام کو روزہ سے ہو۔ میں نے پوچھا: کیا حضرت محمد ﷺ اس طرح روزہ رکھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں (3)۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرات سعید بن مسیب، حسن بصری، امام مالک اور سلف کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دسویں کا دن ہے۔ امام ترمذی نے حضرت حکم کی حدیث ذکر کی ہے اور اس پر صحت وحسن کا کوئی حکم بیان نہیں کیا پھر اس کے بعد یہ ذکر کیا: انبانا قتیبۃ انبأنا عبد الوارث عن یونس عن الحسن عن ابن عباس قال امر رسول اللہ ﷺ بصوم عاشوراء یوم العاشر۔ یعنی حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں کے دن عاشوراء کے روزے کا حکم دیا (4)۔ پھر فرمایا: ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابن عباس کی حدیث حسن، صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بھی یہی کہتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: حضرت ابن عباس کا سائل کو یہ کہنا: تو شمار کر اور نویں کے دن روزے سے ہو۔ اس میں دسویں کے روزے کے ترک پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ وعدہ کیا کہ وہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھے۔ پس دونوں دن روزہ رکھنا دونوں احادیث کو جمع کرنا ہے۔ اور حضرت ابن عباس کا حکم کو جواب جب اس نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ روزہ رکھتے تھے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہاں۔ اس کا مطلب ہے اگر آپ زندہ رہتے۔ وگرنہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نویں محرم کا روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس کا بیان اس روایت میں ہے جو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَئِنْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 358، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 359، جلد 1 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی عاشوراء ای یوم هو، صفحہ 94، جلد 1 (وزارت تعلیم)

بَقَيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ الْيَوْمَ التَّاسِعَ (1) اگر میں آئندہ سال تک باقی رہا تو میں نویں (محرم) کا روزہ ضرور رکھوں گا۔

فضیلت: حضرت ابو قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ، اللہ تعالیٰ سے اس پر امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کا کفارہ بن جائے (2)۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: ہم کسی روایت کو نہیں جانتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ عاشوراء کے دن کا روزہ سال کا کفارہ ہے (3) سوائے حضرت ابو قتادہ کی حدیث کے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ اس کا معنی ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرعونی مردہ حالت میں پانی پر تیرنے لگے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے انہیں غرق ہوتے دیکھا اور اپنی نجات کو بھی دیکھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں کو ان کے لئے نکالا گیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے انہیں دیکھا۔ یہ احسان کے بعد دوسرا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے اور آگاہ ہونے سے غافل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس آدمی کی حالت میں تھے جو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکے جیسے تو کہتا ہے: ھذا الامر منك بمرأى و مسمع یعنی اس حالت میں ہے کہ تو اسے دیکھ سکے اور سن سکے اگر تو چاہے۔ یہ قول اور پہلا قول بنی اسرائیل کے احوال کے زیادہ مطابق ہے کیونکہ دریا سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سے جو صادر ہوا اس میں متواتر عبرت نہیں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق کیا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے دل مطمئن نہیں ہیں کہ فرعون غرق ہو گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اس نے فرعون کو باہر پھینک دیا اور انہوں نے اسے دیکھا۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: فرعون نہیں مرا اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سنا کہ وہ اس کے نبی کو جھٹلا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دریا کے کنارے پر پھینک دیا گویا وہ سرخ بیل ہے۔ بنی اسرائیل نے اسے دیکھا جب وہ مطمئن ہو گئے تو انہیں خشکی کے راستہ سے فرعون کے شہروں کی طرف بھیجا گیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کے خزانے منتقل کیے اور نعمتوں میں غرق ہو گئے۔ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بتوں کے پاس معتکف ہے، تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لئے ایک معبود بنائیں جس طرح ان کے لئے معبود ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں تمہارے لئے معبود تلاش کروں؟ اس نے تمہیں اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارض مقدس کی طرف چلنے کا حکم دیا جہاں ان کے آباء و اجداد کے گھر تھے، تاکہ وہ فرعون کی زمین سے پاک ہو جائیں۔ ارض مقدسہ اس وقت جابر لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس پر غالب تھے۔ پس انہیں اس زمین سے نکالنے کے لئے جنگ کی ضرورت تھی تو بنی اسرائیل نے کہا: (اے موسیٰ!) کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی الحث علی صوم یوم عاشوراء، صفحہ 94، جلد 1 (و،ت)

3۔ ایضاً، حدیث 683

تم ہمیں جابر لوگوں کے لئے شکار بنانا چاہتے ہو؟ اگر تم ہمیں فرعون کے ہاتھ میں رہنے دیتے تو ہمارے لئے بہتر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ... الی قٰعِدُوْنَ۔ (المائدہ:21)، (داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ...... الخ)

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا فرمائی اور انہیں فاسقین کا نام دیا۔ پس وہ ''تیہ'' کے صحرا میں چالیس سال بطور سزا رہے پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے سلوٰی اور بادل کے ذریعے احسان فرمایا...... جیسا کہ آگے آئے گا...... پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء کی طرف چلے تا کہ ان کے لئے تورات لے آئیں۔ پس انہوں نے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا...... اس کا بیان آگے آئے گا...... پھر انہیں کہا گیا: تم بیت المقدس پہنچ چکے ہو تو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حطۃٌ کہتے ہوئے داخل ہو...... اس کا بیان بھی آگے آئے گا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی حیاء دار اور پردہ پوش تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خصیتین کی بیماری ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے لگے تو اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے تو وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بنی اسرائیل کی مجالس کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام برہنہ اس کے پیچھے دوڑے اور کہہ رہے تھے: اے پتھر! میرے کپڑے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (احزاب:69)(1) اس کا بیان بھی آگے آئے گا...... پھر جب حضرت ہارون کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل نے کہا: تو نے ہارون کو قتل کیا ہے اور تو نے اس سے حسد کیا ہے حتیٰ کہ ملائکہ ان کی چارپائی لے آئے اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پر مردہ تھے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ وہ اپنی قربانی کی قبولیت کی نشانی جان لیں۔ پس ایک آگ آسمان سے آتی (اور ان کی قربانیوں کو کھا جاتی) تو یہ ان کی قربانیوں کی قبولیت کی نشانی تھی۔ پھر بنی اسرائیل نے سوال کیا کہ ہمارے لئے آپ دنیا میں گناہوں کے کفارات کو بیان فرمائیں۔ پس جو گناہ کرتا اس کے دروازے پر لکھا جاتا عملت کذا تو نے ایسا عمل کیا اور اس کا کفارہ اپنے اعضاء میں سے عضو کا کاٹنا ہے۔ اس عضو کا نام لیا جاتا تھا، جس کو پیشاب لگ جاتا تو وہ پاک نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ کپڑے کو کاٹ دیتا تھا اور اپنے بدن سے جلد کو دور کر دیتا تھا پھر انہوں نے تورات کو بدلا اور اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا، اپنے ہاتھوں سے تورات میں لکھا اور تورات کے عوض سامان زندگی لیا، پھر یہاں تک پہنچے کہ اپنے انبیاء اور رسل کو قتل کیا یہ ان کے معاملات اپنے رب کے ساتھ تھے اور ان میں ان کا یہ کردار تھا اور یہ ان کا برا اخلاق تھا۔ ان شاء اللہ ان میں سے ہر فصل کا پورا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

طبری نے کہا: ان مغیبات کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے ذریعے قرآن میں بیان جن کا عربوں کو علم نہ تھا اور یہ بنی اسرائیل کے حق میں واقع ہوئے تھے۔ یہ بنی اسرائیل کے پاس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل تھے (2)۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریاناً وحدہ فی الخلوۃ الخ، حدیث 269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو (معبود) ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے"۔

اس آیت میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ابوعمرو نے وعدنا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابوعبید نے اسے اختیار کیا ہے اور اسے راجح قرار دیا ہے اور واعدنا کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: مواعدہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ اور وعید میں منفرد ہے۔ اسی پر ہم نے قرآن کے الفاظ کو پایا۔ جیسے ارشاد ہے: وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ (ابراہیم: 22) (جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (نور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (انفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دوگروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے)۔

مکی نے کہا: الفاظ کا ظاہر بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔ پس اس کو واحد پر محمول کرنا واجب ہے ظاہر نص کی وجہ سے کیونکہ فعل صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ یہ حسن، ابورجاء، ابوجعفر، شیبہ اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ قتادہ اور ابن ابی اسحاق نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ ابوحاتم نے کہا: ہمارے نزدیک عام لوگوں کی قراءت وعدنا بغیر الف کے ہے کیونکہ المواعدۃ زیادہ تر دو شخصوں اور دو بدلہ دینے والوں کے درمیان ہوتا ہے ہر ایک دوسرے سے وعدہ کرتا ہے۔ جوہری نے کہا المیعاد کا معنی باہم وعدہ کرنا، وقت اور جگہ ہے۔ مکی نے کہا: المواعدۃ اصل میں دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی کلام عرب میں (باب) مفاعلہ کا صیغہ واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: طَارَقْتُ النَّعْلَ، دَاوَيْتُ الْعَلِيْلَ، عَاقَبْتُ اللِّصَّ۔ ان تمام جملوں میں باب مفاعلہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ ایک شخص کی طرف سے فعل ہوا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواعدہ کا لفظ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدنا کے معنی کی طرح ہوگا۔ پس دونوں قراءتوں کا ایک معنی ہو جائے گا، واعدنا الف کے ساتھ اختیار کرنا اس لئے ہے کیونکہ یہ وعدنا کے معنی میں ہے اس کے دو معانی میں سے ایک معنی میں، نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ یا قبول کرنا ضروری ہے جو وعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس مفاعلہ کا استعمال صحیح ہے۔

نحاس نے کہا: واعدنا (الف کے ساتھ) پڑھنا اجود اور احسن ہے۔ یہ مجاہد، اعرج، ابن کثیر، نافع، اعمش، حمزہ اور کسائی کی قراءت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ واعدنا موسیٰ یہ باب الموافات ہے۔ وعدہ اور وعید میں سے کوئی شے نہیں ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے: موعدك يوم

الجمعه موعدك موضع كذا اس میں فصیح واعدته کہنا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہاں واعدنا الف کے ساتھ بہتر ہے کیونکہ طاعت کا قبول کرنا مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول اور اتباع ہے۔ یہ مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ابو عبیدہ نے وعدنا کو ترجیح دی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو قبول کرنا اور اس کا التزام کرنا یہ مواعدہ کے مشابہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مُوْسٰى یہ عجمی اسم ہے۔ عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک روایت کے مطابق قبطی لوگ پانی کو مو اور درخت کو شا (سا) کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تابوت میں پانی اور درخت کے پاس پائے گئے تو انہیں موسیٰ کہا گیا(1)۔ سدی نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ان پر خوف ہوا تو اس نے انہیں ایک تابوت میں رکھ دیا اور دریا میں پھینک دیا...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے الہام کیا تھا...... اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درختوں کے درمیان فرعون کے گھر کے قریب دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کی بیوی آسیہ کی لونڈیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا۔ پس اس مکان کے نام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ نام رکھا گیا(2)۔ نقاش وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ جس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا اس کا نام صابوت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔ موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام (3)۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً، اَرْبَعِيْنَ مفعول ثانی کی بنا پر منصوب ہے اور کلام میں حذف ہے۔ اخفش نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: واذ واعدنا موسى تمام اربعين ليلة جیسا کہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں مضاف حذف ہے الاربعون تمام اس وعدہ میں داخل ہیں۔

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ چالیس دن ذی القعدہ کا مہینہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے اور یہ اس کے بعد ہوا جب آپ نے دریا عبور کر لیا تھا اور آپ کی قوم نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اللہ کی طرف سے ہمارے پاس کتاب لے آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر چیدہ افراد لے کر باہر نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھے اور ان سے مکمل چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا، تو مفسرین کے قول کے مطابق انہوں نے بیس دن اور بیس راتیں شمار کیں اور کہنے لگے: ہم سے وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پس انہوں نے ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ سامری نے انہیں کہا: یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے، وہ سامری کی اس بات پر مطمئن ہو گئے۔ حضرت ہارون نے انہیں منع فرمایا اور فرمایا: يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۞ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۞ (طٰہٰ) (اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو تو قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام)۔ حضرت ہارون کی صرف بارہ ہزار نے بات

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ النکت والعیون، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مانی باقیوں نے بچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں حضرت ہارون کی اتباع نہ کی اور تمام لوگ اس بچھڑے کی عبادت میں گر گئے اور وہ دس لاکھ سے زائد تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہیں اس حال میں پایا آپ نے تختیاں نیچے ڈال دیں۔ پس ان میں سے چھ اجزاء اٹھا لئے گئے اور ایک تختی باقی رہ گئی جس میں حرام، حلال اور جن احکام کی انہیں احتیاج تھی وہ باقی رہ گئی۔ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو جلا دیا اور اس کی راکھ کو سمندر میں بکھیر دیا، بنی اسرائیل نے بچھڑے کی محبت کی وجہ سے اس دریا کا پانی پیا۔ پس ان کے ہونٹوں پر زردی ظاہر ہوئی اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ پھر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:54) پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو۔

پس انہوں نے خنجر اور تلواریں اٹھائیں اور سورج کے طلوع ہونے سے چاشت کے بلند ہونے تک ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا کسی والد نے اپنے بیٹے کے بارے میں اور کسی بیٹے نے والد کے بارے میں، اور بھائی نے بھائی کے بارے میں نہ پوچھا جو سامنے آیا اسے تلوار سے قتل کر دیا اسی طرح ہر ایک نے اپنی مثل کو قتل کیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر التجا کی: یارب! بنی اسرائیل تو ختم ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان پر اپنا فضل فرمایا۔ پس جو باقی بچ گئے ان کی توبہ قبول فرمائی اور جو مارے گئے انہیں شہداء میں شمار کر دیا جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اگر کہا جائے کہ راتوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا دنوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے، یہ رتبہ میں دن سے بلند ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ راتوں کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ راتیں مہینوں کا آغاز ہیں اور دن ان کے تابع ہیں۔

مسئلہ نمبر 5: نقاش نے کہا: اس آیت میں صوم وصال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر دنوں کا ذکر فرماتا تو یہ اعتقاد ممکن تھا کہ وہ رات کو افطار کرتے تھے۔ جب راتوں پر نص قائم فرما دی تو کلام کی قوت تقاضا کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن، راتوں سمیت صوم وصال رکھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: میں نے شیخ، زاہد، امام، واعظ ابوالفضل الجوہری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور نماز میں اس کے قریب ہونے کے بارے میں وعظ فرما رہے تھے کہ نماز کھانے پینے سے غافل کر دیتی ہے اور وہ فرما رہے تھے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کتنا قرب نصیب ہوگا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی کو کہا تھا: آتنا غداءنا، اس قول کی وجہ سے انہوں نے زمانہ کے اسی روزے وصال کے ساتھ رکھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے علماء صوفیہ نے وصال پر استدلال کیا ہے اور ان میں افضل چالیس دن ہیں۔ مزید کلام صوم وصال پر، آیت صیام کے تحت اسی سورت میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس آیت کے مزید احکام سورۂ اعراف میں وَ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (اعراف:142) کے تحت آئیں گے۔ اور بچھڑے کا قصہ، اس کی کیفیت کا بیان اور اس کا ڈکارنا وغیرہ کا ذکر سورۂ اعراف میں اور سورۂ طٰہٰ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔ اتَّخَذْتُمْ اصل میں ائتخذتم تھا یہ الاخذ سے مشتق ہے۔ اس کا وزن افتعلتم ہے دو ہمزوں کے امتناع کی وجہ سے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی گئی پھر ایتخذتم ہوا، اور یاء گردان میں مضطرب رہتی ہے یاتخذ میں الف ہوگئی موتخذ میں واؤ ہوگی۔ پس یہاں یاء کو ایک پختہ حرف سے بدلا گیا جو مابعد کی جنس سے تھا اور وہ تاء ہے پھر ادغام کیا گیا پھر الف وصل کو نطق (بولنے) کے لئے لایا گیا۔ کبھی اس الف سے استغناء کیا جاتا ہے جب کلام کا معنی تقریر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) الف تقریر کی وجہ سے الف وصل سے استغناء کیا گیا۔ شاعر نے کہا:

استحدثَ الرکب عن اشیاعھم خبراً		ام راجع القلب من اطرابه طربُ

اس شعر میں الف وصل ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ الف تقریر موجود تھا۔ اسی طرح قرآن میں ہے: اَطَّلَعَ الْغَيْبَ (مریم:78) اَصْطَفَى الْبَنَاتِ (الصافات:153) اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝ (ص) ان تینوں مثالوں میں تقریر کی وجہ سے الف وصل ذکر نہیں کیا گیا۔ ابوعلی فارسی کا مذہب یہ ہے کہ اتَّخَذْتُمْ یہ تخذ سے ہے نہ کہ اخذ سے ہے۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ جملہ حال ہے، ظلم کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ، العفو، اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو معاف کرنا۔ کبھی عفو سزا کے بعد ہوتا ہے اور کبھی سزا سے پہلے، بخلاف الغفران کے کہ اس کے ساتھ یقیناً عقوبت ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہو پھر اسے سزا (عقوبت) نہ دی گئی ہو تو اسے معاف کیا گیا۔ العفو کا مطلب گناہ کو مٹانا ہے، یعنی ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا اور تم سے تجاوز کیا۔ یہ عفت الریح الاثر سے ماخوذ ہے یعنی ہوا نے اثر مٹا دیا، عفا الشئ کسی شے کا کثیر ہونا یہ اضداد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى عَفَوْا (اعراف:95)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی تمہاری بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد۔ بچھڑے کو عجل اس لئے کہا گیا کہ بنی اسرائیل نے اس کی عبادت میں جلدی کی تھی۔ واللہ اعلم

العجل گائے کے بچے کو کہتے ہیں العجول بھی اسی کو کہتے ہیں اس کی جمع العجاجیل اور مؤنث عجلۃٌ آتی ہے۔ یہ ابوالجراح سے روایت ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کے عفو کا۔ لعل کا معنی پہلے گزر چکا

ہے، رہا شکر تو لغت میں اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔
دابۃٌ شکور وہ جانور جس پر موٹاپا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی اس نیکی اور اچھائی پر تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ جوہری نے کہا: الشکر کا مطلب محسن پر اس اچھائی کی وجہ سے تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ کہا جاتا ہے: شکرتہٗ و شکرت لہ۔ لام صلہ افصح ہے، الشُکران، الکُفران کا متضاد ہے، تشکرت لہ یہ شکرت لہ کی مثل ہے۔
امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ مَنْ لَا یَشْکُرِ النَّاسَ (1) جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔
خطابی نے کہا: اس کلام کے دو معانی ہیں: ایک یہ کہ وہ جس کی طبع میں لوگوں کی نعمت کی ناشکری ہے اور ان کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اس کی عادت سے، اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے اور اس کے شکر کا ترک ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان پر بندے کا شکر قبول نہیں کرتا جب بندہ لوگوں کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور لوگوں کے احسان کی ناشکری کرتا ہے کیونکہ ہر ایک امر دوسرے سے متصل ہے۔

مسئلہ نمبر 4: شکر کے معنی میں علماء کی عبارات: حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: شکر کا مطلب، سراً اور علانیۃً معصیت سے اجتناب کے ساتھ ساتھ اطاعت کی ادائیگی میں کوشش کرنا ہے۔
ایک اور گروہ نے کہا: شکر کا مطلب انعام کرنے والے کے شکر کی بجا آوری میں تقصیر کا اعتراف ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا: 13) حضرت داؤد نے کہا تھا: یارب! میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ شکر بھی تو تیری طرف سے نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تو نے مجھے پہچان لیا اور تو نے میرا شکر ادا کیا جب تو نے پہچان لیا کہ شکر بھی میری طرف سے نعمت ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی: یارب! مجھے اپنی سب سے زیادہ مخفی نعمتیں دکھا جو تو نے مجھ پر فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! سانس لے۔ حضرت داؤد نے سانس لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون ہے جو دن رات میں اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے (2)۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ چھوٹی سی نعمت جو تو نے اپنی نعمتوں میں سے میرے ہاتھ میں رکھی میرے سارے اعمال اس کا بدلہ نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کیا (3)۔ جنید نے کہا: شکر کی حقیقت شکر سے عجز ہے۔ حضرت جنید سے ہی مروی ہے، فرمایا: میں حضرت سری سقطی کے سامنے کھیل رہا تھا جبکہ سات سال کا تھا اور حضرت سری سقطی کے سامنے ایک جماعت شکر کے بارے گفتگو کر رہی تھی۔
حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: اے لڑکے! شکر کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی وجہ سے اس کی نافرمانی نہ کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، حدیث نمبر 4177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ الشعب للبیہقی مثلہ، حدیث 4623
3۔ ایضاً، حدیث 4415

جائے۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: بیٹا! اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا حصہ تیری زبان ہو۔ جنید نے کہا: میں اس ایک کلمہ پر ہمیشہ روتا رہتا ہوں جو میرے متعلق حضرت سری سقطی نے کہا تھا۔ شبلی نے کہا: نیکیوں پر محافظت اور تواضع، شہوات کی مخالفت، طاعات میں دوام، زمین اور آسمان کے جبار کا مراقبہ، شکر ہے۔

حضرت ذوالنون مصری ابوالفیض نے کہا: جو تجھ سے بلند ہے اس کی اطاعت کرنا شکر ہے، ہم مثل کو بدلہ دینا شکر ہے، جو کم مرتبہ ہے اس کے ساتھ احسان اور فضل کا مظاہرہ کرنا شکر ہے۔

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت تاکہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو''۔

اِذْ ماضی کے لئے اسم ہے اور اذا مستقبل کے لئے اسم ہے، اٰتَیْنَا کا مطلب ہے ہم نے عطا کیا۔ ان تمام الفاظ کے معانی پہلے گزر چکے ہیں۔ الْكِتٰبَ سے مراد بالاجماع تورات ہے اور الْفُرْقَانَ کے بارے اختلاف ہے۔ فراء اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرقان عطا کی۔ نحاس نے کہا: یہ اعراب اور معنی میں غلطی ہے، رہا اعراب تو کسی شے پر معطوف اس کی مثل ہوتا ہے اور اس قول کے اعتبار سے کسی شے پر معطوف اس کے خلاف ہوگا۔ رہا معنی تو الله تعالیٰ نے فرمایا: اٰتَیْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (الانبیاء: 48) ابواسحاق الزجاج نے کہا: فرقان سے مراد الکتاب ہی ہے تاکید کے لئے دو اسموں کے ساتھ اس کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

یہ فراء سے حکایت ہے، شاعر کا قول ہے:

وقدمت الادیم لراهشیه والفی قولها کذباً و میناً

اس شعر میں کذب اور مَین ایک ہی معنی میں ہیں۔ تاکید کے لئے دو اسم ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا هندٌ وارض بها هندٌ وهندٌ اتی من دونها النأی والبعد

اس شعر میں النأی اور البُعد تاکید کے لئے معطوف کیے گئے ہیں۔ عنترہ کا قول ہے:

حییت من طلل تقادم عهده اقوی واقفر بعد ام الهیثم

نحاس نے کہا: یہ شعر میں ہوتا رہتا ہے، سب سے بہتر اس کے متعلق مجاہد کا قول ہے۔ الْفُرْقَانَ سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے (1)، جو الله تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ ابن زید نے کہا: الْفُرْقَانَ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹنا ہے حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تو انہوں نے دریا عبور کر لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد مصیبت سے چھٹکارا ہے کیونکہ وہ قبطیوں سے دور ہو گئے تھے۔ اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال: 29)

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 327، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد حجت اور بیان ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: واؤ زائد ہے معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب فرقان عطا کی، واؤ کبھی لغت میں زائد بھی ہوتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: فلان حسن و طویل۔ شاعر نے کہا:

الی الملک القرم و ابن الھمام و لیث الکتیبۃ فی المزدحم

اس شعر میں واؤ دونوں جگہ زائدہ ہے، کیونکہ مراد الملک القرم، ابن الھمام لیث الکتیبہ ہے۔ اس تاویل کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (انعام:154) (پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی) یعنی حلال، حرام، کفر، ایمان، وعدہ، وعید وغیرہ سب کچھ بیان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ کا مطلب ان کے اور فرعون کی قوم کے درمیان جدائی ہے۔ یعنی ان کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا۔ اس کی مثال یوم الفرقان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی مدد فرمائی تھی اور ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا(1)۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم گمراہی سے ہدایت پاؤ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اے میری قوم بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو جنہوں نے شرک کیا یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ قوم، صرف مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورتیں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات:11) پھر فرمایا: وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ (الحجرات:11)

زہیر نے کہا:

وما ادری و سوف اخال ادری اقوم آل حصن ام نساء

اس شعر میں اقوم سے مراد شاعر نے مرد لئے ہیں عورتوں کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ (اعراف.80) یہاں صرف مرد مراد ہیں عورتیں نہیں کبھی قوم کا اطلاق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ (نوح:1) اسی طرح ہر نبی کو عورتوں اور مردوں دونوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰقَوۡمِ منادیٰ مضاف ہے۔ يٰقَوۡمِ میں یا کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ حذف کا مقام ہے اور کسرہ اس کے حذف پر دلالت کر رہا ہے یہ یا تنوین کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پس تو اسے حذف کر دے گا جس طرح تنوین کو مفرد اسم سے حذف کیا جاتا ہے۔ غیر قرآن میں اس کا سکون کے ساتھ اثبات بھی جائز ہے۔ تو کہے گا: یاقومیْ کیونکہ یہ اسم ہے اور حالت جری میں ہے، اگر تو چاہے تو اس یا کو فتحہ دے اگر چاہے تو اس کے ساتھ ھا لاحق کر دے۔ تو کہے: یا قومیَہْ اگر چاہے تو اسے الف سے بدل دے کیونکہ یہ اخف ہے اور تو کہے: یا قوما اگر چاہے تو تو کہے: یا قومُ بمعنی یا ایھا القوم، اگر تو اسے نکرہ بنائے تو تو اسے نصب دے گا اور تنوین دے گا، قوم کا واحد امرءٌ ہے جو اس کے لفظ پر نہیں ہے تو کہتا ہے: قوم، اقوام، اقاوم یہ جمع الجمع ہے، یہاں قوم سے مراد بچھڑے کے پجاری ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے امر سے خطاب فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ یہاں جمع کثرت کی جگہ پر جمع قلت کو ذکر کیا اور کبھی جمع کثرت کو جمع قلت کی جگہ رکھا جاتا ہے اور جمع قلت کو کثرت کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ (البقرہ:228) اور ارشاد فرمایا: فِيۡهَا مَا تَشۡتَهِيۡهِ الۡاَنۡفُسُ (الزخرف:71)

ان آیات میں جمع قلت کی جگہ جمع کثرت اور کثرت کی جگہ جمع قلت کا وزن ذکر فرمایا ہے۔

جو کوئی فعل کرتا ہے اس کا ضرر (نقصان) اس کی طرف لوٹتا ہے تو کہا جاتا ہے: انما اسأت الی نفسِك۔ تو نے اپنے نفس پر برا کیا۔ ظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ بعض ارباب معانی نے کہا: ہر انسان نے اپنے آپ پر جلدی کی جس نے اسے ساقط کر دیا اور نفس کی خواہش کی مخالفت کی وہ اس کے ظلم سے بری ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت میں بچھڑے کی عبادت کی تھی جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ جب ان سے کہا گیا کہ تم اپنے پروردگار کی طرف توبہ کرو تو انہوں نے کہا: کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ۔

ارباب الخواطر نے کہا: اپنے نفسوں کو اطاعات کے ساتھ مطیع کرو اور انہیں شہوات سے روکو۔ صحیح یہ ہے کہ حقیقت میں قتل کرنے کا حکم تھا اور قتل کا مطلب حرکت کو مارنا ہے۔ قتلت الخمر یعنی پانی کے ساتھ اس کی شدت کو ختم کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: توبہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف اس امت کو انعام کی، دوسری امتوں کو یہ نعمت عطا نہ فرمائی۔ بنی اسرائیل کی توبہ قتل کرنا تھا۔ اس پر اجماع ہے کہ ان بچھڑے کے پجاریوں میں سے ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے اپنے نفس کو قتل کرنے کا حکم نہیں تھا۔

زہری نے کہا: جب انہیں کہا گیا: فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ تو وہ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں کہا گیا: اب رک جاؤ۔ یہ عمل مقتول کے لئے شہادت تھا اور زندہ کے لئے توبہ تھا، جیسا کہ

پیچھے گزرا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر تاریکی بھیج دی تو تاریکی میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ ایک صف میں کھڑے ہوئے اور جنہوں نے عبادت نہیں کی تھی وہ ہتھیار لے کر ان میں داخل ہوئے اور انہیں قتل کر دیا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ستر آدمی کھڑے ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے اور انہوں نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ والوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔

یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت یوشع بن نون ان کے پاس گئے جبکہ وہ سب گھٹنے کھڑے کر کے ہاتھوں یا کپڑے سے کلاوہ مار کر بیٹھے تھے۔ حضرت یوشع نے کہا: وہ ملعون ہوگا جو اپنا کپڑا یا ہاتھ کھولے گا یا اپنے قاتل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا یا اپنے ہاتھ سے بچاؤ کرے گا یا پاؤں سے بچاؤ کرے گا۔ پس ان میں سے کسی نے اپنا کپڑا نہ کھولا حتیٰ کہ ان میں قتل کیا گیا جو قتل کیا گیا اور ہر شخص نے اپنے قریب والے کو قتل کیا۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ پس جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی پہلے قول کے مطابق انہیں اپنوں کو قتل کرنے کی سزا دی گئی کیونکہ انہوں نے برائی کو روکا نہیں تھا۔ جب وہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور وہ علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو قتل کریں (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اپنے بندوں میں جب برائی پھیل جائے اور اسے روکا نہ جائے تو تمام کو سزا دی جاتی ہے۔

جریر نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے جبکہ وہ اس برائی کو روک سکتے تھے لیکن انہوں نے روکا نہیں تو اللہ تعالیٰ تمام پر عذاب نازل فرماتا ہے (3)۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل فرمایا۔ اس مفہوم پر کلام آگے آئے گی۔ جب ان میں قتل کی کثرت ہو گئی اور وہ ستر ہزار تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے قتل کو اٹھا لیا کیونکہ انہیں اپنوں کو قتل کی مشقت دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر اسلام کے بعد تو بہ سے افضل انعام نہیں فرمایا۔

قتادہ نے فاقیلوا انفسکم ... اقالہ سے مشتق کیا ہے ...... یعنی قتل کے ساتھ اپنی لغزش کا بدلہ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَارِئِكُمْ، البارئ کا معنی الخالق یعنی پیدا کرنے والا ہے ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ البارئ نئے سرے سے پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور الخالق ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نقل کرنے والا ہوتا ہے۔ البریۃ کا معنی الخلق (مخلوق) ہے۔

یہ فعیل بمعنی مفعول ہے لیکن اسے ہمزہ نہیں دیا جاتا۔ ابو عمرو نے بارئکم ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، وہ تمہیں شعور دیتا ہے، تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہے۔

نحویوں کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض وصل میں ضمہ اور کسرہ کو ساکن کر دیتے ہیں اور یہ شعر میں ہوتا ہے، ابو العباس المبرد نے کہا: کلام اور شعر میں معرب حرف میں متواتر حرکات کے ساتھ ساکن کرنا جائز نہیں۔ ابو عمرو کی قراءت غلط ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً تفسیر طبری

نحاس وغیرہ نے کہا: یہ قدماء ائمہ نحو نے جائز قرار دیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ اشعار ذکر کیے ہیں۔

اذا اعْوَجَجْنَ قلت صاحبْ قومْ بالدّو امثال السفين العوم

امرؤالقیس نے کہا:

فاليوم اشربْ غير مُستحْقب اثماً من الله ولا واغل

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت سليمى اِشْتَرلَنا سويقا (1)

ایک اور نے کہا:

رحت و فی رجليكِ مافيهما و قد بداهنك من المئزر (2)

جس نے معرب کے حرف میں سکون دینے کا انکار کیا اس کی حجت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اعراب کی علامت ہوتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: بنا کی حرکت کو توالی الحرکات کے ساتھ ساکن کرنے کے جواز میں نحویوں کا اختلاف نہیں ہے۔

برأ، یہ تبری الشیء من الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ایک شے کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے...... الخلق عدم سے وجود کی طرف جدا ہوئی۔ اسی سے برأت من المرض برءً ا۔ تو مرض سے شفایاب ہوا دوسرے لوگ کہتے ہیں برئت من المرض برأ اور برأت منك و من الديون، والعيوب براءةً۔ میں تجھ سے، قرضوں سے، عیوب سے بری ہوا۔ اسی سے المبارأة للمرأة۔ عورت کو جدا کرنا ہے۔ قد بارأ شريكه و امرأته، اپنے شریک اور اپنی بیوی کو جدا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَابَ عَلَيْكُمْ اس کلام میں حذف ہے، اس تقدیر پر یہ ہے: ففعلتم فتاب عليكم یعنی تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر فرمایا۔ یعنی تم میں سے باقی لوگوں پر نظر کرم فرمائی۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس اس گستاخی پر آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں تمہارے مر جانے کے بعد کہ کہیں تم شکر گزار بنو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْتُمْ یہ معطوف ہے۔ يٰمُوْسٰى ندا مفرد ہے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ۔ ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ ستر آدمی تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

اختیار کیا تھا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں سنایا تو انہوں نے اس کے بعد کہا: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ انبیاء پر ایمان لانا ان کے معجزات کے ظہور کے بعد واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے آگ بھیجی اور انہیں جلا دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں مر جانے کے بعد) ان ستر آدمیوں کا واقعہ ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ابن فورک نے کہا: یہ احتمال ہے کہ ان کی سزا اس وجہ سے ہو کہ انہوں نے رؤیت کی طلب کو اس کے صحیح طریقہ سے خارج کر دیا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ارنا اللہ جھرۃً اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت میں نہیں تھا۔(1)

اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیکھنے) کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر بدعتی لوگ دنیا و آخرت میں اس کا انکار کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت دنیا و آخرت میں اس کے جواز کے قائل ہیں اور آخرت میں اس کے وقوع کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے رؤیت کا طلب کرنا محال کا طلب کرنا نہیں بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا سوال کیا تھا، مزید کلام اس رؤیت کے متعلق سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَهْرَةً یہ مصدر ہے حال کی جگہ میں اس کا معنی علانیۃ (واضح) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی عیاناً ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ الجھر کا اصل معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے اسی سے الجھر بالقرأۃ ہے یعنی قراءت کو ظاہر کرنا المجاھر بالمعاصی۔ علانیہ گناہ کرنے والا۔ رأیت الامیر جھاراً و جھرۃً یعنی میں نے امیر کو دیکھا جبکہ وہ کسی چیز سے چھپا ہوا نہ تھا۔

حضرت ابن عباس نے جَهَرَةً ھاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً زھْرَۃ زَھَرَۃُ۔ الجھر میں جو وجہیں ہیں ایک یہ صفت ہے ان کے خطاب کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا، انہوں نے بھی اعلانیہ یہ کہا۔ اس ترکیب کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: واذا قلتم جھرۃً یا موسیٰ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہے اس کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی رویت کا سوال کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ لیں۔ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر نہ ہوگی۔ الجھر کے ساتھ مؤکد فرمایا تا کہ آنکھوں سے دیکھنے اور خواب میں دیکھنے میں فرق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ۔ الصّٰعِقَةُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی نے اسے الصَّعْقَة پڑھا ہے، یہ تمام قرآن میں ابن محیصن کی قراءت ہے۔ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ کہا جاتا ہے: كَيْفَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (وہ مرے کیسے تھے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے) اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کہتے ہیں: دُوْرُ آلِ فُلَانٍ تَرَاءَى یعنی آل فلاں کے گھر آمنے سامنے ہیں۔ بعض نے فرمایا: تَنْظُرُوْنَ کا معنی ہے: تم اپنے حال، موت اور الصّٰعِقَةُ کے آثار نازل ہوئے تم انہیں دیکھ رہے تھے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ یعنی ہم نے زندہ کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ مر گئے تھے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ان کی روحیں چلی گئی تھیں پھر وہ اپنی عمریں پوری کرنے کے لئے لوٹائے گئے (1)۔ نحاس نے کہا: یہ قریش کے اس شخص کے خلاف حجت ہے جو دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتا اور اہل کتاب کے خلاف حجت ہے کیونکہ انہوں نے اس کی خود خبر دی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر ادا کرو جو اس نے تمہارے ساتھ کیا کہ مرنے کے بعد زندہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ایسی موت مر گئے تھے کہ اس سے غیر عبرت حاصل کرے۔ پھر انہیں بھیجا گیا۔ البعث کا اصل معنی الارسال ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: البعث کا اصل معنی کسی شی کو اپنے محل سے اٹھانا ہے۔ کہا جاتا ہے: بعثت الناقة یعنی میں نے اونٹنی کو حرکت دی۔ امرؤالقیس نے کہا:

وفتیان صدق قد بعثت بسحرة　　فقاموا جمیعا بین عاث و نشوان

اس شعر میں بعث بمعنی حرکت دینا، اٹھانا استعمال ہوا ہے۔ عنترہ نے کہا:

و صحابة شم الانوف بعثتهم　　لیلاً و قد مال الکری بطلاها

اس میں بھی بعث اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ یعنی ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں تعلیم دی۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے کیونکہ اصل حقیقت ہے، وہ موت، سزا کی موت تھی اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (البقرہ: 243) جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5: الماوردی نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ جو مرنے کے بعد لوٹایا گیا اور وہ احوال دیکھنے کے بعد لوٹایا گیا جو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں کیا وہ مکلف باقی رہے گا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

۱۔ ان کا مکلف ہونا باقی ہے تاکہ کوئی عاقل مکلف ہونے سے خالی نہ ہو۔

۲۔ مکلف ہونے کا سقوط استدلال کے ساتھ معتبر ہے، اضطرار کے ساتھ نہیں۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے جب ہوا میں پہاڑ دیکھا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے اور آگ انہیں گھیرے ہوئے تھی تو اس چیز نے انہیں ایمان کی طرف مجبور کر دیا اور ان پر تکلیف کا باقی ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ تھا ان کا مکلف نہ ہونا محال ہے۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

''اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا اور اتارا تم پر من وسلویٰ۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں عطا کر رکھی ہیں اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی ہم نے بادل کو تم پر چھتری کی مانند کر دیا۔ الْغَمَامَ جمع ہے غمامة کی جیسے سحابة اور سحاب۔ یہ اخفش سعید نے کہا ہے۔ فراء نے کہا: غمائم بھی جائز ہے اس سے مراد بادل ہیں کیونکہ وہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ڈھانپی گئی ہو وہ مغموم ہے۔ اسی سے المغموم علی عقله اور غم الھلال ہے جب چاند کو بادل ڈھانپ دے۔ الغین بھی الغیم کی مثل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انه لیغان علی قلبی۔ میرے دل پر چھا جائے۔ صاحب العین نے کہا: غین علیه کا مطلب اسے ڈھانپا گیا۔ الغین گھنے درختوں کو کہتے ہیں۔ سدی نے کہا: الْغَمَامَ سفید بادلوں کو کہتے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس لئے یہ کیا تھا تا کہ دن کے وقت انہیں سورج کی گرمی سے بچائے اور دن کے آخر میں بادل چھٹ جاتا تا کہ وہ چاند سے رات کے وقت روشنی حاصل کریں۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ان پر مصر اور شام کے درمیان تیہ کے صحراء میں ہوا تھا جب انہوں نے جبار لوگوں کے شہر میں داخل ہونے اور ان سے جنگ کرنے سے انکار کیا تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ (المائدہ: 24) پس انہیں اسی جگہ سزا دی گئی چالیس سال پانچ یا چھ فراسخ میں گھومتے رہے۔ روایت ہے کہ وہ دن کو چلتے تھے اور رات کو ٹھہرتے تھے۔ پس وہ وہاں ہی صبح کرتے جہاں گزشتہ کل صبح کرتے تھے، جب وہ تیہ میں جمع تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ہمارے لئے کھانا کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلویٰ اتارا۔ پھر انہوں نے کہا: ہمیں سورج کی گرمی سے کون بچائے گا اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا: ہم چراغ کس کے ساتھ جلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے محلے کے درمیان ایک نور کا ستون بنا دیا۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ وہ آگ کا ستون تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے پانی کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے لباس کون لائے گا، انہیں ایسا لباس دیا گیا جو نہ پرانا ہوتا، نہ بوسیدہ ہوتا اور نہ میلا ہوتا اور بچوں کے بڑھنے کے مطابق ان کے کپڑے بڑے ہوتے جاتے۔ واللہ اعلم (2)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى۔ الْمَنَّ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ اس کی تعیین کئی اقوال پر ہے: بعض نے کہا: ترنجبین ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ الطرنجبین (طا کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے) یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَنَّ سے مراد میٹھی گوند ہے۔ بعض نے فرمایا: شہد ہے بعض نے فرمایا: میٹھی شراب ہے۔ بعض نے فرمایا: باریک روٹی ہے۔ یہ وہب بن منبہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: الْمَنَّ مصدر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بغیر کسی تھکن اور کھیتی باڑی کے احسان فرمایا اس تمام کو شامل ہے (3)۔ اسی سے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الکمأة من المن الذی انزل علی بنی اسرائیل و ماء ھا شفاء للعین (4) وفی روایة من المن الذی انزل اللہ علی موسٰی۔ یعنی کھمبی اس مَنّ میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً، والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، باب وقولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام، حدیث 4118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نازل کیا۔ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔

ایک روایت میں ہے، اس مَنْ میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ کھمبی اس میں سے ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر نازل کیا یعنی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیہ کے صحرا میں پیدا فرمایا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا: کھمبی کو اَلْمَنّ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ اس میں بیج ڈالنے، پانی لگانے اور دیکھ بھال کرنے کی مشقت نہیں۔ پس یہ کھمبی بنی اسرائیل کے مَنْ سے ہے کیونکہ یہ بغیر مشقت کے ملی تھی۔ روایت ہے کہ ان پر من فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک اولوں کی طرح اترتا تھا۔ ہر شخص اپنے لئے اس دن کی خوراک لے لیتا تھا، جو اس سے ذخیرہ کرتا تھا وہ خراب ہوجاتا تھا، مگر جمعہ کے دن وہ ہفتہ کے دن کے لئے ذخیرہ کرتے تھے تو وہ خراب نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا، ہفتہ کے دن ان پر کچھ نازل نہیں ہوتا تھا۔ (1)

مسئلہ نمبر3: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص فرمائی کہ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ بعض علمائے طب نے فرمایا: آنکھ میں جو حرارت ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صرف اس کا پانی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی اور مرض کے لئے دوسری دوا میں مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنکھ کی ہر مرض کے لئے خالص اس کا پانی استعمال کرنے کا نظریہ رکھتے تھے (2)۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابو وجزہ تمام امراض کے لئے شہد استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کی تکلیف کے لئے بھی شہد استعمال کرتے تھے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اہل لغت نے کہا: الکمْ واحد ہے، اس کا تثنیہ کمآن ہے اور تین ہوتو اَکْمُؤ کہا جاتا ہے اور جب زیادہ ہوں تو کمأۃ (تاء کے ساتھ) آتا ہے۔ شجرۃ اور شجر کے برعکس استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَنّ اسم جنس ہے لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: السَّلْوٰی۔ السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بٹیر ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: باجماع مفسرین السَّلْوٰی پرندہ ہے۔ ہذلی نے غلطی کی ہے، اس نے کہا:

و قاسمها بالله جهداً لانتم الذ من السلوى اذا ما نشورها

اس نے اس شعر میں سلوی سے شہد مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے مفسرین کے اجماع کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مؤرج جو لغت اور تفسیر کے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: السَّلْوٰی سے مراد شہد ہے اور اس نے ہذلی کے مذکور شعر سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لغت کنانہ اس طرح ہے۔ اس کو سلوی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تسلی ہوتی ہے۔ اسی سے عين السلوان ہے (بیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المقدس میں ایک چشمہ ہے جس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔) جیسے شعر میں ہے:

لو اشرب السلوان ما سليت　　ما بی غنی عنك وان غنيت

اسی طرح جوہری نے کہا: السلوی۔ شہد ہے اس نے بھی ہذلی کا بیت ذکر کیا ہے۔

الذ من السلوی اذا مانشورها

اور انہوں نے غلطی کا ذکر نہیں کیا۔ السُلْوانة، یہ ایک سپی ہے۔ لوگ کہتے ہیں جب اس پر بارش کا پانی ڈالا جائے اور پھر عاشق اس کو پی لے تو اسے تسلی ہو جاتی ہے۔

شربت علی السلوانة ماء مزنة　　فلا وجديد العيش يا مَیّ ما اسْلُو

اس پانی کا نام سلوان ہے۔ بعض نے فرمایا: السلوان ایک دوا ہے جس کو غمگین پیتا ہے تو اس کو تسلی ہوتی ہے۔ اطباء اس کو مفرح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: سلیت و سلوت یہ دو لغتیں ہیں۔ و ھوفی سلوۃ من العیش، وہ خوشحال زندگی میں ہے۔ یہ ابو زید سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا مفرد ہے۔

اخفش نے کہا: یہ لفظاً جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر ہے اور اس کا واحد سلوی بھی جمع سلویٰ کے مشابہ ہے جیسے کہتے ہیں دِفلی یہ واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سمانی اور شکاعی یہ بھی واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خلیل نے کہا: اس کا واحد سلواۃ ہے جیسے اس شعر میں ہے: (1)

انی لتعرونی لذکراك ھزۃٌ　　کما انتقص السلواۃ من بلل القطر

کسائی نے کہا: السلوی واحد ہے اور اس کی جمع سلاویٰ ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 6: السَّلْوٰی کا عطف، الْمَنَّ پر ہے۔ اس میں اعراب ظاہر نہیں ہے کیونکہ اسم مقصور ہے اور اسم مقصور میں اعراب ظاہر نہ کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ اس کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ خلیل نے کہا: الف، ہوائی حرف ہے اس کا کوئی مستقر نہیں ہے یہ حرکت کے مشابہ ہے اس کی حرکت محال ہے۔ فراء نے کہا: اگر الف کو حرکت دی جائے تو یہ ہمزہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس میں حذف سے تقدیر کلام اس طرح ہے: و قلنا کلوا۔ اختصار اظاہر کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ الطیبات کا لفظ یہاں حلال اور لذیذ دونوں معانی میں ہے۔ (3)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا ظَلَمُوْنَا اس سے پہلے فعصوا مقدر کیا جائے گا۔ انہوں نے نعمتوں کے مقابل شکر نہ کیا۔ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے نعمتوں کے مقابلہ میں گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا تھا کہ داخل ہو اس بستی میں پھر کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو اور داخل ہونا دروازے سے سر جھکاتے ہوئے اور کہتے جانا بخش دے ہمیں اور ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو''۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ، قُلْنَا سے الف کو حذف کیا گیا ہے اس کے سکون اور اس کے بعد دال کے سکون کی وجہ سے۔ اور وہ الف جس کے ساتھ ابتدا کی گئی ہے دال سے پہلے وہ الف وصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذِهِ الْقَرْيَةَ یعنی شہر۔ شہر کو قریۃ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس میں اجتماع ہوتا ہے۔ اسی سے ہے: قریت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کیا اس پانی کا نام قِریٰ ہوتا ہے، اسی طرح جس کے ساتھ مہمان نوازی کی جائے اسے قِریٰ کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ المِقراۃ، حوض کے لئے بولا جاتا ہے۔ القِریٰ، پانی کی گزرگاہ کے لئے اور القَرا پیٹھ کے لئے۔ اسی سے یہ مصرعہ ہے:

لاحقُ　بطنٍ　بِقَراً　سمينٍ

المقاری: بڑے پیالے کہا۔

کہا: عظام المقاری ضیفهم لا یُفزَّع

المقاری کا واحد مِقراۃ ہے۔ ان تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ القریۃ (قاف کے کسرہ کے ساتھ) یمن کی لغت ہے۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے کہا: یہ بیت المقدس ہے۔ بعض نے کہا: بیت المقدس میں سے اریحا ہے۔ عمر بن شیبہ نے کہا: یہ بادشاہوں کی رہائش گاہ تھی (1)۔ ابن کیسان نے کہا: شام کا شہر ہے۔ ضحاک نے کہا: الرملہ، اردن، فلسطین اور تدمُر ہے۔ یہ دوسری نعمت ہے۔ ان کے لئے شہر میں داخل ہونا مباح کر دیا اور ان سے تیہ کی سرگردانی ختم کر دی۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا یہ امر اباحت کے لئے ہے۔ رَغَدًا کثیر اور واسع، یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَغَدًا حال ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ زمین بڑی بابرکت اور زیادہ غلہ دینے والی تھی اس لئے فرمایا: رَغَدًا (2)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، باب کی جمع ابواب ہے اور اس کی جمع الهوبة بھی بناتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

هتاك　اخبية　ولاج　أبوِبَة　　يخلط بالبر منه الجدّ واللينا

اگر اسے مفرد ذکر کرے تو پھر جائز نہیں۔ اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: مرحباً بالقوم... او بالوفد... غیر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

خزایا ولا ندامی(1)۔۔۔ تبوبت بوابًا یعنی میں نے دربان بنایا۔

ابواب مبوبة جیسے کہتے ہیں اصناف مصنفة۔ ھذا شیء من بابتك۔ یہ تمہارے لئے مناسب ہے۔ سجدہ کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ

وہ دروازہ جس سے انہیں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ بیت المقدس میں تھا۔ آج وہ باب حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ مجاہد وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد اس قبہ کا دروازہ ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ سُجَّدًا حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب رکوع کی حالت میں جھکتے ہوئے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تواضع کرتے ہوئے، کوئی متعین ہیئت مراد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قُوْلُوْا اس کا عطف ادْخُلُوا پر ہے۔ حِطَّةٌ جمہور کی قراءت مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدا محذوف ہے یعنی مسئلتنا حطةٌ یا اس کا یہ اعراب حکایۃً ہے اور اخفش نے کہا: حطہ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس تقدیر پر احطط عنا ذنوبنا حطةً (ہمارے گناہ معاف فرمادے۔) نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ تم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو(2)۔ ایک اور حدیث ان سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا: قولوا مغفرةً نصب کی تفسیر یعنی قولوا شيئاً يحط ذنوبكم تم ایسی شے کہو جو تمہارے گناہ معاف کردے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: قل خيراً۔ ائمہ قراء اس پر رفع ہی پڑھتے ہیں یہ لغت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔ اس کی وجہ وہ ہے جو عربوں سے بدل کے معنی میں حکایت کیا گیا ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: کہا جاتا ہے بدّلتہ یعنی میں نے اسے تبدیل کیا اور میں نے اس کی شخصیت کو زائل نہیں کیا ابدلته یعنی میں نے اس شخص اور عین کو بدل دیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عزل　الامير　للامير　المبدل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس:15) (اور کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کردیجئے)۔

حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے، انہوں نے کہا حِطَّةٌ یہ رفع کی بنا پر تفسیر ہے۔ یہ تمام نحاس کے اقوال ہیں۔ حسن اور عکرمہ نے کہا: حطة کا معنی حط ذنوبنا ہے۔ انہیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تاکہ اس کی وجہ سے ان کے گناہ گر جائیں۔ ابن جبیر نے کہا: اس کا معنی استغفار ہے(3)۔ ابان بن تغلب نے کہا: اس کا مطلب توبہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فاز　بالحطة　التی　جعل　الل　ـه　بها　ذنب　عبده　مغفوراً

اس نے ایسی توبہ پائی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے گناہوں کو معاف فرمایا۔

ابن الفارس نے "المجمل" میں کہا کہ حطة یہ ایسا کلمہ ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے گناہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، 85، 402 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

معاف ہوجاتے۔ جوہری نے بھی ''الصحاح'' میں یہی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ انہیں بعینہٖ یہی لفظ کہنے کا مکلف کیا گیا ہو، حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو(1) اور حِطَّةٌ کہو تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ تو انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا وہ دروازے سے اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: حبۃٌ فی شعرۃٍ یعنی (جو میں دانہ)۔ یہ حدیث بخاری نے بھی نقل کی ہے۔ فرمایا: انہوں نے حکم کو بدل ڈالا۔ انہوں نے کہا: حطة حبة فی شعرة اور صحیحین کے علاوہ میں ہے: حنطة فی شعر۔ اور کہا گیا ہے: انہوں نے کہا: هطا سمهاثا۔ یہ عبرانی لفظ ہے اس کی تفسیر سرخ گندم ہے۔ یہ ابن قتیبہ نے حکایت کیا ہے اور یہ ہروی نے سدی اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ ان کا مقصد اس کے خلاف کرنا تھا جو اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ پس انہوں نے نافرمانی کی، سرکشی کی اور استہزاء کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے ساتھ سزا دی۔ ابن زید نے کہا: یہ عذاب طاعون تھا ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ روایت ہے کہ دروازہ چھوٹا بنایا گیا تھا تا کہ وہ جھکتے ہوئے داخل ہوں تو وہ اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

مسئلہ نمبر 6: بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ منصوص علیہا اقوال کو شریعت میں تبدیل کرنا، اس سے خالی نہیں ہوگا کہ اس لفظ کا یا اس کے معنی کا مکلف بنایا گیا ہوگا۔ اگر اس لفظ کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم کو تبدیل کرنے والے کی مذمت کی ہے، اور اگر معنی کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز ہوگا جو اس معنی کو ادا کرے، اسے ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز نہ ہوگا جو اس معنی سے ہی اسے خارج کردے۔(2)

علماء کا اس معنی میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم سے حکایت کیا گیا ہے کہ عالم کے لئے خطاب کے مواقع پر حدیث بالمعنی کا نقل کرنا جائز ہے لیکن مکمل طور پر معنی کے ساتھ مطابقت ہو، یہ جمہور کا قول ہے، بہت سے علماء نے الفاظ کو بدلنے سے منع کیا ہے۔ ان میں سے ابن سیرین، قاسم بن محمد اور رجا بن حیوہ ہیں۔

مجاہد نے کہا: حدیث میں اگر تو چاہے تو کمی کر لیکن اس میں اضافہ نہ کر۔ حضرت مالک بن انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں تا اور یا میں بھی سختی کرتے تھے۔ اس بنا پر ائمہ حدیث کی ایک جماعت لفظ کو تبدیل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیتی تھی کہ وہ غلط سن لیتے تھے اور اس کو جانتے تھے لیکن اسے بدلتے نہیں تھے۔ ابومجلز نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے کوئی حدیث سنی پھر اس نے اسے اسی طرح بیان کیا جس طرح اس نے سنی تھی تو وہ سلامت رہا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت زید بن ارقم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس طرح تقدیم و تاخیر، کمی بیشی میں اختلاف ہے کیونکہ بعض علماء معنی کا اعتبار کرتے ہیں بعض لفظ کا اعتبار کرتے ہیں بعض اس میں سختی کرتے ہیں اور لفظ کو نہیں چھوڑتے۔ یہ

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث نمبر 3151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی زیر آیت ہذا

دین میں احوط، اتقی اور اولی ہے لیکن اکثر علماء کی سیرت سے معلوم ہے وہ واقعات کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ اور یہ نہیں تھا مگر اس لئے کہ وہ اپنی توجہ معانی پر رکھتے تھے اور وہ احادیث پر تکرار اور احادیث کے لکھنے کا التزام نہیں کرتے تھے۔ حضرت واثلہ بن اسقع سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جو کچھ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہم نے تمہاری طرف اسے نقل کیا، تمہارے لئے معنی کافی ہے۔ قتادہ نے حضرت زرارہ بن اوفی سے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ سے ملا، انہوں نے مجھے الفاظ مختلف بیان کیے لیکن معنی ایک تھا۔ نخعی، حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔

حسن نے کہا: جب تو معنی صحیح بیان کرے تو تیرے لئے کافی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: جب میں تمہیں کہوں کہ میں تمہیں اسی طرح بیان کرتا ہوں جس طرح میں نے سنا تو میری تصدیق نہ کرو وہ معنی ہے۔ وکیع نے کہا: اگر معنی میں وسعت نہ ہو گی تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ علماء کا عجمیوں کے لئے ان کی زبان میں شریعت کو نقل کرنے پر اور ان کے لئے ترجمہ کرنے پر اجماع ہے۔ یہ نقل بالمعنی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسا ہی کیا ہے جو اس نے گزشتہ قوموں کی خبریں بیان کی ہیں۔ پس اس نے قصص بیان کیے۔ بعض قصص کو مختلف جگہوں پر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا جبکہ معنی ایک ہے۔ ان قصص کو ان کی زبان میں عربی زبان کی طرف منتقل کیا اور وہ تقدیم و تاخیر، حذف، الغا، کمی بیشی میں ان کے مخالف ہیں۔ جب عربی کو عجمی زبان میں بدلنا جائز ہے تو عربی میں بدلنا بدرجہ اولی جائز ہے اسی معنی سے حسن اور امام شافعی نے حجت پکڑی ہے۔ یہ اس بات میں صحیح ہے۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے شاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا پھر اسے آگے پہنچایا جس طرح اس کو سنا تھا (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے بستر پر سونے کے وقت کی دعا سکھائی۔ آمنت بکتابك الذی أنزلت و نبیك الذی ارسلت (2)۔ اس شخص نے دوبارہ یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا: و رسولك الذی ارسلت۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: و نبیك الذی ارسلت کہو۔ روایت بالمعنی کے عدم جواز کے قائل علماء کہتے ہیں: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے دعا سکھائی اسے لفظ کی مخالفت کی اجازت نہ دی اور فرمایا: اسی طرح ادا کرو جس طرح سنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا کے ارشاد میں مراد اس کا حکم ہے اس کا لفظ نہیں ہے کیونکہ لفظ کا اعتبار نہیں اور تیری رہنمائی کرتا ہے یہ اصول کہ خطاب سے مراد اس کا حکم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ یعنی بہت سے فقہ حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے اور بہت سے فقہ حاصل کرنے والے اس کی طرف پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث بعینہ مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے جبکہ معنی ایک ہے اگرچہ تمام الفاظ کا مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونا ممکن ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ ایک حدیث ہے جو مختلف الفاظ سے نقل کی گئی ہے یہ جواز کی واضح دلیل ہے۔ رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو رسولك کے لفظ سے نبیك کے لفظ کی طرف لوٹانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کا لفظ زیادہ مدح کا باعث تھا ان

1۔ ابوداؤد، باب فضل نشر العلم، حدیث نمبر 3175 (مفہوم) ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فضل من بات علی الوضوء حدیث نمبر 239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دونوں صفات میں ہر صفت کا خاص موقع محل ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول کا اسم تمام پر واقع ہوتا ہے اور نبی کا اسم صرف انبیاء کرام کے لئے بولا جاتا ہے۔ رسولوں کو انبیاء سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ نبوت و رسالت کو جمع کرتے ہیں۔ جب و نبیك فرمایا تو ایسی نعت ذکر فرمائی جو زیادہ مدح کا باعث تھی پھر اسے الذی ارسلت فرما کر رسالت کے ساتھ مقید فرمایا...... پس رسولك کے قول سے نبیك کے قول کی طرف اگر اسے لوٹایا ہے تو یہ اس لئے ہے تاکہ نبوت و رسالت کو جمع کرے۔ یہ کلام کہنا پسندیدہ نہیں ہے کہ تو کہے: هذا رسول فلان الذی ارسلہ هذا قتیل زید الذی قتلہ، کیونکہ ان عبارات میں معنی کا تکرار ہے کیونکہ بعد والی کلام پہلے معنی کو ہی مفید ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے: هذا رسول عبد اللہ الذی ارسلہ الی عمرو و هذا قتیل زید الذی قتلہ بالامس او فی وقعۃ کذا۔ یعنی یہ عبد اللہ کا پیغام رساں ہے جسے اس نے عمرو کی طرف بھیجا ہے یہ زید کا مقتول ہے جسے اس نے کل قتل کیا تھا یا فلاں واقعہ میں قتل کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ جب پہلے راوی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بدلنا جائز ہے تو دوسرے راوی کے لئے راوی کے الفاظ بدلنا بھی جائز ہوگا اور یہ باریک فرق اور خفا کی وجہ سے حدیث کو کلیۃً ختم کرنے کی طرف پہنچا دے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روایت بالمعنی کا جواز معنی کی مطابقت اور مساوات کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اگر معنی سے مطابقت نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں اختلاف صحابہ اور تابعین کے زمانہ کی طرف نظیر کرنے سے متصور ہوتا ہے کیونکہ وہ مادری زبان کی معرفت میں برابر تھے۔ رہا بعد والے لوگوں کا حکم ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ طبائع بدل چکی ہے، مفہوم مختلف ہو چکے ہیں، عادتیں تبدیل ہو چکی ہیں یہی حق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ابن عربی نے ایک انوکھی بات کی ہے کیونکہ جب جواز معنی کی مطابقت کے ساتھ مشروط ہے تو پھر صحابہ، تابعین اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق نہ رہا۔ اسی وجہ سے اصولیین اور محدثین میں سے کسی نے یہ تفریق نہیں کی۔ ہاں اگر ابن عربی کہتے کہ ان کے زمانہ میں مطابقت بہت بعید ہے تو یہ بہتر ہوتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ نافع نے یا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر نے تا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مجاہد کی قراءت ہے باقی قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور نون پر نصب پڑھی ہے یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے پہلے وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا ہے۔ پس نَّغْفِرُ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے پر جاری ہے، تقدیر کلام اس طرح ہوگی: قلنا ادخلوا الباب سجدا نغفر۔ نیز بعد میں بھی سنزید نون کے ساتھ آرہا ہے۔ خَطٰيٰكُمْ یہ اکثر کے قول کے مطابق ہے۔ یہ اپنے باب پر ہے اور جن علماء نے تغفر تا کے ساتھ پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ لفظ خَطٰيٰكُمْ مونث ہے اس لئے صیغہ بھی مونث ہوگا، کیونکہ یہ خطیئۃ کی جمع مکسر ہے اور یا پڑھنے کی وجہ سے جب فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ آگیا تو فعل کا مذکر ذکر کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے یا اور تا بہتر ہیں، اگرچہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے کا ذکر ہے وَ اِذْ قُلْنَا میں کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ گناہوں کو بخشنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس نون سے استغنا کیا اور فعل کو معاف شدہ خطاؤں کی طرف لوٹایا۔

مسئلہ نمبر 8: خطایا جو کہ خطیئۃٌ کی جمع ہے اس کی اصل میں اختلاف ہے۔ خطیئۃٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ خلیل نے کہا: خطایا اصل میں خطائِی تھا پھر قلب کیا گیا اور کہا گیا: خطائِی یعنی ہمزہ پہلے یا بعد میں پھر یا کو الف سے بدلا گیا خطاءا ہو گیا جب دو الف جمع ہوئے جن کے درمیان ہمزہ ہے تو ہمزہ الف کی جنس سے بدل گیا پھر گویا تین الف جمع ہو گئے پھر ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو ہو گیا خطایا۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اصل خطایِئی ہے پھر یا کو ہمزہ بنایا گیا جس طرح مدائن میں یا کو ہمزہ بنایا گیا تو خطائِی ہو گیا۔ پھر ایک کلمہ میں دو ہمزے جمع نہیں ہوتے۔ پس دوسرے ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو خطائی ہو گیا پھر پہلی صورت کی طرح عمل کیا گیا۔

فراء نے کہا: خطایا جمع خطیہ (بغیر ہمزہ کے) ہے۔ جیسے تو کہتا ہو: ھدیۃ و ھدایا۔ فراء نے کہا: اگر خطایا، خطیئۃٌ (مہموزہ) جمع ہوتا تو تو خطاءا کہتا۔ کسائی نے کہا: اگر اس کی جمع مہموزہ ہو تو ایک ہمزہ دوسرے ہمزہ میں ادغام ہو جائے گا جیسے تو کہتا ہے: دواب۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی ان کے احسان میں ہم اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: دوسرے دن کے لیے من وسلویٰ جمع کرنے کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جس نے دوسرے دن کے لیے من وسلویٰ جمع نہیں کیا ان کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: جو گنہگار ہے اس کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جو محسن ہے اس کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ یعنی ہم ان کے پاس سابقہ احسان پر احسان کا اضافہ کر دیں گے۔ محسنین، احسن سے اسم فاعل ہے۔ المحسن وہ ہوتا ہے جس کا توحید کا عقدہ صحیح ہو اور اپنے آپ کو چلانے میں خوبصورت ہو اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو، مسلمانوں سے اپنے شر کو روکے۔ حدیث جبریل میں ہے، احسان کیا ہے؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ جبریل نے کہا: آپ نے سچ فرمایا(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾

"پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا، الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے یعنی ان میں سے ظالموں نے بدلا اور بات سے جو انہیں کہا گیا تھا۔ یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا تھا کہ تم کہو: حِطَّةٌ تو انہوں نے کہا حنطة

1۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 184

جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے ایک حرف کلام سے زیادہ کر دیا۔ پس وہ مصیبت سے دو چار ہوئے، اس میں یہ آگاہی دی کہ دین میں زیادتی اور شریعت میں اپنی ایجاد عظیم خطرہ اور شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ ایک کلمہ کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا جو توبہ سے تعبیر تھا وہ ایسے بڑے عذاب کا موجب بنا پھر تمہارا کیا خیال ہے جو معبود کی صفات میں تبدیلی کرتے ہیں۔ یہ قول کی تبدیلی کی سزا تھی حالانکہ قول، عمل سے کم ہوتا ہے، تو جو فعل میں تبدیلی کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ، بدل اور ابدل کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ جوہری نے کہا: ابدلت الشیء غیرہ۔ تو نے کسی چیز کو دوسری چیز سے بدل ڈالا۔ بدله الله من الخوف امناً، اللہ تعالیٰ نے اس کے خوف کو امن سے بدل دیا، تبديل الشیء کسی چیز کو تبدیل کرنا اگرچہ اس کا بدل نہ بھی لایا جائے۔ استبدل الشیء بغیرہ و تبدله به۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز بدل دے، المبادله کا معنی تبادلہ کرنا۔ الأبدال، ایسے نیک لوگوں کو کہتے ہیں جن سے دنیا خالی نہیں ہوتی۔ جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو ابدال بنا دیتا ہے۔

ابن درید نے کہا، واحد، بدیل ہے اور البدیل کا معنی بدل ہے۔ بدل الشیء غیرہ کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلنا۔ کہا جاتا ہے: بَدَلٌ، بِدلٌ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جیسے شَبَهٌ، شِبْهٌ۔ مَثَلٌ، اور مِثل - نَكَلٌ، اور نِكْلٌ۔ ابوعبید نے کہا: ان چار حروف کے علاوہ فَعَلٌ اور فِعل نہیں سنا گیا۔ البدل اس تکلیف کو بھی کہتے ہیں جو دونوں ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہے۔ بَدِلَ، یَبْدَلُ بَدَلاً بھی استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے ظَلَمُوْا کے لفظ کو مکرر ذکر کیا ضمیر ذکر نہیں فرمائی۔ تکرار دو قسموں پر ہوتا ہے کلام کے مکمل ہونے کے بعد استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور } فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (البقرہ:79) پھر بعد میں فرمایا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ (البقرہ:79) مما کتبوا نہیں فرمایا۔ ویل کا لفظ ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا۔ اسی سے خنساء کا قول ہے:

تعرقنی الدھر نهسًا و حزاً و اوجعنی الدهر قرعاً و غمزاً

یعنی زمانہ نے مجھے بڑی بڑی مصیبتوں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے دو چار کیا۔

دوسری قسم تکرار کی یہ ہوتی ہے کہ ضمیر کی جگہ پر کلام کے مکمل ہونے سے پہلے اسم ظاہر کا تکرار کیا جاتا ہے جیسے اَلْحَآقَّةُ ۙ مَا الْحَآقَّةُ ۚ (الحاقہ) اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ (القارعہ) اگر تعظیم و تفخیم کا ارادہ نہ کیا جاتا تو قیاس کا تقاضا یہ تھا الحاقة ماهی، القارعة ماهی۔ اس کی مثل ہے فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ (الواقعہ) وَ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ ؕ (الواقعہ) اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ کو ان کے بڑے ثواب کو پانے کی وجہ سے اظہار شان کے لئے مقرر ذکر کیا اور اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ کو ان کے عذاب الیم کے پانے کی وجہ سے مکرر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم سے شاعر کا قول ہے:

لیت الغراب غداۃ ینعب دائباً کان الغراب مقطع الاوداج

اس شعر میں شاعر نے الغراب کو دو دفعہ ذکر کیا۔

عدی بن زید نے دونوں معانی کو جمع کیا ہے۔ اس نے کہا:

لا اری الموت یسبق الموت شیء نغص الموت ذا الغنی والفقیرا

شاعر نے موت کے لفظ کو تین مرتبہ ذکر کیا۔ یہ پہلی قسم سے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا ھندٌ و ارض بھا ھند و ھند اتی من دونھا النأی والبعد

اس میں شاعر نے محبوب کی عظمت شان کے لئے اس کا تین دفعہ ذکر کیا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِجْزًا جمہور کی قرأت رجزاً را کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ابن محیصن نے را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الرجز کا معنی عذاب ہے اور سین کے ساتھ رجس ہو تو اس کا معنی بدبو اور گندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ (توبہ:125) یعنی بدبو کو ان کی بدبو کی طرف زیادہ کر دیا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔ فراء نے کہا: الرجز سے الرجس ایک چیز ہے۔ ابو عبید نے کہا: جیسے کہا جاتا ہے السدغ، الزدغ اسی طرح رجس اور رجز ہم معنی ہیں۔ فراء نے کہا: بعض نے کہا الرُّجز (را کے ضمہ کے ساتھ) ایک بت کا نام ہے جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ بھی اس ارشاد میں پڑھا گیا ہے: الرُّجز فاھجر۔

اور الرجز (را اور جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ شعر کی ایک قسم ہے۔ خلیل نے شعر ہونے کا انکار کیا ہے۔ یہ الرَّجز سے مشتق ہے جو اونٹ کے پیچھے حصہ کو لاحق ہوتی ہے جب اسے لاحق ہوتی ہے تو اس کی رانیں کانپنے لگتی ہیں۔

بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ یعنی یفسقھم۔ الفسق کا معنی نکلنا ہے۔ یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے یفسِقون سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝٦٠

''اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے تو ہم نے فرمایا: مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر۔ تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے۔ پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ التقائے ساکنین کی وجہ سے ذال کو کسرہ دیا گیا ہے، سین، سوال کے لئے ہے مثلاً استعلم، استخبر، استنصر (علم طلب کرنا۔ خیر طلب کرنا، مدد چاہنا) یعنی اپنی قوم کے لئے پانی پلانا طلب کیا۔ عرب کہتے ہیں: سقیتہ و اسقیتہ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ شاعر نے کہا:

سقی قومی بنی مجدٍ واسقی　　نمیرًا والقبائل من ھلال

اور یہ بھی کہا گیا ہے: سقیتہ یہ سقی الشفۃ سے مشتق ہے۔ اسقیتہ کا مطلب ہے: میں نے پانی پر اس کی رہنمائی کی۔

مسئلہ نمبر 2: الاستسقاء، پانی کے نہ ہونے اور بارش نہ برسنے پر ہوتا ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو تو اس وقت عبودیت، فقر، مسکنت اور ذلت کے اظہار کا حکم ہوتا ہے ساتھ ساتھ خالص توبہ کا بھی حکم ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب کی، آپ عیدگاہ کی طرف تواضع وانکساری اور تضرع وزاری کرتے ہوئے نکلے (1)۔ یہ تیرے لئے دلیل کافی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کتنا ضروری ہوگا، ہماری تو توبہ بھی نہیں ہوتی مگر یہ کہ ہٹ دھرمی، اللہ تعالیٰ کی مخالفت۔ ہمیں پھر بارش کیسے دی جائے گی۔ لیکن حدیث ابن عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لوگوں نے اپنے اموال کی زکوٰۃ کو نہ روکا مگر آسمان سے بارش روک دی گئی۔ اگر چوپائے نہ ہوتے تو انہیں بارش نہ دی جاتی (2)، مکمل حدیث آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 3: استسقا کا طریقہ: عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے...... جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے...... خطبہ اور نماز ہے، یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی نسبت سے نہ نماز ہے نہ عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے یہ صرف دعا ہے اور امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے بخاری ومسلم نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث میں امام ابوحنیفہ کے لئے حجت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی جو فوراً قبول کی گئی، آپ نے اسی پر اکتفا کیا اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔ اس میں سنت کے بیان کا ارادہ نہ کیا۔ جب سنت کے بیان کا قصد کیا تو اپنے فعل سے اسے بیان کیا جیسا کہ عبداللہ بن زید المازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف نکلے بارش طلب کی اور اپنی چادر کو الٹایا اور دو رکعت نماز پڑھی (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔ استسقا کے مزید احکام سورۂ ہود میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ، العصا، ڈنڈا۔ یہ اسم مقصور مؤنث ہے، اس کا الف واؤ کا بدل ہے۔ شاعر نے کہا:

علی　عصویھا　سابریّ　مُشَبرقُ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی صلاۃ الاستسقاء، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب العقوبات، حدیث نمبر 4008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ابواب الاستسقا، باب تحویل الرداء فی الاستسقاء، حدیث نمبر 956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(یعنی ڈول کی لکڑیوں پر باریک پھٹا ہوا کپڑا ہے)

عصا کی جمع عُصِیّ و عِصِیّ یہ فعول کا وزن ہے عین کو مابعد کسرہ کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور اس کی جمع اَعْصٍ بھی آتی ہے مثلاً زمن از مُن۔ ضرب المثل ہے: العصا من العُصیة یعنی بعض امر بعض سے ہے۔ عربوں کا قول ہے: القی عصاہ۔ یعنی اس نے سفر ترک کر دیا۔ یہ مثال ہے۔ کہا:

فالقت عصاها واستقربها النوی کما قرّ عیناً بالایاب المسافرُ

قرآن حکیم میں ہے:

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (طٰہٰ)

عصا کے منافع پر کلام اسی آیت کے تحت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فراء نے کہا: سب سے پہلی غلطی عراق میں سنی گئی۔ وہ یہ تھی: ھذہ عصاتی۔ کبھی اجتماع و افتراق کو عصا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی وجہ سے خوارج کے بارے میں کہا جاتا ہے: شقوا عصا المسلمین یعنی خوارج نے مسلمانوں کے اجتماع کو پھاڑ دیا۔ وانشقت العصا، یعنی اختلاف واقع ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

اذا کانت الهیجاء وانشقت العصا فحسبك والضحاك سیف مهنّدٌ

یعنی تجھے اور ضحاک کو تیز تلوار کفایت کرے گی جب جنگ شروع ہو جائے اور اختلاف واقع ہو جائے۔

عرب کہتے ہیں: لا ترفع عصاك عن اهلك یعنی ان کو ادب سکھاؤ۔ واللہ اعلم

حجر (پتھر) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تھوڑے پتھر ہوں تو اس کی جمع احجار ہو اور زیادہ ہوں تو حجار، حجارۃ ہو اور الحجارۃ بہت نادر ہے۔ یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے: جمل و جمالہ۔ ذکر و ذکارۃٌ۔ اسی طرح ابن الفارس اور جوہری نے کہا۔

میں کہتا ہوں: قرآن میں ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ (البقرہ:74) وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ (البقرہ:74) قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً (الاسراء:50) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ (الفیل:4) وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً (الحجر:74) قرآن میں اتنی مرتبہ حجر کی جمع حجارۃ استعمال ہوئی ہے تو پھر یہ نادر کیسے ہے۔ مگر یہ کہ یہ دونوں یہ مراد لیتے ہوں کہ قیاس میں نادر ہے استعمال میں کثیر فصیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْفَجَرَتْ اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فضرب فانفجرت۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر تھا کہ وہ پانی کو نکال دیتا اور بغیر ضرب کے پتھر کو پھاڑ دیتا لیکن اس نے اپنی حکمت کی وجہ سے مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط فرمایا تا کہ اس کے بدلے اپنی مراد تک پہنچ سکیں اور اس پر آخرت میں ان کا ثواب و عقاب مرتب ہو الانفجار کا معنی الانشقاق (پھٹنا) ہے۔ اسی سے ہے: انشق الفجر۔ انفجر الماء انفجاراً یعنی فجر پھوٹ پڑی، پانی کھل گیا، الفجرۃ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی نکلے۔ الانبجاس۔ یہ انفجار سے تنگ ہوتا ہے کیونکہ پہلے انبجاس ہوتا ہے پھر انفجار ہوتا

ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انبجس، تجبس، تفجر، تفتق تمام کا ایک معنی ہے۔ یہ ہروی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا، اثْنَتَا یہ انفجرت کی وجہ سے محل رفع میں ہے علامت رفع اس میں الف ہے اس کو اعراب دیا گیا ہے جب کہ دوسرے اسماء اعداد (یعنی ۱۱ سے ۱۹ تک کے اسماء اعداد) کو اعراب نہیں دیا جاتا (دونوں جز مبنی بر فتحہ ہوتے ہیں) کیونکہ تثنیہ ہمیشہ اپنے معنی کی صحت کی وجہ سے معرب ہوتا ہے۔

عَيْنًا اس کو بیان کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مجاہد، طلحہ اور عیسیٰ نے عَشِرَةَ شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بنی تمیم کی لغت ہے، یہ ان کی لغت سے نادر ہے کیونکہ ان کا طریقہ تخفیف ہے اور اہل حجاز کی لغت عشرہ ہے کیونکہ ان کا طریقہ التثقیل ہے۔ یہ تمام نحاس نے بیان کیا ہے۔ العین کا لفظ اسماء مشترکہ میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: عین الماء، عین الانسان، عین الرکبة، عین الشمس (پانی کا چشمہ، انسان کی آنکھ، گھٹنا، سورج کی ٹکیہ) العین اس بادل کو بھی کہتے ہیں جو قبلہ کی سمت سے آتا ہے۔ العین اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو متواتر پانچ یا چھ دن برستی رہے اور ختم نہ ہو۔ بلدٌ قلیل العین۔ ایسا شہر جس میں لوگ کم ہوں۔ وَمَا بها عین، یا کی حرکت کے ساتھ۔ العین مشکیزہ کے سوراخ کو بھی کہتے ہیں۔ العین من الماء (پانی کا چشمہ) العین من الحیوان (حیوان کی آنکھ سے) مشابہ ہے کیونکہ اس سے پانی اس طرح نکلتا ہے جس طرح حیوان کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ جو حیوان کی آنکھ سے نکلتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو انسان میں ہے۔ اسے عین الماء پانی کے چشمہ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ زمین میں جو کچھ ہے اس سے افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 6: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا عصا پتھر پر مارنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ پتھر طور پہاڑ کا تھا اور مربع شکل میں تھا، بکری کے سر کے برابر تھا، بوری کے ٹکڑے میں ڈالا جاتا تھا اور اس کے ساتھ سفر کیا جاتا تھا۔ جب کسی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اترتی تو وہ ان کے پڑاؤ کے درمیان رکھا جاتا تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ پتھر اٹھاتے نہیں تھے بلکہ ہر مقام پر وہ پتھر پالیتے تھے۔ یہ اعجاز و معجزہ میں بہت بڑی چیز ہے(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ حجر مطلق ذکر کیا گیا ہے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام جس پتھر پر چاہیں عصا مار دیں، پانی جاری ہو جائے گا، یہ معجزہ ہونے میں زیادہ بلیغ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک معین پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا تھا جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بیان کیا تھا اسی وجہ سے اسے معرفہ ذکر فرمایا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہ وہ پتھر تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غسل کرتے وقت کپڑے رکھے تھے اور وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس الزام سے آپ کو بری فرمایا جو آپ کی قوم آپ پر لگاتی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا:(2) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ پتھر جو مربع شکل میں تھا، ہر طرف سے تین چشمے نکلتے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے تھے۔ جب انہیں پانی کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور وہ چل پڑتے تھے تو چشمے خشک ہو جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی اپنی انگلیوں سے اور اپنے ہاتھ سے نکالنے کا معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑا معجزہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں صبح وشام پتھروں سے پانی نکل رہا ہے لیکن ہمارے نبی کا معجزہ ایسا تھا جو ہمارے نبی سے پہلے کسی کے لئے نہیں تھا، ہمارے نبی نے گوشت اور خون کے درمیان سے پانی نکالا۔ ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم نے پانی نہ پایا، تو ایک چھوٹا سا پتھر کا پیالہ لایا گیا آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا، میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے نکل رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے، آؤ پاکیزہ پانی کی طرف (1)۔ اعمش نے کہا: مجھے سالم بن ابی الجعد نے بیان کیا، فرمایا: میں نے حضرت جابر سے پوچھا: اس وقت تم کتنے لوگ تھے؟ حضرت جابر نے کہا: پندرہ سو۔ یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ یعنی ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے لئے ایک چشمہ تھا جسے وہ قبیلہ پہچانتا تھا اور وہ کسی دوسرے چشمہ سے نہیں پیتا تھا۔ المشرب، (پینے کی جگہ)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مشروب ہے۔

اسباط بنی اسرائیل میں عربوں کے قبائل کی طرح تھے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے (2)۔ عطا نے کہا: اس پتھر کے چار اطراف تھے ہر ایک طرف سے تین چشمے نکلتے تھے ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا ہر ایک اپنے چشمہ کو ہی استعمال کرتا تھا اور ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ہر سبط میں پچاس ہزار جنگجو تھے، ان کے گھوڑوں اور چوپایوں کے علاوہ، عطا نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے پتھر پر عورت کے پستان کی مثل پہلے ابھار پیدا ہوتا پھر پانی بہنے لگتا۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوا وَاشْرَبُوا کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وقلنا لهم كلوا المن والسلوىٰ واشربوا الماء المتفجر المنفصل۔ ہم نے انہیں کہا: من وسلویٰ کھاؤ اور پھوٹنے والا پانی پیو۔

وَلَا تَعْثَوْا یعنی فساد برپا نہ کرو۔ العیث، سخت فساد کو کہتے ہیں اس سے انہیں منع فرمایا۔ کہا جاتا ہے: عثِي يعثى عُثِيّاً وعثا يعثو عثوّاً۔ عاث يعيث عيثاً وعيوثاً، معاثاً۔ پہلی لغت قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: عثّ يعثّ (مضاعف) اس کا معنی بھی فساد برپا کرنا ہے۔ اس سے العثّة ہے، اون چاٹنے والا کیڑا۔

مُفْسِدِيْنَ یہ حال ہے، لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکیداً معنی کو مکرر ذکر کیا ہے ان کلمات میں نعمتوں کی اباحت، ان کی تعداد، معاصی کی طرف پیش قدمی اور ان سے نہی کا ذکر ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3807

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ؀

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ علیہ السلام! ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر۔ سو آپ دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ نکالے ہمارے لئے وہ جن کو زمین اگاتی ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے۔ (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا۔ اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ یہ انہوں نے تیہ کے صحراء میں کیا تھا جب وہ من و سلویٰ کھا کھا کر اکتا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی شہری زندگی کو یاد کیا (1)۔ حسن نے کہا: وہ سبزیوں، پیازوں اور دالوں کے کھانے کے عادی تھے۔ پس وہ اپنی عادت کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی طبیعتیں، ان کی سابقہ عادت کا اشتیاق کرنے لگیں۔ انہوں نے کہا: ہم ایک جیسے کھانے پر صبر نہیں کریں گے۔ انہوں نے من و سلویٰ کو ایک کھانا کہا حالانکہ یہ دو کھانے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک کھانے کو دوسرے کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ایک کھانا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر دن چونکہ بار بار یہی کھانا ملتا تھا اسی وجہ سے انہوں نے اسے ایک کھانا کہا جیسے تو اس شخص کے بارے میں کہتا ہے جو روزہ، نماز اور قراءت پر مداومت اختیار کرتا ہے، وہ ایک امر پر ہے کیونکہ وہ ان تمام کاموں پر ملازمت اختیار کیے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَنْ نَّصْبِرَ کا معنی یہ ہے کہ ہم تمام اغنیاء ہیں ہم میں سے کوئی دوسرے پر مدد حاصل کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ ہر شخص دوسرے سے مستغنی تھا (2)۔ وہ اسی طرح تھے یہ پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے غلام اور خدام بنائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى طَعَامٍ طعام کا اطلاق ہر کھانے اور پینے والی چیز پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ (البقرہ: 249) (اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے) اور ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا (المائدہ: 93) (نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے۔) یعنی جو انہوں نے شراب پی اس کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ اگر سلویٰ سے مراد شہد ہے جیسا کہ المورج نے حکایت کیا ہے تو وہ بھی مشروب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

بعض اوقات طعام کے ساتھ گندم اور کھجور کو خاص کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں ہے۔ فرمایا: ہم رسول الله کے عہد میں صدقہ فطر ایک صاع طعام یا ایک صاع جو نکالتے تھے (1)۔ عرف اسی سے جاری ہے کہ جب کوئی کہتا ہے: ذهبت الى سوق الطعام تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جگہ جہاں کھانے یا پینے کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ الطعم (طاء کے فتحہ کے ساتھ) جو ذائقہ دے۔ کہا جاتا ہے: طعمه مر اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔ الطعم جس کی بدخواہی کی جائے۔ کہا جاتا ہے: ليس له طعم اس کا کوئی ذوق نہیں ہے۔ و ما فلانٌ بذی طعامٍ، جب کوئی بیکار شخص ہو۔ الطعم (طاء کے ضمہ کے ساتھ) کھانا۔ ابوخراش نے کہا:

اردّ شجاع البطن لو تعلمينهٔ و أوثر غيری من عيالك بالطعم

واغتبق الماء القراح فانتهی اذا الزاد امسی للمزلّج ذاطعم

شاعر نے پہلے طعم سے کھانا مراد لیا اور دوسرے طعم سے وہ چیز مراد لی جس کا شوق کیا جاتا ہے۔ طَعِمَ يطعَمُ فهو طا م، جب کوئی کھائے اور چکھے۔ اسی سے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ (البقرہ: 249) (یعنی جس نے نہ چکھا) فرمایا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (احزاب: 53) (یعنی جب تم کھا چکو)۔

رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کے بارے میں فرمایا: انها طعام طعم و شفاء سقم یہ کھانے کا کھانا ہے اور بیمار کے لئے شفاء ہے۔ استطعمنی فلان الحديث یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: استطعمنی فلان الحديث۔ یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: اذا استطعمكم الامام فاطعموه۔ جب امام تم پر اپنے خزانے کھول دے تو تم بھی اس پر کھول دو۔ فلان ما يطعم النوم الا قائماً، وہ شخص کھڑے کھڑے سولیتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نعاما بوجرة صفر الخدو د ما تطعم النوم الا صياماً

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ بنی عامر کی لغت فادعِ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے کیونکہ دو ساکنوں کا التقاء ہو گیا ہے۔ وہ معتل کو صحیح کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ وہ محذوف کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور يُخْرِجْ کو جزم سَلْه اور قُلْ له کے معنی کی وجہ سے ہے۔ اخرج، يخرج۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لام کے حذف کی تقدیر کے ساتھ دعا کے معنی میں ہے۔ زجاج نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ مِمَّا میں مِنْ اخفش کے قول کے مطابق زائدہ ہے اور سیبویہ کے قول کے مطابق غیر زائدہ ہے کیونکہ کلام موجب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش نے یہ اس لئے کیا کیونکہ اس نے خرج کا مفعول نہیں پایا۔ اس نے ما کو مفعول بنانے کا ارادہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ مفعول محذوف ہو اس پر تمام کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: يخرج لنا مما تنبت الارض ما كولاً۔ اس صورت میں پہلا من بعضیہ ہے اور دوسرا تخصیص کے لئے ہے۔ و من بقلها حرف جر کے اعادہ کے ساتھ یہ ما سے بدل ہے۔ وَ قِثَّآىِٕهَا، یہ معطوف ہے اسی طرح بعد والی کلام بھی معطوف ہے، البقل۔ ہر وہ سبزی جس کا تنا نہ ہو الشجر جس کا تنا ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب صدقة الفطر صاع من طعام، حدیث نمبر 1412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

القثاء یہ معروف ہے۔ کبھی اس میں قاف کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے (1)۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کسرہ زیادہ ہے۔ بعض نے جمع میں قثائی کہا جیسے علباء کی جمع علابی مگر قثاء واوی ہے تو کہتا ہے: اقثأت القوم یعنی میں نے لوگوں کو کھیرے کھلائے و قثأت القدر جب ہانڈی کے پانی کا ابلنا ختم ہو جائے۔ جعدی نے کہا:

تفور علینا قدرهم فندیمها و نفثؤها عنا اذا حمیها غلا

فثأت الرجل جب کسی کو کلام یا کسی اور ذریعے سے توڑ دے اور تو اس کے غصہ کو ٹھنڈا کر دے۔ عدا حتی افثأ، یعنی وہ دوڑا حتیٰ کہ وہ تھک گیا، اور اس نے پوری کوشش کی۔ افثأ الحر، گری ڈھیلی پڑ گئی۔ عرب تھوڑی سی نیکی میں مثال دیتے ہیں: ان الرثیئة تفثأ الغضب۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں سے ناراض ہوا اور غصہ کے ساتھ ساتھ وہ بھوکا بھی تھا۔ پس انہوں نے اسے دہی یا لسی پلائی تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ الرثیئة، کھٹی چیز پر دوہا گیا دودھ تا کہ وہ دہی بن جائے، رثأت اللبن رَثأ جب دودھ کو کھٹی چیز پر دوہا جائے تا کہ دہی بن جائے۔ اسم الرثینة سے ارتثأ اللبن۔ اس کا معنی ہے: دودھ دہی بن گیا۔

ابن ماجہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری والدہ موٹاپے کے لئے میرا علاج کرتی تھی۔ آپ چاہتی تھیں کہ آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجیں۔ یہ ان کے لئے ممکن نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے کھجور کے ساتھ کھیرے کھائے تو میں اچھی طرح موٹی ہو گئی (2)۔ یہ سند صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فُوْمِهَا۔ فوم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تھوم ہے کیونکہ پیاز کے مشابہ ہے یہ جویبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ الثاء، فاء سے بدل جاتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: مغافیر اور مغاثیر۔ جَدَثٌ و جدفٌ (قبر) حضرت ابن مسعود نے ثاء کے ساتھ ثوم ہی پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امیہ بن صلت نے کہا:

کانت منازلهم اذ ذاك ظاهرةً فیها الفرادیسُ والفومان والبصل

ان کے گھر ظاہر تھے ان میں انگور کی بیلیں، تھوم اور پیاز تھے۔

حضرت حسان نے کہا:

وانتم اناسٌ لئام الاصول طعامكم الفوم و الحوقل

تم لوگ اصل کے اعتبار سے لئیم (کمینے) ہو تمہارا کھانا تھوم اور سبزیاں ہیں۔

یعنی تھوم اور پیاز ہے۔ یہ کسائی اور نضر بن شمیل کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد گندم ہے۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین سے یہی مروی ہے (3)۔ نحاس نے اس کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ معنی بہتر ہے، جس نے یہ معنی کیا ہے وہ اعلیٰ ہے اور اس کی اسانید صحیح ہیں اور جویبر کی روایت کے لئے کوئی مثال نہیں ہے اگرچہ کسائی اور فراء

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابن ماجہ، باب القثاء والرطب یجمعان، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

نے بھی پہلے قول کو پسند فرمایا ہے کیونکہ عرب فا کو ثا سے بدل دیتے ہیں اور ابدال پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ اور یہ عربوں کے کلام میں زیادہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے احیحہ بن جلاح کا شعر پڑھا اس شخص کے لئے جس نے آپ سے فوم کا مطلب پوچھا جبکہ وہ گندم ہے:

قد كنت اغنى الناس شخصا واجداً　　ورد المدينة عن زراعة فوم

ابن درید نے کہا: الفومة سے مراد خوشہ ہے۔ اس نے یہ شعر پڑھا:

وقال ربئيهم لما اتانا　　بكفه فومةٌ او فومتان

ان کے چوکیدار نے کہا:: جب وہ ہمارے پاس آیا اس کی ہتھیلی میں ایک خوشہ تھا یا دو تھے۔

اور بکفه میں ہا غیر مشبعہ حرکت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد دال ہے۔ یہ شامی لغت ہے اس کے پیچھے والے کو فامی مغیرّ عن فومی۔ کیونکہ وہ نسب میں تبدیلی کرتے تھے جیسا کہ سہلی اور دہری نے کہا۔ کہا جاتا ہے: فوّموا لنا، ہمارے لئے روٹی پکاؤ۔ فراء نے کہا: یہ قدیم لغت ہے۔ عطا اور قتادہ نے کہا: الفوم ہر اس دانے کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکائی جائے۔

مسئلہ: علماء کا پیاز، تھوم اور بدبودار دوسری سبزیاں کھانے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء ان کی اباحت کے قائل ہیں کیونکہ ان کے بارے میں احادیث ثابت ہیں اور اہل ظواہر کا ایک گروہ جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض خیال کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں کے کھانے سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو فرض کی طرف آنے اور فرض کے قیام سے رد کے اس کا کرنا حرام ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہونا حرام ہے۔ انہوں نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خبیث کہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان فرمایا کہ یُحَرِّمُ الخبائث کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جمہور کی حجت وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھال لایا گیا جس میں سبزیاں تھیں۔ آپ نے ان سے بو محسوس کی۔ حضرت جابر نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سبزیوں کے متعلق بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو ان کے (صحابہ جو آپ کے پاس موجود تھے) قریب کردو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ صحابہ بھی اس کا کھانا ناپسند کر رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ کیونکہ میں ان سے باتیں کرتا ہوں جن سے تم باتیں نہیں کرتے (1)۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ یہ آپ کے لئے نہ کھانا خاص تھا اور دوسروں کے لئے مباح تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا جس میں تھوم بھی تھا۔ جب کھانا واپس حضرت ابوایوب کے گھر بھیجا گیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے لگنے کی جگہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کھانا کھایا ہی نہیں۔ حضرت ابوایوب پریشان ہوئے اور آپ کے پاس اوپر چڑھ گئے۔ پوچھا: حضور! کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت ابوایوب نے کہا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل الثوم، حدیث نمبر 3326، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں یا فرمایا: جسے آپ نے ناپسند کیا۔ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی آتی تھی یہ حرام نہ ہونے پر نص ہے۔ اسی طرح حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے جب صحابہ نے خیبر کے حملہ اور اس کی فتح کے زمانہ میں تھوم کھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا میں اسے حرام نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک درخت (تھوم) ہے جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ یہ تمام احادیث یہ شعور دیتی ہیں کہ یہ حکم آپ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ فرشتوں کے ساتھ ہم کلام ہونے میں آپ خاص تھے لیکن حدیث میں اس حکم کو اس طرح پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے لوگ اس میں برابر ہیں۔ جہاں فرمایا: جس نے اس سبزی تھوم سے کھایا...... کبھی فرمایا: میں نے پیاز اور تھوم اور کراث (بدبودار سبزی ہے) سے کھایا ...... وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ ملائکہ کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے جس سے بنی آدم کو تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک طویل حدیث میں فرمایا: اے لوگو! تم ان درختوں سے کھاتے ہو میں انہیں خبیث دیکھتا ہوں۔ یہ پیاز اور تھوم ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا جب آپ مسجد میں کسی شخص سے ان دو چیزوں (پیاز، تھوم) کی بدبو محسوس کرتے تو اسے نکالنے کا حکم دیتے تو وہ بقیع کی طرف نکال دیا جاتا۔ تو جو ان دو (پیاز اور تھوم) میں سے کھائے اسے اچھی طرح پکا کر کھائے۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا، العدس معروف ہے۔ العدسة وہ پھوڑا جو ان کو نکلتا ہے اور بعض اوقات اسے قتل کر دیتا ہے۔ عَدَسْ خچر کو جھڑکنے کے لئے بولتے ہیں۔

عَدَسْ مالعبادِ علیكِ امارة　　نجوتِ و هذا تحملین طلیق

العدس۔ سختی سے روندنے کو کہتے ہیں اور کوشش کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: عدسه، عدس فی الارض۔ یعنی زمین میں چلا گیا۔ وعدست الیه المنیة، موت اس کی طرف چلی۔

کمیت نے کہا:

اکلفها هول الظلامِ و لم ازل　　اخا اللیل معدوساً الی وعادسا

یعنی میری طرف رات کے وقت اسے چلایا جاتا ہے۔

عدس ایک لغت میں حدس بھی ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: دال کھاؤ کیونکہ یہ برکت والی اور مقدس ہے، یہ دل کو نرم کرتی ہے اور آنسوؤں کو زیادہ کرتی ہے، اس میں ستر انبیاء کی برکت ڈالی گئی ہے۔ ان میں آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (1)۔ یہ ثعلبی وغیرہ نے ذکر ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز ایک دن زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھاتے تھے، ایک دن گوشت کے ساتھ اور ایک دن دال کے ساتھ۔ حلیمی نے کہا: دال اور زیتون کا تیل نیک لوگوں کا کھانا ہے، اگر دال کی فضیلت نہ ہوتی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت اپنے شہر میں اس سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس میں کفایت تھی۔ اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ جسم کو ہلکا کرتی ہے اور بدن عبادت کے

1۔ اس روایت کو ابن جوزی نے الموضوعات جلد 2، صفحہ 197 میں ذکر کیا ہے۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 103

لئے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے شہوات نہیں ابھرتیں جس طرح گوشت سے ابھرتی ہیں اور حنطة، دانوں میں سے دانہ ہے اور صحیح قول کے مطابق یہی فوم (گندم) ہے اور جو اس کے قریب ہے۔ اہل مدینہ کا کھانا گندم تھی جس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شہر کا کھانا دال تھی۔ پس ان دونوں دانوں میں سے ہر ایک دانہ کے لئے کسی ایک نبی کی وجہ سے فضیلت ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی سیراب نہیں ہوئے درآں حالیکہ آپ ﷺ اور آپ کے گھر والے تین دن متواتر گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ یہ معمول رہا مدینہ طیبہ سے لے کر وصال تک (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ- الاستبدال کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنا۔ اسی سے بدل ہے پہلے اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ادنی زجاج کے نزدیک الدنو سے مشتق ہے یعنی قیمت میں قرب۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے: ثوبٌ مقارب۔ کم قیمت کپڑا۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ مہموز ہے الدنئ البیّن الدناءۃ سے مشتق ہے یعنی خسیس ترین مگر اس کے ہمزہ میں تخفیف کی گئی۔ بعض نے فرمایا: الدون سے مشتق ہے۔ گرا وا۔ اس کی اصل ادون، اَفْعَلُ ہے پھر اس میں قلب ھو افلع ہوا پھر واو کو طرف کلمہ میں ہونے کی وجہ سے الف سے بدلا گیا اور شاذ صورتوں میں ادنئ بھی پڑھا گیا ہے (2)۔ آیت کا معنی یہ ہے کیا تم سبزیوں، ککڑیوں، تھوم، دال اور پیاز جو ادنیٰ (گھٹیا) ہیں انہیں بدلنا چاہتے ہو من وسلویٰ جگہ جو من وسلویٰ ان سے بہتر ہیں۔

ان وجوہ میں اختلاف ہے جو دوسری چیزوں پر من وسلویٰ کی فضیلت کا موجب ہیں۔

۱- سبزیوں کی من وسلویٰ کی نسبت کوئی اہمیت نہ تھی وہ دونوں کھانے افضل تھے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

۲- جب من وسلویٰ کا کھانا اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام تھا اور اس نے وہ انہیں کھانے کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے امر کی ہمیشہ پیروی کرنا اور اس کی نعمت کا شکر کرنا آخرت میں اجر اور ذخر کا موجب تھا اور جو انہوں نے طلب کیا وہ ان خصائل میں عاریۃ تھا۔ پس اس وجہ سے وہ کھانا ادنیٰ تھا۔

۳- اللہ تعالیٰ نے جو ان پر احسان فرمایا وہ زیادہ پاکیزہ اور لذیذ تھا بنسبت اس کے جو انہوں نے مطالبہ کیا۔ پس اس وجہ سے لامحالہ جو انہوں نے سوال کیا وہ ادنیٰ تھا۔

۴- اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا فرمایا تھا اس میں کوئی کلفت وتھکاوٹ نہ تھی اور جو انہوں نے طلب کیا وہ کھیتی باڑی اور تھکن سے ملتا تھا۔ پس یہ ادنیٰ ہوا۔

۵- جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا تھا اس کے حلال ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول کی وجہ سے اس کے خالص ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اور باقی تمام دانے اور زمین جن کو بیوع اور غصب لاحق ہوتا اور ان میں شبہ داخل ہوتا ہے اس وجہ سے یہ ادنیٰ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمة، باب ما کان النبی و اصحابه یاکلون، حدیث نمبر 4996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ: اس آیت میں طیبات اور متلذذ کھانے کے جواز پر دلیل ہے۔ نبی کریم ﷺ حلوئی اور شہد پسند فرماتے تھے (1) اور ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ مائدہ اور سورۃ النحل میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا، ھبوط کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہ امر کا صیغہ انہیں عاجز کرنے کے لئے ہے جیسے یہ ہے قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ (الاسراء) کیونکہ وہ تیہ میں تھے اور یہ ان کیلئے سزا تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے جو طلب کیا وہ انہیں دیا گیا (2) مِصْرًا تنوین کے ساتھ نکرہ یہ جمہور کی قراءت ہے اور یہی قرآن کا خط ہے (3)۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے غیر معین شہر مراد لیا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: شہروں میں سے ایک شہر۔ ایک طائفہ جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے معین فرعون کا شہر مراد لیا۔ پہلے قول والے علماء نے ظاہر قرآن کے مقتضیٰ سے استدلال کیا ہے کہ انہیں شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ تیہ کے بعد شام میں ٹھہرے تھے۔ اور دوسرے قول کے قائلین نے جو قرآن میں وارد ہے اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آل فرعون کے شہروں اور آثار کا وارث بنایا تھا اور ان علماء نے اس کے منصرف ہونے کو جائز قرار دیا۔ اخفش اور کسائی نے کہا: اس کی خفت اور ھند اور دعد سے مشابہت کی وجہ سے اس کا منصرف ہونا جائز ہے۔ شعر ہے:

لم تتلفع بفضل مئزرھا　　دعدٌ ولم تسق دعدُ فی العُلَب

دعد نے اپنی اضافی چادر کے ساتھ اپنے آپ کو نہ لپیٹا اور چمڑے کے پیالے میں اسے دودھ نہ پلایا گیا۔

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتیں (منصرف اور غیر منصرف) جمع کی ہیں۔ سیبویہ، خلیل اور فراء اس کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اگر تو کسی عورت کا نام زید رکھ دے تو وہ منصرف نہیں ہو جائے گا۔ اخفش کے علاوہ علماء نے کہا: اس سے مراد مکان ہے اس لئے منصرف ہے۔ حسن، ابان بن تغلب اور طلحہ نے اسے مِصْرَ غیر منصرف پڑھا ہے اسی طرح حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں اور حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے (4)۔ انہوں نے کہا: یہ فرعون کا مصر ہے۔ اشہب نے کہا: مجھے امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک مصر تمہارا شہر ہے جو فرعون کا مسکن تھا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (5)۔ مصر کا لغوی معنی الحد ہے۔ مصر الدار (گھر کی حدود) ابن فارس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ اہل حجر اپنی شروط میں لکھتے تھے: اشتری فلان الدار بمصورھا۔ یعنی فلاں نے گھر حدود سمیت خریدا...... عدی نے کہا:

وجاعل الشمس مصراً لا خفاء بہ　　بین النھار و بین اللیل قد فصلا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، مَّا، اِنَّ کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے سألتم

1۔ صحیح بخاری، باب الحلواء والعسل، حدیث 5011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا　5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

(سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے)۔ کہا جاتا ہے: سألت وسلت بغیر ہمزہ کے، یہ واوی الفاظ میں سے ہے اس کی دلیل عربوں کا قول یتساولان ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ یعنی وہ ذلت و مسکنت سے ملائے گئے ان پر ان دونوں کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ضرب القباب سے مشتق ہے(1)۔ فرزدق نے جریر کے متعلق کہا تھا:

ضربت علیك العنكبوت بنسجها　و قضى علیك به الكتاب المنزل

تجھ پر مکڑی نے اپنا جالا لگا دیا ہے اور اس کا تجھ پر فیصلہ نازل شدہ کتاب نے کیا ہے۔

ضرب الحاكم على اليد۔ یعنی اس سے اٹھایا اور لازم کیا، الذلة، رسوائی، المسكنة غربت۔ کوئی یہودی فقر اور خضوع اور ذلت سے خالی نہیں ہوگا اگرچہ وہ غنی بھی ہو۔ المسكنه، سکون سے مشتق ہے یعنی فقر نے اس کی حرکت کو کم کر دیا۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا: الذله کا معنی رسوائی ہے: المسكنة، المسكين کا مصدر ہے۔ ضحاک بن مزاحم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ فرمایا: ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَآءُوْ یعنی وہ لوٹے اور پلٹے۔ یہ ان کو لازم ہو گیا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے ابوءُ بنعمتك علیّ(2)۔ یعنی میں تیری نعمت کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں اور اپنے نفس پر اسے لازم کرتا ہوں۔ لغت میں اس کا معنی رجوع ہے۔ کہا جاتا ہے: باء بكذا، یعنی اس کے ساتھ لوٹا۔ وباء الى المباءة، منزل کی طرف لوٹا۔ البواء قصاص کے ساتھ لوٹنا۔ هم في هذا الامر بواء، یعنی وہ اس امر میں برابر ہیں۔ وہ اس امر میں ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

الا تنتهي عنا ملوك و تتقي　محارمنا لايبوءُ الدم بالدم

یعنی کیا بادشاہ ہم سے رکتے نہیں ہیں اور ہماری محارم سے بچتے نہیں ہیں خود خون خون کو قصاص میں لوٹا تا نہیں

فابوا بالنهاب و بالسبايا　و ابنا بالملوك مصفدينا

یعنی وہ لوٹے اور ہم بھی لوٹے۔

الغضب کا معنی پہلے سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ علت بیان ہو رہی ہے بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی وہ جھٹلاتے ہیں بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات اور انبیاء کے معجزات جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ، يَكْفُرُوْنَ پر معطوف ہے۔ حسن سے مروی ہے، يقتلون پڑھنا بھی مروی ہے اور ان سے دوسرے قراء کی طرح پڑھنا بھی مروی ہے۔ نافع نے النبیئین ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ قرآن میں واقع ہوا ہے مگر سورۃ الاحزاب میں اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ (الاحزاب: 50) میں اور لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ (الاحزاب: 53)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب افضل الاستغفار، حدیث نمبر 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں بغیر مد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ان دونوں جگہوں پر ہمزہ کو ترک کیا کیونکہ دو مکسور ہمزے جمع ہو رہے تھے اور باقی قراء نے پورے قرآن میں ہمزہ کو ترک کیا ہے (1)۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ اس کا اسم فاعل مُنبیٔ ہے (2) نبی کی جمع انبیاء ہے اور نبی کی جمع نُبَاءُ بھی آئی ہے۔ عباس بن مرداس السلمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا۔

یا خاتم النبآء انك مرسلٌ　　بالحق کل ھدی السبیل ھداکا

اے خاتم النبیین! تم حق کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہو اور ہر ہدایت کا راستہ آپ کی ہدایت سے ہے۔

یہ ہمزہ کی قراءت کا معنی ہے۔ ہمزہ کے ترک کرنے والوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: ہمزہ سے اشتقاق کیا پھر ہمزہ میں تسہیل کی۔ بعض نے فرمایا: یہ نبا ینبو (ظاہر ہونا) سے مشتق ہے۔ پس النبی، نبوۃ سے جس کا معنی بلند ہونا ہے، پس نبی کا مرتبہ بلند ہے بغیر ہمزہ کے نبی سے مراد راستہ بھی ہوتا ہے رسول کو نبی کہا جاتا ہے کہ مخلوق اس سے ہدایت حاصل کرتی ہے جیسے راستہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ شاعر نے کہا:

لاصبح رَتْماً دقاق الحصی　　مکان النبی من الکاثب

رتمت الشیء میں نے اسے توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے: رتم انفهٗ و رثمه، یعنی تا اور ثا دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ الرتم کا مطلب المرتوم یعنی ٹوٹا ہوا بھی ہے، الکاثب پہاڑ کا نام ہے۔ انبیاء ہمارے زمین میں راستوں کی مانند ہیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: السلام علیك یا نبیٔ الله ہمزہ ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لست بنبیٔ الله۔ لیکن میں نبی اللہ (بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ ابو علی نے کہا: اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور اس کے ضعف کو جو چیز مزید قوت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مدح کرنے والے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح مدح کی یا خاتم النُبَاء ...... الخ۔ اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار مروی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِغَيْرِ الْحَقِّ**، برائی اور جو انہوں نے جرم کیا تھا اس کی بڑائی بیان کرنا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل ہے کہ حق کے ساتھ ان کو قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ معصوم ہوتے ہیں اس سے کہ ان سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر ہو جس کی وجہ سے انہیں قتل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے حقیقت ایسی نہیں ہے۔ یہ کلام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ انبیاء کا قتل ظلم ہے اور حق نہیں ہے۔ ان پر مذمت کی زیادتی کے لئے یہ فرمایا ہے یہ معلوم شدہ ہے کہ کسی نبی کو حق کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا لیکن حق کے خلاف قتل کیا جائے گا۔ **بِغَيْرِ الْحَقِّ** سے ان کے گناہ کی برائی اور اس کے واضح ہونے کی تصریح فرمائی۔ نبی سے کبھی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی کہ اس کے قتل کا موجب بنے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کافروں کو انبیاء کے قتل کی کیسے قدرت دی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انبیاء کی کرامت اور ان کے مقامات میں زیادتی کے لئے تھا جیسے مومنین میں سے جو اللہ کے راستہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

میں شہید کیا جاتا ہے (تو اسے مرتبہ ملتا ہے) یہ انبیاء کے لئے خذلان ورسوائی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: انبیاء میں سے کبھی کوئی نبی شہید نہیں ہوا مگر وہ جسے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور جس نبی کو قتال کا حکم دیا گیا تھا اس کی مدد کی گئی (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، ذٰلِكَ پہلے ذالك کی طرف لوٹ رہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تاکید ہے۔ بِمَا میں باسبب کے لئے ہے (2)۔ اخفش نے کہا ما مصدریہ ہے یعنی بعصیانهم، العصیان، طاعت کا متضاد ہے۔ اعتصت النواۃ (گٹھلی سخت ہوگئی) الاعتداء کا معنی ہر چیز میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ ظلم اور معاصی میں معروف ہے۔ (3)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔

سفیان نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ گویا یوں فرمایا کہ جو ظاہراً ایمان لائے تھے اسی وجہ سے ان کا ذکر یہود، نصاریٰ اور صابیوں کے ساتھ کیا، پھر ان تمام کا حکم بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے تھے۔ (4)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اس کا معنی ہے: وہ یہودی ہو گئے وہ یہودا کی طرف منسوب ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کا بڑا بیٹا تھا۔ پھر عربوں نے ذال کو دال سے بدل دیا، جب عجمی زبان، عربی بنائی جاتی ہے تو اس کے لفظ بدل جاتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھا گیا۔ ھاد کا معنی ہے: تاب۔ (اس نے توبہ کی) الھائد، التائب توبہ کرنے والا۔ شاعر نے کہا:

انی امرؤ من حبہ ھائد (5)

میں اس کی محبت سے توبہ کرنے والا ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے: انا ھُدْنا الیك۔ یعنی ہم نے توبہ کی۔ ھاد القوم یھودون ھوداً ھیادۃً اس کا معنی ہے: قوم نے توبہ کی (6)۔ ابن عرفہ نے کہا: ھُدْنا الیك کا مطلب ہے ہم نے تیرے امر کی طرف سکون حاصل کیا۔ الھوادۃ کا معنی السکون

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً　6۔ ایضاً

والموادعة ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا۔ ابوالسمال نے هادَوا (دال کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: وَالنَّصٰرٰی یہ جمع ہے اس کا واحد نَصرانی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا واحد نصران (یاء کے اسقاط کے ساتھ) ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مؤنث نصرانةٌ ہے جیسے ندمان کی مؤنث ندمانة ہے۔ یہ نکرہ ہے الف، لام کے ساتھ معرفہ بنایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

صدّت کما صد عما لا یحل له　　　ساق نصاری قبیل انفصح صوّام

وہ روکی گئی ہے جیسے روزہ دار نصرانیوں کا ساقی عید الفطر سے پہلے اس چیز سے روکا جاتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتی۔ یہاں نکرہ کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا ہے۔ خلیل نے کہا: النصاریٰ کا واحد نصری ہے جیسے مهری اور مهاریٰ ہے۔ سیبویہ نے اس پر استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے:

تراه اذا دار العشا متحَنِّفا　　　و یضحی لدیه و هو نصران شامس (1)

اور ایک اور شعر لکھا ہے:

فکلتا هما خرت و اسجد راسها　　　کما اَسْجَدَتْ نصرانة لم تحنف

دونوں اونٹنیاں گر پڑیں اور انہوں نے اس طرح سر جھکا دیئے جیسے نصرانی عورت سر جھکاتی ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ کہا جاتا ہے: اسجد، یعنی جھک گیا۔ لیکن نصران اور نصرانة یائے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کیونکہ عرب کہتے ہیں: رجلٌ نصرانی و امراۃ نصرانية ..... نصره اس نے سے نصرانی بنا دیا۔ حدیث میں ہے: ابواه یهودانه او ینصرانه (2)۔ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے متعلق اس امت سے کوئی نصرانی اور یہودی نہیں سنے گا پھر اس پر ایمان نہیں لائے گا جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں مگر وہ دوزخی ہوگا ☆۔

واحد کے استعمال کے بغیر جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ یہ النصرانیون ہوتا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس کو نصاریٰ اس شہر کی وجہ سے کہا جاتا ہے جس کا نام ناصرہ تھا اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اترے تھے، اس شہر کی طرف ان کی نسبت کی گئی۔ کہا جاتا ہے: عیسیٰ الناصری۔ جب ان کے شہریوں کو اس کی طرف منسوب کیا گیا تو کہا گیا: النَّصٰرٰی۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے (3)۔ جوہری نے کہا: نصران شام کا شہر ہے جس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں اور اسے ناصرہ کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النَّصٰرٰی نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ شاعر نے کہا:

لما رایت نبطاً انصاراً　　　شمرّت من رکبتی الازارا

کنت لهم من النصاریٰ جارا (4)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح بخاری، باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه وهل، حدیث 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　4۔ ایضا

جب میں نے ایک نبطی کو انصاری دیکھا تو میں نے اپنے گھٹنے سے ازار اوپر کر لی۔ میں نصاریٰ کا پڑوسی تھا۔
بعض علماء نے فرمایا: اس قول کی وجہ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے: مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران:52)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصّٰبِـِٕیْنَ یہ صابی کی جمع ہے۔ بعض نے فرمایا: صاب کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے ہمزہ میں اختلاف ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے نافع کے۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے صبأت النجوم سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے ستارے طلوع ہوئے۔ صبأت ثنية الغلام۔ بچے نے دانت نکالے۔ اور جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھا انہوں نے اسے صبا یصبو سے مشتق کیا ہے۔ جس کا معنی ہے مائل ہونا۔ لغت میں الصابی اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے اور نکل جائے۔ اسی وجہ سے جو شخص مسلمان ہو جائے عرب کہتے تھے: قد صبأ۔ پس الصائبون وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے دین سے نکل گئے۔ (1)

مسئلہ نمبر 5: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں اور ان کی کتاب کی وجہ سے ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے اور ان کا طعام کھانا حلال ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آئے گا اور ان پر جزیہ لگانا جائز ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں آئے گا اور الصّٰبِـِٕیْنَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: یہ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ ابن منذر اور ابن اسحاق نے کہا: صابئین کے ذبیحہ میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اہل کتاب کا ایک طائفہ ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ان کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح میں کوئی حرج نہیں۔ خلیل نے کہا: یہ قوم ایسی ہے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب ہوا کے چلنے کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ مجاہد، حسن اور ابن نجیح نے کہا: وہ ایسی قوم ہے جو اپنے دین کو یہود و مجوس کے دینوں کے درمیان سے مرکب کرتی ہے، ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ حسن اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور پانچ نمازیں پڑھتی ہے۔ زیاد بن ابی سفیان نے ان کو دیکھا تو ان سے ٹیکس ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے جانا کہ یہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں (2) اور جو کچھ ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے ان کے مذہب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موحد ہیں ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ستارے فعال ہیں۔ اسی وجہ سے ابو سعید اصطخری نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا جب ان سے ان کے متعلق سوال کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ اٰمَنَ۔ یعنی جس نے تصدیق کی۔ مَنْ اٰمَنَ میں مَنْ، الَّذِیْنَ سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اور فَلَهُمْ میں فا، من میں جو ابہام تھا اس کے سبب کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ مبتدا خبر ہیں پھر جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ من حالت رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا معنی شرط ہو اور امن شرط کی وجہ سے مجزوم ہو اور الفاء جواب ہو اور لهم اجرهم، من کی خبر ہو پھر جملہ ان کی خبر ہو۔ اور الذین کی طرف عائد

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

محذوف ہو تقدیر کلام اس طرح ہو من آمن منهم بالله۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ایمان بالرسل والکتب والبعث بھی داخل ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 7: اگر کوئی کہے کہ لهم اجرهم میں ضمیر جمع کیوں ذکر کی گئی ہے جبکہ اٰمَنَ لفظ مفرد ہے جمع نہیں ہے۔ اگر له اجره ہوتا تو کلام درست ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے مَنْ کا لفظ واحد، تثنیہ، جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس اس کی طرف، واحد، تثنیہ اور جمع کی ضمیر لوٹانا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس:42) یہ معنی کے اعتبار سے ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (انعام:25) لفظ کے اعتبار سے ہے۔ شاعر نے کہا:

ألما بسلمى عنكما ان عرضتما　　و قولا لها عوجي على مَنْ تخلّفوا (2)

فرزدق نے کہا:

تعال فان عاهدتني لا تخونني　　نكن مثل من يا ذئب يصطحبان

اس میں معنی کا اعتبار کرتے ہوئے تخلفوا کہا۔

پس یہاں معنی پر محمول کرتے ہوئے یصطحبان کہا ہے۔ اگر لفظ پر محمول ہوتا تو یصطحب اور تخلف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (النساء:13) اس میں لفظ کا اعتبار کیا گیا۔ پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ۔ معنی کا اعتبار کیا گیا۔ اگر لفظ کا اعتبار ہوتا تو خالداً فیها ہوتا۔ جب مَنْ کا مابعد لفظ پر محمول ہو تو اس کے مابعد میں معنی کے اعتبار سے مخالفت جائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور جب مَنْ کا مابعد معنی پر محمول ہو تو بعد میں لفظ کے اعتبار سے مخالفت جائز نہیں ہے کیونکہ التباس کلام میں داخل ہو جائے گا(3)۔ پہلا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (انعام) کے تحت کلام گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

مسئلہ نمبر 8: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا کا ارشاد وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:85) سے منسوخ ہے اور دوسرے علماء نے کہا: یہ منسوخ نہیں ہے یہ اس کے حق میں ثابت ہے جو مومنین میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے پر قائم ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تم پر طور کو۔ (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ (احکام) جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنے کے بعد۔ تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ یہ آیت واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ کے معنی کی تفسیر ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلایا اور ہم نے اسے اپنی جگہ سے نکالا (1)۔ فرمایا: ہر وہ چیز جسے تو اکھیڑے اور اسے پھینکے تو اس کے لئے نتقتہ کا لفظ استعمال کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: نتقناہ کا معنی ہے: رفعناہ۔ ابن اعرابی نے کہا: الناتق کا معنی الرافع ہے۔ الناتق الباسط، الناتق الفاتق، امرءۃ ناتق و منتاق ایسی عورت جس کی اولاد زیادہ ہو۔ قتبی نے کہا یہ نتق السقاء سے مشتق کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: مشکیزہ کو ہلانا حتیٰ کہ اس سے مکھن علیحدہ ہو جائے اور واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ کا مطلب ہے اصل سے اکھیڑا گیا۔ (2)

الطُّوْرَ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تھی اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تھی۔ یہ ابن جریج نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جو کچھ اگائے، نہ کہ وہ پہاڑ جو کچھ نہ اگائے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: یعنی یہ پہاڑ تھا۔ مگر مجاہد نے کہا: یہ سریانی زبان میں ہر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے (3)۔ کتاب کے مقدمہ میں کلام گزر چکی ہے کہ قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے مفرد الفاظ موجود ہیں یا نہیں۔ الحمد للہ۔ بکری نے کہا: طور بن اسماعیل علیہ السلام کی وجہ سے اسے طور کہا جاتا ہے۔

طور پہاڑ کے اٹھانے کے بارے میں علماء کے اقوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں لے کر آئے جن میں تورات تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو لے لو اور اس کو لازم پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی طرح کلام کرے جس طرح تجھ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کی۔ پس ان پر بجلی گرائی گئی پھر انہیں زندہ کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تو انہوں نے فلسطین کے پہاڑوں سے ایک پہاڑ اکھیڑا جس کی لمبائی چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ بنی اسرائیل کا لشکر اتنا ہی تھا۔ پس اسے ان پر چھتری کی مثل کر دیا گیا اور ان کے پیچھے سے سمندر اور آگے سے آگ کو لایا گیا، انہیں کہا گیا: اب اس کتاب کو پکڑو اور تم پر عہد لازم ہے کہ تم اسے ضائع نہیں کرو گے ورنہ تم پر پہاڑ آ پڑے گا۔ تو بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہوئے سجدوں میں گر گئے اور تورات کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

طبری نے بعض علماء سے روایت کیا ہے (4)۔ اگر وہ پہلی دفعہ تورات کو لے لیتے تو ان پر میثاق نہیں تھا اور بنی اسرائیل کا سجدہ پیشانی کی ایک طرف پر تھا کیونکہ وہ خوف کی وجہ سے پہاڑ کو دوسری طرف سے دیکھ رہے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا: کوئی سجدہ اس سجدہ سے افضل نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پس انہوں نے ایک طرف پر سجدہ کا حکم دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ قول جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کے وقت ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرما دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبوراً ایمان لائے تھے اور ان کے دل مطمئن نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذُوْا یعنی ہم نے حکم دیا کہ اس کو پکڑ لو۔ مَآ اٰتَیْنٰكُمْ محذوف ہے بِقُوَّةٍ یعنی کوشش اور محنت سے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: نیت اور اخلاص کے ساتھ۔ مجاہد نے کہا: قوۃ سے مراد ہے اس میں جو احکامات ہیں ان پر عمل کرنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: بِقُوَّةٍ یعنی کثرت سے پڑھنے کے ساتھ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ یعنی غور وفکر کرو، اس کے اوامر اور وعید کی حفاظت کرو اور یاد کرو اور اس کو بھولو نہیں اور اس کو ضائع نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: کتب سے یہ مقصود ہے ان کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنا، نہ صرف زبان سے تلاوت کرنا اور ترتیل سے پڑھنا، کیونکہ صرف زبان سے پڑھنا اور عمل نہ کرنا تو نبذٌ (پھینکنا) کے زمرہ میں آتا ہے جیسا کہ شعبی اور ابن عیینہ نے کہا ہے۔ ان دونوں حضرات کا قول نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (البقرہ: 101) کے تحت آئے گا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سے فاسق شخص وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں سے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا (یعنی احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ مقصود عمل کرنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، امام مالک نے فرمایا: بعض اوقات وہ شخص قرآن پڑھتا ہے جس میں خیر نہیں ہوتی (یعنی صرف پڑھتا ہے عمل نہیں کرتا)۔ پس جو ہم سے پہلے لوگوں پر لازم تھا اور ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ ہم پر بھی لازم اور واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: 55) اس میں اپنی کتاب کی اتباع اور اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے بھی عمل اسی طرح ترک کر دیا ہے جس طرح یہود ونصاری نے ترک کر دیا تھا۔ صرف کتابوں اور مصاحف کی ذوات باقی ہیں جو کچھ مفید نہیں کیونکہ جہالت، ریاست کی طلب اور خواہش نفس کی اتباع کا غلبہ ہے۔ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے، انہوں نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پھر کہا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم اٹھا لیا جائے گا حتیٰ کہ وہ علم میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔ زیاد بن لبید انصاری نے عرض کی: ہم سے علم کیسے اٹھا لیا جائے گا جبکہ ہم نے قرآن پڑھا۔ اللہ کی قسم! ہم قرآن پڑھتے رہیں گے اور ہم اپنی عورتوں اور بیٹوں کو پڑھائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے زیاد! تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے فقہائے مدینہ سے شمار کرتا تھا۔ یہ تورات، انجیل یہود ونصاریٰ کے پاس موجود ہیں ان کو یہ کچھ فائدہ دیتی ہیں (1)۔ یہ حدیث تفصیل سے آگے آئے گی۔ نسائی نے جبیر بن نفیر عن عوف بن مالک الاشجعی کے سلسلہ صحیحہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیاد کو فرمایا: اے زیاد! تیری ماں تجھ پر روئے۔ یہ تورات، انجیل یہود ونصاریٰ کے پاس موجود ہیں۔ موطا میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کو فرمایا: تو ایک ایسے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

زمانہ میں ہے جس میں فقہاء کثیر ہیں، قراء قلیل ہیں اس میں قرآن کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اور حروف کی ادائیگی کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا، سوال کرنے والے تھوڑے ہیں، عطا کرنے والے بہت ہیں، لوگ نماز لمبی پڑھتے ہیں، خطبہ چھوٹا دیتے ہیں، اپنی خواہشات سے پہلے اعمال خیر کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں فقہاء کم ہوں گے، قراء زیادہ ہوں گے، اس میں حروف کی حفاظت کی جائے گی اور اس کی حدود کو ضائع کیا جائے گا، سوال کرنے والے زیادہ ہوں گے اور عطا کرنے والے کم ہوں گے، خطبے لمبے دیں گے اور نمازیں مختصر کریں گے، اپنے اعمال سے پہلے خواہش نفس پر عمل کریں گے(1)۔ یہ نصوص ہماری اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے۔ یحییٰ نے کہا: ابن نافع سے میں نے یبدءون اھوائھم قبل اعمالھم کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا لوگ اپنی خواہش نفس پر عمل کریں گے اور اس عمل کو ترک کریں گے جو ان پر فرض ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ پر پہلے کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ، تولی باب تفعل ہے اس کا اصل معنی جسم میں سے کسی چیز سے اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا ہے، پھر یہ وسعت و مجاز کی وجہ سے اوامر، ادیان اور معتقدات میں سے اعراض میں استعمال ہوتا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی دلیل کے بعد۔ وہ میثاق کا لینا اور پہاڑ کو بلند کرنا ہے۔

فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، فضل سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جس کا اظہار جائز نہیں کیونکہ اس کے اظہار سے مستغنی ہوتے ہیں مگر یہ کہ جب وہ اس کے اظہار کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ لاتے ہیں جب وہ اَنْ کے ساتھ لاتے ہیں تو خبر کو حذف نہیں کرتے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فلولا فضل اللہ تدارککم۔

رَحْمَتُهٗ اس کا عطف فَضْلُ پر ہے۔ یعنی اس کا لطف اور مہلت دینا نہ ہوتا۔

لَكُنْتُمْ یہ لولا کا جواب ہے مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ، کنتم کی خبر ہے۔ الخسران کا معنی نقصان ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا فضل یہ ہے کہ توبہ قبول کرنا۔ اور رَحْمَتُهٗ سے مراد العفو ہے اور الفضل سے مراد ثابت شدہ پر زیادتی ہے۔ الافضال ایسا فعل کرنا جو واجب نہ ہو۔ ابن فارس نے المجمل میں کہا: الفضل سے مراد زیادتی اور خیر ہے۔ الافضال کا مطلب الاحسان ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

''اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے''۔

اس میں سات مسائل ہیں (☆)۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، عَلِمْتُمْ اس کا معنی ہے: تم نے ان کے اعیان (اشخاص) کو پہچان لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: تم ان کے احکام جان چکے ہو، ان دونوں (علم اور معرفت) میں فرق یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں تین مسائل ہیں۔

ہے کہ معرفت ذات مسمی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور علم مسمیٰ کے احوال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تو کہتا ہے کہ عرفت زیداً اس سے مراد ہے میں نے زید کی شخصیت کو پہچان لیا۔ جب تو کہتا ہے: علمت زیداً اس سے مراد اس کے احوال (فضل یا نقص) وغیرہ کو جان لیا۔ پہلی صورت میں ایک فعل کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور علمتم بمعنی عرفتم ہے اور دوسری صورت میں دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: لقد علمت زیداً ولم اعلمه، اس میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، قرآن حکیم میں ہے: لا تعلمونهم الله یعلمهم۔ یہ تمام معرفت کے معنی میں ہیں۔

اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، الَّذِيْنَ کا صلہ ہے۔ الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: نسائی نے حضرت صفوان بن عسال سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا: ہم اس نبی کے پاس چلیں۔ دوسرے ساتھی نے کہا: نبی نہ کہو اگر اس نے تجھے (یہ کہتے ہوئے) سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ (یعنی بہت خوش ہوگا)۔ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نو آیات بینات کے بارے پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، اس نفس کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، کسی بری شخص کو سلطان (بادشاہ) کے پاس نہ لے جاؤ، کسی کا تمسخر نہ اڑاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامنہ پر بہتان نہ لگاؤ، جنگ کے دن پیٹھ نہ پھیرو اور اے یہودیو! خاص تمہارے لئے کہ تم ہفتہ کے دن (کے احکام سے) تجاوز نہ کرو۔ پس انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نبی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تمہیں میری اتباع کرنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ان کی اولاد سے ہمیشہ نبی ہو۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں گے تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کے الفاظ سورۂ سبحان میں ان شاء اللہ آئیں گے۔

مسئلہ نمبر 3: فِي السَّبْتِ اس کا معنی فی یوم السبت ہے، (یعنی ہفتہ کے دن میں)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد ہفتہ کے دن کا حکم ہو(1)۔ پہلا قول حسن کا ہے۔ انہوں نے حلال سمجھنے کی جہت سے اس میں مچھلیاں پکڑی تھیں۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن رومان نے کہا: ایک شخص ایک دھاگہ لیتا تھا اور اس میں ایک ایسی رسی لگاتا تھا جو جانور کی گردن میں ڈالی جاتی ہے پھر اسے مچھلی کے دم میں ڈالتا تھا اور دھاگے کی دوسری طرف ایک کیل ہوتا تھا، وہ اتوار کے دن تک اسے اسی طرح چھوڑے رکھتا تھا پھر جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ایسا کرنے والے کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کیا گیا تو عام لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مچھلی کا شکار ہفتہ کے دن میں زیادہ ہو گیا اور مچھلیاں بازار میں آنے لگیں اور فاسق لوگوں نے شکار کا اعلان کر دیا۔ ایک فرقہ اٹھا، انہوں نے ایسے لوگوں کو منع کیا اور برسر منبر انہیں منع کیا اور ایسا کرنے والوں سے جدا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ منع کرنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ پس انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ شہر کو تقسیم کر دیا۔ ایک دن منع کرنے والے اپنی مجلس میں تھے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی باہر نہ نکلا، انہوں نے کہا: لوگوں کو کچھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہو گیا ہے۔ انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور ان کے پاس گئے۔ پس بندروں کا نسب انسان سے جانا گیا ہے، لیکن انسان کا نسب بندروں سے معروف نہیں۔ وہ بندر اپنے خاندان والوں میں سے کسی انسان کے پاس آتے، اس کے کپڑے سونگھتے اور رونے لگتے۔ وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا وہ سر سے اشارہ کر کے کہتے: ہاں (1)۔ قتادہ نے کہا: نوجوان بندر بن گئے تھے، بوڑھے خنزیر بن گئے تھے صرف منع کرنے والے بچے تھے باقی سب ہلاک ہو گئے تھے (2)۔ ان لوگوں کا قول سورۂ اعراف میں آئے گا جنہوں نے کہا تھا کہ وہ تین گروہوں میں تھے، اور یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ صحیح ہے جنہوں نے کہا: ان کے دو گروہ تھے۔ واللہ اعلم

السَّبْتِ، السبت سے ماخوذ ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہفتہ کے دن میں اشیاء جدا کی گئی تھیں اور ان کی خلقت مکمل ہوئی تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ السبوت سے مشتق ہے جس کا معنی راحت اور سکون ہے۔ (3)

علماء کا مسخ شدہ امت کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی نسل چلی ہے یا نہیں۔ علماء کے دو قول ہیں: زجاج نے کہا: ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جائز ہے کہ یہ بندر ان لوگوں میں سے ہوں۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: مسخ شدہ امت کی نسل باقی نہیں چلی۔ رہے بندر اور خنازیر وغیرہما اس سے پہلے بھی موجود تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کیا تھا وہ ہلاک ہو گئے تھے اور ان کی نسل باقی نہیں رہی تھی کیونکہ انہیں سخط اور عذاب لاحق ہوا تھا ان کے لئے دنیا میں تین دن کے بعد قرار نہیں تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: کوئی قوم جو مسخ کی گئی تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کھایا، نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی (4)۔ ابن عطیہ نے کہا (5): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور ثابت ہے کہ مسخ شدہ کی نہ نسل چلی، نہ کھایا اور نہ پیا اور نہ تین دن سے زیادہ زندہ رہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول دونوں قولوں میں صحیح ہے اور ابن عربی وغیرہ نے پہلے قول کی صحت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی ایک امت مفقود ہو گئی۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا میں نے نہیں دیکھا مگر وہ چوہیا ہے کیا تم اسے دیکھتے نہیں کہ جب اس کے سامنے اونٹنی کا دودھ رکھا جائے تو یہ اسے نہیں پیتی اور اس کے سامنے بکری کا دودھ رکھا جائے تو پی لیتی ہے (6)۔ یہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے اور دوسری حجت گوہ والی حدیث ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حضرت جابر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوہ لائی گئی تو آپ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں سے ہو جو مسخ کی گئیں۔ یہ روایات منقول ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔

ابن عربی نے کہا: بخاری میں عمرو بن میمون سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا۔ بندروں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ یہ بخاری کے بعض نسخوں میں ثابت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 6۔ صحیح بخاری، باب خیر مال المسلم غنم، حدیث نمبر 3360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور بعض میں ساقط ہے۔ حدیث کی نص میں ثابت ہے (اس نے زنا کیا) یہ لفظ بعض سے ساقط ہے۔

ابن عربی نے کہا: اگر کہا جائے کہ چوپائیوں میں شریعت کی پہچان باقی ہے حتیٰ کہ وہ نسل درنسل ان احکام کے وارث بنتے رہے حتیٰ کہ عمرو کے زمانہ تک پہنچے؟ ہم کہیں گے: ہاں، اسی طرح تھا کیوں کہ یہود نے رجم میں تبدیلی کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مسخ شدہ لوگوں میں اس کو قائم رکھا تاکہ ان لوگوں پر حجت میں مبالغہ ہو جائے جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تبدیل کیا تاکہ ان کی کتب اور ان کے علماء اور ان کی مسخ شدہ قومیں ان کے خلاف گواہی دیں تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو چھپاتے ہیں اور جو اعلان کرتے ہیں اور وہ سب شمار کیا جا رہا ہے جو وہ تغیر و تبدل کرتے ہیں ان پر حجت قائم فرمائی جہاں سے اسے قیام کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد فرماتا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جاتی (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کا کلام احکام میں ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ انہوں نے جو عمرو بن میمون کا قصہ ذکر کیا ہے حمیدی نے جمع صحیحین میں ذکر کیا ہے۔ ابو مسعود الدمشقی نے حکایت کیا ہے کہ عمرو بن میمون الاودی کی صحیحین میں حصین کی روایت سے حکایت ہے، عمرو نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر دوسرے بندر جمع ہوئے اور اسے رجم کیا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اسی طرح حضرت ابو مسعود نے حکایت کیا ہے، اس نے ذکر نہیں کیا کہ کسی جگہ بخاری نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے، ہم نے اس کے متعلق کوشش کی تو ہم نے اسے بعض نسخوں میں پایا نہ کہ تمام نسخوں میں۔ امام بخاری نے اسے ''کتاب ایام الجاہلیۃ'' میں ذکر کیا ہے اور نعیمی عن الفربری کی روایت میں بندروں کے بارے میں اس خبر کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شاید یہ کتاب البخاری میں مقحمات (گھسیڑی گئی روایات) میں سے ہے اور وہ جو بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں ذکر کیا ہے مجھے نعیم بن حماد نے کہا: ہمیں ہشیم نے ابو بلج سے اور حصین نے عمرو بن میمون سے روایت کر کے بتایا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر بندر جمع تھے انہوں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اس روایت میں قد زنت۔ (اس نے زنا کیا) کے الفاظ نہیں ہیں اگرچہ روایت صحیح ہو تو امام بخاری نے اسے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے روایت کیا کہ عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت پایا ان کے گمان کی کوئی پرواہ نہیں جو انہوں نے زمانہ جاہلیت کے بارے میں کیا۔ ابو عمرو نے ''الاستیعاب'' میں حضرت عمرو بن میمون کا ذکر کیا ہے ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے کوفیوں میں سے بڑے تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بندروں کا رجم دیکھا تھا اگر یہ صحیح ہو کیونکہ اس کے راوی مجہول ہیں۔ بخاری نے نعیم عن ھشیم عن حصین عن عمرو بن میمون الاودی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس نے زنا کیا تھا پھر بندروں نے اسے رجم کیا تھا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا تھا۔ اس کو عباد بن العوام نے حصین سے روایت کیا جس طرح ہشیم نے مختصراً روایت کیا۔ اور رہا یہ قصہ اپنے طول کے ساتھ تو وہ عبد الملک بن مسلم عن عیسیٰ بن حطان پر گھومتا ہے جو دونوں استاد، شاگرد قابل حجت نہیں ہیں۔ یہ اہل علم کی جماعت کے نزدیک منکر ہے کہ زنا کی اضافت غیر مکلف کی طرف کی گئی ہے اور اس میں حدود کو حیوانوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ جنوں میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سے ہوں گے دوسرے حیوان نہ ہوں گے۔ رہا حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد میں نے نہیں دیکھا۔ چوہے اور گوہ کے بارے میں فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں میں سے ہو جو مسخ کی گئی تھی اور اس کی مثل دوسری مثالیں۔ یہ ظن اور خوف کی بنا پر فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ گوہ اور چوہے وغیرہا مسخ شدہ سے ہوں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی آنے سے پہلے اپنی طرف سے اظہار فرمایا، جب وحی آگئی تو یہ خوف زائل ہو گیا اور جان لیا کہ گوہ اور چوہے مسخ شدہ قوموں میں سے نہیں ہیں۔ وحی کے آنے کے بعد ہمیں اپنے ارشاد میں بتایا جب آپ سے پوچھا گیا بندروں اور خنازیر کے متعلق کہ کیا یہ مسخ شدہ قوموں میں سے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا یا عذاب نہیں دیا پھر ان کی نسل چلائی ہو۔ بندر اور خنازیر اس سے پہلے موجود تھے۔ یہ نص صحیح صریح ہے اسے حضرت عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور اسے مسلم نے کتاب القدر میں نقل کیا ہے اور نصوص ثابت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور آپ کے دستر خوان پر گوہ کھائی گئی اور آپ نے انکار نہیں فرمایا۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری توفیق ہے۔

مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ صرف ان کے دل مسخ کیے گئے اور ان کے افہام، بندروں کے افہام جیسے بنا دیئے گئے (1)، میری معلومات کے مطابق کسی اور مفسر نے یہ نہیں کہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً، قِرَدَةً کان کی خبر ہے۔ خٰسِـِٕيْنَ اس کی صفت ہے، اگر تو چاہے تو اسے کان کی خبر بنا دے یا کونوا میں ضمیر سے حال بنا دے اور خٰسِـِٕيْنَ کا معنی مبعدین دور کیے گئے ہے۔ کہا جاتا ہے: فخسأ و خسئ و انخسأ یعنی میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (الملک: 4) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام ہو کر) اخستوا فیھا۔ یعنی اس میں دور چلے جاؤ۔ تباعد کا معنی ناراض ہونا ہے۔ کسائی نے کہا: خسأ الرجل خسوٗا۔ وخساتہ خسا، اس صورت میں الخاسئ کا معنی گھٹیا اور رسوا ہوگا۔ کہا جاتا ہے: قمؤ الرجل قمائ و قماءۃ صار قمیئا یعنی ذلیل وخوار ہوا۔ اقماتہ میں نے اسے رسوا و ذلیل کیا فھو قمیئ، فعیل کے وزن پر ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

''پس ہم نے بنا دیا اس سزا کو عبرت ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے اور (اسے) نصیحت بنا دیا پرہیزگاروں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا مفعول ثانی کی بنا پر نَكَالًا منصوب ہے اور عبرت بنانے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد سزا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد شہر ہے کیونکہ کلام کا معنی اس کا تقاضا کرتا ہے، بعض نے فرمایا: امت جو مسخ کی گئی، بعض نے فرمایا: مچھلیاں۔ اس قول میں بعد ہے۔ النکال کا معنی زجر اور عقاب ہے۔ النکل والانکال، اس سے مراد بیڑیاں ہیں (2)۔ بیڑیوں کو انکال کہتے ہیں کیونکہ یہ آدمی کو روکتی ہیں۔ بھاری لگام کو نَکل اور نِکل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جانور کو روکتی ہے نَکَل عن الامر یَنکُلُ و نَکِل یَنکَل جب کوئی رک جائے۔ التنکیل، دشمن کو ایسی تکلیف پہنچانا کہ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دوسرے لوگوں کو وہ روک دے۔ الازہری نے کہا: النکال سے مراد عقوبت ہے۔ ابن درید نے کہا: المنکل وہ چیز جو انسان کو روک دے۔

فاذمر علی اقفائهم بمنکل۔ تو ان کو گدیوں پر روکنے والی چیز سے مار۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس سے مراد اس قوم کے پہلے گناہ ہیں۔ وَمَا خَلْفَهَا جو ان کے بعد اس قسم کے گناہ کرے گا۔ فراء نے کہا: مسخة کو گزشتہ گناہوں کی وجہ سے عبرت اور سزا بنایا گیا اور جو ان کے بعد عمل کرنے والے ہیں تا کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مسخ سے ڈریں۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ عمدہ قول ہے اور دونوں ضمیریں عقوبت کیلئے ہیں۔ حکم نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جو لوگ موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے(2)۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا: یہ معنی کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا اور مَا خَلْفَهَا سے مراد شہر ہیں(3)۔ قتادہ نے کہا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا سے مراد ان کے گناہ ہیں اور مَا خَلْفَهَا سے مراد مچھلیوں کا شکار ہے۔(4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ اس کا عطف نکال پر ہے اس کا وزن مفعلة ہے یہ اتعاظ سے اور انزجار سے ہے۔ الوعظ کا معنی ڈرانا ہے۔ العظة اسم ہے۔ خلیل نے کہا: الوعظ سے مراد خیر کی ایسی نصیحت کرنا جس کے لئے دل نرم ہو جائے۔

الماوردی نے کہا: المتقین کو نصیحت کے لئے خاص کیا گیا ہے اگرچہ یہ تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر معاندین سے متقین نصیحت قبول کرنے میں منفرد ہوتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا(5): لفظ ہر امت کے ہر متقی کو شامل ہے۔ زجاج نے کہا مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ یعنی امت محمدیہ کے لئے نصیحت ہے تا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے انہیں منع فرمایا ہے وہ ان کے ارتکاب سے بچیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اصحاب السبت جیسا عذاب پہنچے جو انہیں ہفتہ کے دن اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ افعال کے ارتکاب کی وجہ سے پہنچا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً

اس میں چار مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ ایضا　4۔ ایضا　5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ابو عمرو سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے یا مرکم راء سے ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابوالعباد المبرد نے کہا: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ را حرف اعراب ہے اور ابو عمرو سے صحیح یہ مروی ہے کہ وہ حرکت میں اختلاس کرتے تھے۔ اَنْ تَذْبَحُوْا یہ يَاْمُرُكُمْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یعنی بان تذبحوا۔ بَقَرَةً پر نصب تَذْبَحُوْا کی وجہ سے ہے ذبح کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً یہ تلاوت میں مقدم ہے اور قَتَلْتُمْ نَفْسًا گائے کے متعلق جو کچھ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس پر یہ معنی کے اعتبار سے مقدم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قَتَلْتُمْ نزول میں مقدم ہو اور ذبح کا امر موخر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ نزول کی ترتیب تلاوت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گویا انہیں گائے کے ذبح کا حکم دیا حتیٰ کہ انہوں نے اسے ذبح کیا پھر قتل کے امر سے جو واقع ہوا وہ واقع ہوا۔ پس انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کا بعض اس مقتول کو ماریں، پہلے قول کے مطابق معنی کے اعتبار سے وَاِذْ قَتَلْتُمْ مقدم ہوگا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ واو ترتیب کا موجب نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے جو طوفان اور اس کے ختم ہونے کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس قول میں حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (ہود) پہلے ان لوگوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا جو ہلاک ہوئے پھر اس پر اس ارشاد سے عطف فرمایا: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (ہود: 41) خطاب میں رکوب کا ذکر متاخر کیا اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ان کا سوار ہونا ہلاکت سے پہلے تھا۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً و لم یجعل لہ عوجاً۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بکری کو ذبح کرنا اور اونٹ کو نحر کرنا اولیٰ ہے اور گائے میں اختیار ہے۔ بعض نے فرمایا: ذبح اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذبح کا ذکر فرمایا نیز منحر کے مذبح کے قرب کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: میں کسی عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کا کھانا حرام قرار دیا ہو جس کو ذبح کرنا تھا اس کو نحر کیا گیا یا جس کو نحر کرنا تھا اسے ذبح کیا گیا۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے اور کسی کا کسی شے کو مکروہ قرار دینا اسے حرام قرار دینا نہیں ہے۔ مزید ان شاء اللہ ذبح کے احکام، ذبح کرنے والا اور ان دونوں کی شرائط سورۂ مائدہ میں اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے تحت تفصیل سے آئیں گے۔ ماوردی نے کہا: انہیں صرف گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ان کے معبود بچھڑے کی جنس سے تھے تاکہ جس چیز کی وہ تعظیم کرتے تھے ان کے نزدیک اس کی اہانت کی جائے۔ نیز اس لئے تاکہ وہ جان لے کہ ان کے نفسوں میں اس کی عبادت کی قبولیت کتنی ہے۔ یہ معنی گائے کے ذبح میں علت ہے اور سائل کے جواب میں علت نہیں ہے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ مقتول، زندہ کے قتل کے ساتھ زندہ ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اشیاء کی ایجاد ان کی اضداد کے ساتھ کرنے میں زیادہ ظاہر کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَقَرَةً یہ مونث کا اسم ہے، مذکر کے لئے ثور اسم ہے، جیسے اونٹنی کے لئے ناقۃ اور

اونٹ کیلئے جملٌ، عورت کے لئے امرأۃ اور مرد کیلئے رجلٌ، البقرۃ، البقر کا واحد ہے اس میں مذکر، مؤنث برابر ہے، اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: بَقَرَ بَطنَہ، اس نے اس کا پیٹ چاک کیا۔ البقرہ (گائے) زمین کو چیرتی اور پھاڑتی ہے اسی سے ابوجعفر محمد بن علی زین العابدین کو الباقر کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے علم کو چیرا اور اس کی اصل کو پہچانا، البقیرۃ وہ کپڑا جو پھاڑا جاتا ہے پھر عورت اسے اپنی گردن میں ڈالتی ہے اس کی آستین نہیں ہوتیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہدہد کی شان میں ہے۔ فبقر الارض (1) اس نے زمین کو پھاڑا۔ شمر نے کہا: بقر کا مطلب ہے: اس نے پانی کی جگہ کو دیکھا اور زمین کے نیچے پانی کو دیکھا۔ الازہری نے کہا۔ البقر جنس کے لئے اسم ہے اس کی جمع باقر ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: کہا جاتا ہے بقیر، باقر، بیقور۔ عکرمہ اور ابن یعمر نے ان الباقر پڑھا ہے۔ الثور، اس کی جمع ثیران ہے۔ الثور، مردوں میں سے سردار کو کہتے ہیں۔ الثور، پنیر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ الثور کائی کو بھی کہتے ہیں۔ ثور ایک پہاڑ کو بھی کہتے ہیں ثور عربوں کا ایک قبیلہ بھی ہے۔ حدیث میں ہے: وقت العشاء ما لم یغب ثور الشفق یعنی عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا جب شفق کا پھیلاؤ غائب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ثار یثور ثوراً و ثوراناً جب افق میں پھیل جائے۔ حدیث میں ہے: من اراد العلم فلیثوّر القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے اسے قرآن پڑھنا چاہئے۔ شمر نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے ساتھ علماء سے علم تلاش کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا جواب تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان ایک مقتول پایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام عامیل تھا۔ ان پر قاتل کا معاملہ مشتبہ ہو گیا اور ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ انہوں نے کہا: ہم آپس میں لڑ رہے ہیں جبکہ اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے۔ پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے اس کا بیان پوچھا۔ یہ تورات میں قسامت کے حکم کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سنا جبکہ اس کے ظاہر میں ان کے سوال کا جواب نہیں تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس مقتول کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے۔ کہنے لگے: تو ہمارے ساتھ مزاح کرتا ہے۔ الھزء، کھیلنا، مزاح کرنا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

جحدری نے أیتخذنا پڑھا ہے وہ یہ ایک دوسرے سے کہنے لگے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ جواب دیا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں) کیونکہ سائل کے جواب سے خروج جہالت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ نے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کہا کیونکہ یہ ایسی صفت ہے جو انبیاء کرام میں نہیں پائی جاتی (2)۔ جہالت، علم کی نقیض ہے۔ اس وجہ سے جہالت سے پناہ مانگی جس طرح انہوں نے جہالت کا مظاہرہ کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ انہوں نے اسے کہا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے رہا تھا۔ اس قول کا ظاہر ایسا کہنے والے کے اعتقاد کے فساد

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر دلالت کرتا ہے اس شخص کا ایمان صحیح نہیں ہوتا جو ایسے نبی سے ایسی بات کرے جس کے معجزات ظاہر ہو چکے تھے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا حکم دیتا ہے، کیا تو ہم سے مزاح کرتا ہے...... اگر کوئی اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کے متعلق یہ کہے تو اس کی تکفیر واجب ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ ان سے طبعی قساوت، جفا اور معصیت کی بنا پر تھا جیسا کہ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا(1)۔ اسی طرح ایک اور نے کہا تھا: اعدل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم عدل کرو(2)۔ یہ تمام جہالت کے قبیح ہونے پر واضح دلیل ہے اور جہالت مفسد دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد هُزُوًا یہ دوسرا مفعول ہے، ہمزہ کی تخفیف جائز ہے تو اسے واؤ اور ہمزہ کے درمیان کر دے۔ حفص نے واو کو مفتوحہ بنایا ہے کیونکہ یہ ہمزہ مفتوحہ ہے جس سے پہلے ضمہ ہے یہ بدل کے طور پر جاری ہے جیسے السفہاء ولکن ہے۔ زاء سے ضمہ کا حذف کرنا جائز ہے جس طرح عضد سے حذف کیا جاتا ہے تو کہتا ہے: هُزْوًا جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے۔ اسی طرح وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص) ہے۔

اخفش نے عیسیٰ بن عمر سے حکایت کیا ہے کہ ہر وہ اسم جس کے تین حرف ہوں پہلا حرف مضموم ہو تو اس میں دو لغتیں ہوتی ہیں، تخفیف اور تثقیل۔ جیسے عسر، یسر، ہزء۔ اس کی مثل وہ تمام جمع کے الفاظ ہیں جو فُعلٌ کے وزن پر ہوتے ہیں جیسے کُتُبٌ، و کُتْبٌ، رُسُلٌ و رُسْلٌ، عُوْنٌ و عُوُنٌ۔

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (زخرف:15) یہ ہزء اور کف کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ اصل میں فعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ اپنی جگہ پر اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے اور مسلمانوں کے دین سے اور ایسے شخص سے جس کی تعظیم واجب ہے اس سے استہزاء کرنا منع ہے اور یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا وعید کا مستحق ہے۔ مزاح، استہزاء میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے اور آپ کے بعد ائمہ بھی مزاح فرمایا کرتے تھے۔ ابن خویز منداد نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی کہ ایک شخص عبید اللہ بن الحسن کی طرف گیا۔ اس وقت عبید اللہ، کوفہ کے قاضی تھے۔ عبید اللہ نے اس شخص سے مزاح کیا۔ عبید اللہ نے کہا: تیرا یہ جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا مینڈھے کی اون کا ہے؟ وہ شخص کہنے لگا: اے قاضی! جہالت کا مظاہرہ نہ کر۔ عبید اللہ نے کہا: تو نے مزاح کو کہاں جہالت پایا ہے؟ پھر یہ آیت اسے سنائی، عبید اللہ نے اس سے اعراض کر لیا کیونکہ اس نے اسے جاہل دیکھا کیونکہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق نہیں جانتا تھا حالانکہ ہر ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث 3153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

''بولے دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے وہ گائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو۔ تو بجالاؤ جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یہ بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اطاعت کی کمی کا اظہار ہے۔ اگر وہ حکم کی پیروی کرتے اور کوئی گائے ذبح کر دیتے تو مقصود حاصل ہو جاتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ حضرت ابن عباس اور ابوالعالیہ وغیرہما کا یہ قول ہے (1)۔ اسی طرح حضرت حسن بصری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

بنی عامر کی لغت ادع ہے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یُبَیِّنْ، جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مَا هِيَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ ماهیة الشی، شے کی حقیقت اور اس کی ذات جس پر وہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں فعل کے وقت سے پہلے نسخ کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ جب گائے کا حکم دیا تو وہ کوئی گائے تھی جب صفت میں زیادتی کی تو یہ پہلے حکم کو دوسرے سے منسوخ کرنا ہے جس طرح اگر کہا تیس اونٹوں میں ایک بنت مخاض پھر اسے نسخ فرمایا بنت لبون یا حقہ سے۔ اسی طرح یہاں جب صفت کو متعین کر دیا تو یہ پہلے حکم کے لئے نسخ ہو گیا۔

الفارض، المسنة، فرضت، تفرض فروضاً۔ یعنی بڑی ہو گئی پرانی چیز کو فارض کہا جاتا ہے۔ راجز نے کہا:

شیب اصداغی فرأسی ابیض　　محامل فیها رجال فرّض

میری کان پٹیاں سفید ہو گئیں اور میرا سر سفید ہے، اس میں بوڑھے لوگ محامل کی طرح بھاری ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لعمرك قد اعطیت جارك فارضاً　　تساق الیه ما تقوم علی رجل

تیری عمر کی قسم! تو نے اپنے پڑوسی کو بوڑھی گائے دی اس کو تو وہ جانور دیا جاتا ہے جو اپنے قدموں پر چلتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا رب ذی ضغن علی فارض　　له قروء کقروٴ الحائض (3)

ہائے! مجھ پر قدیم کینہ رکھنے والا، اس کے لئے حیض ہیں جیسے حیض والی عورت کے لئے حیض ہوتے ہیں۔

لَّا فَارِضٌ، بقرہ کی صفت کی وجہ سے مرفوع ہے۔ وَّلَا بِكْرٌ معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: لَّا فَارِضٌ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی لاهی فارض۔ اسی طرح لا ذلول ہے اور اسی طرح لا تسقی الحرث کا حکم ہے اسی طرح مسلمة کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَارِضٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس نے بہت سے بچے جنم دیئے ہوں اور اس کا پیٹ پھول گیا ہو۔ الفارض کا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　3۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لغوی معنی واسع (کھلا) ہے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ البکر غیر حاملہ چھوٹی گائے کو کہتے ہیں۔ قتبی نے کہا: جو بچہ جنم دے چکی ہو۔ البکر پہلے بچہ کو بھی کہتے ہیں۔

یا بکرَ بکرین و یا خلب الکبد　　　اصبحت منی کذراع من عضد

اے دونوجوانوں کی پہلی اولاد! اے جگر کی جھلی! تو میرے نزدیک اس طرح ہے جیسے بازو سے ہاتھ کا تعلق ہے۔

البکر جانوروں اور بنی آدم کی مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو ابھی نر سے جفتی نہ کیا ہو یا با کے کسرہ کے ساتھ ہے با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اونٹ کا جوان بچہ مراد ہوتا ہے۔

العوان، نصف ایسی مادہ جو ایک یا دو بچے جنم دے چکی ہو یہ گاؤں میں سے جو طاقتور اور خوبصورت ہوتی ہے بخلاف گھوڑوں کے، شاعر گھوڑے کی صفت بیان کرتا ہے:

کمیت بھیم اللون لیس بفارض　　　ولا بعوان ذات لون مخصف

سیاہ رنگ والا ہے، نہ بوڑھا ہے اور نہ چھوٹا ہے، کئی رنگوں والا چتکبرا ہے۔

فرس اخصف، چتکبرا گھوڑا۔ مجاہد نے کہا: گائیوں میں سے العوان اسے کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے بچے جنم دے چکی ہو، یہ اہل لغت نے بیان کیا ہے(1)۔ کہا جاتا ہے: ان العوان النحلة الطویلة۔ لمبی کھجور کو عوان کہتے ہیں یہ ان کے گمان کے مطابق یمنی لغت ہے۔ حربٌ عوان، جب اس سے پہلے ایک جنگ ہو چکی ہو۔ زہیر نے کہا:

اذا لقحت حربٌ عوان مضرۃٌ　　　ضروس تھرّ الناس انیابھا عُصل

جب جنگ تیز ہو اور نقصان دینے والی ہو۔ داڑھوں والی ہو تو لوگ اس کے ٹیڑھے دانتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

یعنی وہ گائے نہ چھوٹی ہو نہ بوڑھی ہو یعنی وہ درمیانی عمر کی ہو۔ عوان کی جمع عُوْن عین کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ عُوُن واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی اس کی جمع سنی گئی ہے جیسے رُسُل یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے حکایت کیا ہے، العوان سے عونت تعویناً ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ یہ امر کی تجدید اور تاکید کے لئے ہے اور ہٹ دھرمی ترک کرنے پر تنبیہ ہے۔ پس انہوں نے اس کو نہ چھوڑا(2)۔ یہ دلیل ہے کہ امر وجوب کے لئے آتا ہے جس طرح کہ فقہاء کہتے ہیں یہ صحیح ہے جو اصول الفقہ میں مذکور ہے اور امر (حکم) فوری طور پر لازم ہوتا ہے۔ یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اس کی صحت پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے یہ کوتاہی سمجھی جب انہوں نے حکم کو بجالانے میں جلدی نہ کی۔ فرمایا: فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۝ (البقرہ) بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ امر کا وجوب علی التراخی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاخیر اور خطاب میں رجوع پر سختی نہیں فرمائی۔ ابن خویز منداد نے یہ کہا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾

''کہنے لگے: دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا، مَا استفہام مبتدا ہے لَوْنُهَا خبر ہے۔ لَوْنُهَا کو یبین کے ساتھ نصب دینا بھی جائز ہے اور اس صورت میں مَا زائدہ ہوگا۔ لون کی جمع الالوان ہے یہ ایک ہیئت ہے جیسے کالا، سفید، سرخ۔ اللون کا معنی نوع بھی ہے۔ فلان متلون، رنگین مزاج شخص جو ایک عادت پر اور ایک حال پر نہ رہتا ہو۔ شاعر نے کہا:

كل يوم تتلون غير هذا بك اجمل

ہر روز تو بدلتا رہتا ہے مگر پھر بھی یہ عمل تجھ سے خوبصورت لگتا ہے۔

لون البسر تلويناً جب کھجور میں پکنے کے اثر کا آغاز ہو۔ اللون، کھجور کی ایک قسم ہے۔

اخفش نے کہا: یہ جمع ہے اور اس کا واحد لينةٌ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صَفْرَآءُ۔ جمہور مفسرین نے کہا کہ زرد رنگ کی ہو۔ یہ الصفرة المعروفه سے ہے یعنی زرد رنگ جو معروف ہے۔ مکی نے بعض سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ اس کے سینگ اور کھر بھی زرد ہوں۔ حسن اور ابن جبیر نے کہا: صرف اس کے سینگ اور کھر زرد ہوں (1)، حسن نے کہا صَفْرَآءُ کا معنی سیاہ ہے (2)۔ شاعر نے کہا:

تلك خيلي منه و تلك ركابي هن صفر اولادها كالزبيب

یہ میرے گھوڑے اور میری سواریاں اس کی طرف سے ہیں۔ یہ سیاہ ہیں ان کی اولاد کشمش کی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ ظاہر ہے اور یہ قول شاذ ہے۔ یہ مجازاً اونٹوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (3)۔ اگر یہاں سیاہ رنگ مراد ہوتا تو اس کی تاکید الفقوع کے ساتھ نہ ہوتی کیونکہ فقوع کی صفت کے ساتھ مختص ہے۔ سیاہ رنگ کی صفت اس کے ساتھ نہیں لگائی جا سکتی۔ عرب کہتے ہیں: اسود حالك حَلَكوك و حُلكوك، و دجوجی و غربیب۔ یہ سب کالے رنگ کی صفات ہیں اور سرخ رنگ کی صفت قانی۔ کہا جاتا ہے: احمر قانی۔ سفید رنگ کے لئے ابیض ناصع، لهق، لهاق و يقق کہا جاتا ہے اور سبز رنگ کے لئے اخضر ناضرٌ اور زرد رنگ کے لئے اصفر فاقعٌ کہا جاتا ہے۔ فقع لونها يفقع فقوعاً جب خالص زرد رنگ ہو۔ الافقاع بری حالت کو کہتے ہیں۔ فواقع الدهر، زمانے کی مصیبتیں، وفقع باصابعه، جب انگلیوں سے آواز نکالے۔ اسی سے حضرت ابن عباس کی حدیث ہے: نهى عن التفقيع في الصلاة (4)۔ نماز میں چٹخارے نکالنے سے منع فرمایا۔ الفرقعة انگلیوں کو موڑنا حتیٰ کہ آواز نکلے۔ صَفْرَآءُ معرفہ اور نکرہ ہر حالت میں غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ فی الصلاۃ، حدیث 954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الف تانیث ہے جو لازم ہے اور یہ ھا کے مخالف ہے کیونکہ جس اسم کے آخر میں ھا ہوتی ہے وہ نکرہ ہونے کی صورت میں منصرف ہو جاتا ہے جیسے فاطمہ، عائشہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا خالص رنگ مراد ہے اس کی جلد کی رنگت کے علاوہ اس میں کوئی رنگ نہ ہو۔ تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ وہب نے کہا: گویا سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے نکل رہی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا: زرد رنگ نفس کو خوش کرتا ہے۔ انہوں نے زرد جوتا پہننے پر برانگیختہ کیا۔ یہ نقاش نے ان سے حکایت کیا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو زرد چمڑے کا جوتا پہنے گا اس کا غم کم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ۔ یہ ثعلبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن الزبیر، محمد بن ابی کثیر نے سیاہ جوتا پہننے سے منع فرمایا کیونکہ یہ پریشان کرتا ہے۔ تَسُرُّ کا معنی اچھا لگنا خوش کرنا ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا: اس کا معنی ہے اسے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ گائے دو وصفوں والی تھی۔ (1)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝

”کہنے لگے: پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا انہوں نے چوتھا سوال کیا اور بیان کے بعد بھی حکم کی پیروی نہیں کی۔ یہاں الْبَقَرَ مذکر ذکر کیا کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا۔ الْبَقَرَ کے لفظ کی تذکیر کی وجہ سے فعل کا صیغہ بھی مذکر ذکر فرمایا۔ قطرب نے کہا: البقرۃ کی جمع باقر، باقور اور بقر ہے۔ اصمعی نے کہا: الباقر، جمع ہے باقرۃ کی۔ اور کہا: باقورۃ بھی بقر کی جمع بنائی جاتی ہے۔ یہ نحاس نے حکایت کیا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی بقر کی جنس ہے۔ حسن نے اس کے مطابق پڑھا جو نحاس نے ذکر کیا ہے (2) اور اعرج نے اس کے مطابق جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَهَ (تاء اور شین کی شد کے ساتھ) انہوں نے تشابہ کو فعل مضارع اور مؤنث بنایا ہے اصل میں تتشابہ تھا۔ پھر تا کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مجاہد نے تشّبّهٔ جیسا کہ ان دونوں کی قراءت ہے مگر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں تشابہت (شین کی تشدید کے ساتھ) ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے اس باب میں تا ادغام نہیں ہوتی مگر مضارع میں۔ یحییٰ بن یعمر نے ان الباقر یشابہ پڑھا ہے (3)۔ انہوں نے اسے فعل مستقبل بنایا ہے بقر کو مذکر تصور کیا اور ادغام کیا۔ ان البقر تشابہ، شین کی تخفیف اور ھا کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ ثعلبی نے حسن سے حکایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یشابہ شین اور یا کی تخفیف کے ساتھ جائز نہیں ہے یہ تا میں جائز ہے کیونکہ اصل تتشابہ تھا دو تا کے اجتماع کی وجہ سے ایک کو حذف کر دیا۔ البقر، الباقر، البیقور، البقیر یہ تمام لغتیں ہیں اور سب کا معنی ایک ہے عرب اس کو مذکر اور مؤنث دونوں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

طرح استعمال کرتے ہیں۔ تشابہ میں مختلف قراءت کے معانی اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَهَ عَلَيْنَا انہوں نے اس لئے کہا کیونکہ گائیوں کے رنگ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس سے حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فتنے رات کے ٹکڑوں کی طرح اس طرح آئیں گے جیسے گائیوں کے چہرے۔ یعنی بعض، بعض کے مشابہ ہوں گے اور گائیوں کے چہرے متشابہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے کہا: گائے ہم پر متشابہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ یہ ان کی طرف سے استثنا ہے۔ اس آخری میں استثنا کے ذکر کرنے میں ان کی طرف سے قبولیت اور پیروی ہے اور امر کی موافقت نہ کرنے پر شرمندگی کی دلیل ہے(1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی گائے کا پتا نہ پاتے (2)۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: انا لمهتدون ان شاء الله۔ اهتداء کو ذکر میں اس کے اہتمام کی وجہ سے مقدم فرمایا۔ شَآءَ شرط کی جگہ میں ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس کا جواب اِنَّ اور جس میں وہ عمل کر رہا ہے۔ اور ابو العباس المبرد کے نزدیک جزا محذوف ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

''موسیٰ علیہ السلام بولے: اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو، بے عیب بے داغ۔ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ۔ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ جمہور علماء نے لَّا ذَلُوْلٌ کو بَقَرَةٌ کی صفت کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: لَّا ذَلُوْلٌ، بَقَرَةٌ کی صفت ہے اور اس پر نصب بھی جائز ہے۔ ابو عبد الرحمن السلمی نے لا ذلول کو نفی کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور خبر مضمر ہے اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: لاهی ذلولٌ لاهی تسقی الحرث وهی مسلمة۔ لا ذلولَ کا مطلب ہے: اسے کام نے مطیع نہ بنایا ہو۔ کہا جاتا ہے: بقرة مذللة بينة الذِل، انتہائی مطیع گائے۔ رجل ذليل بين الذِل (3)، انتہائی مطیع شخص، یعنی وہ گائے سخت ہو اس کو کام پر نہ لگایا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُثِيْرُ الْاَرْضَ یہ بھی بقرہ کی صفت کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی هی بقرة لا ذلول مثيرةٌ(4)۔ حسن نے کہا: وہ گائے وحشی تھی (5)۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ وصف بیان فرمایا لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی کھیتی کو پانی پلانے کے لئے اس کو عادی نہ بنایا گیا ہو اور نہ اس پر پانی لایا جاتا ہو۔ اس پر وقف بہتر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً　5۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: تُثِيْرُ علیحدہ فعل ہے۔ اس کا معنی ہے: زمین چیرتی ہو اور اس سے کھیتی کو پانی نہ لگایا جاتا ہو (1)۔ اس تاویل پر لَا ذَلُوْلٌ پر وقف ہوگا پہلا قول دو وجوہ سے اصح ہے۔ ایک وجہ تو وہ ہے جو نحاس نے حضرت علی بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ تُثِيْرُ کو علیحدہ کلام بنانا جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد لَا تَسْقِي الْحَرْثَ آ رہا ہے اگر یہ مستانفہ جملہ ہوتا تو واو اور لا کے ساتھ جمع نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ زمین جوتتی ہو تو پھر وہ کام کی وجہ سے مطیع ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا ذَلُوْلٌ، وہ کام پر لگانے کی وجہ سے مطیع نہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ تُثِيْرُ الْاَرْضَ عمل شمار نہ ہوتا ہو اس کے خوش ہونے اور نشاط کی وجہ سے جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا:

یھیل و یذری تربۃ و یثیرہ　　اثارۃ نباث الھواجر مخمس

وہ مٹی کو پھاڑتا ہے جس طرح گرمی میں پانچ اونٹوں والا آدمی مٹی کو چیرتا ہے تا کہ گیلی مٹی تک پہنچ جائے۔

اس صورت میں تُثِيْرُ مستانفہ ہوگا۔ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ اس پر معطوف ہوگا۔ اثارۃ الارض، مٹی کو حرکت دینا، اسے کریدنا۔ اسی سے حدیث پاک ہے: اثیروا القرآن فانہ علم الاولین والاخرین، قرآن کو کھولو (پڑھو) کیونکہ یہ پہلے اور پچھلے لوگوں کا علم ہے۔

ایک روایت میں ہے: من اراد العلم فلیثور القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ قرآن کی تلاوت کرے۔ پہلے یہ گزر چکی ہے۔ قرآن میں ہے: اَثَارُوا الْاَرْضَ یعنی انہوں نے کھیتی باڑی کے لئے زمین کو الٹ پلٹ لیا، الحرث وہ زمین جس میں کھیتی باڑی کی جائے۔

مسئلہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ حیوان کو اس کی صفات سے مقید کیا جاسکتا ہے جب اس کی صفت بیان کر دی جائے اور وہ صفات سے مقید کر دیا جائے تو اس میں بیع سلم جائز ہے۔ یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے اور امام اوزاعی، لیث اور امام شافعی کا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کی صفت بیان ہو سکتی ہے اس کی بیع سلم جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں گائے کا وصف بیان فرمایا جو تعیین کے قائم مقام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت دوسری عورت کا اپنے خاوند کے سامنے اس طرح حلیہ بیان نہ کرے حتیٰ کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے صفت کو دیکھنے کے قائم مقام رکھا ہے اور آپ ﷺ نے قتل خطا کی دیت کو اس کے ذمہ کیا ہے جس نے دیت کو ایک مدت تک بطور قرض، اپنے اوپر لیا ہے اور فوراً ادا کرنا ضروری قرار نہیں دیا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح بخاری، باب لاتباشر المرأۃ المرأۃ فتنعتھا لزوجھا، حدیث 4839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ کوفی علماء، امام ابوحنیفہ (ا) اور ان کے اصحاب، ثوری اور حسن بن صالح کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں: حیوان کی بیع سلم جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے، حیوان کی صفت کی حقیقت پر آگاہی نہیں ہوسکتی جیسے اس کا چلنا اور حرکت کرنا کیونکہ صفات کے اعتبار سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیع سلم کا حکم اور اس کی شرائط اس سورت کے آخر میں آیت الدین کے ضمن میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُسَلَّمَةٌ یعنی ھی مسلمۃ۔ اس کا وصف ہونا بھی جائز ہے یعنی وہ گائے لنگڑے پن اور تمام عیوب سے سلامت ہو۔ یہ قتادہ اور ابوالعالیہ کا قول ہے (1)۔ مسلّمۃ من العمل، عمل سے سلامت نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمل سے نفی فرمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس کے پاؤں سلامت ہوں ان میں کام کا کوئی اثر نہ ہو۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا شِيَةَ فِيهَا اس میں ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے کثیر رنگ کے مخالف ہو۔ یہ گائے ساری زرد ہو نہ اس میں سفیدی ہو نہ سرخی ہو اور نہ سیاہی ہو۔ جیسا کہ فرمایا: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا۔ شِيَةَ اصل میں وشی تھا واو کو حذف کیا گیا جیسا کہ یشی سے حذف کیا گیا اصل میں یوشی تھا۔ اس کی مثال زنۃ، عدۃ اور صلۃ ہیں۔

الشیۃ، وشی الثوب سے مشتق ہے جب کپڑا دو رنگوں پر بنا گیا ہو۔ ثورٌ موشی جس بیل کے منہ میں اور پائیوں میں سیاہی ہو۔ ابن عرفہ نے کہا: الشیۃ سے مراد رنگ ہے، چغلخور کو واش نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ وہ کلام کو تبدیل کردے اور اس میں مزید اپنی طرف سے رنگ بھر دے اور اسے مختلف اقسام پر کر دے اور اس میں سے جو چاہے مزین کر دے۔ الوشی، کا معنی کثرت بھی ہے۔ وشی بنو فلان اس کا مطلب ہے۔ وہ زیادہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فرس ابلق، کبش أخرج، تیسٌ ابرق، غراب ابقع اور ثورٌ اشیہ، ان میں ہر ایک کا معنی چتکبرا ہے، یہ اہل لغت کی نص ہے۔ (3)

گائے میں یہ اوصاف ذکر کرنا اس لئے تھا کہ انہوں نے سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی اللہ کا دین آسان ہے۔ انبیاء کرام اور علماء وغیرہ سے بغیر ضرورت سوال کرنا مذموم ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ اس گائے کے قصص میں بہت سی روایات مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ اس کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی ایک بچھڑی تھی اس نے اسے ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور کہا: اے اللہ! میں یہ بچھڑی تیری بارگاہ میں ودیعت کرتا ہوں اس بچے کے لئے۔ وہ شخص فوت ہوگیا، جب وہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے اسے کہا: وہ ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، تیرے باپ نے تیرے لئے ایک بچھڑی اللہ کی بارگاہ میں ودیعت کی تھی، تم جاؤ اور وہ لے آؤ۔ وہ لڑکا گیا۔ جب گائے نے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آ گئی حتیٰ کہ اس نے اس کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ وہ گائے وحشی بنی ہوئی تھی، اس نے اسے اپنی ماں کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بنی اسرائیل اسے راستہ میں ملے تو انہوں نے اس گائے کو اس صفت پر پایا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سودا کیا تو اس نے ان سے بہت زیادہ قیمت مانگی۔ عکرمہ کی روایت کے مطابق اس کی قیمت تین دینار تھی۔ وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: یہ شخص ہم سے بہت زیادہ قیمت مانگتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً　(ا) احناف کے نزدیک بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے

کہا: اس کی ملکیت کے بارے میں اسے راضی کرو۔ پس انہوں نے وہ گائے اس سے اس کے وزن کے مطابق خریدی۔ یہ عبیدہ کا قول ہے۔ سدی نے کہا: دس مرتبہ وزن کے ساتھ خریدی۔ بعض نے کہا: اس کی کھال دنانیر سے بھر کر دینے کے بدلے میں خریدی۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ یہ گائے آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ زمین کی گائیوں میں سے نہیں تھی۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ یعنی تو نے حق کو بیان کیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے (2)۔ اخفش نے کہا: قَالُوا الْـٰٔنَ الف وصلی کو قطعی بنایا جیسے کہا جاتا ہے: یا اللہ۔ ایک اور وجہ حکایت کی ہے: قالوا لاٰنَ۔ واو کے اثبات کے ساتھ اس کی مثال اہل مدینہ اور ابو عمرو کی قراءت ہے عادا اُلُولیٰ کوفیوں نے قالو الآن ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ کی قراءت قال لان ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ اور التقائے ساکنین کی وجہ سے واو کے حذف کے ساتھ۔ زجاج نے کہا: آن مبنی برفتحہ ہے یہ باقی تمام کلمات کے مخالف ہے جن میں الف، لام ہوتا ہے کیونکہ الف اور لام غیر عہد کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: انت الی الآن هنا اس کا معنی ہے: تو اس وقت تک یہاں ہے پس اس کو مبنی بنایا گیا ہے جس طرح ھذا کو مبنی بنایا گیا ہے اور نون کو التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ حال سے عبارت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ سیبویہ نے کادان یفعل کو عسی کی مشابہت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ یہ بحث سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ یہ خبر ہے کہ انہوں نے گائے کے ذبح میں تاخیر کی اور اللہ تعالیٰ کے امر کو جلدی پورا نہ کیا۔ قرظی محمد بن کعب نے کہا: اس کی وجہ قیمت کا مہنگا ہونا تھا۔ بعض نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خوف تھا کہ قاتل کا پتہ چل جائے گا، یہ حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے۔ (3)

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿72﴾

''اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ یہ کلام قصہ کی ابتدا پر مقدم ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: واذ قتلتم نفساً فاذارأتم فیھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح کا حکم دیتا ہے، یہ اس ارشاد کی طرح ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً ولم یجعل له عوجا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں جو ہم نے قصہ کے آغاز میں بیان کر دی ہیں۔

اس شخص کے قتل کے سبب کے متعلق دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی۔ اس نے پسند کیا کہ اس کے چچا کا بیٹا اس سے نکاح کرے لیکن چچا نے اسے منع کیا۔ پس اس نے اسے قتل کر دیا اور پھر اپنے شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر میں پھینک دیا۔ بعض نے فرمایا: دونوں شہروں کے درمیان پھینک دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس نے میراث طلب کرنے کی خاطر اسے قتل کیا۔ وہ فقیر تھا اس نے کسی خاندان پر اس کے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: بنی اسرائیل کی ایک

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسجد تھی اس کے بارہ دروازہ تھے۔ ہر دروازہ ایک قوم کے لئے تھا۔ وہ اس سے داخل ہوتے تھے۔ پس انہوں نے ایک خاندان میں ایک مقتول پایا، ہر قوم نے دوسری قوم پر دعویٰ کیا پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (البقرہ:67)

ادارأتم کا معنی ہے: تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا۔ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ تدارأتم اس کی اصل ہے تا کو دال میں ادغام کیا گیا، مدغم کے ساتھ ابتدا کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ ساکن ہوتا ہے اس لئے الف زیادہ کیا گیا...... وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَّا كُنْتُمْ یہ مُخْرِجٌ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اضافت کی وجہ سے تنوین کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَكْتُمُوْنَ یہ کان کی خبر کی جگہ ہے اس میں عائد محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: تکتمونہٗ۔

اس قول کی بنا پر کہ اس نے میراث کی خاطر قتل کیا تھا تو اس وقت جان بوجھ کر قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا تھا۔ یہ عبیدہ سانی نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس شخص نے اپنے چچا کو میراث کی خاطر قتل کیا تھا(3)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہماری شریعت میں بھی اسی طرح ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے کہ احیحہ بن الجلاح کا واقعہ اس کے چچا کے بارے میں یہی قاتل کے وارث نہ ہونے کا سبب بنا تھا۔ پھر اسلام میں یہ قانون ثابت رہا جس طرح بہت سی چیزیں زمانہ جاہلیت کی ثابت رہیں (4)۔ اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا دیت اور میراث کا وارث نہ ہوگا مگر ایک فرقہ جمہور سے جدا ہوا وہ سب بدعتی ہیں۔ اور خطاً قتل کرنے والا دوسری میراث سے وارث ہوگا، دیت سے وارث نہ ہوگا۔ یہ امام مالک، اوزاعی، ابو ثور اور امام شافعی کا قول ہے کیونکہ ایسے شخص پر تہمت نہیں ہوتی کہ اس کو میراث کے لئے قتل کیا ہے اور مال لینے کے لئے قتل کیا ہے۔ سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: امام شافعی کا بھی دوسرا قول یہی ہے عمداً اور خطاً قتل کرنے والا نہ مال سے وارث ہوگا نہ دیت سے وارث ہوگا۔ یہی قول شریح، طاؤس، شعبی اور نخعی کا ہے۔

شعبی نے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا اور خطاً قتل کرنے والا کسی چیز کا وارث نہ ہوگا۔ مجاہد سے دونوں قول مروی ہیں۔ بصریوں کے ایک طائفہ نے کہا: قتل خطا میں دیت اور باقی مال دونوں سے وارث ہوگا۔ یہ ابو عمر نے حکایت کیا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے جیسا کہ آیۃ المواریث میں اس کا بیان آئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

''تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے۔ (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو۔ اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا بعض علماء نے فرمایا: بعض سے مراد زبان ہے کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے۔ بعض نے کہا: ریڑھ کی ہڈی، کیونکہ اس سے انسان کی تخلیق مرکب کی جاتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ران ہے، بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً، زیر آیت ہذا　4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کوئی ہڈی ہے، کوئی کاٹا ہوا عضو ہے، جب اسے گائے کا کوئی ٹکڑا لگایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق خبر دی پھر مردہ ہو گیا جس طرح پہلے تھا۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قسامت کے قول کی صحت پر مقتول کے قول کا (میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے) ابن وہب اور ابن قاسم کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی اور جمہور علماء نے مقتول کے قول سے استدلال سے منع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہی صحیح ہے کیونکہ مقتول کا قول میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے یہ ایک خبر ہے جو صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مدعیٰ علیہ کا خون معصوم ہے اور اس کو مباح کرنا ممنوع ہے مگر یقین کے ساتھ اور احتمال کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہو سکتا۔ پس مقتول کے قول کا اعتبار باطل ہے۔ رہا بنی اسرائیل کا مقتول تو وہ معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے زندہ کرنے کی خبر دی تھی۔ وہ اپنے قاتل کے متعلق پختہ سچی خبر دینے کا متضمن ہے اس میں کوئی احتمال نہیں ہے۔ پس یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اس شخص کے زندہ کرنے میں معجزہ تھا۔ جب وہ زندہ ہو گیا تو اس کا کلام قبول ورد میں دوسرے لوگوں کے کلام کی طرح ہو گیا۔ یہ ایک دقیق علم کا فن ہے جس کو صرف امام مالک ہی سمجھ سکتے ہیں، قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جب وہ خبر دے گا تو اس کا صدق واجب ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہیں اس کے ساتھ قسامت کا بھی حکم دیا ہو۔ امام بخاری، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو بعید سمجھا ہے۔ انہوں نے کہا: خون کے بارے اس کا قول کیسے معتبر ہو گا حالانکہ اس کا قول ایک درہم کے بارے بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ: قسامت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ سالم، ابو قلابہ، عمر بن عبد العزیز اور حکم بن عیینہ سے اس کے حکم کے بارے میں توقف مروی ہے۔ امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قسامت کی حدیث اپنی جگہ پر ذکر نہیں کی۔ جمہور علماء نے کہا: قسامت کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے پھر اس کے حکم کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

ایک طائفہ نے کہا: پہلے دعویٰ کرنے والے قسمیں اٹھائیں گے۔ جب وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ مستحق ہو جائیں گے اگر وہ انکار کریں گے تو مدعیٰ علیہم پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور بری ہو جائیں گے۔ یہ اہل مدینہ، لیث، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس کی دلیل حویصہ اور محیصہ والی حدیث ہے۔ اس کو امام مالک وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ مدعیٰ علیہم سے پہلے قسم لی جائے گی۔ پس وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ بری ہو جائیں گے۔ حضرت عمر بن خطاب، شعبی اور نخعی سے یہی مروی ہے، ثوری اور کوفیوں نے بھی کہا ہے اور ان علماء نے شعبہ بن عبید عن بشیر بن یسار کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے مدعیٰ علیہم پہلے قسمیں اٹھائیں اور وہ یہود تھے۔ اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے ابو داؤد نے عن الزھری عن ابی سلمہ بن عبد الرحمن عن رجال من الانصار کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: اور پہلے ان سے آغاز کیا، کیا تم میں سے پچاس آدمی قسمیں اٹھائیں گے؟ انہوں نے انکار کیا۔ آپ نے پھر انصار سے فرمایا: (تم قسمیں اٹھا کر) اپنا حق طلب کرو۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم غیب پر (کیسے) قسمیں اٹھائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت یہود پر لازم فرمائی کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا تھا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ "قسم مدعیٰ علیہ پر ہے(1)"۔ پس مدعیٰ علیہ متعین کیے گئے۔ ان علماء نے فرمایا: یہ قطعی اصل ہے دعویٰ میں جس کی حکمت پر شرع نے تنبیہ فرمائی ہے "اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے متعلق دیا جاتا تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور مالوں کا دعویٰ کرتے لیکن قسم مدعیٰ علیہ پر ہے۔"

پہلے مقالہ والوں نے ان کا جواب اس طرح دیا ہے کہ سعید بن عبید کی حدیث یہود کے آغاز کرانے میں اہل حدیث کے نزدیک وہم ہے۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے فرمایا: اس روایت میں سعید کا متابع کوئی نہیں اور حضرت بشیر عن سہیل کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعین سے آغاز فرمایا۔ حضرات یحییٰ بن سعید، ابن عیینہ، حماد بن زید، عبدالوہاب الثقفی، عیسیٰ بن حماد اور بشیر بن المفضل یہ سات افراد ہیں انہوں نے اس حدیث کو مسند ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل ذکر کیا لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اسے متصل ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث سعید بن عبید کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ ابو محمد الاصیلی نے کہا: خبر واحد کے ساتھ ایک جماعت کی خبر پر معارضہ کرنا جائز نہیں اس کے ساتھ ساتھ سعید بن عبید نے اپنی حدیث میں کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے اونٹوں سے سو اونٹ اس کی دیت دی اور صدقہ دیت میں نہیں دیا جاتا اور صدقہ کے ذریعے غیر اہل سے صلح نہیں کی جاتی۔ ابوداؤد کی حدیث مرسل ہے اس کے ساتھ احادیث صحیحہ متصلہ کا معارضہ نہیں کیا جاسکتا اور اصل میں تمسک کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم خونوں کی حرمت کے لئے بنفسہ اصل ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بینہ (دلیل) کو مدعی اور قسم کو مدعیٰ علیہ پر جاری فرمایا اور اس کے ظاہر کے ساتھ حکم لگانا واجب ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے نبی کی زبان پر کسی چیز کے بارے میں حکم کو خاص کر دے تو اس خبر سے اس کی استثناء کی جائے گی۔ ان چیزوں میں کتاب اللہ جس پر دلالت کرتی ہے مقذوف کی حد، قاذف کو لازم کرنا جب اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں جو قاذف کی صداقت کی گواہی دیں۔ اس بارے میں جو اس نے مقذوف پر تہمت لگائی۔ اسی طرح جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو اسے اس سے حد کو ساقط کرنے کے ساتھ خاص فرمایا جب کہ وہ چار مرتبہ شہادت دے، اور ان دلائل میں سے جس کو سنت نے خاص کیا ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قسامت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ ابن جریج نے عطاء عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے پر گواہ پیش کرنا ہے اور قسم منکر پر ہے مگر قسامت میں (ایسا نہیں) اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے اس مسئلہ کے لئے مؤطا میں جس دلیل سے حجت پکڑی ہے اس میں کفایت ہے، وہاں غور کرو۔

مسئلہ: قسامت کے ساتھ قصاص کے وجوب میں بھی اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے اس کے ساتھ قصاص واجب کیا ہے۔ یہ امام مالک، لیث، احمد اور ابوثور کا قول ہے۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حویصہ محیصہ اور عبدالرحمٰن کو فرمایا کیا تم قسم اٹھاؤ گے اور تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے(2)۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اختلف الراھن والمرتھن فالبینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه، حدیث 2331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الموادعة والمصالحة مع المشرکین بالمال وغیرہ واثم من لم یف بالعهد، حدیث 2937، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضر بن مالک کے ایک شخص کو قسامت کی وجہ سے قتل کیا۔ دار قطنی نے کہا: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ صحیح ہے۔ اسی طرح ابو عمر بن عبد البر نے عمرو بن شعیب کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: میں نے علی بن مدینی، احمد بن حنبل، حمیدی، اسحاق بن راہویہ کو دیکھا وہ اس حدیث سے حجت پکڑتے تھے۔ دار قطنی نے "السنن" میں یہی کہا۔ ایک جماعت نے کہا: قسامت کے ساتھ قصاص نہیں ہے اس سے دیت واجب ہوتی ہے۔ یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہی نخعی اور حسن کا قول ہے۔ یہی نظریہ ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور اسحاق کا ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو امام مالک سے ابن ابی لیلیٰ بن عبد اللہ عن سہل بن ابی حثمہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تم اپنے ساتھی کی دیت دے دو یا اعلان جنگ کرو۔ ان علماء نے فرمایا: یہ دیت پر دلیل ہے نہ کہ قصاص پر اور یہ علماء فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حویصہ وغیرہ کو یہ کہنا کہ تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے مقتول کے خون کی دیت کے مستحق ہو جاؤ گے کیونکہ یہود ان کے اصحاب نہیں تھے اور جو اپنے ساتھی کی دیت کا مستحق ہوگا وہی اس کے خون کا مستحق ہوگا کیونکہ کبھی دیت قتل عمد میں لی جاتی ہے۔ پس یہ خون کا استحقاق ہوگا۔

مسئلہ: قسامت کا موجب جب اللوث ہے اس کا ہونا ضروری ہے اور اللوث سے مراد ایسی علامت ہے جو قتل کے مدعی کی سچائی کو ظن پر غالب کر دے۔ مثلاً ایک عادل آدمی کا قتل کے دیکھنے پر گواہی دینا یا مقتول اپنے خون میں لت پت دیکھا گیا اور جس پر تہمت لگائی ہے وہ اسی طرف ہے یا اس کے قریب ہے اس پر قتل کے آثار ہیں۔ اللوث، اس کے متعلق قول میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ مقتول کا قول ہے کہ میرا خون فلاں کے پاس ہے۔

ایک عادل گواہ لوث ہے۔ اسی طرح ابن القاسم کی روایت مالک سے ہے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ ایک غیر عادل شاہد اور ایک عورت کے ساتھ قسم لی جائے گی۔ ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ عورتوں کی گواہی لوث ہے۔ محمد نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی لوث ہے نہ کہ ایک عورت کی گواہی۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: اللوث میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ مذہب مشہور یہ ہے کہ وہ عادل شاہد ہے۔ محمد نے کہا: یہی میرے نزدیک محبوب ہے۔ فرمایا: ابن القاسم اور ابن عبد الحکم نے اسی کو اختیار کیا۔ عبد الملک بن مروان سے مروی ہے کہ مجروح اور مضروب جب کہے کہ میرا خون فلاں پر ہے اور پھر وہ مر جائے تو قسامت ہے۔ امام مالک اور لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک نے بنی اسرائیل کے مقتول سے حجت پکڑی ہے۔ اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا۔ امام شافعی نے فرمایا: اللوث ایک گواہ ہے یا تو وہ دلیل لائے اگرچہ وہ عادل نہ بھی ہوں۔

ثوری اور کوفیوں نے صرف مقتول کے پائے جانے کے ساتھ قسامت کو ثابت کیا ہے اور انہوں نے مقتول کے قول کی رعایت اور ایک گواہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں: جب مقتول ایک قوم کے محلہ میں پایا گیا اور اس پر قتل کا اثر بھی ہے تو

اس جگہ کے لوگ حلف اٹھائیں گے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور دیت ان (اہل محلہ) پر ہوگی اور جب اس پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا تو عاقلہ پر کچھ نہ ہوگا مگر یہ کہ کسی ایک کے خلاف بینہ (دلیل) قائم ہو جائے۔ سفیان نے کہا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ یہ ضعیف قول ہے۔ انہوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے۔ اس میں ان سے پہلے کوئی ایسا قول کرنے والا نہیں ہے۔ یہ قول قرآن وسنت کے مخالف ہے کیونکہ اس میں عاقلہ پر بغیر دلیل اور بغیر اقرار کے مال کو لازم کرتا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ ہے کہ مقتول جب کسی قوم کے محلہ میں پایا جائے تو وہ رائیگاں ہے کسی قریبی گھر والے کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ کبھی مقتول قتل کیا جاتا ہے پھر اسے کسی دوسرے قوم کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے تا کہ وہ ملوث ہو جائیں۔ پس ایسی صورت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا حتیٰ کہ وہ اسباب جو قسامت کے وجوب میں علماء نے مقرر کیے ہیں وہ پائے جائیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس میں فیصلہ کو موخر کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس میں فیصلہ فرمائے گا۔

مسئلہ: قاسم بن مسعدہ نے کہا: میں نے نسائی سے کہا امام مالک قسامت کا قول نہیں کرتے مگر لوث کے ساتھ، پھر انہوں نے قسامت کی حدیث کیوں ذکر کی ہے۔ اس میں لوث کا ذکر تو نہیں ہے۔ نسائی نے کہا: مالک نے انصار اور یہود کے درمیان جو عداوت تھی اسے لوث کے قائم مقام رکھا ہے اور لوث اور میت کے قول کو عداوت کے قائم مقام رکھا ہے۔ ابن ابی زید نے کہا: اس کی اصل بنی اسرائیل کے قصہ میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندہ فرمایا جس کو گائے کا کوئی حصہ لگایا گیا تھا اور اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا ہے اور عداوت بھی لوث (علامت) ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ہم مقتول کے قول کو لوث نہیں سمجھتے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب دو قوموں میں عداوت ظاہر ہو جیسا کہ انصار اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور مقتول کسی ایک فریق میں پایا گیا ہو اور ان کے درمیان اور کوئی قوم نہ ہو تو قسامت اس میں واجب ہوگی۔

مسئلہ: اس مقتول کے بارے میں اختلاف ہے جو اس محلہ میں پایا گیا جس کے باشندے کرائے دار ہیں۔ اصحاب الرائے نے کہا: قسامت مالکوں پر ہوگی، رہائشی لوگوں پر کچھ نہ ہوگا، اگر وہ مالکان اپنے مکانات بیچ دیں پھر کوئی مقتول پایا گیا تو دیت مشتری پر ہوگی رہنے والوں پر کچھ نہ ہوگا۔ اگر گھروں کے مالکان غائب ہوں اور انہوں نے اپنے گھر کرائے پر دے دیئے ہوں تو قسامت اور دیت غائب مالکان پر ہوگی، رہائشیوں پر کچھ نہ ہوگا جن کے درمیان وہ مقتول پایا گیا۔ پھر یعقوب نے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اس نے کہا: قسامت اور دیت گھروں میں رہنے والوں پر ہوگی۔ اس قول کو ابن ابی لیلیٰ سے حکایت کیا ہے اور انہوں نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہ اہل خیبر عمال تھے اور رہائشی تھے (مالکان نہیں تھے) وہ کام کرتے تھے۔ پس مقتول ان میں پایا گیا۔ ثوری نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ اصل مالکوں پر ہوگا۔ امام احمد نے کہا: ابن ابی لیلیٰ کا قول قسامت میں ہے نہ کہ دیت میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ سب برابر ہیں، نہ دیت ہے نہ قصاص ہے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو قائم ہو جائے یا کوئی ایسی بات پائی جائے جو قسامت کو ثابت کرے تو اولیاء قسم دیں گے۔ ابن منذر نے کہا: یہ قول اصح ہے۔

مسئلہ: قسامت میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے کیونکہ حویصہ اور محیصہ کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے ان میں سے کسی ایک پر۔'' اگر مستحق پچاس ہوں تو ان میں سے ہر ایک ایک قسم اٹھائے گا۔ اگر ان کی تعداد پچاس سے کم ہو یا ان میں سے کوئی ایسا شخص قسم اٹھانے سے انکار کرے جس کا معاف کرنا جائز نہیں تو ان کی تعداد کے مطابق ان پر قسمیں لوٹائی جائیں گی اور قتل عمد میں دو مردوں سے کم قسم نہیں اٹھائیں گے۔ مردوں میں سے ایک اور عورتیں قسم نہیں اٹھائیں گی، اولیاء قسم اٹھائیں گے اور وہ قسم اٹھائیں گے جن سے اولیاء مدد طلب کرتے ہوں گے عصبہ میں سے اور یہ پچاس قسمیں اٹھائیں گے۔

یہ امام مالک، امام لیث، امام ثوری، امام اوزاعی، امام احمد اور داؤد کا مذہب ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے ساتھ کوئی قسم نہیں اٹھائے گا اور وہی خود قسمیں اٹھائیں گے جیسا کہ اگر وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں تو پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور اپنے آپ کو قسموں کے ذریعے بری کریں گے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم نہیں اٹھائے گا مگر وارث خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطا ہو۔ مال پر قسم نہیں اٹھوائی جائے گی اور اس کا مستحق نہ ہوگا مگر جس کے لئے بذات خود مالک ہو یا ورثاء میں سے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملک بنائی ہو اور ورثاء اپنی اپنی میراث کے مطابق قسمیں اٹھائیں گے۔ یہ ابو ثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا اور یہی صحیح ہے کیونکہ جس پر دعویٰ نہیں کیا گیا اس کے لئے کوئی سبب نہیں ہے کہ اس کی طرف اس میں قسم متوجہ ہو (یعنی اس سے قسم لی جائے)۔ قسم سے مقصود دعویٰ سے برأت ہے اور جس پر دعویٰ ہی نہیں کیا گیا وہ بری ہے۔ امام مالک نے قتل خطا میں فرمایا: اس میں مردوں میں سے اور عورتوں میں سے ایک قسم لی جائے گی۔ جب پچاس قسمیں ایک سے یا زیادہ سے مکمل ہو جائیں گی تو قسم اٹھانے والا میراث کا مستحق ہوگا اور جو قسم سے انکار کرے گا وہ کسی چیز کا مستحق نہ ہوگا۔ اگر وہ آ جائے جو غائب تھا اور قسم اٹھا دے جو اس پر واجب تھی تو وہ میراث کا مستحق ہوگا۔ یہ امام مالک کا مشہور قول ہے اور امام مالک سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قتل خطا میں قسامت نہیں دیکھتے تھے۔

قسامت کے مسائل، اس کی فروع اور احکام اور اختلاف کتب فقہ میں موجود ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

مسئلہ: اس گائے کے قصہ میں دلیل ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے۔ متکلمین اور فقہاء کی ایک قوم نے اسے اختیار کیا ہے۔ کرخی نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن بکیر قاضی جو ہمارے علماء سے ہیں انہوں نے اس پر نص قائم کی ہے۔ قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہ وہ ہے جس کا تقاضا مالک کے اصول کرتے ہیں اور ان کا اختلاف ان کی کتب میں موجود ہے۔ امام شافعی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ** (انعام: 90) (ان کی ہدایت کی اقتدا کرو)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى** یعنی جس طرح اس نے اس شخص کو مرنے کے بعد زندہ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مرنے والے کو زندہ کرے گا، اس میں کاف محل نصب میں ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ **وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ** یعنی اپنی علامات اور اپنی قدرت **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی تم اس کی نافرمانی سے

رک جاؤ۔ عقلت نفسی عن کذا یعنی میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے روکا۔ المعاقل، قلعے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور کوئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ، القسوہ کا معنی صلابت، شدت اور خشکی ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی آیات کا یقین اور ان کی طرف لوٹنے سے محروم ہونا ہے (1)۔ ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہ نے کہا: اس سے مراد تمام بنی اسرائیل کے دل ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مقتول کے ورثاء کے دل مراد ہیں کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی اور پھر فوت ہو گیا تو انہوں نے اس کے قتل کا انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اس کے بعد کہ وہ اتنی بڑی نشانی دیکھ چکے تھے، پہلے کبھی ان کے دل اتنے اندھے نہ تھے اور کبھی اپنے نبی کی سخت تکذیب نہیں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے قتل کے بارے میں نافذ ہو گیا (2)۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کلام زیادہ نہ کرو کیونکہ کلام کی کثرت، اللہ کے ذکر کے بغیر دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے زیادہ دور سخت دل ہے۔ مسند البزار میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار چیزیں شقاوت (بدبختی) سے ہیں: آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی آنسو نہ آنا) دل کی سختی، لمبی امید اور دنیا کا لالچ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً بعض علماء نے فرمایا: اَوْ بمعنی واو ہے جس طرح فرمایا اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (الدہر) عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ (المرسلات) ان دونوں آیتوں میں او بمعنی واو ہے۔ شاعر نے کہا:

نال الخلافة او كانت له قدراً

اس مصرعہ میں او بمعنی واو ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: او بمعنی بل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ (الصافات)

اس کا معنی بل یزیدون ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

بدت مثل قرن الشمس في رونق الضحى و صورتها او انت في العين املح

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

اس شعر میں او بمعنی بل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی مخاطب پر ابہام کرنا ہے۔ اسی سے ابوالاسود الدؤلی کا قول ہے:

احب محمداً حبا شدیداً و عباساً و حمزة او علیاً

فان یك حبهم رشداً اصبه ولست بمخطئ ان کان غیاً (1)

میں حضرت محمد ﷺ، عباس، حمزہ اور علی سے شدید محبت کرتا ہوں، اگر ان کی محبت رشد و ہدایت ہے تو میں اسے پالوں گا اور میں خطا کرنے والا نہیں ہوں اگر وہ بہت دور بھی ہوگی۔

ابوالاسود کو کوئی شک نہیں کہ ان نفوس قدسیہ کی محبت رشد و ہدایت ہے اس نے صرف ابہام کا قصد کیا ہے۔ ابوالاسود نے جب یہ شعر کہے تو اس سے پوچھا گیا: تجھے شک ہے؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استشہاد کیا وَ اِنَّاۤ اَوْ اِیَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝ (سبا) ہم یا تم (دونوں میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا کھلی گمراہی میں ہے) ابوالاسود نے کہا: جس نے یہ خبر دی ہے (2) کیا اسے شک تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی تخییر ہے یعنی تم ان کو پتھروں کے ساتھ تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے یا پتھروں سے سخت چیز سے تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے۔ یہ اس طرح کا کلام ہے: جالس الحسن او ابن سیرین، تعلم الفقة او الحدیث او النحو (حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ۔ فقہ حاصل کر، یا حدیث، یا نحو)

بعض علماء نے فرمایا: او شک کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: اے مخاطبین! تمہاری نظر میں اگر تم ان کی قسوت کو دیکھتے تو تم شک میں مبتلا ہو جاتے کہ کیا یہ پتھروں کی مانند ہیں یا پتھروں سے سخت ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا بھی یہی معنی ہے: اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ۝ (الصافات) ایک گروہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مراد لیا ہے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کے دل پتھر کی مانند ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو گروہ ہیں (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَشَدُّ، اَشَدُّ، كَالْحِجَارَةِ میں کاف کی جگہ پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ پتھر کی مثل ہیں یا اس سے زیادہ سخت اور حجارة پر عطف کی وجہ سے اشدّ پر فتحہ جائز ہے اور قسوة، تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ ابوحیوہ نے قساوة پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ، الانفجار کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یَشَّقَّقُ اصل میں یتشقق ہے تاء کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ ان چشموں سے عبارت ہے جو اتنے بڑے نہ ہوں کہ وہ نہریں بن جائیں۔ یا پتھروں سے عبارت ہے جو پھٹ جاتے ہیں اگرچہ ان میں وسیع پانی جاری نہ ہو۔ ابن مصرف نے ینشقق (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں جگہ لما یتفجر اور لما یتشقق میں لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قراءت قابل توجہ نہیں ہے۔ مالک بن دینار نے ینفجر نون اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے کہا: پتھر نے عذر پیش کیا اور بنی آدم میں سے شقی لوگوں نے عذر پیش نہ کیا(1)۔ ابو حاتم نے کہا: لما یتفجر تاء کے ساتھ بھی جائز ہے اور لما تتشقق تاء کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ جب کہا: تتفجر تو الانہار کی تانیث کی وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا لیکن تشقق میں ایسی صورت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جو ابو حاتم نے انکار کیا ہے معنی کے اعتبار سے وہ جائز ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: وان منها لحجارة تتشقق۔ اور یشقق کو لفظ ما کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ الشق کی جمع الشقوق ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے۔ تو کہتا ہے: بيد فلان و رجليه شقوق۔ فلاں کے ہاتھوں اور پاؤں میں دراڑیں ہیں۔ تو شقاق نہ کہہ کیونکہ الشقاق ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لاحق ہوتی ہے وہ پھٹن ہے۔ یہ جانوروں کی کلائیوں کو لاحق ہوتی ہے اور کبھی ان کی پنڈلیوں اور ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یعقوب سے مروی ہے، الشق سے مراد الصبح بھی ہے اور لما یتفجر میں ما محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اِنّ کا اسم ہے اور لام تاکید کے لئے ہے۔ منہ لفظ ما کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے منها بھی جائز ہے۔ اسی طرح وان منها لما يشقق فيخرج منه الماء ہے۔ قتادہ نے اِنْ کو دونوں جگہ مخففه من مثقله پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یعنی پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جو تمہارے دلوں سے زیادہ نفع مند ہیں کیونکہ ان سے پانی نکلتا ہے وہ خشیت سے گر پڑتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: جو پتھر پہاڑ کی چوٹی سے گرتا ہے، جو نہر پتھر سے پھوٹتی ہے اور اس سے جو پانی نکلتا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی کے متعلق قرآن نازل ہوا۔ اسی کی مثل ابن جریج سے مروی ہے(2)۔ بعض متکلمین نے وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کے تحت فرمایا: کہ اس سے مراد وہ اولے ہیں جو بادل سے گرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ھبوط (گرنا) یہ مجاز ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ پتھروں کی تخلیق سے دل عبرت حاصل کرتے ہیں ان کی طرف دیکھ کر دلوں میں تواضع پیدا ہوتی ہے۔ تو دیکھنے والے کی تواضع کو ان پتھروں کی طرف مضاف کیا گیا۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ناقة تاجرة۔ یعنی ایسی اونٹنی جو بیچی جاتی ہے جو اسے دیکھے گا خریدنے کے لئے(3)۔ طبری نے ایک گروہ سے حکایت کیا ہے کہ پتھروں کے لئے خشیت یہ استعارہ ہے جیسے يريد ان ينقض میں دیوار کے لئے استعارہ ہے۔ اسی طرح زید الخیل نے کہا:

لما اتى خبر الزبير تواضعت　　سور المدينة والجبال الخشع

جب حضرت زبیر کی خبر پہنچی تو مدینہ کی دیواریں اور پہاڑ جھک گئے۔

ابن بحر نے ذکر کیا ہے کہ اِنَّ مِنْهَا میں ضمیر دلوں کی طرف راجع ہے نہ کہ پتھروں کی طرف یعنی دلوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو خشیت الٰہی کی وجہ سے جھک جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ تاویلات کی گئی ہیں لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے، پہلا قول صحیح ہے یہ کوئی ممتنع نہیں ہے کہ بعض جمادات کو معرفت عطا کی جائے اور وہ سمجھ جائیں۔ جیسے اس کھجور کے خشک تنے کی روایت ہے جس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دینے کے لئے ٹیک لگاتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے دور ہٹ گئے تو وہ رونے لگ گیا(1)۔ اور یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک پتھر جو مجھ پر زمانہ جاہلیت میں سلام کرتا تھا میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (☆)۔ اسی طرح روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثبیر پہاڑ نے مجھے کہا: اتر جائیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو میری پشت پر قتل کر دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے گا (☆☆)۔ غار حرا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا دی تھی یا رسول اللہ! میری طرف تشریف لے آئیں۔ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (احزاب: 72) (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے) اور فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر: 21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) اس کا مزید بیان سورۂ سبحان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اہل حجاز کی لغت پر بغافل محل نصب میں ہے اور تمیم کی لغت پر محل رفع میں ہے اور باتاکید کے لئے ہے عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی تمہارے عمل سے وہ غافل نہیں ہے ہر چھوٹا بڑا جو بھی سرزد ہوتا ہے اسے وہ تم پر شمار کرے گا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزلۃ) (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا) اس میں ما، عائد کا محتاج نہیں مگر یہ کہ اسے الذی کے معنی میں کیا جائے۔ اسم کے طول کی وجہ سے عائد کو حذف کیا گیا ہے یعنی من الذی تعملونہ۔ ابن کثیر نے یعملون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوگا۔ (2)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"(اے مسلمانو!) کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ یہ استفہام ہے اس میں انکار کا معنی ہے۔ گویا مومنوں کو یہود کے اس ٹولہ کے ایمان سے مایوس کرنا ہے یعنی اگر انہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لئے اس میں پہلے مثال موجود ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انصار یہود کے اسلام قبول کرنے کے حریص تھے کیونکہ ان کے درمیان حلف اور معاہدہ تھا(3)۔ بعض نے فرمایا: خطاب صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، یعنی آپ پریشان نہ ہوں اس پر کہ وہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو بتا دیا کہ یہ ان برے

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3318، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً مسند امام احمد، حدیث نمبر 5886

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً ☆ تفسیر بغوی زیر آیت ہذہ ☆☆ ثبیر مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑ ہے۔

لوگوں میں سے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ ان محل نصب میں ہے یعنی فی ان یومنوا۔ یومنوا اَنْ کے ساتھ منصوب ہے۔ اسی وجہ سے نون کو اس سے حذف کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے: طمع فیه طَمَعاً و طماعیة (مخفف) فهو طَمِعٌ، بروزن فعِلٌ۔ اطمعه فیه غیره، تعجب میں کہا جاتا ہے: طمُع الرجل میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ زیادہ لالچ والا ہو گیا۔ الطمع لشکر کی خوراک کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرهم الامیر باطماعهم یعنی امیر نے لشکر کے رزق کا حکم دیا امرأة مطماع ایسی عورت جو لالچ کرتی ہے لیکن غلبہ نہیں پاتی۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ۔ الفرق اسم جمع ہے لفظاً اس کا واحد نہیں ہے اور اس کی جمع قلت افرقةٌ اور جمع کثرت افرقاء ہے۔ یَسْمَعُوْنَ، کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر مِّنْهُمْ ہو اور یَسْمَعُوْنَ فریق کی صفت ہو۔ اس میں بُعد ہے۔

كَلٰمَ اللّٰهِ۔ یہ جماعت کی قراءت ہے۔ اعمش نے كَلِمَ الله پڑھا ہے یعنی کلمه کی جمع (1)۔ سیبویہ نے کہا: میں جانتا ہوں کہ ربیعہ کے کچھ لوگ منهم کو میم کے کسرہ کی اتباع میں هاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک درمیان میں ساکن اس اتباع سے روکنے والا نہیں۔

كَلٰمَ اللّٰهِ، یَسْمَعُوْنَ کا مفعول ہے اور اس سے مراد ستر افراد ہیں جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چنا تھا۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی نہ کی۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی باتوں کو بدل ڈالا۔ یہ ربیع اور ابن اسحاق کا قول ہے اور اس قول میں ضعف ہے (2)۔ اور جنہوں نے کہا کہ ستر آدمیوں نے وہ سنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا۔ اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اور کلام کرنے کے ساتھ ان کی خصوصیت کو ختم کر دیا ہے (3)۔ سدی وغیرہ نے کہا: وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ان کے اذہان مختلط ہو گئے۔ انہوں نے امید رکھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام سنیں گے اور وہ ان کے لئے لوٹائیں گے۔ جب وہ فارغ ہوئے اور باہر نکلے تو ایک گروہ نے اللہ کے کلام کو بدل ڈالا جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (توبہ: 6) (اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تا کہ وہ سنے اللہ کا کلام)

اگر یہ کہا جائے کہ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ انہیں اپنا کلام سنائے۔ پس انہوں نے برق کی آواز کی طرح آواز سنی انی انا الله لا اله الا الله الحی القیوم اخرجتکم من مصر بید رفیعة و ذراع شدیدۃ، میں اللہ ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو حی، قیوم ہے میں نے تمہیں مصر سے نکالا بلند ہاتھوں اور سخت بازوؤں کے ساتھ۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن مروان نے کلبی سے روایت کی ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں قابل

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

حجت نہیں ہے۔ تمام اولادِ آدم سے کلام کے ساتھ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص کیا گیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کلام کی ہے اور انہیں بھی اپنا کلام سنایا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان پر فضیلت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا فرمانا حق ہے۔ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ (اعراف:144) یہ زیادہ واضح قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کیسے پہچانا جبکہ انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا خطاب نہیں سنا تھا بعض علماء نے فرمایا آپ نے کلام سنا جس میں حروف اور آوازیں نہ تھیں اور نہ اس میں تقطیع تھی نہ نفس۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کلام سنا جو کسی جہت سے نہیں تھا، اور انسان کا کلام تو چھ جہتوں میں سے کسی جہت سے سنا جاتا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ کا پورا جسم قوت سماعت بن گیا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ آپ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: معجزہ نے دلالت کی کہ جو انہوں نے سنا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا: اپنا عصا ڈالو تو انہوں نے عصا ڈال دیا وہ بہت بڑا سانپ بن گیا تو یہ صدقِ حال پر ان کے لئے علامت تھا۔ اور وہ جس نے انہیں کہا انی انا ربك وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے اپنے دل میں کوئی بات چھپائی ہوئی تھی جس پر صرف علام الغیوب ہی واقف ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب میں اس پوشیدہ بات کی خبر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے جو اس سے مخاطب ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مزید بیان سورہ القصص میں نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص:30) کے تحت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مجاہد اور سدی نے کہا: اس سے مراد یہود کے علماء ہیں جو تورات میں تحریف کرتے تھے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتے تھے اپنی خواہشات کے مطابق (1)۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی پہچاننے اور جاننے کے بعد۔ یہ ان کو توبیخ ہے یعنی یہ یہود، ان کے آباء و اجداد برائی اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے گزر گئے یہ ان کے طریقوں پر ہیں پھر تم کیسے ان کے ایمان کی طمع کرتے ہو۔

یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ حق جاننے والا معاند، ہدایت سے دور ہوتا ہے کیونکہ وہ وعدہ اور وعید کو جان چکا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے یہ علم اپنے عناد سے نہیں روکتا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ۝

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر، یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ لَقُوا کی اصل لَقِیُوا ہے پہلے یہ گزر چکا ہے۔ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ یہ آیت یہود کے بارے میں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر منافقت کی تھی وہ مومنین کو بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے آباء واجداد کو عذاب دیا گیا تھا۔ یہود نے انہیں کہا: اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ یعنی تم پر اللہ تعالیٰ نے جو عذاب کا فیصلہ فرمایا تا کہ وہ کہیں کہ ہم تم سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر کی جنگ کے موقع پر قریظہ کے پاس گئے تو آپ نے سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بک رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ انہیں تبلیغ نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا: میں گمان کرتا ہوں تو نے ان سے میری گستاخی سنی ہے، اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے تو رک جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے پاس گئے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے بندروں اور خنازیر کی اولاد! تم نے عہد توڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔ انہوں نے کہا: آپ جاہل نہیں تھے اور ہم پر جہالت کا اظہار نہ کریں۔ یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ یہ خبر ہماری طرف سے نکلی ہے یہ معنی مجاہد سے بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَا، خَلَا اصل میں خَلَوَ تھا واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے واو الف سے بدل گئی۔ خلاء کا معنی سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ فتح کا معنی حکم (فیصلہ کرنا) اور عربوں کے ہاں الفتح کا لفظ القضاء اور الحکم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (اعراف) اس آیت میں فاتحین کا معنی حاکمین (فیصلہ کرنے والے) ہے۔ میرے اور تیرے درمیان قاضی ہے۔ قاضی کو فتاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتا ہے۔ الفتح کا معنی مدد کرنا ہی ہے۔ اسی سے ہے: یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (البقرہ: 89) وہ کافروں کے خلاف مدد طلب کرتے تھے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ (انفال: 19) چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیُحَآجُّوْكُمْ لام کی کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر تو چاہے تو اَنْ کے اضمار کے ساتھ نصب دے نصب کی علامت نون کا حذف ہے۔ یونس نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ لام کی کو فتحہ دیتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کیونکہ فتحہ اصل

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

ہے۔ خلف الاحمر نے کہا: یہ بنی العنبر کی لغت ہے۔ لیحاجوکم کا معنی لیعیروکم ہے (وہ تمہیں عار دلائیں گے) وہ کہیں گے ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ معزز ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تم پر تمہارے قول سے حجت پکڑیں گے وہ کہیں گے تم نے اس کا انکار کیا اس کی سچائی پر واقفیت کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا: یہود کا ایک شخص اپنے مسلمان دوست کو یہ تلقین کرتا تھا کہ تم دین محمد ﷺ کو مضبوطی سے پکڑے رکھو کیونکہ وہ سچا نبی ہے: عِنْدَ رَبِّكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یعنی آخرت میں۔ جیسا کہ فرمایا: ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (الزمر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عند ذکر ربکم، بعض نے فرمایا: عند بمعنی فی ہے یعنی وہ تم سے تمہارے رب کے بارے میں جھگڑیں گے۔ پس وہ تم سے زیادہ حقدار ہو جائیں گے تم پر اپنی حجت کے ظہور کی وجہ سے۔ حسن سے مروی ہے، الحجة مطلق سیدھی کلام کو کہتے ہیں۔ اسی سے محجة الطریق ہے (یعنی راستہ کا درمیان) حاججت فلاناً فحججته۔ میں نے فلاں سے جھگڑا کیا اور حجت کے ساتھ میں اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے حدیث میں ہے: فحج آدم موسیٰ (1)۔ حضرت آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ غالب آ گئے: أَفَلَا تَعْقِلُونَ بعض علماء نے فرمایا: یہ احبار (علماء) کا اپنے پیروکاروں کو کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ یعنی تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بنی اسرائیل ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وہ ان احوال میں ہیں (2) پھر انہیں توبیخ فرمائی۔ أَوَلَا يَعْلَمُونَ یہ استفہام، توبیخ و تقریع کے معنی میں ہے۔ جمہور علماء نے يَعْلَمُونَ یا کے ساتھ پڑھا ہے، ابن محیصن نے تا کے ساتھ پڑھا ہے مومنین کو خطاب ہے وہ جو انہوں نے اپنا کفر چھپا رکھا تھا اور وہ جو انہوں نے اعلانیہ انکار کیا تھا۔ (3)

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ

''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے اور وہ تو محض وہم و گمان ہی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ یعنی یہود میں سے۔ بعض نے فرمایا: یہود اور منافقین میں سے جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ امیون کا واحد امی ہے۔ یہ الامة الامیة کی منسوب ہے یعنی جو امت اپنی ماؤں کی ولادت کی اصل پر ہوتے ہوئے لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: انا امة امية لا نكتب ولا نحسب (4)۔ ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں نہ حساب لگاتے ہیں۔ انہیں امیون کہا گیا کیونکہ انہوں نے ام الکتاب کی تصدیق نہیں کی یہ حضرت ابن

1۔ صحیح بخاری، باب واصطفعتک لنفسی، حدیث نمبر 4367، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوۃ والسلام لا نکتب ولا، حدیث 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے مروی ہے(1)۔ حضرت ابوعبیدہ نے کہا: انہیں امیون کہا گیا کیونکہ کتاب کا نزول ان پر ہوا تھا گویا وہ ام الکتاب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ گویا فرمایا: ومنهم اهل الكتاب لا يعلمون الكتاب۔ ان میں سے اہل کتاب جو کتاب کو نہیں جانتے۔ عکرمہ اور ضحاک نے کہا یہ عرب کے نصاریٰ ہیں بعض نے فرمایا: یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ ان کی کتاب ان کے گناہوں کی وجہ سے اٹھالی گئی پس وہ امیین بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مجوسی ہیں۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اظہر ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ یہاں اِلَّا بمعنی لکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی)۔ نابغہ نے کہا:

حلفت يميناً غير ذي مثنوية ولا علم الا حسن ظن بصاحب

میں نے قسم اٹھائی جس میں استثناء نہیں اور علم نہیں تھا مگر ساتھی پر حسن ظن کی۔

ابوجعفر، شیبہ اور اعرج نے اِلَّا امانِ یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ایک یاء کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا۔ ابوحاتم نے کہا: ہر لفظ جو اس طرح ہو کہ ایک مشدد ہو تو اس میں تشدید و تخفیف جائز ہے جیسے اثافی، اغانی، امانی وغیرہ۔ اخفش نے کہا: یہ اس طرح ہے جیسے مفتاح کی جمع میں کہا جاتا ہے: مفاتیح، و مفاتح۔ یہ جمع کی یاء ہے۔ نحاس نے کہا: معتل میں حذف اکثر ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وهل يرجع التسليم او يكشف العمى ثلاث الاثاني والرسوم البلاقع

کیا تین چیزیں تسلیم کو لوٹاتی ہیں یا اندھے پن کو کھولتی ہیں، چولہے کے پتھر، بقیہ بنیادیں جو کھنڈر بن چکی ہیں۔

الامانی، یہ امنیۃ کی جمع ہے اس کا معنی تلاوت ہے اصل میں امنویۃ، افعولۃ کے وزن پر تھا واو کو یا میں ادغام کیا گیا یا کی وجہ سے نون کو کسرہ دیا گیا ہے تو امنیۃ بن گیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج: 52) یعنی جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان ڈالتا ہے۔ کعب بن مالک نے کہا تھا:

تمنى كتاب الله اول ليلة واخره لاقى حمام المقادر

اس نے رات کے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ میں تلاوت کی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تمنى كتاب الله اخر ليلة تمنى داؤد الزبور على رسل

اس نے رات کے آخری حصہ میں کتاب اللہ کی تلاوت کی جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور کی تلاوت آہستہ آہستہ کی۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الامانی کا معنی جھوٹ بھی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ما تمنیت منذ اسلمت(1)، جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ کسی عربی نے ابن دأب کو کہا تھا جب وہ بیان کر رہا تھا: أھذا شئ رَویتَہٗ ام شیء تمنیتہٗ۔ کیا یہ وہ چیز ہے جو تم نے کسی سے روایت کی ہے یا تو نے خود گھڑی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے الامانی کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے(2)۔ الامانی ہر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کی انسان تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ قتادہ نے کہا: الا امانی یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر ایسی تمنا کرتے ہیں جو ان کے لئے نہیں ہے(3)۔ بعض نے فرمایا: الامانی کا معنی التقدیر ہے کہا جاتا ہے: مُنِیَ لہ یعنی اس کے لئے مقدر کیا گیا۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ ابن بحر نے یہ حکایت کیا ہے۔ شاعر کا قول بیان کیا ہے:

لا تامنن وان امسیت فی حرم　　حتی تلاق ما یمنی لک المانی

تو امن میں نہ ہو اگرچہ تو شام حرم میں گزارے حتیٰ کہ تو وہ پالے جو تقدیر بنانے والے نے تیری تقدیر میں لکھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ، ان بمعنی ما نافیہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۝ (الملک) اس آیت میں اِن، ما نافیہ کے معنی میں ہے اور یَظُنُّوْنَ کا معنی ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ انہیں اس چیز کی صحت کا علم ہی نہیں ہے جو وہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے علماء کے مقلد ہیں اس میں جو وہ پڑھتے ہیں۔

ابوبکر انباری نے کہا: ہمیں احمد بن یحییٰ النحوی نے بتایا کہ عرب ظن کو علم، شک اور کذب کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: جب علم کے دلائل قائم ہو جائیں اور وہ شک کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن یقین ہوگا، اور جب یقین کے دلائل اور شک کے دلائل برابر ہوں تو ظن شک ہوگا۔ جب شک کے دلائل یقین کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن کذب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے علماء یہود کے بارے میں بتایا کہ وہ تحریف کرتے ہیں اور تبدیلی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ الآیہ (البقرہ:79) (سو ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے)

جب معاملہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اور علماء کی رعیت بری ہو گئی اور وہ دنیا پر حرص و لالچ کرنے لگے اور انہوں نے ایسی چیزیں طلب کیں جو لوگوں کے رخ ان کی طرف پھیر دیں تو انہوں نے اپنی شریعت میں بدعتوں کو نکالا اور شریعت کو بدل ڈالا۔ پھر انہیں تورات کے ساتھ لاحق کر دیا۔ اپنے بیوقوف لوگوں کو کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ ان کی طرف سے یہ قبول کر لیں اور ان کی ریاست مستحکم ہو جائے اور اس کے ذریعے وہ دنیا کا مال و متاع حاصل کریں اور جو کچھ انہوں نے اختراع کیا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ انہوں نے کہا پس لیس علینا فی الامیین سبیل وھم العرب یعنی ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی گرفت نہیں ہے اور وہ عرب ہیں یعنی جو کچھ ہم ان کے مال سے لے لیں وہ ہمارے لئے حلال ہے اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، باب کراہیۃ مس الذکر بالیمین والاستنجاء بالیمین، حدیث نمبر 306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

اختراع میں سے یہ بھی تھا کہ انہوں نے لا یضرنا ذنب فنحن احباء ہ و ابناء ہ۔ ہمیں کوئی گناہ مضر نہیں ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نازیبا بات سے بلند ہے۔

تورات میں تھا: یا احباری و یا ابناء رسلی۔ (اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد) تو انہوں نے اسے بدل ڈالا اور یہ لکھا: یا احبائی و یا ابنائی (یعنی اے میرے محبوبو! اے میرے بیٹو!) اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کو نازل فرمایا: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ:18)

یہود نے کہا: ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دے گا۔ اگر وہ عذاب دے گا تو چالیس دن عذاب دے گا جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) (اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے دن۔ آپ فرمایئے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ۔)

ابن مقسم نے کہا: عَهْدًا سے مراد توحید ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم:87) اس آیت میں عَهْدًا سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ) تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا اور فرمایا: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ) ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ دوزخ اور جنت میں خلود کفر اور ایمان کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس اعتبار سے جو انہوں نے کہا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

''پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے۔ پھر کہتے ہیں: یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کر لیں اس کے عوض تھوڑے سے دام۔ سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: فَوَيْلٌ، ویل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ آگ کا پہاڑ ہے(1)۔ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے کہ ویل دو پہاڑوں کے

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

درمیان جہنم میں ایک وادی ہے جس میں گرنے والا چالیس سال گرتا جائے گا۔(1)

سفیان اور عطا بن یسار سے مروی ہے کہ اس آیت میں ویل سے مراد ایک وادی ہے جو جہنم کے فنا میں ہے اس میں دوزخیوں کی پیپ چلتی ہے(2)۔ بعض نے فرمایا: جہنم میں ایک حوض ہے۔ الزہراوی نے دوسروں سے حکایت کیا ہے کہ یہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے(3)، الویل، عذاب کی تکلیف ہے۔ خلیل نے کہا: اس تکلیف کی شدت ہے۔ اصمعی نے کہا: ویل سے مراد افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ اور الویح سے مراد رحم کا اظہار کرنا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جو ہلاکت میں واقع ہو اس کے لئے ویل اور جو ہلاکت کے قریب ہو اس کے لئے ویح استعمال ہوتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ویل سے مراد غم ہے۔ کہا جاتا ہے: تویل الرجل جب وہ ویل پکارے یہ غم اور مصیبت کے وقت کہا جاتا ہے۔ اس سے ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل ہلاکت ہے ہر وہ شخص جو ہلاکت میں واقع ہوا ہو وہ ویل کو پکارتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ (الکہف:49) ویل اور ویلہ دونوں کا معنی ہلاکت ہے اس کی جمع ویلات ہے۔ شاعر نے کہا:

له الويل ان امسى ولا ام هاشم

ایک اور نے کہا:

فقالت لك الويلات انك مرجلي

ویل پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کو مبتدا بنانا جائز ہے اگرچہ نکرہ ہے کیونکہ اس میں دعا کا معنی ہے۔ اخفش نے کہا: فعل کے اضمار کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی الزمهم الله ويلاً۔ فراء نے کہا: الویل اصل میں وَیْ تھا یعنی غم۔ جیسے تو کہتا ہے: وی لفلان یعنی فلاں کے لئے غم۔ عربوں نے اس کے ساتھ لام ملا دیا اور پھر اس سے اسے مقدر کیا اور اسے اعراب دیا۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ جب یہ مضاف نہ ہو تو اس پر رفع ہو کیونکہ یہ وقوع کا تقاضا کرتی ہے اور دعا کے معنی پر نصب بھی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

خلیل نے کہا: صرف ان الفاظ کا مبنی ہونا سنا گیا ہے: ویح و ویس و ویہ و ویک و ویل و ویب۔ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں، بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ یہ مصادر ہیں ان کو عرب فعل کے ساتھ نہیں بولتے۔ الجرمی نے کہا: اور ان کلمات میں سے جن کو نصب مصادر کی نصب کی طرح دی جاتی ہے وہ ویلہ، عولہ، ویحہ اور ویسہ ہیں جب ان کے ساتھ لام کو داخل کرے گا تو تو رفع دے گا اور کہے گا: ویلٌ لہ، وویحٌ لہ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ کتابت معروف ہے اور سب سے پہلے جس نے قلم کے ساتھ لکھا اور قلم کے ساتھ تحریر لکھی وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے اور یہ بات حضرت ابوذر کی حدیث میں آئی ہے جسے الآجری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو کتابت کا فن دیا گیا تو وہ آپ کی اولاد میں وراثت ہو گیا۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَيْدِيْهِمْ یہ تاکید ہے کیونکہ یہ معلوم شدہ ہے کہ کتابت (لکھائی) ہمیشہ ہاتھ کے ساتھ ہوتی ہے یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام: 38) اس آیت میں جناح کا ذکر تاکید کے لئے ہے کیونکہ پرندہ اڑتا ہی پروں کے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ویقولون بافواههم۔ وہ اپنے مونہوں سے بولتے ہیں تو بولنا تو ہوتا ہی منہ کے ساتھ ہے اس لئے یہاں افواههم تاکید کے لئے ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بِاَيْدِيْهِمْ ان کے جرم کے بیان کے لئے ہے اور ان کے اعلانیہ یہ کام کرنے کے اثبات کے لئے ہے جو خود کسی کام کو شدت سے سرانجام دیتا ہے وہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جس کے وہ کام سپرد نہ ہوا گرچہ اس کی رائے موجود ہو۔ ابن سراج نے کہا بِاَيْدِيْهِمْ یہ کنایہ ہے کہ یہ ان کی اپنی طرف سے تھا ان پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ ہاتھوں کے لکھنے میں حقیقت نہ تھی۔ (1)

مسئلہ نمبر 4: اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت میں تبدیلی تغییر اور شرع میں زیادتی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ پس جس نے اللہ کے دین میں کوئی بدعت نکالی، کوئی ایسی تبدیلی کی جو دین میں سے نہیں ہے اور دین میں وہ جائز نہ ہو تو وہ اس سخت وعید اور عذاب الیم میں داخل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ڈرایا جب آپ نے آخر زمانہ میں جو ہونے والا ہے، اسے جان لیا..... فرمایا: خبردار! تم میں سے اہل کتاب بہتر ملتوں میں جدا جدا ہوئے اور یہ امت تہتر ملتوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک کے سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے ..... اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو قرآن وسنت اور اصحاب کی سنت کے مخالف ہوگی تو وہ لوگوں کو اس کے ساتھ گمراہ کریں گے۔ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا تھا وہ واقع ہوا اور عام ہوا۔ پھیلا اور کثرت سے پھیلا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو قلت کی صفت سے بیان فرمایا جو وہ لیتے تھے۔ اس لئے کہ یا تو وہ فنا ہونے والی تھی اور اس کو ثبات نہیں تھا یا وہ حرام تھی کیونکہ حرام میں بھی برکت نہیں ہوتی اور وہ اللہ کی بارگاہ میں نہیں بڑھتا۔ ابن اسحاق اور کلبی نے کہا: تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت ذکر تھی ربعة اسمر (درمیانہ قد اور گندمی رنگ) اور انہوں نے اسے آدم سبطاً طویلاً کے الفاظ سے بدل ڈالا یعنی گندمی سیدھے بالوں والا لمبے قد والا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور متبعین کو کہتے: اس نبی کی صفت دیکھو جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا۔ اس کی صفت تو اس کے مشابہ نہیں ہے۔ یہود کے مشائخ اور علماء کے لئے ریاست اور کمائی تھی۔ پس انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر وہ صحیح صحیح بیان کریں گے تو ان کے کھانے بند ہو جائیں گے اور ریاست چلی جائے گی اس وجہ سے انہوں نے تحریف کی۔ (2)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۝ بعض علماء نے فرمایا: مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ سے مراد ان کے کھانے ہیں۔ بعض نے فرمایا: گناہ ہیں اور ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے ویل کو دوبارہ ذکر کیا۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

"اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے چند دن۔ آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے الله سے کوئی وعدہ، تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا الله اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو الله پر جو تم جانتے ہی نہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا یعنی یہود نے کہا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً اس کے نزول کے سبب میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے پوچھا: دوزخی کون ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم۔ پھر تم ہمارے پیچھے آؤ گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ پس اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو یہود کہتے تھے: یہ دنیا سات ہزار (سال) ہے۔ لوگوں کو دنیا کے ہر ہزار سال کے لئے آخرت کے دنوں میں سے ایک دن آگ میں عذاب دیا جائے گا یہ کل سات دن ہوں گے۔ الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یہ مجاہد کا قول ہے (2)۔ ایک طائفہ نے کہا: یہود نے کہا: تورات میں ہے کہ جہنم کی مسافت چالیس سال ہے وہ ہر روز ایک سال کی مسافت طے کریں گے حتیٰ کہ اس مسافت کو مکمل کرلیں گے تو جہنم ختم ہو جائے گی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا کہ انہوں نے تورات میں یہ لکھا ہوا پایا ہے کہ جہنم کے دونوں کناروں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے یہاں تک کہ لوگ زقوم کے درخت تک پہنچیں گے اور یہود نے کہا: ہمیں عذاب دیا جائے گا حتیٰ کہ ہم زقوم کے درخت تک پہنچیں گے پھر جہنم ختم ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ سے بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا: الله تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ انہیں چالیس دن آگ میں داخل کرے گا جتنے دن انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ پس الله تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا (4) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا رد ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد دعی الصلوۃ ایام اقرائك (5) (تو اپنے حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ دے) سے استدلال کیا ہے کہ حیض کی مدت اتنی ہے جس کو ایام حیض کہا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن (☆)۔ احناف کہتے ہیں: جو تین دن سے کم ہو اسے یوما اور یومین سے تعبیر کیا جاتا ہے جو دس سے زائد ہو اسے احد عشر یوما کہا جاتا ہے اس میں ایام نہیں کہا جاتا تین سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اذا غدر المشرکون بالمسلمین هل یعفی عنهم، حدیث 2933، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

5۔ صحیح بخاری، باب الاستحاضہ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ دقت نظر سے دیکھا جائے تو احناف کے نقطہ نظر کا کوئی رد نہیں بلکہ احناف کا استدلال قوی ہے ممیز اور تمیز میں یہی ملحوظ ہوتا ہے جو احناف نے ذکر کیا ہے۔

دس تک کے اسمائے اعداد کے ساتھ ایام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 196) پھر تین دنوں کے روزے حج میں تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ (ہود: 65) تم لطف اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن۔ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ (الحاقہ: 7) (مسلط کر دیا اسے ان پر سات راتیں)۔ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ: 7) (آٹھ دن جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی) تو احناف کو کہا جائے گا اللہ تعالیٰ نے روزے کے بارے میں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا اس سے پورا مہینہ مراد ہے۔ اور فرمایا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ: 80) اس اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد چالیس دن ہیں اور جب ایام کسی عارض کی طرف مضاف ہوں تو اس سے تعداد کی تحدید مراد نہیں ہوتی بلکہ کہا جاتا ہے: ایام مشیك و سفرك و اقامتك۔ اگرچہ تیس اور بیس دن بھی ہوں، جو عدد تو چاہے مراد لے سکتا ہے۔ شاید وہ مراد لیا جو عورت کے لئے معتاد تھا اور عورت کی عادت چھ دن یا سات دن ہوتی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اس کے مطابق فرمایا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ، اتخذ کے بارے میں کلام گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا کیا تم نے پہلے نیک عمل کیا ہے تم ایمان لائے تم نے اطاعت کی کہ تم آگ سے نکلنے کے مستحق ہو۔ یا تم نے اس کی وحی سے پہچانا ہے جس میں اس نے تم سے عہد کیا ہے۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ توبیخ اور تقریع ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلٰى یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے ذکر کیا ہے۔

سیبویہ نے کہا بَلٰى اور نعم اسم نہیں ہیں۔ یہ بل وغیرہ کی طرح دونوں حرف ہیں۔ یہ ان کے قول لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کا رد ہے۔ کوفیوں نے کہا: اس کی اصل بل ہے جس کا معنی پہلی کلام سے اضراب ہوتا ہے۔ اس پر یا کا اضافہ کیا گیا ہے تا کہ وقف عمدہ ہو جائے یا ایجاب اور انعام کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (1)۔ پس بل انکار کے رد پر دلالت کرتا ہے اور یا مابعد کے ایجاب پر دلالت کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر کوئی کہے: الم تاخذ دینارا؟ (کیا تو نے دینار نہیں لیا؟) تو کہے گا: نعم تو معنی لا ہوگا یعنی میں نے نہیں لیا کیونکہ تو نے نفی کو ثابت کیا اور جب تو کہے: بَلٰى تو معنی ہوگا میں نے دینار لیا۔ فراء نے کہا: جب کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے: مالك علی شئ؟ (تیرے لئے مجھ پر کچھ نہیں ہے) دوسرا کہے: نعم تو یہ تصدیق ہوگی اس کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لئے اس پر کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کہے: بَلٰی تو یہ اس کے قول کا رد ہوگا۔ تقدیر یوں ہوگی: بلی لی علیک (کیوں نہیں میرے لئے تجھ پر ہے) قرآن میں ہے: الست بربکم قالوا بلی۔ اگر وہ نعم کہتے تو کافر ہوتے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَیِّئَۃً اس سے مراد شرک ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے کہا من کسب سیئۃ؟ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا: شرک (1) اور پھر یہ آیت بطور دلیل پڑھی وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ (النمل:90) (جو برائی لے کر آئے گا تو ان کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں) اسی طرح حسن اور قتادہ نے کہا: خطیئۃ کبیرہ ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 3: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ تو یہ دلیل ہے کہ دو شرطوں پر یہ حکم معلق ہے، دونوں شرطوں سے کم کے ساتھ حکم مکمل نہیں ہوگا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (فصلت:30) (بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) استقامت اختیار کی) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی کو کہا، جب انہوں نے کہا تھا یا رسول اللہ! مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیں کہ اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنت باللہ ثم استقم (تو کہہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہ) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس مفہوم میں کلام گزر چکی ہے اور جو کچھ علماء نے وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾ (البقرہ:35) کے ضمن میں فرمایا وہ بھی گزر چکا ہے۔ نافع نے خطیئاتہ، یعنی جمع پڑھا ہے باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور معنی کثرت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم:34) یہاں نعمۃ مفرد ہے لیکن معنی کثرت ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۗ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

"اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو"۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ان الفاظ کے بیان میں کلام گزر چکی

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

ہے، یہاں جس میثاق کا ذکر ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ مکی نے کہا: یہ وہ میثاق ہے جو اس وقت لیا گیا جب لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا گیا۔ بعض نے فرمایا: یہ وہ میثاق ہے جو ان سے لیا گیا جبکہ وہ زندگی میں عقلاء تھے۔ انبیاء کرام کی زبانوں کے ذریعے۔ وہ یہ ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (1) (تم عبادت نہیں کرتا مگر الله کی) الله تعالیٰ کی عبادت اس کی توحید کا اثبات ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق ہے اور جو کچھ اس نے اپنی کتب میں نازل کیا اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ سیبویہ نے کہا: لَا تَعْبُدُوْنَ، قسم کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم نے ان سے حلف لیا الله کی قسم تم عبادت نہیں کرتے مگر الله کی۔ مبرد، کسائی اور فراء نے اس کو جائز قرار دیا۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے لا تعبدوا نہی کا صیغہ پڑھا ہے (2) اسی وجہ سے کلام امر کے صیغہ کے ساتھ متصل ہے۔ فرمایا: قوموا و قولوا۔ اقیموا و آتوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال ہے یعنی ہم نے ان سے میثاق لیا دراں حالیکہ وہ توحید کے اظہار کرنے والے تھے یا وہ معاند نہیں تھے۔ یہ قطرب اور مبرد کا قول ہے۔ یہ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی کی قراءت پر یعبدون (یاء کے ساتھ) پر صحیح ہوتا ہے۔

فراء، زجاج اور ایک جماعت نے کہا (3) اس کا معنی ہے اخذنا میثاقھم بالا یعبدوا الا الله و بان یحسنوا للوالدین و بالا یسفکوا الدماء (ہم نے ان سے میثاق لیا کہ وہ الله کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے یہ کہ وہ والدین سے حسن سلوک کریں گے، یہ کہ وہ خون ریزی نہیں کریں گے) پھر ان اور با کو حذف کیا گیا تو فعل کو رفع دیا گیا ان دونوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ (الزمر: 64) مبرد نے کہا: یہ خطا ہے جو عربی میں مضمر ہوتا ہے وہ ظاہر عامل کی طرح عمل کرتا ہے تو کہتا ہے: و بلد قطعت یعنی رُبَّ بلد۔

میں کہتا ہوں: یہ خطا نہیں ہے بلکہ دونوں وجہیں صحیح ہیں، ان دونوں وجوہ پر سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

الا ایھذا الزاجری احضر الوغی　　　وان اشھد اللذات ھل انت مخلدی

اس شعر میں احضر پر نصب اور رفع دونوں پڑھے گئے ہیں۔ نصب اَنْ کے اضمار کی بنا پر اور رفع اَنْ کے حذف کی بنا پر۔

مسئلہ نمبر 3: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یعنی ہم نے انہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس آیت میں الله تعالیٰ نے والدین کے حق کو توحید کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اول الله تعالیٰ کی طرف سے اور تخلیق ثانی (تربیت) والدین کی طرف سے ہوتی ہے اسی لئے الله تعالیٰ نے ان کے شکر کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (لقمان: 14)

والدین سے احسان کا مطلب ان سے حسن معاشرت، ان کے لئے تواضع، ان کے حکم کی پیروی، ان کے وصال کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعا، ان سے محبت کرنے والوں سے تعلقات قائم کرنا وغیرہ ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء الله سورۃ اسراء

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ذِی الْقُرْبٰی اس کا عطف والدین پر ہے اَلْقُرْبٰی بمعنی قرابت ہے یہ مصدر ہے جیسے الرجعی، العقبیٰ (1) یعنی ہم نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے احسان کا حکم دیا۔ تفصیلی بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْیَتٰمٰی یہ بھی معطوف ہے۔ یہ یتیم کی جمع ہے جیسے ندامی، ندیم کی جمع ہے۔ انسانوں میں الیتیم باپ کا نہ ہونا ہے اور جانوروں میں ماں کا نہ ہونا ہے (2)۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو۔ پہلا قول معروف ہے اس کا اصل معنی جدا ہونا ہے۔ صبی یتیم یعنی وہ بچہ جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ بیت یتیم جس کے آگے پیچھے کوئی شعر نہ ہو۔ درۃ یتیمۃ، ایسا موتی جس کی مثال نہ ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی الابطاء (تاخیر کرنا) ہے۔ یتیم کو اس لئے یتیم کہا جاتا ہے کہ نیکی اس سے مؤخر ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: یتمَ ییتمُ یتما جیسے عظم یعظم۔ اور یتمَ ییتم یُتماً ویَتماً جیسے سمع یسمع۔ فراء نے دو وجہیں ذکر کی ہیں: قد ایتمہ اللہ۔ اللہ نے اسے یتیم بنایا۔

یہ آیت یتیم پر شفقت کرنے پر اور اس کی کفالت اور اس کے مال کی حفاظت کرنے پر برانگیختہ کر رہی ہے۔ اس کا بیان سورۃ نساء میں آئے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے یتیم کی کفالت کرنے والا یا کسی غیر کے یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔ مالک نے سبابہ اور درمیانی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ امام حافظ ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے حسن بن دینار ابو سعید بصری، جو حسن بن واصل، کی حدیث نقل کی ہے، فرمایا: ہمیں اسود بن عبد الرحمن نے بتایا انہوں نے ہصان سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم کے پیالے پر یتیم نہ بیٹھے ان کے پیالے کے قریب شیطان ہوتا ہے۔ عبد الغنی نے حسین بن قیس کی حدیث بھی نقل کی ہے اور وہ ابو علی جبی ہے۔ انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک یتیم مسلمان کو اپنے کھانے اور پینے میں شریک کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے سیر کر دے گا تو اس کے یقیناً سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جس کی دو محبوب چیزیں لے لے گا اور وہ صبر کرے گا اور ثواب کی امید رکھے گا تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا: کریمتاہ (دو محبوب چیزوں) سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس کی آنکھیں اور جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں گی وہ ان پر خرچ کرے گا اور ان سے حسن سلوک کرے گا حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے یا وہ فوت ہو جائیں تو یقیناً اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ ایک بدو جس نے ہجرت کی تھی اس نے کہا: یا رسول اللہ! جس کی دو بیٹیاں ہوں اس کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خواہ دو بیٹیاں ہوں اس کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عباس جب یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حدیث بیان کرتے تھے تو فرماتے تھے: اللہ کی قسم! یہ حدیث کے غرائب اور غرر سے ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 6: سبابہ وہ انگلی ہوتی ہے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اسے سبابہ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے گالی دیتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو انہوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور انہوں نے اس کا نام المشیرہ رکھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اشارہ کرتے تھے، اس کو سباحہ بھی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام حضرت وائل بن حجر وغیرہ کی حدیث میں آیا ہے لیکن لغت زمانہ جاہلیت میں جو معروف تھا اس کے مطابق چلتی رہی اور وہ غالب رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے مطابق مروی ہے کہ ان میں سے المشیرہ، درمیانی انگلی سے بڑی تھی، اور درمیانی انگلی، المشیرہ سے چھوٹی تھی پھر بنصر درمیانی سے چھوٹی تھی۔ یزید بن ہارون نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں عبداللہ بن مقسم الطائفی نے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے میری پھوپھی سارہ بنت مقسم نے بتایا کہ انہوں نے حضرت میمونہ بنت کردم کو سنا، انہوں نے فرمایا: میں اس حج کے موقع پر نکلی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سواری پر دیکھا، میرے باپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ چیزوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے دیکھا میں تعجب کرتی تھی...... جب کہ میں بچی تھی ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انگلی کی لمبائی پر جو انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے وہ تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انا و ھو کھاتین فی الجنۃ اور دوسری حدیث میں ہے اُحْشَرُانا و ابوبکر و عمر یوم القیامۃ ھکذا (میں، ابوبکر اور عمر قیامت کے روز اس طرح اٹھائے جائیں گے) اپنی تین انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ آپ نے مخلوق کی منازل اور مخلوق پر جھانکنے کا ارادہ فرمایا اور فرمایا: ہم اس طرح اٹھیں گے اور ہم اوپر سے جھانک رہے ہوں گی۔ اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والے کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کی شان کو نہیں جانتا اس نے حدیث کی تاویل انضمام و اقتراب سے کی ہے یعنی درجے ملے ہوئے ہوں گے اور یہ معنی بعید ہے کیونکہ رسل، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی منازل متفرق اور مختلف ہوں گی۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمَسٰكِيْنِ یہ بھی معطوف ہے یعنی ہم نے انہیں مساکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حاجت نے ساکن کر دیا ہو اور انہیں ذلیل کر دیا ہو۔ یہ صدقہ، مواسات، مساکین کے احوال جاننے اور ضعیفوں کی خبر گیری کرنے کو متضمن ہے(2)۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: بیوہ اور مسکین (کی کفالت کے لئے) کوشش کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ میرا خیال ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور اس قیام کرنے والے کی طرح ہے جو کمزور نہیں پڑتا اور اس روزے دار کی طرح جو افطار نہیں کرتا(3)۔ ابن منذر نے کہا: بہنوں کے لئے محنت مزدوری کرنا اللہ کے راستہ میں جہاد سے افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، حُسْنًا کو معنی کے اعتبار سے نصب مصدر کی بنا پر ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب الساعی علی المسکین، حدیث نمبر 5548، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس کا معنی ہے تمہارا قول اچھا ہو۔ بعض نے فرمایا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: وقولوا للناس قولا ذا حسن، یہ مصدر ہے معنی کے اعتبار سے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے حَسَنًا، حاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: دونوں کا معنی ایک ہے، جیسے بخل اور بَخَل، الرشد اور الرَّشَد کا معنی ایک ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: حسنیٰ یعنی بغیر تنوین کے فعلیٰ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا اور یہ عربی زبان میں جائز نہیں، ایسے صیغہ کو الف، لام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جیسے الفضلیٰ، الکبریٰ، الحسنیٰ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے حُسُنًا حاء اور سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے الحُلُم۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم انہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو اور انہیں اس کا حکم دو۔ ابن جریج نے کہا: یعنی تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں لوگوں سے سچی بات کہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں تبدیلی نہ کرو۔ سفیان ثوری نے کہا: لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور انہیں برائی سے روکو۔ ابو العالیہ نے کہا: انہیں اچھی بات کہو اور اچھا بدلہ دو اس سے جو تم چاہتے ہو کہ تمہیں بدلہ دیا جائے۔ یہ تمام مکارم اخلاق پر ابھارنا ہے (1)۔ پس انسان کو چاہئے کہ لوگوں کے ساتھ اس کا کلام نرم ہو اس کا چہرہ ہر فاسق و فاجر کے لئے، سنی اور بدعتی کے لئے مسکراتا اور کھلا ہوا ہو لیکن دین میں مداہنت نہ کرے اور ایسی کلام نہ کرے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے مذہب سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:44) (اس سے نرم لہجہ میں بات کرو) کوئی قائل، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل نہیں ہے اور کوئی فاجر فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کے ساتھ نرم کلام کرنے کا حکم دیا۔

طلحہ بن عمر نے کہا: میں نے عطا سے کہا تیرے پاس مختلف خواہشات کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور میرے اندر تیزی اور سختی ہے میں ان کو سخت کلام کہتا ہوں۔ حضرت عطا نے کہا: تم ایسا مت کیا کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اس آیت میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں تو پھر حنفی (مسلمان) کا کیسا حکم ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تو فحش کلام کرنے والی نہ ہو جا، کیونکہ بے شک فحش اگر مرد ہوتا تو برا مرد ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا: الناس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسے اس ارشاد میں ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:54) گویا یوں ارشاد فرمایا: قولوا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم حسنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی بات کہو۔

مہدوی نے قتادہ سے حکایت کیا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا ارشاد، آیت السیف (قتال والی آیت) سے منسوخ ہے (2)۔ ابو نصر عبد الرحیم بن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت ابتدا میں نازل ہوئی پھر اسے آیۃ السیف نے منسوخ کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: (3) یہ آیت دلیل ہے کہ ابتداء اسلام میں اس امت کو اس جیسے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق خبر اور جو انہیں حکم دیا گیا وہ اس میں منسوخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اس کے بارے میں قول گزر چکا ہے اس میں خطاب بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: (4) وہ لوگ اپنی زکوٰۃ کو ایک جگہ رکھتے تھے جو قبول ہوتی اس پر آگ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

نازل ہوتی اور جو قبول نہ ہوتی اس پر آگ نازل نہ ہوتی۔ ان کی زکوٰۃ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی زکوٰۃ جیسی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ بات نقل کی محتاج ہے جیسا کہ یہ بات ان کے مال غنیمت میں ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زکوٰۃ جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اخلاص تھا۔ (1)

مسئلہ نمبر10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود کو خطاب ہے، ان کی طرف نسبت کی گئی ہے حالانکہ ان کے اسلاف نے پیٹھ پھیری تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حق سے اعراض میں ان کے راستہ پر تھے اور ان کی مثل تھے جیسا کہ کہا جاتا ہے شِنْشِنَةٌ اعرفها من اخزم۔ یہ وہ خصلت ہے جو مجھے اخزم سے معلوم ہوئی۔ (یہ ابو اخزم الطائی کا قول ہے اس نے اپنے بیٹے اخزم کو عاق کر دیا تھا تو اخزم کے بیٹوں نے اپنے دادا کو مارا تو اس نے کہا: یہ خصلت میں اخزم سے ہی جانتا ہوں)

اِلَّا قَلِيْلًا جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی۔ قَلِيْلًا استثناء کی بنا پر منصوب ہے اور المستثنیٰ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہوتا ہے کیونکہ وہ مفعول کے مشابہ ہوتا ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: یہ حقیقت میں مفعول ہے معنی یہ ہے استثنیت قلیلا میں نے چند آدمیوں کی استثنا کی۔ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ الاعراض اور تولی کا ایک معنی ہے لفظ میں دونوں کے درمیان مخالفت ہے۔ بعض نے فرمایا: تولی جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور اعراض دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا: وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ حال ہے کیونکہ اس میں تولی، اعراض پر دلالت کر رہا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

"اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو"۔

اس میں دو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر1: اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور معنی کے اعتبار سے بعد والے بھی داخل ہیں۔ لَا تَسْفِكُوْنَ، اعراف میں لا تعبدون کی طرح ہے، طلحہ بن مصرف اور شعیب بن حمزہ نے فا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابو نہیک نے تاء کے ضمہ فاء کی تشدید اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ السفک کا معنی انڈیلنا، بہانا ہے پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ یہ معطوف ہے اَنْفُسَكُمْ، النفس ماخوذ ہے النفاسة سے۔ انسان کا نفس، انسان کی چیز سے افضل ہے۔ الدار اس منزل کو کہتے ہیں جس میں ٹھہرنے کے لئے مکان بنے ہوئے ہوں بخلاف وقتی ٹھہرنے کی منزل کے۔ خلیل نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں کوئی قوم اترے وہ ان کے لئے دار ہے اگرچہ وہ مکانات نہ بھی ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: دار کو دار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رہنے والوں پر چکر لگاتا ہے۔ اسی طرح الحائط کو حائط کہتے

1۔ [illegible] زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہیں کہ وہ اسے گھیرے ہوئے ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ اَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ہے۔ یعنی تم نے اس میثاق کا اقرار کیا جو تم سے اور تمہارے پہلوں سے لیا گیا تھا۔ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ یہ الشہادت سے ہے یعنی اس پر تم اپنے دلوں کے گواہ ہو۔ بعض نے فرمایا: شہادت بھی حضور ہے یعنی تم خون ریزی کے وقت اور گھروں سے نکالنے کے وقت موجود تھے۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ کیا کوئی اپنا خون بہاتا ہے اور اپنے آپ کو گھر سے نکالتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان کی ملت ایک تھی اور ان کا معاملہ ایک تھا اور وہ امم میں ایک شخص کی مانند تھے تو بعض کا بعض کو قتل کرنا اور بعض کا بعض کو نکالنا، اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو نکالنے سے بنایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد قصاص ہے یعنی کوئی کسی کو قتل کرتا تو اس سے قصاص لیا جاتا یا اس نے اپنا ہی خون بہایا۔ اسی طرح جو زنا کرتا اور جو مرتد ہوتا تو اس کا خون مباح ہو جاتا۔ وہ فساد برپا کرتا تو اسے جلاوطن کیا جاتا، یہ گویا اس نے اپنے آپ کو ہی اپنے گھر سے نکالا۔ یہ اسی تاویل پر ہے جس میں بہت بعد ہے اگرچہ معنی صحیح ہے۔

معاملہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے نہ ایک دوسرے کو جلاوطن کریں گے اور نہ غلام بنائیں گے۔ اسی طرح دوسری طاعات کا ان سے عہد لیا تھا۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ سب کام ہم پر بھی حرام ہیں، یہ تمام فتنے ہم میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔ قرآن حکیم میں ہے: اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (انعام: 65) (خلط ملط کرے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ابن خویز منداد نے کہا: جائز ہے کہ اس سے مراد ظاہر ہو، کوئی انسان خودکشی نہ کرے، اور بیوقوفی کی وجہ سے اپنے گھر سے نہ نکلے جس طرح کہ ہندو اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں یا انسان انتہائی پریشانی اور مصیبت کے وقت خودکشی کر لیتا ہے یا صحراء میں گھومتا رہتا ہے، دین سے ناواقفی اور عقل میں کمی کی وجہ سے گھروں میں نہیں آتا۔ یہ تمام صورتوں کو حکم شامل ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیعت کی اور سب نے یہ عزم کیا کہ وہ بوریا کا لباس پہنیں گے، صحرا میں گھومیں گے اور گھروں میں نہیں آئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے اور اپنی عورتوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان بن مظعون کے گھر آئے، اسے گھر پر نہ پایا، ان کی بیوی سے فرمایا: مجھے عثمان کے بارے یہ کیا بات پہنچی ہے؟ بیوی نے اپنے خاوند کا راز افشا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بولنا ناپسند کیا۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ اسی طرح ہے جس طرح آپ کو پہنچی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم عثمان کو کہنا کیا میری سنت کی مخالفت کرتے ہو یا میری ملت کے علاوہ کسی ملت پر ہو۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں، گھروں میں بھی پناہ لیتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں جو میری سنت سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ حضرت عثمان اور آپ کے ساتھی اپنی حالت سے واپس لوٹ آئے۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب الترغیب فی النکاح، حدیث نمبر 4675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶

''پھر تم وہی ہونا (جنہوں نے یہ وعدے کیے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے۔ (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے۔ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو، حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا۔ تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا۔ (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا ہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔ اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض۔ تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ، اَنْتُمْ مبتدا ہے اس کو اعراب نہیں دیا جاتا کیونکہ یہ ضمیر ہے۔ اَنْتُمْ میں تا کو ضمہ دیا جاتا ہے، کیونکہ واحد مذکر مخاطب کے صیغہ میں تا مفتوح ہوتی ہے واحد مونث مخاطب میں تا مکسور ہوتی ہے۔ پس جب تو تثنیہ یا جمع کا صیغہ بنائے گا تو صرف ضمہ باقی ہے۔ هٰٓؤُلَآءِ قتبی نے کہا: اس کی تقدیر یا ہؤلاء ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سیبویہ کے قول کے مطابق خطا ہے، اور هذا اقبل جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: هٰٓؤُلَآءِ بمعنی الذین ہے، تَقْتُلُوْنَ یہ صلہ میں داخل ہے یعنی ثم انتم الذین تقتلون۔ بعض نے فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ مبتدا ہے اور اَنْتُمْ خبر مقدم ہے اور تَقْتُلُوْنَ، هٰٓؤُلَآءِ سے حال ہے۔ بعض نے فرمایا: اعنی کے اضمار کے ساتھ هٰٓؤُلَآءِ منصوب ہے (1)۔ زہری نے تقتلون پہلی تا مضموم اور دوسری کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح فلم یُقتلون انبیاء اللہ میں پڑھا ہے، یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے۔ یہ ان کے اسلاف کی طرف لوٹانے کا احتمال نہیں رکھتا۔ یہ بنی قینقاع، قریظہ اور نضیر یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ بنو قینقاع، قریظہ کے دشمن تھے اور اوس، بنی قینقاع کے حلیف تھے۔ خزرج، بنی قریظہ کے حلیف تھے۔ نضیر (2)، اوس اور خزرج بھائی تھے اور قریظہ اور نضیر آپس میں بھائی بھائی تھے۔ پھر وہ جدا جدا ہو گئے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے پھر جنگ ختم ہوتی تو وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر شرم دلائی اور فرمایا: وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ (3) (اور اگر آئیں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے یا کباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَظٰهَرُوْنَ اس کا معنی تتعاونون (معاونت کرنا) ہے۔ یہ الظھر سے مشتق ہے کیونکہ بعض، بعض کو تقویت دیتا ہے تو وہ اس کے لئے پیٹھ کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تظاھرتم استاہ بیت تجمعت علی واحد لازلتم قرن واحد

اس شعر میں تظاھر کا معنی مدد کرنا ہے۔

الاثم اس فعل کو کہتے ہیں جس کا کرنے والا مذمت کا مستحق ہوتا ہے۔ الْعُدْوَانِ ظلم میں زیادتی کرنا اور ظلم میں تجاوز کرنا۔ اہل مدینہ اور اہل مکہ نے تظاھرون ظا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے وہ تا کو ظا میں ادغام کرتے ہیں ان کے قرب کی وجہ سے، اصل میں تتظاھرون تھا۔ کوفیوں نے تظاھرون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلی تا کی دلالت کی وجہ سے دوسری تا کو حذف کر دیا اسی طرح وان تظاھرا علیہ کو پڑھا ہے۔ قتادہ نے تظھرون علیھم پڑھا ہے، یہ سب تعاون کے معنی کی طرف راجع ہیں۔ اس سے ہے وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِیْرًا (الفرقان) (اور کافر اپنے رب کے مقابلہ میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ (التحریم) (سارے فرشتے اس کے علاوہ مدد کرنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى یہ شرط ہے اور اس کا جواب تُفٰدُوْهُمْ ہے اور اُسٰرٰى کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ ابوعبید نے کہا: ابوعمرو کہتے تھے جو ان کے ہاتھوں میں تھا وہ اُسٰرٰى تھا، اور جو قیدی ہو کر آئیں وہ اسریٰ ہیں۔ اہل لغت میں یہ معروف نہیں جو ابوعمرو نے کہا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: سکاریٰ، سکریٰ۔

اکثر کی قراءت اُساریٰ ہے۔ حمزہ نے اسے اسریٰ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے۔ یہ اسیر کی جمع ہے، اسیر بھی ماسور ہے، فعلی، فعیل کی جمع ہے۔ جیسے تو کہتا ہے قتیل سے قتلی، جریح سے جرحی۔ ابوحاتم نے کہا اساریٰ جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اساریٰ جیسے کہا جاتا ہے سکاریٰ، فعلیٰ اصل ہے اور فُعالیٰ اس پر داخل ہے۔

محمد بن یزید سے حکایت ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: اسیرٌ، اُسراءُ، جیسے ظریف سے ظرفاء۔ ابن فارس نے کہا: اسیر کی جمع میں اسریٰ، اُساریٰ کہا جاتا ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے بعض نے فرمایا: أَساریٰ (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ)

مسئلہ نمبر 2: الاسیر، یہ الاسار سے مشتق ہے اس سے مراد وہ چمڑے کی رسی ہے جس کے ساتھ محمل کو باندھا جاتا ہے، اس کو اسیر اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کو باندھا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: قد اسر قتبہ، اس نے پالان کو باندھا پھر ہر پکڑی گئی چیز کو اسیر کہتے ہیں اگرچہ اسے باندھا نہ بھی گیا ہو۔ اعشیٰ نے کہا:

و قیدنی الشعر فی بیتہ کما قید الآسرات الحمارا

مجھے شعر نے اس طرح قید کر دیا ہے جس طرح عورتیں پالان کی لکڑی کو قید کئے ہوئے ہوتی ہیں

یعنی انافی بیتہ۔ اس سے اس کی مراد انتہا کو پہنچنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (الدہر: 28) میں اسر سے مراد خَلق ہے۔ اسرۃ الرجل، آدمی کا خاندان، گروہ۔ کیونکہ وہ ان سے قوت حاصل کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تُفْدُوْهُمْ۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے اسی طرح پڑھا ہے اور باقی قراء نے تفدوھم پڑھا ہے یہ فداء سے ہے الفداء کا معنی قیدی کا فدیہ طلب کرنا ہے۔ جوہری نے کہا: الفِداء کو جب فا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ ممدود اور مقصور ہوتا ہے اور فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو صرف مقصور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قم فدًی لك ابی۔ اور عربوں میں سے جو فا کو کسرہ دیتے ہیں اسے فداءٍ تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں خصوصاً جب اس کے ساتھ لام جارہ ہو۔ پس وہ کہتے ہیں: فداءٍ لك۔ کیونکہ یہ نکرہ ہے اس سے وہ دعا کا معنی مراد لیتے ہیں۔ اصمعی نے نابغہ کا یہ شعر پڑھا ہے:

مهلاً فداءٍ لك الاقوام كلهم وما اثمر من مال ومن ولدِ

کہا جاتا ہے: فداه وفاداه تو کوئی عطیہ دے پھر اسے ختم کر دے۔ فداه بنفسه و فداه یفدیه جب کہا میں نے تیرا فدیہ دیا۔ تفادوا، یعنی بعض نے بعض کو فدیہ دیا۔ الفدیة، الفَدَی، الفِداء تمام کا معنی ایک ہے۔ وفادیت نفسی یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کوئی چیز دینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ یہ بمعنی فدیت ہے، اسی سے حضرت عباس کا نبی کریم ﷺ سے عرض کرنا ہے: فادیت نفسی و فادیت عقیلاً میں نے اپنا فدیہ دیا ہے اور عقیل کا فدیہ دیا ہے۔ یہ دونوں فعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں، ان میں سے دوسرا حرف جر کے ساتھ ہے۔ تو کہتا ہے: فدیت نفسی بمالی و فادیتهٔ بمالی (1)۔ شاعر نے کہا:

قفی فادی اسیرك ان قومی و قومَكَ ما اریٰ لهم اجتماعا

تو ٹھہر جا اور اپنے قیدی کا فدیہ دے دے میری اور تیری قوم میں ان کا اجتماع میں نہیں دیکھتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ هُوَ مبتدا ہے یہ اخراج سے کنایہ ہے، مُحَرَّمٌ خبر ہے اور اِخْرَاجُهُمْ، هُوَ سے بدل ہے، اگر تو چاہے تو هُوَ ضمیر کو الحدیث اور القصہ سے کنایہ بنا دے اور اس کا مابعد جملہ خبر ہو، یعنی والامر محرم علیکم اخراجهم، پس فاخراجهم دوسرا مبتدا ہوگا اور محرم اس کی خبر ہوگی اور پھر جملہ هُوَ کی خبر ہوگا۔ اور محرم میں جو ضمیر نائب فاعل ہے وہ الاخراج کی طرف لوٹ رہی ہے یہ بھی جائز ہے کہ محرم مبتدا ہو اور اخراجهم اس کا نائب فاعل، محرم کی خبر کے قائم مقام ہے پھر جملہ هو کی خبر ہو۔ فراء نے کہا: هُوَ عماد ہے یہ بصریوں کے نزدیک خطا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ عماد اول کلام میں نہیں ہوتا اور ضمہ کے ثقل کی وجہ سے ھاء کے سکون کے ساتھ وَهْوَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فَهْوَ لا تنمی رمیتهٔ ما له لا عدّ من نفره

اس میں فهو کو ھا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے لام اور ثم لائے تو بھی ھا ساکن کر دے۔

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے چار عہد لئے تھے: قتل نہ کرنا، جلاوطن نہ کرنا، مدد نہ کرنا اور قیدیوں کا فدیہ دینا۔ انہوں نے سوائے فدیہ کے حکم کے سب سے اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توبیخ فرمائی جو پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا: أفتومنون ببعض الکتاب (تورات) وتکفرون ببعض۔

میں کہتا ہوں: اللہ کی قسم! ہم نے فتنوں کی وجہ سے تمام احکام کو ترک کر دیا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی مسلمانوں پر افسوس بلکہ کافروں پر افسوس۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو ذلیل و رسوا چھوڑ دیا ان پر مشرکین کے احکام جاری ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ایک درہم بھی باقی نہ ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت قیدیوں کے چھڑانے کے وجوب کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس کے متعلق وارد ہیں، آپ نے قیدیوں کو چھڑایا اور ان کو چھڑانے کا حکم دیا(1)، اسی پر مسلمان کا عمل جاری ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ بیت المال سے قیدیوں کو چھڑانا واجب ہے اگر بیت المال نہ ہو تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہے۔ جس نے بھی یہ فریضہ ادا کر دیا باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر5: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یہ مبتدا اور خبر ہیں الخزی کا معنی رسوائی ہے۔ جوہری نے کہا: خَزِیَ یخزیٰ خزیاً جب کوئی ذلیل و رسوا ہو جائے۔ ابن سکیت نے کہا: وہ مصیبت میں واقع ہوا۔ اخزاہ اللہ اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کیا۔ خزِیَ، یخزیٰ خزایۃ جب کوئی حیا کرے۔ فھو خزیان. قوم خزایا و امرءۃٌ خَزیَا۔

مسئلہ نمبر6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ عام قراء کی قراءت یردون یا کے ساتھ ہے۔ حسن نے تردون تا خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اس سے پہلے کلام گزر چکی ہے۔ اسی طرح اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا اس پر بھی کلام ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں یوم کو نصب یردون کی وجہ سے ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے۔ اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جبریل علیہ السلام سے تو کیا جب بھی لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑنے لگے بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل

1۔ صحیح بخاری، باب فکاک الاسیر، حدیث نمبر 2819، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنے لگے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ، کتاب سے مراد تورات ہے تقفینا ہم نے پیچھے بھیجا۔ التقفیة پیچھا کرنا، پیچھے بٹھانا۔ یہ اتباع القفا سے ماخوذ ہے، القفا گردن کے پیچھے حصہ کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: استقفیتہ، جب تو کسی کے پیچھے آئے۔ اسی سے قافیة الشعر ہے کیونکہ وہ سارے کلام میں پڑھا جاتا ہے، القافیة کا معنی گدی ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: یعقد الشیطان علی قافیة رأس احد کم (1)۔ شیطان تم میں سے کسی کے سر کی گدی پر گرہ لگاتا ہے۔ القفی، القفارة دودھ وغیرہ جو اس شخص کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے جس کا تو اکرام چاہتا ہے۔ قفوت الرجل یعنی میں نے فجور کے ساتھ اسے تہمت لگائی۔ فلان قِفْوَتی۔ فلاں میری تہمت ہے۔ وقفوتی یعنی میری خیر ہے۔ ابن درید نے کہا: گویا یہ اضداد میں سے ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت اس آیت کی مثل ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون: 44) ہر رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا وہ تورات کے اثبات اور اس کے لزوم کے امر کے ساتھ آیا (2)۔ کہا جاتا ہے: رُسُلٌ وَ رُسْلٌ یہ دونوں لغتیں ہیں، پہلی لغت حجاز ہے اور دوسری لغت تمیم ہے خواہ مضاف ہو یا مضاف نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ، بینات سے مراد دلائل و براہین ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران اور سورۃ مائدہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (3)۔ وَ اَیَّدْنٰهُ یعنی ہم نے قوت دی۔ مجاہد اور ابن محیصن نے اسے آیدناہ مد کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ابو مالک اور ابو صالح نے ابن عباس اور معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ حضرت حسان نے کہا:

و جبریل رسول اللہ فینا و روح القدس لیس به خفاءُ

جبریل ہم میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں اور وہ روح القدس ہیں اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جبریل کو روح کہا گیا اور پھر القدس کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تکوین کے ساتھ روح تھا نہ اس طرح اس کی تکوین تھی جس طرح والد، اولاد کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے۔ غالب بن عبداللہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: القدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی طرح حسن نے فرمایا: القدس اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی روح جبریل ہے۔ ابو روق نے ضحاک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد وہ اسم ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے (4)۔ حضرت سعید بن جبیر اور عبید نے بھی یہی کہا یہ اسم اعظم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انجیل ہے اس کو روح کہا ہے جس طرح قرآن کو روح کہا ہے وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ: 52) پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

القدس کا معنی طہارت بھی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب عقد الشیطان علی قافیة الرأس اذا لم یصل باللیل، حدیث نمبر 1074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ یعنی جو تمہاری خواہشات کے موافق نہیں ہوتا۔ ضمیر عائد کو اسم کے طول کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اصل اس طرح ہے: بما لا تھواہ (استکبرتم) اس کی بات قبول کرنے سے تکبر کیا رسولوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اور رسالت کو مستعبد سمجھتے ہوئے۔ الھوی کا اصل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے اس کی جمع اھواء ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اس کی جمع اھویۃ نہیں آئی باوجود اس کے کہ عرب کہتے ہیں ندی اندِیَۃٌ۔

فی لیلۃ من جمادیٰ ذاتِ اندیۃ　　　لا یبصر الکلب فی ظلمائھا الطنبا

جوہری نے کہا: یہ شاذ ہے۔ اور الھوی کو ھویٰ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھی کو آگ میں گراتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عام طور پر ایسی بات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حق نہ ہو اور جس میں خیر نہ ہو۔ یہ آیت اسی سے ہے۔ کبھی یہ حق میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں کہا: ھوی رسول اللہ ﷺ ما قال ابوبکر ولم یھو ما قلت۔ رسول اللہ ﷺ کا میلان اس طرف ہوا جو ابوبکر نے کہا تھا اس طرف نہ ہوا جو میں نے کہا تھا (1)۔ حضرت عائشہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: واللہ ما اری ربك الا یسارع فی ھواك (☆)۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تیرے پروردگار کو دیکھتی ہوں کہ وہ تیری خواہش کو جلدی پورا فرما دیتا ہے۔ ان دونوں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ، كَذَّبْتُمْ کی وجہ سے فریقاً منصوب ہے اور اسی طرح وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ہے۔ پس کچھ ان میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما السلام کو جھٹلایا اور کچھ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو قتل کیا۔ اس کا بیان سورۂ سبحان میں آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا یعنی یہود قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، غُلْفٌ لام کے سکون کے ساتھ ہے اس کی جمع اغلف ہے یعنی ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔ یہ اس قول کی مثل ہے: قلوبنا فی اکنۃٍ مما تدعونا الیہ۔ (ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں)۔ مجاہد نے کہا غلفٌ یعنی ان پر پردہ ہے (2)۔ عکرمہ نے کہا: یعنی ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے: غلفت السیف، میں نے تلوار کے لئے غلاف بنایا۔ فقلبٌ اغلَف یعنی ایسا دل جو فہم و تمیز سے پوشیدہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اعرج اور ابن محیصن نے غُلُف لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا معنی ہے ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں انہیں حضرت محمد ﷺ اور کسی دوسرے کے علم کی ضرورت نہیں (3)۔ بعض نے فرمایا: یہ غلاف کی جمع ہے جیسے خمار، خمر۔ یعنی ہمارے دل علم کے برتن ہیں کیا وجہ ہے کہ تمہاری بات کو نہیں سمجھتے حالانکہ ہم نے بہت سا علم محفوظ کر رکھا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: حضرت محمد ﷺ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

کا علم ان سے کیسے پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ (لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے) پھر اس کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ایمان سے کیوں بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو انہوں نے کفر کیا اور جرأت کی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے یہ گناہ پر بڑی سزا ہے۔ اللعن کی اصل دھتکارنا اور دور کرنا ہے بھیڑیئے کو لعین کہا جاتا ہے دھتکارے ہوئے شخص کو لعین کہا جاتا ہے۔ الشماخ نے کہا:

ذعرتُ به القطا و نفيتُ عنهُ　　مقام الذئب كالرجل اللعين

اس شعر میں اصل کلام اس طرح تھی: مقام الذئب اللعين كالرجل۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنی توفیق اور اپنی ہدایت سے دور کر دیا۔ بعض نے فرمایا: ہر خیر سے دور کر دیا یہ عام ہے۔ فَقَلِيۡلًا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فایمانا قلیلا یومنون (1)۔ معمر نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس میں سے تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں سے اکثر کا انکار کرتے ہیں (2)۔ قلیلا حرف الصفۃ کے نزع کے ساتھ منصوب ہے، اور ما صلۃ ہے یعنی فقلیلا یومنون۔ واقدی نے کہا: اس کا معنی ہے نہ وہ تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں نہ زیادہ پر جیسے تو کہتا ہے: ما اقل ما یفعل کذا یعنی اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کسائی نے کہا: عرب کہتے ہیں: مررنا بارضٍ قلّ ما تنبت الکراث والبصل یعنی ہم ایسی زمین سے گزرے جو کچھ نہیں اگاتی تھی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۡ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۝

''اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلے سے۔) تو جب تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمۡ یعنی یہود۔ (کتاب) یعنی قرآن۔ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ یہ کتاب کی صفت ہے اور غیر قرآن میں اس کو حال کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے جس طرح حضرت ابی کے مصحف میں نصب کے ساتھ ہے (3) لِّمَا مَعَهُمۡ۔ یعنی تورات، انجیل، یعنی قرآن انہیں بتاتا ہے جو انجیل اور تورات میں ہے وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ یعنی وہ مدد طلب کرتے ہیں الاستفتاح کا معنی مدد طلب ہے۔ استفتحت، میں نے مدد طلب کی۔

حدیث پاک میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محتاج، کمزور مہاجرین کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور نمازوں کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے (4)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ (المائدہ:52) (وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دے دے فتح کامل یا ظاہر کر دے کامیابی کی کوئی بات

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ المکبیر طبرانی، صفحہ 857

اپنی طرف سے) النصر کا معنی بند چیز کو کھولنا ہے۔ یہ اس قول کی طرف لوٹتا ہے فتحت الباب میں نے دروازہ کو کھولا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس امت کی، ان کے ضعیف لوگوں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے مدد فرمائی۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میرے لئے کسی ضعیف کو طلب کرو کیونکہ تمہیں تمہارے ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: خیبر کے یہود غطفان سے جنگ کرتے تھے جب مقابلہ ہوا تو یہود کو شکست ہوئی۔ یہود پھر اس دعا کے ساتھ لوٹے۔ یا یہ معنی ہے کہ اس دعا کی انہوں نے پناہ لی۔ انا نسالك بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان الا تنصرنا علیهم۔ ہم تجھ سے اس امی نبی کے واسطہ سے سوال کرتے ہیں جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ تو ہمارے لئے اسے آخر زمانہ میں نکالے گا ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب مقابلہ ہوا تو انہوں نے یہ دعا مانگی تو انہوں نے غطفان کو شکست دے دی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے انکار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیرے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لَمَّا جَآءَهُمْ، لَمَّا کا جواب فاء اور اس کا مابعد ہے جو اس قول میں ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا فراء کے قول کے مطابق (2) دوسرے لَمَّا کا جواب کفروا ہے۔ اخفش سعید نے کہا: لَمَّا کا جواب محذوف ہے کیونکہ سامع کو معلوم ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے (3)۔ مبرد نے کہا لَمَّا کا جواب کفروا ہے اور لَمَّا کو دوبارہ ذکر کیا گیا۔ کلام کے طول کی وجہ سے یہ ذنب (گناہ) کی تقریر اور تاکید کے لئے مفید ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

"بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی، حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے پس وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے۔ اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا۔ بئس عرب کلام میں مذمت کے لئے ہے جیسے نعم مدح کے لئے ہے ان میں سے ہر ایک کی چار لغات ہیں: بِئْس بَئْسَ بِيْسَ بِيِسَ، نَعْمَ نَعِمَ نِعْم نِعِمَ۔ سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ما، بئس کا فاعل

1۔ صحیح بخاری، باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب، حدیث نمبر 2681، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
سنن ابوداؤد، باب الانتصار برذل الخیل والضعفة، حدیث نمبر 2227، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

ہے اور یہ اسمائے اجناس اور نکرات پر داخل ہوتا ہے اسی طرح نعم ہے تو کہتا ہے: نعم الرجل زَیدٌ، نعم رجلاً زیدٌ جب اس کے ساتھ اسم بغیر الف، لام کے ہوتو اسے ہمیشہ نصب دی جاتی ہے جب اس پر الف لام ہوتو ہمیشہ مرفوع ہوتا ہے رجلاً پر نصب تمیز کی بنا پر ہے اور نعم میں ضمیر تفسیر کی شرط پر مضمر ہے اور زید دو اعتبار سے مرفوع ہے۔ ایک مبتدا محذوف کی خبر کے اعتبار سے گویا پوچھا گیا ممدوح کون ہے تو تو نے کہا: وہ زید ہے۔ دوسری وجہ مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ ابو علی نے جائز قرار دیا ہے کہ اس کے ساتھ موصولہ اور غیر موصولہ ملا ہوا اس حیثیت سے کہ وہ مبہمہ ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ کسی ایک کو خاص نہیں کرتا۔ سیبویہ کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے(1): بئس الشیء اشتروا به انفسهم ان یکفروا۔ پس ان یکفروا محل رفع میں مبتدا ہوگا اور اس کا ماقبل خبر ہوگا جیسے تیرا قول ہے بئس الرجل زیدٌ اور اس قول کے مطابق ما موصولہ ہوگا۔ اخفش نے کہا(2): ما تمیز کی بنا پر محل نصب میں ہے جیسے تیرا قول ہے: بئس رجلاً زیدٌ پس تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: بئس شیئاً ان یکفروا۔ اشتروا به انفسم۔ اس قول کے مطابق ما کی صفت ہوگا۔

فراء نے کہا:(3) بئسما ایک شے ہے حبذا کی طرح مرکب کیا گیا ہے اس قول کے مطابق یہ معترضہ ہے۔ کیونکہ فعل بغیر فاعل کے رہ جائے گا۔ کسائی نے کہا: ما اور اشتروا، ایک اسم کے قائم مقام ہے اور یہ قائم بنفسہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: بئس اشتراؤهم ان یکفروا۔ یہ قول مردود ہے کیونکہ نعم اور بئس اسم معین معرف پر داخل نہیں ہوتے۔ شراء ضمیر کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں سے واضح قول اخفش اور سیبویہ کا قول ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: ان یکفروا اگر تو چاہے تو ان کو محل جر میں کر دے بہ میں ھاء ضمیر کی طرف لوٹاتے ہوئے۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہوگا اشتروا انفسم بان یکفروا بما انزل الله۔ فاشتریٰ بمعنی باع اور بمعنی ابتاع ہے۔ مطلب یہ ہے: بئس الشیٔ الذی اختاروا لانفسم حیث استبدلوا الباطل بالحق والکفر بالایمان۔ (یعنی بری ہے وہ چیز جو انہوں نے اپنے نفسوں کے لئے اختیار کی اس حیثیت سے کہ انہوں نے حق کو باطل سے بدلا اور ایمان کو کفر سے بدلا)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بَغْيًا** اس کا معنی حسداً ہے یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے(4)۔ یہ مفعول لاجلہ ہے۔ یہ حقیقت میں مصدر ہے، اصمعی نے کہا: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قد بغی الجرح، زخم خراب ہوگیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی طلب کرنا ہے اسی وجہ سے زانیہ کو بغیا کہا جاتا ہے۔ **اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ** یہ محل نصب میں ہے یعنی لان ینزل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل نازل کرنے کی وجہ سے۔ ابن کثیر، ابو عمرو، یعقوب اور ابن محیصن نے ان ینزل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح پورے قرآن میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ماینزله جو سورہ الحجر میں ہے اور سوائے علی ان ینزل آیۃ جو سورۃ الانعام میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبَآءُوْ** وہ لوٹے۔ اکثر یہ شر میں بولا جاتا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے **بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ**، غضب الله علیهم کا معنی گزر چکا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا غضب ان کے بچھڑے کی

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عبادت کرنے کی وجہ سے ہے اور دوسرا غضب حضرت محمد ﷺ کا انکار کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت عکرمہ نے کہا کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا پھر حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا یعنی یہود نے ایسا کیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے، پہلا غضب ان کا انجیل کے انکار کی وجہ سے تھا، دوسرا قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے تھا۔ بعض نے فرمایا: مراد تائید ہے(1) اور اس حال کی شدت کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا نہ کہ دو معصیتوں کی تعلیل کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا مُّهِيْنٌ یہ الهوان سے ہے، یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا مقتضی ہے بخلاف مسلمان گنہگار کے خلود کے، کیونکہ مسلمانوں کا آگ میں جانا ان کی طہارت اور تمحیص کے لئے ہوگا جیسے زانی کو رجم کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس کا بیان سورۃ نساء میں حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں: ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمائیے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا تصدیق کرو بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن قَالُوْا نُؤْمِنُ یعنی ہم تصدیق کرتے ہیں۔ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یعنی تورات۔ وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یعنی جو تورات کے علاوہ ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا:(2) جو تورات کے بعد ہے۔ یہی قول ابو عبیدہ کا ہے، معنی ایک ہے۔ جوہری نے کہا: وراء بمعنی خلف (پیچھے) ہے کبھی یہ بمعنی قدام (آگے) ہوتا ہے۔ یہ (وراء) اضداد میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ (الکہف: 79) (یعنی آگے بادشاہ تھا) وراء کی تصغیر وُريئة ہے یعنی هاء کے ساتھ یہ شاذ ہے۔ وراء پر نصب ظرف کی بنا پر ہے۔ اخفش نے کہا: کہا جاتا ہے لقيتهٔ من وراءٍ۔ غایت کی بنا پر اس کو رفع دیا جاتا ہے جب مضاف نہ ہو اسے اسم غیر متمکن بنائے گا، جیسے تیرا قول من قبلُ و من بعدُ میں ہے۔

اذا انا لم أومَنْ عليك و لم يكن　　لقاءك الا مِنْ وراءُ وراءُ

جب مجھے تجھ پر امن نہ ہو تو تیری ملاقات پردے کے پیچھے ہوگی۔

میں کہتا ہوں: حدیث حضرت عائشہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: انما كنت خليلاً من وراء وراء۔ میں پردے کے پیچھے خلیل تھا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

الوراء، پوتے کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْحَقُّ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مُصَدِّقًا سیبویہ کے نزدیک حال مؤکدہ ہے لِمَا مَعَهُمْ، ما محل جر میں ہے لام کی وجہ سے اور مَعَهُمْ، ما کا صلہ ہے اور مَعَهُمْ کو نصب ظرف مستقر کی بنا پر ہے اور جنہوں نے اس کو ساکن کیا ہے انہوں نے اس کو حرف بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ یہ یہود کا رد ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی تکذیب ہے اور انہیں توبیخ ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو نے کیسے قتل کیا حالانکہ تمہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور مراد ان کے اسلاف ہیں۔ خطاب ان کے بیٹوں کی طرف متوجہ ہے کیونکہ یہ ان کے پیروکار تھے جنہوں نے قتل کیا تھا جیسے ارشاد فرمایا: وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ (المائدہ: 91) (اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو اپنا دوست)

جب یہ بھی ان کے پیچھے چلے تو یہ ان کے قائم مقام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ ان کے فعل پر راضی اور خوش تھے اس لئے یہ فعل ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ تَقْتُلُوْنَ فعل مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے کیونکہ مِنْ قَبْلُ کے قول سے اشکال اُٹھ گیا۔ جب کوئی اشکال نہ ہو تو ماضی کا مستقبل کے معنی اور مستقبل کا ماضی کے معنی میں لانا جائز ہے۔ الحطیئۃ نے کہا: (1)

شهد　الحطيئة　يوم　يلقى　ربه　　ان　الوليد　احق　بالعذر

اس شعر میں شهد بمعنی يشهد ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان کا اعتقاد رکھتے ہو تو پھر انبیاء کے قتل پر کیوں راضی ہو۔ بعض علماء نے فرمایا اِنْ بمعنی ما ہے اور لم کی اصل لما ہے الف کو حذف کیا گیا استفہام اور خبر میں فرق کرنے کے لئے، اس پر وقف مناسب نہیں، کیونکہ اگر اس پر بغیر ھاء کے وقف کیا جائے گا تو غلطی ہوگی اور اگر اس پر ھاء کے ساتھ وقف کیا جائے گا تو تاریکی میں اضافہ ہوگا۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

"اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلیں لے کر، پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد اور تم جفا کار ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ اس میں لام، لام قسم ہے اور البینات سے مراد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (الاسراء: 101) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔ وہ یہ تھیں: عصا، سخت قحط سالی، ید بیضا، خون، طوفان، مکڑی، جوئیں، مینڈک اور دریا کا پھٹنا۔

بعض نے فرمایا البینات سے مراد تورات اور اس میں موجود دلالات ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ اس میں توبیخ ہے، اور ثُمَّ تفریع میں واؤ سے زیادہ بلیغ ہے یعنی آیات میں غور وفکر کے بعد اور ان کے آنے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنایا۔ یہ آیت دلیل ہے کہ انہوں نے آیات میں غور وفکر کی مہلت کے بعد یہ جرم کیا اور یہ ان کا بہت بڑا جرم تھا۔ (1)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے، یہ ان کے انکار کی نحوست تھی۔ فرمایئے: بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب وغریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا اس پر کلام گزر چکی ہے۔ اسْمَعُوْا کا معنی ہے: اطاعت کرو اس سے مراد صرف قول کا ادراک نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو تم نے سنا اس پر عمل کرو اور اسے لازم پکڑو۔ اسی سے ہے سمع اللہ لمن حمدہ یعنی قبول فرمایا۔

شاعر نے کہا: (2)

دعوت الله حتى خفت الا یکون الله یسمع ما اقول

میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمادے جو میں کہتا ہوں۔

الراجز نے کہا:

والسمع والطاعة والتسلیم خیرٌ و اعفی لبنی تمیم

قبول کرنا، اطاعت کرنا، تسلیم کرنا بنی تمیم کے لئے بہتر و مناسب ہے اور گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا اس میں اختلاف ہے کہ ان سے یہ الفاظ حقیقۃً زبان سے ادا ہوئے تھے یا انہوں نے ایسا فعل کیا تھا جو ان کو اس کے قول کے قائم مقام تھا۔ اس صورت میں یہ مجاز ہوگا۔ جیسے شاعر نے کہا:

امتلأ الحوض وقال قطنی مهلاً رویدًا قد ملأت بطنی (3)

حوض بھر گیا اور اس نے مجھے کہا: ٹھہر جاؤ میرا پیٹ تو نے بھر دیا ہے۔

انہوں نے جو کہا تھا نؤمن بما انزل علینا اس قول میں ان پر احتجاج (حجت) ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں راسخ ہوگئی۔ معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں نے اس کی محبت کو پینا شروع کیا۔ یہ تشبیہ اور مجاز ہے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت راسخ ہوگئی۔ (1)

حدیث میں ہے تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً فأیّ قلب اشربها نکت فیه نکتةٌ سوداء۔ (دلوں پر فتنے ڈالے جائیں گے چٹائی کی طرح بار بار، جو دل ان کو پیئے گا اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جائے گا) اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، کہا جاتا ہے: أشرب قلبه حُبّ کذا۔ اس کی محبت اس کے دل میں راسخ ہوگئی۔ زہیر نے کہا:

فصحوت عنها بعد حب داخلٍ　　والحبّ تشربهٔ فؤادك داء (2)

میں نے اس کی محبت کے دل میں داخل ہونے کے بعد صحت پائی، محبت دل کے لئے بیماری ہے۔

بچھڑے کی محبت کو شرب سے تعبیر فرمایا کھانے سے تعبیر نہیں فرمایا کیونکہ پانی کا پینا اعضاء میں جلدی چلا جاتا ہے حتیٰ کہ پیٹ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ کھانا اتنا جلدی اعضا میں نہیں پہنچتا۔ اس معنی پر ایک تابعی نے زیادتی کی ہے اس نے اپنی بیوی عثمہ سے کہا: وہ کسی معاملہ میں اس پر ناراض ہوا تو اسے طلاق دے دی حالانکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

عثمہ کی محبت میرے دل میں اتر گئی اور جنگل میں خوف زدہ کے ساتھ چلتی ہے۔

وہ محبت وہاں تک سرایت کرگئی ہے جہاں تک نہ کوئی پینا پہنچتا ہے نہ کوئی غم اور نہ کوئی خوشی پہنچتی ہے۔ جب میں اس سے کیا ہوا عہد یاد کرتا ہوں تو میں اڑنے کے قریب پہنچ جاتا ہوں کاش! انسان اڑ سکتا ہوتا۔

سدی اور ابن جریج نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توڑا اور اسے پانی میں بکھیر دیا۔ آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اس پانی سے پیو، وہ سب نے پیا۔ جو اس بچھڑے سے محبت کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سونے کا برادہ نکلا (3)، اور روایت ہے کہ کسی نے وہ پانی نہ پیا تھا مگر وہ مجنون ہوگیا تھا (4)۔ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: دریا میں اس کا بکھیرنا، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا (طٰہٰ) (پھر ہم بکھیر کر بہادیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو)۔ اور رہا پانی کا پینا اور ہونٹوں پر سونے کے برادہ کا ظہور، اس کو اللہ تعالیٰ کا قول رد کرتا ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ سیراب ہوچکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ یعنی تمہارا وہ ایمان جو تم اپنے زعم سے کہتے ہو نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ بعض نے فرمایا: یہ کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ یہود کو توبیخ کرو یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیں کہ بری ہیں تمہاری یہ اشیاء جو تم نے کیں اور جن کا تمہارے ایمان نے تمہیں حکم دیا (5)۔ بِئْسَمَا پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنۡ یَّتَمَنَّوۡہُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۹۵﴾

''آپ فرمائیے: اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راحتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

جب یہود نے باطل دعوے کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان دعوؤں کو اپنی کتاب میں ان کی طرف سے بیان فرمایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً (البقرہ:80) اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ بجز گنتی کے چند دن۔ وَ قَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی (البقرہ:111) اور انہوں نے کہا: ہرگز داخل نہ ہوں گے جنت میں مگر جو یہودی یا نصرانی ہوں گے) اور انہوں نے کہا: نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا ثابت کیا اور اس پر حجت لازم فرمائی۔ اور فرمایا: اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو۔ اِنۡ کَانَتۡ لَکُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ۔ دار آخرت سے مراد جنت ہے یعنی اگر تمہارے لئے جنت ہے فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۹۴﴾ تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اقوال میں سچے ہو)۔ کیونکہ جس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ جنتی ہے تو اس کے نزدیک دنیوی زندگی سے موت محبوب ہوتی ہے کیونکہ اسے وہاں جنت کی نعمتیں ملیں گی اور اس سے دنیا کی تکالیف ختم ہو جائیں گی۔ پس وہ اپنے اعمال کی قباحت اور نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) کے قول کی وجہ سے اپنے کفر کی معرفت کی وجہ سے اور دنیا پر حرص کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے رک گئے (1)۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنے سچے قول کے ساتھ خبر دی وَ لَنۡ یَّتَمَنَّوۡہُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۹۵﴾ یہ ان کے جھوٹ کی تحقیق کے طور پر فرمایا اگر وہ تمنا کرتے تو مر جاتے اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انہیں تمنا کے اظہار سے پھیر دیا اور اس سے روک دیا تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معجزہ بن جائے۔ یہ تین وجوہ تھیں ان کے تمنا کو ترک کرنے کی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ کے تحت روایت کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے ایک فریق کے جھوٹا ہونے پر موت کی دعا تو کرو (2)۔ تو انہوں نے دعا نہ کی کیونکہ انہیں اپنے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: تمنا کبھی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی دل سے ہوتی ہے پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے دل سے تمنا نہیں کی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا وَ لَنۡ یَّتَمَنَّوۡہُ اَبَدًا وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ اگر وہ دلوں کے ساتھ تمنا کرتے تو اسے اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کر دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت کو باطل کر دیں۔ یہ بالکل واضح ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَالِصَةً۔ اس کی نصب کان کی خبر کی بنا پر ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال بنا دے۔ اور عِنْدَ اللّٰهِ خبر ہو۔ اَبَدًا ظرف زمان ہے قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے جیسے حین اور وقت قلیل اور کثیر کے لئے استعمال ہوتے ہیں، عمر کی ابتدا سے موت تک کی مدت یہاں مراد ہے۔ بِمَا میں ما بمعنی الذی ہے اور عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: قدمتہ، اور ما مصدریہ ہو تو عائد کی ضرورت نہیں ہے اَیْدِیْهِمْ محل رفع میں ہے یا سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کسرہ کے ساتھ اس کے ثقل کی وجہ سے۔ اگر یہ محل نصب میں ہو تو اسے نصب دے گا کیونکہ نصب خفیف ہے اور شعر میں ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ یعنی یہود زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا بعض علماء نے فرمایا مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے پہلے احرص محذوف ہے کیونکہ انہیں اپنے کرتوتوں کی معرفت تھی۔ اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لئے کوئی خیر نہیں ہے اور مشرکین عرب صرف دنیوی زندگی کو جانتے تھے، آخرت کے متعلق انہیں کوئی علم نہ تھا۔ آپ نے ان کے شاعر کا قول ملاحظہ نہیں کیا:

تمتع من الدنیا فانك فانٍ　　　من النشوات والنساء الحسان

تو نشہ اور حسین عورتوں سے لطف اندوز ہو لے کیونکہ تو فنا ہونے والا ہے۔

اَحَدُهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: حَيٰوةٍ پر کلام مکمل ہے، پھر مشرکین کے گروہ کے متعلق نئے سرے سے خبر دی جا رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مجوسی ہیں (1) اور چھینک مارنے والے کو اپنی زبان میں دعا دیتے تھے جس کا معنی ہے: تو ہزار سال زندہ رہ۔ ہزار کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ یہ حساب میں عقد کی انتہا ہے (2)۔ حسن کا نظریہ یہ ہے کہ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد مشرکین عرب ہیں ان کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ عمر کے لمبا ہونے کی تمنا کرتے تھے (3)۔ سنۃ کی اصل سنھۃ ہے بعض نے فرمایا سنوۃٌ ہے۔ بعض نے فرمایا اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے ولتجدنھم و طائفۃ من الذین اشرکوا احرص الناس علی حیاۃ۔ (تم انہیں اور مشرکین کے ایک طائفہ کو پاؤ گے زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ، يَوَدُّ اصل میں یوددتھا، دال کو دال میں ادغام کیا گیا تا کہ ایک جنس کے دو متحرک حرف جمع نہ ہو جائیں دال کی حرکت واو کو دی گئی تا کہ یہ دلالت کرے کہ ایسا کیا گیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے وَدَدْتُ، اس صورت میں یوَدُّ، واو کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے یودّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ نحویوں کا هُوَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ احد جو پہلے گزر چکا اس کے لئے ضمیر ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: ما احدھم بمزحزحه۔ اور مبتدا کی خبر مجرور ہے۔ أَنْ يُعَمَّرَ، بمزحزح کا فاعل ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: تعمیر کے لئے ضمیر ہے، تقدیر یوں ہوگی وما التعمیر بمزحزحه۔ اور خبر مجرور ہے أَنْ يُعَمَّرَ، اس قول کے مطابق تعمیر کا بدل ہے۔ طبری نے ایک فرقہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ھو عماد ہے(1)، (اسی کو فصل بھی کہتے ہیں)

میں کہتا ہوں: اس قول میں بُعد ہے کیونکہ عماد وہ ہوتی ہے جو دو متلازم چیزوں کے درمیان آجائے۔ مثلاً ان کان ھذا ھو الحق اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولکن کانوا ھم الظالمین (پہلی آیت میں کان کے اسم اور خبر کے درمیان ہے اور اسی طرح دوسری مثال میں بھی ہے) بعض علماء نے فرمایا: ما عاملہ حجازیہ ہے، اور ھو اس کا اسم ہے اور خبر بمزحزحه ہے، ایک طائفہ نے کہا: ھو ضمیر شان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(2): اس میں بعد ہے کیونکہ نحویوں سے محفوظ قول یہ ہے کہ ضمیر شان وہ ہوتی ہے جس کی تفسیر ایسے جملہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو حرف جر سے سلامت ہو۔ (بمزحزحه)، الزحزحة کا مطلب ہے دور کرنا۔ کہا جاتا ہے: زحزحته میں نے اسے دور کیا۔ فتزحزح، یعنی وہ دور ہوا، اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے متعدی استعمال کیا ہے۔

یا قابض الروح من نفس اذا احتضرت وغافر الذنب زحزحنی عن النار

اے نفس سے روح قبض کرنے والے! جب وہ قریب المرگ ہو جائے۔ اے گناہوں کو معاف کرنے والے! مجھے آگ سے بچالے۔

ذوالرمہ نے کہا:

یا قابض الروح عن جسم عصی زمنا وغافر الذنب زحزحنی عن النار

اے جسم سے روح قبض کرنے والے! جس نے ایک زمانہ نافرمانی کی۔ اے گناہوں کو بخشنے والے! مجھے آگ سے بچا۔

ایک اور شاعر نے لازم معنی میں استعمال کیا ہے:

خلیلی مابال الدجی لا یتزحزح وما بال ضوء الصبح لا یتوضح

اے میرے دو دوستو! اس تاریکی کو کیا ہے یہ تو دور ہی نہیں ہوتی اور صبح کی روشنی کو کیا ہے واضح نہیں ہوتی۔

نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آگ سے ستر سال دور کر دے گا ☆۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ یعنی یہ جو ہزار سال زندہ رہنے کی تمنا کرنے والے ہیں ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ جن قراء نے تعملون تا کے ساتھ پڑھا ہے(1) ان کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے: قل لهم یا محمد الله بصیرٌ بما تعملون۔ اے پیارے محمد! تم انہیں فرماؤ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر فرمایا۔ اس کا یہ معنی ہے کہ وہ خفیہ امور کو جاننے والا ہے اور البصیر عرب کلام میں اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو جاننے والا ہو اس کے متعلق باخبر ہو۔ عربوں کا قول ہے: فلان بصیر بالطب و بصیر بالفقه و بصیر بملاقات الرجال، فلاں طب کو جاننے والا ہے فلاں فقہ کو جاننے والا ہے، مردوں سے ملاقات کو جاننے والا ہے۔

شاعر نے کہا:

فان تسألونی بالنساء فانی بصیر بادواء النساء طبیب

اگر تم مجھ سے عورتوں کے متعلق پوچھو گے تو میں عورتوں کے امراض کو جاننے والا اور طبیب ہوں۔

خطابی نے کہا البصیر کا معنی عالم ہے۔ البصیر کا معنی دیکھنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر ذکر فرمایا اس کا مطلب ہے: دیکھی جانے والی اشیاء بنانے والا ہے۔ یعنی ان اشیاء کا ادراک کیا جاتا ہے آنکھوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے جو ادراک کرنے والا آلہ اور قوت پیدا فرمائی ہے اس کے ساتھ ان کا ادراک کیا جاتا ہے وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (آل عمران) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا بنانے والا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل علیہ السلام کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (یہ) تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے''۔

اس آیت کے نزول کا سبب یہ کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے کہا: کوئی نبی نہیں آیا مگر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ایک فرشتہ وحی اور رسالت کے ساتھ آیا، تمہارا ساتھی (فرشتہ) کون ہے تا کہ ہم آپ کی اتباع کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل، انہوں نے کہا: وہ تو جنگ و جدل کو لاتا ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے جو بارش اور رحمت لاتا ہے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ تک یہ آیت نازل فرمائی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ، انه میں ضمیر دو معانی کا احتمال رکھتی ہے پہلا معنی یہ کہ فان الله نزل۔ یعنی اللہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب من کان عدوا لجبریل، حدیث نمبر 4120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے جبریل کو آپ کے دل پر اتارا۔ دوسرا معنی یہ کہ فان جبریل۔ یعنی جبریل نے قرآن کو آپ کے دل پر اتارا۔ قلب کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ عقل، علم اور معرف کے حصول کی جگہ ہے۔ یہ آیت جبریل کے شرف اور اس کے دشمنوں کی مذمت پر دلالت کرتی ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کے علم سے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ اس سے مراد تورات ہے۔ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِیْلَ وَ مِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾

''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ہے۔ یہ جبریل کے دشمنوں کے لیے وعید اور مذمت ہے اور یہ اعلان ہے کہ بعض کی عداوت اللہ تعالیٰ کی عداوت کا تقاضا کرتی ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا معصیت ہے، اس کی اطاعت سے اجتناب ہے اور اس کے اولیاء سے دشمنی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے دشمنی رکھنا، اسے عذاب دینا، اور اس پر عداوت کے اثر کا اظہار کرنا ہے(2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل کا خصوصی ذکر کیوں فرمایا اگرچہ ملائکہ کا ذکر ان کو بھی شامل تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے شرف کی وجہ سے خصوصی ذکر فرمایا۔ جیسا کہ فرمایا: فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمن) فَاكِهَةٌ (پھل) میں نَخْلٌ (کھجور) اور رُمَّانٌ (انار) کا ذکر تھا لیکن ان کے شرف کے لئے علیحدہ ذکر فرما دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ یہود نے ان کا ذکر کیا تھا، آیت کا نزول ان کے سبب سے تھا پس ان کا ذکر واجب تھا تا کہ یہود یہ نہ کہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں سے عداوت نہیں کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے تخصیص کے ذریعے ان کی تاویل کو باطل کرنے کے لئے نص قائم فرما دی، علماء لغت نے جبریل اور میکائیل میں کئی لغات بیان کی ہیں۔ جبریل میں دس لغات ہیں:

ا- جبریل یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت حسان نے کہا: و جبریل رسول اللہ فینا (جبریل ہم میں اللہ کے رسول ہیں۔)

۲- جَبریل۔ (جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءت ہے، ابن کثیر سے مروی ہے کہ اس نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ جبریل اور میکائیل پڑھ رہے تھے میں ہمیشہ ان کو ایسا ہی پڑھوں گا۔

۳- جَبْرَئِیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ جیسے جبرعیل) جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے(3) انہوں نے دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

شهدنا فما تلقى لنا من كتيبة   مدى الدهر الا جَبْرَئِیلُ امامُها

(ہم نے دیکھا پس ہمیں ایک زمانہ کوئی لشکر نہ ملا مگر جبریل اس کے آگے تھا) یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

۴- جَبْرَئِل (علی وزن جبرعل) مقصور ہے یہ ابوبکر عن عاصم کی قراءت ہے۔(1)

۵- اس کی مثل ہے مگر لام پر شد ہے یہ یحییٰ بن یعمر کی قراءت ہے۔(2)

۶- جبرائل (را کے بعد الف پھر ہمزہ) اس طرح عکرمہ نے پڑھا ہے۔

۷- اس کی مثل ہے لیکن ہمزہ کے بعد یا ہے۔

۸- جبرئییل (ہمزہ کے بعد دو یا کے ساتھ) اس طرح اعمش اور یحییٰ بن یعمر نے پڑھا ہے۔(3)

۹- جبرئین۔ (جیم مفتوحہ، ہمزہ مکسورہ اور اس کے بعد یا اور نون کے ساتھ)

۱۰- جبرین (جیم کے کسرہ، یا کی تسکین اور بغیر ہمزہ کے نون کے ساتھ) یہ بنی اسد کی لغت ہے(4)۔ طبری نے کہا: اس طرح نہیں پڑھا گیا۔ نحاس نے کہا اور اس نے ابن کثیر کی قراءت ذکر کی ہے..... کلام عرب میں فَعلیل معروف نہیں ہے۔ فِعلیل ہے۔ جیسے دلہیز، قطمیر، برطیل وغیرہ۔ یہ انکار نہیں کیا جاتا کہ جو عجمی کلام میں ہو اس کی عرب کلام میں مثال نہیں اور نہ یہ انکار ہے کہ اس میں تغیر کثیر ہے جیسے عرب کہتے ہیں: ابراھیم، ابرھم، ابراھم و ابراھام۔ بعض علماء نے کہا: جبریل عجمی اسم ہے عربوں نے اسے عربی بنایا اسی وجہ سے اس میں کئی لغات ہیں اور اسی وجہ سے یہ منصرف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ عربی ہیں ان کو جبریل واضح عربی زبان میں لے کر آئے ہیں۔ نحاس نے کہا: جبریل کی جمع مکسر جباریل بنائی جاتی ہے اور میکائیل میں چھ لغات ہیں:

۱- میکائیل۔ یہ نافع کی قراءت ہے۔ میکائیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ) یہ حمزہ کی قراءت ہے۔ میکال۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور ابوعمرو و حفص عن عاصم کی قراءت ہے۔

ابن کثیر سے تین وجوہ مروی ہیں۔ کعب بن مالک نے کہا:

و یوم بدر لقینا کم لنا مددٌ   فیه مع النصر میکالٌ و جبریل

جنگ بدر میں ہمارا تم سے مقابلہ ہوا تو ہمارے لئے مدد تھی اور اس مدد میں میکائیل و جبریل تھے۔

ایک اور شاعر نے کہا:(5)

عبدوا الصلیب و کذّبوا بمحمدٍ   و بجبریل و کذبوا میکالا

انہوں نے صلیب کی عبادت کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور جبریل و میکائیل کو جھٹلایا۔

۴- میکئیل جیسے میکعیل یہ ابن محیصن کی قراءت ہے۔

۵- میکاییل (دو یا) یہ اعمش کی قراءت ہے۔ (ان سے اختلاف کے ساتھ)

۶- میکاءل۔ جیسے کہا جاتا ہے اسراءل (ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ) یہ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ حضرت ابن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً   4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا   5۔ ایضاً

عباس نے ذکر کیا ہے کہ جبر، میکا اور اسراف یہ تمام عجمی الفاظ ہیں۔ ان کا معنی عبد، غلام ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے (1)۔ اسی سے حضرت ابوبکر صدیق کا قول ہے جب انہوں نے مسیلمہ کذاب کی سجع سنی۔ یہ ایسی کلام ہے جو ال سے نہیں ہے یعنی اللہ کی طرف سے نہیں ہے (2)۔ قرآن حکیم میں ہے: لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (توبہ: 10) ایک تاویل کے مطابق اس آیت میں اِلًّا سے مراد اللہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

ماوردی نے کہا: جبرئیل اور میکائیل دو اسم ہیں ایک کا معنی عبداللہ اور دوسرے کا معنی عبیداللہ ہے کیونکہ ایل سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جبر کا معنی عبد ہے اور میکا کا معنی عبید ہے، گویا جبریل کا معنی عبداللہ اور میکائیل کا معنی عبیداللہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے مفسرین میں اس کی مخالفت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض مفسرین نے یہ زیادہ کیا ہے: اسرافیل عبدالرحمٰن (3)۔ نحاس نے کہا: جس نے حدیث کی تاویل کی کہ جبر سے مراد عبد اور ائل سے مراد اللہ ہے تو انہیں یہ کہنا واجب ہے: ھذا جبریلُ، رایت جبریلَ، مررت بجبریلِ اور یہ نہیں کہا جاتا۔ تو ثابت ہوا کہ حدیث کا مطلب ہے یہ مسمیٰ ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اگر اس طرح ہوتا جس طرح انہوں نے کہا ہے تو یہ منصرف ہوتا۔ اس کا منصرف نہ ہونا دلیل ہے کہ یہ اسم واحد، مفرد ہے، مضاف نہیں ہے۔ عبدالغنی الحافظ نے، افلت بن خلیفہ...... وہ فلیت العامری ہے جو ابو احسان ہے...... عن جسرہ بنت دجاجہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اللّٰھم رب جبریل و میکائیل و اسرافیل اعوذبك من حر النار و عذاب القبر۔ اے اللہ! جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب میں تجھ سے آگ کی گرمی اور عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝

''اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے''۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ ابن صوریا کا جواب ہے جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جس کو ہم پہچانتے ہوں۔ آپ پر کوئی واضح آیت نہیں اتری کہ ہم آپ کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ یہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ (4)

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے۔ بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لائی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا یہاں واو عطف کے لئے ہے اس پر الف استفہام داخل ہوا ہے، جیسے فاء پر داخل ہوتا ہے جیسے أفحكم الجاهلية۔ أفانت تسمع الصم۔ افتتخذونه و ذريته، اور جس طرح ثم پر داخل ہوتا ہے۔ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: یہ واو زائدہ ہے، کسائی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اَوْ تھا تسہیل کے لئے واو کو

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

حرکت دی گئی۔ ایک قوم نے اوْ واؤ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ بل کے معنی میں ہوگا، جیسے کوئی کہتا ہے: لاضربنك پھر جواب دینے والا کہتا ہے: او یکفی اللہ۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ تمام تکلف ہے۔ صحیح سیبویہ کا قول ہے كُلَّمَا ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ آیت میں مراد مالک بن صیف ہے، اس کو ابن صیف بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا: اللہ کی قسم! ہماری کتاب میں ہم سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیا گیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہود نے عہد کیا تھا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ مل کر مشرکین عرب کی مخالفت کریں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا۔ عطا نے کہا: یہ وہ عہود تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان تھے۔ ان کو انہوں نے توڑا۔ جیسے قریظہ اور نضیر نے کیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ (انفال)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ، النبذ کا معنی پھینکنا ہے، اسی سے النبیذ، المنبوذ پھینکا ہوا۔

ابوالاسود نے کہا:

وخبرنی من کنت ارسلت انما　　اخذت کتابی معرضاً بشمالکا
نظرت الی عنوانه فنبذته　　کنبذك نعلاً اخلقت من نعالکا

مجھے اس نے بتایا جسے میں نے بھیجا تھا تو نے میری کتاب اعراض کرتے ہوئے لی۔ اور تو نے اس کے عنوان کو دیکھا تو تو نے اسے اس طرح پھینک دیا جس طرح تو پرانی جوتی پھینکتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ان الذین امرتهم ان یعدلوا　　نبذوا کتابك واستحلوا المحرما

بے شک وہ لوگ جنہیں تو نے عدل کرنے کا حکم دیا انہوں نے تیری کتاب کو پھینک دیا اور حرام کو حلال کیا۔

یہ مثال اس شخص کے لئے دی جاتی ہے جو کسی شے کو حقیر سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے۔ عرب کہتے ہیں: اجعل هذا خلف ظهرك دبراً منك و تحت قدمك یعنی اس کام کو چھوڑ دے اور اس سے اعراض کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (ہود: 92) (اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت) فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:

تمیم بن زید لا تکونن حاجتی　　بظهرٍ فلا یعیا علی جوابها

اے تمیم بن زید! میری حاجت کو پشت کے پیچھے نہ ڈال مجھے اس کا جواب عاجز نہیں کرے گا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ یہ مبتدا ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ فعل مستقبل خبر ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یہ رسول کی نعت ہے اور حال کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا جائز ہے نَبَذَ فَرِیْقٌ یہ لَمَّا کا جواب ہے مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ کتاب اللہ، نبذ کی وجہ سے منصوب ہے، مراد تورات ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور آپ کو جھٹلانا، یہ کتاب اللہ (تورات) کو پھینکنا ہے۔ سدی نے کہا: انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: كِتٰبَ اللّٰهِ سے قرآن مراد لینا بھی جائز ہے۔ شعبی نے کہا: قرآن ان کے ہاتھوں میں تھا اسے پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل انہوں نے ترک کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: انہوں نے اسے ریشم و دیباج میں لپیٹ دیا اور اسے سونے اور چاندی سے مزین کر دیا لیکن اس کے حلال کو حلال نہ کیا اور اس کے حرام کو حرام نہ کیا۔ یہی نبذ ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ بے علموں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی۔ جب انہوں نے جاہلوں والا فعل کیا۔ یہ لفظ بھی آئیں گے کہ انہوں نے علم کے باوجود کفر کیا۔ (2)

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۫ؕ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝

''اور پیروی کرنے لگے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں حالانکہ سلیمان علیہ السلام نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو۔ نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت اور ماروت تھے۔ اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا۔ (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس میں جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لئے نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح) کو۔ کاش! وہ کچھ جانتے''۔

اس میں چوبیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔ یہ اس گروہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جنہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں جادو کی اتباع کی، وہ یہود تھے۔ سدی نے کہا: یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تورات کے ساتھ معارضہ کیا تو تورات اور قرآن عقائد و نظریات میں متفق نکلے تو انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان کا رسولوں میں ذکر کیا تو ان کے کسی عالم نے کہا: محمد کہتا ہے کہ ابن داؤد نبی تھا اللہ کی قسم! وہ تو جادوگر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (1) یعنی شیطانوں نے بنی آدم کے دلوں میں ڈالا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں، پرندوں اور جنوں کو مسخر کیے ہوئے ہیں یہ سب جادو کے بل بوتے پر ہے۔ کلبی نے کہا: شیطانوں نے جادو اور تلبیس کا عمل لکھا آصف کی زبان پر جو حضرت سلیمان کا کاتب تھا۔ انہوں نے ان کتب کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے مصلیٰ کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہی بخشی اور حضرت سلیمان کو اس کا علم نہ تھا جب حضرت سلیمان کا وصال ہوا تو انہوں نے اس جادو کو نکالا اور لوگوں کو کہا: اس علم کے ذریعے سلیمان تم پر حکومت کرتے تھے۔ پس لوگوں نے اس جادو کو سیکھا۔

بنی اسرائیل کے علماء نے کہا: معاذ اللہ! یہ حضرت سلمان علیہ السلام کا علم نہیں ہو سکتا اور بے وقوف نے کہا: یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے۔ پس لوگ اس جادو کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے انبیاء کی کتب کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت سلیمان کا عذر نازل فرمایا اور جو ان پر تہمت لگائی گئی تھی اس کی براءت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ۔ عطا نے کہا تَتْلُوا کا معنی تقرؤا ہے یعنی تلاوت کرنا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تَتْلُوا کا معنی تتبع اور پیروی کرنا ہے، جیسے تو کہتا ہے: جاء القوم یتلو بعضھم بعضاً بعض بعض کے پیچھے آئے۔ (2)

طبری نے کہا: اتَّبَعُوْا بمعنی فضلوا (فضلیت دینا) (3)

میں کہتا ہوں: ہر وہ شخص جو کسی کی اتباع کرتا ہے اسے اپنے آگے کرتا ہے تو وہ اسے فضیلت دیتا ہے۔ تتلوا کا معنی تلت یعنی ماضی کے معنی میں ہے۔ شاعر نے کہا:

وإذا مررت بقبره فاعقر به | كوم الهجان و كل طرف سابح
وانضح جوانب قبره بدمائها | فلقد يكون اخادم و ذبائح

جب تو اس کی قبر کے پاس سے گزرے تو عمدہ اور تیز رفتار اونٹنیوں کو ذبح کر اور قبر کی ہر طرف ان کا خون چھڑک دے تحقیق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وہ خون بہانے والا اور ذبح کرنے والا تھا۔

اس شعر میں قد یکون بمعنی کان ہے، اور (ما) اتبعوا کا مفعول ہے یعنی کچھ شیطانوں نے حضرت سلیمان کے خلاف کیا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ بعض علماء نے فرمایا: ما نافیہ ہے لیکن یہ نظم کلام کے اعتبار سے کلام کی صحت کے اعتبار سے درست نہیں۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ملک سلیمان سے مراد ان کی شرع اور ان کی نبوت ہے(1)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے: علی عھد ملك سلیمان اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فی ملك سلیمان ہے۔ یعنی ان کے قصص، صفات اور اخبار میں (2)۔ فراء نے کہا: ایسی جگہ پر علی اور فی درست ہیں۔

علی فرمایا اور بعد نہیں فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج:52)

اس حدیث میں امنیتہ کا معنی ہے: اس کی تلاوت میں۔ شیطان کا معنی اور اس کا اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں شیطان سے مراد شیاطین الجن ہیں۔ اس اسم سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد انسانوں کے شیاطین ہیں جو گمراہی میں سرکشی کرتے ہیں جیسے جریر کا قول ہے۔

ایام یدعوننی الشیطان من غزلی و کن یھویننی اذ کنت شیطاناً

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی برأت فرمائی کسی آیت میں یہ نہیں گزرا کہ کسی نے حضرت سلیمان کی طرف کفر کی نسبت کی ہو لیکن یہود نے آپ کی طرف جادو کی نسبت کی لیکن جب جادو کفر تھا تو یہ ایسے ہو گیا جیسے انہوں نے کفر کی طرف ان کی نسبت کی۔

پھر فرمایا: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا اللہ تعالیٰ نے جادو کی تعلیم کی وجہ سے ان کے کفر کو ثابت کیا(3)۔ يُعَلِّمُوْنَ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے اور خبر ثانی کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے، عاصم کے سوا کوفیوں نے و لکن الشیاطین یعنی لکن کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الشیاطین کے نون کو رفع دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ انفال میں ہے لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال:17) ابن عامر نے ان سے موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے تشدید اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے لکن اس کے دو معانی ہیں۔ ماضی کی خبر کی نفی اور مستقبل کی خبر کا اثبات۔ یہ تین کلمات سے بنایا گیا ہے۔ لام، کاف، ان لانفی ہے۔ ک خطاب ہے اور ان اثبات و تحقیق ہے۔ استثقال کی وجہ سے ہمزہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ کبھی مثقلہ اور مخففہ ہوتا ہے جب مثقلہ ہو تو نصب دیتا ہے جیسے ان مثقلہ نصب دیتا ہے اور جب مخففہ ہو تو رفع دیتا ہے جیسے اِن مخففہ عن المثقلہ سے رفع دیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: السِّحْرَ (جادو)۔ بعض علماء نے فرمایا: سحر کا معنی حیلوں اور خیالوں سے چیز کو کچھ اور بنا کر دکھانا،

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ساحر (جادوگر) کچھ اشیاء اور معانی کرتا ہے وہ جس کے لئے جادو کیا گیا ہوتا ہے اسے وہ اپنی حقیقت کے خلاف تصور کرتا ہے جیسے وہ شخص جو دور سے سراب کو دیکھتا ہے اور وہ اسے پانی تصور کرتا ہے۔ جیسے چلنے والی کشتی میں بیٹھا ہوا شخص یہ خیال کرتا ہے کہ درخت اور پہاڑ اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سحرت الصبی سے مشتق ہے جب تو اسے دھوکا دے اور تو اسے کھیل میں ڈال دے۔ التسحیر اس کی مثل ہے۔

لبید نے کہا:

فان تسالینا فیم نحن فاِنّنا عصا فیر من ھذا الانام المسَحّرِ

اگر تو ہمارے متعلق پوچھے کہ ہم کس حیثیت میں ہیں تو ہم اس مسحر مخلوق میں سے چڑیاں ہیں۔

ایک اور نے کہا:

اُرانا مُوضعِین لامرِ غیبٍ و نسحَرُ بالطعام و بالشراب

عصافیر و ذبان و دودٌ اجرأ من مجلحَة الذئاب

ہم موت کے لئے جلدی کرنے والے ہیں اور ہمیں کھانے پینے کے ساتھ جادو کیا گیا ہے۔ چڑیاں مکھیاں اور کیڑے ہیں اور جری بھیڑیے سے زیادہ جری ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما انت من المسحرین۔ کہا جاتا ہے: المسحر وہ ہوتا ہے جو سحر والا پیدا کیا گیا ہو کبھی اس کا معنی المعلّلین بھی کیا جاتا ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو طعام کھاتے ہیں مشروب پیتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الخفاء ہے کیونکہ جادو خفیہ عمل کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی الصرف ہے کہا جاتا ہے: ما سحرك عن كذا یعنی کس چیز نے تجھے اس سے پھیر دیا۔

السِّحْرَ، جو اپنی جہت سے پھیرا گیا ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الاستمالہ ہے فقد سحرك اس نے تجھے مائل کیا۔ بعض نے فرمایا: بل نحن قوم مسحورون یعنی ہم پر جادو کیا گیا ہے تخییل کی وجہ سے ہماری معرفت زائل کر دی گئی ہے۔ جوہری نے کہا: السِّحْرَ کا معنی الأخذة ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ لطیف ہو اور باریک ہو وہ سحر ہے۔ سحرہ یسحرہ سحراً والساحر، سحرہ کا معنی دھوکا دینا بھی ہے۔ یہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: ہم زمانہ جاہلیت میں السحر کو العِضہ کہتے تھے اور عربوں کے نزدیک العضہ کا مطلب بہت زیادہ ملمع سازی کرنا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو کہتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

اعوذ بربی من النافثا ت فی عِضہ العاضہ المُعضہ

میں اپنے رب سے جادو میں پھونکے مارنے والیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4: کیا جادو کی حقیقت ہے یا نہیں۔ غزنوی حنفی نے ''عیون المعانی'' میں ذکر کیا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک سحر دھوکا ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک یہ وسوسہ اور امراض ہیں۔ فرمایا: ہمارے نزدیک اس کی اصل طلسم

ہے جو ستاروں کی تاثیر پر مبنی ہوتا ہے جیسے فرعون کی لاٹھیوں کے بارے میں سورج کی تاثیر۔ یا اس میں شیاطین کی تعظیم ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی مشکل کو آسان کر دیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نزدیک یہ حق ہے اور اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ پھر جادو میں کچھ وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کی صفائی سے ہوتا ہے جیسے الشعوذۃ (مداری کا تماشا)۔ پھرتی سے کرتب دکھانے والے کو الشعوذی کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: الشعوذۃ بادیہ نشینوں کے کلام سے نہیں ہے۔ یہ ہاتھوں میں پھرتی ہوتی ہے یہ جادو کی طرح ہے۔ اس سے کلام کچھ ہوتا ہے جو محفوظ کیا جاتا ہے اور دم ہوتے ہیں جو اللہ کے اسماء سے پڑھے جاتے ہیں کبھی یہ شیاطین کے عہود سے ہوتا ہے کبھی دواؤں سے اور دھوؤں وغیرہ سے ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: رسول اللہ نے کلام میں فصاحت اور زبان میں طاقت کو سحر کہا ہے۔ فرمایا: ان من البیان لسحرا (بیان میں سے بعض جادو ہوتے ہیں) اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کیونکہ اس میں بھی باطل کو درست کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ سامع اسے حق سمجھنے لگتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اِنّ من البیان لسحرا (☆)، فصاحت و بلاغت کی مدح اور بیان کی تفضیل کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے پہلا قول اصح ہے اور اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فلعلّ بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعضٍ (1) (شاید کوئی تم میں سے دوسرے سے اپنی حجت کو بیان کرنے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہو) اور فرمایا: اِنّ ابغضکم الیّ الثرثارون المتفیھقون تم میں سے میرے نزدیک مبغوض لوگ زیادہ بولنے والے ہیں۔ الثرثرۃ، کلام کی کثرت اور اسے گھمانا ہے۔ کہا جاتا ہے: فھو ثرثار مھذار زیادہ باتیں کرنے والا، ہنسانے والا۔ المتفیھق بھی اسی طرح ہے۔ ابن زید نے کہا: فلان یتفیھق فی کلامہ۔ وہ اپنے کلام میں وسعت رکھتا ہے۔ اس نے کہا اس کی اصل الفھق ہے جس کا معنی بھرنا ہے۔ گویا ایسا شخص کلام کے ساتھ اپنے منہ کو بھر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ معنی جو ہم نے بیان کیا ہے اس کی تفسیر عامر الشعبی جو حدیث کے راوی ہیں اور صعصعہ بن صوحان نے کی ہے، دونوں حضرات نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان من البیان لسحرا ایک شخص پر حق ہوتا تھا (2) اور وہ حقدار سے زیادہ چرب زبان ہوتا تھا وہ اپنے بیان سے قوم کو مسحور کر دیتا تھا تو وہ حق لے جاتا تھا حالانکہ اس پر حق ہوتا تھا۔ علماء نے بلاغت اور لسانت کی تعریف کی ہے جب وہ لمبی گفتگو کرنے اور باطل کو حق ثابت کرنے کی حد تک نہ پہنچے۔ یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 6: جادو کچھ ایسا ہوتا ہے جس کا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو لوگوں کی صورتوں میں تبدیلی کرنے اور جانوروں کی ہیئت میں ان کو نکالنے، اور ایک مہینہ کی مسافت ایک رات میں طے کرنے، ہوا میں اڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو اس قسم کا فعل کرے تاکہ لوگوں کو وہم دلائے کہ یہ حق ہے تو اس کی طرف سے کفر ہوگا۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم قشیری کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح بخاری، باب من اقام البینۃ بعد الیمین، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی الشعر، حدیث نمبر 4359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4651

عمرو نے کہا: جو یہ کہتا ہے کہ ساحر حیوان کو ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف تبدیل کرتا ہے وہ انسان کو گدھا بنا دیتا ہے اور وہ اجساد کو نقل کرنے، انہیں ہلاک کرنے اور انہیں تبدیل کرنے پر قادر ہے وہ ایسے ساحر کے قتل کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء سے کفر کرنے والا ہے وہ ان کی آیات اور معجزات کی مثل دعویٰ کرنے والا ہے اس طرح تو نبوت کی صحت کا علم درست نہیں رہے گا کیونکہ جب اس کی مثل حیلہ سے حاصل ہو جائے گا اور رہا وہ جو کہتا ہے کہ جادو، دھوکا، تمویہات، تخیلات اور جھوٹ کا نام ہے وہ جادوگر کو قتل کرنے کو واجب نہیں کہتا مگر یہ کہ اگر جادوگر اپنے فعل میں کسی کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7: اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ جادو ثابت ہے اس کی حقیقت ہے۔ عام معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق استر آبادی کا نظریہ یہ ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تمویہ اور تخیل ہے اور وہم دلانا ہے کہ چیز اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔ یہ شعبدہ بازی اور ہاتھوں کی پھرتی کی ایک صورت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾ (طہ) (یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں)۔

یہ نہیں فرمایا کہ یہ حقیقت میں دوڑ رہے تھے بلکہ فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ (اسے خیال گزرتا تھا) اسی طرح فرمایا: سَحَرُوٓا أَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف: 116)۔ (انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ تخیل وغیرہ جادو میں سے ہے لیکن اس کے بعد ایسے امور ثابت ہیں عقل جن کو جائز قرار دیتی ہے اور نقل بھی ان کے متعلق وارد ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں جادو اور اس کی تعلیم کا ذکر آیا ہے اگر اس کی حقیقت نہ ہوتی تو اس کی تعلیم نہ ہوتی، نہ اللہ تعالیٰ خبر دیتے کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ چیز دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جادوگروں کے واقعہ میں فرمایا: وَجَآءُو بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾ (اعراف) (اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا) اور سورہ فلق میں اس کا ذکر فرمایا۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کے نزول کا سبب لبید بن اعصم کا جادو تھا۔ جس کا ذکر بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کیا جس کو لبید بن اعصم کہا جاتا تھا(1)۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب جادو ختم ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی شفاء علت کے ختم ہونے اور مرض کے زائل ہونے کے ساتھ ہوتی ہے۔

یہ دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخبار اس کے وجود اور وقوع پر قطعی ہیں۔ اور صاحب عقل لوگوں کا اس پر اجماع ہے۔ چند معتزلیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ان کی اہل حق کی مخالفت قابل اعتناء نہیں، جادو عام ہو گیا ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی پھیلا ہوا تھا اور لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے اس کی اصل کا انکار نہیں کیا۔ سفیان نے ابو الاعور سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مصر کے شہروں میں سے ایک شہر میں جادو سیکھا گیا جس کو الفرما کہا جاتا تھا۔ پس جس نے اس کی تکذیب کی وہ کافر ہے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلانے والا ہے اور ایک مشاہدہ شدہ چیز کا انکار کرنے والا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب صفۃ ابلیس و جنودہ، حدیث نمبر 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 8: ہمارے علماء نے فرمایا: اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جادوگر کے ہاتھ پر خارق للعادت عمل ظاہر ہو جو انسان کی قدرت میں نہیں ہوتا مثلاً مرض میں مبتلا کر دے، مرض کو ختم کر دے، عقل زائل ہو جائے، کوئی عضو ٹیڑھا کر دے۔ اس کے علاوہ چیزیں جن کا بندوں سے سرزد ہونا محال ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا: جادو میں یہ بعید نہیں کہ جادوگر کا جسم اتنا باریک ہو جائے کہ وہ کسی سوراخ یا چھوٹی سی کھڑکی میں داخل ہو جائے، بانس کے سرے پر کھڑا ہو جائے، باریک دھاگے پر چلنے لگے، ہوا میں اڑنے لگے، پانی پر چلنے لگے، کتے وغیرہ پر سوار ہو جائے، لیکن اس کے باوجود جادو نہ اس کا موجب ہوگا نہ اس عمل کے وقوع کی علت ہوگا نہ سبب مولد ہوگا اور نہ جادوگر اس میں مستقل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کو پیدا فرماتا ہے اور جادو کے پائے جانے کے وقت وہ اسے تخلیق فرما دیتا ہے جس طرح کھانے کے وقت سیر ہونا پیدا فرماتا ہے پانی پینے کے وقت سیرابی پیدا فرماتا ہے۔ سفیان نے عمار ذہبی سے روایت کیا ہے کہ ایک جادوگر ولید بن عقبہ کے پاس ایک رسی پر چل رہا تھا وہ گدھے کی دبر سے داخل ہوتا اور اس کے منہ سے نکل جاتا، جندب نے اس پر تلوار سونتی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ جندب بن کعب ازدی تھے جنہیں البجلی کہا جاتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: (میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کو جندب کہا جائے گا وہ تلوار مارے گا حق اور باطل کے درمیان فرق کر دے گا) اس کو جندب خیال کرتے تھے یہ جادوگر کا قاتل ہے۔ علی بن مدینی نے کہا: ان سے حارثہ بن مضرب نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ جادو کے وقت جو کچھ کرتا ہے جیسے مکڑی کا اتارنا، جوؤں اور مینڈک، دریا کا پھٹنا، عصا کا سانپ میں تبدیل ہونا، مردوں کو زندہ کرنا، جانوروں کو بلوانا اور اسی قسم کی دوسری آیات جو رسل سے ظاہر ہوئیں، یہ جادو میں سے نہیں ہیں۔ یہ معجزات اور ایسی دوسری چیزیں جن کا حکم قطعی ہے کہ وہ نہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ جادوگر کے ارادہ کے وقت ایسا نہیں کرے گا۔ قاضی ابو بکر بن طیب نے کہا: ہم اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اگر اجماع نہ ہوتا تو ہم جائز قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 10: جادو اور معجزہ کے درمیان فرق: ہمارے علماء نے فرمایا: جادو جادوگر وغیرہ سے پایا جاتا ہے کبھی اس کو ایک جماعت جانتی ہے اور ان کے لئے ایک وقت میں اس کا لانا ممکن ہوتا ہے اور معجزہ وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مثل اور اس کا معارض پیش کرنے کی کسی کو قدرت ہی نہیں دیتا، پھر جادوگر نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا پس اس سے جو صادر ہوتا ہے وہ معجزہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ معجزہ کے لئے نبوت کا دعویٰ اور اس کا چیلنج شرط ہے جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11: فقہاء کا مسلم اور ذمی جادوگر کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان جب ایسے کلام سے جادو کرے جو کفر ہو تو اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہوتا ہے جیسے زندیق اور زانی ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر کہا ہے۔ فرمایا: وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (البقرہ: 102) (اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا)

یہ امام احمد بن حنبل، ابوثور، اسحاق، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت حفصہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت قیس بن سعد اور سات تابعین سے جادوگر کا قتل کرنا مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، جادوگر کی حد تلوار سے اسے مارنا ہے۔ یہ ترمذی نے نقل کی ہے اور یہ قوی نہیں ہے۔ اسماعیل بن مسلم منفرد ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابن عیینہ نے اسماعیل بن مسلم عن الحسن کے سلسلہ میں مرسلاً روایت کی ہے اور بعض علماء نے عن الحسن عن الجندب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے آپ نے ایک جادوگرنی بیچی تھی جس نے جادو کیا تھا اور اس کی قیمت غلاموں کے آزاد کرنے میں لگائی تھی۔ ابن منذر نے کہا: جب کوئی شخص اقرار کرے کہ اس نے ایسے کلام سے جادو کیا ہے جو کفر تھا تو اس کا قتل کرنا واجب ہے اگرچہ وہ توبہ نہ بھی کرے اسی طرح اگر اس پر گواہوں سے ثابت ہو جائے اور وہ گواہ کلام کی ایسی صفت بیان کریں جس سے کفر لازم آتا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے...... اگر وہ کلام جو اس نے ذکر کیا ہے، جس کے ساتھ اس نے جادو کیا ہے، وہ کفر نہیں ہے تو اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اس نے مسحور میں کوئی جنایت پیدا کر دی جو قصاص کا موجب ہے تو اس نے یہ عمل عمداً کیا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ ایسی جنایت ہے جس میں قصاص نہیں ہے تو اس میں اس کی دیت ہوگی...... ابن منذر نے کہا: جب کسی مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف ہو تو اس قول کی اتباع واجب ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ موافق ہو اور یہ جائز ہے کہ جو جادو جس کے کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ ایسا جادو ہو جو کفر ہو تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے موافق ہے اور یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ نے جس جادوگرنی کے بیچنے کا حکم فرمایا وہ جادو کفر نہ ہو اور اگر کوئی جندب کی حدیث سے حجت پکڑے جو حضرت جندب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے جادوگر کی حد، اسے تلوار سے مارنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو احتمال ہے کہ اس جادوگر کے قتل کا حکم ہو جس کا جادو کفر ہو۔ تو یہ ان اخبار کے موافق ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں مگر تین چیزوں میں سے ایک چیز پائے جانے کے ساتھ۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے مسلمانوں کے خون بہانا ممنوع ہیں ان کو یقین کے بغیر مباح نہیں کیا جا سکتا اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بعض علماء نے فرمایا کہ اہل فن نے کہا: جادو مکمل نہیں ہوتا مگر کفر اور تکبر کے ساتھ یا شیطان کی تعظیم کے ساتھ۔ پس اس تقدیر پر جادو کفر پر دال ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی سے مروی ہے کہ جادوگر کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے اور وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور اس میں قتل خطا کی طرح دیت ہوگی۔ اگر اس نے جادو کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو اسے اس کے نقصان کی مقدار ادب سکھایا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ دو اعتبار سے باطل ہے ایک یہ کہ اسے جادو کا علم نہیں تھا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مؤلف کلام ہے جس کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ ان النفس بالنفس والعین بالعین۔۔۔ الآیۃ، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غیر اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور ان کی طرف مقادیر اور کائنات کی نسبت کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تصریح فرمائی کہ یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ یعنی حضرت سلیمان نے جادو کے قول کے ساتھ کفر نہیں کیا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا یعنی شیاطین نے جادو کر کے اور اس کی تعلیم کے ساتھ کفر کیا۔ ہاروت و ماروت کہتے تھے ہم فتنہ ہیں، تو کفر نہ کر۔ یہ بیان کی تاکید ہے۔

امام مالک کے اصحاب نے حجت پکڑی ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جادو ایک پوشیدہ عمل ہے اس کا کرنے والا اسے ظاہر نہیں کرتا۔ پس اس کی توبہ معروف نہیں ہوگی جیسے زندیق ہے۔ جو مرتد ہو کر کفر کا اظہار کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام مالک نے فرمایا: اگر جادوگر یا زندیق توبہ کر لے، اس سے پہلے کہ اس کے خلاف گواہی دی جائے، تو ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اس کی حجت یہ ارشاد ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (غافر: 85) (انہیں نفع نہ دیا ان کے ایمان نے جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا) یہ دلیل ہے کہ عذاب کے نزول سے پہلے ان کا ایمان انہیں نفع دیتا تھا۔ اسی طرح یہ دونوں (ساحر، زندیق) ہیں۔

مسئلہ نمبر 12: رہا ذمی جادوگر، بعض علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا: اسے قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے، اور جو اس نے جنایت کی ہوگی اس کا ضمان دے گا۔ اگر کوئی ایسا کافر شخص جادو کرے جس کے ساتھ معاہدہ نہیں ہے تو اسے قتل کیا جائے گا (1)، ابن خویز منداد نے کہا: اگر جادوگر ذمی ہو تو امام مالک سے اس کے متعلق روایت مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام کا اقرار ہے، کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اگرچہ وہ اسلام قبول کر بھی لے۔ رہا حربی تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ توبہ کر لے۔ اسی طرح امام مالک نے اس ذمی کے بارے فرمایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدزبانی کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام قبول کرنا ہے۔ کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی جیسے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

امام مالک نے ذمی کے بارے میں فرمایا: جب وہ جادو کرے، تو اسے سزا دی جائے گی مگر یہ کہ وہ اپنے جادو کے ساتھ کسی کو قتل کرے یا کوئی اور جنایت کر دے تو اس کے جرم کی مقدار اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے عہد کو توڑا اور جادوگر کا وارث، جادوگر کی میراث نہیں پائے گا کیونکہ جادوگر کافر ہے، مگر یہ کہ اس کا جادو کفر نہ ہو...... امام مالک نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو اپنے خاوند کو اپنے سے جادو کے ذریعے روک لیتی ہے یا کسی اور سے روک لیتی ہے تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 13: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ساحر (جادوگر) سے جادو کو دور کرنے کا سوال کیا جائے گا؟ حضرت سعید بن مسیب نے اس کو جائز قرار دیا جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے اور اسی کی طرف مزنی کا میلان ہے۔ حضرت حسن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بصری نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ شعبی نے کہا: تعویذ اور دم سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن بطال نے کہا: وہب بن منبہ کی کتاب میں ہے کہ سبز سات پتے بیری کے لے پھر اسے دو پتھروں کے درمیان پیس دے پھر اسے پانی میں ملائے اور اس پر آیۃ الکرسی پڑھے پھر اس سے تین گھونٹ پی لے اور بقیہ پانی کے ساتھ غسل کرے، اس عمل سے جو کچھ اسے ہوگا وہ دور ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ ایک عمدہ عمل ہے اس شخص کے لئے جسے اپنے اہل سے حقوق زوجیت سے روکا گیا ہو۔

مسئلہ نمبر 14: معتزلہ کے علماء نے شیاطین اور جنوں کا انکار کیا ہے۔ ان کا انکار ان کی کم فکری اور دین کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے اثبات میں کوئی عقلی محال نہیں ہے کتاب وسنت کی نصوص ان کے اثبات پر دلالت کرتی ہے اور عقلمند اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے والے پر حق ہے کہ جس کا عقل تقاضا کرے اس کے جواز کو ثابت کرے۔ شرع نے اس کے ثبوت پر نص قائم فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (شیطانوں نے کفر کیا) اور فرمایا: وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ (الانبیاء: 82) (شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرے) اس کے علاوہ دوسری آیات اور سورہ جن ان کے ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1)۔ (شیطان ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے) اس خبر کا بہت سے لوگوں نے انکار کیا ہے اور انہوں نے ایک جسم میں دو خون کا ہونا محال قرار دیا ہے جبکہ عقل انسانی میں ان کے چلنے کو محال قرار نہیں دیتی جبکہ شیطانوں کے اجسام رقیق اور بسیط ہیں جیسا کہ بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ کہتے ہیں...... اگر ان کے جسم کثیف بھی ہوتے تو بھی صحیح تھا جیسا کہ کھانا، پینا جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کیڑے بنی آدم میں ہوتے ہیں جبکہ وہ بھی زندہ ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ، مانفی کے لئے ہے واو عاطفہ ہے اس کا عطف وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہود نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبریل و میکائیل کو جادو کے ساتھ اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی فرمائی (2)۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: وما کفر سلیمان و ما انزل علی الملکین و لکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر ببابل ھاروت و ماروت، ہاروت اور ماروت وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا میں الشَّيٰطِيْنَ سے بدل ہے (3)۔ جن صورتوں پر یہ آیت محمول کی گئی ہے ان میں سے یہ صورت اولیٰ ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اصح ہے اور اس کے سوا کسی قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ جادو، شیاطین کے جوہر کی لطافت اور ان کے افہام کی دقت کی وجہ سے ان سے حاصل کیا جاتا ہے اکثر انسانوں میں سے اسے عورتیں کرتی ہیں خصوصاً حیض کی حالت میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ (فلق)

شاعر نے کہا:

اعوذ بربی من النافثات

1۔ صحیح بخاری، باب ھل یدرأ المعتکف من نفسہ، حدیث نمبر 1898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

میں پھونکیں مارنے والیوں سے اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 16: اگر کوئی یہ کہے کہ جمع سے تثنیہ کیسے بدل ہوسکتا ہے حالانکہ مبدل منہ اور بدل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا جواب تین اعتبار سے ہے: (۱) تثنیہ پر جمع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء: 11) اور ماں کو ثلث (۱/۳) سے السدس (۱/۶) کی طرف صرف دو بھائی یا دو سے زیادہ ہی محجوب کرتے ہیں جیسا کہ سورہ نساء میں آئے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دو جب تعلیم میں اصل تھے تو ان پر نص قائم فرمادی۔ ان کے متبعین کا ذکر نہ کیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ (مدثر) (اس پر نو فرشتے مقرر ہیں) تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کا خصوصی ذکر کیا ان کے تمرد و سرکشی کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝ (الرحمن) (ان باغوں میں پھل، کھجور اور انار ہیں) اور (جبریل و میکائیل) کا قول۔ یہ قرآن میں اور عرب کلام میں کثرت سے ہے کہ عموم میں سے بعض کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے ان کے شرف کی وجہ سے اور ان کی فضیلت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران: 68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم علیہ السلام سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز اور و جبریل و میکال ان کے ذکر کی حکمت یا تو ان کی اعلیٰ طہارت کی وجہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝ (الرحمٰن) یا اکثریت کی وجہ سے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جعلت لی الارض مسجداً و تربتها طهوراً (1)۔ میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور اس کی مٹی طہارت کا باعث بنائی گئی ہے یا تمرد و سرکشی کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: ما کا عطف السحر پر ہے اور یہ مفعول ہے اس بنا پر ما، الذی کے معنی میں ہوگا اور جادو، دو فرشتوں پر لوگوں کے فتنہ اور آزمائش کے لئے اتارا گیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ چاہے اپنے بندوں کو آزمائے اس کی شان کو زیبا ہے۔ جیسے اس نے طالوت کو نہر سے آزمایا تھا اسی وجہ سے وہ فرشتے کہتے: اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ (ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں) ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جادوگر کا عمل کفر ہے اگر تو ہماری اطاعت کرے گا تو نجات پائے گا اور اگر ہماری نافرمانی کرے گا تو ہلاک ہوگا۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، کعب احبار، سدی اور کلبی سے اس کا معنی مروی ہے۔ جب اولاد آدم میں فساد زیادہ ہوگیا تھا...... یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں تھا...... ملائکہ نے انہیں عار دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تم میں ان عناصر کی ترکیب ہوتی جو ترکیب ان میں ہے تو تم بھی ان جیسے اعمال کرتے۔ فرشتوں نے کہا: تیری ذات پاک ہے ہمارے لئے تو یہ مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اعلیٰ فرشتوں میں سے دو فرشتوں کا انتخاب کرو۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو چنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں اتارا اور ان میں شہوات کا عنصر رکھ دیا، ان پر ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوگئے اس عورت کا نام نبطی زبان میں (بیدخت)

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیداً طیبا۔ الآیۃ، حدیث 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

فارسی میں ناھیل اور عربی میں زہرہ تھا، وہ ان کے پاس جھگڑا لے کر آئی اور ان دونوں فرشتوں نے اس سے خواہش پوری کرنی چاہی تو اس نے انکار کیا، مگر یہ کہ وہ دونوں اس کے دین میں داخل ہو جائیں، شراب پئیں اور اس نفس کو قتل کریں جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ انہوں نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور انہوں نے شراب پی۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انہیں ایک شخص نے دیکھ لیا انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ ان فرشتوں سے اس عورت نے اس اسم کے بارے پوچھا جس کے ذریعے وہ آسمان پر چڑھ جاتے تھے۔ وہ بھی انہوں نے اسے سکھا دیا۔ اس نے وہ کلمہ پڑھا اور اوپر چڑھ گئی۔ اسے ایک ستارہ کی شکل میں مسخ کر دیا۔

سالم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے کعب الحبر نے بتایا کہ ان دونوں فرشتوں نے اپنا دن مکمل نہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے وہ سب کام کر دیئے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے تھے۔ اس حدیث کے علاوہ میں ہے۔ ان فرشتوں کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کا عذاب اختیار کیا۔ انہیں بابل میں ایک سرنگ میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ بعض نے کہا: بابل سے مراد بابل عراق میں ہے۔ بعض نے کہا: بابل نہاوند ہے (1)، عطا سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر جب زہرہ ستارہ اور سہیل ستارہ کو دیکھتے تو انہیں برا بھلا کہتے اور فرماتے: سہیل یمن میں عشر وصول کرتا تھا اور لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور زہرہ ہاروت و ماروت کی دوست تھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ سب حضرت ابن عمر وغیرہ سے بعید اور ضعیف ہے کوئی چیز بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو ان فرشتوں کے متعلق اصول رد کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی پر امین ہیں اس کے رسولوں کے سفیر ہیں لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) (نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجا لاتے ہیں جو حکم انہیں فرمایا جاتا ہے) بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں) يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات دن اور وہ اکتاتے نہیں)

رہی عقل تو وہ فرشتوں کے معصیت میں واقع ہونے کا انکار نہیں کرتی۔ عقلاً ان سے اس کا خلاف پایا جا سکتا ہے جن کا انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں شہوات پیدا کی جا سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء، اولیاء، فضلاء، علماء کا خوف تھا لیکن اس جائز کے وقوع کا ادراک نہیں ہو سکتا مگر نقل کے ساتھ۔ اور وہ نقل صحیح نہیں ہے ایک اور چیز جو اس واقعہ کی عدم صحت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا فرمایا اور ان کواکب کو پیدا فرمایا جب آسمان کو پیدا فرمایا۔ حدیث میں ہے: جب آسمان کو پیدا کیا گیا تو اس میں سات گردش کرنے والے ستارے پیدا کیے: زحل، مشتری، بہرام، عطارد، زہرہ، سورج اور چاند۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) کا یہی معنی ہے اس سے ثابت ہوا کہ زہرہ اور سہیل یہ آدم کی تخلیق سے پہلے موجود تھے پھر فرشتوں کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ "ہمارے لئے یہ مناسب نہیں" باعث عار ہے، تو ہمیں آزمانے پر قادر نہیں یہ کفر ہے ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتے ہیں اور معزز فرشتوں کی

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

طرف ایسی نسبت کرنے سے پناہ مانگتے ہیں ہم ان کی پاکیزگی اور طہارت بیان کرتے ہیں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اور جو کچھ مفسرین نے نقل کیا ہے اس سے فرشتے پاک ہیں: سبحان ربك رب العزة عما يصفون۔

مسئلہ نمبر 17: حضرت ابن عباس، ابن ابزی، ضحاک اور حسن نے الملِکین (لام کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ابن ابزی نے کہا: وہ داود اور سلیمان میں اس قول کے مطابق ما نافیہ ہے نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: یہ دو عجمی کافر تھے بابل کے بادشاہ تھے اس قول کے مطابق ما مفعولہ ہوگا نافیہ نہ ہوگا۔ (1)

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِبَابِلَ یہ تانیث اور تعریف اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ زمین کا ایک قطر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد عراق اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اہل کوفہ سے کہا: تم حیرہ اور بابل کے درمیان ہو۔ قتادہ نے کہا: یہ نصیبین سے راس العین تک کا علاقہ ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ مغرب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): یہ ضعیف ہے ایک قوم نے کہا: نہاوند کا پہاڑ ہے۔ بابل نام رکھنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں زبانیں گڈمڈ ہوتی تھیں جب نمرود کا محل گرا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ فرمایا کہ بنی آدم کی زبانوں کے درمیان اختلاف پیدا فرمائے تو اس نے ایک ہوا بھیجی تو اس نے لوگوں کو آفاق سے بابل تک جمع کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں کو گڈمڈ کر دیا پھر اس ہوا نے انہیں شہروں میں جدا جدا کر دیا۔ البلبلة کا معنی ہے، جدا جدا کرنا۔ فرمایا: اس کا معنی الخلیل ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: جو کچھ البلبلہ کے بارے میں کہا گیا اس میں سے سب سے بہتر وہ روایت ہے جو داؤد بن ابی ہند نے علیاء بن احمر سے انہوں نے حضرت عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب جودی پہاڑ سے نیچے اترے تو انہوں نے ایک شہر بنایا جس کا نام ثمانین (اسی ۸۰) رکھا۔ ایک دن صبح کی تو اس میں اسی زبانیں بولی جا رہی تھیں ان میں سے ایک عربی زبان تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔

مسئلہ نمبر 19: عبد اللہ بن بشر مازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بچو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ دنیا ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ جادوگر ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دنیا ان سے زیادہ جادوگر ہے کیونکہ دنیا تجھے اپنے دھوکے کے ساتھ مسحور کرتی ہے، اپنے فتنہ کو تجھ سے چھپاتی ہے۔ پس یہ تجھے اپنے حرص اور اپنے حصول کے لئے مقابلہ کی دعوت دیتی ہے، اس کے لئے جمع کرنا اور منع کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے درمیان جدائی کر دیتی ہے تیرے اور حق تعالیٰ کی رویت اور اس کی رعایت کے درمیان فرق کر دیتی ہے۔ پس دنیا ان دونوں سے زیادہ مسحور کن ہے۔ یہ تیرے دل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق ادا کرنے اور وعدہ اور وعید سے روک لیتی ہے دنیا کا جادو، اس کی محبت، اس کی شہوات، تیرا لذت حاصل کرنا اور جھوٹی تمناؤں کے ساتھ تیرا تمنا کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے دل کو یہ چیزیں گھیر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حبك الشئ يعمي و يصم۔ تجھے کسی شے کی محبت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی اور معرفہ ہیں ان کی جمع ھواریت اور مواریت ہے جیسے طواغیت کہا جاتا ہے ھوارتہ و ھوار و موارتہ و موار اس کی مثل جالوت اور طالوت ہے، یہ پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے یا اس کے علاوہ تھے۔ اس میں اختلاف ہے زجاج نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا اور فرشتے جادو سے ڈرانے کی تعلیم لوگوں کو دیتے تھے نہ ان کی طرف دعوت دینے کی تعلیم دیتے تھے۔ زجاج نے کہا: یہ اکثر اہل لغت اور اہل نظر لوگوں کا قول ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے رکنے کی تعلیم دیتے تھے وہ انہیں کہتے تھے کہ ایسا نہ کرو ایسا حیلہ نہ کرو تا کہ تم مرد اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دو۔ اس پر نہی (روکنا) اتارا گیا تھا وہ گویا لوگوں سے کہتے ایسا عمل نہ کرو۔ یعَلمان بمعنی یُعلِمان (آگاہ کرتے تھے) جیسا کہ فرمایا وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (الاسراء: 70) اس میں کرّمنا بمعنی اکرمنا ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ، من تاکید کے لئے زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے: و یعلمان احداً، حَتّٰى يَقُوْلَآ حتیٰ کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے ہذیل اور ثقیف کی لغت عتی (یعنی عین غیر معجمہ کے ساتھ) ہے اور یعلمان میں ضمیر ہاروت و ماروت کے لئے ہے (1)۔ یعلمان کے بارے میں دو قول ہیں: (1) یہ تعلیم سے اپنے باب سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اعلام سے ہے، التعلیم سے نہیں ہے۔ پس یُعَلّمان بمعنی یُعْلِمان ہوگا۔ کلام عرب میں تعلّم بمعنی اعلم آیا ہے۔ ابن الاعرابی (2) اور ابن الانباری نے یہ ذکر کیا ہے۔

کعب بن مالک نے کہا:

تعلّم رسول اللہ انك مدرکی وان وعیداً منك کالاخذ بالید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگاہ کیا کہ تو مجھے پانے والا ہے اور تیری وعید، ہاتھ سے پکڑنے کی طرح ہے۔

القطامی نے کہا:

تعلم ان بعد الغی رشدا وان لذلِكَ الغیّ انقشاعاً

اس نے آگاہ کیا کہ گمراہی کے بعد ہدایت ہے، اس گمراہی کو (ایک دن) چھٹنا ہے۔

زہیر نے کہا:

تعلمن ھا لعمر اللہ ذاقسما فاقدر بذرعك وانظر این تنسلك

ایک اور شاعر کا قول ہے:

تعلم انہ لا طیرَ الا علی متطیر و ھو الثبور

ان تمام اشعار میں تعلم بمعنی اعلم استعمال ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ جب فرشتوں نے اپنا فتنہ ہونا بتا دیا تو دنیا ان سے زیادہ مسحور کن ہوئی جبکہ وہ اپنے فتنہ کو چھپاتی ہے۔
فَلَا تَكۡفُرۡ ایک جماعت نے کہا: جادو کی تعلیم کے ساتھ کفر نہ کر، ایک فرقہ نے کہا: جادو کے استعمال کے ساتھ کفر نہ کر۔
مہدوی نے کہا: یہ استہزا ہے کیونکہ وہ دونوں اسے یہ کہتے جس کی گمراہی متحقق ہوتی۔(1)

مسئلہ نمبر 22: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَيَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡهُمَا سیبویہ نے کہا: تقدیر عبارت فهم يتعلمون ہے اس کی مثل فرمایا: کن فیکون۔ بعض نے فرمایا: یہ ما يعلمان کے محل پر معطوف ہے کیونکہ (وما يعلمان) اگر اس پر مانا فیہ داخل ہوا ہے تو اس کے ضمن میں تعلیم میں ایجاب ہے(2)۔ فراء نے کہا یہ قول يُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ کی طرف لوٹایا گیا ہے یعنی وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور سیکھتے تھے۔ اور فَيَتَعَلَّمُوۡنَ کا قول اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ کے قول سے متصل ہوگا۔ پس وہ آتے تھے اور سیکھتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ دونوں کہتے تھے جو بھی ان کے پاس آتا تھا ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کر اگر وہ لوٹنے سے انکار کرتا تو وہ اسے کہتے راکھ لے آ اور اس میں پیشاب کر جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف چڑھ جاتا۔ یہ ایمان ہوتا تھا۔ پھر اس سے سیاہ دھواں نکلتا تھا وہ اس کے کان میں داخل ہو جاتا تھا یہ کفر تھا۔ جب وہ انہیں اس کے متعلق بتاتا جو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ اسے جادو بتاتے جس کے ساتھ وہ میاں بیوی میں جدائی کرتا(3)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جادوگر اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے تفریق کے متعلق بتایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمت اور اس کی تعلیم کی غایت کا اظہار کرنے کے لئے اس کو ذکر کیا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ پر قادر ہوتا تو اسے بھی ذکر فرماتا۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ اغلب سے ذکر کیا ہے۔ اس کا انکار نہیں کہ جادو کی دلوں میں تاثیر ہوتی ہے، محبت، بغض اور شر پیدا کرنے کے اعتبار سے حتیٰ کہ جادوگر میاں، بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ مرد اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یہ تکالیف کے داخل کرنے اور بڑی بڑی بیماریوں میں مبتلا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب مشاہدہ سے پایا گیا ہے اور اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ، مَا هُمۡ یہ جادوگروں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے کہا: شیاطین کی طرف اشارہ ہے بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ، بِهٖ کی ضمیر جادو کی طرف لوٹ رہی ہے مِنۡ اَحَدٍ میں مِنۡ زائدہ ہے۔ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ اللہ کے ارادہ اور اس کی قضا سے نہ کہ اس کے امر سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائیوں کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ساتھ اپنی مخلوق پر فیصلہ فرماتا ہے۔ زجاج نے کہا اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ کا مطلب ہے الا بعلم اللہ (یعنی اللہ کے علم سے)۔

نحاس نے کہا ابو اسحاق کا قول، اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ، الا بعلم اللہ کے معنی میں ہے، غلط ہے کیونکہ علم میں وقد اذنت اذنا کہا جاتا ہے، لیکن ان کے اور اس کے درمیان یہ حلال نہیں تھا وہ ایسا کرتے تھے تو گویا اس نے مجازاً مباح کر دیا۔

مسئلہ نمبر 24: وَيَتَعَلَّمُوۡنَ مَا يَضُرُّهُمۡ یعنی آخرت میں نقصان دے گی۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تھوڑا سا نفع حاصل کیا۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں وہ اسے نقصان دے گا کیونکہ جادو کا نقصان اور تفریق دنیا میں جادوگر پر لوٹتی ہے جب وہ دریافت ہو جائے، کیونکہ اسے تادیب کی جاتی ہے اور اسے جھڑکا جاتا ہے اور اسے جادو کی نحوست لاحق ہوتی ہے۔

باقی آیات واضح ہیں کیونکہ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا میں لام تاکید ہے لَمَنِ اشْتَرٰىهُ لام قسم کے لئے ہے یہ بھی تاکید کے لئے ہے اور مَنْ محل رفع میں مبتدا ہے کیونکہ لام کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اور مَنْ بمعنی الذی ہے۔ فراء نے کہا: یہ مجازات کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: یہ شرط کی جگہ نہیں ہے اور من بمعنی الذی ہے جیسے تو کہتا ہے: علمت لمن جاءك ما له عقل۔ (من خلاق) من زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے ما له فی الاخرۃ خلاق اور مثبت کلام میں مِنْ زائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: کبھی مثبت میں بھی زائدہ ہوتا ہے اور انہوں نے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: 31)

الخلاق کا معنی حصہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ زجاج نے کہا: اہل لغت کے نزدیک اسی طرح ہے مگر یہ خیر کے حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے متعلق پوچھا گیا: وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ پہلے بتایا کہ وہ جان چکے تھے پھر فرمایا وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ بتایا کہ وہ نہیں جانتے اس کا جواب وہ ہے جو قطرب اور اخفش نے دیا ہے۔ جو جانتے تھے وہ شیاطین تھے اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا وہ انسان تھے جو نہیں جانتے تھے۔ زجاج نے کہا: علی بن سلیمان نے کہا: میرے نزدیک عمدہ یہ ہے کہ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا یہ فرشتوں کے لئے ہو کیونکہ وہ جاننے کے زیادہ مستحق ہیں اور فرمایا عَلِمُوْا (حالانکہ وہ دو تھے) تو یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے الزیدان قاموا۔ زجاج نے کہا: جنہوں نے جانا وہ علماء یہود ہیں۔ لیکن کہا گیا ہے: لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ پس وہ اس شخص کی جگہ داخل ہوئے جس کو کہا جاتا ہے: لست بعالم تو عالم نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق اپنا عمل ترک کر دیا اور ان سے رہنمائی حاصل کی جنہوں نے جادو کا عمل کیا تھا۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو (اس کا) ثواب اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا۔ کاش! وہ کچھ جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا یعنی جادو سے بچتے۔ لمثوبۃ ثواب۔ یہ بعض علماء کے نزدیک لو کا جواب ہے۔ اخفش سعید نے کہا: یہاں لو کا جواب لفظاً نہیں ہے لیکن معنی ہے۔ اس کا معنی ہے لاثیبوا۔ انهم میں اَنْ کا محل رفع ہے یعنی لو وقع ایمانهم۔ کیونکہ لو کے ساتھ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر متصل ہوتا ہے کیونکہ یہ حروف شرط کے قائم مقام ہے کیونکہ اس کے لئے جواب ضروری ہے اور (ان) اس کے ساتھ فعل متصل ہوتا ہے۔ محمد بن زید نے فرمایا: لو کے ساتھ مجاز جائز نہیں کیونکہ تمام حروف مجازات ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں جب لو میں یہ معنی نہیں ہے تو اس سے مجازات بھی جائز نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اے ایمان والو! (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو ''راعِنا'' بلکہ کہو ''انظرنا'' اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا یہود کی جہالتوں میں سے ایک اور چیز کو ذکر فرمایا۔ اور مقصود مسلمانوں کو اس کی مثل سے روکنا ہے۔ رَاعِنَا کی حقیقت لغت میں أَرْعِنا و لنرعك۔ کیونکہ باب مفاعلہ دو آدمیوں سے ہوتا ہے۔ پس یہ رعاك اللہ سے مشتق ہوگا یعنی تو ہماری حفاظت کر اور ہم تمہاری حفاظت کریں گے دارقبنا و لنرقبك۔ آپ ہمارا خیال کریں ہم تمہارا خیال کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارعنا سمعك سے مشتق ہو یعنی آپ ہماری کلام کے لئے اپنے سننے کو فارغ کریں۔ اس خطاب میں جفاء ہے۔ پس مومنین کو حکم دیا کہ الفاظ میں اچھے الفاظ استعمال کریں اور معانی میں سے لطیف معانی اختیار کریں (1)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے رَاعِنَا یعنی وہ رغبت وطلب کی جہت سے عرض کرتے کہ آپ ہماری طرف نظر التفات فرمائیں اور یہ یہود کی زبان میں بددعا تھا۔ یعنی تم سنو تو کبھی نہ سنے، پس یہود نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا: پہلے ہم اسے مخفی طور پر بددعا دیتے تھے اب ہم اسے جہراً بددعا دیں گے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لفظ سے مخاطب کرتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ نے ان سے یہ کلمہ سنا، حضرت سعد ان کی لغت جانتے تھے۔ حضرت سعد نے یہود سے کہا: تم پر اللہ کی لعنت ہو اب اگر میں نے تم میں سے کسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے کہتے سنا تو میں اس کی گردن اتار دوں گا۔ یہود نے کہا: کیا تم یہ کلمہ نہیں کہتے ہو تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تا کہ لفظ میں یہود اقتدا نہ کریں اور اس سے وہ فاسد معنی کا قصد نہ کریں۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: (۱) ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرنا جس میں تنقیص شان اور عظمت میں کمی کا اشارہ ہو، اور اس سے تعریضاً قذف کا سمجھنا نکلتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حد کا موجب ہے جبکہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک حد واجب نہیں۔ انہوں نے تعریض (اشارۃً کلام کرنا) قذف اور غیر قذف کا احتمال رکھتی ہے اور حد شبہات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ النور میں آئے گا۔ (۲) سد ذرائع کو مضبوطی سے پکڑنا اور آپ کی حمایت کرنا۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی یہی ہے اس اصل پر کتاب وسنت دلالت کرتی ہے ذریعہ اس امر کو کہتے ہیں جو فی نفسہ ممنوع نہیں ہوتا لیکن اس کے کرنے سے ممنوع کام میں وقوع کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی دلیل تو یہ آیت کریمہ ہے، اس سے تمسک کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ لفظ استعمال کرتے تھے ان کی لغت میں یہ بددعا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ جان لیا تو مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے ہی منع فرما دیا کیونکہ یہ بددعا کا ذریعہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام:108)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بتوں کو گالی دینے سے منع فرمایا اس اندیشہ سے کہ مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ الآیہ (الاعراف:163) اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار حرام کر دیا۔ ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر ظاہر ہو کر آتی تھیں وہ انہیں ہفتہ کے دن روک دیتے تھے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے تھے۔ پس روکنا شکار کا ذریعہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندروں اور خنازیر میں انہیں مسخ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لئے تحذیر کے لئے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا کو فرمایا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ:35) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

رہیں احادیث، تو اس مفہوم میں بہت سی احادیث صحیحہ ثابت ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں۔ انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ تھے ان میں کوئی نیک شخص ہوتا تھا پھر وہ مر جاتا تھا تو یہ اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے اور اس میں ان نیک لوگوں کی تصویریں بناتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برے ترین لوگ ہیں (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ان کے پہلے لوگوں نے یہ عمل اس لئے کیا تھا تاکہ ان تصویروں کو دیکھ کر انس حاصل کریں اور ان کے احوال صالحہ کو یاد کریں اور یہ بھی ان کی طرح کوشش اور محنت کریں اور ان کی قبور کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ پس ان پر جب عرصہ دراز گزر گیا پھر ان کے بعد کے لوگ آئے جو پہلے لوگوں کی اغراض سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء واجداد ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے۔ پس انہوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثل سے منع فرمایا اور جو ایسا کرے اس پر سخت انکار اور وعید فرمائی اور جو کام اس عمل تک پہنچانے والے تھے ان سے بھی روک دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے جس نے اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبور کو مساجد بنایا اور فرمایا: اے اللہ! میری قبر کو ایسا بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے ان کے درمیان متشابہات امور ہیں جو ان شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لے گا اور جو شبہات میں واقع ہوگا وہ حرام میں واقع ہوگا جیسے چرواہا چراگاہ کے اردگرد (مویشی) چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائے۔ (الحدیث) (2)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبہات کی طرف جانے سے منع فرمایا اس خوف سے کہ وہ محرمات میں واقع ہو جائے گا۔ یہ سد ذرائع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندہ متقین میں سے نہیں ہوتا حتیٰ کہ وہ اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں کوئی حرج نہیں احتیاط کرتے ہوئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہو جس میں حرج ہے (3)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب بناء المسجد علی القبر، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الحلال بین والحرام بین وبینهما مشبهات، حدیث نمبر 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب الورع والتقوی، حدیث نمبر 4204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والدین کو گالی دینا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ ایک شخص دوسرے کے والد کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے جو دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے اسے اپنے والدین کو گالی دینے والا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم بیع عینۃ کرو گے اور گائیوں کے دموں کو پکڑو گے اور کھیتی پر خوش ہو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط فرمائے گا اور یہ ذلت تم سے دور نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ(1)۔ ابو عبید الہروی نے کہا: بیع عینۃ یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے شخص کو معلوم قیمت کے ساتھ مخصوص مدت تک ایک چیز فروخت کرتا تھا پھر بیچنے والا اس خریدنے والے سے وہی چیز اس سے کم قیمت میں خرید لیتا تھا۔

فرمایا: اگر بیع عینہ طلب کرنے والے کی موجودگی میں سامان کسی دوسرے شخص سے معلوم ثمن کے ساتھ خریدے۔ پھر وہ قبضہ کرے پھر وہ عینہ طلب کرنے والے کو اس قیمت سے زیادہ پر بیچ دے، جس میں اس نے خریدی تھی ایک معین مدت تک، پھر یہ مشتری پہلے بائع کو نقد فروخت کرے کم قیمت پر تو یہ بھی بیع عینۃ ہوگی۔ یہ پہلی صورت سے زیادہ آسان ہے اور بعض کے نزدیک یہ جائز ہے، اس کو بیع عینہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صاحب عینۃ کو نقدی حاصل ہوتی ہے، یہ اس لئے ہے کہ حاضر مال موجود ہے مشتری اسے خریدتا ہے تاکہ عین حاضر مال کے ساتھ اسے بیچے جو اسے جلدی مل جائے۔

ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم کی ام ولد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا کہ اس نے زید کو ایک غلام آٹھ سو میں ادھار بیچا ہے پھر اس سے نقد چھ سو میں خرید لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: برا ہے جو تو نے بیچا ہے اور برا ہے جو تو نے خریدا ہے۔ زید کو یہ پہنچاؤ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کیے ہوئے جہاد کو باطل کر دیا اگر اس نے اس بیع سے توبہ نہ کی۔ یہ حضرت عائشہ نے یقیناً اپنی رائے سے نہیں کہا ہوگا کیونکہ اعمال کا باطل کرنا، اس کی معرفت صرف وحی سے ہوسکتی ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود اور شک (والی بیع) کو چھوڑو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی دراہم کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا جن کے درمیان حریزہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ ہمارے سد ذرائع پر دلائل ہیں، اس پر مالکی علماء نے بیوع وغیرہ میں کتاب الآجال وغیرہ مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ شوافع کے نزدیک کتاب الآجال (مدت کے بارے میں مسائل) نہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک مختلف مستقل عقود ہیں۔ انہوں نے کہا: اشیاء کی اصل ظواہر پر ہے نہ کہ ظنون (گمان) پر ہے۔ مالکی علماء نے اس سامان کو زیادہ دراہم کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ عین ربا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا۔ یہ نہی تحریمی ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ حضرت حسن نے راعناً پڑھا یعنی تنوین کے ساتھ اور فرمایا: اس کا مطلب ہے: نامناسب بات۔ یہ مصدر ہے قول کی وجہ سے اسے نصب دی گئی ہے۔ یعنی لا تقولوا رعونۃ۔ اور زر بن حبیش اور اعمش نے راعونا پڑھا ہے، یہ پہاڑ کی چوٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبل

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النھی عن العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارعن چوٹی والا پہاڑ، جیش ارعن یعنی متفرق لشکر۔ اسی طرح رجل ارعن، متفرق حجتوں والا جس کی عقل مجتمع نہ ہو، نحاس سے یہ مروی ہے۔ ابن فارس نے کہا رعُن الرجل یَرْعُنُ رعنا فھو أرعن، محتاج شخص، المرأۃ رعناء، بلند عورت، بصرہ کو رعناء کہتے ہیں کیونکہ وہ پہاڑ کی بلندی کے مشابہ ہے۔ ابن درید نے یہی کہا ہے۔ فرزدق نے کہا ہے:

لو لا ابن عتبہ عمرو والرجاء لہ　　ما کانت البصرۃ الرعناء لی وطناً

اگر ابن عتبہ عمرو نہ ہوتا اور اس کی امید نہ ہوتی تو بصرہ رعناء میرا وطن نہ ہوتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوا انْظُرْنَا مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ حضرت محمد ﷺ کو عزت و احترام سے مخاطب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف توجہ فرمائیں، ہماری طرف نظر کرم فرمائیں۔ تعدیہ کا حرف حذف کیا گیا ہے یعنی تقدیر یوں ہے: وانظر الینا

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ظاھرات الجمال والحسن ینظر　　ن کما ینظر الاراك الظباء

ظاہری حسن و جمال والی دیکھی جاتی ہیں جس طرح ہرنیاں اراک بان کے درخت کو دیکھتی ہیں۔

اس شعر میں عبارت الی الاراک تھا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہمیں سمجھایئے اور ہمارے لئے بیان فرمایئے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہمارا انتظار فرمایئے اور ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ کلام فرمایئے۔ شاعر نے کہا:

فانکما ان تنظرانی ساعۃً　　من الدھر ینفعنی لدی ام جندب

تم دونوں اگر ایک گھڑی میری طرف دیکھ لو تو مجھے ام جندب کے سامنے یہ نفع دے گا۔

ظاہراً اس کا مطلب آنکھ سے دیکھنے کی استدعا ہے جو دیکھنا تدبر حال سے مقترن ہو۔ یہ راعنا کا معنی ہے، مومنین کے لئے لفظ بدل دیا گیا اور یہود کا تعلق زائل ہو گیا۔ اعمش وغیرہ نے أَنظِرنا ہمزہ قطعی اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہمیں مہلت دیجئے حتیٰ کہ ہم آپ کی بات سمجھ جائیں اور آپ سے مفہوم حاصل کرلیں۔ (1)

شاعر نے کہا:

ابا ھند فلا تعجل علینا　　وانظرنا نخبرك الیقینا

اے ابو ہند! ہم پر جلدی نہ کر اور ہمیں مہلت دے ہم تجھے یقینی خبر دیں گے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسْمَعُوْا پہلے نہی فرمائی اب حکم دیا۔ سننے کا حکم دیا جس کے ضمن میں اطاعت ہے۔ جان لو! جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے گا وہ کافر ہوگا عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ (2)

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضا

مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

''نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرما لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ یعنی خواہش نہیں کرتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ، وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ، اهل پر معطوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ کا عطف الَّذِيْنَ پر ہو۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ، من زائدہ ہے خیر فعل مجہول کا اسم ہے اَنْ محل نصب میں ہے، یعنی بان ینزل - وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ۔ یعنی بنبوتہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ مختص فرمایا(1)۔ ایک قوم نے کہا: الرحمة سے مراد قرآن ہے(2)۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں رحمت عام ہے ان تمام انواع رحمت کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پہلے فرمائیں اور جواب فرما رہا ہے(3)۔ کہا جاتا ہے: رحِم یرحمُ جب کوئی نرم ہو جائے، الرحم والمرحمة والرحمة تمام کا ایک معنی ہے۔ ابن فارس نے یہ کہا ہے: رحمة الله لعبادہ، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور انہیں معاف کرنا مراد ہے وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ ذُو بمعنی صاحب ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

''جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے''۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا، نُنْسِهَا کا عطف ننسخ پر ہے، جزم کی وجہ سے یا کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے ننسأها پڑھا ہے انہوں نے جزم کی وجہ سے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے اس کا معنی آگے آئے گا نَاْتِ یہ جواب شرط ہے۔ یہ احکام میں ایک عظیم آیت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہود نے جب مسلمانوں سے کعبہ کی طرف منہ کرنے میں حسد کیا اور اس کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنے اصحاب کو ایک چیز کا حکم دیتا ہے پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ پس قرآن ان کی طرف سے ہے اسی وجہ سے قرآن کا بعض، بعض کے مخالف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (نحل: 101) اور مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ کا ارشاد نازل فرمایا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 2: اس باب کی معرفت بڑی مؤکد ہے اور اس کا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے علماء کو بھی استغناء نہیں اس کا انکار صرف غبی جہلاء ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس پر بہت احکام مرتب ہوتے ہیں حرام سے حلال کی معرفت ہوتی ہے۔ ابوالبختری نے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ وہاں ایک شخص لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ اجتماع کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: ایک شخص لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ شخص لوگوں کو نصیحت نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہے: میں فلاں ابن فلاں ہوں مجھے پہچانو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور پوچھا: کیا تو ناسخ، منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہماری مسجد سے نکل جا اس میں تو وعظ و نصیحت نہ کر۔ دوسری روایت میں ہے، کیا تو ناسخ و منسوخ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: عرب کلام میں نسخ دو وجوہ سے ہے:

۱۔ ایک اس کا معنی نقل کرنا ہے جیسے ایک کتاب سے دوسری کتاب کو نقل کرنا، اس معنی کے اعتبار سے پورا قرآن منسوخ ہوگا یعنی یہ لوح محفوظ سے نقل ہوا ہے اور بیت العزت کی طرف آسمان دنیا میں اترا ہے۔ اس آیت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ (الجاثیہ) یعنی ہم اس کے لکھنے اور اس کے اثبات کا حکم دیتے ہیں۔ (1)

۲۔ نسخ کا دوسرا معنی ابطال اور زائل کرنا ہے۔ یہاں یہی مقصود ہے اور یہ لغت میں پھر دو قسموں میں منقسم ہے: (۱) کسی شے کو ختم کر دینا اور زائل کر دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا۔ اس سے نسخت الشمس الظل، جب سورج سائے کو مٹا دے اور اس کے قائم مقام دوسرے سائے کو کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ، اور صحیح مسلم میں ہے: لم تکن نبوة قط الا تناسخت یعنی نبوت ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھرتی رہی یعنی امت کا معاملہ پھرتا رہا۔ ابن فارس نے کہا: نسخ کا معنی کتاب کا نقل کرنا، اور النسخ کا معنی کسی ایسے امر کو ختم کر دینا جس پر پہلے عمل ہو رہا تھا پھر تو اسے کسی حادثہ کی وجہ سے ختم کر دے، جیسے کسی خاص امر کے لئے ایک آیت نازل ہوتی پھر دوسری آیت کے ساتھ وہ منسوخ ہو جاتی۔ ہر وہ چیز جو کسی شے کے قائم مقام ہو جائے تو اس نے اسے منسوخ کر دیا۔ کہا جاتا ہے: انتسخت الشمس الظل، الشیب الشباب سورج نے سائے کو ختم کر دیا، بڑھاپے نے جوانی کو ختم کر دیا۔ تناسخ الورثة ورثاء دوسرے ورثاء کے بعد مر گئے، اور میراث کی اصل قائم ہے۔ تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی طرح تناسخ الازمنة والقرون ہے یعنی ہر زمانہ اور ہر قوم پہلے زمانہ اور پہلی قوم کو ختم کر دیتی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ چیز کو ختم کر دینا اور اس کے قائم مقام دوسری چیز نہ رکھنا۔ جیسے نسخت الریح الاثر (2) ہوا نے اثر مٹا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

دیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ (الحج: 52) (جو شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دیتا ہے) اس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور اس کا بدل مصحف میں ثابت نہیں ہوتا۔ ابو عبید نے کہا: یہ نسخ کی دوسری قسم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سورت نازل ہوتی تھی پھر وہ اٹھالی جاتی تھی نہ اس کو پڑھا جاتا تھا اور نہ اس کو لکھا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں: اسی سے وہ روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سورۂ احزاب، طوالت میں سورۂ بقرہ کے برابر تھی جیسا کہ سورۂ احزاب میں یہ تفصیل سے بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے جو ابوبکر انباری نے بیان کی۔ فرمایا: مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں نصر بن داؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بیان کیا ہمیں عبد اللہ بن صالح نے بیان کیا انہوں نے لیث سے انہوں نے یونس اور عقیل سے انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا، فرمایا: مجھے ابو امامۃ بن سہل بن حنیف نے حضرت سعید بن مسیب کی مجلس میں بیان کیا کہ ایک شخص رات کو اٹھا تا کہ قرآن کی سورت تلاوت کرے تو وہ اس میں سے کچھ بھی پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ دوسرا اٹھا تو وہ بھی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، تیسرا اٹھا تو وہ بھی اس سورت میں سے کچھ پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ وہ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا میں یارسول اللہ! کھڑا ہوا تا کہ قرآن کی سورت پڑھوں تو میں اس کی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، دوسرا اٹھا اس نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری بھی یہی کیفیت تھی، تیسرا اٹھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! یارسول اللہ! میری بھی یہی کیفیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورت گزشتہ رات اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دی۔ ایک روایت میں ہے، سعید بن مسیب سنتے تھے جو ابوامامہ بیان کرتے تھے اور انکار نہیں کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 4: متاخرین علماء اسلام کے ایک طائفہ نے اس کے جواز کا انکار کیا ہے اور ان کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ سلف صالحین کا اجماع ہے کہ شریعت میں نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح یہود کے ایک گروہ نے بھی نسخ کا انکار کیا ہے، اس کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ان کے اپنے خیال کے مطابق تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے نکلنے کے وقت فرمایا: ہر چوپایہ تمہارے لئے اور اولاد کے لئے خوراک ہے اور میں نے یہ تمہارے لئے مطلق رکھا ہے جیسے نبات تمہارے لئے حلال کی ہیں لیکن خون حلال نہیں ہے اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوان حرام کر دیئے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھائی کی بہن سے شادی کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر اس کو حرام کر دیا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا پھر فرمایا تو اسے ذبح نہ کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اپنے ان لوگوں کو قتل کریں جو بچھڑے کی پوجا کرتے ہیں پھر ان سے تلوار اٹھانے کا حکم دیا، پہلے وہ اپنی نبوت کے ساتھ مکلف نہ تھے پھر اس کے بعد اس کے ساتھ مکلف ہوئے۔ یہ البداء سے نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کو ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف نقل کرنا ہے اور ایک حکم کو دوسرے حکم کی طرف نقل کرنا ہے اس میں کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مملکت کا کمال مقصود ہوتا ہے۔ اس میں عقلاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء کرام کی شریعتوں سے مخلوق کے دنیوی اور اخروی مصالح کا

قصد کیا گیا ہے، بدأہ تو تب لازم آتی جب وہ امور کے انجام کو جاننے والا نہ ہوتا اور جو انجام کو جاننے والا ہوتا ہے وہ مصالح کی تبدیلی کے مطابق اپنے خطابات کو تبدیل کرتا ہے، جیسے طبیب اپنے مریض کے احوال کے مطابق خطابات کو بدلتا ہے اس نے اپنی مشیت اور ارادہ سے اپنی مخلوق میں یہ تبدیلی رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا خطاب بدلتا ہے۔ اس کا علم اور اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوتا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی جہت سے محال ہے۔

یہود نے نسخ اور بداء کو ایک چیز بتایا ہے اسی وجہ سے انہوں نے نسخ کو جائز قرار نہیں دیا، پس وہ گمراہ ہوئے (1)۔ نحاس نے کہا: نسخ اور البداء کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسخ کا مطلب ہے ایک عبادت کو دوسری عبادت کی طرف بدلنا، (مثلاً) پہلے ایک چیز حلال تھی اسے حرام کر دیا، پہلے ایک چیز حرام تھی پھر اسے حلال کر دیا اور البداء یہ ہے کہ پہلے جس چیز پر عزم کیا گیا ہے اسے ترک کر دینا جیسے تو کہتا ہے تم آج فلاں کے پاس جاؤ پھر تو کہتا ہے اس کے پاس نہ جاؤ۔ تیرے لئے پہلے قول سے عدول ظاہر ہوتا ہے یہ انسان کو لاحق ہوتا ہے ان کے نقصان اور کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اگر تو کہے اس سال تو یہ چیز کاشت کر پھر تو کہے یہ نہ کر، تو یہ البداء ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ناسخ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے مجازاً خطاب شرعی کو ناسخ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے نسخ واقع ہوتا ہے (2)۔ جس طرح مجازاً محکوم فیہ کو ناسخ کا نام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رمضان کے روزوں نے عاشوراء کے روزہ کو منسوخ کر دیا۔ منسوخ وہ ہوتا ہے جو زائل کیا جاتا ہے اور منسوخ عنہ وہ ہوتا ہے جو زائل کی گئی عبادت کا مکلف ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: ہمارے ائمہ کی عبارات ناسخ کی تعریف میں مختلف ہیں۔ اہل سنت میں سے ماہر علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلے حکم شرعی کو بعد میں آنے والے خطاب سے زائل کرنا ہے۔ قاضی عبدالوہاب اور قاضی ابوبکر نے بھی اسی طرح تعریف کی ہے اور انہوں نے یہ زیادہ لکھا ہے اگر یہ والا حکم نہ آتا تو پہلا حکم ہی باقی رہتا (3)۔ ان دونوں حضرات نے نسخ کے لغوی معنی کا بھی لحاظ رکھا ہے کیونکہ نسخ کا لغوی معنی اٹھا دینا اور زائل کرنا ہے اور انہوں نے حکم عقلی سے احتراز کیا ہے۔ خطاب کا لفظ ذکر کیا تاکہ وجوہ دلالت نص، ظاہر، مفہوم وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ اور قیاس اور اجماع کو خارج کر دے کیونکہ قیاس اور اجماع میں نہ تو نسخ متصور ہو سکتا ہے نہ ان کے ساتھ نسخ ہو سکتا ہے اور تراخی کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ اگر بعد والا حکم پہلے سے متصل ہو تو وہ حکم کا بیان ہوتا ہے۔ ناسخ نہیں ہوتا یا دوسرا کلام، پہلے کلام کو اٹھانے والا ہوتا ہے۔ جیسے قم لا تقم، تو کھڑا ہو تو کھڑا نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 7: منسوخ ہمارے اہل سنت کے ائمہ کے نزدیک وہ حکم ہوتا ہے جس کی ذات ثابت ہو نہ اس کی مثل جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ خطاب، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مستقبل میں ثابت حکم کی مثال آنے والی نص سے زائل ہونے والا ہے اور اس قول کی طرف ان کی رہنمائی ان کے مذہب نے کی ہے کہ اوامر مراد ہوتے ہیں اور حُسن، حَسَن کی ذاتی صفت ہے اور اللہ کی مراد حَسَن ہے اس کو ہمارے علماء نے اپنی کتب میں رد کیا ہے۔ (4)

مسئلہ نمبر 8: ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اخبار میں نسخ داخل ہوتا ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ نسخ،

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اوامر ونواہی کے ساتھ خاص ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کذب محال ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: خبر جب حکم شرعی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو تو اس کا نسخ جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا (النحل: 67) اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

مسئلہ نمبر 9: عموم سے تخصیص وہم دلاتی ہے کہ یہ نسخ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ مخصص کو عموم شامل ہی نہیں ہوتا، اگر عموم کسی شے کو شامل ہو پھر اس شے کو عموم سے نکالا جائے تو یہ نسخ ہوگا تخصیص نہ ہوگی (2)۔ اور متقدمین علماء مجازاً تخصیص پر نسخ کا اطلاق کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: کبھی شرع میں ایسی اخبار وارد ہوتی ہے جن کا ظاہر مطلق اور استغراق ہوتا ہے اور ان کی تقیید دوسری جگہ وارد ہوتی ہے، پس وہ اطلاق اٹھ جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی)۔

اس آیت میں حکم کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا ہر حال میں قبول فرماتا ہے لیکن دوسرے مقام پر اس کی قید آئی ہے: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام: 41)

وہ شخص جسے بصیرت نہیں ہوتی وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اخبار میں نسخ کے باب سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اطلاق اور تقیید کے باب سے ہے۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

مسئلہ نمبر 11: ہمارے علماء نے فرمایا (3): اثقل (بھاری حکم) کا نسخ اخف (ہلکے حکم) کی طرف جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے دس کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے حکم کو دو کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور اخف حکم سے اثقل کی طرف نسخ بھی جائز ہے جیسے عاشوراء کے حکم کو رمضان کے روزوں سے منسوخ کر دیا۔ اس کا بیان روزوں والی آیت میں آئے گا۔ کبھی ایک حکم کو اس جیسے حکم سے منسوخ کیا جاتا ہے جیسے ایک قبلہ کو دوسرے قبلہ سے منسوخ کر دیا۔ کبھی ایک چیز کو منسوخ کیا جاتا ہے اور اس کا بدل نہیں دیا جاتا جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ قرآن کو قرآن کے ساتھ منسوخ کیا جاتا ہے اور سنت کو عبارت سے منسوخ کیا جاتا ہے اور عبارت سے مراد ''الخبر المتواتر القطعی'' ہے اور خبر واحد کو خبر واحد سے منسوخ کیا جاتا ہے۔

ماہرین ائمہ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن، سنت سے بھی منسوخ ہوتا ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں موجود ہے: لا وصیۃ لوارث کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے (4)۔ یہ امام مالک کے ظاہر مسائل سے ہے۔ امام شافعی (5) اور ابوالفرج مالکی نے اس کا انکار کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، اس دلیل سے کہ یہ سب اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، باب لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2703، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اختلاف ہے۔ مثلاً شادی شدہ زانی جس کو رجم کیا جاتا ہے اس سے کوڑوں کی سزا ساقط ہے اور یہ سنت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل سے ساقط ہے اور یہ واضح ہے۔ ماہرین علماء کا یہ بھی نظریہ ہے کہ سنت، قرآن کے ساتھ منسوخ ہوتی ہے اور یہ قبلہ کی تحویل میں موجود ہے کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا کتاب اللہ میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنہ:10) ان عورتوں کا رجوع، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قریش سے صلح کی بنا پر ہوا تھا۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ عقلاً خبر واحد سے قرآن کا نسخ جائز ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرعاً واقع ہوا ہے یا نہیں۔ ابوالمعالی وغیرہ کا خیال ہے کہ مسجد قبا کے واقعہ میں واقع ہوا تھا اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے۔ قیاس کے ساتھ نص کا نسخ صحیح نہیں ہے، کیونکہ قیاس کی شرائط میں سے ہے کہ وہ نص کے مخالف نہ ہو۔

یہ نسخ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں تھا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اور شریعت کے استقرار کے بعد، امت کا اجماع ہے کہ نسخ نہیں ہے اسی وجہ سے اجماع نہ منسوخ ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ نسخ واقع ہوتا ہے کیونکہ اجماع کا انعقاد وحی کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا اجماع پاتے ہیں جو نص کے مخالف ہوتا ہے تو پھر یہ جانا جائے گا کہ اجماع کسی ناسخ نص کی طرف منسوب ہے جسے ہم نہیں جانتے...... مخالف نص ایسی ہوتی ہے جس پر عمل چھوڑا جاتا ہے اور اس کا مقتضیٰ منسوخ ہوتا ہے لیکن اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے قرآن میں سال کی عدت والی آیت تلاوت کی جاتی ہے، اس میں غور کرو یہ ایک نفیس گفتگو ہے۔ کبھی حکم منسوخ ہوتا ہے، تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم، کبھی تلاوت منسوخ ہوتی ہے حکم منسوخ نہیں ہوتا جیسے آیت رجم۔ کبھی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں اور اس سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ہم پڑھتے تھے: لا ترغبوا عن آبائکم فانہ کفر۔ (اپنے آباء سے انحراف نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے)۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ جس کو ناسخ کا حکم نہ پہنچا ہو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے اس کا بیان تحویل قبلہ میں آئے گا۔

ماہرین کے نزدیک حکم عمل سے پہلے بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔ یہ ذبیح کے واقعہ میں موجود ہے اسی طرح نمازیں پچاس فرض تھیں عمل سے پہلے پانچ نمازوں سے منسوخ کر دی گئیں جیسا کہ سورۃ الاسراء اور سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 12: ناسخ کی پہچان کے طرق: (۱) نص کے الفاظ نسخ پر دلالت کرتے ہوں جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا(1)۔ (میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا۔ پس (اب) زیارت کیا کرو)۔ میں نے تمہیں مشروب پینے سے منع کیا تھا مگر چمڑے کے برتنوں میں۔ پس اب ہر برتن میں مشروب پیو مگر نشہ دینے والا مشروب نہ پیو۔ (۲) راوی تاریخ ذکر کر دے۔ مثلاً وہ کہے: میں نے خندق کے سال سنا تو اس سے پہلے والا حکم منسوخ معلوم ہو جائے گا یا کہے کہ فلاں فلاں حکم منسوخ ہے۔ (۳) امت کا اجماع ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ بعد میں آنے والا ہے۔ یہ اصول فقہ میں تفصیلی مباحث موجود ہیں ہم نے بقدر ضرورت ذکر کر دیا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ مسلم شریف، جلد 1 صفحہ 314 کتاب الجنائز، باب فصل فی جواز زیارۃ القبور، فی الذھاب الی زیارۃ القبور (قدیمی کتب خانہ)

للهداية۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق بخشنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: جمہور قراء نے ما ننسخ نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس معنی پر ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ہم کسی آیت کا حکم اٹھا دیتے ہیں اور اس کی تلاوت کو باقی رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ اس معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ ہم آیت کا حکم اور تلاوت اٹھا دیتے ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عامر نے ننسخ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ انسخت الکتاب سے مشتق ہے اس معنی پر کہ میں نے اسے منسوخ پایا۔ ابوحاتم نے کہا: یہ غلط ہے۔ الفارسی ابوعلی نے کہا: یہ لغت نہیں ہے کیونکہ نسخ اور انسخ ایک معنی میں ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا مگر یہ کہ اس کا معنی ہو ہم اس کو منسوخ نہیں پاتے۔ جیسے تو کہتا ہے: احمدت الرجل وابخلتہ، یعنی میں نے اسے محمود اور بخیل پایا۔ ابوعلی نے کہا: ہم اسے منسوخ نہیں پاتے مگر یہ کہ ہم اسے منسوخ کر دیں۔ معنی میں دونوں قراءتیں متفق ہیں اور لفظ میں مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَانَنْسَخْ کا مطلب ہے، ہم تیرے لئے جسے نسخ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نسخت الکتاب جب تو کتاب کو لکھ لے۔ وانتسختہ غیری جب تو اس کے لئے لکھ دے۔ مکی نے کہا: ہمزہ کا متعدی کے لئے ہونا جائز نہیں کیونکہ اس طرح معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ معنی پھر یہ ہو جائے گا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کوئی آیت تجھ پر اتارتے اور انساخہ ایاھا، کا مطلب ہے: انزالھا علیہ۔ معنی یہ ہوگا: ہم تجھ پر کوئی اتارتے ہیں یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ ہر آیت جو نازل ہوئی اس سے بہتر لائی گئی، تو اس طرح سارا قرآن منسوخ ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن کا تھوڑا حصہ منسوخ ہوا ہے جب افعل اور فعل کا ہم معنی ہونا ممتنع ہوا کیونکہ ایسا سنا نہیں گیا تو معنی کے فساد کی وجہ سے ہمزہ کا متعدی ہونا بھی ممتنع ہوتا۔ پس یہی صورت باقی رہتی ہے کہ یہ اس باب سے ہو: احمدتہ وابخلتہ (میں نے اسے محمود اور بخیل پایا)۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ نُنْسِهَا ابوعمرو اور ابن کثیر نے نون کے فتحہ، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابوعمر، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، حضرت ابی بن کعب، عبید بن عمیر، النخعی، ابن محیصن وغیرہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی تاخیر کرنا ہے۔ یعنی ہم اس کے الفاظ کے نسخ کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم اسے "ام الکتاب" میں چھوڑ دیتے ہیں پس وہ منسوخ نہیں ہوتی۔ یہ عطا کا قول ہے اور عطا کے علاوہ کا قول ہے کہ او ننسأھا کا معنی ہے: ہم وقت معلوم تک نسخ کو مؤخر کرتے ہیں۔ یہ عربوں کے قول نسأت ھذا الامر سے مشتق ہے یعنی جب تو کام کو مؤخر کر دے۔ اس سے یہ قول ہے: بعتہ نسأ۔ جب تو اس میں تاخیر کر دے (1)۔ ابن فارس نے کہا: عرب کہتے ہیں: نسأ اللہ فی اجلک و انسأ اللہ اجلک۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے، قد انتسأ القوم، جب قوم دور ہو جائے، نسأتھم، میں نے اسے پیچھے کر دیا۔ معنی یہ ہے کہ ہم اس کے نزول کو مؤخر کرتے ہیں یا اسے منسوخ کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم تم سے اس طرح اسے لے جائیں گے کہ تم نہ پڑھو گے اور نہ یاد کرو گے۔ باقی قراء نے ننسھا نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، نسیان سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ترک ہے، یعنی ہم اسے چھوڑ دیں گے نہ تبدیل کریں گے اور نہ منسوخ کریں گے۔ یہ حضرت ابن

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عباس اور سدی کا قول ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں چھوڑ دیا۔ اس قراءت کو ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا۔ ابو عبید نے کہا: میں نے نعیم القاری کو یہ کہتے ہوئے سنا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خواب میں ابو عمرو کی قراءت پڑھی تو آپ نے مجھ پر صرف دو حرفوں کی تبدیلی فرمائی۔ فرمایا: میں نے پڑھا أَرْنا تو آپ نے فرمایا أَرِنا۔ ابو عبید نے کہا: دوسرا حرف میں او ننسأها خیال کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَوْ نُنْسِهَا۔ الازہری نے نُنْسِهَا حکایت کیا ہے۔ یعنی ہم اسے چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: انسیته الشیٔ یعنی میں نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ نسیتة، میں نے اسے ترک کر دیا۔ شاعر نے کہا:

ان علیّ عقبة اقضیها　　لست بناسیها ولا منسیها

اگر میں اپنے اوپر اونٹوں کو چرانے کا فیصلہ کروں گا تو میں اسے ترک نہیں کروں گا اور نہ اسے ترک کا حکم دوں گا۔

زجاج نے کہا: نون کے ضمہ کے ساتھ قراءت اس میں ترک کے معنی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ نہیں کہا جاتا: انسی بمعنی ترك ہے اور جو علی بن ابی طلحہ بن ابن عباس سے روایت کیا ہے أَوْ نُنْسِهَا فرمایا: ہم اسے چھوڑتے ہیں اسے تبدیل نہیں کرتے (2) یہ صحیح نہیں ہے۔ شاید حضرت ابن عباس نے فرمایا ہو نترکھا اور ضبط نہ کیا گیا ہو۔ اہل لغت میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ أَوْ نُنْسِهَا کا معنی ہے: ہم تمہارے لئے اس کا ترک مباح کرتے ہیں۔ یہ نَسِيَ سے مشتق ہے جب کوئی کسی چیز کو چھوڑ دے پھر تعدیہ کیا گیا۔ ابو علی وغیرہ نے فرمایا: اور یہ قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے: ہم تجھے بنا دیں گے کہ تم اسے چھوڑ دو (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نسیان سے ہے جس کا معنی ہے یاد نہ ہونا، اس معنی پر او ننسکها یا محمد فلا تذ کرھا۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ بھلا دیں گے پس آپ اسے یاد نہیں کریں گے۔ ہمزہ کے ساتھ نقل کیا گیا اور فعل کو دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ھا ضمیر ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم محذوف ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ یہاں خیر کا لفظ تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اے لوگو! اس جلدی میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ اخف ہو اور تاخیر میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ (آیت) زیادہ مشکل ہو اور اگر ناسخ و منسوخ برابر ہوں تو اس کی مثل میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے (4)۔ امام مالک نے فرمایا: منسوخ کی جگہ محکم آیت تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت کے اعتبار سے زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال یہ ہے: من جاء بالحسنة فلهٗ خیر منها۔ یعنی جو نیکی کرے گا اس کے لیے اس سے بہتر نفع اور اجر ہوگا۔ اس خیر سے مراد افضل نہیں ہے اور پہلے قول کی دلیل او مثلها کے کلمات ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝

"کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کیلئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں"۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ، لَمْ کی وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے اور حروف استفہام عامل کے عمل میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اَنَّ کو فتحہ دیا گیا ہے کہ یہ محل نصب میں ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی ایجاد و اختراع، ملک و سلطان، امر و ارادہ سب زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ ملك پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور له اس کی خبر ہے اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔

یہاں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجئے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے حکمرانی اور سلطانی ہے۔ آسمانوں اور زمین میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ ولیّ یہ ولیت امر فلان سے مشتق ہے یعنی میں نے فلاں کے معاملہ کی دیکھ بھال کی۔ اسی سے ولی العہد ہے یعنی مسلمانوں کے جو معاملات اس کے سپرد کئے گئے ہیں ان کی نگرانی کرنے والا۔ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ کے سوا، اللہ کے بعد۔ جیسے امیہ بن الصلت نے کہا: (1)

یا نفس مالك دون الله من واق　　وما علی حدثان الدهر من باق

اے نفس! اللہ کے سوا تجھے کوئی بچانے والا نہیں اور زمانے کے واقعات میں سے کوئی باقی رہنے والا نہیں۔

جمہور قراء نے ولا نصیر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ولی پر اس کا عطف کیا ہے اور نصیرٌ ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ ولی کے مقام پر عطف کی حیثیت سے کیونکہ اس کا معنی ہے: ما لکم من دون اللہ ولیّ ولا نصیرٌ۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

"کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تُرِيْدُوْنَ میں اَمْ منقطعہ ہے جو بمعنی بل ہوتا ہے یعنی بل تریدون۔ کلام کا معنی توبیخ ہے۔ اَنْ تَسْـَٔلُوْا، تُرِيْدُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے كَمَا سُىِٕلَ کاف مصدر محذوف کی لغت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی سوالاً کما۔

مُوْسٰى نائب فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے مِنْ قَبْلُ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات عیاں دکھائیں اور اس امت کے لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ ان کے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دیں (2)۔ حسن نے کما سِیل پڑھا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت ہے جو کہتے ہیں: سلت أسالُ۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ کا بدل یاء ساکنہ ہو اور بغیر قیاس کے ہو۔ پھر اس سے پہلے سین کو کسرہ دیا گیا ہو۔ نحاس نے کہا: ہمزہ کا بدل بعید ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

السواء ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: فی سواء الجحیم۔ (جحیم کے وسط میں) عیسیٰ بن عمر نے حکایت کیا ہے، فرمایا: ما زلت اکتب حتی انقطع سواتی (میں لکھتا رہا حتیٰ کہ میرا درمیان ٹوٹ گیا) حضرت حسان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

یا ویح اصحاب النبی ورھطه　　بعد المغیّب فی سواء الملحدِ (1)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور آپ کے گروہ پر افسوس قبر کے درمیان چھپائی گئی ذات کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا السواء کا معنی قصد کرنا ہے۔ فراء سے مروی ہے: ذھب عن قصد الطریق و سَمْتِہٖ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستہ سے ہٹ گیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ رافع بن خزیمہ (2) اور وہب بن زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ہمارے پاس آسمان سے کتاب لے آؤ جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لئے نہریں جاری کرو تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

''دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے (یہ سب کچھ) اس کے بعد اور جب کہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق۔ پس (اے غلامانِ مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے ہو یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَدَّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ كُفَّارًا یہ يَرُدُّوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہے مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ یود کے متعلق ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَدًا کے متعلق ہے اور كُفَّارًا پر وقف ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حَسَدًا، وَدَّ کا مفعول لہ ہے یا مصدر ہے اپنے ماقبل پر دلالت کرتا ہے اور مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے اپنی طرف سے، نہ وہ یہ کتاب میں پاتے ہیں اور نہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہوتا ہے حسد کا لفظ یہ مفہوم دیتا ہے اور عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ بطور تاکید اور الزام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ (آل عمران:167) اسی طرح یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ (البقرہ:79) اور اسی طرح وَ لَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (انعام:38) ان تینوں آیات میں بِاَفْوَاهِهِمْ، بِاَیْدِیْهِمْ اور بِجَنَاحَیْهِ تاکید کے لئے ہے۔ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 2: حسد کی دو قسمیں ہیں: (۱) مذموم، (۲) محمود۔ مذموم یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، خواہ تو نے یہ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ نعمت لوٹ آئے یا تو نے یہ تمنا نہ کی ہو۔ اس قسم کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ممانعت فرمائی ہے: اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:54)

یہ حسد مذموم ہے کیونکہ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ کی تقسیم کو درست نہ سمجھنا ہے کہ اس نے (گویا) غیر مستحق پر انعام کر دیا ہے۔ اور حسد کی محمود صورت وہ ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد صرف دو شخصوں سے کرنا چاہئے: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ قرآن عطا فرماتا ہے اور وہ رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور وہ اسے رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں خرچ کرتا ہے(2)۔ یہ وہ حسد ہے جس کا معنی غبطہ (رشک) ہے، اسی طرح اس پر امام بخاری نے باب باندھا ہے: باب الاغتباط فی العلم والحکمة۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو تمنا کرے کہ تیرے لئے بھی وہ خیر اور نعمت ہو جو تیرے مسلمان بھائی کے پاس ہے اور اس سے خیر زائل نہ ہو۔ اس کو منافسہ کہنا بھی جائز ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۝ (المطففین) اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (یعنی اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو چکا ہے)۔ حق سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور قرآن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: فَاعْفُوْا اصل میں اعفووا تھا ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ العفو سے مراد گناہ پر مؤاخذہ کو ترک کرنا ہے۔ الصفح کا معنی نفس سے گناہ کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ صفحت عن فلان کا معنی ہے: میں نے اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ ضربت عنہ صفحاً میں نے اس سے اعراض کیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (الزخرف:5) (کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو)

مسئلہ نمبر 2: یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب اغتباط صاحب القرآن، حدیث 4637، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (توبہ:29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر...... اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں) یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی ناسخ فاقتلوا المشرکین ہے (1)۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہر وہ آیت جس میں قتال کا ترک ہے وہ مکی ہے اور قتال کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے (2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا یہ حکم کہ یہ آیت مکی ہے ضعیف ہے کیونکہ یہود کی مخالفتیں تو مدینہ میں تھیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بات صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر سوار ہوئے جس کے اوپر فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور حضرت اسامہ آپ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ بنی حارث بن خزرج میں حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ پس وہ دونوں چلے حتیٰ کہ اس مجلس کے پاس سے گزرے جس میں عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہ عبداللہ کے ظاہراً اسلام قبول کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مجلس میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہود جمع تھے۔ مسلمانوں میں سے حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی تھے۔ جب مجلس پر گدھے کا غبار چھانے لگا تو عبداللہ بن ابی نے اپنا ناک اپنی چادر سے ڈھانپ دیا اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔

رسول اللہ ﷺ نے سلام کیا پھر آپ ٹھہرے اور گدھے سے اترے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر قرآن پڑھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: اے شخص! یہ انداز اچھا نہیں جو آپ کہتے ہیں اگر حق بھی ہے تو ہمیں ہماری مجالس میں اس کے ساتھ اذیت نہ دے، اپنی منزل کی طرف لوٹ جا جو تیرے پاس آئے اسے بیان کر۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیں ہم اس پیغام کو پسند کرتے ہیں۔ مشرکوں، مسلمانوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہو گئی حتیٰ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے قریب ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ انہیں خاموش کراتے رہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور چل پڑے حتیٰ کہ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! کیا تو نے نہیں سنا جو ابوحباب...... آپ کی مراد عبداللہ بن ابی تھا...... نے کہا ہے اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ حضرت سعد نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اس کو معاف کر دیں اور اس سے درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔ اللہ آپ کے پاس حق لایا جو اس نے آپ پر اتارا، مدینہ طیبہ کے لوگوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عبداللہ بن ابی کو تاج پہنائیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ساتھ اس معاملہ کو رد کر دیا جو آپ کو عطا فرمایا تو یہ غصہ میں ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے اس نے کہا جو آپ نے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب مشرکوں اور اہل کتاب کو معاف کر دیتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا اور اذیت پر صبر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا (آل عمران:186) (اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دینے والی بہت باتیں) اور فرمایا وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب)۔
رسول اللہ ﷺ حکم الٰہی کے مطابق معاف فرماتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے لڑنے کی اجازت دی۔
جب رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر لڑی تو اللہ تعالیٰ نے قریش کے رئیسوں اور کفار کے سرداروں کو آپ ﷺ کے ذریعے قتل کر دیا، پس رسول اللہ ﷺ اور صحابہ جنگ بدر سے مال غنیمت حاصل کر کے اور فتحیاب ہو کر لوٹے، ان کے ساتھ قریش کے سردار اور کفار کے رئیس قیدی تھے، عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھ مشرکوں اور بت پرستوں نے کہا: یہ امر ظاہر ہو کر رہے گا۔ پس انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام کی بیعت کر لی، اور اسلام لے آئے۔(1)
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یعنی قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ حدیث پاک میں ہے بندہ جب مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: اس نے پیچھے کیا چھوڑا، فرشتے کہتے ہیں: اس نے آگے کیا بھیجا۔ بخاری اور نسائی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وارث کے مال سے زیادہ اپنا مال پسند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرا مال وہ ہے جو تو نے آگے بھیجا، اور تیرے وارث کا مال وہ ہے جو تو نے پیچھے چھوڑا۔ یہ نسائی کے الفاظ کا ترجمہ ہے اور بخاری کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال زیادہ محبوب ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا (2)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بقیع الغرقد (مدینہ طیبہ کا قبرستان) سے گزرے اور کہا: السلام علیکم اہل القبور پھر کہا: ہمارے پاس خبریں یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے نکاح کر لئے ہیں، تمہارے گھروں میں دوسرے لوگ سکون پذیر ہیں، تمہارے مال تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہاتف نے جواب دیا: اے ابن خطاب! ہمارے پاس خبریں یہ ہیں ہم نے جو آگے بھیجا وہ ہم نے پا لیا اور جو ہم نے خرچ کیا اس کا ہم نے نفع پایا اور جو ہم نے پیچھے چھوڑا اس میں ہم نے نقصان اٹھایا...... کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

قدم لنفسك قبل موتك صالحاً و اعمل فليس الى الخلود سبيل

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے نیک اعمال بھیج اور نیک عمل کر کسی کے لئے ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔
ایک اور شاعر نے کہا:

قدم لنفسك توبة مرجوة قبل الممات و قبل حبس الالسن

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے اور زبانوں کے خاموش ہونے سے پہلے توبہ کر جس کی قبولیت کی امید ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب كنية المشرك، حدیث نمبر 5739، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، باب ما قدم من ماله فهو له، حدیث 5961

ایک اور نے کہا:

ولدتك اذ ولدتك امك باكياً والقوم حولك يضحكون سروراً

فاعمل ليوم تكون فيه اذا بكوا في يوم موتك ضاحكاً مسروراً

تیری والدہ نے تجھے جنم دیا جبکہ تو رو رہا تھا اور قوم تیرے اردگرد خوشی سے ہنس رہی تھی۔ تو اس دن کے لئے عمل کر جس میں لوگ تیری موت پر رو رہے ہوں جبکہ تو اس میں خوشی سے ہنس رہا ہو۔

ایک اور نے کہا:

سابق الى الخير و بادر به فانما خلفك ماتعلم

و قدم الخير فكل امرئ على الذى قدمه يقدم

تو نیکی کی طرف سبقت کر اور اس میں جلدی کر تیرے پیچھے وہ ہوگا جس کو تو جانتا ہے۔ اور نیکی کو آگے بھیج ہر شخص اس پر ہوگا جو وہ آگے بھیجے گا۔

ان تمام سے خوبصورت ابو العتاہیہ کا قول ہے:

اسعد بما لك فى حياتك انما يبقى وراءك مصلح او مفسد

واذا تركت لمفسد لم يبقه و اخو الصلاح قليله يتزيد

وان استطعت فكن لنفسك وارثاً ان المورث نفسه لمسدد

تو اپنی زندگی میں اپنے مال سے سعادت حاصل کر لے تیرے پیچھے نیکوکار ہوگا یا فسادی ہوگا۔ جب تو اپنا مال فسادی کے لئے چھوڑے گا تو وہ اسے نہیں چھوڑے گا اور نیکوکار کا تھوڑا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو اپنے لئے وارث بنا وارث بنانے والا ہی پختہ ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''انہوں نے کہا: نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس۔ نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى مطلب یہ ہے کہ یہود نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو نصرانی ہوگا۔ فراء نے جائز قرار دیا کہ هُوْدًا بمعنی یہودیا اور یہ جمع ہے ھائدٌ کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ من کا معنی جمع ہے۔ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ، هَاتُوْا اصل میں هاتِیُوا تھا، ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر یا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا واحد مذکر کے لئے کہا جاتا ہے: ھات جیسے رام اور مونث کے لئے ھاتی جیسے رامی۔

البرھان سے مراد وہ دلیل ہوتی ہے جو یقین کو واقع کرتی ہے یعنی جس سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ برھان کی جمع براھین ہے جیسے قربان و قرابین، سلطان و سلاطین۔ طبری نے کہا: یہاں دلیل طلب کرنا غور و فکر کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے (1) اور جو اس کی نفی کرتا ہے اس کا رد کرتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یعنی اگر تم اپنے ایمان میں یا اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ہی جنت میں داخل ہو گے۔ یعنی جو تم نے کہا ہے اسے دلیل سے بیان کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰى یہ ان کا رد ہے اور انہیں جھٹلانا ہے یعنی ایسا نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو۔ بعض نے فرمایا: معنی پر محمول ہے، گویا کہ کہا گیا ہے کیا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا؟ تو کہا گیا: بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ، اَسْلَمَ کا معنی سرنگوں ہونا اور سر تسلیم خم کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اپنے عمل کو خالص کرنا ہے، الوجه (چہرہ) کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ انسان کا جو حصہ نظر آتا ہے اس میں سے معزز ترین حصہ ہے، اور اس لئے کہ یہ جو اس کی جگہ ہے، اس میں عزت و ذلت ظاہر ہوتی ہے عرب چہرہ کا ذکر کر کے پوری چیز کی خبر دیتے ہیں اس آیت میں وجہ سے مراد مقصد ہونا بھی صحیح ہے وَهُوَ مُحْسِنٌ یہ جملہ حال ہے، ضمیر، وَجْهَهٗ کی طرف لوٹ رہی ہے اور لہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسی طرح اجرہ ہے علیھم میں ضمیر جمع معنی کے اعتبار سے ہے اسی طرح یحزنون بھی معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ یحزنون کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّ هُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتابیں۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے''۔

یعنی ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مقابل کسی چیز (دین) پر نہیں ہے اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا زیادہ مستحق ہے (2)۔ وَّ هُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی وہ تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ جملہ حال ہے اور الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

مراد جمہور کے نزدیک عرب کے کفار ہیں کیونکہ ان کے پاس کتاب نہ تھی۔ عطا نے کہا ہے: اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھیں (1)۔ ربیع بن انس نے کہا: مطلب یہ ہے کہ یہود نے نصاریٰ سے پہلے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اہل نجران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو ان کے پاس یہود کے علماء بھی آئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑنے لگے، ہر ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم کسی دین پر نہیں ہو۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَظْلَمُ خبر ہے مطلب یہ ہے کہ لا احدَ اظلم کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے۔ اور اَنْ محل نصب میں ہے۔ مَسٰجِدَ سے بدل کے اعتبار سے۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: کراھیة ان یُذکَرَ پھر حذف کیا گیا۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: من ان یذکر فیھا۔ اور حرف جر کو طول کلام کی وجہ سے ان سے پہلے حذف کیا گیا اور یہاں مَسٰجِدَ سے مراد بیت المقدس اور اس کی محرابیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: کعبہ ہے اور جمع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کعبہ مساجد کا قبلہ ہے یا تعظیم کے لئے جمع ذکر کیا گیا۔ بعض نے فرمایا: مَسٰجِدَ سے مراد تمام مساجد ہیں، ان کا واحد مسجِد (جیم کے کسرہ کے ساتھ۔) عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: مسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) (3)۔ فراء نے کہا ہے: ہر فعل جو فعل یفعُلُ کے وزن پر ہو مثلاً دخل یدخل تو اس سے مَفعَل فتحہ کے ساتھ آتا ہے خواہ وہ اسم ہو یا مصدر ہو۔ اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً دخل یدخل مدخلا۔ ھذا مدْخَلُہٗ۔ مگر چند الفاظ ایسے ہیں جن پر کسرہ پڑھا جاتا ہے: مسجِد، مطلِع، المغرِب، المشرِق، المسقِط، المفرِق، المجزِر، المسکِن، المرفِق۔ (یہ رفق یرفق سے ہے) المنبِت، المنسِك (یہ نسك ینسك سے ہے) کسرہ کو اسم کی علامت بنایا ہے۔ بعض اوقات بعض عرب اسم میں فتحہ دیتے ہیں وہ المسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) انسان کی پیشانی جہاں سجدہ کے لیے پہنچتی ہے: الآراب، وہ سات اعضاء جو سجدہ میں زمین پر لگتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے مراد کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اور یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ بخت نصر کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے بیت المقدس کو خراب کیا تھا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

نے کہا: یہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ معنی یہ ہے کہ تم کیسے دعویٰ کرتے ہو اے نصاریٰ! کہ تم اہل جنت میں سے ہو حالانکہ تم نے بیت المقدس کو خراب کیا اور اس میں نمازیوں کو نماز پڑھنے سے روکا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: نصاریٰ کے فعل پر تعجب کا اظہار ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کے ساتھ یہ کیا حالانکہ وہ اس کی تعظیم بھی کرتے تھے اور انہوں نے یہود سے عداوت کی۔

سعید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ الله کے دشمن نصاریٰ ہیں، یہود کے بعض نے انہیں ابھارا کہ انہوں نے بخت نصر بابلی مجوسی کی بیت المقدس کی تخریب میں معاونت کی۔ (2)

روایت ہے کہ یہ تخریب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی۔ بعض نے فرمایا: یہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے نمازیوں کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روکا اور حدیبیہ کے ساتھ انہیں مسجد حرام میں داخل نہ ہونے دیا (3)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے بھی قیامت تک کسی مسجد سے کسی کو روکا۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے۔ بعض مساجد کے ساتھ تخصیص اور بعض اشخاص کے ساتھ خاص کرنا ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: مساجد کا خراب کرنا کبھی حقیقۃً ہوتا ہے جیسے بخت نصر اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی تخریب کی تھی جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے اپنے کسی بادشاہ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام نطوس بن اسیسانوس رومی تھا جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ پس انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنایا، تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس میں غلاظت پھینکی اور اسے خراب کیا۔

اور کبھی تخریب مسجد مجازاً ہوتی ہے، جیسے مشرکین کا مسلمانوں کو منع کرنا۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام سے روک دیا۔ پس نماز اور شعائر اسلام کی مساجد میں ادائیگی سے روک دینا یہ اسے خراب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: عورت کو حج کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے جب اس نے حج نہ کیا ہو خواہ اس کا محرم ہو یا نہ ہو اور اسے مساجد میں نماز پڑھنے سے بھی نہ روکا جائے جب اس پر فتنہ کا خوف نہ ہو۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تمنعوا اماء الله مساجد الله (4)۔ تم الله کی بندیوں کو مساجد سے نہ روکو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: مسجد کو توڑنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کا بیع کرنا اور معطل کرنا جائز ہے اگرچہ محلہ خراب بھی ہو جائے اور مسجد بنانے سے بھی نہیں روکا جائے گا مگر یہ کہ لوگوں کا ارادہ اختلاف اور جھگڑا ہو مثلاً وہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائیں اور ان سے مقصود پہلی مسجد کے لوگوں میں جدائی ڈالنا ہو اور خراب کرنا ہو اور اختلاف پیدا کرنا ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو دوسری مسجد کو توڑا جائے گا اور اس کے بنانے سے منع کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ایک شہر میں دو جامع مسجد ہونی جائز نہیں ہیں اور نہ ایک مسجد کے لئے دو امام جائز ہیں اور نہ ایک مسجد میں دو جماعتیں جائز ہیں۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورہ براءت میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، باب هل على من لم يشهد الجمعة غسل من النساء والصبيان وغيرهم، حدیث نمبر 849، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے گا اور سورۂ نور میں مساجد اور ان کی بنا کا حکم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیان کیا جائے گا۔ یہ آیت نماز کے امر کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے۔ جب نماز افضل عمل ہے اور اجر کے اعتبار سے عظیم ہے تو اس کا منع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ہر جگہ جہاں اللہ کی عبادت کرنا ممکن ہو اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا جاتا ہو اسے مسجد کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً (میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا باعث بنائی گئی ہے) اس حدیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے(1)۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ وہ جگہ جو زبان کے ساتھ نماز کے لئے متعین کی گئی ہو تو وہ مالک کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے اور وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص اپنے گھر میں مسجد بنائے اور لوگوں کو اس سے روکے اور اسے اپنے لئے مختص کرے تو وہ اس کی ملکیت پر رہے گی اور وہ مسجد کی تعریف میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ تمام لوگوں کے لئے اس میں نماز پڑھنا مباح کر دے تو پھر اس کا حکم عام مساجد جیسا ہو جائے گا اور ملکیت سے نکل جائے گی۔

مسئلہ نمبر 6: اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ، اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے خَآىِٕفِیْنَ حال ہے یعنی مسلمان جب اس پر غالب آ جائیں اور وہ مسلمانوں کی سلطنت کے تحت آ جائے تو اس وقت ان مساجد میں کافر کا داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ اگر کافر اس میں داخل ہوں گے تو انہیں خوف ہوگا کہ مسلمان انہیں نکال دیں گے اور اس میں داخل ہونے پر سزا دیں گے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کافر کے لئے مسجد میں داخل ہونا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جنہوں نے اس آیت کو نصاریٰ کے بارے تصور کیا اس نے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی اسلام میں تعمیر فرمائی تو اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا کہ کوئی نصرانی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا مگر اسے سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد کہ وہ ان کی عبادت گاہ تھی(2) اور جنہوں نے اسے قریش کے بارے تصور کیا۔ اس نے کہا: نبی کریم ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی بیت اللہ کا طواف برہنہ ہو کر نہیں کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس سے مقصود امر ہے یعنی تم کافروں سے جہاد کرو اور انہیں جڑ سے اکھیڑ دو حتیٰ کہ ان میں سے کوئی مسجد حرام میں داخل نہ ہو مگر ڈرتے ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (احزاب: 53) یہ حقیقت میں نہی ہے جو خبر کے لفظ کے ساتھ وارد ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ بعض علماء نے فرمایا: یہ حربی کو قتل کرنا ہے اور ذمی کے لئے جزیہ ہے، قتادہ اور سدی سے مروی ہے، الخزی لهم فی الدنیا سے مراد مہدی کا قیام، عموریہ، رومیہ، قسطنطنیہ اور ان کے دوسرے شہروں کی فتح ہے۔ جیسا کہ ہم نے ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے اور جنہوں نے کہا یہ قریش کے متعلق ہے انہوں نے الخزی سے مراد فتح مکہ لیا ہے اور آخرت میں عذاب ہے اس کے لئے جو کافر ہو کر مرے گا۔

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ، الْمَشْرِقُ سے مراد طلوع کی جگہ اور الْمَغْرِبُ سے مراد غروب ہونے کی جگہ ہے۔ یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی جہات اور مخلوق کی ایجاد و اختراع اللہ کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ مشرق و مغرب کو خصوصی ذکر فرمایا ان کو شرف دینے کے لئے، جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ۔ کیونکہ آیت کا سبب اس کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا یہ شرط ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے۔ این عاملہ ہے اور ما زائدہ ہے۔ اور جواب فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ہے۔ حسن نے تولوا تا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اصل میں تتولوا تھا اور ثم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے اس کا معنی بعد ہے، مگر یہ مبنی برفتحہ ہے معرب نہیں ہے کیونکہ یہ مبہم ہے۔ یہ بعد کے لئے ھناک کے قائم مقام ہے اگر تو قرب کا ارادہ کرے گا تو توھنا کہے گا۔

مسئلہ نمبر 3: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا کس معنی میں نازل ہوا؟ اس میں علماء کے پانچ مختلف اقوال ہیں: حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے تاریک رات میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تاریک رات میں سفر پر تھے ہمیں معلوم نہ تھا کہ قبلہ کہاں ہے ہر شخص نے اپنی سمت پر نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ابوعیسیٰ نے کہا: یہ حدیث ایسی ہے جس کی سند قابل حجت نہیں ہے ہم اس کو اشعث السمان کی حدیث سے جانتے ہیں اور اشعث بن سعید ابوالربیع حدیث میں ضعیف شمار کیا جاتا ہے۔ (1)

اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب بادل کی صورت میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر بعد میں اسے علم ہو کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ حضرات سفیان، ابن المبارک، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے مگر امام مالک فرماتے ہیں: پھر وقت میں اس نماز کا اعادہ مستحب ہے اور اس پر اعادہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس نے فرض تو ادا کر لیا جیسا اسے حکم دیا گیا تھا اور کمال وقت میں پایا جا سکتا ہے۔ یہ امام مالک نے سنت سے استدلال کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے تنہا نماز پڑھی پھر اس نے اس نماز کو وقت کے اندر جماعت کے ساتھ پایا تو وہ لوگوں کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور وقت میں استحباباً اعادہ نہ کرے مگر وہ جو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھے یا مشرق یا مغرب کی طرف اپنی پوری کوشش کے بعد نماز پڑھے۔ اور جس نے قبلہ کی تھوڑی دائیں یا بائیں

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، جلد 2 صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

جانب کوشش سے نماز پڑھی اس پر وقت کے اندر اور وقت کے بعد اعادہ نہیں ہے۔ مغیرہ اور امام شافعی نے کہا: نماز جائز نہیں ہے کیونکہ قبلہ کی سمت ہونا نماز کی شروط میں سے ہے (جب شرط نہ پائی گئی تو نماز ہی نہ ہوئی)۔ جو امام مالک نے کہا ہے وہ اصح ہے کیونکہ قبلہ کی جہت کو ضرورت، جنگ کی حالت میں اس کے ترک کو مباح کر دیتی ہے اور حالت سفر میں رخصت اس کو مباح کر دیتی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: یہ آیت مسافر کے بارے نازل ہوئی وہ نفل پڑھ سکتا ہے جدھر بھی اس کی سواری کا رخ ہو۔ یہ مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے سواری پر نفلی نماز پڑھتے تھے جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا تھا (1)۔ فرمایا: اس کے متعلق فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ نازل ہوئی۔ علماء کا سواری پر نفل پڑھنے میں اس حدیث کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور کسی کے لئے جان بوجھ کر بغیر شدت خوف کے قبلہ کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

مریض کے بارے میں امام مالک کا قول مختلف ہے جو محمل پر نماز پڑھتا ہے۔ کبھی فرمایا: وہ اونٹ کی پیٹھ پر فرض ادا کرے اگرچہ مرض شدید بھی ہو۔ سحنون نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اعادہ کرے گا۔ یہ الباجی نے حکایت کیا ہے۔ کبھی کہا: اگر وہ ایسا شخص ہے جو زمین پر نماز نہیں پڑھ سکتا مگر اشارہ کے ساتھ تو وہ اونٹ کے اوپر نماز پڑھ لے اس کے بعد اس کے اونٹ کو روکا جائے اور منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔ اور اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی صحیح آدمی کے لئے فرض ادا کرنا جائز نہیں ہیں مگر زمین پر، مگر خوف شدید ہو تو پھر سواری پر فرض نماز ادا کر سکتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

فقہاء کا اس مسافر کے بارے میں اختلاف ہے جو ایسا سفر کرتا ہے جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور ثوری نے فرمایا کہ سواری پر نفل نہ پڑھے مگر ایسے سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ سفر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکایت کئے جاتے ہیں کہ ان میں آپ نوافل سواری پر پڑھتے تھے، وہ وہ سفر تھے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن حیی، اللیث بن سعد، داؤد بن علی نے کہا: شہر سے باہر ہر سفر میں سواری پر نفل نماز پڑھنا جائز ہے خواہ اس سفر میں نماز قصر کی جاتی ہو یا نہ کی جاتی ہو کیونکہ آثار ایسے ہیں جن میں کسی خاص سفر کا ذکر نہیں۔ ہر سفر میں نفلی نماز جائز ہے مگر یہ کہ کسی سفر کو ایسی روایت کے ساتھ خاص کیا گیا ہو جو واجب التسلیم ہو۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: شہر میں بھی سواری پر اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید کی حدیث حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گدھے پر اشارے سے نماز پڑھی۔ طبری نے کہا: ہر سوار اور پیدل کے لئے جائز ہے جو وہ مقیم ہو یا مسافر ہو سواری پر اور چلتے ہوئے نفلی نماز اشارے سے پڑھے۔ بعض اصحاب شافعی سے حکایت ہے کہ ان کا مذہب سفر و حضر میں سواری پر نفل پڑھنے کے جواز کا ہے۔ الاثرم نے کہا: احمد بن حنبل سے حضر میں سواری پر نماز کے بارے پوچھا گیا تو امام احمد نے فرمایا: سفر کے بارے تو میں نے سنا ہے لیکن حضر کے بارے نہیں سنا۔ ابن القاسم نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب القبلۃ، باب الحال التی یجوز علیہا استقبال غیر القبلۃ، حدیث نمبر 735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب الوتر فی السفر، حدیث نمبر 945، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو محمل میں نفل پڑھے تو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کا قیام چوکڑی مار کر بیٹھنا ہے وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکوع کرے پھر اپنے سر کو اٹھائے۔ قتادہ نے کہا: یہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ فوت ہوا تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر بلایا۔ صحابہ نے عرض کی: ہم اس شخص پر کیسے نماز پڑھیں گے جو فوت ہو چکا ہے اور وہ ہمارے قبلہ کے علاوہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا(1)۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا، اس کا نام اصحمہ تھا عربی میں اس کا معنی عطیہ ہے۔ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہوا تھا حالانکہ قبلہ تبدیل ہو چکا تھا اور قبلہ کعبہ بن چکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بارے میں نازل ہوا: وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ (آل عمران: 199) یہ نجاشی کے لئے عذر تھا۔(2)

نبی کریم ﷺ نے نو ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ اس سے غائب پر نماز جنازہ پڑھنے پر امام شافعی نے استدلال کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میت پر نماز کے مسائل میں سے غریب ترین مسئلہ وہ ہے جو امام شافعی نے کہا کہ غائب پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ میں بغداد میں فخر الاسلام کی مجلس میں تھا۔ ان کے پاس خراسان سے ایک شخص آیا اس سے فخر الاسلام نے پوچھا: فلاں کا کیا حال ہے؟ اس شخص نے کہا: وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ فخر الاسلام نے کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ پھر ہمیں فرمایا: اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ پس وہ کھڑے ہوئے اور ہمیں اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ اس کے مرنے کے چھ ماہ بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور درمیان میں چھ ماہ کی مدت تھی۔

شوافع کے نزدیک اس کی اصل نجاشی پر نبی کریم ﷺ کا نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ تین وجوہ کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تھے۔(۱) نبی کریم ﷺ کے لئے زمین جنوباً شمالاً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ نجاشی کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا، جس طرح زمین شمالاً جنوباً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ آپ نے مسجد اقصیٰ دیکھ لی۔ مخالف نے کہا: اس روایت میں کیا فائدہ ہے؟ آپ کی برکت کے لاحق ہونے کا فائدہ ہے۔(۲) نجاشی کے لئے وہاں مومنین میں سے کوئی ولی نہ تھا جو اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ مخالف نے کہا: یہ عادۃً محال ہے، بادشاہ ایک دین پر ہو اور اس کا کوئی پیروکار نہ تھا، محال کے ساتھ تاویل محال ہے(۳) نبی کریم ﷺ نے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے میں اس پر رحمت داخل کرنے اور اس کے بعد والے بادشاہوں کی الفت چاہنے کا ارادہ کیا تھا جب وہ زندہ اور مردہ حالت میں اس کا اہتمام دیکھیں گے۔ مخالف نے کہا: دعا کی برکت نبی کریم ﷺ سے اور دوسروں سے میت کو بالاتفاق لاحق ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک نبی کریم ﷺ کے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے کی حکمت یہ تھی کہ نجاشی اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں میت پر نماز پڑھنے کا علم نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بغیر نماز کے ہی اسے دفن کر دیں گے تو آپ نے اس کی نماز کی طرف جلدی کی۔

میں کہتا ہوں: پہلی تاویل احسن ہے کیونکہ جب آپ نے اسے دیکھ لیا تو غائب پر نماز نہ ہوئی بلکہ حاضر اور مرئی پر نماز جنازہ پڑھی۔ غائب وہ ہوتا ہے جو نظر نہ آئے۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

چوتھا قول: ابن زید نے کہا: یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے اور کہتے تھے: ہدایت نہیں پائی مگر ہمارے ذریعے۔ جب کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہود نے کہا: کس چیز نے پھیر دیا انہیں جس پر (پہلے) وہ تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (1) (اللہ کے لیے ہے مشرق و مغرب) اس قول پر وجہ نظم یہ ہے کہ یہود نے جب قبلہ کے امر کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اپنے بندوں کو جس قبلہ کا چاہے مکلف بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے، اگر چاہے تو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے۔ اس کے فعل کے خلاف حجت پیش نہیں کی جاسکتی۔ جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور لوگوں سے ان کے افعال کے متعلق پوچھا جائے گا۔

پانچواں قول: یہ آیت، اس آیت وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ: 144) سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس نے ذکر کیا ہے گویا ابتداء اسلام میں جائز تھا کہ جدھر چاہے آدمی منہ کر کے نماز پڑھ لے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قتادہ نے کہا۔ اس آیت کا ناسخ یہ ارشاد ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ: 149) (یعنی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو) یہ ابو عیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے۔

چھٹا قول: مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو ادھر ہی اللہ تعالیٰ ہے اس نے استقبال قبلہ کا حکم دیا ہے (2)۔ مجاہد اور ابن جبیر سے مروی ہے جب ادعونی استجب لکم نازل ہوا تو لوگوں نے کہا کدھر منہ کر کے مانگیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

حضرت ابن عمر اور نخعی سے مروی ہے، تم اپنے سفروں میں اور گردشوں میں جہاں بھی ہو ادھر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا تعلق وَمَنْ اَظْلَمُ الخ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے: اے مومنو! اللہ کے شہر تمہیں سما سکتے ہیں، تمہیں اس شخص کی تخریب قبلہ کی طرف منہ کرنے سے نہ روکے، جو اللہ کی مساجد کی تخریب کرتا ہے، تم زمین میں جہاں بھی ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے قریب جانے سے روکا گیا تھا، تو مسلمان اس پر مغموم ہوئے (3)۔ یہ دس اقوال ہیں۔ اور جن علماء نے اسے منسوخ کیا ہے ان پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی کیونکہ خبر، امر کے معنی کا احتمال رکھتی ہے اور اس معنی کا احتمال ہے کہ تم اپنے چہرے اللہ کی طرف کر لو۔ یہ آیت وہ ہے جو حضرت سعید بن جبیر نے تلاوت کی تھی جب حجاج نے زمین کی طرف منہ کر کے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 4: قرآن و حدیث میں وَجْهُ جو اللہ کی طرف مضاف ہوتا ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ماہرین نے کہا: یہ وجود کی طرف راجع ہے یہ کلام میں مجاز ہے ذات کو اس سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ اعضاء میں ظاہر ترین عضو ہے اور قدر و منزلت میں عظیم ہے (4)۔ ابن فورک نے کہا: بعض دفعہ صفت ذکر کی جاتی ہے اور مجازاً موصوف مراد ہوتا ہے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً، تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے: میں نے آج فلاں کا علم دیکھا، میں نے فلاں کے علم کی طرف دیکھا۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ میں نے عالم دیکھا اور عالم کی طرف دیکھا۔ اسی طرح یہاں وَجْهُ ذکر ہے اور مراد وجود ہے۔

اسی تاویل پر یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر:9) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے لئے وَجْهُ ہے اس طرح یہ آیت ہے: اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ (اللیل) یعنی وہ ذات جس کے لئے وجہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وَجْهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ (الرحمٰن)

بعض ائمہ نے فرمایا: یہ نقل سے صفت ثابتہ ہے اور ان صفات سے زائد ہے جن کو عقول واجب قرار دیتی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا(1): اس قول کو ابوالمعالی نے ضعیف قرار دیا ہے یہ اسی طرح ضعیف ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں الوجہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے یعنی قبلہ، بعض نے فرمایا: الوجہ سے مراد قصد ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

استغفر الله ذنبًا لست مُحْصيه　　رب العباد اليه الوجه والعمل

میں اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جو بے شمار ہیں بندوں کے رب کی طرف ہی قصد اور عمل ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی ہے: فثم رضا الله و ثوابه، یعنی ادھر اللہ کی رضا اور ثواب ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر:9) ہم اللہ کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب میں تمہیں کھلاتے ہیں۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من بنی مسجدا یبتغی به وجه الله بنی الله له مثله فی الجنة (2)۔ جس نے مسجد بنائی اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی رضا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: قیامت کے روز مہر شدہ صحیفوں کو لایا جائے گا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: ان کو پھینک دو اور ان کی طرف توجہ کرو۔ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے رب! تیری عزت کی قسم! ہم تو انہیں خیر دیکھتے تھے اللہ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان هذا كان لغير وجهي ولا اقبل من العمل الا ما ابتغي به وجهي۔ یہ اعمال میری رضا کے لئے نہ تھے اور میں صرف وہی عمل پسند کرتا ہوں جو میری رضا کے لئے ہو...... اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مراد فثم الله ہے الوجہ زائد ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: و هو معکم۔ یہ کلبی، قتبی کا قول ہے۔ معتزلہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ اپنے بندوں پر ان کے دین میں وسعت فرماتا ہے اور انہیں ایسی تکلیف نہیں دیتا جو ان کی طاقت میں نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاسِعٌ کا معنی ہے: اس کا علم ہر چیز گھیرے ہوئے ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ (طٰہٰ)

فراء نے کہا: الواسع اس سخی کو کہتے ہیں جس کی عطا ہر چیز کو شامل ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَرَحْمَتِيْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح بخاری، کتاب المساجد، باب من بنی مسجدا، حدیث نمبر 431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف:156)

اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مغفرت میں وسعت رکھنے والا ہے، کوئی گناہ اس مغفرت سے بڑا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنے بندوں پر فضل فرمانے والا اور ان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یسع ما یسئل، یعنی فلاں عطا فرماتا ہے جو اس سے مانگا جاتا ہے یعنی بخل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (الطلاق:7) یعنی غنی کو اس سے خرچ کرنا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا۔ ہم اپنی کتاب الاسنیٰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا، پاک ہے وہ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یہ نصاریٰ کے متعلق خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا: المسیح ابن اللہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے) نعوذ باللہ من ذالک۔ بعض نے فرمایا: عرب کے کفار کے متعلق خبر ہے کہ انہوں نے کہا: الملائکۃ بنات اللہ (ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) اسی طرح کی اخبار جاہل کفار کے متعلق ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم اور انبیاء کرام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اور اسے یہ مناسب نہ تھا، ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اسے یہ چاہیے نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا: میں اسے دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں ہوں جس طرح وہ پہلے تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: میرا بیٹا ہے میری ذات کسی کو بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 3: سُبْحٰنَهٗ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہے: پاک کرنا، بری کرنا، ہر نقص سے علیحدہ جاننا۔ لوگوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے، اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو پیدا کیا ہے کہ وہ بیوی کا محتاج ہو۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام:101) (کیونکر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو)

ولم یُوْلَدْ، نہ وہ پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم اور منکر کہتے ہیں بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ما مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر مجرور ہے یعنی ایجاد و اختراع کے اعتبار سے ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے، اور جو یہ کہنے والا ہے کہ اس نے بیٹا بنایا یہ جملہ آسمانوں اور زمین میں داخل ہے(2)۔ سبحان اللہ کا معنی

1۔ صحیح بخاری، باب وقالوا اتخذ اللہ ولدا سبحانہ، حدیث نمبر 4122، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: بچہ، والد کی جنس سے ہوتا ہے۔ پس حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے اپنی مخلوقات میں سے بیٹا بنانا کیسے درست ہوگا جبکہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم) (کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمن کی بارگاہ میں بندہ بن کر) اسی طرح فرمایا: بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلکہ اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے)۔ اولاد ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے اور قدیم ہونا وحدانیت اور ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم، ازلی اور یکتا ہے تنہا اور بے نیاز ہے۔ وہ وہ ہے جس نے نہ کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ پھر بیٹا ۔ ۔ غلامی اور عبودیت کے منافی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مریم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ پس بیٹا عبد کیسے ہوگا۔ یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ تقدیر عبارت کلھم ہے پھر ھا اور میم کو حذف کیا گیا۔ قٰنِتُوْنَ کا معنی اطاعت کرنے والے اور عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہے۔ جمادات کی اطاعت ان پر اور ان میں اس کی صنعت کے ظہور میں ہے۔ قنوت کا معنی اطاعت اور سکوت ہے(1)۔ اسی سے حضرت زید بن ارقم کا قول ہے ہم نماز میں کلام کرتے تھے۔ آدمی اپنے قریب والے شخص سے بات کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ:238) ہمیں سکوت کا حکم دیا گیا اور ہمیں کلام سے منع کیا گیا۔

القنوت کا معنی نماز بھی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

قانتاً　للہ　یتلو　کتبہ　　و　علی　عمد　من　اعتزل

اس شعر میں قانتاً نماز پڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

سدی وغیرہ(2) نے كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کے تحت لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ حسن نے کہا: جو بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی دینے والا ہے وہ اس کا عبد ہے۔ القنوت کا لغوی معنی قیام ہے۔ اسی سے حدیث پاک میں ہے: افضل الصلوۃ طول القنوت(3)۔ نماز میں سے افضل نماز وہ ہے جس کا قیام لمبا ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے ساری مخلوق اس کی عبودیت کو قائم کرنے والی ہے خواہ اقرار کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے۔ اس کی صنعت کا قرآن پر ظاہر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل اطاعت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (احزاب:35) مزید تفصیل وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ:238) کے تحت آئے گی۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

''موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب ارادہ فرماتا ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 164، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

جاتا ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ۔ مبالغہ کے لئے فعیل کا وزن ہے، مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اسم فاعل مبدِعٌ ہے جیسے بصیر سے مبصرٌ ہے ابدعت الشیء لاعن مثال یعنی میں نے بغیر کسی مثال کے چیز کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا، ان کا موجد، ان کو نئے سرے سے بنانے والا اور بغیر کسی مثال اور حد کے ایجاد کرنے والا ہے۔ ہر وہ شخص جو کوئی نئی چیز پیدا کرے جس سے پہلے وہ چیز کسی نے پیدا نہ کی ہو تو اسے مبدع کہا جاتا ہے۔ اسی سے اصحاب البدع ہیں۔ بدعت کو بدعت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کہنے والا اپنے امام کی کلام اور فعل کے بغیر کہتا ہے۔ بخاری میں ہے: نعمت البدعة هذه۔ یعنی رمضان کا قیام اچھی بدعت ہے۔

مسئلہ نمبر 2: ہر وہ بدعت جو مخلوق سے صادر ہو اس کی دو صورتیں ہوں گی یا تو اس کی شرع میں اصل ہوگی یا شرع میں اس کی اصل نہ ہوگی۔ اگر تو اس کی کوئی اصل ہو، وہ اس عموم کے تحت واقع ہو جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برانگیختہ کیا ہے تو وہ مدح کے مقام پر ہوگی اگرچہ اس کی مثال موجود نہ ہو جیسے جود و سخا کی نوع، اور نیکی کا کوئی فعل، تو یہ فعل، افعال محمودہ سے ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے کوئی کرنے والا نہ بھی ہو۔ اس قول کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول کرتا ہے: نعمت البدعة هذه (1) یہ اچھی بدعت ہے جب وہ بدعت افعال خیر میں سے تھی اور مدح کے تحت داخل تھی۔ قیام رمضان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا مگر اسے ترک کر دیا تھا اور اس پر دوام اختیار نہیں فرمایا تھا اور نہ لوگوں کو جمع کیا تھا۔ پس حضرت عمر کی اس پر محافظت اور لوگوں کو اس پر جمع کرنا اور انہیں اس کی طرف بلانا، بدعت تھا لیکن یہ بدعت محمودہ ممدوحہ تھی۔ اگر وہ کوئی ایسا عمل ہو جو اللہ اور اس کے رسول کے امر کے خلاف ہو تو وہ مذمت و انکار کے مقام میں ہوتا ہے۔ یہ معنی خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد جو خطبہ میں فرمایا اس کا یہی معنی ہے: و شر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلاله (2) برے امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ یعنی ایسی بدعت جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو یا صحابہ کے عمل کے موافق نہ ہو اور اس حقیقت کو اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا: مَنۡ سَنَّ فی الاسلام سُنَّةً حسنة کان له اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیء و من سَنَّ فی الاسلام سنةً سیئةً کان علیها وزرها و وزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیءٌ (3)۔ یعنی جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام شروع کیا تو اسے اس کا اجر اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا اور ان کے اجور میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا

1۔ الموطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی قیام رمضان، صفحہ 97 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعة فصل فی خطبة الجمعة، جلد 1، صفحہ 285 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقة لو بشق تمرة او کلمة طیبة، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی کتب خانہ)

عمل شروع کیا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے، ان کے گناہوں میں کمی کئے بغیر۔ یہ اشارہ ہے جو قبیح یا حسن بدعت شروع کی جاتی ہے۔ یہ اس باب کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عصمت و توفیق کا سوال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پالنے والا نہیں۔

مسئلہ نمبر3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ جب کسی امر کے احکام اور اتقان کا ارادہ فرماتا ہے...... جیسا کہ اس کے علم میں پہلے تھا...... تو اسے کُنْ فرماتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: قضاء الشئی کا مطلب اس کا احکام اور اس کا جاری کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے، اسی وجہ سے قاضی کو قاضی کہتے ہیں کیونکہ جب وہ فیصلہ فرماتا ہے تو جھگڑا کرنے والوں کے جھگڑا سے فارغ ہو جاتا ہے۔ الازہری نے کہا: لغت میں قضیٰ کے کئی معانی ہیں اس کا مرجع کسی چیز کو ختم کرنا اور مکمل کرنا ہے۔ ابوذؤیب نے کہا:

و علیہما مسرودتان قضاھما　　داؤد او صنع السوابغ تبع

ان کے اوپر دو زرہیں ہیں جنہیں داؤد نے بنایا ہے یا تبع نے مکمل کی ہیں۔

شماخ نے حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں فرمایا:

قضیت اموراً ثم غادرت بعدھا　　بوائق فی اکمامھا لم تفتق

تو نے کاموں کو مکمل کیا الخ۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قضیٰ کا لفظ مشترک ہے کبھی یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (فصلت:12) یہ قضیٰ بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے کبھی یہ اعلام کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ (الاسراء:4) یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو آگاہ کیا۔ کبھی یہ امر (حکم) کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (الاسراء:23) یعنی تمہارے رب نے حکم دیا...... کبھی الزام اور احکام کو جاری کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ (القصص:29) (جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی) کبھی ارادہ کے معنی میں ہوتا ہے جیسے وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا...... الخ جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا(1): قضیٰ بمعنی قدّر (اندازہ کرنا) اور کبھی بمعنی اَمْضٰی بھی آتا ہے۔ اہل سنت کے مذہب پر اس آیت میں یہ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں یعنی ازل میں مقدر فرمایا اور اپنا حکم نافذ فرمایا اور معتزلہ کے مذہب پر خلق اور ایجاد حکم نافذ فرمایا۔

مسئلہ نمبر4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْرًا، الامر واحد ہے اس کی جمع الامور ہے یہ امر یامر کا مصدر نہیں ہے(2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قرآن میں امر چودہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

(۱) دین: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتّٰی جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ (توبہ:48) حتیٰ کہ حق آیا اور اللہ کا دین اسلام ظاہر ہوا۔

(۲) قول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (المومنون:28) یعنی جب ہمارا قول آئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ (طہٰ:62) یہاں بھی امر بمعنی قول ہے۔

(۳) عذاب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ (ابراہیم:22) یعنی جب دوزخیوں کے بارے عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا (البقرہ:117) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ بغیر باپ کے ہوں گے۔

(۵) بدر میں قتل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ (غافر:78) یعنی بدر میں قتل اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (انفال:42) اس آیت میں مکہ کے کفار کا قتل مراد ہے۔

(۶) فتح مکہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ:24)۔ یہاں امر سے مراد فتح مکہ ہے۔

(۷) قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی: فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (البقرہ:109) اس آیت میں امر سے مراد قتل قریظہ اور بنی نضیر کی جلاوطنی ہے۔

(۸) قیامت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ (النحل:1) اللہ کا امر (قیامت) آ گیا۔

(۹) القضاء: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (السجدہ:5) اس میں امر بمعنی فیصلہ ہے۔

(۱۰) وحی: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ:5) وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی نازل فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ (طلاق:12)

(۱۱) امر الخلق: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (الشوریٰ) یعنی مخلوق کے امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۱۲) النصر (مدد، نصرت): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ (آل عمران:154) (کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے)

(۱۳) الذنب (گناہ): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا (الطلاق:9) یعنی اپنے گناہ کی سزا۔

(۱۴) شان اور فعل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (ہود) اس میں امر سے مراد فعل اور شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ۔ (نور:63) اس آیت میں بھی امر سے مراد فعل ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْ بعض علماء نے فرمایا: کاف، کینونه سے ہے اور نون نور سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اعوذ بکلمات التامة من شر ما خلق سے یہی مراد ہے۔ بکلمة اللہ التامة یعنی مفرد بھی مروی ہے۔ جمع اس اعتبار سے ہے کہ جب یہ کلمہ تمام امور میں ہے، پس جب ہر امر کے لئے كُنْ کہا اور ہر شے کے لئے كُنْ کہا تو یہ بہت سے کلمات ہو گئے۔ اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابوذر سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

روایت کی ہے اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عطائی کلام وعذابی کلام میری عطا کلام ہے اور میرا عذاب کلام ہے۔ ان الفاظ کو ایک طویل حدیث میں امام ترمذی نے نقل کیا ہے کلمہ، کلمات کے معنی میں بھی ہوتا ہے لیکن جب ایک کلمہ تمام اوقات میں تمام امور میں جدا جدا ہو یہ بہت سے کلمات ہو گئے اور ان کا مرجع ایک کلمہ ہے، اور تامۃ فرمایا کیونکہ اہل لغت کے نزدیک کم از کم کلام کے تین حروف ہوتے ہیں۔ ایک حرف جس سے آغاز کیا جاتا ہے ایک حرف جس کے ساتھ کلمہ جمع کیا جاتا ہے اور ایک حرف جس پر سکوت کیا جاتا ہے جب کسی کلمہ کے دو حرف ہوں تو وہ ان کے نزدیک ناقص ہوتا ہے جیسے ید، دم، ضم یہ علت کی وجہ سے ناقص ہیں۔ یہ کلمات آدمیوں کی طرف سے منقوصات میں سے ہیں کیونکہ یہ دو حرفوں پر مشتمل ہیں نیز کیونکہ یہ ادوات کے ساتھ تلفظ کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تامہ ہیں کیونکہ یہ بغیر ادوات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کی شبہ سے بلند و بالا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَكُونُ یہ نون کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے علیحدہ کلام کے اعتبار سے (1)۔ سیبویہ نے کہا: یہ فھو یکون ہے یا فانہٗ یکون ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ یقول پر معطوف ہے (2)۔ پہلی صورت میں یہ امر کے بعد ہوگا اگرچہ پہلے معدوم ہوگا، کیونکہ یہ موجود کے قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ معلوم ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور دوسری صورت میں امر کے ساتھ موجود ہوگا، اس کو طبری نے پسند کیا ہے۔ فرمایا اس نے کسی شے کو کُنْ کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے وہ حکم کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور کوئی شے موجود نہیں ہوتی مگر وہ جسے وجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس کی مثال، لوگوں کا قبور سے کھڑا ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے بلاوا سے نہ مقدم ہوں گے نہ مؤخر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ (الروم)

ابن عطیہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فرمایا: یہ معنی کی جہت سے غلط ہے کیونکہ یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ قول، تکوین اور وجود کے ساتھ ہے۔ (3)

اس آیت میں عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معدومات کا ہمیشہ سے آمر ہے ان کے وجود کی شرط کے ساتھ۔ مقدورات کے تاخر کے ساتھ قادر ہے۔ معلومات کے تاخر کے ساتھ عالم ہے۔ پس آیت میں ہر وہ چیز جو استقبال کا تقاضا کرتی ہے وہ ماموارت کے اعتبار سے ہے کیونکہ محدثات نہ ہونے کے بعد ہوتی ہیں، ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے قدرت اور علم سے وہ قدیم اور ہمیشہ ہوتی ہے (4)، پس (کن) کی عبارت جس معنی کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور قائم بالذات ہے۔

ابو الحسن الماوردی نے کہا: اگر کہا جائے کس حال میں وہ اسے کن کہتا ہے کہ وہ ہو جاتی ہے کیا عدم کی حالت میں یا اس کے وجود کی حالت میں۔ اگر تو وہ حالت عدم میں ہوتی ہے تو حکم کرنا محال ہے مگر مامور کو۔ جیسے محال ہوتا ہے امر ہونا مگر آمر کی طرف سے۔ اگر وہ حالت وجود میں ہے تو یہ ایسی حالت ہے جس میں وجود اور حدوث کا امر جائز ہی نہیں ہے کیونکہ وہ موجود حادث

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہے۔ اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے اس کی موجود مخلوق میں اس کے اوامر کے نفوذ کی، جیسے اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ دھتکارے ہوئے بندر بن جائیں اور یہ معدومات کی ایجاد میں وارد نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ہونے والا ہے اس کے ہونے سے پہلے اسے جانتا ہے۔ پس وہ اشیاء جو موجود نہیں وہ اس کے علم میں اپنے ہونے سے پہلے ان چیزوں کے مشابہ ہیں جو موجود ہیں۔ پس انہیں کونی کہنا جائز ہے۔ وہ انہیں حالت عدم سے حالت وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ حالت عدم میں ان کو جانتا ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جس کو اس نے پیدا کرنا ہے تمام کو شامل ہے جب وہ اس کی پیدائش اور تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور پائی جاتی ہے بغیر اس کے کہ وہاں اسے قول فرمائے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے جو وہ چاہتا ہے، اس کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ قول نہ بھی ہو۔ جیسے ابوالنجم کا قول ہے۔

قد قالت الانساع للبطن الحق (1)

یہ کوئی قول نہیں ہے، اس نے ارادہ کیا کہ پیٹھ پیٹ کے ساتھ لاحق ہوگئی ہے۔ جیسے عمرو بن حممہ الدوسی نے کہا:

فاصبحت مثل النسر طارت فراخهٗ　　اذا رام تطیاراً یقال له قع

میں گدھ کی طرح ہو گیا جس کے بچے اڑ گئے۔ جب وہ اڑنے کا ارادہ کرتی ہے تو اسے قع کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

قالت جناحاہ لساقیه الحقا　　و نجیا لحمکما ان یمزقا

اس کے پروں نے اس کی پنڈلیوں کو کہا: مل جاؤ اور اپنے گوشت کو پھٹنے سے بچالو۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تھے، ان کی طرح بے سروپا بات۔ ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل بے شک ہم نے صاف صاف بیان کردی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں۔ مجاہد نے کہا: نصاریٰ ہیں۔ طبری نے اس کو راجح کہا ہے کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہے۔ ربیع، سدی اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں و لولا بمعنی ھلا ہے۔ یہ حرف تحضیض (2) (ابھارنا) ہے۔ جیسے اشہب بن رمیلہ نے کہا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تعدون عقرالنیب افضل مجدکم　　بنی ضوطریٰ لولا الکمی المقنعا (1)

اس شعر میں لولا بمعنی ھلاّ ہے۔

یہ وہ لولا نہیں ہے جو ایک چیز کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے (یعنی شرط کے پائے جانے کی وجہ سے جزا کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے) ان دونوں کے درمیان علماء لغت کے درمیان یہ فرق ہے کہ لولا جو تحضیض کے معنی میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ فعل ظاہر یا فعل مقدر ملا ہوا ہوتا ہے اور جو امتناع کے لئے ہوتا ہے اس کے ساتھ مبتدا ملا ہوا ہوتا ہے اور عادت جاری ہے کہ خبر حذف ہوتی ہے (2)۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا تاکہ ہم جان لیں کہ وہ نبی ہے پھر ہم اس پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس وہ کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتے جو ان کی نبوت کی علامت ہو۔ الایۃ کا معنی دلالت اور علامت ہے۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جن علماء نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد کفار قریش لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد پہلی قومیں ہیں، اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ بعض علماء نے فرمایا: ان کے دل ہٹ دھرمی، اقتراح اور ترک ایمان میں ان کے مشابہ ہیں۔ فراء نے کہا: ان کے دل کفر میں متفق ہونے میں مشابہ ہیں۔ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾

”بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب! ﷺ) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا، (عذاب سے) ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہوگی ان دوزخیوں کے متعلق“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا، بَشِیْرًا حال کی بنا پر منصوب ہے اور نَذِیْرًا اس پر معطوف ہے۔ ان کا معنی گزر چکا ہے۔

وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ مقاتل نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ یہود پر عذاب نازل کرتا تو یہ ایمان لے آتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ۔ تسأل کے رفع کے ساتھ یہ جمہور کی قراءت ہے بشیرا، نذیراً پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دراں حالیکہ آپ بشارت دینے والے، ڈرانے والے اور غیر مسؤل ہیں۔ سعید اخفش نے کہا: لا تسأل (تاء کے فتحہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ) اور بَشِیْرًا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہے (3)۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دراں حالیکہ آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، دوزخیوں کے متعلق آپ پوچھنے والے نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے متعلق ان کے ڈرانے کے بعد آپ کو آگاہ کر دیا تو آپ ان کے متعلق سوال کرنے سے مستغنی ہیں۔ غیر سائل کا یہ معنی ہے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

اور غیر مسئول کا معنی یہ ہے کہ جو بشارت اور انذار کے بعد کفر کرے گا اس کے کفر کی وجہ سے آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش! معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ اس شخص کی قراءت پر ہے جنہوں نے لا تسأل جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ صرف نافع کی قراءت ہے اس میں دو وجہیں ہیں: اس شخص کے بارے سوال کرنے سے نہی ہے زندہ لوگوں میں سے جس نے نافرمانی کی اور کفر کیا کیونکہ حالت تبدیل ہوتی رہتی ہے، کبھی کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے اور معصیت سے اطاعت کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے جو زیادہ واضح ہے کہ اس کے متعلق سوال سے نہی ہے جو کفر اور معصیت پر فوت ہو گیا، اس کی حالت کی بڑائی اور شان کی تغلیظ کی وجہ سے یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے: تو فلاں کے متعلق نہ پوچھ یعنی وہ تیرے گمان سے زیادہ تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے لن تسأل پڑھا ہے اور ابی نے و ما تسأل پڑھا ہے۔ ان کا معنی جمہور کی قراءت کے موافق ہے اس کی نفی کی کہ آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے سوال کیا تھا کہ میرے والدین میں سے کون از روئے موت قریب ہے (2) تو یہ آیت نازل ہوئی، ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کے لئے زندہ کیا تھا اور وہ دونوں آپ پر ایمان لائے تھے، ہم نے حضور علیہ السلام کا قول بھی ذکر کیا ہے جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ (میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں) ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ الحمد للہ۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آچکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! جو یہ آیات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی غرض ایمان لانے کی نہیں ہے بلکہ اگر آپ وہ سب کچھ لے بھی آئیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ انہیں تو صرف یہی چیز راضی کرے گی کہ آپ جس دین اسلام پر ہیں اس کی پیروی چھوڑ دیں۔ کہا جاتا ہے: رضی یرضی رِضا رُضا و رضوانا و رُضوانا و مَرضاۃ۔ یہ واوی ہے، تثنیہ میں رِضوان کہا جاتا ہے۔ کسائی نے رضیان حکایت کیا ہے۔ ممدود بھی حکایت کیا گیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ گویا یہ راضی یراضی مراضاۃ و رضائی کا مصدر ہے۔ نتبع، ان کی وجہ سے منصوب ہے لیکن حتیٰ کے ساتھ انْ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ خلیل نے کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حتیٰ اسم کو جر دیتا ہے جیسے ارشاد ہے: حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۝ (القدر) جو اسم میں عامل ہوتا ہے وہ فعل میں عامل نہیں ہوتا۔ اور جو اسم کو جر دیتا ہے وہ فعل کو نصب نہیں دیتا۔ نحاس نے کہا نتبع، حتیٰ کی وجہ سے منصوب ہے اور حتیٰ، انْ سے بدل ہے۔ الملۃ اس کا اسم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتب میں اور اپنے رسولوں کی زبان پر اپنے بندوں کے لئے مشروع فرماتا ہے۔

پس ملت اور شریعت برابر ہیں۔ رہا دین تو اس کے اور ملت و شریعت کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ شریعت وہ ہوتی ہے جس کے کرنے کی طرف اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بلاتا ہے اور دین وہ ہوتا ہے جس کو بندے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ادا کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے علماء کی ایک جماعت، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، داؤد اور امام احمد بن حنبل نے دلیل پکڑی ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِلَّتَهُمْ، ملت کو واحد ذکر فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝ (الکافرون: 4) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لایتوارث اهل الملتین (1)۔ (دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے)۔ یہاں ملتین سے مراد اسلام اور کفر ہیں۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لایرث المسلمُ الکافرَ۔ مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

امام مالک اور ایک روایت امام احمد سے یہ ہے کہ کفر کی بہت سی ملتیں ہیں۔ پس یہودی، نصرانی کا وارث نہ ہوگا اور یہودی اور نصرانی، مجوسی کے وارث نہیں ہوں گے۔ امام مالک اور امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر قول لایتوارث اهل ملتین کو لیا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں مِلَّتَهُمْ اس سے مراد کثرت ہے اگرچہ لفظاً مفرد ہے کیونکہ کثرت کی ضمیر کی طرف مضاف ہے جیسے تو کہتا ہے: اخذت عن علماء اهل المدینه علمهم۔ سمعت علیهم حدیثهم۔ ان مثالوں میں علومهم اور احادیثهم مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جس ہدایت پر آپ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے اسے رکھ دیتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ، الاهواء، جمع ہے هوی کی جیسے تو کہتا ہے: جمل و اجمال۔ جب خواہشات مختلف تھیں تو جمع اهواء ذکر کیا اگر ملت کے افراد پر محمول کیا جاتا تو هواهم ہوتا (3)۔ اس خطاب میں دو وجہیں ہیں: (۱) یہ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کیونکہ خطاب آپ کی طرف متوجہ ہے۔ (۲) خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس

1۔ سنن ابی داؤد، باب هل یرث المسلم الکافر، حدیث 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب میراث اهل الاسلام من اهل الشرك، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

سے مراد امت ہے۔ پہلی صورت میں اس میں امت کے لئے تادیب ہے کیونکہ ان کا مرتبہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے۔ اس آیت کا سبب یہ ہے کہ لوگ صلح و آشتی کا سوال کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ وہ آپ سے راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان سے جہاد کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْعِلْمِ امام احمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا ہے قرآن مخلوق ہے۔ امام احمد نے فرمایا: وہ کافر ہے، پوچھا گیا: آپ نے اسے کیسے کافر کہا۔ امام احمد نے فرمایا: کتاب اللہ کی آیات کی وجہ سے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ۔ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۠ ﴿۱۲۱﴾ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْــٴًـا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر۔ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلہ دے سکے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ قتادہ نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ اور اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے اسلام لائے تھے۔ اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ اور آیت عام ہے(1)۔ اَلَّذِیْنَ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ اٰتَیْنٰهُمُ اس کا صلہ ہے۔ یَتْلُوْنَهٗ مبتدا کی خبر ہے۔ اگر تو چاہے تو خبر اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کو بنا دے۔

یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ پیروی کرتے ہیں جیسے اس کی پیروی کرنے کا حق ہے یعنی اس کے امر و نہی کی پیروی کرنے کے ساتھ، اس کے حلال کو حلال کرتے ہیں اور اس کے حرام کو حرام کرتے ہیں اور جو احکامات اس میں ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ (الشمس) (جب چاند اس کے پیچھے آتا ہے)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کے قول کا یہی معنی

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

قد جعلت دلوی تستتلینی میرا ڈول میرے پیچھے آیا۔

نصر بن عیسیٰ نے مالک سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: یتبعونہٗ حق اتباعہٖ۔ یعنی وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جس طرح پیروی کا حق ہے اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں جیسا کہ خطیب ابوبکر احمد نے ذکر کیا ہے، لیکن س کا معنی صحیح ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا: جو قرآن کی پیروی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ جنت کے باغیچوں پر اترے گا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کسی رحمت والی آیت سے گزرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب عذاب والی آیت سے گزرتے ہیں تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی معنی نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے جب آپ آیت رحمت سے گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کی محکم آیات پر عمل کرتے ہیں اور متشابہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو مشکل ہوتا ہے وہ اس کے جاننے والے کے سپرد کرتے ہیں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے مگر یہ کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کے الفاظ کو ترتیل سے پڑھتے ہیں اور اس کے معانی کو سمجھتے ہیں۔ معانی کا سمجھنا اتباع ہوتا ہے اس کے لئے جس کو توفیق دی گئی ہوتی ہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجالایا۔ اللہ نے فرمایا: بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی: میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک''۔

اس میں بیس مسائل ہیں (☆)۔

مسئلہ نمبر 1: جب کعبہ اور قبلہ کا ذکر جاری تھا تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمادیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا تھا۔ یہود کا حق تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے انحراف نہ کرتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی نسل سے تھے۔ الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ اس کا معنی حکم دینا ہے اور مکلف بنانا ہے۔ ابراھیم، اس کی سریانی زبان میں تفسیر وہ ہے جو ماوردی نے ذکر کی ہے اور عربی میں وہ ہے جو ابن عطیہ نے ذکر کی ہے اب رحیم (4) (مہربان باپ)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے حالانکہ تفصیل میں تئیس مسائل ہیں۔

سہیلی نے کہا: اکثر سریانی اور عربی زبان میں اتفاق واقع ہوتا ہے یا لفظ میں ایک دوسری کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ابراہیم کی تفسیر ابٌ راحمٌ (مہربان باپ) بچوں پر ان کی شفقت کی وجہ سے ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ قیامت تک مومنوں کے ان بچوں کے کفیل ہیں جو بچپن میں فوت ہو گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس پر بخاری کی حدیث دلالت کرتی ہے، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ ایک لمبا خواب ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باغ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا ان کے اردگرد لوگوں کی اولاد تھی۔ ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو کتاب ''التذکرہ'' میں کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے ابراہیم بن تارخ بن تاخور۔ یہ بعض مؤرخین کے قول کے مطابق ہے(1) اور قرآن حکیم میں ہے: واذ قال ابراھیم لابیہ آزر (جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا) اسی طرح صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ان میں اختلاف اور تناقض نہیں ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ اسماعیل، اسحاق، مدین، مدائن۔ جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں مفعول کو اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی حضرت ابراہیم کو آزمانے والا تھا۔ فاعل کے ساتھ ضمیر کا متصل ہونا عربی میں مفعول کی تقدیم کا موجب ہوتا ہے اس اہتمام پر کلام کی بنیاد رکھی گئی ہے(2)۔ عام قراءت ابراھیم نصب کے ساتھ ہے ربہ رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے انہوں نے اس کا الٹ پڑھا ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے انہیں اسی طرح پڑھایا۔ معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا دعا مانگی۔ اس میں بکلمات میں باء کی وجہ سے بُعد ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِكَلِمٰتٍ** یہ کلمہ کی جمع ہے ان کی تحقیق اللہ تعالیٰ کے کلام کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہاں کلمات سے مراد وہ وظائف ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا جب ان وظائف کی تکلیف کلام کے ساتھ تھی اس لئے اسے کلمات سے تعبیر فرمایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کیونکہ وہ کن کے کلمہ سے صادر ہوئے۔ کسی شے کا اس کے مقدمہ کے ساتھ نام رکھنا مجاز کی ایک قسم ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3: الکلمات کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شرائع اسلام ہیں اور یہ تیس ہیں۔ دس کا ذکر سورہ برأت میں ہے **اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ**...... الی اخرہ۔ دس کا ذکر سورۂ احزاب میں ہے **اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ** الخ۔ دس کا ذکر سورہ المومنون میں ہے **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ** ... **عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ** تک اور سورۂ سال سائل میں **اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ** سے لے کر **وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ** تک ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کے ساتھ جس کو بھی آزمایا تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا۔ اسلام کے ساتھ آزمایا تو حضرت ابراہیم نے اسے مکمل کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے برأت لکھی۔ فرمایا: **وَ اِبْرٰهِیْمَ**

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الَّذِیْ وَفّٰۤى (النجم: 37)(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد امر و نہی ہے، بعض نے فرمایا: اپنے بیٹے کا ذبح کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسالت کی ادائیگی ہے۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: میں تجھے ایک امر سے آزمانے والا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کی: تو مجھے لوگوں کے لئے امام بنا دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔

حضرت ابراہیم نے عرض کی: مِنْ ذُرِّيَّتِيْ میری اولاد سے بھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: تو اپنے گھر کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: امن والا بنائے گا۔ فرمایا: ہاں۔ تو ہمیں مناسک دکھائے گا اور ہم پر نظر کرم فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کی: اس کے باسیوں کو پھلوں سے رزق دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ تکمیل فرمانے والا ہوگا(2)۔ اس سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ کے تحت روایت کی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طہارت کے ساتھ آزمایا۔ پانچ چیزیں سر میں تھیں اور پانچ پورے جسم میں تھیں: مونچھوں کا کاٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا اور جسم میں یہ چیزیں تھیں: ناخن کاٹنا، زیر ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، پیشاب، پاخانہ کی جگہ کو پانی کے ساتھ دھونا(3)، اس قول پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تکمیل کرنے والے ہوں(4)۔ یہی قرآن کا ظاہر ہے۔ مطر نے ابوالجلد سے روایت کیا ہے کہ یہ بھی دس کلمات تھے۔ انہوں نے مانگ کی جگہ اعضاء کے جوڑوں کو دھونا، اور استنجاء کی جگہ زیر ناف بال صاف کرنے کو رکھا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ خاص مناسک حج ہیں۔ حسن نے کہا: یہ چھ خلال ہیں: ستارہ، چاند، سورج، آگ، ہجرت اور ختنہ کرنا۔ ابواسحاق الزجاج نے کہا: یہ اقوال ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں ان تمام کے ساتھ حضرت ابراہیم کو آزمایا گیا۔ میں کہتا ہوں: مؤطا وغیرہ میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا: ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے ختنہ کیا اور پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، پہلے شخص ہیں جنہوں نے زیر ناف بال صاف کئے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے ناخن تراشے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے مونچھیں کاٹیں، پہلے شخص ہیں جن کے بال سفید ہوئے، جب سفید بالوں کو دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وقار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! میرے وقار میں اضافہ فرما...... ابوبکر بن ابی شیبہ نے سعید بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے منبر پر خطبہ دیا وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، دوسرے علماء نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے ثرید (سالن میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھانا) بنائی، جس نے سب سے پہلے تلوار چلائی، جس نے سب سے پہلے مسواک کیا، جس نے سب سے پہلے پانی سے استنجا کیا، جس نے سب سے پہلے شلوار پہنی وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم نے منبر بنایا تھا، اگر میں لاٹھی پکڑوں تو میرے باپ ابراہیم نے لاٹھی پکڑی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ ایسے احکام ہیں جن کا بیان اور جن پر آگاہی اور جن پر کلام کرنا ضروری ہے، ان میں سے پہلا ختنہ کرنا ہے اور اس کے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ یہی مسئلہ ہے؟

مسئلہ نمبر 4: علماء کا اجماع ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تھا، جس عمر میں آپ نے ختنہ کیا اس میں اختلاف ہے۔ مؤطا میں حضرت ابوہریرہ سے موقوفاً مروی ہے ختنہ کرنے کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ اس قسم کی روایت، اپنی رائے سے نہیں ہوسکتی۔ اوزاعی نے مرفوعاً یحییٰ بن سعید سے انہوں نے حضرت سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی پھر اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ یہ ابوعمر نے ذکر کیا ہے۔ یحییٰ کے علاوہ کئی واسطوں سے مسند مرفوع روایت کی ہے کہ انہوں نے ختنہ کیا جب آپ کی عمر اسی سال کو پہنچ گئی تھی اور تیسے کے ساتھ آپ نے ختنہ کیا تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ کی عمر اسی سال تھی یہی حدیث عجلان میں اور حدیث اعرج عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ سے محفوظ ہے (1)۔ حضرت عکرمہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر اسی سال تھی۔ اس کے بعد ملت ابراہیم پر کسی نے بیت اللہ کا طواف نہ کیا مگر وہ مختون تھا۔ اسی طرح عکرمہ نے کہا اور مسیب بن رافع نے کہا ہے۔ مروزی نے یہ ذکر کیا ہے۔ القدوم (تیسہ) یہ دال کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ ابوالزناد نے کہا: القدوم دال کی شد کے ساتھ ہو تو اس سے مراد جگہ کا نام ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 5: ختنہ کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مؤکدہ سنن میں سے ہے اور فطرت اسلام میں سے ہے۔ مردوں کو اس کے ترک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (النحل: 123)

قتادہ نے کہا: اس سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ بعض مالکیوں کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، ابن سریج نے اس کے وجوب پر شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی حرمت سے استدلال کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ختنہ کرنا فرض نہ ہوتا تو مختون کی شرمگاہ کو دیکھنا مباح نہ ہوتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے جسم کی مصلحت کے لئے یہ مباح ہوتا ہے جیسے طبیب کے لئے دیکھنا مباح ہوتا ہے اور طب بالاجماع واجب نہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو حجاج بن ارطاۃ نے ابوالملیح سے اور انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ختنہ کرنا مردوں کے لئے سنت ہے اور عورتوں کے لئے اچھا عمل ہے) حجاج

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا، حدیث 3107، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5824، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قابل حجت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں جس حدیث سے حجت پکڑی جاتی ہے وہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا...... الحدیث۔ آگے تفصیل سے آئے گی۔ ابوداؤد نے حضرت ام عطیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت مدینہ طیبہ میں عورتوں کے ختنے کرتی تھیں۔ اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کاٹنے میں مبالغہ نہ کیا کر کیونکہ یہ عورت کے لئے اچھا ہے اور خاوند کے لئے پسندیدہ ہے۔ ابوداؤد نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اس کا راوی مجہول ہے (1)۔ وہ روایت جس کو رزین نے ذکر کیا ہے اس میں مبالغہ نہ کر کیونکہ چہرہ کے لئے زیادہ نور کا باعث ہے اور مرد کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اگر بچہ مختون پیدا ہو تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں۔ میمونی نے کہا: مجھے احمد نے کہا: یہاں ایک شخص ہے اس کا مختون بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس وجہ سے شدید غمگین ہوا، میں نے اسے کہا جب اللہ تعالیٰ نے خود تیری اس مسئلہ میں کفایت فرمائی ہے تو تو پریشان کس لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ابوالفرج جوزی نے کہا: مجھے حضرت کعب الاحبار سے بتایا گیا ہے، فرمایا: تیرہ انبیاء کرام مختون پیدا ہوئے تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت سام، حضرت لوط، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت شعیب، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ وعلیہم اجمعین۔ محمد بن حبیب ہاشمی نے کہا: وہ چودہ انبیاء کرام تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (یہ اصحاب الرس کے نبی تھے) اور حضرت محمد ﷺ وعلیہم اجمعین۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ابونعیم الحافظ نے اپنی کتاب "الحلیۃ" میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ ابوعمرو نے "التمہید" میں اس سند، حدثنا احمد بن محمد بن احمد حدثنا محمد بن عیسیٰ حدثنا یحییٰ بن ابوب بن بادی العلاف حدثنا محمد بن ابی السری العسقلانی حدثنا الولید بن مسلم عن شعیب عن عطاء الخراسانی عن عکرمہ عن ابن عباس کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عبدالمطلب نے ساتویں دن نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا تھا اور دسترخوان لگایا تھا اور آپ ﷺ کا نام (محمد) رکھا تھا۔ ابوعمر نے کہا: یہ حدیث مسند غریب ہے۔ یحییٰ بن ایوب نے کہا: میں نے یہ حدیث تلاش کی تو مجھے ان محدثین میں سے کسی کے پاس نہیں ملی جن سے میری ملاقات ہوئی ہے مگر ابن ابی السری کے پاس ملی۔ ابوعمر نے کہا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا اختلاف ہے کہ بچے کا ختنہ کب کیا جائے۔ اخبار میں علماء کی ایک جماعت سے ثابت ہے وہ کہتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا، اپنے بیٹے اسحاق کا ختنہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی الختان، حدیث 4587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتویں روز کیا تھا۔ حضرت سیدہ فاطمہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا ساتویں روز ختنہ کرتی تھی۔ امام مالک نے اس کا انکار کیا اور کہا یہ یہود کا عمل ہے۔ مالک سے ابن وہب نے یہ ذکر کیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: بچے کا ختنہ سات سال سے دس سال تک کے درمیان کیا جائے۔ ابن وہب نے مالک سے اس طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے فرمایا: اس کے متعلق میں نے کچھ نہیں سنا۔ بخاری میں سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا: تم کتنی عمر کے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اس وقت مختون تھا۔ فرمایا: اور لوگ مرد کا ختنہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جاتا یا قریب البلوغ ہوتا۔ (1)

بڑا آدمی جو اسلام قبول کرے علماء نے اس کا ختنہ کرنا مستحب قرار دیا ہے۔ عطا کہتے تھے: اس کا اسلام مکمل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کا ختنہ کیا جائے اگرچہ وہ اسی سال کو پہنچ جائے۔ حسن سے مروی ہے: وہ بوڑھے شخص کو ختنہ نہ کرنے کی رخصت دیتے تھے جو مسلمان ہوتا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے اور اس کی شہادت، اس کا ذبیحہ، اس کے حج اور نماز میں بھی کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور غیر مختون کے حج کے بارے میں حضرت بریدہ کی حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن زید اور عکرمہ سے روایت ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا اور اس کی شہادت جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اول من استحدّ کا قول۔ استحداد کا مطلب ہے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنا۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نورہ (چونا) استعمال کرتے تھے تو زیر ناف بالوں کے لئے اپنے ہاتھ سے نورہ استعمال کرتے تھے (2)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نورہ لگایا حتیٰ کہ جب زیر ناف تک پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو یہاں سے چلا جا پھر اپنے ہاتھ سے زیر ناف نورہ لگایا۔ حضرت انس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نورہ نہیں لگاتے تھے جب زیر ناف بال زیادہ ہوتے تو انہیں مونڈ دیتے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ دلیل ہے کہ آپ کا اکثر فعل حلق تھا اور نورہ کبھی استعمال کرتے تھے، یہ اس لئے تاکہ دونوں حدیثوں کو جمع کرنا صحیح ہو۔

مسئلہ نمبر 10: تقلیم الاظفار (ناخن کاٹنا)۔ قلامہ اس حصہ کو کہتے ہیں جو ناخن سے تراشا جاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں عورتوں کے لئے ناخن کاٹنا اور زیر ناف بال صاف کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح مردوں پر ہے۔ یہ حارث بن مسکین اور سحنون نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں الاصل التاسع والعشرون فصل میں ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا فرمایا ہمیں ابراہیم بن العلاء زبیدی نے بتایا انہوں نے عمر بن بلال فرازی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن بشیر مازنی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ناخن کاٹو اور ناخنوں کے تراشوں کو دفن کرو، اپنے جوڑوں کو صاف کرو، کھانے سے اپنے مسوڑھوں کو صاف کرو، مسواک کرو

1۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الاطلاء بالنورة، حدیث 3741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور میرے پاس پیلے دانتوں اور بدبو کے ساتھ نہ آیا کرو۔ پھر اس حدیث پر کلام فرمائی اور عمدہ کلام فرمائی۔ امام ترمذی نے فرمایا: رہا ناخن کاٹنا یہ اس لئے ہے کیونکہ اس سے خراش لگتی ہے اور نقصان ہوتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان جنبی ہو جاتا ہے اور اس میل کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچتا اور وہ ہمیشہ جنبی رہتا ہے۔ جو آدمی جنبی ہو اور غسل کرنے کے بعد سوئی کی جگہ بھی خشک رہ جائے تو وہ اپنی حالت پر جنبی ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ پورے جسم کا غسل کر لے۔ اسی وجہ سے ناخن کاٹنے کی ترغیب دی۔ اظافیر جمع ہے اظفور کی۔ اور الاظفار جمع ہے الظفر کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: جب آپ نماز میں بھول گئے فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں نہ وہم کروں جبکہ تم میں سے کسی کے ناخنوں اور پوروں کے درمیان میل ہوتی ہے تم میں سے کوئی مجھ سے آسمان کی خبر کے متعلق پوچھتا ہے جبکہ اس کے ناخنوں میں جنابت اور میل ہوتی ہے (1)۔ اس خبر کو ابوالحسن علی بن محمد الطبری المعروف الکیا نے ''احکام القرآن'' میں سلیمان بن فرح ابوواصل سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: میں حضرت ابوایوب کے پاس آیا میں نے ان سے مصافحہ کیا تو انہوں نے میرے لمبے ناخن دیکھے۔ حضرت ابوایوب نے فرمایا: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آتا ہے جب کہ اس کے ناخن پرندوں کے ناخنوں کی طرح ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے (2)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ادفنوا قلا ماتکم ناخنوں کے تراشے دفن کر دو کیونکہ مومن کا جسم حرمت والا ہے، جو مومن کے جسم سے ساقط ہو اور زائل ہو اس کی بھی حرمت قائم ہے (3)۔ پس اسے دفن کر دینا چاہئے جیسے مومن جب مر جاتا ہے تو اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اور جب اس کا بعض حصہ مر جائے تو دفن کر کے اس کی حرمت قائم کی جائے گی تاکہ وہ بکھر نہ جائے، آگ میں نہ گرے یا کسی گندی جگہ نہ گرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خون دفن کرنے کا حکم دیا جب آپ نے پچھنے لگوائے تھے تاکہ اسے کتے نہ پئیں۔ اس کے متعلق میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں بتایا اور کہا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بتایا فرمایا: ہمیں مفید بن قاسم بن عبدالرحمٰن بن ماغر نے بتایا فرمایا: میں نے عامر بن عبداللہ بن زبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جبکہ آپ پچھنے لگوا رہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: اے عبداللہ! یہ خون لے جاؤ اور ایسی جگہ انڈیل دو جہاں تجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوجھل ہو گئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی لیا، جب وہ واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! تو نے اس خون کو کیا کیا؟ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اسے مخفی جگہ رکھ دیا ہے۔ میرا گمان ہے وہ لوگوں سے مخفی رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لعلك شربته۔ شاید تو نے وہ پی لیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تو نے خون کیوں پیا ہے؟ لوگوں کے لئے تجھ سے ہلاکت ہے اور تیرے لئے لوگوں سے ہلاکت ہے۔

میرے باپ نے مجھے بتایا، فرمایا: مالک بن سلیمان ہروی نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں داؤد بن عبدالرحمٰن نے بتایا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 45 2۔ احکام القرآن زیر آیت ہذہ 3۔ نوادر الاصول، صفحہ 45

انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ انسان کی سات چیزوں کو دفن کرنے کا حکم دیتے تھے: بال، ناخن، خون، حیض، دانت، قلفہ (وہ حصہ جو ختنہ کرنے والا کاٹا جاتا ہے) اور قے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نقوا براجمکم اپنے جوڑ صاف کرو جہاں میل جمع ہو جاتی ہے۔ براجم کا مفرد بُرجَمۃٌ ہے ہر جوڑ کی گرہ۔ پس ہر گرہ کی پیٹھ کو برجمہ کہا جاتا ہے اور جو دو گرہوں کے درمیان ہو اسے راجبۃ کہتے ہیں اس کی جمع رواجب ہے۔ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جو ظاہر سے ملا ہوا ہوتا ہے یہ انگلی کا قصبہ ہے ہر انگلی کے دو برجم اور تین رواجب ہوتے ہیں سوائے انگوٹھے کے اس کا ایک برجم اور دو راجب ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی صفائی کا حکم دیا تاکہ میل نہ ہو اور جنابت باقی نہ رہے اور میل، پانی اور جلد کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نظفوا لثاتکم (اپنے مسوڑوں کو صاف کرو)۔ لثۃٌ واحد ہے اور اس کی جمع لثات ہے۔ یہ وہ گوشت ہوتا ہے جو دانتوں کے اوپر اور دانتوں کے نیچے ہوتا ہے دانتوں کے نکلنے کی جگہ اور العُمُور اس تھوڑے سے گوشت کو کہتے ہیں جو دانتوں کے درمیان ہوتا ہے، اس کا مفرد عَمْر ہے۔ ان کے صاف کرنے کا حکم دیا تاکہ اس میں کھانے کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہے اور اس میں بدبو نہ پیدا ہو جائے اور فرشتوں کو کوئی تکلیف ہو۔ کیونکہ یہ قرآن کا راستہ ہے اور فرشتوں کے بیٹھنے کی جگہ بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق) کے تحت خبر روایت کی گئی ہے کہ فرشتہ آدمی کے بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ محمد بن علی الشقیقی نے ہمیں یہ بیان کیا، فرمایا: میں نے اپنے باپ کو سفیان بن عیینہ سے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے بہت عمدہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ، ہونٹوں کا عمل ہے وہ کلام کو اپنی زبان سے باہر پھینکتا ہے لدیہ سے مراد اس کے پاس ہے۔ لدی اور عند کا معنی لغت میں ایک ہے اسی طرح لدن ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ گویا آیت سے معلوم ہوتا ہے سخت کلام کرنے والے کے پاس تاڑنے والا سخت موجود ہے اور وہ بڑا دانت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تسننوا یہ السن سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے مسواک کرو، یعنی دانت صاف کرو۔

لا تدخلوا علی قحرا بخرا میرے نزدیک محفوظ قحلاً و قلحاً ہے۔ یعنی میرے پاس پیلے دانتوں اور منہ کی بدبو کے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے جارود کو نضر سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ اقلح اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دانت پیلے ہوں حتیٰ کہ ان کے اندر سے بدبو آئے۔ میں القحر نہیں جانتا، البخر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے جسم سے بدبو آئے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ ابخر، رجال بخرٌ۔

ہمیں جارود نے بتایا، فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے ابو علی سے انہوں نے ابو جعفر بن تمام بن عباس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسواک کرو تمہیں کیا ہے تم میرے پاس پیلے دانتوں کے ساتھ آتے ہو۔

مسئلہ نمبر 11: قص الشارب (مونچھوں کا کاٹنا) مونچھیں اتنی کاٹنا کہ ہونٹ کی طرف ظاہر ہو جائے۔ بالکل نہ مونڈ

دے کہ اپنے آپ کو مثلہ کردے (1)۔ امام مالک نے یہی فرمایا۔ ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ جو مونچھوں کا حلق (مونڈ دے) کرائے اسے ادب سکھایا جائے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں مونڈنا بدعت ہے جو ایسا کرے اسے سزا دی جائے۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک نے فرمایا: جو مونچھوں کا حلق کرے اسے مار کر تکلیف دینی چاہئے گویا وہ اسے مثلہ دیکھتے تھے، حلق کی نسبت مونچھوں کو چھوٹا کرنا امام مالک کے نزدیک اولیٰ ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ کے بال لمبے تھے۔ آپ کے صحابہ میں سے کسی کے بال لمبے ہوتے تھے اور کسی کے چھوٹے ہوتے تھے۔ عمرہ اور حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر کا حلق کرایا تو صحابہ نے بھی حلق کرایا۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کی طرف جانے سے پہلے ناخن اور مونچھیں کاٹتے تھے۔ امام طحاوی نے فرمایا: ہم امام شافعی سے اس کے بارے میں کوئی نص نہیں پاتے اور ان کے اصحاب جن کو ہم نے دیکھا مزنی اور ربیع یہ اپنی مونچھوں کو خوب پست کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عمل لیا ہوگا۔ فرمایا: امام ابوحنیفہ، امام زفر، امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب سر کے بالوں اور مونچھوں کے بارے میں یہ تھا کہ تقصیر سے احفاء افضل ہے۔ یعنی بال اور مونچھیں چھوٹی کرنے سے بالکل مونڈ دینا افضل ہے۔ ابن خویز منداد نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ ان کا مذہب مونچھوں کو حلق (مونڈنے) کرنا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ ابوبکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل کو دیکھا وہ مونچھوں کو انتہائی پست کرتے تھے۔ میں نے سنا کہ ان سے مونچھوں کے انتہائی پست کرنے کے سنت ہونے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسی طرح انتہائی پست کی جائیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: احفوا الشوارب مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔

ابوعمر نے کہا: اس باب میں دو اصل ہیں۔ ایک لفظ ہے اُحفوا مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔ یہ لفظ تاویل کا احتمال رکھتا ہے دوسرا لفظ قص الشارب ہے یہ لفظ مفسر ہے اور مفسر، مجمل پر غالب ہوتا ہے۔ یہی اہل مدینہ کا عمل ہے یعنی (مونچھوں کو کاٹنا) اور جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے یہ بہتر ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مونچھوں کو کاٹتے تھے اور فرماتے تھے: ابراہیم خلیل الرحمن ایسا کرتے تھے (2)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا، بغلوں کے بال نوچنا (3)۔ حضرت ابن عمر سے ترمذی میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو انتہائی پست کرو، داڑھیوں کو بڑھاؤ اور عجمی لوگ اپنی داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں یا دونوں کو اکٹھا بڑھاتے ہیں۔ یہ جمال اور نظامت کے برعکس ہے۔ رزین نے نافع سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر اپنی مونچھوں کو اتنا پست کرتے تھے کہ ان کی جلد نظر آتی تھی، اور مونچھوں اور داڑھی کو کاٹتے تھے۔

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الفطرۃ، صفحہ 712 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، ابواب الاداب، باب ما جاء فی قص الشارب، جلد 2، صفحہ 100 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، باب خصال الفطرۃ، جلد 1، صفحہ 129 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں ہے حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی جو قبضہ سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض اور طول سے کاٹتے تھے(1)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

مسئلہ نمبر 12: بغلوں کے بال نوچنا سنت ہے جس طرح زیر ناف بالوں کا حلق (مونڈنا) سنت ہے اگر کوئی اس کا الٹ کردے تو بھی جائز ہوگا کیونکہ نظافت حاصل ہوگئی۔ پہلا طریقہ بہتر ہے اور آسان و معتاد ہے۔

مسئلہ نمبر 13: فرق الشعر (بالوں کی مانگ نکالنا)۔ نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے۔ جب آپ کے بندھے ہوئے بال بکھر جاتے تو آپ مانگ نکالتے۔ کہا جاتا ہے: فرقت الشعر افرقه فرقاً بالوں کو جدا جدا کرنا۔ کہتے ہیں: ان انفرق شعر راسه فرقه فی مفرقه۔ سر کے بال بکھر جاتے تو اسے اپنی مانگ میں علیحدہ علیحدہ کر دیتے اور اگر بکھرتے نہیں تھے تو سر پر اکٹھا رکھتے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو پیشانی پر ڈالے رکھتے تھے جب کہ مشرک لوگ اپنے بالوں کی مانگ نکالتے تھے۔ آپ ﷺ ہر اس کام میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جس میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بالوں میں مانگ نکالتے تھے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے(2)۔ قاضی عیاض نے کہا: سدل الشعر کا مطلب بالوں کو کھلا چھوڑ دینا اور اس حدیث میں علماء کے نزدیک بالوں کو پیشانی پر چھوڑنا ہے اور ان کا گچھا بنانا ہے۔ بال میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ اس طرف نبی کریم ﷺ نے رجوع کیا تھا، روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جمعہ سے واپس آتے تھے تو مسجد کے دروازے پر اپنے سپاہیوں کو کھڑا کرتے تھے اور ہر اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے جو اپنے بالوں کی مانگ نکالے ہوئے نہ ہوتا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھی۔

مسئلہ نمبر 14: سفید بال نور ہیں اور ان کا نکالنا مکروہ ہے۔ نسائی اور ابوداؤد میں عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید بال نہ نوچو، جس مسلمان کے اسلام میں بال سفید ہوتے ہیں وہ قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھے گا اور اس سے گناہ معاف فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں: جس طرح سفید بال نوچنا مکروہ ہے اسی طرح سفید بالوں کو سیاہی میں بدلنا بھی مکروہ ہے لیکن سیاہی کے علاوہ کسی رنگ سے بدلنا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابو قحافہ کے حق میں فرمایا...... انہیں لایا گیا تھا جب ان کے بال ثغامہ بوٹی کی طرح سفید تھے...... اس کو کسی چیز سے تبدیل کردو، اور سیاہ (خضاب) سے اجتناب کرو۔ کتنا خوبصورت شعر کہا ہے جس نے کہا ہے

یسود اعلاها و یبیض اصلها ولا خیر فی الاعلی اذا فسد الاصل

1۔ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی الاخذ من اللحية، جلد 2، صفحہ

2۔ صحیح بخاری، صفة النبی علیه الصلوة والسلام، حدیث 3294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اوپر سے سیاہ اور اصل سفید ہے، اوپر والے رنگ میں کوئی بھلائی نہیں جب اصل بری ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا خاضب الشیب بالحناء تسترہ — سل الملیك له ستراً من النار

اے مہندی کے ساتھ سفید بالوں کو خضاب کر کے چھپانے والے! اللہ تعالیٰ سے آگ سے پردہ کا سوال کر۔

مسئلہ نمبر 15: الثرید (سالن میں ٹکڑے بھگو کر چوری بنا کر کھانا) یہ عمدہ کھانا ہوتا ہے اور زیادہ برکت والا ہوتا ہے۔ یہ عربوں کا کھانا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام کھانوں پر اس کھانے کی فضیلت کی گواہی دی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے (1)۔ صحیح البستی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ وہ جب ثرید بناتی تھیں تو اسے کسی چیز سے ڈھانپ دیتی تھیں حتیٰ کہ اس کی گرمی ختم ہو جائے اور فرماتی تھیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یہ بڑی برکت والا کھانا ہے۔

مسئلہ نمبر 16: میں کہتا ہوں: یہ سب اس روایت کا مفہوم تھا جو عبدالرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کی اور جو سعید بن مسیب وغیرہ نے کہا، کلی، ناک میں پانی ڈالنا اور مسواک کا ذکر سورۃ النساء میں آئے گا اور استنجا کا حکم سورۂ برأت میں اور ضیافت کا حکم سورۂ ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں کاٹنے، ناخن تراشنے، بغلوں کے بال نوچنے، زیر ناف بال مونڈنے کا ہمارے لئے وقت متعین کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ انہیں نہ چھوڑے رکھیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چالیس راتیں یہ اکثر مدت کی حد ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ہر جمعہ کو یہ صفائی کی جائے۔ یہ حدیث جعفر بن سلیمان نے روایت کی ہے۔ عقیلی نے کہا: اس کی حدیث میں نظر ہے۔ ابوعمر نے اس کے متعلق کہا: جعفر بن سلیمان اپنے حافظہ کی خرابی اور غلطیوں کی کثرت کی وجہ سے حجت نہیں ہے۔ نقل کے اعتبار سے یہ حدیث قوی نہیں ہے لیکن ایک قوم نے اس کا قول کیا ہے اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 17: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، الامام کا معنی، قُدْوَہ ہے۔ اسی سے خیط البناء کو امام کہا جاتا ہے، راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ چلنے کے لئے اس کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے امام بنائیں گے۔ ان خصال میں وہ تیری اقتداء کریں گے، نیک لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل اطاعت کے لئے امام بنایا۔ اسی وجہ سے تمام امتوں کا آپ کے بارے میں اجتماعی دعویٰ ہے کہ آپ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہونے والے تھے۔ (2)

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اللہ کی بارگاہ میں رغبت کی جہت سے دعا ہے۔ یعنی اے میرے رب! میری اولاد سے بھی امام بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولاد کے متعلق استفہام کی جہت سے ہے یعنی اے میرے

1۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جلد 2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رب! میری اولاد سے کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں گنہگار، ظالم ہوں گے وہ امامت کے مستحق نہ ہوں گے(1)۔
حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ ان کی اولاد سے امام بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کی اولاد میں نافرمان بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ، ذریۃٌ یہ الذر سے فُعْلِیۃٌ کا وزن ہے کیونکہ انسانی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذروں کی طرح نکالا تھا جب انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ذرأ الله الخلق یذرؤھم ذرءاً سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: اللہ نے انہیں پیدا کیا، اسی سے الذریۃ ہے جس کا معنی ہے جن وانس کی نسل لیکن عربوں نے اس کا ہمزہ ترک کر دیا، اس کی جمع الذراری ہے(2)۔ حضرت زید بن ثابت نے ذریۃ ذال کے کسرہ کے ساتھ اور ذریۃ ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی ابو الفتح عثمان نے کہا: اس حرف کی اصل چار الفاظ کا احتمال رکھتی ہے: (۱) ذرأ (۲) ذرر (۳) ذرو (۴) ذری۔ ہمزہ والی صورت ہو تو یہ ذرأ الله الخلق سے مشتق ہوگا ذرر ہو تو الذر کے لفظ سے ماخوذ ہوگا۔ یہ اس لئے ہے کہ خبر میں وارد ہے کہ مخلوق ذروں کی مانند تھی۔ واو اور یاء سے ہو تو یہ ذروت الحبّ و ذریتہ سے ہوگا یہ دونوں اکٹھے بولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (الکہف:45)

یہ اس کے لطافت اور خفت کی وجہ سے ہوگا یہ دانے کی حالت ہے۔ جوہری نے کہا: ذرت الریح التراب وغیرہ تذروہ و تذریہ ذرواً و ذریاً یعنی ہوا نے مٹی کو اڑایا۔ اسی سے ہے: ذری الناس الحنطة۔ لوگوں نے دانوں کو اڑایا۔ اذریت الشیء۔ جب تو کسی چیز کو پھینکے جیسے تو کھیتی کے لئے دانے کو پھینکتا ہے۔ و طعنہ فاذراہ عن ظھر دابتہ۔ اس نے اسے نیزہ مارا اور سواری کی پیٹھ سے پھینک دیا۔ خلیل نے کہا: اسے ذریۃ کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مخلوق کو زمین پر اس طرح پھینک دیا جس طرح کسان دانے پھینکتا ہے۔ بعض نے کہا ذریۃ کی اصل ذرورۃ ہے لیکن جب تضعیف زیادہ ہوئی تو ایک را کو یا سے بدل دیا گیا تو ذرویۃ ہوگیا پھر واو کو یا میں ادغام کیا گیا تو ذریۃ ہوگیا، یہاں ذریت سے مراد بیٹے ہی ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق آباء اور ابناء، دونوں پر ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ (یٰسین:41) یہاں ذریت سے مراد آباء ہیں۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ عہد کے مراد میں علماء کا اختلاف ہے، ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے۔ سدی نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد امامت ہے۔ قتادہ نے کہا: ایمان ہے۔ عطا نے کہا: رحمت ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کا دین ہے، بعض نے کہا: اس کا امر ہے(3)۔ عہد کا اطلاق امر پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ (آل عمران:183)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا۔ فرمایا: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ (یس:60)۔ یعنی میں نے پہلے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ جب عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہو تو لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کا مطلب ہوگا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ظالم لوگ ان کی جگہ آئیں جو اللہ کے اوامر کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

قبول کرتے ہیں وہ ان کو قائم نہیں کریں گے۔ اس کا بیان ابھی قریب ہی ان شاء اللہ آئے گا۔ معمر نے قتادہ سے اس ارشاد لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کے تحت روایت کیا ہے کہ قتادہ نے فرمایا: اللہ کا عہد آخرت میں ظالموں کو نہیں ملے گا (1)۔ رہا دنیا میں تو ظالم نے اس کو پایا، اس کے ساتھ اس نے امن پایا، کھایا، زندہ رہا اور دیکھا۔

زجاج نے کہا: یہ عمدہ قول ہے لاینال امانی الظالمین یعنی میں انہیں اپنے عذاب سے امن نہیں دوں گا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہاں ظالم سے مراد مشرک ہے۔ حضرت ابن مسعود، طلحہ بن مصرف نے لاینال عهدی الظالمون پڑھا ہے یعنی ظالمون کے رفع کے ساتھ۔ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ، حفظ اور ابن محیصن نے عهدی میں یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اس آیت سے علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ امام عادل، محسن اور فضل والا ہونا چاہئے ساتھ ساتھ اس کو عدل کے قیام کی قوت بھی ہو۔ اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الاینازعوا الامر اهله۔ یعنی جو حکمرانی کے حقدار ہیں ان سے جھگڑا نہ کرو گے، اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ رہے فاسق، ظالم اور جابر لوگ وہ حکمرانی کے اہل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ اسی وجہ سے حضرت ابن زبیر اور امام حسین رضی اللہ عنہما نے خروج کیا تھا، اہل عراق میں سے نیک لوگوں نے اور عراقی علماء نے حجاج بن یوسف پر خروج کیا تھا۔ اہل مدینہ نے بنی امیہ پر خروج کیا تھا اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حرہ کا واقعہ جوان پر مسلم بن عقبہ نے واقع کیا تھا۔ یہی وجہ تھی اکثر علماء کا یہ خیال ہے کہ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا، خروج سے اولیٰ ہے کیونکہ اس سے لڑنے اور اس پر خروج کرنے میں امن کو خوف سے بدلنا ہے اور خون بہانا ہے اور بیوقوفوں کے ہاتھ کو کھولنا ہے اور مسلمانوں پر حملہ کا دروازہ کھولنا ہے اور زمین میں فساد کا شروع کرنا ہے۔ پہلا مسلک معتزلہ کے ایک گروہ کا ہے یہی خوارج کا مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 22: ابن خویز منداد نے کہا، جو ظالم ہو وہ نہ نبی ہوتا ہے نہ خلیفہ نہ حاکم ہوتا ہے نہ مفتی۔ نہ نماز کا امام ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی روایت قبول کی جاتی ہے جو وہ صاحب شریعت سے روایت کرتا ہے، نہ احکام میں اس کی گواہی قبول ہوتی ہے مگر وہ اپنے فسق کی وجہ سے معزول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ اسے دانشمند لوگ معزول کریں۔ جو اس نے پہلے احکام دیئے وہ صحیح احکام تھے تو وہ جاری و نافذ ہوں گے وہ نہیں ٹوٹیں گے۔ امام مالک نے خوارج اور باغیوں کے متعلق اس پر نص قائم کی ہے کہ ان کے احکام نہیں ٹوٹیں گے جب وہ ان میں اجتہاد کے ساتھ صحیح سمت پر پہنچے ہوں اور انہوں نے اجماع کو نہ توڑا ہو اور نصوص کی مخالفت نہ کی ہو۔ یہ ہم نے صحابہ کے اجماع کی وجہ سے کہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کے ایام میں خروج کیا، نہ کوئی منقول ہے کہ ائمہ نے ان کے احکام کی جستجو کی تھی اور نہ ان میں سے کسی چیز کو توڑا اور نہ دوبارہ زکوٰۃ لی، نہ دوبارہ حدود کو قائم کیا، جو کچھ خوارج نے کہا تھا اسے ہی قائم رکھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ اجتہاد کی وجہ کو انہوں نے صحیح پایا ہو تو ان کے احکام سے تعارض نہ کیا جائے گا۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 23: ابن خویز منداد نے کہا: ظالم حکمرانوں سے تنخواہ لینا، اس کے تین احوال ہیں اگر جو ان کے قبضہ میں ہے وہ شریعت کے مطابق انہوں نے حاصل کیا ہے تو پھر اس کا لینا جائز ہے۔ صحابہ اور تابعین نے حجاج وغیرہ کے ہاتھ سے مال لیا تھا اگر ملا جلا مال ہو حلال بھی ہو اور حرام بھی جیسا کہ آج کے امراء کے ہاتھ میں ہے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ نہ لیا جائے۔ اور محتاج کے لئے اس کا لینا جائز ہے وہ چور کی مانند ہے اس کے ہاتھ میں چوری کا مال بھی ہے اور پاکیزہ حلال مال بھی ہے ایک شخص نے اس مال کا اسے وکیل بنایا ہے۔ چور نے اس مال سے کسی انسان پر صدقہ کر دیا تو اس سے صدقہ لینا جائز ہے۔ اگر چہ جائز تھا کہ چور نے چوری شدہ سے کچھ صدقہ کیا ہو جبکہ کوئی چیز چوری شدہ مال سے معروف نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی چیز بیچے یا خریدے تو عقد صحیح لازم ہوگی اگر چہ تقویٰ یہ ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اموال بذات خود حرام نہیں ہوتے بلکہ اپنی جہات کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اگر صراحۃ ظلماً لیا گیا ہو تو پھر ان سے لینا جائز نہیں اور اگر ان کے ہاتھوں میں غصب شدہ مال ہو مگر اس مال کا مالک اور مطالبہ کرنے والا معروف نہ ہو تو وہ اسی طرح ہے اگر وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پایا جائے اسے بیت المال میں رکھا جائے گا اور بقدر اجتہاد اس کے طالب کا انتظار کیا جائے گا جب معلوم نہ ہوگا تو امام اسے مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کر دے گا۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵

''اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لئے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنا لو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز اور ہم نے تاکید کر دی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: جَعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ البیت سے مراد کعبہ ہے۔ مثابۃ کا معنی ہے مرجع کہا جاتا ہے ثاب یثوب مثابًا و مثابۃ و ثؤوبًا و ثوبانًا۔ مثابۃ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے کعبہ کے بارے میں کہا:

مثابًا لافناء القبائل کلھا　　تخب الیھا الیعملات الذوامل (1)

کعبہ تمام قبائل کا مرجع ہے اس کی طرف اونٹ آہستہ چلنے والے آتے ہیں۔

اعمش نے مثابات جمع پڑھا ہے (2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ثواب سے ہو یعنی لوگوں کو وہاں ثواب دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: کوئی شخص اس سے اپنا مطلوب پورا نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

جعل البیت مثابًا لھم　　لیس منہ الدھر یقضون الوطر

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کعبہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا گیا ہے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتے۔

اصل میں مثوبۃ تھا واو کی حرکت ثا کو دی گئی پھر واو ثاب یثوب کی اتباع میں الف سے بدل گئی اور اسے مفعول ثانی کی وجہ سے نصب دی گئی ہے، مبالغہ کے لئے ۃ کا اضافہ کیا گیا ہے کیونکہ کثرت سے لوٹنے والے ہوتے ہیں بہت کم ہے کہ کوئی بیت اللہ سے جدا ہوتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ابھی اس نے اپنی حاجت پوری نہیں کی۔ یہ نسابہ اور علامۃ کی طرح ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مصدر کی تانیث کی ھاء ہے، مبالغہ کے لئے نہیں ہے۔(1)

اگر کہا جائے کہ ہر شخص جو دوبارہ اس کی طرف نہیں آتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ لوٹنا ایک مرتبہ آنے والے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے خالی نہیں ہوتا لوگوں سے قصد کرنے والے معدوم نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْنًا امام ابوحنیفہ اور فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے استدلال کیا ہے کہ محصن اور چور پر حرم کی حدود میں حد قائم نہیں کی جائے گی جب وہ حرم میں پناہ لے گا۔ اور اپنے قول کی تائید اس آیت سے کی ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: 97) گویا فرمایا: جو بیت اللہ میں داخل ہو جائے اسے امن دو۔ اور صحیح، حرم میں حدود کا قائم کرنا ہے۔ یہ منسوخ ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ بیت اللہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور بیت اللہ سے باہر قتل کیا جائے گا۔ اختلاف اس میں ہے کہ حرم میں قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ حرم پر بیت کے اسم کا اطلاق حقیقۃً نہیں ہوتا اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر حرم میں کوئی قتل کرے گا تو اسے حرم میں قتل کیا جائے گا اگر کسی نے حد کا موجب جرم کیا تو اس سے جرم میں بدلا لیا جائے گا۔ اگر حرم میں کوئی جنگ کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی اس کی جگہ اسے قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جو حرم کی طرف پناہ لے گا اسے حرم میں قتل نہیں کیا جائے گا نہ اس کا پیچھا کیا جائے گا اسے ہمیشہ تنگ کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے یا حرم سے باہر آ جائے۔

اور ہم اسے تلوار سے قتل کرتے ہیں اور وہ اسے بھوک کے ذریعے قتل کرتے ہیں۔ پس اس سے سخت قتل کون سا ہے؟ اَمْنًا یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید ہے یعنی بیت المقدس میں یہ فضیلت نہیں ہے نہ لوگ اس کا حج کرتے ہیں، جو حرم میں پناہ لے تو وہ حملہ سے امن میں ہو جاتا ہے، مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَاتَّخَذُوْا نافع اور ابن عامر نے خبر کے اعتبار سے خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین میں سے جنہوں نے مقام ابراہیم کو مصلی بنایا ان کے متعلق خبر ہے۔ اس کا عطف جَعَلْنَا پر ہے۔ یعنی جعلنا البیت مثابۃ واتخذوہ مصلی۔ ہم نے بیت اللہ کو لوٹنے کی جگہ بنایا اور لوگوں نے اسے مصلی بنایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اذ کی تقدیر پر معطوف ہے، گویا یوں فرمایا: واذ جعلنا البیت مثابۃ واذ اتخذوا۔

پہلی ترکیب پر کلام ایک جملہ ہے اور دوسری ترکیب پر دو جملے ہیں۔ جمہور قراء نے اسے اتخذوا امر کے صیغہ کے اعتبار سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلے کلام سے اسے الگ کیا ہے اور انہوں نے جملہ کا جملہ پر عطف کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اذکروا نعمتی پر اس کا عطف جائز ہے گویا یہ یہود سے فرمایا جارہا ہے۔ یا اس کا عطف اِذْ جَعَلْنَا کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے اذکروا اذ جعلنا یا اس کا عطف مثابۃ کے معنی پر ہے کیونکہ مثابۃ کا معنی ہے ثُوبُوا۔ (1) (لوٹ کر آؤ)

مسئلہ نمبر 2: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی ہے۔ مقام ابراہیم میں، پردے کے بارے میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ اس روایت کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بخاری نے یہ روایت حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے فرمایا: میں نے تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کی ہے یا فرمایا: میرے رب نے تین چیزوں میں میری موافقت کی ہے...... الحدیث ...... ابو داؤد الطیالسی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حماد بن سلمہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں علی بن زید نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر آپ مقام کے پیچھے نماز پڑھیں تو یہ آیت نازل ہوگئی وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دے دیں کیونکہ ان کے پاس نیک اور فاجر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (احزاب: 53) اور یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۝ (المومنون) جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا: تبارك الله احسن الخالقین تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الفاظ نازل ہوئے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۝ (المومنون)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس گیا۔ میں نے کہا: تم رک جاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر دوسری عورتیں عطا فرمادے گا تو یہ آیت نازل ہوئی: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ (التحریم: 5) (2)

میں کہتا ہوں: اس روایت میں بدر کے قیدیوں کا ذکر نہیں ورنہ پانچ چیزوں میں حضرت عمر کی موافقت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ مَّقَامِ، المقام لغت میں قدموں کی جگہ کو کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: مقام، یہ قام یقوم سے ہے۔ مصدر ہوگا اور جگہ کا اسم ہوگا اور مُقام، اقام سے ہے۔ زہیر کا قول ہے:

و فیهم مقامات حسن وجوههم واندية ينتابها القول والفعل

ان میں اہل مقام ہیں جن کے چہرے خوبصورت ہیں اور مجالس ہیں جن میں قول و فعل پے در پے ہوتا ہے۔

اس شعر میں مقامات سے مراد اہل مقامات ہیں۔

المقام کی تعیین میں بہت سے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے اصح یہ ہے کہ وہ پتھر آج لوگ جس کو پہچانتے ہیں جن کے پاس لوگ طواف قدوم کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں یہ حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ وغیرہ کا قول

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی، حدیث 4123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر کی طویل حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیت اللہ کو دیکھا تو رکن کو استلام کیا پھر تین چکروں میں رمل کیا، اور چار چکر آرام سے چلے پھر مقام ابراہیم کی طرف گئے اور یہ آیت پڑھی۔ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ پھر رکعتیں پڑھیں ان میں سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی۔ یہ دلیل ہے کہ طواف کی دو رکعتیں اور دوسری نمازیں اہل مکہ کے لئے افضل ہیں اور من وجہ یہ دلیل ہے کہ مسافروں کے لئے طواف افضل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بخاری میں ہے: مقام سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چڑھتے تھے جب ان پتھروں کو اٹھانے سے کمزور پڑ گئے تھے جو کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پیش کرتے تھے، آپ کے قدم اس پتھر میں دھنس گئے تھے۔ حضرت انس نے کہا: میں نے المقام میں حضرت ابراہیم علیہ کی انگلیوں، ایڑھی اور قدموں کے نیچے اٹھی ہوئی جگہ کا نشان دیکھا، لیکن لوگوں کے ہاتھوں کے چھونے نے اس نشان کو ختم کر دیا ہے۔ قشیری نے یہ بیان کیا ہے (2)۔ سدی نے کہا: المقام سے مراد وہ پتھر ہے جو حضرت اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم کے قدموں کے نیچے رکھا تھا۔ جب اس نے حضرت ابراہیم کا سر دھویا تھا (3)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور عطا سے مروی ہے، مقام سے مراد مکمل حج ہے۔ عطا سے مروی ہے، عرفہ، مزدلفہ اور جمار ہے۔ یہ شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: پورا حرم مقام ابراہیم ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ ابونعیم نے محمد بن سوقه عن محمد بن المنکدر عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو رکن اور مقام یا دروازے اور مقام کے درمیان دیکھا وہ دعا مانگ رہا تھا اے اللہ! فلاں کو بخش دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس شخص نے کہا: مجھے ایک شخص نے اس مقام میں دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوٹ جا تیرے ساتھی کی بخشش ہوگئی۔ ابونعیم نے اس سند سے بھی یہ روایت نقل کی ہے: حدثنا احمد بن محمد احمد بن ابراهیم القاضی، قال حدثنا محمد بن عاصم بن یحیی الکاتب، قال حدثنا عبد الرحمن بن القاسم القطان الکوفی، قال حدثنا الحارث بن عمران الجعفری عن محمد بن سوقه۔

ابونعیم نے کہا: اسی طرح یہ عبدالرحمن نے حارث سے انہوں نے محمد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حارث کی حدیث محمد عن عکرمه عن ابن عباس کی سند سے معروف ہے۔ مُصَلًّى کا معنی ایسی جگہ جہاں دعا کی جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے بعض نے فرمایا: نماز کی جگہ جس کے قریب نماز پڑھی جائے۔ یہ قتادہ کا قول ہے (4)۔ بعض نے فرمایا: قبلہ جس کے پاس امام کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَ عَهِدْنَاۤ بعض نے فرمایا: اس کا معنی امرنا (ہم نے حکم دیا) ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی اوحینا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

(ہم نے وحی کی) اَنْ طَهِّرَا، اَنْ حرف جر کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

سیبویہ نے کہا: اَنْ بمعنی ای مفسرہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہے۔ کوفیوں نے کہا: عَهِدْنَآ بمعنی قلنا ہے۔ طَهِّرَا بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: بتوں سے پاک کرو۔ یہ مجاہد اور زہری سے مروی ہے۔ حضرات عبید بن عمیر اور سعید بن جبیر نے کہا: آفات اور ریب سے پاک کرو۔ بعض نے فرمایا: کفار سے پاک کرو۔ سدی نے کہا: طہارت اور طہارت کی نیت سے اس کی بنیاد رکھو اور تعمیر کرو۔ اس قول کی مثل اُسس علی التقویٰ ہے۔ یمان نے کہا: اس کا معنی ہے: اسے خوشبو لگاؤ اور دھونی دو (1)۔ بَيْتِيَ، بیت کی اضافت اپنی طرف کی، یہ شرف و تکریم بخشنے کے لئے ہے، یہ مخلوق کی خالق کی طرف اور مملوک کی مالک کی طرف اضافت ہے (2)۔ حضرات حسن، ابن ابی اسحاق، اہل مدینہ، ہشام اور حفص نے بیتیَ یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلطَّآئِفِيْنَ اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ عطا کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے مسافروں کے لئے جو مکہ میں وارد ہوتے ہیں (3)۔ اس میں بعد ہے وَالْعٰكِفِيْنَ جو اس شہر کے ہیں اور جو مسافر ہیں۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ اسی طرح کا قول لِلطَّآئِفِيْنَ کے بارے میں ہے لغت میں عکوف لزوم اور کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عکف النبیط یلعبون الفنزجا (4)

نبطی لوگ رقص کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

مجاہد نے کہا: العاکفون سے مراد مجاور ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نمازی ہیں۔ بعض نے فرمایا: جو بغیر طواف کے بیٹھنے والے ہیں۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے والے۔ رکوع و سجود کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں احوال نمازی کو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والے ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود کا لغوی معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام گھر شامل ہیں۔ ان کا حکم بھی تطہیر و نظافت میں اس جیسا ہوگا، کعبہ کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ اس وقت وہاں اور کوئی گھر نہ تھا یا اس لئے کہ اس کی حرمت زیادہ ہے۔ پہلا معنی اظہر ہے۔ قرآن میں ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (النور: 36) اس آیت کے تحت دوسری مساجد کا حکم آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی۔ حضرت عمر نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ کیا تو جانتا ہے تو کہاں ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی، ڈرانے والوں کے بھائی، اے رسولوں کے بھائی! اپنی قوم کو ڈراؤ کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر سلیم دلوں

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کے ساتھ، سچی زبانوں کے ساتھ، پاکیزہ ہاتھوں کے ساتھ، صاف شرمگاہوں کے ساتھ اور میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں جب تک کہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا ہو۔ کیونکہ میں اس پر لعنت کرتا ہوں جب تک وہ میرے سامنے کھڑا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ظلم سے چھینی ہوئی چیز مظلوم کو واپس کر دے۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور وہ میرے اولیاء و اصفیاء میں سے ہو جاتا ہے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ میرا پڑوسی بن جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس آیت میں امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور سلف کی جماعت نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز اور نفل نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر بیت اللہ کے درمیان کسی دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ اگر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جبکہ دروازہ کھلا ہوا تھا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اسی طرح جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی تو اس کی نماز باطل ہے کیونکہ کعبہ کا کوئی حصہ اس کے سامنے نہ تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کے اندر فرض اور سنن ادا نہیں کی جائیں گی۔ اس میں نفل پڑھے جائیں گے مگر اس نے فرض کعبہ کے اندر پڑھے تو وقت میں دوبارہ پڑھے گا۔ اصبغ نے کہا: وہ ہمیشہ لوٹائے گا۔

میں کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(1)، فرمایا: مجھے حضرت اسامہ بن زید نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کی تمام اطراف میں دعا مانگی اور اس میں نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ کعبہ سے نکل آئے۔ جب باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا: یہ قبلہ ہے اور یہ نص ہے۔

اگر کہا جائے کہ بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال، حضرت عثمان بن طلحہ حجبی بیت اللہ میں داخل ہوئے اور اپنے اوپر دروازہ بند کر لیا۔ جب دروازہ کھولا تو میں پہلا شخص تھا جو اندر داخل ہوا۔ میں حضرت بلال سے ملا۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی؟ حضرت بلال نے کہا: ہاں دو یمنی ستونوں کے درمیان پڑھی تھی۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں دو ستونوں کو اپنی بائیں جانب اور ایک ستون کو دائیں جانب اور تین ستونوں کو پیچھے رکھا، اس وقت بیت اللہ چھ ستونوں پر تھا۔

ہم کہتے ہیں: ہو سکتا ہے صلی بمعنی دعا ہو۔ جس طرح حضرت اسامہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ صلی سے مراد نماز ہی ہو، جب اس میں احتمال آ گیا تو اس سے احتجاج ساقط ہو گیا۔

اگر کہا جائے کہ ابن منذر وغیرہ نے حضرت اسامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ میں تصاویر دیکھیں تو میں ڈول میں آپ کے پاس پانی لے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ پانی ان تصاویر پر مارا۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن ابی ذئب نے عبدالرحمٰن بن مہران سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: ہمیں عمیر مولیٰ ابن عباس نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کعبہ میں داخل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی، حدیث 383، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصاویر دیکھیں، فرمایا: آپ ﷺ نے پانی کا ڈول منگوایا۔ میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا تو آپ ان تصاویر کو مٹانے لگے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس قوم کو قتل کرے جو ان کی تصاویر بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے۔

اس میں احتمال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت نماز پڑھی ہو جب حضرت اسامہ پانی لینے گئے ہوں اور حضرت بلال نے وہ عمل دیکھا ہو جو حضرت اسامہ نے نہ دیکھا۔ پس جو ثابت کرنے والا ہوتا ہے وہ نفی کرنے والے سے اولیٰ ہوتا ہے۔ حضرت اسامہ نے خود کہا: لوگوں نے حضرت بلال کے قول کو لیا اور میرے قول کو چھوڑ دیا۔ مجاہد نے حضرت عبداللہ بن صفوان سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطاب سے پوچھا رسول اللہ ﷺ جب کعبہ میں داخل ہوئے تو کیسے عمل کیا؟ حضرت عمر نے کہا: دو رکعت نماز پڑھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ نوافل پر محمول ہے، ہم کعبہ میں نوافل کی صحت میں علماء کا اختلاف نہیں جانتے۔ رہے فرض تو اس کے ہم قائل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہت کو اپنے ارشاد فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ میں متعین فرمایا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد، جب آپ باہر نکلے، ھذہ القبلۃ۔ تو آپ نے اس کی تعیین فرمائی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تعیین فرمائی تھی۔ اگر کعبہ کے اندر فرض صحیح ہوتے تو آپ ھذہ القبلۃ نہ فرماتے۔ اس طرح احادیث کو جمع کرنا صحیح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بعض احادیث کو ساقط کرنے سے اولیٰ ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ الحمد للہ

مسئلہ نمبر 5: اسی طرح کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی نے تو وہی فرمایا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے وہ وقت میں دوبارہ پڑھے۔ اور بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ ہر حال میں اعادہ کرے (خواہ وقت موجود ہو یا وقت گزر چکا ہو) امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی اس پر کچھ واجب نہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے یا اس کا طواف کرنا افضل ہے۔ امام مالک نے فرمایا: باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور اہل مکہ کے لئے نماز افضل ہے، یہ حضرات ابن عباس، عطا اور مجاہد سے ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ نماز افضل ہے، حدیث میں ہے۔ اگر خشوع کرنے والے مرد، رکوع کرنے والے بوڑھے، دودھ پینے والے بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو ہم تم پر عذاب نازل کرتے۔

ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے اپنی کتاب (السابق واللاحق) میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں خشوع کرنے والے مرد، چرنے والے جانور، دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو مجرموں پر عذاب نازل کر دیا جاتا۔ اس میں بوڑھے رکوع کرنے والوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے: نماز بہتر چیز ہے تو زیادہ پڑھ یا کم پڑھ (تیری مرضی) اس کو الاجری نے ذکر کیا ہے۔ نماز اور سجدہ کی فضیلت میں اخبار بہت زیادہ ہیں جو جمہور کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ

مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب! بنا دے اس شہر کو امن والا اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر۔ اللہ نے فرمایا: (ان میں سے) جس نے کفر بھی کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلَدًا اٰمِنًا اس سے مراد مکہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد اور دوسرے لوگوں کے لئے امن اور خوشحال زندگی کی دعا مانگی (1)۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے جبریل سے فرمایا: شام سے طائف کو اکھیڑ۔ پس جبریل نے طائف کے ساتھ بیت اللہ کے اردگرد سات چکر لگائے ...... طائف کو طائف اسی لئے کہا جاتا ہے (2)...... پھر طائف کو تہامہ میں اتارا، مکہ اور اس کے قریب کا علاقہ اس وقت چٹیل تھا۔ نہ پانی تھا نہ کوئی نبات۔ پس اللہ تعالیٰ نے مکہ کے اردگرد کے علاقہ جیسے طائف وغیرہ میں برکت ڈال دی اور اس میں قسم قسم کے پھل اگائے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اختلاف ہے کہ مکہ حضرت ابراہیم کے سوال سے حرم بنا یا پہلے سے ہی حرم تھا۔ اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ ہمیشہ جابر مسلطین سے، خسوف اور زلزلوں سے اور دوسرے تمام حوادث سے جو شہروں پر نازل ہوتے ہیں سے حرم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سرکش نفوس میں اس کی تعظیم اور ہیبت ڈال دی جس کی وجہ سے مکہ کے رہنے والے دوسرے لوگوں سے امن کی وجہ سے ممتاز ہو گئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر ایک بہت بڑی علامت رکھ دی جس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس میں کتا اور شکار جمع ہوتے ہیں اور کتا شکار پر حملہ نہیں کرتا اور نہ شکار اس سے ڈرتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ دونوں حرم سے نکل جاتے ہیں تو کتا اس شکار پر حملہ کرتا ہے اور وہ بھاگنے لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ مکہ کو قحط، بنجر ہونے اور حملوں سے امن والا بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ اس کا خون بہانا بھی منع ہے جس کا قتل کرنا لازم ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مقصود سے بہت بعید ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ ان کی شرع میں اس شخص کا قتل کرنا حرام ہو جو حرم میں پناہ لے۔ یہ انتہائی بعید قول ہے۔

دوسرا قول۔ مکہ حضرت ابراہیم کی دعا سے پہلے دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا اور آپ کی دعا سے حرم اامنا بنا جیسا کہ مدینہ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریم سے امن والا بنا اس سے پہلے حلال تھا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

پہلے مقالہ والوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ شہر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں جنگ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھی اور نہ میرے لئے حلال ہے مگر دن کی ایک گھڑی۔ یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، اس کا نہ کانٹا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار ڈرایا جائے گا نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے گی مگر جو اس کا اعلان کرے اور نہ اس کی خشک گھاس کاٹی جائے گی۔ حضرت عباس نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اذخر گھاس کی استثنا فرمائیں کیونکہ وہ ہمارے لوہاروں کے لئے اور ہمارے گھروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اذخر گھاس کی استثناء فرما دی۔ (1)

اسی طرح کی حدیث ابوشریح کی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور اہل مکہ کے لئے دعا کی، میں نے مدینہ کو حرم بنایا جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں نے اس کے صاع اور اس کے مد کے لئے اس کے دو مثل کی دعا کی جو حضرت ابراہیم نے اہل مکہ کے لئے دعا کی۔ ابن عطیہ نے کہا: ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی حدیث اس کے متعلق خبر دے رہی ہے جو مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں تھا اور اس کے فیصلہ میں تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی مدت ہے اور ایمان کے ساتھ افق کو آباد کرنے کے اوقات کی حرمت ہے۔

اور دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم کا اس کی حرمت کی تجدید اور اس کے مٹنے کے بعد، اس کے اظہار کی خبر ہے۔ پہلا قول نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن مومنوں پر مکہ کی حرمت کی تعظیم کی خبر دیتے ہوئے فرمایا اور اس کی تحریم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور مدینہ طیبہ کی تحریم کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور مثال ذکر فرمایا۔ لامحالہ مدینہ کی تحریم بھی اللہ کی طرف سے ہوگی اور اس کی قضا کے نفاذ سے اور اس کے سابق علم سے ہوگی۔ طبری نے کہا (3): مکہ حرام تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مکلف نہ کیا حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حرم بنا دیا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ، رزق کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ثمرات، ثمرۃ کی جمع ہے یہ بھی پہلے گزر چکا ہے مَنْ اٰمَنَ یہ اھل سے بدل ہے اور کل سے بدل بعض ہے۔ الایمان کا معنی تصدیق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ، مَنْ محل نصب میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: و ارزق من کفر۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور یہ شرط ہے اور خبر فامتعهٗ ہو اور یہ جواب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ حضرت ابی بن کعب اور اسحٰق وغیرہما نے کہا (4): یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور انہوں نے فامتعه ہمزہ کے ضمہ، میم کے فتحہ اور تا کی

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ و تحریم صیدھا و خلاھا و شجرھا، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب لا ینفر صید الحرم، حدیث 1702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز | 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا | 4۔ ایضاً

تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثم اضطرہ ہمزہ کے قطع اور را کے ضمہ کے ساتھ۔ ابن عامر کے سوا قراء سبعہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابن عامر نے میم کے سکون اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو اسحاق الزجاج نے حکایت کیا ہے کہ ابی کی قراءت میں فنمتعه قليلا ثم نضطره یعنی نون کے ساتھ ہے (1)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے انہوں نے فامتعه کو ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ثم اضطرہ کو الف کے وصل اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کے حق میں دعا فرمائی اور کفار کے خلاف دعا کی (2)۔ اس صورت میں قال کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور قال کو دوبارہ ذکر کیا کلام کی طوالت کی وجہ سے یا اس لئے کہ آپ مومنین کے لئے دعا مانگنے نکلے اور کفار کے خلاف دعا کرنے میں داخل ہوئے۔ جمہور کی قراءت پر قال کا فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا۔ ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون اور الف کے وصل کے ساتھ قراءت شاذ ہے، نسق کلام اور تفسیر دونوں اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ رہا نسق کلام تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے میرے رب! اس کو امن والا شہر بنا۔ پھر یہ عرض کی: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ان دونوں کے درمیان قال کے ساتھ فاصلہ نہیں کیا پھر اس کے بعد فرمایا: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد قال ابراهیم نہیں فرمایا۔

رہی تفسیر تو حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت محمد بن کعب سے صحیح مروی ہے۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابراہیم نے جو لوگ ایمان لائے تھے صرف ان کے لئے دعا فرمائی کفار کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ کافروں کو بھی اسی طرح رزق دے گا جس طرح ایمان والوں کو رزق دے گا اور وہ انہیں تھوڑا عرصہ لطف اندوز کرے گا پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف مجبور کرے گا۔ ابو جعفر نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (اسراء: 20) (ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وامم سنمتعهم (کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں۔)

ابو اسحاق نے کہا: حضرت ابراہیم کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے اس لئے آپ نے دعا میں مومنین کو خاص فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ (نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، القواعد سے مراد اس کی بنیادیں ہیں۔ یہ ابو

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

عبیدہ اور فراء کا قول ہے۔ کسائی نے کہا: اس سے مراد دیواریں ہیں، معروف بنیاد ہے۔

حدیث میں ہے: بیت اللہ کو جب گرایا گیا تو اس سے بڑے بڑے پتھر نکلے۔ ابن زبیر نے کہا: یہ وہ پتھر ہیں جن سے حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ بعض نے فرمایا: وہ بنیادیں مٹ گئی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان پر مطلع فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: بیت اللہ کو ان ارکان پر رکھا گیا تھا جو آپ نے دیکھے تھے اور دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے۔ پھر زمین کو اس کے نیچے سے پھیلایا گیا۔

القواعد کا واحد قاعدۃٌ ہے اور القواعد من النساء کا واحد قاعدٌ ہے(1)۔ علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے کعبہ کی بنیاد رکھی۔ بعض نے فرمایا: ملائکہ نے سب سے پہلے اس کی بنیاد رکھی۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: میرے باپ سے بیت اللہ کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں پوچھا گیا جب کہ میں بھی موجود تھا تو میرے والد صاحب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ:30) (میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں) تو فرشتوں نے کہا: کیا تو اس میں اسے خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں پر ناراض ہوا تو انہوں نے اس کے عرش کے ذریعے پناہ طلب کی۔ انہوں نے عرش کے اردگرد سات چکر لگائے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ۔ بنی آدم میں سے جس پر میں ناراض ہوں گا وہ اس کی پناہ لے گا اور اس کے اردگرد طواف کرے گا جس طرح تم نے میرے عرش کے اردگرد طواف کیا۔ پس میں اس سے راضی ہو جاؤں گا جس طرح میں تم سے راضی ہوا، پس فرشتوں نے بیت اللہ بنایا۔

عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے عطا اور ابن مسیب وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب تو نیچے زمین پر اترے تو میرے لئے ایک گھر بنا پھر اس کو گھیر لے جس طرح تو نے ملائکہ کو دیکھا کہ انہوں نے میرے عرش کو گھیرا تھا جو آسمان میں تھا۔

عطا نے کہا: لوگوں کا خیال ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کو پانچ پہاڑوں سے بنایا: حرا، طور سینا، لبنان، جودی اور طور سینا۔ اس کی ربض حرا سے تھی (2)۔ خلیل نے کہا: الربض سے یہاں مراد پتھر سے بنی ہوئی بیت اللہ کی گول بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے مدینہ کے اردگرد کی جگہ کو ربض کہا جاتا ہے۔ ماوردی نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین کی طرف اترے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اے آدم! تو جا اور میرے لئے ایک گھر بنا اور اس کا طواف کر اور اس کے پاس مجھے یاد کر جس طرح تو نے ملائکہ کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام چلتے ہوئے آئے اور زمین ان کے لئے لپیٹی گئی تھی اور جنگل ان کے لئے سکیڑے گئے تھے آپ جہاں قدم رکھتے تھے وہ جگہ آباد ہو جاتی تھی حتیٰ کہ آپ بیت حرام کی جگہ پر پہنچے۔ جبریل نے اپنے پر زمین پر مارے اور مٹی

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا		2۔ ایضاً

ساتویں زمین پر قائم بنیاد کو ظاہر کر دیا۔ پس ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف پتھر پھینکے۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ تیس آدمی انہیں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں سے کعبہ بنایا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

بعض اخبار میں مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے جنت کے خیموں سے ایک خیمہ اتارا گیا وہ کعبہ کی جگہ پر لگایا گیا تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور اس کا طواف کریں وہ خیمہ باقی رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی روح قبض فرمائی تو پھر اٹھالیا گیا۔ یہ حضرت وہب بن منبہ کے طریق سے ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک بیت (گھر) اتارا گیا آپ اس کا طواف کرتے تھے اور آپ کی اولاد میں سے مومنین، غرق کے زمانہ تک طواف کرتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھالیا تو وہ آسمان میں ہو گیا اسی گھر کو بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ قتادہ سے روایت ہے جسے حلیمی نے اپنی کتاب ''منہاج القرآن'' میں ذکر کیا ہے (1)۔ انہوں نے فرمایا: جو معنی قتادہ نے بیان کیا وہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک گھر اتارا گیا یعنی وہ طولاً، عرضاً اور بلندی کے اعتبار سے بیت المعمور کی مقدار کا تھا پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا: اتنا بناؤ اور کوشش کرو کہ یہ اس کے بالمقابل ہو، وہ کعبہ کی جگہ کے سامنے تھا۔ پس آپ نے اس میں کعبہ بنایا۔ رہا وہ خیمہ یہ جائز ہے کہ وہ اتارا گیا ہو اور کعبہ کی جگہ لگایا گیا ہو۔ جب کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا تو آپ نے کعبہ تعمیر کیا اور کعبہ کے ارد گرد حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے لئے طمانیت تھی جب تک آپ زندہ رہے وہ خیمہ قائم رہا پھر اسے اٹھالیا گیا۔ پس یہ اخبار اس طرح متفق ہو جاتی ہیں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بنا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ ابن جریج نے کہا: لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس میں ایک سر تھا۔ اس سر نے کہا: اے ابراہیم! تیرا رب تجھے حکم دیتا ہے کہ تو اس بادل کی مقدار لے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے دیکھنا شروع کیا اور اس کی مقدار خط کھینچ دیا۔ پھر اس سر نے کہا: تو نے کر دیا۔ پھر آپ نے اس جگہ کی کھدائی کی اور زمین میں قائم اساس کو ظاہر کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو آپ شام سے نکلے اور آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا اسماعیل اور اس کی ماں ہاجرہ بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سکینت (ہوا) کو بھیجا جس کی ایک زبان تھی جس کے ساتھ وہ کلام کرتی تھی۔ صبح کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے ساتھ چلتے جب وہ چلتی اور اس کے ساتھ آپ واپس آ جاتے جب وہ واپس آتی، حتیٰ کہ وہ سکینت حضرت آدم علیہ السلام کو لے کر مکہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: میری جگہ پر بنیاد رکھو۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دیواریں بلند کیں حتیٰ کہ حجر اسود کی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا: اے میرے بیٹے! میرے لئے ایک پتھر تلاش کر جسے میں لوگوں کے لئے علامت بناؤں۔ حضرت اسماعیل ایک پتھر لے آئے جسے آپ نے پسند نہ فرمایا اور فرمایا اور کوئی پتھر تلاش کرو۔ آپ تلاش کرتے رہے پھر آپ خود آئے اور حجر اسود لے آئے اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ حضرت اسماعیل نے کہا: اے میرے ابا جان! یہ پتھر تمہارے پاس کون لایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا: وہ جو مجھے تیرے سپرد نہیں کرتا (2)۔ حضرت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ابن عباس نے کہا: جبل ابوقبیس نے پکارا اے ابراہیم، اے خلیل الرحمن! تیرے لئے میرے پاس ایک ودیعت ہے وہ تم لے لو۔ تو وہ جنت کے یاقوت میں سے ایک سفید پتھر تھا وہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں تو چکور شکل کا ایک بادل آیا جس میں ایک سر تھا اس بادل نے آواز دی میری مقدار پر بلند (تعمیر) کرو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت اللہ تعمیر کرنے پر جزا عطا فرمائی۔

حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے نعیم بن حماد نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں عبدالوہاب بن ہمام نے بتایا جو عبدالرزاق کے بھائی تھے، انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: پہلے گھوڑے بھی دوسرے وحشی جانوروں کی طرح وحشی تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کو بنیادیں بلند کرنے کی اجازت دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم دونوں کو ایک خزانہ دینے والا ہوں جو میں نے تم دونوں کے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے پھر حضرت اسماعیل کو وحی فرمائی کہ تم اجیاد کی طرف جاؤ اور دعا مانگو تمہارے پاس خزانہ آجائے گا آپ اجیاد کی طرف گئے ...... وہاں گھوڑے رہتے تھے ...... آپ نہیں جانتے تھے کہ دعا کیا ہے اور خزانہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام فرمایا۔ پس سطح زمین پر کوئی گھوڑا باقی نہ رہا جو عرب کی زمین پر رہتا تھا مگر وہ آپ کے پاس آگیا۔ تمام گھوڑوں کی اپنی پیشانیوں پر آپ کو قدرت بخشی اور ان کو آپ کا مطیع کر دیا۔ پس تم ان پر سوار ہو اور انہیں چارہ ڈالو کیونکہ یہ برکت ہیں یہ تمہارے باپ اسماعیل کی میراث ہیں۔ الفرس کو عربی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کو دعا کا حکم دیا گیا تھا اور آپ نے دعا فرمائی۔

عبدالمنعم بن ادریس نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سب سے پہلے مٹی اور پتھر سے کعبہ بنایا وہ حضرت شیث علیہ السلام تھے، رہی قریش کی تعمیر کعبہ تو وہ مشہور ہے اور اس میں سانپ کی خبر مذکور ہے۔ سانپ انہیں کعبہ گرانے سے روکتا تھا، حتیٰ کہ تمام قریش مقام ابراہیم کے پاس جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہمیں نہ ڈرا ہم تیرے گھر کی تشریف و تزئین کا ارادہ رکھتے ہیں اگر تو اس سے راضی ہے تو فبہا ورنہ جو تو چاہے کر۔ انہوں نے آسمان سے پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ دیکھا تو گدھ سے بڑا ایک پرندہ تھا جس کی پیٹھ سیاہ تھی پیٹ اور پاؤں سفید تھے اس نے اپنے پنجے سانپ کی گدی میں گاڑھے پھر اس کو لے کر اڑا وہ سانپ اتنی بڑی دم کھینچتا گیا حتیٰ کہ وہ پرندہ اسے اجیاد کی طرف لے گیا۔ پھر قریش نے کعبہ کو گرایا اور پھر اسے وادی کے پتھروں سے بنانے لگے جن کو قریش اپنی گردنوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ قریش نے اس کو آسمان کی طرف بیس ہاتھ بلند کیا، اسی اثنا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجیاد سے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے آپ کے اوپر ایک چادر تھی۔ چادر آپ پر تنگ ہوگئی۔ آپ نے چادر کو کندھے پر اٹھانا شروع کیا تو چادر کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے شرمگاہ ظاہر ہوگئی، ندا آئی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی برہنہ نہ دیکھے گئے۔ کعبہ کی تعمیر اور نزول قرآن کے درمیان پانچ سال کا فاصلہ تھا۔ آپ کی ہجرت اور تعمیر کعبہ کے

درمیان پندرہ سال کا فاصلہ تھا۔

یہ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عثمان سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے۔ معمر عن الزھری سے مروی ہے حتیٰ کہ جب قریش نے کعبہ بنالیا اور حجر اسود رکھنے کی جگہ پہنچے تو قریش اس کو رکھنے میں جھگڑنے لگے کہ کون سا قبیلہ اسے اٹھا کر رکھے گا؟ حتیٰ کہ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: آؤ ہم اس کا فیصلہ تسلیم کرلیں جو اس گلی سے سب سے پہلے ہمارے پاس آئے گا، اس پر صلح ہوگی۔ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے آپ ابھی جوان تھے آپ کے اوپر ایک دھاری دار چادر تھی۔ انہوں نے آپ کو ثالث مقرر کردیا۔ آپ نے پتھر کو ایک کپڑے میں رکھنے کا حکم دیا پھر ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا اور اسے کپڑے کی ایک طرف عطا فرمائی پھر آپ اوپر چڑھے۔ تمام سرداروں نے وہ پتھر آپ کو اٹھا کر دیا اور آپ ﷺ نے اسے اپنی جگہ پر لگا دیا۔

ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قریش نے حجر اسود میں، سریانی زبان میں لکھی ایک تحریر پائی وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیا ہے حتیٰ کہ ایک یہودی نے انہیں پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہ لکھا تھا، میں اللہ ہوں، مکہ کا مالک۔ میں نے اس کو اس دن پیدا کیا تھا جس دن میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا اور چاند اور سورج کو صورت بخشی تھی اور میں نے اسے سات املاک سے گھیرا ہوا ہے، یہ زائل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے ابوقبیس اور احمر پہاڑ زائل ہو جائیں گے۔ اس کے رہنے والوں کے لئے پانی اور دودھ میں برکت رکھی گئی ہے۔ ابوجعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرمایا: کعبہ کا دروازہ عمالقہ، جرہم اور حضرت ابراہیم کے دور میں زمین پر تھا حتیٰ کہ قریش نے اسے تعمیر کیا (تو دروازہ اونچا کردیا)۔

مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یہ کعبہ کے ساتھ والی دیوار کعبہ سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کی: انہوں نے اس کو کعبہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: تیری قوم کے پاس خرچ کم ہو گیا تھا۔ میں نے عرض کی: اس کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری قوم نے یہ اس لئے کیا تھا تاکہ جنہیں چاہیں داخل کریں اور جنہیں چاہیں منع کریں اگر تمہاری قوم کا زمانہ جاہلیت قریب نہ ہوتا مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کریں گے تو میں اس دیوار کو کعبہ میں داخل کر دیتا، اور اس کے دروازے کو زمین سے ملا دیتا (1)۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری خالہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تیری قوم کا زمانہ شرک قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا۔ ایک مشرق سے اور ایک مغرب سے اور اس میں چھ ہاتھ حطیم سے زیادہ کرتا کیونکہ قریش نے اسے چھوٹا بنایا تھا جہاں انہوں نے کعبہ بنایا تھا۔

عروہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہاری قوم کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ دیتا اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر بناتا کیونکہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ وبناھا، جلد 1، صفحہ 30-429 (قدیمی کتب خانہ)

چھوٹا کر دیا اور میں اس کا خلف بناتا (1)۔ بخاری میں ہشام بن عروہ نے کہا: یعنی (باباً) دروازہ بناتا۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ میں اس کے دو دروازے بناتا یہ قریش کی بنا ہے پھر جب اہل شام نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر حملہ کیا اور ان کے جلاؤ نے کعبہ کو کمزور کر دیا۔ تو حضرت ابن زبیر نے اسے گرایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق بنایا۔ اس میں پانچ ہاتھ حطیم سے زیادہ کیا حتیٰ کہ وہ بنیاد ظاہر کر دی اور لوگوں نے اسے دیکھا اور اس پر کعبہ کی تعمیر کی۔ کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا جب اس میں زیادتی کی تو لمبائی کم کر دی پھر اس کی لمبائی میں دس ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک میں سے لوگ داخل ہوتے دوسرے سے نکل جاتے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ حدیث کے الفاظ مختلف ہیں۔

سفیان نے داؤد بن شابور عن مجاہد کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: جب حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو گرانے اور دوبارہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے لوگوں کو کہا: کعبہ کو گرادو۔ لوگوں نے اسے گرانے سے انکار کیا اور وہ ڈر گئے کہ کہیں عذاب نہ آجائے۔ مجاہد نے کہا: ہم منیٰ کی طرف نکل گئے اور ہم وہاں تین دن ٹھہرے رہے اور عذاب کا انتظار کرتے رہے۔ فرمایا: حضرت عبداللہ بن زبیر خود کعبہ کی دیوار پر چڑھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا تو لوگوں نے حوصلہ باندھا۔ فرمایا: لوگوں نے کعبہ کو گرایا۔ جب اسے حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا تو اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اس میں دیوار والی طرف سے چھ ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے طول میں نو ہاتھ کا اضافہ کیا۔ مسلم نے اپنی حدیث میں کہا: جب حضرت عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کو اس کے متعلق بتانے کے لئے خط لکھا اور اسے بتایا کہ ابن زبیر نے کعبہ کو اس بنیاد پر تعمیر کیا جس کی طرف اہل مکہ میں سے عادل لوگوں نے دیکھا۔ عبدالملک نے اس کی طرف لکھا کہ ہم ابن زبیر کی کسی چیز کو باقی رکھنے والے نہیں جو اس نے اس کی لمبائی میں زیادتی کی ہے اس کو برقرار رکھو اور جو اس نے حطیم سے زیادتی کی، اس کو پہلی بنا پر لوٹا دو اور جو اس نے دروازہ کھولا تھا اسے بند کر دو۔ پس حجاج نے اسے توڑا اور پہلی بنا پر لوٹا دیا۔

ایک روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ ابا خبیب (ابن زبیر) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے جو وہ کہتا ہے کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے۔ حارث بن عبداللہ نے کہا: کیوں نہیں میں نے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا، اس نے کہا: تو نے اسے کیا کہتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم نے بیت اللہ کی عمارت کم کر دی ہے۔ اگر ان کے شرک کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں اسے لوٹا دیتا جو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اگر میرے بعد تیری قوم کو اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا خیال آئے تو ادھر آؤ میں تجھے دکھاؤں جو انہوں نے کعبہ میں سے چھوڑ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو سات ہاتھ کے قریب دکھایا۔

ایک اور روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: اگر میں اس کے گرانے سے پہلے یہ حدیث سن لیتا تو میں اسے حضرت ابن زبیر کی بنیاد پر چھوڑ دیتا۔ یہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں آثار مروی ہیں۔ روایت ہے کہ رشید نے حضرت مالک بن انس کے

1۔ صحیح بخاری، باب فضل مکۃ وبنیانہا، حدیث 1482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے ذکر کیا کہ وہ حجاج کی تعمیر کعبہ کو گرانا چاہتا ہے اور اسے حضرت ابن زبیر کی تعمیر پر لوٹانا چاہتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر نے اس کی پیروی کی تھی۔ امام مالک نے رشید کو کہا: اے امیر المومنین! میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم اس گھر کو بادشاہوں کے لئے کھلونا نہ بناؤ، ہر آنے والا بیت اللہ کو توڑ دے گا اور نئی تعمیر کرے گا اور اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں سے چلی جائے گی۔

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں معمر نے ہمام بن منبہ سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسعد حمیری کو گالی دینے سے منع فرمایا۔ یہ تبع تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے بیت اللہ کو غلاف پہنایا تھا اور یہ دوسرا تبع تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: پہلے قباطی کپڑے پہنائے جاتے تھے پھر یمنی چادریں بنائی جاتی تھیں اور جس نے سب سے پہلے دیباج (ریشم) کا کپڑا پہنایا وہ حجاج تھا۔ علماء نے فرمایا: کعبہ کے غلاف سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئے کیونکہ وہ کعبہ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کعبہ کی خوشبو میں سے کوئی چیز لینا شفا حاصل کرنے کے لئے مکروہ ہے۔ جب وہ خادم کو کوئی چیز لیتے ہوئے دیکھتے تو اسے سر کے پیچھے طمانچہ مارتے وہ اسے تکلیف پہنچانے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ عطا نے کہا: ہم میں سے کوئی جب اس سے شفا طلب کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ خوشبو لے آتا اس کو پتھر کے ساتھ مس کرتا پھر اسے اٹھا لیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا معنی ہے وہ دونوں کہہ رہے تھے: ربنا تقبل یقولان کو حذف کیا گیا ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں اسی طرح ہے: واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل و یقولان ربنا تقبل منا(1)۔ اسماعیل کی تفسیر یہ ہے: اسمع یا اللہ (اے اللہ! سن لے) کیونکہ ایل، سریانی زبانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے رب سے دعا مانگی تو کہا: اسمع یا ایل (اے اللہ! سن لے میری فریاد) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بچہ عطا فرمایا تو اس کا نام اپنی دعا کے ساتھ رکھا۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ان کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں کر دی ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

"اے ہمارے رب! بنا دے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو اور بتا دے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہے"۔

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یہاں وَاجْعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے اور مُسْلِمَيْنِ مفعول ثانی ہے۔ دونوں (ابراہیم واسماعیل) نے ثبات اور دوام کی دعا مانگی۔ یہاں اسلام سے مراد ایمان اور اعمال دونوں ہیں (1)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:19) اس آیت میں دلیل ہے ان علماء کی جو کہتے ہیں کہ ایمان اور اسلام ایک شے ہیں۔

ایک اور آیت سے انہوں نے اپنے اس قول کو قوت دی ہے: فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِیْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۶﴾ (الذاریات) (ہم نے نکال لیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو پس نہ پایا ہم نے اس ساری بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے)۔

حضرت ابن عباس اور عوف اعرابی نے مسلمین جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یعنی ہماری اولاد سے بنا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے دعا مانگی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے، اپنی امت کے لئے اور اس امت (محمدیہ) کے لئے دعا مانگی۔ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ ظالم ہوں گے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ سے خاص عرب مراد ہیں (3)۔ سہیلی نے کہا: ان دونوں کی اولاد عرب ہیں کیونکہ عرب نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا بنو تیمن بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے: قیدر بن نبت بن اسماعیل...... العدنانیہ یہ نبت کی اولاد ہیں اور قحطانیہ قیدر بن نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا ایک قول کے مطابق تیمن کی اولاد ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (4): یہ ضعیف ہے کیونکہ آپ کی دعوت عربوں میں ظاہر ہوئی تھی اور ان لوگوں میں جو عربوں کے علاوہ تھے۔

اُمَّةً کا یہاں معنی جماعت ہے ایک شخص کو بھی امت کہا جاتا ہے خیر میں جس کی اقتدا کی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (النحل:120) (بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ کے مطیع تھے) نبی کریم ﷺ نے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں فرمایا تھا وہ ایک امت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا کیونکہ کوئی دوسرا اس کے دین میں شریک نہ تھا۔ واللہ اعلم

کبھی لفظ اُمَّةً کا اطلاق دوسرے معانی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ (زخرف:22) یعنی ہم نے اپنے آباء کو ایک دین اور ملت پر پایا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (الانبیاء:92) کبھی الحین اور الزمان کے معنی میں ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف:45) (یعنی کچھ عرصہ کے بعد یاد آیا) کہا جاتا ہے ھذہ امۃ زید۔ یعنی یہ زید کی ماں ہے۔ اُمَّةً کا معنی قامت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان حسن الامہ یعنی خوبصورت قامت والا ہے۔ شاعر نے کہا:

وان معاویة الاکرمیہ ن حسان الوجوہ طوال الامم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: الامة اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو دماغ کی اصل تک پہنچ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ماموم و امیم، ایسا شخص جسے دماغ پر زخم لگا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا، اَرِنَا، یہ آنکھ سے دیکھنے سے ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ رؤیت قلب سے ہے، یہ کہنے والے پر لازم ہے کہ فعل اس کی طرف سے تین مفاعیل کی طرف متعدی ہو۔ ابن عطیہ نے کہا(1): کبھی ہمزہ کے باوجود رویت قلب سے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح بغیر ہمزہ کے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ حطائط بن یعفر اخو الاسود بن یعفر نے کہا:

اریني جواداً مات هزلاً لانني　　اری ما ترین او بخیلاً مخلّداً

حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت قتادہ، حضرت ابن کثیر، حضرت ابن محیصن، سدی اور روح نے یعقوب اور رویس السوی نے ازنا قرآن میں راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو عمرو نے راء کے کسرہ کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے، اصل میں أرْئنا ہمزہ کے ساتھ تھا، جنہوں نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے کہا: ہمزہ اور اس کی حرکت ختم ہو گئی اور راء اپنی حالت پر ساکن باقی رہی اور انہوں نے شاعر کے قول سے استدلال کیا ہے:

ارنا اداوة عبدالله نملؤها　　من ماء زمزم ان القوم قد ظمئوا

ہمیں عبداللہ کا لوٹا دکھاؤ ہم زمزم کے پانی سے اسے بھریں گے کیونکہ قوم پیاسی ہے۔

شاعر نے اسے ارْنا پڑھا ہے۔

اور جن علماء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ ہمزہ محذوفہ کی حرکت نقل کر کے را کو دیتے ہیں۔ ابو عمرو نے خفت کو طلب کیا ہے۔ شجاع بن ابی نصر سے مروی ہے، وہ امین اور سچے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا انہوں نے ابو عمرو کے حروف سے بہت سی اشیاء کا ذکر کیا تو صرف دو حروف کی تصحیح فرمائی۔ ایک یہ أرْنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ارِنا اور دوسرا ما ننسخ من آیة او ننسأها (مہموز)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنَاسِكَنَا کہا جاتا ہے: لغت میں النسك کا معنی غسل ہے۔ کہا جاتا ہے: نسك ثوبه جب کوئی اپنے کپڑے کو دھوئے۔ یہ شرع میں عبادت کا اسم ہے کہا جاتا ہے رجل ناسك، جب کوئی شخص عابد ہو۔

علماء کا اختلاف ہے کہ المناسك سے کیا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا مناسک حج اور اس کی علامات مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ مجاہد، عطاء، ابن جریج نے کہا المناسك سے مراد ذبح کی جگہیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام عبادات ہیں (2) ہر وہ عمل جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اسے منسك اور منسِك کہا جاتا ہے۔ الناسك سے مراد عابد ہے۔ نحاس نے کہا نَسَكَ یَنْسُكُ۔ اس صورت میں منسُك کہنا واجب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لیکن عرب کلام میں مفعل نہیں ہے۔ زہیر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت الحرام کی بناء سے فارغ ہوئے تو عرض کی: اے رب! میں فارغ ہو چکا ہوں تو ہمیں مناسک دکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جبریل امین کو بھیجا، پس آپ نے جبریل امین کے ساتھ حج کیا حتیٰ کہ جب عرفہ سے لوٹے اور دسویں کا دن آیا تو ابلیس آپ کے سامنے آیا جبریل امین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اسے کنکریاں مارو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں پھر اگلے دن اور تیسرے دن کنکریاں ماریں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام ثبیر پہاڑ پر چڑھے اور کہا: اے اللہ کے بندو، اجیبوا (جواب دو) پس سمندروں کے درمیان جو بھی ایسا شخص موجود تھا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان تھا اس نے آپ کی دعوت کو سن لیا۔ اور اس نے کہا: لبیك اللھم لبیك۔ فرمایا: سطح زمین پر ہمیشہ سات یا اس سے زائد مسلمان ہوں گے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زمین اور اس کے رہنے والے ہلاک ہو جاتے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کا جواب اہل یمن نے دیا۔ ابو مجلز سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور انہیں بیت اللہ کا طواف دکھایا۔ فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے فرمایا: الصفا والمروۃ پھر دونوں جمرہ عقبہ کی طرف چلے سامنے شیطان آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں اٹھائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں، پہلے جبریل امین نے کنکری ماری اور تکبیر کہی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا، کنکری مارو اور تکبیر کہو پس دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر جمرہ وسطیٰ کی طرف چلے۔ شیطان پھر سامنے آیا، جبریل نے سات کنکریاں لیں اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی سات کنکریاں دیں۔ جبریل امین نے کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ حتیٰ کہ شیطان چلا گیا۔ پھر جمرہ قصویٰ پر آئے، شیطان سامنے آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں لیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں اور کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو۔ دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر دونوں مزدلفہ میں آئے اور جبریل امین نے کہا: یہاں لوگ اپنی نمازوں کو جمع کریں گے پھر جبریل امین، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لے کر عرفات میں آئے اور کہا: عرفت (تو نے جان لیا؟) حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو عرفات کہا جاتا ہے۔ روایت ہے، جبریل امین نے تین مرتبہ کہا عرفت، عرفت، عرفت۔ یعنی منیٰ، مزدلفہ اور اس جگہ کو پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس مکان کو عرفات کہا جاتا ہے۔ خصیف بن عبدالرحمن سے مروی ہے کہ مجاہد نے انہیں بتایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا یعنی الصفا والمروۃ۔ یہ نص قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں پھر جبریل امین آپ کو لے کر نکلے جب جمرہ عقبہ سے گزرے تو اس پر شیطان بیٹھا تھا۔ جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا: تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو، ابلیس، جمرہ وسطیٰ پر چڑھ گیا۔ جبریل امین نے کہا تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو پھر جمرہ قصویٰ پر اسی طرح ہوا۔ پھر وہ اسے مشعر حرام کی طرف لے گئے۔ پھر عرفہ میں لے آئے۔ پھر جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا کیا تو نے پہچان لیا جو میں نے تجھے دکھایا؟ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے عرفات کو عرفات کہا جاتا ہے۔ جبریل امین نے کہا: تم لوگوں میں حج کا

اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے کہا: میں کیسے کہوں؟ جبریل امین نے کہا: تم کہو: اے لوگو! اپنے رب کا حکم قبول کرو۔ یہ تین مرتبہ اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے کہا: لبیک اللھم لبیک۔ فرمایا: اس دن جس نے جواب دیا وہ حج کرے گا۔ دوسری روایت میں ہے جب آپ نے آواز دی تو آپ گھومے اور ہر طرف ندا دی۔ مشرق و مغرب ہر طرف سے لوگوں نے لبیک کہا۔ پہاڑ جھک گئے حتیٰ کہ آپ کی آواز دور تک چلی گئی۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن صلوات اللہ علیہ بیت الحرام کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور کہا: اس کے سات چکر لگاؤ۔ حضرت ابراہیم نے اس کے سات چکر لگائے اور حضرت اسماعیل بھی آپ کے ساتھ تھے، ہر طواف میں ہر رکن کا استلام کیا جب سات چکر دونوں نے مکمل کر لئے تو مقام کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ فرمایا: جبریل امین کھڑے ہوئے اور تمام مناسک دکھائے، صفا، مروہ، منیٰ اور مزدلفہ۔ فرمایا: جب منیٰ میں داخل ہوئے اور عقبہ سے اترے تو شیطان سامنے آیا، جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تمام ارکان کا استلام کرتے تھے اور فرمایا: شام سے حضرت اسحاق اور سارہ علیہما السلام نے حج کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال براق پر حج کرتے تھے ان کے بعد انبیاء اور امم نے حج کیا۔ محمد بن سابط نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نبی جب اس کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ میں آ جاتا تھا اور یہاں وہ اور اس پر ایمان لانے والے عبادت کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ فوت ہو جاتے تھے۔ مکہ میں حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کا وصال ہوا اور ان کی قبور زمزم اور حطیم کے درمیان ہیں (1)۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی مکہ میں فوت ہوئے تھے ان کی قبور مکہ کی غربی جانب دار الندوہ اور بنی سہم کے درمیان ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسجد میں صرف دو قبریں ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر۔ حضرت اسماعیل کی قبر حطیم میں ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر حجر اسود کے مقابل ہے۔ عبداللہ بن ضمرہ السلولی نے کہا: رکن اور مقام کے درمیان ننانوے انبیاء کی قبور ہیں جو حج کے لئے آئے تھے یہاں دفن ہوئے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ تُبْ عَلَيْنَا** حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اس قول کے معنی میں اختلاف ہے۔ **تُبْ عَلَيْنَا** کہا حالانکہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: انہوں نے اس دعا سے تثبیت اور دوام کو طلب کیا، نہ اس لئے کہ ان کا کوئی گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں: یہ اچھا جواب ہے اور اس سے احسن جواب یہ ہے کہ جب ان دونوں نے مناسک کو جان لیا اور بیت اللہ کو تعمیر کر لیا تو ان دونوں نے ارادہ کیا کہ وہ لوگوں کے لئے بیان کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ جگہ اور دوسرے مناسک حج گناہوں سے طہارت اور توبہ طلب کرنے کی جگہیں ہیں (2)۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم میں سے جو ظالم ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔ عصمت انبیاء پر کلام حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے اور **اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** کے معنی میں بھی کلام گزر چکا ہے پس اعادہ کی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

''اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں۔ بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا، رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں ہے وابعث فی آخرھم رسولاً منھم حضرت خالد بن معدان نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپ سے عرض کی: یارسول اللہ! ہمیں اپنی ذات کے بارے میں بتائیے۔ فرمایا: ہاں میں اپنے باپ ابراہیم کی دعوت ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں (1)۔ اور رسول بمعنی مرسل (بھیجا گیا) ہے یہ رسالت سے مفعول کا وزن ہے۔ ابن انباری نے کہا: ہوسکتا ہے کہ عربوں کے اس قول سے ہو: ناقۃٌ مِرسال ورَسْلَۃٌ۔ جب اونٹنی آرام سے چلنے والی ہو دوسری اونٹنیوں کے آگے چلنے والی ہو اور مہمل جماعت کے لئے المرسلۃ کہا جاتا ہے۔ رسل کی جمع ارسال ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء القوم ارسالاً۔ یعنی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے آئے، اسی سے دودھ کو رسل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کھیری سے متواتر نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، الْكِتَابَ سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد دین کی معرفت، اور فہم ہے جو تاویل میں سمجھ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصلت اور نور ہے۔ یہ مالک نے کہا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد سنت اور شریعت کا بیان ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حکم اور قضا ہے، سب کا معنی قریب قریب ہے۔ تعلیم کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے کیونکہ آپ وہ تمام امور عطا فرماتے ہیں جن میں غور وفکر کیا جاتا ہے آپ غور وفکر کے طرق کی تعلیم دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعے عطا فرماتا تھا۔ (3)

وَيُزَكِّيهِمْ یعنی شرک کی میل سے انہیں پاک کرتا ہے۔ ابن جریج (4) وغیرہ سے مروی ہے، زکوٰۃ کا مطلب پاک کرنا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: آیات سے مراد ظاہر الفاظ کی تلاوت ہے، کتاب سے مراد الفاظ کے معانی ہیں اور حکمت سے مراد حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مراد ہے کہ وہ مطلق ہے، مقید ہے، مفسر ہے، مجمل ہے، عموم وخصوص ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الْعَزِيزُ اس کا معنی ہے وہ محفوظ ذات جس کو نہ پایا جاسکتا ہے اور نہ مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کا معنی ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہ کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (فاطر: 44)۔ الکسائی نے کہا: الْعَزِيزُ کا معنی غالب ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وعزّنی فی الخطاب۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ضرب المثل ہے: مَنْ عَزَّبَزَّ یعنی جو غالب آیا اس نے سلب کیا۔ بعض نے فرمایا: اَلْعَزِیْزُ وہ ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو، اس کا بیان ہے: لیس کمثلہ شیٔ۔ ہم نے اس معنی کو اَلْعَزِیْزُ کے اسم کے تحت اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں زیادہ بیان کیا ہے۔ اَلْحَکِیْمُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور کون روگردانی کرسکتا ہے دین ابراہیم سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، مَنْ استفہامیہ ہے۔ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یرغب، مَنْ کا صلہ ہے اور اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یہ خبر کی جگہ ہے، یہ تقریع اور توبیخ ہے اس میں نفی کا معنی ہے یعنی وہ مایرغب کا معنی ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ یعنی دین اور شرع ابراہیمی سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اس سے پہلے نفس کو دور رکھتا ہے جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنایا۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں انہوں نے ملت ابراہیمی سے اعراض کیا اور یہودیت و نصرانیت خود ایجاد کی وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے(1)۔ زجاج نے کہا: سفہ کا معنی ہے اپنے نفس کے امر سے جاہل رہا اور اس میں غور و فکر نہ کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ ثعلب اور مبرد نے حکایت کیا ہے کہ سَفِهَ فاء کے کسرہ کے ساتھ اسی طرح متعدی ہے جس طرح سفہ فاء کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ متعدی ہے(2)۔ یعنی اس نے اپنے نفس کے ساتھ ایسا فعل کیا کہ وہ سفیہ بن گیا۔ ان سے مروی ہے، یہ ایک لغت ہے جو بمعنی سفہ ہے۔ یہ مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ رہا سَفُهَ فاء کے ضمہ کے ساتھ یہ متعدی نہیں ہوتا۔ یہ مبرد اور ثعلب کا قول ہے۔ کسائی نے اخفش سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: جھل فی نفسہ۔ فی کو حذف کیا گیا اور نفسہ کو منصوب پڑھا گیا۔

اخفش نے کہا: اس کی مثل عقدۃ النکاح ہے یعنی علی عقدۃ النکاح۔ (علی کو حذف کیا گیا) یہ سیبویہ کے مذہب پر جاری ہے اس سے عربوں سے حکایت کیا ہے ضرب فلان الظھر والبطن۔ اصل میں فی الظھر والبطن تھا فی کو حذف کیا گیا(3)۔ فراء نے کہا: نفسہ تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ابن بحر نے کہا: اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے نفس سے اور جو اس میں دلالات اور آیات ہیں ان سے غافل رہا جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس نفس کا ایک صانع (بنانے والا) ہے جس کی مثل کوئی نہیں ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کو جان لیتا۔

میں کہتا ہوں: یہ زجاج کے قول کا معنی ہے۔ وہ اپنے نفس میں غور و فکر کرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پکڑتا ہے اور اپنے قدموں سے چلتا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے، زبان سے بولتا ہے، دودھ سے غنی ہونے کے وقت اس کی داڑھیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

پیدا فرمائیں تا کہ وہ اس سے کھانے کو چبائے، معدہ بنایا گیا وہ غذا کو پکانے کے لئے ہے، جگر ہے جس کی طرف اس غذا کو صاف مال جاتا ہے اور اس کی نسیں اور رگیں ہیں جن کے ذریعے مختلف اطراف میں خون پہنچتا ہے۔ انتڑیاں ہیں جن کی طرف غذا کا فضلہ جاتا ہے اور نیچے والے بدن سے نکل جاتا ہے، اس سے انسان استدلال کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق، قادر، علیم اور حکیم ہے۔ یہی معنی ہے اس آیت کا وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)۔

اس کی طرف خطابی نے اشارہ کیا ہے اس کا مزید بیان سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے اس نے جس نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہماری شریعت ہے مگر جو اس سے منسوخ ہو گیا یہ اس قول کی مانند ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج: 78)۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (النحل: 123)۔ آپ ابراہیمی ملت کی اتباع کریں۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ہم نے اس کو رسالت کے لئے چن لیا اور ادناس (میل کچیل) سے صاف بنایا۔ اصطفینا اصل میں اصتفینا تھا۔ تاء کو طا سے بدلا تا کہ اطباق میں صاد کے ساتھ مناسبت ہو جائے یہ لفظ الصفوۃ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: جو زیادہ صاف ہو اس کا اختیار کرنا۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، الصالح فی الاخرۃ سے مراد کامیاب ہونے والا ہے۔ پھر یہ سوال کیا گیا ہے کہ فِي الْاٰخِرَةِ کو مقدم کیسے کیا گیا ہے حالانکہ یہ صلہ میں داخل ہے؟ نحاس نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح نہیں ہے: انہ لمن الصالحین فی الآخرۃ کہ صلہ مقدم ہو۔

اہل عرب کے اس کے متعلق تین اقوال ہیں: (۱) یہ کہ اس کا معنی ہے وہ آخرت میں صالح ہے پھر کلام میں حذف کیا گیا۔ بعض نے فی فرمایا: فی الاخرۃ، مصدر محذوف کے متعلق ہے یعنی صلاحۃ فی الاخرۃ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ الصالحین، الذین صلحوا کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ اسم قائم بنفسہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: الرجل، الغلام۔

میں کہتا ہوں: چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: انہ فی عمل الاخرۃ لمن الصالحین کلام مضاف کے حذف پر ہے(2)۔ حسین بن فضل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ کلام اس طرح ہے: ولقد اصطفینا فی الدنیا والآخرۃ و انہ لمن الصالحین۔

حجاج بن حجاج نے روایت کیا ہے، یہ حجاج بن الاسود ہے اور وہی حجاج الاحول ہے جو زق العسل (شہد کا مشکیزہ) سے معروف تھا۔ فرمایا: میں نے معاویہ بن قرۃ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا: اللھم ان الصالحین انت اصلحتھم و رزقتھم ان عملوا بطاعتک فرضیت عنھم۔ اللھم کما اصلحتھم فاصلحنا و کما رزقتھم ان عملوا بطاعتک فرضیت عنھم فارزقنا ان نعمل بطاعتک وارض عنا۔ اے اللہ! صالحین کو تو نے صالحیت بخشی تو نے انہیں توفیق بخشی کہ وہ تیری طاعت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

کے اعمال کریں اور تو ان سے راضی ہوا۔ اے اللہ! جس طرح تو نے انہیں صالحیت بخشی ہمیں بھی صالحیت عطا فرما اور جس طرح تو نے انہیں اپنی طاعت کی توفیق بخشی اور تو ان سے راضی ہوا ہمیں بھی اپنی طاعت کی توفیق عطا فرما اور ہم سے راضی ہو۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

''اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم!) گردن جھکا دو۔ عرض کی: میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے''۔

اِذْ کا عامل اصْطَفَيْنٰهُ کا قول ہے۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ستارے، چاند اور سورج سے آزمائش کی (1)۔ ابن کیسان اور کلبی نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ اپنے دین کو خالص کر۔ بعض نے فرمایا: اَسْلِمْ کا معنی ہے خضوع و خشوع کر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت فرمایا جب آپ سرنگ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں اس کا ذکر آئے گا۔ اسلام یہاں تمام وجوہ کے ساتھ ہے۔ کلام عرب میں اسلام کا معنی خضوع اور انقیاد ہے۔ ہر اسلام، ایمان نہیں ہے اور ہر ایمان، اسلام ہے کیونکہ جو اللہ پر ایمان لایا اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے سر جھکا دیا اور اس کی اطاعت کی۔ اور ہر اسلام لانے والا ایمان لانے والا نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا ہو اور یہ ایمان نہیں ہوگا۔ قدریہ اور خوارج کا قول اس کے خلاف ہے (☆)۔ انہوں نے کہا: اسلام ہی ایمان ہے۔ ہر مومن، مسلم ہے اور ہر مسلم، مومن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) یہ دلیل ہے کہ اسلام، دین ہے اور جو مسلمان نہیں وہ مومن نہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا (الحجرات: 14)

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمائیے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی۔

اللہ تعالیٰ نے اس میں بیان فرمایا کہ ہر مسلمان، مومن نہیں پس یہ دلیل ہے کہ ہر مسلمان، مومن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا: جب انہوں نے عرض کی تھی: حضور! فلاں کو عطا فرمائیں وہ مومن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا بلکہ تم کہو مسلم ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ایمان اسلام نہیں ہے کیونکہ ایمان باطنی چیز ہے اور اسلام ظاہر ہے۔ یہ واضح ہے کہ کبھی ایمان، اسلام کے معنی میں ہوتا۔ اسلام بولا جاتا ہے اور مراد ایمان ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کو لازم ہے۔ جیسے اسلام جو ایمان کا ثمرہ، اور ایمان کی صحت پر دلیل ہے (یہی نقطہ نظر ماتریدیہ کا ہے)۔

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆۔ یہ قول قابل توجہ ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے نزدیک اعمال ایمان کا جز ہیں اس لیے وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج کرتے ہیں۔ جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے لغوی اعتبار سے تو فرق ہے لیکن کسی کے لیے ایک کا ثبوت اور دوسرے کی نفی کرنا ممکن نہیں اہلسنت میں سے یہ ماتریدیہ کی رائے ہے مفسر کا اس کی تعبیر کرنا درست نہیں۔

اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ، ھا ضمیر سے مراد ملت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ کلمہ ہے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ یہ زیادہ درست ہے کیونکہ یہ قریب مذکور ہے (1) یعنی تم اسلمنا کہو۔ وَوَصّٰى اور اوصی دونوں ہم معنی قریش کی لغتیں ہیں۔ مثلاً کرمنا اور اکرمنا۔ اوصی اور وصی دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ کے مصحف میں وصّی تھا اور حضرت عثمان کے مصحف میں اوصی تھا۔ یہ اہل مدینہ، شام اور دوسرے قراء کی قراءت ہے۔ وصّی اس میں کثرت کا معنی ہے (2)۔ لفظ ابراہیم کو اس کے فعل کی وجہ سے رفع دیا ہے اور یعقوب، ابراہیم پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ علیحدہ کلام ہے اس کا معنی ہے: واوصی یعقوب۔ (3) مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

حضرت ابراہیم کے بیٹے، ایک حضرت اسماعیل تھے۔ ان کی والدہ ہاجرہ قبطیہ تھی یہ آپ کے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انہیں مکہ کی طرف منتقل کیا تھا جبکہ یہ ماں کا دودھ پیتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس وقت ان کی عمر دو سال تھی۔ بعض نے فرمایا: چودہ سال تھی۔ پہلا قول اصح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ حضرت اسماعیل اپنے بھائی اسحاق سے چودہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور ان کا وصال ہوا تو ان کی عمر ایک سو تہتر سال تھی۔ بعض نے فرمایا: ایک سو تیس سال تھی اور جب آپ کے والد حضرت ابراہیم کا وصال ہوا تو ان کی عمر ۸۹ سال تھی۔ ایک قول کے مطابق حضرت اسماعیل ذبیح تھے۔ یہ اصح قول ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کی اولاد سے روم، یونان، ارمن اور جو ان کے پیچھے آئے اور بنی اسرائیل تھے۔ حضرت اسحاق ایک سو اسی سال زندہ رہے، ارض مقدسہ میں ان کا وصال ہوا اور اپنے باپ حضرت ابراہیم کے پاس دفن کئے گئے پھر جب حضرت سارہ کا وصال ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قنطورا بنت یقطن کنعانیہ سے نکاح کیا اس سے آپ کی یہ اولاد ہوئی۔ مدین، مدائن، نہشان، زمران، نشیق، شبوخ۔ پھر آپ کا وصال ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان دو ہزار چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ یہود اس سے چار سو سال کم کرتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا ذکر سورۂ یوسف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمرو بن فائد اسواری اور اسماعیل بن عبداللہ مکی نے یعقوب، بنیہ پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے (4)۔ اس صورت میں جن کو وصیت کی گئی ان میں حضرت یعقوب بھی داخل ہوں گے (5)۔ قشیری نے کہا: یعقوب پر بنیہ پر عطف کی بناء پر نصب پڑھی گئی ہے اور یہ بعید ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی تو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی اولاد کے درمیان موجود نہ تھے۔ یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کو پایا تھا۔ وہ حضرت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

ابراہیم کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی۔ حضرت یعقوب کی اولاد کے اسماء ان شاء اللہ آئندہ آئیں گے۔

کلبی نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ بتوں کی، آگ کی اور گائے کی عبادت کرتے ہیں آپ نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان پر آپ کو اندیشہ ہوا۔ فرمایا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔

کہا جاتا ہے: یعقوب کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے بھائی عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے اور آپ اپنے بھائی عیص کی عقب (ایڑھی) کو پکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس قول میں نظر ہے کیونکہ یہ عربی اشتقاق ہے اور یعقوب عجمی اسم ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نام رکھنے میں عربی میں موافقت ہے جیسے حجل پرندے کا جو مذکر ہوتا ہے اسے یعقوب کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو سینتالیس سال زندہ رہے تھے اور مصر میں آپ کا وصال ہوا تھا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ارض مقدسہ کی طرف لے جایا جائے اور ان کے باپ حضرت اسحٰق کے قریب دفن کیا جائے، تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کو ادھر لے گئے تھے اور ان کے والد حضرت اسحٰق کے پہلو میں انہیں دفن کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰبَنِیَّ اس کا معنی ہے ان یا بنی، اسی طرح حضرت ابی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ضحاک کی قراءت میں ہے(1)۔ فراء نے کہا اَنْ کو لغو کیا گیا ہے کیونکہ توصیۃ قول کی طرح ہے ہر کلام جو قول کے معنی کی طرف راجع ہو، اس میں ان کا دخول جائز ہوتا ہے اور اس کا لغو کرنا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: نحویوں کا قول کہ (اَنْ) کا ارادہ فرمایا اور ان کو لغو کیا گیا یہ کچھ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا: یٰبَنِیَّ نداء مضاف ہے۔ یہ یاء النفس ہے اس پر فتحہ ہی جائز ہے کیونکہ اگر اس کو ساکن کیا جائے تو دو ساکنوں کا جمع ہونا لازم آئے گا۔ اس کی مثال بمصرخی ہے اِنَّ اللّٰہَ میں اِنَّ کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ اوصی اور قال ایک معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: قول کے اضمار کی وجہ سے اِنَّ پر کسرہ پڑھا گیا ہے۔ اصْطَفٰی کا معنی اختیار ہے۔ راجز نے کہا:

یا بن ملوك ورثوا الاملاكا　خلافة الله التی اعطاك

لك اصطفاها ولها اصطفاك

اے بادشاہوں کے بیٹے اور انہوں نے تجھے املاک کا وارث بنایا۔ اللہ کی خلافت وہ ہے جو تجھے عطا کی۔ تیرے لئے اس کو اس نے چنا ہے اور اس کے لئے تجھے اس نے چنا ہے۔

لَكُمُ الدِّیْنَ، الدِّیْنَ سے مراد اسلام ہے۔ الدِّیْنَ پر الف، لام عہد کے لئے ہے کیونکہ وہ اس دین کو جانتے تھے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اس میں ایجاز بلیغ ہے۔ اس کا معنی ہے اسلام کو لازم پکڑو اور اس پر دوام اختیار کرو اور اس سے جدا نہ ہو حتیٰ کہ تم فوت ہو جاؤ مختصر الفاظ ذکر فرمائے جن کے ضمن میں مقصود موجود ہو اور وعظ اور موت کی یاد بھی اس کے ضمن میں ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر انسان کو یہ تو یقین ہے کہ وہ فوت ہوگا اور یہ نہیں جانتا کہ کب مرے گا۔ جب کسی کو کسی ایسے امر کا حکم دیا جائے کہ اسے موت نہ آئے مگر اسی امر پر تو خطاب امر کے وقت سے ہمیشہ کے لئے متوجہ ہوتا ہے(2)۔ لا نہی ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 213، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تَمُوْتُنَّ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور واؤ کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ مبتدا اور خبر محل حال میں ہیں یعنی تم اپنے رب پر اچھا گمان کرنے والے ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: مخلصون (یعنی تم مخلص ہو)۔ بعض نے فرمایا: مفوضون (تم اپنا آپ اپنے رب کے سپرد کرنے والے ہو) بعض نے فرمایا: مومنون (تم ایمان لانے والے ہو)۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

''بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آ پہنچی یعقوب کو موت۔ جب پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد۔ انہوں نے عرض کی: ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگ ابراہیم و اسماعیل اور اسحق کے خدا کی جو خدائے وحدہ لاشریک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ، شُهَدَآءَ، کان کی خبر ہے غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے اور یہ الف جمع کی تانیث کے لئے داخل ہوتی ہے جس طرح ھا داخل ہوتی ہے۔ خطاب، یہود و نصاریٰ کو ہے جو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت نہیں کی تھی اور وہ یہودیت اور نصرانیت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا۔ یہ ارشاد توبیخ کی جہت سے ہے: تم یعقوب کے پاس موجود تھے اور جو انہوں نے وصیت کی تھی تمہیں اس کا علم تھا جس کی بنا پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو۔ یعنی تم اس وقت موجود نہ تھے بلکہ تم یہ جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ اور ام بمعنی بل ہے۔ یعنی بلکہ کیا تمہارے اسلاف یعقوب کے پاس موجود تھے۔ پہلے اِذْ کا عامل شہادت کا معنی ہے اور دوسرا اِذْ پہلے کا بدل ہے شُهَدَآءَ، شاھد کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہے حاضر اور حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ کا معنی ہے حضرت یعقوب پر موت کے مقدمات اور اسباب موجود تھے وگرنہ آگے موت آ جاتی تو اس کے لئے یہ کہنا ممکن نہ ہوتا۔ المعبود کو ما کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مَنْ نہیں فرمایا کیونکہ انہیں آزمانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر مَنْ فرماتے تو اس کا مقصود یہ ہوتا کہ آپ ان میں ہدایت یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصود ان کا تجربہ تھا آپ نے ما ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ متعارف معبودان باطلہ جمادات تھے جیسے بت، آگ، سورج، اور پتھر پس آپ نے پوچھا کہ کس کی عبادت کرو گے؟ اور مِنْۢ بَعْدِيْ کا معنی ہے میرے وصال کے بعد۔ حکایت کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اختیار دیا گیا جس طرح انبیاء کو اختیار دیا جاتا ہے تو آپ نے موت کو اختیار فرمایا اور فرمایا: مجھے مہلت دو حتیٰ کہ میں اپنے بیٹوں اور اپنے گھر والوں کو وصیت کروں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو جمع فرمایا اور انہیں یہ فرمایا۔ پس وہ ہدایت یافتہ تھے انہوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ الآیۃ اور بیٹوں نے دین پر اپنے ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت دکھائی (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ، ابرہیم، اسماعیل اور اسحاق یہ بدل کی حیثیت سے محل جر میں ہیں یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی ہیں۔ کسائی نے کہا: اگر تو چاہے تو اسحاق کو منصرف بنا دے اور تو اسے السحق سے مشتق کرے اور یعقوب کو منصرف کرے اور تو اسے پرندوں سے بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے چچا اور دادا تمام کو اباء سے تعبیر فرمایا اور دادا کا ذکر پہلے فرمایا پھر اسماعیل چچا کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ اسحاق سے بڑے تھے۔ اِلٰهًا یہ الهك سے بدل ہے اور یہ معرفہ سے نکرہ بدل ہے اس کو وحدانیت کی صفت کے فائدہ کے لئے اس کا تکرار فرمایا، بعض نے فرمایا اِلٰهًا حال ہے۔ ابن عطیہ نے کہا یہ حسن کا قول ہے کیونکہ غرض وحدانیت کی حالت کا اثبات ہے۔ حسن یعمر جحدری اور ابو رجاء عطاردی نے واله ابیك پڑھا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

(۱) مفرد ذکر کیا اور مراد صرف حضرت ابراہیم لئے اور اسماعیل کو اب بنانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ چچا تھے۔ نحاس نے کہا: یہ واجب نہیں ہے کیونکہ عرب چچا کو اب کہتے ہیں۔

(۲) سیبویہ کے مذہب کے مطابق ابیك جمع سالم ہوگی۔ سیبویہ نے اب کی جمع ابون اور ابین حکایت کی ہے۔ شاعر نے کہا:

فقلنا　اسلموا　انا　اخوکم

اس میں اصل اخون تھا اضافت کی وجہ سے نون گر گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا

فلما　تبین　اصواتنا　بکین و فدیننا بالابینا (1)

اس میں ابین، أب کی جمع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور یہ حال ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس میں عامل نعبد ہے (2)۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

”یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، تِلْكَ مبتدا ہے اور اُمَّةٌ خبر ہے اور قَدْ خَلَتْ، اُمَّةٌ کی صفت ہے اگر تو چاہے تو قَدْ خَلَتْ کو خبر بنا دے اور اُمَّةٌ، تِلْكَ سے بدل ہوگا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ، مَا محل رفع میں ہے یا کوفیوں کے ایک قول کے مطابق صفت ہے وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ یہ لَهَا مَا كَسَبَتْ کی مثل ہے۔ خیر اور شر کا ارادہ فرمایا ہے (3)۔ اس میں دلیل

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے کہ اعمال اور اکساب کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسے قدرت دی ہے اگر وہ اچھے اعمال پر اچھی جزا دے تو یہ اس کا فضل ہوتا ہے اور برے اعمال پر سزا دے تو یہ اس کا عدل ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے قرآن میں اس مفہوم کی آیات کثیر ہیں۔ بندہ اپنے افعال کا مکتسب ہے اس معنی پر کہ فعل کے متصل اللہ تعالیٰ اس کے لئے قدرت پیدا فرما دیتا ہے اس کے ساتھ حرکت اختیاری اور حرکت رعشہ کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ یہی قدرت اور تکلیف کا مدار ہے۔ جبریہ فرقہ نے بندے کے اکتساب کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں: بندہ نبات کی طرح ہے ہوائیں اسے گردش دیتی رہتی ہیں قدریہ اور معتزلہ کا قول ان دونوں قولوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اپنے افعال کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی کسی کے گناہ کی وجہ سے دوسرے سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام: 164) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اور (یہودی) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے۔ آپ فرمائیے میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ہر فرقہ نے اس کی طرف بلایا جس پر وہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا، فرمایا: بَلْ مِلَّةَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کہو ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے اسی وجہ سے مِلَّةَ کو نصب دی گئی ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے بل نھتدی بملة ابراھیم جب حرف جر حذف کیا گیا تو مِلَّةَ منصوب ہو گیا اعرج اور ابن ابی عبلہ نے بل ملةُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ تقدیر عبارت بل الهدی ملة یا ملتنا دین ابراھیم۔ (یعنی ہدایت تو ملت ابراہیمی ہے یا ہماری ملت دین ابراہیم ہے) حَنِيْفًا تمام ناپسندیدہ دینوں سے انحراف کر کے دین حق، دین ابراہیم کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: یعنی بل نتبع ملة ابراھیم فی ھذہ الحالةِ یعنی اس حال میں ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ اعنی کی بنا پر منصوب ہے اور حال بنانا خطا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے: جاء نی غلام ھند مسرعة۔ حضرت ابراہیم کو حنیف کہا گیا کیونکہ وہ اللہ کے دین اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الحنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اسی سے ہے رجلٌ حنفاء، رجل احنف۔ یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے قدموں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف انگلیوں کے ذریعے مائل ہوتا ہے۔

ام الاحنف نے کہا:

واللہ لولا حنفٌ برجله ما کان فی فتیانکم من مثله

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ کی قسم! اگر اس کے پاؤں میں میلان نہ ہوتا تو تمہارے بچوں میں اس کی مثل نہ ہوتا۔

شاعر نے کہا:

اذا حول الظل العشی رأیتہٗ حنیفا و فی قرن الضحی یتنصّرُ

الحرباء سورج ڈھلنے کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرتی ہے اور صبح کے وقت مشرق کی طرف منہ کرتی ہے۔ یہ نصاریٰ کا قبلہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الحنف کا معنی استقامت ہے۔ دین ابراہیم کو اس کی استقامت کی وجہ سے حنیف کہا جاتا ہے۔ ٹیڑھی ٹانگوں والے کو استقامت سے فال پکڑتے ہوئے احنف کہا جاتا ہے جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم کہا جاتا ہے اور ہلاکت کی جگہ کو مفازۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

”کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لئے عربی میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو نازل کیا گیا(1)۔ محمد بن سیرین نے کہا: جب تجھے کہا جائے تو مومن ہے؟ تو تو کہہ: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ الآیہ۔

اکثر سلف نے کسی کے لئے یہ کہنا ناپسند کیا: انا مؤمن حقاً میں یقیناً مومن ہوں (2)۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ متقدمین میں سے کسی سے پوچھا گیا: کسی شخص سے پوچھا جائے کیا تو فلاں نبی پر ایمان لاتا ہے، اس نے اس نبی کا نام لیا جسے وہ شخص جانتا نہیں تھا۔ اب اگر وہ ہاں کہہ دے ہو سکتا ہے وہ نبی نہ ہو، تو وہ غیر نبی کی نبوت کی شہادت دینے والا ہوگا اور اگر وہ نہیں کہہ دے تو ہو سکتا ہے وہ نبی ہو تو وہ ایک نبی کا انکار کرنے والا ہوگا۔ اب وہ شخص کیا کرے؟ اس عالم نے فرمایا: اسے یوں کہنا چاہئے کہ اگر وہ نبی تھا تو میں اس پر ایمان لایا۔ اس آیت میں خطاب اس امت کو ہے جنہیں ایمان سکھایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کا ایک گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا کہ انبیاء میں سے کس پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ قولوا امنا باللہ، حدیث 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ یہ قول محل نظر ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں ہے جب بندے سے تصدیق اور اقرار پایا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا صحیح ہے انا مؤمن حقا

ایمان لایا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا ہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اور جو اس پر ایمان لایا اس پر ایمان نہیں لاتے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ، ابراهیم کی جمع براهیم ہے۔ اسماعیل کی جمع سماعیل ہے۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ کوفیوں نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے براهمه اور سماعلة جمع بھی حکایت کی ہے اور انہوں نے براہم اور سماعل بھی حکایت کیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ زیادت کی جگہ نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں: اباره اور اسامع جمع ہے اور ابار یه و اسامیع جمع بھی جائز ہے۔ احمد بن یحییٰ نے براہ کو جائز قرار دیا ہے جیسے تصغیر میں کہا جاتا ہے بُریه۔ اسحاق کی جمع اساحیق ہے۔ کوفیوں نے اساحقه اور اساحق حکایت کیا ہے۔ اسی طرح یعقوب کی جمع یعاقیب و یعاقبه و یعاقب حکایت کی ہے۔ نحاس نے کہا: رہا اسرائیل۔ ہم کوئی ایسا عالم نہیں جانتے جس نے اس کی ابتدا سے ہمزہ حذف کیا ہو۔ کہا جاتا ہے اساریل۔ کوفیوں نے اسارله اور اسارل حکایت کیا ہے ان تمام میں جمع سالم بنائی جائے اور کہا جائے: ابراهیمون، اسحاقون، یعقوبون اور جمع سالم میں عمل نہیں ہے۔

الْاَسْبَاطِ سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، آپ کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ہر ایک کی بہت سی اولاد تھی، اس میں سے ہر ایک سبط تھا۔ بنی اسرائیل میں سبط حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے قبیلہ کے قائم مقام تھا ان کو الْاَسْبَاطِ کہا جاتا تھا۔ یہ سبط سے ہے جس کا معنی ہے درپے ہونا وہ جماعت جو ایک دوسرے کی متابعت کرے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل السَبَط سے ہے۔ اس سے مراد درخت ہے یعنی وہ کثرت میں درخت کے قائم مقام تھے۔ اس کا مفرد سبطةٌ ہے۔ ابو اسحٰق زجاج نے کہا: تیرے اس چیز کو یہ سند بیان کرتی ہو، جو ہمیں محمد بن جعفر انباری نے بیان کی، فرمایا: ہمیں ابو نجید الدقاق نے بیان کی فرمایا: ہمیں اسود بن عامر نے بیان کیا۔ فرمایا: ہمیں اسرائیل نے بیان کیا انہوں نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا، فرمایا: تمام انبیاء بنی اسرائیل سے تھے سوائے دس کے۔ حضرت نوح، حضرت شعیب، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی کے دو نام نہ تھے سوائے حضرت عیسیٰ اور حضرت یعقوب کے۔ السبط کا مطلب جماعت اور قبیلہ ہے۔ ایک اصل کی طرف لوٹنے والے۔ شعر سَبِطٌ و سبطٌ۔ سیدھے بال جو گھنگھریالے نہ ہوں لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم بعض پر ایمان نہیں لاتے اور نہ بعض کا انکار کرتے ہیں جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 657، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

''تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب تو ہدایت پائیں گے اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلے میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا یہ خطاب حضرت محمد ﷺ اور آپ کی امت کو ہے۔ اس کا معنی ہے: اگر وہ ایمان لائیں تمہارے ایمان کی مثل اور تصدیق کریں تمہاری تصدیق کی طرح تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ دونوں ایمانوں کے درمیان مماثلت ہے۔ بعض نے فرمایا: باء زائدہ مؤکدہ ہے۔ ابن عبس اس طرح پڑھتے تھے جس طرح طبری نے حکایت کیا ہے۔ فان آمنوا بالذی آمنتم بہ فقد اھتدوا۔ یہ قراءت کا معنی ہے اگرچہ مصحف کے مخالف ہے۔ مثل کا لفظ زائدہ ہے جیسے اس قول میں ہے: لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) (یعنی لیس کھو شیٔ) میں مثل زائدہ ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

فصیروا مثل کعصف ماکول

اس مصرعہ میں بھی مثل زائدہ ہے۔

بقیہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے ابوحمزہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم یہ نہ کہو: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں ہے بلکہ تم کہو: بالذی آمنتم بہ(2)۔ علی بن نصر جہضمی نے شعبہ سے روایت کرنے میں بقیہ کی متابعت کی ہے۔ یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے: اگر وہ تمہارے نبی پر اور تمام انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں جس طرح تم نے تفریق نہیں کی تو وہ ہدایت پا جائیں گے اگر وہ اس کا انکار کریں سوائے تفریق کے وہ دین سے منہ پھیر کر شقاق کی طرف جانے والے ہیں فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: 11) میں کاف زائدہ ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس سے جو قراءت عامہ سے نہی مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حضرت ابن عباس سے تفسیر کے طور پر ہے یعنی اس طرح تاویل کرنی چاہئے۔

بعض نے فرمایا: مثل اپنے معنی پر ہے یعنی نازل شدہ کی مثل اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: و قل آمنت بما انزل اللہ من کتاب اور یہ ارشاد ہے: وَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ (العنکبوت: 46) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ ایمان سے اعراض کریں فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ (وہ مخالفت پر کمر بستہ ہیں) زید بن اسلم نے فرمایا شقاق کا معنی جھگڑا ہے۔ بعض نے فرمایا: شقاق کا معنی جھگڑا کرنا ہے، مخالفت کرنا اور دشمنی کرنا ہے۔ اس کی اصل الشق سے ہے جس کا معنی جانب ہے۔ گویا ہر فریق اپنے مخالف کی دوسری شق (طرف) میں ہوتا ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 163، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ تفسیر طبری، صفحہ 659، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الی کم تقتل العلماء قسراً و تفجر بالشقاق و بالنفاق

ایک اور شاعر نے کہا:

و الا فاعلموا انا وانتم بغاةٌ ما بقینا فی شقاقِ

بعض نے فرمایا: شقاق، مشکل کام سے ماخوذ ہے، دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے پر مشکل پیدا کرنے کا حریص ہوتا ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی طرف سے اس کے دشمن کو کافی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی سے وعدہ ہے کہ وہ ہر معاند و مخالف کی طرف سے مومنین کے ذریعے کفایت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ یہ بنی قینقاع، بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی میں پورا ہوا(2)۔ کاف، ہا، میم محل نصب میں، دونوں مفعول ہیں، اور غیر قرآن میں فسیکفیك ایاھم بھی جائز ہے۔ اس حرف فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا تھا جب وہ شہید ہوئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی خبر دی تھی۔ السَّمِيعُ وہ کہنے والے کی بات کو سننے والا ہے الْعَلِيمُ اپنے بندوں میں جو نافذ کرتا ہے اور ان پر جاری کرتا ہے، حکایت ہے کہ ابودلامہ، منصور کے پاس گیا، اس کے اوپر ایک لمبی ٹوپی تھی اور ان کے کندھوں کے درمیان جبہ کے اوپر فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ لکھا ہوا تھا اور اس کی کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ منصور نے لشکر کو اس لباس کا حکم دیا تھا۔ منصور نے کہا: اے ابودلامہ تیرا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا اے امیر المومنین! بری حالت ہے۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ اس نے کہا: تیرا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کا چہرہ اس کے وسط میں ہو، جس کی تلوار اس کی سرین میں ہو اور کتاب اللہ کو پیٹھ کے پیچھے ڈالا ہوا ہو...... منصور اس پر ہنسا اور اس لباس کو اسی وقت تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''(ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے۔ ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ اخفش وغیرہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا دین ہے یہ ملة سے بدل ہے۔ کسائی نے کہا: یہ اتبعوا کی تقدیر پر منصوب ہے یا اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی الزموا صبغة الله۔ اللہ کے دین کو لازم پکڑو۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تب بھی جائز ہے۔ یعنی ھی صبغة الله۔ شیبان نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: یہود اپنے بیٹوں کو یہودا رنگ کرتے تھے اور نصاریٰ اپنے بیٹوں کو نصاریٰ رنگ چڑھاتے تھے۔ اور اللہ کا رنگ اسلام ہے(3)۔ زجاج نے کہا: یہ دلیل ہے کہ صبغة، ملة سے بدل ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا	2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا	3۔ تفسیر طبری، صفحہ 660، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

مجاہد نے کہا: اس سے مراد فطرۃ الله التی فطر الناس علیھا۔ ابو اسحق نے کہا: مجاہد کا یہ قول اسلام کی طرف راجع ہے کیونکہ فطرۃ مخلوق کی ابتدا ہے، اور جس پر وہ ابتداً پیدا کئے گئے ہیں وہ اسلام ہے۔ مجاہد، حسن، ابو العالیہ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الصبغۃ سے مراد دین ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ نصاریٰ اپنے بچوں کو پانی میں رنگتے تھے اسے وہ معمور یہ کہتے تھے اور کہتے: یہ ان کے لئے تطہیر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نصاریٰ کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا اور اس پر سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں داخل کرتے جسے وہ اس کے لئے معمودیہ کا پانی کہتے تھے وہ اس پانی میں بچے کو رنگتے تاکہ اس کے ساتھ اس کے ختنہ کی جگہ کو پاک کریں کیونکہ ختنہ کرنا تطہیر ہے۔ جب وہ ایسا کر دیتے تو کہتے اب یہ پکا نصرانی ہو گیا ہے۔ الله تعالیٰ نے ان کا اس پر رد فرمایا۔

ارشاد ہوا: صِبْغَةَ اللّٰهِ یعنی الله کا رنگ بہتر رنگ ہے اور وہ اسلام ہے۔ دین کو استعارۃً اور مجازاً صبغۃ کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور دیندار پر اس کی نشانی واضح ہوتی ہے جس طرح کپڑے پر رنگ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض شعراء ملوک ہمدان نے کہا:

و کل أناس لهم صبغة　　و صبغة همدان خير الصبغ

صبغنا على ذاك ابناءنا　　فاكرم بصبغتنا فى الصبغ

تمام لوگوں کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے اور ہمدان کا رنگ بہتر رنگ ہے۔ ہم نے اس پر اپنے بیٹوں کو رنگ کیا اور رنگوں میں کتنا بہتر ہمارا رنگ ہے۔

بعض نے فرمایا: الصبغۃ سے مراد غسل کرنا ہے اس کے لئے جو اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ نصاریٰ کے معمودیہ کا یہ بدل ہے۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر کافر کا غسل کرنا واجب ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2: صِبْغَةَ اللّٰهِ کا معنی ہے: تم اسلام قبول کرنے کے وقت وہ غسل کرو جو الله تعالیٰ نے تم پر واجب کیا ہے۔ اس معنی میں قیس بن عاصم اور ثمامہ بن آثال کی احادیث بھی آئی ہیں جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ابو حاتم بستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ ثمامہ حنفی کو قید کیا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اسلام قبول کیا۔ اسے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے ساتھی کا اسلام خوبصورت ہے (1)۔

حضرت قیس بن عاصم سے مروی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا (2)۔ یہ حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الله کی قربت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارت، باب الکافر فیغتسل، صفحہ 171، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ سنن نسائی، کتاب الطہارت، ذکر ما یوجب الغسل و ما لا یوجبه، حدیث نمبر 188، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو صبغہ کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے "المجمل" میں یہ حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ بعض نے فرمایا: صبغۃ سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو ختنہ پر صبغہ جاری ہوا کیونکہ بچوں کو پانی میں رنگا جاتا تھا۔ یہ فراء کا قول ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝۱۳۹

"آپ فرمایئے کیا تم جھگڑے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک، اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں"۔

حسن نے کہا: ان کا جھگڑنا یہ تھا کہ انہوں نے کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں کیونکہ ہمارے آباء اور ہماری کتب مقدم ہیں۔ اور اس لئے کہ ہم نے بتوں کی عبادت نہیں کی۔ آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہو: یعنی ان یہود ونصاریٰ کو کہو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تم سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریبی ہیں اپنے آباء اور اپنی کتب کے مقدم ہونے کی وجہ سے، اس میں دین کی تقدیم کی کیا تاثیر ہے (1)۔ فِي اللّٰهِ کا معنی ہے: اللہ کے دین میں، اس کے قرب میں۔

اکثر قراء کی قراءت اتحاجوننا ہے ایک جنس کے دو متحرک حروف کا اجتماع جائز ہے۔ کیونکہ دوسرا حرف منفصل کی طرح ہے۔ ابن محیصن نے اتحاجونا ایک جیسے حروف کے اجتماع کو ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے لیکن اکثر علماء کے قول کے مخالف ہے۔ اتحاجون دوسرے نون کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے جس طرح نافع نے فبم تبشرون پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یعنی عبادت میں مخلص ہیں۔ اس میں توبیخ کا معنی ہے یعنی تم مخلص نہیں ہو پھر تم کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں۔ اخلاص کا معنی ہے مخلوق کے ملاحظہ سے فعل کو پاک اور صاف کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں بہتر شریک ہوں۔ پس جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا (کسی عمل میں) تو وہ عمل میرے شریک کے لئے ہے۔ اے لوگو! اپنے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر وہ جو اس کے لئے خالص ہو، اور یہ نہ کہو کہ یہ اللہ کے لئے ہے اور رحم کے لئے ہے۔ پس وہ رحم (صلہ رحمی) کے لئے ہے اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے اور یہ نہ کہو: یہ اللہ کے لئے اور تمہارے مونہوں کے لئے ہے۔ وہ تمہارے مونہوں کے لئے ہے، اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے (2)۔ یہ حضرت ضحاک بن قیس الفہری نے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... آگے یہ حدیث ذکر کی ہے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ رویم نے کہا: اخلاص یہ ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 216، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ سنن دارقطنی، باب النیہ، صفحہ 51، جلد 1 (دار المحاسن)

کہ آدمی اس عمل پر دارین میں عوض نہ چاہتا ہو نہ فرشتوں سے کوئی حصہ چاہتا ہو۔

جنید نے کہا: اخلاص بندے اور الله کے درمیان راز ہے جسے فرشتہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اسے لکھ لے...... اور نہ شیطان جانتا ہے کہ وہ اسے خراب کر دے۔ اور نہ خواہش جانتی ہے کہ وہ اسے مائل کر دے۔ ابو القاسم قشیری وغیرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے جبریل امین سے پوچھا: اخلاص کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے الله رب العزت سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے میں اسے اپنے بندوں میں سے اس کے دل میں رکھتا ہوں جسے میں پسند کرتا ہوں (1)۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

”کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم واسماعیل واسحٰق ویعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی۔ فرمایئے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا الله اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو الله کی طرف سے اس کے پاس ہے اور الله بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تَقُوْلُوْنَ یہ بمعنی قالوا ہے۔ حمزہ، کسائی اور عاصم نے اور ایک روایت میں حفص نے تقولون تاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ کلام مفصل ہے۔ گویا معنی ہے: کیا تم الله کے دین کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو یا تم کہتے ہو انبیاء کرام تمہارے دین پر تھے۔ یہ ام متصلہ ہے اور جنہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی قراءت پر ام منقطعہ ہے، پس یہ دو کلام ہوں گے۔ اور ام بمعنی بل ہو گا۔

هُوْدًا یہ کان کی خبر ہے اور ان کی خبر جملہ میں ہے اور غیر قرآن میں هُوْدًا کو رفع اِنّ کی خبر کی حیثیت سے جائز ہے اور کان ملغہ ہو گا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ یہ تقریر اور ان کے دعویٰ پر توبیخ ہے کیونکہ وہ یہود یا نصاریٰ تھے۔ پس الله تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ انہیں تم سے زیادہ جانتا ہے یعنی تم یہود و نصاریٰ نہ تھے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ یہ لفظاً استفہام ہے اور معنی ہے زیادہ ظالم نہیں ہے۔ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً مطلب یہ ہے کہ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کرام اسلام پر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت سے چھپایا تھا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

سیاق کلام کے اعتبار سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یہ وعید ہے اور آگاہ کرنا ہے کہ اس

1۔ اتحاف السادۃ المتقین، صفحہ 104، جلد 13 (دار الکتب العلمیہ)

کا معاملہ اللہ تعالیٰ رائیگاں نہیں چھوڑے گا بلکہ انہیں ان کے اعمال پر جزا دے گا۔ غافل وہ ہوتا ہے جو امور کو جانتا نہیں ہے ان سے غفلت کی وجہ سے۔ یہ الارض الغفل سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ زمین ہوتی ہے جس میں کوئی علامت نہیں ہوتی اور عمارت کا کوئی اثر نہیں ہوتا (1)۔ ناقۃ غفل ایسی اونٹنی جس کی علامت نہ ہو۔ رجل غفل جو امور کا تجربہ نہ رکھتا ہو۔ کسائی نے کہا: ارض غفل، جس پر بارش نہ ہو۔ غفلت عن الشئ غفلۃ و غفولاً و اغفلت الشئ۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس آیت کو دوبارہ ذکر فرمایا کیونکہ یہ تہدید و تخویف کا معنی ضمن میں لیے ہوئے ہے یعنی جب یہ انبیاء اپنی امامت اور فضل کے باوجود اپنے کسب کی جزا پائیں گے تو تم اس کے زیادہ لائق ہو۔ پس تاکید واجب تھی اس لئے اس کا تکرار فرمایا (2)۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ فرمائیے: اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف''۔

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ مومنین کے شام سے کعبہ کی طرف پھرنے میں وہ کہیں گے کہ انہیں کس چیز نے پھیرا ہے (3)۔ اور سَيَقُوْلُ بمعنی قال ہے اور ماضی کی جگہ مضارع کو رکھا تاکہ اس کی ہمیشگی پر دلالت کرے اور وہ اس قول پر ہمیشہ رہیں گے۔ مِنَ النَّاسِ کے قول کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بے وقوف جمادات و حیوانات میں بھی ہوتے ہیں اور السُّفَهَآءُ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے ما ولاھم کہا۔ السُّفَهَآءُ جمع ہے اس کا واحد سفیہ ہے جس کی عقل کم ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے ثوبٌ سفیہ جب کپڑا کمزور بنا ہوا ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور النساء سفانہ استعمال ہوتا ہے۔ المورج نے کہا: السفیہ وہ ہوتا ہے جو بہت زیادہ بہتان لگانے والا ہو، جھوٹ بولنے والا ہو اور اپنے علم کے خلاف کا ارادہ کرنے والا ہو۔ قطرب نے کہا: السفیۃ سے مراد بہت زیادہ ظلم کرنے والا، جاہل ہے۔ السُّفَهَآءُ سے مراد یہاں مدینہ طیبہ کے یہود ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا منافقون ہیں۔ زجاج نے کہا: قریش کے کفار ہیں جب انہوں نے تحویل قبلہ کا انکار کیا تو کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کی جگہ کا اشتیاق رکھتا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 217، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 218، جلد 1

ہے۔عن قریب تمہارے دین کی طرف لوٹ آئے گا، یہود نے کہا: اس پر معاملہ ملتبس ہو گیا ہے اور یہ حیران ہے۔ منافقوں نے کہا: **مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ** اور مسلمانوں سے استہزاء کیا۔ **وَلّٰىهُمْ** کا معنی ہے: انہیں پھیر دیا۔

مسئلہ نمبر 2: ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ امام مالک کے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لوگ صبح کی نماز میں قباء میں تھے اچانک ایک آنے والا آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آج رات قرآن نازل ہوا ہے اور انہیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تم کعبہ کی طرف منہ کر لو۔ ان صحابہ کے چہرے پہلے شام کی طرف تھے تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے (1)۔ امام بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ ماہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ پسند فرماتے تھے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور صحابہ کرام نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں ایک کسی اور مسجد والوں کے پاس سے گزرا جبکہ وہ رکوع میں تھے تو اس نے کہا: میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو وہ صحابہ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور شہید ہو گئے تھے ہم نہیں جانتے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ** (البقرہ: 143) (2) اس روایت میں نماز عصر کا ذکر ہے۔

امام مالک کی روایت میں صبح کی نماز کا ذکر ہے، بعض علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں نازل ہوا تھا جبکہ آپ ظہر کی نماز میں دو رکعت پڑھ چکے تھے تو آپ نماز میں ہی پھر گئے تھے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے (3)۔ ابو الفرج نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عباد بن نہیک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ ابو عمر نے ''التمہید'' میں حضرت نویلہ بنت اسلم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور یہ مبایعات (بیعت کرنے والیوں) میں سے تھیں فرماتی ہیں: ہم ظہر کی نماز میں تھے۔ عباد بن بشر بن قیظی آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کر لیا ہے یا کہا: بیت حرام کی طرف منہ کر لیا ہے۔ پس مرد عورتوں کی جگہ پھر گئے اور عورتیں، مردوں کی جگہ پھر گئیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نماز کے علاوہ حالت میں نازل ہوئی۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ کعبہ کی طرف پہلی نماز، نماز عصر پڑھی گئی۔ واللہ اعلم

روایت ہے کہ جب قبلہ کی تحویل ہوئی تو پہلی نماز جس نے کعبہ کی طرف پڑھی وہ ابو سعید بن معلّی تھے۔ حضرت ابو سعید مسجد سے گزر رہے تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ منبر پر لوگوں کو تحویل قبلہ کے بارے خطبہ دے رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے: **قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ** (البقرہ: 144) حتیٰ کہ آپ آیت سے فارغ ہوئے تو میں (ابو سعید) نے اپنے ساتھی سے کہا: آؤ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر سے اترنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پس ہم پہلے کعبہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب القبلۃ، باب ما جاء فی القبلہ، صفحہ 182 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ سیقول السفہاء من الناس، حدیث 4126، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 172، جلد 1 (دار الفکر)

کی طرف نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ پس ہم نے جانوروں کو چھپا دیا اور ہم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر رسول الله ﷺ اترے اور اس دن آپ نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابو عمر نے کہا ابو سعید بن معلٰی کے لئے اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے حالانکہ سورۂ فاتحہ کی فضیلت میں کنت اصلی والی حدیث موجود ہے (1) جو بخاری نے نقل کی ہے، یہ پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: مدینہ طیبہ تشریف لانے کے کتنے عرصہ بعد تحویل قبلہ ہوا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: سولہ ماہ بعد یا سترہ ماہ بعد قبلہ تبدیل ہوا (2)۔ جیسا کہ بخاری میں ہے۔ دار قطنی نے بھی یہ حدیث حضرت براء سے نقل کی ہے۔ فرمایا: ہم نے رسول الله ﷺ کے مدینہ طیبہ آنے کے بعد سولہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر الله تعالیٰ نے اپنے نبی کی خواہش دیکھی تو یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (3) اس روایت میں بغیر شک کے سولہ ماہ کا ذکر ہے۔ مالک نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن مسیب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ تحویل قبلہ غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ ابراہیم بن اسحاق نے کہا ہجرت کے دوسرے سال رجب میں قبلہ کی تبدیلی ہوئی تھی۔ ابو حاتم بستی نے کہا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ ماہ اور تین دن متواتر نماز پڑھی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ بارہ ربیع الاول کو آئے تھے۔ الله تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم منگل کے دن پندرہ شعبان کو دیا تھا

مسئلہ نمبر 4: علماء کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کیفیت میں تین مختلف اقوال ہیں:

۱۔ حسن نے کہا کہ یہ رائے اور اجتہاد سے تھا۔ عکرمہ اور ابو العالیہ کا یہ قول ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کو بیت المقدس اور کعبہ کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو آپ نے یہود کے ایمان لانے اور ان کے مائل کرنے کے لئے بیت المقدس کو اختیار فرمایا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مشرکین کی آزمائش کے لئے بیت المقدس کی طرف منہ کیا کیونکہ وہ کعبہ سے الفت رکھتے تھے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے، یہ جمہور کا قول ہے اور حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ الله تعالیٰ کے امر اور اس کی وحی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا پھر الله تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اور جمہور نے الله تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ الآیۃ (اور نہیں مقرر کیا ہم نے بیت المقدس کو قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں)۔

مسئلہ نمبر 5: اس میں اختلاف ہے کہ جب ابتدا میں نماز مکہ میں فرض ہوئی تو کیا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا یا مکہ کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا: بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا اور مدینہ طیبہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب فضل الفاتحہ، حدیث نمبر 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، ولکل وجهة موليها، حدیث نمبر 4132، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دار قطنی، باب تحویل الی الکعبہ، صفحہ 273، جلد 1 (دار صادر)

میں بھی سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف قبلہ پھیر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ابتدا میں نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھنا فرض کی گئی تھی آپ مکہ میں رہائش کے درمیان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نماز تھی۔

جب آپ مدینہ طیبہ آئے تو سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ ابو عمر نے کہا: یہ میرے نزدیک اصح قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ آئے تو آپ نے یہود کی الفت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ یہ چیز ان کو اسلام کی طرف بلانے کا باعث ہو جب ان کا عناد ظاہر ہوا اور آپ ان سے مایوس ہو گئے تو آپ نے کعبہ کی طرف پھرنا پسند کیا۔ آپ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور آپ کی محبت کعبہ کی طرف تھی کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ عربوں کو اسلام کی طرف بلانے کا زیادہ باعث تھا۔ بعض نے فرمایا: اس میں یہود کی مخالفت تھی، یہ مجاہد سے مروی ہے(1)۔ ابو العالیہ الریاحی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد اور ان کا قبلہ کعبہ تھا، فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کعبہ کی طرف صخرہ کی جانب نماز پڑھتے تھے (2) یہ تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

مسئلہ نمبر 6: اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ناسخ و منسوخ ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے مگر جس نے علیحدہ راہ اختیار کی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ قبلہ اول قرآن سے منسوخ کیا گیا اور یہ دو مرتبہ منسوخ ہوا۔ ایک قول کے مطابق جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: یہ آیت قرآن کے ساتھ سنت کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، جبکہ یہ قرآن میں حکم نہیں تھا اور یہ حکم سنت کی جہت سے تھا پھر یہ قرآن کے ساتھ منسوخ ہوا اور اس اعتبار سے کنت علیھا بمعنی انت علیھا ہوگا۔

مسئلہ نمبر 8: اس میں خبر واحد کے ساتھ قطعی علم کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا صحابہ کے نزدیک قطعی تھا پھر اہل قباء کے پاس آنے والا آیا اور انہیں بتایا کہ قبلہ مسجد حرام کی طرف پھر گیا ہے، تو انہوں نے اس کا قول قبول کیا اور وہ کعبہ کی طرف پھر گئے پس خبر واحد کے ساتھ انہوں نے متواتر کو ترک کر دیا حالانکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

علماء کا اس کے عقلاً جواز میں اور اس کے وقوع میں اختلاف ہے۔ ابو حاتم نے کہا: مختار اس کا عقلاً جواز ہے اگر اس کے ساتھ شرع مکلف کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قباء کے قصہ کی دلیل کے ساتھ اس کا وقوع بھی ہوا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو کسی علاقہ کا والی بنا کر بھیجتے تھے اور وہ ناسخ و منسوخ کا حکم پہنچاتے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ممنوع ہے کیونکہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن اور متواتر معلوم، خبر واحد کے ساتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ سلف و خلف میں سے کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہیں ہے اور جو منع کرتے ہیں انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ چیز

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

محال تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے ظن کے ساتھ قطعی امر کو اٹھانا۔ رہا اہل قبا کا قصہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا والی بھیجنا وہ علم کے افادہ کے قرائن پر یا تو نقلاً اور تحقیقاً محمول ہے یا احتمالاً اور تقدیراً اس سوال وجواب کی مکمل تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اس میں دلیل ہے کہ جس کو ناسخ نہ پہنچا ہو تو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے، بخلاف اس کے جس نے کہا کہ پہلا حکم ناسخ کے وجود کے ساتھ ساتھ اٹھ جاتا ہے نہ کہ علم کے ساتھ۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اہل قبا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ آنے والا آیا اور اس نے انہیں ناسخ کے متعلق بتایا تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ پس ناسخ کا وجود پایا گیا تو وہ لامحالہ اٹھانے والا ہے لیکن اس کے علم کی شرط کے ساتھ۔ لیکن ناسخ خطاب ہے اور وہ اس کے حق میں خطاب نہیں ہوتا جسے خطاب نہ پہنچا ہو۔ اس اختلاف کا فائدہ عبادات میں ظاہر ہوتا ہے جو نسخ کے بعد ادا کی گئیں اور نسخ کے پہنچنے سے پہلے ادا کی گئیں، کیا ان کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟ اسی پر مبنی ہے وکیل کے تصرف کا مسئلہ جو مؤکل کے معزول کرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا مؤکل کے مرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا اسے علم پہنچنے سے پہلے تصرف کرتا ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں: اسی طرح مضاربت کا مسئلہ ہے اور حاکم جس کو والی بنائے جب وہ مر جائے یا معزول کیا گیا ہو تو صحیح یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کا فعل نافذ ہوگا اور اس کا حکم رد کیا جائے گا۔ قاضی عیاض نے کہا: اس شخص کے احکام میں کوئی اختلاف نہیں جس کو آزاد کیا گیا ہو اور اسے آزادی کا علم نہ ہو اس کے اور لوگوں کے درمیان احکام آزاد والے ہوں گے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس کے احکام جائز ہوں گے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ آزاد کی گئی عورت آزادی کے بعد پڑھی گئی نماز جو اس نے بغیر ستر کے، آزادی کے علم سے پہلے پڑھی تھی اس کا اعادہ نہیں کرے گی۔ انہوں نے اختلاف کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس پر کوئی ایسا موجب طاری ہو جو اس کی عبادت کے حکم کو تبدیل کردے جب کہ وہ اس کی عبادت میں ہو، قبا کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے۔ پس جس نے ایک حال پر نماز پڑھی پھر نماز مکمل کرنے سے پہلے اس کی وہ حالت بدل گئی تو وہ اپنی نماز کو مکمل کرے اور توڑے نہیں اور اس کی پہلی نماز ہو چکی ہے۔ اسی طرح جس نے برہنہ نماز پڑھی پھر نماز کے اندر ہی اسے کپڑا مل گیا یا حالت صحت میں نماز شروع کی پھر وہ مریض ہو گیا یا مریض تھا پھر صحیح ہو گیا یا بیٹھا تھا پھر قیام پر قادر ہو گیا یا لونڈی نماز کے اندر ہی آزاد ہو گئی تو وہ اپنا پردہ لے لے اور سابقہ نماز پر بناء کرے۔

میں کہتا ہوں: جیسے کوئی تیمم کر کے نماز میں داخل ہوا پھر اس نے پانی پالیا تو وہ نماز کو نہ توڑے جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ نماز توڑ دے یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں خبر واحد کے قبول پر دلیل ہے اور اس پر سلف کا اجماع ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت سے تواتر کے ساتھ معلوم ہے کیونکہ آپ والیوں کو اور مبلغین کو بھیجتے تھے جو ایک ایک ہوتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر ونواہی بتائیں۔

مسئلہ نمبر 11: اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا رہا اور ایک حال کے بعد دوسرے حال میں ضرورت کے مطابق اترتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ

لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ:3)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ حجت قائم فرمائی یعنی مشارق و مغارب کی ملکیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس اس کے لائق ہے جس جہت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف ہدایت دی۔ الصراط سے مراد راستہ ہے المستقیم جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

”اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں۔ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان اور رحم فرمانے والا ہے“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کعبہ زمین کے درمیان ہے اسی طرح تمہیں امت وسط بنایا یعنی تمہیں انبیاء سے کم درجہ اور دوسری امتوں سے بلند درجہ بنایا۔ الوسط کا مطلب العدل ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اچھی چیز درمیانی چیز ہوتی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے تحت روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدلاً یعنی وسط سے مراد عدل ہے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ قرآن میں ہے: قال اوسطھم یعنی درمیان والے اور بہتر شخص نے کہا۔ زہیر نے کہا:

هم وسط يرضى الانام بحكمهم　　اذا نزلت احدى الليالى بمعظم (2)

ایک اور شاعر نے کہا:

انتم اوسط حي علموا　　بصغير الامر او احدى الكبر

ایک اور شاعر نے کہا:

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ بقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (وزارت تعلیم)　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

لا تذھبنّ فی الامور فرطا　　لا تسألنّ ان سألت شططا

وکن من الناس جمیعاً وسطاً

ان تمام اشعار میں وَّسَطًا بہتر اور عمدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وسط الوادی وادی کی بہتر جگہ کو کہتے ہیں جس میں گھاس اور پانی زیادہ ہو۔ جب وسط میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی تو وہ محمود ہوتا ہے۔ یعنی اس امت میں نہ تو نصاریٰ کا غلو ہے جو وہ انبیاء کرام کے بارے کرتے تھے اور نہ یہود کی طرح کوتاہی ہے جو وہ انبیاء کی شان میں کرتے تھے۔ حدیث پاک میں ہے: خیر الامور اوسطھا۔(1) بہتر کام اچھا کام ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: علیکم بالنمط الاوسط۔ تم پر بہتر جماعت کو پکڑنا لازم ہے۔ بہتر جماعت وہ ہوتی ہے، بلند جس کی طرف اترتا ہے اور نیچے والا اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ فلان من اوسط قومہ، فلاں اپنی قوم سے بہتر ہے۔ وانہ لواسطۃ قومہ ووسط قومہ۔ یعنی وہ اپنی قوم سے بہتر ہے ان میں سے اہل حسب میں سے ہے۔ قد وسط وساطۃ وسطہ۔ الوسط سے نہیں ہے جو دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے الوسط (سین کے سکون کے ساتھ) ظرف ہے تو کہتا ہے: صلیت وسط القوم، جلست وسط الدار کیونکہ یہ اسم ہے۔ جوہری نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں بین رکھنا صحیح ہو وہاں وسط ہوگا اور اگر جہاں بین رکھنا صحیح نہ ہو تو وہ وسط (حرکت کے ساتھ) ہوگا اور کبھی سین کو ساکن کیا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّتَكُوْنُوْا لام کی کی وجہ سے منصوب ہے یعنی لان تکونوا۔ شھداء، کان کی خبر ہے۔ عَلَى النَّاسِ یعنی محشر میں امتوں کے خلاف انبیاء کے گواہ بنو، جیسا کہ بخاری میں حضرت ابوسعید خدری سے ثابت ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ وہ کہیں گے: لبیك وسعدیك یا رب۔ اے رب! میں حاضر ہوں، تیری سعادت سے سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نے پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا، کیا اس نے تمہیں پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری گواہی کون دے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کہیں گے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت۔ پس یہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کی تھی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔(2)

ابن مبارک نے اس حدیث کو طویل ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے: امتیں کہیں گی وہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دیں گے جنہوں نے ہمیں پایا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم ان کے خلاف کیسے گواہی دو گے جن کو تم نے پایا ہی نہیں۔ امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری طرف تو نے رسول مبعوث فرمایا، ہماری طرف تو نے اپنا عہد اور اپنی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب صلاۃ الخوف، صفحہ 273، جلد 3 (دار الفکر)

2۔ صحیح بخاری، باب وکذالك جعلناکم امۃ وسطاً صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کتاب نازل فرمائی، تو نے خود ہم پر بیان کیا کہ انہوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ پس جو تو نے ہمیں عہد دیا تھا اس کی بنا پر ہم نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: انہوں نے سچ کہا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا . . . الوسط سے مراد عدل ہے...... لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابن انعم نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قیامت کے روز حضرت محمد ﷺ کی امت گواہی دے گی مگر وہ گواہی نہیں دے گا جس کے دل میں اپنے بھائی کے بارے میں عداوت ہوگی (1)۔ ایک طائفہ نے کہا آیت کا معنی ہے: بعض بعض کے مرنے بعد گواہی دیں گے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب آپ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو اس پر خیر سے تعریف کی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس پر واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ حضرت عمر نے عرض کی: میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان ہوں۔ جنازہ گزرا اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی تم نے خیر کے ساتھ تعریف کی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی اس کے لئے آگ واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو (2)۔ بخاری نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ بخاری اور مسلم کے علاوہ میں کئی طرق میں ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابان اور لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا کی گئی ہیں جو سوائے انبیاء کے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا تو اسے فرمایا: مجھ سے دعا مانگ میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس (میری) امت کو فرمایا اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اور جب کسی نبی کو بھیجا تو اسے فرمایا: تم پر دین میں کوئی حرج نہیں اور اس امت کو بھی فرمایا: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر شہید بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس حدیث کو حکیم ابو عبداللہ نے ''نوادر الاصول'' میں نقل کیا ہے (☆)۔

مسئلہ نمبر 3: ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں اپنے خاص فضل سے آگاہ فرمایا کہ اس نے ہمیں عدالت کے اسم سے موسوم فرمایا اور تمام مخلوق پر گواہی کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس نے مرتبہ کے اعتبار سے ہمیں اول بنایا اور زمانہ کے اعتبار سے آخر بنایا جس طرح فرمایا: نحن الآخرون الاولون۔ (3) ہم زمانہ کے اعتبار سے آخری ہیں اور مرتبہ کے

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 15، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)　2۔ صحیح مسلم، باب فی وجوب الجنۃ والنار بشہادۃ، صفحہ 308، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً، کتاب الجمعہ، صفحہ 282، جلد 2　☆ نوادر الاصول، صفحہ 391

اعتبار سے اوّل ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ عادل ہی صرف گواہی دیں گے غیر پر غیر کا قول نافذ نہ ہوگا مگر جب کہ وہ عادل ہو۔ عدالت کا بیان اور اس کا حکم ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں اجماع کی صحت اور اس کے ساتھ حکم کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ جب وہ عادل ہوں گے وہ لوگوں پر گواہی دیں گے، ہر ہر زمانہ کے لوگ بعد والوں پر گواہ ہیں۔ صحابہ کا قول تابعین پر حجت اور شاہد ہے اور تابعین کا قول بعد والوں پر حجت ہے۔ جب امت شہداء (گواہ) ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہے۔ اس شخص کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جس نے کہا کہ اس سے پوری امت مراد ہے کیونکہ پوری امت کا اجماع تو قیامت تک ثابت نہ ہوگا۔ اصول فقہ کی کتب میں اس کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے قیامت کے روز رسول مکرم ﷺ تمہارے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بمعنی لکم ہے یعنی تمہارے لئے ایمان کی گواہی دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تمہارے لئے تم پر تبلیغ کی گواہی دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ بعض علماء نے فرمایا: یہاں قبلہ سے قبلہ اولیٰ مراد ہے کیونکہ فرمایا كُنْتَ عَلَیْهَاۤ بعض نے فرمایا: دوسرا قبلہ مراد ہے اور کاف زائدہ ہے یعنی انت الآن علیها جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) یعنی انتم خیر امۃ۔ یہ بعض علماء کا قول ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لِنَعْلَمَ کا معنی ہے لنری۔ (ہم دیکھ لیں) اور عرب رؤیت کی جگہ علم کو اور علم کی جگہ رؤیت کو استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (الفیل: 1) اس میں اَلَمْ تَرَ بمعنی الم تعلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مگر تا کہ تم جان لو کہ ہم جانتے ہیں کیونکہ منافقین شک میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے پائے جانے سے پہلے انہیں جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہم یقین والوں کو شک کرنے والوں سے ممتاز کر دیں۔ یہ ابن فورک نے بیان کیا ہے اور طبری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ نبی مکرم ﷺ اور آپ متبعین جان لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی جس طرح کہا جاتا ہے، امیر نے ایسا کیا حالانکہ وہ کام اس کے متبعین نے کیا ہوتا ہے۔ یہ مہدوی نے بیان کیا ہے اور عمدہ قول ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ حضرت محمد ﷺ جان لیں۔ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی تخصیص اور تفضیل کے لئے جس طرح اپنے اس ارشاد میں اپنی ذات کی طرف اشارہ فرمایا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی (1)۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے کیونکہ اس کا معنی معاینۃ کا علم ہے جو جزا کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ کسی چیز کے پائے جانے سے پہلے بھی اسے جانتا ہے۔ معلومات پر احوال مختلف ہوتے ہیں اور اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب عیادۃ المریض، صفحہ 318، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کا علم مختلف نہیں ہوتا بلکہ تمام کے ساتھ ایک تعلق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جو اس معنی کی آیات موجود ہیں ان کا یہی معنی ہے مثلاً وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران: 140)، وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ (محمد: 31)۔ (یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے کچھ شہید اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تا کہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں) اور اس کے مشابہ آیات۔

یہ آیت قریش کے قول مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا کا جواب ہے قریش کعبہ سے محبت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر مالوف سے آزمایا تا کہ ظاہر ہو جائے جو رسول کی اتباع کرتا ہے اس سے جو اتباع نہیں کرتا۔ زہری نے الا لِيُعْلَمَ پڑھا ہے۔ اس قراءت میں مَنْ محل رفع میں ہوگا کیونکہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے اور جمہور کی قراءت پر مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے يَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ یعنی استقبال قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ یعنی جو اس کے دین سے مرتد ہوتا ہے۔ کیونکہ قبلہ جب تبدیل ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ مرتد ہو گئے تھے اور ایک قوم منافق ہو گئی تھی۔ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً یعنی قبلہ تبدیل ہونا بہت بڑا تھا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا یہ قول ہے۔ عربی میں تقدیر یوں ہوگی۔ وان كانت التحويلة۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً۔ فراء کا خیال ہے: اِنْ اور لام، بمعنی ما اور الا ہے۔ بصری کہتے ہیں: ان ثقیلۃ کو مخففہ کیا گیا ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی قبلہ، یا تحویلہ یا تولیہ بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ یعنی اس نے ہدایت کو پیدا کیا۔ اس سے مراد دلوں میں ایمان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (مجادلہ: 22)۔ یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ علماء کا اتفاق ہے یہ ان کے متعلق نازل ہوئی جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت براء بن عازب کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہو گا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن (1)، صحیح ہے۔ نماز کو ایمان کہا گیا ہے کیونکہ یہ نیت، قول اور عمل پر مشتمل ہے۔

امام مالک نے فرمایا میں اس آیت کے ساتھ مرجئۃ کا قول ذکر کرتا ہوں کہ جو کہتے ہیں کہ نماز، ایمان میں سے نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یعنی قبلہ کی طرف متوجہ ہونے اور اپنے نبی کی تصدیق کی وجہ سے تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کی اکثریت اور اصولیین کا نظریہ یہی ہے۔

1۔ جامع ترمذی، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ابن وہب، ابن قاسم، ابن عبد الحکم اور اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ فرمایا: ایمان سے مراد نماز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، الرأفۃ، رحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: الرأفۃ اکثر من الرحمۃ۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں اس کا لغوی معنی، اس کے اشعار اور معانی کا ذکر کیا ہے۔ کوفیوں اور ابو عمرو نے لَرَؤُف، فَعُل کے وزن پر پڑھا ہے یہ بنی اسد کی لغت ہے۔ اسی سے ولید بن عقبہ کا قول ہے:

و شر الطالبين فلا تكنه　　يقاتل عمه الرَؤُف الرحيم

کسائی نے حکایت کیا ہے کہ بنی اسد کی لغت فَعْل کے وزن پر لَرَأْف ہے۔ ابو جعفر بن القعقاع نے لروف بغیر ہمزہ کے ثقیل پڑھا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ میں ہر ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے جو ساکن ہے یا متحرک ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف اور بے شک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں''۔

علماء نے فرمایا: یہ آیت، سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ کے قول پر نزول کے اعتبار سے مقدم ہے۔ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ کا معنی ہے: تیرا آسمان کی طرف اپنا چہرہ پھیرنا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: آسمان کی طرف آپ کا نظریں پھیرنا۔ دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ السماء کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ یہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کی تعظیم کے ساتھ مختص ہے اور آسمان سے نازل ہوتی ہے مثلاً بارش، رحمت اور وحی۔ ترضاھا یعنی آپ جس کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو پسند فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ۔

ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی طرف منہ کرنا پسند کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (1) اس کا معنی اور اس پر کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

1۔ صحیح بخاری، باب سیقول السفھاء من الناس، صفحہ 644، جلد 2 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَوَلِّ یہ امر کا صیغہ ہے۔ شَطْرَ سے مراد طرف ہے الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مراد کعبہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پورے کعبہ کے سامنے ...... یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: کعبہ کے پرنالہ کے سامنے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ اور میزاب یہ مدینہ طیبہ اور اہل شام کا قبلہ ہے اور اہل اندلس کا قبلہ ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن جریج نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت اللہ اہل مسجد کے لئے قبلہ ہے اور مسجد اہل حرم کے لئے قبلہ ہے اور حرم، میری امت کے مشرق و مغرب میں رہنے والے اہل زمین کا قبلہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، الشطر کے کئی محمل ہیں۔ طرف، جہت جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ یہ ظرف مکان ہے جیسے تو کہتا ہے: تلقاءہ وجھتہ۔ ظرف کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے یہ مفعول بہ کے قائم مقام ہے، فعل اس میں واقع ہوا ہے۔ داؤد بن ابی ہند نے فرمایا: حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے: فول وجھك تلقاء المسجد الحرام شاعر نے کہا:

اقول لام زنباع اقیمی صدور العیس شطر بنی تمیم

ایک اور شاعر نے کہا:

و قد اظلکم من شطرِ ثغرکم ھول له ظلم یغشا کم قطعاً

ایک اور شاعر نے کہا

الا من مبلغ عمراً رسولاً و ما تغنی الرسالة شطر عمرو

اور شطر الشی کا معنی ہے: اس کا نصف۔ اسی سے حدیث ہے: الطھور شطر الایمان (3)۔ طہارت ایمان کا نصف ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: شطر الی کذا جب کوئی کسی چیز کی طرف متوجہ ہو۔ شطر عن کذا جب کسی سے اعراض کیا گیا ہو۔ شاطر اس شخص کو کہتے ہیں جو ٹیڑھی راہ اختیار کرے اور وہ اپنے اہل کو خست کی وجہ سے عاجز کر دے۔ شطَرَ و شطُرَ شطارۃً۔ بعض علماء سے شاطر کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جو اس کام کو اختیار کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ہر افق میں کعبہ قبلہ ہے اور اس پر اجماع ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو اس پر عین قبلہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ اگر اس نے اس کا استقبال ترک کر دیا جبکہ وہ کعبہ کو دیکھنے والا تھا اور اس کی جہت کا عالم تھا تو اس کی نماز نہ ہوگی جو اس نے نماز پڑھی ہوگی اس کا اعادہ لازم ہوگا۔ ابو عمرو نے ذکر کیا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جو کعبہ سے غائب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 222، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 10، جلد 2 (دار الفکر)

3۔ صحیح مسلم، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے وہ کعبہ کی طرف منہ کرے، اگر اس پر کعبہ کی جہت مخفی ہو تو ستاروں، ہواؤں، پہاڑوں وغیرہ سے استدلال کرے اور جو مسجد حرام میں بیٹھا ہو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہونا چاہئے اور اس کی طرف ایمان اور ثواب کی نیت سے دیکھے۔ روایت ہے کہ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے (1)۔ عطا اور مجاہد کا یہ قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں اختلاف ہے غائب کا عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے یا جہت کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے؟ بعض علماء کا پہلا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ ایسی تکلیف ہے جس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض نے جہت کا قول کیا ہے۔ یہ تین وجوہ سے صحیح ہے: (۱) ممکن وہ ہے جس کے ساتھ تکلیف مرتب ہو۔ (۲) قرآن میں اس کا حکم ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ۔ یعنی زمین کے مشرق یا مغرب میں ہو فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (۳) علماء نے لمبی صف سے حجت پکڑی ہے جو قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ بیت اللہ کی عرض سے دگنی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اس آیت میں امام مالک اور ان کے موافق قول کرنے والوں کے نظریہ کی واضح حجت ہے کہ نمازی سامنے دیکھے، سجدہ کی جگہ نہ دیکھے۔ ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، حسن بن حی نے کہا: اپنے سجدہ کی جگہ کی طرف دیکھے۔ شریک قاضی نے کہا: قیام میں سجدہ کی طرف دیکھے اور رکوع میں قدموں کی طرف دیکھے اور سجدہ میں اپنے ناک کی جگہ کی طرف دیکھے اور قعدہ میں اپنی گود کی طرف دیکھے۔ ابن عربی نے کہا: سامنے دیکھے کیونکہ اگر وہ اپنے سر کو ٹیڑھا کرے گا تو اس کا سر میں جو قیام فرض تھا وہ ضائع ہو گیا، حالانکہ سر تمام اعضاء سے معزز عضو ہے اگر سر کو سیدھا کرے گا اور تکلیف سے زمین کی طرف دیکھے گا تو اسے بہت زیادہ مشقت اور حرج لاحق ہوگی اور دین میں ہم پر حرج نہیں رکھی گئی، لیکن جو اس پر قادر ہو اس کے لئے یہ افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ یعنی بیت المقدس سے قبلہ کا پھرنا حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ کیسے جانتے تھے جبکہ یہ نہ ان کے دین میں تھا اور نہ ان کی کتاب میں تھا؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جب انہوں نے اپنی کتاب سے جان لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی ہیں تو انہوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ حق کہتے ہیں اور حق کا حکم دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے: انہوں نے اپنے دین سے نسخ کا جواز جان لیا تھا اگرچہ بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ پس وہ قبلہ کے جواز کو جاننے والے ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تعلمون تا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اہل کتاب یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو خطاب ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کو مہمل نہیں چھوڑے گا اور ان سے غافل نہیں ہوگا اور اس کے ضمن میں وعید ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ

1۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 212، جلد 12 حدیث نمبر 34714 (التراث الاسلامی)

قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ کیونکہ انہوں نے کفر کیا ہے حالانکہ ان کے لئے حق واضح ہو چکا ہے، انہیں آیات وعلامات نفع نہیں دیں گی۔ قبلہ کی جمع مکسر قبلٌ ہے اور جمع سالم قبلات ہے اور کسرہ کو فتحہ سے بدلنا جائز ہے اور تو کہے قِبلات اور کسرہ کو حذف کرنا اور با کو ساکن کرنا جائز ہے اور لئن کا جواب لو کے جواب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی ضد ہے کیونکہ لو اپنے جواب میں ماضی اور وقوع کو طلب کرتا ہے اور لئن استقبال کو طلب کرتا ہے۔

فراء اور اخفش نے کہا: لو کے جواب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے لو اتیت۔ اسی طرح لئن کے جواب کے ساتھ لو کا جواب دیا جاتا ہے تو کہتا ہے لو احسنت احسن الیك اسی کی مثل قرآن میں ہے: وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم: 51) یعنی لو ارسلنا ریحاً۔ سیبویہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے کہا: لئن کا معنی لو کے مخالف ہے ایک دوسرے پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ کہ اگر آپ اہل کتاب کے پاس کوئی بھی نشانی لے آئیں وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ سیبویہ نے کہا: وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم: 51) کا معنی لیظلُّنَ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ یہ لفظاً خبر ہے لیکن اپنے ضمن میں امر کو لئے ہوئے ہے یعنی اس میں سے کسی شے کی طرف مائل نہ ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہود، نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں اور نصاریٰ، یہود کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ یہ سدی اور ابن زید سے مروی ہے۔ یہ ان کے اختلاف، تدابر اور گمراہی کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا یہ معنی ہے کہ جو ان میں سے اسلام لے آئے ہیں وہ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں جو اسلام نہیں لائے۔ اور جو اسلام نہیں لائے وہ اسلام لانے والوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں (1) اور پہلا معنی زیادہ واضح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ اس آیت میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ لوگ ہیں جن کا خواہش کی پیروی کرنا جائز ہے اور خواہش کی پیروی کرنے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا عمل کرنا جائز ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ظالم ہو جائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اور آپ سے ایسے اعمال سرزد نہ ہونے کی قطعیت کی وجہ سے امت کے ارادہ پر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 223، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

محمول ہے۔ معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا، نیز اس لئے کہ آپ پر یہ حکم نازل ہوا۔ الاھواء جمع ہے ھویٰ کی۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی طرح علم کی تفسیر بھی گزر چکی ہے اعادہ کا فائدہ نہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ان میں سے ایک گروہ چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ، اَلَّذِیْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور یَعْرِفُوْنَهٗ خبر ہے۔ الظّٰلِمِیْنَ کی صفت ہونے کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی صحیح ہے اور یَعْرِفُوْنَ کا حال ہونا صحیح ہے یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی رسالت کی صداقت کو جانتے ہیں۔ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کا پھرنا جانتے تھے کہ وہ حق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن جریج، ربیع اور قتادہ کا قول ہے۔ (1)

معرفت میں اَبْنَآءَ (بیٹوں) کو ذکر کیا ہے ان کے نفسوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ نفس زیادہ قریب ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر ایک ایسا وقت گزرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور کوئی ایسا وقت انسان پر نہیں گزرتا جس میں وہ اپنے بیٹے کو نہ جانتا ہو۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے عبد اللہ بن سلام سے کہا کیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح اپنے بیٹے کو جانتا ہے؟ عبد اللہ بن سلام نے کہا: ہاں میں آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان میں امین کو اپنی زمین میں اپنے امین کی طرف اس کی نعت کے ساتھ بھیجا پس میں اسے جان گیا۔ اور میرا بیٹا میں نہیں جانتا اس کی ماں سے کیا ہوا۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ مجاہد، قتادہ اور خصیف کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اَلْحَقَّ سے مراد استقبال کعبہ ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ یہ عناداً ان کے انکار کی صحت میں ظاہر ہے (3)۔ اسی طرح ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ (النمل: 14)

اور ارشاد ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

''یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، اَلْحَقُّ سے مراد استقبال کعبہ ہے۔ نہ وہ جو یہود نے آپ کو اپنا قبلہ بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے الحق کو منصوب پڑھا، یَعْلَمُوْنَ کی وجہ سے یعنی وہ حق کو جانتے ہیں اور الزم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً

الحق کی تقدیر پر بھی اس کی نصب صحیح ہے اور رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی ھو الحق، یا فعل کے اضمار پر ہوگا یعنی جاء الحقُ...... نحاس نے کہا: سورۃ الانبیاء میں اَلْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے منصوب کے علاوہ پڑھا ہو۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں آیت کے آغاز میں جبکہ سورہ انبیاء میں ایسا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾۔ الْمُمْتَرِيْنَ کا معنی ہے: شک کرنے والے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے، کہا جاتا ہے: امترىٰ فلان فی کذا جب کسی کو کبھی یقین حاصل ہو اور کبھی شک لاحق ہو، اور وہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے دور کرے، اس سے المراء (جھگڑنا) ہے، ہر شخص اپنے مقابل کے قول میں شک کرتا ہے۔ الامتراء فی الشیء، کسی شی میں شک کرنا، اسی طرح التماری ہے۔ طبری نے استشہاد کے طور پر اعشی کا قول ذکر کیا ہے کہ ممترین کا معنی شاکون ہے۔

تدر علی أسْؤق الممتریـ نْ رکضاً اذا ما السراب ارجحنّ

ابن عطیہ نے کہا: اس میں اسے وہم ہوا ہے کیونکہ ابوعبیدہ وغیرہ نے کہا: الممترون۔ شعر میں جو استعمال ہوا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے پیروں کے ساتھ گھوڑوں کو تیز چلاتے ہیں۔ شعر میں شک کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ طبری نے کہا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: اس میں شک کا معنی موجود ہے کیونکہ مالک اپنے گھوڑے کو آزماتا ہے کہ یہ چلنے کی عادت پر قائم ہے یا نہیں تا کہ اسے کوئی مصیبت لاحق نہ ہو، یا یہ ابتدا میں خریدنے کے وقت ہوتا ہے وہ اسے چلاتا ہے تا کہ اس کے چلنے کی مقدار جان لے۔ جوہری نے کہا مریت الفرس جب تو کوڑے وغیرہ کے ساتھ اس کا چلنا نکالے۔ اسم المریۃ ہے یہ میم کے کسرہ کے ساتھ ہے کبھی میم کو ضمہ دیا جاتا ہے، مریتُ الناقۃَ مَرْیاً جب تو اس کی کھیری کو مس کرے تا کہ دودھ دوہے، اَمْرَتْ جب اس کا دودھ اتر آئے۔ اسم المِرْیَۃُ ہے میم کے کسرہ کے ساتھ اور میم کو ضمہ دینا غلط ہے۔ المریۃ کا معنی شک ہے کبھی اس کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے۔ پس آگے بڑھ جاؤ دوسروں سے نیکیوں میں تم کہیں بھی ہو، لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ، الوجھۃ کا وزن فِعلۃٌ ہے اور یہ المواجھۃ سے ہے۔ الوجھۃ، الجھۃ اور الوجہ کا ایک معنی ہے۔ اس سے مراد قبلہ ہے یعنی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ ان کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے خواہ حق ہے یا خواہش نفس ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هُوَ مُوَلِّيهَا**، هُوَ ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ اس کے معنی کی طرف کیونکہ اگر معنی کی طرف راجع ہوتی تو هم مولوها ہوتا۔ ھا ضمیر مفعول اول ہے اور دوسرا مفعول مولی کا محذوف ہے۔ عبارت یوں ہوتی هو موليها وجهه و نفسه، مطلب یہ ہے کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے۔ صاحب قبلہ اپنا چہرہ ادھر پھیرنے والا ہے۔ یہ واحد کا صیغہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے۔ یہ ربیع، عطا اور حضرت ابن عباس کا قول ہے، حضرت علی بن سلیمان نے کہا: موليها کا معنی ہے: متوليها۔ ابن عبس اور ابن عامر نے مولّاها مجہول پڑھا ہے(1)۔ اس قرأت پر ضمیر واحد کی طرف لوٹے گی یعنی لوگوں میں سے ہر ایک کے لئے قبلہ ہے۔ الواحد مولاها یعنی ہر ایک اس کی طرف پھیرا گیا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمہور کی قراءت پر هُوَ ضمیر اللہ تعالیٰ کا اسم ہو، اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے معنی یہ ہوگا کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف پھیرنے والا ہے۔

طبری نے حکایت کیا ہے کہ ایک قوم نے ولكل وجهة پڑھا ہے یعنی کل کو وجهة کی طرف مضاف کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری نے غلطی کی ہے(2)، جبکہ یہ تعبیر قابل توجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جہت کی نیکی میں سبقت کر جس کی طرف تمہیں اس نے پھیرا ہے اور اپنے معاملہ میں اس اور اس کے چکر میں نہ پڑو۔ یعنی تم پر تمام امور میں اطاعت لازم ہے۔ لكل وجهة کو فاستبقوا پر مقدم کیا گیا ہے الوجهه کے اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ مفعول کو مقدم کیا جاتا ہے۔ ابوعمرو دانی نے یہ قرأت حضرت ابن عباس سے ذکر کی ہے وجهة میں واو سلامت رہی ہے عدۃ اور زنۃ اور اس کے درمیان فرق کرنے کے لئے کیونکہ جهة ظرف ہے اور یہ مصادر ہیں۔ ابوعلی نے کہا ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ بھی مصدر ہے اور خلاف قیاس ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ اسم ہے مصدر نہیں ہے۔ ابوعلی کے علاوہ علماء نے کہا جب تو اس سے مصدر مراد لے تو تو جهة کہے گا اور ظرف میں بھی کبھی الجهة کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ** یعنی الى الخيرات حرف جر کو حذف کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے البیت الحرام کی طرف منہ کرنے کا جو تمہیں حکم دیا ہے اس میں جلدی کرو۔ اگرچہ یہ اپنے ضمن میں تمام طاعات کی طرف جلدی کرنے کا معنی لئے ہوئے ہے۔ آیات کے سیاق کی وجہ سے استقبال قبلہ مراد لیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز کو اول وقت میں پڑھنے کے لئے جلدی کرو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ نسائی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کی طرف جلدی جانے والا اس شخص کی مثل ہے جو اونٹ قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس کی مانند ہے جو گائے قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس شخص کی مانند ہے جو مینڈھا قربانی دیتا ہے پھر وہ جو اس کے پیچھے آنے والا ہے وہ اس کی طرح ہے جو مرغی قربانی دیتا ہے پھر جو اس کے پیچھے آنے والا ہے اس کی طرح ہے جو انڈا قربانی دیتا ہے(3)۔ دارقطنی نے

1۔ معالم التنزیل، صفحہ 175، جلد 1 (دارالفکر) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

3۔ سنن نسائی، کتاب الامامۃ والجماعۃ، صفحہ 138، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی نماز کو اپنے وقت پر پڑھتا ہے حالانکہ اس نے پہلے وقت میں اس کو ترک کر دیا تھا جو اس کے اہل اور مال سے بہتر تھا(1)۔
مالک نے یحییٰ بن سعید سے ان کا قول نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصلاۃ فی اول وقتھا(2) بہتر عمل نماز کو وقت پر ادا کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اول وقتھا ہے۔ اس میں پہلے فی حرف جر نہیں ہے۔

ابراہیم بن عبدالملک نے حضرت ابومحذورہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اول وقت الله کی رضا ہے اور درمیانی وقت الله کی رحمت ہے اور آخر وقت الله کا عفو ہے(3)، ابن عربی نے زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: الله کی رضا ہمیں الله تعالیٰ کی عفو سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ اس کی رضا محسنین کے لئے ہے اور اس کا عفو کوتاہی کرنے والوں کے لئے ہے یہ امام شافعی کا اختیار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا آخری وقت افضل ہے کیونکہ یہ وجوب کا وقت ہے، امام مالک کے قول میں تفصیل ہے۔ صبح اور مغرب میں پہلا وقت افضل ہے۔ صبح میں افضیلت حضرت عائشہ کی حدیث کی وجہ سے ہے کہ فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے تھے عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں(4)۔ اور رہی مغرب کی پہلے وقت میں افضیلت تو وہ حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث کی وجہ سے ہے۔ آپ مغرب کی نماز پڑھتے تھے جب سورج غروب ہوتا تھا اور پردے میں چھپ جاتا تھا(5)۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے اور نماز عشاء میں تاخیر افضل ہے جو دیر سے پڑھنے پر قادر ہو۔ حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ایک رات عشاء کی نماز کے لئے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے، آپ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ رات کا تیسرا حصہ یا اس کے بعد کا وقت گزر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ اپنے گھر والوں میں مشغول رہے یا کسی اور وجہ سے مشغول رہے۔ آپ جب باہر نکلے تو فرمایا: تم نماز کا انتظار کر رہے ہو تمہارے علاوہ کوئی اہل دین اس کا انتظار نہیں کر رہا۔ اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں اس وقت نماز پڑھاتا(6)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز کو نصف رات تک مؤخر فرمایا پھر نماز پڑھی(7)۔

حضرت ابوبرزہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے، اور رہی ظہر کی نماز کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کے وقت آتی ہے۔ پس اس میں تھوڑی تاخیر مستحب ہے تاکہ لوگ تیار ہو جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ابوالفرج نے کہا امام مالک نے فرمایا ہر نماز میں افضل وقت پہلا وقت ہے مگر سخت گرمی میں ظہر کی نماز کے لئے تاخیر افضل ہے۔ ابن ابی اویس

1۔ سنن دارقطنی، النھی عن الصلاۃ بعد صلاۃ الفجر و بعد صلاۃ العصر، صفحہ 248، جلد 1 (دار المحاسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 247، جلد 1 (دار المحاسن)
3۔ ایضاً، صفحہ 250، جلد 1 4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، صفحہ 230، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ ایضاً، صفحہ 228، جلد 1 6۔ ایضاً، صفحہ 229، جلد 1
7۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب وقت العشاء الی نصف اللیل، صفحہ 81، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نے کہا امام مالک زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھنا ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بعد پڑھتے اور فرماتے وہ خوارج کی نماز ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، مؤذن نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھنڈا کرو۔ پھر اس نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو پھر آپ نے فرمایا: ٹھنڈا کرو حتیٰ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کی بھڑک سے ہے جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا (2) اور دونوں حدیثوں کو حضرت انس کی روایت جمع کرتی ہے کہ جب گرمی شدید ہوتی تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھتے تھے اور جب سردی ہوتی تو جلدی پڑھتے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: اہل علم کی ایک جماعت نے سخت گرمی میں ظہر کی نماز میں تاخیر کو پسند کیا ہے۔ یہ ابن مبارک، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرنا چاہیے جب مسجد کے نمازی دور سے آتے ہوں، جو تنہا نماز پڑھنے والا ہے اور وہ جو اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے والا ہے میں اس کے لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ سخت گرمی میں بھی نماز کو مؤخر نہ کرے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: جن علماء کا سخت گرمی میں ظہر کو مؤخر کرنے کا نظریہ ہے وہ اتباع کے زیادہ قریب ہے اور رہا امام شافعی کا قول کہ دور سے آنے والوں کے لئے اور لوگوں پر مشقت کی وجہ سے رخصت ہے کیونکہ حضرت ابوذر کی حدیث امام شافعی کے قول کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے حضرت بلال نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! ٹھنڈا کرو، ٹھنڈا کرو، اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح امام شافعی نے کہا ہے تو یہاں وقت کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی معنی نہیں تھا کیونکہ سفر میں سب لوگ جمع تھے، وہ دور سے آنے کے محتاج نہ تھے (3) اور رہی عصر کی نماز تو اس کو جلدی پڑھنا افضل ہے۔ ہمارے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جماعت کی امید کرتے ہوئے نماز کو مؤخر کرنا اس کو مقدم کرنے سے افضل ہے۔ اور جماعت کی فضیلت معلوم ہے، اول وقت کی فضیلت مجہول ہے اور معلوم کی تحصیل اولیٰ ہے اور یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یہ شرط ہے اور اس کا جواب یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف ہر چیز پر قدرت کے ساتھ بیان فرمایا تا کہ مرنے کے بعد اور بوسیدگی کے بعد اعادہ کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ صفت مناسب ہو جائے۔

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، صفحہ 77، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب اوقات الصلوٰۃ، صفحہ 223، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی تاخیر الظہر، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِیْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

''اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان میں سے۔ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو تاکہ میں پورا کر دوں اپنا انعام تم پر تاکہ راہ راست پر ثابت قدم رہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بعض علماء نے فرمایا: یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید اور اس کے اہتمام کے لئے ہے کیونکہ تحویل کا موقع لوگوں کے نفوس میں مشکل تھا تو معاملہ کو مؤکد فرمایا تاکہ لوگ اس کے اہتمام کو دیکھیں اور ان پر تخفیف ہو جائے اور ان کے نفوس کو تسکین حاصل ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلے فول وجهك سے مراد کعبہ کی سمت ہے یعنی جب اسے دیکھ رہا ہو تو عین اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر فرمایا حَیْثُ مَا كُنْتُمْ مسلمان جو دوسری تمام مساجد میں ہیں مدینہ طیبہ وغیرہ میں وہ کعبہ کی سمت منہ کریں۔ پھر فرمایا: وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ یعنی سفر میں استقبال کعبہ واجب ہے۔ پس زمین کی تمام اطراف میں تمام جگہوں میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا یہ حکم تھا۔ یہ قول پہلے قول سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ہر آیت کو ایک فائدہ پر محمول کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے اور اپنی سواری پر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ کی طرف منہ کرتے اور تکبیر کہتے پھر نماز پڑھتے رہتے خواہ جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا (1)۔ ابوداؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے (2)۔ امام شافعی، امام احمد اور ابوثور کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ استقبال کعبہ لازم نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مدینہ طیبہ آتے ہوئے سواری پر نماز پڑھتے تھے۔ فرمایا: اس کے متعلق نازل ہوا: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: 115) (3) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: ان احادیث کے درمیان تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہیں۔ امام شافعی کا قول اولیٰ

1۔ سنن دارقطنی، صفۃ صلاۃ التطوع فی السفر، صفحہ 396، جلد 1 (دار المحاسن)

2۔ سنن ابی داؤد، باب التطوع علی الرحلۃ والوتر، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، باب وما جعلنا القبلۃ، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے اور اس کے متعلق حضرت انس کی حدیث صحیح ہے۔ روایت ہے کہ جعفر بن محمد سے قرآن میں تکرار کے بارے پوچھا گیا؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ تمام لوگ سارا قرآن یاد نہیں کریں گے: اگر قصص مکرر نہ ہوتے تو یہ بعض کے پاس ہوتے اور بعض کے پاس نہ ہوتے تکرار کیا گیا تا کہ جو کچھ حصہ یاد کرے اس کے پاس بھی یہ قصص ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ان کی حجت سے مراد ان کا قول ہے کہ آپ نے ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیا تو انہیں اس ارشاد قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ:42) سے جواب دیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ کا معنی ہے تا کہ تم نہ کہو کہ تمہیں استقبال کعبہ کا حکم دیا گیا تھا حالانکہ تم اسے خیال نہیں کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرہ:144) تو پہلے حکم کو زائل کر دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا الّا یہاں واؤ کے معنی میں ہے یعنی والذین ظلموا۔ یہ استثناء واو کے معنی میں ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ما بالمدينة دارٌ غير واحدة		دار الخليفة الا دار مروانا

گویا اس شعر میں کہا: الا دار الخليفة و دار مروان۔

اسی طرح یہ ارشاد ہے: إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (التین) یعنی والذین آمنوا زجاج نے اس قول کو باطل قرار دیا ہے(2)۔ اس نے کہا یہ حذاق نحویوں کے نزدیک غلط ہے اور اس میں معانی کا بطلان ہے اور اِلّا اور اس کا مابعد، اپنے ذکر سے مستغنی ہو جائیں گے۔ نحویوں کے نزدیک قول یہ ہے کہ یہ پہلے کلام سے استثناء نہیں ہے، یعنی جن لوگوں نے ان میں سے ظلم کیا وہ حجت پکڑتے ہیں۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ نے قبلہ کے متعلق احتجاج کا امر اپنے فرمان وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا میں بتایا تا کہ لوگوں کے لئے تم پر حجت نہ رہے مگر جو ایک واضح امر میں احتجاج کر کے ظلم کرے۔ جیسے تو کہتا ہے: مالك علي حجة الا الظلم او الا ان تظلمني، یعنی مجھ پر تیرے لئے یقیناً کوئی حجت نہیں۔ لیکن تو مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے ظلم کو حجت کہا کیونکہ اس ظالم سے حجت پکڑنے والے نے اسے حجت کہا ہے۔ اگرچہ زائل ہونے والی حجت ہے۔ قطرب نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو کہ تم پر لوگوں کے لئے حجت نہ ہو مگر ان پر جنہوں نے ظلم کیا، الذین، علیکم میں کم ضمیر سے بدل ہو گا۔ ایک گروہ نے کہا الا الذین مستثنیٰ متصل ہے۔ اس کا معنی حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے اور کہا اللہ تعالیٰ نے نفی فرمائی کہ کسی کے لئے استقبال قبلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر حجت ہو۔ معنی یہ ہے کہ تم پر کسی کے لئے حجت نہیں ہے مگر باطل حجت...... اس حیثیت سے کہ انہوں نے کہا: انہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین میں متحیر ہے۔ وہ ہمارے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوا مگر اس لئے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، اس کے علاوہ وہ اقوال جو بت پرستوں، یہودیوں یا منافقوں سے صادر ہوتے تھے۔ حجت سے مراد مخاصمت اور جھگڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت کہا اور اس کے فساد کا حکم لگایا کیونکہ یہ ظالموں کی طرف سے

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا		2۔ ایضاً

تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے کہا(1): یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ الناس سے مراد یہود ہوں۔ پھر عرب کے کفار کی استثناء کی گویا فرمایا: لیکن جنہوں نے ظلم کیا جو تم سے جھگڑتے ہیں۔ لیکن مِنْهُمْ کا قول اس تاویل کو رد کرتا ہے معنی یہ ہے کہ: لیکن جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفار قریش نے اپنے اس قول میں ظلم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آیا ہے وہ ہمارے پورے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔ اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جس نے بھی یہود کے علاوہ نازل ہونے والی آیت میں کلام کیا۔ حضرت ابن عباس، زید بن علی اور ابن زید نے الا الذین ظلموا پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے فتحہ اور لام کی تخفیف کے ساتھ۔ اس معنی پر کہ یہ نیا کلام ہے اس صورت میں الذین ظلموا مبتدا ہوگا یا اغراء کے معنی پر ہوگا۔ اس صورت میں الذین فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہوگا(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْشَوْهُمْ۔ یعنی لوگوں سے نہ ڈرو وَاخْشَوْنِي، خشیت کا اصل معنی وہ طمانیت ہے جو کسی تکلیف سے بچنے پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خوف کا مطلب دل کا گھبرانا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اعضاء کی خفت کی وجہ سے اسے خوف کہا جاتا ہے۔ آیت کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کی تحقیر کرنا ہے، اللہ کے سوا ہر ایک کے امر کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر کی رعایت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ یہ لِئَلَّا يَكُونَ پر معطوف ہے۔ یعنی لان اُتم۔ یہ اخفش کا قول ہے بعض نے فرمایا: یہ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور اس کی خبر مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولا تم نعمتی علیکم عرّفتکم قبلتی۔ یعنی میں تمہیں اپنے قبلہ کی معرفت عطا کر کے اپنی نعمت کو مکمل کردوں۔ یہ زجاج کا قول ہے، نعمت کے مکمل کرنے سے مراد قبلہ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اتمام نعمت سے مراد جنت کا دخول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت مکمل نہ ہوگی حتیٰ کہ اسے جنت میں داخل کردے گا۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب و حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَآ أَرْسَلْنَا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے لا تم نعمتی علیکم اتماماً مثل ما ارسلنا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام اقوال میں سے بہتر قول ہے۔ یعنی تم پر ابراہیم کی سنت کے بیان میں اپنی نعمت مکمل کردوں جس طرح ہم نے رسول مبعوث کیا(3)۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے لعلکم تهتدون اهتداء مثل ما ارسلنا، تاکہ تم ہدایت پاؤ ایسی ہدایت جو ہمارے رسول بھیجنے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ محل نصب میں بحیثیت حال ہے۔ معنی ہے میں تم پر اس حال میں اپنی نعمت مکمل کردوں۔ تشبیہ اس طرح واقع ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 225، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 226، جلد 1

قبلہ میں نعمت، رسالت میں نعمت کی طرح ہے۔ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ بڑائی میں نعمت کی بڑائی کی طرح ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام کے معنی میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی مجھے یاد کرو جس طرح ہم نے رسول بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے زجاج نے پسند کیا ہے یعنی جس طرح ہم نے تم میں رسول بھیجا جسے تم سچائی کے ساتھ پہچانتے ہو۔ پس تم مجھے توحید کے ساتھ اور اسے تصدیق کے ساتھ یاد کرو۔ اس قول پر تھتدون پر وقف جائز ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اسی کو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے، یعنی جس طرح میں نے تم پہ احسان کئے ہیں جن کو میں نے تم پر شمار کیا ہے۔ پس تم شکر کے ساتھ مجھے یاد کرو میں مزید نعمت کے ساتھ تجھے یاد کروں گا کیونکہ تمہارے اس ذکر میں میرے لئے شکر ہے اور میں نے شکر پر تم سے مزید کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) یہاں کما میں کاف اور سورت انفال میں كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ (انفال: 5) میں کاف اور سورہ حجر کے آخر میں كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ (الحجر) میں کاف، اپنے مابعد کے متعلق ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ اس میں مجازاۃ کا معنی ہے۔ اس وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے۔ ذکر کی اصل مذکور کے لئے دل کا متنبہ ہونا اور اس کے لئے دل کا بیدار ہونا۔ ذکر باللسان کو ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر قلبی پر دلالت کرتا ہے لیکن جب زبانی ذکر پر کثرت سے ذکر کا اطلاق ہوا تو یہی ذکر سمجھا جانے لگا۔ آیت کا معنی ہے: تم اطاعت کے ساتھ میرا ذکر کرو میں تمہارا ثواب اور مغفرت کے ساتھ ذکر کروں گا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے اور اسی طرح فرمایا: ذکر، اللہ کی اطاعت ہے جس نے اس کی اطاعت نہ کی اس نے اس کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ وہ کثرت سے تسبیح، تہلیل اور قرآن کی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کا ذکر کیا اگرچہ اس کی نماز اور روزہ کم بھی ہوں اور خیر کے اعمال تھوڑے بھی ہوں اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گیا، اگرچہ نماز، روزہ اور خیر کے کام زیادہ بھی ہوں۔ ابو عبید اللہ محمد بن خویز منداد نے ''احکام القرآن'' میں اس کو ذکر کیا ہے...... ابو عثمان نہدی نے کہا: میں اس گھڑی کو جانتا ہوں جب اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر کرتا ہے، ان سے پوچھا گیا تم یہ کیسے جان لیتے ہو؟ ابو عثمان نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) سدی نے کہا: جو بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے، جو مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے یاد کرتا ہے اور کوئی کافر اسے یاد نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے عذاب سے یاد کرتا ہے (1)۔ ابو عثمان سے پوچھا گیا کہ ہم اللہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن ہم اپنے دلوں

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 46، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی)

میں کوئی مٹھاس اور ذوق نہیں پاتے؟ ابوعثمان نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد کرو کہ اس نے تمہارے ظاہری اعضاء کو اطاعت کے ساتھ مزین کیا۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: جس نے حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا وہ اپنے پہلو میں ہر چیز کو بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ہر چیز کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر چیز سے عوض ہو گا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ابن آدم نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا ہو۔

ذکر کی فضیلت اور اس کے ثواب میں احادیث کثیر ہیں جن کو ائمہ حدیث نے ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اسلام کی شرائع (احکام) بہت سے ہیں مجھے ان میں سے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں(2)۔ اس عنوان کی احادیث اور ذکر کا مزید بیان یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا (احزاب) کے تحت آئے گا ذکر سے مراد دل کا ذکر ہے جو عمومی حالات میں ہمیشہ رہنا واجب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ فراء نے کہا: کہا جاتا ہے: شکرتك و شکرت لك نصحتك و نصحت لك۔ پہلا فصیح ہے۔ شکر کا مطلب احسان کو جاننا اور اس کو بیان کرنا ہے اس کا لغوی معنی ظاہر ہونا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کر کے اس کی ثنا کرے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت پر اپنے بندے کی تعریف فرماتا ہے مگر بندے کا شکر زبان سے اور دل سے طاعات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَكْفُرُوْنِ یہ نہی ہے اسی وجہ سے جمع کا نون حذف کیا گیا ہے اور یہ نون متکلم کا ہے اور یا کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور غیر قرآن میں اس کا اثبات احسن ہے، یعنی میری نعمت اور میرے احسان کا انکار نہ کرو۔ یہاں کفر سے مراد جھٹلانا نہیں بلکہ نعمت کا چھپانا ہے۔ کفر کے لغوی معنی کی تحقیق گزر چکی ہے اور صبر اور نماز سے استعانت کا معنی بھی گزر چکا ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

''اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کئے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے''۔

یہ اس آیت کی مثل ہے: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ (آل عمران) اس آیت کے تحت شہید اور شہداء کے احکام کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

جب اللہ تعالیٰ شہداء کو ان کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے تا کہ انہیں رزق دے تو جائز ہے کہ وہ کفار کو زندہ کرے تا کہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل الذکر، صفحہ 277، (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً

انہیں عذاب دے۔ اس آیت میں عذاب قبر پر دلیل ہے۔ شہداء زندہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اگر یہ معنی ہوتا تو شہداء اور دوسرے لوگوں میں فرق نہ ہوتا کیونکہ آئندہ تو ہر ایک زندہ ہوگا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ بھی دلالت کرتا ہے۔ مومنین جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اموات کو مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع دیا گیا ہے اسی طرح بَلْ اَحْيَآءٌ کی ترکیب ہے، یعنی هم امواتٌ و هم احیاءٌ۔ ان میں قول کو عمل کرانا صحیح نہیں کیونکہ قول اور اس کے درمیان مناسبت نہیں ہے۔ جس طرح تیرے اس قول میں صحیح ہے: قلت کلاماً وحجةً۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنائیے ان صبر کرنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ یہ واؤ مفتوحہ ہے۔ سیبویہ کے نزدیک کیونکہ التقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: جب واؤ نون ثقیلہ کے ساتھ ملائی گئی تو فعل مبنی ہو گیا۔ پس یہ خمسة عشر کے قائم مقام ہو گیا۔ بلاء کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی محبت ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ ہم مجاہد اور صابر کو آنکھوں سے دیکھنے والے کے علم کی طرح علم حاصل کرلیں تاکہ اس پر جزا واقع ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے ساتھ آزمائے گئے تاکہ بعد والوں کے لئے نشانی بن جائیں اور وہ جان لیں کہ انہوں نے اس پر صبر کیا جب ان کے لئے حق واضح ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں اس سے آگاہ کیا تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ انہیں مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پس اس پر وہ اپنے نفسوں کو تسکین دیں اور جزع وفزع سے دور رہیں۔ اس آیت میں عزم اور نفس کو تسکین دینے میں جلدی ثواب ملنے کا مژدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِشَيْءٍ یہ لفظاً مفرد ہے اور اس کا معنی جمع ہے۔ ضحاک نے باشیاء جمع پڑھا ہے جمہور نے مفرد پڑھا ہے یعنی کچھ خوف سے کچھ بھوک سے۔ پہلے کے ساتھ شے کے ذکر پر اختصار کی وجہ سے اکتفا کیا۔ مِّنَ الْخَوْفِ یعنی دشمن کا خوف اور جنگ کی گھبراہٹ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ وَالْجُوْعِ یعنی قحط سالی کے ساتھ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا رمضان کے مہینہ کی بھوک مراد ہے۔ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کفار سے جنگ لڑنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: مال کے ضیاع کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا فرضی زکوٰۃ کے ساتھ۔ الْاَنْفُسِ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جہاد میں قتل اور موت کے ساتھ ہم جانوں میں کمی کر کے آزمائیں گے۔ امام شافعی نے فرمایا: امراض کے ساتھ الثَّمَرٰتِ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد بچوں کی موت ہے۔ انسان کی اولاد اس کے دل کا ثمرہ ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نباتات کی قلت اور برکات کا انقطاع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ صبر پر ثواب کی بشارت دو۔ الصبر کا اصل معنی روکنا ہے۔ صبر کا ثواب غیر مقدر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے لیکن صبر، پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے جیسا کہ بخاری نے حضرت انس سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبر پہلے صدمہ کے وقت ہے (1)۔ مسلم نے اس سے مکمل ذکر کی ہے۔ صبر جو نفس پر شاق ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب ہوتا ہے وہ مصائب کے ہجوم اور ان کی حرارت کے وقت ہے یہ دل کی قوت اور صبر کے مقام پر ثابت قدم رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو اس وقت ہر ایک صبر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے، عقلمند پر واجب ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اس کیفیت کو لازم پکڑے جو احمق کی تین دن کے بعد ہوتی ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ تو صبر زندگی بن گیا۔ صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) سے صبر کرنا، یہ مجاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا (2)، یہ عابد ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی معصیت سے صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی قضا پر رضا کا وارث بنا دیتا ہے۔ رضا کی علامت، نفس پر مکروہات اور محبوبات وارد ہونے پر دل اپنی جگہ سکون میں رہے۔ خواص نے کہا: صبر، کتاب و سنت کے احکام پر ثابت رہنا ہے۔ رویم نے کہا: صبر، شکوہ کا ترک کرنا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: صبر، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے۔ استاذ ابوعلی نے کہا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر معترض نہ ہو۔ رہا شکوہ کے بغیر مصیبت کا اظہار، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کے قصہ میں فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ (ص: 44) (بے شک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ) اس کے ساتھ یہ بھی ان کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ (الانبیاء: 83)

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں: بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں''۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُّصِيْبَةٌ ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت اور تکلیف دیتی ہے وہ مصیبت ہے۔ کہا جاتا ہے: اصابہ، اصابۃ و مصابۃ و مصاباً۔ اور مُّصِيْبَةٌ کی جمع مصائب ہے۔

المصُوبۃ (صاد کے ضمہ کے ساتھ) مصیبت کی مثل ہے۔ عرب ہمزہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں۔ المصائب اس کی اصل واؤ ہے گویا انہوں نے اصلی کو زائد کے ساتھ مشابہت دی۔ اس کی جمع مصاوب بھی آتی ہے یہ اصل ہے۔ المصاب الاصابۃ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 301، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

شاعر نے کہا:

أسليم ان مصابكم رَجلاً اهدی السلام تحيةً ظلمُ

وصاب السهم القرطاس، يصيب صيباً به، اصاب کے معنی میں ہے۔ المصيبة۔ النكبة ينكبها الانسان۔ اور یہ شر میں استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رات چراغ بجھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت دے وہ مصیبت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح حدیث میں ثابت ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، ان دونوں حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ مومن کو جو مصیبت، تھکن، بیماری، غم، حتیٰ کہ دل کا روگ جو اسے پریشان کرتا ہے، لاحق ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے گناہ مٹائے جاتے ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 2: ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ حضرت فاطمہ بنت حسین سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہو پھر اس نے اپنی مصیبت کو یاد کیا اور پھر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا ہو اگرچہ اس مصیبت کو بہت سا عرصہ گزر چکا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا اجر لکھ دیتا ہے جس دن اسے مصیبت پہنچی تھی (2)۔

مسئلہ نمبر 3: مصائب میں سے بڑی مصیبت دین کی مصیبت ہے۔ ابو عمر نے فریابی سے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں فطر بن خلیفہ نے بیان کیا، فرمایا: ہمیں حضرت عطا بن ابی رباح نے بیان کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو مصیبت پہنچے تو میری وجہ سے جو اسے مصیبت پہنچی ہے اسے یاد کرنا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی مصیبت ہے (3)۔ یہ سمرقندی ابو محمد نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ ابو نعیم نے ہمیں بتایا، ہمیں فطر نے بتایا...... پھر اسی طرح حدیث بیان کی ہے۔ اسی طرح مکحول سے مرسلاً روایت کی ہے۔ حضرت ابو عمر نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کیونکہ آپ سے جدائی کی مصیبت ہر مصیبت سے بڑی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک بندہ مومن کو پہنچنے والی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے سے وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ سب سے پہلا شر جو ظاہر ہوا وہ عربوں وغیرہ کا ارتداد تھا۔

یہ خیر کا پہلا انقطاع اور پہلا نقصان تھا۔ حضرت ابو سعید نے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی مٹی سے ہاتھ نہیں جھاڑے تھے حتیٰ کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔ ابو العتاہیہ نے اپنی نظم میں اس حدیث کے معنی کو کتنا حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

اصبر لكل مصيبة و تجلد و اعلم بان المرء غير مخلد

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن، صفحہ 319، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، ما جاء فی الصبر علی المصيبة، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارمی، باب وفاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 40، جلد 1 (دار المحاسن)

اوما تری ان المصائب جمة　و تری المنیة للعباد بمرصد
من لم یصب ممن تری بمصیبة　هذا سبیل لست فیه باوحد
فاذا ذکرت محمد و مصابه　فا ذکر مصابك بالنبی محمد ﷺ

تو ہر مصیبت اور تکلیف پر صبر کر اور جان لے کہ انسان ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ مصیبتیں بہت سی ہیں اور موت بندوں کی تاڑ میں ہے۔ کون ہے جن کو مصیبت نہیں پہنچی، تو اس راستہ میں اکیلا نہیں ہے۔ جب تو حضرت محمد ﷺ اور آپ کی مصیبت کو ذکر کرے تو اپنی مصیبت کو نبی محمد ﷺ کے ساتھ یاد کرو۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو مصیبت زدہ کے لئے پناہ گاہ بنایا ہے اور آزمائش میں مبتلا کئے گئے لوگوں کے لئے حفاظت کا باعث بنایا ہے، کیونکہ یہ مبارک معانی کا جامع ہے کیونکہ اِنَّا لِلّٰهِ کا قول توحید اور عبودیت کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا اقرار ہے اور وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا ارشاد اپنے نفسوں پر ہلاکت کا اقرار ہے اور قبور سے اٹھنے کا اقرار ہے اور اس پر یقین کا اظہار ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا یہ کلمات، ہمارے نبی سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کو پہچان لیتے تو یہ نہ کہتے یا اسفی علی یوسف۔

مسئلہ نمبر 5: ابوسفیان نے کہا: میں نے اپنے بیٹے سنان کو دفن کیا جبکہ ابوطلحہ خولانی قبر کے کنارہ پر کھڑے تھے۔ جب میں نے قبر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور مجھ سے محبت کا اظہار کیا اور کہا: اے ابوسنان! کیا میں تجھے بشارت نہ دوں۔ محمد ضحاک نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب بندے کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: میرے بندے نے (اس صدمہ پر) کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو(1)۔

مسلم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللھم اجرنی فی مصیبتی و اخلف لی خیراً منھا، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس سے بہتر بدلا دیتا ہے(2)۔ یہی تنبیہ ہے وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۝ کے ارشاد پر۔ یا تو نعم البدل مل جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ام سلمہ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات عطا فرمائی تھی، جب ان کا خاوند ابوسلمہ فوت ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یا بڑا ثواب عطا فرماتا ہے جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث میں ہے اور کبھی یہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب فضل المصیبة، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 300، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دونوں چیزیں ملتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ یہ صبر کرنے والوں اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے والوں پر الله تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں ہیں۔ الله تعالیٰ کی بندے پر صلاۃ کا مطلب، اس کا عفو، رحمت، برکت اور دنیا و آخرت میں شرف بخشنا ہے۔ زجاج نے کہا: الله تعالیٰ کی طرف سے صلاۃ کا مطلب بخشنا اور اچھی تعریف ہے۔ اسی سے میت پر صلاۃ ہے۔ یہ اس کی تعریف اور اس کے لئے دعا ہے۔ رحمت کا لفظ دوبارہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ تاکید اور معنی کا اشباع ہے کیونکہ لفظ مختلف ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا من البینات و الھدیٰ۔ اور ارشاد ہے: اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ (زخرف: 80) شاعر نے کہا:

صلی علی یحیی و اشیاعه رَبٌّ کریمٌ و شفیعٌ مطاع

یحییٰ اور اس کے گروہ پر رب کریم اور شفیع مطاع نے صلاۃ بھیجی۔

بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد مصیبت کا دور کرنا اور حاجت کو پورا کرنا ہے۔

بخاری میں ہے، حضرت عمر نے فرمایا: نعم العدلان و نعم العلاوۃ: الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (بقرہ) (1) عدلان سے مراد الصلاۃ اور رحمت ہے اور علاوہ سے مراد اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ہے۔ (عدلان، اونٹ کے دونوں طرفوں کے بوجھ کو کہتے ہیں اور علاوہ وہ بوجھ ہوتا ہے جو اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے) بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد ثواب کا استحقاق اور اجر کا بڑا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: مصائب کا آسان کرنا اور حزن میں تخفیف کرنا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝

"بے شک صفا اور مروہ الله کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو الله تعالیٰ بڑا قدردان خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری نے عاصم بن سلیمان سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم دیکھتے تھے کہ صفا و مروہ زمانہ جاہلیت کے امور سے ہیں۔ جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے، الله تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ...... الخ (2)۔

ترمذی نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عائشہ سے کہا: میں کسی پر کوئی گناہ نہیں دیکھتا جو صفا و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمة الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 646، جلد 1

مروہ کے درمیان طواف نہ کرے اور میں بھی کوئی پروانہیں کرتا کہ میں ان کے درمیان طواف نہ کروں۔ حضرت عائشہ نے کہا: اے میرے بھانجے! تو نے بری بات کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صفا و مروہ کا طواف کیا اور مسلمانوں نے طواف کیا جو منات بت کے لئے احرام باندھتا تھا، جو مشلل میں تھا تو صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح تو نے کہا ہے تو عبارت اس طرح ہوتی۔ فلا جناح علیہ الایطوف بھما۔ زہری نے کہا: میں نے روایت ابر بکر بن عبدالرحمن بن حارث کے سامنے ذکر کی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: یہ علم ہے۔

میں نے بہت سے اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو عربوں میں سے صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے: ہمارا طواف ان دو پہاڑوں کے درمیان امر جاہلیت سے تھا اور انصار میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا گیا ہے، صفا و مروہ کے طواف کا حکم نہیں دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے کہا: میرا خیال ہے یہ آیت ان لوگوں اور ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور فرمایا یہ حدیث حسن، صحیح ہے (1)۔ بخاری نے اس کا معنی نقل کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ کے الفاظ کے بعد یہ ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان طواف کی سنت قائم فرمائی، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان کا طواف چھوڑ دے۔ پھر میں نے ابوبکر بن عبدالرحمن کو بتایا تو انہوں نے کہا: جو تو نے سنا ہے یہ علم ہے۔ میں نے اہل علم سے سنا ہے وہ ذکر کرتے تھے کہ لوگ..... مگر جن کا حضرت عائشہ نے ذکر کیا، منات بت کے لئے احرام باندھتے تھے وہ تمام صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا اور قرآن میں صفا و مروہ کا ذکر نہیں کیا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر نازل کیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہم پر کوئی حرج ہے کہ ہم صفا و مروہ کا طواف کریں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ الآیۃ، ابوبکر نے کہا یہ آیت دونوں فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے بارے میں بھی جو زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور ان کے بارے میں جو پہلے طواف کرتے تھے پھر دور اسلام میں ان کا طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کے طواف کے بعد اس کا ذکر کیا (2)۔

ترمذی نے عاصم بن سلیمان الاحول سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ دونوں جاہلیت کے شعائر سے تھیں جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروۃ، صفحہ 222، جلد 1 (وزارت تعلیم)

فرمایا یہ تطوع ہے...... وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ...... فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ یہ بخاری نے نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں شیاطین ساری رات صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے رہتے تھے اور صفا و مروہ کے درمیان بت رکھے ہوئے تھے۔ جب اسلام ظاہر ہوا تو مسلمانوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتے کیونکہ یہ شرک ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ شعبی نے کہا: زمانہ جاہلیت میں صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا۔ اور مروہ پر ایک بت تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا(2)۔ جب لوگ طواف کرتے تو ان بتوں کو چھوتے تھے۔ مسلمان اس وجہ سے ان کے درمیان طواف کرنے سے رک گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2: لغت میں الصفا، صاف پتھر کو کہتے ہیں۔ مکہ میں یہ ایک معروف پہاڑ ہے اسی طرح مروہ بھی ایک پہاڑی ہے، اسی وجہ سے دونوں کو معرف بالام ذکر کیا۔ الصفا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر حضرت آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے تو ان کے نام سے اسے موسوم کیا گیا اور حضرت حوا مروہ پر ٹھہری تھیں تو اسے عورت کے اسم سے تعبیر کیا۔ اس وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا۔ شعبی نے کہا: صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت تھا جس کو نائلہ کہا جاتا تھا، اسی اعتبار سے ان کی تذکیر و تانیث جاری ہوئی (3)۔ مذکر کو مقدم کیا۔ یہ عمدہ ہے کیونکہ احادیث اس معنی پر دلالت کرتی ہیں اور جو لوگ ان میں طواف ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ بھی یہی تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں حرج کو اٹھا دیا۔ اہل کتاب کا خیال ہے کہ اساف اور نائلہ نے کعبہ میں زنا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پتھروں میں مسخ کر دیا۔ انہیں صفا و مروہ پر رکھا گیا تاکہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں جب عرصہ زیادہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت ہونے لگی۔ واللہ اعلم

الصَّفَا (مقصور ہے) یہ صفاۃ کی جمع ہے اس سے مراد صاف پتھر ہے۔ بعض نے فرمایا: الصفا، مفرد اسم ہے اس کی جمع صُفِیّ اور اصفاء ہے جسے اَرْجَاء جمع ہے۔ راجز نے کہا:

كأن مَتْنَيْه من النفي　　مواقع الطير على الصُّفِي(4)

بعض علماء نے فرمایا: صفا کی شروط میں سے سفیدی اور صلابت ہے اور یہ صفا یصفو سے مشتق ہے یعنی مٹی سے پاک۔ المروہ یہ المرو کا واحد ہے، یہ چھوٹے چھوٹے پتھر جن میں نرمی ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سخت پتھر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مروہ پتھر ہے۔

شاعر نے کہا:

و تولى الارض خفا ذابلاً　　فاذا ما صادف المرو رضخ (5)

شاعر نے مرو کو پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 229، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی)　　5۔ ایضاً

ابوذویب نے کہا:

حتی کانی للحوادث مروۃ بصفا المشقر کل یوم تقرع

شاعر نے یہاں بھی پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض نے فرمایا: یہ کالے پتھر ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سفید چمکدار پتھر ہیں جن میں آگ ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ یہ عبادت کی جگہوں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ یہ شعیرۃ کی جمع ہے۔ الشعائر وہ جگہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے علامات بنایا۔ جیسے موقف، سعی اور نحر۔

شعار کا مطلب علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: اشعر الھدی۔ لوہے کی نوک سے اونٹ کی کوہان میں علامت بنانا، یہ تیرے قول اشعرت سے ہے میں نے علامت بنائی۔ کمیت نے کہا:

نقتلهم جیلاً فجیلاً تراهم شعائر قربانٍ بهم یتقربُ (1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ۔ حَجَّ کا معنی قَصَدَ ہے الحج کا معنی قصد کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

فاشهد من ع ؐ حلولاً کثیرۃً یحجون سب الزبرقان المزعفرا

السب، یہ مشترک لفظ ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: السب (کسرہ کے ساتھ) بہت زیادہ گالی دینے والا۔ سَبّك، جو تجھے گالی دے۔ شاعر نے کہا:

لا تسبنّنیْ فلست بسبی ان سبی من الرجال الکریم (2)

السب کا معنی دوپٹہ بھی ہے اسی طرح عمامہ بھی اس کا معنی ہے۔ مخبل سعدی نے کہا:

یحجون سِب الزبرقان المزعْفرا

وہ زعفران سے رنگے ہوئے عمامے باندھے ہوئے حج کرتے ہیں۔

لغت ہذیل میں السب، رسی کو بھی کہتے ہیں۔ ابوذویب نے کہا:

تدلی علیها بین سِبٍ و خیطة بجرداء مثل الوکف یکبو غرابُها

السبوب، رسیاں۔ روئی کا باریک دھاگہ۔ السبیبة اس کی مثل ہے جمع السبوب و السبائب۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

حج الطبیب الشجة، جب طبیب سرچو کے ساتھ زخم کی پیائش کا قصد کرے۔

شاعر نے کہا:

یحج مأمومةً فی قعرها لجف

وہ دماغ کے زخم کا علاج کرتا ہے جس کی گہرائی خوفناک ہے۔ اللجف، دھنسنے کو کہتے ہیں تلجفت البئر کنویں کا نچلا حصہ

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 1 (داراحیاء التراث العربی) 2۔ ایضاً، صفحہ 55، جلد 1

دھنس گیا۔ پھر یہ اسم بیت اللہ کی طرف افعال مخصوصہ کے ساتھ قصد کرنے کے لئے خاص ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوِاعْتَمَرَ یعنی زیارت کرنا۔ العمرۃ کا معنی زیارت ہے۔ شاعر نے کہا:

لقد سما ابن معمر حین اعتمر مغزی بعیداً من بعید و ضبر

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ یعنی اس پر گناہ نہیں ہے۔ اس کی اصل جنوح سے ہے۔ اس کا معنی مائل ہونا ہے اسی سے الجوانح ہے۔ اعضاء کو ان کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے جوانح کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ کی تاویل اس آیت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ کہنے والے کا قول لا جناح علیك ان تفعل کا مطلب فعل کا مباح کرنا ہے اور لا جناح علیك الا تفعل کا مطلب ہے فعل کے ترک کی اباحت۔ جب عروہ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ فرمایا: یہ دلیل ہے کہ طواف کا ترک کرنا جائز ہے۔ پھر شریعت کو اس پر پایا کہ طواف چھوڑنے میں رخصت نہیں پھر ان دو متعارض کو جمع کرنا طلب کیا۔ حضرت عائشہ نے عروہ سے کہا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ طواف کے ترک کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ترک کی دلیل تب ہوتا اگر عبارت اس طرح ہوتی: فلا جناح علیہ الا یطوف بهما۔

پس یہ لفظ طواف کے ترک کی اباحت کے لئے نہیں آیا، اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ طواف کی اباحت کے افادہ کے لئے آیا ہے اس شخص کے لئے جو جاہلیت میں اجتناب کرتے تھے یا جو جاہلیت میں ان کا طواف کرتے تھے ان بتوں کا قصد کرتے ہوئے جو ان پہاڑوں کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ طواف ممنوع نہیں ہے جب طواف کرنے والا باطل کا قصد نہ کرے۔

اگر کہا جائے کہ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فلا جناح علیہ الا یطوف بهما پڑھا ہے اور یہی حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت انس سے اس کی مثل مروی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس کے خلاف ہے جو مصحف میں ہے اس لئے ایک قراءت کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑا جا سکتا جو مصحف میں ہے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قراءت صحیح ہے یا نہیں ہے۔ عطا بغیر سماع کے حضرت ابن عباس سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں اور حضرت انس سے جو روایت ہے وہ بھی ثقہ نہیں ہے یا (لا) تاکید کے لئے زائدہ ہوگا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وما ألوم البیض الا تسخرا لما راین الشمط القفندرا

اس شعر میں الا تاکید کے لئے زائدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں آئے تو بیت اللہ کے سات چکر لگائے اور پھر یہ آیت پڑھی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ: 125) پھر مقام کے پیچھے نماز پڑھی پھر حجر اسود کے پاس آئے اسے استلام کیا پھر فرمایا: ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا آپ نے صفا سے

شروع فرمایا اور فرمایا: صفا اور مروہ شعائر الله سے ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اس پر اہل علم کے نزدیک عمل ہے صفا سے آغاز کرے۔ اگر مروہ سے پہلے شروع کیا تو یہ جائز نہ ہوگا پھر صفا سے شروع کرے۔

مسئلہ نمبر 8: صفا و مروہ کے درمیان سعی کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا: یہ رکن ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعی کرو کیونکہ الله تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کی ہے (2)۔ اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ اور کتب بمعنی اوجب ہے۔ جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (البقرہ: 183) تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے پانچ نمازیں الله تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں (3)۔ ابن ماجہ نے شیبہ کی ام ولد سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا آپ فرمار ہے تھے: ''درمیانی وادی کو تیز چل کر طے کیا جائے گا (4)''۔ جو سعی کو چھوڑ دے یا ایک چکر بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے یا جہاں سے اسے یاد آئے مکہ کی طرف لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے کیونکہ سعی ہمیشہ طواف کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ برابر ہے خواہ حج میں ہو یا عمرہ میں ہو۔ اگرچہ عمرہ میں فرض نہیں۔ اگر اس نے حقوق زوجیت ادا کر لئے ہوں تو اس پر امام مالک کے نزدیک تمام مناسک پورے کرنے کے باوجود اس پر عمرہ اور ہدی ہوگی۔

امام شافعی نے فرمایا: اس پر ہدی ہوگی عمرہ کا کوئی معنی نہیں جب وہ لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے۔ امام ابوحنیفہ نے اور ان کے اصحاب، ثوری اور شعبی نے کہا: سعی واجب نہیں ہے اگر کوئی حاجی سعی چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ اپنے شہر چلا جائے تو اس کا نقصان دم سے پورا کیا جائے گا کیونکہ سعی حج کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ امام مالک کا قول العتبیۃ میں ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت انس بن مالک اور ابن سیرین سے روایت ہے کہ سعی تطوع (نفل) ہے کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا** حمزہ اور کسائی نے یطوع مضارع مجزوم پڑھا ہے اس طرح فمن تطوع خیراً فھو خیر لہ میں پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ تطوع پڑھا ہے۔ تطوع سے مراد وہ نیک عمل ہوتا ہے جو مومن اپنی طرف سے کرتا ہے پس جو نوافل ادا کرتا ہے الله تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے۔ الله تعالیٰ کا بندے کے لئے شکر یہ ہے کہ وہ اسے اپنی اطاعت پر ثابت رکھتا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام شافعی کا نظریہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھ سے اپنے مناسک (حج) سیکھ لو (5)۔

پس یہ حج کے مجمل کا بیان ہوگیا۔ پس فرض ہونا واجب ہے جس طرح نماز کی رکعات تعداد بیان فرمائی۔ جو اس طرح ہو تو

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ مسند امام احمد بن حنبل، صفحہ 421، جلد 6 (دار صادر)
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب السعی بین الصفا والمروۃ، صفحہ 221 (وزارت تعلیم)
5۔ السنن الکبری للبیہقی، کتاب الحج، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)

اتفاق نہیں ہوتا کہ سنت ہے یا نفل ہے۔

طلیب نے کہا: حضرت ابن عباس نے ایک قوم کو صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے دیکھا تو فرمایا: یہ تمہیں تمہاری ماں ام اسماعیل نے وراثت میں دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح بخاری میں ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 9: کسی کے لئے بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی سوار ہو کر نی جائز نہیں مگر عذر ہو تو جائز ہے۔ اگر عذر کی بناء پر سوار ہو کر طواف کیا تو اس پر دم ہوگا اور اگر غیر معذور نے سوار ہو کر طواف کیا تو وہ دوبارہ ادا کرے اگر بیت اللہ کے قریب ہو اور اگر دور جا چکا ہو تو ہدی دے۔ یہ ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود طواف کیا اور فرمایا: خذوا عنی مناسکم۔ مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔ اور عذر کی بناء پر ہم نے جائز قرار دیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر کیا تھا اور اپنی کھونٹی سے حجر اسود کو استلام کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: جب انہوں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی: لوگوں کے پیچھے طواف کر دراں حالیکہ تو سوار ہو (1)۔

ہمارے اصحاب نے اونٹ پر طواف کرنے اور انسان کی پیٹھ پر طواف کرنے کے درمیان فرق کیا ہے اگر انسان کی پیٹھ پر طواف کرے گا تو جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت وہ طواف کرنے والا نہ ہوگا بلکہ اٹھانے والا طواف کرنے والا ہوگا جب اونٹ پر طواف کرے گا تو وہ خود طواف کرنے والا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ اختیار کا تفرقہ ہے۔ رہا کفایت کرنا تو یہ کفایت کر جائے گا۔ جیسے اگر کسی پر غشی طاری ہو اور اسے اٹھا کر طواف کرایا جائے یا اٹھا کر عرفات میں اسے وقوف کرایا گیا تو اس کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں، یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو نازل شدہ بینات اور ہدایت کو چھپاتا ہے وہ ملعون ہے۔ اس کی مراد میں اختلاف ہے بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود اور عیسائی راہب ہیں جو حضرت محمد ﷺ کے امر کو چھپاتے تھے۔ یہود نے رجم کے امر کو چھپایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق کو چھپایا یہ ہر شخص میں عام ہے (خواہ) جس نے دین کے علم کو چھپایا جبکہ اس کے پھیلانے کی ضرورت تھی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں اس کی تفسیر کی گئی ہے جس سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب المریض یطوف راکباً، صفحہ 221، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کوئی علمی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا تھا پھر اس نے اسے چھپایا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز آگ کی لگام سے لگام دے گا۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص نے روایت کیا ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول اس کے معارض ہے: تو کسی قوم کے سامنے ایسی حدیث بیان کرے جن تک ان کی عقول نہیں پہنچیں گی تو وہ بعض لوگوں کے لئے فتنہ کا باعث ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو وہ بیان کرو جس کو وہ سمجھتے ہوں کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے (2)۔ یہ بعض علوم پر محمول ہے۔ جس طرح علم کلام ہے یا ایسا علم جس کے سمجھنے میں تمام لوگ برابر نہ ہوں۔ عالم کا حکم یہ ہے کہ وہ وہ چیز بیان کرے جو سمجھی جائے اور ہر انسان کو اس کے مرتبہ کے مطابق ڈیل کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ نمبر 2: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کا ارادہ فرمایا تھا جب آپ نے فرمایا تھا: اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو میں تمہیں کوئی حدیث بیان نہ کرتا (3)۔ اس سے علماء نے علم حق کی تبلیغ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ عمومی طور پر علم کو بیان کرنا اس پر اجرت لئے بغیر کیونکہ اس پر اجرت لینے کا مستحق نہیں ہوتا جس کا اس پر کرنا لازم ہو۔ جس طرح اسلام پر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

آیت کی تحقیق یہ ہے کہ عالم جب علم کو چھپانے کا قصد کرے گا تو نافرمان ہوگا اور جب علم چھپانے کا قصد نہ کرے تو تبلیغ لازم نہیں۔ جب اسے معلوم ہو کہ غیر کے پاس یہ علم ہے اور جس سے کوئی بات پوچھی جائے تو اس آیت اور حدیث کی وجہ سے اس پر تبلیغ کرنا واجب ہے اور کافر کو قرآن اور علم سکھانا جائز نہیں حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اسی طرح جھگڑالو بدعتی اور جھگڑالو آدمی کو تعلیم دینا جائز نہیں تاکہ اہل حق سے جھگڑے۔ اور کسی خصم کو ایسی حجت نہ سکھائی جائے جس کے ذریعے مال ظلماً لے لے۔ اور بادشاہ کو ایسی تاویل نہ سکھائے جس کے ذریعے وہ رعیت کو تکلیف دے اور بے وقوف لوگوں میں ایسی رخصت نہ پھیلائے کہ وہ اس کو ممنوعات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کا راستہ بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمت کو اس کے اہل سے مت روکو ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے اور غیر اہل لوگوں کو حکمت نہ سکھاؤ ورنہ تم حکمت پر ظلم کرو گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، فرمایا: (موتیوں کو خنازیر کی گردنوں میں نہ لٹکاؤ (4)) یعنی فقہ کی تعلیم ایسے شخص کو نہ دو جو اس کا اہل نہیں۔ سحنون نے کہا: حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی حدیث شہادت کے بارے میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں ہے ''جس سے علم کے متعلق پوچھا گیا (5)'' یہ نہیں فرمایا جس نے شہادت کو بیان نہیں کیا۔ ظاہر پر باقی رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ اس پر کوئی ایسی چیز وارد ہو جو اس کو زائل کر دے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من سئل من علم فکتمہ، صفحہ 23 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، صفحہ 24، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 121، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 22، جلد 1 (وزارت تعلیم) 4۔ تاریخ بغداد، صفحہ 350، جلد 9 (دار الکتب المصریۃ)

5۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب فی کتمان العلم، صفحہ 89، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى یہ منصوص علیہ اور مستنبط کو شامل ہے کیونکہ ھدیٰ کا اسم تمام کو شامل ہے۔ اس میں ایک شخص کے قول کے عمل کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اس پر بیان واجب نہیں مگر اس کے قول کا قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا (البقرہ:160) ان کی خبر کے ساتھ بیان کے وقوع کا حکم لگایا۔

اگر کہا جائے کہ یہ جائز ہے کہ ہر ایک کو علم چھپانے سے منع کیا گیا ہو اور بیان کا حکم دیا گیا ہو تا کہ خبر دینے والے کثیر ہوں اور ان کی خبر متواتر ہو۔ ہم کہتے ہیں: یہ غلط ہے کیونکہ کتمان سے منع نہیں کیا گیا مگر انہیں جن پر اتفاق جائز ہو اور جن کا کتمان پر اتفاق جائز ہے ان کی خبر علم کا موجب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ نمبر 4: جب مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى فرمایا: تو یہ دلیل ہے کہ بینات اور ہدایت کے علاوہ جو علم ہے اس کا چھپانا جائز ہے، خصوصاً جب اس کے اظہار میں خوف ہو تو اس کا چھپانا مزید مؤکد ہو گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو ترک فرمایا جب انہیں خوف تھا۔ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (علم کے) یاد کیے۔ ایک برتن کو میں نے پھیلا دیا اور دوسرا برتن اگر میں اسے پھیلاؤں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے۔ اس روایت کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو عبداللہ نے فرمایا: بلعوم، کھانے والی نالی کو کہتے ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ وہ علم تھا جس کو حضرت ابو ہریرہ نے نہیں پھیلایا اور انہیں اس کے پھیلانے میں فتنہ اور قتل کا خوف تھا۔ یہ علم فتنوں کے امر کے متعلق تھا منافقین اور مرتدین کی شخصیات پر نص کے متعلق تھا۔ ہر وہ علم کہ بینات اور ھدیٰ کے متعلق نہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ، بَيَّنّٰهُ میں ضمیر کا مرجع بینات اور ہدایت ہیں۔ الْكِتٰبِ اسم جنس ہے اور اس سے مراد تمام کتب منزلہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے بری ہوتا ہے اور ان کو ثواب سے دور رکھتا ہے اور انہیں کہتا ہے تم پر میری لعنت ہو جس طرح شیطان لعین کو کہا وان علیك لعنتی۔ لغت میں لعن کا معنی دور کرنا اور دھتکارنا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ قتادہ اور ربیع نے کہا: اللاعنون (لعنت کرنے والے) سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ واضح اور کلام کے مقتضیٰ پر جاری ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد حشرات الارض اور جانور ہیں جنہیں علماء سوجو علم کو چھپانے والے ہوتے ہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے خشکی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس وہ انہیں لعنت کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا: درست قول ان علماء کا ہے جو کہتے ہیں کہ اللاعنون سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ اور رہا یہ کہ اس سے مراد زمین کے جانور ہیں اس کی حقیقت پر آگاہی صرف نص یا خبر لازم سے ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہم کوئی چیز نہیں پاتے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: اس کے متعلق ایک خبر وارد ہے جسے حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ کے تحت فرمایا: دواب الارض یعنی اللاعنون سے مراد زمین کے جانور ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے محمد بن الصباح سے روایت کیا ہے ہمیں عمار بن محمد نے لیث سے انہوں نے ابوالمنہال سے انہوں نے زاذان سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اگر کہا جائے کہ عقول اور غیر عقول کو کیسے جمع کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر عقول کی طرف عقول والوں کا فعل منسوب کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف: 4)۔ یہاں ساجدات نہیں فرمایا۔ فرمایا: لم شهدتم علینا۔ اور فرمایا: وَ تَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ (اعراف: 198) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ ان شاء اللہ آگے وضاحت آئے گی۔

حضرت براء بن عازب اور حضرت ابن عباس نے کہا اللّٰعِنُوْنَ سے مراد جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے اس کی چیخ جن وانس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے اور ہر سننے والا اس کو لعنت کرتا ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: ایک شخص اپنے ساتھی کو لعنت کرتا ہے پھر وہ لعنت آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے پھر وہ نیچے آتی ہے تو وہ اس شخص میں اس کی اہلیت نہیں پاتی تو وہ پھر لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے اسے بھی اس کا اہل نہیں پاتی تو وہ ان یہود پر واقع ہوتی ہے جنہوں نے نازل شدہ کلام کو چھپایا (3)، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ سے یہی مراد ہے۔ پس ان میں سے جو مر جاتا ہے اس سے لعنت اٹھ جاتی ہے اور جو باقی یہود ہوتے ہیں ان میں موجود رہتی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۰﴾

''البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں (جواب تک چھپاتے رہے) تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں، اچھے اعمال کرنے والوں اور توبہ کی طرف لوٹنے والوں کی استثنا فرمائی۔ ہمارے علماء کے نزدیک توبہ میں صرف یہ کہنا (میں نے توبہ کی) کافی نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے پہلے قول وعمل کے خلاف دوسرا قول وفعل ظاہر ہو اگر وہ مرتد تھا تو وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ شرائع اسلام کو ظاہر کرنے والا ہو۔ اگر وہ گنہگاروں سے ہو تو اس سے نیک عمل ظاہر ہو اور اہل فساد اور ان احوال سے کنارہ کش ہو جس پر پہلے وہ تھا اگر وہ بت پرستوں میں سے تھا تو وہ بت پرستوں سے علیحدہ ہو جائے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح پہلے جس حالت پر تھا اس کا عکس ظاہر کرے۔ توبہ کا بیان اور اس کے احکام ان شاء اللہ سورۂ نساء میں آئیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ بَیَّنُوْا سے مراد شراب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب لعقوبات، صفحہ 300 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب جاء فی عذاب القبر، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اللعن، صفحہ 316، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے مٹکے توڑ دینا اور شراب کو بہادینا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد تورات میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور آپ کی اتباع کا وجوب جو موجود ہے اسے بیان کرنا ہے۔ عموم اولیٰ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یعنی جس حالت پر تھے اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ كُفَّارٌ واو حالیہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: مجھے میرے اکثر مشائخ نے بتایا کہ معین کافر پر لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کی وفات کی حالت معلوم نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لعنت کے اطلاق میں کفر پر وفات شرط رکھی ہے۔ اور وہ روایت جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے متعین کفار پر لعنت کی (1)۔ تو یہ اس لئے تھا کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے انجام کا علم تھا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک ظاہر حال کی وجہ سے لعنت کرنا اور اسے قتل کرنا اور اس سے قتال کرنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! عمرو بن العاص نے میری ہجو کی اسے معلوم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس پر لعنت کر اور اس کی ہجو کر جتنی اس نے میری ہجو کی (2)، آپ ﷺ نے عمرو بن العاص پر لعنت کی، اگرچہ ایمان، دین اور اسلام اس کا انجام تھا۔ آپ ﷺ نے انصاف فرمایا کہ عرض کی: جتنی اس نے میری ہجو کی ہے اتنی اس کی ہجو فرما، زیادتی نہیں کی تاکہ وہ عدل وانصاف کو جان لے اور ہجو کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا یہ باب الجزاء سے ہے۔ اس وصف سے ابتدا نہیں کی۔ جس طرح مکر، استہزا اور خدیعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند وبالا ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: بغیر تعیین کے تمام کفار پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام مالک نے داؤد بن حصین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اعرج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: خواہ کفار ذمی ہوں یا ذمی نہ ہوں یہ واجب نہیں۔ لیکن جو کفار پر لعنت کرے اس کے لئے مباح ہے کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا اور دین اور دینداروں سے عداوت کی۔ اسی طرح جو سر عام گناہ کرے جیسے شراب پینے والے، سود کھانے والے اور جو عورتوں میں سے مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں اور مردوں میں سے جو عورتوں کی مشابہت

1۔ احکام القرآن لابن عربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 548، جلد 13، حدیث نمبر 37431 (مکتبۃ التراث الاسلام)

اختیار کرتے ہیں ان کے علاوہ جن کے متعلق احادیث میں لعنت وارد ہے۔

مسئلہ نمبر 2: کافر کو لعنت کرنا کفر پر زجر کے اعتبار سے نہیں بلکہ وہ کفر پر جزا اور اس کے کفر کے قبح کے اظہار کے طور پر ہے کافر مردہ ہو یا مجنون ہو۔ سلف کی ایک قوم نے کہا: جو کافر مجنون ہے یا جو کافر مر چکا ہے اس کو لعنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ بطریق جزا جائز ہے اور نہ بطریق زجر کیونکہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس معنی کے اعتبار سے آیت سے مراد یہ ہوگا کہ لوگ قیامت کے دن اسے لعنت کریں گے تاکہ وہ اس سے متاثر ہو اسے نقصان پہنچے اور اس کا دل دکھے...... تو یہ اس کے کفر پر جزا ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت: 25)

اس قول پر دلیل ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینا ہے کہ وہ ان پر لعنت کرتا ہے یہ بطور امر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: معین گنہگار کو لعنت کرنا بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک بار شراب پینے والے کو لایا گیا تو محدود لوگوں میں سے کسی نے کہا اللہ اس پر لعنت کرے اسے کتنی بار لایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے معاون نہ ہو۔ آپ نے اس کے لئے اخوت کی حرمت کا ذکر کیا، یہ شفقت کا موجب ہے، یہ حدیث صحیح ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے معین گنہگار کو لعنت کرنے میں جواز کا قول کیا ہے۔ انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نعیمان کے حق میں فرمایا جبکہ اس پر حد قائم ہو چکی تھی۔ اور جس پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم ہو جائے اسے لعنت کرنا مناسب نہیں اور جس پر حد قائم نہ ہوا سے لعنت کرنا جائز ہے۔ خواہ اس کا نام لیا گیا ہو یا متعین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لعنت نہیں فرماتے تھے مگر اس پر جس پر لعنت واجب ہوتی ہے جب تک وہ اس لعنت کی موجب حالت پر باقی رہتا، جب وہ اس جرم سے توبہ کر لیتا اور اس کو ختم کر دیتا، اور حد اسے پاک کر دیتی تو لعنت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان نے واضح کیا ہے: جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے حد لگاؤ اور اسے برا نہ کہو (2)...... یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تثریب (برا بھلا کہنا) اور لعنت کرنا حد لگنے سے پہلے اور توبہ کرنے سے پہلے ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

ابن عربی نے کہا: گنہگار پر مطلقاً لعنت کرنا بالاجماع جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے جو انڈا چوری کرتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے۔ اللعن کا اصل معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندوں کی طرف سے لعنت، دھتکارنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت عذاب ہے۔ حسن بصری نے والملائکۃ والناس اجمعون حالت رفعی میں پڑھا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا، صفحہ 70، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب لعن السارق، صفحہ 1003، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1) اس کی تاویل یہ ہے: اولئك جزاء هم ان يلعنهم الله و يلعنهم الملائكة و يلعنهم الناس اجمعون۔ جیسے تو کہتا ہے: کرھت قیامر زیدٍ و عمروٌ و خالدٌ کیونکہ اس کا معنی ہے کرھت انْ قامر زیدٌ۔ حسن کی قراءت مصاحف کے مخالف ہے۔

اگر کہا جائے: تمام لوگ تو لعنت نہیں کرتے کیونکہ ان کی قوم تو انہیں لعنت نہیں کرتی۔ اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں: (۱) اکثر لوگوں کی طرف سے لعنت ہوتی ہے اس لئے تمام لوگوں کی لعنت کا اطلاق کیا گیا۔ اکثر کو اقل پر غلبہ دیا گیا۔ (۲) سدی نے کہا: ہر ایک ظالم پر لعنت کرتا ہے جب کافر ظالم پر لعنت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے۔ (۳) ابوالعالیہ نے کہا: اس سے مراد قیامت کے دن کی لعنت ہے تمام لوگوں کے ساتھ ان کی قوم بھی انہیں لعنت کرے گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت:25)

پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے یعنی لعنت کی جزا میں۔ بعض نے فرمایا ان کا لعنت میں خلود ہمیشہ ہے۔ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی کسی وقت بھی عذاب سے مؤخر نہیں کئے جائیں گے خٰلِدِيْنَ، علیھم میں ہا اور میم سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس میں عامل علیھم کا قول ظرف ہے۔ کیونکہ اس میں لعنت کے استقرار کا معنی ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

''اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی خدا بجز اس کے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ جب اللہ تعالیٰ نے حق کو چھپانے سے ڈرایا تو یہ بیان فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جس کا اظہار واجب ہے اور جس کا چھپانا جائز نہیں وہ توحید کا امر ہے اور اس کو برہان کے ذکر سے ملایا، نظر وفکر کا طریقہ سکھایا اور وہ کائنات کے عجائب میں غور وفکر ہے تا کہ وہ جان لے کہ اس کائنات کے لئے کوئی فاعل ہونا ضروری ہے جس کے مشابہ کوئی شی نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قریش کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لئے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اور مشرکین کے لئے تین سو ساٹھ بت تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ ایک ذات ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ نفی اور اثبات ہے اس کا اول کفر ہے اور اس کا آخر ایمان ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

شبلی سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: اللہ اللہ کہتے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کہتے تھے، اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: مجھے ڈر رہتا ہے کہ میں نفی کا کلمہ کہوں اور اقرار کا کلمہ نہ کہہ سکوں۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علوم دقیقہ میں سے ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنی کتاب میں نفی اور اثبات میں ذکر فرمایا اور اس کا تکرار فرمایا اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے اس کے کہنے والے کے لئے بہت بڑے ثواب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 232، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اخلاص، صفحہ 172، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کا وعدہ فرمایا۔ موطا، بخاری اور مسلم وغیرہم نے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا آخری کلام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا (1) اور اس سے مقصود دل سے یہ تسلیم کرنا ہے، زبان سے کہنا نہیں ہے۔ اگر کسی نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور وہ فوت ہوا جبکہ اس کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ان تمام صفات پر تھا جو اللہ تعالیٰ کے لئے واجب ہیں تو اہل سنت کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسم واحد اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ کا معنی اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں بیان کر دیا ہے۔ والحمد للہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا رہے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں، جو حکم کا پابند ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے۔ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں"۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: عطا نے کہا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار قریش نے کہا: ایک خدا سب لوگوں کی باتیں کیسے سنتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ سفیان نے اپنے باپ سے انہوں نے ابوالضحیٰ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے کہا اس پر کوئی دلیل بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (2) گویا انہوں نے نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے توحید کی دلیل بیان فرمائی کہ یہ عالم اور اس کی عجیب تخلیق کا ضرور کوئی بانی اور صانع ہے۔ اور سٰمٰوٰت کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ یہ مختلف اجناس ہیں اور ہر آسمان کی جنس، دوسرے سے مختلف ہے اور زمین کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ تمام مٹی ہی ہیں۔ واللہ اعلم

آسمانوں کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ یہ بلند ہیں اور نہ تو ان کے نیچے کوئی ستون ہے اور نہ ان کے اوپر رسی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خرق عادت پر دلیل ہے۔ اگر ایک نبی آئے وہ ہوا میں ایک پہاڑ کو بغیر کسی سہارا کے ٹھہرانے کا چیلنج کرے تو یہ معجزہ ہوگا۔ پھر آسمان میں سورج، چاند اور چلنے والے ستارے اور مشرق و مغرب میں چمکتے اور روشن ستارے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب التلقین، صفحہ 88، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 75، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

چھپے ہوئے ستارے دوسری نشانی ہیں۔

اور زمین کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اس کے دریا، اس کی نہریں، اس کی معدنیات، اس کے درخت، اس کا ہموار ہونا اور اس کے نشیبی علاقے یہ سب صانع کی قدرت کی دلیل ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا ہے اس حیثیت سے کہ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا اوصاف میں مختلف ہونا ہے جیسے نور و ظلمت میں، طول و قصر میں۔ اللیل یہ لیلة کی جمع ہے۔ جیسے تمرة و تمر، نخلة و نخل اور لیلة کی جمع لیالی اور لیالِ بھی آتی ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ یہ جمع کے قیاس سے جدا ہے، جسے شبه و مشابه، حاجة و حوائج، ذکر و مذاکر، گویا قیاساً لیالی کی جمع لیلاۃ ہوتی۔ لیلاۃ کو شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فی کل یوم وکل لیلاۃ

ایک اور شاعر نے کہا:

فی کل یوم ما وکل لیلاہ حتی یقول کل راءٍ اذا رأہ

یا ویحة من جمل ما اشقاہ

ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی پرندے کو بھی لیلاً کہا جاتا ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔ النہار کی جمع نُهُرٌ و اَنهرَةٌ۔ احمد بن یحیی ثعلب نے کہا: نہر کی جمع نُهُر ہے اور یہ نہار کی جمع الجمع ہے۔ بعض نے فرمایا: النہار ایسا اسم مفرد ہے جس کی جمع نہیں بنائی جاتی کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے۔ جس طرح تیرا قول الضیاء ہے یہ قلیل و کثیر پر واقع ہوتا ہے۔ پہلا اکثر ہے۔ شاعر نے کہا:

لولا الثریدان هلکنا بالضمر ثرید لیل و ثریدٌ بالنهر (1)

ابن الفارس نے کہ النہار معروف ہے اور اس کی جمع نہر اور انہار ہے اور کہا جاتا ہے النہار کی جمع نہر بنائی جاتی ہے۔ النہار سے مراد طلوع فجر اور غروب شمس کے درمیان کی روشنی ہے۔ رجلٌ نَهِرٌ، صاحب نہار کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: النہار، حباری (چکور) پرندے کے بچے کو کہتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے کہا: نہار کا آغاز سورج کے طلوع سے ہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کو نہار سے شمار نہیں کیا جاتا۔ ثعلب نے کہا: عربوں کے نزدیک اس کا اول سورج کا طلوع ہونا ہے اور اس نے امیہ بن ابی الصلت کے شعر سے استشہاد کیا ہے۔

والشمس تطلع کل آخر لیله حمراء یصبح لونها یتورّد

اور عدی بن زید کا شعر ہے:

و جاعل الشمس مصراً لا خفاء به بین النهار و بین اللیل قد فصلا

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 2 (داراحیاء التراث العربیۃ)

اور کسائی نے یہ شعر لکھا ہے:

اذا طلعت شمس النهار فانها　　أمارة تسليمي عليك فسلمي

اور زجاج نے ''کتاب الانواء'' میں کہا ہے: دن کا آغاز سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہے(1)۔

ابن انباری نے زمانے کی تین اقسام بنائی ہیں: ایک کو اس نے محض رات بنایا ہے اور وہ سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر کے طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور دوسری قسم کو محض دن بنایا ہے اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے اس کے غروب ہونے تک کا وقت ہے ایک اور قسم دن اور رات کے درمیان مشترک بنائی ہے اور وہ فجر کے طلوع ہونے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کا وقت ہے یہ رات کی تاریکی کا بقایا ہے اور دن کی روشنی کا آغاز ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے، جس طرح کہ ابن فارس نے المجمل میں روایت کیا ہے اور اس پر دلیل صحیح مسلم میں حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے، فرمایا: جب یہ ارشاد حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ: 187) نازل ہوا تو عدی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھتا ہوں ایک دھاگہ سفید اور ایک دھاگہ سیاہ، ان کے ساتھ دن سے رات کی پہچان کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے(2)۔ یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قسموں میں فقہ کا مقتضا بھی یہی ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوتے ہیں۔ پس جو قسم اٹھائے کہ لا یکلم فلانا نھارا میں فلاں سے پورا دن کلام نہیں کروں گا تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے بھی کلام کرے گا تو حانث ہوگا، اور پہلے قول کے مطابق حانث نہ ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کا قول اس میں فیصل اور حکم ہے۔ اور رہا لغت کے ظاہر اور سنت کے اعتبار سے تو روشنی کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کا وقت وسیع ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

ملكت بها كفي فانهرت فتقها　　يرى قائم من دونها ما وراءها

اور حضرت حذیفہ سے مروی حدیث بھی اسی قول پر دلالت کرتی ہے جس کو نسائی نے نقل فرمایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزوں کی آیات کے ضمن میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ، الْفُلْكِ سے مراد کشتیاں ہیں۔ مفرد اور جمع کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور مذکر اور مونث کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے(3)۔ لیکن مفرد اور جمع کی حرکات ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ ایسی ہیں کہ گویا جمع کی دوسری بنا ہے۔ اور اس پر دلیل تثنیہ کا درمیانی حرف ہے۔ عرب کہتے ہیں: فُلْكان، الفلك مفرد مذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ (یاسین) یہاں مذکر استعمال ہوا ہے اور فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 233، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 349، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 1 (دار احیاء التراث العربیہ)

وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ۔ یہاں مونث ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور فرمایا: اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ (یونس: 22) اس آیت میں جمع استعمال ہوا ہے گویا جب یہ واحد ہو اور مرکب کے معنی میں ہو تو مذکر ہوتا ہے اور سفینة کے معنی میں ہو تو مونث ہوتا ہے۔ فلك السماء۔ جس پر ستارے گردش کرتے ہیں۔ فلکت الجاریة جب بچی کے پستان گول ہو جائیں۔ اسی سے ہے فلكة المغزل، چرخہ کا پرتلہ۔ کشتی کو فلک کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی ہے۔ آیت میں الْفُلْكِ کو بطور قدرت کی نشانی پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسخر کر دیا ہے حتیٰ کہ پانی کی سطح پر چلتی ہے اور اتنی بوجھل ہونے کے باوجود پانی کے اوپر ٹھہرتی ہے سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور جبریل امین نے انہیں کہا: پرندے کے سینہ پر بنا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسے بنایا جس طرح جبریل امین نے آپ کو دکھایا جبکہ یہ عالمین میں وراثت ہے، کشتی ایک الٹا پرندہ ہے پانی اس کے نیچے ہے جس طرح ہوا اس کے اوپر ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت اور اس کی مثل آیات سمندر پر سوار ہونے کے جواز کی دلیل ہیں خواہ وہ سوار ہونا تجارت کے لئے ہو یا عبادت کے لئے ہو جیسے حج اور جہاد۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے (1)۔ اور حضرت انس بن مالک کی حدیث ام حرام کے واقعہ کے متعلق ہے۔ ان دونوں احادیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث کو ان میں سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو بشر بن عمر نے امام مالک سے انہوں نے اسحاق سے انہوں نے حضرت انس سے انہوں نے حضرت ام حرام سے روایت کیا ہے، انہوں نے اسے مسند ام حرام میں شامل کیا ہے نہ کہ حضرت انس کی مسند میں۔ اسی طرح حضرت انس سے بندار محمد بن بشار نے اس کو بیان کیا ہے اس میں جہاد کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے سمندر پر سوار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ جب جہاد کے لئے سوار ہونا جائز ہے تو فرض حج کے لئے سوار ہونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے سمندر پر سوار ہونے سے منع کرنا مروی ہے جبکہ قرآن و حدیث اس قول کا رد کرتے ہیں۔ اگر اس کا سوار ہونا مکروہ ہوتا یا جائز نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو منع فرما دیتے جنہوں نے کہا تھا: ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں (2)۔ یہ آیت اور اس کی مثل آیات اس غرض سے نص ہیں۔ ان کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور اس کی تاویل کی جائے گی جو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے وہ احتیاط اور طلب دنیا اور کثرت دنیا کی طلب کے لئے سوار ہونے پر محمول

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب الوضوء بماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

جامع ترمذی، کتاب الطھارۃ، باب ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطھارۃ، ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ہوگا، فرائض کی ادائیگی پر محمول نہیں ہوگا۔ اور معنی کی جہت سے اس کے اوپر سوار ہونے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو زمین کے درمیان رکھا اور باقی مخلوق کو زمین کے کناروں پر رکھا۔ اور منافع کو دونوں جہتوں کے درمیان تقسیم فرمایا اور ان منافع کو حاصل نہیں کیا جا سکتا مگر سمندر عبور کرنے کے بعد۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کا راستہ کشتی کے ذریعے آسان فرمایا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک عورت کے لئے حج کی خاطر سمندری سفر کو ناپسند کرتے تھے اور جہاد کے لئے زیادہ مکروہ ہوگا۔ قرآن و سنت اس قول کو رد کرتے ہیں مگر بعض اہل بصرہ نے کہا: امام مالک نے اس لئے مکروہ فرمایا کیونکہ حجاز میں کشتیاں چھوٹی تھیں، عورتیں اس میں پردہ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ تنگ ہوتی تھیں اور لوگوں کی ان میں بھیڑ ہوتی تھی اور مدینہ سے مکہ کی طرف جانے کا خشکی کا راستہ بھی موجود تھا، اس لئے امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بڑی کشتیاں جیسے اہل بصرہ کی کشتیاں ہیں ان میں کوئی حرج نہیں اور فرمایا: اصل یہ ہے کہ حج آزاد، بالغ آدمیوں میں سے حج کی استطاعت رکھنے والے پر فرض ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، جبکہ راستہ امن والا ہو۔ اس میں سمندری یا بری راستہ کی تخصیص نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب و سنت اور معنی ان دونوں سفروں کے لئے اس پر سوار ہونے کی اباحت پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ عبادت ہو یا تجارت ہو پس یہ حجت ہے اور اس میں نمونہ ہے مگر سمندر پر سوار ہونے میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں، بہت سے سواروں پر اس پر سوار ہونا آسان ہوتا ہے اور ان کے لئے دشوار نہیں ہوتا، جبکہ بعض دوسروں پر اس کا عبور کرنا دشوار ہوتا ہے اور اس مسئلہ میں کمزور ہوتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور جو ایسی حالت میں فرائض ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے، پس پہلے لوگوں کے لئے جائز ہے اور دوسرے لوگوں پر حرام ہے اور ممنوع ہے اور اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: سمندر جب طغیانی میں ہو تو کسی کے لئے بھی اس پر سوار ہونا جائز نہیں اور اس زمانہ میں بھی سوار ہونا جائز نہیں جبکہ غالب گمان عدم سلامتی کا ہو۔ ان کے نزدیک ایسے زمانہ میں سوار ہونا جائز ہے جس میں غالب گمان سلامتی کا ہو وہ لوگ جو سلامتی کی حالت میں سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور نجات پاتے ہیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں اور وہ جو اس میں ہلاک ہوتے ہیں وہ روکے جاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ یعنی تجارت اور دوسرے مقاصد جس کے ساتھ لوگوں کے احوال درست ہوتے ہیں وغیرہ منافع کے ساتھ چلتی ہے۔ سمندر پر سوار ہونے کے ساتھ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور جو اس میں سامان اٹھاتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے اور جنہوں نے دین میں طعن کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہاری کتاب میں فرماتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (انعام: 38)

پس جو کھانے کی مصلحت کی چیزیں ہیں مثلاً نمک، کالی مرچ وغیرہ میں ان کا ذکر کہاں ہے تو اس کو بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ کے ساتھ جواب دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ یعنی بارشیں جن کے ساتھ عالم کی

بڑھوتری ہے، نباتات اور خوراک کا پیدائش ہے(1) اور اس سے کچھ جمع کیا جاتا ہے تاکہ بارشوں کے نہ ہونے کے وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (المومنون: 18)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، بَثَّ کا معنی تفریق کرنا اور پھیلانا ہے۔ اسی سے كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ (القارعۃ) ہے دَآبَّةٍ کا لفظ تمام حیوانوں کو جامع ہے۔ بعض نے ان سے پرندوں کو نکالا ہے وہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6)

پرندہ بعض حالات میں اپنے پیروں پر چلتا ہے۔ اعشی نے کہا:

دبیب قطا البطحاء فی کل منہل

علقمہ بن عبدہ نے کہا:

صواعقها لطيرهن دبيبُ

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ ہواؤں کا چلنا۔ تصریف سے مراد انہیں عقیم اور باربردار کر کے چلانا ہے اور کچھ کو مدد کرنے والی اور ہلاک کرنے والی بنا کر چلانا ہے، کچھ کو ٹھنڈی اور کچھ کو گرم بنا کر چلانا ہے، کچھ کو نرم اور کچھ کو سخت بنا کر چلانا ہے۔ بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ سے مراد ان کا جنوباً شمالاً (مشرق و مغرب) چلانا ہے۔ نقصان دہ اور فائدہ مند بنا کر چلانا ہے اور یکبارگی ہوا کا چلانا ہے اس سے مراد وہ ہوا ہے جو ان دونوں ہواؤں کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ سے مراد ان ہواؤں کا اتنی مقدار میں چلانا ہے جتنی کہ وہ کشتیاں سامان اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، ان کو برداشت کر لیں۔ اسی طرح چھوٹی کشتیوں کے لئے ان کے مطابق ہواؤں کو چلانا ہے اور ان سے ان ہواؤں کو روکنا ہے جو انہیں نقصان دیتی ہیں۔ ان کے بادبانوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں اگر ہوا ایک جسم بن کر آتی تو اس کے بادبانوں کو پھاڑ دیتی اور انہیں غرق کر دیتی۔

الرِّيٰحِ، یہ ریح کی جمع ہے، اس کا یہ نام اس لئے ہے کہ عام طور پر رحمت کو لاتی ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ **الريح من روح الله تأتي بالرحمة و تأتي بالعذاب فاذا رأيتموها فلا تسبوها و اسألوا الله خيرها و استعيذوا بالله من شرها۔**(2) (یعنی ہوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو لاتی ہے اور کبھی عذاب کو لاتی ہے، جب تم ہوا کو دیکھو تو اسے برا مت کہو اور اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو)۔ اسی حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ رحمت لاتی ہے اور کبھی عذاب لاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو(3)۔ نبی کریم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، صفحہ 339، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 273 (وزارت تعلیم)

ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ رحمن کے نفس سے ہے (1)۔ معنی یہ ہے: اس نے ہواؤں میں تفریج، تنفیس اور ترویح رکھی اور اور اضافت، فعل کے طریق سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا بنایا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نصرت بالصبا و أهلكت عادٌ بالدبور۔ (2) (صبا کے ساتھ میری مدد کی گئی اور عاد کو دبور کے ساتھ ہلاک کیا گیا)۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے جنگ احزاب میں ہوا کے ذریعے تکلیف کو دور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب: 9) (پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے) کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فلاں سے دنیا کی مصیبتوں سے ایک مصیبت کو دور فرمایا۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں اس کی ایک مصیبت کو دور کرے گا (3)۔ شاعر نے کہا:

كأن الصبا ريح اذا ما تنسمت علی كبد مهموم تجلت هومها

ابن عربی نے کہا: النسیم ہوا کے چلنے کی ابتدا کو کہتے ہیں۔ الریح کی اصل روح ہے اسی وجہ سے جمع قلت ارواح آتی ہے ارياح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ واوی ہے کثرت کی جہت سے اور یا کی مناسبت کی طلب کی وجہ سے ریاح کہا جاتا ہے اور حضرت حفصہ کے مصحف میں و تصریف۔ رواح ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ حمزہ اور کسائی نے الریح مفرد پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف، کہف، ابراہیم، النمل، الروم، فاطر، شوریٰ اور جاثیہ میں پڑھا ہے ان کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حمزہ اور کسائی کی ابن کثیر نے سورہ اعراف، النمل، الروم، فاطر اور شوریٰ میں موافقت کی ہے اور حمزہ نے الریح لواقح کو مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے هو الذی ارسل الریح کو سورۂ الفرقان میں مفرد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تمام جگہوں پر جمع کا صیغہ پڑھا ہے سوائے ان الفاظ کے جو سورہ ابراہیم اور شوریٰ میں ہیں۔ ان کو نافع کے سوا کسی نے جمع نہیں پڑھا۔ ان مواقع کے علاوہ میں ساتوں قراء کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو سورہ روم میں ہم نے ذکر کیا ہے وہ دوسرا مقام ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (روم: 48) اور الریاح مبشرات میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ابوجعفر یزید بن القعقاع نے پورے قرآن میں الریاح کو جمع پڑھا ہے جب اس پر الف لام آیا ہے، سوائے ان مقامات کے تھوی به الریح۔ الریح العقیم اور اگر الف، لام اس پر نہ ہو تو مفرد پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے الریاح کو مفرد پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسم جنس ہے، قلیل و کثیر پر دلالت کرتا ہے اور جنہوں نے جمع پڑھا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ ہوائیں مختلف جہات سے چلتی ہیں اور بعض نے رحمت والی ہواؤں کو جمع پڑھا ہے اور عذاب والی ہوا کو واحد پڑھا ہے۔ انہوں نے اس میں قرآن کے اغلب قول کا اعتبار کیا ہے جیسے

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، صفحہ 298، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، صفحہ 141، جلد 1 (وزارت تعلیم) و صحیح مسلم، کتاب الاستسقاء، صفحہ 295، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، صفحہ 345، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الریاح مبشرات۔ الریح العقیم۔ قرآن میں رحمت کے ساتھ جمع اور عذاب کے ساتھ مفرد کا ذکر ہے سوائے سورہ یونس کے ان الفاظ کے۔ و جرین بھم بریح طیبۃ۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب ہوا چلتی تو آپ یہ دعا پڑھتے: اللھم اجعلھا ریاحًا و لا تجعلھا ریحًا(1)۔ (یا اللہ! اسے رحمت بنا اور اسے ریح نہ بنا)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عذاب کی ہوا سخت ہوتی ہے، اس کے اجزاء ملے ہوئے ہوتے ہیں گویا وہ ایک جسم ہے جبکہ رحمت کی ہوا نرم اور جدا جدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان ہواؤں کو الریاح کہا جاتا ہے اور سورۂ یونس میں الفلک کے ساتھ مفرد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشتیوں کو چلانے والی ہوا یہ ایک متصل ہوا ہوتی ہے پھر طیب کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو ان کے درمیان اور عذاب کی ریح (ہوا) کے درمیان اشتراک زائل ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 11: علماء نے فرمایا: الریح تو ہوا کو حرکت دیتی ہے کبھی وہ سخت ہوتی ہے اور کبھی کمزور ہوتی ہے، جب ہوا کی حرکت قبلہ کے سامنے سے ظاہر ہوتی ہے قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اس ہوا کو صبا کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کے پیچھے سے ظاہر ہوتی ہے اور قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اسے دبور کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی دائیں طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ قبلہ کی بائیں جانب کو چلتی ہے تو اسے ریح الجنوب کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی بائیں جانب سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دائیں طرف کو چلتی ہے تو اسے ریح الشمال کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر ہوا کی ایک خاص طبع ہے، اس کی منفعت اس کی طبع کے مطابق ہوتی ہے۔ صبا گرم خشک ہوتی ہے دبور ٹھنڈی تر ہوتی ہے۔ جنوب گرم تر ہوتی ہے اور شمال ٹھنڈی خشک ہوتی ہے۔ ان کی طبع کا اختلاف سال کے موسموں کے طبائع کے اختلاف کی طرح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کے لئے چار موسم بنائے۔ ان کا مرجع ہوا کے احوال کی تبدیلی کی طرف ہے۔ موسم ربیع بنایا جو موسموں کا آغاز ہے اسے گرم تر بنایا اور اس میں نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، اس میں بارشیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنا نکھار نکالتی ہے اور اس کا سبزہ ظاہر ہوتا ہے لوگ درخت لگاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، اس میں حیوان پیدا ہوتے ہیں اور دودھ زیادہ ہوتے ہیں۔ جب موسم ربیع ختم ہوتا ہے تو اس کے پیچھے موسم گرما ہوتا ہے یہ ایک طبع میں موسم ربیع کے مشابہ ہے اور وہ حرارت ہے اور رطوبت میں اس کے مخالف ہے کیونکہ گرمیوں میں ہوا گرم اور خشک ہوتی ہے اس میں پھل پکتے ہیں اور موسم ربیع میں کھیتوں کے دانے خشک ہوتے ہیں۔ جب موسم گرما ختم ہوتا ہے تو موسم خزاں اس کے پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع میں موسم گرما کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ ہے خشکی اور حرارت میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ موسم خزاں میں ہوا ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے۔ اس میں پھلوں کی صلاح اپنی انتہا کو پہنچتی ہے اور وہ خشک ہوتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں اور ذخیرہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھل اس موسم میں توڑے جاتے ہیں اور انگور کاٹے جاتے ہیں اور تمام درختوں سے فراغت حاصل کی جاتی ہے۔ جب موسم خریف ختم ہوتا ہے تو موسم سرما پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع یعنی برودت میں موسم خریف کے موافق ہوتا ہے اور دوسری طبع خشکی میں مخالف ہوتا ہے کیونکہ ہوا سردیوں میں ٹھنڈی اور تر ہوتی ہے۔ پس اس میں بارشیں اور اولے زیادہ ہوتے ہیں۔ زمین آرام پانے والے جسم

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، صفحہ 214، جلد 11، حدیث نمبر 11533 (العلوم والحکم)

کی طرح ہوتی ہے اور حرکت نہیں کرتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف موسم ربیع کی حرارت کو لوٹا دے، جب وہ رطوبت کے ساتھ جمع ہوتی ہے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، کبھی کبھی ہوائیں زیادہ چلتی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے مگر اصول یہی چار ہیں۔ ہر ہوا، دو ہواؤں کے درمیان چلتی ہے۔ پس اس کا حکم اس ہوا والا ہوتا ہے جو اس کے مکان کے قریب ہوتی ہے اس ہوا کو النکباء کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 12: السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ، السَّحَابِ کو یہ نام اس لئے دیا جاتا ہے کیونکہ ہوا میں یہ چلتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: سحبت ذیلی سحباً، تسحّبَ فلان علی فلان جرأت کرنا۔ السحب کا مطلب زیادہ کھانا، پینا ہے۔ السخر، مطیع۔ بادل کی تسخیر کا مطلب: اسے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چلانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بادل کی تسخیر کا مطلب بغیر کسی سہارا کے آسمان اور زمین کے درمیان اس کا ٹھہرنا ہے (1)۔ پہلا معنی اظہر ہے کبھی بادل پانی کے ساتھ اور کبھی عذاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص صحرا میں اپنی زمین میں تھا۔ اس نے بادل میں ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سیراب کر، پس وہ بادل چلا اور اپنا پانی ایک ٹیلے پر بہایا وہاں ایک نالی تھی، وہ پانی سے بھر گئی۔ متواتر پانی چلتا رہا وہ شخص اپنے باغ میں اپنی کسی کے ساتھ پانی ادھر ادھر پھیر رہا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: فلاں۔ اس نے وہ نام بتایا جو اس نے بادل میں سنا تھا۔ اس نے اسے کہا: اے اللہ کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو سیراب کر تیرا نام لیا۔ تو اس باغ میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا: جب تو نے یہ کہا ہے تو میں اس کی پیداوار کا انتظار کرتا ہوں میں اس کی تہائی صدقہ کرتا ہوں اور تہائی خود اور اپنے عیال کو کھلاتا ہوں اور تہائی پھر اسی زمین میں کاشت کرتا ہوں (2)۔ ایک روایت میں ہے: میں تہائی مساکین، سائلین اور مسافروں کے لئے رکھوں گا (3)۔ قرآن حکیم میں ہے: وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (فاطر: 9) (اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھالاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف) اور فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ (اعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف)

ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آفاق میں سے کسی افق میں سے بادل کو آتا ہوا دیکھتے تو اپنا کام چھوڑ دیتے تھے اگرچہ نماز میں ہی ہوتے حتیٰ کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگتے: اے اللہ! ہم اس شر سے پناہ مانگتے ہیں جس کے ساتھ اس (بادل) کو بھیجا گیا ہے۔ اگر بارش نازل ہوتی تو آپ یہ دعا کرتے: اللھم سیباً نافعاً (نفع بخش بارش دے) دو یا تین مرتبہ کہتے اگر اللہ تعالیٰ اس بادل کو ختم کر دیتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے (4)۔ مسلم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب فضل الانفاق علی المسکین، صفحہ 411، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، صفحہ 286 (وزارت تعلیم)

نے اس حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عائشہ سے نقل کی ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب ہوا اور بادل والا دن ہوتا تو آپ کے چہرہ سے پریشانی معلوم ہو جاتی آپ آگے پیچھے آتے جاتے۔ جب بارش ہو جاتی تو آپ خوش ہو جاتے اور آپ کی پریشانی دور ہو جاتی۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے آپ سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہیں یہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔ اور جب آپ بارش کو دیکھتے تو کہتے: رحمت (1)۔ ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! شاید جس طرح قوم عاد نے کہا تھا: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (احقاف: 24) (2)

یہ احادیث اور آیات پہلے قول کی صحت پر دلیل ہیں اور تسخیر السحاب سے مراد بادل کا زمین و آسمان کے درمیان ثبوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ ثبوت تو عدم انتقال پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ثبوت سے مراد اس کا ہوا میں ہونا مراد لیا گیا ہوتا نہ کہ آسمان اور زمین میں تو یہ صحیح تھا کیونکہ بین استعمال ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ مسخرہ محمولہ ہے۔ یہ قدرت کی عظیم نشانی ہے جیسے پرندہ ہوا میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (النحل: 79) (کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے)۔

اور فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (الملک: 19) (کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلاتے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمن کے۔)

مسئلہ نمبر 13: کعب الاحبار نے کہا: بادل، بارش کی چھلنی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ یہ کعب نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ خطیب ابوبکر احمد بن علی نے معاذ بن عبداللہ بن خبیب الجہنی سے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو دیکھا وہ خچر پر گزرے جبکہ میں بنی سلمہ میں تھا۔ ان کے پاس سے کعب کی بیوی کا بیٹا تبیع گزرا۔ اس نے حضرت ابن عباس کو سلام کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس سے پوچھا: کیا تو نے کعب احبار سے بادل کے بارے کچھ کہتے سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: بادل بارش کے لئے چھانی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا جب آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ انہوں نے کہا: کیا تو نے کعب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین ایک سال ایک نبات اگاتی ہے اور دوسرے سال دوسری نبات اگاتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ بیج آسمان سے اترتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے یہ کعب سے سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَاٰيٰتٍ ایسی دلالات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 294، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)　　2۔ ایضاً

دلالت کرتی ہیں اسی وجہ سے اِن امور کو وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کے بعد ذکر کیا ہے تا کہ ان سے پہلے جو اللہ کی وحدانیت، اس کی رحمت کے ذکر اور اس کی مخلوق پر رأفت، ذکر کی ہے اس کی سچائی پر دلالت کرے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس میں غور و فکر نہیں کیا (1)۔ اگر کہا جائے کہ اس میں انکار نہیں ہے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔ کہا جائے گا: یہ محال ہے اگر یہ خود پیدا ہوئی ہیں تو پھر ان کا دو حالتوں سے خالی ہونا جائز نہیں یا تو یہ موجود ہوں گی یا موجود نہیں ہوں گی۔ اگر یہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں پہلے موجود نہیں تھیں تو یہ محال ہے کیونکہ کسی چیز کے عدم سے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حی، عالم، قادر اور مرید ذات کی تخلیق سے ہو اور جو پہلے موجود نہ ہو اس کا اس سے وصف صحیح نہیں۔ اگر یہ پہلے موجود تھیں تو پھر ان کا موجود ہونا ان کے پیدا کرنے سے انہیں غنی کر دے گا۔ پس جو کچھ انہوں نے کہا جائز ہو تو خود بخود پیدا ہونا جاری ہوگا۔ اسی طرح چیرنا اور بننا ہے، یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ محال ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت میں صرف اخبار پر اکتفا نہیں فرمایا حتیٰ کہ اس نے قرآن کی آیات میں غور و فکر کے ساتھ اس کو ملایا۔ اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمایئے غور سے دیکھو کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اور یہ کفار کو خطاب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس) (اور فائدہ نہیں پہنچا تیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے اور فرمایا۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف: 185) (کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں) یعنی ملکوتی آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اور فرمایا: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) فرمایا کیا انہوں نے تفکر و تدبر کی نظر سے نہیں دیکھا حتیٰ کہ یہ استدلال کرتے کہ یہ چونکہ حوادث و تغیرات کا محل ہیں تو یہ حادث ہیں اور حادث چیز اپنے صانع سے مستغنی نہیں ہوتی اور وہ صانع حکیم، عالم، قدیر، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے کیونکہ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو انسان اس سے کامل ہوگا، یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا فرمایا پھر ہم نے اس کی نسل اور اولاد بنائی نطفة فی قرار مکین ...... تبعثون، انسان جب اس تنبیہ کے ساتھ غور و فکر کرے گا اس عقل کے ساتھ جو اسے عطا کی گئی ہے تو وہ اسے غور و فکر کرنے والا پائے گا اور مختلف احوال پر پھرتا ہوا پائے گا۔ وہ پہلے نطفہ تھا پھر جما ہوا خون تھا پھر گوشت کا لوتھڑا پھر گوشت اور ہڈیاں تھا، تو وہ جان لے گا کہ حالت نقص سے حالت کمال کی طرف خود بخود پھرنے والا نہیں کیونکہ وہ خود اس پر قادر نہیں کہ وہ اس افضل حالت میں پیدا ہو جو اس کی عقل کا کمال ہے اور اس کے اعضاء کامل اور مضبوط ہوں۔ انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اعضاء میں کسی عضو کا اضافہ کرے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنی حالت نقص میں اور اپنے ضعف کے وقت میں کسی فعل سے زیادہ عاجز ہے۔ کبھی اپنے آپ کو جوان دیکھتا ہے، کبھی ادھیڑ عمر میں دیکھتا ہے، کبھی بوڑھا دیکھتا ہے۔ وہ خود بخود

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، صفحہ 400، جلد 4، حدیث نمبر 7158 (دار الباز)

حالت شباب اور قوت سے بڑھاپے کی حالت کو نہیں پہنچتا۔ نہ وہ خود اختیار کرتا ہے اور نہ اس کی وسعت میں ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت کو زائل کر کے پھر جوانی کی قوت کو لوٹا لے۔ پس وہ جان لے گا کہ وہ ایسا نہیں ہے جو ان افعال کو خود کر سکے، اس کا کوئی صانع ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نقل کرنے والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے احوال بلا ناقل و مدبر تبدیل نہ ہوتے۔ بعض حکماء نے کہا: اس عالم کبیر میں جو چیز بھی ہے اس کی عالم صغیر میں ایک مثال ہے اور عالم صغیر سے مراد انسان کا بدن ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین)

بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَفِيْٓ أَنْفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) انسان کے حواس چمکنے والے ستاروں سے اشرف ہیں، سمع اور بصر مدرکات کے ادراک میں سورج اور چاند کے قائم مقام ہیں اور اس کے اعضاء بوسیدگی کی حالت میں زمین کی جنس سے مٹی ہو جاتے ہیں۔ اس میں پانی کی جنس سے رگیں اور دوسری بدن کی رطوبات ہیں اور ہوا کی جنس سے اس میں روح اور نفس ہے اور آگ کی جنس سے اس میں زرد پتہ ہے اور اس کی رگیں زمین کی نہروں کے قائم مقام ہیں اور اس کا جگر ان چشموں کی مانند ہے نہریں جن سے مدد حاصل کرتی ہیں اور رگیں جگر سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ اس کا مثانہ دریا کے قائم مقام ہے۔ بدن کے برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس میں جاتا ہے جس طرح نہریں دریا میں جاتی ہیں اور اس کی ہڈیاں پہاڑوں کی طرح ہیں جو زمین کے کیل ہیں اور اس کے اعضاء، درختوں کی طرح ہیں جس طرح ہر درخت کے پتے ہوتے ہیں یا پھل ہوتے ہیں اسی طرح ہر عضو کا فعل یا اثر ہوتا ہے اور بال بدن پر نباتات اور گھاس کی مانند ہیں پھر انسان اپنی زبان سے ہر حیوان کی آواز کو حکایت کرتا ہے اور اپنے اعضاء کے ساتھ ہر حیوان کے کام کو حکایت کرتا ہے۔ یہ عالم صغیر، عالم کبیر کے ساتھ مخلوق ہے صانع واحد کا پیدا کردہ ہے۔ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّأَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

''اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں ایسی چیز کی خبر دی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت اور عظیم سلطانی پر دلیل تھی۔ تو آپ نے بتایا کہ ان آیات قاہرہ کے باوجود ذوی عقول میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا مدمقابل بناتے ہیں۔ انداد کا

واحد ند ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ اس طرح عبادت کرتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے حالانکہ وہ عاجز ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے بتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: انداد سے مراد وہ رؤساء ہیں جن کی پیروی کی جاتی تھی وہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔ یُحِبُّوْنَهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق اصل پر ہے اور پہلے قول کے مطابق ضمیر بتوں کے لئے ہے۔ یہ غیر اصل پر ہے۔ ابن کیسان اور زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ محبت میں بتوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان برابری کرتے ہیں (1)۔ ابو اسحق نے کہا یہ صحیح قول ہے اور اس کی صحت پر دلیل وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ہے۔

ابو رجاء نے یحبونهم یاء کی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس طرح جہاں بھی قرآن میں آیا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حببت الرجل فهو محبوبٌ۔ فراء نے کہا: ابو تراب نے کہا:

احب لحبها السودان حتی　　حببت لحبها سود الکلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے کالے لوگوں سے محبت کرتا ہوں حتیٰ کہ اس کی محبت کی وجہ سے کالے کتوں سے بھی محبت کرتا ہوں۔

اور مَنْ، من یتخذ میں مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور یتخذ واحد کا صیغہ من کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ اور غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یتخذون بھی جائز ہے اور یُحِبُّوْنَهُمْ معنی کے اعتبار سے ہے اور یحبهم لفظ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ یتخذ میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی محبین کے معنی میں ہے۔ اگر تو چاہے تو انداد کی نعت بنادے یعنی محبوبة کے معنی میں۔ کحب میں کاف محذوف کی صفت ہے یعنی یحبونهم حبًا کحب اللہ۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی بت پرست جتنی اپنے بتوں اور تابعین اپنے متبوعین سے محبت کرتے ہیں مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان سے محبت کرتا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ پس جو محبت کی وجہ سے اس کی محبت کی گواہی دیتا ہے اس کی محبت اتم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ: 54) مومنین کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی مومنین سے محبت کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ اہل مدینہ اور اہل شام کی قراءت تا کے ساتھ ہے۔ اہل مکہ، اہل کوفہ اور ابو عمرو نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اس آیت میں اشکال اور حذف ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کا معنی ہے اگر ظالم دنیا میں آخرت کا عذاب دیکھ لیتے تو جان لیتے جب وہ اسے دیکھتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اور اس بنا پر یری بصر کی رؤیت پر محمول ہوگا۔ (2)

نحاس نے معانی قرآن میں کہا ہے: یہ قول وہ ہے جس پر اہل تفسیر کا نظریہ ہے اور اعراب القرآن میں فرمایا: محمد بن یزید

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 235، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: یہ تفسیر جو ابو عبید نے کی ہے بعید ہے۔ اس کی عبارت اس میں عمدہ نہیں ہے کیونکہ کلام مقدر کی جاتی ہے۔ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ گویا اس نے اس کو مشکوک بنایا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب کیا ہے۔ لیکن تقدیر عبارت اس طرح ہے اور یہی اخفش کا قول ہے...... ولو یری الذین ظلموا ان القوۃ للہ۔ اور یری بمعنی یعلم ہے یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی حقیقت اور اس کے عذاب کی شدت کی حقیقت کو جان لیتے تو حقیقۃً وہ جان لیتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ والذین، یری کا فاعل ہے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے تا کہ انہیں خدا بنانے کا نقصان واضح ہو جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (انعام:30) وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ (انعام:27) اور لو کا جواب نہیں ہے۔

زہری اور قتادہ نے کہا: اضمار، وعید کے لئے سخت ہے اس کی مثال، قائل کا قول ہے: لو رایت فلاناً والسیاط تاخذہ!۔ اور جنہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی تقدیر یہ ہے: ولو تری یا محمد الذین ظلموا۔ یعنی اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر تم ظالموں کو اس حال میں دیکھتے جب وہ عذاب کو دیکھتے اور اس سے گھبراہٹ کے وقت انہیں دیکھتے اور اس کی عظمت کو دیکھتے تو یہ اقرار کرتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے۔ پس جواب اس طریق پر مضمر ہے اور وہی ان کا عامل ہے۔ دوسری تقدیر یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ ظالموں کو اس کے عذاب دیکھنے اور اس سے گھبراہٹ کی حالت میں دیکھتے تو آپ جان لیتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو جان لیا تھا لیکن خطاب آپ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ ان میں سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے علم کی تقویت کے لئے اس قسم کا مشاہدہ کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ معنی ہونا بھی جائز ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ظالم کو فرمایئے۔ بعض نے فرمایا: انّ مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا سیبویہ نے استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے۔

واغفر عوراء الکریم ادخارہ و اعرض عن شتم اللئیم تکرماً

یہ ادخار، لادخار کے معنی میں ہے۔ معنی ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ ظالموں کو عذاب دیکھنے کی حالت میں دیکھتے کیونکہ قوت اللہ کے لئے ہے تو آپ ان کی سزا کا مبلغ جان لیتے اور جو عذاب ان پر نازل ہوا اس کو عظیم جانتے۔ اذ، داخل ہوا ہے جب کہ ماضی میں امر ثابت کرنے کے لئے آتا ہے مقصود امر کو قریب ثابت کرنا اور اس کے وقوع کی تصحیح ہے۔ ابن عامر نے یُرون یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، یعقوب، شیبہ، سلام اور ابو جعفر نے اِنَّ القوۃ اور اِنّ اللہ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نئے کلام کے اعتبار سے یا قول کی تقدیر پر۔ یعنی اگر تو ظالموں کو دیکھے جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ قوت اللہ کے لئے ہے بخلاف معتزلہ کے قول کے وہ صفات قدیمہ کے معانی کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

"(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں

گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا اس سے مراد سردار اور رؤساء ہیں وہ کفر پر اپنے متبعین سے براءت کریں گے۔ حضرت قتادہ، عطا اور ربیع سے مروی ہے۔ قتادہ اور سدی کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد گمراہ کرنے والے شیاطین ہیں جو انسانوں سے براءت کریں گے(1)۔ بعض نے فرمایا: یہ ہر متبوع میں عام ہے وَ رَاَوُا الْعَذَابَ یعنی اتباع کرنے والے اور جن کی اتباع کی گئی۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے وقت۔ بعض نے فرمایا: آخرت میں پیشی اور سوال کے وقت۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں ہوں گے۔ وہ موت کے وقت اس ذلت کو دیکھیں گے جس کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے اور آخرت میں عذاب الیم کا مزہ چکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اسباب سے مراد وہ تمام تعلقات ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا سے ملتے ہیں خواہ وہ رشتہ داری کے تعلقات ہیں یا کوئی اور۔ یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ اسباب کا واحد سبب ہے اور اس کا معنی حلق ہے۔ السبب کا اصل معنی وہ رسی ہے جس کے ساتھ کسی شے کو باندھا جاتا ہے اور پھر اسے کھینچا جاتا ہے۔ پھر ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کو کھینچے۔

سدی اور ابن زید نے کہا: اسباب سے مراد اعمال ہیں اور سبب کا معنی کنارہ بھی ہے۔ اس سے زہیر کا قول ہے:

و من هاب اسباب المنايا ينلنهٔ و لو رام اسباب السماء يُسَلّم

جو موت کے اسباب سے ڈرا انہوں نے اسے پالیا۔ اگر وہ آسمانی اسباب کا قصد کرتا تو سلامت رہتا۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے وہ (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے۔ یونہی دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں گے ان کے لئے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً، اَنّ محل رفع میں ہے یعنی اگر ہمارے لئے لوٹنا ہوتا۔ فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ یہ تمنا کا جواب ہے۔

الکرۃ، سے مراد ایک حالت کی طرف لوٹنا ہے یعنی اتباع کرنے والے کہیں گے: اگر ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا جاتا حتیٰ کہ ہم نیک عمل کرتے اور ان سے بری ہو جاتے۔ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ اس کا حال کے اعتبار سے منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ متبرئین اس کی تقدیر ہوگی۔ التبرء کا معنی ہے: جدا ہونا۔

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 193، جلد 1 (دار الفکر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ کاف محل رفع میں ہے یعنی امر اسی طرح ہے یعنی جس طرح اللہ انہیں عذاب دکھائے گا اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا یُرِيْهِمُ اللّٰهُ بعض علماء نے فرمایا یہ آنکھ سے دیکھنا ہے۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے پہلا مفعول هم ضمیر ہے اور دوسرا اَعْمَالَهُمْ ہے اور حَسَرٰتٍ حال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رویۃ قلب سے ہو اس صورت میں حَسَرٰتٍ تیسرا مفعول ہوگا۔ اَعْمَالَهُمْ۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب کیا پس ان کے لئے ان اعمال کی وجہ سے دوزخ واجب ہے، حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں جن کو انہوں نے چھوڑ دیا، پس وہ جنت سے محروم ہو گئے۔ اس قول میں احادیث روایت کی گئی ہیں۔ سدی نے کہا: ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اسے دیکھیں گے اور جنت میں اپنے گھروں کو دیکھیں گے (1)۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے تو انہیں وہ گھر ملتے، پھر ان کے گھر مومنین کے درمیان تقسیم کئے جائیں گے تو اس وقت وہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ اعمال ان کی طرف مضاف کئے گئے ہیں کیوں کہ انہیں ان کا حکم دیا گیا تھا اور اعمال فاسدہ کی ان کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ انہوں نے ان کا ارتکاب کیا۔ الحسرة کی جمع الحسرات ہے جیسے تمرة اور تمرات، جفنة اور جفنات، شھوة اور شھوات۔ یہ اس صورت میں ہے جب اسم ہو۔ جب تو اسے نعت بنائے گا تو تو اس کو ساکن کرے گا جیسے ضخمة و ضخمات، عبلةٌ و عبلات۔ الحسرة فوت شدہ چیز پر اعلیٰ درجہ کی ندامت کو کہتے ہیں۔ التحسر کا معنی افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: حسرت علیه، سین کے کسرہ کے ساتھ۔ احسر حسرا و حسرة۔ یہ اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو تھک جائے اور اس کی قوت ختم ہو جائے جیسے اونٹ تھک جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حسر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: کھل جانا، اسی سے الحاسر فی الحرب ہے وہ شخص جنگ میں جس کے پاس زرہ نہ ہو۔ الانحسار کا معنی انکشاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ یہ کفار کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی دلیل ہے، کفار دوزخ سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ یہ اہل سنت کے علماء کا قول ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف: 40) (اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

''اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثقیف، خزاعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر جانوروں میں سے کچھ حرام کئے تھے۔ لفظ عام ہے اور یہاں طیب سے

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 194، جلد 1 (دار الفکر)

مراد حلال ہے یہ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکید ہے۔ یہ طیب کے بارے میں امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: طیب سے مراد ہے جس سے لذت حاصل کی جائے۔ یہ تنویع ہے اسی وجہ سے گندے حیوان کے کھانے سے منع کیا گیا ہے (1)۔ اس کا بیان سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَلٰلًا طَيِّبًا، حَلٰلًا حال ہے۔ بعض نے فرمایا: مفعول ہے حلال کو حلال کہنے کی وجہ یہ ہے اس سے منع کی گرہ کھل جاتی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: نجات تین چیزوں میں ہے: حلال کھانا، فرائض ادا کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا، ابو عبداللہ ساجی نے کہا ...... اس کا نام سعید بن زید تھا ...... پانچ خصال کے ساتھ علم مکمل ہوتا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت (۲) حق کی معرفت (۳) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص (۴) سنت پر عمل (۵) حلال کھانا۔ اگر ان میں سے ایک خصلت بھی نہ پائی جائے تو عمل بلند نہیں ہوتا۔ حضرت سہل نے کہا: حلال کھانا ہو ہی نہیں سکتا مگر علم کے ساتھ۔ اور مال حلال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ چھ چیزوں سے پاک ہو: سود، حرام، السحت یہ مجمل اسم ہے ...... خیانت، مکروہ اور شبہ۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ نہی ہے۔ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، خُطُوٰتِ جمع ہے خَطْوَۃ اور خُطْوَۃ کی، دونوں کا معنی ایک ہے۔ فراء نے کہا الخطوات خطوۃ کی (خاء کے فتحہ کے ساتھ) جمع ہے خُطْوَۃ (خاء کے ضمہ کے ساتھ) دو قدموں کے درمیان کے فاصلہ کو کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: جمع قلت خَطْوات، خُطُوات اور خَطَوات ہے اور جمع کثرت خطأ ہے اور الخطوۃ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) مصدر ہے۔ جمع خطوات اور خطاء ہے جیسے رکوۃ اور رکاء ہے۔ امرء القیس نے کہا:

لها وثبات كوثب الظباء فوادٍ خطاءٌ و وادٍ مطر

ابو السماء العدوی اور عبید بن عمیر نے خطوات (خا اور طا کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، قتادہ، اعرج، عمرو بن میمون اور اعمش نے خطؤات خا اور طا کے ضمہ اور واو پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: قراءت کرنے والوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خطیئۃ کی جمع ہے یہ الخطاء سے ہے الخطو سے نہیں ہے۔ جمہور کی قراءت پر معنی یہ ہوگا: شیطان کے پیچھے نہ چلو اور اس کے اعمال پر نہ چلو۔ اور جس عمل کے بارے شرع کا حکم وارد نہیں وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: خطوات الشیاطین سے مراد شیطانی اعمال ہیں۔ مجاہد نے کہا: شیطان کی خطائیں ہیں (2)۔ سدی نے کہا: اس سے مراد شیطان کی اطاعت ہے۔ ابو مجلز نے کہا: یہ گناہوں کی نذریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ سنن اور شرائع کے علاوہ تمام بدعات اور گناہوں کو شامل ہے۔ شیطان کے بارے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ شیطان دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے۔ عقلمند پر واجب ہے کہ وہ اس دشمن سے بچے جس کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ظاہر ہے۔ اس نے اپنی پوری عمر انسان کے احوال کے خراب کرنے میں خرچ کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچنے کا حکم فرمایا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 92، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

ارشاد فرمایا: وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (البقرہ) ''وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اور فرمایا: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ:268)

شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ (النساء)

''چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ (المائدہ)

''یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (القصص) ''وہ دشمن کھلا گمراہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۶﴾ (فاطر)

''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تا کہ وہ جہنمی بن جائیں''۔

یہ ڈرانے میں حد ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: شیطان نچلی زمین میں باندھا ہوا ہے جب وہ حرکت کرتا ہے تو زمین میں ہر دو شخصوں یا زیادہ کے درمیان شر اس کے تحرک سے ہوتا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو مالک اشعری کی حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے: میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس کی مثال اس شخص کی مثل ہے جس کے پیچھے دشمن جلدی سے نکلتا ہے حتیٰ کہ وہ شخص ایک محفوظ قلعہ میں آتا ہے اور دشمنوں سے اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ اسی طرح بندہ شیطان سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''وہ تو حکم دیتا ہے فقط تمہیں برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿۱۶۹﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ، سؤ کو سؤ اس لئے کہا جاتا ہے: آدمی اپنے مقابل کو برے

1۔ جامع ترمذی، ابواب الامثال، باب ماجاء فی مثل الصلوٰۃ والصیام، صفحہ 110-109، جلد 2 (وزارت تعلیم)

انجام سے پریشان کرتا ہے۔ سوء، ساء یسوٴ سوءً ا اور مساءۃً کا مصدر ہے، جب کوئی کسی کو پریشان کرے۔ سؤتہ فسیئ جب اس نے اسے پریشان کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (الملک: 27)

شاعر نے کہا:

ان یک ھذا الدھر قد ساءنی	فطالما قد سرنی الدھر

الامر عندی فیھما واحد	لذاک شکر و لذاک صبر

اگر اس زمانہ نے مجھے پریشان کیا ہے تو اس نے مجھے خوش بھی کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں حالتوں میں معاملہ ایک ہے۔ خوشی کے لئے شکر ہے اور تکلیف اور پریشانی کے لئے صبر ہے۔

الفحشاء برے منظر کو کہتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

و جید کجید الریم لیس بفاحش

(اور اس کی گردن، ہرن کی گردن کی طرح ہے وہ بری نہیں ہے۔)

پھر یہ لفظ برے معانی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ شرع ہی کسی چیز کو حسین اور قبیح بناتی ہے، ہر وہ چیز جس سے شریعت نے منع فرمایا وہ فحشاء میں سے ہے۔ مقاتل نے کہا: قرآن میں فحشاء کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد زنا ہے سوائے اس ارشاد کے اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ: 268) یہاں فحشاء سے مراد زکاۃ نہ دینا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس بناء پر بعض علماء نے کہا السوء وہ جرم ہے جس میں حد نہیں اور الْفَحْشَآءِ وہ گناہ ہے جس میں حد ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ طبری نے کہا: کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انہوں نے بحیرہ اور سائبہ میں سے حرام کی تھیں اور انہیں اپنی طرف سے شرع بنایا تھا (1)۔ وَاَنْ تَقُوْلُوْا، بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

"اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 93، جلد 2 (داراحیاء التراث العربیۃ)

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ، ھم ضمیر سے مراد کفار عرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ طبری کا قول ہے: لَهُمُ میں ضمیر، یا ایھا الناس میں جو الناس ہے اس کی طرف راجع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: من یتخذ من دون اللہ میں جو مَنْ ہے اس کی طرف راجع ہے(1) اور اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قول و عمل میں قرآن کی اتباع کرو۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا، اَلْفَيْنَا کا معنی ہے ہم نے پایا۔

شاعر نے کہا:

فالفیتہ غیر مستعتب ولا ذاکر اللہ الا قلیلاً(2)

میں نے اسے نہ تو یہ کرنے والا اور نہ اللہ کا ذکر کرنے والا پایا مگر تھوڑا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ الف استفہام کے لئے ہے اور واو کو فتحہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ واو عاطفہ ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے کیونکہ فساد کی غایت التزام میں یہ ہے کہ وہ کہیں ہم اپنے آباء کی پیروی کریں گے اگر چہ وہ نہ بھی سمجھتے تھے۔ پس انہوں نے اپنے نظریہ سے چمٹے رہنے اور اس کے التزام کو ثابت کیا کیونکہ یہی ان کے آباء کی حالت تھی۔

مسئلہ: ہمارے علماء نے فرمایا: اس آیت کے الفاظ کی قوت، تقلید کے ابطال کا تقاضا کرتی ہے اس کی مثل یہ آیت بھی ہے۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ: 104) (جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف تو کہتے ہیں: کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو)۔

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت اپنے ماقبل سے متصل ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی جہالت کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے اپنی بیوقوفانہ آراء سے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ جانوروں کی حرمت کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے حجت اس سے پکڑی کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس پر انہوں نے اپنے آباء کو پایا اور اس میں ان کی اتباع کی اور اس کو چھوڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا اور جس کا اس نے اپنے دین میں حکم دیا۔ پس لھم میں ضمیر دونوں آیتوں میں کفار عرب کی طرف لوٹے گی۔

مسئلہ نمبر 3: بعض علماء نے اس آیت کی وجہ سے تقلید کی مذمت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت فرمائی کیونکہ انہوں نے باطل میں اپنے آباء کی اتباع کی تھی اور کفر و معصیت میں ان کی پیروی کی تھی۔ یہ مذمت تقلید باطل میں تو صحیح ہے لیکن حق میں تقلید کرنا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور مسلمانوں کی عصمتوں میں سے ایک عصمت (حفاظت) ہے۔ جاہل جو خود غور و فکر سے قاصر ہوتا ہے وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہے۔ علماء کا اصول کے مسائل میں اس کے جواز میں اختلاف ہے جیسا کہ آگے آئے گا اور فروعی مسائل میں اس کا جواز صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 4: علماء کے نزدیک تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر دلیل کے قبول کرنا۔ اس معنی کے اعتبار سے

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 94، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)
2۔ ایضاً صفحہ 95، جلد 2

جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں غور وفکر کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قبول کیا وہ مقلد ہے اور جس نے معجزات میں غور وفکر کر کے آپ کے قول کو قبول کیا وہ مقلد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو کسی کے قول کی صحت کو نہیں جانتا اس کے فتویٰ کی صحت کا اعتقاد کرنا تقلید ہے۔ لغت میں یہ قلادة البعیر (اونٹ کا ہار) سے ماخوذ ہے۔ عرب کہتے ہیں: قلدت البعیر، جب تو اس کے گلے میں ایسی رسی ڈالے جس کے ساتھ اس کو چلایا جائے۔ گویا مقلد اپنے تمام امور اپنے قائد کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

و قلدوا امرکم لله درکم ثبت الجنان بامر الحرب مضطلعاً

مسئلہ نمبر 5: تقلید یہ تو علم کا طریق ہے، نہ علم تک یہ پہنچانے والی ہے، نہ اصول میں ہے، نہ فروع میں ہے۔ یہ جمہور عقلاء اور علماء کا قول ہے جبکہ حشویہ اور ثعلبیہ جہال سے حکایت ہے کہ یہ (تقلید) حق کی معرفت کا ذریعہ ہے اور یہ واجب ہے اور غور وفکر حرام ہے۔ اور ان پر ہمارے علماء نے جو حجت پیش کی ہے وہ کتب اصول میں ہے۔

مسئلہ نمبر 6: عام آدمی پر فرض ہے کہ وہ احکام کے استنباط میں احکام کے اصول میں مشغول نہ ہو کیونکہ اسے اس کی اہلیت نہیں ہے اور یہ حکم اس کے لئے ہر اس دینی معاملہ میں ہے جس کو وہ خود نہیں جانتا اور وہ محتاج ہوتا ہے اپنے زمانہ اور اپنے شہر کے بڑے عالم کی طرف جانے کا ...... پس وہ ہر نئے مسئلہ کو اس سے پوچھے اور اس کے فتویٰ کی پیروی کرے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پوچھو اہل علم سے اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے)۔

اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم سے پوچھنے کی کوشش کرے تا کہ اکثر لوگوں کا اس پر اتفاق واقع ہو اور عالم پر بھی فرض ہے کہ وہ کسی بھی جدید مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی تقلید کرے جس میں دلیل ونظر کی وجہ اس پر مخفی ہو گئی ہے وہ اس میں غور وفکر کرنے کا ارادہ کرے حتیٰ کہ وہ مطلوب تک پہنچ جائے۔ پس اس کے پاس وقت تنگ ہو اور اسے عبادت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا حکم کے ضیاع کا خوف ہو، خواہ وہ دوسرا مجتہد صحابی ہو یا کوئی اور ہو۔ قاضی ابوبکر اور محققین کی جماعت کا یہی قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ابن عطیہ نے کہا: عقائد میں تقلید کے ابطال پر امت کا اجماع ہے (1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی، ابو عمر و عثمان بن عیسیٰ بن درباس الشافعی جیسے علماء کا قول اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابن درباس نے اپنی کتاب ''الانتصار'' میں کہا ہے کہ بعض علماء نے کہا: توحید کے امر میں تقلید جائز ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (زخرف: 22) اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنے آباء کی تقلید پر اور رسل کی اتباع ترک کرنے پر ان کی مذمت کی ہے جیسے اہل بدعت نے اپنے بڑوں کی تقلید کی اور دین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کیا کیونکہ ہر مکلف پر توحید کے امر کا سیکھنا فرض ہے اور ضروری ہے اور یہ کتاب وسنت سے ہی حاصل ہوتا ہے جس طرح آیت توحید میں ہم نے بیان کیا تھا۔ اللّٰهُ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الحج)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 238، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن درباس نے کہا: اکثر اہل زیغ کا قول یہ ہے کہ جو کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ مقلد ہے۔ یہ ان کی خطا ہے بلکہ یہ ان کے زیادہ لائق ہے ان کے مذہب کے مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے رہنماؤں اور بڑوں کے قول کو قبول کیا جن میں انہوں نے الله کی کتاب اور رسول الله کی سنت اور اجماع صحابہ کی مخالفت کی ہے۔ پس یہ ان میں داخل ہیں جن کی الله تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مذمت کی ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (سورۂ احزاب) (اے ہمارے رب ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی پس ان ظالموں نے ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے الخ)۔

اور الله تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (زخرف) پھر الله تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا۔ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (زخرف) (اس نبی نے فرمایا: اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا: ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فانتقمنا منھم پس ہم نے انتقام لیا ان سے۔ الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہدایت ان احکام میں ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے۔

اہل اثر کا قول ان کے عقائد کے بارے میں نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ائمہ اور آباء اور لوگوں کو کتاب وسنت اور صالحین کے اجماع پر پایا۔ اور کفار نے کہا: ہم نے اپنے آباء کو پایا اور ہم نے اپنے سادات اور بڑوں کی ایک راستہ میں اطاعت کی۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنی اطاعت کو قرآن اور متابعت رسول کی طرف منسوب کیا جبکہ کافروں نے اپنے جھوٹ کو اہل باطل کی طرف منسوب کیا پس وہ گمراہی میں زیادہ ہو گئے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ الله تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ ارشاد فرمایا: اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ (یوسف) (میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے الله پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں اور میں تو پیروکار بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں الله تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو (توحید پر ایمان) تو الله تعالیٰ کا خاص احسان ہے)۔

جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء وحی کے متبعین تھے اور یہی دین خالص ہے جس کو الله تعالیٰ نے پسند کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آباء کی پیروی کرنا ان کی مدح کی صفات سے ہے۔ اور آپ وہ نہیں لائے جو وہ لائے تھے، اعراض کا ذکر اور اعراض کا جواہر کے ساتھ تعلق اور ان کا ان سے بدلنا پس یہ دلیل ہے کہ ان میں ہدایت نہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والوں میں ہدایت ہے۔

ابن حصار نے کہا: ان کے ساتھ تلفظ دو سو سال بعد مامون کے زمانہ میں ظاہر ہوا تھا جب پہلی کتب کے ترجمے کئے گئے اور ان میں عالم کے قدم اور حدوث میں اختلاف ظاہر ہوا اور جوہر اور اس کا ثبوت، عرض اور اس کی ماہیت میں اختلاف ظاہر ہوا۔

پس بدعتیوں اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں کجی تھی، انہوں نے ان اصطلاحات کی حفاظت کی طرف جلدی کی اور ان کے ذریعے اہل سنت پر اغراب کا قصد کیا اور اہل ملت میں سے کمزور لوگوں پر شبہات کو داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ معاملہ اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ بدعت غالب آئی اور بدعتی ایک گروہ بن گیا اور سلطان پر معاملہ ملتبس ہو گیا حتیٰ کہ امیر نے خلق قرآن کا قول کیا اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا اور امام احمد بن حنبل کو اس کی مخالفت پر سزا دی۔ اہل سنت کے علماء شیخ ابوالحسن اشعری، عبداللہ بن کلاب اور ابن مجاہد، محاسبی اور دوسرے ان جیسے علماء نے ان کو جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور بدعتیوں کے ساتھ ان کی اصطلاحات میں غور وخوض کیا پھر ان کے ساتھ جنگ کی اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ انہیں قتل کیا جو مسلمان کتاب وسنت کو پکڑنے والے تھے اور ملحدین کے شبہات سے اعراض کرنے والے تھے۔ انہوں نے جوہر اور عرض میں غور نہ کیا اور اسی پر سلف صالحین تھے۔

میں کہتا ہوں: جس نے اب متکلمین کی اصطلاح میں غور وفکر کیا حتیٰ کہ اس کے ساتھ دین کا دفاع کیا اس کا مرتبہ انبیاء کے مرتبہ کے قریب ہے...... اور جو غالی متکلمین میں سے ان لوگوں کے راستہ پر چلا جنہوں نے اثر کو مضبوطی سے پکڑا اور علم کلام کی کتب کے درس پر برانگیختہ کیا اور وہ حق کو صرف ان اصطلاحات کے واسطہ سے پہچانتا تھا تو وہ مذموم ہو گیا کیونکہ انہوں نے سابقہ ائمہ کے راستہ کو چھوڑ دیا...... دلیل اور حجت کے ساتھ جھگڑنا یہ تو قرآن میں واضح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

"اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کو وعظ کرنے والے اور ان کو دعوت دینے والے کو اس چرواہے کے ساتھ تشبیہ دی جو بکریوں اور اونٹوں کو آواز دیتا ہے...... وہ داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے...... اور وہ جانور صرف اس کی آواز اور ندا کو سنتے ہیں اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اسی طرح حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سدی، زجاج، فراء اور سیبویہ نے اس کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ یہ انتہائی ایجاز کے ساتھ کلام ہے(1)۔ سیبویہ نے کہا: ان کفار کو پکارنے والے سے تشبیہ نہیں دی بلکہ جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیری مثال اور کفار کی مثال ان جانوروں کو آواز دینے والے اور ان جانوروں کی ہے جو سمجھتے نہیں ہیں۔ پس معنی کی دلالت کو حذف کیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے کہ کفار کی اپنے پتھر کے خداؤں کو پکارنے کی مثال رات کے درمیان میں چیخنے والے کی ہے۔ پس صدیٰ اس کو جواب دیتی ہے وہ ان کو آواز دیتا ہے جو سنتے نہیں ہیں اور وہ ایسا جواب دیتا ہے جس کی حقیقت نہیں ہے اور نفع بخش نہیں ہے(2)۔ قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے کفار کا انہیں پکارنا جو ان کی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں جس طرح چرواہا اپنی بکریوں کو آواز دیتا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ طبری نے کہا: اس سے مراد کافروں کا اپنے بتوں کو پکارنے کی مثال اس شخص کی ہے جو دور سے کسی چیز کو پکارتا ہے اور دوری کی وجہ سے

1۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری آیت ہذا　2۔ ایضاً

اس کی آواز نہیں سنی جاتی۔ پس پکارنے والے کے لئے صرف پکار اور ندا ہے جو اسے مشقت اور تھکن میں ڈالتی ہے۔ ان تینوں تاویلات میں کفار کو پکارنے والے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بتوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ النعیق کا معنی بکریوں کو جھڑکنا اور ان کو آواز دینا ہے۔ کہا جاتا ہے: نعق الراعی بغنمہ ینعق نعیقا و نعاقاً و نعقاناً۔ یعنی چرواہا اپنی بکریوں پر چلایا اور انہیں جھڑکا۔ اخطل نے کہا:

انعق بضانك يا جرير فانما　　　منتك نفسك فى الخلاء ضلالاً

شاعر نے یہاں آواز دینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا۔ یعنی اے جریر! اپنی بکریوں کو آواز دے۔

قتبی نے کہا: جریر بھیڑیں چرانے والا نہیں تھا۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بنی کلیب کو بھیڑیں چرانے کی وجہ سے عار دلائی جاتی تھی اور جریر ان میں سے تھا، وہ ان کی جہالت میں تھا۔ عرب جہالت میں بکریوں کے چرواہے سے مثال دیتے تھے وہ کہتے تھے: اجھل من راعی الضان، وہ بھیڑیں چرانے والے سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ قتبی نے کہا: جو اس آیت کا یہ معنی بیان کرتا ہے یہ اس کا اپنا مذہب ہے مگر ہماری معلومات کے مطابق علماء میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔

ندا بعید کے لئے اور دعا قریب کے لئے ہوتی ہے اسی وجہ سے نماز کی اذان کو ندا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دور والوں کے لئے ہوتی ہے۔ ندا کو کبھی نون کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے جبکہ اصل نون پر کسرہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو تشبیہ دی کہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

''اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

یہ پہلے امر کی تاکید ہے اور یہاں تفضیل کے لئے مومن کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا اور کھانے سے مراد ہر اعتبار سے انتفاع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اکل سے مراد معروف کھانا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اسی بات کا حکم فرمایا جو اس نے رسولوں کو فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (المومنون) اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بے شک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ اور ارشاد فرمایا: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ بال ہے، غبار آلود ہے وہ ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور کہتا ہے: یارب یارب! جبکہ اس کا کھانا حرام ہے اور مشروب حرام ہے اور اس کا لباس

حرام ہے اور حرام کی غذا دی گئی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی (1)۔ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ شکر کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اس نے حرام کیا تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام۔ لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ، اِنَّمَا کا کلمہ حصر کے لئے وضع کیا گیا ہے نفی اور اثبات کو متضمن ہے، خطاب جس کو شامل ہوتا ہے اسے ثابت کرتا ہے اور ماعدا کی نفی کرتا ہے یہاں تحریم کی حصر کی گئی ہے خصوصاً تحلیل کے بعد آئی ہے۔ پہلے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اس میں مطلقاً اباحت ہے پھر حرام کا ذکر اِنَّمَا کے کلمہ کے ساتھ کیا۔ پس یہ دونوں قسموں کے ایجاب کا تقاضا ہے۔ پس کوئی حرام اس آیت سے خارج نہیں۔ یہ آیت مدنی ہے، اس کو دوسری آیت کے ساتھ مؤکد کیا۔ روایت ہے کہ یہ عرفہ میں نازل ہوئی۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ ......الآیۃ (انعام:45) آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے۔ پس اول و آخر بیان مکمل ہوا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے اس پر مزید کلام سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 2: اَلْمَيْتَةَ اس کو حرّم کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اور ما کافہ ہے اور اسے الذی کے معنی میں کرنا بھی جائز ہے جو لکھنے میں جدا ہوتا ہے اور ان کی خبر کی حیثیت سے المیتۃ، الدم اور لحم الخنزیر کو رفع دیا جائے گا۔ یہ ابن ابی عبلہ کی قراءت ہے اور حرم میں ضمیر الذی کی طرف لوٹے گی...... اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ (طٰہٰ:69) ابوجعفر نے حُرِم حاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعد والے اسماء کو رفع دیا گیا ہے یا نائب فاعل کی حیثیت سے یا ان کی خبر کی حیثیت سے۔ ابوجعفر بن قعقاع نے المیتۃ (2) تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ طبری نے کہا ہے: لغوی علماء کی جماعت نے کہا: میت اور میت، تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ ابو حاتم وغیرہ نے کہا: جو فوت ہو چکا ہو اس میں میت اور میت کہا جاتا ہے اور جو ابھی تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے میت تخفیف کے ساتھ نہیں بولا جاتا اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر:30)۔ شاعر نے کہا:

لیس من مات فاستراح بمیت　　انما المیت میت الاحیاء

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، صفحہ 326، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 239، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جو فوت ہو گیا اور راحت پا گیا وہ میت نہیں میت تو زندوں کا میت ہے۔

جب تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے کسی نے تخفیف کے ساتھ نہیں پڑھا، مگر جوبزی نے ابن کثیر سے روایت کیا ہے وما ھو بمیت اس سے مشہور تثقیل ہے۔ رہا شاعر کا قول:

اذا ما مات میت من تمیم فسرك ان یعیش فجئ بزاد

جب تمیم میں سے کوئی میت مرتا ہے تو تجھے خوش کرتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زاد راہ لایا جائے۔

میں مکمل ہجو نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے حقیقتاً میت کا ارادہ کیا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے شارف الموت (قریب الموت) کا ارادہ کیا ہے۔ پہلا معنی اشہر ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اَلْمَیْتَۃَ جو چیز ذبح کی جاتی ہے اگر ذبح کے بغیر اس کی روح نکل جائے تو اسے المیتة کہتے ہیں اور جو چیز کھائی نہیں جاتی اس کی ذبح اس کی موت کی طرح ہے جس طرح درندے وغیرہ ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور سورۂ انعام میں بھی آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت عام ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے ساتھ تخصیص داخل ہوئی ہے۔ ہمارے لیے دو مردے حلال کئے گئے ہیں: مچھلی اور مکڑی اور دو خون حلال کئے گئے ہیں: جگر اور تلی (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح عنبر (مچھلی) کے بارے میں حضرت جابر کی حدیث ہے۔ قرآن کا عموم اس کی سند کی صحت کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) (2) کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے اس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

اکثر اہل علم سمندر کے تمام جانور زندہ اور مردے کھانے کے جواز کے قائل ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے اور پانی کے خنزیر کے بارے میں جواب دینے سے توقف کیا ہے اور فرمایا: تم کہتے ہو: خنزیر۔ ابن القاسم نے کہا: میں اس سے بچتا ہوں اور میں اسے حرام خیال نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا کتاب کی تخصیص سنت (حدیث) سے کرنے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث کے ساتھ قرآن کی تخصیص جائز نہیں۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ کبھی اس آیت کی تخصیص پر صحیح مسلم کی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے (3)، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں سات غزوات میں شرکت کی، ہم آپ ﷺ کے ساتھ مکڑی کھاتے تھے۔ اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اسے کھایا جائے جیسے بھی وہ مرے پکڑنے سے یا خود بخود ابن نافع، ابن عبدالحکم اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، صفحہ 246 (وزارت تعلیم) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4013، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 826، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 152، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب اکل الجراد، حدیث 5071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حنیفہ (1) وغیرہما کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس دریائی جانور کو کھانے سے منع کیا ہے جو طبعی موت مرجائے کیونکہ وہ خشکی کے شکار سے ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ محرم جب اسے قتل کرے گا تو اس کی جزا دے گا۔ پس وہ ہرن کے مشابہ ہے۔ اشہب نے کہا: اگر وہ پاؤں یا پر کے کاٹنے کی وجہ سے مرجائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا کیونکہ یہ ایسی حالت تھی جس کے ساتھ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی نسل جاری ہو سکتی تھی۔ مکڑی کے حکم کا مزید بیان سورہ اعراف میں اس کے ذکر کے وقت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 6: علماء کا اختلاف ہے کیا میت سے نفع حاصل کرنا اور نجاسات میں سے کوئی فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ امام مالک کے اس مسئلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ کبھی فرمایا: ان سے نفع اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ حضرت میمونہ کی (مردہ) بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں حاصل نہیں کی (1) (الحدیث) اور کبھی فرمایا: مردہ چیز ساری کی ساری حرام ہے، کسی اعتبار سے بھی اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اور نہ نجاستوں میں سے کسی نجاست سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ ناپاک پانی سے کھیتی کو سیراب کرنا اور کسی حیوان کو پلانا جائز نہیں اور جانوروں کو نجاستوں کا چارہ نہیں کھلایا جائے گا، مردار کتوں اور درندوں کو بھی نہیں کھلایا جائے گا۔ اگر حیوان ناپاک چیز کھائیں تو انہیں منع کیا جائے گا۔ اس قول کی وجہ کو خاص نہیں فرمایا۔ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ خطاب مجمل ہے، کیونکہ مجمل وہ ہوتا ہے جس کے ظاہر سے مراد سمجھی نہیں جاتی۔ عربوں نے اس فرمان حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (مائدہ:3) کا مراد سمجھا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے "مردار کی کھال اور پٹھوں سے نفع نہ اٹھاؤ (2)"۔ اور یہ ارشاد آپ نے وصال سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔ ان اخبار کا بیان اور ان پر کلام سورہ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 7: رہی وہ اونٹنی یا گائے یا بکری جو ذبح کی گئی اور اس میں مردہ بچہ تھا تو بغیر ذبح کیے اس کا کھانا جائز ہے مگر یہ کہ وہ زندہ نکلے تو اسے ذبح کیا جائے گا۔ اس کے لیے اس کے نفس کا حکم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ بچہ جب ذبح کے بعد مردہ نکلا تو وہ اس جانور کے اعضاء میں سے ایک عضو کے قائم مقام ہے۔ اور اس کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بکری بیچے اور اس کے پیٹ کی چیز کا استثناء کرے تو جائز نہیں ہے جس طرح اگر کوئی جانور کے کسی عضو کی استثناء کرے تو جائز نہیں ہوتا۔ جو کچھ جانور کے پیٹ میں ہوتا ہے وہ دوسرے تمام اعضاء کی طرح اس کا تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لونڈی کو آزاد کرے جبکہ اس کے پیٹ والی چیز پر آزادی کو واقع نہ کرے تو بھی وہ آزاد ہو جائے گا لیکن اگر بچہ ماں سے جدا ہو تو وہ بیع، عتق (آزادی) میں تابع نہ ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے گائے اور بکری کے بارے پوچھا گیا جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور اونٹنی جسے نحر کیا جاتا ہے اور اس کے پیٹ میں مردہ بچہ ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 158، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 1397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب روی ان لاینتفع باھاب المیتۃ، حدیث 3598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز (1) امام ابوحنیفہ کی یہ رائے نہیں

فرمایا: اگر تم چاہو تو اس مردہ بچے کو کھاؤ کیونکہ اس کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہے۔ ابوداؤد نے اس کا معنی حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے(1)، یہ نص ہے جو احتمال نہیں رکھتی ہے اس کا مزید بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 8: امام مالک سے مردار کی کھال کے متعلق روایات مختلف ہیں، کیا اس کو دباغت کے ساتھ پاک کیا جائے گا یا نہیں؟ امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک نہیں کیا جائے گا یہ ان کا ظاہر مذہب ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھال کی دباغت کی جائے گی وہ پاک ہو جائے گی(2)۔ اور پاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مردار کا جز ہے اگر بحالت حیات اس کی کھال اتاری جاتی تو وہ نجس ہوتی۔ پس واجب ہے کہ دباغت بھی اسے پاک نہ کرے جس طرح گوشت دباغت سے پاک نہیں ہوتا اور جو اخبار طہارت کے متعلق ہیں انہیں اس پر محمول کیا جائے گا کہ جلد سے دباغت میل کچیل کو زائل کر دیتی ہے حتیٰ کہ اس سے خشک چیزوں میں اور اس پر بیٹھنے کا نفع اٹھایا جا سکتا ہے اور مشکیزہ بنا کر پانی میں بھی اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ پانی طہارت کی اصل پر ہے جب تک اس کا وصف نہ بدلے۔ اس کا حکم سورۂ فرقان میں آئے گا۔ طہارت لغت میں میل کچیل کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس طرح طہارت شرعیہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 9: مردار کے بال اور اس کی اون پاک ہے، کیونکہ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مردار کی کھال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کی جائے اور اس کی صوف اور بالوں میں کوئی حرج نہیں جب وہ دھوئے جائیں(3) کیونکہ وہ طاہر تھے اگر وہ زندہ حالت میں جانور سے لئے جاتے پس واجب ہے کہ موت کے بعد بھی اسی طرح ہوں مگر گوشت جب حالت حیات میں نجس تھا تو موت کے بعد بھی اسی طرح ہوگا۔ پس اون کا حکم موت کی حالت میں گوشت کے خلاف ہوگا جیسا کہ حالت حیات میں اس کا حکم گوشت سے مختلف تھا۔ یہ استدلال بالعکس کے اعتبار سے ہے۔ اس پر دودھ اور مردہ مرغی سے نکلنے والے انڈے کا حرام ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے نزدیک موت کے بعد بھی دودھ پاک ہے اسی طرح انڈا بھی پاک ہے لیکن وہ ناپاک برتن سے حاصل ہوئے تو برتن کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گئے نہ کہ وہ موت سے نجس ہوئے۔ مزید تفصیل اس مسئلہ کی اور اس سے پہلے والے مسئلہ کی اور علماء کا اختلاف ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: وہ چیز جس میں چوہا گر جائے اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ چوہا زندہ نکل آئے گا تو وہ پاک ہوگا اور اگر اس میں چوہا مر جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز مائع ہوگی تو وہ ساری ناپاک ہو جائے گی۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز جامد ہوگی تو جو حصہ اس چوہے کے ساتھ متصل ہوگا وہ ناپاک ہوگا پس جو اس کے قریب ہوگا اسے پھینک دیا جائے گا اور مابقی سے نفع اٹھایا جائے گا وہ پاک ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے چوہے کے متعلق پوچھا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، صفحہ 35، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، صفحہ 266 (وزارت تعلیم) وجامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 208، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن دارقطنی، صفحہ 47، جلد 1 (دار المحاسن)

گیا جو گھی میں گر کر مر جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ گھی جامد ہو تو اسے اور اس کے ارد گرد کے گھی کو پھینک دو اور اگر وہ مائع ہو تو اسے بہا دو (1)''۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب اسے دھویا جائے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ دھونے سے پاک نہ ہوگا کیونکہ نجس مائع ہے وہ خون، شراب، پیشاب اور دوسری نجاستوں کے مشابہ ہے۔

ابن قاسم نے فرمایا: دھونے کے ساتھ پاک ہو جائے گا کیونکہ وہ جسم تھا جو نجاست کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گیا۔ پس وہ کپڑے کے مشابہ ہے، اس سے خون کا پاک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہے اور شراب اور پیشاب، ان کو دھونا ان کو ہلاک کر دیتا ہے انہیں دھویا نہیں جا سکتا۔

مسئلہ نمبر 11: جب ہم غسل کے ساتھ طہارت کا حکم کریں گے تو وہ طہارت میں اور تمام وجوہ انتفاع میں پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا لیکن اسے بیچے گا نہیں حتیٰ کہ اسے بیان کرے کیونکہ یہ لوگوں کے نزدیک عیب ہے اور نفوس اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور بعض علماء اس کی تحریم اور نجاست کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ عیب کو بیان کرے جس طرح کہ دوسری معیوب اشیاء ہیں اور غسل سے پہلے اس کا بیچنا کسی حال میں جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک نجاسات کا بیچنا جائز نہیں۔ نیز یہ نجس مائع ہے یہ شراب کے مشابہ ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی قیمت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے ان پر چربی حرام کی گئی تھی پھر انہوں نے اسے پگھلایا اور اسے بیچا اور اس کی اثمان کو کھایا (2)''۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی ثمن کو حرام کرتا ہے۔ یہ مائع نجاست کی وجہ سے حرام کی گئی تھی پس اس کی ثمن کا ظاہر حکم کی وجہ سے حرام کرنا واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 12: جب ہانڈی میں کوئی حیوان پرندہ وغیرہ گر جائے اور مر جائے تو ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہانڈی میں جو کچھ تھا اسے نہیں کھایا جائے گا۔ مردار کی مخالطت سے وہ ناپاک ہو چکا ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور شوربہ انڈیل دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور اسے کھایا جائے گا اور شوربے کے متعلق ان کے شاگردوں میں سے کوئی مخالف نہیں یعنی اسے انڈیل دیا جائے گا۔ یہ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: رہا مردار کے معدہ کا پنیر اور مردار کا دودھ، تو امام شافعی نے فرمایا یہ نجس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ: 3) عام ہے۔ امام ابوحنیفہ نے ان دونوں چیزوں کی طہارت کا کہا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ خلقت کی جگہ کا اس چیز کے پلید کرنے میں کوئی اثر نہیں جس میں خلقت کا عمل ہوا ہے اسی وجہ سے وہ گوشت کھایا جاتا ہے جس میں رگیں ہوتی ہیں حالانکہ ان رگوں میں خون داخل ہوتا ہے اور نہ اس کو دھویا جاتا ہے اور نہ اس کی تطہیر کی جاتی ہے۔ امام مالک کا قول بھی امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ موت کے ساتھ ناپاک نہیں ہوتا بلکہ ناپاک برتن کی مجاورت کی وجہ

1۔ سنن ابی داود، کتاب الاطعمة، صفحہ 181، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم بیع الخمر والمیتة، صفحہ 23، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

سے ناپاک ہوتا ہے اوران چیزوں میں سے ہے جس کو دھویا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح مرغی سے جو انڈا اس کے مرنے کے بعد نکلتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ انڈا مرغی سے نکلنے سے پہلے مائع کے حکم میں ہوتا ہے یہ ہوا کے ساتھ سخت ہوجاتا ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا: اگر کہا جائے کہ تمہارا قول اجماع کے خلاف تک پہنچا تا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد مسلمان پنیر کھاتے تھے جو ان کے پاس عجمیوں کی زمین سے لایا جاتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ عجمی مجوسی تھے ان کا ذبیحہ مردار ہے۔ صحابہ کرام یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ مردار جانور کے معدہ کا پنیر ہے یا ذبح کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: خشک دودھ میں جو پنیر کی مقدار واقع ہوتی تھی وہ تھوڑی ہوتی تھی اور تھوڑی نجاست معاف ہے جبکہ وہ کثیر مائع میں مل جائے۔ یہ ایک روایت کے مطابق جواب ہے اور دوسری روایت پر یہ جواب ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور یہ کسی کے لئے نقل کرنا ممکن نہیں کہ صحابہ کرام نے عجمیوں کی زمین سے لایا گیا پنیر کھایا تھا بلکہ پنیر عربوں کے طعام سے نہیں تھا جب مسلمان عجم کی زمین میں فتوحات کے ذریعے پھیل گئے تو ذبائح ان کے لئے ہو گئے پھر ہمارے لئے کہاں سے ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے پنیر کھایا تھا چہ جائیکہ وہ عجم کی زمین سے لایا گیا ہو اور وہ ان کے ذبائح کے معدہ سے بنایا گیا ہو۔

ابو عمر نے کہا: بت پرستوں، مجوسیوں کے کھانے کو کھانے میں کوئی حرج نہیں اور باقی تمام کفار کے کھانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ کھانا ان کے ذبائح سے نہ ہو اور نہ اسے ذبح کی احتیاج ہو مگر وہ پنیر جس میں مردار کے معدہ کا پنیر ہو۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: پنیر اور گھی۔

حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور فراء (ایسی پوستین جس کا اندرونی حصہ لومڑی بلی وغیرہ کی کھال سے تیار کیا جاتا ہے) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے سکوت اختیار کیا گیا وہ معاف ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الدَّمَ علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام نجس ہے نہ اسے کھایا جائے گا اور نہ اس سے نفع اٹھایا جائے گا، ابن خویز منداد نے کہا: خون حرام ہے جب تک اس میں عموم بلویٰ نہ ہو اور عوم بلویٰ معاف ہے اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جو خون معاف ہوتا ہے اس سے مراد وہ خون ہے جو گوشت اور رگوں میں ہوتا ہے یہ بدن میں اور کپڑے میں تھوڑا ہو اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ہم نے یہ اس وجہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (المائدہ:3)

دوسری جگہ فرمایا: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (انعام:145)

(آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس کتاب میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا ہوا خون)۔

پس بہنے والا خون حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہانڈی پکاتے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب اکل الجبن والسمن، صفحہ 249 (وزارت تعلیم)

تھے خون کی وجہ سے زردی بلند ہوتی تھی ہم کھاتے تھے اور ہم اسے ناپسند نہیں کرتے تھے (1)۔ اس سے بچنا بوجھ ہے اور اس میں مشقت ہے اور دین میں بوجھ اور مشقت اٹھالی گئی ہے۔ یہ شرع میں اصل ہے۔ جب عبادت کی ادائیگی میں امت کو حرج لاحق ہوا اور اس پر بوجھ ہوا تو عبادت ساقط کر دی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ مضطر مردار کھاتا ہے، مریض افطار کرتا ہے اور مرض میں تیمم کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے یہاں مطلقاً خون کا ذکر کیا اور سورۃ الانعام میں مَّسْفُوْحًا کے ساتھ مقید فرمایا۔ علماء نے یہاں مطلق کو مقید پر محمول فرمایا ہے یہاں خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ جو گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے وہ بالا جماع حرام نہیں ہے اسی طرح جگر اور تلی کی حلت پر بھی اجماع ہے اور مچھلی کے خون میں اختلاف ہے۔ قابسی سے مروی ہے کہ یہ پاک ہے۔ اس کی طہارت سے لازم آتا ہے کہ یہ حرام نہیں ہے (2)۔ یہ ابن عربی کا اختیار ہے۔ فرمایا: اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو اس کی زکاۃ (ذبح کرنا) مشروع ہوتی۔

میں کہتا ہوں: یہ مچھلی کے خون کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ میں نے بعض حنفیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس کے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کا خون خشک ہوتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے بخلاف دوسرے خونوں کے، وہ سیاہ ہو جاتے ہیں یہ نکتہ شوافع پر احناف کی طرف سے حجت ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کا ذکر کیا تا کہ اس کے عین کی تحریم پر دلالت کرے خواہ ذبح کیا گیا ہو یا ذبح نہ کیا گیا ہو، تا کہ چربی اور دوسری بھر بھری ہڈیوں وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ (3)

مسئلہ نمبر 16: خنزیر کی چربی کی تحریم پر امت کا اجماع ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ جس نے چربی نہ کھانے کی قسم اٹھائی پھر اس نے گوشت کھایا تو وہ گوشت کھانے کی وجہ سے حانث نہ ہوگا۔ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھائی تو حانث ہوگا کیونکہ چربی کے ساتھ گوشت ہو تو اس پر گوشت کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے۔ گوشت کے اسم میں چربی داخل ہے اور گوشت، چربی کے اسم میں داخل نہیں اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام کیا اور گوشت کا ذکر کیا اور چربی کا ذکر نہ کیا کیونکہ یہ گوشت کے تحت داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر چربی کو حرام کیا اپنے اس ارشاد کے ساتھ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ (انعام: 146) اس سے ان پر گوشت کی حرمت واقع نہیں ہوئی اور چربی کے اسم میں گوشت داخل نہیں۔ اسی وجہ سے امام مالک نے چربی کی قسم اٹھانے والے اور گوشت کی قسم اٹھانے والے میں فرق کیا ہے مگر یہ کہ قسم اٹھانے والے کی نیت گوشت کی ہو، چربی کی نیت نہ ہو تو وہ حانث نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کے قول میں حانث نہ ہوگا جب وہ قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر وہ چربی کھالے۔ امام احمد نے کہا: جب قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھالی تو کوئی حرج نہیں مگر اس نے چربی سے اجتناب کا ارادہ کیا ہو۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 17: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خنزیر سارا حرام ہے سوائے بالوں کے۔ اس کے بالوں کے ساتھ جوتی سینا جائز ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے خنزیر کے بالوں کے ساتھ جوتا سینے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن خویز منداد نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس کے ساتھ جوتیاں سی جاتی تھیں، اس کے بعد بھی یہ عمل موجود تھا، ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کسی امام نے اس کا انکار کیا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جس کو جائز قرار دیا وہ ابتداء الشرع کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 18: خشکی کے خنزیر کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور پانی کے خنزیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے اس کے بارے میں کچھ جواب دینے سے انکار کیا اور فرمایا: تم خنزیر کہتے ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 19: اکثر لغوی علماء کا خیال ہے کہ خنزیر کا لفظ رباعی ہے۔ ابن سیدہ نے بعض سے روایت کیا ہے کہ یہ خزر العین سے مشتق ہے کیونکہ وہ اس طرح دیکھتا ہے، اس صورت میں لفظ ثلاثی ہوگا (1) اور ''الصحاح'' میں ہے تخازر الرجل، اپنی پلک کو تنگ کرنا تا کہ نظر کو تیز کرے۔ الخزر، آنکھ کا تنگ ہونا اور چھوٹا ہونا۔ رجل اخزر بین الخزر۔ اور کہا جاتا ہے: گویا وہ انسان آنکھ کے آخری حصہ سے دیکھتا ہے۔ خنزیر کی جمع خنازیر ہے۔ خنازیر ایک معروف بیماری بھی ہے یہ ایک سخت زخم ہوتا ہے جو گردن میں ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس سے مراد مجوسی، بت پرست اور معطل کا ذبیحہ ہے کیونکہ بت پرست بت کے لئے ذبح کرتا ہے مجوسی آگ کے لئے ذبح کرتا ہے اور معطل، وہ کسی ذات کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ اپنے لئے ذبح کرتا ہے۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مجوسی جسے آگ کے لئے ذبح کرتا ہے، بت پرست جو اپنے بت کے لئے ذبح کرتا ہے اسے نہیں کھایا جائے گا اور ان کا ذبیحہ امام مالک، اور امام شافعی وغیرہما کے نزدیک نہیں کھایا جائے گا اگرچہ وہ آگ اور بت کے لئے نہ بھی ہو۔ ابن مسیب اور ابوثور نے ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے جو وہ مسلمان کے لئے اس کے حکم سے ذبح کرے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ الاهلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: اهل بکذا یعنی اس نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ابن احمر صحرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

يهل بالفرقد ركبانها كما يهل الراكب المعتمر

قافلہ والے فرقد میں اس طرح آواز بلند کرتے ہیں جس طرح عمرہ کرنے والا سوار آواز نکالتا ہے۔

نابغہ نے کہا:

او درة صدفية غواصها بهج متى يرها يهل و يسجد

یا صدف والا موتی جس کا غواص خوش ہوتا ہے جب اسے دیکھتا ہے آواز نکالتا ہے اور جھکتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اسی سے اھلال الصبی ہو استھلالہ ہے ولادت کے وقت بچے کا چیخنا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو بتوں اور تھانوں کے لئے ذبح کی جاتی ہیں (1)۔ اس سے مراد وہ نہیں ہے جس پر مسیح کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ذبیحہ سے مقصود اسم کا اعتبار کرتے ہیں اور اس استعمال میں یہ غالب ہو گیا نیت کا اعتبار ہی نہیں کیا جو تحریم کی علت ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان اونٹوں میں نیت کا اعتبار کیا جن کو غالب ابو فرزدق نے نحر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ ان جانوروں سے ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا، میں نے حسن بن ابی حسن کی اخبار میں دیکھا، ان سے ایک مالدار عورت کے متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی دل لگی کے لئے ایک شادی کا اہتمام کیا اور اس نے کئی اونٹ ذبح کئے۔ حضرت حسن نے فرمایا اس کا کھانا حلال نہیں یہ بت کے لئے ذبح کئے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں وہ روایت ہے جو ہم نے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی مسلم کے شیخ سے روایت کی ہے فرمایا: ہمیں جریر نے قابوس سے روایت کر کے بتایا، کہ میرے باپ نے ایک عورت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا اور اسے کہا کہ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی طرف سے سلام کہنا اور پھر ان سے پوچھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سی نماز زیادہ پسند تھی اور کس نماز پر آپ دوام اختیار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے جن میں قیام لمبا فرماتے تھے اور رکوع و سجود خوب اچھا کرتے تھے اور رہی وہ نماز جس کو آپ صحت، مرض، سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑتے تھے وہ صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ ایک عورت نے عرض کی: اے ام المومنین! ہمارے لئے عجمیوں میں سے کچھ مہربان ہیں ان کی ایک عید ہوتی ہے اس موقع پر وہ ہمیں تحائف بھیجتے ہیں کیا اس میں سے ہم کچھ کھا سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: جو اس دن کے لئے ذبح کیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ اور ان کے درختوں کے پھلوں سے کھاؤ۔

مسئلہ نمبر 21: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ یہ اتباع کی وجہ سے نون کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ کسرہ اصل ہے کیونکہ التقاء ساکنین ہوا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی ان محرمات میں سے کسی چیز کی طرف کوئی مجبور ہے۔ اضطر۔ یہ ضرورۃ سے باب افتعال ہے۔ ابن محیصن نے فمن اطرّ ضاد کو طا میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور ابو السمال نے طا کے کسرہ کے ساتھ فمن اضطِرّ پڑھا ہے اور اس کی اصل اضطرر ہے جب ادغام کیا گیا تو را کی حرکت طا کی طرف نقل کی گئی۔

مسئلہ نمبر 22: اضطرار یا تو ظالم کے مجبور کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے یا بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جمہور فقہاء اور علماء کا اس آیت میں اس معنی پر اتفاق ہے کہ وہ بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ اور یہی صحیح ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے جو ان محرمات کے کھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ مجاہد نے کہا یعنی کسی کو مجبور کیا گیا ہو مثلاً ایک شخص کو دشمن پکڑ لیتا ہے اور وہ اسے خنزیر وغیرہ کا گوشت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 240، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کھانے پر مجبور کرتا ہے مگر یہ اکراہ مجبور کرنا اس کے کھانے کو اس وقت مباح کرے گا جب وہ اکراہ مجبور کرنا انتہا کو پہنچ جائے۔

وہ بھوک یا تو وہ دائمی ہوگی یا دائمی نہیں ہوگی۔ اگر بھوک دائمی ہو تو مردار سے بھوک مٹانے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں مگر مردار کا کھانا اس کے لئے حلال نہیں جبکہ وہ کسی مسلمان کا مال پاتا ہو جس میں اس کو قطع ید کا خوف نہ ہو مثلاً لٹکی ہوئی کھجوریں اور حریسۃ الجبل (پہاڑ کی چھوڑی گئی بکری) اور اس قسم کی چیزیں جن میں ہاتھ نہیں کاٹے جاتے اور اذیت نہیں دی جاتی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے ہم نے ایک اونٹنی دیکھی جس کی کھیری درخت کے کانٹوں سے باندھی گئی تھی تو ہم اس کی طرف لوٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں پکارا تو ہم آپ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ اونٹ مسلمانوں کے گھر والوں کے لئے ہیں یہ ان کی خوراک ہیں اور ان کی برکت ہیں...... کیا تمہیں اچھا لگے گا اگر تم اپنے مشکیزوں کی طرف جاؤ اور تم دیکھو کہ جو کچھ ان میں تھا وہ ختم ہو چکا ہے کیا تم اس کو عدل سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ اسی طرح حرام ہے۔ ہم نے کہا: آپ فرمایئے اگر ہمیں کھانے پینے کی ضرورت ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ اور ساتھ نہ لے جاؤ، پیو اور ساتھ نہ لے جاؤ (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک اصل ہے، ابن منذر نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب ہم سے کوئی شخص مجبور ہو جائے تو اس کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کیا حلال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ کھائے اور ساتھ نہ لے جائے، پیئے اور ساتھ نہ لے جائے (2)۔ ابن منذر نے کہا: تمام چیزیں جن میں اس کے بعد اختلاف ہوگا وہ تحریم کی طرف لوٹائی جائیں گی۔

ابوعمر نے کہا: اس کے متعلق قول یہ ہے کہ مسلمان پر جب کھانا کھلانا متعین ہو جائے تو وہ اتنی مقدار میں کھلائے جس سے اس کی روح لوٹ آئے اور اس مسلمان پر کھانا کھلانا فرض ہوگا۔ مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہاں کوئی اور نہ ہو، تو اس پر آدمی کی روح کو لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو ایسی حالت میں کھانے سے روکا گیا ہو اس کے لئے اس سے لڑنا جائز ہے جو اسے کھانے سے منع کرے، اگرچہ یہ چیز اس کے اپنے خلاف ہی چلی جائے۔ اہل علم کے نزدیک اس صورت میں ہے جب صرف ایک شخص وہاں موجود ہو اس پر فرض کا تعین ہو جائے گا۔ اگر بہت سے لوگ ہوں پھر ان پر کھانا کھلانا فرض کفایہ ہوگا اور اس میں پانی اور دوسری چیز جو مسلمان کے نفس لوٹاتی اور قائم رکھتی ہیں برابر ہیں، مگر اس شے کی قیمت کے وجوب میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ اس کی روح لوٹ آئی ہے، بعض نے قیمت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں دو قول ہیں: متقدمین اور متاخرین علماء کے درمیان مسلمان کی روح لوٹانے کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں جب کہ اس کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، کسی تھوڑی سی چیز کے ساتھ جس میں اس کے مالک کا نقصان نہ ہو اور اس میں گزارہ ہو۔

مسئلہ نمبر 23: ابن ماجہ نے دو سندوں کے ساتھ حضرت عباد بن شرحبیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں ایک سال بھوک کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینہ طیبہ آیا پھر میں ایک باغ میں آیا۔ میں نے ایک خوشہ پایا، میں نے اسے توڑا اور اسے کھایا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 68-167 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور میں نے اسے اپنی چادر میں رکھ دیا۔ باغ کا مالک آیا، اس نے مجھے مارا اور مجھ سے میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو فرمایا: تو نے اسے نہ کھلایا جب یہ بھوکا تھا اور تو نے اسے نہ علم سکھایا جب وہ جاہل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے کپڑا لوٹا دے اور اسے طعام کا ایک وسق یا نصف دے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم اس کے رجال پر متفق ہیں مگر ابن ابی شیبہ، وہ صرف مسلم کا راوی ہے عباد بن شرحبیل الغبری یشکری بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل نہیں کی، اس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کے علاوہ کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ ابو عمر نے جو ذکر کیا ہے یہ حدیث بھوک کی حالت میں قطع ید اور تنبیہ کرنے کی نفی کرتی ہے۔ ابو داؤد نے حسن سے انہوں نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی جانور کے پاس آئے اگر اس کے پاس اس کا مالک ہو تو وہ اس سے اجازت لے پھر وہ اگر اسے اجازت دے تو وہ دودھ دوہ لے اور پی لے۔ اگر مالک نہ ہو تو تین دفعہ آواز دے اگر تو مالک جواب دے تو اس سے اجازت طلب کرے۔ اگر وہ اسے اجازت دے تو فبہا ورنہ وہ دودھ دوہے اور پی لے لیکن اٹھا کر ساتھ نہ لے جائے (2)۔

ترمذی نے یحییٰ بن سلیم سے انہوں نے عبید اللہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے اور جھولی میں نہ ڈال لے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں جانتے مگر یحییٰ بن سلیم کی حدیث سے۔ اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کسی ضرورت مند نے ان پھلوں میں سے کچھ لے لیا جبکہ وہ جھولی میں ڈالنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے جب تم میں سے کوئی باغ سے گزرے تو اسے ضرورت کے مطابق کھالینا چاہئے اور کپڑے میں نہیں ڈالنا چاہئے (یعنی ساتھ نہ لے جائے)۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو نے کہا ثباناً اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے اگر تو اسے اپنے آگے اٹھائے تو وہ ثبان ہے۔ کہا جاتا ہے: قد تثبنت ثباناً، اگر تو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائے تو ابھی اس کا وہی ثبان نام ہے۔ اسی سے جب چادر کو لپیٹ کر اس میں کوئی چیز ڈالی جائے اور پیٹھ پر اٹھائی جائے تو ثبانا کہا جاتا ہے۔ اگر تو اسے اپنی جھولی میں ڈال لے تو اسے خبنۃ کہا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن شعیب کی مرفوع حدیث ہے۔ ولا یتخذ خبنۃً،(3) جھولی میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: خبنت اخبن خبنا۔ ابو عبید نے کہا: اس حدیث میں بھوکے مجبور کے لئے رخصت ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو جس کے ساتھ وہ کچھ خرید سکے اور وہ نہ اٹھائے مگر اتنی مقدار جتنی اس کے پیٹ میں طاقت ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ اصل جس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ غیر کا مال حرام ہے مگر یہ کہ غیر خوشی سے دے۔ اگر معاشرہ میں اس عمل کی عادت ہو جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں تھا یا اب بعض شہروں میں ہے تو یہ جائز ہے اور کبھی اسے بھوک اور ضرورت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 167 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، صفحہ 352، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، صفحہ 154، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کے اوقات پر محمول کیا جاتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور اگر بھوک دائمی نہ ہو کسی وقت میں ہو تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ کھائے حتیٰ کہ سیر ہو جائے اور خوب سیر ہو جائے، اور اگر آئندہ اس صحرا اور جنگل میں ضرورت کا خدشہ ہو تو ساتھ لے جائے، جب اس سے مستغنی ہو جائے تو اسے پھینک دے۔ یہی معنی امام مالک نے اپنے مؤطا میں بیان کیا اور یہی قول امام شافعی اور کثیر علماء کا ہے۔ حجت یہ ہے کہ ضرورت، حرمت کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اباحت لوٹ آتی ہے اور ضرورت کی مقدار، خوراک نہ ہونے کی حالت میں خوراک کے موجود ہونے تک ہوتی ہے۔ العنبر (مچھلی) والی حدیث اس میں نص ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب سفر سے لوٹ کر آئے تو ان کا زادراہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ساحل سمندر تک چلے تو ان کے لئے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑے ٹیلے کی طرح (مچھلی) ظاہر ہوئی۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو وہ ایک جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو لشکر کے امیر تھے، انہوں نے کہا: مردار ہے۔ پھر فرمایا: نہیں بلکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام رساں ہیں اور اللہ کے راستہ میں ہیں اور تم بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ پس تم اسے کھاؤ۔ راوی فرماتے ہیں: ہم ایک مہینہ اسے کھاتے رہے اور ہم تین سو آدمی تھے حتیٰ کہ ہم موٹے ہو گئے۔ (الحدیث)

صحابہ نے اسے کھایا اور سیر ہوئے (رضی اللہ عنہم) اس کے باوجود کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ مردار ہے اور وہ اس میں سے مدینہ طیبہ کی طرف بھی لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ حلال ہے اور فرمایا: اس کے گوشت میں سے کچھ تمہارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ صحابہ نے اس میں سے گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کھایا (1)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اتنی مقدار کھائے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔ ابن ماجشون اور ابن حبیب کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کے اصحاب نے مسافر اور مقیم کے درمیان فرق کیا ہے وہ فرماتے ہیں: مقیم اتنا کھائے جس سے اس کی زندگی بچ جائے اور مسافر سیر ہو کر کھائے اور ساتھ بھی لے جائے جب اس سے غنا پائے تو اسے پھینک دے، اگر کوئی مجبور پائے تو اسے دے دے اور اس سے عوض نہ لے کیونکہ مردار کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 24: اگر کوئی شراب پینے پر مجبور ہو۔ اگر شراب پینے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں وہ شراب پی لے۔ اگر بھوک یا پیاس کی وجہ سے مجبور ہو تو نہ پیئے۔ یہ امام مالک کا العتبیۃ میں قول ہے۔ فرمایا: شراب، پیاس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو مطلقاً حرام فرمادیا اور مردار کو ضرورت نہ ہونے کی شرط کے ساتھ حرام کیا۔ ابہری نے کہا: اگر شراب اس کی بھوک یا پیاس کو مٹائے تو اسے پی لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے پھر ضرورت کے لئے مباح کیا اور شراب کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے۔ پس خنزیر اباحت میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوگا اس جلی معنی کی وجہ سے جو قیاس سے زیادہ قوی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ سیر کرے گا اگرچہ ایک گھڑی کے لئے ہی سیر کرے گا اور بھوک کو مٹائے گا اگرچہ تھوڑی سی مدت کے لئے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، صفحہ 147، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 25: اصبغ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجبور خون پی لے اور شراب نہ پیئے۔ مردار کھالے اور کسی کے گم شدہ اونٹوں کے قریب نہ جائے ...... یہ ابن وہب کا قول ہے ...... پیشاب پی لے اور شراب نہ پیئے، کیونکہ شراب میں حد لازم ہوتی ہے۔ معلوم ہوا یہ زیادہ سخت ہے۔ اس پر امام شافعی کے اصحاب کی نص ہے۔

مسئلہ نمبر 26: اگر کسی کو لقمہ پھنس جائے تو کیا وہ شراب کے ساتھ اسے نگلے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں۔ اس خوف سے کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ اور ابن حبیب نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ یہ ضرورت کی حالت ہے۔ ابن عربی نے کہا: جس کو لقمہ پھنس جائے اس کے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو معاملہ ہے اس کے اعتبار سے جائز ہے اور رہا ہمارے درمیان کا مسئلہ تو ہم اسے دیکھیں گے اور اگر ہم پر قرائن کی وجہ سے پھنسنے کی صورت مخفی نہیں ہوگی تو ہم اس کی تصدیق کریں گے جب یہ ظاہر ہو جائے گا اور اگر پھنسنے کی صورت ظاہر نہ ہوگی تو ہم ظاہر کی بنا پر اسے حد لگائیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں باطناً عقوبت سے محفوظ رہے گا۔ پھر جب مجبور شخص مردار، خنزیر اور آدمی کا گوشت پائے تو وہ مردار کھالے کیونکہ وہ حلال ہے، جبکہ خنزیر اور آدمی کسی حالت میں حلال نہیں ہیں۔ ہلکی تحریم کو اختیار کرنا بہتر ہے بنسبت بھاری تحریم میں داخل ہونے کے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی بہن یا کسی اجنبی عورت سے وطی کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اجنبی عورت سے وطی کرلے کیونکہ بہن کسی صورت میں حلال نہیں۔ یہی ان احکام میں ضابطہ ہے۔ انسان کا گوشت نہ کھائے اگرچہ مر بھی جائے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی امام احمد اور داؤد نے کہا ہے۔ امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ ''مردہ آدمی کی ہڈی توڑنا، زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے(1)''۔ امام شافعی نے فرمایا: آدمی کا گوشت کھالے اور اس کے لئے کسی ذمی کو قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ محترم الدم ہے اور نہ کسی مسلمان اور نہ قیدی کو قتل کرے کیونکہ وہ غیر کا مال ہے۔ اگر حربی یا زانی شادی شدہ ہو تو اس کا قتل کرنا اور اس سے کھانا جائز ہے۔ ابو داؤد نے مزنی پر سخت تنقید کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: انبیاء کرام کا گوشت کھانا مباح ہے۔

ابن شریح نے بھی اس پر سخت جرح کی ہے کہ تو انبیاء کرام کے قتل تک پہنچ گیا ہے جبکہ تو نے کافر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ آدمی کا گوشت نہ کھائے مگر جب اسے یقین ہو کہ یہ اسے مرنے سے بچالے گا اور زندگی کا باعث بنے گا۔

مسئلہ نمبر 27: امام مالک سے پوچھا گیا کہ مجبور مردار کھا سکتا ہے جبکہ وہ غیر کا مال کھجور، کھیتی یا بکریاں پائے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر اسے اپنے بدن پر ضرر کا اندیشہ نہ ہو مثلاً اسے چور شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی تو وہ جو چیز پائے اس سے کھالے جو اس کی بھوک کو مٹائے لیکن اس میں سے ساتھ نہ لے جائے۔ میرے نزدیک مردار کھانے سے یہ کھانا بہتر ہے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے اور اگر اسے اندیشہ ہو کہ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور اسے چور شمار کریں گے اگر وہ مردار کھالے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ اس مقام پر مردار کھانے میں اس کے لئے وسعت ہے۔

مسئلہ نمبر 28: ابو داؤد نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے، ایک شخص پتھر یلے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، صفحہ 102، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ٹیلے پر اترا اور اس کے ساتھ اس کے گھر والے اور بچے بھی تھے۔ ایک شخص نے کہا: میری اونٹنی گم ہو گئی ہے اگر تو اسے پائے تو اسے روک لینا۔ پس اسے اونٹنی مل گئی لیکن اس کا مالک اسے نہ ملا۔ وہ اونٹنی مریض ہو گئی۔ بیوی نے اسے کہا: تو اسے نحر کر دے لیکن اس شخص نے انکار کیا حتیٰ کہ وہ مر گئی۔ بیوی نے کہا: اس کی کھال اتار لے تاکہ ہم اس کے گوشت اور چربی کو خشک کریں اور اسے کھائیں۔ اس شخص نے کہا: نہیں حتیٰ کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھ لوں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے پاس اتنی غذا ہے جو تجھے مستغنی کر دے۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تم اسے کھالو۔ فرمایا: پھر اس کا مالک آیا تو اس نے اسے پورا قصہ بتایا، اس نے کہا: تو نے اسے نحر کیوں نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے تجھ سے حیا آ گیا تھا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ایک یہ کہ مجبور، مردار میں سے کھالے اگرچہ اسے تلف (ضائع) ہونے کا اندیشہ نہ بھی ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے غنا کے متعلق پوچھا تھا، اس سے اپنے نفس پر خوف کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کھائے، سیر ہو کر کھائے، ذخیرہ بھی کرے اور ساتھ بھی لے جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادخار (ذخیرہ کرنا) کو مباح کیا اور اس پر سیر نہ ہونے کی شرط بھی نہیں لگائی۔ ابوداؤد نے اپنی سند سے فجیع عامری سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا: ہمارے لئے کون سا مردار حلال ہے؟ فرمایا: جو تمہارا کھانا ہے۔ ہم نے کہا: نغتبق و نصطبح۔ ابونعیم نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم ایک پیالہ صبح پیتے ہیں اور ایک شام کو پیتے ہیں۔ فرمایا: میرے باپ کی قسم! یہ بھوک ہے۔ فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں مردار کو ان کے لئے حلال کیا(1)۔

ابوداؤد نے کہا: الغبوق سے مراد دن کا آخری حصہ ہے اور الصبوح سے مراد دن کا ابتدائی حصہ ہے۔ خطابی نے کہا: الغبوق سے مراد شام کا کھانا ہے اور الصبوح سے مراد صبح کا کھانا ہے یعنی صبح کے وقت ایک دودھ کا پیالہ اور شام کے وقت دودھ کا پیالہ زندگی کو باقی رکھتا ہے اور نفس کو قائم رکھتا ہے اگرچہ جسم کو مکمل غذا اور تام سیرابی نہ دے، ان کے لئے اس کے ہوتے ہوئے مردار کھانے کو مباح کیا۔ یہ دلالت ہے کہ مردار کا کھانا مباح ہے یہاں تک کہ وہ نفس خوراک سے اپنی ضرورت حاصل کر لے۔ یہی امام مالک کا نظریہ ہے، یہی امام شافعی کا ایک قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب صبح و شام دودھ کا پیالہ پینا جائز ہے تو سیر ہونا اور زادراہ ساتھ لے جانا بھی جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے مردار کا کھانا جائز نہیں ہے مگر جو اس کی زندگی بچا لے۔ مزنی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر ابتدا میں یہ حالت ہو تو اس سے کھانا جائز نہیں اسی طرح جب اس کو کھانے کے بعد اس حال پر پہنچ جائے اسی طرح حسن سے مروی ہے قتادہ نے فرمایا: سیر ہو کر نہ کھائے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: تین لقموں سے زیادہ نہ کھائے، صحیح اس کے خلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 29: ان چیزوں کے ساتھ علاج کرنا، ان کے استعمال کی دو صورتیں ہیں: یا تو ان کے عین کو باقی رکھ کر انہیں استعمال کیا جائے گا یا جلا کر استعمال کیا جائے گا۔ اگر جلانے کے ساتھ بدل جائیں تو ابن حبیب نے کہا: ان کے ساتھ علاج کرنا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن ماجشون نے اس کی تخفیف کی اس بنا پر کہ جلانا، صفات کی تبدیلی کے لئے تطہیر ہے۔ اور **العتبیۃ**

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 178، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں امام مالک نے کہا: مَرْتَکْ (دواء) دوا جو مردار کی ہڈیوں سے بنائی جاتی ہے جب اسے زخم پر رکھا جائے تو اس کے ساتھ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ اسے دھو لے۔ اگر مردار قائم بعینہ ہو تو سحنون نے کہا: اس کے ساتھ اور خنزیر کے ساتھ کسی حالت میں علاج نہ کیا جائے کیونکہ ان کا بدل حلال موجود ہوتا ہے بخلاف بھوک کے۔ اگر ان کا بھوک میں بھی عوض پایا جائے تو پھر مردار کو نہیں کھایا جائے گا۔ اسی طرح شراب سے علاج نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا ظاہر بھی یہی ہے۔ یہ ابن ابی ہریرہ جو امام شافعی کے اصحاب میں سے ہیں ان کا بھی یہی مختار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: دوا کے طور پر پینا جائز ہے، پیاس کے لئے پینا جائز نہیں۔ یہ اصحاب شافعی میں قاضی طبری کا مختار مذہب ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ شوافع میں سے بعض بغدادیوں نے کہا: پیاس کے لئے پینا جائز ہے، دواء کے لئے جائز نہیں کیونکہ پیاس کا نقصان جلدی پہنچنے والا ہے بخلاف علاج کے۔

بعض علماء نے فرمایا: دونوں کے لئے پینا جائز ہے۔ بعض اصحاب شافعی نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے سوائے اونٹوں کے پیشاب کے۔ کیونکہ اس کے متعلق عرنیین والی حدیث موجود ہے۔ بعض علماء نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جو ان پر حرام کی گئی ہے (1) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طارق بن سوید سے کہا: جب انہوں نے شراب کے متعلق پوچھا تو آپ نے اسے منع فرمایا تھا یا شراب بنانے کا ناپسند فرمایا تھا۔ اس نے کہا: میں اسے دواء کے لئے بناتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دواء نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے (2)۔ مسلم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ یہ حالت اضطرار کے ساتھ مقید ہو۔ کیونکہ زہر کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے اور اس کا پینا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 30: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرَ بَاغٍ، غَيْرَ کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ بعض نے فرمایا: استثنا کی بنا پر ہے، جب تو غَيْرَ کو دیکھے کہ اس کی جگہ فی صحیح ہوتا ہے تو یہ حال ہوتا ہے اور جب اس کی جگہ الا رکھنا صحیح ہو تو یہ استثنا ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کرلو۔ بَاغٍ اصل میں باغی تھا ضمہ یا پر دشوار تھا اسے ساکن کر دیا گیا پھر تنوین اور یا ساکن جمع ہوئے تو یا کو حذف کیا گیا اور کسرہ یا کے حذف پر دلالت کرتا ہے۔ قتادہ، حسن، ربیع، ابن زید اور عکرمہ نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے وہ حاجت سے زیادہ کھانے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ۔

اور سدی نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا مطلب ہے: وہ شہوت ولذت کے لئے کھانے والا نہ ہو اور وَّلَا عَادٍ سیر ہونے کی حد تک پورا کھانے والا نہ ہو۔ مجاہد، ابن جبیر وغیرہما نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے: مسلمانوں پر بغاوت کرنے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ اور ان پر تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ باغی اور عادی میں ڈاکو، سلطان پر خروج کرنے والا، قطع رحمی میں سفر کرنے والا، اور مسلمانوں پر حملہ کرنے والا داخل ہے۔ یہ صحیح ہے، کیونکہ لغت میں البغی کا معنی فساد کا قصد کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغت المراۃ تبغی بغاءً، جب عورت بدکاری کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ (النور: 33)

کبھی البغی فساد کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: تو کہتا ہے: خرج الرجل فی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربہ، صفحہ 840، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، صفحہ 163، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

بغاء ابل له، وہ اونٹوں کی تلاش میں نکلا۔ شاعر کا قول ہے:

لا ینعك من بغا ء الخیر تعقاد الرتائم
ان الأشائم کالایا من والأیامن کالأشائم

خیر کی تلاش تجھے نہ روکے۔ دھاگے باندھے جاتے ہیں۔ بائیں، دائیں کی طرح ہیں اور دائیں بائیں کی طرح ہیں۔

مسئلہ نمبر 31: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّلَا عَادٍ، عاد کی اصل عائد ہے اور یہ مقلوب سے ہے جیسے شاکی السلاح، ھارٍ اور لاثٍ(1)۔ اصل میں شائك، ھائرِ، لائث یہ لثت العمامة سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں تمام محرمات کو مباح قرار دیا کیونکہ یہ تمام مباحات سے عاجز تھا۔ پس مباح چیز کا نہ ہونا حرام چیز کی اباحت کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 32: علماء کا اختلاف ہے جب اس کی ضرورت کے ساتھ معصیت متصل ہو مثلاً ڈاکہ ڈالنے والا ہو، یا مسافروں کو خوف دلانے والا ہو۔ امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں معصیت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مباح کیا بطور مدد اور گنہگار کی مدد کرنا حلال نہیں۔ اگر کھانے کا ارادہ کرے تو اسے توبہ کرنا چاہئے اور کھانا چاہئے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے دوسرے قول میں ان کے لئے بھی مباح کیا ہے۔ انہوں نے معصیت اور اطاعت کے درمیان مباحت میں برابری کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: عجب ہے ان کے لئے جو گنہگار کے لئے بھی اس کو مباح کرتا ہے میں کسی کو یہ کہنے والا خیال نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا کہے تو وہ قطعاً غلطی کرنے والا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا خلاف صحیح ہے کیونکہ سفر معصیت میں اپنے آپ کو ضائع کرنا اس معصیت سے زیادہ ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) یہ عام ہے۔ شاید وہ دوسری حالت میں توبہ کرے اور توبہ اس کے گناہ کو مٹا دے۔ مسروق نے کہا: جو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی طرف مجبور ہو اور وہ نہ کھائے حتیٰ کہ مر جائے تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ ابوالحسن طبری المعروف بالکیا نے کہا: ضرورت کے وقت مردار کھانا رخصت نہیں بلکہ عزیمت واجبہ ہے۔ اگر کوئی مردار کے کھانے سے رک جائے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ مردار کا کھانا سفر کی رخصت نہیں ہے یا سفر سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت کے نتائج سے ہے خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں ہو۔ مقیم گنہگار کے افطار کی طرح ہے جب وہ مریض ہوتا ہے اور اسی طرح گنہگار مسافر کا تیمم کرنا پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ فرمایا: ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں امام مالک سے روایات مختلف ہیں ان کا مشہور مذہب جو الباجی نے ''المنتقی'' میں ذکر کیا ہے۔ سفر معصیت میں اس کے لئے کھانا جائز ہے اور سفر معصیت میں نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ ابن خویز منداد نے کہا: اضطرار کی حالت میں کھانا، اس میں اطاعت شعار اور گنہگار برابر ہیں، کیونکہ سفر و حضر میں مردار کا کھانا جائز ہے۔ گناہوں کی طرف نکلنے والوں سے مقیم کا حکم اس سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ مقیم ہونے سے بھی بری حالت میں ہوتا ہے، یہ فطر اور قصر اس طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں رخصتیں سفر سے متعلق ہیں۔ جب سفر، سفر معصیت ہو تو اس میں قصر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ رخصت سفر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: وہ سفر معصیت میں پانی کے نہ ہونے کے
وقت تیمم کرے کیونکہ تیمم سفر وحضر میں برابر ہے اس کو مردار کھانے اور تیمم کرنے سے معصیت کی وجہ سے یہ منع کرنا جائز ہے
جس معصیت کا اس نے ارتکاب کیا ہے۔ مردار کو نہ کھانے میں جان کا ضیاع ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور تیمم کے ترک
میں نماز کو ضائع کرنا ہے کیا یہ کہنا جائز ہے؟ تو نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اب دوسرا گناہ کر۔ کیا شراب پینے والے کو یہ کہنا
جائز ہے کہ تو زنا کر، اور زانی کو کیا کہنا جائز ہے کہ تو کفر کر یا دونوں کو کہا جا سکتا ہے کہ تم دونوں نماز ضائع کرو؟ یہ تمام مسائل
انہوں نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں بیان کئے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے کسی کا خلاف ذکر نہیں کیا۔
الباجی نے کہا: زیاد بن عبدالرحمٰن اندلسی نے روایت کیا ہے کہ گنہگار اپنے سفر میں نماز کو قصر کرے اور رمضان میں افطار
کرے اور یہ حکم تمام لوگوں میں برابر ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو اپنی جان کو مردار کے
کھانے سے رک کر تلف کرنا جائز نہیں کیونکہ اسے وجوب کے طور پر مردار کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور جو معصیت کے سفر
میں ہو اس سے فرائض واجبات، روزہ، نماز ساقط نہیں ہوتے بلکہ ان کا ادا کرنا اس پر لازم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ذکر کیا
ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ معانی سفروں میں لوگوں کی حاجت کے لئے مباح ہیں۔ اس کے لئے ان سے گناہوں پر مدد
حاصل کرنا مباح نہیں تھا اور اس کو اپنے نفس کو قتل کرنے کی حاجت نہیں۔ ابن حبیب نے کہا: وہ پہلے گناہ سے توبہ کرے پھر توبہ
کے بعد مردار کا گوشت کھائے۔ ابن حبیب نے اس مسئلہ میں الله تعالیٰ کے اس ارشاد سے تعلق جوڑا ہے: **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ**
وَّلَا عَادٍ ضرورت کے لئے مردار کی اباحت میں شرط رکھی ہے کہ وہ باغی نہ ہو اور حرابۃ، ڈاکہ، قطع رحمی، گناہ کا طالب باغی اور حد
سے تجاوز کرنے والا ہے۔ ان میں اباحت کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں۔ والله اعلم

میں کہتا ہوں: یہ استدلال خطاب کے مفہوم سے ہے اور اس میں اصولی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کا نظم یہ ہے
کہ مضطر باغی نہیں ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا نہیں اور اس پر گناہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ سے خاموشی کی گئی ہے۔ اصل
عموم خطاب ہے۔ جس نے کسی امر کے لئے اس کے زوال کا دعویٰ کیا اس پر دلیل لانا لازم ہے۔

(☆) **مسئلہ نمبر 34**: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** یعنی الله تعالیٰ گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ پس
جس میں رخصت دی گئی ہے اس سے مؤاخذہ نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ہے اور یہ الله تعالیٰ کی رحمت سے ہے کہ اس نے رخصت دی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ
مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ وَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں الله کی نازل کی ہوئی کتاب اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ۔ سو
وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور بات تک نہ کرے گا ان سے الله تعالیٰ قیامت کے دن اور

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں (33) مسائل ہیں۔

نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت اور رسالت کی صحت کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا تھا اسے انہوں نے چھپایا۔ اَنْزَلَ بمعنی اظہر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس آیت میں سانزل بمعنی سأظهر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نزول کے معنی میں ہی ہے۔ یعنی جو ملائکہ نے اس کے رسل پر اتارا۔ وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ، بِهٖ میں ضمیر کا مرجع چھپائی گئی بات ہے۔ ثَمَنًا قَلِیْلًا یعنی رشوت لیتے ہیں۔ اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اس کی مدت ختم ہونے والی ہے اور اس کا انجام برا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو وہ رشوت لیتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت اگرچہ علماء یہود کے متعلق ہے یہ مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو دنیا کے حصول کی خاطر حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیْ بُطُوْنِهِمْ یہ بطون کا ذکر کھانے کی حقیقت پر تاکید اور دلالت کے لئے ہے، کبھی یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے مثلاً اكل فلان ارضي و نحوه (فلاں نے میری زمین کو کھایا) اور بطون کے ذکر میں ان کی نادانی پر تنبیہ ہے۔ انہوں نے اپنی آخرت کو اپنے اس کھانے کے بدلے فروخت کیا جس کا کوئی مقام نہیں (1)۔ اِلَّا النَّارَ کا معنی یہ ہے کہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ اس پر انہیں آگ کا عذاب دے گا۔ جو انہوں نے رشوت کھائی اسے آگ فرمایا کیونکہ وہ انہیں آگ تک پہنچانے والا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ انہیں حق کو چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھانے کے ساتھ عذاب دے گا۔ اس نے مآل کے مطابق حال کے ساتھ خبر دی (2)۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (النساء: 10) یعنی ان کا انجام اسی کی طرف پھیرا جائے گا۔ اسی سے عربوں کا قول ہے:

لدوا للموت وابنوا للخراب موت کے لئے پیدا کرو اور خرابی کے لئے بناؤ۔

ایک اور نے کہا:

فللموت ما تلد الوالدة جو ماں جنم دیتی ہے وہ موت کے لئے ہے۔

ایک اور نے کہا:

ودورنا لخراب الدهر نبنيها ہم اپنے گھر زمانے کی خرابی کے لئے بناتے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں قرآن اور اشعار میں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یہ ان پر ناراضگی اور رضا کے زوال سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان لا یکلم فلاناً، جب تو کسی سے ناراض ہو۔ طبری نے کہا: لَا یُكَلِّمُهُمْ یعنی ایسی کلام نہیں فرمائے گا جس کو وہ پسند کرتے ہوں گے۔ قرآن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضا

حکیم میں ہے: اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ) بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتوں کو ان کی طرف سلام کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ یعنی ان کے برے اعمال کی اصلاح نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ زجاج نے کہا: وہ ان کی خیر کے ساتھ تعریف نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو ازکیاء کہے گا۔ اَلِیْمٌ یہ بمعنی مؤلم (دردناک) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: (۱) بوڑھا زانی (۲) جھوٹا بادشاہ (۳) متکبر غریب (1)۔ ان کو عذاب الیم اور سخت سزا کے ساتھ خاص فرمایا محض مخالفت کی وجہ سے اور اس استخفاف کی وجہ سے جس نے انہیں ان جرموں پر برانگیختہ کیا کیونکہ اس پر انہیں کسی حاجت نے نہیں ابھارا اور نہ کسی ضرورت نے اس کی طرف انہیں بلایا جس طرح ضرورت انہیں بلاتی ہے جو ان کی مثل نہ ہوں لا ینظر الیھم کا معنی ہے وہ ان پر نہ رحم کرے گا اور نہ مہربانی کرے گا۔ مزید بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝

''یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض اور عذاب کو نجات کے بدلے (تعجب ہے) کس چیز نے صابر بنا دیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ جب عذاب ضلالت کے تابع ہے اور مغفرت اس ہدایت کے تابع ہے جس کو انہوں نے ترک کر دیا تو یہ دونوں شراء کے مجاز میں داخل ہوئیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ جمہور کا مذہب...... جن میں حسن اور مجاہد بھی ہیں کہ اس کا معنی تعجب ہے۔ یہ مخلوق کی طرف راجع ہے۔ گویا فرمایا: انہوں نے ان کے آگ پر صبر کرنے پر اور آگ پر ٹھہرے رہنے پر تعجب کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ۝ (عبس) غارت ہو (منکر) انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ واسمع بھم وابصر (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے۔ اس معنی کی بنا پر ابو علی نے لکھا ہے کہ حسن، قتادہ، ابن جبیر اور ربیع نے کہا: اللہ کی قسم! آگ پر انہیں صبر نہیں ہے لیکن وہ کتنے آگ پر جرأت کرنے والے ہیں (3)۔ یہ یمنی لغت ہے۔ فراء نے کہا: مجھے کسائی نے بتایا، فرمایا: مجھے یمن کے قاضی نے بتایا کہ دو جھگڑے والے ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک پر قسم واجب ہوئی تو اس نے قسم اٹھا دی۔ دوسرے مخالف نے اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ پر کتنا جرأت کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ آگ پر کتنے بہادر ہیں کیونکہ وہ ایسے اعمال کرتے ہیں جو انہیں آگ تک پہنچاتے ہیں۔ زجاج نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ 71، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اس کا معنی ہے وہ آگ پر کتنے باقی رہنے والے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: ما اصبر فلاناً علی الحبس، یعنی وہ کتنا حبس (قید) میں باقی رہنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا آگ سے جزع فزع کتنا کم ہے۔ جزع کی قلت کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسائی اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے وہ دوزخیوں کے عمل پر کتنا دوام اختیار کرنے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ما استفہام ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس (1)، سدی، عطا، ابوعبیدہ، معمر بن مثنی کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے: کس چیز نے انہیں دوزخیوں کے عمل پر صبر دیا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کی استہانت اور ان کے امر کے استخفاف (ہلکا سمجھنا) کی بناء پر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۱۷۶﴾

"یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بے شک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے اور حکم کی طرف اشارہ ہے۔ گویا فرمایا: ذالك الحكم بالنار۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہے: الامر ذالك یا ذالك الامر یا ذالك العذاب لهم۔ اور ذٰلِكَ کی خبر مضمر ہے اس کا معنی ہے: یہ ان کو معلوم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فعلنا ذالك بهم (ہم نے یہ ان کے ساتھ کیا)

بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یہاں الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ بِالْحَقِّ سے مراد سچ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حجت ہے۔ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد تورات ہے۔ نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے اور یہود نے آپ کی صفت سے انکار کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے آباء اور سلف کی مخالفت کی تورات سے حجت پکڑنے میں۔ بعض نے فرمایا: جو تورات میں حضرت محمد ﷺ کی صفت تھی اس میں مخالفت کی اور اس میں اختلاف کیا۔ بعض نے فرمایا: الْكِتٰبِ سے مراد قرآن ہے اور جنہوں نے اختلاف کیا وہ کفار قریش تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا: یہ قرآن جادو ہے۔ بعض نے کہا یہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ گھڑا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور شِقَاقٍ کے معنی پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآىِٕلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

"نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیزگار ہیں"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَیْسَ الْبِرَّ اس خطاب کی مراد میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: ہمیں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے نیکی کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرائض کے نازل ہونے سے پہلے جو ان لا الہ الا اللہ اور ان محمدا عبدہ رسولہ کی گواہی دیتا اور پھر فوت ہو جاتا تو اس کے لئے جنت واجب تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ربیع اور قتادہ نے یہ بھی کہا کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ قبلہ کی طرف منہ پھیرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ یہود کہتے تھے: قبلہ مغرب کی طرف بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کہتے تھے مشرق کی طرف سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے اور انہوں نے قبلہ کی تبدیلی میں بھی کلام کیا، ہر فرقہ نے اپنے قبلہ کی فضیلت بیان کی۔ ان سے کہا گیا یہ نیکی نہیں ہے جس میں تم ہو بلکہ نیکی تو یہ ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ... الخ۔(1)

مسئلہ نمبر 2: حمزہ اور حفص نے البر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لیس، کان کے اخوات سے ہے۔ اس کے بعد دو معرفے واقع ہوں تو تو جس کو چاہے اسم بنا دے یا خبر بنا دے۔ اور جب لیس کے بعد البر واقع ہوا تو اسے تو نے نصب دی اور اَنْ تُوَلُّوْا کو اسم بنایا اور مصدر کا اسم ہونا اولیٰ ہے کیونکہ وہ نکرہ نہیں بنتا۔ اور البر کبھی نکرہ بن جاتا ہے اور فعل تعریف میں قوی ہوتا ہے۔ باقی قراء نے البر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ لیس کا اسم ہے اور اس کی خبر اَنْ تُوَلُّوْا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: لیس البر تولیتکم وجوھکم۔ یعنی نیکی تمہارا اپنے قبلہ کی طرف مونہوں کو پھیرنا نہیں۔ اور پہلی ترکیب کے اعتبار سے معنی ہوگا تمہارا منہ پھیرنا نیکی نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا (الجاثیہ: 25) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں: ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۗى اَنْ كَذَّبُوْا (روم: 10) (آخر کار ان کا انجام جنہوں نے برائی کی تھی بہت برا ہوا کیونکہ انہوں نے جھٹلایا) فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ (الحشر: 17) (ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے)

یہ رفع کی قرأت قوی ہے کیونکہ دوسری آیت میں بالاجماع خبر پر با آئی ہوئی ہے لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (البقرہ: 189) اس آیت میں صرف البر پر رفع جائز ہے۔ پہلی آیت کو دوسری پر محمول کرنا اولیٰ ہے بنسبت مخالفت

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے۔ اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں با کے ساتھ ہے لیس البربان تولوا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کے مصحف میں بھی ہے۔ اکثر قراء کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں قرائتیں بہتر ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، الْبِرَّ یہاں خیر کے لئے اسم جامع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولکن البربرّ من آمن۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ جیسے اس آیت میں مضاف حذف ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:82) اصل میں اهل القريہ تھا۔ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ:93) اس میں بھی مضاف محذوف ہے۔ یہ فراء، قطرب اور زجاج کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

فانما هی اقبال و ادبارٌ

یہ اصل میں ذات اقبال و ذات ادبار ہے۔

نابغہ نے کہا:

و کیف تواصل من اصبحت خلالته کابی مرحب

اس شعر میں اصل کخلالۃ ابی مرحب ہے۔ پس اس میں حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: لکن ذاالبر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (آل عمران:163) یہ اصل میں ذو درجات ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور فرائض، فرض کئے گئے اور قبلہ، کعبہ کو بنایا گیا اور حدود مقرر کی گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: کامل نیکی یہ نہیں کہ تم نماز پڑھو اور اس کے علاوہ عمل نہ کرو بلکہ نیکی والا وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے ...... الخ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، عطا، سفیان اور زجاج کا قول ہے(1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ البرّ، البارّ اور البرّ کے معنی میں ہو۔ فاعل کو کبھی مصدر کے معنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل عدل، رجل صوم و فطر قرآن حکیم میں ہے: اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا (الملک:30) اس میں غوراً بمعنی غائراً ہے۔ یہ ابوعبیدہ کا اختیار ہے(2)۔ مبرد نے کہا: اگر میں قرآن کے قاریوں میں سے ہوتا تو میں ولکن البر۔ یعنی با کے فتحہ کے ساتھ پڑھتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف مَنْ پر ہے کیونکہ من جمع کے معنی میں اور محل رفع میں ہے گویا اس طرح فرمایا و لکن البر المومنون والموفون۔ یہ فراء اور اخفش کا قول ہے۔ الصابرین پر نصب مدح کی بنا پر یا فعل کے اضمار کے ساتھ ہے عرب مدح اور ذم کی بنا پر نصب دیتے ہیں۔ گویا وہ اس سے ممدوح اور مذموم کے افراد کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ اسے پہلے کلام کا تابع نہیں کرتے بلکہ اسے نصب دیتے ہیں۔ مدح کی مثال یہ ارشاد ہے: وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ (3) (النساء:162) نسائی نے یہ اشعار پڑھے ہیں

وکل قوم اطاعوا امر مرشد هم الا نميرا اطاعت امرغاويها
الظاعنين ولما يظعنوا احداً والقائلون لمن دارٌ نخليها

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہر قوم نے اپنے مرشد کے حکم کی اطاعت کی سوائے نمیر کے۔ انہوں نے اپنے گمراہ کرنے والے کے امر کی اطاعت کی۔ وہ کوچ کرنے والے ہیں انہوں نے کسی کو کوچ نہیں کرایا اور جس کا گھر اس کے کہنے والے ہیں کہ ہم اسے خالی کرتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے یہ شعر پڑھے ہیں:

لا یبعدن قومی الذین هم　سم العداة وآفة الجزر

النازلین بکل معترك　والطیبون معاقد الأزر

ان اشعار میں النازلین کو بطور مدح نصب دی گئی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نحن بنی ضبة اصحاب الجمل

اس میں بھی بنی ضبہ کو نصب مدح کے طور پر ہے۔ ذم کی مثالیں یہ ہیں: مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا (احزاب: 61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں پائے جائیں گے)۔

عروہ بن الورد نے کہا:

سقونی الخمر ثم تکنفونی　عداة الله من کذب وزور

اس میں عداۃ اللہ کو نصب بطور ذم دی گئی ہے۔

یہ سلسلہ نعوت میں عام ہے، اعراب کی جہت سے اس میں طعن نہیں کیا جاتا۔ کلام عرب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ وہ لوگ جو کلام میں ہٹ دھرمی کرتے ہیں انہوں نے کہا: لکھنے میں کاتبوں سے غلطی ہوئی ہے جب انہوں نے قرآن کا نسخہ لکھا تھا اور کہا کہ اس پر وہ روایت ہے جو حضرت عثمان (1) سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن کا نسخہ دیکھا تو انہوں نے کہا اس میں غلطی ہے عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اس کو درست کرلیں گے۔ اسی طرح سورہ النساء میں وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ (النساء: 162) اور سورہ المائدہ میں الصائبون کے بارے میں کہا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا (کہ عرب کلام میں بطور مدح یا ذم، صفت کو اعراب میں جدا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح کیا گیا ہے)۔

بعض علماء نے فرمایا: الموفون کو رفع مبتدا کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت و هم الموفون ہے۔ کسائی نے کہا والصابرین کا عطف ذوی القربی پر ہے گویا فرمایا وآتی الصابرین۔ نحاس نے کہا: یہ قول غلط ہے اور خطا واضح ہے۔ کیونکہ جب تو الصابرین کو نصب دے گا اور اس کا عطف ذوی القربی پر کریگا تو یہ (من) کے صلہ میں داخل ہوجائے گا۔ اور جب تو الموفون کو من پر عطف کی وجہ سے رفع دے گا تو تو نے صلہ کے مکمل ہونے سے پہلے من پر عطف کر دیا اور تو نے معطوف کے ساتھ صلہ اور موصول کے درمیان فرق کر دیا۔ کسائی نے کہا: حضرت عبداللہ کی قراءت میں الموفین

1۔ حضرت عثمان کے قول کی صحت کا محققین علماء نے انکار کیا ہے۔ علامہ زمخشری، ابو حیان اور آلوسی وغیرہ نے اس قول کی حضرت عثمان کی طرف نسبت کا شد و مد سے انکار کیا ہے۔ یہ واضعین کی کارستانی ہے۔

والصابرین ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں ذوالقربیٰ پر معطوف ہیں یا بطور مدح منصوب ہیں۔ فراء نے کہا: عبداللہ کی قراءت میں سورہ النساء میں وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (النساء:162) ہے۔ یعقوب اور اعمش نے الموفون والصابرون پڑھا ہے یعنی دونوں کو رفع کے ساتھ (1)۔ جحدری نے بعهودهم پڑھا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف اس ضمیر پر ہے جو آمن میں ہے۔ ابوعلی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا کہ معنی اس پر نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد ان البر برمن آمن باللہ ہو والموفون۔ یعنی ہم تمام پر ایمان لائے جیسے تو کہتا ہے: الشجاع مَنْ اقدم هو و عمرو۔ اور من آمن کے قول کے بعد جو کچھ ہے وہ من آمن کے افعال کو اور ان کے اوصاف کو شمار کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت عظیمہ امہات الاحکام میں سے ہے کیونکہ یہ سولہ قواعد اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات پر ایمان...... ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی وضاحت اپنی کتاب ''الاسنیٰ'' میں کر دی ہے...... نشر، حشر، میزان، صراط، حوض، شفاعت، جنت، دوزخ ان کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں کر دیا ہے...... ملائکہ، نازل شدہ کتب یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہیں...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے...... انبیاء کرام، مال خرچ کرنا، واجبی طور پر اور نفلی طور پر قریبی رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا۔ ان سے قطع تعلقی کو ترک کرنا، یتیم کی دیکھ بھال کرنا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنا اسی طرح مساکین کی خیر خواہی کرنا، مسافروں کی رعایت کرنا۔ ابن السبیل سے مراد بعض نے فرمایا: جو راستہ سے پیچھے رہ جانے والے ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مہمان ہے...... سوال کرنا، غلاموں کو آزاد کرانا...... اس کا بیان آیت الصدقات میں آئے گا...... نماز کی حفاظت کرنا، زکوٰۃ دینا، عہد کو پورا کرنا، تکلیف میں صبر کرنا، ان قواعد میں سے ہر قاعدہ ایک کتاب کا محتاج ہے، اکثر پر تنبیہ پہلے گزر چکی ہے۔ باقی کا بیان ان شاء اللہ ان کے مواقع پر آئے گا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا نفلی صدقہ سے یتیم کو صلہ رحمی کے طور پر یتیم ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی بھی ہو یا نہیں دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ فقیر ہو۔ اس کے متعلق عطا کے دو قول ہیں: یہ واجب زکوٰۃ کے علاوہ مال دینے کی بنا پر ہے، جیسا کہ ابھی ہم بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ جنہوں نے یہ کہا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے اور نیکی کا کمال اسی کے ساتھ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کے راستہ میں دیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے (3)۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ دارقطنی نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے پھر یہ آیت تلاوت کی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، ترمذی نے اپنی جامع میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث ایسی ہے کہ اس کی سند ایسی نہیں ہے۔

ابوحمزہ میمون اعور کو ضعیف کہا گیا ہے، بیان اور اسماعیل بن سالم نے شعبی سے یہ قول روایت کیا ہے اور یہ اصح ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے اس کی صحت پر آیت کا معنی ہی دلالت کرتا ہے۔ فرمایا: وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔ نماز کے ساتھ زکوۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ سے مراد فرضی زکوۃ نہیں ہے (کیونکہ زکوۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ورنہ تکرار ہو جائے گا(1) واللہ اعلم۔ علماء کا اتفاق ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کو کوئی ضرورت پڑ جائے تو اس میں مال کا خرچ کرنا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر اپنے قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ان کا سارا مال بھی اس میں غرق ہو جائے۔ اس پر اجماع بھی ہے اور یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى حُبِّهٖ، حُبِّهٖ میں ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: مال دینے والے کی طرف راجع ہے۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور وہ مال ہے۔ ذوی القربیٰ کو حُبِّهٖ کی وجہ سے نصب دینا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: علی حب المعطی ذوی القربیٰ۔ بعض نے فرمایا: یہ ضمیر مال کی طرف لوٹ رہی ہے مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا(2): اور عَلٰى حُبِّهٖ کا قول، کلام کے درمیان اعتراض بلیغ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا (الدھر: 8) یہ دونوں معانی کو جامع ہے الاعتراض اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کرنا۔ یعنی علی حب الطعام۔ اعتراض کی مثال یہ ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ (النساء: 124) اس کو تتمیم کہا جاتا ہے اور یہ بلاغت کی ایک قسم ہے احتراس واحتیاط کہا جاتا ہے۔ پس عَلٰى حُبِّهٖ کے قول کے ساتھ تتمیم کی اور وھو مومنٌ کے قول کے ساتھ تتمیم کی۔ اسی سے زہیر کا قول ہے:

من یلق یوماً علی عِلّاتِہ ھرماً　　　یلق السماحۃ منہ والندی خلقاً

اس شعر میں علی علاتہ تتمیم حسن ہے۔

اور امرء القیس نے کہا:

علی ھیکل یعطیک قبل سؤالہ　　　افانین جريٍ غیر کزٍّ و لا وانِ

اس شعر میں قبل سوالہ، تتمیم حسن ہے۔

اسی طرح عنترہ کا قول ہے:

اثنی علیّ بما علمت فاننی　　　سھلٌ مخالفتی اذا لم أُظلم

اس شعر میں لم أُظلم، تتمیم حسن ہے۔

طرفہ نے کہا:

فسقی دیارک غیر مفسدھا　　　صوب الربیع و دیمۃ تھمی

اس میں غیر مفسدھا تتمیم اور احتراس ہے۔

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ربیع بن ضبع الفزاری نے کہا:

فنیت و ما یفنی صنیعی و منطقی و کل امرئ الا احادیثہ فان

اس شعر میں الا احادیثہ تتمیم اور احتراس ہے۔

ابو ہفان نے کہا:

فأفنی الردی ارواحنا غیر ظالم وأفنی الندی اموالنا غیر عائب

اس میں غیر ظالم اور غیر عائب تتمیم اور احتیاط ہے۔ شعر میں یہ کثیر ہوتا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع الایتاء ہے کیونکہ فعل اپنے مصدر پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ (آل عمران: 80) یعنی بخل ان کے لئے بہتر ہے جب کوئی حاجت لاحق ہو یا فاقہ لاحق ہو تو مال کا عطا کرنا انہیں محبوب ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: حبہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کا اسم ہے جو مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان ان وجوہ میں خرچ کرے جبکہ وہ صحیح ہو (اس مال پر) بخیل ہو فقر کا اندیشہ ہو اور بقا کی امید رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ، الْبَاْسَآءِ سے مراد شدت اور فقر ہے اور الضَّرَّآءِ سے مراد مرض اور اپاہج پن ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں سے کوئی بندہ جسے میں اس کے بستر میں بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اپنے تیمارداروں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اس کے گوشت سے بہتر گوشت اور اس کے خون سے بہتر خون عطا کرتا ہوں، اگر میں اس کی روح قبض کر لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہوں، اگر میں اسے عافیت دیتا ہوں تو اسے عافیت دیتا ہوں جبکہ اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کے گوشت سے کون سا گوشت بہتر ہے؟ فرمایا: وہ گوشت جس نے گناہ نہیں کیا ہوتا۔ عرض کی گئی: اس کے خون سے بہتر خون کون سا ہے؟ فرمایا: ایسا خون جس نے گناہ نہیں کیا الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ۔ دونوں فعلاء کے وزن پر ہیں۔ ان کا فعل نہیں ہے کیونکہ یہ اسم ہیں اور صفت نہیں ہیں وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اس سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یعنی وہ اپنے امور میں سچ اور تقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے امور کو پورا کرتے ہیں۔ وہ دین میں کوشش کرنے والے ہیں یہ انتہائی تعریف اور ثناء ہے۔ صدق کا متضاد کذب ہے۔ کہا جاتا ہے: صدقوھم القتال انہوں نے قتال کی تصدیق کی۔ الصدیق جو صدق کو لازم پکڑتا ہے اور حدیث میں ہے: علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر و ان البر یھدی الی الجنۃ و ما یزال الرجل یصدق و

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

یتحری الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً ☆۔ (تم پر سچ بولنا لازم ہے۔ سچ، نیکی کی طرف ہدایت دیتا ہے نیکی جنت کی طرف ہدایت دیتی ہے انسان سچ بولتا ہے اور سچ کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سچا لکھا جاتا ہے)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اے ایمان والو! فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پس جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز تو چاہیے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہیے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح۔ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ تو جس نے زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری(1)، نسائی اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: بنی اسرائیل میں صرف قصاص (بدلہ) تھا ان میں دیت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کہا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ، العفو سے مراد قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ وہ معروف طریقہ سے طلب کرے اور وہ احسان کے ساتھ ادا کرے۔ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ جو تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ جس نے دیت کی قبولیت کے بعد قتل کیا تو اس پر عذاب الیم ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ حمیدی نے ہمیں بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں سفیان نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں عمرو نے بیان کیا، فرمایا: میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ شعبی نے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کے تحت فرمایا: یہ عربوں کے دو قبائل کے بارے اتری جو آپس میں لڑے تھے۔ انہوں نے کہا ہم اپنے غلام کے بدلے میں فلاں بن فلاں کو قتل کریں گے اور ہم اپنی لونڈی کے بدلے میں فلانۃ بنت فلاں کو قتل کریں گے۔ اسی طرح قتادہ سے مروی ہے۔(2)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ، كُتِبَ کا معنی فُرِضَ اور اثبت ہے۔ اسی سے عمر بن

1۔ صحیح بخاری، باب یاایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص۔۔۔ الآیہ، حدیث نمبر 4138، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ابی ربیعۃ کا قول ہے:

کتب القتل والقتال علینا و علی الغانیات جر الذیول

ہم پر قتل اور قتال فرض کیا گیا ہے اور گانے والیوں پر دامنوں کو گھسیٹنا۔

بعض علماء نے فرمایا: كُتِبَ یہاں خبر دینا ہے اس کے متعلق جو لوح محفوظ پر رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے القصاص۔ یہ قص الاثر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پیچھا کرنا۔ اسی سے القاص ہے کیونکہ وہ آثار اور اخبار کی اتباع کرتا ہے۔ قص الشعر اس کے اثر کی اتباع کرنا۔ گویا قاتل قتل کے راستہ پر چلتا ہے تو اس میں اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اس میں اس کے راستہ پر چلا جاتا ہے (1)۔ اسی سے ہے: فارتدا علی اثارھما قصصا، وہ اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھے آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: القص کا معنی کاٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: **قصصت ما بینھما**۔ اسی سے قصاص لینا ہے کیونکہ اسے اس کی مثل زخم لگایا جاتا ہے جو اس نے لگایا تھا یا اسے قتل کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اقصّ الحاکم فلاناً من فلان و أباءہ بہ فامثلہ فامتثل بہ یعنی حاکم نے فلاں سے قصاص لیا۔

مسئلہ نمبر 3: قصاص کی صورت یہ ہے کہ قاتل پر فرض ہے کہ جب ولی قتل کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کرے اور قصاص شرعی کی پیروی کرے اور ولی پر فرض ہے کہ وہ قاتل کو ہی قتل کرے، اس کے ولی کو قتل نہ کرے اور غیر پر تعدی نہ کرے جیسا کہ عرب تعدی کرتے تھے وہ غیر قاتل کو قتل کرتے تھے (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہی معنی ہے کہ لوگوں میں سے اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے روز تین شخص زیادہ نافرمان ہوں گے: ایک وہ جس نے غیر قاتل کو قتل کیا، وہ جس نے حرم میں قتل کیا، وہ جس نے جاہلیت کی دشمنی کا بدلہ لیا۔ شعبی اور قتادہ وغیرہما نے کہا: اہل جاہلیت میں برائی اور شیطان کی اطاعت تھی۔ ایک قبیلہ جس میں عزت اور قوت ہوتی تھی پھر اس کا غلام قتل کیا جاتا تھا تو اس کے مقابل والے کہتے: ہم اس کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے۔ جب ان کی عورت قتل ہوتی تو کہتے: ہم اس کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے جب ان کا کوئی کم مرتبہ شخص قتل ہوتا تو وہ کہتے: ہم اس کے بدلے میں شریف کو قتل کریں گے اور کہتے: قتل، قتل سے بچانے والا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حد سے تجاوز کرنے سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ**۔ اور فرمایا: **وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ** فصاحت و بلاغت میں ان دونوں کے کلاموں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں کوئی اختلاف نہیں قتل کا فیصلہ اولی الامر حاکم کرے گا۔ ان پر قصاص کا قائم کرنا اور حدود کا قائم کرنا فرض کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کو قصاص کے ساتھ خطاب فرمایا۔ پھر تمام مسلمان تو قصاص پر جمع نہیں ہو سکتے تو انہوں نے سب کے قائم مقام سلطان کو کیا کہ وہ قصاص اور حدود کو قائم کرے۔ القصاص لازم نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ قصاص اور دوسری حدود زیادتی تک تجاوز نہ کریں (3)۔ جب قصاص کے بدلے میں دیت یا معافی کے ساتھ مقتول کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اولیاء راضی ہو جائیں تو یہ مباح ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُتِبَ عَلَيْكُمُ کا معنی ہے: تم پر فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا ہے تو پھر قصاص کیسے واجب ہوگا؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب تم ارادہ کرو جان لو کہ قصاص جھگڑے کے وقت غایت ہے۔ القتلی، قتیل کی جمع ہے اور مونث کا لفظ، جماعت کی تانیث ہے یہ ان افعال میں سے ہیں جو لوگوں پر کرھاً (ناپسندیدگی) داخل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس بنا پر یہ الفاظ آئے ہیں جیسے جرحی، زمنی، حمقی، صرعی، غرقی، اور اس کے مشابہ الفاظ۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا یہ آیت نوع کے حکم کو بیان کر رہی ہے جب کوئی اپنی نوع کو قتل کرے۔ اس آیت سے آزاد کا حکم بیان کیا جب وہ آزاد کو قتل کرے، غلام جب غلام کو قتل کرے، عورت جب عورت کو قتل کرے، ایک نوع جب دوسری نوع کو قتل کر دے تو اس سے تعرض نہیں کیا۔ یہ آیت محکم ہے اور اس میں اجمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان کر رہا ہے: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ الخ۔ (المائدہ:45) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے بیان فرمایا جب ایک یہودی نے ایک عورت کو قتل کر دیا تھا (1)۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ آیت سورۂ مائدہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6: کوفیوں اور ثوری نے کہا: آزاد کو غلام کے بدلے، مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى۔ یہ حکم عام ہے اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ:45) وہ فرماتے ہیں: حرمت میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔ جس میں قصاص ہوتا ہے وہ ہے خون کی حرمت جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔ ذمی بھی ہمیشہ محفوظ الدم ہوتا ہے اور اسی طرح مسلمان بھی۔ دونوں دارالاسلام کے اہل سے ہو گئے اور اس چیز کو یہ امر بھی ثابت کرتا ہے کہ ذمی کا مال مسلمان کے مال کے برابر ہے۔ پس خون کی مساوات کی یہ دلیل ہے کیونکہ مال کی حرمت، مالک کی حرمت کے ساتھ ہوتی ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی، ثوری، ابن ابی لیلیٰ کا اتفاق ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح غلام کے بدلے غلام کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے اور یہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ سعید بن مسیب، قتادہ، ابراہیم نخعی اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔ جمہور علماء غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: آیت میں تنویع و تقسیم کے لئے حکم ہے۔ ابو ثور نے کہا: جب تمام علماء کا اتفاق ہے کہ نفوس سے کم میں غلاموں اور آزاد لوگوں میں قصاص نہیں ہے تو نفوس اس کے زیادہ لائق ہیں اور جنہوں نے ان کے درمیان فرق کیا ان کے کلام میں تناقض ہے۔ اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جو غلام کو خطا قتل کر دے تو اس پر غلام کی قیمت واجب ہے۔ پس جس طرح غلام قتل خطا میں آزاد کے مشابہ نہیں ہے قتل عمد میں بھی مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح غلام سامانوں میں سے ایک سامان ہے اور بیچا جاتا ہے اور خریدا جاتا ہے اور اس میں مرضی سے تصرف کیا جاتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب مایذکر فی الاشخاص والخصومة بین المسلم، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس غلام اور آزاد کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے اور کوئی برابری نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ اجماع صحیح ہے۔ رہا پہلا قول (جب تمام علماء کا اتفاق ہے اس کی کلام میں تناقص ہے) ابن ابی لیلیٰ اور داؤد نے نفس میں اور تمام اعضاء میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص کا قول کیا ہے اور داؤد نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: المسلمون تتکافأ دمائھم (1) (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ بخاری نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت نقل کی ہے (2) اور اس کے مخالف جو حدیث ربیعہ سے روایت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ایک مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کیا۔ یہ حدیث اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع ہے اور ابن البیلمانی کی حدیث جو حضرت ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع مروی ہے یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ ابن البیلمانی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابراہیم بن ابی یحییٰ کے علاوہ کسی نے اس کو مسند نہیں بنایا اور ابراہیم متروک الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عن ربیعہ عن ابن البیلمانی مرسل ہے ابن البیلمانی ضعیف الحدیث ہے۔ جب وہ حدیث کو متصل بیان کرے تب بھی اس کی حدیث حجت نہیں ہوتی تو پھر اس کی مرسل کیسے حجت ہوگی۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں بخاری کی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کی تخصیص کرتی ہے یعنی كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى اور النفس بالنفس کے عموم کو خاص کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 8: حضرت علی بن ابی طالب، حسن بن ابی حسن بصری سے روایت ہے کہ یہ آیت مذکورین کے حکم کو بیان کرتی ہے تا کہ ان کے درمیان اور ان کے درمیان جو آزاد، غلام کو قتل کر دے یا غلام، آزاد کو قتل کر دے یا مذکر، مونث کو قتل کر دے، مونث، مذکر کو قتل کر دے فرق پر دلالت کرے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا: جب کوئی مرد، عورت کو قتل کر دے اگر اس عورت کے اولیاء اس کو قتل کرنا چاہیں تو اس کے ورثاء کو نصف دیت دے دیں اور اگر اس عورت کے اولیاء اسے زندہ رکھنے کا ارادہ کریں تو اس سے نصف دیت لے لیں۔ اور اگر کوئی عورت مرد کو قتل کر دے پھر اگر اس مرد کے اولیاء اس عورت کو قتل کرنا چاہیں تو اسے قتل کر دیں اور نصف دیت لے لیں۔ وگرنہ اپنے ساتھی کی دیت لے لیں اور عورت کو زندہ چھوڑ دیں (3)۔ شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام شعبی نے حضرت علی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ حضرت حکم نے حضرت علی اور حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب مرد، عورت کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا قصاص ہوگا۔ یہ روایت شعبی کی حضرت علی سے روایت کے مخالف ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ کانا اور ایک ہاتھ جس کا شل ہو جب وہ کسی سلامت اعضاء والے کو قتل کر دے تو اس کے ولی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کانے شخص کو قتل کر دے اور نصف دیت لے لے۔ اس وجہ سے کہ اس نے دو آنکھوں والے کو قتل کیا تھا اور یہ کانا تھا اور اس نے دو ہاتھوں والے کو قتل کیا جب کہ اس کا

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی السریۃ ترد علی اھل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم، حدیث نمبر 108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　3۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ایک ہاتھ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ نفس، نفس کا مقابل ہے بچے کا نفس بڑے کے نفس کا مقابل ہے۔

اور یہ کہنے والے کو کہا جائے گا کہ آدمی، عورت کا مقابل نہیں ہوتی اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) کے تحت داخل ہے۔ پھر تم نے اس عورت کے بدلے میں مرد کو کیوں قتل کر دیا جبکہ وہ مرد کے برابر نہیں ہے؟ پھر تم نصف دیت بھی لیتے ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ دیت قصاص کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ جب دیت قبول کی جائے گی تو خون حرام ہو جائے گا اور قصاص اٹھ جائے گا۔ پس تیرا یہ قول اس کی نہ اصل ہے نہ قیاس۔ یہ ابو عمر کا قول ہے جب آزاد غلام کو قتل کرے گا تو پھر اگر غلام کا مالک چاہے تو آزاد کو قتل کرے اور آزاد کی دیت دے دے مگر غلام (مقتول) کی قیمت منہا کر لے اگر چاہے تو آزاد کو زندہ چھوڑ دے اور غلام کی قیمت لے لے۔ یہ حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس روایت نے بھی پہلے لوگوں کا انکار کیا۔(1)

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے بدلے مرد کو اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا اور جمہور علماء کسی شے کے ساتھ رجوع کا نظریہ نہیں رکھتے۔ ایک فرقہ اضافی دیتوں کا نظریہ رکھتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ثوری اور ابوثور نے کہا: اسی طرح نفس سے کم میں بھی ان کے درمیان قصاص ہوگا۔ حماد بن ابی سلیمان اور امام ابوحنیفہ نے کہا: نفس سے کم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ قصاص نفس کے بدلے نفس کا ہے ان پر حجت اس طرح پیش کی گئی ہے کہ جب نفس کے بدلے نفس ہے تو اس سے کم میں بدلہ بدرجہ اولی ہوگا جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: ابن عربی نے کہا: لوگوں میں جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگوں نے کہا: آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اس کے متعلق انہوں نے حسن عن سمرہ کے سلسلے سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے(2)۔ یہ حدیث ضعیف ہے اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ** (اسراء: 33)۔ یہاں ولی سے مراد سردار اور مالک ہے اس کے لئے اپنے نفس پر سلطان کیسے ہوگی؟ علماء کا اتفاق ہے کہ مالک اگر خطا اپنے غلام کو قتل کر دے تو مالک سے غلام کی قیمت بیت المال کے لئے نہیں لی جائے گی۔ عمرو بن شعیب سے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے کوڑے لگائے اور ایک سال تک اسے جلاوطن کیا مسلمانوں سے اس کا حصہ ختم کر دیا اور اس غلام کے بدلے میں اس سے قصاص نہ لیا۔(3)

اگر کہا جائے کہ جب مرد اپنی بیوی کو قتل کر دے تو پھر تم کیوں کہتے ہو کہ خاوند سے قصاص دور کرنے میں شبہ نکاح ہے کیونکہ نکاح غلامی کی ایک قسم ہے۔ یہ لیث بن سعید نے کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکاح عورت کے لئے خاوند پر منعقد ہوتا ہے، جس طرح مرد کے لئے عورت پر منعقد ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نہ تو اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے اور نہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ سنن ابن ماجہ، باب هل یقتل الحر بالعبد، حدیث نمبر 2652، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 2653

چار عورتوں سے زائد سے نکاح کر سکتا ہے۔ عورت خاوند سے وطی کے حق کا مطالبہ کر سکتی ہے جس طرح مرد اس سے مطالبہ کر سکتا ہے لیکن مرد کو عورت پر قوامت کی فضیلت حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے بنائی ہے کیونکہ وہ اپنے مال سے اس پر خرچ کرتا ہے یعنی اس پر مہر اور نفقہ واجب ہوتا ہے اگر شبہ ہوگا تو دونوں طرف سے ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث جس کو ابن عربی نے ضعیف کہا ہے وہ صحیح ہے۔ نسائی اور ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے۔ اس کا مکمل متن یہ ہے: جو غلام کا ناک کاٹے گا ہم اس کا ناک کاٹیں گے اور جو اس کو خصی کرے گا ہم اسے خصی کریں گے۔ بخاری نے علی بن مدینی سے روایت کیا ہے کہ حسن کا سمرہ سے سماع صحیح ہے اور انہوں نے اس حدیث کو لیا ہے۔ بخاری نے کہا: میں اسی کی طرف جاتا ہوں (یعنی میرا مذہب یہی ہے) اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو یہ دونوں امام اس کو اپنا مذہب نہ بناتے۔ تیرے یہ دونوں امام کافی ہیں۔ آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ نخعی اور ثوری نے ایک قول میں یہی کہا۔ بعض محدثین نے کہا: حسن نے حضرت سمرہ سے نہیں سنا سوائے عقیقہ کی حدیث کے۔ واللہ اعلم۔ غلاموں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یہ عمر بن عبدالعزیز، سالم بن عبداللہ زہری، قران، امام مالک، امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے شعبی، نخعی، ثوری اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ان کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول اصح ہے۔

مسئلہ نمبر 11: دارقطنی، ابوعیسیٰ ترمذی نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باپ بیٹے سے قصاص لے گا اور بیٹا باپ سے قصاص لے گا۔ ابوعیسیٰ نے کہا: اس حدیث کو ہم سراقہ کی حدیث سے نہیں جانتے مگر اس طریق سے۔ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اس کو اسماعیل بن عباس سے مثنی بن صباح سے روایت کیا ہے اور مثنی حدیث میں ضعیف ہے۔ اس حدیث کو ابوخالد احمر نے حجاج سے انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اس کے دادا سے انہوں نے حضرت عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، یہ حدیث عمرو بن شعیب سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ اس حدیث میں اضطراب ہے اہل علم کے نزدیک علم اس پر ہے کہ باپ جب بیٹے کو قتل کردے گا تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب باپ بیٹے پر تہمت لگائے گا تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر قصاص نہیں ہے اور اس پر دیت ہے۔ یہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ عطا اور مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک، ابن نافع، ابن عبدالحکم نے کہا: باپ کو بیٹے کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: ہم کتاب وسنت کے ظاہر کی وجہ سے یہی کہتے ہیں: ظاہر کتاب یہ کُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے المومنون تتکافأ دمائھم ''مومنوں کے خون برابر ہیں'' اور ہم کوئی خبر ایسی نہیں جانتے جس میں باپ کی استثناء ثابت ہو۔ اس کے متعلق ہم نے جو اخبار روایت کی ہیں وہ ثابت نہیں ہیں۔ الکیا طبری نے عثمان البتی سے حکایت کیا ہے کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ قرآن میں قصاص کے متعلق عام حکم ہے۔ اس کی مثل امام مالک سے مروی ہے۔ شاید وہ قرآن کی عمومات کے مقابلہ میں اخبار احاد کو قبول نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کر دے مثلاً اسے لٹائے اور ذبح کر دے یا اسے باندھ دے جبکہ اس کے لئے اس میں کوئی عذر نہ ہو اور اس کے خطا کے دعویٰ میں کوئی شبہ نہ ہو تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ رہا وہ شخص جو ادب سکھانے کے لئے اسے ہتھیار سے مارے یا گلا دبا کر اسے قتل کر دے تو اس میں دو قول ہیں: اس کو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسے قتل نہیں کیا جائے گا (1)۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے شیخ فخر الاسلام الشاشی سے سنا وہ فرما رہے تھے: باپ کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کے وجود کا سبب تھا پس بیٹا اس کے عدم کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ قول اسی سے باطل ہو جاتا ہے کہ جب کوئی اپنی بیٹی سے بدکاری کرے تو اسے رجم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس بچی کے وجود کا سبب تھا اور یہ اس کے عدم کا سبب ہوئی ہے۔ پھر یہ کس فقہ کے تحت ہے، وہ اس کے عدم کا سبب کیوں نہ ہو۔ جب اس کے متعلق اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والد سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ یہ حدیث باطل ہے (2)۔ ان کے متعلق ہے کہ حضرت عمر نے بیٹے کے قاتل کے بارے میں دیت مغلظہ کا فیصلہ فرمایا اور کسی صحابی نے ان پر انکار نہیں کیا۔ تمام فقہاء نے مطلق مسئلہ کو لیا اور کہا کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور امام مالک نے مسئلہ کو محکمہ مفصلہ لیا اور فرمایا: اگر اس نے اس پر تلوار سونتی تو یہ حالت قتل کے قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے اور عدم قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ ابوہ کی شفقت ایک قائم شبہ ہے۔ قتل کے قصد کے نہ ہونے کا شاہد شبہ ہے۔ پس قصاص ساقط کیا جائے گا۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کو لٹا دے تو اس کے قصد سے پردہ اٹھ گیا پس وہ اصل کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کہتے ہیں بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں بیٹے کو قتل کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 12: امام احمد بن حنبل نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مساوات کی شرط رکھی ہے اور جماعت اور ایک آدمی کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ (المائدہ: 45) اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص سے مراد آیت میں جس نے کسی کو قتل کیا ہے اسے قتل کرنا ہے۔ اس میں عربوں کا رد ہے جو اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے تھے جس نے قتل کیا ہوتا تھا اور ایک کے مقابلہ میں سو کو قتل کرتے تھے، اپنی جاہ و حشمت کا اظہار اور فخر کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل اور مساوات کا حکم دیا کہ جو قتل کرے صرف اسے قتل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صنعا میں ایک شخص کے بدلے میں سات شخصوں کو قتل کیا اور فرمایا: اگر اہل صنعا اس کو قتل کرنے میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن خباب کے بدلے میں خارجیوں کو قتل کیا۔ حضرت عبد اللہ بن خباب کو انہوں نے بکری کی طرح ذبح کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے کہا: اللہ اکبر۔ آپ نے فرمایا: انہیں کہو کہ حضرت عبد اللہ بن خباب کے قاتل کو ہمارے سامنے نکالو۔ انہوں نے کہا: ہم سب نے قتل کیا ہے۔ تین مرتبہ یہ کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابن ماجہ، باب لا یقتل الوالد بولدہ، حدیث نمبر 2650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اپنے اصحاب سے کہا: اس قوم کو پکڑو۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علی اور ان کے ساتھیوں نے خارجیوں کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں حدیثیں دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں اور ترمذی میں حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر سارے آسمان والے اور سارے زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو آگ میں اوندھا گرائے گا۔ اس حدیث کے متعلق فرمایا یہ حدیث غریب ہے اگر ایک جماعت کو معلوم ہوگا کہ جب وہ ایک شخص کو قتل کریں گے تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا...

اس قاعدہ کی رعایت کرنا، الفاظ کی رعایت کرنے سے اولیٰ ہے۔ ابن منذر نے کہا: زہری، حبیب بن ابی ثابت اور ابن سیرین نے کہا: دو شخصوں کو ایک کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے یہ حضرت معاذ بن جبل، ابن زبیر اور عبدالملک سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ اصح ہے۔ جس نے ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل کرنا مباح کیا ہے اس کے پاس کوئی حجت نہیں حالانکہ حضرت ابن زبیر سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: ائمہ نے ابوشریح کعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اے خزاعہ کے گروہ! تم نے ہذیل کا یہ شخص قتل کیا ہے اور میں اس کی دیت دینے والا ہوں۔ پس میری اس گفتگو کے بعد جس کا کوئی شخص قتل کیا جائے گا اس کے ورثا کو دو چیزوں میں اختیار ہوگا یا تو وہ دیت لے لیں یا قاتل کو قتل کریں۔ یہ ابوداؤد کے لفظ ہیں (1)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابوشریح خزاعی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کا کوئی شخص قتل ہو جائے تو اسے قتل کرنے یا معاف کرنے یا دیت لینے کا اختیار ہے۔ بعض اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں دیت لینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: مقتول کے ولی کو اختیار ہے اگر چاہے تو قصاص لے لے اگر چاہے تو دیت لے لے۔ اگرچہ قاتل راضی نہ بھی ہو۔ یہ سعید بن مسیب، عطاء، حسن سے مروی ہے اس کو اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے۔ لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ان کی حجت ابوشریح کی حدیث ہے اور جو اس کے ہم معنی احادیث ہیں یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ نیز نظر کے طریق سے اس کی رضا کے بغیر اس پر دیت لازم ہے کیونکہ اس پر فرض نفس کا احیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء:29) نہ قتل کرو اپنے نفسوں کو اور ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی جو اپنا خون ترک کر دے۔ (یہ تاویل کے مطابق) اور اس سے دیت لینے میں راضی ہو۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس نے دیت لینی ہے وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل پر ضروری ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے ادا کرے۔ ٹال مٹول نہ کرے اور ادائیگی کے وقت سے تاخیر نہ کرے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ہم سے پہلے لوگوں پر قصاص کے علاوہ کچھ فرض نہ تھا اس امت پر دیت کے ساتھ فضل فرمایا جبکہ مقتول کا وارث راضی ہو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مقتول کے ولی کے لئے صرف قصاص ہے وہ دیت نہیں لے گا مگر جب قاتل راضی ہو۔ ابن القاسم نے مالک سے یہ روایت کیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب ولی العمد یرضی بالدیۃ، حدیث نمبر 3905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ ان کا مشہور قول یہی ہے۔ ثوری اور کوفیوں نے یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ربیع کے واقعہ کے متعلق ہے جب اس نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا تھا۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور فرمایا: کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے، کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اختیار نہیں دیا جس پر جنایت کی گئی تھی کہ وہ قصاص لے یا دیت لے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے عمد (جان بوجھ کر جنایت کرنے) میں قصاص ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے ابو شریح کی مذکور حدیث کی وجہ سے۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے ابو حنیفہ بن سماک بن فضل شہابی نے بتایا، فرمایا: اور مجھے ابن ابی ذئب نے بتایا، انہوں نے مقبری سے انہوں نے ابو شریح کعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال فرمایا: جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو چیزوں میں اختیار ہے اگر پسند کرے تو دیت لے لے، اگر پسند کرے تو اس کے لئے قصاص (بدلہ) ہے۔ ابو حنیفہ نے کہا: میں نے ابن ابی ذئب سے کہا۔ اے ابو الحارث! تو اس پر عمل کرتا ہے۔ اس نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور بلند آواز سے مجھے کہا: میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے: تو اس پر عمل کرتا ہے۔ ہاں میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ یہ مجھ پر اور سننے والے پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے منتخب فرمایا اور آپ کے ذریعے ہدایت دی اور آپ کے ہاتھوں پر ہدایت دی اور لوگوں کے لئے وہ پسند کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پسند کیا اور آپ کی زبان پر پسند کیا۔ مخلوق پر لازم ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی سے یا ذلیل ہو کر اطاعت کریں۔ مسلمان کے لئے اس سے خروج کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ابو حنیفہ نے کہا: ابن ابی ذئب مجھ سے خاموش نہ ہوئے حتی کہ میں نے خواہش کی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنۡ عُفِيَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَيۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ۔

مَنۡ اور عفی کی تاویلات میں پانچ اقوال ہیں:

۱- مَنۡ سے مراد قاتل ہے اور عُفِیَ، عافیا کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور وہ مقتول کا ولی ہے۔ الاخ سے مراد مقتول ہے اور شیئٌ سے مراد وہ خون ہے جو اس کو معاف کیا گیا ہے اور دیت لینے کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے اور العفو اس قول میں اپنے معنی پر ہے اور وہ ہے: ترک کرنا۔ معنی یہ ہے کہ قاتل کو جب مقتول کا ولی خون معاف کر دے اور قصاص ساقط کر دے تو وہ دیت لے، وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل اچھے طریقہ سے دیت ادا کرے۔

۲- یہ امام مالک کا قول ہے۔ مَنۡ سے مراد ولی ہے اور عُفِیَ کا معنی آسانی کرنا ہے یہ العفو کے معنی میں نہیں ہے اور الاخ سے مراد قاتل ہے اور شیٔ سے مراد دیت ہے یعنی ولی جب قصاص معاف کر کے دیت لینے کی طرف مائل ہو تو قاتل کو اختیار ہے کہ وہ اسے دیت دے یا اپنا آپ حوالے کر دے۔ ایک مرتبہ اس پر آسانی کی گئی ہے اور ایک مرتبہ آسانی نہیں کی گئی۔ امام مالک کے علاوہ علماء فرماتے ہیں: جب اولیاء دیت پر راضی ہوں تو قاتل کو کوئی اختیار نہیں بلکہ اس پر دیت لازم ہے۔ امام مالک سے یہ قول

بھی مروی ہے ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس کو ترجیح دی ہے(1)۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: عُفِیَ کا معنی بُذِلَ ہے، خرچ کیا گیا اور العفو کا لغوی معنی بذل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خذ العفو وہ لو جو آسان ہو۔ ابوالاسود الدؤلی نے کہا:

خذی العفو منی تستدیمی مودتی

تو مجھ سے جو آسان ہے وہ لے تو میری محبت کو ہمیشہ پائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کا پہلا وقت اللہ کی رضا ہے اور اس کا آخری وقت اللہ کی معافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر گواہی دی۔ گویا فرمایا: دیت میں سے جو خرچ کیا گیا ہو وہ اسے قبول کرے اور معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور ایک قوم نے کہا: قاتل اسے اچھے طریقہ سے ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مال لینے کو کہا جب قاتل کی جہت سے یہ آسان ہو اور بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں قصاص کے ذکر کے بعد فرمایا **فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ** (المائدہ:45) پس عفو اور صدقہ کی رحمت کی طرف بلایا۔ اسی طرح اس آیت میں دیت کے قبول کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی جبکہ مجرم دیت ادا کرے۔ پھر ولی کو عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرنے اور قاتل کو اچھے طریقہ سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

ایک قوم نے کہا: یہ الفاظ ان کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جن کے درمیان برابری ہے ان کے درمیان دیتوں کو ساقط کر دیا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان دیات میں سے کسی اعتبار سے دونوں طائفوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو۔ اس صورت میں عُفِیَ بمعنی فُضِلَ (فضیلت دیا گیا) ہوگا۔

سفیان بن حسین بن شوعہ نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: عربوں کے دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ ایک قبیلہ سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور دوسرے قبیلہ سے بھی کچھ لوگ قتل ہوئے۔ ایک قبیلہ والوں نے کہا: ہم راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا۔ پس وہ اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب مقتول برابر ہیں۔ پس انہوں نے دیات پر صلح کی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر زیادتی دی گئی۔ کتب سے **فَمَنۡ عُفِيَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ** تک یہی مراد ہے یعنی جس کی اپنے بھائی پر دیت زائد ہو تو وہ اسے معروف طریقہ سے ادا کرے۔ شعبی نے آیت کے نزول کے سبب کے بارے میں بتایا اور سفیان نے یہاں عفو کا معنی زیادہ ذکر کیا ہے اور لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہے۔

پانچویں تاویل- یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ مرد اور عورت کی دیت اور آزاد اور غلام کی دیت میں فرق ہے یعنی جس کے لئے دیت زیادہ ہو وہ معروف طریقہ سے طلب کرے۔ اس قول میں بھی عُفِیَ بمعنی فضل ہے۔(2)

مسئلہ نمبر16: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیت کا مطالبہ کرنے والے کو حسن تقاضا پر ابھارا ہے اور ادا کرنے والے کو بھی عمدہ طریقہ سے ادا کرنے پر ابھارا ہے(3)۔ کیا یہ وجوب پر ہے یا استحباب پر؟ رفع کی قراءت وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ معنی ہے فعلیہ اتباع المعروف یعنی اس پر واجب ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرے۔ نحاس نے کہا **فَمَنۡ**

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

عُفِیَ لَهٗ شرط ہے اور فَاتِّبَاعٌ جزا ہے اس کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر اس طرح ہے فعلیه اتباع بالمعروف اور غیر قرآن میں فاتباعاً و اداءً بھی جائز ہے یعنی دونوں کو مصدر بنایا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): ابراہیم بن ابی عبلہ نے فاتباعاً نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع، واجبات کے لئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فامساك بمعروف۔ رہا مندوب تو وہ منصوب آتا ہے جیسے فضربَ الرقاب۔

مسئلہ نمبر 17: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ اہل تورات کے لئے صرف قتل کرنا تھا ان کے لئے اور کوئی صورت نہ تھی اور اہل انجیل کے لئے عفو تھا ان کے لئے قصاص اور دیت نہ تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف فرمائی پس جو چاہے قتل کرے اور جو چاہے دیت لے لے اور جو چاہے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ یہ شرط اور جواب ہے یعنی دیت لینے کے بعد اور خون معاف کرنے کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حسن نے کہا: زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا تو وہ اپنی قوم کی طرف بھاگ جاتا پھر اس کی قوم دیت کے ساتھ صلح کرتی اور مقتول کا ولی کہتا میں دیت قبول کرتا ہوں حتیٰ کہ قاتل امن میں ہو جاتا اور وہ باہر نکلتا تو اسے قتل کر دیتا اور پھر دیت انہیں واپس کر دی جاتی۔

علماء کا اختلاف ہے کہ جس نے دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کیا۔ ایک جماعت نے کہا جن میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں: وہ ابتداءً قتل کرنے والے کی طرح ہے۔ اگر اس کا ولی چاہے تو اسے قتل کر دے اگر چاہے تو معاف کر دے اور آخرت میں اس کے لئے عذاب ہوگا۔ حضرات قتادہ، عکرمہ اور سدی نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ اسے یقیناً قتل کیا جائے گا۔ حاکم ولی کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے جس سے دیت لینے کے بعد قتل کیا اس کا مال زیادہ نہ ہو۔ حسن نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ صرف دیت لوٹائی جائے گی اور قتل کا گناہ آخرت کے عذاب تک اس پر رہے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس کا معاملہ امام کے سپرد ہے جو دیکھے وہ کرے۔ سنن دارقطنی میں ابوشریح خزاعی سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس کو خون کی مصیبت پہنچائی گئی یا لنگڑا کر دیا گیا تو اسے تین باتوں میں اختیار ہے اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھوں کو پکڑ لو۔ وہ قصاص لے۔ یا معاف کر دے یا دیت لے۔ اگر ان چیزوں میں سے جو قبول کر لی پھر اس کے بعد اس نے تجاوز کیا تو اس کے لئے دوزخ کا عذاب ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو! تا کہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ یہ بلیغ مگر مختصر کلام ہے۔ اس کا معنی ہے: بعض بعض کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

قتل نہ کریں۔ یہ سفیان نے سدی سے انہوں نے ابو مالک سے روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قصاص جب قائم کیا جائے گا اور حکم قاتل میں ثابت ہو جائے گا تو وہ دوسرے کے قتل کے ارادہ سے باز رہے گا اس خوف سے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ پس اس سے وہ دونوں زندہ رہیں گے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تھا تو دونوں کے قبیلے گرم ہو جاتے اور آپس میں جنگ کرتے اور یہ چیز بہت زیادہ لوگوں کے قتل کا باعث بنتی جب اللہ تعالیٰ نے قصاص مشروع فرمایا تو تمام اس پر قناعت کرنے والے ہو گئے اور جنگ ترک کر دی، پس ان کے لئے اس میں زندگی ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 2: ائمہ فتویٰ کا اتفاق ہے کہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سلطان کے بغیر خود اپنے حق میں قصاص لے۔ لوگوں کے لئے ایک دوسرے سے قصاص لینا جائز نہیں۔ یہ کام سلطان کے سپرد ہے یا اس کے سپرد ہے جس کو سلطان مقرر کرے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سلطان بنایا تا کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں کو روکے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اجماع ہے کہ سلطان سے بھی قصاص لیا جائے گا اگر وہ اپنی رعیت میں سے کسی پر تعدی کرے گا۔ کیونکہ سلطان بھی ان میں سے ایک ہے، اسے لوگوں کی دیکھ بھال کی فضیلت ہے جیسے وصی اور وکیل ہوتا ہے۔ یہ چیز قصاص سے مانع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں حاکم اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى** (البقرہ:178) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے اس شخص سے کہا جس نے شکایت کی تھی کہ عامل نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے، میں تیرا اس سے قصاص لوں گا اگر تو سچا ہوگا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص آپ کے اوپر جھکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی اس چھڑی سے چوک دی جو آپ کے پاس تھی، وہ شخص چیخا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ادھر آ اور اپنا بدلہ لے لے۔ اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا۔ ابو داؤد طیالسی نے ابو فراس سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے خطبہ دیا اور کہا: خبردار! امیر جس پر ظلم کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے تو میں اس کا اس امیر سے قصاص لوں گا۔ حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور کہا: اے امیر المومنین! اگر ہم میں سے کوئی اپنی رعیت میں سے کسی کو تادیب کرے تو آپ اس سے قصاص لیں گے؟ حضرت عمر نے کہا: میں اس سے قصاص کیسے نہیں لوں گا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ اپنے نفس سے لوگوں کو قصاص لیتے دیتے۔ ابو داؤد سجستانی کے لفظ یہ ہیں، فرمایا: ہمیں حضرت عمر بن خطاب نے خطاب فرمایا اور فرمایا: میں نے اپنے عمال اس لئے نہیں بھیجے کہ وہ تمہارے چمڑوں پر ضربیں لگائیں اور نہ اس لئے بھیجے کہ وہ تم سے تمہارے اموال لیں۔ جو کسی کے ساتھ ایسا کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے میں اس سے قصاص لوں گا اس کے ہم معنی حدیث ذکر کی۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں مراد ہے تم قتل سے بچ جاؤ اور قصاص سے سلامت رہو پھر یہ تقویٰ کی دوسری اقسام کی طرف داعی ہوگا۔ اللہ اطاعت پر اطاعت کے ساتھ ثواب دیتا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ الربعی نے ولکم فی القصص حیاۃٌ پڑھا ہے (1)۔ نحاس نے کہا: ابوالجوزاء کی قراءت شاذہ ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قصاص کی طرح مصدر ہو (2)۔ بعض نے فرمایا: القصص سے مراد قرآن ہے یعنی تمہارے لئے کتاب اللہ میں حیات ہے جس میں قصص کو بیان کیا گیا ہے۔ حیاۃ سے مراد نجات ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

''فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آجائے تم میں سے کسی کو موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کُتِبَ عَلَيْكُمْ آیت وصیت ہے۔ قرآن میں اور وصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت میں اور سورہ النساء میں من بعد وصیۃ اور سورہ مائدہ میں حین الوصیۃ اور جو سورہ بقرہ میں ہے وہ اتم اور اکمل ہے یہ فرائض اور مواریث کے نزول سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ کلام میں واو عطف کی تقدیر ہے۔ یعنی و کتب علیکم۔ جب کلام طویل ہوگئی تو واو ساقط کر دی گئی اور اس کی مثل بعض اقوال میں ہے: لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝ (اللیل)۔ یعنی والذی۔ یہاں بھی واو کو حذف کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب ذکر کیا کہ مقتول کے ولی کے لئے قصاص لینا ہے پس جس سے قصاص لیا جانا ہے وہ قصاص اس کی موت کا سبب ہے گویا موت اس پر حاضر ہے اور یہ وصیت کا وقت ہے اس آیت کا تعلق ماقبل آیت سے ہے اسی وجہ سے واو عطف ساقط ہوگئی ہے۔ کُتِبَ کا معنی فرض اور اُثبت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضور الموت سے مراد موت کے اسباب کا آنا ہے اور جب سبب موجود ہو تو عرب اسے مسبب سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

یایها الراکب المزجی مطیته ۔۔۔ سائل بنی اسد ما هذه الصوت
و قل لهم بادروا بالعذر والتمسوا ۔۔۔ قولا یبرئکم انی انا الموت

اے سوار! جو اپنی سواری کو آہستہ آہستہ چلانے والا ہے بنی اسد سے پوچھ یہ آواز کیسی ہے۔ اور انہیں کہو کہ عذر پیش کرنے میں جلدی کرو اور کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمہیں بری کر دے کہ میں (تمہارے لئے) موت بنوں۔

عنترہ نے کہا:

وان الموت طوع یدی اذا ما ۔۔۔ وصلت بنانها بالهندوان

موت میرے ہاتھوں کی خوشی ہے جب ان کے پورے ہندوان تک پہنچ جائیں۔

جریر نے فرزدق کی ہجو میں کہا:

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

انا الموت الذی حدثت عنہ فلیس لھارب منی نجاء

وہ موت جس کے متعلق میں نے بتایا، مجھ سے بھاگنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ کُتِبَ فرمایا، اور۔ کتبت نہیں فرمایا، حالانکہ وصیت مؤنث ہے۔ کہا جائے گا کہ یہاں وصیت سے مراد الایصاء ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے اور فاصل تاء تانیث کے عوض کی طرح ہے۔ عرب کہتے ہیں: حضر القاضی الیوم امراۃ یہاں بھی فاصلہ کی وجہ سے فعل مذکر اور فاعل مؤنث ہے۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: قام امراۃ۔ لیکن اس ''کتب'' فعل کے مذکر لانے کا حسن، حائل کے طول کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا، اِنۡ شرط ہے اس کے جواب میں ابو الحسن اور اخفش کے دو قول ہیں: اخفش نے کہا: تقدیر فالوصیۃ ہے پھر فاء کو حذف کیا گیا۔ جیسے شاعر نے کہا:

من یفعل الحسنات اللہ یشکرھا والشر بالشر عنداللہ مثلان

جو نیکیاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے اور اللہ کے نزدیک شر کے بدلے شر برابر ہے۔

دوسرا جواب: ماضی کا جواب اس سے پہلے اور اس کے بعد ہونا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: الوصیۃ للوالدین والاقربین ان ترك خیراً۔ اگر تو فاء کو مقدر مانے گا تو الوصیۃ کو رفع ابتدا کی وجہ سے ہوگا۔ اگر فاء کو مقدر نہیں مانے گا تو اس کو ابتداء کی وجہ سے رفع دینا جائز ہے اور نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ یعنی کتب علیکم الوصیۃُ۔ جمہور نحویوں کے نزدیک الوصیۃ کا اذا میں عمل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ مصدر کے صلہ کے حکم میں ہے جو الوصیۃ ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس کا اپنے سے پہلے میں عمل کرنا جائز نہیں اور یہ جائز ہے کہ اذا میں عامل کتب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایجاب کا تمہاری طرف متوجہ ہونا اور کتاب کے مقتضی کا متوجہ ہونا ہے جب موت حاضر ہو۔ ایجاب کی توجہ کو کتب سے تعبیر فرمایا تاکہ اس معنی کی طرف منظم ہو جائے کہ یہ حکم ازل میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اذا میں عامل الایصاء مقدر ہو جو وصیت پر دلالت کر رہا ہو۔ معنی ہوگا: کتب علیکم الایصاء اذا۔ (1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَيۡرَا اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے اور اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مال کثیر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ انہوں نے سات سو دینار میں بھی فرمایا کہ یہ قلیل ہے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے الخیر سے مراد ہزار دینار اور اس سے زائد مال ہے۔ شعبی نے کہا: پانچ سو دینار سے ہزار تک ہے (2)۔ الوصیۃ ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زندگی میں اور موت کے بعد اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ عرف نے اس کو اس کے ساتھ خاص کر دیا ہے جس کے کرنے کا عہد کیا جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو نافذ کیا جاتا ہے۔ وصیۃ کی جمع وصایا ہے جیسے قضیۃ کی جمع قضایا ہے۔ الوصی وصیت کرنے والا ہوتا ہے اور جس کو وصیت کی جاتی ہے اس کی اصل وَصَیٰ سے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تواصی النبت تواصیًا، جب کھیتی متصل ہو۔ ارضٌ واصیۃٌ، جس کی کھیتی متصل ہو۔ اوصیت لہ بشیء و اوصیت الیہ، جب تو کسی کو اپنا وصی مقرر کرے۔ اس کا اسم الوِصایۃ اور الوَصایۃ ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ اوصیتہٗ و وصیتہ توصیۃً ہم معنی ہیں، اسم، الوصاۃ ہے۔ تواصی القوم او طٰی بعضھم بعضًا۔ بعض نے بعض کو وصیت کی۔ حدیث پاک میں ہے: استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عند کم (1)۔ عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ و وصیت الشیٔ بکذا جب تو کسی چیز کو دوسری چیز سے ملا دے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا وصیت کے وجوب میں اختلاف ہے جو مال چھوڑ جائے اور اس پر اجماع ہے کہ جس پر ودیعتیں ہوں اور جس پر قرض ہو اس کا وصیت کرنا واجب ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں: وصیت اس پر واجب نہیں ہے جس پر ودیعت اور قرض وغیرہ نہ ہوں، یہ امام مالک، امام شافعی اور ثوری کا قول ہے خواہ وصیت کرنے والا امیر ہو یا فقیر ہو۔ ایک طائفہ نے کہا: ظاہر قرآن کے مطابق وصیت واجب ہے، یہ زہری اور ابومجلز کا قول ہے (2) مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ابوثور نے کہا: وصیت واجب نہیں ہے مگر اس پر جس پر قرض ہو یا اس کے پاس کسی قوم کا مال ہو۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی وصیت کو لکھے اور جو کچھ اس پر کسی کا حق ہے اس کے متعلق بتائے۔ رہا وہ جس پر نہ قرض ہے اور نہ ودیعت ہے، اس پر وصیت کرنا واجب نہیں مگر وہ چاہے تو۔ ابن منذر نے کہا: یہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانات کی ادائیگی فرض کی ہے اور جس پر کوئی حق نہیں ہے اور کوئی امانت نہیں ہے اس پر وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کے حاملین نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ائمہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو وہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔ ایک روایت میں ہے، وہ تین راتیں گزارے۔ اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے مجھ پر ایک رات بھی نہیں گزری مگر میرے پاس میری وصیت (لکھی ہوئی) ہے اور جن علماء نے وصیت کو واجب نہیں کہا انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اگر وصیت واجب ہوتی تو اس کو وصیت کرنے والے کے ارادہ پر نہ چھوڑا جاتا، اس پر ہر حال میں وصیت کرنا لازم ہوتا۔ پھر اگر تسلیم کیا جائے کہ اس کا ظاہر وجوب ہے تو وجوب کا قول اسے رد کرتا ہے۔ یہ اس کے متعلق ہے جس پر لوگوں کے حقوق ہوں ان کے ضیاع کا خوف ہوگا جیسا کہ ابوثور نے کہا۔ اسی طرح جس کے لئے لوگوں کے پاس حقوق ہوں گے ورثۃ پر اس کے تلف ہونے کا خوف ہوگا، اس صورت میں اس پر وصیت کرنا واجب ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُتِبَ عَلَيْكُمْ، کُتِبَ بمعنی فرض ہے تو یہ وصیت کے وجوب کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق جواب پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا معنی ہے: جب تم وصیت کا ارادہ کرو۔ نخعی نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور وصیت نہیں کی اور حضرت ابوبکر نے وصیت کی۔ اگر وصیت کرے تو یہ اچھا ہے اگر وصیت نہ کرے تو اس پر کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس مال سے وصیت کرنی ہے اس کی مقدار بیان نہیں کی۔ فرمایا: اِنْ

1۔ سنن ابن ماجہ باب حق المراۃ علی الزوج، حدیث نمبر 1840، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تَرَكَ خَيْرًا، الخیر سے مراد مال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (البقرہ: 272) وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ (العادیات: 8) ان آیات میں خیر سے مراد مال ہے۔ اس کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پانچویں حصہ کی وصیت کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانوں کے مال غنیمت سے خمس (پانچویں حصہ) ہے۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے چوتھائی کی وصیت کی، یہ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک خمس کی وصیت کرنا چوتھائی وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے اور چوتھائی وصیت کرنا ثلث وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جس کا مال تھوڑا ہو اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے وصیت نہ کرنا بہتر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن ابی ملیکہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تمہارا کتنا مال ہے؟ اس نے کہا: تین ہزار۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا: چار۔ حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اور یہ تمہارا مال تھوڑا ہے۔ یہ اپنے عیال کے لئے چھوڑ دے کیونکہ تیرے لئے یہی افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور علماء کا خیال ہے کہ کسی کے لئے ثلث سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں مگر امام ابوحنیفہ اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ موصی اگر ورثاء نہ چھوڑے تو اس کے لئے پورے مال کی وصیت کرنا جائز ہے۔ احناف فرماتے ہیں: وصیت میں ثلث پر اکتفا اس لئے ہے کہ ورثاء کو اغنیاء چھوڑے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا ان کو فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور جس کا وارث نہ ہو وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ابوعبیدہ اور مسروق کا بھی یہی قول ہے۔ اسحاق اور امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ اختلاف کا سبب ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ بیت المال میں اختلاف ہے کہ کیا وہ وارث ہے یا حافظ ہے اس مال کا جو اس میں رکھا جائے۔ اس میں دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا اجماع ہے کہ جو فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے تمام مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فرمایا: جب ان کی موت کا وقت قریب آیا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: آپ وصیت فرمائیں، آپ کا مال میرے مال میں ہے۔ حضرت عمرو نے کاتب کو بلایا اور اسے وصیت لکھوائی۔ حضرت عبداللہ نے کہا میں نے انہیں کہا میں نہیں دیکھتا ہوں مگر یہ کہ آپ نے میرے اور اپنے مال کی وصیت کر دی ہے اگر میں اپنے بھائیوں کو بلاؤں تو ان سے یہ حلال کروالوں۔

1۔ صحیح بخاری، الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر 2538، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہم امض لاصحابی ھجرتھم ومرثیتہ لمن مات مکۃ، حدیث 3643، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اجماع ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اس میں سے جتنا چاہے رجوع کرے مگر مدبر غلام کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ وصیت کرنے والا حالت صحت میں یا حالت مرض میں ایسی وصیت کرے جس میں غلاموں میں سے کسی غلام کو آزاد کرنا ہو یا اس کے علاوہ کوئی امر ہو تو جو چاہے اس میں تبدیلی کرے اور جو چاہے اس میں عمل کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہو جائے۔ اگر وہ اس وصیت کو ختم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے مگر یہ کہ اس کے غلام کو مدبر بنایا جائے اگر غلام کو مدبر بنائے تو اس میں اس کو تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں گزارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔ ابو الفرج مالکی نے کہا: قیاس میں مدبر بھی ایک مہینہ تک آزاد کئے جانے والے غلام کی طرح ہے موت لامحالہ آنے والی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ وہ مدت تک آزاد کرنے اور عتق کی قسم جو ایک مدت تک اس۔ نے اٹھائی ہے اس میں رجوع نہیں کر سکتا اسی طرح مدبر بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے امام شافعی، احمد اور اسحاق نے کہا: یہ وصیت ہے اور یہ بھی ثلث میں ہوگا جس طرح دوسرے وصایا کا حکم ہے اور مدبرہ (لونڈی) سے ان کا وطی کی اجازت دینا ان کے مدبر کو ایک مدت تک عتق پر قیاس کرنے کو توڑتا ہے...... حالانکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدبر غلام کو فروخت کیا(1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی لونڈی کو مدبرہ بنایا پھر اسے فروخت کیا یہ تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: انسان اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے مگر آزادی میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شعبی، ابن سیرین، ابن شُبرمہ اور نخعی نے کہا ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جو اپنے غلام کو کہتا ہے: تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور وصیت کا ارادہ کیا تو امام مالک کے نزدیک اس کو رجوع کا حق ہے اور اگر کہا: فلاں میری موت کے بعد مدبر ہے تو اس میں اس کے رجوع کا حق نہیں ہے اور اگر پہلے قول سے تدبیر کا ارادہ کیا ہوگا تو اسے اکثر اصحاب مالک کے نزدیک رجوع کا حق نہ ہوگا۔ امام شافعی، احمد، اسحاق کے نزدیک یہ وصیت ہے کیونکہ یہ ثلث میں ہے اور جو ثلث میں ہو وہ وصیت ہے مگر امام شافعی نے کہا: مدبر میں رجوع نہیں مگر یہ کہ اسے فروخت کرے یا ہبہ کے ساتھ اپنی ملکیت سے نکال دے۔ اور صرف یہ کہنا (میں نے رجوع کیا) رجوع نہیں ہے اور اگر مدبر کو اپنی ملکیت سے نہ نکالا حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا تو اس کے مرنے کے ساتھ غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام شافعی کا پہلا قول یہ ہے کہ وہ مدبر میں اسی طرح رجوع کر سکتا ہے جس طرح وصیت میں رجوع کر سکتا ہے۔ مزنی نے اس کو اختیار فرمایا۔ انہوں نے علماء کی اس بات کے اجماع پر قیاس کیا ہے کہ جو عتق کی وصیت کرے وہ رجوع کر سکتا ہے۔ ابو ثور نے کہا: اگر اس نے کہا: میں نے اپنے مدبر میں رجوع کیا تو اس کی تدبیر باطل ہو گئی اگر وہ مر گیا تو غلام آزاد نہ ہوگا۔ ابن القاسم اور اشہب نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے کہا: میرا غلام میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور اس نے اس قول سے وصیت اور

1۔ صحیح بخاری، بیع المدبر، حدیث نمبر 2078، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تدبیر کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن القاسم نے کہا: یہ وصیت ہے، اشہب نے کہا: وہ مدبر ہے اگرچہ اس نے وصیت کا ارادہ نہ کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 11: علماء کا اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ منسوخ ہے یا محکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ محکم ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی ان والدین کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہیں ہوتے جیسے والدین کافر ہوں اور غلام ہوں اور ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہ ہوں (1)۔ یہ ضحاک، طاؤس اور حسن کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وصیت زیادہ اور کم ہر مال میں واجب ہے۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اجماع ہے کہ ان والدین کے لئے وصیت ہے جو وارث نہیں ہوتے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے جو وارث نہیں ہوتے۔

حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت عامۃ ہے اس کا حکم ایک تھوڑے سے عرصہ کے لئے ثابت رہا پھر جو رشتہ دار آیت فرائض کے ذریعے وارث ہوا ان میں سے ہر ایک منسوخ ہو گیا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت الفرائض نے اس کو مستقل منسوخ نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ضمیمہ کے ساتھ منسوخ ہوئی اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا فرمایا، وارث کے لئے وصیت نہیں (3)“۔

اس حدیث کو حضرت ابو امامہ نے روایت کیا ہے اور اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ آیت کا نسخ سنت ثابتہ سے ہے نہ کہ ارث سے۔ علماء کے اقوال میں سے صحیح قول کے مطابق اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو ان دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہوتا کہ میت سے وصیت کے ذریعے مال حاصل کریں اور اگر وصیت نہ کی ہو تو میراث کے ذریعے حاصل کریں یا جو وصیت کے بعد باقی بچے لیکن اس سے مانع یہ حدیث اور اجماع ہے۔ امام شافعی اور ابو الفرج اگرچہ کتاب کا سنت کے ساتھ نسخ تسلیم نہیں کرتے، لیکن صحیح اس کا جواز ہے اس دلیل کی وجہ سے کہ ہر ایک اللہ کا حکم ہے اور اسی کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں اختلاف ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگرچہ یہ خبر ہمیں احاداً پہنچی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا اجماع مل گیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ قریبی وارثوں کے لئے وصیت کا وجوب سنت کے ساتھ منسوخ ہے اور علماء کے اجماع سے اس کو تائید حاصل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: والدین کے لئے وصیت اس فرض کے ساتھ منسوخ ہے جو سورۃ النساء میں ہے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت ثابت ہے جو وارث نہیں ہوتے۔ یہ امام شافعی اور اکثر مالکیوں اور اہل علم کا مذہب ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مال بچے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تھی۔ پس اس نے جو پسند کیا اسے منسوخ کر دیا۔ پھر دو عورتوں کے حصہ کی مثل ایک مذکر کے لئے حصہ مقرر کیا اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ مقرر کیا اور عورت کے لئے آٹھواں اور چوتھا حصہ مقرر کیا، خاوند کے لئے نصف اور چوتھا حصہ مقرر کیا۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید نے کہا: یہ ساری آیت منسوخ ہے اور وصیت ندباً باقی ہے۔ امام

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا، باب ماجاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک کا قول اسی طرح ہے۔ نحاس نے یہ شعبی اور نخعی سے ذکر کیا ہے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: وصیت نہیں ہے، عروہ بن ثابت نے کہا: میں نے ربیع بن خثیم سے کہا مجھے اپنے مصحف کی وصیت کیجئے۔ ربیع نے اپنی اولاد کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (انفال:75) حضرت ابن عمر نے اسی طرح کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَقْرَبِيْنَ یہ اقرب کی جمع ہے ایک قوم نے کہا: اقربین کے لئے وصیت کرنا، اجنبیوں کے لئے وصیت کرنے سے اولیٰ ہے کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نص قائم فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ ضحاک نے کہا: اگر کسی نے اپنے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو معصیت کی وجہ سے اس کا عمل ختم ہو گیا۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد لونڈیوں کے لئے وصیت کی، ہر ایک کے لئے چار ہزار کی وصیت کی۔ روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنی لونڈی کے لئے گھر کے سامان کی وصیت کی۔ حضرت سالم بن عبداللہ سے اس کی مثل مروی ہے (1)۔ حسن نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو وصیت اقربین کے لئے پھیری جائے گی۔ اگر اجنبی کے لئے وصیت ہوگی تو وہ ان کے ساتھ ہوگا۔ قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ کر غیروں کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ جب ابوالعالیہ فوت ہوئے تو لوگوں نے کہا: اس کے لئے تعجب ہے اس کو ریاح قبیلہ کی ایک عورت نے آزاد کیا تھا اور اس نے اپنے مال کی بنی ہاشم کے لئے وصیت کی۔ شعبی نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں تھا نہ کرامت تھی۔ طاؤس نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی ہوگی تو اسے قرابتداروں کی طرف پھیرا جائے گا اور اس کا فعل توڑ دیا جائے گا۔ یہ حضرت جابر بن زید کا قول ہے (2) اس کی مثل حسن سے مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: جس نے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی اور اپنے قرابتداروں کو ترک کر دیا تو اس نے برا کیا اور اس کا فعل جائز ہوگا اور جس کے لئے اس نے وصیت کی ہوگی غنی، فقیر، قریب، بعید، مسلمان، کافر سب کے لئے نافذ ہوگی۔ یہی معنی حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول احسن ہے۔ رہا ابوالعالیہ کا فعل، شاید اس نے دیکھا کہ بنی ہاشم اس کے آزاد کرنے والوں سے زیادہ مستحق ہیں، حضرت ابن عباس کی صحبت کی وجہ سے اور حضرت ابن عباس کے تعلیم دینے کی وجہ سے اور اسے دنیا و آخرت میں علماء کے درجہ پر فائز کرنے کی وجہ سے۔ یہ ابوۃ اگرچہ معنوی ہے حقیقت میں یہی حقیقی ہے۔ اور اس کی آزاد کرنے والی نے دنیا میں اسے احرار کے ساتھ لاحق کیا تھا۔ پس اس نے اپنے عتق سے ثواب کی نیت کی تھی اس کے لئے اس کا ثواب کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 13: جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مریض پر اس کے مال میں حجر کیا جائے گا اور اہل ظاہر نے اس پر سختی کی اور کہا: اس پر حجر نہیں کیا جائے گا اور یہ صحیح کی طرح ہے۔ حدیث اور معنی جمہور کا رد کرتا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا: حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس تکلیف میں بیمار پرسی کی جس میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ تکلیف پہنچ چکی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

میں اپنے مال کا دوثلث صدقہ کردوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کی: نصف صدقہ کردوں؟ فرمایا: نہیں۔ تیسرا حصہ صدقہ کرو اور تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اگر تم اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ تو یہ ان کے غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اہل ظاہر نے ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ ورثاء جائز بھی قرار دیں اور باقی تمام علماء نے اس کو جائز قرار دیا جب ورثاء جائز قرار دیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ مریض تو ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے، وارث کے حق کی وجہ سے منع کیا گیا ہے جب ورثاء نے اپنا حق خود ساقط کر دیا تو یہ جائز اور صحیح اور یہ ان کی طرف سے ہبہ کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ورثاء چاہیں۔ حضرت عمرو بن خارجہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت نہیں مگر یہ کہ ورثاء اجازت دیں۔

مسئلہ نمبر 14: موصی کی زندگی میں وارث کے لئے وصیت کو جائز کرنے والے کے اس کے مرنے کے بعد رجوع میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ ان پر جائز ہے، اس میں ان کے لئے رجوع جائز نہیں۔ یہ عطاء بن ابی رباح، طاؤس، حسن، ابن سیرین، ابن ابی لیلیٰ، زہری، ربیعہ اور اوزاعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اگر وہ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود، شریح، حکم، طاؤس، ثوری، حسن بن صالح، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور کا قول ہے، ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب وہ حالت صحت میں اجازت دیں تو ان کے لئے رجوع کرنا جائز ہے اگر وہ اس کی حالت مرض میں اجازت دیں جب اسے مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے تو یہ ان کے لئے جائز ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے پہلے مقالہ والوں نے حجت پیش کی ہے کہ منع ورثاء کی وجہ سے تھا، جب وہ جائز قرار دیں تو جائز ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ جو وہ ثلث سے زیادہ اجنبی کے لئے وصیت کرے تو ورثاء کی اجازت سے جائز ہے اسی طرح یہاں ہے۔ اور دوسرے قول والوں نے یہ حجت پیش کی ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی جبکہ اس وقت وہ مالک نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد وہ مالک ہوں گے۔ کبھی وارث جو پہلے اجازت دینے والا تھا وہ فوت ہو جاتا ہے اور وہ وارث نہیں ہوتا ہے کبھی کوئی اور وارث ہو جاتا ہے کبھی وہ اجازت دیتا ہے جس کا اس مال میں کوئی حق نہیں ہوتا تو اس سے کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ امام مالک نے اس قول سے حجت پیش کی ہے کہ ایک شخص جب صحیح ہوتا ہے تو وہ اپنے مال کا زیادہ حقدار ہوتا ہے جو چاہے اس میں تصرف کرے۔ جب انہوں نے اس کو اس کی حالت صحت میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو چھوڑا جو ان کے لئے واجب نہ تھی۔ اور جب انہوں نے اس کی حالت مرض میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو ترک کیا جو ان کے لئے ثابت تھی۔ پس ان کے لئے اس میں رجوع نہیں جب وہ کر چکا ہے کیونکہ وہ فوت ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اگر مریض اس کو نافذ نہ کرے تو وارث کے لئے اس میں رجوع ہے کیونکہ تنفیذ کے ساتھ فوت نہ ہوا۔ یہ ابہری کا قول ہے۔ ابن منذر نے اسحاق بن راہویہ سے روایت کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک کا قول سنت کے زیادہ مشابہ ہے۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور ابوثور کا قول متفق ہے کہ جب اس کی وفات کے

بعد جائز قرار دیں تو انہیں لازم ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 16: علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو بعض کے لئے مال کی وصیت کرے اور اپنی وصیت میں کہے: اگر ورثاء نے اجازت دی تو یہ اس کے لئے ہوگا اگر وہ اجازت نہیں دیں گے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے گا۔ پس ورثاء نے اجازت نہ دی۔ امام مالک نے فرمایا: اگر ورثاء اس کی اجازت نہ دیں تو ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور معمر (صاحب عبدالرزاق) کے قول میں اللہ کے راستہ میں خرچ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 17: بالغ، عاقل غیر مجور علیہ کی وصیت میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسروں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ جس کی عقل میں ضعف ہو، سفیہ اور وہ شخص جو کبھی دماغی تکلیف میں افاقہ پاتا ہو ان کے وصایا جائز ہیں جب کہ وہ اتنی عقل رکھتے ہوں کہ جو وہ وصیت کر رہے ہوں انہیں جانتے ہوں۔ اسی طرح چھوٹا بچہ جب اس چیز کو سمجھتا ہو جس کی وصیت کر رہا ہے اور کوئی غلط نہ کرے تو اس کی وصیت جائز اور نافذ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: بچے کی وصیت جائز نہیں۔ مزنی نے کہا: یہ امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ میں نے امام شافعی کی اس کے متعلق کوئی چیز نہیں پائی جو انہوں نے ذکر کی ہو اور اس پر نص قائم ہو۔ شوافع کے اصحاب کے دو قول ہیں: ایک امام مالک کے قول کی طرح ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ اس کی طلاق اور غلام آزاد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ جنایت میں اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور نہ قذف میں اسے حد لگائی جاتی ہے۔ وہ بالغ مجور علیہ کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اس کی وصیت جائز ہے اور یہ معلوم شدہ ہے کہ بچوں میں سے جو اپنی وصیت کو سمجھتا ہے اس کا حال اس کے مال میں مجور علیہ کے حال کی طرح ہے اور حجر کی علت مال میں اسراف اور اسے تلف (ضائع) کرنا ہے۔ یہ علت اس سے موت کے ساتھ اٹھ گئی ہے اور مجور علیہ اپنے مال میں اس مجنون کے مشابہ ہے جو عقل نہیں رکھتا۔ پس اس امر کے ساتھ اس کی وصیت واجب ہے جس کے متعلق حضرت عمر سے روایت مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مدینہ طیبہ میں اس پر اجماع ہے۔ محمد بن شریح نے کہا: جس نے وصیت کی بڑا ہو یا چھوٹا ہو اس نے حق کو پالیا اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان پر فیصلہ فرمایا اور حق کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِالْمَعْرُوْفِ** یعنی عدل کے ساتھ، نہ اس میں کمی ہو نہ اس میں زیادتی ہو۔ یہ میت کے اجتہاد اور موصی کی نظر پر منحصر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر اس کی تقدیر بیان فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تہائی اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری وفات کے وقت اموال کے ثلث کو صدقہ کیا ہے یہ تمہاری نیکیوں میں زیادتی ہے تاکہ اس کو تمہارے لئے زکوٰۃ بنادے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابوامامہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: وصیت جائز نہیں مگر تہائی میں۔ بخاری کا نظریہ بھی یہی ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حجت پکڑی ہے۔ **وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (المائدہ: 49) (اور تم فیصلہ کرو ان کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے۔ کہ ثلث (تہائی) کثیر ہے یہ وہ حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے

اتارا ہے اور جس نے اس حد سے تجاوز کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی اور تہائی سے زائد وصیت کی تو اس نے وہ کام کیا جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو وہ جاننے والا ہو تو وہ اس فعل میں گنہگار ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الثلث کثیر اس سے آپ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ یہ قلیل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَقًّا اس سے مراد ثبوت ہے لیکن فرض اور وجوب کا ثبوت مراد نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد فرمایا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ یہ دلیل ہے کہ اس کا ہونا بطور استحباب ہے اگر یہ فرض ہوتا تو تمام مسلمانوں پر ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے متقی کو خاص فرمایا یعنی جو کوتاہی اور گناہ کا خوف کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لازم نہیں ہے مگر اس صورت میں جس میں اسے تلف ہونے کی توقع ہو۔ اگر فوت ہو جائے اس صورت میں اس پر بطور قرض لازم ہوگا وہ لکھنے اور وصیت میں جلدی کرے کیونکہ اگر وہ خاموش رہے گا تو وہ ضائع کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوگا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے...... حَقًّا، مصدر مؤکد کی بنا پر منصوب ہے اور غیر قرآن میں حق بھی جائز ہے یعنی ذالك حق۔

مسئلہ نمبر 20: علماء نے فرمایا: وصیت کو جلدی لکھنا یہ آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عمر کی حدیث سے ہے۔ اس کا فائدہ یقین کی زیادتی میں مبالغہ کرنا ہے اور اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی گواہی دی گئی ہے اور اس وصیت پر عمل کرنے میں اتفاق ہے۔ اگر عادل آدمیوں کو گواہ بنالے اور گواہ اس شہادت کو لفظاً قائم کریں تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا اگرچہ لکھی نہ گئی ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ سے لکھے اور گواہ نہ بنائے تو امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا مگر ایسی صورت میں جس میں اس شخص کے لئے حق کا اقرار ہو جس کے بارے میں اس پر تہمت نہ ہو تو اس کا نفاذ لازم ہوگا۔

مسئلہ نمبر 22: دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ اپنے وصایا کے آغاز میں یہ لکھتے تھے: هذا ما اوصى به فلان بن فلان انه يشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وان محمدا عبده و رسوله، وان الساعة آتية لا ريب فيها، وان الله يبعث من فى القبور، واوصى من ترك بعده من اهله بتقوى الله حق تقاته وان يصلحوا ذات بينهم، و يطيعوا الله و رسوله ان كانوا مؤمنين، و اوصاهم بما وصى به ابراهيم بنيه و يعقوب يا بنى ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون۔ ترجمہ:۔ میں فلاں بن فلاں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے (برگزیدہ) بندے اور رسول ہیں اور (وہ گواہی دے کہ) قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ اٹھائے گا انہیں جو قبور میں ہیں اور میں اسے بھی وصیت کرتا ہوں، جو وہ اپنے گھر والوں میں سے چھوڑے، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے اور میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرائیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اگر وہ مومن ہیں اور میں انہیں اس کے ساتھ وصیت کرتا ہوں جو ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ (اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

''پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہی بدلنے والوں پر ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّمَآ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ہے۔ ما کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روکنے والا ہے۔ اثمہ کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے، علی الذین یبدلونہ خبر ہے۔ بدّلہ میں ضمیر کا مرجع بھی ایصاء ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ۔ اس میں مَوۡعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور ارشاد ہے: اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ (النساء: 8) یعنی مال۔ اس کی دلیل منہ کا قول ہے...... اس کی مثل شاعر کا قول ہے: ما ھذہ الصوت، یعنی الصیحۃ۔ امرء القیس نے کہا:

برھرھۃ رؤدۃٍ رخصۃ کخرعوبۃ البانۃ المنفطر

نرم جلد، خوبصورت جوان، ملائم الحلق، نرم ٹہنی، کھلنے والا بان کا درخت۔

سَمِعَهٗ یہ احتمال رکھتا ہے اس نے وصی سے خود سنا ہو اور احتمال ہے کہ اس نے ان سے سنا ہو جن کے پاس وہ ثابت ہے۔ یہ دو عادل آدمی ہیں اثمہ میں ضمیر کا مرجع التبدیل ہے یعنی تبدیلی کا گناہ تبدیل کرنے والے پر ہے، میت پر نہیں ہے۔ کیونکہ موصی وصیت کے ساتھ ملامت سے خارج ہوگیا۔ اور ملامت وارث پر یا ولی پر متوجہ ہوئی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس موصی نے جب تبدیلی کی اور وصیت کو ترک کر دیا یا اس نے اس طرح اس کو جاری نہ کیا جو شرع میں اس کے لئے لکھا گیا تھا اس پر گناہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں دلیل ہے کہ جب میت دین (قرض) کی وصیت کرے تو وہ ذمہ سے بری ہو گیا اور ولی سے مطالبہ کیا جائے گا اس کی ادائیگی میں اس کے لئے اجر ہوگا اور تاخیر میں گناہ بھی اس پر ہوگا۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: یہ اس صورت میں صحیح ہے جب میت نے قرضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی ہو مگر جب وہ ادائیگی پر قادر تھا اور پھر ادائیگی کو ترک کیا پھر اس کی وصیت کی تو ولی کی کوتاہی اس کے ذمہ سے اس کو زائل نہیں کرے گی۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف نہیں کہ جب کسی ایسی چیز کی وصیت کرے جو جائز نہ ہو مثلاً شراب یا خنزیر یا کسی گناہ کی وصیت کرے تو اس کو تبدیل کرنا جائز ہے، اس کا پورا کرنا جائز نہیں جس طرح تہائی سے زائد کا پورا کرنا جائز نہیں۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان کے ہوتے ہوئے وصیت کرنے والے کا ظلم کرنا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا تبدیلی کرنا مخفی نہیں ہے۔

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸۲﴾

''اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا پس وہ صلح کرا دے ان کے درمیان تو کچھ گناہ نہیں اس پر بے شک اللہ تعالیٰ غفور (اور) رحیم ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ، مَنْ شرطیہ ہے اور خاف کا معنی ہے: ڈرنا۔ بعض نے فرمایا: خَافَ کا معنی جاننا ہے خاف اصل میں خَوِفَ تھا، واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے الف سے بدل گئی۔ اہل کوفہ خاف میں اِمالہ کرتے ہیں تا کہ کسرہ پر دلالت کرے۔ یہ فَعِلَ سے ہے۔ مِنْ مُّوْصٍ عاصم، حمزہ اور کسائی سے ابو بکر نے تشدید کے ساتھ قرأت روایت کی ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تخفیف زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اکثر نحوی کہتے ہیں: موص، تکثیر کے لئے ہے اور کرّم د اکرم کی مثل ہونا بھی جائز ہے۔ جنفاً۔ یہ جنف یجنف سے ہے جس کا معنی ظلم کرنا، اس سے اسم جنف و جانفٌ ہے۔ نحاس سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

تجانف عن حجر الیمامة ناقتی　　　وما قصدت من اهلها لسوائکا (1)

میری اونٹنی یمامہ کے پتھر سے مائل ہو گئی، اس نے تیرے سوا اپنے اہل کا قصد نہ کیا۔

الصحاح میں ہے الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ جنف یجنف کا معنی ہے: مائل ہونا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا۔

شاعر نے کہا: (2)

هم المولی وان جنفوا علینا　　　وانا من لقائهم لزور

وہ سردار ہیں اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں ہم ان کی ملاقات سے قوت حاصل کرنے والے ہیں۔

ابو عبید نے کہا: یہاں المولی، موالی کی جگہ ہے۔ اس سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (الحج: 5) پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے بچہ بنا کر)

لبید نے کہا:

انی امرء منعت ارومة عامر　　　ضیمی و قد جنفت علی خصومی

میں ایسا شخص ہوں عامر کی اصل نے مجھے میرے ظلم سے روکا اور میرے خصم میری طرف مائل ہوئے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح الجانئ (ہمزہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی مائل ہونے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجنف الرجل یعنی زیادتی لایا۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلَامَ، یعنی ایسا عمل کیا جس پر ملامت کی جاتی ہے۔ اَخَسَّ یعنی خسیس کام کیا۔ تجانف لاثم گناہ کی طرف مائل ہوا۔ رجل اجنف (پشت کوز) جنفی فَعَلٰی (فاء کے ضمہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ) کے وزن پر ہے۔ یہ جگہ کا نام ہے اور ابن السکیت سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حیفاً پڑھا (حاء اور یاء کے ساتھ) اس

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کا معنی ہے ظلماً۔

مجاہد نے کہا: فَمَنْ خَافَ یعنی جسے موصی کے ظلم کرنے اور بعض لوگوں کو میراث سے محروم کرنے اور اذیت پہنچانے کا اندیشہ ہو یا بلا ارادہ اذیت دینے کا اندیشہ ہو۔ یہ جنف بغیر گناہ کے ہے۔ اگر ارادۃً ہو تو گناہ میں مائل ہونا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس کو نصیحت کی گئی اور وہ لوٹا اور اس نے اس کے اور ورثاء کے درمیان اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ موصی کو بخشنے والا ہے جب اس نے موعظت پر عمل کیا اور اذیت کے ارادہ سے باز آیا۔ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بتایا کہ آیت کا معنی ہے: موصی کے مرنے کے بعد جو اسے علم تھا اسے اس نے بیان کیا کہ موصی نے بعض ورثاء کو اذیت دینے کا ارادہ کیا تھا پھر اس نے ورثاء کے درمیان جو جھگڑا تھا اس کی اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ پہلے تبدیل کرنے والے کا گناہ اس کو لاحق نہ ہوگا اگرچہ اس فعل میں تبدیلی ہے اور یہ ضروری ہے لیکن یہ تبدیلی مصلحت کے لئے ہے وہ تبدیلی جس میں گناہ ہے وہ وہ ہے جو خواہش نفس سے تبدیل ہو۔ (1)

مسئلہ نمبر 2: فَمَنْ خَافَ کا خطاب تمام مسلمانوں کے لئے ہے، انہیں کہا گیا: اگر تمہیں موصی سے وصیت میں حق سے میل اور عدول کا خوف ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور تمہیں خوف ہو کہ وہ معروف طریقہ سے وصیت نہیں کرے گا ..... یہ اس طرح ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے خاوند کے لئے مال کی وصیت کرے یا اپنی بیٹی کی اولاد کے لئے وصیت کرے تاکہ مال اس کی بیٹی کی طرف یا پوتے کی طرف لوٹ آئے ..... اس کی غرض یہ ہے کہ مال اس کے بیٹے کی طرف لوٹ آئے یا وہ اپنے غلاموں کے لئے وصیت کرے اور قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ دے تو ان کے درمیان اصلاح میں جلدی کرو۔ جب صلح واقع ہوگی تو مصلح سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔ اصلاح کرنا فرض کفایہ ہے جب لوگوں میں سے کوئی اصلاح کر دے گا تو باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر سب اصلاح نہیں کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 3: اس آیت میں ظن کے ساتھ حکم لگانے پر دلیل ہے کیونکہ جب فساد کے قصد کا گمان ہو تو اصلاح میں سعی واجب ہے جب فساد متحقق ہو تو صلح نہیں ہوتی بلکہ دفع کا حکم ہوتا ہے۔ فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے اور فساد کو کاٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ اس کا عطف خاف پر ہے۔ ضمیر سے مراد ورثاء ہیں اور ان کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے کیونکہ معنی معروف ہے اور جواب شرط فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زندگی میں اور صحت میں صدقہ کرنا، موت کے وقت صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، آپ سے پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو صدقہ کرے جب کہ تو صحیح ہو اور اس پر بخل کرنے والا ہو (2)۔ (الحدیث) بخاری و مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب فضل صدقۃ الشحیح الصحیح، حدیث نمبر 1330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سو درہم صدقہ کرنے سے افضل ہے(1)۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ اس شخص کی مثل ہے جو سیر ہونے کے بعد ہدیہ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اور جو اپنی وصیت میں کسی کو نقصان نہ دے تو اس کی یہ وصیت اس کی طرف سے اس زکوٰۃ کا کفارہ ہوگی جو اس نے ادا نہ کی تھی۔ دارقطنی نے حضرت معاویہ بن قرۃ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس پر موت آنے کا وقت قریب ہو پھر وہ وصیت کرے اور اس کی وصیت کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہو تو اس کی سابقہ زکوٰۃ جو اس نے ادا نہیں کی تھی اس کے لئے کفارہ ہوگی اور اگر وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچائے تو پھر یہ صورت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6: دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مرد یا عورت ساٹھ سال اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہوتی ہے۔ نسائی نے باب باندھا ہے: الصلاۃ علی من جنف فی وصیتہ۔ پھر اپنی سند سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کئے جبکہ اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ اس سے ناراض ہوئے اور فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے غلاموں کو بلایا ان کے تین حصے بنائے پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا، دو کو آزاد فرمایا اور چار کو غلام بنایا۔ مسلم نے اس حدیث کا معنی بیان کیا ہے مگر انہوں نے آخر میں فرمایا: آپ ﷺ نے اسے سخت کلام کہی جبکہ پہلی حدیث میں تھا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

''اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور جو خوشی سے زیادہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی کراھیۃ الاضرار فی الوصیۃ، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ۔ جب مکلفین پر قصاص اور وصیت کے فرض ہونے کا ذکر کیا تو ان پر روزوں کے فرض ہونے کا بھی ذکر کیا اور ان پر روزوں کو بھی لازم کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا(1)۔ اس حدیث کو حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ صوم کا لغوی معنی رکنا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہ ہونا ہے۔ خاموشی کو بھی صوم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کلام سے رکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (مریم:26) یعنی کلام نہ کرنے کی میں نے نذر مانی ہے۔ الصوم کا معنی ہوا کا رک جانا بھی ہے، ہوا کا چلنے سے رک جانا، گھوڑا اپنی رسی پر ٹھہرا رہے یعنی وہ ٹھہر جائے اور چارہ نہ کھائے۔ صام النہار کا معنی ہے: دن کا معتدل ہونا۔ مصام الشمس، نصف النہار کے وقت میں سورج کا برابر ہونا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

خیلٌ صیام و خیل غیر صائمۃ　　تحت العجاج و خیل تعلك اللجما

یعنی گھوڑے کھڑے ہوئے ہیں چلنے سے اور حرکت کرنے سے رکے ہوئے ہیں۔

امراؤالقیس نے کہا:

کان الثریا علقت فی مصامها

گویا ستارے اپنی جگہوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں منتقل نہیں ہوتے ہیں۔

ایک اور کا قول ہے:

والبکرات شرهن الصائمة

جوان اونٹنیاں ان کی برائی یہ ہے کہ وہ چلتی اور گھومتی نہیں ہیں۔

امرؤالقیس نے کہا:

فدعها و سل الهمّ عنك بجسرۃ　　ذمولٍ اذا صام النهار و هجرا

یعنی سورج منتقل ہونے سے اور چلنے سے ست پڑ گیا۔ پس سستی کی وجہ سے وہ رکنے والے کی طرح ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

حتیٰ اذا صام النهار و اعتدل　　و سال للشمس لعابٌ فنزل

جب دن درمیان میں تھا اور سورج کے لئے لعاب ٹپکا تو وہ ڈھل گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، حدیث نمبر 7، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک اور نے کہا:

نعمًا بوجرة صفر الخدود ما تطعم النوم الا صیاماً

شرع میں روزہ کا معنی، طلوع فجر سے سورج کے غروب ہونے تک نیت کے ساتھ روزہ کو توڑنے والی چیزوں سے رکنا ہے اور اس کا تمام اور کمال ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور محرمات میں واقع نہ ہونا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه (1)۔ (جو جھوٹ کے قول کو اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس کے کھانے، پینے کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 2: روزہ کی عظیم فضیلت اور بڑا ثواب

اس کے متعلق کثرت سے صحیح اور حسن احادیث آئی ہیں جن کا ذکر ائمہ نے اپنی اپنی مسانید میں کیا ہے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔ تیرے لئے اب اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے رب کریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزے کے یہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا (2)۔ (الحدیث) روزے کو خاص فرمایا کہ وہ اس کے لئے ہے اگرچہ تمام عبادات اس کے لئے ہیں۔ دو امور کی وجہ سے روزے کا مرتبہ باقی تمام عبادات سے بلند ہے۔

پہلا امر یہ ہے کہ روزہ نفس کو لذتوں اور شہوات سے روکتا ہے جبکہ ان چیزوں سے دوسری عبادات اتنا نہیں روکتی ہیں۔ دوسرا امر یہ ہے کہ روزہ بندے اور اس کے رب کے درمیان راز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ مختص ہے اور دوسری عبادات ظاہر ہیں۔ بعض اوقات انسان اسے تصنع اور ریاکاری کے طور پر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے روزے کو دوسری عبادات سے خاص فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی روزے کی عظمت کے متعلق اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا كُتِبَ کاف صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: کتابًا کما یا صومًا کما۔ یا یہ صیام سے حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، بعض نحویوں نے فرمایا: کاف صیام کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے کیونکہ اس کی تعریف محض نہیں ہے اس اجمال کی وجہ سے جو اس میں ہے جس کے ساتھ شریعت نے تفسیر بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی کما کے ساتھ صفت جائز ہے کیونکہ صفت ہمیشہ نکرہ کی لگائی جاتی ہے۔ یہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے قائم مقام ہے اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ما محل جر میں ہے اور اس کا صلہ كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ہے۔ اور کتب میں ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ اہل تاویل کا تشبیہ کے مقام پر اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 4: شعبی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: تشبیہ روزے کے وقت اور روزے کی قدر کی طرف لوٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب هل یقول انی صائم اذا شتم، حدیث نمبر 1771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی قوم پر رمضان کے روزے فرض کیے پھر انہوں نے اس میں تبدیلی کی۔ ان کے علماء نے ان پر دس ایام زیادہ کر دیئے۔ پھر ایک عالم بیمار ہوا تو اس نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دی تو وہ دس روزوں کا اضافہ کرے گا تو اس نے ایسا ہی کیا۔ نصاریٰ کے روزے پچاس دن ہو گئے۔ پھر گرمی میں روزے رکھنا ان پر مشکل ہوئے تو انہوں نے اپنے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا(1)۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: یہ آیت کے مفہوم کے مشابہ ہے۔ اس کے متعلق ایک حدیث ہے جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہے، حضرت دغفل بن حنظلہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: نصاریٰ پر ایک مہینہ کے روزے فرض تھے، ان کا ایک شخص مریض ہوا تو لوگوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا تو ہم دس دنوں کا اضافہ کریں گے پھر دوسرا ایک شخص تھا جس نے گوشت کھایا اور اس کے منہ کو تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفاء دے گا تو ہم سات دنوں کا اضافہ کریں گے پھر ایک اور بادشاہ کا دور آیا۔ لوگوں نے کہا: ہم ان سات ایام کو مکمل کریں گے اور ہم روزے موسم بہار میں رکھیں گے۔ فرمایا: پس پچاس روزے ہو گئے۔

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے تھے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے عہد کیا کہ تیس دنوں سے پہلے ایک دن اور ایک دن بعد ہر سال روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ان کے پچاس دن مکمل ہو جائیں گے پھر گرمیوں میں ان پر مشکل ہوئی تو انہوں نے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بارے میں حضرت دغفل بن حنظلہ، حسن بصری اور سدی سے حدیث مروی ہے۔(2)

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے...... حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے...... شک والے دن (انتیس شعبان کے بعد والے دن) کا روزہ اور عید الفطر کے متصل چھ روزوں کو مکروہ کیا گیا ہے۔ شعبی نے کہا: اگر میں پورا سال روزہ رکھتا تو شک والے دن پھر بھی افطار کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے گئے تھے جس طرح ہم پر فرض کئے گئے ہیں۔ پس انہوں نے موسم بہار کی طرف روزوں کو پھیر دیا کیونکہ یہ روزے کبھی گرمیوں میں آجاتے تھے۔ پھر انہوں نے تیس دن شمار کئے۔ پھر اس کے بعد ان پر ایک زمانہ آیا انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ تیس دنوں سے پہلے اور بعد ایک ایک دن روزہ رکھیں گے پھر...... حتیٰ کہ ان کے روزے پچاس ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے: كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اصل وجوب کی طرف راجع ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نہ وقت میں تشبیہ ہے نہ کیفیت میں۔ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اس روزے کی صفت میں واقع ہے جو ان پر فرض تھا کہ کھانا، پینا، حقوق زوجیت ادا کرنا منع تھا۔ جب افطار کا وقت ہوتا تو جو سو جاتا وہ یہ کھانا، پینا بھی نہیں کرتا تھا۔

نصاریٰ بھی ابتدا میں اسی طرح تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے پہلا

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

حکم منسوخ کر دیا۔ فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ۔ (البقرہ: 187) جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا یہ سدی، ابو العالیہ اور ربیع کا قول ہے (1)۔ حضرت معاذ بن جبل اور عطا نے کہا: تشبیہ صرف روزے پر واقع ہے نہ صفت میں ہے نہ تعداد میں ہے۔ اگرچہ دونوں روزے زیادہ اور کمی میں مختلف تھے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر مہینہ میں تین دن اور عاشوراء کے دن کا روزہ فرض تھا كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی جس طرح یہود پر روزہ فرض تھا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق تین دن اور عاشوراء کا روزہ ان پر فرض تھا پھر اس امت میں رمضان کے مہینہ کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہو گیا (2)۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا اس کو اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے ساتھ منسوخ کیا گیا پھر ایام کو رمضان کے ساتھ منسوخ کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لعل ان کے حق میں ترجی (امید) کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تَتَّقُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہاں کمزور ہونا ہے کیونکہ جب کم کھایا جاتا ہے تو شہوت کم ہوتی ہے، جب شہوت کم ہوتی ہے تو گناہ کم ہوتے ہیں۔ یہ خوبصورت وجہ مجاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تاکہ تم گناہوں سے بچ جاؤ۔ بعض نے فرمایا: یہ عموم پر ہے کیونکہ روزہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الصیام جنۃٌ (3) و وجاءٌ (روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو ختم کرتا ہے) کے مطابق تقویٰ کا سبب ہے کیوں یہ شہوات کو مار دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، اَيَّامًا، كُتِبَ کا مفعول ثانی ہے یہ فراء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: كُتِبَ کی ظرف کی بنا پر منصوب ہے یعنی تم پر روزے ایام میں فرض کئے گئے ہیں۔ اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان کا روزہ ہے۔ یہ حضرت معاذ سے جو مروی ہے اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

اس میں سولہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّرِيْضًا مریض کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی حال میں بھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اس پر تو افطار کرنا واجب ہے دوسری حالت یہ ہے کہ وہ ضرر اور مشقت کے ساتھ روزہ پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے افطار مستحب ہے اور ایسی صورت میں صرف جاہل ہی روزہ رکھتا ہے۔ ابن سیرین نے کہا: جب انسان کو ایسی حالت لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ مریض کہا جا سکتا ہو تو اس کے لئے افطار کرنا صحیح ہے اس کو مسافر پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ اس میں سفر کی علت کی وجہ سے افطار کرنا صحیح ہے اگرچہ افطار کی ضرورت نہ بھی ہو۔ طریف بن تمام العطاردی نے کہا: میں رمضان میں محمد بن سیرین کے پاس گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میری اس انگلی میں تکلیف ہے۔ جمہور علماء نے فرمایا: جب اسے کوئی ایسی مرض ہو جو اسے تکلیف دیتی ہو یا اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے افطار

1۔ تفسیر طبری، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب فضل الصوم، حدیث نمبر 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنا صحیح ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ اصحاب مالک کے ماہر علماء کا مذہب ہے، اس کے ساتھ وہ مناظرے کرتے تھے۔ رہے امام مالک کے الفاظ کہ وہ مرض جو آدمی کو تکلیف دیتی ہو اور اسے انتہا تک پہنچاتی ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک سے ایسی مرض کے بارے میں اختلاف ہے جو افطار کو مباح کرتی ہے۔ کبھی فرمایا: روزے سے تلف ہونے کا خوف ہو، کبھی فرمایا: شدت مرض اور مرض میں زیادتی، سخت مشقت۔ یہ صحیح مذہب ہے اور ظاہر کا مقتضا ہے کیونکہ کوئی مرض خاص نہیں ہے۔ یہ ہر مرض میں مباح ہے مگر جس کو دلیل خاص کرے جیسے سر درد، تھوڑا سا بخار یا کوئی تھوڑی سی مرض جس کے ہوتے ہوئے روزے میں تکلیف نہ ہو۔ حسن نے کہا: ایسی مرض جس میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ روزہ افطار کرے۔ یہ نخعی کا قول ہے(2)۔ ایک فرقہ نے کہا: کسی مرض میں افطار نہ کرے مگر ایسی مرض جس کی ضرورت افطار کی داعی ہو، جب اس مرض کے ساتھ ضرورت کا احتمال ہو تو افطار نہ کرے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔(3)

میں کہتا ہوں: اس باب میں ابن سیرین کا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں رمضان میں تھوڑا سا بیمار تھا، اسحاق بن راہویہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں میری عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے فرمایا: اے ابو عبداللہ! تو نے افطار کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: تجھے اندیشہ تھا کہ تو رخصت کے قبول کرنے سے کمزور ہو جائے گا۔ میں نے کہا: ہمیں عبدان نے بتایا انہوں نے ابن المبارک سے روایت کیا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا، فرمایا: میں نے عطا سے پوچھا میں کس مرض کی وجہ سے افطار کروں؟ انہوں نے فرمایا: جو بھی مرض ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا۔ بخاری نے فرمایا یہ حدیث اسحاق کے پاس نہ تھی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب انسان کو اپنے نفس پر خوف ہو جبکہ وہ روزہ سے ہو اگر وہ افطار نہیں کرے گا تو اس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ جائے گی یا بخار شدید ہو جائے گا تو وہ افطار کرے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ عَلٰى سَفَرٍ علماء کا اس سفر کے بارے اختلاف ہے جس میں افطار اور قصر جائز ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ سفر اطاعت ہو جیسے حج اور جہاد۔ ان دونوں سفروں کے ساتھ صلہ رحمی کا سفر، ضروری معاش کی طلب کا سفر متصل ہے، رہا تجارت کا سفر اور مباحات کا سفر اس میں منع اور اجازت کا اختلاف ہے، جواز کا قول ارجح ہے اور رہا سفر گناہ اس کے متعلق بھی علماء کا جواز و منع میں اختلاف ہے۔ منع کا قول راجح ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے(4)۔ سفر کی مسافت امام مالک کے نزدیک وہی ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے پھر انہوں نے رجوع کیا اور فرمایا: اڑتالیس میل کی مسافت ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ کبھی فرمایا: بیالیس میل ہے، کبھی فرمایا: چھتیس میل ہے، کبھی فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے۔ ان سے دو دن بھی مروی ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ کبھی خشکی اور سمندری سفر کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ فرمایا: سمندری راستہ میں ایک دن اور ایک رات ہے اور خشکی کے راستہ میں اڑتالیس میل ہے اور مذہب میں تیس میل ہے اور غیر مذہب میں تین دن ہیں۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور ثوری

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے کہا: افطار تین دنوں کے سفر میں ہے۔ یہ ابن عطیہ نے حکایت کیا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: بخاری میں ہے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس چار برد کے سفر میں افطار کرتے تھے اور یہ چار برد، سولہ فرسخ ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اختلاف ہے کہ رمضان میں سفر کرنے والے کے لئے فطر کی نیت کرنا جائز نہیں کیونکہ مسافر نیت کے ساتھ مسافر نہیں ہوتا بخلاف مقیم کے۔ مسافر عمل کرنے اور اٹھ کر جانے کے ساتھ ہی مسافر ہو جاتا ہے اور مقیم عمل کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اقامت کی نیت کرتا ہے تو اسی وقت مقیم ہو جاتا ہے کیونکہ اقامت عمل کی محتاج نہیں ہوتی۔ پس یہ دونوں جدا جدا ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف نہیں کہ جو سفر کی امید رکھتا ہے تو اس کے لئے نکلنے سے پہلے افطار جائز نہیں اگر افطار کرے تو ابن حبیب نے کہا: اگر وہ سفر کے لئے تیاری کر چکا تھا اور سفر کے اسباب لے چکا تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ یہ اصبغ اور ماجشون سے حکایت کیا گیا ہے۔ اگر سفر سے اسے کوئی عارضہ روک لے تو اس پر کفارہ ہوگا اور اگر سفر کرے تو کفارے سے بچ جائے گا۔ عیسیٰ نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے: اس پر ایک دن کی قضا لازم ہے کیونکہ وہ فطر میں تاویل کرنے والا تھا۔ اشہب نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں خواہ سفر کرے یا نہ کرے۔ سحنون نے کہا: اس پر کفارہ ہے خواہ سفر کرے یا نہ کرے یہ اس عورت کی طرح ہے جو کہتی ہے کل مجھے حیض آجائے گا اس لئے وہ افطار کر دیتی ہے۔ پھر سحنون نے عبدالملک اور اصبغ کے قول کی طرف رجوع کر لیا اور فرمایا: عورت کی طرح نہیں ہے کیونکہ مرد جب چاہتا ہے سفر کرتا ہے اور عورت حیض خود نہیں لاتی۔

میں کہتا ہوں: ابن القاسم اور اشہب کا قول کفارہ کی نفی میں بہتر ہے کیونکہ اس نے وہ فعل کیا جو اسے کرنا جائز تھا اور ذمہ بری ہے اور اس میں کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا۔ پھر اَوْ عَلٰی سَفَرٍ کے ارشاد کا یہی مقتضا ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ اس مسئلہ میں صحیح ترین قول ہے۔ کیونکہ وہ روزے کی حرمت کو توڑنے والا نہیں تھا اس نے اس کا قصد اور ارادہ کیا ہوا تھا۔ پس متاول تھا۔ اگر کھانا سفر کی نیت کے ساتھ ہو تو اس پر کفارہ واجب ہے کیونکہ یہ سفر کی طرف نکلنے سے پہلے تھا ابھی تک خروج نے اس سے اس کو ساقط نہیں کیا تھا۔ پس تو اس میں غور کرے گا تو تو بھی اسی طرح پائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے، حضرت محمد بن کعب سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کے پاس آیا، وہ سفر کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور ان کی سواری بھی تیار کر دی گئی تھی اور وہ سفر والا لباس پہن چکے تھے اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ انہوں نے کھانا منگوایا اور اس سے کھایا پھر سوار ہو گئے۔ میں نے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: مجھے حضرت ابو موسیٰ نے کہا: کیا میں تجھے نہ بتاؤں جب تو نکلے گا تو روزہ سے نکلے گا اور جب تو داخل ہوگا تو روزہ سے داخل ہوگا۔ جب تو سفر پر نکلے تو افطار کر کے نکل جب تو گھر میں داخل ہو تو افطار کرتے ہوئے داخل ہو۔ حسن نے کہا: جس دن سفر کا ارادہ ہو اس دن گھر میں اگر چاہے تو افطار کرے۔ احمد نے کہا جب وہ گھروں سے نکل جائے تو افطار کرے۔ اسحاق نے کہا: نہیں۔ بلکہ جب سواری پر کجاوہ رکھے تو افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: احمد کا قول صحیح ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو حالت صحت میں صبح کرے پھر بیمار ہوا تو وہ بقیہ دن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

افطار کرے۔ اسی طرح جب حضر میں صبح کرے پھر سفر کی طرف نکلے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس دن افطار نہ کرے اگر چہ سفر شروع بھی کر دے۔ اسی طرح زہری، مکحول اور یحییٰ انصاری، امام اوزاعی، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے۔ اگر وہ افطار کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ پھر تمام کہتے ہیں کہ وہ قضا کرے گا اور کفارہ نہیں دے گا۔ امام مالک نے فرمایا: سفر چونکہ طاری عذر ہے۔ یہ مرض کی طرح ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ قضا کرے اور کفارہ بھی دے۔ یہ ابن کنانہ اور مخزومی کا قول ہے۔ الباجی نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے، ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے اور یہی کہا ہے۔ فرمایا: سفر عذر ہے جو عبادت کے لزوم کے بعد لاحق ہوا ہے۔ یہ مرض اور حیض کے مخالف ہے کیونکہ مرض اس کے لئے افطار کو مباح کرتی ہے۔ حیض اس پر روزے کو حرام کر دیتا ہے اور سفر یہ اس کے لئے مباح نہیں کرتا اس پر روزے کی حرمت توڑنے کی وجہ سے کفارہ واجب ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت میں اس کے لئے افطار کو مباح کیا ہے۔ رہا علماء کا یہ قول کہ وہ افطار نہ کرے یہ اس کا استحباب ہے جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ اگر وہ اللہ کی رخصت کو لے گا تو اس پر قضا ہوگی۔ رہا کفارہ تو اس کی کوئی وجہ نہیں، جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس نے اس چیز کو واجب کیا جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب نہیں کیا۔ حضرت ابن عمر سے اس مسئلہ میں مروی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس دن افطار کرے جب وہ سفر پر نکلے۔ یہ شعبی، امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے اس مسئلہ پر یہ باب باندھا ہے: من افطر فی السفر لیراہ الناس اور حضرت ابن عباس سے حدیث نقل کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف نکلے تو روزہ رکھے رہے، حتیٰ کہ عسفان تک پہنچ گئے پھر پانی منگوایا اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا تاکہ لوگوں کو دکھائیں کہ آپ نے افطار کیا ہے حتیٰ کہ مکہ مکرمہ آئے اور یہ رمضان کا مہینہ تھا (1)۔ مسلم نے بھی یہ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، اس میں فرمایا: پھر برتن منگوایا جس میں مشروب تھا دن کے وقت وہ مشروب پیا تاکہ لوگ آپ کو دیکھ لیں پھر آپ نے افطار کیا تاکہ مکہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ اس باب میں نص ہے۔ پس مخالف قول ساقط ہوا۔ وباللہ التوفیق۔ اس میں جو یہ کہتا ہے کہ روزہ سفر میں منعقد نہیں ہوتا، حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جو سفر میں روزہ رکھے تو حضر میں قضا کرے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی طرح ہے (2)۔

اہل ظواہر کی ایک قوم نے یہی کہا ہے اور انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت کعب بن عاصم سے روایت ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اس میں اس کے قول کی حجت ہے جو کہتا ہے: جو سفر میں رات کو روزہ کی نیت کرے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے اگر چہ عذر نہ بھی ہو۔ مطرف کا خیال بھی یہی ہے۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے اور یہی اہل ظواہر کی ایک جماعت کا قول

1۔ صحیح بخاری، باب من افطر فی السفر لیراہ الناس، حدیث نمبر 1812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی الافطار فی السفر، حدیث نمبر 1655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ امام مالک ایسے شخص پر قضا اور کفارہ واجب کرتے تھے۔ امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہے یہ عبدالملک کے سوا اکثر اصحاب مالک کا قول ہے۔

عبدالملک نے کہا: اگر جماع کے ساتھ افطار کرے گا تو کفارہ دے گا کیونکہ اس میں سفر پر نہ قوت حاصل کرتا ہے اور نہ اسے کوئی عذر ہے، مسافر کے لئے افطار اس لئے مباح ہوتا ہے تا کہ اپنے سفر پر قوت حاصل کرے، عراق اور حجاز کے تمام فقہاء نے کہا: اس پر کفارہ نہیں۔ ان میں سے ثوری، امام اوزاعی، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور تمام کوفہ کے فقہاء ہیں۔ یہ حضرت ابوعمر کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر4: اس میں علماء کا اختلاف ہے سفر میں افطار افضل ہے یا روزہ افضل ہے؟ امام مالک اور امام شافعی نے بعض روایات میں فرمایا: روزہ افضل ہے جو روزہ کی طاقت رکھتا ہو اور امام مالک کا مذہب اختیار کا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور دوسرے ان کے متبعین علماء نے کہا: اسے اختیار ہے اور انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اسی طرح ابن علیہ نے کہا: کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے، فرمایا: ہم نے رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا تو روزہ دار نے افطار کرنے والے پر عیب نہیں لگایا اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔(1)

اس حدیث کو بخاری، مسلم اور مالک نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اور حضرت انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کہا: سفر میں روزہ افضل ہے اس کے لئے جو اس پر قدرت رکھتا ہو(2)۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رخصت افضل ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، شعبی، عمر بن عبدالعزیز، مجاہد، قتادہ، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: افطار افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:185)

مسئلہ نمبر5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اس کلام میں حذف ہے یعنی تم میں سے جو مریض یا مسافر ہو وہ افطار کرے اور قضا کرے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اہل شہر جب انتیس دن روزے رکھیں اور شہر میں کوئی مریض آدمی ہو اور صحیح نہ ہو تو وہ انتیس دن روزے رکھے۔ ایک قوم نے کہا: ان میں سے حسن بن صالح بن حی ہے۔ انہوں نے کہا: ایک مہینہ کے بدلے میں ایک مہینہ روزے رکھے ایام کی تعداد کا اعتبار کئے بغیر۔ الکیا طبری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یہ نہیں فرمایا کہ دوسرے ایام سے ایک مہینہ روزے رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَعِدَّةٌ جو اس نے افطار کیا ہے اس کی تعداد پوری کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کچھ دن رمضان کے افطار کیا ہو تو ان کی تعداد کے مطابق قضا کرنا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورا مہینہ افطار کیا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔

مسئلہ نمبر6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ اس کو رفع مبتدا کی خبر کے اعتبار سے ہے اس کی تقدیر الحکم بالواجب

1۔ صحیح بخاری، باب لم يعب اصحاب النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بعضهم بعضا فی الصوم والافطار، حدیث 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عدۃٌ ہے۔ فعلیه عدۃٌ بھی صحیح ہے (1)۔ کسائی نے کہا: فعدۃً بھی جائز ہے یعنی فلیصم عدۃً من ایامٍ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس پر روزوں کی تعداد ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور عدۃ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے۔ عدۃٌ۔ یہ العد سے فعلۃ کے وزن پر ہے یہ بمعنی معدود ہے جیسے طحن بمعنی مطحون ہوتا ہے تو کہتا ہے: اسمع جعجعة ولا اری طحنا (یہ اس شخص کی مثال دی جاتی ہے جو کثرت سے کلام کرتا ہے اور عمل نہیں کرتا) اسی سے عورت کی عدت ہے۔

مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، اُخَرَ سیبویہ کے نزدیک غیر منصرف ہے کیونکہ یہ الف لام سے پھیرا گیا ہے۔ کیونکہ اس باب سے فُعَل کے وزن پر الف لام کے ساتھ آتا ہے جیسے الکبر، الفضل۔ کسائی نے کہا: یہ آخر سے معدول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے حمراء، حمر، اسی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے۔ بعض نے فرمایا یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جُمَع کے وزن پر ہے، یہ ایام کی صفت ہے اُخریٰ نہیں آیا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ یہ عدۃ کی صفت ہے۔ بعض نے فرمایا: اخر یہ اخریٰ کی جمع ہے گویا ایام اخریٰ پھر کثرت کی وجہ سے ایام اخر کہا گیا۔ بعض نے فرمایا: اگر یہ ایام کی صفت ہوتا تو مونث ہوتا اسی وجہ سے اُخر کے ساتھ نعت لگائی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 7: لوگوں کا قضا روزے متواتر رکھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں: دونوں دار قطنی نے اپنی سنن میں ذکر کئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا فعدۃ من ایام اُخر متشابهات نازل ہوا ہے پھر متشابهات ساقط ہو گیا اور یہ فرمایا: یہ اسناد صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر رمضان کے روزے ہوں وہ متواتر رکھے اور ان میں انقطاع نہ کرے۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن ابراہیم ضعیف الحدیث ہے۔ حضرت ابن عباس سے قضا روزوں کے متعلق مروی ہے، صمه کیف شئت۔ تو جیسے چاہے روزے رکھ۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: صمه کما افطرته۔ جیسے تو نے افطار کئے اسی طرح روزے رکھ۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عمرو بن عاص سے مسنداً مروی ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان کے (قضا) روزے علیحدہ علیحدہ قضا کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ تجھ پر منحصر ہے تم بتاؤ اگر تم میں سے کسی پر قرض ہو ایک درہم، وہ دو درہم ادا کرے تو کیا وہ ادائیگی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بخشنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کی سند حسن ہے مگر مرسل ہے اور متصل ثابت نہیں ہے۔ مؤطا امام مالک میں نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے: رمضان کے متصل روزے رکھے جو مرض یا سفر کی وجہ سے متواتر افطار کرے۔ الباجی نے "المنتقیٰ" میں فرمایا یہ احتمال ہے کہ وجوب کے متعلق خبر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ استحباب کے متعلق خبر ہو، جمہور کا قول استحباب پر ہے۔ اگر وہ جدا جدا بھی رکھے تب بھی جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اس قول کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یہاں متفرق اور متواتر کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ جب متفرق رکھے گا تو دوسرے دنوں کی گنتی پوری کر دی پس اس کا جائز ہونا واجب ہے۔ ابن عربی نے کہا: (رمضان کے) مہینہ میں تواتر واجب ہے کیونکہ وہ معین ہے اور قضا میں تعیین واجب نہیں۔ پس تفریق جائز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 8: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یہ قضا کے وجوب پر بغیر زمانہ کی تعیین کی دلیل ہے کیونکہ لفظ زمانہ کے متعلق عام ہے بعض، بعض کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے تھے میں شعبان سے پہلے قضا نہیں کر سکتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشغولیت کی وجہ سے۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے خیال سے (1)۔ یہ نص ہے اور آیت کا بیان ہے۔ یہ داؤد کے قول کا رد کرتی ہے۔ اس پر دو شوال سے قضا واجب ہے تو جس نے دو شوال کو روزہ نہ رکھا پھر وہ مرگیا تو ان کے نزدیک وہ گنہگار ہے اور انہوں نے اس پر بنیاد رکھی ہے کہ جس پر غلام کا آزاد کرنا واجب تھا پھر اس نے غلام پایا جو ثمن کے ساتھ بیچا جا سکتا تھا تو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے تجاوز کرے اور کوئی دوسرا خریدے کیونکہ اس پر پہلا غلام آزاد کرنا واجب تھا جو اس نے پایا تھا دوسرا غلام جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس غلام ہو تو اس کے لئے دوسرا خریدنا جائز نہیں اگر وہ مرجائے جو اس کے پاس ہے تو عتق باطل نہ ہوگا جس طرح اس کے حق میں عتق باطل ہو جاتا ہے جو معین غلام کو آزاد کرنے کی نذر مانے پھر وہ مرجائے تو اس کی نذر باطل ہو جائے گی اور یہ اس کے قول کو فاسد کرتا ہے۔ بعض اصولی علماء نے کہا: جب شوال کے دوسرے دن کے گزرنے کے بعد وہ مرجائے تو عزم کی شرط پر گنہگار نہ ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وہ نہ تو گنہگار ہوگا اور نہ وہ کوتاہی کرنے والا شمار ہوگا۔ یہ جمہور کا قول ہے لیکن جلدی قضا کرنا مستحب ہے تاکہ کہیں اسے موت نہ آجائے اور اس پر فرض باقی ہو۔

مسئلہ نمبر 9: جس پر رمضان کے قضا روزے ہوں اور اس پر عید الفطر کے بعد اتنے ایام گزر گئے جن میں اس کا روزے رکھنا ممکن تھا اس نے روزوں کو موخر کیا پھر اس کو کوئی مانع لاحق ہوا جس نے اسے دوسرے رمضان تک قضا کرنے سے روکے رکھا تو اس پر کوئی کھانا کھلانا نہیں ہے کیونکہ وہ تاخیر کے جواز کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مالکیوں میں سے بغدادی علماء کا قول ہے اور وہ ''المدونہ'' میں ابن قاسم کا قول روایت کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: اگر آئندہ شعبان تک بھی قضا روزے نہ رکھے تو کیا اس وجہ سے اس پر کوئی کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: ہاں، اس پر قضا ہے۔ امام ابوحنیفہ، حسن، نخعی اور داؤد نے کہا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس سے مرسلاً مروی ہے کہ وہ کھانا کھلائے اور اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ فرمایا فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ سے مسنداً اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں کوتاہی کرتا ہے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آجاتا ہے۔ فرمایا: وہ لوگوں کے ساتھ اس رمضان کے روزے رکھے اور جن روزوں میں کوتاہی کی ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے رمضان کے مہینہ کے روزے کسی مرض کی وجہ سے نہیں رکھے پھر وہ صحیح ہو گیا اور پھر بھی روزے نہیں رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آگیا تو وہ اس رمضان کے روزے رکھے پھر اس

1۔ صحیح بخاری، باب متی یقضی رمضان، حدیث نمبر 1814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہینہ کے روزے رکھے جس کے روزے افطار کئے تھے یا یہ ہر دن کے لئے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی سند میں ابن نافع اور ابن وجیہ دو ضعیف راوی ہیں۔

مسئلہ نمبر 11: اگر کسی کا مرض لمبا ہو گیا اور وہ صحیح نہ ہوا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد گندم کھلائے پھر اس پر قضا نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرمایا: جب دو رمضانوں کے درمیان صحیح نہ ہو تو اس رمضان کے روزے رکھے اور دوسرے رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ جب صحیح ہوا اور روزہ نہ رکھا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جائے تو اس رمضان کے روزے رکھے اور گزشتہ رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے جب افطار کرے تو قضا کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ کے اقوال سے قیاس کے خلاف حجت پکڑی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا: میں دو رمضان بیمار رہا۔ اسے حضرت ابن عباس نے فرمایا: تمہاری مرض متواتر رہی ہے یا درمیان میں تو صحیح بھی ہوا تھا؟ اس شخص نے کہا: میں صحیح ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: دونوں رمضانوں کے روزے رکھ اور ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا۔ یہ حضرت ابن عباس کے اس قول کا بدل ہے: اگر اس کے ساتھ مرض بڑھ جائے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے بارے میں ان کے مذہب کے مشابہ ہے کہ وہ کھانا کھلائیں اور ان پر قضا نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 12: پھر جن علماء نے کھانا کھلانا واجب کیا ہے، اس کھانے کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوہریرہ، قاسم بن محمد، امام مالک، امام شافعی فرماتے ہیں: ہر دن کی طرف سے ایک مد کھلائے۔ ثوری نے کہا: ہر دن کے بدلے نصف صاع کھلائے۔

مسئلہ نمبر 13: پھر اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں افطار کرے یا جماع کرے اس پر کیا واجب ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے قضا روزوں میں سے کوئی روزہ توڑ دیا تو اس پر بغیر قضا کے کچھ واجب نہیں ہے۔ اس کے لئے مستحب ہے کہ اختلاف کی وجہ سے اس روزے کو پورا کرے پھر اس کی قضا کرے اور اگر جان بوجھ کر افطار کیا تو گنہگار ہو گا اور اس پر اس دن کی قضا کے علاوہ کچھ نہ ہو گا اور اس روزہ کی پابندی نہ کرے کیونکہ اس کو ان چیزوں سے روکنے کا اب کوئی معنی نہیں جن سے روزہ دار رکتا ہے کیونکہ جان بوجھ کر توڑنے کی وجہ سے علماء کے نزدیک وہ روزہ دار نہیں رہا۔ رہا کفارہ تو امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس میں کفارہ واجب نہیں ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کر کے یا اس کے علاوہ کسی طرح رمضان کا قضا روزہ توڑا تو اس پر کفارہ نہیں ہے، اس پر اس دن کی قضا ہے۔ قتادہ نے کہا: جس نے رمضان کے قضا روزے میں جماع کیا اس پر قضا اور کفارہ ہے۔

ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے رمضان کا قضا روزہ توڑ دیا تو اس پر دو دن کی قضا ہے۔ ابن القاسم پہلے بھی فتویٰ دیتے تھے پھر اس سے رجوع کر لیا تھا پھر فرمایا: اگر قضا کی قضا میں جان بوجھ کر افطار کیا تو اس کی جگہ دو دنوں کے روزے رکھے گا، جیسے جس نے اپنا حج اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا، پھر اس نے آئندہ سال حج

کیا پھر اسے اپنی بیوی سے جماع کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا تو اس پر دو حج ہوں گے۔ ابو عمرو نے کہا: ابن وہب اور عبد الملک نے حج میں اس کی مخالفت کی ہے۔ مختلف فیہ میں اصل پر قیاس واجب نہیں ہے۔ میرے نزدیک ...... واللہ اعلم ...... صحیح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک دن کی قضا واجب ہے کیونکہ یہ ایک دن تھا اس نے اسے دو مرتبہ فاسد کیا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا یہی مقتضا ہے جب اس نے قضا رمضان میں افطار کی وجہ سے ایک پورا دن روزہ رکھ لیا تو اس نے واجب ادا کر دیا اس پر اس کے علاوہ کچھ واجب نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 14: جمہور علماء کا قول ہے کہ جو کسی بیماری کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑ دے پھر وہ اسی بیماری کی وجہ سے مر جائے یا وہ سفر کرے اور اسی سفر میں مر جائے تو اس پر کچھ واجب نہیں۔ طاؤس اور قتادہ نے اس مریض کے بارے میں فرمایا جو صحیح ہونے سے پہلے مر جائے کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔

مسئلہ نمبر 15: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس پر رمضان کے روزے تھے اور ابھی قضا نہیں کئے تھے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے۔ امام احمد، اسحاق، ابو ثور، لیث، ابو عبید اور اہل ظواہر نے کہا: اس کی طرف سے روزہ رکھا جائے مگر انہوں نے اس کو نذر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی سے مروی ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے رمضان کے قضا روزوں کے متعلق بتایا کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔ جنہوں نے روزہ رکھنے کا قول کیا ہے انہوں نے مسلم کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مروی سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مر جائے اور اس پر روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے (1) مگر یہ ارشاد روزہ میں عام ہے اور مسلم کی حضرت ابن عباس سے روایت اس کی خاص کرتی ہے۔ فرمایا: ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس پر نذر کا روزہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بتاؤ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو تو اسے ادا کرتی تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھ۔ امام مالک اور ان کے ہم مذہب لوگوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر: 18) (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم) (انسان کے لئے نہیں ہے مگر جو اس نے کوشش کی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164)

اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو نسائی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: کوئی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے بلکہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک مد گندم کھلائی جائے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث عام ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لا یصوم احد عن احد سے مراد رمضان کا روزہ ہو۔ رہا نذر کا روزہ

1۔ صحیح بخاری، باب من مات وعلیہ صوم، حدیث نمبر 1816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو وہ جائز ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث حضرت ابن عباس کی حدیث کی طرح ہے اور اس کے بعض طرق میں ہے دو مہینوں کے روزے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے روزہ رکھو۔ پھر اس عورت نے کہا: اس نے کبھی حج نہیں کیا تھا، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر۔ اس عورت کا قول کہ دو مہینے کے روزے تھے، یہ رمضان کے روزے ہونے کی نفی کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ سب سے قوی دلیل جو امام مالک کی طرف سے پیش کی جاتی ہے وہ اہل مدینہ کا عمل ہے اور قیاس جلی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ عبادت بدنی ہے اس میں مال کا کوئی دخل نہیں ہے پس جس پر بدنی عبادت جیسے نماز واجب ہو تو دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرے گا اور یہ قول، حج کرنے کے قول سے نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس میں مال کا دخل ہے (☆)۔

مسئلہ نمبر 16: اس آیت میں ان علماء نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ منعقد ہی نہیں ہوتا اس پر ہمیشہ قضا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یعنی اس پر تعداد ہے کلام میں نہ حذف ہے، نہ اضمار ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سفر میں روزہ نیکی میں سے نہیں ہے۔ فرمایا: جو نیکی میں سے نہ ہوگا وہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رمضان کا روزہ سفر میں جائز نہیں۔

جمہور علماء کہتے ہیں: فافطر محذوف ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے: ہم نے رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا کسی روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور کسی افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہ لگایا۔ اس کو مالک نے حمید الطویل سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اس کو مسلم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مل کر ایک جنگ میں شرکت کی رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا تھا اور بعض نے افطار کیا تھا۔ روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ جمہور علماء نے طا کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل یطوقونہ تھی کسرہ کو طا کی طرف نقل کیا گیا اور واو کو ماقبل کسرہ کی وجہ سے کسرہ سے بدلا گیا۔ حمید نے اصل پر بغیر اعلال کے پڑھا ہے اور قیاس اعلال ہے (1)۔ حضرت ابن عباس کی مشہور قراءت یطوقونة طاء مخففہ کے فتحہ اور واو کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مجاہد سے یطیقونہ طاء کے بعد یاء کے ساتھ یکیلونہٗ کے لفظ پر پڑھا ہے۔

☆ ائمہ احناف کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

یہ باطل اور محال ہے کیونکہ فعل طوق سے ماخوذ ہے اس میں واو لازم اور واجب ہے اس مثال میں یا کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ابو بکر انباری نے کہا: احمد بن یحییٰ نحوی نے ابن ذوئب کا یہ شعر پڑھا ہے:

فقیل تحمل فوق طوقك انها مطبعة من یاتها لا یضیرها

طوق میں واو کو ظاہر کیا، اس کی وجہ سے صحیح یہ ہے کہ واو کی جگہ یا کو رکھنے والا صواب (صحیح رائے) سے دور ہے۔ ابن انباری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، یطیقونہ یا کے فتحہ، طا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ، پھر یا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ بمعنی یطیقونہ کہا جاتا ہے طاق، اطاق، اَطیَق سب کا ایک معنی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت طاؤس اور حضرت عمرو بن دینار سے یطوقونہ یا مفتوحہ، طا مشددہ مفتوحہ کے ساتھ مروی ہے۔ لغت میں یہ درست ہے کیونکہ اس کی اصل لیتطوقونہ ہے تا کو ساکن کر کے طا میں ادغام کیا گیا تو طا مشددہ ہوگی اور یہ قرآن سے نہیں ہے خلاف اس کے جس نے اس قراءت کو قرآن ثابت کیا ہے۔ یہ تفسیر کی بنا پر قراءت ہے۔ اہل مدینہ اور شام نے۔ فِدْیَةُ طَعَامُ مضاف کر کے پڑھا ہے اور مساکین جمع پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے طعام مسکین، مفرد پڑھا ہے جیسا کہ بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(1)۔ یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ اس نے ایک دن میں جو حکم تھا اس کو بیان کیا۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا یہ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابو عبید نے کہا اس قرأت نے بیان کیا کہ ہر دن کے لئے ایک شخص کو کھانا کھلانا ہے اور واحد جمع کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ جمع، واحد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مساکین جمع ہو تو معلوم نہیں ہوتا ان میں سے کتنے ایک دن میں مگر کسی دوسری آیت سے اور مساکین میں جمع کی قراءت اس کو ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ الذین یطیقونہ جمع اور ان میں سے ہر ایک کو ایک مسکین لازم تھا پس اس کا لفظ جمع لایا گیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً (النور: 4) یعنی ہر ایک کو اسی کوڑے لگاؤ۔ اسی کوڑے ان تمام میں متفرق طور پر نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے لئے اسی کوڑے ہیں۔ ابو علی نے یہ معنی بیان کیا(2)۔ جمع کی قراءت نحاس نے اختیار کی۔ فرمایا: ابو عبید نے جو اختیار کیا وہ مردود ہے کیونکہ یہ دلالت سے پہچانی گئی ہے۔ اور عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ کا معنی یہ ہے کہ ہر دن کے لئے ایک مسکین ہے اس قراءت کا اختیار جمع پر جمع کو رد کرتا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبید نے فدیۃٌ طعامُ پڑھنا پسند کیا ہے فرمایا: طعام سے مراد فدیہ ہے پس طعام کا صفت ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ جوہر ہے لیکن بطور بدل جائز ہے۔ فدیة طعامِ اضافت کے ساتھ پڑھنا اس سے زیادہ واضح ہے کیونکہ فدیة مبہم ہے طعام وغیرہ کے لئے واقع ہوتا ہے۔ پس یہ تیرے قول هذا ثوب خزٍ کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 2: آیت کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ منسوخ ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے، ابن نمیر نے فرمایا: ہمیں اعمش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں عمرو بن مرہ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں ابن ابی لیلیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ رمضان کا حکم نازل ہوا تو لوگوں پر گراں گزرا۔ پس جس نے ہر دن

1۔ سنن ابی داؤد، باب نسخ قولہ تعالیٰ و علی الذین یطیقونہ فدیة، حدیث نمبر 1972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ایک مسکین کو کھانا کھلایا اس نے روزہ چھوڑ دیا ان لوگوں میں سے جو روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ پہلے ان کو اس کی رخصت دی گئی تھی پھر اس کو وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ نے منسوخ کر دیا۔ اسی پر جمہور کی قراءت یطیقونہ ہے یعنی وہ روزہ کی طاقت رکھتے تھے۔ کیونکہ روزے کا فرض اسی طرح تھا جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا مسکین کو کھانا کھلاتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت شیوخ اور بوڑھے لوگوں کے لئے رخصت تھی جب کہ وہ افطار کرنا چاہیں اگرچہ وہ روزے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ پھر یہ آیت اس قول فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ:185) سے منسوخ ہوگئی۔ پس یہ رخصت ختم ہوگئی مگر اس کے لئے باقی ہے جو ان میں سے روزہ رکھنے سے عاجز ہے۔(1)

فراء نے کہا: یطیقونہ میں ضمیر کا مرجع صیام ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ان پر جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ جب افطار کریں تو کھانا کھلائیں پھر یہ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا کے ساتھ منسوخ ہوگیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع فدیہ ہو یعنی جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور رہی یطوّقونہ کی قراءت اس کا معنی ہے: وہ مشقت جو ان کو لاحق ہوئی ہے اس کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں جیسے مریض اور حاملہ عورت وہ دونوں اس پر قدرت رکھتے ہیں لیکن مشقت کے ساتھ جو نہیں لاحق ہوئی ہے، اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بھی جائز ہے اور اگر وہ فدیہ دیں تو یہ بھی ان کے لئے جائز ہے۔ حضرت ابن عباس نے یطیقونہ کی تفسیر یتکلفونہ سے بیان فرمائی ہے۔ اگر ان سے اسناد صحیح ہو۔ بعض نقل کرنے والوں نے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(2)، وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فرمایا یہ حبلی (حاملہ عورت) اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے ثابت ہے اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ بوڑھے اور بوڑھی عورت کے لئے رخصت تھی حالانکہ وہ روزہ رکھ سکتے تھے وہ افطار کریں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو جب اپنی اولاد پر خوف ہو تو وہ افطار کریں اور کھانا کھلائیں(3)۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا ہے، فرمایا: بوڑھے آدمی کے لئے رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ صحیح سند ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے، فرمایا: وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس سے مراد بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہر دن کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے آپ نے اپنی ام ولد کو فرمایا جو حاملہ تھی یا دودھ پلانے والی تھی، تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تم پر جزا ہے، قضا نہیں ہے۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے، آپ کی ام ولد دودھ پلاتی تھی (بغیر شک کے ہے) اس کو تکلیف ہوئی تھی تو آپ نے اسے افطار کرنے کا حکم دیا اور قضا نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس سے صحیح اسانید کے ساتھ ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ سنن ابی داؤد، باب من قال ھی مثبتۃ للشیخ، حدیث 1973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، باب من قال ھی مثبتۃ للشیخ، حدیث 1974، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے حق میں محکم ہے۔ پہلا قول بھی صحیح ہے مگر یہ احتمال ہے کہ نسخ وہاں تخصیص کے معنی میں ہو۔ متقدمین اکثر تخصیص کے معنی میں نسخ کو استعمال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرات حسن بصری، عطا بن ابی رباح، ضحاک، نخعی، زہری، ربیعہ، اوزاعی اور اصحاب رائے نے فرمایا: حاملہ اور دودھ پلانے والی دونوں روزہ افطار کریں اور ان پر کھانا نہیں ہے۔ یہ مریض کی طرح ہیں وہ افطار کرتا ہے اور قضا کرتا ہے۔ یہ ابوعبید اور ابوثور کا قول ہے۔ یہ ابوعبید نے ابوثور سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ امام مالک کا قول حاملہ کے بارے میں ہے اگر وہ افطار کرے۔ رہی دودھ پلانے والی اگر وہ افطار کرے تو اس پر قضا اور کھانا کھلانا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا: وہ افطار کریں گی اور کھانا کھلائیں گی اور قضا کریں گی۔ اور اس پر اجماع ہے کہ بوڑھے مرد اور عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اور سخت مشقت کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں وہ افطار کریں اور جوان پر واجب ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ربیعہ اور مالک نے کہا: ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ لیکن امام مالک نے کہا: اگر وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں تو میرے نزدیک محبوب ہے۔ حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قیس بن السائب اور حضرت ابوہریرہ نے کہا: ان پر فدیہ ہوگا۔ یہ امام شافعی اور اصحاب الرائے کا مسلک ہے۔ انہوں نے تمام صحابہ کے قول کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** پھر فرمایا **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ** یہ لوگ نہ مریض ہیں اور نہ مسافر ہیں ان پر فدیہ واجب ہے اور امام مالک کے قول کی دلیل ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے افطار کرنے والا ہے جو اس میں موجود ہے اور وہ بوڑھا ہونا ہے اور بڑی عمر کا ہونا ہے۔ پس کھانا کھلانا لازم نہ ہوگا جیسے مسافر اور مریض پر کھانا کھلانا نہیں ہے۔ یہ ثوری، مکحول سے مروی ہے، ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا فدیہ کی مقدار میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ہر دن کے بدلے ایک مد نبی کریم ﷺ کے مد کے برابر دے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: ہر دن کا کفارہ ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم ہے۔ حضرت ابن عباس سے نصف صاع گندم مروی ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: جو بوڑھا ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر ہر دن کے لئے ایک مد گندم ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ وہ ایک سال روزہ رکھنے سے کمزور ہوگئے تو آپ نے کھانے کا ایک تھال تیار کیا پھر تیس مساکین کو بلایا اور انہیں سیر کر کے کھلایا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ** ابن شہاب نے فرمایا: جو روزے کے ساتھ کھانا کھلانے کا ارادہ کرے اور مجاہد نے کہا: جو کھانے میں مد پر زیادتی کرے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا** دوسرے مسکین کو کھلائے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے اور کہا: اس کی سند صحیح ثابت ہے اور دوسرا خیر، اسم تفضیل ہے اسی طرح تیسرا اور پہلا بھی (2)۔ عیسیٰ بن عمر اور یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے یطوع خیرا مشدد پڑھا ہے اور عین کو جزم دی ہے یتطوع کے معنی میں اور باقی قراء نے تطوع تا اور طا کی تخفیف اور عین کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضا

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَصُوْمُوْا یعنی روزہ تمہارے لئے بہتر ہے اسی طرح ابی نے پڑھا ہے (1) یعنی فدیہ کے ساتھ افطار سے روزہ رکھنا بہتر ہے یہ نسخ سے پہلے تھا۔ بعض نے فرمایا وَ اَنْ تَصُوْمُوْا یعنی سفر اور مرض میں بغیر تکلیف کے روزہ رکھنا، واللہ اعلم۔ یہ روزے رکھنے پر ابھارنے کا تقاضا کرتا ہے یعنی تم یہ جان لو اور روزہ رکھو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری اور (چاہتا ہے) تم گنتی پوری کرلیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ اہل تاریخ نے کہا: سب سے پہلے رمضان کا روزہ حضرت نوح علیہ السلام نے رکھا جب وہ کشتی سے باہر نکلے تھے۔ مجاہد کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان فرض کیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں۔ واللہ اعلم۔ الشھر یہ الاشھار سے مشتق ہے کیونکہ یہ مشہور ہوتا ہے کسی پر اس کا علم مشکل نہیں ہوتا جو اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شھرت السیف (جب کوئی تلوار سونت لے) رمضان رمض الصائم یرمض سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے: شدت پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا پیٹ گرم ہو گیا۔ الرمضاء (ممدودۃ) سخت گرمی کو کہتے ہیں۔ اس سے حدیث ہے: صلاۃ الاوابین اذا رمضت الفصال۔ اوابین کی نماز اس وقت ہے جب گرمی سے پاؤں جلنے لگ جائیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ رمض الفصال کا مطلب ہے: گرمی اونٹوں کے پاؤں جلا دے اور وہ گرمی کی وجہ سے بیٹھ جائیں۔ رمضان گرمی میں واقع ہوا۔ یہ رمضاء سے ماخوذ ہے جوہری نے کہا: شھر رمضان اس کی جمع رمضانات اور ارمضاء آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے مہینوں کے اسماء لغت قدیمہ سے نقل کئے ہیں اور انہوں نے ان کے نام اس زمانہ کے ساتھ رکھے جس میں وہ مہینہ واقع ہوا۔ یہ مہینہ شدید گرمی میں واقع ہوا تو اس وجہ سے اس کا نام رمضان رکھا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: رمضان کو رمضان اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی اعمال صالحہ کے ساتھ گناہوں کو جلا دیتا ہے یہ الارماض سے ہے جس کا معنی جلانا ہے۔ اس سے رمضت قدمہ ہے۔ یہ الرمضاء سے ہے یعنی اس کا پاؤں جل گیا۔ ارمضتنی الرمضاء یعنی گرمی نے مجھے جلا دیا۔ اسی سے کہا جاتا ہے ارمضنی الامر۔ معاملہ نے مجھے جلا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مہینہ میں دل موعظت اور آخرت کے امر میں فکر کی حرارت حاصل کرتے ہیں جس طرح ریت اور پتھر سورج کی گرمی حاصل کرتے ہیں۔ الرمضاء۔ گرم پتھر۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رمضت النصل ارمضہ وارمُضُہ رمضاً سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے دو پتھروں کے درمیان تیر کے بھالے کو کوٹنا تاکہ باریک ہو جائے۔ اسی سے نصل رمیض و مرموض ہے۔ یہ ابن السکیت سے مروی ہے۔ رمضان کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ رمضان میں اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے تھے تاکہ ان کے ساتھ حرمت والے مہینوں کے داخل ہونے سے پہلے شوال میں جنگ کریں۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ اس کا نام زمانہ جاہلیت میں ناتق تھا۔

و فی ناتق اجلَتْ لدی حومة الوغی ودلَّتْ علی الادبار فرسان خثعما

اس شعر میں ناتق رمضان کے مہینہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شَهْرُ پر رفع ابتدا کی بنا پر ہے اور خبر الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ہے یا یہ مبتدا کے اضمار کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: المفروض علیکم صومہ شہر رمضان، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ یا یہ معنی کہ تم پر رمضان کا مہینہ فرض کیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ شَهْرُ مبتدا ہو اور الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ صفت ہو اور خبر فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ہو (1)۔ الشَّهْرَ کا ذکر تعظیماً لوٹایا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَآقَّةُ ۙ مَا الْحَآقَّةُ ۚ (الحاقہ) اور جائز ہے کہ جزا کا معنی اس میں داخل ہو کیونکہ شہر رمضان اگرچہ معرفہ ہے لیکن بعینہ معرفہ نہیں کیونکہ ہر آنے والے مہینہ میں عام ہے۔ یہ ابو علی کا قول ہے۔ مجاہد اور شہر بن حوشب سے شہر کا نصب بھی مروی ہے۔ اس کو ہارون اعور نے حضرت ابو عمرو سے روایت کیا ہے (2)۔ اس کا معنی ہے: الزموا شہر رمضان یا صوموا، اور الذی انزل فیہ القرآن اس کی نعت ہے اور تصوموا کے ساتھ اس کو نصب دینا جائز نہیں تاکہ صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ فاصلہ نہ ہو جائے اور وہ خیر لکم ہے۔ رمانی نے کہا اس پر ایاماً معدودات کے قول سے بدل کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس میں اختلاف ہے کہ کیا شہر کے بغیر رمضان کہا جائے یا نہیں۔ مجاہد نے اس کو ناپسند کیا ہے اس نے کہا: اسی طرح کہا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا (3) شَهْرُ رَمَضَانَ اور حدیث میں ہے: رمضان نہ کہو کیونکہ اس کو منسوب کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے منسوب کیا اور فرمایا شَهْرُ رَمَضَانَ فرماتے تھے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے وہ اس معنی کی وجہ سے اس کے لفظ کی جمع بنانا ناپسند کرتے تھے اور اس روایت سے حجت پکڑتے تھے۔ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ابو معشر نجیح کی حدیث سے ہے اور یہ ضعیف ہے۔ بغیر اضافت کے رمضان کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ صحاح میں ثابت ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان آتا ہے تو رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیطان جکڑے جاتے ہیں۔ البستی کی صحیح میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان ہوتا ہے تو اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں (1)۔ ابن شہاب عن انس بن ابی انس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ فرماتے سنا...... پھر یہ حدیث بیان کی۔ البستی نے کہا: انس بن ابی انس یہ مالک بن انس کا والد ہے۔ ابوانس کا نام مالک بن ابی عامر ہے یہ مدینہ طیبہ کے ثقہ لوگوں سے ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث بن عثمان بن جثیل بن عمرو یمن کے قبائل میں سے ذی اصبح سے تھا۔

نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس رمضان آیا ہے، مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اس میں دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور اس میں سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اس میں اللہ کی ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہو گیا۔ ابوحاتم البستی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا: سرکش شیطانوں کا جو ذکر آیا ہے پہلے جو مطلق احادیث میں ہے کہ شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے اس کے لئے یہ تقیید ہے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری عورت کو فرمایا: اذا کان رمضان فاعتمری فان عمرۃ فیه تعدل حجة۔ جب رمضان آئے تو تو عمرہ کر کیونکہ اس میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے (2)، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کا قیام تمہارے لئے سنت بنایا ہے۔ جو اس کا روزہ رکھے گا اور اس کا قیام کرے گا ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسے جس دن بچے کو ماں جنم دیتی ہے (اور اس پر گناہ نہیں ہوتا) اس کے متعلق آثار کثیر ہیں۔ ان تمام احادیث میں رمضان کے ساتھ شہر کا لفظ نہیں ہے۔ عرب اکثر رمضان سے شہر کا ذکر ساقط کر دیتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

جارية لی درعها الفضفاض ابیض من اخت بنی اباض

جاريةٌ لی رمضان الماضی تقطع الحدیث بالایماض

کھلی قمیص میں لڑکی تھی بنی اباض کی بہن سے سفید تھی۔ گزشتہ رمضان میں لڑکی تھی چمک کی وجہ سے بات کاٹتی تھی۔

رمضان کی فضیلت عظیم ہے اور ثواب بڑا ہے۔ اشتقاق کا معنی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گناہوں کو جلانے والا ہے اور اس کے علاوہ احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں وہ اس کی فضیلت پر دلیل ہیں۔

1۔ صحیح بخاری، باب مول یقال رمضان او شهر رمضان ومن رأی کله واسعا، حدیث نمبر 1766، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی قیام شهر رمضان، حدیث نمبر 1317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے یعنی رمضان کے چاند کی مدت کی وجہ سے اس کو شہر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: فان غمّ علیکم الشهر اگر تم پر چاند ابر آلود ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

اخوان من نجد علی ثقة والشهر مثل قلامة الظفر

حتی تکامل فی استدارته فی اربع زادت علی عشر

نجد سے بھائی پر اعتماد تھے چاند ناخن کے تراشے کی طرح تھا۔ حتیٰ کہ وہ گولائی میں مکمل ہوا چودھویں کی رات کو بڑھا۔

چاند ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دنوں کو مکمل کرنا فرض ہے اور رمضان کے تیس دن مکمل کرنا فرض ہے تاکہ ہم عبادت میں یقین سے داخل ہوں اور یقین سے خارج ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: 44) (اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے جو نازل کیا گیا اس کی طرف)۔

ائمہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند کو دیکھ کر افطار کرو۔ اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تعداد کو مکمل کرو (1)۔ ایک روایت میں ہے، اگر تم پر مہینہ ابر آلود ہو جائے تو تیس دن شمار کرو۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر جو کبار تابعین میں سے تھے اور ابن قتیبہ جو لغت کے علماء میں سے تھے ان دونوں حضرات نے کہا: رمضان کے روزہ میں بادل کے وقت منازل کی تقدیر منازل کے حساب سے حساب لگایا جائے گا حتیٰ کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو دیکھا جاتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تم اس کی منازل سے استدلال کرو (2) اور مہینہ کی تکمیل کا اندازہ اس کے حساب سے لگاؤ۔ جمہور نے کہا: فاقدروا کا معنی ہے: مقدار کو مکمل کرو۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے: فاکملوا العدّة۔ داؤدی نے کہا ہے کہ فاقدروالہ کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ منازل کا اندازہ کرو۔ ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ معنی کیا ہو۔ مگر بعض اصحاب شوافع نجومیوں کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس پر اجماع حجت ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے ''الامام'' میں رویت کیا ہے: چاند کی رؤیت سے نہ روزہ رکھے نہ افطار کرے بلکہ حساب پر روزہ رکھے اور افطار کرے۔ اس قول کی نہ اقتداء کی جاتی ہے نہ اتباع۔ ابن عربی نے کہا: بعض اصحاب شافعی سے لغزش ہوئی ہے انہوں نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے حساب پر اعتماد کیا ہے یہ لغزش ہے۔ اللہ تعالیٰ ٹھوکر سے محفوظ رکھے۔

مسئلہ نمبر 4: امام مالک، امام شافعی کا اختلاف ہے کہ ایک شخص کی شہادت سے رمضان کا چاند ثابت ہوگا یا دو گواہوں سے ثابت ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں ایک شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ چاند پر گواہی ہے اور اس میں دو سے کم افراد کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس کی اصل شوال اور ذی الحجہ کے چاند پر شہادت ہے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ نے کہا: ایک شخص کی خبر قبول کی جائے گی کیونکہ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے (3)، فرمایا: لوگوں

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اذا رأیتم الهلال فصوموا فاذا رأیتموه فافطروا، حدیث نمبر 1776، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1773 3۔ سنن ابی داؤد، باب فی شهادة الواحد علی رؤية هلال رمضان، حدیث 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے چاند دیکھا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ پس آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا: اس میں مروان بن محمد نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان کا چاند دیکھنے کی گواہی دی تو آپ نے روزہ رکھا۔ میرا خیال ہے آپ نے فرمایا: لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا اور حضرت علی نے فرمایا: شعبان کا میں ایک دن روزہ رکھوں۔ یہ میرے نزدیک رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے سے زیادہ محبوب ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر عام لوگوں نے رمضان کا چاند نہ دیکھا ہو اور ایک عادل شخص نے دیکھا ہو تو میرا خیال ہے کہ میں اسے اثر اور احتیاط کی وجہ سے قبول کرلوں گا۔ امام شافعی نے اس کے بعد کہا: رمضان پر شہادت دینے کے لئے بھی دو گواہ ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ہمارے بعض اصحاب نے کہا: میں اس پر دو گواہ ہی قبول کروں گا۔ یہ ہر مغیب پر قیاس ہے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے صرف رمضان کا چاند دیکھا ہو یا صرف شوال کا چاند دیکھا ہو۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے: جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار کرے اور اس کو پوشیدہ رکھے۔ ابن وہب نے مالک سے اس شخص کے بارے روایت کیا ہے جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اس کے لئے افطار کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دن رمضان کے مہینہ سے ہے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار نہ کرے کیونکہ لوگ تہمت لگائیں گے کہ اس نے افطار کیا جو مامون نہیں پھر جب یہ لوگ غالب آجائیں گے تو کہیں گے ہم نے چاند دیکھا۔ ابن منذر نے کہا: یہی قول لیث بن سعد، امام احمد بن حنبل کا ہے۔ عطا اور اسحاق نے کہا: نہ وہ روزہ رکھے اور نہ افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: وہ روزہ رکھے اور افطار کرے۔

مسئلہ نمبر 6: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں چاند نظر آنے کی خبر دے پھر وہ شہر قریب ہوگا یا دور ہوگا اگر وہ شہر قریب ہے تو اس کا حکم ایک ہے اور اگر وہ شہر دور ہے تو ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے۔ یہ عکرمہ، قاسم اور سالم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی طرف بخاری نے اشارہ کیا ہے جہاں اس نے باب باندھا ہے کہ ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے اور دوسرے علماء نے کہا جب لوگوں کے نزدیک ثابت ہو جائے کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تھا تو ان پر اس روزے کی قضا لازم ہے جو انہوں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح لیث بن سعد اور امام شافعی نے کہا: ابن منذر نے کہا: میں یہ نہیں جانتا مگر مزنی اور کوفی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جب کسی شہر والوں نے چاند دیکھ کر تیس دن روزے رکھے ہوں اور دوسرے شہر والوں نے انتیس روزے رکھے ہوں تو جنہوں نے انتیس روزے رکھے ہوں گے وہ ایک دن کی قضاء کریں گے۔ اصحاب شافعی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ کیونکہ شہروں کے مطالع کا مختلف ہونا جائز ہے۔ احناف کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ ایک شہر والوں کی رؤیت سے ثابت ہوا کہ تعداد تیس ہے، پس ان پر ان کا مکمل کرنا واجب تھا اور ان کے مخالف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول سے حجت پکڑتے ہیں

کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (الحدیث) اور یہ ہر قوم کی ان کے شہر میں عادت کے اعتبار کو ثابت کرتی ہے۔ ابو عمرو نے اجماع حکایت کیا ہے کہ دور والے شہروں کی رؤیت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ جیسے اندلس، خراسان سے دور ہے اور فرمایا: ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہے مگر جو بڑا شہر ہو اس کے قطر مسلمانوں کے دوسرے شہروں کے قریب ہوں تو پھر سب کے لئے ایک ہی رویت کافی ہوگی۔ مسلم نے کریب سے روایت کیا ہے کہ حضرت ام فضل بنت حارث نے حضرت امیر معاویہ کی طرف انہیں شام کی طرف بھیجا۔ کریب نے کہا: میں شام میں آیا اور اپنی ضرورت کو پورا کیا مجھ پر وہاں رمضان کا چاند طلوع ہو گیا جبکہ میں ابھی شام میں ہی تھا میں نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا پھر میں مہینہ کے آخر میں مدینہ آیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ ابن عباس نے پوچھا پھر چاند کا ذکر ہوا تو پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا تو نے خود چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں لوگوں نے چاند دیکھا، لوگوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ ہم روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ہم تیس دن مکمل کریں گے یا ہم خود چاند دیکھ لیں گے۔ میں نے کہا: تمہارے لئے حضرت معاویہ کی رویت اور اس کا روزہ کافی نہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: نہیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تصریح ہے۔ یہ حجت ہے کہ شہر جب دور ہوں جیسے شام، حجاز سے دور ہے تو ہر شہر والوں پر اپنی رؤیت پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسروں کی رؤیت کا اعتبار نہیں۔ اگرچہ امام اعظم کے نزدیک ثابت ہو جبکہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور نہ کرے، اگر وہ لوگوں کو مجبور کرے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ الکیا طبری نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول کہ "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔" یہ احتمال ہے کہ اس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صوموا لرؤیتہ وافطروا لرویتہ کی تاویل کی ہو۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس کے اس قول کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اس کو رد کیا کیونکہ یہ خبر واحد تھی۔ بعض نے فرمایا: اس لئے رد کیا کیونکہ مطالع میں قطر مختلف تھے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ قریب نے گواہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے اس حکم کے متعلق بتایا تھا جو شہادت کے ساتھ ثابت تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم ثابت میں خبر واحد بھی جائز ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ اغمات میں چاند کا دیکھنا جمعہ کی رات ثابت ہوا اور اشبیلیہ میں ہفتہ کی رات کو نظر آئے تو ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ سہل ستارہ اغمات میں نظر آتا ہے اور اشبیلیہ میں نظر نہیں آتا یہ اختلاف مطالع کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے "المجموعہ" میں روایت کیا ہے کہ جب اہل بصرہ رمضان کا چاند دیکھیں پھر کوفہ، مدینہ، یمن والوں کو یہ خبر پہنچے تو ان پر روزہ یا قضاء لازم ہے اگر ادا فوت ہو جائے۔ قاضی ابو اسحاق نے ابن ماجشون سے روایت کیا ہے کہ اگر ایک عام امر کے ساتھ بصرہ میں چاند ثابت ہو جائے جو شہادت اور تعدیل سے مستغنی ہو تو دوسرے شہر والوں پر بھی لازم ہوگی۔ اگر چاند کا ثبوت حاکم کے پاس دو آدمیوں کی شہادت سے ہو تو پھر ان شہروں پر روزہ رکھنا لازم ہوگا جو اس حاکم کی ولایت میں ہیں اور اگر چاند امیر المومنین کے پاس

ثابت ہو تو تمام مسلمانوں پر قضا لازم ہے۔ فرمایا: یہ امام مالک کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور لوگوں نے شہر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی ذلکم شھر المفترض علیکم صیامه شھر رمضان۔ یا الصوم شھرٌ یا الایام شھرٌ۔ اس کی تقدیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کتب کا نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یعنی کتب علیکم شھر رمضان۔ اور رمضان غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں نون زائدہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہونا بھی جائز ہے اور اس کی خبر الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی خبر فمن شھد ہے الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اس کی صفت ہے بعض نے فرمایا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ جس نے کہا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ میں الصِّیَامُ سے مراد تین روزے اور عاشورا کا روزہ ہے اس نے مبتدا ہونے کا قول کیا ہے اور جنہوں نے کہا الصِّیَامُ سے مراد رمضان ہے تو انہوں نے ابتدا یا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع کہا ہے یعنی کتب علیکم شھر رمضان(1)۔ مجاہد، اشہر بن حوشب نے شہر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا۔ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کا معنی وان تصوموا شھر رمضان ہے۔ فراء نے کہا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ یعنی ان تصوموا شھر رمضان۔ نحاس نے کہا: شھر رمضان کو تصوموا کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ صلہ میں داخل ہوگا پھر صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کرے گا۔ اسی طرح صیام کے ساتھ نصب دینی بھی جائز نہیں لیکن اغراء کی بنا پر نصب دینا جائز ہے۔ ای الزموا شھر رمضان، و صوموا شھر رمضان۔ یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ شھر کا ذکر پہلے نہیں ہوا تا کہ اس پر اغرا (ابھارنا) کیا جائے میں کہتا ہوں: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ۔ یہ الشھر پر دلالت کرتا ہے پس اغرا جائز ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اخفش نے کہا: ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن اور ابو عمرو سے راء کا راء میں اوغام حکایت کیا ہے یہ جائز نہیں تا کہ دو ساکن جمع نہ ہوں (2) اور را کی حرکت کو ہا پر بدلنا جائز ہے ہا کو ضمہ دیا جائے گا پھر ادغام کیا جائے گا یہ کوفیوں کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 8: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ یہ نص ہے کہ قرآن رمضان میں نازل ہوا۔ اور الله تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کو بیان کرتا ہے: حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ (دخان) حٰمٓ حق کو واضح کرنے والی کتاب کی قسم ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ (القدر) ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں۔ یہ دلیل ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کسی اور مہینہ میں نہیں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن لوح محفوظ سے لیلۃ القدر میں اکٹھا نازل ہوا۔ پھر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں رکھا گیا۔ پھر جبریل اوامر، نواہی اور اسباب کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارتے رہے۔ یہ بیس سال میں اترا (3)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن لوح محفوظ سے یکبارگی آسمان دنیا میں فرشتوں کی طرف اتارا گیا پھر جبریل اسے مختلف اوقات میں اکیس سال میں اتارتے رہے۔ مقاتل نے شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ کے بارے میں فرمایا: لوح محفوظ سے ہر سال لیلۃ القدر میں آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا پھر بیس مہینوں میں ملائکہ کی طرف اتارا گیا۔ جبریل بیس سال میں اس کو لے کر آیا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: مقاتل کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے قرآن اکٹھا نازل ہوا تھا۔ واللہ اعلم

حضرت واثلہ بن اسقع نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو نازل کئے گئے تھے تورات چھ رمضان کو، انجیل تیرہ رمضان کو اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ (1)

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں حسن کے قول کی دلیل ہے کہ لیلۃ القدر چوبیس رمضان کو ہوتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلْقُرْاٰنُ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اسم ہے اور یہ بمعنی المقروء (پڑھا گیا) ہے جیسے مشروب کو شراب کہا جاتا ہے، المکتوب کو کتاب کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ قرء یقرء قراءۃ و قرانًا کا مصدر ہے قراءت اور قرآن کا معنی ایک ہے۔ شاعر نے کہا:

ضحوا باشمط عنوان السجود به یقطع اللیل تسبیحاً و قرآنا

اس شعر میں قرآنا بمعنی قراءت ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سمندر میں شیطان بندھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو باندھا ہے قریب ہے وہ نکلیں اور لوگوں پر قراءت کریں، قرآن حکیم میں ہے: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء) یعنی فجر کی قراءت مقروٗ کو قراءۃ کہا جاتا ہے۔ مفعول کو مصدر کا نام دینا عربوں کی عادت ہے جس طرح وہ معلوم کو علم، مضروب کو ضرب اور مشروب کو شرب کا نام دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر اس میں استعمال مشہور ہوا اور اس کے ساتھ عرف شرعی متصل ہو گیا۔ پس قرآن اللہ کے کلام کا اسم بن گیا حتیٰ کہ جب کہا گیا القرآن غیر مخلوق تو اس سے مراد المقروٗ لیا گیا ہے نہ کہ اس کی قراءت اور وہ مصحف جس میں اللہ کا کلام لکھا جاتا ہے اس کو قرآن کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر نہ کرو۔ یہاں قرآن سے مراد مصحف ہے۔ یہ قرأت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کا علم ہے۔ یہ غیر مشتق ہے جیسے تورات اور انجیل یہ امام شافعی سے حکایت کیا اور صحیح یہ ہے کہ تمام میں اشتقاق ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ، هُدًى قرآن سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی لوگوں کے لئے ہدایت دینے والا ہے وَ بَيِّنٰتٍ، هُدًى پر معطوف ہے۔ الهدی کا مطلب الارشاد اور البیان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے بیان اور ارشاد ہے، اس سے مراد پورا قرآن ہے۔ محکم، متشابہ، ناسخ و منسوخ ذکر اور تخصیص سے شرف بخشا البینات سے مراد حلال، حرام، مواعظ اور احکام ہیں۔ بینات، بینہ کی جمع ہے یہ بان الشیء یبین سے مشتق ہے کسی چیز کا واضح ہونا۔ الْفُرْقَانِ جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ لام کی جزم کے ساتھ عام قراء کی قراءت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ حسن اور اعرج نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) یہ لام امر ہے اور اس کا حق کسرہ ہے جب علیحدہ ہو جب یہ کسی چیز کے ساتھ ملایا گیا ہو تو اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں: جزم اور کسرہ۔ اور تین حروف کے ساتھ یہ ملایا جاتا ہے۔ فاء جیسے ارشاد ہے: فلیصمہ، فلیعبدوا اور جیسے ولیوفوا اور ثم، جیسے: ثم لیقضوا۔ شَهِدَ کا معنی حضر ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی من شھد منکم المصر فی الشھر عاقلاً بالغاً صحیحاً مقیماً فلیصمہ۔ جو تم میں سے رمضان کے مہینہ میں شہر میں موجود ہو جبکہ وہ عاقل، بالغ، صحیح، مقیم ہو تو وہ روزے رکھے۔ کہا جاتا ہے: یہ عام ہے اس کی تخصیص اس قول سے ہے فمن کان منکم مریضاً او علی سفر، الشَّهْرَ مفعول بہ نہیں بلکہ ظرف زمان ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت سوید بن غفلہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اور ابومجلز لاحق بن حمید اور عبیدہ السلمانی نے کہا: جو رمضان کے مہینہ کے آغاز میں اپنے شہر میں اور اپنے گھر والوں میں موجود ہو اسے اپنے روزوں کو مکمل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ سفر کرے یا مقیم ہو اور سفر میں افطار کرے جس پر رمضان داخل ہو جبکہ وہ سفر میں ہو۔ ان علماء کے نزدیک معنی یہ ہے کہ جس نے رمضان کو سفر کی حالت میں پایا وہ افطار کرے اور اس پر دوسرے دنوں سے تعداد پوری کرنا لازم ہے اور مقیم حالت قیام میں رمضان کو پائے تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ جمہور امت نے کہا: جو رمضان کے مہینہ میں آغاز اور آخر میں مقیم ہو جب تک وہ مقیم رہے تو روزہ رکھے۔ اگر سفر کرے تو افطار کرے(2)۔ یہ قول صحیح ہے۔ اس پر اخبار ثابتہ دلالت کرتی ہیں۔ امام بخاری نے پہلے کا رد کرتے ہوئے یہ باب باندھا۔ باب اذا صام ایاماً من رمضان ثم سافر۔ امام بخاری نے اس باب کے تحت اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں مکہ کی طرف نکلے آپ نے روزہ رکھا حتیٰ کہ آپ کدید کے مقام پر پہنچے تو روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ پس لوگوں نے بھی روزہ رکھنا چھوڑ دیا حضرت ابوعبیداللہ نے کہا الکدید، عسفان اور قدید کے درمیان ہے(3)۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کے قول کو سفر مندوب پر محمول کیا جائے جیسے فضلاء اور صالحین کا بھائیوں کی زیارت کرنے کے لئے سفر کرنا یا سفر مباح پر محمول ہو جیسے کفایت پر زائد رزق کی طلب کے لئے سفر کرنا۔ رہا ضروری خوراک کے لئے واجب سفر کرنا یا کسی شہر کو فتح کرنے کے لئے سفر کرنا جبکہ اس کی فتح یقینی ہو۔ یا دشمن کو دور کرنے کا سفر ہو تو اس صورت میں اسے اختیار ہے اسے روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ قوت کے لئے اس میں افطار افضل ہے اگرچہ وہ رمضان کے مہینہ میں اپنے شہر میں موجود بھی ہو اور اس میں بعض روزے رکھ بھی لئے ہوں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث ہے، اس میں ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: مکلف ہونے کی شرط کے ساتھ جو رمضان کے مہینہ میں موجود ہو مجنون اور بیہوش بھی نہ ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے اور جس پر رمضان آئے جبکہ وہ مجنون ہو اور اس کا جنون پورا مہینہ طاری رہے تو اس پر قضا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب اذا صام ایاما من رمضان ثم سافر، حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں ہے کیونکہ اس نے رمضان کے مہینہ کو اس صفت پر نہیں پایا جس کے ساتھ روزے واجب ہوتے ہیں اور جس کو مہینہ کی ابتدا میں اور آخر میں جنون لاحق ہو تو وہ جنون کے دنوں کی قضا کرے۔ اس تاویل پر شھر کو نصب شھِدَ کے مفعول بہ کی حیثیت سے صریح ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 12: یہ ثابت شدہ امر ہے کہ روزے کی فرضیت اسلام، بلوغ اور رمضان کے مہینہ کے علم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب فجر سے پہلے کوئی کافر مسلمان ہو یا بچہ بالغ ہو تو ان پر اس دن کا روزہ لازم ہوگا اور اگر فجر کے بعد بالغ ہو یا مسلمان ہو تو دونوں کے لئے کھانے پینے وغیرہ سے رکا رہنا مستحب ہے اور ان پر رمضان کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی جس میں بچہ بالغ ہوا اور کافر مسلمان ہو، قضا لازم نہیں ہے اور علماء کا اس کافر کے بارے میں اختلاف ہے جو رمضان کے آخری دن میں مسلمان ہو گیا اس پر سارے رمضان کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ کیا اس پر اس دن کی قضا لازم ہے جس میں وہ مسلمان ہوا؟ امام مالک اور جمہور علماء نے کہا: اس پر گزشتہ دنوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے اسلام کے وقت رمضان کا مہینہ پایا۔ امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک اس دن کی قضا کرنا محبوب ہے جس دن وہ مسلمان ہوا۔ عطا اور حسن نے کہا: وہ باقی دنوں کے روزے رکھے اور گزشتہ دنوں کی قضا کرے۔

عبد الملک بن ماجشون نے کہا: اس دن کھانے سے رکا رہے اور اس کی قضا کرے۔ امام احمد اور اسحاق نے اس کی مثل کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر مہینہ کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی قضا لازم نہیں ہے۔ الباجی نے کہا: ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کفار شرائع الاسلام کے مخاطب ہیں...... یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول کا مقتضا ہے...... انہوں نے اس پر بقیہ دن کھانے پینے سے رکا رہنے کو واجب کہا ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے ''المدونہ'' میں اس کو روایت کیا ہے یہی شیخ ابو القاسم کا قول ہے اور ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کہ کفار مخاطب نہیں ہیں، انہوں نے کہا: بقیہ دن رکا رہنا لازم نہیں ہے۔ یہ اشہب، عبد الملک بن ماجشون کے قول کا مقتضا ہے۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اس میں صرف مومنین کو خطاب فرمایا کسی اور کو خطاب نہیں فرمایا یہ واضح ہے پس بقیہ دن اس پر رکا رہنا واجب نہیں اور گزشتہ دنوں کی قضا بھی نہیں۔ پہلے وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ کے تحت کلام گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ، اَلْیُسْرَ یہ جماعت کی قرأت ہے الیُسُر (سین کے ضمہ کے ساتھ) یہ دونوں لغتیں ہیں اسی طرح العسر میں دونوں لغتیں ہیں (2)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا(3): الیسر سے مراد سفر میں افطار اور العسر سے مراد سفر میں روزہ ہے۔ لفظ کا عموم تمام امور دینیہ کو شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے دین اللہ یسر (اللہ کا دین) آسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یسروا ولا تعسروا۔ آسانی کرو، تنگی نہ کرو۔ الیسر، سہولت سے ہے اور اسی سے غناء کے لئے یسار

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا

استعمال ہوتا ہے، بائیں ہاتھ کو الید الیسریٰ کہا جاتا ہے یا تو فال پکڑنے کے لئے یا اس لئے کہ دائیں ہاتھ کی یہ معاونت کرتا ہے تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ کا معنی یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ ہے۔ تاکید کے لئے تکرار فرمایا۔

مسئلہ نمبر 14: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قدیم، ازلی ذات پر زائد ارادہ کے ساتھ ارادہ فرمانے والا ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے جس طرح وہ علم کے ساتھ عالم ہے، اپنی قدرت کے ساتھ قادر ہے، حیات کے ساتھ زندہ ہے، سمع کے ساتھ سمیع ہے، بصر کے ساتھ بصیر ہے، کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ یہ تمام معانی موجود، ازلی ذات پر زائد ہیں۔

فلاسفہ اور شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زائغین کے قول اور معطلین کے ابطال سے بلند و بالا ہے اور جو بات ان اہل تعطیل کی جڑ کاٹتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے صاحب ارادہ ہونے کی تصدیق نہ کی جائے تو صادق آئے گا کہ وہ صاحب ارادہ نہیں ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو ہر وہ ذات جو صاحب ارادہ نہ ہو وہ اس کی نسبت ناقص ہوگی جو صاحب ارادہ ہوگی۔ بے شک جس کی صفات ارادہ یہ ہوں اس کے لئے جائز ہوتا ہے کہ کسی شے کو خاص کرے اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہوتا ہے کہ اسے خاص نہ کرے۔ پس عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ ارادہ کمال ہوتا ہے نہ کہ نقص حتیٰ کہ اگر وہم کے ساتھ اندازہ کیا گیا ہو اور اس سے یہ امر سلب کیا گیا ہو تو اس کا پہلا حال دوسرے حال کی نسبت اکمل ہوگا۔ پس یہی باقی رہ جائے گا کہ جو ارادہ سے متصف نہیں وہ ناقص ہے اس ۔ ے جو ارادہ سے متصف ہے اور اس میں جو محال ہے وہ مخفی نہیں، یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخلوق خالق سے اکمل ہو اور خالق اس سے کم مرتبہ ہو؟ بداہت اس کا رد اور ابطال کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنا وصف بیان کیا ہے کہ وہ مرید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ (البروج) کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ ارادہ فرماتا ہے اللہ تم سے آسانی کا اور نہیں ارادہ فرماتا تم سے تنگی کا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ (النساء: 28) اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے تم سے تخفیف کرنے کا اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (یٰس: 82) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو: ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے پھر یہ عالم حکمت، پختگی، انتظام اور احکام پر مبنی ہے، اس کے باوجود اس کا ہونا اور اس کا نہ ہونا جائز ہے اور وہ ذات جس نے وجود کے ساتھ اس کو خاص کیا اس کے لئے اس کا ارادہ کرنے والا ہونا، اس پر قادر ہونا اور اس کا عالم ہونا واجب ہے اگر وہ عالم، قادر نہ ہو تو اس سے کسی شے کا صدور صحیح نہیں اور جو عالم نہ ہو اگرچہ قادر ہو اس سے حکمت و اتقان پر اشیاء کا صدور ممکن نہیں اور جو مرید نہ ہو بعض جائزات کی بعض احوال اور اوقات کے ساتھ تخصیص اولیٰ نہ ہو۔ کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ایک نسبت ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جو اس کا قادر، مرید ہونا ثابت ہوا تو اس کا زندہ ہونا بھی ثابت ہوا کیونکہ زندہ ہونا ان صفات کی شرط ہے۔ زندہ ہونے سے لازم آتا ہے کہ وہ سمیع، بصیر اور متکلم بھی ہو اگر اس کے لئے یہ صفات ثابت نہ ہوں تو لامحالہ ان صفات کی اضداد سے متصف ہوگا جیسے اندھا، بہرہ اور گونگا ہونا جیسا کہ اس عالم شہادت میں معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے ان تمام صفات سے جو اس کی ذات میں نقص کا موجب ہوں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ اس میں دو تاویلیں ہیں: (1) جس نے سفر یا مرض میں

روزے چھوڑے ان کی تعداد پوری کرنا (۲) چاند کی تعداد پوری کرنا خواہ وہ انتیس دنوں کا ہو یا تیس دنوں کا ہو۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے اس میں اس شخص کی تاویل کا رد ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد شھرا عید لا ینقصان رمضان و ذوالحجۃ(1) کی تاویل کی کہ تیس دنوں سے یہ دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور جمہور علماء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ دو مہینے اجر اور خطاؤں کی تکفیر میں کم نہیں ہوتے خواہ یہ انتیس دنوں کے ہوں یا تیس دنوں کے ہوں۔

مسئلہ نمبر 16: تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آئے تو وہ شوال کا نہیں ہوگا بلکہ وہ آئندہ رات کا ہوگا یہ صحیح قول ہے۔ حضرت عمر سے اس مسئلہ کو روایت کرنے والے مختلف ہیں، دارقطنی نے شقیق سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا جبکہ ہم خانقین میں تھے۔ حضرت عمر نے اپنے خط میں فرمایا: چاند بعض، بعض سے بڑے ہوتے ہیں۔ جب تم دن کے وقت چاند کو دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ دو گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا۔

ابو عمر نے عبد الرزاق عن معمر عن الاعمش عن ابی وائل کی سند سے روایت کیا ہے، ابو وائل نے کہا: حضرت عمر نے ہماری طرف لکھا...... آگے سابقہ کلام ذکر کیا۔ حضرت ابو عمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے جو عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے۔ یہی قول حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا ہے اور یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن، لیث اور اوزاعی کا ہے اور یہی قول امام احمد اور اسحاق کا ہے۔ سفیان ثوری اور امام ابو یوسف نے کہا: اگر زوال کے بعد چاند دیکھا گیا تو وہ آئندہ رات کا ہوگا اگر زوال سے پہلے چاند دیکھا گیا تو وہ گزشتہ رات کا ہوگا۔ حضرت عمر سے اس کی مثل قول مروی ہے۔ عبد الرزاق نے ثوری سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے شباک سے انہوں نے ابراہیم سے یہ روایت ذکر کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ جب تم دن کے وقت سورج کے زوال سے پہلے چاند کو دیکھو تو تیس دن مکمل ہونے کی وجہ سے تم افطار کر دو اور جب تم سورج کے زوال کے بعد چاند دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ شام ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسناد کی جہت سے اس مسئلہ میں کوئی چیز صحیح مروی نہیں ہے۔ سلیمان بن ربیعہ سے ثوری کے قول کی مثل مروی ہے۔ عبد الملک بن حبیب کا بھی یہی خیال ہے وہ قرطبہ میں اسی کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سے اس مسئلہ میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عمر سے جو حدیث مروی ہے جس کے مطابق امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ کا قول ہے وہ متصل ہے اور وہ حدیث جو ثوری کے مذہب کے مطابق مروی ہے وہ منقطع ہے۔ پس متصل کی طرف رجوع کرنا اولیٰ ہے۔ جن علماء نے ثوری کا مذہب اختیار کیا انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے مگر حضرت اعمش کی حدیث مجمل ہے اس میں زوال سے پہلے اور بعد کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور حضرت ابراہیم کی حدیث مفسر ہے پس اس کے ساتھ قول کرنا اولیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں: جو حضرت عمر سے متصلاً موقوفاً مروی ہے اسی معنی میں مرفوع بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو

1۔ صحیح بخاری، باب شھرا عید لا ینقصان، حدیث نمبر 1779، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تیس رمضان کی صبح روزے سے تھے آپ نے دن کے وقت شوال کا چاند دیکھا تو افطار نہ کیا حتیٰ کہ شام ہوگئی اس کو واقدی کی حدیث سے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: واقدی نے کہا: ہمیں معاذ بن محمد انصاری نے بیان کیا، فرمایا: میں نے زہری سے شوال کے چاند کے مطابق پوچھا جب وہ جلدی دیکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر شوال کا چاند فجر کے طلوع ہونے سے لے کر عصر تک یا سورج کے غروب ہونے کے درمیان تک دیکھا جائے تو وہ آنے والی رات کا ہوگا۔ ابوعبداللہ نے کہا اس پر اجماع ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 17: دارقطنی نے حضرت ربعی بن خراش سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگوں کا رمضان کے آخری دن کے بارے میں اختلاف ہوا۔ دو دیہاتی آئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس گزشتہ شام چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روزہ افطار کرنے کا حکم دیا اور صبح عیدگاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے کہا: یہ اسناد حسن سے ثابت ہے۔ ابوعمر نے کہا: امام مالک اور اصحاب مالک سے کوئی اختلاف مروی نہیں (2)۔ عید کی نماز عید کے علاوہ کسی دن نہیں پڑھی جائے گی اور نہ عید کے دن زوال کے بعد پڑھی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ سے یہی قول حکایت کیا گیا ہے۔ امام شافعی کا قول اس مسئلہ میں مختلف ہے کبھی امام مالک کے قول کے مطابق فرمایا اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: جب عید کے دن زوال کے بعد عید کی نماز پڑھنی جائز نہیں تو دوسرا دن عید کے وقت سے زوال سے بھی زیادہ دور ہے اس لئے دوسرے دن بدرجہ اولیٰ نہیں پڑھی جائے گی اور امام شافعی سے دوسری روایت مروی ہے کہ دوسرے دن چاشت کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی۔ بویطی نے کہا: عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی مگر جب اس کے بارے میں کوئی حدیث ثابت ہو۔ ابوعمر نے کہا: اگر نماز عید وقت کے بعد ادا کی جائے گی تو یہ فرائض کے مشابہ ہو جائے گی اور علماء کا سنن کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کی قضا نہیں کی جاتی۔ اور یہ نماز عید سنن کی مثل ہے۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: دوسرے دن وہ نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے ''الاملاء'' میں اسی طرح فرمایا۔ حسن بن صالح بن حی نے فرمایا: عید الفطر میں نہیں نکلیں گے، عید الاضحیٰ میں (دوسرے دن) نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں امام تیسرے دن نماز عید پڑھائے گا (اگر پہلے دو دنوں میں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے ہوں) ابوعمر نے کہا: اضحیٰ ایام عید ہیں اور یہ نماز عید ہے۔ اور فطر کی عید صرف ایک دن ہے جب پہلے دن عید الفطر نہیں پڑھی ہوگی تو دوسرے دن قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ فرض نہیں ہے کہ اسے قضا کیا جائے۔ لیث بن سعد نے کہا: دوسرے دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ پڑھی جائے گی۔ (اگر وہ پہلے دن نہیں پڑھ سکے ہوں گے)

میں کہتا ہوں: ان شاء اللہ دوسرے دن پڑھنے کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کے متعلق سنت ثابت ہے اور شارع علیہ السلام سنن میں سے جس کو چاہیں مستثنیٰ کردیں اور اس کے وقت کے نکلنے کے بعد اس کی قضا کا حکم دے دیں، اس میں کوئی مانع نہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں

1۔ سنن دارقطنی، جلد 2، صفحہ 173
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 169

(سنتیں) ادا نہیں کیں وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے (1)۔ ابو محمد نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: بعض اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے اور اس کے مطابق سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور حضرت ابن المبارک کا قول ہے اور حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: جس پر وقت تنگ ہو اور وہ صبح کی نماز (فرض) پڑھ لے اور فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) چھوڑ دے تو وہ اگر چاہے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت ادا نہ کرے پھر جب ہم نے کہا کہ وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھے تو کیا وہ یہ قضا پڑھے گا یا ان دو رکعتوں کا ثواب، فجر کی سنتوں کے ثواب کے قائم مقام ہو جائے؟ شیخ ابو بکر نے کہا: یہ اصل مذہب پر جاری ہے اور قضا کا ذکر مجازاً ہے۔

میں کہتا ہوں: کوئی بعید نہیں کہ دوسرے دن نماز عید الفطر کا حکم اسی اصل پر ہو خصوصاً جبکہ یہ نماز سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے نیز سنت سے بھی ثابت ہے۔ نسائی نے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے عمرو بن علی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں شعبۃ نے بتایا فرمایا: مجھے ابو بشر نے بتایا انہوں نے ابو عمیر بن انس سے روایت کیا، انہوں نے اپنے چچوں سے روایت کیا کہ ایک قوم نے چاند دیکھا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سورج بلند ہونے کے بعد افطار کرنے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ دوسرے دن عید کے لئے نکلیں ایک روایت میں ہے، وہ عید گاہ کی طرف دوسرے دن نکلیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18: ابو بکر نے عاصم سے اور ابو عمرو نے (بعض روایات میں جو ان سے مروی ہیں (2)) اور قتادہ، حسن اور اعرج نے وَ لِتُكَمِّلُوا الْعِدَّةَ پڑھا ہے یعنی میم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے تخفیف کو پسند کیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ: 3) نحاس نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہم معنیٰ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (طارق) (اس میں **مهّل** اور **امهلهم** دونوں لغتیں ہم معنی ہیں) اور و لتکملوا کو لام کے سکون کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں اور اس کے اور اس سے پہلے والے لام میں فرق پہلے گزر چکا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و یرید لان تکملوا اور ان اور کسرہ کا حذف کرنا جائز نہیں۔ یہ بصریوں کا قول ہے اسی طرح کثیر ابو صخر کا قول ہے: ارید لانسی ذکرھا میں اس کا ذکر بھولنا چاہتا ہوں۔

یہ اصل میں لان انسی ہے۔ یہ لام مفعول پر داخل ہوتا ہے جیسے تیرے اس قول میں ہے ضربت لزید۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تعداد کے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے العدۃ رخص لکم ھذہ الرخصۃ۔ یہ کوفیوں کا قول ہے نحاس نے یہ قول فراء سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حسن قول ہے۔ **و کذالك نری ابراهیم ملكوت السموات والارض و لیكون من الموقنین**، ای و لیکون من الموقنین فعلنا ذالك۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب الاذان، باب ما جاء فی اعادتهما، حدیث نمبر 388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب الخروج الی العیدین من الغد، حدیث نمبر 977، ضیاء القرآن 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: یہ واؤ مقحمہ ہے، بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ لام، لام امر ہو اور واؤ عاطفہ ہو جملہ کلام کا جملہ کلام پر عطف ہو(1)۔ ابو اسحٰق براہیم ابن السری نے کہا: یہ معنی پر محمول ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فعل اللہ ذالك یسھّل علیکم ولتکملوا العدۃ۔ ابو اسحاق نے کہا: سیبو یہ نے اس کی مثل یہ شعر کہے ہیں:

بادت غیر آیھن مع البلیٰ	الا رواکد جمرھن ھباء
ومشجج اما سواء قذاله	فبدا و غیب سارہ المعزاء

اس کا معنی ہے: بادت الا رواکد بھا رواکد۔ گویا یوں فرمایا: و بھا مشجج او ثم مشجج۔ یعنی شہر ہلاک ہو گئے بوسیدگی کے ساتھ ان کے نشان تبدیل ہو گئے سوائے چولہوں کے نشانات کے، ان کے انگارے غبار ہیں پھر خیموں کے کیل ان کا درمیان برابر ہے۔ پس وہ ظاہر ہوا اور پتھریلی زمین نے اس کا چلنا غائب کر دیا۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ۔ اس کا وَلِتُكْمِلُوا پر عطف ہے اس کا مطلب جمہور علماء کے قول کے مطابق رمضان کے آخر میں تکبیر پر برانگیختہ کرنا ہے اس کی حد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا سعید بن مسیب، عروہ، ابو سلمہ سے مروی ہے کہ یہ لوگ عید الفطر کی رات تکبیریں کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اور فرمایا: یہ لیلۃ النحر (قربانی والی رات) کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: مسلمانوں پر حق ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیریں کہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ انسان چاند دیکھنے سے لے کر خطبہ کے ختم ہونے تک تکبیریں کہے اور امام کے ظاہر ہونے کے وقت رک جائے اور اس کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہے۔ ایک قوم نے کہا: چاند دیکھنے سے لے کر امام کے نماز کے لئے ظاہر ہونے تک تکبیریں کہے۔ سفیان نے کہا: یہ فطر والے دن کی تکبیر ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: لوگ جب عید گاہ کی طرف نکلتے تو تکبیریں کہتے جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو عید ختم ہو جاتی ہے(2)۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ تکبیریں گھر سے نکلنے سے لے کر امام کے نکلنے تک ہیں۔ ابن قاسم اور علی بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ اگر سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکلے تو راستہ میں تکبیریں نہ کہے اور بیٹھے ہوئے تکبیر کہے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے اگر سورج طلوع ہونے کے بعد گھر سے جائے تو راستہ میں عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہے اور جب بیٹھ جائے تب بھی تکبیریں پڑھتا رہے حتیٰ کہ امام نقل کرے۔ امام مالک کے نزدیک اس مسئلہ میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ برابر ہیں۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں تکبیریں کہے اور عید الفطر میں تکبیریں نہ کہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ کیونکہ یہ عید کا دن ہے اور سال میں اس کا تکرار نہیں ہوتا۔ پس اس کی طرف نکلنے میں تکبیر سنت ہے جس طرح عید الاضحیٰ میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے۔ دارقطنی نے ابو عبد الرحمٰن سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ عید الفطر میں تکبیریں، عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ شدت سے کہتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن اپنے گھر سے نکلنے کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا	2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وقت تکبیر کہتے حتیٰ کہ عید گاہ پہنچ جاتے اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ جب وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی طرف جاتے تو بلند آواز سے تکبیریں کہتے حتیٰ کہ عید گاہ میں پہنچ جاتے۔ پھر آپ تکبیر کہتے رہتے حتیٰ کہ امام آجاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے اکثر اہل علم عید الفطر میں تکبیریں کہنے کا نظریہ رکھتے تھے۔ یہ ابن منذر نے نقل کیا ہے، فرمایا: یہ امام اوزاعی نے الیاس سے ذکر کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے: جب کسی کو شوال کا چاند نظر آجائے تو میں پسند کرتا ہوں کہ لوگ اکٹھی اور علیحدہ علیحدہ تکبیریں کہیں۔ وہ متواتر تکبیریں کہتے رہیں اور تکبیروں کو ظاہر کریں حتیٰ کہ جنازہ گاہ کو چلے جائیں اور جب امام نکل آئے تو تکبیریں کہنا بند کردیں۔ اسی طرح جس نے حج نہیں کیا اس کے لئے تکبیریں کہنا پسند ہے۔ عیدوں کی نماز کا حکم اور ان میں تکبیر کا حکم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ (اعلیٰ) اور سورہ الکوثر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 20: امام مالک اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک تکبیر کے الفاظ یہ ہیں: الله اکبر، الله اکبر، الله اکبر تین مرتبہ کہے۔ حضرت جابر بن عبد الله سے مروی ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: تکبیروں کے درمیان میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سبحان الله بھی کہے۔ بعض فرماتے ہیں: یہ الفاظ کہے: الله اکبر کبیراً، الحمد لله کثیراً و سبحان الله بکرۃ واصیلاً۔ حضرت ابن مبارک جب عید الفطر کے لئے نکلتے تھے تو یہ کہتے تھے: الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر ولله الحمد الله اکبر علی ما ھدانا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک نے اس کی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ امام احمد نے فرمایا: اس میں وسعت ہے۔ ابن عربی نے فرمایا: ہمارے علماء نے مطلق تکبیر کو اختیار کیا یہی ظاہر قرآن ہے اور میرا میلان بھی اسی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 21: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اپنے روزے میں تبدیلی کر کے نصاریٰ اس میں بھٹک گئے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء پر فخر کرتے تھے اور اپنے حسب ظاہر کرتے تھے اور اپنے مناقب شمار کرتے تھے اس کے بدلے میں جو ہدایت دی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے تمہاری شرائع کی طرف جو رہنمائی فرمائی ہے اس پر تم اس کی عظمت بیان کرو۔ یہ عام ہے(1) اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶

''اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے پس انہیں چاہیے کہ میرے حکم مانیں اور ایمان لائیں مجھ پر تاکہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا سَاَلَكَ اس کا معنی ہے جب یہ آپ سے معبود کے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتاؤ کہ وہ قریب ہے وہ اطاعت پر ثواب دیتا ہے اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے اور بندہ جو صوم وصلاۃ میں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

سے کرتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ مقاتل نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کیے تو اس پر بہت شرمندہ ہوئے اور رونے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صورت حال عرض کی اور پریشان ہو کر واپس آئے اور رخصت کے نزول سے پہلے یہ مسئلہ تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔

مسئلہ نمبر 2: بعض علماء نے فرمایا: جب ابتدا میں سونے کے بعد کھانا ترک کرنا واجب ہوا تو بعض نے سونے کے بعد کھانا کھا لیا پھر پریشان ہوا تو توبہ کی قبولیت میں یہ آیت نازل ہوئی اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ کلبی نے ابو صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہود نے کہا ہمارا رب ہماری دعا کیسے سنتا ہے جبکہ تمہارا خیال ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور پھر ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے کہ ہم اسے پکاریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عطا اور قتادہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تو ایک قوم نے کہا ہم کس وقت اسی سے دعا مانگیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ یعنی جو میری عبادت کرتا ہے میں اس کی عبادت قبول کرتا ہوں۔ دعا بمعنی عبادت ہے، اجابت کا معنی قبول کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے حضرت نعمان بن بشیر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: دعا عبادت ہے تمہارے رب نے فرمایا: تم میری عبادت کرو میں تمہاری عبادت قبول کروں گا۔ دعا کو عبادت کہا جاتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝ (غافر) (جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔)

اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم دیا اور اس پر ابھارا اور اس کو عبادت فرمایا اور دعا مانگنے والوں کی دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میری امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو کسی کو عطا نہیں کی گئیں سوائے انبیاء کرام کے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا: تو مجھ سے دعا کر میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس امت کو بھی یہی فرمایا: ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جب بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور اس امت کو بھی فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر گواہ بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ خالد الربعی فرماتے تھے اس امت کے لئے ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں میں تعجب کرتا ہوں۔ خود ہی اللہ نے انہیں دعا کا حکم فرمایا اور خود ہی قبولیت کا وعدہ فرمایا اور ان کے درمیان کوئی شرط نہیں ہے۔ کسی

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کہنے والے نے ان سے کہا اس کی مثل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ:25) یہ شرط ہے اور وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (یونس:2) میں عمل کی شرط نہیں ہے۔ اور فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (غافر:14) یہاں شرط ہے اور ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں شرط نہیں ہے۔ پہلی امتیں اپنی ضروریات میں اپنے انبیاء کی بارگاہ میں پناہ لیتی تھیں حتیٰ کہ ان کے انبیاء ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ بہت سے دعا کرنے والے دعا مانگتے ہیں لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اجیب اور استجب ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو مطلقاً قبول کرنے کا تقاضا نہیں کرتا اور ہر مطلوب کو عطا کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (اعراف) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو) ہر وہ شخص جو جانتے ہوئے گناہ کبیرہ پر مصر ہے یا جہالت کی وجہ سے گناہ کبیرہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پس اس کی دعا کیسے قبول کرے گا اور حد سے تجاوز کرنے کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں آئے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اگر میں چاہوں گا تو قبول کروں گا جیسے ارشاد فرمایا: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام:41) (تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لئے اگر چاہے) پس یہ مطلق و مقید کے باب سے ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں مانگیں اور دو آپ کو عطا کی گئیں اور ایک سے روکا گیا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ انعام میں آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان اخبار کا مقصود تمام مومنین کی تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ فی الجملہ دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے، وہ اپنے بندے کے قریب ہے، اس کی دعا کو سنتا ہے اور اس کے اضطرار کو جانتا ہے اور جو چاہتا ہے قبول فرماتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ (احقاف:5) (اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کرسکتا۔)

مالک اپنے غلام کی بات کبھی قبول کرتا ہے، والد اپنے بیٹے کی بات کبھی قبول کرتا ہے پھر اس کا سوال اسے عطا نہیں کرتا۔ پس دعا کے پائے جانے کے وقت قبولیت لامحالہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُجیبُ اور استجب خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوتی ورنہ مخبر جھوٹا ہو جائے گا۔ اس تاویل پر حضرت عبداللہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے لئے دعا میں (دروازہ) کھولا گیا اس کے لئے قبولیت کے دروازے کھولے گئے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تم میرے بندوں میں سے ظالموں کو کہو مجھ سے مت مانگو کیونکہ میں نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں گا جو مجھ سے دعا مانگے گا اور میں جب ظالموں کی دعا قبول کروں گا تو میں ان پر لعنت کروں گا...... ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول فرماتا ہے یا تو اس کی قبولیت دنیا میں ظاہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی، حدیث نمبر 3471، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرماتا ہے یا اس دعا کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یا آخرت میں اس کے لئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان دعا مانگتا ہے جب کہ اس میں گناہ اور قطع رحمی کا سوال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا فرماتا ہے یا تو جلدی اس کی دعا کو (قبول فرما کر) پورا کر دیتا ہے یا اس کے لئے اسے ذخیرہ فرما دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: پھر تو ہم زیادہ دعا کریں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ قبول کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے اور موطا میں یہ منقطع ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) کی تفسیر میں نقل کی جاتی ہے۔ یہ سب اجابت (قبولیت) پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بندہ دعا کرتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اگر جو دنیا میں اپنے لئے رزق کی دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کیا جاتا ہے اگر اسے دنیا میں نہیں دیا جاتا تو اس کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو سعید کی حدیث اگر چہ تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبولیت کی دلیل ہے لیکن گزر چکا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے سے اجتناب کرنے والا ہو جو قبولیت سے مانع ہے۔ ارشاد فرمایا: جب وہ گناہ یا قطع رحمی کا سوال نہ کرے۔ اور مسلم میں یہ زائد ہے کہ جب وہ جلدی نہ کرے۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے نبی کریم ﷺ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا بندہ کہے میں نے دعا کی اور میں نے دعا کی میں نے نہیں دیکھا کہ میری دعا قبول ہوئی پس وہ اس دعا کو نہیں مانگتا اور دعا چھوڑ دیتا ہے (1)۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہے کہ میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث کے الفاظ یستجاب لاحدکم (ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے) قبولیت کے وقوع کے وجوب کے متعلق خبر دینے اور قبولیت کے وقوع کے جواز کے متعلق خبر دینے کا احتمال رکھتے ہیں۔ جب وجوب کے متعلق خبر دینے کا معنی ہو تو قبولیت مذکورہ تین چیزوں کے مفہوم کے ساتھ ہوگی۔ جب وہ کہے: میں نے دعا مانگی اور قبول نہیں ہوئی تو ان تین چیزوں میں سے ایک کا وقوع باطل ہوا اور دعا سب چیزوں سے خالی ہوگئی اور اگر قبولیت کے جواز کے معنی میں ہو تو جو اس نے مانگا اس کے فعل کے ساتھ خاص ہوگی اور دعا کرنے والے کا یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی اسے مانع ہے کیونکہ مایوسی ضعف، تعیین اور ناراضگی کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح دعا کی قبولیت سے حرام کا کھانا بھی مانع ہے اور جو چیز حرام کے مفہوم میں ہو وہ بھی دعا کی قبولیت سے مانع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے پراگندہ بال اور پراگندہ حال وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے (عرض کرتا ہے) یا رب یا رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کا پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام

1۔ صحیح بخاری، باب یستجاب للعبد مالم یعجل، حدیث نمبر 5865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اسے حرام کے ساتھ غذا دی گئی ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ سوالیہ انداز میں فرمایا کہ جو اس صفت پر ہو اس کی دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے کیونکہ دعا کی قبولیت کے لئے داعی (دعا کرنے والا) میں، دعا میں اور جس چیز کا سوال کیا گیا ہے ان میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ داعی (دعا کرنے والا) میں یہ شرط ہے کہ وہ جاننے والا ہو کہ اس کی حاجت پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے اور سارے وسائط اس کے قبضہ میں ہیں اور اس کی تسخیر کے ساتھ مسخر ہیں اور وہ سچی نیت اور حضور قلب کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا اور وہ حرام کھانے سے اجتناب کرنے والا ہو اور دعا سے اکتانے والا نہ ہو اور جو چیز مانگی جا رہی ہے اس کی شرط سے یہ ہے کہ ایسے امور سے ہو جس کا طلب کرنا جائز ہو اور وہ فعل شرعی ہو جیسے ارشاد فرمایا جب تک وہ گناہ اور قطعی رحمی کا سوال نہ کرے۔ پس گناہ میں ہر گناہ داخل ہے جس کے ساتھ انسان گنہگار ہوتا ہے اور قطع رحمی میں مسلمانوں کے تمام حقوق اور مظالم داخل ہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: دعا کی سات شرائط ہیں (۱) تضرع (۲) خوف (۳) امید (۴) ہمیشگی (۵) خشوع (۶) عموم (۷) حلال کھانا۔

ابن عطا نے کہا: دعا کے ارکان، پر، اسباب اور اوقات ہیں اگر اس کے ارکان پائے جائیں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔ اگر اسے پر مل جائیں تو وہ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے، اگر اسے وقت سے موافقت ہو جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، اگر اسباب سے موافقت کر جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، دعا کے ارکان حضور قلب، رأفت، عجز اور خشوع ہے اس کے پر سچائی ہے، اس کا وقت سحری کا وقت ہے اس کے اسباب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی چار شرائط ہیں (۱) تنہائی کے وقت، دل کی حفاظت کرنا مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے زبان کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے آنکھ کی حفاظت کرنا جن کا دیکھنا حلال نہیں اور حرام چیز سے پیٹ کی حفاظت کرنا۔ بعض علماء نے فرمایا: دعا کی شرائط میں سے ہے کہ وہ غلطی سے سلامت ہو۔ بعض نے کہا:

ینادی ربہ باللحن لیث کذالك اذا دعاہ لا یجیب

لیث اپنے رب سے غلطی کے ساتھ دعا مانگتا ہے اس طرح جو وہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کہ ہم دعا مانگتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا لیکن تم نے اس کی اطاعت نہ کی، تم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور اس کی سنت کی اتباع نہ کی، تم نے قرآن کو پہچانا اور اس کے مطابق عمل نہ کیا، تم نے اللہ کی نعمتوں کو کھایا اور ان کا شکر ادا نہیں کیا، تم نے جنت کو پہچانا اور اس کو طلب نہیں کیا، تم نے آگ کو پہچانا اور اس سے بھاگے نہیں ہو، تم نے شیطان کو پہچانا اور اس سے تم نے جنگ نہیں کی ہے بلکہ تم نے اس سے موافقت کی ہے، تم نے موت کو پہچانا اور تم نے اس کے لئے تیاری نہیں کی، تم نے مردوں کو دفن کیا اور تم نے عبرت حاصل نہیں کی، تم نے اپنے عیوب کو ترک کیا اور لوگوں کے عیوب کے ساتھ مشغول ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نوف البکالی کو کہا: اے نوف! اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی تھی کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر پاک دلوں کے ساتھ، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ، پاک ہاتھوں کے ساتھ، میں ان میں سے

کسی کی دعا قبول نہیں کروں گا جب تک میری مخلوق میں سے کسی کے لئے ظلم موجود ہوگا۔ اے نوف! نہ تو شاعر بن، نہ تو پیغام پہنچانے والا بن، نہ سپاہی بن، نہ ٹیکس وصول کرنے والا بن اور نہ تو عشر وصول کرنے والا بن کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام رات کی ایک گھڑی میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ ایسا وقت ہے جو بندہ دعا مانگتا ہے اس کے لئے دعا قبول کی جاتی ہے مگر یہ کہ وہ بادشاہوں کو پیغام پہنچانے والا ہو یا سپاہی ہو یا ٹیکس وصول کرنے والا ہو یا عشر وصول کرنے والا ہو یا طنبور بجانے والا ہو یا طبل بجانے والا ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دعا کرنے والا یہ نہ کہے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر، اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت کر اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر بلکہ اپنی دعا اور اپنے رسول کو چاہنے کے قول سے خالی کرے۔ اور اس شخص کے سوال کی طرح سوال کرے جو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتا مگر جو چاہتا ہے (اگر تو چاہے) کے قول میں اس کی مغفرت، عطا اور رحمت سے استغنا کی ایک قسم ہے جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے اگر تو چاہے کہ مجھے عطا کر تو ایسا کر۔ یہ استغنا اور عدم ضرورت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مجبور شخص تو اپنے سوال میں عزم و یقین رکھتا ہے وہ اس فقیر کی طرح سوال کرتا ہے جو اپنے سوال کی طرف مجبور ہوتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے، یہ بخاری کے الفاظ کا ترجمہ ہے حضرت انس بن مالک نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو عزم کے ساتھ سوال کرے۔ یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں (1)۔ مؤطا میں ہے (2) یہ نہ کہے: اے اللہ! میری مغفرت فرما اگر تو چاہے، اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: (عزم سے سوال کرے) یہ قول دلیل ہے کہ مومن کو دعا میں کوشش کرنی چاہئے اور وہ قبولیت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ وہ کریم ذات سے دعا مانگ رہا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: کسی کو کسی دعا سے منع نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے بدترین ابلیس کی دعا کو بھی قبول فرمایا۔ اس نے عرض کی تھی: اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (اعراف: 14) مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (اعراف: 15) بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے)

دعا کے لئے کچھ اوقات اور احوال ہیں جن میں غالب طور پر قبول ہوتی ہے جیسے سحری کا وقت، افطاری کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان، اضطرار کے وقت، سفر اور مرض کی حالت میں، بارش کے نزول کے وقت اور اللہ کے راستہ میں مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کے وقت ان اوقات میں سے ہر وقت کے بارے میں آثار مروی ہیں ان کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ حضرت شہر بن حوشب نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام الدرداء نے انہیں کہا: اے شہر! کیا تم کپکپی محسوس نہیں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں کپکپی محسوس کر رہا ہوں۔ فرمایا: اللہ سے دعا مانگو کیونکہ کپکپی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ (3)

1۔ صحیح بخاری، باب لیعزم المسألة فانه لا مکرہ له، حدیث نمبر 5863، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 5864

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: مسجد الفتح میں تین دن دعا مانگی، سوموار، منگل اور بدھ اور بدھ کے روز دو نمازوں (ظہر اور عصر) کے درمیان آپ کی دعا قبول کی گئی میں نے آپ کے چہرہ اقدس میں خوشی دیکھی۔ حضرت جابر نے فرمایا: مجھ پر کبھی انتہائی مشکل امر نازل نہیں ہوا مگر میں نے اس گھڑی کی کوشش کی پھر میں نے اس میں دعا مانگی تو میں قبولیت کو جان گیا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ ابو رجا خراسانی نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے مانگو (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہیں طلب کرنا چاہئے کہ میں ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔ یہ باب استفعال سے ہے یعنی اس نے چیز کو طلب کیا مگر جو سخت تھی جیسے استغنی اللہ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ قبول کریں ایمان جس کی طرف میں نے انہیں بلایا ہے یعنی اطاعت اور عمل..... کہا جاتا ہے اجاب اور استجاب ہم معنی ہیں۔ شاعر کا قول ہے۔

فلم یستجبه عند ذالك مجیب۔ اس وقت قبول کرنے والے نے اس کی بات قبول نہ کی۔ (2)

سین زائدہ ہے اور لام، لام امر ہے اسی طرح وَلْيُؤْمِنُوْا لام امر نے فعل کو جزم دی کیونکہ یہ فعل کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔ پس یہ ان شرطیہ کے مشابہ ہے۔ بعض نے فرمایا کیونکہ یہ صرف فعل پر واقع ہوتا ہے۔ الرشاد، یہ الغی (گمراہی) کا متضاد ہے۔ وقد رشُد یرشد رُشدًا اور رَشِدَ یرشَد رشدًا اس میں ایک لغت ہے اور ارشدہ اللہ، المراشد، مقاصد الطرق۔ راستوں کے مقاصد۔ الطریق الارشد جیسے الطریق الاقصد ہے۔ تو کہتا ہے ہو لرشدۃ تیرے قول زِنْیَۃ کے خلاف ہے، ام راشد، چوہیا کی کنیت ہے۔ بنو رشدان عربوں کے قبائل۔ جوہری سے مروی ہے، ہروی نے کہا: الرُّشد، الرَّشد و الرشاد سب کا معنی ہدایت و استقامت ہے اسی سے ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورت کے پاس جانا۔ وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت اور آرام ہو۔ جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید

1۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کرلیں''۔

اس میں چھتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُحِلَّ لَكُمْ لفظ أُحِلَّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہ عمل حرام تھا پھر منسوخ کیا گیا(1)۔ ابوداؤد نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے اصحاب نے ہمیں بیان کیا، فرمایا: ایک شخص جب روزہ افطار کرتا تھا پھر کچھ کھانے سے پہلے سو جاتا تھا تو وہ صبح تک نہیں کھاتا تھا۔ فرمایا: حضرت عمر آئے اور اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا تو بیوی نے کہا: میں سو چکی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: ویسے کہہ رہی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ ایک انصاری آیا اس نے کھانے کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے کہا: ہم تیرے لئے کھانا گرم کرتے ہیں۔ وہ شخص سو گیا جب صبح ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں ہے: أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جب کوئی روزہ رکھتا تھا پھر افطاری کے وقت افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تو وہ اس رات اگلے دن شام تک کچھ نہ کھاتا تھا، قیس بن صرمہ انصاری روزہ دار تھا...... ایک روایت میں ہے وہ دن کے وقت کھجوروں کے باغ میں کام کرتا رہتا اور وہ روزے سے تھا...... وہ افطار کے وقت حاضر ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا تیرے پاس کھانا ہے؟ اس نے کہا: نہیں لیکن میں جاتی ہوں اور تیرے لئے کھانا طلب کرتی ہوں۔ وہ سارا دن کام کرتا رہا تھا پس اسے نیند آ گئی اس کی بیوی آئی تو اس نے اسے سویا ہوا دیکھا تو کہا: ہائے تیرے لئے خسارہ۔ جب آدھا دن گزرا تو اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس چیز کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ۔ تو صحابہ کرام بہت خوش ہوئے اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

اور بخاری میں حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ پورا رمضان عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور کچھ لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ۔

کہا جاتا ہے: خان اور اختان، خیانة سے مشتق ہیں اور ہم معنی ہیں یعنی روزوں کی راتوں میں مباشرت کی وجہ سے اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اپنے نفس سے خیانت کی اپنے نفس کی طرف اس عذاب کو کھینچا۔ قتبی نے کہا: خیانت کی اصل یہ ہے کہ کسی کو کسی شے کا امین بنایا جائے اور وہ اس امانت کو صحیح ادا نہ کرے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس آئے اور حضرت عمر آپ کے پاس ایک رات دیر تک باتیں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرتے رہے۔ واپس آئے تو بیوی کو سویا ہوا پایا۔ حضرت عمر نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے حضرت عمر سے کہا: میں تو سو گئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: تو نہیں سوئی تھی۔ حضرت عمر نے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں اللہ تعالیٰ اور آپ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں، میں نفس کے دام میں پھنس گیا اور میں نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ کیا میرے لئے کوئی رخصت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے عمر! تو اس کا حق نہیں رکھتا تھا جب حضرت عمر اپنے گھر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا بھیجا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عذر کی قبولیت قرآن کی آیت کے ذریعے سنائی۔

نحاس اور مکی نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت عمر سو گئے پھر اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کے متعلق خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی (1): **عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ**۔ (جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ**، **لَيْلَةَ** کو نصب ظرف کی وجہ سے ہے۔ یہ اسم جنس ہے اسی وجہ سے مفرد ذکر کی گئی ہے۔ **الرَّفَثُ**، یہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے کنایہ فرماتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا ہے (2) اور زجاج نے کہا: **الرَّفَثُ** ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس عمل کا جامع ہے جس کا مرد اپنی بیوی سے ارادہ کرتا ہے۔ یہ الازہری کا قول بھی ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: یہاں **الرَّفَثُ** سے مراد جماع ہے۔ الرفث صراحۃً جماع کا ذکر کرنا ہے اور اس کا واضح ذکر کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

ویرین من انس الحدیث زوانیا … وبھن عن رفث الرجال نفارُ

یہاں رفث کو شاعر نے صراحۃً جماع کے ذکر کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: الرفث کا اصل معنی فحش کلام ہے۔ کہا جاتا ہے: رفث، ارفث جب کوئی قبیح کلام کرے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ورب اسراب حجیج کظم … عن اللغا و رفث التکلم (3)

یہاں رفث فحش کلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

الرَّفَثُ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں الی کے ساتھ متعدی ہے جبکہ تو رفثت الی النساء نہیں کہتا لیکن یہاں یہ الافضاء پر محمول ہے جس سے مراد ملابست لی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ** (النساء: 21) (مل جل چکے ہو تم تنہائی میں ایک دوسرے سے) اسی معنی سے ہے: **وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ** (البقرہ: 14) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا** (توبہ: 35) یہاں یحمی، یوقد پر محمول ہے کیونکہ تو کہتا ہے: احمیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً

الحدیدۃ فی النار۔ یعنی احمی کا صلہ فی استعمال ہوتا ہے جبکہ پہلی آیت میں علی استعمال ہوا ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ (النور: 63) اس آیت میں یخالفون کو ینحرفون کے معنی پر محمول کیا گیا ہے جس کا صلہ عن استعمال ہوتا ہے یا یروغون عن امرہ کے معنی پر محمول ہے۔ کیونکہ تو کہتا ہے خالفت زیدا یعنی خالف کا صلہ استعمال ہی نہیں ہوتا اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (احزاب) یہاں رحیم، رؤف کے معنی پر محمول ہے جیسے ارشاد ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ) کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تو کہتا ہے رؤفت بہ۔ یعنی رأف کا صلہ با استعمال ہوتا ہے تو رحمت بہ نہیں کہتا جب اس کا معنی رؤف کے موافق ہو تو متعدی ہونے میں اس کے قائم مقام ہوا۔ اسی قسم سے ابو کبیر ہذلی کا قول ہے۔

حملت بہ فی لیلۃ مزءودۃ کرھا و عقد نطاقھا لم یحلل

اس شعر میں حمل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ اس کا حق یہ ہے کہ بغیر صلہ کے متعدی ہو، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا (احقاف: 15) لیکن شاعر نے حملت بہ کہا کیونکہ یہ حبلت بہ کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ یہ مبتدا خبر ہیں اور هُنَّ میں نون کو مشدد کیا گیا ہے کیونکہ یہ مذکر میں جو واو اور میم ہے اس کے قائم مقام ہے وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، لِبَاسٌ اصل میں کپڑے میں استعمال ہوتا ہے پھر میاں، بیوی کے ملنے کو لباس کہا گیا کیونکہ ان کے جسم بھی آپس میں مل جاتے ہیں، کپڑے کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے۔

نابغہ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تداعت فکانت علیہ لباسا (1)

جب پہلو میں سونے والے نے اس کی گردن دوہری کی اس نے اسے بلایا تو وہ اس پر لباس تھی۔ اور کہا:

لبست أناساً فافنیتھم و افنیتُ بعد أناسٍ أناساً

میں کئی لوگوں سے ملا اور میں نے انہیں فنا کر دیا اور کئی لوگوں کے بعد کئی لوگوں کو فنا کر دیا۔

بعض نے کہا: ہر اس چیز کو لباس کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ لے اور اس کا گھیراؤ کر لے۔ یہ بھی جائز ہے کہ میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حرام سے پردہ بن جاتا ہے جیسا کہ خبر میں وارد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ وغیرہ نے کہا: عورت کو کہا جاتا ہے، یہ تیرا لباس ہے، تیرا بستر ہے اور تیرا ازار ہے، ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب سے کہا تھا۔

الا ابلغ ابا حفص رسولا فدی لک من اخی ثقۃ ازاری

ابوعبیدہ نے کہا: اس شعر میں ازار سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نفس ہے۔

ربیع نے کہا: یہ تمہارے لئے بچھونا ہیں اور تم ان کے لحاف ہو۔ مجاہد نے کہا: تمہارے لئے سکون ہے یعنی بعض، بعض سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سکون حاصل کرتے ہیں۔(1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ سونے کے بعد روزوں کی راتوں میں کھانے، پینے اور جماع جیسی ممنوع چیزوں میں مشورہ کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:85) یعنی ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ ہر ایک اپنے نفس سے خیانت کرتا ہے، اپنے نفس سے خیانت کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کا نقصان اس کی اپنی طرف ہی لوٹنے والا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ دو معانی کا احتمال رکھتا ہے: (۱) اپنے نفسوں سے خیانت سے ان کی توبہ قبول کرنا (۲) رخصت و اباحت کے ساتھ ان سے تخفیف کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (مزمل:20) یعنی اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ یعنی قتل خطا کے بعد۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (النساء:92) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے۔ کیونکہ جو خطاً قتل کرنے والا ہے اس نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے توبہ لازم ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (توبہ: 117) یہاں بھی تَابَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اگرچہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی ایسی چیز واجب نہیں ہوئی تھی جو توبہ کا موجب تھی۔ وَ عَفَا عَنْكُمْ یہ گناہ کو معاف کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور توسع و تسہیل کا بھی احتمال رکھتا ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اول وقت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور آخر وقت اللہ تعالیٰ کا عفو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمائی اور آسانی فرمائی عَلِمَ اللّٰهُ کا معنی تم سے اس کا وقوع مشاہدۃً جان لیا فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی اس میں وقوع کے بعد اس نے تم پر تخفیف فرمائی۔ وَ عَفَا یعنی آسانی فرمائی۔ تَخْتَانُوْنَ یہ خیانت سے ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء زہد نے فرمایا: عنایت اور شرف منزلت اس طرح ہوا کہ حضرت عمر نے اپنے نفس سے خیانت کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شریعت بنا دیا اور ان کی وجہ سے پوری امت سے تخفیف فرما دی۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ یہ جماع سے کنایہ ہے یعنی جو تم پر حرام تھا اسے حلال کر دیا۔ جماع کو مباشرت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دو جلدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ دلیل ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب حضرت عمر کا حقوق زوجیت ادا کرنا ہے نہ کہ حضرت قیس کی بھوک ہے کیونکہ اگر حضرت قیس کی بھوک سبب ہوتی تو ارشاد ہوتا: فالآن کلوا یعنی اب کھاؤ۔ کلام کا آغاز اس سے فرمایا کیونکہ یہی اہم امر تھا جس کے لئے آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ حضرت ابن عباس، مجاہد، حکم بن عیینہ، عکرمہ، حسن، سدی، ربیع اور ضحاک نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اولاد طلب کرو(2)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے بعد اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھا وہ قرآن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے قرآن کو طلب کرو جو تمہارے لئے اس میں مباح کیا گیا ہے اور تمہیں جس کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: لیلۃ القدر کو طلب کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: رخصت اور وسعت طلب کرو۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ قول حسن ہے۔ بعض نے فرمایا: لونڈیاں اور بیویاں طلب کرو۔ حسن بصری اور حسن بن قرۃ نے کہا: اتباع طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے اس کو جائز قرار دیا اور ابتغوا کو الابتغاء سے ترجیح دی۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا یہ جواب حضرت قیس کے بارے نازل ہوا اور پہلا حضرت عمر کا جواب تھا۔ پہلے حضرت عمر کا جواب نازل ہوا کیونکہ وہ زیادہ اہم تھا اور وہ مقدم تھا۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، حتی یہ تبیین کی غایت کے لئے ہے اور کسی ایک کے لئے ظہور کا وقوع صحیح نہیں ہے اور اس پر کھانا حرام نہیں ہے مگر فجر کے طلوع ہونے کی مقدار گزر چکی ہے اور اس حد میں اختلاف ہے جس کے ظہور کے ساتھ کھانے پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ جمہور نے کہا: وہ فجر جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے اس کے متعلق اخبار آئی ہیں اور علماء اسی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ (2)

مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ افق کی لمبی سفیدی جو اس طرح اوپر نیچے پھیلتی ہے۔ حماد نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے اس کو حکایت کیا۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے: فجر وہ نہیں جو اس طرح ہوتی ہے اپنی انگلیوں کو جمع کیا پھر زمین کی طرف اس کو جھکایا۔ لیکن صبح وہ ہوتی ہے جو اس طرح ہوتی ہے۔ اپنی مسبحہ انگلی کو دوسری مسبحہ انگلی پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (☆)۔

دار قطنی نے حضرت عبدالرحمن بن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو قسمیں ہیں وہ جو اس طرح ہوتی ہے گویا بھیڑیے کی دم ہے وہ نہ تو کسی چیز کو حلال کرتی ہے اور نہ حرام کرتی ہے۔ اور وہ جو افق میں عرضاً پھیلتی ہے اس میں نماز حلال ہوتی ہے اور کھانا (روزوں میں) حرام ہوتا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ فجر کے طلوع ہونے کے بعد جس کے ساتھ راستوں اور گھروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابن عباس، حضرت طلق بن علی، حضرت عطا بن ابی رباح اعمش سلیمان وغیرہم سے مروی ہے۔ راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر فجر کے ظاہر ہونے کے ساتھ کھانے، پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ مسروق نے کہا: وہ تمہاری فجر کو فجر شمار نہیں کرتے تھے وہ اس فجر کو شمار کرتے تھے جو گھروں کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ نسائی نے عاصم سے انہوں نے زر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نے حذیفہ سے کہا: تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس وقت سحری کھائی؟ فرمایا: وہ دن تھا مگر سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ دار قطنی سے حضرت طلق بن علی سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: کھاؤ، پیو اور تمہیں اوپر بلند ہونے والی صبح دھوکے میں نہ ڈالے۔ کھاؤ، پیو حتیٰ کہ تمہارے لئے سرخی عرضاً پھیل جائے۔ دار قطنی نے کہا قیس بن طلق

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان قبل الفجر، حدیث نمبر 586، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قوی نہیں ہے۔ ابوداؤد نے کہا اس میں اہل یمامہ منفرد ہیں (1)۔ طبری نے کہا: وہ چیز جس نے اس کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ روزہ دن کے وقت ہے اور دن ان کے نزدیک سورج طلوع ہونے سے مشروع ہوتا ہے اور اس کا آخر اس کا غروب ہوتا ہے۔ لغوی علماء کے درمیان اس میں اختلاف گزر چکا ہے (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان فرمائی کہ وہ رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس میں اور ایامًا معدودات میں یہی فیصل قول ہے۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے رات کو روزہ نہ رکھا اس کا روزہ نہیں۔ اس روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباد، حضرت مفضل بن فضالہ سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ اس سند کے ساتھ تمام راوی ثقہ ہیں۔ حضرت حفصہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن ابی بکر نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے۔ یہ ثقہ راویوں میں سے ہیں جو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ حضرت حفصہ سے مرفوعا مروی ہے۔ ان دو حدیثوں میں فجر کے بارے میں جمہور کے قول کی دلیل ہے اور فجر طلوع ہونے سے پہلے نیت کے بغیر روزہ نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 8: روزہ جملہ عبادت سے ہے یہ بغیر نیت کے صحیح نہیں ہے۔ شارع علیہ السلام نے فجر سے پہلے اس کا وقت مقرر فرمایا۔ یہ کیسے کہا جائے گا کہ فجر کے بعد بھی کھانا، پینا جائز ہے؟ بخاری (3) اور مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے **وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ** تک نازل ہوا اور **مِنَ الْفَجْرِ** کے الفاظ نازل نہ ہوئے۔ لوگ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو ان میں سے ایک اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگہ باندھ دیتا اور وہ اس وقت تک کھاتا، پیتا رہتا حتی کہ ان دونوں کا دیکھنا اس کے لئے ظاہر ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد **مِنَ الْفَجْرِ** کے الفاظ نازل کئے تو وہ جان گئے کہ اس سے مراد دن کی سفیدی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! خیط ابیض اور خیط اسود سے کیا مراد ہے، کیا یہ دو دھاگے مراد ہیں؟ فرمایا: اگر تو دو دھاگے دیکھے تو پھر بڑی چوڑی گدی والا ہے، پھر فرمایا: نہیں بلکہ اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے فجر کو خیط (دھاگہ) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ابتدا میں سفیدی لمبے دھاگے کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر ابوداؤد ابادی نے کہا:

الخیط الابیض ضوء الصبح منفلق والخیط الاسود جنح اللیل مکتوم

خیط ابیض سے مراد صبح کی روشنی ہے جو پھوٹنے والی ہے اور خیط اسود سے مراد رات کا جھکاؤ ہے۔

عربوں کے کلام میں خیط سے مراد رنگ ہے۔ الفجر، فجرت الماء المجرۃ، فجرا کا مصدر ہے۔ پانی کا جاری ہونا اور پھوٹنا ہے۔ اس کا اصل معنی پھٹنا ہے۔ اسی وجہ سے سورج کی روشنی جو مطلع سے ظاہر ہوتی ہے اسے فجر کہتے ہیں۔ یہ دن کی سفیدی کا آغاز ہے جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے عربی میں اس کو خیط ابیض کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب وقت السحور، حدیث نمبر 2001، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالی وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض ۔۔۔ الآیۃ، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو داؤد ابادی نے کہا:

فلما اضاءت لنا سدفة ولاح من الصبح خیط انارا (1)

جب ہمارے لئے رات کی تاریکی روشن ہوئی اور صبح سے دھاگہ ظاہر ہوا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قد کاد یبدو و بدت تباشرہ و سدف اللیل البھیم ساترۃ

قریب تھا کہ روشنی ظاہر ہو اور کالی رات کی تاریکی چھپانے والی تھی۔

فجر کو الصدیع بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے عرب کہتے ہیں: انصدع الفجر، فجر پھوٹی۔ بشر بن ابی خازم یا عمرو بن معدیکرب نے کہا:

تری السرحان مفترشاً یدیه کان بیاض لبته صدیع

تو نے بھیڑیے کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے تھا اس کی گردن کی سفیدی دھاگے کی مانند تھی۔

شماخ نے سر کی مانگ کو فجر سے تشبیہ دی ہے:

اذا ما اللیل کان الصبح فیه اشق کمفرق الراس الدھین

جب رات میں صبح ہوتی ہے تو وہ اس طرح پھوٹتی ہے جس طرح تیل لگے ہوئے سر میں مانگ ہوتی ہے۔

واضح امر کو بھی الفجر کہتے ہیں۔ یہ صبح کے پھوٹنے کی طرح واضح ہے۔ شاعر نے کہا:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وارد ہوئی اور صبح تاریکی میں چھپنے والی تھی۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ اللہ تعالیٰ نے رات کو کھانے، سونے اور جماع کے لئے ظرف بنایا اور دن کو روزے کے لئے ظرف بنایا۔ دونوں زمانوں کے احکام بیان فرمائے اور ان دونوں کے درمیان فرق کیا۔ دن کے وقت کوئی چیز جائز نہیں ہے جس کو رات کے وقت مباح فرمایا مگر مسافر اور مریض کے لئے جائز ہے۔ جیسا کہ بیان گزر چکا ہے۔ جس نے رمضان میں روزہ افطار کیا (مسافر اور مریض کے علاوہ) تو پھر یا تو وہ جان بوجھ کر یا بھول کر توڑنے والا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو امام مالک نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر کھایا، پیا یا جماع کیا تو اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ جیسا کہ امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں افطار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو غلام آزاد کرنے یا دو ماہ کے روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ دینے کا حکم دیا۔ (الحدیث) یہی امام شعبی نے فرمایا: امام شافعی وغیرہ نے فرمایا: یہ کفارہ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو جماع کے ساتھ روزے کو توڑے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تجھے کس چیز نے ہلاک کیا، اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا ہے (1) (الحدیث) اس میں کفارہ کا بیان ترتیب سے ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ یہ قضیہ پہلے قضیہ پر علماء نے محمول کیا ہے۔

انہوں نے کہا: یہ ایک واقعہ ہے اور یہ غیر مسلم ہے بلکہ یہ دو قضیے ہیں جو مختلف ہیں کیونکہ دونوں کا انداز مختلف ہے۔ جس نے افطار کیا کفارہ کو اس پر قیود سے معلق نہیں فرمایا تو مطلقاً لازم ہے۔ یہی قول امام مالک، ان کے اصحاب، اوزاعی، اسحاق، ابوثور، طبری اور ابن منذر کا ہے۔ یہ ایک روایت میں عطا سے مروی ہے۔ حسن اور زہری سے مروی ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول لازم ہے۔ احوال کے تعارض کے باوجود تفصیل کا ترک کرنا حکم کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے اس پر قضا کے ساتھ عقوبت (سزا) کو واجب کیا کیونکہ اس نے رمضان کی حرمت کو توڑا۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ عورت جس سے خاوند رمضان میں وطی کرے، امام مالک، امام ابو یوسف اور اصحاب رائے نے فرمایا: اس عورت پر بھی خاوند کی طرح کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر ایک کفارہ واجب ہے خواہ اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہو یا خاوند نے اسے مجبور کیا ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کفارہ کے ساتھ سائل کا جواب دیا اور تفصیل نہیں فرمائی۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے: اگر اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہوگی تو ہر ایک پر کفارہ ہوگا اور اگر خاوند نے اسے مجبور کیا ہو تو پھر صرف مرد پر کفارہ ہوگا۔ یہ سحنون بن سعید مالکی کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر دو کفارے ہیں۔ یہی امام مالک کے پیروکاروں کی جماعت کے نزدیک امام مالک کے مذہب کا ماحاصل ہے۔

مسئلہ نمبر 11: علماء کا اختلاف ہے جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر جماع کیا یا بھول کر کھایا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور اسحاق نے فرمایا: دونوں صورتوں میں اس پر کوئی چیز واجب نہیں نہ قضا ہے نہ کفارہ ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے، قضاء ہے۔

اس کی مثل عطا سے مروی ہے۔ اور عطا سے مروی ہے، اس پر کفارہ ہے اگر جماع کرے اور انہوں نے فرمایا: ایسی بات نہیں بھولتی۔ اہل ظاہر کی ایک قوم نے کہا: خواہ بھول کر وطی کی ہو یا جان بوجھ کر اس پر قضا اور کفارہ دونوں ہیں۔ یہ ابن ماجشون عبدالملک کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حدیث کفارہ کو ثابت کرتی ہے اس میں بھولنے والے اور جان بوجھ کر توڑنے والے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 12: امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا: جب بھول کر کھائے پھر یہ خیال کرے کہ روزہ تو ٹوٹ گیا ہے پھر جان بوجھ کر جماع کر لیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ المذہب میں فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے اگر اس نے روزے کی حرمت کو توڑنے کا ارادہ کیا ہے۔ ابوعمر نے کہا: مالک کی اصل پر واجب ہے کہ وہ کفارہ نہ دے کیونکہ جس نے بھول کر کوئی چیز کھائی تو وہ ان کے نزدیک افطار کرنے والا ہے وہ اس دن

1۔ صحیح بخاری، باب قولہ تعالیٰ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم ۔۔۔۔، حدیث نمبر 6215، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی قضا کرنے والا ہے۔ اس نے حرمت توڑنے کا ارادہ کیا ہے دراں حالیکہ وہ افطار کرنے والا ہے۔ امام مالک کے علاوہ علماء کے نزدیک جس نے بھول کر روزے میں کوئی چیز کھائی وہ افطار کرنے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے جس نے بھول کر کھایا یا پیا تو اس پر قضا نہیں اور اس کا روزہ مکمل ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب روزہ دار بھول کر کھائے یا بھول کر پیئے تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا اور اس پر قضا نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے: وہ روزے کو مکمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا اور پلایا۔

اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔ ابوبکر اثرم نے کہا: میں نے حضرت ابوعبداللہ سے سنا ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو بھول کر رمضان میں کچھ کھائے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کی بنا پر اس پر کچھ نہیں ہے پھر ابوعبداللہ مالک نے فرمایا اور لوگوں نے کہا: امام مالک کہتے ہیں: اس پر قضا ہے اور ہنس پڑے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے بھول کر کھایا یا پیا، وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جب فرمایا یتم صومہ (وہ روزہ مکمل کرے) پس اس نے روزہ مکمل کیا تو اس کا روزہ مکمل ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے بھول کر روزہ افطار کیا اس پر قضا نہیں ہے اور اس کا روزہ مکمل ہے اور جس نے جان بوجھ کر جماع کیا اس پر قضاء اور کفارہ ہے...... واللہ اعلم...... اس طرح جس نے بھول کر افطار نہیں کیا، ہمارے علماء نے قضا کے ایجاب پر اس طرح حجت پکڑی ہے کہ مطلوب پورا روزہ ہے جس میں کسی قسم کی دراڑ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر اتموا الصیام الی اللیل۔ رات تک روزہ مکمل کرو۔ یہ روزہ اس نے مکمل نہیں کیا۔ بس وہ اس پر باقی ہے۔ شاید یہ حدیث نفلی روزہ کے متعلق ہو کیونکہ اس میں تخفیف ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے جو بھول گیا حالانکہ وہ روزہ سے تھا اس نے کھا، پی لیا تو وہ اپنے روزہ کو مکمل کرے (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قضا کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ آپ نے مؤاخذہ کے سقوط اور روزہ پر جاری رہنے اور اسے مکمل کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ اگرچہ واجب تھا۔ پس یہ قضا کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا نفلی روزہ تو اس میں قضا نہیں ہے جس نے بھول کر کھایا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے جس چیز سے حجت پکڑی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ شارع علیہ السلام سے اس کا مروی ہونا صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ نص صریح میں آیا ہے اور اس کو حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے مہینہ میں روزہ افطار کیا اس پر قضا اور کفارہ نہیں ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ابن مرزوق اس میں منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے اس نے انصاری سے روایت کیا ہے۔ پس احتمال زائل ہو گیا اور اشکال اٹھ گیا۔ الحمد للہ ذی الجلال والکمال۔

مسئلہ نمبر 13: جب اللہ تعالیٰ نے روزے میں ممنوعہ چیزوں کا ذکر کیا وہ کھانا، پینا، جماع ہیں لیکن اس مباشرت کا

1۔ صحیح بخاری، باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا، حدیث نمبر 1797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ذکر نہیں فرمایا جس کا معنی ہے: جلد کا جلد سے مل جانا جیسے بوسہ دینا، چھونا وغیرہ۔ یہ دلیل ہے کہ جس نے بوسہ دیا اور جسم کے ساتھ جسم ملایا اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ کلام کا انداز اس چیز کی حرمت پر دلالت کرتا ہے جس کو رات نے مباح کیا اور وہ تین چیزیں ہیں۔ اس میں کسی اور چیز پر دلالت نہیں ہے بلکہ یہ دلیل پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ علماء متقدمین کا اختلاف ہے، اسی سے مباشرت ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جس کو اپنے نفس پر ضبط نہ ہو اس کے لئے مکروہ ہے تاکہ روزے کے فساد کا سبب نہ بن جائے۔ مالک نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روزہ دار کو بوسہ اور مباشرت سے منع فرمایا۔ یہ اس خوف کی وجہ سے ہے جو ان سے فساد پیدا ہوگا۔ اگر بوسہ دے اور سلامت رہے تو اس پر کوئی حرج نہیں اسی طرح اگر مباشرت کرے۔ بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے تھے اور مباشرت (جسم سے جسم ملانا) کرتے تھے حالانکہ آپ روزے سے ہوتے تھے، جنہوں نے روزہ دار کے لئے بوسہ کو مکروہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عروہ بن زبیر بھی ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، وہ ایک دن اس کی جگہ قضا کرے اور حدیث ان پر حجت ہے۔ ابوعمر نے فرمایا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس شخص کے لئے مباشرت اور بوسہ کی رخصت دی ہو جس پر روزے کا فساد پیدا ہوتا ہو اور جس نے بوسہ دیا اور اس کی منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ، اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن اور امام شافعی کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ اور فرمایا: جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ابوعمر نے کہا: اگر بوسہ دیا اور مذی نکل آئی تو ان کے نزدیک اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام احمد نے فرمایا: جس نے بوسہ دیا اور اسے مذی آگئی یا منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے مگر جس نے جماع کیا اور بھول کر یا جان بوجھ کر آلہ تناسل کو داخل کیا تو اس پر کفارہ بھی ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے بوسہ دیا، مباشرت کی...... اس سے کوئی پانی نہ نکلا تو اس پر قضا ہے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر قضا نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے مذی نکلے۔ قاضی ابومحمد نے فرمایا: ہمارے اصحاب کا اتفاق ہے کہ ایسے شخص پر کفارہ نہیں ہے اگر منی نکلے تو کیا قضا کے ساتھ کفارہ لازم ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: بوسہ دیا ہوگا، پھر انزال ہو گیا ہوگا یا اس نے بوسہ دیا ہوگا پھر اس نے لذت اٹھائی اور پھر دوبارہ بوسہ لیا پھر انزال ہو گیا۔ اگر اس نے ایک بوسہ دیا یا ایک مرتبہ مباشرت اور چھوا تو اشہب اور سحنون نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بار بار یہ عمل کرے۔

ابن قاسم نے کہا: وہ تمام صورتوں میں کفارہ دے گا مگر نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں حتیٰ کہ بار بار یہ عمل کرے اور جنہوں نے کفارہ کے وجوب کا قول کیا ہے جب وہ بوسہ دے یا مباشرت کرے یا اپنی بیوی سے ملامست کرے یا فرج کے علاوہ میں جماع کرے پھر اسے منی آجائے۔ ان میں حسن بصری، عطا، ابن المبارک، ابوثور اور اسحاق ہیں۔ یہ "مدونہ" میں امام مالک کا قول ہے اور اشہب کے قول کی حجت یہ ہے کہ چھونے، بوسہ دینے اور مباشرت فی نفسہا روزہ توڑنے والی چیزیں نہیں ہیں معاملہ کو اسی کی طرف پھیرا جائے گا جن سے افطار ہوتا ہے جب اس نے ایک مرتبہ یہ عمل کیا اور انزال اور افساد صوم کا ارادہ نہیں کیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے جس طرح عورت کی طرف دیکھنا ہے۔ جب اس نے اس عمل کا تکرار کیا تو اس نے روزہ

کے افساد کا قصد کیا پس اس پر کفارہ لازم ہے جیسا کہ اگر بار بار دیکھے۔ لخمی نے کہا: دیکھنے سے انزال کی صورت میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر کفارہ نہیں مگر یہ کہ وہ بار بار کرے۔ اصل یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں مگر اس پر جس نے روزہ توڑنے کا قصد کیا اور روزہ کی حرمت تار تار کرنے کا ارادہ کیا۔ جب یہ صورت ہو تو جس کو انزال ہو جاتا ہو یا اس کی عادت مختلف ہو، کبھی انزال ہوتا ہو اور کبھی انزال نہ ہوتا ہو تو میں اس پر کفارہ دیکھتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے والا روزہ توڑنے کا ارادہ کرنے والا ہے اور اگر اس کی عادت سلامتی ہو تو اندازہ کیا جائے گا کہ عادت کے خلاف ہو تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ امام مالک کا قول کفارہ کے وجوب کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ یہ جاری نہیں ہوتا مگر اس سے جس کی یہ طبع ہو اور ظاہر پر اکتفا کیا۔ اشہب نے لوگوں کے غالب امر پر محمول کیا کہ وہ اس سے سلامت ہوتے ہیں اور نظر میں ان کا قول اس پر دلیل ہے۔

میں کہتا ہوں: نظر میں جو اتفاق حکایت کیا ہے اور اس کو اصل بنایا ہے، حقیقۃً اس طرح نہیں ہے۔ باجی نے ''المنتقی'' میں حکایت کیا ہے۔ اگر ایک نظر دیکھا اس سے مقصود لذت تھی پھر اسے انزال ہو گیا تو شیخ ابو الحسن نے کہا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ الباجی نے کہا: میرے نزدیک یہی صحیح ہے کیونکہ جب اس سے اس نے لطف اٹھانے کا قصد کیا تو وہ بوسہ ہے اور دوسری استمتاع کی قسموں کی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔ جابر بن زید، ثوری، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے عورت کی طرف بار بار دیکھا حتیٰ کہ اس سے منی نکل آئی تو اس پر قضاء و کفارہ نہیں ہے۔ یہ ابن منذر کا قول ہے۔ الباجی نے کہا: مدینہ میں ابن نافع نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر برہنہ عورت کو دیکھا پھر لذت محسوس کی اور انزال ہو گیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جمہور علماء کا قول ہے کہ جنبی حالت میں جس پر فجر طلوع ہو اس کا روزہ صحیح ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: یہ بالاجماع جائز ہے۔ صحابہ کے درمیان اس میں کلام واقع ہوئی پھر اس پر معاملہ ٹھہر گیا کہ جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے اس کا روزہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کے درمیان کلام کے وقوع کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے وہ صحیح اور مشہور ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے: جس نے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں اس کو موطا وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔ نسائی کی کتاب میں ہے جب حضرت ابو ہریرہ نے رجوع کیا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے نہیں کہا یہ اللہ کی قسم! حضرت محمد ﷺ نے کہا تھا۔ اس سے حضرت ابو ہریرہ کے رجوع کے متعلق اختلاف ہے اہل علم کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کا روزہ نہیں۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ حسن بن صالح سے روایت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک تیسرا قول بھی مروی ہے، فرمایا: جب اسے جنابت کا علم ہو پھر سو جائے حتیٰ کہ صبح ہو جائے تو وہ افطار کرنے والا ہے اگر وہ نہ جانے حتیٰ کہ وہ صبح کر لے تو روزہ دار ہے۔ یہ عطا، طاؤس اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ حسن اور نخعی سے مروی ہے کہ یہ نوافل میں جائز ہوگا فرض میں قضا کرے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ علماء کے اس شخص کے بارے میں چار اقوال ہیں جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے ان میں سے صحیح

1۔ صحیح بخاری، الصائم یصبح جنبا، حدیث نمبر 1791، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قول جمہور علماء کا ہے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت بغیر احتلام کے جماع سے جنبی ہوتے تھے پھر روزہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ رمضان میں بغیر احتلام کے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرتے تھے پھر غسل کرتے تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے(1) فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے ارشاد سے ضرورۃً یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب طلوع فجر تک جماع کرتا رہے تو ضرورۃً معلوم ہوا کہ اس پر فجر طلوع ہوگی تو وہ جنبی ہوگا۔ غسل فجر کے بعد ہی ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ذکر عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو وہ اسے فجر طلوع ہونے کے ساتھ نکالے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ مزنی نے کہا: اس پر قضا ہے کیونکہ یہ مکمل جماع ہے۔ پہلا قول صحیح ہے اور وہی ہمارے علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 15: علماء کا حیض والی عورت کے بارے میں اختلاف ہے جو فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل نہ کرے حتیٰ کہ صبح ہو جائے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اس پر روزہ واجب ہے خواہ اس نے جان بوجھ کر روزہ ترک کیا ہو یا بھول کر جس طرح جنبی کا حکم ہے۔ یہ امام مالک اور ابن قاسم کا قول ہے۔ عبدالملک نے کہا: جب عورت فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل کو مؤخر کرے حتیٰ کہ فجر طلوع ہو جائے تو اس کا وہ دن افطار کا دن ہے کیونکہ وہ دن کے بعض حصہ میں پاک نہیں تھی وہ جنبی کی طرح نہیں ہے کیونکہ احتلام روزے کو نہیں توڑتا جبکہ حیض کا خون روزے کو توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ابوالفرج نے اپنی کتاب میں عبدالملک سے روایت کیا ہے۔ اوازعی نے کہا: اس نے چونکہ غسل کرنے میں کوتاہی کی ہے اس لئے وہ قضا کرے گی۔ ابن الجلاب نے عبدالملک سے روایت کیا ہے کہ اگر وہ فجر سے پہلے ایسے وقت میں پاک ہوتی جس میں غسل کرنا اس کے لئے ممکن تھا پھر اس نے کوتاہی کی اور غسل نہ کیا حتیٰ کہ صبح ہوگئی تو اسے کچھ ضرر نہیں جیسے جنبی کا حکم ہے۔ اگر وقت تنگ ہو جس میں وہ غسل نہیں کر سکتی تو اس کا روزہ جائز نہیں اور اس کا وہ دن افطار کا دن ہے۔ یہی قول امام مالک کا ہے۔ یہ اس عورت کی مانند ہے جس پر فجر طلوع ہو جبکہ وہ حیض سے ہو۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ایسی عورت کے بارے فرمایا وہ روزہ بھی رکھے اور قضا بھی کرے۔ جیسا کہ اوزاعی کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے اور ان کا یہ قول شاذ ہے۔ انہوں نے فجر سے پہلے پاک ہونے والی عورت پر کفارہ اور قضا کو واجب کیا ہے جبکہ اس نے سستی کی ہو اور صبح تک غسل نہ کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 16: جب عورت رمضان میں رات کو پاک ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ کیا اسے طہارت فجر سے پہلے ہوئی یا بعد تو وہ اس دن روزہ رکھے اور احتیاطاً اس دن کے روزہ کی قضا بھی کرے اور اس پر کفارہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 17: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: پچھنے لگانے والا اور پچھنے لگوانے والا افطار کرے۔ یہ حضرت ثوبان کی حدیث، حضرت شداد بن اوس اور حضرت رافع بن خدیج کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد نے شداد کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علی بن المدینی نے حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: اس پر قضا نہیں ہے مگر یہ تغریر (کمزوری کے اندیشہ) کی بنا پر اس کے لئے مکروہ

1۔ صحیح بخاری، باب الاغتسال الصائم، حدیث نمبر 1795، ایضاً

ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ حضرت انس سے پوچھا گیا: کیا تم پچھنے لگوانے روزہ دار کے لئے مکروہ جانتے تھے؟ حضرت انس نے فرمایا: نہیں مگر ضعف کی بناء پر (2)۔ ابو عمر نے کہا: شداد اور رافع اور ثوبان کی حدیث ہمارے نزدیک منسوخ ہے اور اس کی ناسخ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ کیونکہ حضرت شداد وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اٹھارہ رمضان کو پچھنے لگوا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پچھنے لگانے والا اور جس کو پچھنے لگائے گئے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سال احرام اور روزہ کی حالت میں خود پچھنے لگوائے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج، حجۃ الوداع کا سال تھا تو یہ لامحالہ پہلی حدیث کی ناسخ ہے کیونکہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان پایا ہی نہیں تھا کیونکہ ربیع الاول میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ یہ امر ہے اور وجوب کا مقتضا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اِلٰی غایت کے لئے ہے جب اس کا مابعد اس کے ماقبل کی جنس سے ہو تو وہ ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے جیسے تیرا قول ہے اشتریت الفدان الی حاشیتہ (میں نے چار سو مربع زمین حاشیہ سمیت خریدی) یا اشتریت منك من ھذہ الشجرۃ الی ھذہ الشجرۃ۔ مبیع شجر ہے اور آخری درخت بھی اس مبیع میں داخل ہے۔ بخلاف تیرے اس قول کے: اشتریت الفدان الی الدار۔ اس میں دار مبیع میں داخل نہ ہوگا کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے ظہور تک روزہ کو مکمل کرنے کی شرط رکھی ہے جیسا کہ کھانا جائز قرار دیا حتیٰ کہ دن ظاہر ہو جائے۔ (3)

مسئلہ نمبر 19: روزے کی تکمیل میں سے نیت کا متصل ہونا بھی ہے۔ اگر دن کا بعض حصہ روزے کی نیت نہ کی اور فطر کی نیت کی مگر اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ تو "مدونہ" میں اسے افطار کرنے والا بنایا ہے اور اس پر قضا لازم ہے۔ ابن حبیب کی کتاب میں ہے کہ وہ اپنے روزے پر ہے اور روزے میں اسے کوئی چیز خارج نہیں کرتی مگر بالفعل افطار کرے اور نیت بھی نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ سحنون نے کہا: جس نے رات کو افطار کی نیت کی وہ کفارہ دے اور جس نے دن میں روزے کی نیت کی اسے کوئی نقصان نہیں لیکن وہ استحساناً قضا کرے۔ میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ جب رات ظاہر ہو جائے تو افطار کرنا شرعاً سنت ہے خواہ کچھ کھائے یا نہ کھائے۔ ابن عربی نے کہا: امام ابو اسحاق شیرازی سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے تین طلاق کی قسم اٹھائی کہ وہ گرم، سرد چیز پر روزہ افطار نہیں کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے وقت افطار کرے گا تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے حجت پکڑی ہے۔ جب رات ادھر سے آئے اور دن ادھر سے چلا جائے تو روزہ افطار کر دے (4)۔ امام ابو نصر بن صباغ صاحب الشامل سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصائم یحتجم، حدیث نمبر 2020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الحجامۃ والقئ للصائم، حدیث نمبر 1804، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب متی یحل فطر الصائم، حدیث نمبر 1818، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گرم یا سرد چیز پر افطار کرنا ضروری ہے اور امام ابو اسحاق نے جو جواب دیا وہ اولیٰ ہے کیونکہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اگر کسی نے بادل کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے، پھر اس نے روزہ افطار کر دیا پھر سورج ظاہر ہو گیا تو اکثر علماء کے قول کے مطابق اس پر قضا ہے۔ بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: ہم نے بادل والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں روزہ افطار کر دیا، پھر سورج طلوع ہو گیا۔ ہشام سے پوچھا گیا: انہیں قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ فرمایا: انہیں قضا لازم ہے۔ حضرت عمر نے اس مسئلہ میں فرمایا: مسئلہ آسان ہے۔ ہم نے وقت میں اجتہاد کیا۔ آپ نے قضا مراد لی۔ حضرت عمر سے مروی ہے، فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے، فرمایا: اس پر بھولنے والے کی طرح قضا نہیں ہے۔ یہی قول اسحاق اور اہل ظاہر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس قول کو رد کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 22: اگر روزہ افطار کیا دراں حالیکہ اسے سورج کے غروب ہونے میں شک تھا تو وہ قضا کے ساتھ کفارہ دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے مگر یہ کہ اس کا غالب گمان سورج کے غروب ہونے کا ہو۔ اور جسے فجر کے طلوع ہونے کا شک ہو تو اسے کھانے، پینے سے رکنا لازم ہے۔ اگر اس نے شک کے ساتھ کھایا تو اس پر قضا ہوگی جیسے بھولنے والے کا حکم ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اہل مدینہ وغیرہ کے علماء میں سے بعض اس پر کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے حتیٰ کہ اس کے لئے فجر کا طلوع ہونا واضح ہو جائے۔ ابن منذر کا یہی قول ہے۔ الکیا طبری نے کہا: ایک قوم نے گمان کیا کہ جب اس کے لئے اول فجر تک افطار مباح ہے جب اس نے اس گمان پر کھایا کہ فجر طلوع نہیں ہوئی تو اس نے شرع کی اجازت سے کھانے کے جواز کے وقت میں کھایا۔ پس اس پر قضا نہیں ہے۔ اسی طرح مجاہد اور جابر بن زید نے کہا ہے اور قضا کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب رمضان کی پہلی رات میں چاند مطلع کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے پھر اس نے کھایا۔ اس کے بعد ظاہر ہوا کہ آج رمضان کا دن تھا ہم بھی اس جیسے مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی طرح دار الحرب میں قیدی نے جب شعبان کا دن گمان کرتے ہوئے کچھ کھایا پھر اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس میں صوم وصال سے نہی کا تقاضا پایا جاتا ہے کیونکہ رات روزے کی غایت ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے(1)۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر، ابراہیم التیمی، ابو الجوزا، ابو الحسن دینوری وغیرہم صوم وصال رکھتے تھے۔ حضرت ابن زبیر سات دن وصال کا روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کرتے تھے تو کبھی گھی اور مصبر پیتے تھے حتیٰ کہ انتڑیاں بھر جاتی تھیں۔ فرمایا: ان کی انتڑیاں خشک ہوتی تھیں۔ ابو الجوزاء سات دنوں اور سات راتوں کا صوم وصال رکھتے تھے، اگر وہ کسی سخت آدمی کے بازو کو پکڑتے تو اس کا بازو توڑ دیتے۔ قرآن وسنت کا ظاہر صوم وصال سے منع کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سورج ادھر سے غروب ہو اور رات ادھر سے آجائے تو روزہ دار افطار کر دے۔ اس کو مسلم نے حضرت عبد اللہ بن اوفی کی حدیث سے نقل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا، جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو کوئی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ان کے ساتھ صوم وصال رکھا پھر عید الفطر کا چاند نظر آ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر چاند نظر نہ آتا تو میں اور زیادہ تمہیں صوم وصال رکھواتا، یہ آپ ان پر انکار کے طور پر فرما رہے تھے جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے: اگر ہمارے لئے مہینہ لمبا ہوتا تو ہم متواتر صوم وصال رکھتے رہتے تا کہ اعمال میں شدت کرنے والے شدت چھوڑ دیتے۔

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صوم وصال سے اجتناب کرو صوم وصال سے اجتناب کرو۔ یہ صوم وصال سے منع میں تاکید کے طور پر فرمایا۔ اور بخاری نے اس حدیث کو نقل فرمایا ہے۔ صوم وصال کو اس لئے ناپسند فرمایا کیونکہ اس میں قویٰ میں ضعف آ جاتا ہے اور بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ جمہور علماء میں سے بعض نے صوم وصال کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ظاہر کی مخالفت ہے اور اہل کتاب سے مشابہت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ صوم وصال نہ رکھو جو وصال کا ارادہ کرے وہ سحری تک وصال کرے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری ہیئت کی طرح نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا کھلانے والا ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور میرا پلانے والا ہے جو مجھے پلاتا ہے۔ علماء نے کہا: سحری تک فطر کی تاخیر میں اباحت ہے اور یہ وصال کی غایت ہے جو وصال کرنا چاہے اور ایک دن کو دوسرے دن کے ساتھ ملانے سے منع ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابن وہب (جو مالک کے شاگرد ہیں) کا قول ہے اور جنہوں نے وصال کے جواز پر حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے کہا: وصال سے اس لئے نہی فرمائی تھی کہ لوگوں کا زمانہ اسلام قریب تھا تو رسول اللہ ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ وہ وصال کی تکلیف اٹھائیں گے اور اعلیٰ مقامات کی کوشش کریں گے اور جہاد اور دشمن پر قوت جو اس سے زیادہ نفع بخش ہے اس میں کمزور پڑ جائیں گے اس وقت انہیں قوت و جہاد کی ضرورت ہے۔ جو نبی کریم ﷺ صوم وصال اور طاعات کے اعلیٰ مقام کو لازم پکڑتے تھے جب صحابہ نے وصال کے بارے میں پوچھا تو اپنے اور ان کے درمیان فرق ظاہر فرمایا اور انہیں بتایا کہ اس سلسلہ میں ان کی حالت، عام لوگوں کی حالت سے مختلف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری مثل نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ جب صحابہ کے دلوں میں ایمان مکمل ہو گیا اور ان کے سینوں میں مستحکم و راسخ ہو گیا اور مسلمانوں کی کثرت ہوگئی اور دشمنوں پر غالب آ گئے تو اولیاء اللہ نے صوم وصال رکھا اور اپنے لئے اعلیٰ مقامات کو لازم پکڑا۔

میں کہتا ہوں: اسلام کے ظہور اور دشمنوں کے مغلوب ہونے کے باوجود صوم وصال کو ترک کرنا اولیٰ ہے اور یہ اعلیٰ درجہ اور ارفع مقام ہے۔ اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور رات صوم شرعی کا زمانہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی رات کو نیت کے ساتھ روزہ رکھے تو اسے اس پر ثواب نہ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے متعلق خبر دی کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب مایجوز من اللو، حدیث نمبر 6700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ گمان کیا تو کہا: آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ آپ کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا کھانا، پینا دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان معانی اور لطائف پر محمول ہے جو آپ کے دل پر وارد ہوتے تھے۔ جب کوئی لفظ حقیقت و مجاز کا احتمال رکھتا ہو تو اصل حقیقت ہوتی ہے حتیٰ کہ کوئی دلیل وارد ہو جو حقیقت کو زائل کر دے پھر جب صحابہ نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے ساتھ صوم وصال رکھا آپ کی تو عادت تھی جیسا آپ نے اپنے متعلق خود خبر دی اور صحابہ ایسی عادت پر تھے حتیٰ کہ وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کا صبر کم ہوگا تو وہ صوم وصال نہیں رکھیں گے۔ یہ ہے آپ کے انکار کی حقیقت تا کہ وہ تعمق (انتہائی گہرائی) کو چھوڑ دیں اور اس شدت کو ترک کر دیں جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ اگر ہم (میں کھلایا اور پلایا جاتا ہو) کا اپنا معنی مراد لیں تو آپ حکماً افطار کرنے والے ہوں گے جیسے جس نے روزے میں چغلی کھائی یا جھوٹ کی گواہی دی تو وہ حکماً افطار کرنے والا ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔(1)

مسئلہ نمبر 24: روزہ دار کے لئے مستحب ہے کہ جب وہ افطار کرے تو کھجوروں، چھوہاروں اور پانی کے گھونٹوں سے افطار کرے جیسا کہ ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے سے پہلے کھجوروں سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوہاروں سے افطار کرتے اگر چھوہارے بھی نہ ہوتے تو پانی کے گھونٹ بھرتے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ دعا مانگتے: لَكَ صمنا و علی رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السميع العليم۔ ''ہم نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا، تیرے رزق پر افطار کیا تو ہماری طرف سے قبول فرما بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ کہتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ اجر ثابت ہے۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: حسین بن واقد اس میں منفرد ہیں اس کی سند حسن ہے(2)۔ ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کے پاس روزہ افطار کیا تو یہ کہا: افطر عندكم الصائمون و اكل طعامكم الابرار و صلت عليكم الملائكة (تمہارے پاس روزہ داروں نے روزہ افطار کیا، تمہارا کھانا نیکوکاروں نے کھایا اور تم پر فرشتوں نے درود بھیجا)۔ حضرت زید بن خالد جہنی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزہ دار کو روزہ افطار کرایا اسے ان جیسا اجر ملے گا اور ان کے اجروں سے بھی کچھ کم نہ ہو گا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ دار کے لئے افطار کے وقت کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو یہ فرماتے سنا کہ جب وہ افطار کرتے تو یہ دعا

1۔ صحیح بخاری، باب من لم يدع قول الزور و العمل به، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب القول عند الافطار، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مانگتے۔ اللھم انی اسألك برحمتك التی وسعت کل شیٔ ان تغفرلی (اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس رحمت کے طفیل اپنی مغفرت کا سوال کرتا ہوں جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے جب افطار کرتا ہے تو افطاری سے خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملاقات کرے گا تو اپنے روزے سے خوش ہوگا۔

مسئلہ نمبر 25: شوال کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے جیسا کہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوایوب انصاری سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے پیچھے شوال کے روزے رکھے اس کے لئے پورے زمانہ کے روزوں کے ثواب کی طرح ثواب ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سعد بن سعید انصاری مدنی کی حدیث ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے بخاری نے کوئی چیز نقل نہیں کی۔ اور ابو اسماء الرجی عن ثوبان مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے عمدہ سند کے ساتھ تفسیر سے یہ حدیث مروی ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کے بدلے دس نیکیاں رکھی ہیں، رمضان کا مہینہ دس مہینوں کا بدل ہے اور عیدالفطر کے بعد چھ ایام پورے سال کا بدل ہیں (1)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ان ایام کے روزوں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں مکروہ کہا ہے اس خوف سے کہ جاہل لوگ رمضان کے ساتھ اس چیز کو نہ ملا دیں جو رمضان میں سے نہیں ہے اور جس کا خوف امام مالک نے کیا وہ واقع بھی ہوا حتیٰ کہ خراسان کے بعض شہروں میں رمضان کی عادت کے مطابق سحری کے وقت اٹھتے تھے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام مالک خود یہ روزے رکھتے تھے۔ امام شافعی نے ان روزوں کو مستحب کہا ہے، امام ابو یوسف نے ان کو مکروہ کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 26: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جماع اعتکاف کو فاسد کر دیتا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو اعتکاف کی حالت میں جان بوجھ کر جماع کرے گا وہ اپنے اعتکاف کو فاسد کرنے والا ہوگا پھر جب کوئی ایسا کرے تو اس پر جو ہوگا اس میں اختلاف ہے۔ حسن بصری اور زہری نے کہا: ایسے شخص پر وہی ہوگا جو رمضان میں اپنی اہلیہ سے جماع کرنے والے پر ہوتا ہے اور رہی بغیر جماع کے مباشرت اگر اس سے تلذذ کا قصد کیا ہوگا تو یہ مکروہ ہے۔ اگر تلذذ کا قصد نہیں کیا تو مکروہ نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کو کنگھی کرتی تھی جبکہ آپ معتکف ہوتے تھے (2) لامحالہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کو اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوں گی۔ یہ دلیل ہے کہ بغیر شہوت کے مباشرت ممنوع نہیں ہے۔ یہ عطا، امام شافعی اور ابن منذر کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ معتکف نہ مباشرت کرے نہ بوسہ دے۔ اگر ایسا کرے تو اس پر حد ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔
امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ یہ مزنی کا قول ہے۔ مسائل

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی ثواب من فطر صائما، حدیث نمبر 1705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، باب المعتکف یدخل رأسه البیت للغسل، حدیث نمبر 1905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف میں انہوں نے دوسری جگہ فرمایا: وطی سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا مگر ایسی وطی جو حد کو واجب کرتی ہے۔ مزنی نے حج اور روزے میں اس کی اصل پر قیاس کرتے ہوئے یہ اختیار کیا۔

مسئلہ نمبر 27: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ لغت میں اعتکاف کا معنی ملازمت ہے۔ کہا جاتا ہے: عکف علی الشیٔ جب کوئی کسی چیز کو لازم پکڑ لے اور اس کی طرف متوجہ ہو۔ راجز نے کہا: عکف النبیط یلعبون الفنزجا (نبطی نے رقص، کھیل کو لازم پکڑا۔)

ایک اور شاعر نے کہا:

وظل بنات اللیل حولی عکفا	عکوف البواکی بینهن(1) صریع

خیالات میرے اردگرد جمے رہے، رونے والیوں کے بیٹھنے کی طرح جن کے درمیان قبر ہو۔

جب معتکف اعتکاف کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے عمل کو لازم پکڑتا ہے تو اسے یہ اسم لازم ہوتا ہے اور عرف شرع میں اعتکاف سے مراد مخصوص جگہ میں مخصوص شرط پر مخصوص وقت میں مخصوص اطاعت کو لازم پکڑنا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہیں ہے۔ یہ قربتوں میں سے ایک قربت ہے اور نوافل میں سے ایک نفل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کا عمل کیا اور اگر اپنے نفس پر لازم کرے گا تو اس پر لازم ہو جائے گا۔ اس شخص کے لئے اعتکاف کرنا مکروہ ہے جسے اعتکاف کے حقوق پورے کرنے سے عجز کا اندیشہ ہو۔

مسئلہ نمبر 28: علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الْمَسٰجِدِ پھر علماء کا مساجد کی مراد میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد مساجد کی ایک خاص قسم ہے اور وہ وہ ہے جسے کسی نبی نے تعمیر کیا ہو جیسے مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد ایلیاء (بیت المقدس) حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے۔ ان کے نزدیک اعتکاف ان مساجد کے علاوہ کسی مسجد میں جائز نہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف صرف جامع مسجد میں جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک آیت میں اس جنس کی مساجد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ عروہ، حکم، حماد، زہری، ابو جعفر محمد بن علی کا قول ہے اور امام مالک کا ایک قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر اور ابو قلابہ وغیرہم سے مروی ہے۔ یہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ ان کی حجت آیت کو عموم پر محمول کرنا ہے ہر اس مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس میں امام اور مؤذن ہو۔ امام مالک کا ایک قول بھی یہی ہے۔ ابن علیہ، داؤد بن علی طبری اور ابن منذر کا قول بھی یہی ہے۔ دار قطنی نے ضحاک سے انہوں نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ دار قطنی نے کہا: ضحاک نے حضرت حذیفہ سے نہیں سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 29: امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک کم از کم اعتکاف ایک دن اور ایک رات ہے۔ اگر کسی نے کہا: مجھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر اللہ کیلئے اعتکاف ہے تو اس پر ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر مانی تو ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ سحنون نے کہا: جس نے ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر ایک دن کی نذر مانی تو بغیر رات کے دن کا اعتکاف لازم ہوگا اور اگر رات کی نذر مانی تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں جیسا کہ سحنون نے کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر وہی ہے جو اس نے نذر مانی اگر رات کی نذر مانی تو رات کا اعتکاف ہوگا، اگر دن کی نذر مانی تو دن کا اعتکاف ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: کم از کم ایک لحظہ کا اعتکاف ہے اس کے اکثر کی کوئی حد نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بعض اصحاب نے کہا: ایک ساعت (گھڑی) کا اعتکاف بھی صحیح ہے۔ اس قول کی بناء پر اعتکاف کی شرط سے روزہ نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل سے ایک قول مروی ہے اور یہی قول داؤد بن علی اور ابن علیہ کا ہے، ابن منذر اور ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف رمضان میں ہوتا تھا اور یہ محال ہے کہ رمضان کا روزہ رمضان کے لئے اور دوسرے دنوں کے لئے ہو۔ اگر معتکف نے رمضان میں اپنے روزے سے نفل اور فرض روزے کی نیت کی تو اس کا روزہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک فاسد ہے۔ یہ معلوم ہے کہ معتکف کو اعتکاف کی رات میں عورتوں سے مباشرت سے اجتناب لازم ہے جس طرح دن میں اجتناب لازم ہے اور اعتکاف کی رات اس کے اعتکاف میں داخل ہے اور رات روزے کا محل نہیں ہے اسی طرح دن بھی روزے کا محتاج نہیں ہے۔ اگر وہ روزہ رکھے تو بہتر ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور مؤطا میں قاسم بن محمد اور نافع مولی حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ اعتکاف روزے کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوۡہُنَّ وَ اَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ ۙ فِی الۡمَسٰجِدِ۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ کیا ہے۔ یحییٰ نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک معاملہ اسی پر ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو عبد اللہ بن بدیل نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات اور دن کے اعتکاف کی (کعبہ کے پاس) نذر مانی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف کر اور روزہ رکھ۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابن بدیل، عمرو سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے۔ دارقطنی نے کہا: سوید بن عبد العزیز نے سفیان بن حسین سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت عروہ سے انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک روزے کی شرط سے نہیں ہے کہ وہ اعتکاف کے لئے ہو بلکہ اعتکاف کے لئے روزہ ہو، رمضان کے لئے ہو، نذر کے لئے ہو اور کسی اور وجہ سے ہو۔ صحیح یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے نے نذر مانی تو اس کی نذر کو اصل شرع میں

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یر علیہ صوما اذا اعتکف۔ حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کے مقتضا کی طرف پھیرا جائے گا۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے نماز کی نذر مانی تو وہ اس پر لازم ہے اس پر خاص اس نماز کے لئے پاک ہونا ضروری نہیں بلکہ جائز ہے کہ کسی دوسری چیز کے لئے کی گئی طہارت سے بھی اسے ادا کرنا جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 30: معتکف کے لئے اپنی اعتکاف کی جگہ سے نکلنا جائز نہیں مگر وہ کام جو اس کے لئے ضروری ہو جیسا کہ ائمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرتے تھے تو اپنے سر کو میرے قریب کرتے تھے میں آپ کو کنگھی کیا کرتی تھی اور گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر حاجت انسانی کے لئے (1) (یعنی پیشاب، پاخانہ کے لئے)۔ اس مسئلہ میں ائمہ اور امت کا کوئی اختلاف نہیں جب معتکف ضرورت کے لئے باہر نکلے تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپس آجائے اور اپنے سابقہ اعتکاف پر بنا کرے اور اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ضرورت میں سے واضح مرض اور حیض ہے۔ ان کے علاوہ امور کے لئے نکلے گا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک کے مذہب کو اس کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں اسی طرح امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، حسن، نخعی مریض کی عیادت کرتے تھے اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن ان سے ثابت نہیں۔ اسحاق نے واجب اعتکاف اور نفل اعتکاف میں فرق کیا ہے۔ واجب اعتکاف کے بارے میں فرمایا: اس میں مریض کی عیادت نہ کرے اور جنازوں میں شرکت نہ کرے اور نفلی اعتکاف کے بارے میں فرمایا: وہ اعتکاف کی ابتدا میں جنازوں میں حاضر ہونے، مریضوں کی عیادت کرنے اور جمعہ پڑھنے کی شرط لگا لے۔ امام شافعی نے فرمایا: مریض کی عیادت، جنازوں میں حاضری اور دوسری ضروریات کے لئے اعتکاف سے نکلنے کی شرط لگانا صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں امام احمد نے مختلف روایات بیان کی ہیں کبھی منع فرمایا، کبھی فرمایا: مجھے امید ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے امام مالک کی طرح فرمایا ہے: اعتکاف میں شرط نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: معتکف اعتکاف سے نہ نکلے مگر جس کے لئے نکلنا ضروری ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاجات ضروریہ کے لئے نکلتے تھے۔

مسئلہ نمبر 31: معتکف کا جمعہ کے لئے نکلنا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے اور سلام پھیرنے کے ساتھ ہی واپس آجائے کیونکہ وہ ایک فرض کے لئے نکلا تھا اور اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ یہ ابن الجہم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابن عربی اور ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جو دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ کرے یا دس دنوں کی نذر مانے تو وہ جامع مسجد میں اعتکاف کرے جب وہ کسی دوسری مسجد میں اعتکاف کرے تو جمعہ کے لئے جانا اس کو لازم ہے اور اس کا اعتکاف باطل ہے۔ عبدالملک نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے، جمعہ میں حاضر ہو اور پھر اپنی جگہ واپس آجائے اس کا اعتکاف صحیح ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ یہ ارشاد عام ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف واجب نہیں سنت ہے اور جمہور ائمہ کا اجماع ہے کہ جمعہ ذوات پر فرض ہے۔ جب دو واجب کسی پر جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے مؤکد ہو تو مؤکد کو مقدم کیا جاتا ہے۔ جب مندوب اور واجب جمع ہوں تو پھر کیا کیفیت ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب لا یدخل البیت الا لحاجة، حدیث نمبر 1889، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسی نے بھی جمعہ کو ترک کرنے کا قول نہیں کیا۔ جمعہ کی طرف نکلنا یہ حاجت سے ہے۔

مسئلہ نمبر 32: معتکف جب کبیرہ گناہ کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا کیونکہ کبیرہ گناہ عبادت کی ضد ہے جس طرح کہ حدث، طہارت اور نماز کی ضد ہے۔ اور جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کیا ہے ان کا چھوڑنا اعتکاف کی عبادت میں اعلیٰ منازل میں سے ہے۔ یہ ابن خویز منداد نے مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33: مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو صبح کی نماز پڑھتے پھر اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ (الحدیث)

معتکف کے اعتکاف میں داخل ہونے کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہا ہے، ثوری اور لیث سے ایک قول یہی مروی ہے۔ ابن منذر اور تابعین کے ایک طائفہ کا یہی قول ہے۔ ابوثور نے کہا: یہ وہ شخص کرے جس نے دس دنوں کی نذر مانی ہو۔ اگر دس سے زیادہ کی نذر مانی ہو تو سورج غروب ہونے سے پہلے داخل ہو جائے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب اس نے ایک مہینہ کا اعتکاف اپنے اوپر واجب کیا ہو تو وہ اس دن کی رات سے سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائے۔ امام مالک نے فرمایا: اسی طرح جس نے ایک دن یا زیادہ دنوں کے اعتکاف کی نیت کی ہو۔ یہی امام ابوحنیفہ، ابن ماجشون اور عبدالملک کا قول ہے کیونکہ پہلی رات اعتکاف کے دنوں میں داخل ہے وہ اعتکاف کا زمانہ ہے۔ دن کی طرح اس کا بعض حصہ چھوڑا نہیں جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: جب کسی نے کہا مجھ پر اللہ کے لئے ایک دن (کا اعتکاف) ہے وہ طلوع فجر سے پہلے داخل ہو اور سورج غروب ہونے کے بعد نکلے۔ یہ ان کا قول مہینے والے اعتکاف کے بارے میں قول کے خلاف ہے۔ لیث نے ایک قول میں اور زفر نے کہا: فجر کے طلوع ہونے سے پہلے داخل ہو۔ مہینہ، اور ایک دن ان کے نزدیک حکم میں برابر ہیں اسی طرح امام ابو یوسف سے مروی ہے۔ قاضی عبدالوہاب کا بھی یہی قول ہے۔ رات اعتکاف میں تبعاً داخل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے اور رات روزے کا زمانہ نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ اعتکاف سے مقصود دن ہے رات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت عائشہ کی حدیث ان اقوال کو رد کرتی ہے تنازع کے وقت یہ حجت ہے یہ ایسی حدیث ہے جو ثابت ہے اس کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ نمبر 34: امام مالک نے اس شخص کے لئے مستحب قرار دیا ہے کہ جو دس دنوں کا اعتکاف کرے وہ عیدالفطر کی رات مسجد میں گزارے حتیٰ کہ صبح یہاں سے عیدگاہ کی طرف جائے۔ یہی امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی اور امام اوزاعی نے کہا: جب سورج غروب ہو تو نکل جائے۔ یہ سحنون نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کیونکہ مہینہ کے ختم ہونے کے ساتھ دس دن بھی ختم ہو گئے اور رمضان شریف کے آخری دن کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ سحنون نے کہا: یہ وجوب کے طور پر ہے۔ پس جو عیدالفطر کی رات نکلے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

ابن ماجشون نے کہا: ہم نے جو مہینہ کے ختم ہونے کے متعلق کہا ہے وہ اس قول کا رد کرتا ہے اگر عیدالفطر کی رات ٹھہرنا

اعتکاف کی شرط سے ہوتا تو وہ اعتکاف صحیح نہ ہوتا جو فطر کی رات سے متصل نہ ہوتا اور اس کے جواز پر اجماع ہے کہ عید الفطر کی رات ٹھہرنا معتکف کے لئے اعتکاف کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے۔ یہ روزے کے احکام اور اعتکاف جو آیات کے متعلق تھے کافی وشافی ہیں، جو ان پر انحصار کرنے والا ہے اس کے لئے کفایت ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 35: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں پس ان کی مخالفت نہ کرو۔ تِلْكَ، ان اوامر ونواہی کی طرف اشارہ ہے۔ الحدود سے مراد رکاوٹیں ہیں اور الحد سے مراد منع کرنا ہے۔ اسی وجہ سے لوہے کو حدید کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہتھیار کو بدن تک پہنچنے سے روکتا ہے، چوکیدار اور جیل کے داروغے کو حداد کہا جاتا ہے کیونکہ جو گھر کے اندر ہوتے ہیں ان کو نکلنے سے روکتا ہے اور باہر والوں کو اندر جانے سے روکتا ہے۔ ان احکام کو اللہ کی حدود اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ان چیزوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہوتے اور جو ان سے ہوتے ہیں ان کو خروج سے روکتے ہیں۔ اسی سے گناہوں کی حدود ہیں جو گناہ کرنے والوں کو دوبارہ گناہ کرنے سے روکتی ہیں۔ اسی طرح عدت والی عورت کو حاد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زیب وزینت سے رک جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 36: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان حدود کو بیان فرمایا اسی طرح تمام احکام کو بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان سے تجاوز کرنے سے بچو۔ الایات سے مراد وہ علامات ہیں جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لَعَلَّهُمْ لوگوں کے حق میں ترجی (امید) ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی اس شخص میں خاص ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت کو آسان فرماتا ہے ان آیات کی دلالت کی وجہ سے جن کے ضمن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ (1)

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت عبدان بن اشوع حصری کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے امرء القیس کندی پر مال کا دعویٰ کیا تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ امرء القیس نے انکار کیا۔ اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ قسم سے رک گیا۔ اس نے اپنی زمین کا فیصلہ عبدان کے سپرد کر دیا اور اس سے جھگڑا نہ کیا (2)۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ زاد المسیر، صفحہ 168، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے خطاب حضرت محمد ﷺ کی تمام امت کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض، بعض کا مال ناحق نہ کھائے۔ اس میں جوا، دھوکا، غصب، حقوق سے انکار اور ایسی چیز جس کے دینے پر مالک خوش نہیں ہے یا ایسی چیز جس کو شریعت نے حرام کیا ہے اگرچہ مالک خوشی سے دینے پر راضی بھی ہو جیسے زانیہ کی کمائی، کاہن کا نذرانہ، شرابوں اور خنازیر کی قیمتیں وغیرہ داخل ہیں۔ اور بیع میں غبن داخل نہیں جبکہ بائع اس چیز کی حقیقت بتا دے جو اس نے بیچی کیونکہ اس صورت میں غبن (زیادتی) گویا ہبہ ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۂ نساء میں آئے گا۔ اموال کو ان لوگوں کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے جن کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جس کو روکا گیا ہے اور جس سے روکا گیا ہے جیسا فرمایا: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 85) ایک قوم نے کہا: اس آیت سے مراد کھیلوں میں جو مال لگائے جاتے ہیں، گانے والیوں کے مال، شراب کی قیمت اور برے لوگوں رشوت خور وغیرہ کے اموال ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: جس نے کسی کا مال شرع کی اجازت کے بغیر لیا اس نے باطل ذریعہ سے کھایا وہ مال بھی باطل شمار ہوگا جس کا فیصلہ قاضی تیرے حق میں کر دے جبکہ تو جانتا ہے کہ تو باطل پر ہے۔ قضا قاضی سے حرام، حلال نہیں ہو جاتا کیونکہ قاضی تو ظاہر حال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اموال کے بارے میں اجماع ہے اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی کی قضا فروج (شرمگاہوں) میں باطناً بھی نافذ ہو جاتی ہے۔ جب قضا قاضی اموال میں باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتی تو فروج میں بدرجہ اولیٰ تبدیلی نہیں کرے گی (☆)۔ ائمہ نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس جھگڑا لے کر آتے ہو شاید تم میں سے کوئی دوسرے سے حجت بیان کرنے میں زیادہ فصیح ہو میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں نے (گواہیاں، دلائل) سنے تو میں اس کے بھائی کے مال سے کوئی چیز اس کے لئے کر دوں تو وہ نہ لے میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا اسے دینے والا ہوں گا (1)۔ ایک روایت میں ہے: وہ اس کو اٹھا لے یا اس کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کے مطابق جمہور علماء اور ائمہ فقہاء کا قول ہے۔ یہ نص ہے کہ حاکم کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتا خواہ وہ مال، خون اور شرمگاہوں کے متعلق ہو۔ مگر امام ابوحنیفہ سے فروج کے متعلق جو قول حکایت کیا گیا ہے کہ باطن میں حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر دو جھوٹے گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور حاکم ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ کر دے کیونکہ وہ گواہ اس کے نزدیک عادل ہیں تو اس عورت کی شرمگاہ عدت کے بعد نئے نکاح کرنے والے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ جو یہ جانتا بھی ہے کہ فیصلہ غلط تھا۔ اسی طرح اگر ان گواہوں میں سے بھی ایک اس سے نکاح کر لے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ جب وہ ظاہر میں تمام مردوں کے لئے حلال ہو گئی تو گواہ اور دوسرے سب برابر ہیں۔ کیونکہ قاضی کی قضا نے اس کی عصمت کو ختم کر دیا اور اس میں تحلیل و تحریم کی ظاہر و باطن میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)

☆۔ ائمہ احناف کا کہنا یہ ہے کہ جب عورت ایسی ہے جو مرد پر حرام نہیں اور اس کے عقد میں آ سکتی ہے تو قاضی کے فیصلہ سے پہلے بطور اقتضاء النص نکاح تسلیم کیا جائے گا تا کہ دونوں کا ایک دوسرے سے انتفاع درست ہو جائے۔ ہدایہ۔ کتاب النکاح۔

ایک نئی صورت پیدا کردی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دوسرے خاوندوں کے لئے حلال نہ ہوتی اور امام ابو حنیفہ نے لعان سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: بیوی جھوٹے لعان کی وجہ سے اپنے خاوند سے جدائی تک پہنچ گئی۔ جس کے بارے میں اگر قاضی کو اس کے کذب کا علم ہو جاتا تو وہ اسے حد لگاتا، ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اور پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق سے کسی چیز کا فیصلہ کردوں تو وہ اسے نہ لے، کے عموم میں شامل نہیں (1)۔ (الحدیث)

مسئلہ نمبر 4: اس آیت سے ہر موافق و مخالف دلیل پکڑنے والا ہے اپنے حکم کے بارے میں جو وہ اپنے لئے دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ جائز نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کرتا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کہا جائے گا ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ باطل ہے حتیٰ کہ دلیل کے ساتھ واضح کرے۔ اس وقت اس عموم میں داخل ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ معاملات میں باطل جائز نہیں۔ اس میں باطل کی تعیین نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ لغت میں باطل کا معنی ہے: جانے والا، زائل ہونے والا۔ کہا جاتا ہے: بطل یبطل بطولا وبطلانا۔ باطل کی جمع بواطل ہے۔ بطولة کی جمع اباطیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا یاتیه الباطل۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ابلیس ہے۔ وہ قرآن میں کمی، بیشی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هو الله الباطل۔ یعنی شرک۔ البطله، جادوگروں کو کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ودیعت ہے اور ایسی چیز ہے جس میں دلیل نہ ہو۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ یتیم کا مال ہے جو اوصیاء کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہی حکام کے پاس معاملہ لے جاتا ہے جب اس سے اس مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا کچھ حصہ ہتھیا لے اور ظاہراً اس کے لئے حجت بھی ہو۔ زجاج نے کہا: تم اس کے مطابق عمل کرتے ہو احکام کا ظاہر جس کو ثابت کرتا ہے اور تم اس کو ترک کرتے ہو جس کے بارے تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے۔ کہا جاتا ہے: ادلی الرجل بحجته او بالامر الذی یرجو النجاح به (اس شخص نے اپنی حجت پیش کی یا وہ امر پیش کیا جس کے ساتھ وہ نجات کی امید رکھتا ہے) اس کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو کنویں میں اپنا ڈول پھینکتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: ادلی دلوہ اس نے ڈول چھوڑا دلاھا، ڈول نکالا۔ الدلو، الدلاء کی جمع ادلٍ و دلاءٌ و دُلِیٌّ۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ باطل کے ذریعے مال کھانے اور حکام تک حجج باطلہ کے ساتھ معاملات کو لے جانا جمع نہ کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (البقرہ: 42) یہ تیرے اس قول کے قبیل سے ہے: لا تاکل السمک و تشرب اللبن مچھلی کا کھانا اور دودھ کا پینا جمع نہ کر۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اپنے اموال کے ساتھ حکام سے تعلق نہ جوڑو اور انہیں رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے لئے اس سے زیادہ کا فیصلہ کریں۔ پس باء مطلق ملانے کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول راجح ہے کیونکہ حکام رشوت لینے والے ہوتے ہیں مگر جسے اللہ محفوظ رکھے اور وہ بہت کم ہیں۔ دونوں الفاظ متناسب ہیں۔ تدلوا، ارسال الدلو سے مشتق ہے الرشوة، الرشاء سے ہے۔ وہ اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رسی کو لمبا کرتا ہے تا کہ حاجت کو پورا کرے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس قول کو تدلوا بھا کا قول قوت دیتا ہے تدلوا، تاکلوا پر عطف کی بناء پر مجزوم ہے جیسا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مصحف حضرت ابی میں ہے ولا تدلوا حرف نہی کے تکرار کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت تدلوا کے جزم کی تائید کرتی ہے جو اکثر کی قراءت ہے۔ بعض نے فرمایا تدلوا ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک اس جیسی مثال میں ناصب ان مضمرہ ہوتا ہے اور بھا میں ضمیر کا مرجع اموال ہیں اور پہلے قول کے مطابق اس کا مرجع حجت ہے اور اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے دوسرے قول کو اموال کا ذکر بھی قوت دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔ الصحاح میں ہے: الرشوۃ معروف ہے الرُّشوۃ بھی اس کی مثل ہے اس کی جمع رُشًی و رِشًی ہے۔ رشاہ یرشوہ، وارتشی کا معنی رشوت لینا ہے استرشی فی حکمہ۔ یعنی حکم پر اس نے رشوت طلب کی۔ میں کہتا ہوں: اس دور میں حکام سراپا رشوت ہیں۔ ان کے بارے رشوت لینے کا گمان نہیں بلکہ یقیناً رشوت لیتے ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِتَاْكُلُوْا، لام کی کی وجہ سے منصوب ہے فَرِيْقًا ٹکڑا، جز کو کہتے ہیں۔ فریق کو قطعہ اور بعض سے تعبیر فرمایا۔ الفریق بکریوں کا چھوٹا سا ریوڑ جو بڑے ریوڑ سے جدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لتاکلوا اموال فریق من الناس۔ بِالْاِثْمِ اس کا معنی ظلم اور تعدی ہے اس کو اثم اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ظلم کرنے والے کے ساتھ گناہ متعلق ہوتا ہے اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم اس کا بطلان اور گناہ جانتے ہو۔ یہ جرأت و معصیت میں مبالغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اہل سنت کا اتفاق ہے کہ جس نے وہ چیز لی جس پر مال کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اس کی وجہ سے اسے فاسق کہا جائے گا کیونکہ اس پر اس کا لینا حرام تھا۔ لیکن بشر بن معتمر اور اس کے متبعین معتزلیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: مکلف کو فاسق نہیں کہا جائے گا مگر دوسو دراہم لینے کے ساتھ۔ اس سے کم میں فاسق نہیں کیا جائے گا۔ ابن الجبائی کا قول اس کے خلاف ہے اس نے کہا: دس دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا دس سے کم میں فاسق نہیں کہا جائے گا۔ ابن ہذیل کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: پانچ دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا۔ اور بعض بصرہ کے قدریوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: ایک درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا اس سے کم میں نہیں۔ یہ تمام اقوال قرآن و سنت سے اور امت کے علماء کے اتفاق سے مردود ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2) (الحدیث) اس کی صحت پر اتفاق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 260، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحریم الدماء، صفحہ 61، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

''دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) فرمایئے: یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ''۔

اس میں بارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ یہ ان سوالوں میں سے ہے جو یہود نے پوچھے تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت معاذ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہود ہم پر غالب آ گئے وہ ہم سے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ چاند کو کیا ہے کہ یہ باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ برابر اور گول ہو جاتا ہے پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ پہلی حالت پر ہو جاتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب مسلمان قوم کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے متعلق سوال تھا۔ اس چاند کے آخری راتوں میں چھپنے، اس کے مکمل ہونے اور سورج کی حالت سے مختلف ہونے کا سبب کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَنِ الْاَهِلَّةِ، اهلہ جمع ہے هلال کی۔ اس کو جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ چاند حقیقت میں ایک ہے اس حقیقت سے کہ ایک مہینہ میں ایک ہوتا ہے اور دوسرے مہینہ میں دوسرا ہوتا ہے۔ مہینہ کے تمام احوال چاندوں سے ہوتے ہیں اور اھلہ سے مراد مہینے ہیں، کبھی شہر سے چاند مراد ہوتا ہے کیونکہ چاند مہینہ میں وارد ہوتا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

اخوان من نجد على ثقة　　　والشهر مثل قلامة الظفر

اس شعر میں شہر سے مراد چاند ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چاند کو شہر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ہاتھ اس کی رؤیت کی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اس کو شہرت دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں اور ھلال کے لفظ کا اطلاق مہینہ کی آخری دو راتوں اور آغاز کی دو راتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: پہلی تین راتوں کو کہا جاتا ہے۔ اصمعی نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو باریک دھاگے کی طرح گول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ آسمان کو روشن کرتا ہے اور یہ ساتویں کی رات میں ہوتا ہے(2)۔ ابو العباس نے کہا: چاند کو ہلال اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کے متعلق خبر دینے کے لئے اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں۔ اسی سے استهل الصبی ہے جب بچے کے چیخنے کے ساتھ اس کی زندگی ظاہر ہو۔ استهلّ وجههٗ فرحاً و تهلل جب اس میں سرور ظاہر ہو۔ ابو کبیر نے کہا:

واذا نظرت الى اسرة وجهه　　　برقت كبرق العارض المتهلل

کہا جاتا ہے: اهللنا الهلال جب ہم مہینہ میں داخل ہوں، جوہری نے کہا: أُهلّ الهلال واستُهلّ۔ مجہول کا صیغہ استعمال ہوتا ہے استهلّ بمعنی تبیّن (ظاہر ہونا) بھی بولا جاتا ہے۔ أَهلّ نہیں کہا جاتا، کہا جاتا ہے: اهللنا عن ليلة كذا اور

1۔ زاد المسیر، صفحہ 169، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 261، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اهللناه فهلّ نہیں کہا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ہم نے اسے داخل کیا تو وہ داخل ہو گیا۔ یہ اس کا قیاس ہے۔ ابونصر عبد الرحیم القشیری نے اپنی تفسیر میں کہا جاتا ہے: اهل الهلال واستهلّ واهللنا الهلال واستهللنا۔

مسئلہ نمبر 3: ہمارے علماء نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ قرضہ ادا کرے گا یا ایسا کرے گا فی الهلال اور رأس الهلال او عند الهلال۔ پھر اس نے وہ کام چاند دیکھنے کے دو دن بعد کیا یا ایک دن بعد کیا تو وہ حانث نہیں ہو گا۔ اور تمام مہینے تمام عبادات و معاملات کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس آیت میں چاند کے بڑھنے اور کم ہونے کی حکمت بیان ہو رہی ہے۔ مدتوں، معاملات، قسموں، حج، تعداد، روزہ، عید، مدت حمل، اجارات، کرایوں کے علاوہ دوسرے بندوں کی مصلحتوں سے اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (الاسراء: 12) اس آیت کی وضاحت آگے آئے گی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (یونس: 5) چاندوں کا شمار کرنا، دنوں کے شمار سے آسان ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: جو ہم نے ثابت کیا ہے اس پر اہل ظواہر اور ان کے ہمنواؤں کا رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ مساقات (درختوں کو پانی لگانا) کا عمل مجہول عدل تک غیر معلوم سالوں تک جائز ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف کھیتی اور کھجوروں پر یہود کو عامل مقرر کیا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے بغیر کسی وقت کے تعین کے۔ اس میں اہل ظواہر کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو کہا تھا: میں تمہیں ان زمینوں پر باقی رکھوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں باقی رکھے گا(1)۔ یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی آپ اس فیصلہ میں اپنے رب کے منتظر تھے کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں۔ شریعت نے اجازت اور تمام معاملات کے معانی و مطالب کو پختہ و مضبوط کر دیا ہے۔ یہی علماء امت کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَوَاقِيْتُ یہ میقات کی جمع ہے جس کا معنی ہے: وقت۔ بعض نے فرمایا: میقات، وقت کا منتہیٰ ہے اور مواقیت غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی احاد میں کوئی مثال نہیں یہ جمع ہے اور جمع کی نہایت ہے، کیونکہ اس کی جمع نہیں بنائی جاتی۔ پس یہ ایسی ہو گی جس میں گویا تکرار ہو چکا ہے اور قواریر منصرف ہے کیونکہ وہ آیت کے سرے پر واقع ہوا ہے اس کو تنوین دی گئی ہے جس طرح قوافی کو تنوین دی جاتی ہے۔ یہ تنوین الصرف نہیں جو کسی اسم کے معرب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَجِّ جمہور کی قراءت میں حا پر فتحہ ہے۔ ابن ابی اسحاق نے پورے قرآن میں اسے حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حج البیت جو سورہ آل عمران میں ہے اس میں بھی حا کے کسرہ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، صفحہ 452، جلد 1 (وزارت تعلیم)

پڑھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: الْحَجّ جیسے الرد اور الشدّ۔ اور الحِج جیسے الذِ کر۔ یہ دونوں مصدر ہیں اور ہم معنی ہیں بعض نے فرمایا: حاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور حاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ نے حج کا ذکر علیحدہ فرمایا کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس میں وقت کی معرفت کی احتیاج ہے۔ اس میں وقت سے تاخیر جائز نہیں بخلاف عربوں کے نظریہ کے وہ عدد اور مہینوں کی تبدیلی کے ساتھ حج کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول اور فعل کو باطل کر دیا۔ اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 8: امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ اس آیت کی وجہ سے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام چاندوں کو اس کے لئے ظرف بنایا ہے۔ پس تمام مہینوں میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے۔ امام شافعی نے اس میں مخالفت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ: 197) جیسا کہ آگے آئے گا، اس آیت کا معنی ہے بعض چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں، بعض حج کے لئے وقت ہیں یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: الجاریۃ لزید و عمرو۔ یہ لونڈی زید اور عمرو کے لئے ہے یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی کا بعض زید کے لئے ہے اور بعض عمرو کے لئے ہے۔ یہ کہنا جائز نہیں کہ تمام لونڈی زید کے لئے ہے اور تمام عمرو کے لئے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں اور تمام چاند حج کا وقت ہیں۔ اگر بعض مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: بعضھا مواقیت للناس و بعضھا مواقیت للحج۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: ان شھر رمضان میقات لصوم زید و عمرو رمضان کا مہینہ زید اور عمرو کے روزے وقت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام رمضان ہر ایک کے روزے کے وقت ہے اور جو انہوں نے لونڈی کی مثال دی تھی وہ صحیح ہے کیونکہ پوری لونڈی کا زید کے لئے ہونا اور پوری لونڈی کا عمرو کے لئے ہونا محال ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا زید کے لئے وقت ہونا اور عمرو کے لئے وقت ہونا صحیح ہے، پس جو انہوں نے کہا: وہ باطل ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے کوئی سامان بیچا معلوم سامان معلوم قیمت کے ساتھ عربوں کے مہینوں سے معلوم مدت تک یا ایسے ایام تک جن کی تعداد معروف ہو، بیع جائز ہے۔ اسی طرح معلوم مدت تک بیع سلم کے بارے میں کہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس نے فصل کاٹنے تک یا گہنے تک یا عطا تک یا اس کے مشابہ کوئی غیر معین وقت تک کے لئے کوئی چیز بیچی۔ امام مالک نے فرمایا: یہ جائز ہے کیونکہ یہ معروف ہے۔ ابو ثور کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے کہا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہوگی۔ اس طرح نمازیوں کے واپس آنے تک کوئی چیز بیچی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ عطا کرنے تک کوئی چیز خریدتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرمایا ہے اور وقت کو ان کی بیوع اور مصالح میں ان کی علامت بنایا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: یہی امام شافعی اور نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول صحیح ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 261، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 10: جب چاند بڑا دکھائی دے تو ہمارے علماء نے کہا: اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ وہ اسی رات کا ہوگا۔ مسلم نے ابوالبختری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم عمرہ کے لئے نکلے۔ جب ہم نخلہ کے بطن میں اترے۔ فرمایا: ہمیں چاند نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کہا: یہ تین راتوں کا ہے، بعض نے کہا: دو راتوں کا ہے۔ فرمایا: ہم حضرت ابن عباس سے ملے۔ ہم نے کہا: ہم نے چاند دیکھا۔ بعض نے کہا: تین راتوں کا ہے بعض نے کہا: دو راتوں کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: کس رات تم نے اسے دیکھا تھا؟ ہم نے کہا: فلاں رات، حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے چاند کو دیکھنے کے لئے لمبا کیا وہ اسی رات کا ہے جس رات کو تم نے اسے دیکھا (1)۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا اس مسئلہ کو حج کے وقت کے ذکر کے ساتھ ملایا کیونکہ چاندوں کے متعلق اور گھروں کے پیچھے سے داخل ہونے کے متعلق اکٹھے سوال ہوئے تھے۔ پس یہ آیت دونوں مسئلوں کے متعلق نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو ان کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ وہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھتے تھے وہ شرعاً التزام کرتے تھے کہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو جب ان سے کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد گھر سے نکلتا تھا پھر کسی حاجت کے لئے لوٹ آتا تھا تو وہ حجرہ کے دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا بلکہ گھر کی چھت سے داخل ہوتا تھا تاکہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو وہ اپنے گھر کے پیچھے دیواروں پر ایک کوہان بناتا تھا پھر وہ اپنے حجرہ میں کھڑا ہوتا تھا اور اپنی حاجت کا حکم دیتا تھا پھر اس کے گھر سے وہ چیز اس کی طرف نکالی جاتی تھی اور وہ اس عمل کو نیکی اور عبادت سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ کئی چیزوں کو عبادت سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ان کا رد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نیکی اس کے حکم کی پیروی میں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابو صالح کی روایت میں ہے فرمایا: لوگ زمانہ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی دور میں (اس طرح تھے) کہ ان میں سے کوئی جب حج کا احرام باندھتا تھا اگر وہ کچے مکانوں والوں میں سے ہوتا تھا تو وہ اپنے گھر کے پیچھے سے سوراخ کرتا تھا اس سے داخل ہوتا تھا اور اس سے خارج ہوتا تھا یا وہ سیڑھی رکھتا تھا اس سے چڑھتا تھا اور اس سے اترتا تھا اگر وہ خیمہ والوں میں سے ہوتا جو وہ خیمہ کے پیچھے سے داخل ہوتا تھا مگر جو حمس (قریش) میں سے ہوتا تھا وہ ایسا نہیں کرتا تھا (2)۔

زہری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے زمانہ میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ اپنے حجرہ میں داخل ہوئے اور بنی سلمہ میں سے ایک انصاری بھی آپ کے پیچھے دروازہ سے داخل ہو گیا، اس نے اپنی قوم کی عادت کو توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: تو کیوں دروازہ سے داخل ہوا جبکہ تو نے احرام باندھا ہوا تھا؟ اس نے کہا: حضور! آپ داخل ہوئے تو میں بھی آپ کے داخل ہونے کے ساتھ داخل ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تو حمس ہوں یعنی ایسی قوم سے ہوں جو اس کو دین نہیں سمجھتے۔ اس شخص نے کہا: میں اپنے اور تمہارے دین پر ہوں تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ یہ حضرات

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 348، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 233، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ تفسیر طبری ملی قولہ تعالیٰ ویسئلونك عن الاهلة، صفحہ 225، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

ابن عباس، عطا اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شخص قطبہ بن عامر انصاری تھا۔

الحمس قریش، کنانۃ، خزاعہ، ثقیف، جشم، بنو عامر بن صعصعہ، بنو نصر بن معاویہ کو کہا جاتا ہے۔ ان کو حمس اس لئے کہا جاتا ہے: یہ اپنے دین میں بہت سخت تھے۔ الحماسہ کا معنی شدت ہے۔ حجاج نے کہا: و کم قطعنا من تقاف حمس، ہم نے حمس کی کتنی سخت جگہوں کو کاٹا؟ پھر اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے وہ کہا جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ تاخیر کرنا ہے اور حج کو مؤخر کرنا مراد ہے حتیٰ کہ وہ حلال مہینہ کو حج کی تاخیر کے لئے حرام بنا دیتے تھے اور حرام مہینہ کو حلال بنا دیتے تھے تاکہ حج کو اس سے مؤخر کریں تو بیوت کا ذکر اس بنا پر ہے حج میں واجب کی مخالفت اور حج کے مہینوں میں مخالفت کی یہ مثال ہے۔ تاخیر کرنے کا بیان ان شاء اللہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ آیت ضرب المثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم جاہلوں سے پوچھو بلکہ تم اللہ سے ڈرو اور علماء سے پوچھو۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے: اتیت ھذا الامر من بابہ۔ اس کام کو میں نے اس کے تقاضا کے مطابق کیا۔ مہدوی اور مکی نے ابن انباری سے، ماوردی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عورتوں کے جماع میں مثال ہے حکم دیا کہ ان کی قبل میں وطی کرو، دبر میں وطی نہ کرو۔ عورتوں کو بیوت (گھر) کہا گیا ہے کیونکہ عورتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس طرح گھروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ابن عطیہ نے کہا: یہ بعید ہے اور کلام کے انداز کو بدلنا ہے۔ حسن نے کہا: وہ فال پکڑتے تھے، پس جو سفر کرتا اور اس کی حاجت پوری نہ ہوتی تو وہ خسارہ سے فال پکڑتے ہوئے گھر کے پیچھے سے آتا تو انہیں کہا گیا کہ بدشگونی میں نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس پر توکل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے کیونکہ حضرت براء نے روایت کیا ہے، فرمایا: انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: ایک انصاری شخص آیا اور اپنے دروازے سے داخل ہو گیا۔ اس کو اس کے متعلق کہا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی(1) وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ یہ بیوت کے بارے میں حقیقی نص ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رہے دوسرے اقوال وہ دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔ آیت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے کہ نیکی کو اس کے تقاضا کے مطابق کرو اور تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق کرو۔ گھروں کے دروازوں سے آنے کا ذکر بطور مثال ہے تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ہم امور کو اس طریقہ سے ادا کریں جس طرح اللہ نے ہمیں ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں سب صحیح ہیں۔ البیوت جمع ہے بیت کی۔ البُیُوت کو با کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تقویٰ اور فلاح اور لعل کا معنی گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 12: اس آیت میں بیان ہے کہ جس کام کو اللہ نے قربت نہیں بنایا اور اس کی طرف اس نے بلایا نہیں تو وہ قربت نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی قربت حاصل کرنے والا قربت حاصل کرے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب کسی کام کے قربت ہونے اور قربت نہ ہونے کا اشکال ہو تو اس عمل کو دیکھا جائے گا اگر تو اس کی فرائض و سنن میں کوئی مثال ہے تو وہ جائز ہو

1۔ صحیح مسلم، صفحہ 421، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

گا اور اگر مثال نہ ہو تو نہ وہ نیکی ہو گا نہ قربت۔ فرمایا: اس کے متعلق آثار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ذکر ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے جبکہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا تھا۔ اس کے متعلق آپ نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا، نہ سایہ حاصل کرے گا، نہ بولے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو کہو کہ یہ کلام کرے، سایہ حاصل کرے اور بیٹھے اور اپنے روزے کو مکمل کرے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کاموں کو باطل کر دیا جو قربت نہیں تھے، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں تھی اور اس قربت کو صحیح قرار دیا جس کی فرائض و سنن میں مثال تھی۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم میں نازل ہوئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت سے پہلے ان ارشادات کی وجہ سے قتال ممنوع تھا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (المومنون:96) (دور کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ (المائدہ:13) (معاف فرماتے رہئے اور درگزر فرمایئے)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾ (مزمل) (اور ان سے الگ ہو جایئے بڑی خوبصورتی سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ﴿۲۲﴾ (الغاشیہ) (آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) اس قسم کے دوسرے ارشادات جو مکہ میں نازل ہوئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کو قتال کا حکم دیا گیا یہ ارشاد نازل ہوا: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرہ:190) یہ حضرت ربیع بن انس وغیرہ کا قول ہے (2)۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے کہ پہلی آیت قتال کے بارے میں یہ نازل ہوئی (3): اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج:39) پہلا قول زیادہ ہے۔ اذن والی آیت عام مثال کے بارے نازل ہوئی مشرکین میں سے جو قتال کرے اور جو نہ کرے ہر ایک سے جنگ کرنے کا اذن ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف عمرہ کے لئے نکلے تھے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں اترے...... حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے، اس کنویں کے نام کی وجہ سے اس جگہ کو بھی حدیبیہ کہا جاتا ہے ...... مشرکوں نے آپ کو بیت اللہ کی طرف جانے سے روکا۔ آپ ایک مہینہ حدیبیہ میں ٹھہرے رہے پھر مشرکوں نے آپ سے صلح کی کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں جس طرح آئے ہیں آئندہ سال ان کے لئے تین دن مکہ خالی کر دیا جائے گا اور اس شرط پر صلح کی کہ دس سال ان کے درمیان قتال نہ ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ جب اگلا سال آیا تو آپ نے عمرۃ القضاء

1۔ صحیح بخاری، باب النذر فیما لا یملك ولی معصیۃ، حدیث نمبر 6210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ ایضاً

کی تیاری کی۔ مسلمانوں کو کفار کے دھوکا کا خوف ہوا۔ مسلمانوں نے حرم میں اور حرمت والے مہینہ میں لڑنا ناپسند کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہارے لئے قتال حلال ہے اگر کفار تم سے قتال کریں۔ یہ آیت حج کے ذکر اور گھروں کے پیچھے سے آنے کے گزشتہ ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ کرتے تھے جو آپ سے جنگ کرتا تھا اور اس سے جنگ نہیں کرتے تھے جو آپ سے جنگ نہیں کرتا تھا(1) حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (توبہ: 5)

پس یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن زید اور ربیع نے کہا اس کو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (توبہ: 36) نے منسوخ کیا تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابن عباس، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجاہد نے کہا: یہ آیت محکم ہے یعنی تم ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور عورتوں اور بچوں اور راہبوں کے قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ سنت اور نظر میں اصح قول ہے۔ سنت میں ابن عربی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنگ میں عورت کو مقتولہ دیکھا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا(2)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ رہی نظر تو فَاعَل کا صیغہ عام طور پر دو شخصوں سے پایا جاتا ہے جیسے مقاتلہ، مشاتمۃ، مخاصمہ، جھگڑنا، گالی دینا، لڑنا وغیرہ۔ قتال عورتوں، بچوں اور ان کے مشابہ لوگوں میں نہیں ہوتا جیسے راہب، اپاہج، بوڑھے اور مزدور لوگ۔ پس یہ لوگ قتل نہیں کئے جائیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو یہی وصیت کی تھی جب اسے شام کی طرف بھیجا تھا مگر یہ کہ یہ لوگ اذیت دینے والے ہوں تو ان کو قتل کیا جائے گا۔ اس کو مالک وغیرہ نے نقل کیا ہے اور علماء کی اس میں چھ صورتیں ہیں۔

(۱) عورتیں اگر قتال کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ سحنون نے کہا: جنگ کی حالت میں اور جنگ کے بعد(3) ایسی عورتوں کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (ان کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ) اور عورت کے لئے جنگ میں آثار عظیمہ ہوتے ہیں مثلاً اموال سے امداد، جنگ پر ابھارنا کبھی عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، ندبہ کرتے ہوئے، ابھارتے ہوئے اور فرار پر عار دلاتے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس صورت میں ان کا قتل کرنا مباح ہے مگر جب وہ قیدی ہو جائیں تو انہیں لونڈیاں بنانا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ وہ جلدی اسلام قبول کر لیتی ہیں اور اپنے ادیان سے رجوع کر لیتی ہیں اور ان کا اپنے اوطان کی طرف بھاگ جانا مشکل ہوتا ہے بخلاف مردوں کے۔

(۲) بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچوں کے قتل سے نہی ثابت ہے کیونکہ ان پر تکلیف نہیں یعنی وہ مکلف نہیں ہیں۔ اگر بچہ

1۔ الکشاف، صفحہ 235، جلد 1 (مکتبۃ الاعلام الاسلامی بیروت)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل النساء فی الحرب، صفحہ 423، جلد 1 (وزارت تعلیم)

مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، النہی عن قتل النساء والولدان، صفحہ 465 (وزارت تعلیم)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر)

جنگ میں شریک ہو تو اسے قتل کیا جائے گا(1)۔

(۳) راہبوں کو نہ قتل کیا جائے گا نہ انہیں غلام بنایا جائے گا بلکہ ان کے اموال وغیرہ بھی چھوڑ دیئے جائیں گے جن سے وہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اہل کفر سے جدا رہیں کیونکہ حضرت ابوبکر نے حضرت یزید کو کہا تھا: اور تم ایسی قوم پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روک رکھا ہے۔ انہیں چھوڑ دو اور جو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو روک رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دو...... اگر وہ کفار کے ساتھ کنائس میں ہوں تو پھر قتل کئے جائیں گے۔ اگر عورت راہبہ بن چکی ہو تو اشہب نے کہا: اُسے نہیں ڈرایا جائے گا۔ سحنون نے کہا: راہبہ ہونا اس کے حکم کو نہیں بدلے گا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح اشہب کی روایت ہے کیونکہ وہ اس قول کے تحت داخل ہے انہیں چھوڑ دو اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روکا ہوا ہے(2)۔

(۴) اپاہج: سحنون نے کہا: ان کو قتل کیا جائے گا۔ ابن حبیب نے کہا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے احوال کا اعتبار کیا جائے گا، اگر وہ اذیت دینے والے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا ورنہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اس کے راستہ میں بیٹھنے والے ہیں وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کے حال پر وحشت نہیں ہے(3)۔

(۵) الشیوخ: مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: شیوخ (بوڑھوں) کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس پر جمہور کا نظریہ ہے اگر کوئی بوڑھا شخص ہو جو قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو نہ اس کی رائے سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور وہ دفاع کرنے والا ہو تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا ہے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں: (۱) جمہور کے قول کی مثل ہے اور دوسرا یہ ہے کہ راہب کو قتل کیا جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر نے حضرت یزید کو یہی کہا تھا اور اس قول کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس پر اجماع ہے۔ نیز یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جنگ نہیں کرتے اور نہ دشمن کی مدد کرتے ہیں۔ پس اس کا قتل کرنا جائز نہیں جیسے عورت ہے مگر ایسا بوڑھا جس کے نقصان کا خوف ہو وہ جنگ کرتا ہو یا رائے دیتا ہے یا مال دیتا ہے پھر یہ جب قیدی ہو جائے گا تو امام کو اس میں اختیار ہوگا قتل کرے، احسان کرے یا فدیہ لے یا غلام بنالے یا جزیہ کی ادائیگی پر ذمہ کا عقد کرے۔

(۶) عسفاء: مزدور لوگ اور کسان لوگ ہیں۔ مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا(4)۔ امام شافعی نے فرمایا: کسانوں، مزدوروں اور بوڑھے لوگوں کو قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں یا جزیہ ادا کریں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ رباح بن ربیع کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خالد بن ولید سے مل جاؤ اور کسی بچے اور مزدور کو قتل نہ کرنا(5)۔ حضرت عمر نے فرمایا: بچوں اور ان کسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارے لئے جنگ کھڑی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کسان کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

1۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب النھی عن قتل النساء و الولدان، صفحہ 465 (و، ت)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 105، جلد 1 (دار الفکر) 4۔ ایضاً، صفحہ 106، جلد 1

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، فی قتل النساء، صفحہ 6، جلد 2 (و، ت)، ایضاً، حدیث 2295، سنن ابن ماجہ، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 2: اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ سے مراد اہل مدینہ ہیں جنہیں ان سے قتال کا حکم دیا گیا تھا جو ان سے قتال کریں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام مسلمانوں کو خطاب ہے ہر ایک کو حکم دیا کہ وہ ان سے جہاد کریں جو ان سے جنگ کرے۔ جب کوئی اور صورت ممکن نہ ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کیسے سورہ برأت میں بیان فرمایا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ (توبہ:123)

پہلا مقصود اہل مکہ تھے۔ پس ان سے آغاز متعین ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح فرمایا تو پھر ان سے متصل لوگوں سے جنگ تھی جو اذیت دیتے تھے حتیٰ کہ دعوت عام ہو جائے اور کلمۃ اللہ تمام آفاق میں پہنچ جائے اور کفار میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ یہ حکم قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر رکھی گئی ہے، اجر اور مال غنیمت (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی غایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔ یہ پہلی حدیث کے موافق ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَعْتَدُوْا اس کی تاویل میں وہی کہا گیا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ محکم آیت ہے اور رہے مرتد لوگ تو ان کے لئے قتل ہے یا توبہ ہے۔ اسی طرح گمراہ لوگوں کے لئے تلوار یا توبہ ہے۔ اور جس نے باطل اعتقاد کو چھپایا پھر ظاہر ہو گیا تو وہ زندیق کی طرح قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ رہے ائمہ عدل پر خوارج سے جنگ کرنا واجب ہے حتیٰ کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ایک قوم نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ جیسے حمیت، شہرت کا حصول وغیرہ بلکہ اللہ کے راستہ میں ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور مقصود دین کی سربلندی ہو اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کا اظہار ہو۔ بعض نے فرمایا: وَ لَا تَعْتَدُوْا یعنی جو تم سے نہیں لڑتا اس سے نہ لڑو، اس صورت میں تمام کفار سے جنگ کرنے کے حکم کے ساتھ یہ آیت منسوخ ہوگی۔ واللہ اعلم

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾

''اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ وہ (خود) تم سے وہاں جنگ کرنے لگیں۔ سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں۔ یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثَقِفْتُمُوْهُمْ کہا جاتا ہے ثقف یثقف ثقفا و ثقفا۔ رجل ثقف وہ شخص (2) جو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ، صفحہ 319، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کاموں کو پختہ کرتا ہے۔ اس آیت میں قیدی کو قتل کرنے پر دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ انفال میں ان شاء اللہ آئے گا۔
وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ یعنی مکہ سے تم ان کو نکالو۔ طبری نے کہا: یہ خطاب مہاجرین کے لئے ہے اور ضمیر کفار قریش کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وہ فتنہ جس پر انہوں نے تمہیں ابھارا اور انہوں نے اس کے ذریعے تمہارے کفر کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا وہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مومن کو قتل کرنے سے۔ پس قتل کرنا اس پر فتنہ سے زیادہ خفیف ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ان کا اللہ سے شریک ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا اس قتل سے بڑا جرم ہے جس کی وہ تمہیں عار دلاتے ہیں (1)۔ یہ دلیل ہے کہ یہ آیت عمرو بن حضرمی کے بارے میں نازل ہوئی جب اسے واقد بن عبداللہ تیمی نے رجب (جو حرمت والا مہینہ تھا) کے آخری دن قتل کر دیا تھا جیسا کہ عبداللہ بن جحش کے سریہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ اس آیت کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: (۱) ایک یہ کہ یہ منسوخ ہے (۲) دوسرا یہ کہ یہ محکم ہے۔ مجاہد نے کہا: آیت محکم ہے کسی کے لئے مسجد حرام میں جنگ کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس سے مسجد حرام میں جنگ کی جائے (2)۔ یہ طاؤس کا قول ہے اور آیت کی نص اس کا تقاضا کرتی ہے اور دونوں قولوں میں سے یہی قول صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ الصحیح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ وہ شہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے حرام فرمایا جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک حرام (حرمت والا) ہے اس میں کسی کے لئے مجھ سے پہلے قتال حلال نہ تھا اور میرے لئے صرف دن کی ایک گھڑی حلال کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت سے قیامت تک کے لئے حرام ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: یہ آیت اس آیت فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) سے منسوخ ہے (4)۔ مقاتل نے کہا: اس آیت کو اس آیت وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ نے منسوخ کیا ہے پھر اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ:5) پس حرم میں قتال سے آغاز کرنا جائز ہے اور جس سے انہوں نے حجت پکڑی وہ یہ ہے کہ سورہ برأت، سورۂ بقرہ کے دو سال بعد نازل ہوئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر خود تھا۔ کسی نے کہا: ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کر دو (5)۔

ابن خویز منداد نے کہا: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ منسوخ ہے کیونکہ اجماع سے ثابت ہے کہ دشمن اگر مکہ پر غالب آجائے اور کہے میں تم سے جنگ کروں گا اور میں تمہیں حج سے روکوں گا اور میں مکہ سے نہیں جاؤں گا تو اس سے جنگ کرنا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ معالم التنزیل، صفحہ 235، جلد 1 (دار الفکر)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ، صفحہ 437، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
5۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، صفحہ 614، جلد 2 (وزارت تعلیم)

واجب ہے اگر چہ وہ قتال (جنگ) کا آغاز نہ بھی کرے مکہ اور دوسرے شہر برابر ہیں اس کی تعظیم کے لئے اسے حرام کیا گیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو فتح مکہ کے دن بھیجا اور فرمایا: تلوار سے ان کو کاٹ دے حتیٰ کہ تم مجھے صفا پر ملو۔ حتیٰ کہ حضرت عباس آئے اور کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش ختم ہو گئے آج کے بعد کوئی قریش نہیں۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا اس کی تعظیم کی خاطر فرمایا: اس کی گری پڑی چیز کوئی نہ اٹھائے مگر (1) وہ جو اعلان کروائے مکہ میں گری پڑی چیز اور کسی دوسرے شہر میں برابر ہے اور یہ آیت وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کے ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے۔

ابن عربی نے کہا: میں بیت المقدس میں...... اللہ اسے پاک کرے...... ابوعقبہ حنفی زنجانی کے مدرسہ میں آیا اور قاضی زنجانی نے ہمیں جمعہ کے دن درس دیا۔ ہم اس کیفیت میں تھے کہ ایک خوبصورت شکل والا شخص آیا، اس کی پیٹھ پر پرانے کپڑے تھے اس نے علماء کی طرف سلام کیا اور چرواہوں کے لباس کے ساتھ صدر مجلس بن کر بیٹھ گیا۔ قاضی زنجانی نے کہا: سردار کون ہے؟ اس نے کہا: وہ شخص کہ کل جس سے شاطر نے مال چھینا تھا اور میرا ارادہ اس حرم مقدس کا تھا۔ میں اہل صاغان کے طالبعلموں میں سے ہوں۔ قاضی نے جلدی سے کہا: اس سے سوال کرو...... عادت کے مطابق علمائے اکرام میں ان سے جلدی سے سوال کئے جاتے ہیں کافر کے مسئلہ پر قرعہ نکلا۔ جب وہ حرم میں پناہ لے تو کیا اسے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ اس نے فتویٰ دیا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کی دلیل پوچھی گئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ اور ولا تقتلوھم اور ولا تقاتلوھم بھی پڑھا گیا ہے اگر ولا تقتلوھم پڑھا جائے تو مسئلہ واضح ہے اور اگر ولا تقاتلوھم پڑھا جائے تو یہ تنبیہ ہے کیونکہ جب جنگ سے منع فرمایا جو قتل کا سبب ہے تو یہ قتل سے نہی پر ظاہر، واضح دلیل ہو گی اس پر قاضی نے امام شافعی اور امام مالک کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اعتراض کیا اگر چہ قاضی ان کے مسلک کا قائل نہیں تھا...... عادت کے مطابق...... اس نے کہا: یہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے۔ صاغانی نے کہا: یہ قاضی کے منصب اور اس کے علم کے مناسب نہیں۔ یہ آیت جو آپ نے پیش کی ہے وہ تمام جگہوں میں ہے اور جس سے تو نے حجت پکڑی ہے وہ خاص ہے، کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عام، خاص کو منسوخ کرتا ہے۔ قاضی زنجانی مبہوت ہو گیا۔ یہ بدیع الکلام سے ہے (2)۔ ابن عربی نے کہا: اگر کافر حرم میں پناہ لے تو اس کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ نص قرآنی اور سنت ہے اس میں قتال منع ہے۔ رہزانی اور قاتل اس پر حد قائم کرنا ضروری ہے مگر کافر جنگ کا آغاز کرے تو نص قرآنی کی وجہ سے اسے قتل کیا جائے گا (3)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے جو ابن خطل اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے حجت پیش کی ہے، اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ اس وقت ہوا تھا جب مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حلال کیا گیا تھا۔ یہ دار حرب اور دار کفر تھا۔ جس گھڑی میں مکہ حلال کیا گیا تھا اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اہل مکہ میں سے جن کا خون بہانا چاہتے تھے جائز تھا۔ پس ثابت ہوا کہ پہلا قول صحیح ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، عام الفتح، صفحہ 617، جلد 2

2۔ احکام القرآن، صفحہ 107، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 4: بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ امام پر بغاوت کرنے والا الحکم میں کافر کے خلاف ہے۔ کافر جب قتال کرے تو اسے ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور باغی جب قتال کرے تو دفاع کی نیت سے اس سے جنگ کی جائے گی۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور زخمیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ باغیوں کے احکامات سورۂ الحجرات میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا اگر وہ ایمان لانے کے ساتھ جنگ سے رک جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے سب گناہ معاف کر دے گا اور ان میں سے ہر ایک پر جرموں سے عفو کے ساتھ رحم فرمائے گا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (انفال: 38) (اس کا بیان آگے آئے گا)۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

"اورلڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قٰتِلُوْهُمْ یہ ہر جگہ ہر مشرک سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس کے قول کے مطابق جو اسے ناسخ دیکھتا ہے اور جو اسے غیر ناسخ کہتا ہے وہ کہتا ہے: اس کا معنی ہے ان سے لڑو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ اگر وہ تم سے لڑیں، پہلا قول اظہر ہے۔ یہ مطلق قتال کا امر ہے اس میں کفار کے آغاز کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (دین اللہ کے لئے ہو جائے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا یہ کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔(1) یہ آیت اور حدیث دلالت کرتی ہیں کہ قتال کا سبب کفر ہے کیونکہ فرمایا: حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے) یعنی کفر نہ رہے۔ جہاد کی غایت کفر کا نہ ہونا بیان فرمائی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس قتادہ، ربیع، سدی وغیرہم نے فرمایا: یہاں فتنہ سے مراد شرک اور وہ تمام چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی اذیت کا باعث تھیں (2)۔ فتنہ کا اصل معنی اختیار اور امتحان ہے۔ یہ فتنت الفضة سے ماخوذ ہے جب تو چاندی کو آگ میں ڈالے تاکہ ردی، عمدہ سے علیحدہ ہو جائے، اس کے محاصل کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا اگر وہ کفر سے رک جائیں، اسلام قبول کرنے کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا جزیہ ادا کرنے کے ساتھ، یہ اہل کتاب کے حق میں ہے۔ اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔ کفر سے باز آ جائیں تو فبہا ورنہ قتل کئے جائیں گے۔ یہ ظالم ہیں ان پر ہی تعدی ہوگی۔ ظالموں کی سزا کو عدوان (تعدی) سے تعبیر فرمایا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل استقبال القبلۃ، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کیونکہ وہ ان کی تعدی (ظلم) کی سزا ہے کیونکہ ظلم اپنے ضمن میں عدوان کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عدوان کی جزا کو بھی عدوان کہا گیا۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40)، الظالمون، دونوں تاویلوں میں سے ایک تاویل پر۔ جس نے قتال سے آغاز کیا۔ اور دوسری تاویل پر جو کفر اور فتنہ پر باقی رہا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے۔ تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ اس سے پہلے اَلشَّهْرُ کا اشتقاق گزر چکا ہے اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو حضرات ابن عباس، قتادہ، مجاہد، مقسم، سدی، ربیع اور ضحاک وغیرہ سے روایت کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ عمرۃ القضاء اور حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمرہ کے لئے نکلے حتیٰ کہ ذی القعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفار قریش نے بیت اللہ کی طرف جانے سے روک دیا۔ آپ واپس آ گئے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ مکہ میں ضرور داخل ہوں گے۔ پس آپ سات ہجری کو مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے عمرہ کی قضا کی تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حسن سے مروی ہے کہ مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا: کیا تجھے شہر حرام میں قتال سے منع کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پس مشرکین نے حرمت والے مہینے میں جنگ کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ اس مہینہ میں قتال کو حلال کریں تو آپ ان سے قتال کریں (2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان کی موافقت کو مباح کیا۔ پہلا قول مشہور ہے اور اکثر علماء کی رائے اسی پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، الحرمات جمع ہے حرمۃ کی جیسے الظلمة کی جمع الظلمات ہے۔ حجرۃ کی جمع حجرات ہے حرمات جمع ذکر فرمایا کیونکہ شہر حرام کی حرمت، بلد حرام کی حرمت، احرام کی حرمت مراد لی ہے۔ الحرمۃ کا مطلب جس کے توڑنے سے منع کیا گیا ہو۔ القصاص کا معنی المساوات ہے یعنی میں نے تمہارے لئے ان سے برابری کر دی ہے۔ انہوں نے تمہیں چھ ہجری میں روکا تو تم نے سات ہجری میں عمرہ قضا کیا۔ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ ما قبل سے متصل ہے اور اس کے متعلق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی کلام سے جدا ہے۔ یہ ابتداء اسلام میں تھا جو تیری حرمت کو تار تار کرتا تو اس سے اتنا بدلہ لے سکتا تھا جتنی اس نے تجھ پر زیادتی کی ہوتی تھی پھر یہ قتال کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ احکام القرآن، صفحہ 111، جلد 1 (دار الفکر)

طائفہ نے کہا: حضرت محمد ﷺ کی امت کے درمیان تعدی اور جنایات میں سے جو اس آیت میں شامل ہیں وہ منسوخ نہیں ہیں جس کے مال میں یا زخم کے اعتبار سے ظلم کیا گیا ہو اس کے لئے اتنی تعدی (زیادتی) کرنا جائز ہے جو اس پر کی گئی ہے جب کہ اس کے لئے زیادتی ظاہر ہو جائے۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اپنی زیادتی کا بدلہ لینے میں کچھ نہیں ہوگا (یعنی اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ امام شافعی وغیرہ کا قول ہے یہ امام مالک کے مذہب کی روایت ہے۔ امام مالک کے اصحاب میں سے ایک طائفہ نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ قصاص (بدلہ) کا امر حکام پر موقوف ہے اور اموال کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد شامل ہے۔ امانت اسے ادا کرو جس نے تمہیں امین بنایا اور جس نے تم سے خیانت کی تم اس سے خیانت نہ کرو (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ پس جس کو خیانت کرنے والے نے امین بنایا ہو اسے اس کے ساتھ خیانت کرنا جائز نہیں اور جس نے اسے امین بنایا ہے اس کا حق اسے پہنچائے۔ یہ مشہور مذہب ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے انہوں نے اسی حدیث کو دلیل بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء: 58) (بے شک اللہ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل نہیں)۔ یہ عطا خراسانی کا قول ہے۔ قدامۃ بن الہیثم نے کہا: میں نے عطا بن میسرہ خراسانی سے سوال کیا، میں نے ان سے پوچھا: میرا ایک شخص پر حق ہے، جس کا اس نے مجھ پر انکار کیا ہے اور میرے لئے دلیل پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیا میں اس کے مال سے اپنے مال کے برابر لے لوں؟ عطا نے کہا: تم بتاؤ اگر وہ تیری لونڈی سے جماع کرتا تو تو جانتا ہے جو تو کرتا۔

میں کہتا ہوں: صحیح اس کا جواز ہے جیسے ہی اپنے حق کو حاصل کرے جبکہ تو چور شمار نہ ہو۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے اس کو داؤدی نے امام مالک سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے یہ خیانت نہیں ہے یہ تو اپنے حق کو پانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو (2)۔ ظالم سے حق لینا یہ اس کی مدد کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہند بنت عتبہ، ابوسفیان کی بیوی کو کہا: جب اس نے کہا تھا۔ ابوسفیان کنجوس آدمی ہے مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے لئے کافی ہو اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو مگر یہ کہ میں اس کے مال سے اس کے علم کے بغیر لے لوں، کیا مجھ پر مال لینے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو معروف طریقہ سے اتنا لے لے جو تجھے کافی ہو اور تیری اولاد کو کافی ہو (3)۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے لینا مباح قرار دیا مگر وہ اتنی مقدار ہے جو اس کے لئے ضروری ہو۔ یہ تمام صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو لیکن اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی)۔ یہ اختلاف کی صورت میں قطعی حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف ہے کہ جو اپنے مال کی جنس کے علاوہ مال حاصل کرنے پر کامیاب ہو جائے۔ بعض

1۔ سنن ابی داؤد، باب البیوع، فی الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ، صفحہ 142، جلد 2 (و، ت)
ایضاً، حدیث 3968، جامع ترمذی، حدیث 1183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، فی المظالم و القصاص، صفحہ 330، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، کتاب النفقات، صفحہ 808، جلد 2

علماء نے فرمایا: وہ نہ لے مگر حاکم کے حکم سے۔ امام شافعی کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں: اصح لے لینا ہے انہوں نے اسے اس پر قیاس کیا ہے اگر وہ اپنے مال کی جنس سے حاصل کرنے پر قادر ہو۔ دوسرا قول ہے کہ وہ نہ لے کیونکہ وہ اس کے مال کی جنس کے خلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو اس کے خصم پر ہے اس کی قیمت کا قصد کرے اور اس کی مقدار لے لے یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے دلیل سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: ہم اس لینے پر فرعی مسائل نکالتے ہیں۔ کیا اس پر خود قرض وغیرہ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام شافعی نے فرمایا: نہیں، بلکہ جو اس کا اس پر ہے وہ لے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مقروض کو مفلس قرار دیا گیا ہو تو اس کے لئے دوسرے غرباء کے ساتھ جو حاصل ہوگا اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی قیاس ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ** یہ عموم متفق علیہ ہے، خود لینا ممکن ہو تو خود لے لے یا حکام کے ذریعے لے لے۔ لوگوں کا بدلہ لینے میں اختلاف ہے۔ کیا بدلہ کو عدوان کہا جائے گا یا نہیں جس نے کہا: قرآن میں مجاز نہیں ہے۔ فرمایا: مقابلہ عدوان ہے اور وہ مباح عدوان ہے جیسا کہ کلام عرب میں مجاز مباح کذب ہے۔ کیونکہ کہنے والے کا قول ہے: فقالت له العینان سمعاً و طاعة . . . ۔ اس کی آنکھوں نے اسے کہا ہم سنیں گی اور اطاعت کریں گی۔ اسی طرح قول ہے: امتلأ الحوض وقال قَطْنِی۔ حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے کافی ہے۔ اسی طرح جملہ ہے: شکا الیّ جملی طول السری۔ میرے اونٹ نے مجھ سے طویل چلنے کی شکایت کی۔

یہ معلوم شدہ ہے کہ یہ اشیاء بولتی نہیں ہیں اور جھوٹ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق اس کی حقیقت کے خلاف خبر دینا۔ اور جنہوں نے کہا: قرآن میں مجاز ہے، انہوں نے اسے مجاز کے طریق پر عدوان کا نام دیا۔ کلام کا مقابلہ اس کی مثل ہے۔ جیسے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

الا لا یجهلن احد علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا

خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم اس کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اسی طرح ایک اور نے کہا:

ولی فرس للحلم بالحلم ملجم ولی فرس للجهل بالجهل مسرج

میرے لئے ایک گھوڑا حلم کے لئے ہے جسے حلم کی لگام دی گئی ہے اور ایک جہالت کا گھوڑا ہے جسے جہالت کی زین پہنائی گئی ہے۔

و من رام تقویمی فانی مقوم و من رام تعویجی فانی معوج

جس نے میری تقویم کا ارادہ کیا تو میں مقوم (سیدھا کیا گیا) ہوں اور جس نے میرے ٹیڑھے پن کا ارادہ کیا تو میں ٹیڑھا ہوں۔ اس کی مراد ہے: میں جاہل اور ٹیڑھے شخص کو بدلہ دیتا ہوں۔ وہ اپنی جہالت اور ٹیڑھے پن سے مدح نہیں کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس نے کوئی حیوان یا سامان ضائع کر دیا جس کا نہ کیل کیا

جاتا ہے نہ وزن کیا جاتا ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: اس پر اس کی مثل ہے قیمت کی طرف نہیں پھیرا جائے گا مگر مثل کے نہ پائے جانے کے وقت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل:126) (اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔)

علماء فرماتے ہیں: یہ تمام اشیاء میں عام ہے اور انہوں نے اس سے تائید حاصل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ کے گھر ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا تھا جس نے دوسری زوجہ محترمہ کا پیالہ توڑا تھا اور صحیح پیالہ واپس کیا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: برتن کے بدلے برتن اور کھانے کے بدلے کھانا ہے(1)۔ اس حدیث کو ابو دوٗد نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا دوسری سند میں ہے ہمیں محمد بن مثنی نے بتایا: انہوں نے کہا: ہمیں خالد نے بتایا انہوں نے حمید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی زوجہ محترمہ کے پاس تھے۔ تو دوسری امہات المومنین میں سے کسی نے اپنے خادم کے ساتھ ایک پیالہ بھیجا جس میں کوئی کھانا تھا۔ فرمایا: جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اس نے ہاتھ مارا اور پیالہ توڑ دیا۔ حضرت ابن مثنی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ٹکڑے لئے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور اس میں کھانے کو جمع کرنا شروع کر دیا اور فرمایا: تمہاری ماں نے غیرت کی ہے۔ حضرت ابن مثنی نے یہ زائد بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ۔ پس حاضرین مجلس نے وہ کھانا کھایا حتیٰ کہ جس نے وہ پیالہ توڑا تھا وہ اپنا وہ پیالہ لے آئی جو اس کے گھر میں موجود تھا۔

پھر ہم مسدد کی حدیث کے الفاظ کی طرف لوٹتے ہیں۔ فرمایا: کھاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خادم اور پیالے کو روک لیا حتیٰ کہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح پیالہ خادم کو دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ اپنے گھر میں روک لیا(2)۔ ہمیں ابو داؤد نے بتایا، فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا، فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے سفیان سے روایت کیا فرمایا: ہمیں فلیت عامری نے بتایا، ابو داؤد نے کہا: یہ افلت بن خلیفہ ہے انہوں نے جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے کوئی ایسا کھانا تیار کرنے والا نہیں دیکھا جو حضرت صفیہ کی طرح کھانا تیار کرتا ہو۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا پھر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ شدت غیرت کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی میں نے برتن توڑ دیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کا کیا کفارہ ہے جو میں نے کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برتن کی مثل برتن (3)، کھانے کی مثل کھانا۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے فرمایا: جس شخص پر حیوان یا سامان ہو جن کا نہ کیل کیا جاتا ہو نہ وزن کیا جاتا ہو اس کی قیمت ہوگی، مثل نہیں ہوگی...... اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو غلام کے نصف کی قیمت اپنے شریک کو دینے کو کہا جس نے غلام کا نصف آزاد کر دیا۔ آپ نے اس غلام کے نصف کی مثل کی ضمانت کا حکم نہ دیا۔ اور علماء کے درمیان کھانے، پینے والی چیزوں اور وزنی چیزوں میں مثل کی ضمانت دینے پر کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، باب فیمن افسد شیئا یغرم مثلہ، صفحہ 146، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

نے فرمایا: طعام کے بدلے طعام ہے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت قصاص میں برابری میں اصل ہے جس نے کسی کو جس چیز سے قتل کیا ہوگا اسے اس چیز کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ جمہور کا قول ہے جب تک کہ اس نے کسی برائی سے قتل نہ کیا ہو۔ جیسے لواطت سے قتل کیا ہو یا شراب پلا کر قتل کیا ہو تو اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ شوافع کے دو قول ہیں: اسے اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ اس صفت پر ایک لکڑی بنائی جائے گی اور وہ اس کی دبر میں ماری جائے گی حتیٰ کہ وہ بھی مرجائے اور اسے شراب کی جگہ پانی پلایا جائے گا حتیٰ کہ وہ مرجائے۔ ابن ماجشون نے کہا: جس نے آگ یا زہر سے قتل کیا تو اس کے ساتھ قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سوا آگ کے ساتھ کوئی عذاب نہ دے (1)۔ اور زہر پوشیدہ آگ ہے۔ جمہور علماء کا خیال ہے: وہ اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا کیونکہ آیت میں عموم ہے۔

مسئلہ نمبر 8: لاٹھی کے ساتھ قصاص لینا: امام مالک کی ایک روایت میں ہے کہ اگر لاٹھی سے قتل کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہو اور عذاب ہوتا ہو تو تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے اور ابن قاسم کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسے لاٹھی کے ساتھ قتل کیا جائے گا اگرچہ اس میں تطویل وتعذیب بھی ہو۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب اور ابن نافع نے مالک سے پتھر اور لاٹھی سے قتل کرنے والے کے متعلق روایت کیا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ جب ایک ضرب سے اس کا کام تمام ہو جائے اور اگر بہت سی ضربوں کی ضرورت ہو تو پھر نہیں۔ پتھر اور تیر نہیں مارے جائیں گے کیونکہ اس میں تعذیب ہے۔ یہ عبدالملک کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء کے اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ مماثلت (برابری) واجب ہے، مگر یہ کہ تعذیب ہوتی ہو تو پھر تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ جب کسی نے کسی کا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی اور اس نے اسے عذاب دینے کا قصد کیا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کے چرواہے کے قاتلوں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر وہ مدافعت یا لڑائی میں تھا اور قتل کر دیا تو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ ایک جماعت کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا (2)۔ یہ امام ابوحنیفہ، شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصاص نہیں ہے (3) مگر لوہے کے ساتھ اور مثلہ سے نہی کی گئی ہے۔ نیز فرمایا: آگ کے ساتھ صرف آگ کا رب ہی عذاب دے گا (4)۔

صحیح مذہب جمہور کا ہے کیونکہ ائمہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ ایک لونڈی کا سر دو پتھروں میں رکھ کر کچلا گیا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا: تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا، کیا فلاں نے کیا فلاں نے؟ حتیٰ کہ جب انہوں نے یہودی کا ذکر کیا تو اس نے سر سے (ہاں) میں اشارہ کیا۔ وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے اقرار کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کا سر دو پتھروں

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)　2۔ احکام القرآن، صفحہ 14-113، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ سنن ابن ماجہ، باب لا قود الا بالسیف، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابی داؤد، کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے درمیان کچلنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو پتھروں کے درمیان قتل کیا(1)۔ یہ صریح صحیح نص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل:126) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ اور انہوں نے حدیث جابر سے جو استدلال کیا ہے وہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے وہ صحیح طریق سے مروی نہیں ہے۔ اگر صحیح ہوتی تو ہم اس کے مطابق قول کرتے۔ جب لوہے کے ساتھ قتل کرے گا تو اسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے گا اس پر حضرت انس کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ایک یہودی نے ایک بچی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلنے کا حکم دیا(2)۔ رہی مثلہ کرنے سے نہی تو بھی یہی کہتے ہیں کہ جب اس قاتل نے مثلہ نہ کیا ہو تو اس کا مثلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب وہ مثلہ کرے گا تو ہم بھی اس کا مثلہ کریں گے۔ اس پر عرنیین کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اسے ائمہ نے نقل کیا ہے۔ اور رہا یہ ارشاد کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک عذاب دے گا۔ صحیح ہے جب اس نے نہ جلایا ہو اگر اس نے جلایا ہو گا تو اسے جلایا جائے گا۔ اس پر قرآن کا عموم دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر قاتل نے جان بوجھ کر مقتول کو آگ میں ڈالا ہو گا تو اسے بھی آگ میں ڈالا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ وقار نے اپنی مختصر میں مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ یہی محمد بن عبدالحکیم کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: بہت سے اہل علم کا قول، اس شخص کے بارے میں جو کسی کا گلہ دبا دیتا ہے یہ ہے کہ اس پر قصاص ہو گا۔ امام محمد بن حسن نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: اگر اس نے گلا دبایا اور آدمی مر گیا یا اسے کنویں میں پھینکا اور وہ مر گیا یا اس نے اسے پہاڑ سے گرایا یا کسی بلند جگہ سے گرایا اور وہ مر گیا تو اس پر قصاص نہ ہو گا اور اس کے عاقلہ (خاندان) پر دیت ہو گی۔ اگر وہ شخص اس جرم میں معروف ہو اس نے کئی شخصوں کا گلا دبایا ہو تو اس پر قتل ہے۔ ابن منذر نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی سے قصاص لیا جس نے بچی کا سر پتھروں سے کچلا تھا تو یہ بھی اس کے مفہوم میں ہے۔ پس امام محمد بن حسن کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہی قول امام ابوحنیفہ سے حکایت کیا گیا ہے، نقل کرنے والے نے کہا: امام ابوحنیفہ کا قول منفرد ہے۔ انہوں نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے گلا دبا کر قتل کیا ہو یا زہر دے کر قتل کیا ہو یا پہاڑ سے گرایا ہو یا کنویں میں گرایا ہو یا لکڑی کے ساتھ مارا ہو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر جس نے اس کو تیز دھار آلہ کے ساتھ یا پتھر کے ساتھ یا لکڑی کے ساتھ قتل کیا ہو وہ گلا دبانے میں معروف ہو یا پہاڑ سے گرانے میں معروف ہو تو اس کے عاقلہ پر دیت ہو گی۔ یہ ان کی طرف سے کتاب و سنت کو چھوڑنا ہے اور امت کا معاملہ جس پر قائم تھا اس میں بدعت نکالنا ہے اور یہ قصاص کو دور کرنے کا ذریعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے لئے مشروع کیا ہے۔ اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔

مسئلہ نمبر 9: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے کسی کو روکا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ عطا نے کہا: قاتل کو قتل کیا جائے گا اور روکنے والے کو قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے اسے روکا اور

1۔ صحیح مسلم، باب القسامة، صفحہ 58، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 115، جلد 1 (دار الفکر) صحیح بخاری، کتاب الخصومات باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومة، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ بھی اسے قتل کرنا چاہتا تھا تو دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی، ابوثور، نعمان کے قول میں روکنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: عطا کا قول صحیح ہے یہ نزول قرآن کا مقتضا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب کوئی کسی شخص کو روک لے اور دوسرا اسے قتل کر دے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو روکنے والا ہو گا اسے قید کیا جائے گا(1)۔ اس حدیث کو سفیان ثوری نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو معمر اور ابن جریج نے اسماعیل سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى، الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و من یتعدّ حدود اللہ (جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔) پس جس نے تجھ پر ظلم کیا تو اپنے ظلم کی مقدار اس سے اپنا حق وصول کر لے اور جس نے تمہیں گالی دی تو اس کو اس کی مثل قول لوٹا دے۔ جس نے تیری عزت کو تار تار کیا تو بھی اس کی عزت کے ساتھ ایسا کر۔ تو اس کے والدین تک تجاوز نہ کر نہ اس کے بیٹے اور اس کے قریبی تک تجاوز کر اور تیرے لئے اس پر جھوٹ بولنا جائز نہیں اگرچہ اس نے تجھ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ معصیت کا مقابلہ معصیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اگر مثلاً اس نے تجھے کہا: اے کافر! تو بھی اسے کہہ سکتا ہے: تو کافر۔ اگر اس نے تجھے کہا: اے زانی! تو تیرا قصاص اسے یہ کہنا ہے: اے جھوٹا! جھوٹ کی گواہی دینے والا۔ اگر تو اسے اے زانی! کہے گا تو تو جھوٹا ہو گا اور جھوٹ میں تو گنہگار ہو گا۔ اگر وہ قرضہ وغیرہ کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے حالانکہ وہ غنی ہے کوئی عذر بھی نہیں ہے تو تو اسے کہہ: اے ظالم! اے لوگوں کا مال کھانے والا! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غنی کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے(2)۔ عرض سے مراد وہی ہے جو ہم نے تفسیر بیان کی ہے اور عقوبت سے مراد قید خانہ ہے جس میں اسے قید کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ اسلام کے قوی ہونے سے پہلے نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں میں سے جس کو اذیت دی جاتی تھی اسے اپنی ذات کے برابر اذیت دینے کا حکم تھا یا وہ صبر کرے یا معاف کر دے پھر اس کو اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا(3) وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (التوبہ: 36) بعض علماء نے فرمایا اس کو سلطان کی طرف لوٹانے کے ساتھ منسوخ کیا اور کسی کے لئے سلطان کی اجازت کے بغیر کسی سے قصاص لینا جائز نہیں۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں اور اچھے کام کیا کرو۔ بے شک اللہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود و الدیات، حدیث 176، صفحہ 140، جلد 3 (دار المحاسن)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، صفحہ 323، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تعالیٰ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری نے حذیفہ سے روایت کیا ہے: وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡكُمۡ اِلَی التَّہۡلُكَۃِ۔ کا ارشاد خرچ کے بارے میں نازل ہوا (1)۔ یزید بن ابی حبیب نے اسلم ابو عمران سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی اور مسلمانوں کی جماعت کے جرنیل عبد الرحمن بن ولید تھے اور رومیوں نے اپنی پیٹھیں شہر کی دیوار سے لگائی ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے دشمن پر حملہ کیا تو لوگوں نے کہا: رک جا رک جا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، یہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے کہا: سبحان اللہ۔ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی تھی اور دین کو غالب کیا تھا تو ہم نے کہا: آؤ اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور ان کی اصلاح کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اموال کی طرف متوجہ ہوں ان کی اصلاح کریں اور جہاد کو چھوڑ دیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اللہ کے راستہ میں ہمیشہ جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ قسطنطنیہ میں دفن ہوئے ان کی قبر مبارک بھی وہاں ہے۔ حضرت ابو ایوب نے کہا: القاء بالید الی التهلكة کا مطلب اللہ کے راستہ میں جہاد کو ترک کرنا ہے۔ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اس کی مثل حضرات حذیفہ، حسن، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی نے یزید بن ابی حبیب سے انہوں نے اسلم ابو عمران سے یہ خبر اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ فرمایا: ہم روم کے شہر میں تھے، رومیوں نے ہماری طرف ایک بڑا لشکر نکالا مسلمانوں میں سے ان کے مقابلہ میں اتنے ہی لوگ نکلے یا ان سے بھی زیادہ تھے۔ اور اہل مصر پر عقبہ بن عامر امیر تھے اور جماعت پر فضالہ بن عبید۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رومیوں کے لشکر پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ وہ ان کے اندر داخل ہو گیا۔ لوگ چیخے اور کہا: سبحان اللہ۔ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کر رہے ہو، یہ آیت تو ہم انصار کے گروہ کے بارے نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہنے لگے ہمارے مال ضائع ہو گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور جو ضائع ہو چکا ہے اس کی اصلاح کریں تو بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہماری بات کا رد نازل فرمایا۔ وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡكُمۡ اِلَی التَّہۡلُكَۃِ۔ آیت میں التَّہۡلُكَۃِ سے مراد اموال کی دیکھ بھال کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اور جہاد کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابو ایوب اللہ کے راستہ میں لڑتے رہے حتیٰ کہ روم کی زمین میں دفن ہوئے (2)۔ ابو عیسیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، عکرمہ، عطاء، مجاہد اور جمہور لوگوں کا قول ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کو ترک کر دینا اور اہل وعیال کا خوف کرنا۔ ایک شخص کہتا: میرے پاس تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے (1) جسے میں خرچ کروں۔ اس معنی کی طرف امام بخاری گئے ہیں جبکہ کسی دوسرے نے ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اگرچہ تمہارے پاس تیر وغیرہ نہ بھی ہو، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: میں تو کوئی چیز نہیں پاتا (2)۔ سدی سے اسی طرح مروی ہے تم خرچ کرو اگرچہ رسی ہی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور تم کہو کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے (3)۔ تیسرا قول حضرت ابن عباس کا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو جہاد کی طرف نکلنے کا حکم دیا تو مدینہ طیبہ کے کچھ بدو لوگ ٹھہر گئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیا تیاری کریں؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو نہ زادراہ ہے اور نہ ہمیں کوئی کھلائے گا تو یہ ارشاد نازل ہوا: وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یعنی اے خوشحال لوگو! اللہ کے راستہ میں یعنی اللہ کی طاعت میں خرچ کرو۔ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے ہاتھوں کو صدقہ سے نہ روکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح مقاتل نے کہا: حضرت ابن عباس کے قول کا معنی یہ ہے کہ صدقہ سے نہ رکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے یعنی کمزور لوگوں پر خرچ کرنے سے نہ رکو۔ کیونکہ جب وہ تم سے پیچھے رہ جائیں گے تو دشمن تم پر غالب آ جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا کیا اس سے مراد وہ شخص ہے جو لشکر پر تنہا حملہ کرتا ہے؟ حضرت براء نے کہا: نہیں بلکہ ایک شخص گناہ کرتا تھا پھر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا تھا۔ وہ کہتا تھا: میں گناہوں میں حد کو پہنچ چکا ہوں توبہ کا کوئی فائدہ نہیں وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ گناہوں میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ یہاں ہلاکت سے مراد اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا ہے۔ یہ عبیدہ سلمانی کا قول ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: اس کا معنی ہے جہاد میں بغیر زادراہ کے سفر نہ کرو۔ کچھ لوگوں نے ایسا کیا تھا تو اس عمل نے انہیں راستہ میں ہی کاٹ دیا تھا یا وہ لوگوں پر بوجھ بن گئے تھے (4)۔ یہ پانچ اقوال ہیں:

سَبِيْلِ اللّٰهِ سے یہاں جہاد مراد ہے اور لفظ تمام راستوں کو شامل ہے۔ بِاَيْدِيْكُمْ میں با زائدہ ہے۔ تقدیر عبارت تلقوا ایدیکم ہے۔ اس کی مثال الم یعلم بان اللہ یری اس میں با زائدہ ہے۔ مبرد نے کہا: بِاَيْدِيْكُمْ سے مراد نفوس ہیں۔ بعض سے کل مراد لیا ہے۔ جیسے ارشاد ہے: فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ: 30) بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ (الحج: 10) ان آیات میں ایدی اور ید سے مراد پوری ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ضرب المثل ہے تو کہتا ہے: فلان القی بیدہ فی امر کذا۔ جب کوئی امر کو تسلیم کرے۔ قتال میں شکست تسلیم کرنے والا اپنے ہتھیار اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ہر عاجز کرتا ہے خواہ وہ کسی فعل میں عاجز ہو۔ اسی سے عبدالمطلب کا قول ہے: واللہ ان القاءنا بایدینا للموت لعجز۔ اللہ کی قسم! موت کے لئے ہمارا اپنے آپ کو ڈال دینا عجز ہے۔ بعض علماء نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: لا تلقوا انفسکم بایدیکم۔ جیسے تو کہتا ہے: لا تفسد حالك برایك۔ اپنے حال کو اپنی رائے کے ساتھ خراب نہ کر۔ التھلکۃ لام کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، صفحہ 242، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)
3۔ معالم التنزیل، صفحہ 238، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

هلك يهلِك هلاكًا و هلكًا و تهلكة کا مصدر ہے۔ یعنی اس عمل میں نہ پڑو جو تمہیں ہلاک کر دے (1)۔ یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے یعنی اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو تم اللہ کی نافرمانی کرو گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے اپنے اموال کو نہ روکو کہ تم سے تمہارے علاوہ اس کے وارث بنیں ورنہ تم اپنے اموال کی منفعت سے محرومی کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ خرچ سے باز نہ آؤ ورنہ دنیا میں نعم البدل اور آخرت میں ثواب چلا جائے گا۔ کہا جاتا ہے لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی حرام مال سے خرچ نہ کرو، وہ تم پر لوٹا دیا جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ اسی طرح حضرت عکرمہ سے مروی ہے، فرمایا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ فرمایا ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی) اس سے خبیث مال خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ طبری نے کہا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ عام ہے، ہر صورت جو ذکر کی گئی ہے اس کو شامل ہے کیونکہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جنگ میں گھس جاتا ہے اور اکیلا دشمن پر حملہ کر دیتا ہے، قاسم بن مخیمرہ، قاسم بن محمد اور عبد الملک (جو ہمارے علماء سے ہیں) نے فرمایا: تنہا ایک شخص کا بڑے لشکر پر حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں طاقت ہو اور نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اگر قوت نہ ہو تو یہ تهلكة (ہلاکت) سے ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اسے شہادت مطلوب ہو اور نیت خالص ہو تو اسے حملہ کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا یہی مقصود ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بیان میں فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ: 207) (لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے (2))

ابن خویز منداد نے کہا: جو تنہا سو آدمیوں پر یا ایک لشکر پر یا چوروں کے گروہ پر یا محاربین پر یا خوارج پر حملہ کرتا ہے اس کی دو حالتیں ہیں: اگر اسے غالب گمان ہے کہ جس پر وہ حملہ کرے گا اسے قتل کر دے گا اور خود نجات پائے گا تو یہ بہتر ہے اسی طرح اگر اسے غالب گمان ہو کہ وہ شہید ہو جائے گا لیکن وہ دشمن کو سخت نقصان پہنچائے گا یا وہ انہیں آزمائش میں ڈال دے گا یا وہ کوئی ایسا اثر چھوڑے گا جس سے مسلمان نفع پائیں گے تو یہ بھی جائز ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کا جب ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کے گھوڑے ایرانیوں کے ہاتھیوں سے ڈر گئے۔ تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مٹی کا ایک ہاتھی بنایا اور اس نے اپنے گھوڑے کو مانوس کیا حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اس کا گھوڑا ہاتھی سے نہ بھاگا، اس نے اس ہاتھی پر حملہ کر دیا جو آگے آگے تھا۔ اس کو کہا گیا: یہ تجھے قتل کر دے گا، اس مسلمان نے کہا: میرا قتل ہونا کوئی نقصان نہیں جبکہ مسلمانوں کو فتح مل جائے۔ اسی طرح جنگ یمامہ میں ہوا۔ جب بنو حنیفہ ایک باغ میں محفوظ ہو گئے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: تم مجھے چمڑے کی ڈھال میں رکھو اور مجھے دشمنوں کے پاس پھینکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اس نے تنہا ان سے جہاد کیا اور ان کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

میں کہتا ہوں: اسی قسم سے ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 65-264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ احکام القرآن، صفحہ 116، جلد 1 (دار الفکر)

کہ اگر میں صبر کرتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے الله کے راستہ میں شہید ہو جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لئے جنت ہے۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھس گیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد میں سات انصاریوں اور دو قریش میں تنہا تھے۔ جب دشمن قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ ایک انصاری آگے بڑھا اس نے جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا پھر دشمن قریب آئے تو فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہے پھر ایک انصاری آگے بڑھا جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ آپ اسی طرح فرماتے رہے حتیٰ ساتوں آدمی شہید ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما انصفنا اصحابنا (1) (ہم نے اپنے ساتھیوں کی قتال پر رہنمائی نہیں کی حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے) (انصَفْنَا اصحابنا) میں ایک روایت فا کے سکون اور اصحابنا با کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دوسری روایت میں فا کے فتحہ اور با کے رفع کے ساتھ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت لوٹ جائے گی اس کی طرف جو آپ کے ساتھیوں میں سے بھاگ گیا تھا۔ محمد بن حسن نے کہا: اگر ایک مسلمان شخص ہزار مشرکوں پر حملہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ اسے نجات کی غالب امید ہو یا دشمن کو قتل کرنے کی امید ہو۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو یہ عمل مکروہ ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کے لئے پیش کیا جبکہ اس میں مسلمانوں کا کوئی نفع نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد مسلمانوں کو کفار پر جرأت دلانا ہے تاکہ وہ بھی اس کی طرح عمل کریں تو اس کا جواز بعید نہیں کیونکہ اس میں بعض وجوہ کے اعتبار سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اگر اس کا قصد دشمن کو ڈرانا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے دین میں صلابت کو جان لیں۔ پس اس کا جواز بھی بعید نہیں ہے اور جب اس میں مسلمانوں کا نفع ہو اور وہ اپنے آپ کو الله تعالیٰ کے دین کے اعزاز کے لئے اور کفر کی توہین کے لئے اپنی جان دیتا ہے تو یہ وہ مقام ہے جس کی الله تعالیٰ نے مومنین کی مدح کی ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیۃ (توبہ: 111) یہ آیت اور دوسری آیات جس میں الله تعالیٰ نے اپنی جان قربان کرنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی بنیاد پر ہونا چاہئے جب اسے دین کے نفع کی امید ہو وہ اس میں جان دے دے حتیٰ کہ وہ شہید کر دیا جائے تو وہ شہداء کے اعلیٰ درجات میں ہوگا۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (لقمان) (حکم دو نیکی کا اور منع کرو برائی سے اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: شہداء میں سے افضل حمزہ بن عبد المطلب ہے اور وہ شخص ہے جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ادا کیا اور اس نے اسے شہید کر دیا (2)۔ مزید تفصیل ان شاء الله سورۂ آل عمران میں آئے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، صفحہ 107، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی، صفحہ 247، جلد 2 (وزارت تعلیم)

سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الامر بالمعروف، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَحۡسِنُوۡا طاعت میں خرچ کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہتر بدل عطا کرنے میں اچھا گمان کرو بعض علماء نے فرمایا: طاعات کی پیروی کرنے کے ساتھ اپنے اعمال میں اچھائی کرو یہ مفہوم بعض صحابہ سے مروی ہے۔

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ ۚ وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ صِيَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ ٚ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈالے) تو وہ فدیہ دے دے روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس (روزے) ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: علماء کا حج وعمرہ اللہ کے لئے مکمل کرنے کے مرادی معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: حج وعمرہ کا اللہ کی رضا کے لئے ادا کرنا ہے، جیسے ارشاد ہے: فَاَتَمَّهُنَّ (انہیں ادا کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ (البقرہ: 187) پھر تم رات تک روزہ رکھو، یہ مفہوم ان علماء کے نزدیک ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے عمرہ کو واجب نہیں کیا انہوں نے فرمایا: حج اور عمرہ شروع کرنے کے بعد انہیں مکمل کرنا مراد ہے جس نے عبادت (حج یا عمرہ) کا احرام باندھا اس پر اس کو مکمل کرنا واجب ہے وہ اسے فسخ نہ کرے۔ شعبی اور ابن زید نے یہی مفہوم بیان کیا ہے اور حضرت علی بنی تخت سے مروی ہے، حج وعمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تم اپنے اہل کے گھر سے دونوں کا احرام باندھو۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہی مروی ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے یہی کہا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: حج وعمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تو ان کا قصد کر کے نکلے، تجارت یا کوئی غرض نہ ہو۔ اس قول کو لِلّٰہِ کا قول تقویت دیتا ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: ان کا اتمام یہ ہے کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔ تمتع اور قران نہ کیا جائے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا اتمام یہ ہے کہ اس میں تم وہ عمل نہ کرو جو تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ وہ احرام میں شرک کرتے تھے وہ تلبیہ اس طرح کہتے تھے: لبیك اللھم لبیك لا شریك لك اِلَّا شریکًا ھو لك تملکه و ما ملك (اے اللہ! میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شرک بھی تیرے لئے ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی مالک ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج وعمرہ کو مکمل کرو اور ان کے ساتھ کسی اور شے کو نہ ملاؤ۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے اور جو حضرت عمران بن حصین نے احرام میں ان مواقیت سے پہلے کیا جن کو رسول اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس کے مطابق حضرت عبد اللہ بن مسعود اور متقدمین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ایلیاء سے احرام باندھا تھا۔ حضرات اسود، علقمہ، عبد الرحمن اور ابو اسحٰق نے اپنے گھروں سے احرام باندھا تھا۔ امام شافعی نے اس میں رخصت دی ہے۔ ابو داؤد، دارقطنی نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے بیت المقدس سے حج یا عمرہ کا احرام باندھا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جس طرح وہ اس دن تھا جس دن والدہ نے اسے جنم دیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ وکیع پر رحم فرمائے انہوں نے بیت المقدس سے مکہ تک احرام باندھا تھا۔ اس میں میقات سے پہلے احرام باندھنے کی اجازت ہے۔ امام مالک نے میقات سے پہلے احرام باندھنے کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی مروی ہے۔ انہوں نے حضرت عمران بن حصین پر انکار کیا تھا جنہوں نے بصرہ سے احرام باندھا تھا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عمر پر انکار کیا تھا جبکہ انہوں نے میقات سے پہلے احرام باندھا تھا۔

امام احمد اور اسحاق نے کہا: عمل کی وجہ مواقیت ہیں۔ اس قول کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مواقیت کو متعین فرمایا اور ان کی تعیین فرمائی، پس یہ حج کے اجمال کے لئے بیان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے حج کا احرام اپنے گھر سے نہیں باندھا تھا بلکہ اس میقات سے باندھا تھا جو اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا تھا اور جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا وہی افضل ہے۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح جمہور صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے کہا: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی وجہ سے پہلے باندھنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا (3)، اور حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے نیز صحابہ کرام سے جو میقات سے پہلے احرام باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حجت پکڑی ہے حالانکہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے میقات سے حج کے احرام باندھنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، من اھل بعمرة من بیت المقدس، صفحہ 222 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، قول النبی یسروا ولا تعسروا، صفحہ 904، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے وقت موجود تھے انہوں نے اس کی مراد و مقصود کو پہچانا تھا اور انہیں علم تھا کہ میقات سے احرام باندھنا امت پر آسانی کرنے کے لئے تھا۔

مسئلہ نمبر 2: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ کو، اہل شام کے لئے جحفہ کو، اہل نجد کے لئے قرن کو، اہل یمن کے لئے یلملم کو میقات مقرر کیا اور یہ میقات ان لوگوں کے لئے ہیں اور جو دوسرے شہروں سے ان مواقیت پر آئے جو حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہو۔ اور اس کے علاوہ علاقوں کے لوگ جہاں سے چاہیں احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں (1)۔ اہل علم کا اس حدیث کے ظاہر قول پر اور اس کے استعمال پر اجماع ہے اس میں سے کسی چیز پر اختلاف نہیں ہے اور اہل عراق کے میقات میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے اس کا میقات مقرر فرمایا۔ ابوداؤد، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مشرق کے لئے العقیق کو میقات مقرر کیا (2)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا (3)۔ صحیح ہے۔ اور جنہوں نے روایت کیا کہ حضرت عمر نے عراق کے لئے میقات مقرر کیا ...... اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے دور میں عراق فتح ہوا...... یہ ان کی غفلت ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا میقات مقرر کیا جس طرح اہل شام کے لئے جحفہ کو مقرر کیا اور شام اس وقت دار کفر تھا جس طرح عراق اور دوسرے شہر دار کفر تھے۔ عراق اور شام حضرت عمر کے عہد میں فتح ہوئے تھے۔ اس میں سیرت نگاروں کا کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے کہا: ہر عراقی یا مشرقی ذات عرق سے احرام باندھے گا تمام کے نزدیک وہ اپنے میقات سے احرام باندھنے والا ہوگا اور العقیق علماء کے نزدیک ذات عرق سے احوط اور اولیٰ ہے اور ذات عرق بالاجماع عراقیوں کا میقات ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھا وہ محرم ہے اور جو علماء میقات سے احرام باندھنے کو افضل قرار دیتے ہیں وہ میقات سے پہلے احرام باندھنے سے منع کرتے ہیں تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے نفس پر اس چیز میں تنگی نہ کریں جو اللہ نے اس پر وسیع فرمائی ہے اور احرام میں کوئی بدعت نہ کرے۔ لیکن تمام کے نزدیک جو میقات سے پہلے احرام باندھے گا اس پر احرام لازم ہوگا کیونکہ اس نے زیادتی کی نہ کہ کمی۔

مسئلہ نمبر 4: اس آیت میں عمرہ کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اتمام کا حکم دیا ہے جس طرح حج کے اتمام کا حکم دیا ہے۔ صبی بن معبد نے کہا: میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ میں نے کہا: میں نصرانی تھا پھر میں نے اسلام قبول کیا، میں نے حج اور عمرہ کو اپنے اوپر فرض پایا ہے۔ میں نے دونوں کا احرام باندھا ہے۔ حضرت عمر نے اسے فرمایا: تجھے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، مھل اھل مکۃ للحج والعمرۃ، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی مواقیت الاحرام لاھل الآفاق، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، فی المواقیت، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نبی کی سنت کی ہدایت دی گئی ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت عمر نے اس کے قول (میں نے اپنے اوپر حج اور عمرہ کو فرض پایا ہے) پر انکار نہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس نے ان کے وجوب کا قول کیا ہے۔ دار قطنی نے ابن جریج سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: مجھے نافع نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے اللہ کی مخلوق میں سے کوئی نہیں ہے مگر اس پر حج اور عمرہ واجب ہیں جو ان کی طرف جانے کے راستہ کی طاقت رکھتا ہے (1) اور تابعین میں سے جو عمرہ کے وجوب کے قائل ہیں وہ یہ ہیں۔ حضرات عطا، طاؤس، مجاہد، حسن، ابن سیرین، شعبی، سعید بن جبیر، ابو بردہ، مسروق، عبداللہ بن شداد، شافعی، احمد، اسحاق، ابوعبید، ابن الجہم (مالکیوں میں سے) ثوری نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ وہ عمرہ واجب ہے۔ زید بن ثابت سے حج سے پہلے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: دو نمازیں ہوں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے تو آغاز کرلے۔ یہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ محمد بن سیرین عن زید بن ثابت کے سلسلہ سے مرفوع حدیث مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے چاہے آغاز کرلے (2)۔ امام مالک فرماتے تھے، عمرہ سنت ہے اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو چھوڑنے کی رخصت دی ہو۔ یہ نخعی اور اصحاب رائے کا قول ہے جو ابن منذر نے حکایت کیا ہے بعض قزوینی اور بغدادی علماء نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اسے حج کی طرح واجب کہتے تھے اور یہ سنت ثابتہ ہے (3)۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ کا قول ہے۔

دار قطنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں محمد بن قاسم بن زکریا نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن العلاء ابو کریب نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبدالرحیم بن سلیمان نے بیان کیا انہوں نے حجاج سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بیان کیا، فرمایا: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں پوچھا کیا یہ واجب ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے عمرہ کے متعلق پوچھا کیا یہ واجب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اور تیرا عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے۔ اس حدیث کو یحییٰ بن ایوب نے حجاج اور ابن جریج سے انہوں نے ابن المنکدر سے انہوں نے حضرت جابر سے موقوف روایت کی ہے (4) یعنی یہ حضرت جابر کا قول ہے۔ یہ ان علماء کی حجت ہے جو عمرہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ سنت کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اس آیت میں وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اتمام کے وجوب میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا ہے نہ کہ آغاز کے وجوب کے اعتبار سے ملایا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کی ابتدا کا ذکر کیا تو فرمایا: **وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ** (البقرہ: 43) اور حج کے ایجاب کا ذکر ابتداً فرمایا **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ** (آل عمران: 97) جب عمرہ کا ذکر فرمایا تو اس کے اتمام کا مکمل کرنا واجب ہے۔ آیت کریمہ اتمام کے الزام کے لئے ہے نہ کہ ابتدا کے الزام کے لئے آئی ہے (5)۔ واللہ اعلم۔۔۔۔ مخالف نے نظر کی جہت سے اس کے وجوب پر یہ دلیل دی ہے کہ حج کا رکن عرفات میں ٹھہرنا ہے اور عمرہ میں وقوف نہیں ہے اگر یہ حج کی سنت کی طرح ہوتا تو افعال میں اس کے مساوی کرنا واجب ہوتا، جس طرح نماز کی سنت

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 2 (قاہرہ)　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 1 (قاہرہ)　5۔ احکام القرآن، صفحہ 19-118، جلد 1 (دار الفکر)

افعال میں اس کی فرضیت کے مساوی ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: شعبی اور ابوحیوہ نے العمرۃ کو تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی اس کے عدم وجوب کی دلیل ہے اور جماعت نے العمرۃ کو تا کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ وجوب کی دلیل ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں واتموا الحج و العمرۃ الی البیت للہ ہے اور ان سے اقیموا الحج و العمرۃ الی البیت (1) بھی مروی ہے لِلّٰهِ کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ عرب حج کا قصد اجتماعیت، تعاون، مقابلہ، تنافر، قضاء حاجت اور بازاروں میں جانے کے لئے کرتے تھے۔ ان سب میں اللہ کے لئے اطاعت نہیں ہے اور اس ارادہ کا کوئی حصہ نہیں ہے اور عقیدہ کے اعتبار سے کوئی قربت نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی اور اللہ کے حق کی ادائیگی کے لئے قصد کرنے کا حکم دیا پھر تجارت کی بھی اجازت فرمادی جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6: اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف نہیں جو مناسک حج میں حاضر ہو جبکہ اس نے حج اور عمرہ کی نیت نہ کی ہو..... قلم اس کے حق میں اور اس کے خلاف جاری ہے..... اس کا بغیر نیت اور قصد کے ان مقامات پر آنا اسے کچھ مفید نہیں ہے..... نیت کرنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَتِمُّوا اور عبادت کے تمام سے نیت کا حضور بھی ہے یہ احرام کے وقت احرام کی طرح فرض ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوئے تو کہا: لبیك بحجة و عمرة معاً۔ (2) جیسا کہ آگے آئے گا۔

ربیع نے بویطی کی کتاب میں امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: اگر کسی نے تلبیہ کہا اور حج اور عمرہ کی نیت نہیں کی تو وہ حج اور عمرہ کرنے والا نہ ہوگا اور اگر نیت کی اور تلبیہ نہ کہا حتیٰ کہ تمام مناسک پورے کر دیئے تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے حجت پکڑی ہے: انما الاعمال بالنیات۔ (3) فرمایا: جس نے اس طرح کہا جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا تھا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر احرام باندھا تھا تو یہ نیت درست ہے کیونکہ یہ غیر کی نیت پر واقع ہوا ہے جو پہلے ہو چکی ہے بخلاف نماز کے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کا مراہق اور غلام کے بارے میں اختلاف ہے یہ جو حج کا احرام باندھتے ہیں پھر مراہق بالغ ہو جاتا ہے، غلام آزاد ہو جاتا ہے اور یہ وقوف عرفہ سے پہلے ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ان دونوں کو احرام کھولنے کی اجازت نہیں اور نہ کسی اور کو یہ اجازت ہے۔ امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اور جس نے احرام کو کھولا اس کا حج اور عمرہ مکمل نہ ہوا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جب بچہ وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ احرام کو نئے سرے سے باندھے۔ اگر اس نے اپنے حج کو جاری رکھا تو یہ فرض حج کی طرف سے جائز نہ ہوگا اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب اس کا حج جائز نہ تھا اور نہ اس کو فرض لازم تھا۔ جب اس نے حج کا احرام باندھا تھا پھر اس کو حج لازم ہو گیا جب وہ بالغ ہوا تو اس کے لئے اس فرض کو چھوڑنا محال ہو گیا جو اس پر متعین ہو چکا ہے، نوافل کا ادا کرنا اور فرض کو

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، باب القران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، بدء الوحی، صفحہ 2، جلد 1 (وزارت تعلیم)

چھوڑنا محال ہے، جس طرح کوئی شخص نوافل میں داخل ہوا پھر فرضوں کی جماعت کھڑی ہوگئی اور اسے فرض کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ نوافل کو توڑ دے اور فرض میں داخل ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: جب بچہ احرام باندھے پھر وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ اسی احرام کے ساتھ عرفات میں ٹھہرا تو اس کا یہ حج فرض ادا ہو جائے گا اور اسی طرح غلام کا حکم ہے۔ فرمایا: اگر مزدلفہ میں آزاد ہوا اور بچہ مزدلفہ میں بالغ ہوا تو وہ دونوں آزادی اور بلوغ کے بعد عرفہ کی طرف لوٹ آئیں پھر وہ طلوع فجر سے پہلے عرفہ کے وقوف کو پالیں تو ان کا فرض حج ادا ہو جائے گا اور ان پر بکری لازم نہ ہوگی اور اگر وہ احتیاطاً بکری وغیرہ دے دیں تو میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ میرے نزدیک واضح نہیں ہے، اور احرام کی تجدید کو ساقط کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کیونکہ جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ یمن سے حج کا احرام باندھ کر آئے تھے تم نے کیسا احرام باندھا ہے۔؟ حضرت علی نے کہا: میں نے کہا: لبیك اللھم باھلال کاھلال نبیك۔ اے اللہ! میں نے تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام جیسا احرام باندھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے اور میں ہدی (بکری یا اونٹ) ساتھ لایا ہوں (1)۔ امام شافعی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کا انکار نہ کیا اور انہیں حج مفرد یا حج تمتع یا حج قران کی نئی نیت کرنے کا حکم فرمایا۔ امام مالک نے اس نصرانی کے بارے میں فرمایا جو عرفہ کی شام کو اسلام قبول کرتا ہے پھر وہ حج کا احرام باندھتا ہے تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح غلام آزاد ہو جائے، بچہ بالغ ہو جائے جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے نہ ہوں اور ان میں سے کسی پر بکری لازم نہ ہوگی...... بکری اس پر لازم ہوتی ہے جو حج کا ارادہ کرے اور میقات سے احرام نہ باندھے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: غلام پر بکری لازم ہے وہ اس آزاد کی مانند ہے جو میقات سے تجاوز کر گیا۔ بخلاف بچے اور نصرانی کے ان پر دخول مکہ کے لئے احرام لازم نہ تھا کیونکہ ان پر فرض ساقط تھا جب کافر مسلمان ہوا، بچہ بالغ ہو تو ان کا حکم مکی کے حکم کی طرح ہے۔ میقات کو ترک کرنے کی وجہ سے ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ

اس میں بارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: ابن عربی نے کہا یہ آیت انتہائی مشکل ہے اور علماء کو عاجز کر دینے والی آیت ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی اشکال نہیں ہے ہم اس کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ ہم کہتے ہیں: احصار کا معنی اس وجہ سے روکنا ہے جس کا تو قصد کئے ہوئے ہے خواہ وہ کسی عذر سے ہو، خواہ دشمن روک لے یا ظالم بادشاہ روک لے، یا مرض روک لے یا کوئی اور وجہ ہو۔ علماء کا مانع کی تعیین میں اختلاف ہے۔ علماء کے دو قول ہیں: (۱) حضرت علقمہ، حضرت عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا: مانع مرض ہے، دشمن نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: صرف دشمن ہے۔ یہ حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر، حضرت انس اور امام شافعی کا قول ہے، ابن عربی نے کہا: یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے۔ اکثر اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ اُحْصِرَ کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من اھل فی زمن النبی، صفحہ 211، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر) 3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

معنی ہے: اس کو مرض لاحق ہوئی اور حصر کا مطلب ہے: اس پر دشمن نازل ہوا (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن عربی نے جو حکایت کیا ہے کہ یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے، یہ صرف اشہب کا قول ہے باقی تمام اصحاب مالک نے اس میں مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: احصار سے مراد مرض کا روک لینا ہے اور رہا دشمن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: حصر حصراً فھو محصور۔ یہ الباجی کا المنتقی میں قول ابو اسحاق۔ زجاج نے حکایت کیا ہے کہ تمام اہل لغت کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا: احصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) حُصِرَ (دشمن کے ذریعے روکا گیا (2)) ابن فارس کی مجمل میں اس کے برعکس ہے۔ فحصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) احصر (دشمن کے ذریعے روکا گیا)

ایک طائفہ نے کہا: دونوں کے لئے احصر استعمال ہوتا ہے یہ ابو عمرو نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کے قول کے مشابہ ہے کہ انہوں نے مؤطا میں دونوں کے لئے احصر کا عنوان باندھا ہے۔ فراء نے کہا: مرض اور دشمن میں دونوں صیغے برابر ہیں۔ قشیری ابو نصر نے کہا: شوافع نے دعویٰ کیا ہے کہ احصار دشمن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مرض کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں صیغے دونوں (مرض اور دشمن) کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: شوافع نے جو دعویٰ کیا ہے امام خلیل بن احمد وغیرہ نے اس کے خلاف نص قائم کی ہے۔ خلیل نے کہا: حصرت الرجل حصراً (میں نے اسے روک لیا) واحصِرَ الحاج عن بلوغ المناسك من مرض او نحوه (حاجی مرض یا اس جیسی چیز سے مناسک تک پہنچنے سے روک دیا گیا)۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا: پہلے تو ثلاثی بنایا حصرت سے مشتق کیا اور دوسرے کو مرض میں رباعی بنایا۔ اسی پر حضرت ابن عباس کا قول ہے: لا حصر الاحصر العدو۔ (3) حصر نہیں ہے مگر دشمن کا حصر۔ ابن السکیت نے کہا: احصرہ المرض جب مرض سفر سے یا حاجت سے روک دے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ حصرہ العدو یحصرونه، جب دشمن اسے روک لے اور وہ دشمن کا گھیراؤ کر لیں۔ حاصروہ محاصرۃً و حصاراً۔ انہوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اخفش نے کہا: حصرت الرجل فھو محصورٌ۔ یعنی میں نے اسے روک لیا۔ فرمایا: احصرنی بولی و احصرنی مرضی اس نے مجھے اپنے نفس کو روکنے والا بنا دیا۔ ابو عمرو شیبانی نے کہا: حصرنی الشیء و احصرنی۔ یعنی اس نے مجھے روک لیا۔

میں کہتا ہوں: اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ حصر دشمن کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احصر مرض کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (البقرہ: 273) (فقراء کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کے راستہ میں)۔ ابن عبادہ نے کہا:

و ما هجر ليلى ان تكون تباعدت   عليك ولا ان احصرتك شغولُ

لیلیٰ کی جدائی نہیں کہ وہ تجھ سے دور ہو گئی نہ تجھے مشغولیت نے روکا۔

زجاج نے کہا: تمام اہل لغت کے نزدیک احصار مرض سے ہوتا ہے۔ رہا دشمن سے احصار تو اس کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حُصِرَ حصراً۔ پہلے میں اُحصر احصاراً کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے قول کی دلیل ہے اس کا معنی روکنا ہے۔ اس

1۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر)   2۔ ایضاً، صفحہ 121، جلد 1   3۔ معالم التنزیل، صفحہ 244، جلد 1 (دار الفکر)

سے الحصیر ہے وہ شخص جو دل کے راز بتانے سے اپنے نفس کو روکتا ہے۔ الحصیر بادشاہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ حجاب کے پیچھے محبوس (قیدی) کی طرح ہوتا ہے۔ الحصیر چٹائی کو بھی کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے کیونکہ اس کے پتے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ رکی ہوئی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: جب الحصر کا اصل معنی روکنا ہے تو احناف نے کہا: محصر وہ ہے جو احرام کے بعد مرض یا دشمن یا کسی وجہ سے مکہ سے روکا گیا ہو اور انہوں نے مطلق احصار کے مقتضا سے حجت پکڑی ہے اور انہوں نے فرمایا: آخر آیت میں امن کا ذکر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ مرض کی وجہ سے نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الزکام امان من الجذام زکام جزام کی مرض سے امان ہے اور فرمایا: جس نے چھینک مارنے والے سے پہلے الحمد کہا وہ دانتوں کی تکلیف، کان کی تکلیف اور پیٹ کی تکلیف سے محفوظ ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ احناف نے کہا: ہم نے دشمن کے روکنے کو مرض پر قیاس کرتے ہوئے حصار بنایا جب وہ اس کے حکم میں ہے نہ کہ ظاہر کی دلالت کے اعتبار سے حصار بنایا ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عباس، امام شافعی اور اہل مدینہ نے کہا: آیت سے مراد دشمن کا روکنا ہے کیونکہ آیت عمرہ حدیبیہ میں ٦ ہجری میں نازل ہوئی جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے روکا تھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو کفار قریش بیت اللہ اور آپ کے درمیان حائل ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدی کو نحر کیا اور اپنے سر کا حلق کرایا(1)۔ اس پر فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ کا ارشاد دلالت کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا: جب تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: جمہور علماء کا خیال ہے کہ محصر جسے دشمن نے روک لیا ہو وہ جہاں روکا گیا ہو وہاں اپنا احرام کھول دے، اپنی ہدی کو نحر کردے اگر اس کے پاس ہدی ہو اور وہ اپنے سر کا حلق کرائے۔ قتادہ اور ابراہیم نے کہا: وہ اپنی ہدی بھیجے اگر ممکن ہو جب اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے تو وہ حلال ہو جائے (2) (یعنی احرام کھول دے) امام ابوحنیفہ نے کہا: احصار کا جانور، دسویں ذی الحجہ کو ذبح کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دسویں کے دن سے پہلے بھی اس کو ذبح کرنا جائز ہے جب ہدی اپنے محل کو پہنچ جائے۔ صاحبین نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ صاحبین نے کہا: یہ دسویں کے دن ذبح کیا جائے گا، اگر دسویں کے دن سے پہلے ذبح کی تو جائز نہ ہوگی۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جو دشمن کی وجہ سے روکا گیا ہو خواہ وہ دشمن کافر ہو یا مسلمان ہو یا جابر سلطان نے اسے قید خانہ میں بند کر دیا ہو اس پر ہدی واجب ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: جو حج یا عمرہ میں بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز ہدی کو نحر کیا تھا، اسے اشعار کیا تھا اور اسے ہار پہنایا تھا جب عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب وہ ہدی اپنے مقام پر نہ پہنچی کفار کے روکنے کی وجہ سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نحر کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ ہدی تھی اور اس کو قلادہ پہنانا اور اشعار کرنا واجب تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لئے نکلے تھے۔ پس اس میں رجوع

1۔ صحیح بخاری، کتاب العمرۃ، اذا احصر المعتمر، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائز نہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکاوٹ کی وجہ سے اسے نحر نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے جو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی واجب نہیں ہے۔ اور جمہور علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز نہ احرام کھولا تھا اور نہ حلق کرایا تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ محصر کے احرام کھولنے کی شرط ہدی کا ذبح کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہدی ہو اور اگر وہ فقیر ہو تو جب وہ ہدی پائے اور اس پر قادر ہو وہ احرام نہ کھولے مگر ہدی دینے کے بعد۔ یہی ارشاد فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا مقتضا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب وہ ہدی پر قادر ہو تو حلال ہو جائے اور ہدی دے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں اسی طرح جو ہدی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کا حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 5: عطا وغیرہ نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر، دشمن کی وجہ سے محصر کی طرح ہے۔ امام مالک اور شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: جس کو مرض نے روک لیا ہو اس کو بیت اللہ کا طواف ہی حلال کرے گا اگرچہ وہ کئی سال ہی ٹھہرا رہے حتیٰ کہ اسے تکلیف سے افاقہ ہو جائے (1)۔ اسی طرح جس کو گنتی میں غلطی ہوئی یا اس پر ذی الحج کا چاند مخفی ہوا، اس کا حکم ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں اہل مکہ اہل آفاق کی طرح ہیں۔ فرمایا: اگر مریض دواء کا محتاج ہو تو وہ اس کے ساتھ علاج کرے اور فدیہ دے اور اپنے احرام پر باقی رہے اور اسے کسی چیز سے حلال ہونا جائز نہیں حتیٰ کہ مرض سے ٹھیک ہو جائے۔ جب مرض سے ٹھیک ہو جائے تو وہ بیت اللہ کی طرف جائے اس کے سات چکر لگائے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور اپنے حج اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ یہ تمام امام شافعی کا قول ہے اور ان کا نظریہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کا ہے۔ انہوں نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر یا گنتی میں غلطی کی وجہ سے محصر کے بارے میں فرمایا: اس کو طواف ہی حلال کرے گا۔ اسی طرح کوئی عضو ٹوٹ جائے یا جلاب لگ جائیں۔ اس کا بھی یہی حکم ہے امام مالک کے نزدیک جس کی یہ حالت ہو اسے اختیار ہو گا جب اسے وقوف عرفہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو مرض کی وجہ سے تو اگر وہ چاہے تو چلا جائے جب اس کے لئے بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو تو وہ طواف کرے اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ اور اگر چاہے تو آئندہ سال تک احرام پر باقی رہے اگر وہ احرام پر باقی رہے گا تو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو حاجی کو منع ہوتا ہے۔ پس اس پر ہدی نہ ہو گی اور اس میں حجت صحابہ کا اجماع ہے کہ جو تعداد میں غلطی کر جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ طواف سے ہی حلال ہو گا اور مکی کے بارے میں فرمایا: جب وہ محصور باقی رہے حتیٰ کہ لوگ اپنے حج سے فارغ ہو جائیں تو وہ حل کی طرف نکل جائے، تلبیہ کہے اور وہی کرے جو عمرہ کرنے والا کرتا ہے اور حلال ہو جائے جب آئندہ سال آئے تو حج کرے اور ہدی دے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: مکہ والوں میں سے مکہ میں محصر ہو تو اسے وقوف عرفہ لازم ہے اگرچہ اسے چارپائی پر اٹھا کر لے جایا جائے۔ اس قول کو ابو بکر محمد بن احمد بن عبد اللہ بن بکیر مالکی نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: محصر مکی کے بارے میں امام مالک کا قول یہ ہے کہ اس پر بھی آفاقیوں کی طرح حج اور ہدی کا اعادہ ہے۔ یہ ظاہر کتاب کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور فرمایا: میرے نزدیک اس مسئلہ میں زہری کا قول پسندیدہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ہے۔ یہ اباحت ان لوگوں کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہیں ہیں وہ ٹھہر جائیں کیونکہ ان کی مسافت دور ہے وہ علاج کرائیں اگر چہ حج فوت بھی ہو جائے اور ایسا شخص جس کے درمیان اور مسجد حرام کے درمیان اتنی مسافت ہو جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی تو وہ مناسک حج پر جائے اگر چہ اسے چار پائی پر ہی لے جایا جائے کیونکہ وہ بیت اللہ کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ہر وہ شخص جو دشمن، مرض، خرچ ختم ہونے، سواری گم ہونے یا کسی موذی چیز کے ڈسنے کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا گیا ہو تو وہ احرام کے ساتھ اپنے مکان پر ٹھہرا رہے اور اپنی ہدی بھیج دے یا ہدی کی قیمت بھیج دے، جب وہ نحر کر دے تو اپنے احرام کو کھول دے۔ اسی طرح حضرات عروہ، قتادہ، حسن، عطا، نخعی، مجاہد اور اہل عراق کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ (الآیۃ)

مسئلہ نمبر 6: امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: محرم کو حج میں شرط لگانا کچھ نفع نہیں دیتا جب اسے مرض یا دشمن سے محصر ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ شرط لگانا یہ ہے کہ تلبیہ کہتے وقت لبیك اللھم لبیك۔ جہاں تو مجھے روک لے گا میں اپنا احرام وہاں کھول دوں گا۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور نے کہا شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے لئے وہ شرط ہوگی جو وہ لگائے گا۔ دوسرے بہت سے صحابہ اور تابعین نے بھی یہی کہا ہے ان کی حجت ضباعہ بنت زبیر عن عبد المطلب کی حدیث ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں کیا میں شرط لگا دوں؟ فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میں کیسے کہوں؟ فرمایا: تو یوں کہہ: لبیك اللھم لبیك و محلی من الارض حیث حبستنی (1) (جہاں تو مجھے روک لے گا میں احرام کھول دوں گی) اس حدیث کو ابو داؤد اور دار قطنی وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ضباعہ کی حدیث ثابت ہوتی تو میں اس سے زیادتی نہ کرتا اس کا احرام کھولنا جائز ہے جہاں اسے اللہ تعالیٰ روک لے۔

میں کہتا ہوں: بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ان میں سے ابو حاتم بستی اور ابن منذر ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ضباعہ بنت زبیر سے کہا: تو حج کر اور شرط لگا لے (2)۔ یہی امام شافعی کا قول ہے جب وہ عراق میں تھے پھر مصر میں اسے توقف کیا۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول بہتر ہے۔ عبد الرزاق نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن جریج نے بتایا فرمایا مجھے ابو زبیر نے بتایا کہ طاؤس اور عکرمہ نے انہیں حضرت ابن عباس سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت ضباعہ بنت زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: میں ایک مریض عورت ہوں، میں حج کرنا چاہتی ہوں آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں اگر میں احرام باندھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو احرام باندھ لے اور شرط لگا لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں تو مجھے روک لے گا (3)۔ راوی فرماتے ہیں: اس عورت نے حج کر لیا تھا۔ یہ سند صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کا اختلاف ہے کہ محصر پر قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: دشمن نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الاشتراط فی الحج، صفحہ 247، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، حدیث 82، صفحہ 235، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ ایضاً، حدیث 83، صفحہ 235، جلد 2

جسے روک لیا ہوا اس پر نہ حج کی قضا ہے نہ عمرہ کی، مگر جس نے اپنا فرض حج نہ کیا ہو تو اس پر وجوب کے مطابق حج ہے۔ اسی طرح ان علماء کے نزدیک عمرہ کرنا واجب ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا مرض یا دشمن نے روک لیا ہو تو اس پر حج اور عمرہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اگر وہ حج کا احرام باندھنے والا تھا تو وہ احصار کی صورت میں حج اور عمرہ قضا کرے گا کیونکہ اس کا حج اور احرام عمرہ بن گیا تھا۔ اگر وہ حج قران کرنے والا تھا تو وہ ایک حج اور دو عمرے قضا کرے گا اگر وہ عمرہ کا احرام باندھنے والا تھا وہ ایک عمرہ قضا کرے گا ان کے نزدیک ہر مرض یا دشمن کے ذریعے روکا گیا برابر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ میمون بن مہران کی حدیث سے انہوں نے حجت پکڑی ہے۔ فرمایا: میں اس سال عمرہ کے ارادہ سے نکلا جس میں اہل شام نے حضرت ابن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا ہوا تھا۔ میری قوم کے کئی لوگوں نے میرے ساتھ اپنی ہدی کے جانور بھیجے، میں اہل شام تک پہنچا تو انہوں نے مجھے حرم میں داخل ہونے سے روک لیا۔ میں نے اسی جگہ ہدی کو نحر کیا پھر میں نے احرام کھول دیا اور واپس آ گیا۔ جب آئندہ سال آیا تو میں اپنے عمرہ کی قضا کے لئے نکلا۔ میں حضرت ابن عباس کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ہدی کا بدل دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو اس ہدی کا بدل دینے کو کہا جو انہوں نے عمرہ قضا میں حدیبیہ کے سال نحر کی تھیں اور ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا جس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج یا دوسرا عمرہ ہے (1)۔ اس حدیث کو عکرمہ نے حجاج بن عمرو انصاری سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج ہے (2)۔ ان علماء نے فرمایا: آئندہ سال رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا حدیبیہ کے سال عمرہ کرنا اس عمرہ کی قضا کے لئے تھا۔ اسی وجہ سے اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو اور کسی ساتھی کو کسی چیز کے قضا کرنے کا حکم دیا اور نہ وہ کوئی چیز لئے لوٹے اور کسی وجہ سے ان سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ سال یہ کہا کہ میرا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا ہے جس میں مجھے روکا گیا تھا۔ یہ کوئی آپ ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: عمرۃ القضاء اور عمرۃ القضیۃ برابر ہیں۔ یہ اس عمرہ کا نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے فیصلہ کیا تھا اور اس سال بیت اللہ سے واپس چلے جانے اور آئندہ سال آنے پر ان سے صلح کی تھی اسی وجہ سے اس کو عمرۃ القضیۃ کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: فقہاء میں سے کسی نے اس شخص کے بارے میں نہیں کہا کہ جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تو ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسی جگہ اپنا احرام کھول دے سوائے ابوثور کے۔ انہوں نے حجاج بن عمرو کی حدیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اس کی متابعت داؤد بن علی اور اس کے اصحاب نے کی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وہ عضو ٹوٹنے کے ساتھ احرام کھولے گا لیکن کیسے کھولے گا۔ امام مالک وغیرہ نے کہا: بیت اللہ کے طواف کے ساتھ کھولے گا اس کے علاوہ نہیں کھولے گا اور کوفہ کے علماء نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب المحصر، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الذی یھل بالحج فیکسر او یعرج، صفحہ 113، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ نیت اور اس فعل کے ساتھ کھولے گا جو اسے حلال کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کے درمیان اس میں اختلاف نہیں کہ احصار (روکنا) حج اور عمرہ میں عام ہے۔ ابن سیرین نے کہا: عمرہ میں احصار نہیں ہے کیونکہ اس کا وقت متعین نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ متعین وقت میں نہیں ہے لیکن عذر کے ختم ہونے تک صبر کرنا ضرر (نقصان) ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن زبیر سے حکایت ہے کہ جس کو دشمن یا مرض نے روک لیا ہو تو اس کا طواف کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں اور یہ حدیبیہ کے سال والی خبر جو نص ہے اس کے مخالف ہے۔

مسئلہ نمبر 10: رکاوٹ یا تو کافر کی طرف سے ہوگی یا مسلمان کی طرف سے ہوگی۔ اگر کافر کی طرف سے ہو تو قتال جائز نہیں اگرچہ اس پر غالب آنے کا وثوق بھی ہو اور وہ وہاں حلال ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** (البقرہ: 191) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اگر تاوان کا سوال کرے تو دینا جائز نہیں کیونکہ یہ اسلام میں کمزوری ہے اگر مسلمان نے روکا ہو تو اس سے بھی کسی حال میں قتال جائز نہیں اور احرام کھول دینا واجب ہے اگر وہ کوئی چیز طلب کرے اور راستے چھوڑ دے تو اس کو وہ چیز دینا جائز ہے اور قتال جائز نہیں کیونکہ اس میں روح کا اتلاف ہے اور عبادت کی ادائیگی میں یہ لازم نہیں کیونکہ دین آسان ہے اور رہا اس کو تاوان دینا تو اس میں دو نقصانوں میں سے آسان کا قبول کرنا ہے کیونکہ حج میں مال کو خرچ کیا جاتا ہے پس یہ اس کے خرچ میں سے شمار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: روکنے والے دشمن کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کے احصار کے بقا اور ہمیشہ ہونے کا یقین ہوگا کیونکہ اس کو قوت اور کثرت حاصل ہے یا ایسا نہیں ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو محصر اسی وقت اس کی جگہ احرام کھول دے اور اگر دوسری صورت ہو اور اس احصار کے زوال کی امید ہو تو وہ محصور نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے اور حج کے درمیان اتنا وقت پایا جائے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اب اگر دشمن چلا بھی گیا تو وہ حج کو نہیں پا سکے گا۔ اس وقت ابن قاسم اور ابن ماجشون کے نزدیک وہ احرام کھول دے۔ اشہب نے کہا: دشمن کی وجہ سے حج سے روکا جانے والا شخص احرام نہ کھولے حتیٰ کہ دسویں کا دن آ جائے اور تلبیہ کو ختم نہ کرے حتیٰ کہ لوگ عرفہ کی طرف چلے جائیں۔ ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کے غلبہ کی وجہ سے اس کے حج کی تکمیل سے مایوسی کا وقت ہے۔ پس اس وقت اس کا احرام کھولنا جائز ہے۔ اس کی اصل عرفہ کا دن ہے اور اشہب کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ممکن حد تک احرام کے حکم میں رہنا ہے اور اس کا دسویں کے دن تک التزام کرنا ہے اور حاجی کے لئے یہی وہ وقت ہے جس میں احرام کھولنا جائز ہے۔ پس اس پر دسویں کے دن احرام کھولنا جائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**، ما محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: **فالواجب او فعلیکم ما استیسر**۔ اور محل نصب میں ہونے کا بھی احتمال ہے یعنی **فانحروا او فاھدوا**، **ما استیسر** سے مراد جمہور اہل علم کے نزدیک بکری ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر نے فرمایا: وہ اونٹ اور گائے ہے اس کے علاوہ نہیں (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حسن نے کہا: اعلیٰ ہدی اونٹ ہے، درمیانی گائے ہے اور کم از کم بکری ہے (1)۔ اس میں امام مالک کے نظریہ کی دلیل ہے: جس کو دشمن نے روکا ہو اس پر قضا واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس میں قضا کا ذکر نہیں۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْهَدْيِ، الْهَدْيِ اور الهدی دونوں لغتیں ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجا جاتا ہے خواہ اونٹ ہو یا کوئی اور جانور، عرب کہتے ہیں: کم هدی بنی فلاں، بنوفلاں کے کتنے اونٹ ہیں۔ ابوبکر نے کہا: اس کو ہدی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے بعض بیت اللہ کی طرف بھیجی جاتی ہیں۔ پس جو حکم بعض کو لاحق ہوتا ہے اس کے ساتھ تمام کا نام رکھ دیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء:25)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لونڈیاں زنا کریں تو ان میں سے لونڈی پر جب وہ زنا کرے تو آزاد کنواری عورت کی سزا کا نصف ہے جب آزاد کنواری عورت زنا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے المحصنات کا لفظ ذکر فرمایا۔ مراد کنواری عورتیں ہیں کیونکہ احصان ان میں سے اکثر میں ہوتا ہے۔ پس انہیں ایسے امر کے ساتھ ذکر کیا گیا جو ان میں سے بعض میں پایا جاتا ہے آزاد عورتوں میں سے محصنہ اسے کہا جاتا ہے جو خاوند والی ہو اس پر رجم واجب ہوتا ہے جب وہ بدکاری کرے اور رجم نصف نہیں ہوتا کہ وہ لونڈی پر نصف ہو۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ المحصنات سے مراد یہاں کنواری عورتیں ہیں نہ کہ خاوند والیاں۔ فراء نے کہا: اہل حجاز اور بنو اسد ہدی کو تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فرمایا: تمیم اور سفلی قیس شد کے ساتھ ہدی پڑھتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

حلفت بربِ مكة والمصلّٰى　و　اعناقِ الهدِیّ مقلداتِ

میں نے مکہ، مصلی اور ہار پہنائی گئی ہدیوں کے گردنوں کے مالک کی قسم اٹھائی۔

فرمایا: الهدی کا واحد ہدیہ اور الهدی کی جمع میں اهداء بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ یہ خطاب تمام امت کو ہے خواہ محصر ہو یا محصر نہ ہو۔ علماء میں بعض یہ محصرین کے لئے خاص کرتے ہیں یعنی احرام نہ کھولیں حتی کہ ہدی کو نحر کر دیا جائے۔ محل وہ جگہ ہے جس میں ذبح حلال ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک دشمن کی وجہ سے روکے گئے شخص کے لئے محل احصار کی جگہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اس میں ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں آپ جہاں محصور ہوئے وہاں ہی احرام کھول دیا اور ہدی کو نحر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ (الفتح:25) بعض علماء نے معکوفا کا معنی محبوساً فرمایا جب بیت اللہ تک پہنچنے سے روکی گئی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک احصار میں ہدی کا محل حرم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۳۳﴾ (الحج) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مخاطب وہ امن والا شخص ہے جو بیت اللہ تک

1۔ البحر المحیط، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پہنچ پاتا ہے۔ رہا محصر (روکا گیا) وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے خارج ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں اپنی ہدی نحر کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے نہیں ہے اور دوسری دلیل احناف کی حضرت ناجیہ بن جندب کی حدیث ہے، اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا: حضور! آپ میرے ساتھ ہدی بھیجیں میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: تو اسے کیسے لے جائے گا(1)؟ اس نے کہا: میں اسے وادیوں سے لے جاؤں گا مشرک اس پر قادر نہیں ہوں گے میں اسے لے جاؤں گا حتیٰ کہ میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے جہاں احرام کھولے وہاں ہی نحر کر دے، نبی کریم ﷺ کے حدیبیہ کے مقام پر فعل کی اقتدا کرتے ہوئے۔ یہ صحیح ہے اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے، نیز ہدی، مہدی (بھیجنے والے) کے تابع ہے۔ جب بھیجنے والا اپنے احصار کی جگہ احرام کھول دے گا تو ہدی بھی اس کے ساتھ نحر کر دی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 2: محصر (روکا گیا) کے بارے میں ہم نے جو ثابت کیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کو حلق کرانا جائز ہے یا مقام حل جیسا کوئی عمل کرنا جائز ہے اس سے پہلے کہ اس نے میسر (ہدی) ذبح نہ کی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: سنت ثابتہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ کسی کے لئے اپنے بال کاٹنا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب محصر، ہدی نحر کرنے سے پہلے احرام کھول دے گا تو اس پر بکری ہوگی اور وہ احرام میں ہوگا جیسا پہلے تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دے۔ اور اگر اس نے شکار کیا ہدی نحر کرنے سے پہلے تو اس پر جزا ہوگی۔ اس میں امیر اور غریب برابر ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا حتیٰ کہ وہ ہدی کو ذبح کرے یا اس کی طرف سے ذبح کر دیا جائے۔ علماء احناف نے فرمایا: کم از کم ہدی بکری ہے جو نہ اندھی ہو، نہ اس کے کان کاٹے ہوئے ہوں اور ان کے نزدیک روزہ کا یہ مقام نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: کوفیوں کے قول میں ضعف اور تناقض ہے کیونکہ وہ دشمن سے روکے گئے شخص کے لئے اور مرض سے روکے گئے شخص کے لئے احرام کھولنا جائز قرار نہیں دیتے حتیٰ کہ حرم میں اس کی ہدی نحر کر دی جائے۔ اور جب وہ مرض کی وجہ سے محصر کے لئے جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ ہدی کا بھیجنے والا اور جس کے ساتھ ہدی بھیجی گئی ہے اس سے متعین دن کا وعدہ لے جس میں وہ اس کی ہدی نحر کرے گا۔ پس اس دن کے بعد وہ احرام کھول دے اور حلق کرا دے۔ پس انہوں نے اس کے لئے احرام کھولنا جائز قرار دیا جبکہ ہدی کے نحر ہونے اور اس کے حرم میں پہنچنے کا یقین نہیں ہے اور انہوں نے غالب گمان کے ساتھ احرام کھولنے پر اس کو محمول کیا جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس پر فرائض لازم ہوں اس کے لئے ان سے گمان کے ساتھ نکلنا جائز نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کے قول کا گمان ہے کہ اگر وہ ہدی ہلاک ہو جائے یا گم ہو جائے یا چوری ہو جائے ادھر اس کا بھیجنے والا احرام کھول چکا ہے۔ اپنی ازواج سے حقوق زوجیت ادا کر چکا ہے یا شکار کر چکا ہے تو وہ احرام میں ہوگا اور جو اس نے شکار کیا اس پر اس کی جزا ہوگی۔ پس انہوں نے اس کے لئے حج کے فساد کو مباح کیا اور اس پر وہ لازم کیا جو احرام نہ کھولنے والے شخص پر لازم ہوتا ہے۔ اس میں تناقض اور مذاہب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب نجاسۃ الدم و کیفیۃ غسلہ، صفحہ 140، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کا ضعف ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ احناف نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت ابن مسعود کے قول پر رکھی اور انہوں نے اس کے خلاف میں نظر نہیں کی۔ امام شافعی نے فرمایا: جب محصر ہدی سے عاجز ہو تو اس میں دو قول ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا مگر ہدی دینے کے ساتھ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ جس پر وہ قادر ہے وہ ادا کرے۔ اگر وہ کسی چیز پر قادر نہیں تو جب وہ قادر ہو ادا کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے یہ کہا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی جگہ احرام کھول دے اور جب قادر ہو ہدی ذبح کرے۔ اگر وہ مکہ میں ذبح پر قادر ہو تو اس کے لئے مکہ میں ہی ذبح کرنا ضروری ہے اگر مکہ میں ذبح کرنے پر قادر نہ ہو تو جہاں قادر ہو وہ ذبح کر دے اور فرمایا: کہا جاتا ہے اس میں جائز نہیں مگر ہدی اور کہا جاتا ہے: جب ہدی نہ پائے تو اس پر کھانا کھلانا یا روزے ہوں گے۔ اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ پائے تو ان میں سے ایک ادا کرے جب قادر ہو۔ غلام کے بارے میں فرمایا: اس کے لئے صرف روزہ جائز ہے پہلے اس کے لئے بکری کی قیمت دراہم میں لگائی جائے گی پھر دراہم کا کھانا بنایا جائے گا پھر کھانے کے ہر مد کے بدلے میں ایک دن روزہ رکھے گا۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف ہے جب محصر اپنی ہدی کو نحر کرے کیا اس کے لئے حلق کرانا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا: اس پر سر کا حلق کرانا واجب نہیں کیونکہ اس سے عبادت ختم ہو چکی ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب احصار کی وجہ سے باقی تمام مناسک ساقط ہو چکے ہیں مثلاً طواف، سعی وغیرہ...... حالانکہ ان کے ساتھ حاجی احرام سے حلال ہوتا ہے...... تو اس سے وہ تمام احکام ساقط ہو گئے جن کے ساتھ حاجی احرام سے حلال ہوتا ہے کیونکہ وہ محصر ہو گیا ہے۔ اور جنہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے ان میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن ہیں۔ انہوں نے فرمایا: محصر پر نہ بال کٹوانا ہے نہ حلق کرانا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: محصر حلق کرا لے اور حلق نہیں کرائے گا تو اس پر کوئی چیز واجب بھی نہ ہوگی اور ابن ابی عمران نے ابن سماعہ سے اور انہوں نے امام ابو یوسف سے ان کی ''نوادر'' میں روایت کیا ہے کہ اس پر حلق کرانا لازم ہے اور بال کٹوانے کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو مختلف اقوال ہیں: (۱) محصر کے لئے حلق کرنا عبادت سے ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبادت میں سے نہیں ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے۔ امام مالک کی حجت یہ ہے کہ طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی وغیرہ سے محصر کو روکا گیا ہے۔ پس جن چیزوں سے اسے روکا گیا ہے وہ تو ساقط ہو جائیں گی لیکن حلق کرانا، اس کے کرنے میں تو کوئی حائل نہیں کہ وہ اس کے کرنے پر قادر ہے اور جس کے کرنے پر وہ قادر ہے وہ اس سے ساقط نہیں اور اس پر دلیل کہ محصر پر حلق کرانا باقی ہوتا ہے جس طرح بیت اللہ تک پہنچنے والے پر باقی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ اور وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلقین (حلق کرنے والوں) کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی تھی۔ یہ قطعی حجت ہے اور اس مسئلہ میں نظر صحیح ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک وہ حاجی جس نے حج کو مکمل کیا اور جس کا حج فوت ہوا، دشمن کے ذریعے روکا گیا اور مرض کے ذریعے روکا گیا تمام پر حلق کرانا عبادت ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ امام مالک کے یہ الفاظ ہیں۔ نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے دعا فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: یا اللہ! مقصرین پر رحم فرما(1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کرانے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کرنا اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا کرنا دلیل ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق کرانا، قصر کرانے سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ کا مقتضا بھی یہی ہے ولا تقصروا نہیں فرمایا اور اہل علم کا اجماع ہے کہ قصر کرانا مردوں کے لئے جائز ہے مگر ایک چیز حسن بصری سے ذکر کی گئی ہے کہ وہ پہلا حج جو انسان کرتا ہے اس میں حلق کو واجب قرار دیتے تھے۔

مسئلہ نمبر 5: عورتیں حلق میں داخل نہیں ہیں ان کے لئے سنت قصر کرانا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: عورتوں پر حلق نہیں ہے ان پر صرف قصر کرانا ہے(2)۔ اس روایت کو ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ عورت کا اپنے سر کا حلق کرانا مثلہ ہے اور عورت بالوں کو کتنا کٹوائے اس مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر، امام شافعی، امام احمد، اسحاق کہتے ہیں: وہ ہر مینڈھی سے پورے کی مثل کاٹے۔ عطا نے کہا: بند تین انگلیوں کی مقدار کاٹے۔ قتادہ نے کہا: تہائی یا چوتھائی کی مقدار کاٹے۔ حفصہ بن سیرین نے بوڑھی عورت اور جوان عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں: بوڑھی عورت چوتھائی بال کاٹ دے اور جوان عورت کے لئے انگلی کے پورے کے ساتھ اشارہ کیا وہ تھوڑے تھوڑے کاٹ لے۔ مالک نے فرمایا: پورے سر کے بالوں کو تھوڑا تھوڑا کاٹے جتنا وہ کاٹ لے گی وہ کافی ہوگا۔ امام مالک کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ بعض بالوں کو کاٹے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ابن منذر نے کہا: جس پر کاٹنے کے اسم کا اطلاق ہو وہ جائز ہوگا۔ احوط یہ ہے کہ انگلی کے پورے کی مقدار تمام بال کاٹے۔

مسئلہ نمبر 6: کسی کے لئے سر کا حلق کرانا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کرلے۔ یہ اس لئے ہے کہ ذبح کی سنت حلق سے پہلے ہے۔ اس میں اصل یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا پہلے آپ نے نحر کیا تھا پھر حلق کرایا تھا جس نے اس کی مخالفت کی حلق پہلے کرایا نحر بعد میں کیا اس نے یہ خطأ اور جہالت کی وجہ سے کیا ہوگا یا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہوگی تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ یہ ابن حبیب نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے اور یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن ماجشون نے کہا: اس پر ہدی ہے، یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اگر دوسری صورت میں ہو تو قاضی ابو الحسن نے روایت کیا ہے کہ نحر پر حلق کو مقدم کرنا جائز نہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ظاہر مذہب منع ہے اور صحیح جواز ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذبح، حلق، رمی، تقدیم و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر عند الاحلال، صفحہ 233، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر، صفحہ 272، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے حلق کرانے سے پہلے ذبح کیا یا ذبح کرنے سے پہلے حلق کرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 7: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں سر کا حلق کرانا عبادت اور مطلوب ہے اور حج کے علاوہ جائز ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا: سر کا حلق کرانا مثلہ ہے، اگر یہ مثلہ ہوتا تو حج اور غیر حج میں جائز نہ ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے (3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر کی شہادت کی خبر آنے کے تین دن بعد ان کے بچوں کا حلق کرایا۔ اگر حلق جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا حلق نہ کرواتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سر کا حلق کراتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: علماء کا بالوں کے رکھنے اور حلق کی اباحت پر اجماع ہے یہی حجت کافی ہے۔ وباللہ التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اس آیت سے بعض شوافع نے استدلال کیا ہے کہ پہلی آیت میں محصر سے مراد دشمن سے روکا گیا ہے نہ مرض سے روکا گیا ہے۔ یہ لازم نہیں ہوتا کیونکہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ کا معنی ہے، جو مریض ہو یا اس کے سر میں اذیت ہو پھر حلق کرادے فَفِدْيَةٌ تو اس پر فدیہ ہے۔ جب یہ بلا اختلاف مرض کے بارے میں وارد ہے تو ظاہر یہ ہے کہ آیت کا آغاز بھی اسی کے متعلق وارد ہے جس کے بارے میں اس کا وسط اور اس کا آخر وارد ہے۔ کیونکہ کلام کا بعض، بعض کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور بعض، بعض کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور آخر آیت میں اضمار کو آیت کے ابتدائی مخاطب کی طرف لوٹانا ہوتا ہے۔ پس ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ ظاہر سے پھیرنے کی دلیل موجود ہو۔ اور ہمارے کلام پر دلیل اس آیت کے نزول کا سبب بھی ہے۔ ائمہ نے روایت کی ہے اور یہ دارقطنی کے الفاظ میں حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا جبکہ جوئیں اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ جوئیں تجھے تکلیف دیتی ہیں؟ کعب نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعب کو حلق کرانے کا حکم دیا جبکہ آپ حدیبیہ میں تھے۔ اور صحابہ کے لئے واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے وہ ابھی مکہ میں داخل ہونے کی امید پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کو نازل فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ چھ مساکین کو ایک فرق کھانا کھلائیں یا ایک بکری ہدی دیں یا تین دن روزے رکھیں۔ اس حدیث کو بخاری نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ قول کہ (صحابہ کے لئے واضح نہ تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے (4)) دلیل ہے کہ صحابہ کو دشمن کے روکنے کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز تقدیم الذبح علی الرمی والحلق، صفحہ 422، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من قدم نسکا قبل نسک، صفحہ 225 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، صفحہ 336، جلد 1 (وزارت تعلیم) 4۔ ایضاً، کتاب المغازی، فی غزوۃ حدیبیہ، صفحہ 599، جلد 2 (وزارت تعلیم)

یقین نہ تھا۔ پس فدیہ کا موجب اذیت اور مرض کی وجہ سے حلق کرانا ہے۔) واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: امام اوزاعی نے اس محرم کے بارے فرمایا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، وہ حلق کرانے سے پہلے فدیہ کے ساتھ کفارہ دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: پھر اس صورت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ کا معنی ہوگا جب وہ حلق کرانے کا ارادہ کرے، جو قادر تھا اور حلق کرایا تو اس پر فدیہ ہے وہ فدیہ نہ دے حتیٰ کہ حلق کرا دے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: ابن عبد البر نے کہا: اس حدیث میں نُسُكٍ سے مراد بکری ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن روزے اور کھانا کھلانے میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ روزے تین ہیں اور حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث سے یہ صحیح محفوظ ہے۔ حضرات حسن، عکرمہ اور نافع سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: اذیٰ کے فدیہ میں دس روزے ہیں اور دس مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ فقہاء امصار اور ائمہ حدیث میں سے کسی کا قول نہیں ہے اور ابوزبیر کی روایت میں مجاهد عن عبد الرحمن عن کعب بن عجرہ کے سلسلہ سے مروی ہے، کعب نے بیان فرمایا کہ اس نے ذی القعدہ میں احرام باندھا ان کے سر میں جوئیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئے وہ اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: گویا تجھے تیرے سر کی جوئیں تکلیف دے رہی ہیں۔ حضرت کعب نے کہا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حلق کرالو اور ہدی دے دو۔ حضرت کعب نے عرض کی: میں ہدی نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چھ دن روزہ رکھو (1)۔ حضرت ابوعمر نے کہا: اس حدیث کا ظاہر ترتیب پر ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو پھر اس کا معنی ہوتا کہ پہلا پھر دوسرا اختیار کرو جبکہ عام آثار جو حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے وہ لفظ تخییر (اختیار) کے ساتھ وارد ہیں اور یہ نص قرآنی ہے اسی پر علماء کا فتویٰ اور عمل ہے۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 4: علماء کا اذیت کے فدیہ میں جو کھانے کا ذکر ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس میں کھانا دو مد ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مد کے حساب سے ہوں۔ یہ ابوثور اور داؤد کا قول ہے۔ ثوری سے مروی ہے، فرمایا: یہ گندم سے نصف صاع (۲ کلو) اور کھجور، جو اور کشمش سے ایک صاع ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس نے نصف صاع گندم کو کھجور کے ایک صاع کے برابر بنایا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ حضرت کعب کی بعض اخبار میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو کھجور کے تین صاع چھ مساکین پر صدقہ کر (2)۔ امام احمد بن حنبل نے کبھی تو اسی طرح کہا جس طرح امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے اور کبھی کہا: اگر وہ گندم کھلانا چاہے تو ہر مسکین کو ایک مد دے اگر کھجور کھلانا چاہئے تو نصف صاع دے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، فمن کان منکم مریضا، صفحہ 244، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز حلق الرأس للمحرم، صفحہ 382، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 5: مساکین کو اذیت کے کفارہ میں صبح وشام کا کھانا کھلانا جائز نہیں حتی کہ ہر مسکین کو نبی کریم ﷺ کے مد کے مطابق دو مد دے۔ یہ امام مالک، ثوری، امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: صبح وشام کا کھانا کھلانا جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اہل علم کا اجماع ہے کہ محرم کے لئے بالوں کا حلق کرنا، انہیں کاٹنا، توڑنا اور انہیں تلف کرنا جائز نہیں خواہ وہ نورہ یا کسی اور چیز کے ساتھ ہو مگر بیماری کی حالت میں جیسا کہ قرآن میں نص موجود ہے اور جس نے احرام کی حالت میں بغیر کسی بیماری کے حلق کرایا تو اس پر فدیہ واجب ہے۔ اور اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے بغیر عذر کے حلق کرایا، سلا ہوا لباس پہنا یا خوشبو لگائی۔ امام مالک نے فرمایا: اس نے برا کیا ہے اور اس پر فدیہ ہے اسے اس میں اختیار ہے اور امام مالک کے نزدیک اس میں عمد، خطا، ضرورت اور عدم ضرورت برابر ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور اس کے اصحاب اور ابو ثور نے کہا: اسے اختیار نہیں مگر ضرورت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ اور جس نے جان بوجھ کر حلق کرایا یا بغیر عذر کے جان بوجھ کر لباس پہنا تو اسے اختیار نہیں ہے اس پر صرف بکری واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جس نے بھول کر ایسا کیا اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جان بوجھ کر اور بھول کر یہ عمل کرنے والا فدیہ کے وجوب میں برابر ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، ثوری اور لیث کا قول ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: (۱) اس پر فدیہ نہیں ہے۔ یہ داؤد اور اسحاق کا قول ہے۔ دوسرا اس پر فدیہ ہے۔ اکثر علماء محرم پر لباس پہننے، سر ڈھانپنے یا بعض سر ڈھانپنے، خفین (موزے) پہننے، ناخن کاٹنے، خوشبو لگانے، اذیت کو دور کرنے کی صورت میں فدیہ کو واجب کرتے ہیں۔ اسی طرح جب اپنے جسم کے بالوں کا حلق کیا یا تیل لگایا یا پچھنے لگوانے کی جگہ کا حلق کیا تو یہی حکم ہے۔ عورت اس مسئلہ میں مرد کی طرح ہے۔ اس پر سرمہ لگانے میں فدیہ ہے اگرچہ اس میں خوشبو نہ بھی ہو اور مرد کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو اور عورت پر فدیہ ہے جو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپے یا دستانے پہنے۔ اس میں یہ عمل جان بوجھ کر کرنا، بھول کر کرنا اور جہالت کی وجہ سے کرنا برابر ہے۔ بعض علماء ہر چیز میں دم (بکری) واجب کرتے ہیں۔ داؤد نے کہا: جسم کے بال مونڈنے میں مرد، عورت پر کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا مذکورہ فدیہ دینے کی جگہ میں بھی اختلاف ہے۔ عطا نے کہا: جو دم (بکری) ہوگا وہ مکہ میں دیا جائے گا اور جو کھانا یا روزہ ہوگا وہ جہاں چاہے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اصحاب رائے نے کہا ہے: حسن سے مروی ہے کہ بکری، مکہ میں دی جائے گی۔ طاؤس اور امام شافعی نے کہا: کھانا اور بکری دونوں مکہ میں ہی دیئے جائیں گے روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے کیونکہ روزہ میں اہل حرم کی کوئی منفعت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ: 95) یہ بیت اللہ کے پڑوس میں رہنے والے مساکین پر شفقت کے لئے فرمایا ہے کھانا کھلانے میں بھی منفعت ہے جبکہ روزہ میں کوئی اہل حرم کی منفعت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے فرمایا: یہ عمل جہاں چاہے کرے اور یہ صحیح قول ہے اور یہ مجاہد کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہاں ذبح

سے نسک مراد ہے اور نص قرآن وسنت کی وجہ سے یہ ہدی نہیں ہے اور نسک جہاں چاہے ادا ہوسکتی ہے اور ہدی صرف مکہ میں ہوتی ہے۔ امام مالک کی حجت وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے مؤطا میں حضرت یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے اس میں ہے حضرت علی بن ابی طالب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا حلق کرنے کا حکم دیا (آپ بیمار تھے) پھر ان کی طرف سے سقیا کے مقام پر نسک دیا ان کی طرف سے اونٹ نحر کیا۔ مالک نے فرمایا: یحییٰ بن سعید نے فرمایا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ کی طرف سفر میں نکلے۔ اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ اذیت کا فدیہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ دینا بھی جائز ہے اور مالک کے نزدیک ہدی میں جائز ہے کہ وہ حرم میں نحر کی گئی ہو تو وہ اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مقصود مسلمان مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ مالک نے فرمایا: جب روزہ حرم کے علاوہ کسی جگہ رکھنا جائز ہے تو اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو کھانا کھلانا بھی جائز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ** مطلق ہے اس میں کسی جگہ کی قید نہیں ہے پس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں بھی فدیہ ادا کرے گا جائز ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا **اَوْ نُسُكٍ** جو ذبح کیا جاتا ہے اسے نسک کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہی نام رکھا ہے اس کو آپ نے ہدی نہیں فرمایا اور ہم پر اس کو ہدی پر قیاس کر کے ہدی کے حکم کی طرف لوٹانا لازم نہیں ہے اور ہم ہدی کا اعتبار نہیں کرتے جو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب کو فدیہ کا حکم فرمایا تھا تو وہ حرم میں نہیں تھے۔ پس یہ سب کچھ حرم سے باہر بھی جائز ہے۔ امام شافعی سے اس کی مثل ایک بعید وجہ کے اعتبار سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ نُسُكٍ**، **نُسُكٍ** کا اصل معنی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَرِنَا مَنَاسِكَنَا** (البقرہ:128) یعنی ہمیں اپنی عبادت کی جگہیں دکھا۔ بعض نے فرمایا: لغت میں **نُسُكٍ** کا معنی غسل کرنا ہے۔ اسی سے ہے: نَسَكَ توبة، یعنی اس نے اپنے کپڑے کو دھویا گویا عبادت کرنے والا اپنے نفس کو عبادت کے ذریعے گناہوں سے دھوتا ہے۔ بعض نے فرمایا: النسك کا معنی چاندی کی پگھلی ہوئی ڈلی ہے، اس کی ہر ڈلی کو نسیکہ کہا جاتا ہے۔ گویا عابد اپنے نفس کو گناہوں کی میل اور کھوٹ سے پاک کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اَمِنْتُمْ** بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ بعض نے فرمایا: روکنے والے دشمن کے خوف سے امن میں ہو جاؤ۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ مفہوم الفاظ کے زیادہ قریب ہے مگر مرض کا خوف خیال کیا جائے تو پھر مرض سے امن مراد ہوگا (1) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ** علماء کا اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت علقمہ اور حضرت ابراہیم نے فرمایا: اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جنہیں راستہ میں حج اور عمرہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے روک دیا گیا ہو وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کے لئے راستہ کھلا ہوا ہو۔ ابن زبیر کے نزدیک متمتع کی صورت یہ ہے کہ آدمی کو روک دیا گیا ہو حتیٰ کہ اس کا حج فوت ہو جائے پھر وہ بیت اللہ تک پہنچے اور عمرہ کر کے حلال ہو جائے پھر آئندہ سال حج کو قضا کرے یہ عمرہ اور آئندہ حج تک کے درمیان میں متمتع ہوا اور دوسرے علماء کے نزدیک محصر متمتع وہ ہے جو روک دیا گیا ہو پھر بغیر عمرہ کئے احرام کھول دے اور اسے موخر کر دے حتیٰ کہ وہ آئندہ سال آئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور اسی سال پھر حج کرے۔ حضرت ابن عباس اور علماء کی جماعت کا قول ہے کہ آیت میں روکے گئے اور جن کے لئے راستہ کھلا ہے سب مراد ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمتع جائز ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی اور حج افراد جائز ہے اور حج قران بھی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صورتوں کو پسند فرمایا اور کسی صحابی کے حج پر اعتراض نہیں فرمایا بلکہ انہیں ہر حج کی اجازت دی اور ان سے راضی ہوئے۔ علماء کا اختلاف اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی کون سی صورت کا احرام باندھا تھا اور حج کی ان صورتوں میں افضل صورت کیا ہے؟ کیونکہ اس کے متعلق وارد احادیث مختلف ہیں، بعض علماء نے فرمایا: جن میں سے امام مالک بھی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج مفرد کیا تھا اور حج افراد، حج قران سے افضل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم میں سے حج اور عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ ایسا کرے اور جو صرف حج کا احرام باندھنا چاہے وہ حج کا احرام باندھ لے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرہ کا احرام باندھ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی احرام باندھا، اور بعض لوگوں نے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا، بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا اور میں ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اس حدیث کو ایک جماعت نے ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے (2)۔ یہ اختلاف کے مقام پر نص ہے یہ ان علماء کی حجت ہے جنہوں نے حج افراد کا قول کیا اور اس کو افضل فرمایا، امام محمد بن حسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف احادیث مروی ہوں اور ہمیں خبر پہنچے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ان میں سے ایک حدیث پر عمل کیا اور دوسری کو ترک کیا تو اس میں دلالت ہے کہ حق وہ ہے جس پر ان دونوں نے عمل کیا۔ اور ابوثور نے افراد کو پسند کیا اور اسے حج تمتع اور حج قران پر فضیلت دی۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول ہے اور دوسرے علماء نے حج تمتع کو پسند فرمایا۔ انہوں نے فرمایا: حج تمتع افضل ہے یہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر کا مذہب ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے دارقطنی نے کہا: امام شافعی نے کہا: میں نے افراد کو پسند کیا۔ تمتع بھی اچھا ہے ہم اسے ناپسند نہیں کرتے اور جنہوں نے حج تمتع کو فضیلت دی انہوں نے مسلم کی حضرت عمران بن حصین سے مروی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمتع کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی (یعنی حج تمتع کے بارے میں آیت) ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا پھر کوئی آیت نازل نہ ہوئی جس نے متعۃ الحج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، افراد الحج، صفحہ 388، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کی آیت کو منسوخ کر دیا ہو اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے کہا جو کہا(1)۔ ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ بن سعید نے بتایا انہوں نے مالک بن انس سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے محمد بن عبد اللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن ابی وقاص، ضحاک بن قیس سے معاویہ بن ابی سفیان کے حج کرنے کے سال سنا ان دونوں نے حج تمتع کا ذکر کیا۔ ضحاک بن قیس نے کہا: حج تمتع نہیں کرے گا مگر وہ جو اللہ کے حکم سے جاہل ہو گا۔ سعد نے کہا: اے میرے بھتیجے! تو نے میری بات کی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عمر بن خطاب اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت سعد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ حج تمتع کیا تھا(2)، یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن اسحاق نے زہری اور انہوں نے سالم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شامی شخص آپ کے پاس آیا اس نے حج تمتع کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: خوبصورت عمل ہے۔ اس شخص نے کہا: تمہارا باپ اس سے منع کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: تجھ پر افسوس میرا باپ اس سے اگر منع کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور اس کا حکم بھی فرمایا تھا۔ میں اپنے باپ کے قول پر عمل کروں یا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کروں؟ تو مجھ سے اٹھ جا۔ اس روایت کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث ابو عیسیٰ ترمذی نے صالح بن کیسان عن ابن شہاب عن سالم کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ لیث عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے حج تمتع کیا تھا سب سے پہلے حج تمتع سے حضرت معاویہ نے منع کیا تھا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث کی یہ حدیث منکر ہے، لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مشہور ہے کہ وہ دونوں حج تمتع سے منع کرتے تھے اگرچہ اہل علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ تمتع جس سے حضرت عمر نے منع کیا تھا اور جس پر مارا تھا وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ کرنا ہے۔ رہا پہلے عمرہ کرنا اور پھر حج کرنا اس سے حضرت عمر منع نہیں کرتے تھے اور جنہوں نے حضرت عمر کے حج تمتع سے منع کرنے کو صحیح کہا ہے ان کا خیال ہے کہ آپ حج تمتع سے اس لئے منع فرماتے تھے تاکہ بیت اللہ میں لوگ سال میں دو یا زیادہ مرتبہ آئیں تاکہ موسم حج کے علاوہ بھی زائرین کی اس میں کثرت رہے۔ آپ نے اہل حرم پر رفق و مہربانی داخل کرنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ حضرت ابراہیم کی دعا ثابت ہو جائے فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ۔ (ابراہیم: 37)

دوسرے کئی علماء نے فرمایا: حضرت عمر نے حج تمتع سے اس لئے منع فرمایا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ آسانی اور رخصت کی وجہ سے حج تمتع کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ پس آپ کو حج افراد اور حج قران کے ضیاع کا اندیشہ ہوا جبکہ وہ دونوں حج بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہیں۔ امام احمد نے حج تمتع کے اختیار پر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے "اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لے آتا اور میں حج کے احرام کو عمرہ بنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی التمتع، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)

دیتا(1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: حج قران افضل ہے، ان میں امام ابو حنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی قول مزنی کا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ اس میں انسان دو فرض اکٹھے ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے، اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب کا قول بھی ہے اور حضرت علی نے حج قران کو پسند کیا ہے اور اس کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو بخاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرمایا: میں نے وادی عقیق میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "اس رات میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اس نے کہا: اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور حج وعمرہ کرو(2)۔" ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیك بعمرۃ وحجۃ۔(3) یعنی آپ نے عمرہ اور حج کی نیت سے تلبیہ کہا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: ان شاء اللہ حج افراد افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ حج مفرد کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: حج افراد افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے حج افراد کے متعلق آثار زیادہ صحیح ہیں نیز حج افراد میں عمل زیادہ ہے پھر عمرہ دوسرا عمل ہے یہ سب طاعت ہیں اور جس میں عمل زیادہ ہو وہ افضل ہوتا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: حج افراد کرنے والے کو متمتع سے زیادہ تھکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ثواب زیادہ ہے اور احادیث کے اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حج تمتع اور قران کا حکم دیا تو یہ کہنا جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع اور قران کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ (زخرف:51)۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: ہم نے رجم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا حالانکہ آپ ﷺ نے رجم کا حکم فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے حج میں ظاہر حج قران ہے آپ قران کرنے والے تھے اس کی وجہ حضرت عمر اور حضرت انس کی مذکورہ احادیث ہیں اور صحیح مسلم میں بکر سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا اکٹھا تلبیہ کہتے ہوئے سنا(4)۔ بکر نے کہا میں نے یہ حضرت ابن عمر سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ کہا۔ میں حضرت انس سے ملا۔ میں نے انہیں حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا۔ حضرت انس نے کہا: تم ہمیں شمار نہیں کرتے مگر بچے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیك عمرۃ وحجۃ۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا اور صحابہ کرام نے حج کا احرام باندھا اور نبی کریم ﷺ نے احرام نہ کھولا اور ان صحابہ نے بھی احرام نہ کھولا جنہوں نے ہدی ساتھ لائی تھی اور باقی لوگوں نے احرام کھول دیا تھا۔ بعض اہل علم نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ جب آپ قران کرنے والے تھے تو آپ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول النبی العقیق واد مبارك، صفحہ 207، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی الجمع بین الحج والعمرۃ، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فی الأفراد والقران، صفحہ 404، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نے حج اور عمرہ کیا تھا۔ اس طرح احادیث متفق ہوگئیں۔ نحاس نے کہا: سب سے بہتر وہ ہے جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جس نے آپ کو دیکھا اس نے کہا: آپ نے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا، بعض نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے افراد کیا پھر کہا: لبیك بحجة و عمرة (1) جس نے آپ سے یہ سنا اس نے کہا: آپ نے قران کیا۔ پس احادیث متفق ہوگئیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو میں نے حج مفرد کیا اور تمتع نہیں کیا اور آپ سے یہ صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے حج قران کیا۔ جیسا کہ نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا تو نے کیسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی: میں نے آپ کے احرام جیسا باندھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور حج قران کا احرام باندھا ہے۔ حضرت علی نے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں بھی ایسا کرتا جیسا تم نے کیا ہے لیکن میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور میں نے حج قران کا احرام باندھا ہے (2)۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عمرہ کا احرام کھول دیا ہے اور آپ نے احرام نہیں کھولا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے سر پر گوند لگائی ہوئی ہے اور میں ہدی ساتھ لایا ہوں میں احرام نہیں کھولوں گا حتیٰ کہ میں قربانی کرلوں گا (3)۔ یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج قران کرنے والے تھے، اگر آپ حج تمتع یا حج مفرد کرنے والے ہوتے تو آپ ہدی کے نحر کی وجہ سے نہ رکتے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے جو یہ کہا ہے کہ کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ میں نے حج افراد کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حج کا احرام باندھتا ہوں اور مسلم کی حضرت ابن عمر سے روایت ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا تو میں حج کا احرام باندھتا ہوں کے ارشاد میں حج مفرد پر دلیل باقی نہ رہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ میں نے حج قران کیا باقی رہا اور حضرت انس جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لبیك بحجة و عمرة معاً کہتے ہوئے سنا۔ یہ جملہ حق قران پر نص صریح ہے کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتا۔ دارقطنی نے عبداللہ بن ابی قتادہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کیا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد آپ دوبارہ حج کرنے والے نہیں۔

مسئلہ نمبر 4: جب حج مفرد، تمتع اور قران کے بارے قول گزر چکا ہے کہ یہ سب بالاجماع جائز ہیں اور حج تمتع کی علماء کے نزدیک چار صورتیں ہیں: (۱) ایک صورت ایسی ہے جس پر اجماع ہے اور تین صورتیں مختلف فیہا ہیں۔ رہی وہ صورت جو مجتمع علیہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔

یعنی انسان حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور وہ شخص آفاقی ہو، مکہ مکرمہ میں آیا ہو، عمرہ

1۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، قران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، التمتع والقران والافراد بالحج، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

سے فارغ ہو گیا ہو پھر مکہ میں اسی سال حج شروع کرنے تک بغیر احرام کے رہا ہو، اپنے گھر کی طرف واپس نہ گیا ہو یا باہر سے آنے والوں کے میقات کی طرف جانے سے پہلے اسی کیفیت میں رہا ہو۔ جب وہ اس طرح کرے گا تو وہ متمتع ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ واجب کیا ہے جو متمتع پر واجب کیا ہے اور یہ میسر ہدی ہے۔ وہ اس ہدی کو ذبح کرے گا اور منیٰ یا مکہ کے مساکین کو کھلائے گا۔ اگر ہدی نہ پائے تو تین روزے رکھے گا اور سات روزے اپنے شہر واپس آ کر رکھے گا۔ جیسا کہ آگے آئے گا اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس پر دسویں کا روزہ نہیں ہے اور ایام تشریق کے روزوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

اس حج تمتع پر علماء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے۔ اس کی آٹھ شروط ہیں: (۱) حج و عمرہ کا جمع کرنا (۲) ایک سفر میں ہونا (۳) ایک سال میں ہونا (۴) حج کے مہینوں میں ہونا (۵) عمرہ کا پہلے کرنا (۶) دونوں کو نہ ملانا بلکہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنا (۷) عمرہ اور حج ایک شخص کی طرف سے ہونا (۸) اہل مکہ کے علاوہ سے ہونا۔ ان شروط میں غور کر جو ہم نے تمتع کے حکم میں بیان کی ہیں تو ان کو پالے گا۔

دوسری وجہ حج قران ہے وہ یہ ہے کہ ایک احرام میں حج اور عمرہ کو جمع کرنا، وہ دونوں کا اکٹھا احرام حج کے مہینے میں باندھے یا کسی اور مہینے میں باندھے اور وہ کہے: لبیك بحجة و عمرة معا (میں نے حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا) جب مکہ شریف میں آئے تو حج و عمرہ کے لئے ایک طواف کرے اور ایک سعی کرے۔ یہ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، اسحاق اور ابو ثور کی رائے ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عطا بن ابی رباح، حسن، مجاہد اور طاؤس کا مذہب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع کے لئے نکلے ہم نے عمرہ کا احرام باندھا ..... الحدیث (1)۔

اس حدیث میں ہے جنہوں نے حج و عمرہ کو جمع کیا تھا، انہوں نے ایک طواف کیا تھا، یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ سے جانے کے دن فرمایا جبکہ حضرت عائشہ نے بیت اللہ کا طواف نہیں کیا تھا کیونکہ آپ کو حیض آ گیا تھا: تیرا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا۔ ایک روایت میں: تیرا صفا و مروہ کا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا (2)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے یا مکہ پہنچ کر دو طواف اور دو سعی کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح اور ابن ابی لیلیٰ کا نظریہ ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ یہی قول شعبی اور جابر بن زید کا بھی ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے حجت پکڑی ہے کہ انہوں نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور دونوں کے لئے دو طواف اور دو سعی کیں پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ دار قطنی نے اپنی سنن میں یہ احادیث روایت کی ہیں اور تمام کو ضعیف قرار دیا ہے اور حج قران کو تمتع کے باب سے بتایا ہے کیونکہ قارن ایک مرتبہ عمرہ اور ایک حج کے سفر کی مشقت کو ترک کرنے کے ساتھ متمتع ہوتا ہے اور دونوں سے اکٹھا متمتع ہوتا ہے اور ہر ایک کے لئے میقات سے علیحدہ احرام نہیں باندھتا اور حج کو عمرہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان وجوہ الاحرام، صفحہ 386، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، صفحہ 91-390، جلد 1

ہے: فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ ۔ یہ تمتع کی ایک صورت ہے اس کے جواز میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں اور اہل مدینہ حج اور عمرہ جمع کرنے کی اجازت صرف اس صورت میں دیتے ہیں جبکہ حاجی ہدی ساتھ لایا ہو۔ اور ان کے نزدیک اس صورت میں اونٹ دینا ہوگا اس سے کم نہیں۔ قران کے تمتع ہونے پر دلیل حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ قران کو انہوں نے اہل آفاق کے لئے بنایا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی۔ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ

پس جو مسجد حرام والوں سے ہو اور وہ حج تمتع یا حج قران کرے تو اس پر قران اور تمتع کا دم (بکری) نہیں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں نے نہیں سنا کہ کسی مکی نے حج قران کیا ہو اگر وہ کرے گا تو اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے اور امام مالک کے قول پر جمہور فقہاء کا نظریہ ہے۔ عبدالملک بن ماجشون نے کہا: جب مکی حج، عمرہ کے ساتھ کرے گا تو اس پر قران کا دم (بکری) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ سے خون اور روزہ کو تمتع میں ساقط کیا ہے۔

تیسری وجہ تمتع کی یہ ہے جس پر حضرت عمر نے دھمکی دی تھی۔ آپ نے فرمایا: دو متعے ایسے ہیں جو رسالت مآب ﷺ کے عہد مبارک میں تھے اور میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان پر سزا دیتا ہوں۔ ایک عورتوں کا متعہ اور دوسرا متعۃ الحج۔ اس کے جواز میں علماء کا ابھی تک جھگڑا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی حج کا احرام باندھے حتیٰ کہ جب مکہ میں داخل ہو تو حج کے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر دے۔ پھر احرام کھول دے پھر بغیر احرام کے ٹھہرا رہے حتیٰ کہ آٹھویں کے دن حج کا احرام باندھے۔ یہ وہ وجہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے آثار وارد ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حج میں صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جس کے پاس ہدی نہیں ہے اور وہ ہدی ساتھ نہیں لایا ہے اور وہ حج کا احرام باندھ چکا تھا تو وہ اسے عمرہ کا احرام باندھے اور ان آثار کی تصحیح پر بھی علماء کا اجماع ہے۔ ان میں سے کسی اثر کو نہیں چھوڑا ہے لیکن اس کے متعلق قول اور علل کی وجہ سے عمل میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے اس پر عمل ترک کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ خاص تھا اور اسی حج کے متعلق تھا۔

حضرت ابوذر نے کہا: حج میں تمتع ہمارے لئے خاص تھا۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: دو متعے صرف ہمارے ساتھ خاص تھے۔ عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعۃ الحج (1)۔ خصوصیت کی علت اور اس میں فائدہ وہ ہے جو حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا ہے لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر بہت بڑا گناہ ہے اور وہ خود محرم کو صفر بنا دیتے تھے اور وہ کہتے تھے جب اونٹ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا، اثر مٹ جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہوگا۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب چار ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے ہوئے۔ آپ ﷺ نے حج کو عمرہ بنانے کا حکم دیا۔ یہ حکم صحابہ کو بڑا عظیم لگا۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ احرام کھولنا کیسا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر پابندی سے حلال ہو گئے ہو (2)۔ یہ حدیث مسلم نے نقل فرمائی ہے۔ مسند صحیح ابو حاتم میں حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 402، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز العمرۃ فی اشہر الحج، صفحہ 406، جلد 1

ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کو ذی الحجہ میں اس لئے عمرہ کرایا تھا کہ اہل شرک کے نظریہ کا قلع قمع ہو جائے۔ قبیلہ قریش اور جوان کے دین کے پیروکار تھے وہ کہتے تھے: جب اونٹ سے اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا زخم ٹھیک ہو جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہو جائے گا، وہ عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے حتیٰ کہ ذوالحجہ گزر جائے۔ حضرت عائشہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے عمرہ کرایا تھا۔ اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ نے حج کو عمرہ میں اس لئے تبدیل کیا تھا تا کہ آپ انہیں دکھائیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو حج اور عمرہ مکمل کرنے کا حکم مطلق دیا جو بھی ان میں داخل ہو اور ظاہر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ثابت نہیں مگر ناسخ کتاب یا سنت مبینہ کی طرف رجوع ضروری ہے جس میں کوئی اشکال نہ ہو۔ اور ان علماء نے حضرت ابوذر کے قول اور حضرت حارث بن بلال کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ حارث اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں، انہوں نے فرمایا: ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! حج کا فسخ کرنا ہمارے ساتھ خاص ہے یا تمام لوگوں کے لئے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمارے ساتھ خاص ہے (1)۔ اور فقہاء حجاز، عراق اور شام کا یہ نظریہ ہے مگر ایک چیز حضرت ابن عباس، حسن، اور سدی سے مروی ہے اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: میں ان صحیح متواتر آثار کو جو حج کو عمرہ میں فسخ کرنے کے متعلق وارد ہیں حضرت حارث بن بلال عن ابیہ کی حدیث سے اور حضرت ابوذر کے قول سے رد نہیں کرتا۔ امام احمد نے فرمایا: جو حضرت ابوذر نے کہا ہے اس پر اجماع نہیں ہے اگر اجماع ہوتا تو حجت ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت ابوذر کی مخالفت کی ہے اور اس کو خصوصیت نہیں بنایا ہے۔

امام احمد نے حضرت جابر کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حج کے بارے میں ہے۔ اس میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اسے عمرہ بناتا۔ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم اٹھے اور عرض کی: یارسول اللہ! یہ ہمارے اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا اور فرمایا: عمرہ حج میں داخل ہوا۔ یہ دو مرتبہ فرمایا: نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے (2)۔ یہ مسلم کے لفظ ہیں اور امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے یہ باب باندھا ہے، جس نے حج کا تلبیہ کہا اور اس کا نام لیا۔ پھر حضرت جابر کی حدیث ذکر کی، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آئے اور ہم نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنانے کا حکم دیا (3)۔

بعض علماء نے فرمایا: احرام کھولنے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا وہ دوسری وجہ سے تھا۔ مجاہد نے وہ وجہ ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے پہلے حج کو فرض نہیں کیا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مطلقاً احرام باندھنے اور نئے حکم کا انتظار کرنے کا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، الرجل یحل بالحج ثم یجعلها عمرة، صفحہ 252، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من یشی بالحج و سماہ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حکم دیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے مطلق احرام باندھا تھا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام تھا اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دیتا۔ گویا آپ حکم کے منتظر ہو کر نکلے تھے اور صحابہ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا۔ اس پر دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''میرے پاس میرے رب کی طرف سے آنے والا اس مبارک وادی میں آیا اور کہا: تم کہو میں حج کو عمرہ میں بدلتا ہوں (1)''۔

متعہ کی چوتھی وجہ محصر اور جس کو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس کا متعہ ہے۔ یعقوب بن شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابوسلمہ تبوذکی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں وہب نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اسحاق بن سوید نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا: اے لوگو! اللہ کی قسم! حج تمتع اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کرتے ہو تمتع یہ ہے کہ ایک شخص حج کے ارادہ سے نکلے پھر دشمن یا کوئی عذر اسے روک لے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں پھر وہ بیت اللہ کے پاس آئے طواف کرے صفا و مروہ کی سعی کرے پھر آئندہ سال تک حلال ہونے کے ساتھ متمتع ہو، پھر حج کرے اور ہدی دے۔ محصر کا حکم اور اس کے متعلق علماء کی آراء واضح طور پر گزر چکی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور ان (حضرت عبداللہ بن زبیر) کے مذہب سے یہ تھا کہ محصر احرام نہ کھولے بلکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ دسویں کے دن اس کی طرف سے ہدی ذبح کی جائے پھر وہ حلق کرائے اور اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ وہ مکہ میں آئے پھر عمرہ کے عمل سے اپنے حج سے حلال ہو۔ اور حضرت ابن زبیر نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کے خلاف ہے: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس کے بعد فرمایا وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (اللہ کے لئے حج اور عمرہ مکمل کرو) احصار کے حکم میں حج اور عمرہ کے درمیان کوئی فرق بیان نہیں کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ جب حدیبیہ میں روکے گئے تو صحابہ نے احرام کھولا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احرام کھولا اور صحابہ کرام کو احرام کھولنے کا حکم دیا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ متمتع کو متمتع کیوں کہا جاتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا: کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جس کا کرنا محرم کے لئے عمرہ سے حلال ہونے کے وقت سے حج شروع کرنے کے وقت تک جائز نہیں ہوتا۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کو متمتع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دو سفروں میں سے ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا کیونکہ عمرہ کا حق ہے کہ تو اس کے لئے سفر کا قصد کرے اور حج کے لئے بھی اسی طرح حق ہے جب ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ہدی کو لازم کیا جیسے قارن پر لازم کیا جس نے ایک سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ پہلی وجہ اعم ہے کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوا اور میقات سے حج کا احرام باندھنا بھی ساقط ہوا۔ اس وجہ سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود نے حج تمتع کو ناپسند کیا۔ ان دونوں حضرات نے یا ان میں سے ایک نے فرمایا: تم میں سے کوئی منیٰ میں آئے گا جبکہ اس کے ذکر سے منی کے قطرے گر رہے ہوں گے جبکہ حج تمتع پر مسلمان کا اجماع ہے۔

1۔ ایضاً، کتاب الحج، قول النبی العتیق واد مبارک، صفحہ 207، جلد 1

علماء کی ایک جماعت نے کہا: حضرت عمر نے اس کو ناپسند کیا کیونکہ وہ پسند کرتے تھے کہ بیت اللہ کی سال میں دو مرتبہ زیارت کی جائے۔ ایک دفعہ حج کے لئے ایک دفعہ عمرہ کے لئے۔ حضرت عمر حج مفرد کو افضل سمجھتے تھے اور وہ حج مفرد کا حکم دیتے تھے، اس کی طرف ان کا میلان تھا اور استحباب کے طور پر حج تمتع اور قران سے منع کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اپنے حج اور اپنے عمرہ کو علیحدہ علیحدہ کرو۔ یہی تمہارے لئے حج کا اتمام ہے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کا احرام باندھنا، عمرہ کا اتمام ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 5: جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرے پھر اپنے شہر کو واپس آ جائے اور پھر اسی سال حج کرے، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ وہ متمتع نہیں ہے اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے۔ حسن بصری نے کہا: وہ متمتع ہے اگرچہ وہ گھر کی طرف لوٹ بھی آئے خواہ اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ متعہ ہے۔ یہ ہشیم نے یونس سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے۔ یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اس پر ہدی نہیں ہے، پہلا قول صحیح ہے اسی طرح ابو عمر نے ذکر کیا ہے، اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کو ابن منذر نے ذکر نہیں کیا۔ ابن منذر نے کہا: ان کی حجت کتاب اللہ کا ظاہر ہے ارشاد ہے: **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ**۔ اس آیت میں کوئی استثناء نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنے والا ہو یا نہ ہو۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبان پر بیان کر دیتا۔ سعید بن مسیب سے حسن کے قول کی طرح مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حسن سے اس مسئلہ میں ایسا قول مروی ہے جس کی متابعت نہیں کی گئی اور اہل علم میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے دسویں ذی الحجہ کے دن کے بعد عمرہ کیا وہ متعہ ہے۔ طاؤس سے دو قول مروی ہیں، دونوں زیادہ شاذ قول ہیں۔ اس سے بھی جو ہم نے حسن سے ذکر کیا ہے، ایک یہ ہے کہ جس نے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ کیا پھر وہ ٹھہرا رہا حتیٰ کہ حج کا وقت داخل ہو گیا، پھر اس نے اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے(2)۔ یہ طاؤس کے علاوہ کسی عالم نے نہیں کہا ہے اور فقہاء امصار میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔ یہ اس لئے کہ حج کے مہینے عمرہ کی نسبت حج کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ عمرہ پورے سال میں سنت ہے اور حج کے لئے معلوم مہینے ہیں۔ جب کسی نے حج کے مہینوں میں عمرہ کیا تو اس نے ایسے وقت میں عمرہ کیا جس میں حج اولیٰ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر متمتع اور قران کرنے والے کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کی رخصت دی ہے اور اس کے لئے جو عمرہ کو علیحدہ کرے۔ یہ اس کی طرف سے رحمت ہے اور اس میں میسر ہدی کو اس میں مقرر کیا ہے۔ دوسری وجہ وہ ہے جو مکی نے بیان کی ہے جو کسی شہر سے حج تمتع کرے اس پر ہدی ہے۔ یہ ظاہر قرآن کے مطابق نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**۔ تمتع علماء کے نزدیک ان شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: علماء کا اجماع ہے کہ ایک ایسا شخص جو اہل مکہ سے نہ ہو اگر وہ حج کے مہینوں میں مکہ میں ٹھہرنے کے ارادہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع ما جاء فی العمرۃ، صفحہ 358 (وزارت تعلیم)　　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 269، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے عمرہ کرتے ہوئے آئے پھر اسی سال حج کرے تو وہ متمتع ہے۔ اس پر وہی کچھ ہے جو متمتع پر ہے اور مکی کے بارے میں اجماع ہے کہ وہ میقات کے پیچھے سے عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے آئے پھر مکہ سے حج شروع کرے جبکہ اس کے گھر والے مکہ میں ہوں اور وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہرے تو اس پر بکری نہیں ہے۔ اسی طرح کا حکم ہے جب وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ ٹھہرے یا مکہ میں ٹھہرے جبکہ مکہ میں اس کے اہل ہوں اور مکہ کے علاوہ کسی شہر میں بھی اس کے اہل ہوں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر وہ مکہ سے اپنے اہل کے ساتھ منتقل ہو گیا پھر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرتے ہوئے آیا پھر مکہ میں ٹھہرا رہا حتیٰ کہ اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔

مسئلہ نمبر 7: امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری اور ابو ثور کا اتفاق ہے۔ متمتع عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کرے گا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے گا تو اس پر اس کے بعد حج کے لئے دوسرا طواف اور دوسری صفا و مروہ کے درمیان سعی ہوگی۔ عطا اور طاؤس سے مروی ہے کہ ایک سعی کافی ہے۔ پہلا قول مشہور ہے وہی جمہور کا نظریہ ہے اور قارن کے طواف کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ شروع کرے پھر حج کے مہینوں میں عمرہ کا عمل کرے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کا عمرہ اس مہینہ میں ہوا جس میں وہ حلالی ہوا تھا اگر وہ حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں اس سے حلالی ہونا چاہتا ہے تو وہ متمتع نہیں ہے۔ اگر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ سے حلالی ہوا ہے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب عمرہ کے لئے حرمت والے مہینوں میں بیت اللہ کا طواف کرے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے کیونکہ عمرہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ مکمل ہوتا ہے اور اس کے کمال کی طرف دیکھا جاتا ہے یہ حسن بصری، حکم بن عیینہ، ابن شبرمہ اور سفیان ثوری کا قول ہے اور قتادہ، احمد اور اسحق نے کہا: عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔ یہی معنی حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔ طاؤس نے کہا: اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوا۔ اصحاب رائے کا قول ہے: اگر اس نے رمضان میں تین چکر لگائے اور چار چکر شوال میں لگائے پھر اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔ اگر رمضان میں چار چکر لگائے اور شوال میں تین چکر لگائے تو وہ متمتع نہیں ہوگا۔ ابو ثور نے کہا: جب حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ میں داخل ہو تو برابر ہے اس نے رمضان میں طواف کیا ہو یا شوال میں طواف کیا ہو وہ اس عمرہ کی وجہ سے متمتع نہیں ہوگا۔

یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔

مسئلہ نمبر 9: اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا اس پر حج کو داخل کر دیا جب تک کہ بیت اللہ کا طواف ابھی شروع نہیں کیا تھا تو وہ قارن شمار ہوگا۔ اس پر وہ لازم ہوگا جو اس قارن پر لازم ہوتا ہے جو حج اور عمرہ کی اکٹھی نیت کرتا ہے۔ اور عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد عمرہ پر حج کو داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر یہ لازم ہے اور جب تک عمرہ کا طواف مکمل نہ کیا ہو وہ قارن شمار ہوگا، اس کی مثل امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ سے مشہور یہ ہے کہ اس کے لئے یہ جائز نہیں مگر طواف میں شروع ہونے سے پہلے نیت کر لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس

کے لئے جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کو داخل کرے جب تک طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں۔ یہ تمام امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول ہیں۔ جب عمرہ کرنے والے نے عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو پھر اس نے حج کا احرام باندھا ہو تو وہ قارن ہوگا اور اس سے باقی عمرہ ساقط ہو جائے گا اور قران کا دم اس پر لازم ہوگا اسی طرح جس نے حج کا احرام باندھا اپنے عمرہ کے طواف کے نصف میں یا اس سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے تو اس کا یہی حکم ہے۔ بعض نے فرمایا: جب تک صفا و مروہ کے درمیان سعی مکمل نہ کی ہو اس کے لئے حج کو عمرہ پر داخل کرنا جائز ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ تمام اقوال اہل علم کے نزدیک شاذ ہیں۔ اشہب نے کہا: جب عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو تو اس پر حج کا احرام لازم نہیں اور وہ قارن نہ ہوگا، وہ اپنے عمرہ کو جاری رکھے حتیٰ کہ اسے مکمل کرے پھر حج کا احرام باندھے۔ یہ امام شافعی اور عطا کا قول ہے اور یہی ابو ثور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10: حج کو عمرہ میں داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: عمرہ حج پر داخل نہ ہوگا اور جس نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا تو عمرہ کسی چیز کے ساتھ نہیں۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول ہے اور مصر میں ان سے یہی مشہور ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ وہ قارن ہو جائے گا اور اس پر وہی ہوگا جو قارن پر ہوتا ہے جب تک کہ اس نے حج کے طواف کا ایک چکر بھی نہ لگایا ہو۔ اگر طواف کر لیا ہو تو اس پر لازم ہوگا کیونکہ اس نے حج میں عمل کیا۔ ابن منذر نے کہا: اس مسئلہ میں میں امام مالک کے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 11: امام مالک نے فرمایا: جس نے عمرہ کے لئے ہدی دی دراں حالیکہ وہ متمتع ہے تو اس کے لئے یہ کافی نہیں اور اس پر متعہ کے لئے دوسری ہدی ہے کیونکہ وہ متمتع ہو جائے گا جب عمرہ سے حلال ہونے کے بعد حج شروع کرے گا اس وقت اس پر ہدی واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہ، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: وہ ہدی کو نحر نہ کرے مگر دسویں کے دن۔ امام احمد نے فرمایا: اگر متمتع دس دنوں سے پہلے آئے تو طواف کرے، سعی کرے اور اپنی ہدی کو نحر کر دے اور اگر دس دنوں میں آئے تو دسویں کے دن نحر کرے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب طواف اور سعی کر لے تو وہ عمرہ کا احرام کھول دے خواہ ہدی لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

مسئلہ نمبر 12: امام مالک اور امام شافعی کا اس متمتع کے بارے میں اختلاف ہے جو مر جائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب حج کا احرام باندھ لیا تھا تو اس پر متعہ کا دم (بکری) ہے جبکہ وہ اس کو پانے والا ہو۔ زعفرانی نے امام شافعی سے یہ حکایت کیا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس متمتع کے بارے پوچھا گیا جو حج کا احرام باندھنے کے بعد عرفہ یا اس کے علاوہ کسی جگہ فوت ہو جاتا ہے، کیا اس پر ہدی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جو جمرہ عقبہ پر رمی جمار کرنے سے پہلے مر جائے تو اس پر ہدی نہیں ہے اور جس نے رمی جمار کر لیا تھا پھر مر گیا تو اس پر ہدی ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کل مال سے ہدی دی جائے گی یا تہائی مال سے،''م مالک نے فرمایا: کل مال سے۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ یعنی جو ہدی نہ پائے مال نہ ہونے کی وجہ سے یا حیوان نہ ہونے کی وجہ سے تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات روزے اپنے شہر میں واپس آکر رکھے اور حج کے تین روزے اس طرح رکھے کہ آخری روزہ نویں ذی الحجہ کا ہو۔ یہ طاؤس کا قول ہے۔ شعبی، عطا، مجاہد، حسن بصری، نخعی، سعید بن جبیر، علقمہ، عمرو بن دینار اور اصحاب رائے سے مروی ہے۔ ابن منذر نے اس کو حکایت کیا ہے۔ ابوثور نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے عمرہ کے احرام میں روزے رکھے کیونکہ وہ تمتع کا ایک احرام ہے۔ پس اس میں ان دنوں کا روزہ جائز ہے جس طرح حج کے احرام میں جائز ہے(1)۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ وہ آٹھویں کے دن سے پہلے ایک دن روزہ رکھے پھر آٹھویں اور عرفہ کے دن کا روزہ رکھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت مالک بن انس نے کہا: اس کے لئے ہے کہ وہ روزہ رکھے جب سے اس نے حج کا احرام باندھا ہے دسویں کے دن تک (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج میں تین روزے رکھے۔ جب عمرہ میں روزہ رکھے تو وہ اپنے وقت سے پہلے ادا کرنے والا ہوگا تو وہ جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل نے کہا: حج کا احرام باندھنے اور نویں ذی الحجہ کے درمیان روزے رکھے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ یہ امام مالک سے مروی ہے، مؤطا میں ان کے قول کا یہی مقتضا ہے تاکہ وہ عرفہ کے دن افطار کرنے والا ہو۔ اس میں سنت کی اتباع ہے اور عبادت پر زیادہ قوت دینے والا ہے(3)۔ امام احمد سے مروی ہے، جائز ہے کہ وہ احرام باندھنے سے پہلے تین روزے رکھے۔ ثوری اور اوزاعی نے کہا: ذی الحجہ کے دس دنوں کے آغاز سے روزے رکھے(4)۔ یہ عطا کا قول ہے۔ عروہ نے کہا: ایام منیٰ میں مکہ میں وہ روزے رکھے۔ یہ امام مالک اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایام منیٰ یہ وہ تین دن ہیں جو دسویں کے دن سے متصل ہیں۔ امام مالک نے مؤطا میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی تھیں: روزہ اس کے لئے ہے جو حج تمتع کرے اور حج کا احرام باندھنے سے لے کر عرفہ کے دن تک ہدی نہ پائے، اگر پہلے روزے نہیں رکھے تو ایام منیٰ میں روزے رکھے(5)۔ یہ الفاظ حج تمتع کا احرام باندھنے کے وقت سے عرفہ کے دن تک روزہ کی صحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ آغاز کا وقت ہے کیونکہ یہ ادائیگی کا وقت ہے اور اس کے بعد ایام منیٰ قضا کا وقت ہے۔ جیسا کہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے اور دسویں کے دن سے پہلے روزے رکھنا ذمہ سے بری ہونا ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ مذہب یہ ہے کہ ادا کے طور پر ہیں اگرچہ ایام منیٰ سے پہلے روزے رکھنا افضل ہے جس طرح نماز کا وقت ہے اس میں ادائیگی کی وسعت ہے اگرچہ پہلا وقت آخری وقت سے افضل ہے۔ یہ صحیح ہے

1۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ تفسیر طبری، صفحہ 297، جلد 2 (دار احیاء التراث العلمیہ)
5۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، صیام التمتع، صفحہ 462 (وزارت تعلیم)

اور یہ ادا ہے قضا نہیں ہے کیونکہ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ کے کلمات یہ احتمال رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حج کی جگہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایام حج مراد ہوں۔ اگر ایام حج مراد ہوں تو یہ قول صحیح ہے کیونکہ آخری دن ایام حج کا دسویں کا دن ہے اور یہ احتمال ہے کہ آخری دن رمی جمار کے دن ہوں کیونکہ رمی جمار کرنا خالص حج کے عمل سے ہے اگرچہ اس کے ارکان سے نہیں ہے۔ اگر حج کی جگہ مراد ہو تو وہ ایام منیٰ میں جب تک مکہ میں ہے روزے رکھ لے جیسا کہ عروہ نے کہا ہے۔ یہ بہت قوی ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ روزوں کو ایام تشریق تک مؤخر کرے، کیونکہ اس پر روزہ واجب نہیں ہے مگر یہ کہ دسویں کے دن ہدی نہ پائے (1)۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت اور امام شافعی کا جدید قول یہ ہے کہ امام شافعی کے اکثر اصحاب کا یہ نظریہ ہے کہ ایام تشریق کا روزہ جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام منیٰ کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نہی ثابت ہو تو یہ عام ہوگا، اس سے متمتع خاص ہوگا اس روایت سے جو بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ ان دنوں میں روزہ رکھتی تھیں۔ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی رخصت نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو ہدی نہ پائے۔ دارقطنی نے کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے تین طرف سے مرفوع روایت کیا ہے اور تینوں طرف کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ حج کے ایام میں سے باقی صرف یہی مقدار رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے روزے کا وجوب متحقق ہو جاتا ہے، ہدی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ فوت ہو جاتا ہے تو ایام تشریق کے بعد روزہ رکھے گا (2)۔ یہ حسن اور عطا کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں، ایک طائفہ نے کہا: جب دس دنوں میں روزہ نہ رکھے تو پھر ہدی کے سوا کوئی چیز یاد نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، طاؤس اور مجاہد سے مروی ہے۔ امام ابو عمر نے امام ابو حنیفہ سے اور آپ کے اصحاب سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اجماع ہے کہ متمتع ہدی پائے تو اسے روزہ رکھنے کا اختیار نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی ہدی کو پانے والا نہ ہو تو پھر وہ روزے رکھنے شروع کر دے پھر روزے مکمل کرنے سے پہلے ہدی کو پالے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ میں داخل ہو پھر ہدی کو پالے تو میرے نزدیک ہدی دینا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اگر اس نے ہدی نہ دی تو روزہ بھی اس کے قائم مقام ہو جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: روزے کو وہ مکمل کرے جبکہ وہ فرض ہے اسی طرح ابو ثور نے کہا: یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے، ابن منذر نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جب تیسرے روزے میں ہدی میسر آگئی تو روزہ باطل ہو جائے گا اور ہدی واجب ہو جائے گی۔ اگر حج میں تین دن روزے رکھ لے پھر اسے ہدی میسر آگئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ گھر واپس آکر سات روزے رکھ لے اور ہدی کی طرف نہ لوٹے۔ یہ ثوری، ابن ابی نجیح اور حماد کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبْعَةٍ جمہور کی قرأت عطف کی بنا پر مجرور ہے۔ زید بن علی نے وسبعة نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: وصوموا سبعة (سات روزے رکھو)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا رَجَعۡتُمۡ جب تم اپنے شہروں کی طرف لوٹو۔ یہ حضرت ابن عمر، قتادہ، ربیع، مجاہد اور عطا کا قول ہے۔ مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: امام شافعی کا بھی یہی قول ہے(1)۔ قتادہ اور ربیع نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اور کسی پر سات روزے واجب نہیں ہوتے مگر جب وطن واپس آ جائے مگر جو اپنے اوپر سختی کرے جس طرح جو رمضان میں سفر میں روزہ رکھتا ہے(2)۔ امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: راستہ میں اسے روزہ جائز ہے۔ مجاہد اور عطا سے مروی ہے، مجاہد نے کہا: اگر وہ چاہے تو راستہ میں روزہ رکھے، یہ رخصت ہے۔ اسی طرح عکرمہ اور حسن نے کہا۔ بعض اہل لغت نے کہا: اس کا مطلب ہے جب تم حج سے لوٹو یعنی جب تم اس حلت کی طرف لوٹو جس پر تم احرام سے پہلے تھے۔ امام مالک نے ''الکتاب'' میں فرمایا: جب منیٰ سے واپس آ جائے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عربی نے کہا: اگر تخفیف اور رخصت ہو تو رخصت کو مقدم کرنا جائز ہے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت کی طرف لوٹنا بالاجماع جائز ہے اگرچہ اس کا وقت متعین ہے لیکن اس میں نص نہیں ہے، نہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شہر کی طرف لوٹنا ہے اور اغلب یہی ہے کہ حج مراد ہے(3)۔ میں کہتا ہوں: بلکہ اس میں ظاہر نص کے قریب ہے۔

مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا اور ہدی دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحلیفہ سے ہدی لے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا احرام باندھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی حج تمتع کیا لوگوں میں سے کچھ ہدی ساتھ لائے تھے اور کچھ ہدی ساتھ نہ لائے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آئے تو لوگوں سے فرمایا: تم میں سے جو ہدی ساتھ لایا ہے وہ کسی چیز سے حلال نہ ہو جو حج کی وجہ سے حرام ہوئی حتیٰ کہ اپنے حج کو مکمل کرے اور جس کے پاس ہدی نہیں ہے وہ بیت اللہ کا طواف کرے پھر صفا و مروہ کا طواف کرے، بال قصر کرائے اور احرام کھول دے پھر محرم احرام باندھے اور ہدی دے۔ جو ہدی کو نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے اور سات روزے گھر والوں کے پاس لوٹ آئے تو رکھے(4)۔ یہ نص کی طرح ہے کہ سات روزے گھر والوں میں شہر والوں میں رکھے۔

اسی طرح بخاری میں حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ ذی الحجہ کی شام ہمیں حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک حج سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ کا طواف کریں گے، صفا و مروہ کا طواف کریں گے تو ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی واجب ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ۔(5) (یعنی جب ہم اپنے شہروں کی طرف آئیں۔ الحدیث)

نحاس نے کہا: یہ بالاجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کہا جاتا ہے: کمل یکمل بروزن نصر ینصر کمل

1۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دارالفکر)　　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دارالفکر)　　4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، وجوب الصوم علی التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالك لمن لم یکن اہلہ، صفحہ 241، جلد 1 (وزارت تعلیم)

یکمل بروزن عظُم یعظُم، کمِلَ یکمل بروزن حَمِد یحمد۔ اس میں یہ تین لغات ہیں۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ کے معنی میں اختلاف ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ دس ہیں۔ زجاج نے کہا: جب کسی خیال کرنے والے کا یہ خیال ہو سکتا تھا کہ حج کے تین روزوں یا واپسی پر سات روزوں میں اختیار ہے اور یہ سات روزے ان تین کا بدل ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ سات روزے اور رکھے تو تِلْكَ عَشَرَةٌ کے قول سے اس وہم وخیال کو زائل کر دیا۔ پھر فرمایا کَامِلَةٌ حسن نے کہا: ثواب میں کامل، جس طرح اس شخص کا ثواب ہے جو ہدی دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: ہدی کا بدل ہونے میں کامل ہے۔ یعنی یہ پورے دس، ہدی کا بدل ہیں، بعض نے فرمایا: ثواب میں کامل ہیں جس طرح اس شخص کا ثواب ہے(1) جس نے تمتع نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظاً اخبار ہے اور اس کا معنی امر ہے یعنی یہ دس مکمل کرو یہ فرض ہیں۔ مبرد نے کہا: عَشَرَةٌ تعداد کے ختم ہونے پر دلیل ہے تاکہ کسی وہم کرنے والے کو وہم نہ ہو کہ ان سات کے بعد بھی کوئی شے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تاکید ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: کتبت بیدی۔ میں نے ہاتھ سے لکھا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے

ثلاث و اثنتان فهن خمسٌ و سادسة تمیل الی شمامی

اس میں خمسٌ تاکید ہے۔

ثلاث بالغداة فذاك حسبی وست حسین یدرکنی العشاء

فذالك تسعة فی الیوم ریی و شرب المرء فوق الری داء

ان اشعار میں تسعة تاکید ہے۔

اور کَامِلَةٌ کا ارشاد دوسری تاکید ہے اس میں روزہ رکھنے کی زیادہ تاکید ہے کہ اس تعداد سے کم نہ کرے جیسے تو کسی کو اہم کام کا حکم دیتا ہے تو کہتا ہے: الله الله لا تقصر۔ اللہ سے ڈرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی وہ مسافر جو مسجد حرام کے رہنے والوں سے نہیں ہے اس پر تمتع کا دم واجب ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: مہاجرین، انصار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی احرام باندھا۔ جب ہم مکہ مکرمہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دو مگر جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو۔ ہم نے بیت اللہ اور صفا ومروہ کا طواف کیا اور ہم عورتوں کے پاس آئے اور ہم نے سلے ہوئے کپڑے پہنے اور فرمایا: جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو وہ حلال نہ ہو حتیٰ کہ اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آٹھویں کی شام حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ اور صفا ومروہ کا طواف کریں گے، پس ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی لازم ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ۔ ہدی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں بکری کافی ہے ایک سال میں انہوں نے دو عبادتیں حج اور عمرہ جمع کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کیا اور اپنے نبی کی زبان پر بیان فرمایا اور مکہ کے علاوہ لوگوں کے لئے اس کو مباح فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اشہر حج سے مراد شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ہیں جو ان مہینوں میں حج تمتع کرے اس پر ہدی یا روزہ ہے۔ الرفث سے مراد جماع ہے اور الفسوق سے مراد گناہ ہیں الجدال سے مراد جھگڑا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 8: لِمَنْ میں لام بمعنی علی ہے۔ یعنی جو مکی نہیں ہے اس پر دم (بکری) واجب ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: اشترطی لھم الولاء۔ اس میں لام بمعنی علی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان اسأتم فلھا۔ اس میں بھی لام بمعنی علی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک مسافر کے لئے حج تمتع اور قران کرنے کی طرف اشارہ ہے اور مکہ کے رہنے والوں کے لئے قران و تمتع نہیں ہے۔ ان میں سے جو ایسا کرے اس پر جنایت کا دم ہوگا جس سے وہ نہیں کھائے گا کیونکہ یہ دم تمتع نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ان کے لئے دم تمتع اور قران ہے۔ اشارہ ہدی اور روزہ کی طرف ہے ان پر ہدی اور روزہ نہیں ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے تمتع اور قران کے درمیان فرق کیا ہے، پس قران میں خون کو واجب کیا ہے اور تمتع میں ساقط کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اس بات پر اجماع ہونے کے بعد کہ اہل مکہ اور اس سے متصل رہنے والے لوگ مسجد حرام میں رہنے والے لوگ ہیں۔ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ طبرانی نے کہا: اہل حرم پر اجماع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس طرح جس طرح اس نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جن پر جمعہ واجب ہے وہ حضری ہے جو اس سے دور ہے وہ بدوی ہے یہ لفظ حضارۃ اور بداوۃ سے بنائے ہیں (2)۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ اہل مکہ اور اس کے متصل رہنے والے لوگ ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد مواقیت اور اس کے اندر رہنے والے لوگ ہیں۔ پس مواقیت یا مواقیت سے اندر رہنے والے ہیں وہ حاضری المسجد الحرام میں سے ہیں۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی جگہ پر رہتے ہیں جن پر مکہ آتے وقت نماز قصر نہیں ہوتی۔ یہ مواقیت کے قریب رہنے والے لوگ ہیں۔ آیت کی تاویل میں متقدمین کے ان اقوال پر مذاہب ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی جو اللہ نے تم پر فرض کیا اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ بعض نے فرمایا: بالعموم تقویٰ کا امر ہے اور عذاب کی شدت سے ڈرانا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالك لمن لم یکن اھلہ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

"حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ پس جو نیت کرلے ان میں حج کی تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیزگاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو!"۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ جب اللہ تعالیٰ نے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ میں حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا تو وقت میں ان کے اختلاف کو بیان فرمایا۔ سارا سال عمرہ کے احرام کا وقت ہے اور عمرہ کا وقت ہے۔ رہا حج یہ سال میں ایک مرتبہ واقع ہوتا ہے، یہ ان مخصوص مہینوں کے علاوہ میں واقع نہیں ہوتا۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ مبتدا خبر ہیں اور کلام میں حذف ہے۔ اس کی تقدیر اشھر الحج اشھرٌ ہے یا وقت الحج اشھرٌ ہے یا وقت عمل الحج اشھرٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر الحج فی الاشھر ہے۔ حرف جر کے سقوط کے ساتھ اشھر کی نصب لازم ہے اور کسی نے اس کی نصب کے ساتھ نہیں پڑھا مگر کلام میں ظرف کی بنا پر نصب جائز ہے۔ فراء نے کہا: اشھر مرفوع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: وقت الحج اشھرٌ معلومات۔ فراء نے کہا: میں نے کسائی کو یہ کہتے سنا: انما الصیف شھران، انما الطیلسان ثلاثۃ اشھر۔ اس سے مراد گرمیوں کا وقت اور چادر اوڑھنے کا وقت لیا ہے۔ اس میں حذف ہے۔

مسئلہ نمبر 2: الاشھر المعلومات میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، عطا، ربیع، مجاہد اور زہری نے کہا: اشھر حج شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ پورا ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی، شعبی اور نخعی نے کہا: یہ شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر کا یہی قول ہے۔ دونوں قول مالک سے مروی ہیں۔ آخری قول ابن حبیب نے حکایت کیا ہے (1) اور پہلا ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ فرق کا فائدہ دم (جانور قربان کرنا) سے متعلق ہے۔ جس نے کہا: ذی الحجہ مکمل، حج کے مہینوں میں سے ہے وہ دسویں کے دن کے بعد اعمال حج میں سے جو عمل واقع ہو اس میں دم واجب نہیں کرتے کیونکہ وہ اشھر حج میں سے ہے۔ دوسرے قول پر حج دسویں کے دن ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جو عمل کرے گا وقت سے تاخیر کی بناء پر دم لازم ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کا اپنی کتاب میں نام نہیں لیا کیونکہ یہ لوگوں کو معلوم تھے۔ اور الاشھر کے لفظ کا اطلاق دو مہینوں اور تیسرے مہینہ کے بعض حصہ پر ہوتا ہے کیونکہ بعض مہینہ پورے مہینہ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رائیتک سنۃ کذا۔ او علی عھد فلاں (یعنی میں نے تجھے فلاں سال یا فلاں کے عہد میں دیکھا) اس نے اسے دیکھا تو ایک لحہ میں تھا۔ وقت کے بعض کو کل کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایام منی ثلاثۃ۔ (2) حالانکہ یہ دو دن اور تیسرے دن کا بعض حصہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں: رایتک الیوم، جئتک العام۔ میں نے آج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی من ادرک الامام، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تجھے دیکھا اور میں تیرے پاس اس سال آیا۔ بعض نے فرمایا: جب دو اور دو سے زیادہ جمع ہوتے ہیں تو اشہر فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4: حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینے میں احرام باندھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حج کی سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھے۔ حضرت عطا، مجاہد، طاؤس اور اوزاعی نے کہا: جس نے حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو وہ اس کے حج کی طرف سے نہ ہوگا...... وہ عمرہ کا ہوگا جیسے کوئی وقت سے پہلے نماز میں داخل ہو تو وہ اس کی فرض نماز نہیں ہوتی وہ نفل ہوتی ہے۔ یہ امام شافعی اور ابو ثور کا قول ہے۔ اوزاعی نے کہا: وہ عمرہ کے ساتھ احرام کھول دے گا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ مکروہ ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ان کا مشہور قول پورے سال میں حج کا احرام باندھنے کا جواب ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے، نخعی نے کہا: حج مکمل کرنے تک احرام کھولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (البقرہ: 189) اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ امام شافعی کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ عام ہے اور یہ آیت خاص ہے یہ بھی احتمال ہے کہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہو کیونکہ ان مہینوں کو دوسرے مہینوں پر فضیلت ہے۔ اس پر امام مالک کا قول صحیح ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ یعنی جس نے نیت کے ساتھ قصداً باطناً حج میں شروع ہو کر اپنے اوپر حج لازم کر دیا اور احرام کے ساتھ ظاہر فعل کے ساتھ اور تلبیہ کے ساتھ زبانی اپنے اوپر حج کو لازم کر لیا۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے اور امام ابوحنیفہ نے کہا: جس نے تلبیہ کے ساتھ اپنے اوپر حج فرض کر لیا (1)۔ امام شافعی کے نزدیک تلبیہ ارکان حج میں سے نہیں ہے۔ یہ حسن بن حیی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: حج کے احرام میں نیت کافی ہے اور تلبیہ کو اہل ظاہر اور دوسرے علماء نے واجب کہا ہے۔ فرض کا لغوی معنی کاٹنا ہے اسی سے فرضة القوس والنهر والجبل ہے۔ قوس کی شگاف کی جگہ، نہر سے پانی پینے کی جگہ، پہاڑ کا وہ حصہ جو اس کے وسط اور جانب سے لڑھک جائے۔ پس فرضية الحج کا مطلب آزاد آدمی پر اس کا لازم ہونا ہے جس طرح تیر کیلئے شگاف ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرض کا معنی علیحدہ کرنا ہے۔ یہ بھی قطع کے معنی کی طرف لوٹتا ہے کیوں کہ جو کسی چیز کو کاٹتا ہے تو وہ اسے دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے اور من مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اس کا معنی شرط ہے اور خبر فرض ہے کیونکہ من موصولہ نہیں ہے۔ فرمایا: رجل فرض۔ اور فرمایا فیهن اور فیها نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: استعمال میں دونوں برابر ہیں۔ مازنی ابو عثمان نے کہا: غیر ذوی العقول کی جمع کثیر واحد مونث کی طرف آتی ہے اور قلیل اس طرح نہیں آتی۔ تو کہتا ہے: الاجذاع انکسرن، الجذوع انکسرت۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے: ان عدة الشهور۔ پھر فرمایا: منها۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ حضرت ابن عباس، ابن جبیر، سدی، قتادہ، حسن، عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک نے کہا: الرفث سے مراد جماع ہے (2)۔ یعنی جماع نہ ہو کیونکہ یہ حج کو فاسد کر دیتا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وقوف عرفات سے پہلے جماع، حج کو فاسد کرنے والا ہے اور اس پر آئندہ سال حج اور ہدی دینا ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر،

1۔ احکام القرآن، صفحہ 133، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

طاؤس، عطاوغیرہم نے فرمایا: الرفث سے مراد عورت کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے۔
اس کا قول: جب ہم احرام کھولیں گے تو ہم تیرے ساتھ ایسا کریں گے۔ یعنی بغیر کنایہ کے کہے ...... یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے انہوں نے احرام کی حالت میں شعر میں کہا:

و هن يمشين بنا هميسا   ان تصدق الطير ننك لميسا

تو آپ کے ساتھی حصین بن قیس نے کہا: کیا تو احرام کی حالت میں رفث کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الرفث وہ ہے جو عورتوں کے پاس کیا جائے۔ ایک قوم نے کہا: عورتوں کے ذکر کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے خواہ وہ حاضر ہوں یا نہ ہوں۔ بعض نے کہا: الرفث ایک جامع کلمہ ہے۔ یہ ہر اس کو شامل ہے جو مرد، عورت سے چاہتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: الرفث کا معنی لغو کلام ہے اور یہ شعر پڑھا ہے۔

و رب اسراب حجيج كظم   عن اللغا و رفث التكلم

کہا جاتا ہے: رفث یرفث، فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ حضرت ابن مسعود نے فلا رفوث پڑھا ہے یعنی جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عربی نے کہا: فلا رفث سے مراد اس کی مشروعیت کی نفی ہے نہ کہ اس کے وجود کی نفی ہے کیونکہ ہم رفث حج میں پاتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خبر غلط واقع نہیں ہو سکتی۔ نفی اس کے مشروع اوجود کی طرف لوٹتی ہے، محسوساً اس کے وجود کی طرف نہیں لوٹتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ:228) ہم طلاق والی عورتوں کو پاتے ہیں کہ وہ انتظار نہیں کرتی ہیں پس نفی حکم شرعی کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ وجود حسی کی طرف، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ (الواقعہ) جب ہم کہتے ہیں یہ آدمیوں کے بارے میں وارد ہے اور یہ صحیح ہے...... اس کا معنی ہے شرعاً آدمیوں میں سے اس کو بے وضو شخص نہیں چھوتا اگر چھونا پایا گیا تو وہ شرع کے حکم کے خلاف ہو گا۔ یہ نکتہ علماء سے فوت ہو گیا انہوں نے کہا: خبر، نہی کے معنی میں ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں پائی جاتی ہے اور اس کا پایا جانا صحیح بھی نہیں ہے یہ دونوں حقیقتہً مختلف ہیں وصفاً متضاد ہیں۔

مسئلہ نمبر7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا فُسُوْقَ اس سے مراد تمام گناہ ہیں یہ حضرت ابن عباس، عطا اور حسن کا قول ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر اور ایک جماعت نے کہا: الفسوق کا معنی حج کے احرام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے جیسے شکار کو قتل کرنا، ناخن کاٹنا، بال نوچنا اور اس کے مشابہ گناہ کرنا ہے۔ ابن زید اور مالک نے کہا: الفسوق سے مراد بتوں کے لئے جانور ذبح کرنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ او فسقاً أهل لغير الله به۔
ضحاک نے کہا: الفسوق سے مراد برے القاب سے یاد کرنا ہے اسی سے ارشاد ہے: بئس الاسم الفسوق۔ حضرت ابن عمر نے کہا: الفسوق سے مراد گالی دینا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے(1)''۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اقوال کو شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور

1۔ صحیح مسلم، سباب المسلم فسوق، صفحہ 58، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73-272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جماع اور گناہ نہ کیا تو وہ اس طرح لوٹا جیسے اس دن تھا جس میں اسے اس کی والدہ نے جنم دیا تھا(1)'' اور مقبول حج کی جزا صرف جنت ہے(2)۔ یہ مسلم وغیرہ نے نقل کی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے راستہ میں جہاد اور مقبول حج سے بہتر عمل کوئی نہیں جس میں جماع، فسق اور جھگڑا نہ ہو(3)۔ فقہاء نے کہا: حج مقبول وہ ہے جس کی ادائیگی کے دوران اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ فراء نے کہا: وہ ہے جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ یہ دونوں قول ابن عربی نے ذکر کیے ہیں۔ میں کہتا ہوں: حج مبرور وہ ہے جس میں اور جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ حسن نے کہا: حج مبرور یہ ہے کہ وہ لوٹے تو دنیا سے دلچسپی نہ رکھتا ہو اور آخرت سے رغبت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ رفع اور تنوین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور وَلَا جِدَالَ میں فتحہ پر اجماع ہے۔ یہ پہلے کلمات میں نصب کی قراءت کو تقویت دیتا ہے کیونکہ مقصود رفث، فسوق اور جدال سے عام نفی ہے تاکہ منفی کے عموم میں ایک نظام پر کلام ہو جائے۔ نصب پر اکثر قراء ہیں۔ تینوں اسماء محل رفع میں ہیں ہر ایک لا کے ساتھ ہے اور فِي الْحَجِّ تمام کی خبر ہے اور رفع کی قراءت کی وجہ یہ ہے کہ لا بمعنی لیس ہے۔ پس اس کے بعد اسم مرفوع ہوا کیونکہ وہ اس کا اسم ہے اور خبر محذوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فلیس رفثٌ ولا فسوق فی الحج۔ اور اس پر دلیل فی الحج کا قول ہے اور دوسرا ظاہر ہے وہ لا جدال کی خبر ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: رفع اس معنی میں ہوگا: فلا یکونن رفثٌ ولا فسوق۔ یعنی ہر ایسا عمل جو حج سے نکالتا ہے پھر نفی کی ابتدا کی۔ فرمایا: وَلَا جِدَالَ۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ کان تامہ ہو۔ جیسے اس قول میں ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ (بقرہ: 280)۔ تو یہ خبر کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کان ناقصہ ہو اور خبر محذوف ہو جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔ اور رفث اور فسوق کو رفع دینا بھی جائز ہے مبتدا کی حیثیت سے اور لا نفی کے لئے ہو اور خبر محذوف ہو۔ ابو جعفر بن قعقاع نے تینوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض طرق میں عاصم سے یہ مروی ہے۔ اس صورت میں فی الحج تینوں کی خبر ہوگا جیسا کہ ہم نے نصب کی قراءت کے بارے میں کہا اور فی الحج کا قراءت کے اختلاف کے ساتھ تمام کی خبر ہونا اچھا نہیں کیونکہ لیس کی خبر منصوب ہوتی ہے اور ولا جدال کی خبر مرفوع ہوتی ہے کیونکہ ولا جدال پہلے سے علیحدہ کیا گیا ہے یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ایک اسم میں دو فاعل نہیں ہوتے اور فلا رفثٌ ولا فسوقٌ جائز ہے۔ مقام پر عطف ہے۔ نحویوں نے یہ شعر پڑھا ہے:

لا نسب الیوم ولا خلة اتسع الخرق علی الراقع

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل الحج والعمرہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال، صفحہ 462، جلد 1

نہ اس دن نسب کا فائدہ ہوگا نہ دوستی ہوگی چیتھڑے والے پر پھٹن زیادہ ہوگی۔

اور کلام میں فلا رفث ولا فسوقا ولا جدال فی الحج لفظ پر عطف کے اعتبار سے جو لا میں واجب تھا یہ فراء نے کہا ہے اور اس کی مثال یہ ہے:

فلا أب وابنا مثل مروان و ابنه اذا هو بالمجد ارتدیٰ و تأزرا

نہ باپ، نہ بیٹا مروان اور اس کے بیٹے کی مثل ہے جب اس نے بزرگی کی چادر اوڑھی اور تہبند باندھا۔

ابورجاء عطاردی نے کہا فلا رفث ولا فسوق دونوں میں نصب کے ساتھ اور ولا جدال رفع اور تنوین کے ساتھ۔ اخفش نے کہا:

هذا وجد کم الصغار بعینه لا ام لی ان کان ذاك ولا اب

یہ اور تمہارا ذلیل دادا میرے لئے نہ ماں ہو نہ باپ اگر وہ ہو۔

بعض علماء نے کہا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ کا معنی نہی ہے، یعنی لا ترفثو ولا تفسقوا۔ اور ولا جدال کا معنی نفی ہے۔ جب معنی میں اختلاف ہے تو لفظ میں بھی اختلاف کیا گیا۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ ولا جدال بھی نہی ہے یعنی لا تجادلوا پھر ان کے درمیان کیوں فرق کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ یہ مجادلہ سے فعال کے وزن پر ہے یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی قتل کرنا ہے اسی سے زمام مجدول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالہ سے مشتق ہے جو زمین ہے۔ گویا ہر شخص اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس پر غالب آتا ہے۔ پس وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے مخالف کو زمین پر مارا۔ شاعر نے کہا:

قد ارکب الآلة بعد الآلة و اترك العاجز بالجدالة

منعفرا لیست له محالة

مسئلہ نمبر 10: علماء نے ان الفاظ کے مرادی معنی میں چھ مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور عطاء نے کہا: الجدال کا یہاں معنی یہ ہے کہ تو کسی مسلمان سے جھگڑے حتیٰ کہ تو اس پر ناراض ہو اور وہ گالی تک پہنچ جائے۔ رہا مذاکرہ علم تو اس سے نہی نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: الجدال سے مراد گالی دینا ہے، حضرت ابن زید اور حضرت مالک بن انس نے کہا: یہاں الجدال سے مراد لوگوں کا اختلاف ہے کہ کس نے حضرت ابراہیم کے موقف کو پایا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے جب قریش دوسرے عربوں سے مختلف جگہ پر ٹھہرتے تھے پھر اس کے بعد جھگڑتے تھے۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ ابراہیم کے موقف کے بارے میں نہ جھگڑو۔ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ کہے کہ آج حج ہے اور دوسرا کہے کہ کل حج ہے۔ مجاہد اور ان کے ساتھ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد مہینوں کے بارے میں جھگڑنا ہے جیسا نسئ (1) (ایک مہینہ کو مؤخر کرنا، دوسرے کو مقدم کرنا) میں عربوں کا معمول تھا، کبھی وہ حج کو ذی الحجہ کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

علاوہ مہینے میں کرتے تھے۔ بعض مزدلفہ میں ٹھہرتے، بعض عرفہ میں ٹھہرتے اور درست مقام میں ٹھہرنے کے بارے میں جھگڑتے تھے (ہر ایک کہتا: میں ٹھیک ہوں)

میں کہتا ہوں: ان دو تاویلوں پر معنی ہوگا نہ وقت میں جھگڑو، نہ ٹھہرنے کی جگہ میں جھگڑو۔ یہ قول زیادہ درست ہے جو وَلَا جِدَالَ کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانہ اس دن کی ہیئت پر گھوم آیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا (1) (الحدیث) مزید بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ یعنی حج کا امر اسی جہت پر لوٹ آیا جس پر تھا یعنی اس دن اور وقت پر لوٹ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب حج فرمایا تو فرمایا: ''مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (2)'' اس کے ساتھ آپ نے حج کے مواقف اور مواضع بیان فرمائیں۔ محمد بن کعب قرظی نے بتایا کہ جدال یہ ہے کہ ایک طائفہ کہتا ہمارا حج، تمہارے حج سے زیادہ درست ہے دوسرا بھی اسی طرح کہتا (3)۔ بعض نے فرمایا: الجدال سے مراد اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ شرط اور جواب شرط ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا کیونکہ عالم میں کسی چیز کے بدلے جزا واقع ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ فحش کلام کی جگہ حسن کلام پر برانگیختہ کرنا ہے اور فسوق و جدال کی جگہ اخلاق میں تقویٰ اور نیکی پر ابھارنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خیر (نیکی) کے فعل کو ضبط نفس سے تعبیر کیا ہے تاکہ وہ عمل نہ پایا جائے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَزَوَّدُوْا زادراہ ساتھ لینے کا حکم ہے۔ حضرت ابن عمر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو حج پر بغیر زادراہ کے آتے تھے۔ بعض کہتے ہیں: ہم بیت اللہ کا حج کیسے کریں گے وہ ہمیں کھانا نہیں کھلائے گا؟ وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے تھے۔ انہیں اس عمل سے منع کیا گیا اور انہیں زادراہ ساتھ لانے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: لوگ زادراہ کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے تو انہیں زادراہ کا حکم دیا گیا (4) اور نبی کریم ﷺ کا حج کے سفر میں ایک اونٹ تھا جس پر زادراہ تھا۔ آپ کے پاس مزینہ قبیلہ کے تین سو آدمی آئے جب انہوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! ان لوگوں کو زادراہ دو۔ بعض لوگوں نے کہا: تَزَوَّدُوْا کا مطلب ہے نیک صالح دوست ساتھ لو۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تخصیص ضعیف ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ تم اپنی آخرت کے لئے اعمال صالحہ کا زادراہ ساتھ لو (5)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول واضح ہے کیونکہ زاد سے مراد حج کے سفر میں کھانے کا سامان ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل یمن حج کرتے تھے اور زادراہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور کہتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، تغلیظ تحریم الدماء والاعراض، صفحہ 60، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، لتأخذوا عنی مناسککم، صفحہ 419، جلد 1

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

5۔ ایضاً

تھے ہم توکل کرنے والے ہیں جب مکہ مکرمہ آئے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى یہ اس میں نص ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ شعبی نے کہا الزاد سے مراد چھوارے اور ستو ہے۔ ابن جبیر نے کہا: کیک اور ستو ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں زادراہ کا حکم دیا جن کے پاس مال تھا اور جن کے پاس مال نہیں تھا اگر وہ کوئی پیشہ رکھتا ہے تو راستہ میں اس کو استعمال کرے یا سائل ہے تو اسے خطاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا جو مال والے تھے اور مال چھوڑ جاتے تھے اور بغیر زادراہ کے نکلتے تھے اور کہتے تھے ہم توکل کرنے والے ہیں، توکل کی شرائط ہیں جو ان شرائط کو بجالائے تو وہ زادراہ کے بغیر نکلے اور وہ خطاب میں داخل نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق کے اعتبار سے حکم فرمایا عام لوگ توکل کے درجہ سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کے حقائق سے غافل ہوتے ہیں(1)۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: ابلیس نے اس قوم پر تلبیس کی جو توکل کا دعویٰ کرتے اور وہ بغیر زادراہ کے نکلتے اور گمان کرتے کہ یہ توکل ہے۔ وہ انتہائی خطا پر ہیں۔ ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی طرف توکل کرتے ہوئے بغیر زادراہ کے جاؤں۔ امام احمد نے اسے کہا: بغیر قافلہ کے جاؤ، اس نے کہا نہیں قافلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ امام احمد نے فرمایا: لوگوں کے برتن پر تو توکل کرے گا۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بہتر زادراہ منہیات سے بچنا ہے۔ پس اللہ نے انہیں زادراہ کے ساتھ تقویٰ کو ملانے کا حکم دیا اور فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اپنے معنی پر معمول ہے کیونکہ تَزَوَّدُوْا کا معنی ہے اس حکم کی اتباع میں اللہ سے ڈرو جو تمہیں زادراہ ساتھ لے جانے کا دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس معنی کا احتمال رکھتا ہے کہ بہتر زاد وہ ہے جس کے ساتھ مسافر ہلاکت سے اور سوال کرنے اور ہاتھ پھیلانے کی حالت سے بچ جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یہ دنیا، قرار کی جگہ نہیں ہے۔ اہل اشارات نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آخرت کا سفر یاد دلایا اور انہیں تقویٰ کے زاد پر ابھارا، تقویٰ آخرت کا زاد ہے۔ اعشی نے کہا: جب تو تقویٰ کے زادراہ کے بغیر کوچ کرے گا اور مرنے کے بعد ان سے ملے گا جو زادراہ ساتھ لے گئے ہیں تو تو شرمندہ ہوگا کہ تو ان کی مثل نہیں ہے۔ تو نے اس طرح اعمال کی نگرانی نہ کی جس طرح انہوں نے کی تھی۔ ایک اور شاعر نے کہا: موت ایک موجیں مارنے والا سمندر ہے اس میں تیرنے والے کا حیلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اے نفس! میں کہنے والا ہوں پس تو ایک مشفق ناصح سے بات سن، انسان کے ساتھ قبر میں تقویٰ اور عمل صالح کے علاوہ کچھ نہیں جاتا۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ خطاب میں عقل والوں کو خاص فرمایا اگرچہ معاملہ تمام کو شامل ہے کیونکہ ان پر اللہ کی حجت قائم ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو پانے والے ہیں اور انہیں قائم رکھنے والے ہیں۔ الباب، جمع ہے لبّ کی اور لب ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں اسی وجہ سے عقل کو بھی لب کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے ابواسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: کیا تو عرب کلام میں مضاعف میں سے کوئی ایسی

1۔ احکام القرآن، صفحہ 135، جلد 1 (دارالفکر)

چیز جانتا ہے جو فَعُلَ کے وزن پر آئی ہو؟ میں نے کہا: ہاں، سیبویہ نے یونس سے حکایت کیا ہے: لبُبْتَ تلب۔ انہوں نے اس کی تحسین کی اور کہا: میں اس کی مثال نہیں جانتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

''نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل (رزق) پھر جب واپس آؤ عرفات سے تو ذکر کرو الله کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: جُنَاحٌ اس کا مطلب ہے: گناہ۔ یہ لَيْسَ کا اسم ہے اَنْ تَبْتَغُوْا۔ لَيْسَ کی خبر کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یعنی فی ان تبتغوا۔ خلیل اور کسائی کے قول پر محل جر میں ہے۔ جب الله تعالیٰ نے حج کو رفث، فسق، جدال سے پاک رکھنے کا حکم دیا تو تجارت کی رخصت دی۔ یعنی الله کا فضل تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ ابتغاء الفضل (فضل کا تلاش کرنا) قرآن میں تجارت کے معنی میں وارد ہوا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:10) اس کی صحت پر دلیل بخاری کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت میں بازار تھے پس لوگ حج کے موسم میں تجارت کرنا گناہ سمجھتے تھے تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی لیس عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، فی مواسم الحج۔(1)

مسئلہ نمبر 2: جب یہ اس آیت میں ثابت ہے، تجارت کا قصد شرک نہیں ہوگا اور مکلف اخلاص سے نہیں نکلے گا جو اخلاص اس پر فرض تھا۔ فقراء کا قول اس کے خلاف ہے۔ حج بغیر تجارت کے افضل ہے تاکہ عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک رہے اور دل عبادت کے علاوہ کسی چیز سے معلق نہ ہو۔ دار قطنی نے اپنی سنن میں ابو امامہ التیمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں اس راستہ میں کرایہ پر جانور دیتا ہوں (2) اور لوگ کہتے ہیں تیرا حج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اس کی مثل سوال کیا جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاموش ہو گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تیرا حج ہے(3)''۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، لیس علیکم جناح، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 253، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 292، جلد 2 (قاہرہ)

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ اس میں سولہ مسائل ہیں (☆):

مسئلہ نمبر 1: فَاِذَآ اَفَضْتُمْ یعنی جب تم چلو۔ کہا جاتا ہے: فاض الاناء۔ جب برتن بھر جائے حتیٰ کہ کناروں سے چھلکنے لگے۔ رجل فیاض، بہت زیادہ عطا کرنے والا۔ زہیر نے کہا۔

وابیض فیاض یدہ غمامۃ　　علی معتفیہ ما تغبّ فواضلہ

سفید، اس کے ہاتھ طلب گاروں پر بادل کی طرح سخاوت کرتے ہیں اس کی عطاء دائمی ہے۔

اور حدیث مستفیض۔ مشہور حدیث۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ عَرَفٰتٍ قراء کی جماعت نے عَرَفٰتٍ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نام مسلمات رکھا جائے تو اسے تنوین کے ساتھ پڑھا جائے گا کیونکہ تنوین منصرف اور غیر منصرف کے درمیان فرق کرنے کے لئے نہیں ہے تاکہ تو اسے حذف کرے۔ یہ تو مسلمین میں جو نون ہے اس کے قائم مقام ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے۔ سیبویہ نے عربوں سے، عرفات سے تنوین کا حذف حکایت کیا ہے۔ کہتا ہے: ھذہ عرفات یا ھذا و رایت عرفات یا ھذا۔ (تا کے کسرہ کے ساتھ اور بغیر تنوین کے) جب عربوں نے اسے معرفہ بنایا تو تنوین کو حذف کیا۔ اخفش اور کوفیوں نے تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاطمہ اور طلحہ کی تا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اور انہوں نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

تنورتها من اذرعات واهلها　　بیثرب ادنی دارها نظرٌ عالِ (1)

اس میں اذرعات پر فتحہ پڑھا ہے۔

پہلا قول عمدہ ہے، اس میں تنوین وہی ہے جو مسلمات میں ہے کسرہ مسلمین میں یا کے مقابلہ میں ہے اور تنوین (2)، نون کے مقابل ہے۔ عرفات، اسم علم ہے جمع کے ساتھ نام رکھا گیا ہے جیسے اذرعات۔ بعض نے فرمایا: اس کے اردگرد کی وجہ سے اسے عرفات کہا جاتا ہے جیسے ارض سباسب (چٹیل زمین) بعض نے فرمایا: اس جگہ کو عرفات اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ وہاں ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ جب ہند میں حضرت آدم علیہ السلام اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں جو بہت لمبی مدت تلاش کے بعد عرفہ کے دن عرفات میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اس دن کو اسی وجہ سے عرفہ کہا جاتا ہے وہ جگہ عرفات کہلائی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ اقوال کہے ہیں جو وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرہ: 128) کے قول کے تحت گزر چکا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل (☆☆) ہے جس طرح تمام جگہوں کے نام ہیں۔ عرفۃ یہ نعمان الاراک ہے۔ اس کے متعلق شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 345، جلد 2 (دار احیاء التراث العلمیہ)　　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں اٹھارہ مسائل ہیں

☆☆ ایک اصطلاح ہے جو منقول کے مقابل ہے منقول اس کو کہتے ہیں جو پہلے کسی اور کے لیے وضع کیا جائے بعد میں اسم میں استعمال ہو۔ مرتجل جو ابتدا سے ہی اس کے لیے استعمال ہوا۔

تزودت من نعمان عود اراكة لهند ولكن من يبلغ هندا (1)

میں نے ہند کے لئے عرفات سے سامان لیا لیکن ہند کو کون یہ پہنچائے گا۔

یہ العرف سے ماخوذ ہے جس کا مطلب خوشبو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عرفها لهم۔ یعنی اللہ نے اس کو ان کے لئے پاک کیا...... یہ پاک جگہ ہے بخلاف منیٰ کے جہاں جانوروں کی غلاظت اور خون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو عرفات کہا جاتا ہے اور وقوف کے دن کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: ان دو اسموں کی اصل صبر ہے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ عارف جب کوئی شخص صبر کرنے والا، خشوع کرنے والا ہو۔ ضرب المثل ہے: النفس عروف وما حملتها تتحمل۔ نفس صبر کرنے والا ہے جو تو اس کو برداشت کرائے گا یہ برداشت کرے گا۔

فصبرت عارفة لذلك حرة یعنی میرا نفس صبر کرنے والا آزاد ہے۔

ذوالرمہ نے کہا:

عروف لما خطت عليه المقادر وہ صبر کرنے والا ہے جو اس پر تقدیر نے لکھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر صبر کرنے والا ہے۔ اس اسم کے ساتھ نام رکھا گیا ہے کیونکہ حاجی خضوع و خشوع کا اظہار کرتے ہیں اور دعا پر صبر کرتے ہیں، مختلف مصائب اور تکلیف برداشت کرتے ہیں تاکہ حج کی عبادت کو قائم کریں۔

مسئلہ نمبر 3: اہل علم کا اجماع ہے کہ جو عرفہ کے دن، عرفہ میں زوال سے پہلے ٹھہرا پھر وہاں سے زوال سے پہلے چلا گیا تو اس کا وقوف شمار نہیں ہوگا اور علماء کا اجماع ہے کہ اس کا حج مکمل ہے جو زوال کے بعد ٹھہرا اور رات سے پہلے دن کے وقت چلا گیا مگر امام مالک بن انس نے فرمایا کہ وہ رات کا کچھ حصہ موقف میں گزارے، رہا وہ شخص جو رات کے وقت عرفہ میں ٹھہرا اس کے حج کے مکمل ہونے میں امت کے درمیان اختلاف نہیں ہے اور جمہور کی حجت مطلق یہ ارشاد ہے فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ اس ارشاد میں دن سے رات کو خاص نہیں فرمایا اور حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث ہے فرمایا میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں طی کے دو پہاڑوں سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو بھی تھکا دیا ہے اللہ کی قسم میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں اس پر ٹھہرا، کیا میرے لئے حج ہے یا رسول اللہ! ؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ صبح کی مزدلفہ میں نماز پڑھی اور اس سے پہلے وہ رات یا دن کے وقت عرفات میں آ چکا تھا تو اس نے حج کے مناسک پورے کر دیئے اور اس کا حج مکمل ہوا (2)۔ اس حدیث کو بہت سے ائمہ نے نقل کیا ہے ان میں سے ابوداؤد، نسائی اور دارقطنی ہیں یہ لفظ دارقطنی کے ہیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو عمر نے کہا حضرت عروہ بن مضرس میں طائی کی حدیث ثابت صحیح ہے۔ اس کو شعبی کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے شعبی سے اور انہوں نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے اسماعیل بن ابی خالد،

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناسک، ما جاء من ادرک الامام، صفحہ 109، جلد 1 (وزارت تعلیم)

داؤد بن ابی ہند، زکریا بن ابی زائدہ، عبد اللہ بن ابی السفر اور مطرف ہیں۔ ان سب نے شعبی سے انہوں نے عروہ بن مضرس بن اوس بن حارثہ بن لام سے روایت کیا ہے۔ امام مالک کی حجت، سنت ثابتہ سے حضرت جابر کی طویل حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا اور تھوڑی زردی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال وجوب پر ہیں خصوصاً حج کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک حج لے لو(1)۔

مسئلہ نمبر 4: جمہور کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو سورج غروب ہونے سے پہلے عرفات سے چلا گیا اور واپس نہ آیا اس پر حج کی صحت کے ساتھ کیا لازم ہے؟ حضرات عطا، سفیان ثوری، شافعی، احمد، ابوثور اور اصحاب رائے وغیرہ نے کہا: اس پر بکری ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس پر ہدی ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس پر اونٹ ہے۔ مالک نے کہا: اس پر آئندہ سال حج ہے اور ہدی کو وہ آئندہ نحر کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا حج فوت ہوگیا۔ اگر وہ عرفہ کی طرف لوٹ آیا پھر سورج غروب ہونے کے بعد نکلا تو امام شافعی نے فرمایا: اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی احمد، اسحاق اور داؤد کا قول ہے۔ طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: اس سے دم ساقط نہ ہوگا اگرچہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد لوٹ آئے یہی ابوثور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو سواری پر قادر ہو اس کے لئے سوار ہو کر عرفہ میں وقوف کرنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ سے جانے تک سورج کے غروب ہونے کے بعد سواری پر وقوف کیا اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا۔ یہ حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں محفوظ ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں بھی ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے حتیٰ کہ موقف میں آئے اپنی اونٹنی قصواء کا بطن جبل رحمت کے نیچے پتھروں کی طرف کیا اور پیدل چلنے والوں کے راستہ کو سامنے رکھا اور قبلہ کی طرف منہ کیا اور آپ سورج کے غروب ہونے تک ٹھہرے رہے اور زردی تھوڑی سی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا(2) (الحدیث) اگر سواری پر سوار ہونے پر قادر نہ ہو تو اپنے قدموں پر دعا مانگتا ہوا کھڑا ہو جب تک طاقت رکھتا ہے اور کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو بیٹھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، سوار ہو کر وقوف کرنے میں مباہات اور حج کی تعظیم ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ (الحج)

ابن وہب نے اپنے مؤطا میں کہا: مجھے مالک نے کہا: عرفہ میں وقوف سواری اور اونٹ پر وقوف میں نزدیک کھڑا ہو کر وقوف کرنے سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور جو کھڑا ہو کر وقوف کرے اس کے آرام کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ نمبر 6: صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرفہ سے چلے تو تھوڑے

1۔ السنن الکبری، کتاب الحج، الایضاح فی وادی محسر، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

تیز چلتے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے (1)۔ ہشام بن عروہ نے کہا: نص، عنق سے زیادہ تیز چلنا ہے۔ اسی طرح حاجیوں کے اماموں اور دوسرے لوگوں کو چلنا چاہئے کیونکہ مزدلفہ کی طرف جلدی چلنا، نماز کی طرف جلدی چلنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغرب کی نماز اس رات مزدلفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، یہ سنت ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: قرآن اور سنت ثابتہ کا عموم ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عرفہ سارا موقف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں ٹھہرا اور عرفہ سارا موقف ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے حضرت جابر کی طویل حدیث سے روایت کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ سارا موقف ہے اور بطن عرنہ سے بلند رہو۔ اور مزدلفہ سارا موقف ہے اور بطن محسر سے بلند رہو (3) (یعنی ان میں نہ ٹھہرو) اسی طرح حفاظ ثقات اور اہل حدیث میں سے اثبات لوگوں نے جعفر بن محمد کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: فقہاء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے وادی عرفہ میں وقوف کیا۔ ابن منذر نے مالک سے ان کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ شخص بکری دے اور اس کا حج مکمل ہے۔ یہ روایت خالد بن نزار نے مالک سے روایت کی ہے، ابو المصعب نے کہا کہ وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے وقوف کیا ہی نہیں اور اس کا حج فوت ہے اس پر آئندہ سال حج ہے جب وہ بطن عرنہ میں ٹھہرا ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جو وادی عرنہ سے چلا اس کا حج نہیں یہ ابن قاسم اور سالم کا قول ہے ابن منذر نے یہ قول امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اس جگہ پر نہ ٹھہرے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: عرفہ سے بطن عرنہ کی استثناء ایسی نہیں ہے جس کی حجت لازم ہو، نہ نقل کی جہت سے اور نہ اجماع کی جہت سے، اور جو ابو المصعب کے مذہب پر چلتے ہیں۔ ان کی حجت یہ ہے کہ عرفہ کا وقوف فرض ہے اس پر اجماع ہے اور یہ معین جگہ میں ہے۔ پس اس کی ادائیگی یقین کے ساتھ ہی ہوگی اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا بطن عرنہ راء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ عرفہ کی مسجد کے مغربی جانب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: عرفہ کی مسجد کی مغربی دیوار اگر گرے گی تو وہ بطن عرنہ میں گرے گی۔ الباجی نے ابن حبیب سے روایت کیا ہے کہ عرنہ حل میں ہے اور عرفہ حرم میں ہے۔ ابو عمر نے کہا: رہی بطن محسر تو وکیع نے ذکر کیا ہے ہمیں سفیان نے بتایا انہوں نے ابو زبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بطن محسر میں تیز چلے (4)۔

مسئلہ نمبر 8: نو ذی الحجہ کو عرفہ کے علاوہ دوسری مساجد میں اہل عرفہ سے تشبیہ اختیار کرتے ہوئے جمع ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شعبہ نے قتادہ سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے، فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابن عباس نے یہ بصرہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الاضافۃ من عرفات الی المزدلفہ، صفحہ 417، جلد 1

2۔ صحیح مسلم، ایضاً، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 400، جلد 1

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، الوقوف بعرفہ، صفحہ 410 (وزارت تعلیم)

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ماجاء فی الافاضۃ من عرفات، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کیا تھا یعنی نویں ذی الحجہ کے دن لوگوں کا بصرہ کو عرفہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے دیکھا جبکہ لوگ ان کے پاس جمع تھے۔ اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے عرفہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں لوگوں کے جمع ہونے کے متعلق پوچھا جو عرفہ کے دن جمع ہوئے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں کئی لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ حسن، بکر، ثابت اور محمد بن واسع عرفہ کے دن مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 9: نویں ذی الحجہ کی فضیلت: نویں کے دن کی بہت بڑی فضیلت ہے اور بہت بڑا ثواب ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور نیک اعمال کو اس میں کئی گنا کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نویں کے دن کا روزہ گزشتہ اور باقی سال کے گناہوں کا کفارہ ہے (1)۔ اس کو ''الصحیح'' میں نقل کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: افضل دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے اور اس میں سے افضل وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (2)۔ دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عرفہ کے دن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی دن میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتا ہے، جو انہوں نے ارادہ کیا اسے بیان فرماتا ہے (3)...... اور مؤطا میں عبید اللہ بن کریز سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن ذلیل وحقیر، دھتکارا ہوا اور غصہ میں نہیں دیکھا جاتا یہ نہیں ہوتا مگر اس لئے کہ جو رحمت کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے گناہوں سے تجاوز دیکھتا ہے۔ مگر بدر کے دن جو اس نے (مسلمانوں کے لیے فرشتوں کی مدد) دیکھی (تو اتنا ہی پریشان و ذلیل ہوا تھا) پوچھا گیا: یا رسول اللہ! بدر کے دن شیطان نے کیا دیکھا تھا؟ فرمایا: اس نے جبریل کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی صفوں کو جنگ کے لئے ترتیب دے رہا ہے (4)۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث ابو النضر اسماعیل بن ابراہیم عجلی نے مالک سے انہوں نے ابراہیم بن ابی عبلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ اور اس حدیث میں عن ابیہ کسی اور نے نہیں کہا اور یہ کچھ نہیں ہے۔ صحیح وہ ہے جو مؤطا میں ہے۔ ترمذی الحکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے اپنی مسند سے عباس بن مرداس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے لئے عرفہ کے پچھلے پہر مغفرت اور رحمت کی دعا مانگی اور بہت زیادہ دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے تیری دعا قبول کر لی مگر جو بعض نے بعض پر ظلم کیا۔ ان کے جو گناہ میرے اور ان کے درمیان ہیں میں نے وہ معاف کر دیئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی: یا رب! تو قادر ہے کہ تو اس مظلوم کو اس پر جو ظلم کیا گیا ہے اس سے زیادہ بہتر جزا عطا فرما دے اور تو اس ظالم کو معاف فرما دے تو اس وقت کوئی جواب نہ دیا جب مزدلفہ کی صبح تھی تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شہر، صفحہ 368، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع الحج، صفحہ 457 (وزارت تعلیم)

آپ نے دعا میں مزید اجتہاد و کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ ایسے وقت میں مسکرائے ہیں جس وقت آپ پہلے کبھی نہیں مسکرائے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کے دشمن ابلیس پر ہنسا ہوں جب اسے علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے بارے میری بات قبول کر لی ہے تو وہ ویل اور موت کو پکارنے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا اور بھاگنے لگا۔ بو عبدالغنی حسن بن علی نے کہا: ہمیں عبدالرزاق نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے ابوالزناد سے انہوں نے اعرج سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ خالص حاجی کو معاف کر دیتا ہے اور جب مزدلفہ کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ تاجروں کو معاف فرما دیتا ہے اور جب منیٰ کا دن ہوتا ہے تو اونٹوں والوں کو معاف فرما دیتا ہے جب جمرہ عقبہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور جو مخلوق موقف میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں میں سے موجود ہوتی ہے اسے معاف فرما دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث مالک کی حدیث سے غریب ہے اور محفوظ نہیں ہے مگر اسی سند سے۔ ابو عبدالغنی نے کہا: میں اسے نہیں جانتا اور اہل علم رغبت اور فضائل والی احادیث ہر ایک سے آسانی سے روایت کر لیتے ہیں اور احکامات کی احادیث میں سختی کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 10: اہل علم نے نویں ذی الحجہ کا روزہ مستحب قرار دیا ہے مگر عرفات کے مقام پر نہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفہ کا روزہ نہ رکھا اور حضرت ام الفضل نے آپ کو دودھ کا پیالہ بھیجا تو آپ نے نوش فرمالیا۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کیا اور آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ وہ افطار کو پسند فرماتے تھے تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے۔ بعض اہل علم نے عرفہ کا روزہ رکھا (1)۔ حضرت ابن عمر سے پہلی حدیث کی مثل مسند سے مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے حضرت عثمان کے ساتھ میں نے حج کیا اور انہوں نے روزہ نہیں رکھا، میں نہ خود روزہ رکھتا ہوں نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں (2)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ عطا نے عرفہ کے دن کے روزہ کے متعلق فرمایا: میں سردیوں میں روزہ رکھتا ہوں اور گرمیوں میں نہیں رکھتا ہوں۔ یحییٰ انصاری نے فرمایا: عرفہ کے دن فطر واجب ہے۔ حضرت عثمان بن ابوالعاصی، حضرت ابن زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم عرفہ کا روزہ رکھتے تھے۔ ابن منذر نے کہا: عرفہ کے دن عرفات میں میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں روزہ نہ رکھنا محبوب ہے اور عرفات کے علاوہ عرفہ کا روزہ رکھنا محبوب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کے دن کے روزہ کے بارے پوچھا گیا، یہ ''گزشتہ اور باقی سال کا کفارہ ہے (3)''۔ اور ہم نے عطا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے عرفہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصوم، فی کراهية صوم يوم عرفة، صفحہ 93، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، صفحہ 94، جلد 1

3۔ ایضاً، صفحہ 93، جلد 1

کے دن روزہ افطار کیا تا کہ دعا پر قوت حاصل کرے تو اس کے لئے روزہ دار کے اجر کا مثل اجر ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ یعنی مشعر حرام کے پاس دعا اور تلبیہ کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، اس کو جمع کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ اس میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ ملے تھے۔ اذدلف الیها کا مطلب ہوتا ہے وہ اس کے قریب ہوا اسی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس میں موجود لوگوں کے فعل کی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس میں ٹھہرنے کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اس کو مشعر کہا جاتا ہے۔ یہ شعار سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، کیونکہ یہ حج، نماز اور رات گزارنے کی علامت ہے اور اس کے پاس دعا حج کے شعائر میں سے ہے اور حرمت کی صفت اس کی حرمت کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 12: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی (1)۔ اہل علم کا اجماع ہے اور کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حاجی کے لئے مغرب وعشاء کی نماز کو جمع کرنا ہے اور اس کے متعلق اختلاف ہے جس نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے نماز پڑھی۔ امام مالک نے کہا: جو امام کے ساتھ ٹھہرے اور امام کے ساتھ نکلے تو وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ آئے اور یہاں دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے اور اس پر انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کو فرمایا تھا ''نماز آگے ہے''۔ ابن حبیب نے کہا: جس نے مزدلفہ میں آنے سے پہلے بغیر عذر کے نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے جب اسے علم ہو، یہ اس شخص کی مانند ہے جس نے زوال سے پہلے نماز پڑھی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الصلاۃ امامك (نماز آگے ہے (2)) یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: اس پر اعادہ نہیں ہے مگر جب اس نے شفق کے غیب ہونے سے پہلے نماز پڑھی ہو، وہ صرف عشاء کی نماز کا اعادہ کرے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ قاضی ابوالحسن نے اس کی تائید کی ہے اور اس نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ دو نمازیں مزدلفہ میں جمع کرنا سنت ہے اور ان کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں ہے، یہ استحباب کے معنی پر ہے جیسے ظہر اور عصر کو عرفہ میں جمع کرنا ہے۔ ابن منذر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے یہ قول عطا بن رباح، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، سعید بن جبیر، احمد، اسحاق، ابوثور اور یعقوب سے حکایت کیا ہے اور امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ میں آئے اگر مزدلفہ پہنچنے سے پہلے نصف رات گزر چکی ہو تو دونوں نمازیں پڑھے۔

مسئلہ نمبر 13: جس نے جلدی کی اور شفق کے غروب ہونے سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا تو ابن حبیب نے کہا: جو شفق کے غروب ہونے سے پہلے جلدی مزدلفہ پہنچا اس کی نماز نہیں، نہ امام کی نماز ہے اور نہ کسی اور کی حتیٰ کہ شفق غائب ہو جائے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز آگے ہے۔ پھر شفق کے غروب ہونے کے بعد مزدلفہ میں نماز پڑھی اس اعتبار سے اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من جمع بینهما ولم یتطوع، صفحہ 227، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، الافاضۃ من عرفات الی المزدلفۃ، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نماز کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد ہے۔ پس شفق کے غائب ہونے سے پہلے اس کو ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر اس کا وقت شفق کے غائب ہونے سے پہلے ہوتا تو اس وقت سے مؤخر نہ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 14: جو امام کے جانے کے بعد عرفہ میں آیا یا جس کو عذر لاحق ہوا جو امام کے ساتھ ٹھہرا تھا تو ابن المواز نے کہا: جو امام کے بعد ٹھہرا وہ ہر نماز اپنے وقت پر پڑھے۔ امام مالک نے اس شخص کے بارے فرمایا جس کو عذر امام کے ساتھ جانے سے روک لے تو وہ دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے جب شفق غائب ہو جائے۔ ابن القاسم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام کے بعد ٹھہرا، اگر اسے رات کے تیسرے حصہ میں مزدلفہ پہنچنے کی امید ہو تو وہ نماز کو مؤخر کرے حتیٰ کہ مزدلفہ پہنچ جائے ورنہ ہر نماز کو اپنے وقت پر پڑھے۔ ابن المواز نے مزدلفہ تک نماز کو مؤخر کرنے کو کہا جو امام کے ساتھ ٹھہرے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے لئے۔ امام مالک نے وقت کی رعایت کی ہے، مکان کی نہیں۔ ابن القاسم نے نماز کے لئے مختار وقت اور مکان کا اعتبار کیا ہے۔ جب مختار وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو مکان کا اعتبار باطل ہو جائے گا اور مختار وقت کی رعایت اولیٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 15: علماء کا مزدلفہ میں نماز کی ہیئت میں دو اعتبار سے اختلاف ہے: (۱) اذان اور اقامت کے اعتبار سے (۲) کیا ان کا جمع کرنا متصل ہوگا یا کسی عمل سے ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا یا ان کے درمیان عمل جائز ہے، مثلاً سواریوں کا اتارنا وغیرہ۔ رہی اذان اور اقامت، ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھی (1)، اسی طرح ظہر اور عصر کی نمازوں میں عرفہ میں کیا مگر یہ بالاجماع ظہر کے پہلے وقت میں ادا کی جائیں گی۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے جو کہا اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مرفوع حدیث نہیں جانتا لیکن حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے۔ ابن منذر نے حضرت ابن مسعود کا بھی زائد ذکر کیا ہے۔ نظر کی جہت سے اس بات میں امام مالک کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ اور عرفہ کی نمازوں میں سنت قائم فرمائی کہ ان دونوں نمازوں کا ایک وقت ہے جب ان کا وقت ایک ہے اور ہر نماز اپنے وقت پر پڑھی جائے گی تو کوئی نماز دوسری سے اذان اور اقامت کے اعتبار سے اولیٰ نہ ہوگی کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ یہ نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی ہے اور جو نماز اپنے وقت پر پڑھی گئی ہو اس کی سنت یہ ہے کہ اس کے لئے اذان دی جائے اور جماعت کے لئے تکبیر کہی جائے اور یہ واضح ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے علماء نے کہا: ان میں سے پہلی نماز اذان اور اقامت کے ساتھ پڑھی جائے اور دوسری نماز بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی جائے۔ علماء نے کہا: حضرت عمر نے دوسری اذان کا حکم دیا تھا کیونکہ لوگ شام کے کھانے کے لئے جدا جدا ہو گئے تھے۔ پس آپ نے اذان دلوائی تا کہ وہ لوگوں کو جمع کریں۔ علماء نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں جب لوگ امام سے کھانے وغیرہ کے لئے جدا ہو گئے تو آپ نے مؤذنین کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں تا کہ لوگ جمع ہو جائیں۔ جب اذان دی تو اقامت بھی کہی۔ علماء نے کہا: یہ وہ معنی ہے جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ عبد الرحمن بن یزید کی حدیث ذکر کی۔ فرمایا: حضرت ابن مسعود عشاء کا کھانا مزدلفہ میں دو نمازوں کے درمیان میں کھاتے تھے اور دوسری سند میں ہے ہر نماز کو اذان اور اقامت کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

پڑھا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: دونوں نمازیں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی جائیں گی اور ان کے درمیان کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ عبدالرزاق اور عبدالمالک بن صباح نے ثوری سے انہوں نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کیا مغرب کی تین رکعتیں پڑھیں اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ایک اقامت کے ساتھ۔ دوسرے علماء نے کہا: مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھی ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ جمع کرے۔ یہ علماء اس روایت پر عمل کرتے ہیں جو ہشیم نے یونس بن عبید سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز کو مزدلفہ میں جمع کرتے تھے اور ان کے درمیان کچھ نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثل حضرت خزیمہ بن ثابت کی حدیث سے مرفوع روایت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ جوزجانی نے محمد بن حسن سے انہوں نے امام ابو یوسف سے انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حکایت کیا ہے کہ دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کی جائیں گی۔ مغرب کے لئے اذان دی جائے گی اور عشاء کے لئے صرف تکبیر کہی جائے گی۔

یہی نظریہ امام طحاوی کا ہے کیونکہ حضرت جابر کی حدیث اس کی دلیل ہے۔ یہ پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔ بعض علماء نے کہا: بغیر اذان کے دونوں نمازیں دو اقامتوں کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور یہ جن علماء نے کہا ان میں سے امام شافعی، ان کے اصحاب اور اسحاق ہیں اور امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ یہ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد کا قول ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے سالم سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ آئے تو مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ہر ایک کے لئے ایک تکبیر کہی اور ان کے درمیان کوئی نوافل نہ پڑھے۔ ابوعمر نے کہا: حضرت ابن عمر سے آثار اس قول کے بارے میں زیادہ ثابت ہیں جو اس باب میں مروی ہیں لیکن یہ تاویل کا احتمال رکھتے ہیں اور حضرت جابر کی حدیث میں اختلاف نہیں ہے اور یہ اولیٰ ہے۔ اس مسئلہ میں نظر کو کوئی دخل نہیں ہے اس میں صرف اتباع ہے۔

مسئلہ نمبر 16: نماز کے علاوہ دونوں نمازوں کے درمیان کسی عمل کے ساتھ فاصلہ کرنا۔ حضرت اسامہ بن زید سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ میں آئے تو اترے، وضو کیا اور مکمل وضو کیا پھر نماز کے لئے تکبیر کہی گئی، آپ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر ہر شخص نے اپنی منزل میں اپنے اونٹ کو بٹھایا پھر تکبیر کہی گئی تو پھر آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی (1)۔ ایک روایت میں ہے ''اور صحابہ نے سامان نہ کھولا حتیٰ کہ عشاء کی تکبیر ہوئی آپ نے نماز پڑھائی پھر سامان کھولا'' ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ کرنے کا جواز ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو مزدلفہ میں آیا کیا وہ پہلے نماز پڑھے یا نماز کو مؤخر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الافاضۃ من عرفات إلی المزدلفۃ، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کرے حتیٰ کہ سواری سے سامان اتارے؟ امام مالک نے فرمایا: سامان خفیف ہو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز سے پہلے اس کو اتار دے اور رہی ساز و سامان والی سواریاں ان کو بٹھانے اور ان کا سامان اتارنے کا نظریہ نہیں رکھتا، اسے چاہئے کہ پہلے نماز پڑھے پھر سواری سے سامان اتارے۔ اشہب نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ اس کے لئے نماز سے پہلے سواری سے اتارنا جائز ہے اور مغرب کی نماز پڑھ کر سامان اتارنا میرے نزدیک محبوب ہے جب تک کہ اس کی طرف مجبور نہ ہو۔ مثلاً سواری پر بوجھ زیادہ ہو یا عذر ہو۔ رہا دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا تو ابن منذر نے کہا: اس میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ سنت یہ ہے کہ جمع کرنے والا دونوں نمازوں کے درمیان نفل نہیں پڑھے گا۔ حضرت اسامہ کی حدیث میں ہے ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔

مسئلہ نمبر 17: جمہور علماء کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا حج کا رکن ہے جو شخص مزدلفہ میں دسویں کی رات نہیں گزارتا اور مزدلفہ میں نہیں ٹھہرتا اس پر جو واجب ہوگا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے مزدلفہ میں رات نہیں گزاری اس پر دم ہے اور جو رات کا اکثر حصہ ٹھہرا اس پر کچھ واجب نہیں ہے کیونکہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک مزدلفہ میں دسویں کی رات گزارنا سنت مؤکدہ ہے فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کا قول عطا، زہری، قتادہ، سفیان ثوری، احمد، اسحاق، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے رات نہیں گزاری۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر مزدلفہ سے نصف رات کے بعد نکل گیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں اور اگر نصف رات سے پہلے نکل گیا اور واپس نہ آیا تو فدیہ دے گا (1) اور فدیہ ایک بکری ہے۔ حضرات عکرمہ، شعبی، نخعی، حسن بصری نے کہا: مزدلفہ میں وقوف فرض ہے اور جس سے مزدلفہ کا وقوف فوت ہو جائے تو اس کا حج فوت ہو جائے گا اور وہ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دے گا۔ یہ حضرت ابن زبیر سے مروی ہے اور یہ اوزاعی کا قول ہے اور ثوری سے اس کی مثل مروی ہے۔ اور ان سے اصح قول یہ مروی ہے کہ مزدلفہ کا وقوف سنت مؤکدہ ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: جس سے مزدلفہ سے چلنا فوت ہو گیا اس کا حج فوت ہو گیا، وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرے اور انہوں نے ظاہر کتاب و سنت سے حجت پکڑی ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔

اور سنت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا پایا پھر وہ لوگوں کے ساتھ ٹھہرا حتیٰ کہ وہ وہاں سے چلا تو اس نے حج پا لیا اور جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا نہیں پایا اس کے لئے حج نہیں ہے (2)۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ دار قطنی نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے لئے حج ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا حتیٰ کہ ہم یہاں سے چل پڑے اور اس سے پہلے وہ عرفات سے رات یا دن کے وقت نکل چکا ہے تو اس کا حج مکمل ہے اور وہ مناسک حج ادا کر چکا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، من لم یدرك صلاة الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1)۔ امام شعبی نے فرمایا: جو مزدلفہ میں نہیں ٹھہرا وہ اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دے اور جس نے جمہور کے لئے حجت پکڑی اس نے یہ جواب دیا کہ آیت میں وقوف کے وجوب اور رات گزارنے پر کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ مذکور نہیں ہے آیت میں صرف اس کا ذکر ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جب سورج دسویں کے دن طلوع ہو جاتا ہے تو مزدلفہ میں وقوف کا وقت فوت ہو جاتا ہے اور جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیتا ہے تو وہ وقوف کو پالیتا ہے یہ اجماع ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے اور جو کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور رہی حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث اس کے بعض طرق میں عرفہ میں وقوف کا بیان ہے مزدلفہ میں رات گزارنے کا بیان نہیں ہے۔ اس کی مثل حضرت عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی کی حدیث ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرفہ میں حاضر تھا۔ اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے انہوں نے حج کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفہ (میں وقوف ہے) جو اسے مزدلفہ کی رات سے فجر طلوع ہونے سے پہلے پالے تو اس کا حج مکمل ہوا(2)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا فرمایا: ہمیں وکیع نے بتایا فرمایا: ہمیں سفیان ثوری نے بتایا انہوں نے بکیر سے انہوں نے عطا سے انہوں نے عبدالرحمن بن یعمر الدیلی سے روایت کیا، فرمایا: میں حاضر تھا، پھر انہوں نے مذکورہ حدیث ذکر کی۔ اس کو ابن عیینہ نے بکیر سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے، کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفات ہے جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیا اس نے حج کو پالیا اور منیٰ کے دن تین ہیں جس نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور عروہ کی حدیث میں ہے ”جس نے ہماری اس نماز جیسی نماز پڑھی (3)“۔ آپ نے مزدلفہ میں نماز کا ذکر فرمایا۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مزدلفہ میں رات گزارے اور امام کے ساتھ نماز پڑھے بغیر سو جائے حتیٰ کہ اس سے نماز فوت ہو جائے تو اس کا حج مکمل ہے۔ جب امام کے ساتھ نماز میں حاضر ہونا حج کی اصل میں سے نہیں ہے تو اس جگہ کا وقوف جس میں نماز ہوتی ہے وہ بدرجہ اولیٰ حج کی اصل میں سے نہیں ہوگا۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث کی وجہ سے یہ فرض متحقق نہیں ہوتا مگر خاص عرفہ میں۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ تاکید کے لئے امر کو دوبارہ ذکر کیا جیسے تو کہتا ہے ارمِ ارمِ (تیر مار، تیر مار) بعض علماء نے فرمایا: پہلا حکم مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم ہے اور دوسرا ذکر کا حکم اخلاص کے حکم پر ذکر کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دوسرے سے مراد نعمت کا شمار کرنا ہے اور اس کے شکر کا حکم ہے پھر انہیں ان کی گمراہی کی حالت یاد دلائی تاکہ انعام کی قدر ظاہر ہو۔ فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ، کما میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور ما مصدریہ یا کافہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عمدہ ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں عمدہ ہدایت دی اور اسے یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا کہ تم کیسے اس کا ذکر کرو، اس سے عدول نہ کرو۔ اِنْ مخففہ من ثقیلہ ہے۔ اس کی دلیل خبر پر لام کا دخول ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: ان نافیہ بمعنی ما ہے اور لام بمعنی اِلّا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 240، جلد 2 (قاہرہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من اتی عرفۃ قبل الفجر، صفحہ 223 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، فیمن لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ثکلتك امُك ان قتلت لمسلما حلت عليك عقوبة الرحمن

تیری ماں تجھ پر روئے تو قتل نہیں کرے گا مگر کسی مسلمان کو تو تجھ پر رحمن کی سزا ہوگی۔

یا ان بمعنی قد ہے یعنی قد کنتم۔ یہ تین اقوال ہیں۔ قَبْلِهٖ میں ضمیر ھدیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم قرآن کے انزال سے پہلے نہیں تھے مگر گمراہ۔ اگر تو چاہے تو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹا دے اگرچہ پہلے آپ کا ذکر نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جاکر) واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب جس کو ہے وہ لوگوں کے ساتھ عرفات میں نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ حرم میں ہے۔ وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں رہنے والے ہیں، پس ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم حرم کی تعظیم کریں اور حل میں سے کسی چیز کی تعظیم نہ کریں۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے وہ حرم سے نہیں نکلتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اسی سے نکلتے تھے اور لوگ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ تو انہیں کہا گیا کہ اکٹھے نکلو اور ثُمَّ اس آیت میں ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ یہ جملہ کلام کے عطف کے لئے ہے۔ یہ اس آیت سے جدا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس آیت کا مخاطب تمام امت ہے اور النَّاسُ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسے ارشاد فرمایا: الذين قال لهم الناس۔ یہاں النَّاسُ سے مراد ایک فرد ہے اور اس تاویل پر احتمال ہے کہ انہیں عرفہ سے جانے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دوسرا چلنا ہو اور یہ مزدلفہ سے چلنا ہے پھر ثُمَّ اپنے معنی پر ہوگا (1)۔ اس احتمال کی بنا پر طبری نے اعتماد کیا۔ معنی یہ ہے کہ تم چلو جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مزدلفہ سے چلے تھے یعنی پھر منیٰ کی طرف چلو کیونکہ عرفات سے نکلنا، مزدلفہ سے نکلنے سے پہلے ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے مزدلفہ میں وقوف کو واجب قرار دیا، اس سے نکلنے کے امر کی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تاویل میں دونوں اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: قریش اور ان کے دین کے پیروکار یعنی حمس، مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں ٹھہرنے والے ہیں اور جو ان کے علاوہ تھے وہ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (2) یہ حدیث حسن صحیح ہے اور مسلم کی صحیح میں حضرت عائشہ سے مروی ہے الحمس وہ لوگ ہیں جن کے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع الترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الوقوف بعرفات، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوگ عرفات سے نکلتے تھے اور الحمس، مزدلفہ سے نکلتے تھے وہ کہتے: ہم نہیں نکلیں گے مگر حرم سے جب یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ تو وہ عرفات کی طرف لوٹے۔ یہ صریح نص ہے اور اس کی مثل زیادہ صحیح ہے۔ باقی اقوال پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ واللہ المستعان۔

حضرت سعید بن جبیر نے الناسی پڑھا ہے اور اس کی تاویل حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿﴾ (طہ) بعض کے نزدیک یا کی تخفیف جائز ہے۔ وہ الناس کہتے ہیں جیسے القاض و الهادِ۔ ابن عطیہ نے کہا: عربی میں اس کا جواز سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور اس کو پڑھنے کا جواز مجھے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا کیونکہ یہ استغفار کی جگہ اور قبولیت کا مقام اور رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی طلب کرو جو تم نے وقوف کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی مخالفت کرتے ہوئے کیا۔ تم مزدلفہ میں جبل قزح پر ٹھہرے اور عرفات میں نہ ٹھہرے (1)۔

مسئلہ نمبر 2: ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی تو آپ قزح پر ٹھہرے اور فرمایا: یہ قزح موقف ہے اور مزدلفہ سارا موقف ہے۔ میں نے یہاں نحر کیا اور منیٰ سارا نحر کرنے کی جگہ ہے تم اپنے خیموں میں نحر کرو اور حاجیوں کا حکم جب وہ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف جائیں تو یہاں رات گزاریں پھر اندھیرے میں امام لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائے اور مشعر حرام میں وہ وقوف کریں۔ قزح ایک پہاڑ ہے جس پر امام ٹھہرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے رہیں اور سورج کے طلوع ہونے کے قریب تک دعا مانگتے رہیں۔ پھر طلوع شمس سے پہلے چلے جائیں۔ عربوں کی مخالفت کرتے ہوئے، کیونکہ وہ سورج طلوع ہونے کے بعد جاتے تھے اور کہتے تھے: اَشْرِقْ ثَبِيرُ كَيْمَا نُغِيرُ ثبیر پہاڑ روشن ہوتا کہ ہم احرام کھولنے کے قریب ہوں اور ہم غارت گری تک پہنچیں۔

بخاری نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت عمر کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھی پھر ٹھہرے اور کہا: مشرکین نہیں نکلتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا اور کہتے تھے: اشرق ثبیر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے چلے (2)۔ ابن عیینہ نے ابن جریج سے انہوں نے محمد بن قیس بن مخرمہ سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اہل جاہلیت، عرفہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے چلتے تھے اور مزدلفہ سے سورج طلوع ہونے کے بعد چلتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے چلنے میں تاخیر فرمائی اور مزدلفہ سے چلنے میں جلدی فرمائی، یعنی مشرکین کے طریقہ کی مخالفت کی۔

مسئلہ نمبر 3: جب سورج طلوع ہونے سے پہلے چلیں تو ان کو حکم ہے کہ وہ عرفہ سے چلنے کی ہیئت پر چلیں۔ یعنی امام

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، متی یدفع من جمع، صفحہ 228، جلد 1 (وزارت تعلیم)

لوگوں کو تھوڑا تیز چلائے جب ان میں سے کوئی کھلی جگہ پائے تو مزید تیز چلے۔ حدیث میں تیز چلنے کے لئے العنق کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ جانوروں کی معروف چال ہے اور النص مزید تیز چلنا ہے جیسے الخبب (جس میں ہچکولے آتے ہیں) یا اس سے زیادہ تیز چلنا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے، ان سے پوچھا گیا جب رسول الله ﷺ عرفہ سے چلتے تھے تو کیسے چلتے تھے؟ فرمایا: تیز چلتے تھے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے تھے (1)۔ ہشام نے کہا: النص فوق العنق کہ نص عنق سے تیز رفتاری کا نام ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور مستحب ہے کہ بطن محسر میں پتھر پھینکنے کی مقدار اپنی سواری کو حرکت دے اگر ایسا نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ منی سے ہے۔ ثوری وغیرہ نے ابوالزبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول الله ﷺ چلے تو آپ پر سکینت تھی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''وادی محسر میں تیز چلو (2)'' اور فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھو۔ جب وہ منیٰ میں آئیں یہ دسویں کے دن کی صبح کا وقت ہے تو جمرہ عقبہ پر چاشت کے وقت سوار ہو کر رمی جمار کریں اگر قادر ہوں اور اس کے علاوہ جمروں میں سوار ہونا مستحب نہیں اور سات کنکریاں ماریں، ہر کنکری ٹھیکری کی مثل ہو۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... جب وہ کنکریاں مارلیں گے تو جو کچھ لباس وغیرہ میں سے اور مثل میں سے حلال ہو جائیں گے مگر عورتیں، خوشبو اور شکار امام مالک اور اسحاق کے نزدیک حلال نہ ہوں گے۔ یہ ابوداؤد خفاف کی ان سے روایت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عمر نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔ امام مالک کے نزدیک جس نے رمی جمار کے بعد اور افاضہ سے پہلے خوشبو لگائی اس پر فدیہ نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ارشاد وارد ہے اور جو امام مالک کے نزدیک جمرہ عقبہ کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے شکار کرے اس پر جزا ہے۔ امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں کے اور یہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 4: حاجی جمرہ عقبہ پر پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کر دے مدینہ اور دوسرے شہروں کے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز اور مباح ہے اور ان کا مشہور قول یہ ہے کہ عرفہ کے دن سورج کے زوال کے وقت سے تلبیہ ختم کر دے جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ امر ہمارے نزدیک ہے۔ میں کہتا ہوں: اس عمل میں سنت وہ ہے جو مسلم نے حضرت فضل بن عباس سے روایت کی ہے وہ رسول الله ﷺ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو جب لوگ چلے، تم پر سکینت لازم ہے۔ آپ اپنی سواری کو تیز چلا رہے تھے حتیٰ کہ آپ وادی محسر میں داخل ہوئے۔ وہ منیٰ کے علاقہ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم وہ کنکریاں لے کر چلو جو جمرہ پر ماری جائیں گی۔ حضرت فضل بن عباس نے کہا: رسول الله ﷺ تلبیہ کہتے رہے حتیٰ کہ جمرہ عقبہ پر رمی کی (3)۔ ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے جیسے انسان کسی چیز کو پھینکتا ہے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الافاضۃ من عرفات الی المزدلفہ، صفحہ 417، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، التعجیل من جمع، صفحہ 268، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، استحباب ادامۃ الحج، صفحہ 415، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ وہ جمرہ کبریٰ تک پہنچے تو بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں جانب تھا، انہوں نے سات کنکریاں ماریں اور فرمایا: اسی طرح کنکریاں ماری تھیں اس ذات نے جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی (1)۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم رمی جمار کرلو اور حلق کرالو اور جانور ذبح کرلو تو تمہارے لئے ہر چیز حلال ہوگئی سوائے بیویوں کے اور تمہارے لئے کپڑے اور خوشبو حلال ہوگئی (2)''۔ اور بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہاتھوں سے خوشبو لگائی جب انہوں نے احرام باندھا اور اس وقت بھی جب طواف افاضہ سے پہلے احرام کھولا اور حضرت عائشہ نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (3)۔ یہ علماء کے نزدیک چھوٹا حلال ہونا ہے اور بڑا حلال ہونا ہے طواف افاضہ کے بعد اس سے عورتیں اور تمام وہ چیزیں جو احرام کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اس کا مزید ذکر ان شاء اللہ سورۂ حج میں آئے گا۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝

''پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ مجاہد نے مناسک سے مراد ذبائح اور ان کا خون بہانا لیا ہے (4)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہی حج کے شعائر ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک سیکھو۔ معنی یہ ہے کہ جب تم حج کے مناسک میں سے کوئی نسک ادا کرلو تو اللہ کا ذکر کرو اور اس پر اس کی نعمتوں کی تعریف کرو۔ ابو عمرو نے کاف کو کاف میں مدغم کیا ہے اسی طرح اس نے سلککم میں کیا ہے کیونکہ دونوں ایک جیسے ہیں اور قضیتم یہاں ادیتم اور فرغتم کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاذا قضیت الصلاۃ یعنی جب تم جمعہ ادا کرلو۔ یہاں فعل کی ادائیگی کو قضا سے تعبیر کیا ہے جس کا متعین وقت نکل چکا ہو۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ عربوں کی عادت تھی جب وہ حج ادا کر لیتے تو جمرہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء پر فخر کرتے اور اپنے آباء کی جرأت و بہادری اور سخاوت کے کارنامے بیان کرتے۔ حتیٰ کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، رمی الجمار بسبع حصیات، صفحہ 235، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 276، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، الطیب بعد رمی الجمار، صفحہ 236، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان میں سے کسی نے کہا: اے اللہ! بے شک میرا باپ عظیم قبہ اور عظیم تھال والا تھا اور کثیر مال والا تھا تو مجھے اسی طرح عطا فرما جس طرح تو نے اسے عطا فرمایا۔ پس اس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے زیادہ کریں جتنا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس، عطا، ضحاک اور ربیع نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے ہیں۔ ابا، اماں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے استغاثہ کرو اور اس کی بارگاہ میں پناہ لو جیسے تم اپنے بچپنے میں اپنے آباء سے کرتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کی حرمت کا دفاع کرو اور جو اس کے دین اور اس کے مشاعر میں شرک کا ارادہ کرے اسے دور کرو جیسے تم اپنے آباء کا خیر کے ساتھ ذکر کرتے ہو جب ان میں سے کسی کی شان گھٹائی جاتی اور تم ان کی طرف سے حفاظت کرتے ہو اور دفاع کرتے ہو (1)۔ ابوالجوزاء نے حضرت ابن عباس سے کہا: ایک شخص آج اپنے باپ کا ذکر نہیں کرتا، پھر اس آیت کا معنی کیا ہے؟ فرمایا: اس طرح بات نہیں ہے لیکن تو اللہ کے لئے ناراض ہو جب اس کی نافرمانی کی جائے، اس سے زیادہ جتنا کہ تو اپنے والدین کی وجہ سے غصہ کرتا ہے جب انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے۔ کذکرکم میں کاف محل نصب میں ہے یعنی ذکرا کذکرکم۔ اَوْ اَشَدَّ زجاج نے کہا او اشد، ذکرکم پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔ معنی ہے: او کاشد ذکرا۔ اور منصرف نہیں کیونکہ افضل صفت کا صیغہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ او اذکروہ اشد کے معنی میں محل نصب میں ہو اور ذکرا بیان کی بنا پر منصوب ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اگر تو چاہے اسے صفت بنا دے يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، من کا صلہ ہے اور مراد مشرکین ہیں۔ ابووائل، سدی اور ابن زید نے کہا: عرب زمانہ جاہلیت میں صرف دنیا کے مصالح کے لئے دعا مانگتے تھے (2)۔ وہ اونٹ، بکری، دشمن پر کامیابی مانگتے تھے اور آخرت کی خیر نہیں مانگتے تھے کیونکہ وہ آخرت کو جانتے نہ تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ پس انہیں صرف دنیا کے لئے دعا مانگنے سے منع کیا گیا، نہی، خبر کے صیغہ میں آئی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وعید مومن کو بھی شامل ہو جو صرف دنیا کے لئے دعا مانگے۔ اس بناء پر وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ یعنی اس شخص کے حصہ کی طرح جو آخرت کا سوال کرتا ہے الخلاق سے مراد حصہ ہے، اور من زائدہ ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

''اور بعض لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ یعنی لوگوں میں سے۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو دنیا اور آخرت کی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

خیر طلب کرتے ہیں۔ اور الحسنتین کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دنیا میں الحسنۃ سے مراد حسین و شکیل عورت ہے(1) اور آخرت میں آہو چشم حوریں ہیں۔ وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس سے مراد بری اور بدصورت عورت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ النَّارِ سے مراد حقیقۃً جلانے والی آگ ہے اور آگ سے عورت مراد لینا تجوز ہے۔ قتادہ نے کہا: حسنۃ الدنیا سے مراد دنیا میں عافیت اور مال بقدر ضرورت ہے۔ حسن نے کہا: حسنۃ الدنیا سے مراد علم اور عبادت ہے(2)۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ اکثر اہل علم کا یہ قول ہے کہ الحسنتین سے مراد دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اور یہ صحیح ہے کیونکہ لفظ تمام چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ حسنۃ نکرہ ہے اور دعا کے سیاق میں ہے۔ یہ بطور بدل ہر حسنۃ کا احتمال رکھتا ہے اور حسنۃ الآخرۃ سے مراد بالاجماع جنت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کوئی ایک حسنۃ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں اچھا عطیہ عطا فرما۔ پس اسم کو حذف کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ، قنا اصل میں اوْقنا تھا واو کو حذف کیا گیا جس طرح یقی اور یشی میں حذف کی گئی کیونکہ واو، یا اور کسرہ کے درمیان واقع ہے جیسے یَعِدُ، میں واو حذف ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: واو کو لازم اور متعدی کے درمیان فرق کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں ورم، یرم، واو کو حذف کرتے ہیں۔ آیت سے مراد یہ دعا ہے کہ وہ ان لوگوں سے نہ ہو جو گناہوں کی وجہ سے آگ میں داخل ہوں گے اور شفاعت انہیں نکالے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دعا جنت میں داخلہ کی طلب کے لئے دعا کو مؤکد کرنا ہے تاکہ دونوں طرف سے نجات اور فوز میں رغبت ہو جیسا کہ ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تھی میں اپنی دعا میں کہتا ہوں: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر اور مجھے آگ سے عافیت دے اور میں آپ کی کلام اور معاذ کی کلام کو نہیں جانتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''ہماری کلام تیری کلام کے قریب ہوتی ہے(3)''۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ نے یہ روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: یہ آیت ایک جامع دعا ہے دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرمائیں۔ آپ نے دعا کی: اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار۔ لوگوں نے کہا: ہمارے لئے مزید دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو، میں نے دنیا و آخرت تو مانگ لی ہے؟ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے تھے: اللھم آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار۔(4) حضرت انس جب دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تو یہ دعا مانگتے: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اس کے علاوہ آپ کی کوئی عادت نہ تھی۔ یہ ابو عبید نے ذکر کیا ہے۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 277، جلد 1

4۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 945، جلد 2 (وزارت تعلیم)

موقف میں مسلمان کی اکثر دعا یہ ہونی چاہیے: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رکن کے پاس ایک فرشتہ کھڑا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا وہ آمین کہتا ہے۔ پس تم کہو: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ عطا بن ابی رباح سے رکن یمانی کے متعلق پوچھا گیا جب کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عطا نے کہا: مجھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ستر فرشتوں کو اس پر مقرر کیا گیا ہے کہ جو یہ دعا پڑھے: اللهم انی اسالك العفو والعافية فی الدنيا والآخرة ربنا آتنا فی الدنيا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار۔ تو وہ کہتے ہیں: آمین(1) (الحدیث) اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے اور پوری حدیث مسنداً سورۃ الحج میں آئے گی۔

اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲

"انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب ان کی (نیک) کمائی کے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا یہ فریق ثانی کی طرف راجع ہے۔ یعنی اسلام کے فریق کی طرف۔ یعنی ان کے لئے حج کا ثواب ہے یا دعا کا ثواب ہے۔ بے شک مومن کی دعا عبادت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ کا مرجع دونوں فریق ہیں مومن کے لئے اس کے عمل اور دعا کا ثواب ہے اور کافر کے لئے اس کے شرک کی سزا اور دنیا پر اس کی نظر کا منحصر ہونے کا وبال ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (انعام: 132)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ یہ سرع یسرع سرعا و سرعة سے مشتق ہے جیسے عظم یعظُم، اس کا اسم فاعل سریع ہے۔ الحساب محاسبه کی طرح مصدر ہے۔ محسوب کو حساب کا نام دیا جاتا ہے الحساب کا معنی شمار کرنا ہے: کہا جاتا ہے: حسبَ یحسب حساباً و حسابة و حسبانا و حسباناً و حسباً یعنی شمار کرنا۔ ابن الاعرابی نے کہا:

یاجمل اسقاك بلا حسابه سقیًا ملیك حسن الربابة

قتلتنی بالدّل والخلابة

اور الحسب، انسان کے مفاخر جو شمار کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حسبه دینُهٗ۔ کہا جاتا ہے: حسبه ماله، اسی سے حدیث ہے: الحسب المال والکرم التقوی۔ (2) (حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے) اس حدیث کو حضرت سمرہ بن

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، فضل الطواف، صفحہ 218 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ حجرات صفحہ 160، جلد 2 (وزارت تعلیم)

جندب نے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور یہ الشہاب میں بھی ہے۔ الرجل حسیبٌ و قد حسُبَ حسابة جیسے خطُبَ خطابة۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ وہ شمار اور عقد اور فکر کو عمل میں لانے کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حساب لگانے والے کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا: کفٰی بنا حاسبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اللھم منزل الکتاب سریع الحساب (الحدیث)(1)

اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے جو کچھ ان کے حق میں ہے اسے جانتا ہے اور جو ان کے خلاف ہے اسے بھی جانتا ہے اسے غور و فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے جو محاسب کے لئے ہے اور جو اس کے خلاف ہے کیونکہ حساب میں فائدہ اس کی حقیقت کا علم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ بندوں کو ان کے اعمال کی بہت جلد جزا دینے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کو ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ وہ ایک حالت میں ان کا محاسبہ کرے گا جیسا کہ فرمایا اور اس کا قول حق ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان:28)

حسن نے کہا: اس کا حساب آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیز ہے(2)۔ خبر میں ہے اللہ تعالیٰ بکری دوہنے کی دیر سے حساب لے لے گا۔ بعض نے فرمایا: وہ جب ایک کا حساب لے گا تو تمام مخلوق کا حساب لے چکا ہوگا۔ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ تعالیٰ ایک دن میں بندوں کا کیسے محاسبہ فرمائے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے ایک دن میں انہیں رزق دیتا ہے۔ حساب کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق جزا کی تقادیر کو جانتا ہے اور انہیں وہ چیزیں یاد دلاتا ہے جو وہ بھول چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ (المجادلہ:6) بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے وہ حساب کے دن کو جلدی لانے والا ہے۔ اس آیت سے مقصود قیامت کے دن سے ڈرانا ہے(3)۔

میں کہتا ہوں: ہر مفہوم کا احتمال ہے۔ انسان اپنے لئے اعمال صالحہ کے ساتھ حساب کی تخفیف کو لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں حساب میں تخفیف فرمائے گا اس پر جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: حضرت ابن عباس نے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وہ شخص جو مال لیتا ہے اور کسی دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ اس آیت کے تحت مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے حج نہیں کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تیرے والد پر قرضہ ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ جائز ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا قرض ادا کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس شخص نے کہا: کیا اس میں میرے لئے اجر ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ یعنی جو میت کی طرف سے حج کرے تو اس کے اور میت کے درمیان اجر ہوگا۔ ابو عبد اللہ محمد بن خویز منداد نے احکام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، الدعاء علی المشرکین، صفحہ 411، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ معالم التنزیل، صفحہ 260، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 277، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کیونکہ امام مالک کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اس کو خرچ کا ثواب ملے گا اور حاجی کو حج کا ثواب ملے گا، گویا اسے اس کے بدن اور اعمال کا ثواب ملے گا اور جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اسے مال اور خرچ کا ثواب ملے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اس میں جس نے پہلے حج کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو حکم مختلف نہیں ہے۔ (یعنی پہلے جس نے حج نہ کیا ہوا ہو وہ حج بدل کر سکتا ہے) کیونکہ وہ اعمال جن میں نیابت ہو سکتی ہے ان میں جس کو نائب بنایا گیا ہے اس کا حکم مختلف نہیں ہے۔ اس نے پہلے اپنا وہ فریضہ ادا کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو اس میں دین و دنیا کے اعمال کا ہم نے اعتبار کیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وہ شخص جس پر زکوٰۃ ہو یا کفارہ ہو یا کوئی اور واجب ہو وہ کسی غیر کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اگرچہ اپنا کفارہ ادا نہ بھی کیا ہو۔ اسی طرح جس نے دنیا میں اپنے مصالح کی رعایت نہ کی ہو اس کا اس کی مثل مصالح میں غیر کا نائب بننا صحیح ہے۔ پس وہ غیر کے لئے مکمل ہوگا اگرچہ اس کے لئے مکمل نہ ہوگا۔ آدمی دوسرے کا نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اپنا نکاح نہ بھی کیا ہو۔

تمّ ترجمة الجزء الثانی من تفسیر القرطبی ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوة والسلام علی سید المرسلین

سید محمد اقبال شاہ عفی عنہ